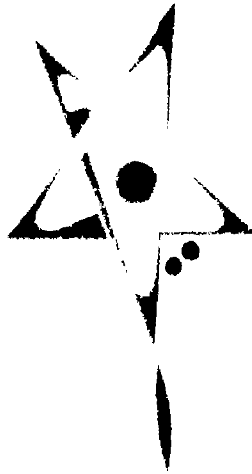
دور

اپریل سنہ ۱۹۹۲ء



تین روپے

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

ایک یادگار تصویر



آنجہانی گنیش شنکر ودیارتھی

مارچ ۱۹۳۱ء میں کان پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا فساد میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لئے شری گنیش شنکر ودیارتھی نے اپنی جان قربان کی تھی۔ اردو ہندی کے مشہور شاعر اور ناقد جناب اقبال ورما سحر ہتگامی نے "شری گنیش شنکر ودیارتھی" کے عنوان سے ایک مسدس چھ بند میں کہا تھا جو "زمانہ" کان پور جلد ۵۶ نمبر ۶ جون ۱۹۳۱ء میں صد ۲۹۹ پر چھپا تھا۔ ذیل میں اس کے تین بند درج کیے جاتے ہیں۔

ہندو و مسلم کے مل جانے کا تو حامی رہا
میل کی خاطر ہی تو نے آہ کتنا دکھ سہا
آپ تو اپنے دلی جذبات کی رو میں بہا
جان ہی دے کر کیا پورا اسے جو کچھ کہا
آج ہم سب کے لئے تو اے خدائے اتحاد
ہو کے قرباں بن گیا ہے رہنمائے اتحاد

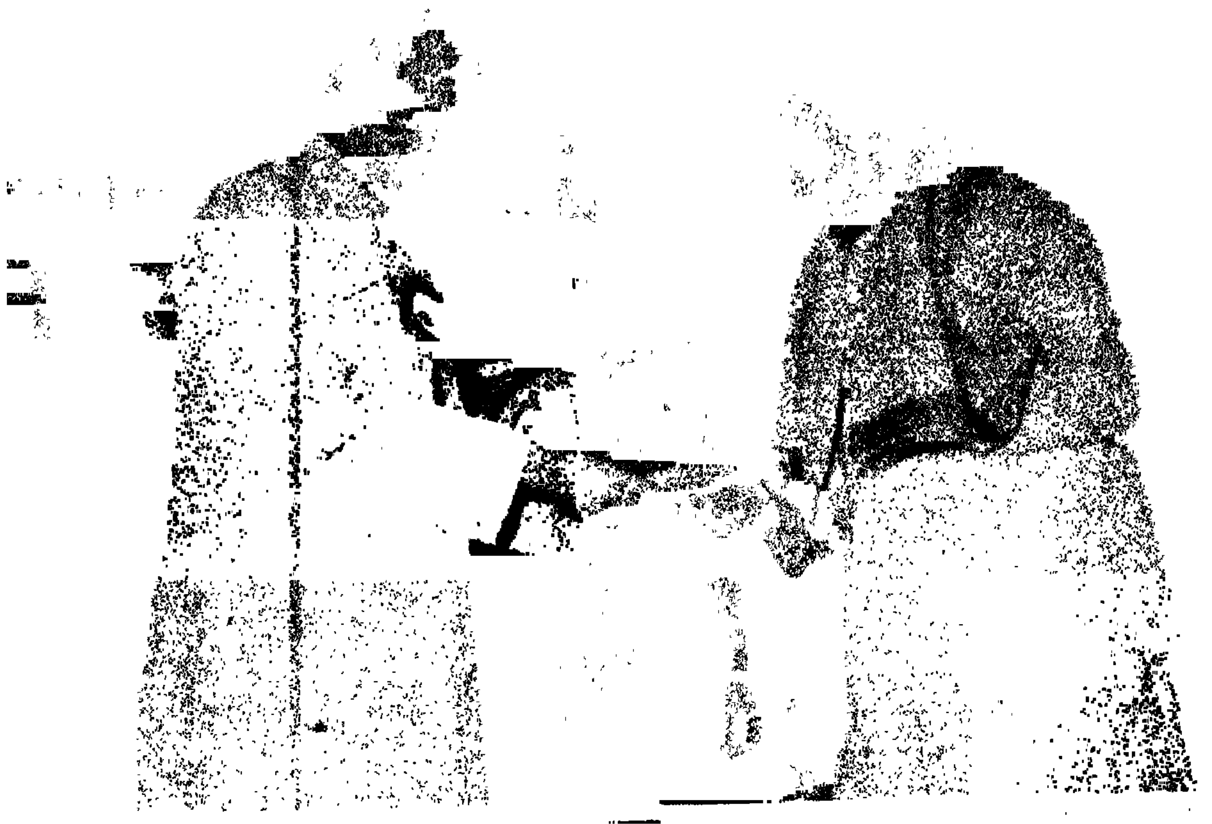
علم تھا اور ساتھ ہی اس کے عمل پرداز تھا
تو غریبوں کا سدا ہمدرد تھا ہمراز تھا
انکسارِ طبع سے تو کس قدر ممتاز تھا
خدمتِ قومی کو تیری خدمتوں پر ناز تھا
رشک کے قابل رہی جس طرح تیری زندگی
رشک کے قابل ہے اب اس طرح تیری موت بھی

گرچہ تھا اپنا ہی اُجڑا گاؤں تیرا بھی وطن
اپنی یکتائی سے تھا تو واقعی فخر زمن
گو ہے تیری موت سے دل دفتِ آلام محن
پھر بھی یہ اک بات تسکیں کا سبب جاتی ہے بن
باخبر ہو کر جیا اور باخبر ہو کر مرا
تو مرا لیکن حقیقت میں امر ہو کر مرا



پیش کش :
ظفر رضوی

Accession Number.
123453
Date 29.8.94



اترپردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرائن ریڈی ۴ مارچ ۱۹۹۲ء کو رویندرالیہ میں
کلاکاروں کو سال ۱۹۹۲ء کا اکادمی اعزاز دیتے ہوئے۔

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

آج سے ایک سو ایک سال قبل ہندستان کے مایہ ناز سپوت ڈاکٹر امبیڈکر نے اپریل کے مہینے میں ایک غریب گھرانے میں جنم لیا۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ معمولی خاندان کا فرد آگے چل کر اپنے کردار اور صلاحیتوں کی بنا پر ہندستان کی غیر معمولی شخصیت بن جائے گا۔

اس غیر معمولی شخصیت نے ہمیں ایک ایسا آئین دیا جو ہندستانی سماج کے لیے موزوں ترین تھا۔ یہ آئین ہمارے ولولوں اور امنگوں کا حقیقی ترجمان ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہمارا نصب العین ہے۔

——— اسی مہینے میں ہندستان کے عظیم مفکر اور فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی یاد آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہے اور ان کا قومی ترانہ آج بھی ہماری زبان پر ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

——— اپریل کے مہینے میں دو عظیم تہوار منائے جائیں گے۔ ایک عیدالفطر اور دوسرا بیساکھی ——— ادارہ نیادور دونوں تہواروں پر اپنے قارئین کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

■ ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا ۱۵ر مارچ ۱۹۹۲ء کو بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر تقریباً ۶۴ سال تھی۔ ان کی شہرت اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں یکساں طور پر تھی۔

ویسے بنیادی طور پر وہ اردو کے شاعر، نقاد اور افسانہ نگار تھے۔ ان کا اصلی وطن غازی پور تھا جہاں ۱۹۲۸ء میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد اپنے زمانے کے مشہور وکیل تھے۔ ڈاکٹر راہی کی ابتدائی تعلیم غازی پور اور لکھنؤ میں ہوئی۔

ڈاکٹر راہی کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ اور انھوں نے راہی غازی پوری تخلص اختیار کیا تھا۔ وہ نکہت پبلیکشنز الہ آباد سے بھی وابستہ رہے جہاں انھوں نے شاہد اختر کے قلمی نام سے ناول لکھے۔ بعد میں وہ علی گڑھ چلے گئے اور مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہیں لیکچرار ہوگئے۔ وہاں سے انھوں نے بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں کی فلمی زندگی نے ان کی ادبی سرگرمیوں کو کسی حد تک متاثر ضرور کیا۔ لیکن مشہور ٹیلی ویژن سیریل "مہابھارت" کے مکالموں نے انھیں غیر معمولی شہرت بھی دلائی۔ انھوں نے تقریباً ۳۰۰ فلموں کے لیے مکالمے اور اسکرین پلے لکھے۔ ادبی میدان میں یگانہ کی شاعری کے تنقیدی مطالعہ کے علاوہ انھوں نے خوبصورت غزلیں اور اچھے افسانے بھی لکھے۔ ان کے انتقال سے دنیائے ادب اور فلم میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

——— ایڈیٹر

عید الفطر



عید تہوار خوش نصیبوں کا
عید انعام تیس روزوں کا

مطمئن قلب، چہرے نورانی
جلوۂ "لم یزل" کی ارزانی

ہونٹ خاموش، بولتی آنکھیں
نشہ پانی میں گھولتی آنکھیں

عالم خواب ہے، نہ بیداری
کیا عبادات کی ہے سرشاری

شکر کیوں کر ادا نہ ہو رب کا
چاندنی جیسا پیرہن سب کا

مہر ڈوبا ہی تھا کہ شام آئی
چاند نے لی فلک پہ انگڑائی

دل نے بوسے ادا ادا کے لئے
ہاتھ اٹھنے لگے دعا کے لئے

برجیاں چھوتی آسمانوں کی
گونجتی نغمگی اذانوں کی

شامیں لائیں بہاریں ایماں کی
صبحیں دیکھیں نزول قرآں کی

مومنوں نے پڑھی جہاں بھی نماز
کوئی محمود تھا، نہ کوئی ایاز

بٹ گئی رسم ہی فقیری کی
سب نے یوں سب کی دستگیری کی

مفلسی بھی امیر جیسی ہے
فطرہ ایسا زکوٰۃ ایسی ہے

لوگ چڑھ کر گھروں پہ جاتے ہیں
روٹھنے والوں کو مناتے ہیں

دل کو سب یوں بھی شاد کرتے ہیں
بھولے بسروں کو یاد کرتے ہیں

دوست ہر ایک کا، ہر اک کا حبیب
ہے یہ تہوار ایکتا کا نقیب

صاف شفاف آئینے دل کے
شاد آباد سب گلے مل کے

عمر انصاری — ۲۰- امین آباد پارک، لکھنؤ

ڈاکٹر محمد حسن
ڈی ۔ ۷۰ ، ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

میری آپ بیتی

شہر مُرادآباد کے محلہ نواب پُورہ میں ۲۵ محرم کو ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوا ۔ مرادآباد کے تین چار مقتدر اور متمول گھرانوں میں ہمارے خاندان کا شمار ہوتا تھا ۔ شہری اور زرعی جائداد کافی تھی ۔ پردادا منشی فدا علی کو منشی کا خطاب اور ۵ دیہاتوں کا اختیار ملا تھا ۔ وہ شاہجہاں پور سے آکر مرادآباد بس گئے تھے ۔ دادا منشی مظہر حسن کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر جمعہ کو دالان میں بیٹھ کر پلیٹ سے غرباء اور مساکین کو اشرفیاں تقسیم کرتے جاتے تھے ۔ میرے والد حاجی الطاف حسن بڑے مذہبی آدمی تھے اور زمینداری کے کام کاج میں نہایت ہوشیار تھے ۔ انھوں نے بھی خود اپنی کوششوں سے جائداد میں اضافے کئے ۔ جگہ جگہ مرادآباد کی آبادی کا آبائی مکان خریدا ۔ کئی دیہات ، باغات وغیرہ مول لیے ۔ میری والدہ رضوان فاطمہ نہایت شفیق متدین اور نرم مزاج تھیں ، ان کی والدہ یعنی میری نانی امروہہ کی تھیں اور مقتدر شیعہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ۔ اب بھی میرے ننھیالی رشتہ دار شیعہ ہیں اور اسی طرح خلوص و محبت اور یگانگت قائم ہے ۔ میرے نانا مرادآباد کے مشہور حکیم مقبول حسن صاحب تھے ، مفت علاج کرتے تھے ، مدتوں مہاراجہ جیند کے سرکاری حکیم رہے تھے عربی کے فاضل اور مرادآباد کے اہم جاگیردار تھے ۔

ادب کا شوق کسی کو نہ تھا ۔ اُردو ادب میں ہمارے پُرکھوں میں سے کسی کا نام ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے گا ۔ ہائی اسکول (جو اس زمانے میں میٹرک کہلاتا تھا) ۱۹۳۹ء میں ہیوٹ مسلم ہائی اسکول مرادآباد سے کیا ۔ اسکول میں ایک کلاس میں بیت بازی ہوئی ۔ اس میں ہماری ٹولی غفران نامی ایک طالب علم سے ہار گئی جسے پورے کلاس سے بھی زیادہ شعر یاد تھے ' لہٰذا دوبارہ بیت بازی کے مقابلے کے لیے ابا سے دیوانِ غالب حاصل کیا اور جس نے مشکل ترین حرفوں پر ٹوٹنے والے شعر یاد کئے ۔ یہ ادب سے پہلی ملاقات تھی ۔

سیاست کا غلغلہ بلند تھا ۔ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر زمیندارہ لیگ کے امیدواروں کے خلاف ۱۹۳۷ء میں الیکشن لڑ رہی تھیں ۔ ہمارا خاندان زمیندارہ لیگ کے امیدوار کی حمایت کر رہا تھا ۔ جس کے صدر ہمارے ہم وطن اور ہمارے خاندان کے پرانے دوست سر جگدیش پرشاد تھے جو وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے ۔ اسکول میں بعض اساتذہ کی گفتگو سے آزادی کا تصور ذہن میں پیدا ہو چکا تھا گو کہ عمر ووٹ دینے کی نہ تھی مگر میری ہمدردیاں کانگریس اور مسلم لیگ کے امیدوار مولوی عبدالسلام کے ساتھ تھیں جو الیکشن ہار گئے تھے ۔ یہ سیاست سے پہلی ملاقات تھی ۔

اخباروں میں 'مدینہ' اور 'تیج' ، رسالوں میں غلام احمد پرویز کا 'طلوعِ اسلام' اور نیاز فتحپوری کا 'نگار' اور کتابوں میں علامہ اقبال کے شعری مجموعوں کے علاوہ علامہ مشرقی کا 'تذکرہ' میں خریدتا تھا اور غور سے پڑھتا تھا اور ہاں منٹو کی ادارت میں شائع ہونے والا 'مصور بمبئی' اور 'چترا' لاہور اور 'ادبِ لطیف' لاہور بھی زیرِ مطالعہ رہتے ۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میری یہ ضد تھی کہ آگے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کروں گا کیونکہ میرے کئی ہم جماعت وہاں جا رہے تھے ۔ والد کی یہ ضد تھی کہ پہلے مرادآباد کے گورنمنٹ کالج سے انٹرمیجیٹ پاس کر لو پھر علی گڑھ جانا ۔ غرض اسی ضدم ضدا میں دو سال کے لئے کہیں داخلہ نہیں لیا ۔

اور انٹر میجیٹ کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ یہ دو سال میری زندگی کے نہایت قیمتی سال تھے جب ہر قسم کے مسلمات پر ذہن نے سوالیہ نشان لگائے اور اپنے طور پر زندگی کی اقدار اور اعتقادات کو پرکھنے کی کوشش کی۔ پہلی بار والہانہ عشق بھی کیا جو محض تقلیدی تھا اور روایتی رنگ سے اس کی آگ میں جلا۔ افتادہ بھی آ ہیں بھریں اور اس کی ناکامی کا داغ اس طرح دل پر لگا کر زندگی کو نئے معنی دے گیا۔ سیاست سے دل چسپی لی، مارکسزم سے متعارف ہوا، رقص و موسیقی سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ غرض ذہنی فضا ہی بدل گئی

پرائیویٹ طور پر فارسی میں منشی کا امتحان پاس کیا، پھر انٹر میجیٹ کیا اور اب علی گڑھ میں داخلہ لینے کے بجائے والد صاحب کی خواہش کے خلاف لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جو ان دنوں آزاد خیالی کے لئے مشہور تھی اور جہاں سیاسی رنگ قوم پرستی کا غالب تھا۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس پر پابندی لگی اور 'ہندوستان چھوڑو' تحریک چلی تو ۹ / اگست کے مظاہرے میں شریک ہوا۔ عملی سیاست میں کانگریس سوشلسٹ گروہ سے تھوڑا بہت رابطہ ہوا اور خفیہ سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا۔

لکھنؤ نے مجھے بہت کچھ دیا۔ یہاں ادب ہی سے نہیں، سیاست تہذیب، فنون لطیفہ، عصری آگہی کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ دل چسپی پیدا ہوئی۔ استاد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور سید احتشام حسین جیسے ملے۔ زمانہ پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی کا تھا۔ کافی ہاؤس میں سیاست سے لے کر ادب تک اور عمرانیات سے لے کر فلسفے تک ہر موضوع زیر بحث رہتا غرض سے نہ سہی دور ہی سے میں اس ہمہ گیر آگہی سے مستفید ہوتا رہا اردو میں ایم۔ اے ۱۹۴۶ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ادب میں مجاز۔ سلام مچھلی شہری اور فراق گورکھپوری کا چرچا تھا۔ نت نئے تجربات ہو رہے تھے اور نئے فکری اسالیب ابھر رہے تھے۔ لگے ہاتھوں ایل ایل بی بھی کر ڈالا۔ اسی زمانے میں آل احمد سرور ریڈر ہو کر لکھنؤ یونیورسٹی آ گئے۔ ان کے طرز فکر اور طرز رہائش کی modernity نے متاثر کیا۔ اس زمانے میں رسالہ 'مضراب' شائع کیا جس کے چار شمارے شائع ہوئے۔

اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد تلاش معاش شروع ہوئی سو ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد اردو والوں کے لیے روزگار کہاں! ذاکر صاحب سے ذرا واقفیت نہ تھی۔ یونہی ان کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے پر خط لکھا اور اپنی بپتا بیان کی۔ انھوں نے فوراً جواب دیا، علی گڑھ چلے آؤ اور یہاں آکر ہندی ایم۔ اے میں داخلہ لے لو۔ فیس وغیرہ بھی ذاکر صاحب کے ذریعہ ادا ہوئی (یا معاف ہوئی) ان کے بنگلے پر ہفتوں مہمان رہا۔ پھر ہوسٹل میں داخلہ ہو گیا۔ مگر یہاں جی نہ لگا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مرادآباد واپس چلا گیا۔

یہاں کمیونسٹ پارٹی قائم کی، عملی سیاست میں حصہ لیا۔ مرادآباد میں پہلا فرقہ وارانہ فساد ہوا تو کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے قیام امن کے لیے پمفلٹ بانٹنے کے جرم میں گرفتار ہوا۔ جیل کی زندگی کا تجربہ ہوا۔ رہائی ہوئی تو سر جگدیش پرشاد سے رجوع کیا، وہ خاندان کے پرانے دوست تھے اور لکھنؤ کے روزنامہ پائنیر کے بورڈ آف ڈائرکٹر کے صدر۔ انھوں نے پائنیر میں امیدوار سب اڈیٹر کی حیثیت سے تقرر کر دیا۔ پھر باقاعدہ سب اڈیٹر ہو گیا۔ ان کا آرٹ کرٹیک اور فلم سیکشن کا انچارج ہوا اور اس کی کامیابی دیکھ کر میری ادارت میں پندرہ روزہ فلمی رسالہ 'فلم میل' جاری کیا گیا جو تقریباً دو سال چلا۔

اس دوران ادب سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ ڈراما محل سرا لکھا جو کافی پسند کیا گیا۔ ریڈیو کے لئے برابر ڈرامے، فیچر اور تقریریں لکھتا رہا۔ پہلا تنقیدی مضمون" ادب، زندگی اور سماج " ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی فرمائش پر رسالہ" شاہراہ " دہلی کے لیے لکھا جو اس سال کے بہترین ادب میں شامل کیا گیا۔ کچھ افسانے لکھے۔ اسی زمانے میں ایک افسانہ رسالہ "آجکل" میں چھپا۔ کچھ انشائیہ نما مضامین لکھے جنھیں 'ادبی دنیا' لاہور میں مولانا صلاح الدین احمد نے بڑے توصیفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ رسالہ "نگار" لکھنؤ کے لیے ڈی سیڈے پر تعارفی مضمون "پھول یا انگارے" کے عنوان سے لکھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں 'حلقہ احباب' قائم کیا جس کے صدر سید احتشام حسین صاحب تھے اور جس کے جلسوں میں پروفیسر کالی پرشاد نے نفسیات اور فلسفے پر، پروفیسر رتن جان کرنے ہندوستانی موسیقی پر اور پروفیسر کے این کول نے حیاتیات پر مضامین پڑھے تھے' افتتاح مولوی عبدالحق نے کیا تھا اسی ادارے کی طرف سے ایک پیروڈی کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی جس میں

سید آل حسن، ممتاز حسین، علی جواد زیدی وغیرہ نے پیروڈیاں پڑھی تھیں جن ادیبوں کے اسلوب کی پیروڈی کی گئی تھی ان میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، قرۃ العین حیدر، مجاز، سلام مچھلی شہری خود بھی شریک تھے۔

اسی دوران احتشام حسین صاحب راک فیلر فاؤنڈیشن کے وظیفے پر دو سال کے لیے امریکا چلے گئے اور ان کی جگہ میرا عارضی تقرر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ہو گیا۔ اس سے قبل بھی سید محمد تقی مرحوم کی علالت کے دوران میرا عارضی تقرر ہوا تھا۔ مگر تقی صاحب کے انتقال کے بعد مستقل جگہ پر میرا تقرر نہ ہو سکا۔ احتشام صاحب کے امریکا سے واپس آنے کے بعد میں بے روزگار ہو گیا۔ ادھر پانیر سے بھی میرا تعلق ختم ہو گیا تھا اور فلم سیل بھی بند ہونے والا تھا۔ تلاش معاش میں بمبئی گیا۔ وہاں سیدین صاحب کی معرفت خواجہ احمد عباس اور راجندر سنگھ بیدی کی مدد سے فلم میں قسمت آزمائی کا ارادہ تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرار کی مستقل جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ جا پہنچا۔

یہاں نو برس لیکچرار رہا۔ لکھنؤ کے مقابلے میں یہاں تگ و تاز کا میدان ذرا تنگ تھا۔ آل احمد سرور بھی پروفیسر ہو کر یہیں آ گئے تھے اور ان کے پرووسٹ ہو جانے پر ان کے ساتھ ایس۔ ایم۔ ایچ کا وارڈن اور رسالہ یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر، یونیورسٹی کا پبلک ریلیشنز آفیسر اور اخبار "اسٹیٹس مین" کا نامہ نگار رہا۔ اب میری چھ کتابیں چھپ چکی تھیں ـــــ ادبی تنقید، اردو ادب میں رومانوی تحریک، جلال لکھنوی، ہندی ادب کی تاریخ، پیسہ اور پرچھائیں (ڈرامے) اور زلیخا، زنجیریں (ترجمہ) ـــــ علی گڑھ میں اُردو تھیٹر قائم کیا اور حیدرآباد اور نینی تال کا دورہ کیا۔ علی گڑھ کا قیام کھٹے میٹھے تجربات کا تھا۔ اس میں کچھ معاملہ علیگ اور غیر علیگ ہونے کا بھی تھا۔ علی گڑھ کے قیام کے آخری دور میں پروفیسر رشید احمد صدیقی سے جنرل ایجوکیشن ریڈنگ میٹریل پروجیکٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بڑی قربت ہو گئی وہ اس پروجیکٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ ان سے روابط میری زندگی کی خوشگوار یادوں میں ہیں۔

۱۹۶۳ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ تھے۔ انھوں نے اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ شعبے کے سلسلے میں زیادہ تر کام میرے صلاح مشورے بلکہ عملی تعاون سے ہونے لگے چنانچہ کئی نئے کورس شروع ہوئے۔ ہر ہفتے مذاکرہ ہونے لگا۔ نظام اُردو خطبات کا سلسلہ گو خود ان کا تجویز کردہ تھا مگر مخطوطات شناسی کا کورس، ترجمے کا پوسٹ گریجویٹ کورس، بی اے آنرز کی سطح پر ریڈیو اور اخبارات کے لیے لکھنے (ماس میڈیا) کا کورس میرے ایما سے شروع ہوئے۔ یونیورسٹی کی سطح پر اردو پڑھانے والے اساتذہ کی تنظیم گو خواجہ صاحب پہلے بنا چکے تھے مگر اس کی پہلی کانفرنس کا پورا کام میرے سپرد ہوا۔ کانفرنس کامیاب ہوئی اور پھر ہر سال ہونے لگی۔ سری نگر، علی گڑھ اور لکھنؤ کے اجلاس کے بعد مجھے اس انجمن کا صدر منتخب کیا گیا اور ہر سال انتخاب میں ۱۹۸۹ء تک مجھے باتفاق رائے منتخب کیا جاتا رہا۔ انجمن کے ایک ۸ رکنی وفد نے پاکستان کی یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور صدر پاکستان نے اس وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

دہلی ہی میں ۱۹۶۹ء میں بزم ہم خیالاں کی بنا ڈالی اور اس کی طرف سے فرقہ واریت کے خلاف پہلا مذاکرہ منعقد کیا جس میں اختر الایمان، مہندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، عطر سنگھ جیسے دانشوروں نے شرکت کی۔ اسی سال جنوری میں سہ ماہی رسالہ "عصری ادب" جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔

۱۹۷۱ء میں کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یہاں نصاب کی تشکیل نو کی، اقبال ہفتہ منایا اور اس کے لیے حکومت ہند کی اجازت سے جگن ناتھ آزاد سے اقبال پر تصویری نمائش تیار کرائی۔ رسالہ ادبیات کا "تنقید" نمبر شائع کیا جس میں مغربی نقادوں کی نمائندہ تحریروں کے اقتباسات کے اُردو ترجمے یکجا کیے گئے تھے۔ یہاں مشرقی علوم کے شعبے کے ڈین اور کشمیر یونیورسٹی اقبال لائبریری کے آنریری لائبریرین کے فرائض بھی ادا کیے۔

۱۹۷۳ء میں ملک کا سب سے بڑا تحقیقی اعزاز جواہر لال نہرو فیلوشپ ملا جس کے تحت انیسویں صدی میں شمالی ہند کے ادب کی فکری اساس" پر کام کرنا طے پایا۔ اس سلسلے میں کام کرنے کے لیے دہلی واپس آیا اور انگلستان، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور پاکستان وغیرہ کی لائبریریوں اور تحقیقی اداروں کا دورہ کیا۔ ۱۹۷۵ء میں

یہ کام مکمل ہوا اور انگریزی میں رائل بک ہاؤس کراچی سے شائع ہوا۔
۱۹۷۵ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے اُردو پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا اور میں نے اسے قبول کرلیا۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء تک جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اُردو پروفیسر رہا۔ دوبار ہندستانی زبانوں کے مرکز کا صدر رہا۔ یہاں کی کلچرل کمیٹی کا بانی اور صدر رہا۔ اقبال اور پریم چند پر دو بین الاقوامی مذاکرے منعقد کیے۔ ادبی سماجیات اور تحقیق کے طریق کار پر دو قومی مذاکروں کا انتظام کیا۔ اقبال پر ہمہ جہتی مذاکرے کے مقالات اردو اور انگریزی میں شائع کیے اور فنون لطیفہ میں تخلیقی عمل کی نوعیت پر مصوری، موسیقی اور ادب کے مشاہیر کا سمینار منعقد کیا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں صحافت، فلم ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے کا باقاعدہ پوسٹ ڈپلوما اُردو کورس شروع کیا۔ ادبی سماجیات۔ تقابلی ادب اور مختلف ہندستانی زبانوں کے ادب سے اردو تحقیق و تنقید کے رشتے استوار کرنے کی غرض سے نئے تحقیقی موضوعات منتخب کیے اور نئے نصاب شروع کیے۔

یافت کی بات آئی ہے تو ارمانوں کی بات بھی ہونی چاہیے سچ تو یہ ہے کہ زندگی چند مجبوریوں میں کٹی۔ تنقید شروع کی تھی۔ انبساط اور آنند کی خاطر کہ جو لمحے نشاط کے تخلیقی سفر میں میسر آئیں ان کا ذکر ہم خیالوں سے کیا جائے اور نصف عیش کو یاد عیش سے دو آتشہ کریں مگر بعد کو جب یہی اُردو میں مدرسی اور معلمی کا پاسپورٹ بن گئی تو تنقید عیاشی کے بجائے ضرورت کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ان سب کاموں کا مختصر سا بیان اس طرح ممکن ہے کہ:

ادبی تنقید میں کلیاتی تنقید کا نظریہ پیش کیا اور تحقیق اور متنی تنقید کے رشتے عمرانی تنقید اور خیالات و اقدار سے ملانے کی کوشش کی کہ ادبی تفہیم کو وسیع تر افق میسر آئیں۔ شاعری میں نثری نظم کے ذریعے احساس اور تاثر کو ایجاز و ارتکاز فراہم کیا اور اس کے رشتے مریضانہ انفرادیت کے بجائے انقلابی حسیت سے ملائے۔ افسانے میں سچی کہانیوں کے ذریعے حقیقتوں کی بوالعجبی اور ان میں چھپی ہوئی وسیع تر آفاقی رمزیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ مجاز پر سوانحی ناول لکھ کر سوانحی ناول کی صنف کو متعارف کیا اور تحقیق میں ادب کی بعض گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کی سعی کی۔ مثلاً آبرو، مرزا سودا کے تنقیدی مراسلات۔ تذکرہ طبقات سخن اور جلال لکھنوی۔ غرض یہی کچھ ہے متاع فقیر۔

رہی ذاتی زندگی کی تفصیل سو مختصراً عرض ہے کہ ۱۹۵۸ء میں روشن آرا بیگم سے شادی ہوئی۔ انھوں نے اُردو اور فارسی میں ایم اے اور فارسی میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ مزاجوں میں تفاوت تھا لہٰذا نرم گرم گزری بڑا لڑکا جاوید حسن امریکا میں ہے۔ چھوٹا لڑکا نوید حسن دوبئی میں۔ لڑکی ثمینہ کی شادی انور صدیقی اسسٹنٹ کمشنر پولیس دہلی سے ہوئی ہے۔ مرادآباد میں میرا آبائی مکان ہے گو بہن بھائی سب علی گڑھ منتقل ہو چکے ہیں۔

اب یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد خوابوں کی تعبیر ڈھونڈھ رہا ہوں۔ جو کرنا چاہتا تھا اور نہ کرسکا وہ کرنے کی کوشش میں ہوں۔ سردست ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے سائنسی اصطلاحات کے ہندستانی اور غیر ملکی زبانوں میں تراجم کا تقابلی مطالعہ کر رہا ہوں۔ انیس[۱۹] زبانوں میں تراجم کو جمع کر رہا ہوں۔ چند ماہ میں، اردو کی سماجیاتی تاریخ، پر کام شروع کرنے والا ہوں۔ چند ڈرامے لکھوں گا اور دو ایک ناول۔
اور بس!

رسالہ عصری ادب نکالتا ہوں اور اس وقت تک سب اڈیشن ملا کر کوئی ۲۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی میں اخبار اسٹیٹس مین اور اُردو میں روزنامہ سیاست حیدرآباد کے لیے کبھی کبھی مضامین لکھتا ہوں۔
سو یہ ہے مختصراً میری آپ بیتی ـــــ کسی تاسف یا تفاخر کے بغیر!

□□

اھــلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ

نیا دور کو اپنی نثری یا شعری تخلیقات فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر صاف اور خوشخط تحریر کر کے اصل کاپی ہی روانہ فرمائیں۔ کاربن یا زیراکس کاپی ہرگز نہ بھیجیں ورنہ اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی۔
(اڈیٹر)

وہ ایک شخص جو انسانیت کا پیکر تھا

(نذرِ امبیڈکر)

شکست و ریخت لیے موسمِ تباہی گیا
جس انقلاب کو آنا تھا آخر آ ہی گیا
جو چار سمت تھا طوفان کم بجھا ہی گیا
مراد قافلہ اہلِ درد پا ہی گیا
مسلم ہے یہ دستور بزمِ ہستی کا
غرور عارضی ہوتا ہے خود پرستی کا

اسی کے فیض سے ہے کائنات جاں روشن
سبھی کی آنکھوں میں امید کا جہاں روشن
ورق ورق پہ عزائم کی داستاں روشن
کہ راستوں میں بھی ہے گردِ کارواں روشن
اداس دل ہے کسی گلستاں کی بات کریں
پھر آؤ عظمتِ ہندوستاں کی بات کریں

روش روش پہ بہارِ شگفتگی کی چمک
قدم قدم پہ سحر خیز روشنی کی چمک
نظر نظر میں وقارِ خود آگہی کی چمک
دل و دماغ میں احساسِ زندگی کی چمک
غرض نشاط و مسرت کی جو بھی صورت ہے
وہ اپنے ملک کے آئین کی بدولت ہے

وہ شخص جس نے کہ دستور کو بنایا ہے
وہ شخص علم سے جس نے عروج پایا ہے
وہ شخص جس نے چراغِ نظر جلایا ہے
اسی کی فکر کا جمہوریت پہ سایا ہے
وہ ایک شخص نہ تھا درس گاہِ عالی تھا
کہ اپنے رنگ کی تصویرِ بے مثالی تھا

غمِ جہاں کا مداوا نظامِ جمہوری
بہارِ باغِ تمنا نظامِ جمہوری
شعارِ زیست سراپا نظامِ جمہوری
اک انتخاب کی دنیا نظامِ جمہوری
اسی نظام میں آسودگی پنپتی ہے
اسی نظام کی مالا حیات جپتی ہے

وہ ذی شعور کہ امبیڈکر کہیں جس کو
وہ باکمال کہ اہلِ نظر کہیں جس کو
وہ خوش خیال کہ ہم دیدہ ور کہیں جس کو
وطن شناس بہ رنگِ دگر کہیں جس کو
عجیب طرز سے ٹوٹے دلوں کو جوڑ گیا
سدا کے واسطے اک اپنی چھاپ چھوڑ گیا

—— رباب رشیدی ——
[illegible]۔ شاہجہاں پور

پروفیسر عنوان چشتی
بی - ۱۱۲، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو تنقید کے تناظر میں

عبدالحق کے تنقیدی افکار کی معنویت

اُردو تنقید کا منظر نامہ بہت دل کش ہے اور پیچیدہ بھی۔ ادب کے افق پر متعدد رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ اور ہر رنگ کو اصرار ہے کہ وہی تنقید کا سب سے زیادہ سچا اور موزوں رنگ ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادبی تنقید نے بھی مغربی افکار و اقدار کا اثر قبول کیا ہے۔ مگر یہ بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ مغربی تنقید سے متاثر ہونے والے اکثر اُردو نقادوں نے اپنی زبان اور ادب کے کلاسیکی پیمانوں کو فراموش کیا ہے۔ مغربی تنقید کے رُجحانوں اور نظریوں میں تشریحی، تاثراتی، جمالیاتی، عمرانی، سماجی، مارکسی اور نفسیاتی تنقید کی خاص اہمیت ہے۔ تشریحی تنقید اشعار کی شرح تک محدود ہے۔ اس میں مغز نہیں، چھلکا ہی چھلکا ہے۔ یہ افکار و اقدار کو پرکھتی ہے نہ کہ زبان و بیان کے جمال آفریں عناصر کی جستجو کرتی ہے۔ پھر بھی یہ انداز نقد شعر کی اعلا فہم کے لیے ذہن کو تیار کرتا ہے۔ کم و بیش یہی حال "تاثراتی تنقید" کا ہے۔ ایسی تنقید نقاد کا وہ ذاتی تاثر ہے جو کسی کی تخلیق کو پڑھ کر، اس کا ذہن قبول کرتا ہے۔ "تاثراتی تنقید" تاثرات کی بازآفرینی پر اکتفا کرتی ہے اور اپنی جگہ تخلیقی تنقید ہونے پر ناز کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ تخلیق ایک چیز ہے اور تخلیق کا تاثر دوسری چیز۔ جو تعلق واقعہ اور واقعہ کے تاثر میں ہوتا ہے وہی تخلیق اور تخلیق کے تاثر میں ہے۔ ایسا نقاد تنقید کے نام پر الفاظ و تاثرات کا ایک دل کش نگار خانہ سجا لیتا ہے۔ اردو میں جمالیاتی تنقید بھی ملتی ہے۔ جمالیات فلسفۂ حسن و فن کا نام ہے۔ جمالیاتی تنقید حسن و فن کی حقیقت اور اہمیت پر نگاہ ڈال کر فلسفے کے دائرے میں داخل ہوجاتی ہے اور ان کی اثر انگیزی کی قوت پر غور کرکے نفسیات کے میدان میں چلی جاتی ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ جمالیاتی تنقید فلسفہ و نفسیات نہیں۔ مگر ان دونوں سے اخذ نور کرتی ہے اور ادب و شعر کی گرہیں کھول کر جمال آفرینی کے عناصر تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ جمالیاتی تنقید کا کام جمالیاتی کیفیت اور جمالیاتی عناصر کی تلاش ہے۔ ظاہر ہے کہ شعری جمالیات میں ہیئت کے عناصر کی خاص اہمیت ہے۔ لیکن جمالیاتی تنقید کے سامنے لسانی، فنی اور عروضی صحت کا کوئی متعین معیار نہیں ہے اس لیے یہ بھی جزوی طور پر زبان و بیان کی اہمیت پر نظر ڈالتی ہے اور اس کوچے سے دبے پاؤں گزر جاتی ہے

اردو تنقید کا ایک اور رجحان مارکسی تنقید ہے۔ اس کو ذرا سی تبدیلی سے کبھی سماجی تنقید، کبھی ترقی پسند تنقید اور کبھی سائنٹیفک تنقید کا نام دیا جاتا ہے۔ اس تنقید کا سنگِ بنیاد مارکس کا نظریہ ہے جس کو جدلیاتی مادیت کہا جاتا ہے۔ مارکسی تنقید اصرار کرتی ہے کہ اصل حقیقت مادہ ہے جو متحرک اور نمو پذیر ہے اور یہ کہ شعور بھی مادے کی ایک ترقی یافتہ یا ارفع جہت ہے۔ مارکسی تنقید ادب اور سماج کی تبدیلیوں کو پیداوار اور طریقۂ پیداوار کی تبدیلیوں سے وابستہ کرتی ہے۔ ادب کو سماجی تبدیلی کا ایک حربہ تصور کرتی ہے اور ادب کو فرد کے تخلیقی اور ذاتی عمل سے زیادہ سماجی عمل خیال کرتی ہے۔ وہ ادب و تنقید کی جمالیاتی اور ادبی اقدار پر اجتماعی، سماجی اور مقصدی اقدار کو فوقیت دیتی ہے مارکسی تنقید ادب میں رمزیت سے زیادہ وضاحت، جمالیاتی کیفیت

تنقید وہ مقصد ہے پورا کرتی ہے۔ اور ادب کے فنی تکنیکی لسانی اور ہیئتی پہلو کو نظر انداز کردیتی ہے۔ مارکسی تنقید ادب کے جمالیاتی رشتوں کی شناخت اور ادب کے ہیئتی عناصر کی جمالیاتی قدر کی تلاش میں قطعاً ناکام ہے۔ اردو کے ایک دو مارکسی نقادوں کو چھوڑ کر اکثر نے سماجی و سیاسی پس منظر کی تعبیر پر سارا زور صرف کیا ہے

اسی نوع کا ایک اور تنقیدی نظریہ ہے جس کو عمرانی تنقید کا نام دیا جاتا ہے۔ عمرانی تنقید، عمرانیات کے حربوں سے لیس ہو کر میدان نقد میں آتی ہے۔ یہ تنقید بھی علوم و فنون کا گہوارہ ہوتی ہے کبھی اساطیر کبھی تاریخ، کبھی نفسیات کا سہارا لیتی ہے اور تخلیق کے گرد ایک نئے انداز کا تانا بانا بنا دیتی ہے۔ عمرانی تنقید قاری کو ادب کے نام پر ادب کے مضافات کی سیر کراتی ہے۔ مگر تخلیق کو ثانوی درجہ دیتی ہے۔ اور اس کے فنی یا خارجی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے یا اس کی من مانی تعبیر پر اصرار کرتی ہے۔ نفسیاتی تنقید بھی تخلیق سے زیادہ خالق (فن کار)، تخلیقی عمل اور محرکات تخلیق سے سروکار رکھتی ہے۔ کبھی فرائڈ کی تحلیل نفسی کا سہارا لے کر ادب کو جنسی جبلتوں کی رقص گاہ قرار دیتی ہے۔ کبھی ژونگ کا نام لے کر اجتماعی لاشعور پر اصرار کرتی ہے اور آرکی ٹائپل کے اظہار کو فن قرار دیتی ہے۔ کبھی اڈلر سے کسب فیض کر کے ادب کو احساس کمتری کا فن کارانہ ردعمل قرار دیتی ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق نفسیاتی تنقید کا ارتقا مختلف سمتوں میں ہوا ہے۔ مگر یہ بھی اس طرف نہیں جاتی جس طرف ادب کا فنی، ہیئتی، لسانی اور اسلوبی پہلو ہوتا ہے۔ غرض تشریحی تاثراتی، جمالیاتی، مارکسی، عمرانی اور نفسیاتی تنقید کے نظریے تخلیقی تجربے کا وسیلۂ اظہار یعنی زبان و بیان اور اس کے ہیئتی و خارجی پہلو سے صرف نظر کرتے ہیں۔

اردو تنقید پر مغرب کے چند اور نظریوں اور رویوں کا اثر ملتا ہے۔ ان میں اسلوبیاتی، صوتیاتی اور ہیئتی تنقید شامل ہے۔ اسلوبیاتی تنقید ادب کی پرکھ میں اسلوبیات کے بیانوں اور صوتیاتی تنقید صوتیاتی اصولوں کا سہارا لیتی ہے۔ ان کی اپنی افادیت ہے، لیکن یہ ادب و شعر کو پرکھنے کے غیر تخلیقی نظریے ہیں۔ ان میں سائنسی قطعیت تو ہے مگر ادبی لطافت اور بصیرت نہیں بلکہ صوتوں اور مفروضوں کی بنیاد پر لسانی اور صوتی نقوش کی

بنیاد پر یا صرف و نحو اور معنی کی کیفیت سے صفات کے نمایاں ... تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو بہت محدود۔ اردو کے بعض لسانیاتی اور صوتیاتی نقاد تو محض اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ ایک تخلیق میں ۲۹ فعلین اور ۱۵ قافیے ہیں۔ لسانیاتی اور صوتیاتی تنقید اپنے بعض مثبت پہلوؤں کے باوجود لسانی، فنی اور عروضی صحت سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ یہ ادب کی پرکھ کا ایک محدود یا مشینی پیمانہ ہے۔ البتہ ہیئتی تنقید کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ ہیئت کے تمام عناصر کی تفہیم اور تجزیے پر مشتمل ہے۔ ہیئتی تنقید بنیادی طور پر ہر تخلیق کو ایک لسانی حقیقت قرار دیتی ہے۔ اس لئے ہیئتی تنقید لفظ سے معنی کی طرف یعنی ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرتی ہے۔

قدیم اردو تنقید کا مزاج بنیادی طور پر ہیئتی تنقید سے ملتا جلتا ہے اگر مغرب کی ہیئتی تنقید اور اردو کی کلاسیکی تنقید کے اصولوں کو یکجا کر کے ان کا اطلاق فن پارے پر کیا جائے تو بعض دلچسپ مگر فکر انگیز نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن مغرب کی ہیئتی تنقید بھی ہیئت کے عناصر کی صحت اور عدم صحت سے واسطہ نہیں رکھتی۔ یہ کام صرف اردو کی کلاسیکی تنقید انجام دیتی ہے۔ اس لیے اس کا ایک منفرد اور ممتاز مقام ہے۔ یہ اپنی جگہ خود مکتفی اور مکمل تنقیدی نظام ہے جو فن پارے کے لسانی، فنی اور عروضی پہلو کو صحت اور حسن کی ضمانت عطا کرتی ہے۔

اردو کی کلاسیکی تنقید کا انحصار عربی و فارسی شعریات پر ہے اور عربی و فارسی شعریات کا دائرہ علم بدیع و بیان اور معانی کے ساتھ علم عروض و قوافی و قواعد پر محیط ہے۔ اساتذۂ سخن نے ان علوم کی روشنی اور اپنے تجربے کی وساطت سے بعض اصول وضع کئے تھے اور جن پر دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے اساتذۂ فن اور ثقہ شعراء نے عمل کیا تھا یوں تو یہ اصول بلاغت کی کتب سے لے کر عروض اور قواعد کی کتابوں تک بکھرے ہوئے ہیں اور اصلاح سخن کی روایت میں ان کی عملی تعبیر نظر آتی ہے، لیکن حسرت موہانی کی کتاب "نکات سخن" ان اصولوں کی اہم دستاویز ہے جس کو اردو میں کلاسیکی تنقید کی نظریاتی بوطیقا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ صفدر مرزا پوری کی "مشاطۂ سخن" (دو حصے) عبدالعلیم شوق سندیلوی کی "اصلاح سخن" سیماب اکبرآبادی کی "دستور الاصلاح" عبدالعلیم آسی کی "تذکرۂ معرکۂ سخن" آبر احسنی کی "اصلاح الاصلاح" اور

"میری اصلاحیں" (دو حصے) اور جوش ملیانی کی کتاب "آئینۂ اصلاح" اس دبستان کی عملی تنقید کی بنیادوں کو استوار کرتی ہیں۔ یاس یگانہ چنگیزی کی کتاب "گلدستہ چراغ سخن"، کلب حسین خاں نادر کی "تلخیص معلیٰ" اور نظم طباطبائی کی کتاب "تلخیص عروض وقافیہ" بھی اس میدان میں مشعل راہ ہیں۔ اردو میں اس نوع کا وافر ذخیرہ اور اہم سرمایہ موجود ہے۔ لیکن اردو کے مغرب زدہ نقادوں نے اردو تنقید کے کلاسیکی سرمایہ سے چشم پوشی کی ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ اب تک کسی یونیورسٹی نے بھی اس پہلو پر کوئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کام نہیں کرایا ہے اس طرح اردو کی کلاسیکی تنقید دو طرح نظر انداز ہوئی ہے۔ ایک تو مغربی نظریوں کو اپنانے سے جن میں زبان وبیان کی یا تو کوئی اہمیت نہیں یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے اردو کے نقادوں کی اپنے کلاسیکی تنقید کے سرمایے سے چشم پوشی کے رجحان سے اس پس منظر میں اردو تنقید کے کلاسیکی دبستان کی بازیافت ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

اردو میں کلاسیکی تنقید کا یہ جواز ہے کہ ایک تو یہ ہماری زبان اور اس کے ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہے، دوسرے یہ بطور خاص ہیئت اور اسلوب کے حسن پر اصرار کرتی ہے اور معانی کے ساتھ انداز پیش کش اور بادۂ گل رنگ کے ساتھ جام جہاں نما کو بھی جمال آفریں بناتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے تنقیدی افکار میں فن کار کی شخصیت، اس کے ماحول اور عہد نیز ذریعۂ اظہار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شخصیت کے وسیلے سے ان کا ذہنی رشتہ نفسیاتی تنقید سے، ماحول اور عہد کے واسطے سے ان کا فکری تعلق سماجی اور تاریخی تنقید سے نیز ذریعۂ اظہار کی نسبت سے ان کا تنقیدی رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں نفسیاتی اور سماجی تنقید کا شعور کم ہے۔ پھر بھی انھوں نے شخصیت اور عہد کی اہمیت پر خاصا زور دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:-

"جب ہم شعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائص اور عادات پر نظر ڈالیں، اور اس کے بعد اس کے عہد کے واقعات و حالات و تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں، جہاں تک ان کا تعلق اس کی شاعری سے ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔"

(تنقیدات عبدالحق صـ۱۵۲)

اس میں شک نہیں کہ فن کار کی تخلیق پر اس کی شخصیت یعنی شعور ولاشعور اور عہد یعنی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی میلانات کا گہرا اثر ہوتا ہے مولوی عبدالحق نے "انتخاب میر" کے مقدمہ میں میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی "شخصیت اور عہد" کے میلانات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور میر کی شاعری پر ان کی شخصیت و عہد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے انھوں نے میر تقی میر کے بارے میں لکھا ہے:-

(۱) "میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا سلسلہ تھی، جس کا تار بچپن سے لے کر لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا۔"

(انتخاب کلام میر صـ۱۲)

(۲) "اس وقت دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی تھی، وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی، مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی، جو بیوہ تو نہیں، پر بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیاری ہے۔"

(انتخاب کلام میر صـ۱۲)

اس ضمن میں مولوی عبدالحق نے میر کی زندگی کے مد و جزر اور ان کے عہد کے اتار چڑھاؤ کے تناظر میں، ان کی شاعری میں، درد و داغ، خستگی و برشتگی اور غم زدگی و بیچارگی کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر میر کی شاعری کو ان کی زندگی اور عہد کے مرقع میں سجا کر دیکھیں تو آسانی سے یہ راز سمجھ میں آسکتا ہے کہ میر کی شاعری میں دل اور دلی کے نوحے کیوں ملتے ہیں؟ مولوی عبدالحق نے بار بار شخصیت و عہد کے اثرات

کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) "ان (میر تقی میر) کے کلام میں ایسا درد بھرا ہوا ہے کہ
اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔"

(انتخاب کلام میر ص۱۸)

(۲) "شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہ تھی
وہ سراپا یاس و حرماں تھے۔ اور یہی حال ان کے کلام کا
ہے۔ گویا ان کا کلام ان کی طبیعت و سیرت کی ہو بہو تصویر
ہے۔" (ایضاً ص۱۹)

(۳) "ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں۔
زبان سے نکلتے ہی دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

(ایضاً ص۲۱)

مولوی عبدالحق نے میر کی شاعری پر ان کی شخصیت اور عہد کے اثرات کی نشاندہی تو ضرور کی ہے۔ لیکن ان کی تنقیدوں میں نفسیاتی اور سماجی تنقید کا واضح اثر نہیں ملتا۔ نفسیاتی تنقید میں فن کار کی شخصیت کے تشکیلی محرکات اس کے ذہن و فکر کے نفسیاتی عوامل اور تخلیقی عمل کا تجزیہ شامل ہے عبدالحق کی تنقیدوں میں نفسیاتی تنقید کے یہ اصول کارفرما نہیں ہیں۔ اسی طرح سماجی تنقید کے نقطۂ نظر سے عبدالحق نے مادیت، زندگی کی کشمکش اور مقصدیت کو نظر انداز کر دیا ہے اور سادہ انداز سے شخصیت اور عہد کے اثرات کی چھان بین کی ہے۔

مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری کا تیسرا اصول ذریعۂ اظہار کی حرمت ہے انھوں نے بار بار اپنی تنقیدی تحریروں میں زبان کی صحت اور بیان کی لطافت پر اصرار کیا ہے۔ جس کا رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے مل جاتا ہے عبدالحق کی تنقید نگاری کا غالب رجحان یہی ہے۔ اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان لسانی، فنی اور عروضی پہلو پر مشتمل ہے۔ لسانی پہلو میں روزمرہ اور محاورہ کی صحت، زبان کے درست استعمال اور قواعد کے اصولوں کی خاص اہمیت ہے۔ فنی پہلو میں جمالیات اور شعریات نیز بدیع بیان اور معنی کے اصولوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ عروضی پہلو میں حروف علت کے سقوط، شکست ناروا اور اوزان و بحور کے مسائل شامل ہیں۔ بنیادی طور پر اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان، شاعری کی ہیئت کے حسن پر اصرار کرتا ہے۔ اس کا زیادہ دل لگتی اور کیف آفریں جانب پر زور دیتا ہے۔ اساتذہ کی اصلاحوں، ادبی معرکوں اور تذکروں نے اس کو پروان چڑھایا ہے۔ مولانا حالی اور شبلی کی تنقیدی تحریروں پر ان اصولوں کا خاصا اثر ہے۔ حسرت موہانی نے "نکات سخن" کی شکل میں اس دبستان کو بیشتر پیش کی ہے۔ مولوی عبدالحق اگرچہ اردو تنقید کے کلاسیکی دبستان کے روایتی علمبردار نہیں لیکن ان کے تنقیدی افکار پر اس دبستان نقد کا گہرا اثر ہے۔

مولوی عبدالحق کے تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تنقیدی مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم اردو تنقید کے دو پہلوؤں یعنی لسانی اور فنی پہلو پر خاص توجہ مبذول کی ہے لیکن عروضی پہلو کو قدرے نظر انداز کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تنقیدوں میں بار بار زبان کے لغوی اور تخلیقی استعمال کی بحث اٹھائی ہے۔ انھوں نے منشی احمد علی شوق قدوائی کے دیوان "فیضان شوق" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

"مرے منھ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھانا تھا
ترے ہونٹوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا

یہ آہیں چند میں نے کھینچ دیں صرف اوپرے دل سے
اثر کی کب تمنا تھی فقط اس کو ڈرانا تھا

ان اشعار میں زبان کے محل استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
"آہیں کھینچ دینا یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں،
"آہیں کھینچی" ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں
"مرے منھ پر" بھی اچھا نہیں ہے۔

(تنقیدات عبدالحق ص۳۴)

اسی مضمون میں مولوی عبدالحق نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے۔

گل ہو کے میں کیا ہنستا، ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گزرا روتے ہی جنم میرا

انھوں نے شوق قدوائی کے مندرجہ بالا شعر کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے،

"اس شعر میں 'جنم گزرا' باندھا گیا ہے۔ خدا جانے
یہ کہاں تک بلحاظ زبان ٹھیک ہے۔" (ایضاً ص۳۵)

مولوی عبدالحق نے جوش ملیح آبادی کی کتاب "روحِ ادب" پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی زبان اور اس کے استعمال پر اس طرح اعتراض کیا ہے:

"بعض مقامات پر عبارت میں خامی معلوم ہوتی ہے
اگرچہ وہ زیادہ قابل لحاظ نہیں، تاہم نہ ہوتی تو بہتر تھا
"عجیب شیرینی کا پہلا جملہ" ایک رنگین عارضوں والی دوشیزہ"
یا اس شعر میں "اشک" کا لفظ ؎
تمھارے سامنے کیوں اشک میرا بہہ نہیں سکتا
اسے محسوس کر سکتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا"

(تنقیدات عبدالحق ص ۱۲۱)

مولوی عبدالحق محض نکتہ چیں ہی نہ تھے۔ بلکہ نکتہ رس بھی تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ زبان کے تخلیقی استعمال کی داد دی ہے اور زبان کی مجازی شکلوں کو سراہا ہے۔ انھوں نے بانگ درا پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کی تین نظموں (شمع و شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام) کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے ان تین نظموں پر جو رائے دی ہے وہ مشرقی شعریات کے اصولوں پر مبنی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔"

(تنقیدات عبدالحق ص ۱۲۹)

واضح رہے کہ تخیل پر حالی اور شبلی نے بالترتیب مقدمہ شعر و شاعری اور شعرالعجم میں اچھی خاصی بحث کی ہے۔ لیکن جہاں تک تشبیہات و استعارات نیز لفظی ترکیبوں کا تعلق ہے یہ مباحث تو خالص مشرقی شعریات کے ہیں۔ جن میں زبان کے تخلیقی استعمال کا حسن ہے۔ مولوی عبدالحق نے ن م راشد کے شعری مجموعے "ماورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے نکتہ رسی کی سطح کو اور تیز کیا ہے اور اس تبصرے میں انھوں نے خیالات کے ساتھ "طرز بیان" کی جدت اور زبان کے نئے پن کا خیر مقدم کیا ہے۔ انھوں نے "ماورا" پر لکھا ہے:

"انھوں (ن م راشد) نے طرز بیان اور خیالات میں بھی جدت دکھائی ہے ؎
ابر کے پانیوں میں دُور ان روح کے طیارے ہیں
سُرعتِ نور سے پا آگہ کے پکارے میں
"پکارے" کا لفظ نیا ہے، اور خوب بنایا ہے۔"

(تنقیدات عبدالحق ص ۱۲۶)

مولوی عبدالحق نے جہاں نئے خیالات کا خیر مقدم کیا ہے وہیں انھوں نے نئے اسالیب کا استقبال بھی کیا ہے۔ "ماورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے عاری نظموں (بلینک ورس) کی پذیرائی کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی مولوی عبدالحق ہیں جنھوں نے نظم معرا کی تحریک پر عبدالحلیم شرر کی حمایت کی تھی۔ اور جن کے مشورے سے شرر نے بلینک ورس کا نام "نظم معرا" تجویز کیا تھا۔ ان مباحث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے نکتہ چینی کے ساتھ نکتہ رسی کا حق بھی ادا کیا ہے اور ہیئت کے جمالیاتی عناصر اور اسالیب کو سراہا ہے۔

اردو تنقید کا تیسرا رکن "عروض" ہے۔ مولوی عبدالحق نے روایتی انداز میں عروضی مباحث پر اظہار خیال نہیں کیا۔ لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں گہرا شعورِ آہنگ کارفرما ہے۔ میر تقی میر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

"الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔"

(انتخاب کلام میر ص ۱۸)

اس میں شک نہیں کہ موسیقی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں نے "میر تقی میر: داخلی موسیقی کا شاعر" عنوان سے اپنے ایک مقالے میں اس انداز فکر کی تھوڑی سی وضاحت کی تھی:

"موسیقی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مجرد آوازوں کی باقاعدہ ترتیب سے پیدا ہونے والی موسیقی اور دوسری بامعنی آوازوں یعنی لفظوں کی باقاعدہ ترتیب سے ابھرنے والی "لسانیاتی موسیقی"۔ شاعری میں دونوں طرح کی "موسیقیت" کا سنگم ہوتا ہے۔ حروف کی موسیقی

بحر و آوازوں کی موسیقی ہے۔ نیز الفاظ، تراکیب اور مصرعوں کی موسیقی بامعنی موسیقی کے دائرے میں آتی ہے۔ اس بامعنی موسیقی میں بحر و آواز یعنی حروف کی موسیقی لازمی طور پر شامل ہوتی ہے۔ اس طرح شاعری میں "لسانیاتی موسیقی" اور اس کی تمام قسمیں جوہر کی طرح پیوست ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب اور باشعور شاعر، اپنی شاعری میں آواز اور اس کی اشاریت کے جملہ امکانات سے فائدہ اُٹھاتا ہے جس کو شعری آہنگ بھی کہا جاتا ہے۔ میر ہمارے ان بڑے شاعروں میں سے ہے جس کو نہ صرف آہنگ کا بھرپور شعور ہے بلکہ وہ اس کو برتنے کا فن بھی جانتا ہے۔ شعری آہنگ بھی دو طرح کا ہوتا ہے، ایک داخلی آہنگ، جس میں جذبے کا آہنگ بھی شامل ہے اور دوسرا خارجی آہنگ جس میں حروف، الفاظ، تراکیب کے آہنگ کے ساتھ بحر و قوافی کا آہنگ بھی شامل ہے۔ شعری آہنگ ان دونوں کے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک اکائی بن جانے سے وجود میں آتا ہے۔"

(معنویت کی تلاش ص ۱)

اگر مولوی عبدالحق کے اصول (الفاظ کا صحیح استعمال اور خاص ترتیب سے پیدا ہونے والی موسیقی) کو عموماً میر کی کل شاعری اور خصوصاً بحر پر وار کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ مولوی عبدالحق کے شعورِ آہنگ کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ اس سے میر کی شاعری کے بارے میں دلکش نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس بحر میں میر تقی میر کی تقریباً ۱۸۳ غزلیں ہیں۔ بظاہر یہ بحر متقارب ہے۔ لیکن میر نے ارکان کی غیر رسمی و غیر روایتی ترتیب سے عروضی آہنگ کے جو پیٹرن اُبھارے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے یہ بھی مولوی عبدالحق کی تنقیدی بصیرت ہے کہ انھوں نے میر کے شعری آہنگ کی انفرادیت کو محسوس کیا اور اس شعورِ آہنگ کو اپنی تنقیدی بصیرت کا حصہ بنایا۔ مولوی عبدالحق نے راشد کے "ماورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے شعورِ آہنگ" پر چند خیال انگیز اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"راشد صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک کی شاعری خصوصاً اردو شاعری اپنی خارجی اصل کے سبب ہمارے "قومی شعورِ نغمہ" کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی بلکہ ایک میکانکی علم عروض پر مبنی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کو بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عروض اور نحو سب میکانکی ہوتے ہیں۔ پہلے شعر ہے اور اس کے بعد عروض، اسی طرح پہلے زبان ہے اور اس کے بعد صرف و نحو۔ مطلق ہو یا صرف و نحو، عروض ہو یا موسیقی، یہ سب ہماری بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اصل نہیں، تغیر پذیر ہیں۔ جب زندہ زبان اور ادب ایک حال پر نہیں رہ سکتے اور ان میں تغیر لازم ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ موسیقی کے اصول ایک حال پر قائم رہیں۔"

(تنقیداتِ عبدالحق ص ۱۴۸)

مولوی عبدالحق نے یہاں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ایک تو انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ "قومی شعورِ نغمہ یا ہندوستانی مزاج موسیقی" کیا ہے؟ اس پر آج تک گفتگو نہیں ہوئی۔ دوسرے انھوں نے "عروضی آہنگ" کی تائید کرتے ہوئے واضح طور پر یہ کہا ہے کہ زبان اور شاعری زمانے کے ساتھ چلتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ جب زمانے کے ساتھ زبان اور شاعری کا رنگ و آہنگ بدلتا ہے تو قواعد اور عروض کو بھی بدلنا ہوگا۔ لیکن یہ تبدیلی ضروری اور فطری ہوگی۔ تبدیلی برائے تبدیلی نہیں۔ کیونکہ شاعری کی ہیئت نامیاتی ہوتی ہے۔ آہنگ جو ہیئت کا حصہ ہوتا ہے، وہ بھی نامیاتی ہوتا ہے، زندگی کے ساتھ زبان اور شاعری، زبان اور شاعری کے ساتھ صرف و نحو نیز آہنگِ شاعری نامیاتی انداز سے بدلتا رہتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے اس اندازِ نظر سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا تصورِ آہنگ معتدل تھا۔ روایتی یا انقلابی نہیں تھا۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اردو تنقید کے دو اصول یعنی لسانی اور فنی توجہوں کے تو قبول کر لیے تھے لیکن عروضی اصول کو من و عن تسلیم نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے شعورِ آہنگ پر زور دیا تھا

اور آفاقیت کا تصور آہنگ کا اثر ہے۔ وہ ردیف و عروض کے زندہ عناصر کو ان کرنا چاہتے ہیں، مگر نئے تصورِ آہنگ کا استقبال بھی کرتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں وسیلۂ اظہار کی جو اہمیت ہے، اس سے ہر فن کار واقف ہے۔ موسیقی میں آواز کے زیروبم، سُر اور تال کی، رقص میں حرکاتِ بدن میں توازن اور ہم آہنگی کی، مصوری میں رنگ خطوط اور الوان کی ترتیب و توازن کی، بُت گری میں سنگ تراشی کے ضابطوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شاعری میں زبان کی صحت، آہنگ و بحور کے اصولوں اور فن کے دیگر لوازمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک موسیقار اپنے ذریعۂ اظہار یعنی آواز کے اتار چڑھاؤ اور سُر تال سے چشم پوشی کرتا ہے، وہ اپنے فن کے ساتھ کیا خاک انصاف کر سکتا ہے؟ اگر ایک رقاصہ اپنے بدن کی حرکات و سکنات میں کسی ترتیب، تناسب اور ہم آہنگی کی قائل نہیں تو کیا وہ دادِ رقص دے سکتی ہے؟ ایک مصور اپنے ذریعۂ اظہار یعنی رنگ و الوان کے استعمال میں اگر کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہیں تو وہ اپنے فن کے ساتھ کیا انصاف کر سکتا ہے؟ یہی حال نقاشی اور صنم سازی کا ہے۔

آج کل شاعری کے میدان میں ایک حشر برپا ہے۔ اکثر شعراء ذریعۂ اظہار کی حرمت کے قائل نہیں۔ زبان اور بیان کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ فن کی تاریخ شاہد ہے کہ جو فن کار اپنے فن کے ذریعۂ اظہار کا احترام نہیں کرتا، فن بھی اس کا احترام نہیں کرتا۔

مولوی عبدالحق کے نظریۂ تنقید پر یوں تو نفسیاتی اور سماجی تنقید کے اصولوں کا اثر ہے یعنی انھوں نے فن کار کی شخصیت اور عہد کے وسیلے سے فن تک رسائی پر زور دیا ہے۔ لیکن ان کے تنقیدی افکار پر اُردو کی کلاسیکی تنقید کا اثر ہے۔ انھوں نے زبان و بیان نیز ہیئت و اسلوب کی صحت اور جمال آفرینی پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زبان اور شاعری کو اگرچہ بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور قواعد و عروض بھی ان تبدیلیوں کو انگیز کرتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے ردیف قافیہ شعور آہنگ کے زندہ عناصر کے ساتھ نئے آہنگ کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔ اُردو کے نئے شعراء اور نقادانِ فن مولوی صاحب کے تجربے سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ □□

دُختَرِ دہقاں

اے کھیتوں کی ملکہ، اے پھولوں کی رانی
قدم چومتی ہے ترے یہ جوانی
ترے گیت وادی میں بکھرے ہوئے ہیں
ترے رنگ پھولوں میں نکھرے ہوئے ہیں
تری چوڑیوں کی کھنک ہے فضا میں!
تجھے یاد کرتا ہے جہلم کا پانی
تو اٹھلاتی گاتی ہوئی جب بھی آئی
نئی جان کیسر کے کھیتوں نے پائی
کلی کھل اٹھی پھول مسکائے لاکھوں
پھرن جب بھی دیکھا ترا آسمانی
گرا ہے جہاں پر بھی تیرا پسینہ
چمکنے لگا بن کے وہ آبگینہ
کہیں لعل کی شکل، نیلم کہیں پر
پہاڑوں کے دل میں ہے تیری نشانی
تو حبہ[1] کے گیتوں کی تصویر سی ہے
تو للّہ[2] کے خوابوں کی تعبیر سی ہے
تو مہجور[3] کی شاعری کا ہے محور
تجھی سے ہے زندہ روایت پرانی

——— سیلانی سیوتے
دور درشن کیندر، لکھنؤ

[1] حبہ خاتون کشمیر کی مشہور شاعرہ اور بادشاہ یوسف چک کی ملکہ تھیں
[2] للّہ دید کشمیر کی مشہور صوفی شاعرہ تھیں
[3] مہجور کشمیر کی جنگ آزادی کے مشہور شاعر اور مجاہد تھے۔

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
شعبۂ اردو ۔ حیدرآباد یونیورسٹی ۔ حیدرآباد

ہائیکو اور اردو شاعری

جب وقت بدلتا ہے تو اس کے ساتھ ہر شے بدلتی ہے انسانی فکر کے زاویے بدلتے ہیں ۔ خیالات اور رجحانات بدلتے ہیں۔ فیشن بدلتا ہے اور جب یہ تبدیلی ادب میں رونما ہوتی ہے تو اظہار کے پیرائے، اسلوب کے سانچے بھی بدلتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ چونکہ موضوعات بدل رہے تھے اس لئے اسلوب میں تبدیلی آنا ایک لازمی امر تھا۔ لہجہ میں ایک نئے آہنگ کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ عالمی شعروادب سے آگہی کے نتیجے میں نئی ہیئتوں کا وجود میں آنا بھی ایک یقینی بات تھی۔ چنانچہ دوسرے ممالک کی زبانوں میں مروجہ اصناف کو اردو میں برتنے کے تجربے کیے گئے۔ "ہائیکو" اسی طرح کا ایک تجربہ ہے۔

ہائیکو" اصل میں جاپانی صنفِ سخن ہے۔ وہاں ابتدائی دور ہی سے مختصر نظمیں مقبول رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندستان میں دوہے یا ایران میں رباعی اور غزل کے اشعار یا قدیم عربی ادب میں قصائد کے دورِ عروج سے قبل ارجوزہ یا اراجیز قبول عام کی سند رکھتے تھے۔

جاپان کی ابتدائی شاعری میں "وکا" یا "تنکا" ایک مشہور و مقبول صنف سخن تھی، جس کے آثار آٹھویں صدی سے ہی نظر آتے ہیں۔ یہ صنف آج بھی مقبول ہے لیکن سولھویں صدی تک یہ جاپانی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی۔ اس نظم میں ۳۱ صوتی اجزا ہوتے تھے اور ۵، ۷، ۵، ۷، ۷ کی ترتیب میں پانچ مصرعے کہے جاتے تھے یعنی پہلے مصرعے میں پانچ صوتی اجزا، دوسرے میں سات، تیسرے میں پانچ اور آخری دو مصرعوں میں سات سات صوتی اجزا ہوتے تھے۔

سترھویں صدی کی شاعری میں مزید اختصار سے کام لیا گیا۔ صرف تین مصرعوں میں سب کچھ کہہ دینے کے جذبے نے "ہائی کائی" یا "ہائی کو" کو جنم دیا۔ جس میں صرف سترہ صوتی اجزا ۵، ۷، ۵ کے تناسب سے استعمال ہوتے تھے۔

مشہور جاپانی شاعر باشو (۱۶۴۴ - ۱۶۹۴ء) نے اس صنف کو اپنی شاعری میں پہلی مرتبہ اختیار کیا اور یوں "ہائی کو" وجود میں آئے۔
ہائی کو" اصل میں "ہوکو" (Hu kku) کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب جاپانی نظم کا ابتدائی حصہ ہے۔ چنانچہ جاپانی شاعری کی دوسری اصناف جیسے رینگا (Renga) یا تنکا (Tanka) کے ابتدائی تین مصرعے ہوکو کہلاتے تھے اور ان میں بھی وہی پانچ سات پانچ صوتی اجزا کی ترتیب موجود ہوتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے پاس غزل کے پہلے دو مصرعے جو ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں، مطلع کہلاتے ہیں۔ جاپانی شاعری میں جب "ہوکو" یا نظم کے مطلع کو علاحدہ نظم کی شکل دی گئی تو اسے "ہائی کائی" اور پھر "ہائی کو" کہا جانے لگا۔

باشو کا ایک جاپانی ہائی کو اس لیے پیش کیا جارہا ہے کہ اس کے صوتی اجزا کو سمجھا جاسکے۔

Furu ike ya
Kawazu to bi komu
Mizu no oto

اس کا ترجمہ انگریزی میں ہیرالڈ جی ہینڈرسن نے یوں

کیا ہے :—

Old pond
Frog jump - in
Water sound

اُردو میں اس کا ترجمہ شاید اس طرح سے ہو :

ایک بوڑھا جوہڑ
جس میں مینڈک کودے اور
پانی جوں کا توں

جاپانی زبان کے مصرعوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے مصرعے کے پانچ صوتی اجزاء ہیں۔ دوسرے مصرعے کے سات اور تیسرے کے پانچ صوتی اجزا ہیں اور اس طرح پوری نظم میں سترہ صوتی اجزاء ہیں۔

اُردو ترجمہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے یہی بات پیشِ نظر رکھی۔ چنانچہ یہ ترجمہ بھی سترہ سبب خفیف پر مبنی ہے۔

اصل میں دوہے ہوں یا رباعی، غزل کا شعر ہو یا ہائیکو۔ ان سب میں ایک بات مشترک ہے — اور وہ ہے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن — جس طرح غزل کے دو مصرعوں میں شاعر تخیل کی ایک کائنات سمو دیتا ہے اسی طرح ہائیکو میں بھی صرف سترہ صوتی اجزا پر مشتمل تین مصرعوں میں سب کچھ کہہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اُردو میں 'ہائیکو' کہنے کا رواج اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۳۶ء میں شاہد احمد دہلوی نے رسالہ 'ساقی' کا 'جاپان نمبر' شائع کیا۔ اس رسالے میں فضل حق اور تمنائی نے جاپانی ہائیکو کے اُردو تراجم پیش کیے۔ فضل حق کا ترجمہ نثر میں تھا جبکہ تمنائی نے تین مصرعوں میں ترجمہ کیا، جس کا حوالہ ڈاکٹر عنوان چشتی کی کتاب "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" میں بھی ملتا ہے۔ تمنائی کا ترجمہ یہ ہے :

یہ دُنیا شبنم کے قطرے جیسی ہے
بالکل شبنم کے قطرے جیسی
پھر بھی کوئی حرج نہیں

لیکن تمنائی نے جہاں آہنگ کو پیشِ نظر رکھا وہیں سترہ صوتی اجزاء کی پابندی کو نظر انداز کر دیا۔

یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ اُردو کا پہلا ہائیکو کس نے لکھا — ؟ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اگر کسی خاص طرز کی پابندی کی جائے یا کسی خاص ہیئت میں نظم لکھنے کی کوشش کی جائے تو فنی لوازمات کو بھی نظر رکھنا چاہیے۔

یہ بات اس لیے کہی گئی کہ اُردو میں ہائیکو کے نام سے جو نظمیں ملتی ہیں ان میں تقریباً سبھی نظمیں ایسی ہیں جنہیں ہائیکو کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں سترہ صوتی اجزاء کی پابندی اور پانچ سات پانچ کی ترتیب کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور جہاں ان اصولوں کی پابندی نظر آتی ہے وہاں اُردو کے مزاج کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔

ہندوستان میں علیم صبا نویدی اور پاکستان میں محمد امین نے ہائیکو کے مجموعے شائع کیے۔ پاکستان ہی میں "جاپانی ثقافتی مرکز" کے زیرِ اہتمام "ہائیکو مشاعرے" بھی منعقد ہوئے جن میں جاپانی ہائیکو کے تراجم کے علاوہ شعراء نے طبع زاد ہائیکو بھی سنائے — اور ان مشاعروں کے چند گلدستے بھی شائع ہوئے۔ ہندوستان میں علیم صبا نویدی کے علاوہ قاضی سلیم سے لیکر شارق جمال اور قلب سر شار تک ہائیکو کہنے والوں کا ایک طویل قافلہ نظر آتا ہے لیکن ان تمام میں وہی ایک بات کھٹکتی ہے — جہاں ترجمہ پیش کیا گیا وہاں تو خیر ایک جواز پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں شاعر کی اپنی کاوش ہے وہاں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس صنف کو اپنانے میں کسی اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ سوائے اس کے کہ تین مصرعے ہوں اور بس : انھیں یا تو سہ سطری نظمیں کہا جا سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ مثلث یا ثلاثی — !

قاضی سلیم بہت اچھے شاعر ہیں اور فنی اعتبارات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ رسالہ تحریک جولائی ۱۹۶۶ء میں ان کی چند مختصر نظمیں شائع ہوئی تھیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ نظمیں ہائیکو کے فارم کی سختی سے پابندی کرتی ہیں۔ بقول ان کے انھوں نے سترہ سیلیبل کی پابندی کی ہے اور یہ سترہ صوتی اجزا ہندی کے لگھو اور گرو ماتراؤں کے اتصال پر مبنی ہیں۔ ان کی ایک نظم پیش ہے :

عکس جو ڈوب گیا
آئینوں میں نہیں

آنکھوں میں اتر کے دیکھو

اس نظم میں ہندی چھند کے اعتبار سے پہلے مصرعے میں پانچ دوسرے مصرعے میں پانچ اور تیسرے مصرعے میں سات جزو ان ماترائیں آئی ہیں اگر عروضی اعتبار سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے مصرعے میں تین سبب خفیف ، ایک سبب ثقیل اور ایک وتد مجموع ہے ۔ دوسرے مصرعے میں چار سبب خفیف اور ایک وتد مجموع آیا ہے اور تیسرے میں چھ سبب خفیف اور ایک وتد مجموع ہے ۔ کیا ہم اسے ہائیکو کہہ سکتے ہیں ۔

علیم صبا نویدی نے "ترسیلے" کے عنوان سے ہائیکو کا جو مجموعہ شائع کیا اس میں بقول کرامت علی کرامت دو طرح کے ہائیکو ہیں ۔ ایک پابند ہائیکو اور دوسرے نثری ہائیکو ۔ جس نظم کو کرامت علی نے پابند ہائیکو قرار دیا اس کا ہر مصرع فاعلاتن مفاعلن فعلن کے وزن پر ہے ۔ اور پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیہ کی پابندی کی گئی ہے ۔

یہ نظم پیش کی جا رہی ہے :-

معتبر منزلوں کا راہی وہ
ہیں سمندر پناہ میں اس کی
ہے صدف آشنا سپاہی وہ

اب حمایت علی شاعر کا ایک "ثلاثی" دیکھئے جس کا عنوان "زاویہ نگاہ" ہے

یہ ایک پتھر ہے جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو بھی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

اس ثلاثی میں اور علیم صبا نویدی کی نظم میں ہیئت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ۔ بحر البتہ مختلف ہے دونوں میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہے اور ہر نظم کے تینوں مصرعے ایک ہی وزن کے ہیں ۔

تو پھر علیم صبا نویدی کی نظم کو ثلاثی کیوں نہ کہا جائے ۔ ایک ہی ہیئت کے آخر دو نام کیوں —؟

البتہ اسی کتاب یعنی "ترسیلے" کے مقدمے میں کرامت علی کرامت نے اپنا بھی ایک ہائیکو پیش کیا ہے جو راقم الحروف کے خیال میں ہائیکو کی تعریف پر پورا اترتا ہے ۔ یہ ہائیکو پیش کیا جا رہا ہے :-

لمحوں کی تتلی

میرے من کے آنگن میں
جانے کیوں آئی

اس نظم میں سترہ سبب خفیف ۵ ، ۷ ، ۵ کی ترتیب میں استعمال کیے گئے ہیں ۔ کرامت علی کرامت نے "ترسیلے" کے مقدمے میں ایک بڑی خوبصورت بات کہی ہے ، جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ "کسی زبان کی مخصوص صنف کو دوسری زبان میں برتتے وقت اس کے فارم میں کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہو جاتی ہیں " ۔ اس بات میں کچھ اضافہ یہ ہو سکتا ہے کہ تبدیلیاں ایسی ہوں جن کے باوجود اس صنف کی انفرادیت باقی رہے اور دوسری اصناف کے ساتھ خلط ملط ہونے کا خدشہ نہ رہے ۔ اور ساتھ ہی فنی لوازمات اور زبان کے مزاج کا بھی خیال رکھا جائے ۔ یعنی ہیئت یا موضوع کے لحاظ سے کوئی بات تو ایسی ہو جس سے صنف کا تعین ہو سکے ۔

اگر ہم کسی نظم کو ہائیکو کہیں تو اس کے کچھ اصول ہوں ۔ ثلاثی کہیں تو اس کے کچھ ضوابط ہیں اور سہ سطری نظمیں کہیں تو اس کا تعین بھی کسی قاعدے کی بنیاد پر ہو ۔ ورنہ ان تین ناموں کی کیا ضرورت ہے ۔؟ قرعہ ڈال کر کسی ایک نام کا انتخاب کر لیا جائے ۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جس کے جو جی میں آئے وہی نام استعمال کرے ۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ، جاپانی ہائیکو کی بنیادی خصوصیات میں سب سے اہم اختصار ہے ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ صرف سترہ صوتی اجزاء سے پانچ ، سات ، پانچ کی ترتیب میں تین مصرعے تشکیل دیئے جاتے ہیں ۔

اب اردو شاعری کا مزاج جاپانی یا انگریزی شاعری سے مختلف ہے ۔ وہاں سلیبل یا صوتی اجزاء کے ذریعے Scanning کی جاتی ہے اور یہاں سبب اور وتد کے ذریعے ارکان بنا کر تقطیع ہوتی ہے ۔ تو پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ سبب یا وتد کو ہائیکو کے لئے بھی بنیاد بنایا جائے ۔!

راقم الحروف کے خیال میں اردو ہائیکو کے لئے بھی یہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے ۔ یعنی سب سے پہلے تو یہ کہ تین مصرعے ہوں اور دوسری بات یہ کہ ۵ ، ۷ ، ۵ کی ترتیب کا خیال رکھا جائے ، یعنی پہلے مصرعے

میں پانچ ہم وزن ٹکڑے، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ ٹکڑے استعمال کیے جائیں۔ یہ ہم وزن ٹکڑے سبب خفیف یا وتد مجموع کے ہو سکتے ہیں۔ البتہ قافیہ اور ردیف کی قید کو ضروری نہ رکھا جائے۔ کیوں کہ جاپانی میں بھی یہ قید نہیں ہے۔ ویسے اگر مزید حسن پیدا کرنے کے لئے پہلے اور تیسرے مصرعے ہم قافیہ ہوں تو اور بھی بہتر ہوگا۔

اگر سترہ سبب خفیف یا سترہ وتد مجموع کو مروجہ عروضی ارکان میں ظاہر کریں تو پہلی شکل یوں ہوگی جس میں سترہ سبب خفیف ہوں گے۔

فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فع

اور سترہ وتد مجموع کے لیے یہ شکل بنے گی:

مفاعلن مفاعلن فعَل
مفاعلن مفاعلن مفاعلن فعل
مفاعلن مفاعلن فعل

یہاں ایک تجویز یہ بھی ہو سکتی تھی کہ کیوں نہ کسی سالم یا محذوف رکن کو سترہ بار استعمال کیا جائے۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہائیکو نظم کی سب سے اہم خصوصیت اختصار ہے۔ سالم یا محذوف رکن استعمال کرنے سے جو طوالت پیدا ہوگی وہ ہائیکو کی روح یعنی اختصار کو مجروح کر دے گی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سبب ثقیل، وتد مفروق اور فاصلہ صغریٰ و کبریٰ کو بھی استعمال ہونا چاہیے۔ لیکن شاید اردو کا مزاج اس کا متحمل نہ ہو سکے۔

بہر حال اگر سترہ سبب خفیف یا سترہ وتد مجموع کی بحور کو اپنا کر اردو میں ہائیکو کہے جائیں تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ صنف نہ صرف مقبول ہوگی بلکہ اس کی اپنی ایک ہیئت بھی ہوگی۔ اور اس کے اصول بھی ہوں گے۔

نمونے کے طور پر راقم الحروف کے کچھ ہائیکو درج ہیں:

(۱) آنسو دیتا ہے
لمحہ تیری یادوں کا
چٹکی لیتا ہے

(۲) میری باتوں سے
سہما سہما ہے سورج
کتنی راتوں سے

---

(۳) اک اک پل جوڑے
زندہ رہنے کی خواہش
دھاگا کب چھوڑے

---

(۴) گلشن بلبل گل
چندا سورج یا تارے
سب لفظوں کے پل

---

(۵) تنہائی میری
دھندلا دیتی ہے اکثر
بینائی میری

حواشی:

۱؎ Syllables پروفیسر گیان چند نے اس اصطلاح کے لیے پہلے "رکن" "بحر" "صوت رکن" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ راقم کے خیال میں "صوتی اجزا" بہتر ہے۔

۲؎ An Introduction to Haiku, Harold G. Henderson P. 19

○ جوابِ طلب امور کے لیے ٹکٹ لگا لفافہ ارسال کریں۔
○ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دے دیں۔
—— ایڈیٹر

رقص ماہتاب

(ایک تاثر)

عبدالاحد ساز

خود فراموشی کی ساکت ساعتیں
رات اک منظر عجب دکھلا گئیں

آسماں کی شوخ پریاں نیم شب | ہولے ہولے سے اُتر کر آ گئیں
ٹھہریاں کچھ دیر پر جوڑے ہوئے | اور پھر آہستہ سے لہرائیاں
نرم لے میں بج اٹھے چاندی کے تار | گونج اٹھیں نقرئی شہنائیاں
جل اُٹھے ہر سمت روپہلی چراغ | سج گئیں ماحول کی انگنائیاں
شہپروں کی دھیمی دھیمی جنبشیں | پیکروں کی خواب ناک انگڑائیاں
جھلملاتے نور کے ہالوں کا رقص | سرسراتی سینگوں پر چھائیاں
حلقہ در حلقہ بکھرتی سی گئیں | اور اک گھیرے میں پھر ل آئیاں
ایک لحظہ! اک شبستانی خامشی | پھر ترنم ریز افسوں زائیاں
حور پس منظر سے اک طالع ہوئی | سر سے پا تک حسن کی رعنائیاں
ناز سے اتری بساطِ رقص پر | لے کے عشووں کی جنوں افزائیاں
پیچ و خم کا سحر، جنبش کا طلسم | تیرتے حلقوں کی جادو زائیاں
سارا پیکر تارہ تارہ جھالریں | ساری قامت کہکشاں آرائیاں
پھوٹتی ہر انگ پارے کی پھوار | جاگتی ہر توس برق آسائیاں
ساق و ساعد کے کھنکتے جل ترنگ | دست و پا کی زمزمہ پیرائیاں
درمیاں وہ پیکرِ انوار رواں | گرد پریاں صورتِ شیدائیاں
سارا منظر اک مدوّر اضطراب | روشنی لیتی ہوئی انگڑائیاں
رفتہ رفتہ اوج پر تھا جوشِ رقص | موج زن تھیں حسن کی برنائیاں
لمحہ لمحہ تیز تر آہنگ ساز | ہر صدا میں آسماں پیمائیاں
سینکڑوں شعلے خنک تارے شرار | مرمریں جسموں کی آتش زائیاں
مرتعش کرنوں کے اندر جلوہ گر | یم بہ یم اظہار کی پہنائیاں
اک حصارِ نور میں کُل کائنات | وسعتیں، اونچائیاں، گہرائیاں
چار جانب اک روپہلی سرخوشی | نقرئی تسکین کی پرچھائیاں

ماہتابی جسم کے ہر لوچ نے
چاندرس کی گگریاں چھلکائیاں

غزل

یاد نے کنکر پھینکا ہوگا
خواب کسی کا ٹوٹا ہوگا

دھوپ میں غم کی عمر کٹی ہے
کب خوشیوں کا سایا ہوگا

پھول کے رُخ پر رنگ نہ چھوڑا
بھنورا کتنا پیاسا ہوگا

چہرے بے گھر ہوگئے ہونگے
آئینہ جب ٹوٹا ہوگا

سچ سچ کہنا تنہائی میں
تم کو کیسا لگتا ہوگا

تجھ سے الگ میری دنیا میں
تنہائی کا پہرا ہوگا

پھینک کے ساکت جھیل میں پتھر
اس نے مجھ کو پرکھا ہوگا

ذکرِ غمِ احباب کی خاطر
شعر کا لہجہ تیکھا ہوگا

نازک سی اک جنبشِ لب سے
پہروں امرت برسا ہوگا

کرچیں کرچیں شیشہ شیشہ
خواب کا جادو بکھرا ہوگا

جانے سعید اس کا دروازہ
کس کے نام پہ کھلتا ہوگا

ڈاکٹر سعید عارفی
تالاب گولپورہ ۔ بہرائچ

نظام صدیقی
۵۷۵، دائرہ شاہ محب اللہ، بہادر گنج
الہ آباد

ساختِ شکن تنقید

کا ایک اور تنقیدی مطالعہ

اُردو ادب میں بھی ۱۹۷۰ء میں جدیدیت کا مینار بابل منہدم ہوگیا۔ فی زمانہ روایتی ترقی پسندی بے معنی آموختہ اور روایتی جدیدیت بھولا ہوا حافظہ ہے۔ یہ تو مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک کا بسیط دور ہے اس میں نئی وجودیت، ساختیات اور مابعد ساختیات کی لہریں بیک وقت رواں دواں ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے منفی عناصر کا ارتفاع کر کے نئے عہد کی تخلیقیت سے ہم آہنگ ہو رہی ہیں سکہ بند محدود معنوں میں فیشن گزیدہ جدیدیت کی جو تحریک ۱۹۵۳ء میں ادارہ رسیدہ ترقی پسندی کی آہن پوش معتقدات کی فصیلوں کی شکست و ریخت میں کامیاب ہوئی تھی، آج وہ خود ایک حنوط شدہ دقیانوسیت عصبیت اور ادعائیت کے مترادف ہوگئی ہے۔ یہ اپنے کو محفوظ گھونسلو میں سمیٹنے کا ایک آسان وسیلہ بن چکی ہے۔ اس کے باعث اُردو ادب میں فی زمانہ نئی جمالیات اور نئی اخلاقیات کی نئی تخلیقیت گزار جستجو کا شعوری طور پر فقدان ہے جو عالمی نفرت سے بھری نیوکلیائی جنگ کی آتش فشاں پر کھڑی پرانی دنیا کے متبادل نئی دنیا کی تخلیق کا آفاقی پیغام دے سکے۔

آج انسان برقی سرعت سے نیا آدمی (NEW MAN) یا نا آدمی (NO MAN) کے خوفناک انسان کش اور کائنات کش موڑ پر آپہنچا ہے۔ عصری تناظر میں نئی قدریں، نیا حسن، نیا آدمی، نئی دنیا اور نیا انصاف ہی یکسر غیر مرئی ہے۔ اس لیے آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے کرنے کی بابت مجہول پرست اور مصلحت گزیدہ رویے اور برتاؤ کو ختم کیا جائے اور ہر نوعیت کے تنظیم پرور اور فرقہ پرست فکری اور فنی جمود سے بے محابا نبرد آزما ہوا جائے جو یکسر ردِ روایت (ادبی فرقہ واریت یا مُردہ روایت) کے مترادف ہے۔ اس کے برخلاف اپنے موجودہ قومی اور عالمی سیاق سے جُڑ کر اپنی زندہ اور متحرک روایت کی بھرپور روشنی میں نئے عہد کی تخلیقیت کی پرورش کی جا سکے تاکہ فکر و خیال کا نیا پن، موضوع اور معنی کا نیا پن اور الفاظ و اظہار کا نیا پن منفرد تخلیقی شان کے ساتھ وجود میں آئے جو زندہ، نامیاتی اور متحرک ادب کی روح ہے۔ درحقیقت نئے عہد کی تخلیقیت تخیل کی بغاوت ہے۔

بغاوت آفریں تخلیقیت ہی حقیقی تخلیقیت ہے۔ وہ تاریخی گردشوں کی امین نہیں ہوتی۔ ادب میں جدید تر یا جدید ترین حقیقی تخلیقیت کے معنویاتی اور کیفیاتی خطوطِ امتیاز کے لئے سیاسی بغاوت نہیں، بلکہ نئے تازہ کار اور توانا تخیل کی بغاوت ناگزیر ہوتی ہے۔ اپنے نئے سیاق کے اصولِ حقیقت (REALITY PRINCIPLE) سے جُڑے بغیر بے معنی تخلیقیت سے عاری، تقلیدی تحریروں کا پہاڑ کھڑا کر دینا تو آسان ہے لیکن رائی بھر تخلیقیت آفریں ادب کی تخلیق نہیں۔ ہر تحریر تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ محض ترتیب، تقلید، تلقین (DICTATION) اور تکسیر کا منشور ہو سکتی ہے۔ تخلیقی فن اور تکسیری فن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حقیقی تخلیق کی تہذیب اور محض تقلید کی کسری تہذیب میں

تخلیقی بغاوت ہے خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے استبدادی تلک الایام پر قائم ہو۔ آگہ وادیب جیتی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر "استبدادی تلک الایام" کی بات کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ انسانی شعور و احساس کے ساتویں آسمان پر عرفان کے بغیر اس تک رسائی ناممکن ہے اور یہ جمالیاتی اور فکری رسائی بیک وقت اپنی ذات، اپنے سماج اور اپنی پوری دنیا کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے یکسر نئے تناظر کے تصور وقت کی مکمل آگاہی سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کی بغاوت آفریں تخیلاتی اور جمالیاتی تقلیب تو بعد میں ہوتی ہے۔ ہر دور میں سیاق نیا ہوتا ہے اور وہی نئی تخلیقی معنویت عطا کرتا ہے جو نئے سیاق کو اس کی تمام داخلی اور خارجی سطحوں پر پہچاننے کو تیار ہے۔ وہ خود بخود صحیح معنی میں نئی تخلیقیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور اس کی ادبی نگارشات سے نئے عہد کی تخلیقیت گویا ہوتی ہے۔ نئے مفاہیم، نئے کوائف اور نئے معانی طلوع ہوتے ہیں جو از سر نو نئی جمالیات اور نئی اخلاقیات کی تخلیق، تشکیل اور تعمیر کرتے ہیں۔

نئے عہد کی تخلیقیت، معنویت اور ساختیت یکسر گوریلا جنگ ہے جو سرحدوں پر لڑی جاتی ہے۔ یہ مختلف شکلوں میں روس کی آہن پوش سرحد پر بھی لڑی گئی۔ چیکوسلواکیہ میں پراگ کی سرحد پر لڑی گئی، سوئزر لینڈ کی سرحد پر لڑی گئی۔ فلسفۂ لسان اور مسئلۂ معنی کی صورت میں انگریزی اور جرمن ادب کی سرحد پر لڑی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں فرانس کی ایسی ہی سرحد پر جامعاتی یک سطحی تنقید اور متن کے متعینہ طے شدہ معنی کے خلاف ساختیات کے علمبردار رولاں بارت کو جنگ کرنی پڑی تھی۔ اس نے ادب کی تخلیقیت افروزی، معنی خیزی اور ذہنی نشاط جوئی کے لئے مکتبی آمروں کی آمریت اور ابلہ فریبیت (MYSTIFICATION) کو منہدم کر دیا تھا اور تخلیقی ادبی تنقید کی تاسیس کی تھی۔ پھر ساختیات کے زوال پر فرانس میں ہی مابعد ساختیاتی تنقید کے مردِ آہن ژاک دریدا کو دانشِ حاضر کی سب سے بڑی جنگ کرنی پڑی ـــ اس نے پوشیدہ مفاد کے حامل ساختیات کے بڑے بڑے بتوں کو مسمار کر دیا۔ اس نے زوال پذیر، انتہا پسند ساختیاتی تصورات کے خلاف نہایت فکر انگیز تنقیدی مباحث شگفت کیے جس سے مابعد ساختیات اور معنویات کی نئی روشنی کے دریچے وا ہوئے۔

ساخت شکن تنقید (Deconstruction) مغربی تنقیدی نظام کی جدید ترین پیش قدمی ہے۔ اس مابعد ساختیاتی طرز فکر کو عالمی ادبیات کے بیشتر ارباب فکر و فن مابعد جدید کردار (Post Modernity) کا حامل تصور کرتے ہیں۔ فرانس کے ساختیات شکن مجتہد فلسفی، ماہر لسانیات اور ادبی ناقد ژاک دریدا فلسفہ اور ادب دونوں میں بیک وقت ساخت شکن تنقید کے بنیاد گزار ہیں۔

ساخت شکن تنقید کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "ردتعمیریت" سے موسوم کرتے ہیں جو اصطلاح سازی کے علاوہ لغوی اور معنوی طور پر بھی غلط اور قابل رد ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس کو "لاتشکیل" سے تعبیر کرتے ہیں جو یکسر بے معنی اور مہمل ہے۔ ردتشکیل (Deconstruction) کے لیے "ہونا" لازمی ہے۔ اس وضعیات شکن مکتب فکر کے دوسرے اہم نمائندے مثل فوکو، ژاک لاکان، جولیا کرسٹیوا، جاناتھن کلر، ہیرلڈ بلوم، لیوسیاں گولڈمن، لوئی آلتھوسے، فرانسواں لیوتار اور مارتو پونتی ہیں۔ ان تمام لوگوں نے اپنے مخصوص ضابطۂ علم میں ساخت شکن رویہ اور برتاؤ کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً لیوسیاں گولڈمن نے مارکسی ہوتے ہوئے بھی اطلاقی سطح پر تخلیقیت پسند ساختیات" کی تشکیل کی اور نئے سیاق کے اصول وقت کے تحت "نئے توازن" کی تلاش پر اصرار کیا اور ہر نوعیت کے پرانے توازن کو انتہا پسندی قرار دیا ہے۔ مائیکل ریان (RYAN) نے ساخت شکن تنقید اور نو مارکسی تنقید میں دانشورانہ مکالمہ اور معانقہ کا آغاز کیا ہے۔

اس مابعد جدید عہد میں ژاک دریدا کی بت شکنی کے باعث ادب اور فلسفہ کی دنیا میں تخیلاتی بغاوت، حقیقی تخلیقیت، کثیر معنویت اور جمالیاتی کیفیت اندوزی کو فوقیت نصیب ہوئی ہے۔ اس نے ہر عالم میں تقلید کے بجائے اجتہاد، تابعداری کے بجائے سرکشی، مماثلت کے بجائے اختلاف و انحراف، آمریت اور مطلق العنانیت کے بجائے تشکیک و تکثیر، یک سطحی معنویت کے بجائے کثیر معنویات کو اہمیت اور فضیلت عطا کی ہے اس کی تخلیقی تشکیک، تنقید اور بے محابا تکثیر نے عصری عالمی دانشوری کے پورے منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ مابعد ساختیاتی عہد سے قبل ادبی تنقید حسن پارہ کی خادمہ تصور کی جاتی تھی۔ اب وہ تخلیقیت اور جمالیاتی

کیفیت رکھتا ہے کہ اعتبار سے پیش قدم کی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے اور تخلیق یا تخلیق نگار کے منصب پر فائز ہے۔ تخلیقی ادبی تنقید کا وظیفہ اب اس قدر معنی کی تلاش نہیں جس قدر معنی کی تخلیق کا رفیع فریضہ ہے۔ فی زمانہ تخلیقی ادبی تنقید اسی ذوقی اور علمی اہمیت اور معنویت کی مستحق ہے جو تخلیق کا منصب ہے۔ ہر تخلیق میں تنقید اور ہر تنقید میں تخلیق شامل ہوتی ہے۔ ہر خالق میں ناقد اور ہر ناقد میں خالق شامل ہوتا ہے۔ خالق فن کار، مخلوق، متن" یا "فن پارہ" اور تخلیقیت شناس ناقد یا قاری باہم دگر منسوب ہیں۔ باہمی رشتوں کے نظام میں منسلک ہیں۔ معنویات (Semantics) اور کیفیات (رس (ras) کا تصور) کی تخلیق میں تینوں کی اضافی سیاق میں مساوی معنویت اور اہمیت ہے۔ اس ضمن میں صرف فن کار (رومانی ادبیات کے مانند)، صرف "متن" (نئی تنقید کے مانند) یا صرف ناقد اور قاری (ساختیات کے مانند) کو ادبی معنی کی تخلیق یا حذف معنی کی کارکردگی میں حتمی اور کلی اہمیت اور فضیلت دینا فکری انتہا پسندی اور جذباتی شور و شر ہے۔ یہ دانش ورانہ سلامت روی اور جمالیاتی سنجیدگی کی ضد ہے۔

فلسفۂ معنی کی رو سے ادبی تفہیم میں ان تینوں محولہ بالا عناصر کی مساوی اہمیت و معنویت ہے۔ اپنی غیر معمولی مفکرانہ، خلاقانہ، جارحانہ جرأت اور قوت تمیز کے باعث فی زمانہ "تنقید کی تہذیب" کی قدر و قیمت "تخلیق کی تہذیب" کے مساوی ہے۔ تخلیقیت حقیقی تخلیق کا احساس و عرفان ہے۔ ساخت شکن تنقید سے قبل یہ احترام، افتخار اور استحقاق تخلیقی ادبی تنقید کا مقدر نہ تھا۔ اس نے اپنے فوری پیش رو ساختیات کو نہ صرف فرانسیسی ادب سے بے دخل کر دیا ہے بلکہ بقول ہمت سلور مین "متن" "انسکرپشن" مغرب میں اس کے چراغ کو گل کر دیا ہے۔ البتہ مختلف پوشیدہ مفادات اور وجوہات کے باعث اب امریکہ میں اس کا رنگ و آہنگ شوخ تر ہو رہا ہے۔ ویسے ساختیات نے ہی اینگلو امریکی "نئی تنقید" کو مسلوب کر دیا ہے جس کو اب "فرسودہ اور از کار رفتہ" "نئی تنقید" اور ساختیاتی تنقید کو "جدید ترین تنقید" سے موسوم کیا جانے لگا ہے۔ اس نے نئی تنقید کے "متن محض" کے بد نام زمانہ نظریہ کو مسترد کر کے "کثیر معنیاتی متن" پر بطور خاص دھیان دیا ہے جو مختلف تہذیبی پس منظر کے قاری کی "قرأت" کا مرہون منت ہوتا ہے۔ پھر قرأت کی معنی سازی (noematic structure) اور معنی آفرینی (noetic structure) کی سطحیں اور ساختیں عہد بہ عہد خاصی تبدیل بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یہ مسلسل نامیاتی اور حرکی عمل ہے۔ حسن پارہ میں معنی کا وجود میکانکی طور پر آہنی پوشش نہیں ہوتا۔ ہر عہد میں اس کے معنوی مرکز (center) اور دائرہ (Periphery) میں ہیر پھیر ہوتی رہتی ہے۔ جو معنی ایک عہد میں محوری کردار کا حامل معلوم ہوتا ہے وہ دائروی اہمیت کا نکلتا ہے اور جو ثانوی محسوس ہوتا ہے وہ مرکزی قدر و قیمت کا امین ہوتا ہے۔

ساخت شکن تنقید کی رو سے ہر فن پارہ میں معنی جوہری طور پر کارفرما ہوتا ہے، ناقد اس کو برآمد کرتا ہے۔ وہ مروجہ یا متعینہ یک سطحی معنی کو مسترد کرتا ہے جس کے گرد و غبار میں رفیع اور وقیع تر معنی کو جبر و استحصال کی قوتیں اقتدار کے کھیل میں دفن کر دیتی ہیں۔ اس ملبہ سے رفیع اور وقیع تر معنی کو تلاش کر کے ناقد تخلیق مکرر کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ ساخت شکن ناقد جب کسی متن کی رد تشکیل (Deconstruct) کرتے ہیں تو اس کو کلی طور پر منہدم نہیں کرتے بلکہ اس کے اندر کے تضادات کو سامنے لاکر اس کی بنت میں استعمال ہونے والے ان شیرازوں کی نشان دہی کرتے ہیں جو نظروں سے اوجھل تھے یا عمداً پوشیدہ مفاد کے تحت دبا دیئے گئے تھے یا پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ اس ساخت شکنی کے عمل سے زنگ آلود، مروجہ اور کہنہ مفہوم باطل ٹھہرتا ہے اور متن کا ایک نیا اور نسبتاً کشادہ باطنی مفہوم نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

ساخت شکن تنقید کا یہ بنیادی باغیانہ موقف ہے کہ متن کو پہلے توڑا جائے اور پھر ایک بلند تر تخلیقیت افروز اور معنی پرور سطح پر اس کو دوبارہ جوڑ دیا جائے۔ اب تو ساخت شکن تنقید کی امریکہ اور انگلینڈ میں بھی خاصی درآمد ہو رہی ہے۔ یوں تو فرانسیسی زبان میں اظہار کردہ اس کے مخصوص مجتہدانہ تصورات کو ادبی قرینہ سے ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دوسرے کئی مابعد ساختیات کے مستند، معتبر اور موقر عالموں — ہیلس ملر، پول دی مان اور ہارٹ مین وغیرہ نے اس کے الہام و تفہیم

کی مستحسن سعی کی ہے لیکن ان فاضلوں نے ژاک دیریدا کی تفسیر کرتے ہوئے اپنے ادارے قائم کر لیے ہیں۔ لہٰذا ان کی تنقیحات ساخت شکنی کے میلان کی تفہیم میں معاون تو ہو سکتی ہیں لیکن ان پر مکمل طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ساخت شکن تنقید کی بابت عالمی ادب میں ذہنی اعتبار سے دو مختلف گروہوں میں بٹا ہوا ہے ایک روشن خیال گروپ کے لوگ اس کو تنقید کے دائرہ کار میں ایک اہم انقلابی قدم تسلیم کرتے ہیں تو دوسرے دقیانوسی حلقہ کے لوگ اس کو بے معنی، دہشت پسند، عدم پرست (Nihilism) روشن خیالی کا دشمن اور یکسر خوفناک تصور کرتے ہیں۔ ان نظریاتی اختلافات کے باوجود بھی یورپ اور امریکا کے دانشوروں کے مراکز میں اس پر نہایت جذباتی شور و شر کے ساتھ جمود شکن بحث و مباحثے ہو رہے ہیں جو درحقیقت نئے عہد کے تخلیقیت پسند ادب کے نئے جمالیاتی اور اقداری نظام کے لئے اساسی سطح پر خام مواد فراہم کرتے ہیں۔ تاہم کسی بھی نئے تنقیدی تصور کو بغیر سمجھے ہوئے نہ تو قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی روایتی ترقی پسند یا روایتی جدیدیت پسند مکروہ عصبیت کے تحت اس کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ یہ نئے عالمی اور قومی ادبی سیاق کے اصولِ حقیقت کو مسلوب کرنے کے مترادف ہوگا۔

سب سے پہلے اس کی اساسی خوبیوں کی تفہیم ناگزیر ہے اس کے بعد ژاک دیریدا کے استعمال کردہ مخصوص کلیدی الفاظ اور مصطلحات کا تجزیہ متقاضی ہے۔ ان کلیدی الفاظ کی مفتاح سے اس کے مقفل دروازے وا کیے جا سکتے ہیں۔ ژاک دیریدا کی کتاب "اوف گرامے ٹولوجی" ساخت شکن تنقید کی بائبل ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اوف گرامے ٹولوجی کا ترجمہ "لاتقریری تحریریات" کیا ہے جو یکسر غلط ہے۔ کون سی تحریر لاتقریری کردار کی حامل ہوتی ہے۔ دماغ ہر وقت کوّے کی مانند کاؤں کاؤں کرتا رہتا ہے۔ وہ خیالات کی صوتیاتی لہروں کا منبع ہوتا ہے۔ خاموشی کی زبان (Language of silence) مراقبہ کی مرہون منت ہوتی ہے۔ وہ ماورائے دماغ کا تجزیہ ہوتا ہے۔ ساخت شکن تنقید بھی "دو ایوانی دماغ (Bicameral mind) سے آگے بڑھتی نہیں ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ "علم تحریر کی بابت" ہے۔ قیصر الاسلام نے اس کا ترجمہ "علم قواعد" کیا ہے۔ ایسا ان دونوں حضرات کو فرانسیسی زبان نہ جاننے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ دونوں تراجم متبادل لفظ کے طور پر بھی غلط ہیں۔ فرانسیسی زبان میں بھی "داگرامے ٹولوجی" میں ژاک دیریدا کا دھاردار فلسفیانہ دقیق اسلوب، نئے مصطلحات اور پیچیدہ تصورات اتنے گڈمڈ ہیں کہ ان کی تفہیم قدرے دشوار اور چیلنج انگیز ہے۔ ان کے بھرپور افہام و تفہیم کے لیے بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ ان کو سمجھنے سے قبل اس کے شارحین کی تنقیحات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ناکافی بھی ہیں اور کہیں کہیں غلط بھی:

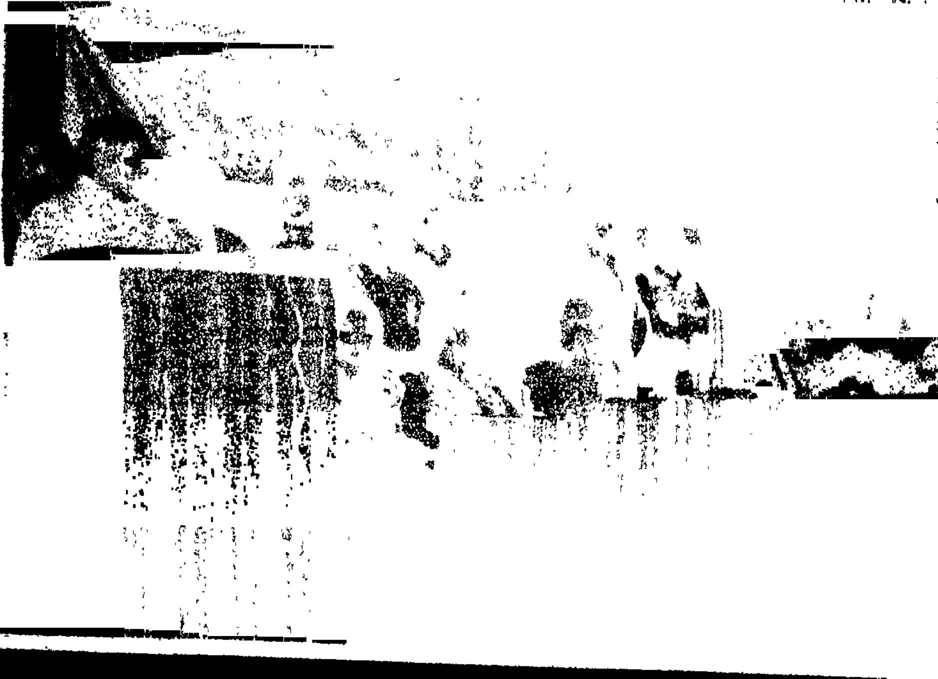
ایچ۔ ایم۔ ابرام کا خیال ہے:

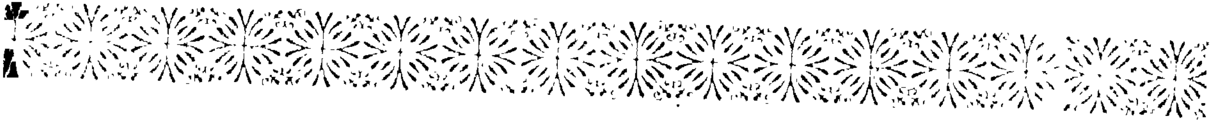
"اس کی کھوج بین زبان سے ہٹ کر متن پر مرکوز ہے اور وہ متن کو غیر معمولی طور سے محدود کر دیتا ہے"

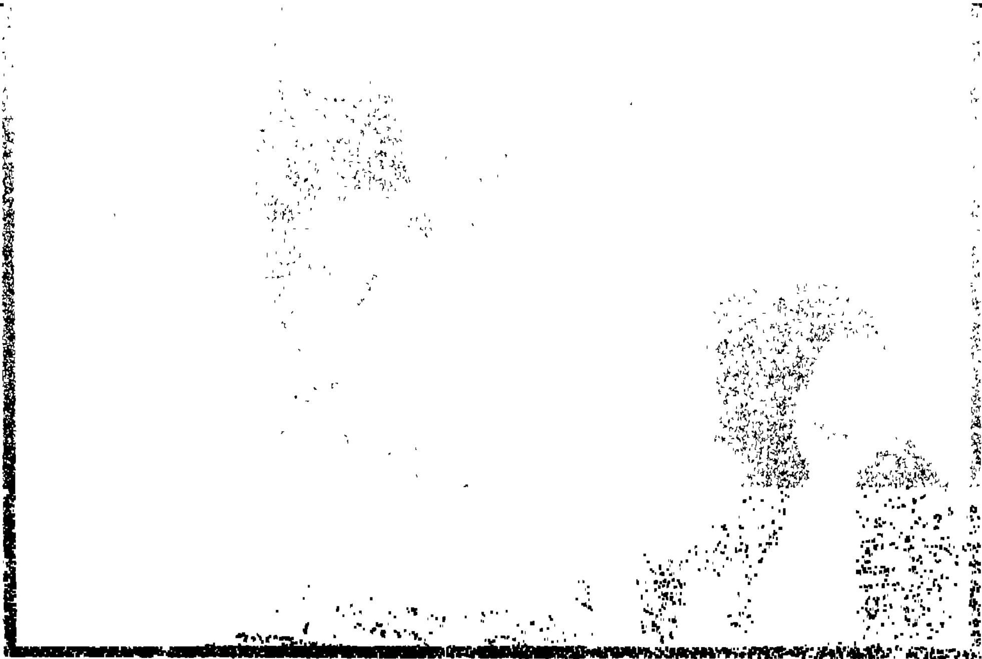
درحقیقت وہ ژاک دیریدا کے نظریات کو بہت جھاڑو پھیر انداز میں پیش کرتا ہے اور تعمیم زدگی سے ژاک دیریدا کو فرانسیسی ساختیات پسندوں کی صف میں بے محابا کھڑا کر دیتا ہے۔ اس کی بوطیقا کی اپنی الگ تفسیر پیش کر دیتا ہے۔ ابرام جو کہتا ہے۔ وہ تو ژاک دیریدا ہرگز نہیں ہے۔ نیوٹن گاروز اس کو "فلسفہ لسانیات" کا جید عالم تسلیم کرتا ہے۔ وہ منطق کے اوپر بدیعیات کو ترجیح دیتا ہے:

"DERRIDA FALLS SQUARRY WITHIN THE MOVEMENT WHICH REGARDS THE ROLE OF THE UTTERANCE OF ACTOAL DISCOORCE AS THE ESSENCE OF LANGUAGE AND MEANING AND REGARDS LOGIC AS DERIVATIVE FROM THE RHETORICAL CONSIDERATIONS"

یعنی دیریدا براہ راست اس تحریک کے زیر اثر آتا ہے جو حقیقی کلام کے حسنِ ادا کو زبان کا جوہر اور معنی تصور کرتا ہے۔ لہٰذا منطق کو بدیعیات













دورہ افطاری کی ایک تقریب میں [illegible] ریڈی اور وزیر [illegible]

[illegible]





ڈاکٹر
گیان چند
مقالہ
پیش
کرتے ہوئے



کاظم علی خاں
مقالہ
پیش
کرتے
ہوئے

[illegible] دیتا ہے۔

ہیلس ملر، جیوفری ہارٹ مین اور پال ڈی مان کا جوڑ ہے۔ وہ ساخت شکن (Deconstruction) تنقید کو بدیعی تنظیم مانتا ہے۔ مرے کریگر کے خیال میں ژاک دیریدا واقعتاً تنقیدی ساختیات پسند (critical structuralist) ہے۔ اس کا یہ بھی اصرار ہے کہ دیریدا، افلاطون کے اُس مشہور زمانہ قول کو نئے انداز سے پیش کرتا ہے کہ شاعر کاذب ہوتا ہے۔ اس نوعیت کی تفسیر پر دیریدا کی تفہیم میں حقیقت کے بجائے سراب کی زیادہ تخلیق کرتی ہیں۔

ژاک دیریدا کو ان لوگوں کی صف میں شمار کرنا سورج آسا حقیقت سے چشم پوشی ہے جو تقریر کی ادائیگی کو زبان کا جوہر اصل تصور کرتے ہیں اور منطق کو علم بدیع و بیان کی زائیدہ اور پروردہ سمجھتے ہیں۔ یہ اصرار بھی کہ وہ افلاطون کے محولہ بالا قول کو نئے اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ جزوی طور پر ہی صداقت کا حامل ہے۔ وہ شعر و ادب کو صداقت کا متلاشی ہونے کے ناتے اسی احترام کا اہل تصور کرتا ہے جو فلسفہ کا مقدر رہی ہے۔ البتہ وہ صحافت گزیدہ حقیقت گزیدگی کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ فلسفہ کے مقابلے پر ادب کی معنویت اور اہمیت پر شدید اصرار کرتا ہے۔

زبان کی روایتی آگہی سے دیریدا متفق نہیں ہے۔ مشہور فرانسیسی مفکر سوسیور کے اصولوں سے بھی اس کے باغیانہ نظریات ہم آہنگ نہیں ہیں جس کے فلسفۂ لسان کے لسانی نظریاتی ماڈل کے اساس پر ساختیات کی نظریہ سازی کی گئی ہے۔ خود سوسیور کا لسانی فلسفہ بہت حد تک روسی اور چیکوسلواکی ہئیت پسندی سے بھی آگے بڑھ کر انگریزی اور جرمن میں ہوئے فلسفۂ لسان کے ضمن میں اہم کام کا مرہون منت ہے جو برٹرینڈ رسل، وٹگنسٹائن، سی۔ ایس۔ پیئرس اور بنجمن وارف وغیرہ نے سرانجام دیا تھا۔ پھر بھی سوسیور کی انفرادی غیر معمولی اپج سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جدید لسانیات میں اس کی حیثیت ایک تاریخ سازکی ہے۔

زبان کی روایتی آگہی دو الفاظ پر منحصر ہے — تقریر اور تحریر! ان دونوں میں تقریر کی اہمیت زیادہ ہے۔ تقریر صوتی پیکر (Sound image) ہے۔ یہ ایک تصور کو انگیخت کرتا ہے۔ اس ردعمل میں صوتی پیکر لمحہ بھر میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔ سننے سننے تقریر تو نہیں رہتی لیکن اس کے ذریعہ پیش کردہ تصور اُبھر آتا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں اشاریہ کنندہ (signifier) صوتی پیکر ہے اور اشاریہ کناں (signified) تصور، خیال، جذبہ اور فکر ہے۔ لسانی تشکیل کی بنیادی اکائی اشاریہ (sign) ہے۔ اشاریہ میں یہ اشاریہ کنندہ اور اشاریہ کناں باہم دگر مخلوط رہتے ہیں۔ اظہار کے دوران یہ اشاریہ کنندہ اشاریہ کناں کا اشاریہ ہوتے ہوئے خود معدوم ہو جاتا ہے۔

مثلاً "نیلوفر" بولنے کے سلسلۂ عمل میں ہی اس نے ایک تصور کا علم ہوتا ہے اور گویائی خاموشی میں بدل جاتی ہے۔ "نیلوفر" طرزِ گویائی ہے کنول کا پھول تصور ہے۔ ان میں تصور کی اہمیت زیادہ ہے جو مخصوص طرزِ ادا کا محرک ہوتا ہے اور "نیلوفر" کو مختلف معنویاتی کردار بھی ادا کر سکتا ہے۔ اس کی استعاراتی، پیکراتی، اُسطوریاتی اور علامتی حیثیت پر دلالت کر سکتا ہے۔ اقبال کی مختصر نظمیں "لالۂ صحرا" اور "گل بخشیں" اس کی زندہ تابندہ اور پائندہ امثال ہیں جو حقیقی فن کار کے تخلیقی وجود، انسانی ضمیر، دیدۂ بینا اور تخلیقیت کی طرف بھی اشاریہ کناں ہیں۔

مزید تفہیم کے لئے عصری شعری تناظر سے رضی اختر شوق، وزیر آغا، صابر زاہد اور ظفر اقبال (پاکستان) کے صرف ایک ایک شعر خاطر نشین ہیں ؎

شہرِ جاں کیا اور چاہے ہے کرن بھر روشنی
اک دیا چاہت برابر، دل برابر روشنی

——— رضی اختر شوق

وہ پھول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے
بے وجہ کیوں ہوا کی طرح دربدر رہے

——— وزیر آغا

کئی پلکیں ہیں اور ہیں کئی، محفوظ ہیں ٹھنڈک جن کی ابھی
کہیں دور نہ جا مت خاک اُڑا ترے چاہنے والے اور بھی ہیں

——— صابر زاہد

یادوں میں الجھا ہوا خواب خواب چاند
اک پھول ہے کہ جس سے مہکتا ہے آسمان

——— ظفر اقبال

رضی اختر شوق کے یہاں "کرن بھر روشنی" "اک دیا چاہت برابر" "دل برابر روشنی" ۔ وزیر آغا کے یہاں "پھول" اور "خوشبو" ۔ صابر زاہد کے یہاں "پیڑ کٹی" ۔ ظفر اقبال کے یہاں "خواب خواب چاند" اور "آسمان" ۔ حقیقی روشنی، حقیقی پھول اور خوشبو، حقیقی پیڑ، حقیقی چاند اور آسمان نہیں ہے بلکہ یہ سب تصور، خیال، جذبہ اور فکر ہے ۔ محولہ بالا یہ تمام الفاظ اور مرکبات نشان، علم یا اشاریہ ہیں۔ یہ اعتباطی (Arbitrary) رشتہ کے حامل ہیں ۔ ان کا باہمی رشتہ بلا جواز ہے ۔ ان کے پیچھے کوئی منطق کار فرما نہیں ہے ادبی اور شعری تخلیقات نشانوں اور اشاریوں کی تشکیل ہوتی ہیں ۔ ان کا رشتہ حقیقی اشیاء سے نہیں ہوتا ہے ۔ یہاں مادی واقعہ و تجربہ پہلے تخیلی تجربہ اور واقعہ اور پھر آخر میں جمالیاتی اور فنی تجربہ اور واقعہ میں وجود پذیر ہوتا ہے ۔ لہٰذا مابعد ساختیاتی ناقدین شعر و ادب میں منشوری اور صحافتی حقیقت نگاری کے تصور کو مسترد کردیتے ہیں ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بالآخر ادبی نشان یا اشاریہ تواریخی تہذیبی، رسومیاتی اور مذہبی نشان ہو جاتے ہیں تو ان کو استعارہ، علامت، پیکر، آرکی ٹائپ (نخستمثال) ارسطو کے طور پر محض تکلم یا تلفظ (Parole) کے بہ نسبت بطور خاص مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور ان کی صحیح اور رفیع تر تفہیم کی جاسکتی ہے ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے مقالہ "پس ساختیات کا پیش رو رولاں بارتھ (رولاں بارت صحیح ہے بارتھ نہیں) میں لسانی تشکیل کی بنیادی اکائی نشان یا اشاریہ کو یکسر بھول گئے ہیں ۔ انھوں نے صرف (Signifier) اور (Signified) کا استعمال کیا ہے ۔ وہ (Sign) اور (Signifier) میں باریک فرق کو ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں ۔ اس لئے اصطلاحی مفہوم بھی کج مج ہے ۔ درحقیقت لسانی تشکیل میں نشانیات (تمثیلاً ۔ Sign) صوتیات (تمثیلاً Signifier) معنویات (تمثیلاً، Signified) مساوی معنویت اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں (مغربی جمالیات میں "رس" کا تصور مفقود ہے ۔ ورنہ لفظ و معنی تو تمام علوم حتیٰ کہ صحافت میں بھی ہوتے ہیں) پھر اس ضمن میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے ۔ شعر و ادب میں لہجہ، طرز ادا اور شعر کی صوتی فضا بڑی جذبات انگیز، کیفیت پرور اور معنی خیز ہوتی ہے ۔ مثلاً جنسی اشعار اور عشقیہ اشعار کے تجزیہ کرنے میں لہجہ، طرز ادا اور شعر کی صوتی فضا کا تجزیہ تنقید کا بڑا اہم و نازک مسئلہ ہوتا ہے ۔ غالب کے مندرجہ ذیل شعر کا لہجہ حقیقی معنوں میں عشقیہ شعر کا لہجہ نہیں ہے یہ بے حد تیز و طرار قسم کا شعر ہے ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

——— (غالب)

اس کے مقابلے میں اسی مضمون کو جب یوں ادا کیا جاتا ہے تو یہ شعر لفظ و معنی کے حسن کے علاوہ لہجہ، طرز ادا اور شعر کی صوتی فضا کی رو سے بھی عشقیہ شاعری کا لازوال غزلیہ حسن پارہ بن جاتا ہے جو بیک وقت معنی آفرینی اور کیفیت آفرینی کا سرچشمہ ہے ؎

مرا پیام صبا کہیو، میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

——— (آتش)

(Signifier) اشاریہ کنندہ عالم صوت ہے ۔ شعر و ادب میں عالم صوت، عالم صور اور عالم معنی کی ہر دور میں معنویت و اہمیت رہی ہے ویسے سنسکرت شعریات میں रसो वै सः (وہ رس روپ ہے) کی سب سے زیادہ اہمیت ہے ۔ یہی شعر و ادب کا جوہر اصل ہے ۔ سنسکرت جمالیات کے (رس کے علاوہ) دوسرے چھ مکاتب فکر انتہا پسندی کے مترادف ہیں ۔ ساختیات اور مابعد ساختیات کے بیشتر مباحث کو صدیوں قبل سنسکرت شعریات میں روئی کے مانند دھن دیا گیا ہے ۔ اب تو اس ضمن میں تخلیقیت پسند امتزاجی رویہ کی ضرورت ہے جو نئے سیاق کے نئے اصول حقیقت کے مطابق نئے توازن کی تلاش کے مترادف ہو ۔ ہر نوعیت کا پرانا توازن بھی فی زمانہ بدترین ادبی فرقہ واریت ہے ۔

مابعد ساختیاتی تنقید کی روشنی میں ہی کلی انضمامی رویہ سے بشیر بدر کی نئی تخلیقیت، فروز غزل کے دو شعر کی اطلاقی تنقید خاطر نشان ہو ۔ ان غزلیہ اشعار کی خارجی آرائشی ساخت (Surfacial Structure)

اس قدر اہم نہیں جس قدر اس کی داخلی کیفیت پیدا اس کی ساخت صداقت خیز اور حسن انگیز (Deep Helical, Structure) ہے ؎

چمک رہی ہے پروں میں اڑان کی خوشبو
بلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو
گلوں پہ لکھی ہوئی لا الہ الا اللہ!
پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

بشیر بدر

محولا بالا اشعار میں "خوشبو" نشان، اشارہ، علم (Sing & Trace) ہے جو اساسی تصور، خیال، جذبہ یا فکر ہے۔ ہر ملفوظی یا مکتوبی پیکر مخصوص فکری رویہ اور سانچہ کا امین ہوتا ہے۔ کوئی شعری اظہاریہ فن کار کے فنطاسیہ، فکریہ، جذبہ اور واردے سے ماورا نہیں ہوتا۔ وہ صرف حواس خمسہ ظاہرہ ہی نہیں حواس خمسہ باطنہ کا بھی امین ہوتا ہے۔ شعری ساخت کی بنیادی اکائی اشاریہ یا نشان ہے۔ اشاریہ میں اشاریہ کنندہ اور اشاریہ کناں ہم آہنگ رہتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار کی پوری غزلیہ تشکیل دائرہ کے مانند "خوشبو" کے چاروں طرف گھومتی ہے اور اکبری تحریر (Arch Writing) یا حقیقی مافیہہ کی تلاش کے لیے غیر معمولی حساس، تخیل شناس اور بیدار مغز قاری کو متحرک کرتی ہے جو درحقیقت ناموجود یا عمیق تر ساخت کی جستجو ہے جو کیفیات کا سرچشمہ ہے۔ اس بشیر بدری غزلیہ حسن پارہ میں زندگی بیج ہے۔ محبت پھول ہے، حسن کی تکمیل، دردمندی یا روحانیت خوشبو ہے جو شان رحمانی سے مملو ہے۔ مابعد ساختیات کے علمبردار مفکر ناقد ژاک دیریدا کے الفاظ میں یہ تلاش خاص سیاق میں انسانی احساس و ادراک کے عمیق تر وجود اور معنویاتی عظمت کی طرف گامزن کرتی ہے اور تہہ در تہہ استعاراتی اور علامتی بُعد کی معنوی اور کیفیتی اعتبار سے شکل کشا ہوتی ہے۔ "اڑان کی خوشبو"، "آسمان کی خوشبو"، "اذان کی خوشبو" کی نئی قافیہ اور ردیف جوڑی کی ترکیبی معنویت اور کیفیت بیکراں علامتی تہہ داری کی حامل ہے۔ ان کے علاوہ "چمک رہی ہے پروں میں"، "بلا رہی ہے بہت" اور "گلوں پہ لکھی ہوئی لا الہ الا اللہ" "پہاڑیوں سے اترتی" کا صوتی زیروبم ایک عجیب حسن پرور کیفیت آفریں اور معنویت انگیز طور پر یوں چشم بصیرت کو وا کرتا ہے کہ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک عظیم تر دائرہ نور میں آ گئے ہیں۔ ہم کچھ زیادہ دیکھ رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں۔ ایک فلیش میں پورا پیٹرن دکھائی دے جاتا ہے جو لاعلمی اور نافہمی کے سیاہ پردے کے پیچھے پوشیدہ رہتا ہے۔ درحقیقت اندر کا اور باہر کا آسمان ایک ہو جاتا ہے جو بیکراں خاموشی کا امین ہوتا ہے بقول ژاک دیریدا:۔

"THERE IS NOW-HERE SPACE WITH OUT INNER SPACE" (GRAMMATOLOGY)

محولہ بالا اشعار کے سادہ بیان "خلادار" ہیں ان میں چند ایسے خلا ہیں جو قاری کے شعور و وجدان کو "لذت خلا پری" عطا کرتے ہیں۔ انسانی ہستی اپنی اولین سطح پر پلو (Caterpillar) کے مانند ہوتی ہے وہ افقی سطح پر ساکن ہوتی ہے، دوسری سطح پر پیوپا (Larva) کے مانند متحرک ہوتی ہے لیکن وہ افقی سطح پر ہی متحرک ہوتی ہے شاذونادر وہ تیسری سطح پر تتلی بن جاتی ہے اور صعودی کردار کی حامل ہو جاتی ہے۔ اس میں بچوں کی سی گُندگی، معصومیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی مکمل قبولیت اور معراجی ہوشمندی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تقسیم، منکشفات اور آئینہ آسا وسیع اور رفیع تر شعور و آگہی یا حقیقی تخلیقی بصیرت ہے جو زمان و مکان کے رمز کو چیر کر انکی سرحد کا ارتفاع کر کے سب کچھ ایک ساتھ دیکھتی ہے۔ تخلیقی ویژن صرف مختلف حقائق کو ایک ساتھ دیکھنے کی وسیع تر آگہی ہے یہ تخلیقی بصیرت ہر نظام کی محدود اخلاقیات سے ماورا آدمی کو آدھی ادھوری نہیں بلکہ پوری سچائی سے جوڑتی ہے جو بیک نظر ساختیات (جسمانیات) معنویات (ذہنیات) اور روحانیات (کیفیات) کے جوہر اصل کی روح شناس ہوتی ہے تو گلوں (دلوں) پہ لکھی ہوئی بے لفظ (خاموش) تحریر (لا الہ) کو پڑھنے اور "پہاڑیوں" (شعور کی سات سطحوں جن کو تمثیلاً سات آسمان سے موسوم کیا جاتا ہے) سے "اترتی اذان کی خوشبو" کو سننے اور محسوس کرنے کی اہل ہوتی ہے ـــ زندگی کے حسن و عظمت سے مملو محولہ بالا اشعار جمال، کمال اور جلال کا منبع نور ہیں جو ہری بھری جھاڑی کی مانند ہیں ہے جبکہ یہ بیشتر نیشن گزیدہ غزلیہ تجربات میں یکسر معدوم ہوتا ہے

اس ہری بھری جماڑی کے جمالیاتی موناڈ (Monad) میں مستغرق ہونا ' آزادئ دید (Philosophy) سے جو حقیقی تخلیقی بصیرت اور رفیع تر جمالیاتی مسرت عطا کرتی ہے ۔ یہ "آزادئ دید" نئے عہد کی تخلیقیت کا نشان امتیاز ہے ۔ یہ صرف خیالی خولی "دید نظر" Philosophy سے ممکن نہیں ہے ۔ یہ تو تقلید محض ہے ۔ بغیر حقیقی وجودی تجربہ کے حسین وزریں لمس کے صدف فکر بے گوہر رہتا ہے ۔ "یعنی تخلیق کی رفیع تر اقداری اور جمالیاتی تہذیب اور محض تقلید کی کسری تہذیب میں ہمالیائی فرق ہوتا ہے ۔

ژاک دریدا کے خیال میں "لکھا ہوا لفظ" درحقیقت گویائی ، تکلم ، لفظ یا صوتی پیکر کا شناس نامہ ہوتا ہے ۔ یہ شناخت نامہ گویائی کی نمائندگی کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ غیر مرئی صوتی پیکر کی بصری تشکیل ہے ۔

تصویری تحریر پسندی (Graphocentrism) ژاک دریدا کی ایک اہم اصطلاح ہے ۔ یہ تصور تصویر کے مترادف ہے ۔ یہ درحقیقت بے تصویریت کو تصویریت عطا کرتا ہے ۔ یہ صوتی ابلاغ کو تصویری ابلاغ میں بدلتا ہے ۔ اس کے نظریہ سے روایتی نطق پسندی صوتی اظہاریت بہت کچھ مابعد الطبیعات مذہبیات اور اسراریات سے متعلق ہے صوتی ترسیل کی اہمیت کو تصویری تحریر پر منتقل کر کے وہ زبان کی بابت روایتی فکری رویہ کو یکسر الٹ دیتا ہے ۔ روایتی طرز فکر میں اگر تحریر جسم ہے تو تقریر روح ہے اور تصور غیر مادی حقیقت یا رفیع صداقت ہے اس کے برخلاف دریدا جسم پر زور دیتا ہے اور اس طرح مکمل طور پر مادیت کا خیر مقدم کرتا محسوس ہوتا ہے ۔

ژاک دریدا جدید فکری لسانیات کے باوا آدم فرڈیناں دا سوسیور (Ferdinand de Saussure) کے زبان سے متعلق تصور سے متفق نہیں ہے ۔ اس تاریخ ساز اختلاف ' انحراف اور اجتہاد سے مابعد ساختیاتی عہد کا آغاز ہوتا ہے جس کو کچھ لوگ مابعد جدید عہد سے بھی موسوم کرتے ہیں ۔ تاہم مابعد ساختیاتی تنقید کی تمام شاخوں کی صحیح تفہیم کے لیے ساختیات اور سوسیور کے لسانی نظریات کی تخلیقیت اور معنی خیزی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ ژاک دریدا کی ساخت شکن تنقید میں بھی بہت سے مشترک عناصر کارفرما ہیں بغیر اس کی آگہی کے ساخت شکن تنقید کے اجتہادی عناصر کو بھی نہیں جا سکتا جو نئے عہد کی تخلیقیت کے فیضان کا سرچشمہ ہے ۔ ساختیات خصوصی طور پر سوسیور کے لسانی نظام کی مرہون منت ہے ۔ اس کی اساس پر سوسیور تنقید کو سائنسی ضابطۂ علم (Discipline) کا روپ دینا چاہتا ہے وہ زبان کی تعریف کرتے ہوئے اس کے دو امتیازی عناصر کا تذکرہ کرتا ہے ۔ ایک Langue یعنی زبان اور دوسرے Parole یعنی گفتگو تقریر انفرادی تلفظ اور طرز ادا ۔ زبان ایک لسانی نظام ہے جس کے مطابق انفرادی گفتار (Parole) روپذیر ہوتی ہے ۔ ہر زبان کا مخصوص نظام ہے ۔ اس کے آداب ، آئین ، اس کی روایت اور اس زبان کے بولنے والوں کے باہمی اتفاق رائے کا ایک مشترک کردار رہتا ہے ۔ لسانی زاویۂ نگاہ سے بلوم فیلڈ کے خیال میں دنیا کی کوئی دو زبانیں ایسی نہیں ہیں جو کسی سماجی سچائی کی یکساں ترجمانی کرتی ہوں ۔ درحقیقت مختلف سماج مختلف دنیاؤں میں رہتے ہیں ۔

ہر معاشرہ کی مخصوص لسانی عادتیں مختلف ڈھنگ سے سوچنے کا مخصوص رویہ پیدا کرتی ہیں ۔ ہر شخص اپنی تہذیب و ثقافت کے انداز سے حقیقت کی آگاہی حاصل کرتا ہے ۔ چنانچہ حقیقت کو مختلف تہذیب و ثقافت کے افراد مختلف انداز میں محسوس کرتے ہیں ۔ تہذیب و ثقافت بھی زبان کے ذریعہ حقیقت تک رسائی حاصل کرتی ہے ۔ اس کے برخلاف نوم چومسکی (Chomsky) نے زبانوں کی رنگا رنگی کے احساس و عرفان کے باوجود مختلف زبانوں کے ان عالمگیر اقدار و اوصاف کی بھی نشاندہی کی ہے جو تمام زبانوں میں کارفرما ہوتے ہیں ۔ ماورائے ثقافت (Metaculture) اور ماورائے شعریات کے مانند ماورائے زبان و لسانیات بھی ہوتی ہے ۔ درحقیقت پارول (Parole) انفرادی گفتگو ہے جو زبان کے ہی مخصوص قوانین سے وجود میں آتی ہے ۔ یہ زبان کا روزمرہ کی زندگی میں بروئے کار لایا جانے والا اظہاریہ ہے ۔ یہ گفتگو زبان سے وابستہ ہونے کے باوصف اپنا ایک الگ تخلیقی وجود بھی رکھتی ہے ۔

زبان اور گفتگو کے فرق کو سب سے پہلے سوسیور نے شطرنج کے کھیل کی مثال دے کر سمجھایا ہے ۔ شطرنج کے کھیل کے کچھ غیر مرئی آداب و آئین ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں کا مرئی ٹھوس پن

حقیقی کھیل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب ہاتھی گھوڑا اور پیادہ وغیرہ باہمی رشتوں میں منسلک ہوتے ہیں اور حقیقی کھیل کی بصری تشکیل ہوتی ہے۔ شطرنج کے غیر مرئی قوانین کے اندر زبان کے بھی اپنے آداب و آئین ہیں۔ حقیقی کھیل گفتگو ہے جو جزواً وجود پذیر ہوتی ہے۔ شطرنج کا حقیقی کھیل جیسے شطرنج کے اصولوں سے منظم رہتا ہے بعینہٖ گفتگو زبان سے مربوط رہتی ہے۔ نوم چومسکی زبان کو صلاحیت (competence) اور گفتگو کو انفرادی کارکردگی (Individual Performance) کہتا ہے۔ زبان ایک نوعیت سے لفظیات کا ذخیرہ گاہ ہے۔ گفتگو اس ذخیرہ گاہ سے اپنے مطلب کے الفاظ کو منتخب کر کے ان کو حسب ضرورت اور حسب قاعدہ جملوں میں منسلک کر دیتی ہے۔ زبان اجتماعی پہلو اور گفتگو یا تقریر انفرادی تخلیقی کردار کی حامل ہوتی ہے۔

جدید لسانیات اور ساختیات نے تحریر کو ثانوی مانتے ہوئے اصرار کیا ہے کہ وہ تقریر کی نمائندگی کرتی ہے۔ مابعد ساختیات اور ساخت شکن تنقید کے نظریہ ساز مفکر اور ناقد ژاک دریدا [نئی اصطلاحیں میں دریدا کی بابت شمس الرحمان فاروقی رقمطراز ہیں: "دریدا نے کوئی تنقید نہیں لکھی، نہ اس نے کوئی تنقیدی نظریہ پیش کیا۔" (ص ۱۱ مطبوعہ کتاب نما دلی) — آگے ص ۱۲ پر وہ تضاد بیانی کا شکار ہو جاتے ہیں — "لاتشکیل (صحیح استرداد تشکیل یا رد تشکیل ہے) البتہ ایک نظریہ ہے اور اس کی سیاسی جہت بھی مقرر ہو سکتی ہے"] کے ساختیات شکن نظریہ کی رو سے یہ تحریر کا ناقص تصور ہے۔ وہ اس کو غیر معتبر تسلیم کر کے یکسر مسترد کر دیتا ہے۔ محولہ بالا تصور کے مطابق ہم شاعری میں مروجہ اور متعینہ معنی کو ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ وہ معنی یا تصور دوسرے معنی اور تصور سے منسلک ہوتا ہے۔ اس طرح ہم معنی کی تکمیلیت تک پہونچتے ہیں۔ تکمیلیت کا تصور گول مول ہے۔ یہ قدرے مشروط روحانی لفظ ہے جو کلام خدا (کرسچین۔ Logos) سے منسلک ہو جاتا ہے [یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ہند یورپی اور آلٹک (Altic) سے قدیم تر زبانوں کا ماخذ ایک اور پرانی زبان "نوسٹریٹک" (Nostratic) کو محققین تسلیم کر رہے ہیں جو دو لاکھ سال قبل افریقہ کی ایک چھوٹی سی انسانی آبادی میں بولی جاتی تھی۔ یہی زبان تمام نسلِ انسانی کی مادری زبان ہے۔ عربی اور عبرانی (قرآن اور بائبل کی زبان) سامی زبانوں میں سے ہیں۔ یہ تو آلٹک (Altic) کی بنات اللسان (Daughter Languages) ہیں] ژاک دریدا زبان کی آگہی اور نامیاتی کردار کو مشروط اور آہن پوش معنویاتی تکمیلیت کے اسرار سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے اس کو نئی تنقیدی اصطلاحات کا اختراع کرنا پڑا جو زبان کی بابت پرانے عقائد اور ادبی تنقید سے متعلق پرانے تصورات کو بیک وقت منہدم کرا دیتی ہیں۔ تاہم آدمی کا دماغ فرسودہ عقائد اور تصورات سے آزاد نہیں ہوتا۔ لہٰذا نئے ماہرین لسانیات بھی پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ سوسیور کا لسانی فلسفہ جو عالمی لسانیات میں انقلابی کردار کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ ژاک دریدا کے خیال میں وہ نئی بوتل میں پرانی شراب کے مصداق ہے۔ دریدا اس روایتی لسانی نظریہ سے خود کو الگ کر کے اپنی مجتہدانہ شناخت بناتا ہے۔ اور بے محابا تقریر کی اہمیت کا تاج تحریر کو پہنا دیتا ہے۔

Litena Scripta manet (there is only writing immortal)

"صرف تحریر کو بقائے دوام حاصل ہے" باقی سب پانی پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نہایت پُر مغز اور تخلیقیت افروز مقالہ "ساختیاتی تنقید" بڑا معنویت انگیز ہے جو ان کے بین العلومی اور روحانی دید و یافت سے مملو ہے۔ متکلم لفظ آواز کے تابع ہے اور اسی لیے ایک عمودی رُخ رکھتا ہے۔ تحریری لفظ اس عمودی رُخ کے علاوہ افقی رُخ کا بھی حامل ہے یعنی جگہ بھی گھیرتا ہے لہٰذا وہ زمان و مکان کے انضمام کا مظہر ٹھہرا۔ نئی انجیل نے متکلم لفظ کی اہمیت کو اجاگر کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ:

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا
اور کلام خدا تھا۔"

(نیا عہد نامہ یوحنا کی انجیل)

دوسری طرف قرآن حکیم نے "تحریری لفظ" کی اہمیت کا یوں احساس دلایا:——

پڑھئے! اپنے رب کے نام سے جس نے تخلیق
کیا (کائنات کو) انسان کو تخلیق کیا جمے ہوئے
خون سے، پڑھئے کہ آپ کا رب کریم ہے جس نے
قلم کے ذریعہ علم عطا کیا:

(قرآن حکیم)

اس میں اہم ترین بات یہ ہے کہ پڑھنے کے عمل کو نئی علم کی ترسیل کے عمل کو بذریعہ قلم آگے بڑھانے کا ذکر ہے۔ "لفظ" سے قلم تک کا یہ فاصلہ ایک انقلابی نوعیت کا حامل تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ تحریر کی ایک فعال کائنات ہے یا شاید یہ کائنات بجائے خود ایک "تحریر" ہے۔ یہ ایک طرح کا Signsystem ہے جس کی حیثیت اس شیشے کی سی نہیں جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے نہ اس کھڑکی جیسی ہے جس میں باہر کی دنیا کو دیکھا جا سکے بلکہ وہ ہر وقت اپنی تخلیقیت اور معنی آفرینی کا مظاہرہ کرتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں طبیعات، تصوف اور نشان فہمی حقیقت کے ادراک میں ایک ہی زاویۂ نگاہ کو بروئے کار لاتے دکھائی دیتے ہیں۔

(اساختیاتی تنقید۔ وزیر آغا)

Life Script is a creative revolu-tion. It ever enfolds in new (seman-tic) elements.

(تحریر شدہ زندگی ایک تخلیقی انقلاب ہے جو ہمیشہ نئے معنویاتی اور کیفیاتی عناصر میں منکشف ہوتی رہتی ہے۔)

(علم تحریر کی بابت: ژاک دریدا)

ژاک دریدا کے مجتہدانہ نظریۂ تحریر، فلسفۂ معنی اور تخلیقیت افروز بعد کی صحیح تفہیم و تفسیر کے لیے اس کے تین بنیادی مصطلحات کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ وہ ہیں خفیف نشان (Trace)، اختلاف Difference اور اکبری تحریر (Arch writing)
میرے خیال سے پہلے دونوں لفظوں کا تعلق خود ادب پارہ سے ہے اور تیسرے کا حقیقی مافیہ کی تلاش سے ہے۔

اختلاف کا تعلق دو عوامل سے ہے۔ اختلاف و امتیاز (Difference) اور تاخیر (التوا Deferment) سے۔ اختلاف کا مطلب ہے، جو ہے وہ دوسرا نہیں ہے۔ تاخیر کا عندیہ یہ ہے کہ ایسا کچھ ہے جو مکمل طور پر متن میں نہیں ہے یا ملتوی (Suspending) ہے اول الذکر مکان (Space) میں قائم ہے تو دوسرا زمان میں۔ پہلے کو اسپیس میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن دوسرے (یعنی ملتوی معنی Suspensory Meaning) کے لیے تو زمانہ اور وقت درکار ہے۔ درحقیقت ظاہری معنی کے برخلاف علامتی پیکری استعاراتی اور اسطوری معنی التوائی اور تاخیری معنی ہوتا ہے۔ یہ باطنی معنی قدرے تاخیر میں صادر ہوتا ہے۔ اس میں التوا Differance ہوتا رہتا ہے۔ بقول دریدا: "It is Tending to Suspense or Suspension"

مثال کے لیے "گوہر" اور "گہر" الفاظ کو لیں۔ محولا بالا انگریزی کے Difference اور Differance کو لیں۔ دونوں کی تقریر اور تحریر میں اختلاف ہے۔ مزید وضاحت کے لئے "نور" اور "نار" کو لیں۔ جو ایک ہے وہ دوسرا نہیں ہے، جو دوسرا ہے وہ پہلا نہیں ہے خفیف نشان (Trance) کی دوسری قوت اس کے معنی کے التوا میں ہے کسی غزلیہ حسن پارہ یا نظمیہ صداقت پارہ میں موجود "نور" کے معنی کی تلاش اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم بخوبی سمجھ لیتے ہیں کہ یہ وہ خارجی روشنی نہیں ہے جس کو ہم حقیقت میں کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس غزلیہ نثر پارہ میں یہ کچھ دوسرا ہی ہے۔ اس ہوتے (Other) کی تلاش مدام تلاش ہی تنقید عالیہ کا وظیفہ ہے۔ مثلاً داغ دہلوی کے اس غیر معمولی شعر کو خاطر نشیں کریں ؎

قمر کو پردۂ شب تو بصر کو پردۂ چشم
کوئی لباس ترے نور کو سیاہ ملے

ذرا "قمر" اور "بصر" لباس اور پردہ اور نور اور سیاہ کی معنویتوں لطافتوں اور زبان و بیان کی اداؤں کی بلاغتوں پر غور فرمائیں اور ان کے باہم دگر" رشتہ کی قدر" کو ملحوظ رکھتے ہوئے تلاش کریں کہ آخر ان نشانوں اور اشاروں کے عقب میں قصہ کیا ہے؟ ایک اعلیٰ پایہ کے حسن پارہ میں ایک ان دیکھی سمت ہوتی ہے اور اعلیٰ پایہ کے ناقد کا منصب اس غیر مرئی جہت کی تلاش میں سفر مدام سفر ہے۔ معلوم سے نامعلوم،

مشہود سے نامشہود اور محدود سے لامحدود تک ذہنی جہانیاں جہاں گشتی ہے جو شرطیت شکن (Deconditioning) اور ساخت شکن Deconstruction ہے اور عدم شرطیت کا دوال ہے۔ لہٰذا نشان کا نصف حصہ وہ ہے جو وہ نہیں ہے اور نصف وہ ہے جو وہاں موجود نہیں ہے۔ سوسیور کے اشارہ (Sign) کا مساوات اشارہ کنندہ + اشارہ کناں ہے اور ژاک دیریدا کے نشان کا مساوات ہے۔ اختلاف و امتیاز + تاخیر و التوا۔

خفیف نشان (Trace) بذات خود ناکافی اور نامکمل ہوتا ہے۔ اس کی ناتمامی اور نامکتفی کے اظہار کے لیے ژاک دیریدا علم میں گم شدگی کی کیفیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس میں کچھ گم بھی رہتا ہے۔ اس گم شدگی اور ناتمامی کو بخوبی واضح کرنے کے لیے وہ لفظ کو لکھ کر کاٹ دیتا ہے جیسے نور" لفظ کو لیں۔ ساخت شکن (Deconstruction) تنقید کے زاویۂ نگاہ سے اس کا اظہار یوں کیا جائے گا۔ نور (x) درحقیقت شعر و ادب میں استعمال کرتے وقت لفظ کو کاٹا نہیں جاتا۔ اپنے مجتہدانہ نظریہ کی تفہیم کے لیے وہ لفظ کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ کٹاؤ تحریر میں دکھائی نہیں دیتا وہ غیر مرئی رہتا ہے۔ کٹاؤ علامتی ہے اس سے لفظ کی ناتمامی نامکتفی اور لاپتہ شدگی کی نشان دہی ہوتی ہے کوئی خفیف نشان کسی ابدی شے کا نہ اشاریہ کنندہ ہوتا ہے اور نہ کسی قدر کا خبر رساں۔ نشان کی معنویت سیاق و سباق میں ہوتی ہے۔ "رشتوں کی قدر" (Relational Value) میں ہوتی ہے۔ انسلاکاتی رویہ اور برتاؤ میں ہوتی ہے۔ رشتوں کے نظام میں ہوتی ہے۔ تمام نشانات ہم کو اپنی تلاش کے لیے وجدانی اور شعوری سطح پر بیدار اور متحرک کرتے ہیں۔

اس ضمن میں بے اختیار سوال انگیخت ہوتا ہے کہ جو رشتوں کی گرہ میں منکوح نشان میں نہیں ہے اس کی تلاش کیسے ہو؟ علم میں بھی کچھ آثار نشانیاں اور نقوش چھوٹے رہتے ہیں جن کی اساس پر ناقد تلاش کی سمت میں بے محابا مائل ہوتا ہے۔ ان خفیف نشانوں کو دیریدا (Trace) کہتا ہے۔ اس ضمن میں اسٹینلے فش (Stanley Fish) کا یہ نکتہ بھی متن کی تفہیم یعنی علم شرح (Hermeneutics) کے شعبہ میں انقلاب انگیز اور روشنی بخش ہے۔

"معنی شے (یا مواد) میں مضمر نہیں ہے بلکہ قرأت کے تجربہ میں موجود ہے"۔

ژاک دیریدا وسیع ترمعنوں میں موسیقی، رقص، صنم تراشی وغیرہ فنون کو بھی تحریر میں سمیٹ لیتا ہے۔

اب آئیے دیکھیں کہ ژاک دیریدا کی خاص اصطلاح اکبری تحریر (Arch Writing) کیا ہے؟ یہ تصویری تحریر یا بصری ترسیل (Visual Communication) کے مانند بھی ہوتی ہے اور غیر تصویری تحریر یا سماعی ترسیل (Audal communication) کے روپ میں بھی جیسے موسیقی۔ پرانے عقائد کی رو سے تصویری تحریر یا سائن اشاریہ کنندہ ہوتا ہے۔ ژاک دیریدا کے زاویۂ نگاہ سے وہ اشاریہ کنندہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے خفیف نشانات (Traces) سے منسلک ہوتا ہے جن سے ناموجود کی تلاش کی جاتی ہے۔ ان خفیف نشانات سے تصویری تحریر مروجہ اور متعینہ معنی کے برخلاف وسیع اور وقیع تر معنی و مفہوم سے مملو ہو جاتی ہے۔ یہی ذہن قاری یا ناقد کی حسب توفیق تخلیقی آگہی اور تخلیقی حسیت کو بیدار کرتی ہے اور بیک وقت اس کے دورہ کو بانی سے اور بانی کو دورہ سے الگ کر دینے والے حسب توفیق قوت تمیز کو بھی متحرک کرتی ہے۔ اس بیک وقت تنقیدی اور تخلیقی تحرک کی جہت کیا ہے؟ وہ ہم کو کس گھاٹ لگاتی ہے۔ اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے مثلاً مشہور عالم مجسمہ مونالیزا کو ہی لیں۔ خارجی سطح پر وہ جو ہے 'وہ' داخلی سطح پر 'وہ' نہیں ہے۔ اس میں کچھ ناموجود ہے جس کو مزید تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن اس میں کچھ غیر مرئی خفیف نشانات یا ٹریسز موجود ہیں۔ جن کی اساس پر وہ جو نہیں ہے اس کی مزید تلاش کی جاتی ہے۔ شعری حسن پارہ یا نثری صداقت پارہ میں ایک ان دیکھی سمت ہوتی ہے جو اکثر لامتناہیت کی حامل ہوتی ہے جیسا کہ میں نے اوپر کہیں پہلے ہی عرض کیا ہے قاری یا ناقد کا اولین فریضہ اس غیر مرئی جہت کی جستجو ہے جو کسی بھی نوعیت کے متعین اور میکانکی معنی کے برخلاف نئے تخلیق شدہ معنی یا معانی کا استخراج کرتی ہے۔ یہ موجود نشانات سے (ناموجود) وسیع اور رفیع تر حقیقت مافیہ، معنی اور مفہوم کی تلاش مدام تلاش ہے جو تخلیقیت افروز ہوتی ہے۔

زبان کے بارے میں اس کا مخصوص نظریہ معلوم ہونے پر ادبی تنقید سے متعلق بہت سارے سوالات کے جوابوں کا سراغ مل جاتا ہے۔ تخلیقی تنقید کیا ہے؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ تنقید تحریر کی وہ مخصوص شکل ہے جو شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور ناول وغیرہ کی ساخت (اسٹرکچر) میں بکھرے ہوئے نشانات کی تلاش کرتی ہے اور اس کے وسیلے سے اس صنف ادب میں ناموجود کیفیات، افکار اور تصورات کا انکشاف کرتی ہے۔ یہ نشانات آسیب کے مانند غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے کچھ نہ کچھ خفیف نشانات بالائی سطح پر بھی ہوتے ہیں۔

تخلیقیت شناس اور تخلیقیت فہم تنقید کی شروعات، ان ہی خفیف نشانوں کی تلاش سے ہوتی ہے۔ تخلیقیت کش ناقد کی کارکردگی شک سے شروع ہوتی ہے۔ وہ شاعری، کہانی، ناول اور ڈرامہ کو پڑھتا ہے اور بڑی ژرف نگاہی سے اس کو بار بار مزید دیکھتا ہے۔ اس کو حتمی یقین ہے کہ جو خارجی ساخت پر دکھائی پڑتا ہے وہ کچھ مختلف ہے۔ ہم جو پڑھتے ہیں یا دیکھتے ہیں، ان میں کچھ اہم اور معنی خیز چیزیں ناموجود ہیں۔ تخلیقیت افروز تنقید انھیں کی تلاش و جستجو ہے۔ ناموجود تحریر ہی اکبری تحریر (Arch Writing) ہے۔ ادب اکبری تحریر کا تخلیقی اظہار ہے۔ یہ اکبری تحریر ادب کی خارجی ساخت میں مخفی کچھ خفیف نشانات میں کارفرما ہوتی ہے۔ یہ نشانات پیر کے نشانوں کے مانند پڑے رہتے ہیں۔ یہ کون ہے جو ان بہت سارے خفی یا جلی نشانات کو چھوڑ گیا ہے؟ وہ ناموجود ہے۔ یہ خفیف نشانات اس کی یاد کو تازہ اور ہم جو تخیل کو بیدار کرتے ہیں۔

روایتی غیر تخلیقیت آفریں تنقید پر الزام عائد کرتے ہوئے ژاک دریدا کہتا ہے کہ اس میں شاعری کا نہایت مشروط، میکانکی اور منطقی مفہوم ڈھونڈا جاتا ہے۔ معنی ایک تصور ہے جو دوسرے تصورات سے وابستہ ہے۔ یہ تصورات ایک مشروطیت گزیدہ مابعد الطبیعاتی یا مافوق الفطری وجود میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ مشروط تنظیم گزیدہ روحانیت اس کی پناہ گاہ ہے۔ ساختیت بھی اس سے آزاد نہیں ہے۔ ساختیات ایک نظام ہے اور اس کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ نظام ہونے کے سبب ہر شے اس میں ڈھال لی جاتی ہے یا کھول جاتی ہے یا منطقی طور پر سمجھانے کے قابل ہوتی ہے۔ جس کو وہ "کلی لسانیاتی اور معنویاتی نظام" تصور کرتی ہے جو ماقبل ثقافتی اور تواریخی نظام کا حصہ ہوتی ہے۔ یہی تمام معانی اور مفاہیم کا منبع ہے۔ انسانی ذہن معنی و مفہوم کے احساس و عرفان کا وسیلہ محض ہے۔ وہ معنی از خود تخلیق نہیں کرتا۔ ساختیات ایسے تمام ادبی نظریات کو مسترد کرتی ہے جو انسانی ذہن کو معانی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ساختیات شکن تنقید (رد تشکیل) تو وجود، صداقت اور نظام کو بھی (گوتم بدھ کے مانند) ایک جعل مانتی ہے (یہ صحیح اور رفیع ترین صداقت ہے۔ اگر وجودی تجربہ نہ ہو تو یہ سب مشروطیت گزیدہ بے معنی اور بے حقیقت رسومیات پرستی اور اوہام پرستی ہے) وہ قطعی طور پر غیر مشروطیت (Decondition:ng) کی قائل ہے۔ اس کے نزدیک لاشیئت ہی سوری ہے جو حقیقی تخلیقیت اور معنویت کا منبع نور ہے۔ انسانی آگہی و بصیرت انسانی ذہن سے ہمیشہ آگے دیکھتی ہے۔

ساختیات افگن تنقید (استرداد تشکیل) تنقید کا کوئی ماڈل نہیں پیش کرتی۔ وہ ہر نوعیت کے ماڈل کی مخالف ہے۔ ماڈل خواہ عمرانی ہو، تواریخی ہو یا لسانی، اسلوبیاتی اور ساختیاتی ہو، لہٰذا اس کو ساخت شکن تنقید، ساخت افگن تنقید، رد تشکیل یا غیر مشروط اور غیر نظامی تنقید سے موسوم کیا جا سکتا ہے لیکن انہدامی تنقید، لاتشکیل اور لانظامی تنقید مہمل ہے۔ رد تشکیل کے لیے ہونا (Be:ng) ناگزیر ہے۔

ساختیات پسندوں کے برخلاف اس کا کسی نظام میں بھی ایقان نہیں ہے۔ ساخت (اسٹرکچر) میں منطقی طور پر ایک نظام دینے کی کوشش پوشیدہ ہوتی ہے۔ بظاہر بد نظمی کی بہ نسبت نظم بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ساخت شکن تنقید (رد تشکیل) اس کو دھوکا، جعل اور پوشیدہ مفاد کا حامل قرار دیتی ہے۔ لیکن بظاہر نظام کا بھرم بھی عدم نظام سے بہتر محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ سفاک حقیقت ہے کہ انسانی دماغ، انسانی فطانت، انسانی زندگی کا اکبری نظام اور ادب کا اصغری نظام وغیرہ گمبھیر روپ سے پیچیدہ، متنوع اور ہمہ جہت ہے۔ لیکن ساختیات پسندوں کے پاس ایک میکانکی حد تک اس پیچیدگی اور کثیر جہتی کو سلجھانے کی کلید ہے۔ یکسر تراشیدہ کمپیوٹری اور دوئی نظام ہے۔ لیکن ساختیات افگن تنقید میں تو نظام کو یکسر مسترد کر دیا گیا ہے۔

ژاک دریدا کا خیال ہے کہ انسانی شعور و آگہی، تخلیقی بصیرت انفرادی تخلیقیت اور نشان کا تعلق اتنا وسیع، پیچیدہ اور عمیق تر ہے کہ ان کو آسانی سے کسی مشروط نظام کی اساس پر نہیں سلجھایا جا سکتا۔ لہٰذا زبان

کے مسئلہ پر بھی از سرِ نو، غیر روایتی انداز سے اب غور و فکر ناگزیر ہے۔ آہنی پوشش لسانیات اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ اگرچہ وہ خود بھی عالمی شہرت کا حامل منتہی مگر مجتہد ماہر لسانیات اور معنویات (Seman-tics) بھی ہے۔ وہ نئی راہوں کا جویا ہے۔ بالآخر وہ ہر نوعیت کی ساخت شکنی کے بعد انکشاف کرتا ہے کہ تخلیقیت افروز تنقید کا عمل اس کھوئی ہوئی چیز کی تلاش ہے جو مرئی نشانوں میں تو نہیں ہے۔ لیکن اس کے کچھ خفیف آثار موجود ہیں۔ اس کھوئی ہوئی شے کو وہ اکبری تحریر کہتا ہے۔ تخلیقیت کشا ادب کی جوہری توانائی نہ زبان میں ہے اور نہ زبان کے نظام میں ہے بلکہ وہ آفاقی تخلیقی قوت اس شے میں ہے جو غیر مرئی اور ناموجود ہے۔

درحقیقت ژین کے مانند ژاک دیریدا کی ساخت شکن تنقید بذاتِ خود مختلف پوشیدہ مفاد کے حامل نظام پرستوں کے لیے کافی دہشت خیز ہے۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ اس کی ادارہ اور تنظیم شکن منفرد تخلیقیت افروز فکر یکسر نئے اور انوکھے کردار کی حامل ہے لیکن اس کے اکثر مصطلحات غیر واضح اور ژولیدہ ہیں۔ لیکن ان کی اساس پر وہ جس نتیجہ پر پہونچتا ہے وہ کتنا مستند، معتبر اور جدید تر ہے۔ مستزاد یہ آہنی پوشش نظاموں کو منسوخ کرکے وہ بورژوا روشن خیالی اور وسعت قلبی کا اس معنی میں ساتھ دیتا ہے کہ وہ آزادی اور وسیع المشربی کا موئد ہے لیکن بورژوا لبرلزم اور ژاک دیریدا کے لبرلزم اور آزادی کی آرزو مندی میں فرق ہے۔ بورژوا لبرلزم محض نظریاتی سطح پر انسانی ہے۔ ژاک دیریدا کا لبرلزم انتہائی باغیانہ سطح پر غیر انسانی اور غیر اقداری کردار کا حامل روایت پسندوں کو معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر نو انسانی حقیقی وجودیت، معنویت اور تخلیقیت کا حامل ہے۔

ژاک دیریدا بالخصوص گندم نما جو فروش نظاموں کا دشمن ہے۔ لیکن ادب کی آگہی اور معرفت کے لیے اس نے "تحریر اور نشان" کا جو تذکرہ اور تجزیہ کیا ہے وہ بہت اہم، معنویت خیز اور تخلیقیت پرور ہے لیکن ملفوظی اور مکتوبی پیکر یا متن اور آیت کا غائر مطالعہ کوئی ایسی خاص بات نہیں جو ژاک دیریدا کی اختراع ہے۔ متن یا آیت کے مطالعہ پر "نئی تنقید" کے حامیوں اور ساختیات پسندوں نے یکساں طور پر زور دیا ہے لفظوں کا سیاقی اور حوالہ جاتی ہونا اور بھی پرانا ہے۔ فلسفۂ معنی اور فلسفۂ تخلیقیت کے بیشتر زاویے ضرور خلاقانہ اور طبع زادانہ کردار کے حامل ہیں۔ تاہم تحریر پر زور دینے سے بھی اپنی جگہ تقریر کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ بصری ترسیل کے ساتھ صوتیاتی ترسیل کی بھی معنویت ہے۔ Astral Physics کی کوانٹم (Quantum) تھیوری بھی فی زمانہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ شاعری کا اسرار بھی بہت حد تک "فن خواندگی" اور "فنِ قرأت" پر منحصر کرتا ہے۔ عرب اور عجم کی تو بات چھوڑ دیجیے، انیس اور دبیر اس کے خصوصی طور سے موئد تھے۔ تقریر کو الگ کر دینے یا کم اہم مان لینے سے مشاہیر کی شاعری کے مفاہیم اور کوائف ابھر کر سامنے نہیں آئیں گے۔ جو شعر خوانی میں خصوصاً رفتار (Speed)، حرکت (Movement) عمل (Action) ارادہ، نمائش (Force of Expression) استعداد (Energy) اسلوبی انداز (Gesture) طرز نشست و برخاست (Posture) سے آشکارہ ہوتے ہیں ـــــ نشان، قدموں کے نشان یا ٹریس کچھ ہیں جس سے ناموجود تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دیریدا اصرار کرتا ہے کہ شاعری میں زبان کا نہیں ـــــ بلکہ نشان، ٹریس یا ناموجود کی معنویت اور اہمیت ہے۔ بے محابا دریافت کیا جا سکتا ہے کہ خود میں شعری نشان یا ٹریس کیا ہیں؟ تو کچھ جواب نہیں ملتا۔ آخر ریت پر پڑتے قدموں کے نشان کے مانند لسانی ٹریس کو نہ تو دیکھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے تو اس کی شناخت کیسے کی جائے؟ درحقیقت ہندوستانی شعریات کے ایک امام کُنتک [illegible] کے ہمہ گیر زاویۂ نگاہ سے ٹریس معنی اظہاریہ (وکروکتی) [illegible] میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ خطِ مستقیم میں ہونے والی شاعری کے برخلاف خطِ منحنی میں ہونے والا غیر براہِ راست پیچ دار کلام ہے جو ابوالمعانی ہے۔ اس میں "نئی تنقید" کے تمام شعری مصطلحات سما جاتے ہیں۔ ایمپسن کی "تخلیقی زبان" کے سارے وسائل بھی اسلوبیاتی تنقید کے "لسانی امتیازات" بھی، ساختیات کی "خارجی اور داخلی ساخت" بھی ـــــ اسی اہم نقطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدائے سخن میر اپنے شعر کو "زلف سا پیچدار" بتلاتے ہیں اور غالب "گرمیٔ اندیشہ" کی بات کرتے ہیں۔ اس میں بلیغ معنویتیں اور زبان اور آواز کی تمام ادائیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو بوند میں کیفیات اور ذوقیات کے سمندر کو پوشیدہ رکھتی ہیں۔

First, is precisely, what makes Language an instrumental of Knowing"

لہذا اس اقتباس کی روشنی میں ژاک دریدا کا قول بہت حد تک درست ہوتے ہوئے بھی قدرے عدم توازن کا حامل ہے۔ پھر دوسرے بیشتر ماہرین لسانیات کے مانند وہ بھی ادب کو یکسر ثقافت، عمرانیات اور تاریخ سے کاٹ کر ایک گمراہی کی تخلیق کرتا ہے جبکہ ایک حد تک حسب ضرورت بین العلومی اور فنونی دریافت معاون ہی ہوتی ہے۔

ناموجود کو وہ اکبری تحریر سے موسوم کرتا ہے یہ ینگ کا اکبری پیکر (Arch image) ہے جس کو تخشتمثال (Arch type) بھی کہتے ہیں۔ یہ قدیم آدمی کے دماغ میں بسے ہوئے اولین اجتماعی بنیادی مثالی نقوش ہیں جو کسی شکل میں اب بھی انسان کے اجتماعی لاشعور میں موجود ہیں۔ اگر اکبری پیکر ہی ادب کی خصوصی پیش کش ہے تو اس کے حدود بہت تنگ اور محدود ہو جاتے ہیں۔ خالص احساس کو چھوڑ کر ادب میں فکر اور تصوّر کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ اکبری تحریر یا اکبری پیکر کی کسوٹی پر کھتے ادب کو کھرا اتارا جا سکتا ہے۔ طالسطائی، ٹامس مان، کافکا تلسی داس، تیر نظیر اور منٹو کے لئے یہ کسوٹی کسی کام کی نہیں۔ اسی زندگی اور دنیا کے نہ جانے کتنے لاتعداد ابعاد ہیں۔ ادب اپنی ہمہ گیری اور وسعت آفرینی میں انھیں میں سے کسی ایک پہلو یا ہشت پہلو کا احاطہ کر لیتا ہے۔

جس ناموجود کا وہ کثرت سے تذکرہ کرتا ہے، وہ صرف اکبری تحریر ہی نہیں ہے۔ "ناموجود" زندگی اور کائنات میں ہر سو بکھرا ہوا ہے۔ زندگی میں بھی شاعری کے مانند ہی وہ بہت کچھ غیر مرئی رہتا ہے لیکن اس کے ٹریس بھی زندگی میں رہتے ہیں۔ اس کو بخوبی گرفت میں لے کر ہی ناموجود کی صداقت تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ زبان میں ٹریس جیسا کہ ژاک دریدا کہتا ہے، یہ نشانات آسیب کی مانند غیر مرئی ہوتے ہیں لیکن ان کے کچھ نہ کچھ خفیف آثار بالائی سطح پر بھی ہوتے ہیں۔ وہ زبان سے یکسر علاحدہ نہیں ہیں۔ وہ تخلیقی زبان کے بدیعی وسائل ہیں۔ لہذا زبان کی اہمیت کا انکار غیر اہم اور غیر معنویت آگیں ہے۔ ٹریس کی اہمیت زبان کی اہمیت سے علاحدہ نہیں ہے۔ اس لئے ٹریس کا نظریہ یکسر نیا اور انوکھا

([illegible])

اس کے بغیر شعر میں حسن و کیفیت پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ذکر کی [illegible] بیکسپیر، بیاوش اور خاموشی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شعر میں لفظ و معنی نہیں وہ کیفیت آفریں اور کیفیت پرور لفظ و معنی ہے۔ شاعر کو اس کے لیے شعوری طور پر اکتساب کرنا لازمی ہے۔ ژاک دریدا تو دوسرے سنسکرت شعریات کے عالموں کے مانند "خاموشی کی جمالیات"، "خاموشی کی موسیقی"۔ خاموشی کی زبان "بامعنی اور کیفیت انگیز" خاموشی وقفہ" وغیرہ کا بھی تذکرہ نہیں کرتا۔ معنویت انگیز خاموشی" اور کیف و سرور بخش "وقفہ" وغیرہ بھی خفیف نشان یا ٹریس ہی ہیں۔ پھر ٹریس کو "غیر مرئی آسیب" کہنا کچھ بھی نشان دہی نہیں کرتا — اسی کے وسیلے سے استعارہ (SIGN) کا بھی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

ژاک دریدا کا اصرار ہے کہ لکھا ہوا کنول لفظ وہ نہیں ہے یا ایلیٹ کے یہاں آگ اور گلاب وہ نہیں ہے جو مادی دُنیا میں دستیاب ہوتا ہے۔ ملفوظی اور مکتوبی متن میں آکر وہ تصور ہو جاتا ہے لیکن تصور ہو کر بھی وہ زندگی اور دُنیا میں دستیاب کنول، آگ اور گلاب کے وصف سے دور نہیں ہوتا۔ استعاراتی، علامتی، پیکری، تخشتمثالی (Archtype) اور اسطوری معنی ہو کر بھی اصل معنیٰ سے یکسر خالی نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے وسیع اور رفیع تر معنی میں ڈھل کر بھی پہلے اصل معنی سے کلی طور پر آزاد نہیں ہو پاتا۔ عالمی شہرت یافتہ ماہر معنویات اسٹیفن المان نے اپنے آرٹیکل "اسلوبیات اور معنویات" میں مجازی اور اصلی معنی کے ضمن میں غیر معمولی مدلل طور پر بحث کی ہے اور اپنی توثیق میں اس نے مفکر W.M. Urban کی مندرجہ ذیل عبارت پیش کی ہے :-

The Fact is that a sign can intend one thing without Cea-sing to intend another thing, that indeed, is the Very con-dition of its being an Expre-ssive Sign, for the second is that it is also a Sign for the

قمر کے سامنے جانسوز منظر رقص کرتے ہیں
اب اپنے گھر سے ہم باہر نکلتے ہیں تو ڈرتے ہیں

انہیں سے ہم کو جبراً مسکرا کر ملنا پڑتا ہے
ہمارے قتل کی سازش میں جن کے دن گزرتے ہیں

گئے دن اور گئے موسم کبھی لوٹا نہیں کرتے
تصور پر مگر تصویر بن بن کر ابھرتے ہیں

دہکتی آگ کی مانند ہے یہ زندگی اپنی
ہم اپنے جسم میں ہر روز جیتے اور مرتے ہیں

عجب فطرت ہے اس ایوان کے مسند نشینوں کی
یہی کانٹے بچھاتے ہیں یہی تعظیم کرتے ہیں

بکھرنا زلفِ شب کا پیش خیمہ ہے سویروں کا
بکھرتے ہیں وہی گیسو کہ جو گیسو سنورتے ہیں

نہیں ایسا کوئی بھی مسئلہ جو حل نہ ہو پائے
مگر یہ مسئلے دل کا بہت نقصان کرتے ہیں

دریچے کھولتے ہیں تو غبار آتا ہے باہر سے
گھٹن اندر کی ڈستی ہے جو ہم در بند کرتے ہیں

بشیر ایسے بھی کچھ اہلِ تمنا ہم نے دیکھے ہیں
جنھیں حسرت ہے گلزاروں کی اور شعلوں سے ڈرتے ہیں

بشیر فاروقی
۵۱۵۔ مراد علی لین، عقب رائل ہوٹل
لکھنؤ

رفاقتیں عجیب ہیں رقابتیں عجیب ہیں
تمام شہرِ سنگ کی روایتیں عجیب ہیں

گزارنا حیات کا ہے سہل بھی محال بھی
کہ ہر نفس حیات کی جبلتیں عجیب ہیں

مزاجِ شہرِ دلبراں سمجھ سکا نہ میں کبھی
کہ روز و شب بدلتی اسکی رنگتیں عجیب ہیں

تمام گلشنوں کی خوشبوئیں ہوں اک طرف مگر
خیالِ قربِ یار کی بھی نکہتیں عجیب ہیں

جفائے دشمناں پہ دل کو رنج ہے نہ تعجب
مگر عطائے دوستاں اذیتیں عجیب ہیں

وصالِ خوش گوار میں وہ سوز و تپش کہاں
عذابِ ہجر کی مگر تمازتیں عجیب ہیں

اے جعفرِ ستم زدہ! یقیں بھی ہو تو کس طرح
دروغ و کذب میں نہاں صداقتیں عجیب ہیں

جعفر عسکری
ممتاز محل کیپاؤنڈ
گولہ گنج، لکھنؤ

افسانہ

فیصل کلیم

۲۱۲- تازی حسنلہ۔ لکھنؤ

روشنی کا مینار

شاہد اب ماضی کی وہ سیاہ عینک اتار کر پھینک چکا تھا جس کو پہننے سے اسے ساری دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اب وہ بھی نیا کی روشنی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا۔ شہر میں اس کی حیثیت روشنی کے مینار جیسی تھی جس کی روشنی دور ہی سے نظر آجاتی ہو۔ اس کو دیکھ کر شہر کے نہ جانے کتنے لوگوں کے دلوں میں وہ سب حاصل کرنے کے ارمان جاگ اٹھتے تھے جو شاہد کو اس وقت میسر تھا۔ کیا نہیں تھا اس کے پاس۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں، شہر میں مختلف مقامات پر بنگلے اور بے پناہ عزت۔

لیکن اب وہ جدو جہد کرتے کرتے تھک چکا تھا اور تھکے ہوئے مسافر کو ایک ہمسفر کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کی ہمسفر تو شادی کے پانچ سال بعد ہی اس سے بچھڑ کر بے نام وادیوں کی طرف جا چکی تھی اس وقت عمران صرف ۳ سال کا تھا اور اب ۱۸ سال کا خوبصورت نوجوان تھا، بلا کا ذہین اور خوش اخلاق۔ اسی سال اس نے سی، پی، ایم، ٹی کا امتحان پاس کیا تھا اور اب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے دوسرے شہر جا رہا تھا۔ شاہد کو عمران سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ اسے اسٹیشن پہونچانے آیا تھا۔ عمران ٹرین پر بیٹھا باپ کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

شاہد کی آنکھوں میں ان لمحوں عمران کے لیے بے پناہ شفقت امنڈ آئی تھی۔ ٹھیک سات بجے ٹرین نے دو تین لمبی لمبی سانسیں بھریں اور اپنی مجبوری کا رونا روتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ حالانکہ وہ اپنے پیچھے نہ جانے کتنوں کو روتا چھوڑ آئی تھی۔

بیوی کے انتقال کے بعد شاہد نے عمران کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا اور کبھی اسے ماں کی کمی نہیں محسوس ہونے دی۔ اس کے چلے جانے پر وہ رونا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ غم تو وقتی ہے اور عمران جلد ہی واپس آجائے گا، اس کو کچھ سکون ملا تھا اور اب وہ پھر سے تجارتوں کے سمندر میں غرق ہونے کے لیے پارکنگ شیڈ سے اپنی کار نکال رہا تھا

وقت تیز رفتاری کے ساتھ چھ مہینوں کو پیچھے چھوڑ آیا۔ اس دوران باپ بیٹے میں برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔ دھیرے دھیرے مہینے سال میں تبدیل ہوتے رہے۔ عمران گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی گھر نہیں آتا تھا، شاہد اس سے ملنے خود ہی چلا جاتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کا بیٹا پڑھائی کی وجہ سے گھر نہیں آتا ہے۔

شاہد آج بہت خوش تھا۔ اس کے کاروبار میں آج کا دن تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ آج ایک غیر ملکی کمپنی نے اس کو کافی بڑا آرڈر دیا تھا۔ اتنے مال کے بندوبست کے لیے اسے کافی رقم کی ضرورت تھی۔

وہ اپنے آفس میں بیٹھا اپنے ماتحتوں سے مشورہ کر رہا تھا شاہد نے ایک کاغذ دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے ہم کو دو ہفتہ کا وقت دیا ہے۔ پیسوں کے انتظام کے لئے اگر ہم اتنے وقت میں اپنے قرض داروں سے رقم وصول کرلیں اور فی الحال ادھار دینے پر بالکل پابندی لگا دیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم روپیوں کا انتظام کرلیں۔"

شاہد کے سکریٹری نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا "ہاں اس سے بڑی مدد ملے گی۔"

"آپ دیکھئے کہ سارے شہروں کے انچارج کو سختی سے اس بات کی ہدایت کر دیجئے کہ فی الحال دو ہفتے تک ادھار بالکل بند کر دیں۔"
شاہد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ شاہد نے ان سب کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

"ہلو! شاہد اسپیکنگ ہیئر۔"

"سر! میں ہوں کاشف۔ آپ نے حساب دکھانے کو کہا تھا لہٰذا میں آپ کے پاس پرسوں پہنچ رہا ہوں۔"

"اوہ۔ ہاں دیکھو۔ فی الحال دو ہفتے کے لئے سارا ادھار بند کرا دو، اور جن لوگوں کے پاس رقم باقی ہو ان سے سختی سے وصول کرو ہمیں دو ہفتے میں کافی رقم چاہئے۔ تم یہاں جلد از جلد آ جاؤ۔ میں تمہارا حساب دیکھ کر شاید کچھ اطمینان محسوس کر سکوں۔"

اگلے دن کاشف، شاہد کے دفتر میں بیٹھا تھا۔

"میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔ ایک ایک پیسے کا حساب ٹھیک ہے۔" شاہد پرجوش لہجے میں بولا۔

"سر! اس کے لئے کیا مجھے بہت پریشان ہونا پڑا۔ آپ کا فون سنتے ہی میں نے فوراً قرض داروں سے وصولی شروع کر دی اور ادھار سختی سے بند کرا دیا۔" کاشف نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے شہر کا سارا مال بلیک میں بکوا دیا ہے۔ ان دنوں اس کی کافی مانگ ہے۔ نقد دام مل جائیں گے۔ اپنے شہر میں تھوڑا سا رکھ لیا ہے۔ مگر صرف ان کے لئے جو اس کی دوگنی قیمت دے سکیں۔"

کاشف نے ایک بار پھر داد طلب نگاہوں سے شاہد کی طرف دیکھا جو اسے تعریفی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی۔

"تمہاری کال ہے۔" شاہد نے ریسیور کاشف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو! کون؟ اوہ جین! کہو کیا بات ہے؟" کاشف دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔

"نہیں، میں نے تمہیں سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ دوگنی قیمت سے ایک پیسہ کم نہیں۔" کاشف پھر دوسری جانب کی آواز سنتا رہا۔

"نوکر لینے دو۔ اس کے جیسے ہزاروں روز آتے ہیں۔" کاشف نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا بات تھی۔ کیا کہہ رہے تھے؟"

"کوئی بات نہیں سر، روزانہ اس طرح کے سیکڑوں افراد آتے رہتے ہیں اور مال نہ ملنے پر خودکشی کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ مگر کرتا کوئی نہیں۔"
کاشف نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ اور بات ختم ہو گئی تھی۔

شاہد کو گھر پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج گئے۔ اس نے جلدی جلدی کھانا نپٹایا اور نوکروں کو صبح ۹ بجے اٹھا دینے کی تاکید کرتا ہوا بیڈروم میں پہنچ گیا۔ صبح اس کی نیند دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے کھلی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی چھ بجے تھے اور ان کم بختوں نے ابھی سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ شاہد بڑبڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔

"کیا ہے۔؟ کیوں دروازہ توڑے ڈال رہے ہو۔" شاہد نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

سامنے اس کا پرانا نوکر شکور ہاتھ میں اخبار اٹھائے کھڑا تھا۔
شاہد نے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا اور پہلے صفحہ پر چھپی تصویر کو گھورنے لگا۔ بمشکل تمام وہ بستر تک آیا اور بستر پر گر کر اس طرح ہانپنے لگا جیسے میلوں لمبی دوڑ لگا کر وہاں پہنچا ہو۔ تبھی ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!" شاہد کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کون۔ شاہد صاحب! اس نے واقعی خودکشی کر لی ہے اور مرنے سے پہلے بیان میں میرے خلاف بہت کچھ پولیس کو بتا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہوشیار رہیے۔ ہو سکتا ہے کہ تفتیش میں آپ کا نام بھی آ جائے۔ اب میں اجازت چاہوں گا۔" دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

شاہد کو ایک دم سکتہ ہو گیا تھا۔ شکور کو اس کے متعلق تشویش ہونے لگی۔ ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہد نے بستر سے چھلانگ لگائی اور دوسرے ہی لمحے اس کا جسم کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہوا سڑک پر گر کر بے جان ہو گیا۔

انسپکٹر زیدی نے سارے نوکروں کے بیانات قلم بند کئے اور پھر شاہد کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ وہ ہر چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر

ہانگ کانگ میں پہ کبھی ورونگ کی ڈائری پڑی ۔ اس میں شاہد کی زندگی کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑے واقعات کا ذکر تھا ۔ اس نے وہ ڈائری اپنے قبضے میں لے لی ۔

اگلے دن اخبارات میں شاہد کی خودکشی کے متعلق تفصیل سے چھپا تھا ۔ ایک روزنامہ کے بموجب شاہد نے اپنی زندگی کے بہترین سال شہر کی سب سے گندی بستی جمال پورہ میں گزارے تھے ۔ کسی دن اس کا تعارف جرائم پیشہ افراد سے ہوگیا تھا اور پھر اس کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لے لی وہ منشیات کی اسمگلنگ کرنے لگا ۔ ملک کے کئی حصوں میں اس کا کاروبار پھیلا ہوا تھا ۔ جس شہر میں عمران ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس کرنے گیا تھا اس شہر کا انچارج کاشف تھا ۔ عمران کو بھی اس نشہ کی لت پڑ چکی تھی وہ اس میں بالکل ڈوب گیا تھا ۔ اس نے پڑھائی بھی ترک کر دی تھی اور دن رات نشہ میں پڑا رہتا تھا ۔ شاہد کو اپنے خون پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا ۔ عمران بھی زیادہ پیسے نہ مانگتا تھا کہ کہیں باپ کو شک نہ ہو جائے ۔

ادھر شاہد کا کسی غیر ملکی اسمگلر سے کافی لمبا سودا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے اپنے کاروبار میں ادھار بالکل بند کرا دیا تھا ۔ عمران کے پاس ان دنوں پیسوں کی سخت تنگی چل رہی تھی ۔ اس نے ادھار لینا چاہا تھا مگر وہاں تو اس کی قیمت دوگنی ہو چکی تھی لہٰذا اسے براؤن شوگر نہیں مل سکی تھی ۔ فوری طور پر وہ اپنے باپ سے پیسے بھی نہیں مانگ سکتا تھا ۔ دوستوں نے بھی مزید ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ نشہ کا عادی جسم یہ باتیں برداشت نہیں کر سکا ۔ اس نے خودکشی کرنے کی سوچ لی ۔ مگر اس سے پہلے اس نے پولیس کو کاشف کے گروہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور خود زہر کھا کر خودکشی کر لی ۔

شاہد نے اخبار میں جب عمران کی تصویر دیکھی اور متعلقہ خبر پڑھی تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا اور اسی دیوانگی کے عالم میں اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی ۔ ایک ناکارہ روشنی کا مینار اندھیروں میں غرق ہو چکا تھا ۔ جو دوسروں کو دکھائی تو دے سکتا تھا مگر کسی گھر کا اندھیرا دور کرنے کی صلاحیت اس میں نہ تھی ۔ جب وہ اپنے ہی گھر کا اندھیرا دور نہ کر سکا تو اس سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی ۔

□□

غزل

وہ چاند چہرہ دریچے میں جب بھی آتا ہے
سکون دل کا مرے لوٹ لوٹ جاتا ہے

چہار سمت ہوائیں مہکنے لگتی ہیں!
ہر ایک پھول محبت کے گیت گاتا ہے

پرانے زخم دعائیں خدا سے مانگتے ہیں
گلے لگا کے محبت وہ جب جتاتا ہے

بلندیاں بھی اسی کو نصیب ہوتی ہیں
جو ٹانگ کھینچ کے دشمن کو گراتا ہے

نہ پھینک اور پہ پتھر یہ سوچ لے دل میں
کبھی یہ سنگ ملامت پلٹ بھی آتا ہے

یہاں تو کوئی نہیں ہے سوائے تنہائی
تو ریگزار میں کس کو صدا لگاتا ہے

اندھیری رات سے اب تو نہ خوف کھا مظہر
وہ دیکھ دور، دیا کوئی ٹمٹماتا ہے

مظہر محمود

۲/۱۲۶ اترولہ ہاؤس ...

آشوبِ آگہی

دھندلکے
ریشمیں رنگیں دھندلکے
دھندلکے سبزہ زاروں آبشاروں کوہساروں، وادیوں، چشموں
زمیں تا آسماں پھیلے ہوئے تھے
ان دھندلکوں میں یہ دنیا کتنی دلکش کتنی پُراسراری لگتی تھی
جیسے دیوتاؤں کا انوکھا خواب
الوہیت کی شبنم کی پھواروں میں
بکھرتا ہی چلا جائے

دھندلکے رفتہ رفتہ ہو گئے تحلیل روشنیوں میں
اور اب آسماں شعلے اگلتا ہے
ہمارا ذہن جلتا ہے

○

عروج آفاقی
سی ۲/۱۲۔ ریلوے کالونی
بادشاہ نگر۔ لکھنؤ

مکین کے بعد

ہوا چلی ہے
سیاہ، پیلے، سفید تنکے
بکھر رہے ہیں

گیا و خستہ
غلام گردش میں
سرنگوں ہے

قلعے نما
اک محل کا پھاٹک
نہ جانے کب سے
خزاں کی آمد کا
منتظر تھا

○

آیندگاں کے لئے

ہوا چل رہی ہے
تمہارے ثمر بھی
ہری گھاس کی گود میں
گر پڑیں گے

ہوا کیا کرے گی
ہماری جڑیں
پاستاں سے جڑی ہیں
ہم آیندگاں کے لئے
پھل رہے ہیں

○

نیستاں

ہمارے کھنڈر کے
عقب میں
کئی منزلہ اک عمارت
کھڑی ہے
عمارت کا سایہ
ہمیں ڈس رہا ہے
ہواؤں میں سرگوشیاں ہیں
کہ ــــ "ہم آج بھی
اک نیستاں کے ماحول میں
جی رہے ہیں"

○

قمر ادیب
۱۴۔ ادریس گنج۔ ہردوئی
(یوپی)

غزلیں

ہر نفس اب درپئے آزار ہے
زندگی کرنا بہت دشوار ہے

آئینے سے وہ بہت بیزار ہے
بولتی تصویر سے انکار ہے

شہر کا ماحول کیا ہوگیا
ہر کسی کے ہاتھ میں تلوار ہے

پھول کی سُرخی چُرا لیتے ہیں آپ
روئے جاناں اس لیے گلنار ہے

میری رُسوائی کی شہرت ہو گئی!
دوستوں کے ہاتھ میں اخبار ہے

——— طفیل احمد انصاری
مفتی محلہ۔ جونپور

راہِ طلب میں منزلِ مقصود کیا ملے
حدِ نگاہ تک تو ہیں کانٹوں کے سلسلے

ایسی خزاں نواز بہاریں فضول ہیں
جس میں کلی چٹک نہ سکے اور نہ گُل کھلے

یہ کیفیت ہے ترکِ تعلق کے باوجود
سر جھک گیا جہاں ترے نقشِ قدم ملے

اپنوں کے طنز غیر کے طعنے ترے ستم
کتنے حسین مجھ کو محبت کے غم ملے

عشرتؔ شکستِ دل کا یقیں ہو چلا ہے اب
وہ ہم سے بدگماں ہیں ہمیں ان سے ہیں گلے

——— عشرت صدیقی فیض آبادی
ممتاز ڈگری کالج۔ لکھنؤ

غموں کا حدِ نظر تک غبار پھیلا ہے
فریب کھائے ہیں اتنے کہ دل شکستہ ہے

وہ میرے زخموں پہ مرہم کبھی نہیں رکھتا
میں کیا بتاؤں کہ کیسا مرا مسیحا ہے

کوئی نہ کر سکا سیراب تشنگی اس کی
نہوں میں جا کے سمندر کے بھی وہ پیاسا ہے

میں حرف حرف میں اُترا ہوں روشنی کی طرح
تو کائنات کا چہرہ نظر میں آیا ہے

سجے ہوئے ہیں فصیلوں پہ سر جو یہ احسنؔ
صلیب و دار سے اب بھی ہمارا رشتہ ہے

——— نواب احسن
۲۲۶۔ بخشی بازار
الہ آباد

وہ شخص محبت کا جو پیکر سا لگے ہے
آئے ہے کبھی پاس تو پتھر سا لگے ہے

اشکِ غمِ ہستی کی یہ وسعت ذرا دیکھو
قطرہ ہے مگر پھر بھی سمندر سا لگے ہے

اس شہرِ نگاراں سے کہیں دور چلیں ہم
یہ شہر تو آسیب زدہ گھر سا لگے ہے

میں سچ بھی کہوں گا تو مری کون سُنے گا
جس شخص کو دیکھو وہ ستم گر سا لگے ہے

اس وقت بہت شدتِ احساس ہے اطہرؔ
وہ پھول بھی مارے ہے تو پتھر سا لگے ہے

——— اطہر رحمانی
محلہ قاضی پورہ
بہرائچ

اُتر پردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

گورنر نے کھادی کے استعمال پر زور دیا

اتر پردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرائن ریڈی نے اندرا نگر میں مرکزی کھادی اور گرام ادیوگ کے نوتعمیر شدہ ریاستی دفتر کی عمارت کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر گورنر نے کھادی نمائش بھی دیکھی۔

گورنر نے اس موقع پر منعقدہ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کھادی کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے "گرام سوراج" کا جو خواب دیکھا تھا اس میں کھادی اور دیہی صنعتوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں کھادی گرام ادیوگ کمیشن، اتر پردیش میں کھادی کو فروغ دینے اور گاؤں میں صنعتی پیشوں کو ترقی دینے کے سلسلے میں قابلِ تعریف کام انجام دے رہا ہے۔

شری ریڈی نے کہا کہ اس کمیشن کے سامنے دیہی علاقوں میں بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنے، قابلِ فروخت اشیا کی پیداوار بڑھانے، دیہی عوام کو خود کفیل بنانے اور ایک مستحکم "گرام سماج" قائم کرنے کا جو نشانہ ہے وہ بہت ہی قابلِ تحسین ہے۔ یہ کمیشن رضاکار تنظیموں، امداد باہمی انجمنوں اور ریاستی کھادی گرام ادیوگ منڈل کے توسط سے دیہاتوں میں کھادی اور دیہی صنعت کی ترقی کے لئے جو کام انجام دے رہا ہے اس سے یقیناً دیہی عوام کو بڑا فائدہ پہونچ رہا ہے۔

گورنر نے اس بات پر زور دیا کہ لوگوں میں ایسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس سے لوگ کھادی اور گرام ادیوگ کی تیار شدہ اشیا کا زیادہ سے زیادہ استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ اسی میں ہم سب کی فلاح مضمر ہے۔ جہاں تک اشیا کی کوالٹی کا معاملہ ہے اسے بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جانا چاہیے تاکہ لوگ اسے خوشی خوشی خریدنا پسند کریں۔

گورنر نے صنعت کاری اور بڑھتی ہوئی آبادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ گاؤں میں زیادہ سے زیادہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ گاؤں میں ہر بیکار ہاتھ کو کام مل سکے اور ان کے لئے روٹی روزی کا وہیں بندوبست ہو جائے۔ اس سلسلے میں کھادی گرام ادیوگ منڈل وغیرہ کو اہم کردار ادا کرنا چاہیے اور دیہی عوام کو خود اپنا کوئی نہ کوئی روزگار شروع کرنے کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ مدد دینا چاہیے تبھی "گرام سوراج" کا ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

"ممتاز شاعر حیات وارثی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے" —— اعزاز رضوی

مشہور و ممتاز شاعر حیات وارثی کے نام سے یحییٰ گنج (باغ مولوی انوار) علاقے کی ایک سڑک کو موسوم کیا جائے گا۔

وزیر غذا و رسد اور مسلم اوقاف شری اعزاز رضوی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے ادیبوں کے ایک وفد کو بتایا کہ شری وارثی ہندی، اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ وہ ہمیشہ ملک و قوم کی خدمت میں منہمک رہے۔ ان کی ۔ کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

شری رضوی نے بتایا کہ وہ ان کے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف

ہیں۔ وہ زندگی بھر اقتصادی مشکلات سے نبرد آزما رہے۔ اس لیے حکومت اردو اکیڈمی سے ان کے کنبے کو پنشن دلائے جانے کا بندوبست کرنے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔

جشن تاج ہر سال منعقد ہوگا

وزیر سیاحت کا اعلان

فن و ثقافت اور دستکاریوں کی نمائش کے لیے جشن تاج ہر سال پندرہ دن کے لئے ۱۸ فروری سے منعقد کیا جائے گا۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ یہ تقریب پھول والوں کی سیر کی طرح بین اقوامی شہرت پائے۔

یہ اطلاع ریاست کے وزیر سیاحت و ثقافتی امور شری کیدار سنگھ فونیا نے آگرہ کے شلپ گاؤں میں جشن تاج اور دستکاری میلہ کا افتتاح کرتے ہوئے دی۔

شری فونیا نے کہا کہ سیاحت کو فروغ دینے کے سلسلے میں تاج بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کی تعمیر ماہر فن کاریگروں نے کی۔ اس طرح سیاحت کو فروغ دینے میں دست کاریوں کا اہم کردار رہا ہے۔

وزیر سیاحت نے کہا کہ سیاحت ایک ایسی صنعت ہے جس میں جاتا کچھ نہیں بلکہ غیر ملکی زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے دست کاروں سے اپیل کی کہ وہ اپنے فن کے ذریعہ ملک کا نام مزید روشن کرنے کی کوشش کریں۔

یکم مارچ سے سات مارچ تک چلنے والے جشن تاج میں ملک کے مختلف حصوں کے دست کاروں کے ۶۵ شہ پارے نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اس رنگا رنگ پروگرام کا افتتاح وزیر سیاحت نے شمع روشن کر کے کیا۔

آیورویدک طریقۂ علاج کو فروغ دینے کے لئے

نئی اسکیموں کا اعلان جلد

وزیر ریاست برائے صحت میڈیکل تعلیم اور خاندانی بہبود ڈاکٹر امر سنگھ نے کہا کہ حکومت اتر پردیش ہندوستان کے قدیم طریقۂ علاج آیورویدک کو فروغ دینے کے لیے پر عزم ہے نیز اسے اور آسان بنانے کے لیے جلد ہی نئی اسکیموں کا اعلان کیا جائے گا۔

انھوں نے کہا کہ آیوروید میں مرض کی صحیح تشخیص کر کے اسے جڑ سے ختم کر دیا جاتا ہے اور آیورویدک دواؤں کا کوئی برا اثر بھی نہیں پڑتا۔

خدمت خلق انسان کا اہم فریضہ

وزیر مالیات کا اظہار خیال

خدمتِ خلق انسان کا اولین فریضہ ہونا چاہیئے۔ خدا نے کائنات کی تخلیق کر کے انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ سماج کے دبے کچلے اور بے سہارا لوگوں کی خدمت تن من دھن سے کرے۔ چنانچہ انسانی اعضا کا عطیہ سماج کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ان خیالات کا اظہار وزیر مالیات اور پارلیمانی امور شری راجندر کمار گپت نے شری ہر مکھ رام کرپا دیوی دھرمارتھ اسپتال کی جانب سے منعقد آنکھ کے مفت علاج کیمپ کے اختتام کے موقع پر کیا۔

وزیر موصوف نے نابینا لوگوں کی زحمتوں کا ذکر کرتے ہوئے آنکھ کے عطیہ پر زور دیا اور لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں آگے آئیں۔

"خواتین ترقی یافتہ سماج کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکتی ہیں"

—— رماپتی شاستری

اتر پردیش کے وزیر سماجی بہبود، ترقی خواتین و اطفال شری رماپتی شاستری نے بین اقوامی یوم خواتین (۸ مارچ) کے موقع پر ترقی خواتین اور ان کی بہتر صحت کی تمنا کی ہے۔

شری شاستری نے اپنے پیغام میں خواتین سے اپیل کی ہے کہ "سماج کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے کے لیے عزم مصمم کے ساتھ آگے

آئیں تبھی ہم ایک ترقی یافتہ سماج کی تشکیل کر سکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ دیہاتوں میں آج بھی خواندہ خواتین کی شرح مردوں سے کم ہے اس فرق کو ہمیں دور کرنا ہے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ دستور میں خواتین کی ترقی اور انھیں خود کفیل بنانے کا بندوبست موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کو اس سلسلے میں خود پہل کرنی ہوگی تبھی ملک وقوم کی بہبود ممکن ہے۔

شری شاستری نے رضا کار خواتین اداروں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے پروگراموں کو گاؤں تک لے جائیں تاکہ وہاں کی خواتین میں غریبی اور ناخواندگی کو دور کرنے کے سلسلے میں بیداری اور دلچسپی پیدا ہو اور وہ بھی ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

چھ چھوٹے آبی بجلی پراجیکٹوں کے لئے ۲٫۴۵ کروڑ روپئے کی گرانٹ

حکومت اتر پردیش نے اترانچل کے چھ چھوٹے آبی بجلی پراجیکٹوں کے لئے موجودہ مالی سال میں ۲٫۴۵ کروڑ روپئے کی گرانٹ دی ہے۔

ضلع پتھورا گڑھ کے سوبلا، کل گاڈ، چھڑن دیو اور دیو کھیت کے چھوٹے آبی بجلی پراجیکٹوں کے لئے بالترتیب ۱۰۰ لاکھ، ۵۰ لاکھ اور دس دس لاکھ روپئے اور کوٹہ باغ (نینی تال) اور گوری کنڈ (چمولی) کے لیے بالترتیب ۳۶٫۳ لاکھ اور ۶۴٫۱۴ لاکھ روپئے کی گرانٹ منظور کی گئی ہے۔

سوبلا کے چھوٹے آبی بجلی پراجیکٹ سے ۶ ہزار کیلوواٹ، کل گاڈ سے ۱۲۰۰ کیلوواٹ، چھڑن دیو سے ۴۰۰ کیلوواٹ، دیو کھیت سے ۵۰۰ کیلوواٹ، کوٹہ باغ سے ۲۰۰ کیلوواٹ اور گوری کنڈ سے ۲ ہزار کیلوواٹ آبی بجلی پیدا ہو سکے گی۔

دیسی اشیاء اپنانے کی تلقین

وزیر ریاست برائے سیاحت شری ہرک سنگھ راوت نے عوام سے اپیل کی ہے کہ ملک میں تیار شدہ مصنوعات کو اپنا کر ملک کو خود کفیل اور خوشحال بنائیں۔ سودیشی اندولن ایک اچھی شروعات ہے اور اسے تب تک جاری رہنا چاہیئے جب تک بیرونی کمپنیوں کے منصوبوں سے پیدا ہونے والے خطرات سے عوام واقف نہیں ہو جاتے۔

وزیر موصوف نے گزشتہ دنوں ضلع اٹاوہ کے سناتن دھرم انٹر کالج میں سودیشی جاگرن منچ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک پوسٹر نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

شری راوت نے کہا کہ سیاحوں کو دوران سفر سہولت بہم پہونچانے کی غرض سے اودی، اٹاوہ میں ۸ پلنگوں والے موٹل کی تعمیر کی تجویز ہے جس کے لئے اودی میں محکمہ تعمیرات عامہ کے انسپکشن ہاؤس کو محکمہ سیاحت کے سپرد کیا جا چکا ہے اور یہ اسکیم مرکزی حکومت کو منظوری کے لئے ارسال کی جا چکی ہے۔

بڑے شہروں میں بجلی سپلائی نظام کے سدھار کے لئے ۱۰٫۱۷ کروڑ روپئے

اتر پردیش کے وزیر توانائی شری لال جی ٹنڈن نے بتایا ہے کہ ریاست کے بڑے شہروں میں بجلی سپلائی نظام میں سدھار لانے کے لیے ۱۰٫۱۷ کروڑ روپئے کا بندوبست کیا گیا ہے جس میں ۸٫۳ کروڑ روپئے لکھنؤ اور ۹۰ لاکھ روپئے کان پور میں بجلی سپلائی نظام کے سدھار پر خرچ ہوں گے۔

وزیر توانائی نے بتایا کہ لکھنؤ میں ۸٫۳ لاکھ روپئے کی رقم سے ۳۳/۱۱ کے. وی. بجلی ذیلی مرکز کی تعمیر، ۱۶٫۵ کلومیٹر ۳۳ کے. وی. لائن کی توسیع، ۱۱ کے. وی. کی ۳۱ کلومیٹر لائن کی توسیع، حسین گنج ذیلی مرکز کی جدید کاری اور ۱۱/۴ کے. وی. کے تیس ٹرانسفارمروں کی تنصیب کے کام انجام دیئے جائیں گے

وزیر توانائی نے بتایا کہ مالی وسائل کی کمی ترقی کے کاموں میں حائل نہیں ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ بجلی سپلائی نظام کو سدھارنے کے لئے میرٹھ کو ایک کروڑ روپئے، آگرہ کو ۷۵ لاکھ روپئے، وارانسی کو ۲۵ لاکھ

روپے، الہ آباد کو ۵۴۰ لاکھ روپے، بریلی کو ۲۰۵ لاکھ روپے، گورکھپور کو ۵۰ لاکھ روپے، فیض آباد کو تیس لاکھ روپے، متھرا کو ۱۱۵ لاکھ روپے، بلند شہر کو ۲۰ لاکھ روپے اور علی گڑھ کو ۱۶۳ لاکھ روپے منظور کیے گئے ہیں۔

شکر اور اناج کی تقسیم کو باضابطہ بنانے کی ہدایت

حکومت اترپردیش نے عوامی نظام تقسیم کے تحت سرکاری سستے غلّے کی دوکانوں کے توسط سے اس ماہ ۵۰،۹۶۳ میٹرک ٹن لیوی شکر کی تقسیم راشن کارڈ ہولڈروں میں کرانے کے لئے ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت جاری کردی ہے۔

اترپردیش کے وزیر خوراک و رسد شری اعزاز رضوی نے اپنی رہائش گاہ پر ایک وفد کو بتلایا کہ آئندہ تیوہاروں کے پیش نظر اس ہفتہ فی راشن کارڈ ۵۰۰ گرام مزید شکر سبھی راشن کارڈ ہولڈروں کو دی جائے گی۔ اس کے لیے ۱۳۸۰۰ میٹرک ٹن شکر ماہ جنوری میں ہی اضلاع کو الاٹ کی گئی تھی۔

شری رضوی نے بتایا کہ اب ایسا بندوبست کیا گیا ہے کہ صارفین شکر، چاول اور گیہوں ایک ساتھ لے سکیں گے۔ کوٹے دار اپنے یہاں کے راشن کارڈ ہولڈروں کو وقت اور تاریخ کا تعین کرکے راشن وقت پر مہیا کرائیں گے۔

ناکارہ ٹرانسفارمروں کو بدلنے کی ہدایت

اترپردیش کے وزیر توانائی شری لال جی ٹنڈن نے بتایا کہ گیہوں کی مڑائی اور طلباء کے امتحانات کے پیش نظر بجلی فراہمی میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کے لیے ناکارہ ٹرانسفارمروں کو فوری تبدیل کرنے کے احکامات دے دیئے گئے ہیں۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ ریاست میں مختلف صلاحیت کے تقریباً سوا دو لاکھ ٹرانسفارمر لگے ہوئے ہیں جن میں سے ۲۷۵۳۸ ٹرانسفارمر ناکارہ تھے۔ ان میں ۲۴۲۲۹ ٹرانسفارمر تبدیل کیے جا چکے ہیں اور باقی ۳۳۰۹ ٹرانسفارمر بھی جلد ہی بدل دیئے جائیں گے۔

وزیر توانائی نے بتایا کہ محکمہ کے ملازمین کی مستعدی اور انسپکشن کے نتیجے میں گزشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال ٹرانسفارمر چوری کے واقعات میں کمی ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بجلی چوری کے روکنے اور بدعنوانیوں کو بچانے کے لئے موجودہ سال مارے گئے ۴۸۱۰۳ چھاپوں کی وجہ سے بجلی چوری کے ۱۷۷۹۹ اور دیگر بدعنوانیوں کے بہت سے معاملات روشنی میں آئے۔ ان معاملات میں صارفین پر ۸۸ر۶ کروڑ کا جرمانہ مقرر کیا گیا اور ۰۳ر۱ کروڑ روپئے وصول کیے گئے۔

پسماندہ علاقوں میں گورنمنٹ گرلس ہائی اسکول

دوران سبھا کے وقفۂ سوالات میں شری ہردے نرائن کے ذریعہ پوچھے گئے ایک سوال کے تحریری جواب میں وزیر برائے ہائر سکنڈری تعلیم شری راج ناتھ سنگھ نے بتایا کہ ریاست میں ۱۱۰ پسماندہ مقامات پر گورنمنٹ گرلس ہائی اسکول کھولنے کے احکامات بھیج دیئے گئے ہیں۔

سیلس ٹیکس کے طریقۂ کار کو آسان بنانے والی کمیٹی کی رپورٹ حکومت کے زیر غور

دوران سبھا میں ڈاکٹر دنیش جوہری کے ایک سوال کے تحریری جواب میں قائم مقام وزیر ادارہ جاتی مالیات شری راجندر کمار گپتا نے بتایا کہ سیلس ٹیکس کی شرحوں کو معقول بنانے کی خاطر مشورے دینے کے لیے تشکیل کردہ کمیٹی کی رپورٹ حکومت کو حاصل ہو گئی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ابھی اس رپورٹ پر غور کیا جارہا ہے۔





نام کتاب : "ساحل، سیپ، سمندر"

شاعرہ : سیدہ شان معراج   قیمت : ساٹھ روپئے

ملنے کا پتہ : سیدہ شان معراج ۔ نارن ٹکی، شاہ جہاں پور (یو۔پی)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو میں حقیقی شاعرات کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی خاص وجہ معاشرتی پابندیاں ہیں۔ آزادی کے بعد صورت حال میں کافی تبدیلی آئی ہے اور آزادیٔ نسواں کی تحریک کے زیر اثر خواتین میں نہ صرف یہ کہ تعلیم کا رواج بڑھا ہے بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی ہیں اور شعر و شاعری کے میدان میں بھی شاعرات آگے بڑھی ہیں۔ حالانکہ ابھی یہ تعداد قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن صورت حال امید افزا ضرور ہے۔

پچھلے دس پندرہ برسوں میں جن شاعرات نے اپنی شناخت مستحکم کی ہے ان میں سیدہ شان معراج کا نام بھی شامل ہے۔ شان معراج یوں تو شاعروں کی شاعرہ ہیں مگر ان کی غزلیں اکثر رسالوں میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ "ساحل، سیپ، سمندر" ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ ہر چند کہ اس مجموعہ میں چند نظمیں بھی شامل ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کی شاعرہ ہیں اور انھوں نے غزل کو اس کی تمام فنی باریکیوں کے التزام کے ساتھ ذریعۂ اظہار بنایا ہے انھوں نے تغزل کو عہد حاضر کے مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے وہ جدید ہیں مگر ان کے یہاں جدت مصنوعی نہیں اور نہ انھوں نے ایسی علامتوں کا استعمال کیا ہے جو غزل کے روایتی اسلوب سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔ خود شان معراج نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری تشبیہات و علامات کے بے ضرورت استعمال سے بوجھل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں زبان کی سادگی اور بیان کے حسن کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے ان کے لہجہ میں سنجیدگی اور وقار ہے۔ روایت سے وابستگی نے ان کی شاعری کو ابتذال اور بے راہ روی سے بچالیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ۔

آرزو جینے کی ہے تو جی چٹانوں کی طرح
ورنہ پتے کی طرح تجھ کو ہوا لے جائے گی

کس طرح اس کی ہر اک پتھر مزاجی کا غرور
میں نے شیشے میں اُتارا یہ کہانی پھر سہی

آج وہ یادوں کی دستاویز جھوٹی ہو گئی
کوئی اس بستی کے نقشے سے مرا گھر لے گیا

کون ہے جس نے مرا عزم سفر چھین لیا
کیا کہوں کس نے یہ زنجیر سی پہنائی ہے

میرے اظہار کی ایک ایک ادا اُس کی تھی
میرے سینے میں چھپا سوز دروں بھی وہ تھا

آئینے عکس سے محروم نگہ منظر سے
اب یہ تنہائی کا عالم ہے کہ سایہ بھی نہیں

عہد حاضر میں غزل نسوانی جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے مگر غزل کو محض انھیں جذبات کے اظہار تک محدود کر دینا غزل کے ساتھ زیادتی ہے۔ سیدہ شان معراج کی غزلوں میں جو نرمی، معصومیت اور ایک طرح کی خود سپردگی کی کیفیت ملتی ہے وہ انھیں جذبات کی مرہون منت ہے، مگر ساتھ ہی ان کے یہاں ایک نوع کی توانائی اور بلند حوصلگی بھی ہے۔ انھوں نے خوابوں کی دنیا بھی سجائی ہے مگر حقائق سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ امید ہے کہ ان کے اس مجموعہ کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

——— مظفر حنفی

نام کتاب : "نقشِ دوام"

شاعر : محمد شریف قریشی متخلص شریفؔ   قیمت : /۵۰ روپے

ملنے کا پتہ : ۱/۱۸ محلہ منڈی ۔ فتح گڑھ ۔ یوپی

جناب شریف قریشی کے مجموعہ کلام "نقش دوام" سے ظاہر ہے کہ وہ ایک جدید شاعر ہیں اور جدید اسلوب سخن کی اپنے انفرادی رنگ میں نمائندگی کرتے ہیں ۔ ان کے کلام میں بے ساختگی اور حقیقت نگاری نمایاں ہے ۔ ان کے افکار کی پرواز انھیں بسا اوقات بعید العقل معنگی (MYSTICISM) کی جانب مائل کر دیتی ہے اور وہ ماحولی جانسوزی (PATHETIC FALACY) کے رنگ سے بھی استفادہ کرتے ہیں ۔ ان کے اشعار میں جذبات کی نزاکت بے ساختگی، لطافت بیان اور رومانیت دیکھیں ؎

باعثِ ترک ملاقات تمھیں کیا معلوم
میری مجبوری حالات تمھیں کیا معلوم
سانس لیتا ہوں تو احساس کی رگ دکھتی ہے
کتنے مجروح ہیں جذبات تمھیں کیا معلوم

آپ ہم سفر ٹھہرے کچھ تو بولیے ہم سے
اس طرح تو سائے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ماحولی جانسوزی ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں ؎

کوئی پرکھ نہ سکا چاندنی کی سازش کو
ہوا خنک تھی مگر ہر کلی جھلس ہی گئی

چاند جب اترتا ہے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں
پُر سکون دریا بھی کروٹیں بدلتے ہیں

لوگ شبنم کی حفاظت میں لیے نیزہ بدست
دھوپ کی کرنیں سمندر کا سمندر لے گئیں

ان کی بعید العقل معنگی ان اشعار سے نمایاں ہے ؎

اور پھر اس کے بعد زیر لب
الوداع الوداع کہتی ہوئی
چھوڑ کر نقش اپنی یادوں کے
کہر کی دھند میں نہ جانے کدھر
اپنی دنیا میں لوٹ جاتی ہے
کون جانے کہاں سے آتی ہے

—————— راجندر بہادر موجؔ

نام کتاب : "یہ رشتے دِل کے" (ناول)

مصنفہ : عطیہ پروین   قیمت : چوّن (۵۴) روپے

ملنے کا پتہ : نسیم بک ڈپو ۲۵ ۔ گوتم بدھ مارگ لکھنؤ

لکھنؤ سے پابندی سے شائع ہونے والا خواتین کا محبوب ماہنامہ "حریم" اپنا خصوصی شمارہ مکمل ناول کی شکل میں شائع کرتا ہے ۔ اس کا ۱۹۹۱ء کا خصوصی شمارہ عطیہ پروین کے ناول پر مشتمل ہے ۔

عطیہ پروین متعدد ناولوں کی خالق ہیں اور خاتون ناول نگاروں میں جانی پہچانی ہیں، انھیں "ناول لکھنے کا فن آتا ہے" ان کا زیر تبصرہ ناول ایک دلچسپ اور کامیاب ناول ہے ۔

یہ ناول شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہے لیکن اگر طرز تحریر اور زبان کی تراش خراش پر کچھ اور توجہ دی جاتی تو یہ اور کامیاب ناول ہو سکتا تھا ۔

انگریزی کے رومانٹک شاعر شیلےؔ نے کہا تھا ہمارے بہترین نغمات وہی ہیں جو غمگین خیالات پر مبنی ہوتے ہیں اسی طرح ہمارے بہترین رشتے درد کے ہی رشتے ہوتے ہیں ۔ کسی درد میں مبتلا آدمی کے اسی کی طرح درد میں مبتلا انسان سے جتنے مضبوط رشتے استوار ہوتے ہیں ۔ اتنے کسی اور سے نہیں اسی لیے عطیہ پروین نے اپنے ناول میں ایک سے درد میں مبتلا افراد کی داستانِ غم کو مضبوط رشتوں کے طور پر پیش کیا ہے ۔ ایک ۲۲ سال کی دوشیزہ ثانی زہرا جعفری ہے جس کے بہت ہی شفیق باپ اس کے تین چھوٹے بھائیوں اور بیوی کو چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوتے ہیں ۔ زہرا کو باپ کے غم کے علاوہ اپنی بیوہ ماں اور تین چھوٹے بھائیوں کی بھی ذمہ داری اٹھانا ہے ۔ خیر النسا ہیں جن کی ازدواجی زندگی کافی کامیاب ہے مگر ایک کسک ہے

کہ کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہی کمک ان کے شوہر کے دل میں ہے مطلب کچھ ہوتے ہوئے بھی زندگی بے رونق ہے۔ یہ تینوں اتفاق سے ملتے ہیں تو ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوتا ہے کہ لائفنگ ثابت ہوتا ہے۔

اگر مصنفہ اس ناول پر تھوڑا وقت اور صرف کرتیں تو یہ جتنا دلچسپ اور کامیاب ہے اس سے کہیں زیادہ کامیاب اور دلچسپ ہو سکتا تھا اس کا انجام یقیناً چونکا دینے والا ہے اور مسئلے کا حل پیش کرتا ہے مگر خاص کردار ثانی زہرا جعفری اور ڈاکٹر سیف حیدر عابدی کے کرداروں میں ذرا جھول ہے۔ زہرا جعفری پاک دامن معصوم اور بھولی بھالی دوشیزہ ہے وہ بڑی آسانی سے ڈاکٹر سیف حیدر عابدی کے دامِ محبت میں پھنس جاتی ہے مگر کوکب صاحب کے از حد متین اور شریف ہونے کے باوجود ان سے اتنا خوف کھاتی ہے کہ کبھی ان کے رُو برو ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پاتی ہے بہت زیادہ قربت کے باوجود ان کے سامنے آتے ہی بوکھلا جاتی ہے یا تو بھاگتے میں دروازے سے ٹکرا جاتی ہے یا پھر کسی فرد سے الجھ جاتی ہے شروع سے آخر تک یہ بوکھلاہٹ برقرار رہتی ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے جبکہ ڈاکٹر عابدی سے وہ کھل جاتی ہے اور شرم و حیا نیز غیرت کی تمام حدود توڑ دیتی ہے بعد میں ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اتنا شریف آدمی نہیں جتنے کہ کوکب تھے۔

ڈاکٹر عابدی کو مصنفہ شروع سے آخر تک اچھا آدمی دکھاتی ہیں۔ وہ بچپن میں اپنی منگنی ہو جانے کے باوجود زہرا کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہیں اور زہرا یقین کر لیتی ہے جب نوبت شادی کی آتی ہے تو وہ اچانک ایک بہانہ کر کے شہر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ زہرا بےچینی سے ان کا انتظار کرتی ہے اسی اثنا میں کوکب اس سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتے ہیں تو وہ محض اس لیے انکار کر دیتی ہے کہ وہ ڈاکٹر عابدی سے شادی کرنے کا وعدہ کر چکی ہے اس پر کوکب اس کو حقیقت سے مطلع کرتے ہیں اور اس سے زیادہ زہرا کی سہیلی نیلما بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کی بچپن میں اپنی ایک رشتہ دار سے نسبت ہو چکی ہے۔ لڑکی امریکہ میں ہے اور وہ ڈاکٹر کو امریکہ میں بلانے پر بضد ہے جبکہ ڈاکٹر وطن نہیں چھوڑنا چاہتے تب زہرا کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ سمجھ پاتی ہے کہ ڈاکٹر نے محض دل بہلانے کے لیے اسے کھلونا بنایا تھا۔

مصنفہ کا شروع میں کچھ ایسا ارادہ تھا کہ وہ یہ بات واضح کریں گی کہ ڈاکٹر مضبوط ارادے اور نیک کردار کا آدمی نہیں ہے پر وہ یا تو یہ بات بھول گئیں یا پھر ارادہ بدل گیا اس سے ایک نقص پیدا ہو گیا جو صرف ذرا سی توجہ سے دُور ہو سکتا تھا۔

ناول کے صفحہ ۴۵ پر سطر ۱۳ میں نیلما کا کہنا "اچھا جی تو ڈاکٹر صاحب یہاں تک پہونچ گئے" بڑا معنیٰ خیز ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ڈاکٹر کی عاشق مزاجی کافی مشہور تھی اور وہ بہت دور تک ہاتھ مار چکے تھے۔ لیکن اس جملے کے بعد پھر مصنفہ نے پورے ناول میں کہیں ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے ڈاکٹر کے کردار پر آنچ آ سکے۔

زہرا کا ہمیشہ بوکھلانا اور اس میں کبھی چوک نہ ہونا ہکلی نہ ہونے کے باوجود صرف مَردوں کے سامنے ہکلا ہو جانا بھی کچھ عجیب سا ہے، اس کے علاوہ ناول کی ابتدا کی طرح انجام بھی روایتی ہی انداز میں ہے حالانکہ ذرا سی محنت سے اسے بہت خوبصورت بنایا جا سکتا تھا اور ندرت بھی پیدا کی جا سکتی تھی۔

کہانی کے لحاظ سے ناول خاصا دلچسپ ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

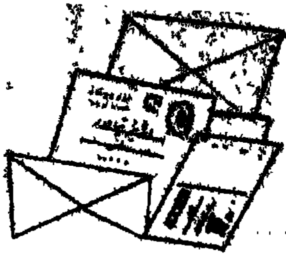
——— احمد ابراہیم علوی

ساخت شکن تنقید .... ص ۳۴ کا بقیہ

نہیں ہے تاہم چونکا دینے والا ضرور ہے۔

ژاک دیریدا کا ساخت شکن نظریہ اس گھنے جنگل کے مانند ہے جس میں کوئی راستہ پہلے سے متعین نہیں ہے۔ مسافر خود اپنا راستہ بنائے گا۔ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب وہ کہیں بھی جا سکتا ہے اس کو پوری تخلیقی آزادی ہے۔ رد تشکیل — یعنی (ڈی کانسٹرکشن) جنگل کے اندر سے جنگل کے پار اس کنوارے منطقے تک رسائی حاصل کرتا ہے جو ناموجود ہے — یہ کل معنویاتی اور کیفیاتی امکانات کی ممکنہ وسعت کی تلاش مدام تلاش ہے جو تخلیقیت آزما، تخلیقیت پرور اور تخلیقیت افروز ہوتی ہے۔

□□



آپ کے نام...

آپ کی ادارت میں نیا دور معنوی اور صوری اعتبار سے جو ترقی کر رہا ہے اسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ نو عمر کے بعد اس جریدہ پر بہار آئی ہے اور خدا کرے عرصۂ دراز تک برقرار رہے۔

——— (ڈاکٹر) صبیح الحسن
لکھنؤ

نیادور کا سال نو کی مبارکباد کے ساتھ گورنر شیخ علی حزیں اپنے دامن میں لیے ہوئے جنوری ۱۹۹۲ء کا شمارہ ملا

بہت مختصر عرصہ میں آپ نے نیادور کے پچھلے تقاضا شمارے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور اسی کے ساتھ اس کے معیار کو برقرار رکھا۔ اس لیے امید بندھ رہی ہے کہ آئندہ یہ رسالہ خوب سے خوب تر بنتا جائے گا اور یہی میری دعا بھی ہے

——— عبدالقوی دسنوی
بھوپال

نیادور (دسمبر ۱۹۹۱ء) موصول ہوا، اس سے قبل بھی چار شمارے ملے شکریہ۔ نیادور اُردو کی غیر معمولی خدمات انجام دے رہا ہے جس کے لیے ادارہ یقیناً سراہے جانے کے قابل ہے مضامین کی ترتیب، معیار، سرورق کی زیبائش قابل داد ہے ورق الٹتے ہی غزل پر نظر پڑی جو کاوش بہاری نور کی ہے۔ نور صاحب کے دو تین اشعار بہت زیادہ پسند آئے۔

ڈاکٹر عبدالحلیم پر عابد سہیل صاحب کا سوانحی مضمون نہایت اثر انگیز ہے۔ رام لعل کا افسانہ آنکھ مچی تو فاصلہ نہ رہا ہماری سیاست گزیدہ سوسائٹی کے درد انگیز پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے۔ تہہ داری رام لعل کے افسانوں کی پہچان ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل سے متعلق ڈاکٹر سید علی حیدر کا مضمون مفید اور کار آمد ہے۔

——— (ڈاکٹر) عبدالرؤف
کلکتہ

میں نیادور کا مطالعہ برابر کرتا ہوں واقعی نیادور اس دور میں جس انداز سے نکل رہا ہے اس کے لیے آپ یقیناً قابل مبارکباد ہیں اس کا معیار بلند سے بلند تر ہو رہا ہے۔
امید ہے نیادور پابندی سے ملتا رہے گا۔

——— محمد وسیم عالم
کانپور

نیادور پابندی سے مل رہا ہے۔ ایسے معیاری رسالے کے مطالعہ سے خوشی ہوتی ہے نومبر کے شمارے میں نیر مسعود صاحب کا مضمون اودھ کی تہذیبی تاریخ کی جھلکیاں بطور خاص پسند آیا۔ اس قسم کے مضامین کی بڑی ضرورت ہے۔
محمود ذکی صاحب نے بڑی محنت سے مولانا برکت اللہ بھوپالی تحریر فرمایا ہے۔ سید علی حیدر صاحب کے مضمون میں تشنگی محسوس ہوئی۔
رام لعل کا افسانہ بہت خوب ہے۔

——— اخلاق اثر
بھوپال

جنوری ۱۹۹۲ء کا نیادور موصول ہوا غزلیات کا حصہ اس بار جاندار ہے کمال لکھنوی، تبسم نقوی، رئیس انصاری، معراج صدیقی، قاسم نیئر نقوی اور حبیب الہ آبادی کی غزلیں قابل ذکر ہیں۔
ڈاکٹر گیان چند کا خود نوشت مضمون مختصر مگر مدلل ہے ذاتی طور پر میں اس سے بہت محظوظ ہوا۔ عصری سماج میں تشدد کا رجحان۔ فاطمہ بنت عبداللہ کی شان رسول" اور "شعور تیسرا اور ناصر کاظمی" نامی مضامین خاص طور پر پسند آئے۔ احسن شاہد اور سلمیٰ شاہین کی نظمیں معیاری اور افادی ہونے کے ساتھ ساتھ انداز دلربائی لیے ہوئے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ کو معیاری افسانے اشاعت کے لیے دستیاب نہیں ہو رہے ہیں۔

——— محمد ابراہیم صدیقی
الہ آباد

جلد ۴۷ | نمبر ۲

مئی ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون ۔۔۔۔ ۲۴۵۶۶۰

معاونین:
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون ۔۔۔۔ ۲۴۷۱۰۸

پبلشر
آشل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: ۔۔۔ تین روپے
زر سالانہ: ۔۔۔ تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری
[illegible]

عنوانات

نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے ہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہندستان کی جس تہذیبی امانت نے ہمیں ایک منفرد پہچان عطا کی اور غیر منقسم ہونے کا تصور بخشا اس کے فروغ کے لیے ہماری حکومت مسلسل کوشاں ہے۔ اس سلسلے میں مختلف اقدامات کیے گئے ہیں نیز آرٹ اور کلچر کے میدان میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرکے انھیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جارہی ہے۔

موجودہ حکومت نہ صرف فکری نقطۂ نظر سے منفرد کردار کی حامل ہے بلکہ اپنے طرزِ عمل اور کارکردگی کے اعتبار سے بھی منفرد ہے وہ انتظامیہ میں لائق، باصلاحیت اور ایمان دار افراد کی حوصلہ افزائی کرکے ایڈمنسٹریشن کو مکمل طور پر غیر جانبدار بنانے کے لیے کوشاں ہے۔

یکم مئی ہر سال دُنیا کے گوشہ گوشہ میں مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ہندستان میں بھی یہ دن بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ موجودہ حکومت مزدوروں کے حقوق کے لیے مسلسل کوشاں ہے اور اس سلسلے میں اس نے متعدد اقدامات بھی کیے ہیں تاکہ عرصہ دراز سے استحصال اور ناانصافی کے شکار مزدوروں کو استحصال اور ناانصافی سے نجات دلاکر انھیں بھی سماج میں باعزت مقام دلایا جاسکے۔

گزشتہ دنوں موجودہ سرکار نے اپنا پہلا بجٹ عوام کے سامنے پیش کیا جس کو ہر مکتب خیال کے افراد نے پسند کیا۔ برسوں کے بعد ایسا بجٹ سامنے آیا ہے جس میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا۔

موجودہ حکومت بہرحال عوام کو سہولتیں پہونچانے کے اپنے وعدے پر عمل پیرا ہے۔ حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عوام کا تعاون بھی ضروری ہے۔

——— ایڈیٹر

پروفیسر گوپی چند نارنگ
شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی ۔ دہلی

سوانحی کوائف

پیدائش: ۱۱ر فروری ۱۹۳۱ء
مقام پیدائش: ڈکی (بلوچستان)

تعلیم: ایم.اے اُردو (دلی کالج) پی.ایچ.ڈی (دہلی یونیورسٹی) آنرز ان پرشین (پنجاب یونیورسٹی)، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما لسانیات (دہلی یونیورسٹی)، سمعیات اور تشکیلی گرامر پر خصوصی کورس (انڈیانا یونیورسٹی) ۔

ملازمت اور علمی مشاغل: یونیورسٹی پروفیسر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی دہلی (جولائی ۱۹۸۶ء تاحال) ۔ یونیورسٹی پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ نئی دہلی ۔ (۱۹۷۴ء تا ۸۵ء)

قائم مقام وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ (جون جولائی ۱۹۸۱ء)
ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز جامعہ ملیہ اسلامیہ (۱۹۸۱ء-۸۲ء)
ڈائرکٹر اُردو خط وکتابت کورس، جامعہ ملیہ اسلامیہ (۱۹۷۵ء تاحال)
وزیٹنگ پروفیسر، وسکانسن یونیورسٹی میڈیسن (۱۹۶۸ء-۱۹۷۰ء)
وزیٹنگ پروفیسر، منی سوٹا یونیورسٹی مینا پلس (گرما ۱۹۶۹ء)
وزیٹنگ پروفیسر وسکانسن یونیورسٹی میڈیسن (۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۵ء)
ریڈر شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی (۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۴ء)
لیکچرر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء)
لیکچرر سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی (۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء)

۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران شکاگو یونیورسٹی، کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے، کولمبیا یونیورسٹی نیویارک، میکگل یونیورسٹی مانٹریال، مشی گن یونیورسٹی این آربر، نیز اورینٹل انسٹی ٹیوٹ پراگ چیکوسلاکیہ میں اردو زبان وادب کے مختلف موضوعات پر لیکچر دیئے۔

۱۹۶۷ء میں ۲۷ ویں بین الاقوامی مستشرقین کانگریس منعقدہ مشی گن یونیورسٹی میں حکومتِ ہند کے نمائندے کے طور پر شرکت کی اور مقالہ پیش کیا۔

۱۹۸۱ء میں حکومت ناروے اور ادبی انجمنوں کے مالی تعاون سے اوسلو ناروے کا علمی دورہ کیا اور اردو زبان وادب پر لیکچر دیئے۔

اپریل ۱۹۸۲ء میں انجمن سادات امروہہ پاکستان کی دعوت پر پاک وہند جوش ملیح آبادی سیمینار کراچی میں شرکت کی۔ نیز انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی، مہران رائٹرز گلڈ کراچی، پاکستان نیشنل سنٹر اسلام آباد، پاکستان فاؤنڈیشن لاہور، دائرہ اسلام آباد اور کئی دوسری ادبی انجمنوں اور اداروں کے زیراہتمام توسیعی خطبات پیش کئے اور لیکچر دیئے۔

اگست ۱۹۸۲ء میں سماجیات کی عالمی کانگرس منعقدہ میکسیکو میں شرکت کی اور سماجی لسانیات کے سیکشن میں مقالہ پیش کیا۔

ستمبر ۱۹۸۲ء میں انجمن اردو کینیڈا کی پہلی انٹرنیشنل اُردو کانفرنس منعقدہ ٹورنٹو یونیورسٹی میں شرکت کی اور مقالہ پیش کیا۔

ستمبر اکتوبر ۱۹۸۲ء میں مختلف یونیورسٹیوں کی دعوت پر واشنگٹن، کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے، لاس اینجلز، اری زونا یونیورسٹی توسان، ڈین ور یونیورسٹی بولڈر، منی سوٹا یونیورسٹی میناپلس، شکاگو یونیورسٹی، وسکانسن یونیورسٹی میڈیسن، کورنیل یونیورسٹی نیویارک، کولمبیا

یونیورسٹی نیویارک اور پنسلوینیا یونیورسٹی فلاڈیلفیا میں اُردو زبان وادب پر بارہ توسیعی خطبات پیش کیے۔

اگست ۱۹۹۱ء اور اگست ۱۹۹۲ء میں اُردو مرکز لندن کے زیرِ اہتمام اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں دو توسیعی خطبات پیش کیے۔

مئی ۱۹۸۴ء میں اہلِ سکھر کی دعوت پر پاکستان کا سفر کیا اور پاک وہند مشاعرے میں بطور مہمان خصوصی کے شرکت کی۔ نیز ہمایوں جیمخانہ سکھر، انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، غالب لائبریری کراچی، پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی، پاکستان نیشنل سنٹر لاہور، حلقہ اربابِ ذوق لاہور، دائرہ اسلام آباد اور حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد میں توسیعی خطبات پیش کیے اور جلسوں سے خطاب کیا۔

۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۱ء میں مختلف ادبی انجمنوں کی دعوت پر پاکستان کا سفر اور متعدد ادبی جلسوں، سیمناروں اور تقاریب میں مقالے پیش کیے اور لیکچر دیئے۔

کتابیں

۱۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ۱۹۶۱ء
۲۔ کرخنداری اردو کا لسانیاتی مطالعہ (انگریزی) ۱۹۶۱ء
۳۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۴ء
۴۔ ریڈنگز اِن اردو پروز (انگریزی، اردو) ۱۹۶۷ء ۱۹۶۸ء
۵۔ منشوراتِ کیفی (ترتیب و مقدمہ) ۱۹۶۸ء
۶۔ آثارِ محروم (مرتبہ) ۱۹۶۹ء
۷۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (باشتراک) ۱۹۷۰ء
۸۔ ارمغانِ مالک جلد اول و دوم (مرتبہ) ۱۹۷۲ء
۹۔ املا نامہ (سفارشات املا کمیٹی ترقی اردو بورڈ) مرتبہ ۱۹۷۴ء۔ ۱۹۹۰ء
۱۰۔ پُرانوں کی کہانیاں (برائے نیشنل بک ٹرسٹ) ۱۹۷۶ء
۱۱۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں (مرتبہ) ۱۹۷۹ء
۱۲۔ وضاحتی کتابیات ۱۹۷۶ء جلد اول (باشتراک) ۱۹۸۰ء
۱۳۔ اُردو افسانہ: روایت اور مسائل (مرتبہ) ۱۹۸۱ء۔ ۱۹۸۸ء
۱۴۔ انیس شناسی (مرتبہ) ۱۹۸۱ء
۱۵۔ انڈین پوئٹری ٹوڈے (جلد چہارم) جدید اُردو شاعری: برائے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز ۱۹۸۱ء
۱۶۔ سفر آشنا ۱۹۸۲ء
۱۷۔ اقبال کا فن (مرتبہ) ۱۹۸۳ء
۱۸۔ نئی کرن (برائے این سی ای آر ٹی باشتراک) ۱۹۸۳ء
۱۹۔ نئی روشنی (" " " " ") ۱۹۸۳ء
۲۰۔ پڑھو اور بڑھو (" " " " ") ۱۹۸۳ء
۲۱۔ وضاحتی کتابیات (جلد دوم) ۱۹۷۷ء۔ ۱۹۷۸ء (باشتراک) ۱۹۸۴ء
۲۲۔ لغت نویسی کے مسائل (مرتبہ) ۱۹۸۵ء
۲۳۔ اسلوبیاتِ میر ۱۹۸۵ء
۲۴۔ اُردو کی نئی کتاب (درجہ ۱۱) باشتراک ۱۹۸۶ء
۲۵۔ " " " (درجہ ۱۲) " ۱۹۸۹ء
۲۶۔ سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ ۱۹۸۶ء۔ ۱۹۹۰ء
۲۷۔ انتظار حسین اور ان کے افسانے (مرتبہ) ۱۹۸۶ء
۲۸۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام ۱۹۸۷ء۔ ۱۹۹۰ء
۲۹۔ نیا اُردو افسانہ: تجزیے و مباحث (مرتبہ) ۱۹۸۸ء
۳۰۔ اُردو کی نئی کتاب (درجہ ۱۰) ۱۹۸۸ء
۳۱۔ اُردو کی نئی کتاب (پہلے درجہ کیلئے) ۱۹۸۹ء
۳۲۔ " " (پانچویں درجہ کیلئے) باشتراک ۱۹۹۰ء
۳۳۔ راجندر سنگھ بیدی (انگریزی انتھالوجی برائے ساہتیہ اکادمی) ۱۹۸۸ء
۳۴۔ کرشن چندر (" " " " ") ۱۹۹۰ء
۳۵۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات ۱۹۹۱ء
۳۶۔ اُردو لینگویج اینڈ لٹریچر (انگریزی) ۱۹۹۱ء
۳۷۔ اُردو کی نئی کتاب (درجہ ۵، باشتراک) زیرِ طبع
۳۸۔ ڈائرکٹری اُردو شعراء اور مصنفین (باشتراک) "
۳۹۔ ادبی تنقید اور ساختیات "
۴۰۔ بلونت سنگھ (انگریزی انتھالوجی برائے ساہتیہ اکادمی) "
۴۱۔ اردو زبان و لسانیات (ترقی اُردو بیورو) "

انعامات واعزازات

صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے پدم شری ۱۹۹۰ء

صدر پاکستان کی جانب سے اقبال صدی طلائی تمغۂ امتیاز ۱۹۷۷ء

غالب ایوارڈ حکومت اتر پردیش ۱۹۷۳ء

کامن ویلتھ فیلوشپ برائے لندن یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

اُردو اکادمی اتر پردیش انعام ۱۹۷۲ء

میر ایوارڈ میر اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۷ء

نیشنل ایوارڈ (قومی کونسل برائے تعلیمات) ۱۹۷۸ء

بہار اُردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۷۹ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی واشنگٹن خصوصی ایوارڈ ۱۹۸۲ء

ایسوسی ایشن ایشین اسٹڈیز جنرل وینیا خصوصی ایوارڈ ۱۹۸۲ء

خصوصی ایوارڈ بہار اُردو اکادمی ۱۹۸۳ء

ساہتیہ کلا پریشد دہلی ایوارڈ ۱۹۸۴ء

غالب انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ ۱۹۸۵ء

ہندی اُردو ساہتیہ ایوارڈ ۱۹۸۵ء

دہلی اُردو اکادمی ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید ۱۹۹۱ء

سیمینار اور کانفرنسیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مندرجہ ذیل سیمینار منعقد کرائے:

۱. جدید اُردو ادب میں زبان کا تخلیقی استعمال، کل ہند سیمینار ۱۹۷۵ء

۲. ہند و پاک انیس صدی سیمینار ۱۹۷۶ء

۳. کل ہند اقبال صدی سیمینار ۱۹۷۷ء

۴. لغت نویسی کے مسائل کل ہند سیمینار ۱۹۷۸ء

۵. ڈاکٹر عابد حسین کی ادبی و قومی خدمات، کل ہند سیمینار ۱۹۸۰ء

۶. ہند و پاک اُردو افسانہ سیمینار ۱۹۸۰ء

۷. ہند و پاک میر تقی میر سیمینار ۱۹۸۵ء

۸. نیا اُردو افسانہ سیمینار (اُردو اکادمی) ۱۹۸۵ء

دیگر کوائف

رکن مجلس منتظمہ اور کنوینر اُردو ایڈوائزری بورڈ، ساہتیہ اکادمی (۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۲ء)

رکن مجلس منتظمہ و رکن مجلس عام، انجمن ترقی اُردو ہند (۱۹۶۵ء تا ۱۹۹۰ء)

کنوینر اُردو ایڈوائزری کمیٹی، بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ (۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۶ء)

چیئرمین اُردو کمیٹی قومی کونسل برائے تعلیمات۔ حکومت ہند (۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۰ء)

چیئرمین ایوارڈ کمیٹی، دہلی اُردو اکادمی (۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۶ء)

سکریٹری مرکزی انیس کمیٹی

سکریٹری خواجہ غلام السیدین ٹرسٹ

لائف ممبر، انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر

رکن مشاورتی کمیٹی، دہلی ٹیلی ویژن

رکن مشاورتی کمیٹی اُردو نشریات آل انڈیا ریڈیو

رکن ترقی اُردو بورڈ، حکومت ہند (۱۹۷۹ء - ۱۹۸۱ء)

رکن پینل برائے ادبیات و لسانیات۔ ترقی اُردو بورڈ (۱۹۷۱ء - ۱۹۸۱ء)

رکن اصطلاحات سازی کمیٹی برائے لسانیات، ترقی اُردو بورڈ (۱۹۷۴ء - ۱۹۸۱ء)

مشیر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا (۱۹۷۴ء - ۱۹۸۳ء)

ڈائرکٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (۱۹۷۶ء - ۱۹۷۸ء)

رکن اکیڈمک کونسل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۱۹۷۵ء - ۱۹۷۷ء)

رکن اتر پردیش اُردو اکیڈمی

رکن عاملہ، جامعہ اُردو، علی گڑھ

رکن ٹیلی ویژن سیریل کمیٹی دہلی دوردرشن (۱۹۹۰ء - ۱۹۹۱ء)

رکن انتظامیہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ (۱۹۸۹ء - ۱۹۹۱ء)

رکن مجلس علمیہ، ابو الکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد (۱۹۸۹ء)

□□

پنچھی جھیل اور کشتی کی کہانی

تنہائی ایک پرندہ ہے
جو چپکے سے آ جاتا ہے
آنسو کے دانے کھاتا ہے
ہر شاخ پہ پر پھیلاتا ہے

اس گہری جھیل کے پانی میں
کچھ لہریں اٹھتی رہتی ہیں
کچھ باتیں پلتی رہتی ہیں
آوازیں اُٹھتی رہتی ہیں

اس پنچھی کے چوڑے بازو
کیا گہرا سایا دیتے ہیں
ہر پل کو اندھا کرتے ہیں
آنکھوں سے لفظ چُراتے ہیں

اس گہری جھیل کے سینے پر
وہ پنچھی لوٹ مچاتا ہے
دُکھ درد کی لہر بہاتا ہے
ہر آن لہو رُلواتا ہے

تنہائی ایسا پنچھی ہے
نوکیلے پنجے رکھتا ہے
گہرے سوراخ بناتا ہے
دل بے دردی سے کھاتا ہے

اک کشتی چہرے جیسی ہے
جو جھیل کے زخمی پانی پر
کرتی ہے ڈوبے دل سے سفر
رکھ دیتی ہے دستِ چارہ گر

دل گہری جھیل ہے، پانی پر
کچھ عکس چمکتے رہتے ہیں
کچھ چاند مچلتے رہتے ہیں
کچھ سورج جلتے رہتے ہیں

پھر جانے کیا ہو جاتا ہے
وہ کشتی اوجھل ہوتی ہے
پانی میں ہلچل ہوتی ہے
پھر جھیل مسلسل روتی ہے

اب سارا قصہ ختم ہوا
کشتی کو اوجھل ہونا تھا
پنچھی کو حائل رہنا تھا
پانی کو گھائل جینا تھا

انیس انصاری
(آئی۔اے۔ایس) —— فلیٹ ۱۲/۲۔ ٹائپ VI ڈالی باغ کالونی۔ لکھنؤ

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اُردو ۔ گورکھ پور یونیورسٹی ۔ گورکھپور

قاضی عبدالستّار سے ایک گفتگو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے پروفیسر اور اُردو کے نامور ادیب، شہرۂ آفاق ناول نگار و افسانہ نگار قاضی عبدالستار صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے اُردو تنقید و تحقیق کو "اردو شاعری میں قنوطیت" اور "ہندوستانی جمالیات" جیسی تصنیفات عطا کی ہیں۔ ان کے ناول "پہلا اور آخری خط"۔ "شب گزیدہ" "صلاح الدین ایوبی"۔ "داراشکوہ" اور "غالب" لافانی شاہکاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ناولٹوں کا مجموعہ "غبارِ شب" اور افسانوں کا مجموعہ "پیتل کا گھنٹہ" تمام ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ قاضی صاحب کی عظیم ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومتِ ہند ۱۹۷۴ء میں "پدم شری" کے قومی اعزاز سے نواز چکی ہے۔

اختر بستوی: قاضی صاحب! اس وقت میں آپ سے کچھ ایسی گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس سے آپ کے فن کے گوشے اُجاگر ہو سکیں ۔۔ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کی اجازت ہے۔؟

قاضی عبدالستّار: بصد شوق

اختر بستوی: قاضی صاحب! میرا خیال ہے ۔۔ اور صرف میرا ہی خیال نہیں بلکہ اُردو ادب سے تعلق رکھنے والے بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کی اصل ادبی عظمت و شہرت آپ کے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے ہے اور تنقید و تحقیق کے میدان میں آپ کے جو کام ہیں وہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا خود آپ کی بھی یہی رائے ہے؟ یا آپ اپنے تنقیدی اور تحقیقی کاموں کو اپنے ناولوں اور افسانوں سے زیادہ وقیع سمجھتے ہیں۔؟

قاضی عبدالستّار: نہیں، یہ جو آپ نے فرمایا ہے میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں افسانے سے زیادہ ناول سے اپنی شناخت چاہتا ہوں اور تنقیدی مضامین یا تنقیدی کتابیں جو ہیں، ضرورت تھی ان کی، پی۔ ایچ۔ ڈی مجھے کرنا تھی، یا ایک مسئلہ ایسا درپیش تھا کہ مجھے کتاب لکھنی پڑی تنقید کو میں اپنا کوئی کارنامہ وغیرہ نہیں سمجھتا۔ کارنامہ تو میں کسی چیز کو نہیں سمجھتا.....

اختر بستوی: نہیں صاحب! فکشن میں جو آپ کے کام ہیں وہ کارنامے ہی ہیں ۔۔۔ بہرحال آپ نے جو ناول لکھے ہیں انھیں وسیع طور پر دو زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک زمرہ تو "پہلا اور آخری خط" اور "شب گزیدہ" جیسے ناولوں کا ہے جنھیں سماجی ناول کہا جا سکتا ہے اور دوسرا زمرہ تاریخی ناولوں کا ہے جس میں "صلاح الدین ایوبی" اور "داراشکوہ" جیسے ناول آتے ہیں، اور جس میں ایک اعتبار سے آپ کے تازہ ترین ناول "غالب" کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔ آپ کے سارے سماجی ناولوں کا اور ان کے ساتھ ساتھ آپ کے بیشتر افسانوں کا بھی جو پس منظر ہے وہ جاگیردارانہ تہذیب، جاگیردارانہ ماحول

اور فضا کا ہے۔ کیا اس ماحول اور فضا کو آپ نے پس منظر کے طور پر اس لیے اپنایا کہ آپ خود اسی ماحول اور فضا میں پلے بڑھے ہیں اور اس سے اچھی طرح واقف ہیں؟ یا اس کا سبب یہ ہے کہ جاگیردارانہ ماحول اور فضا آپ کو ذاتی طور پر پسند ہے۔ یا کوئی اور وجہ ہے؟

قاضی عبدالستار: یہ الزام مجھ پر بہت پرانا ہے کہ چونکہ میں ایک ایسی فضا میں پیدا ہوا اس لئے میں نے "پہلا اور آخری خط" یا "شب گزیدہ" جیسے ناول لکھے۔ تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں پیدا نہیں ہوا، میں غالب کے زمانے میں نہیں پیدا ہوا، میں دارا شکوہ کے زمانے میں نہیں پیدا ہوا یا اب جو چوتھا ناول ہے، تاریخی ناول، خالد بن ولید کے زمانے میں نہیں پیدا ہوا لیکن میں نے انھیں لکھا ــ اصل میں واقعہ یہ ہے جناب والا! کہ میں تہذیب کا عکاس ہوں اور تہذیب کی شکست و ریخت کا جو تماشہ میں دکھلانا چاہتا ہوں وہ اس تہذیب کی پیش کش کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ "شب گزیدہ" کے کیریکٹرز چاہے سچ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر وہ سچ نہ ہوتے تو میں گڑھ لیتا۔ میں CREATE کرلیتا ــــــ "شب گزیدہ" میں بھی اور "پہلا اور آخری خط" میں ــــ اور "مجو بھیا" میں اور "بادل" میں اور "غبارِ شب" میں، میں ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں نہیں بلکہ گزرتی ہوئی چھاؤں کی پیش کش کرنا چاہتا تھا۔

اختر بستوی: قاضی صاحب! آپ نے ایسے ناولوں اور افسانوں میں جو جاگیردارانہ ماحول پیش کیا ہے اس کی پیشکش میں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ آپ اسے GLORIFY کرنا چاہتے ہیں یعنی اس کو ایک خوش نما اور قابلِ قدر چیز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں اور کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو اس ماحول سے کچھ IRRITATOIN سا ہے اور اسے ایک قابلِ نفرین ماحول کے روپ میں پیش کرنا آپ کا مدعا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جاگیردارانہ ماحول کے متعلق آپ کے ان دونوں رویوں میں سے کون سا رویّہ وہ ہے جسے آپ کا اصل رویّہ سمجھا جائے؟

قاضی عبدالستار: اختر بستوی صاحب! مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے یہ سوال کیا۔ جو پیشہ ور نقاد ہیں انھوں نے آج تک کبھی یہ سوال نہیں کیا۔ ویسے انٹرویو تو میرے تقریباً ڈیڑھ درجن ہوئے ہندستان پاکستان میں، لیکن یہ سوال کسی نے نہیں اٹھایا۔ آپ نے بہت POINTED سوال کیا ہے۔ اصل میں اسی سوال ہی میں میرا جواب پوشیدہ ہے۔ ہر تہذیب کہیں قدروں کی نفی کرتی ہے اور کہیں انھیں چمک دیتی ہے، عظمت دیتی ہے، اور میں ایک ظالم حقیقت نگار ہونے کی کوشش کرتا ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس میں چمک دمک جو واقعی ہے اس کی اگر میں نفی کروں تو حقیقت نگاری سے بعید ہے اور اس میں جو ناسور ہے ہیں، جو زخم ہیں، جو خامیاں ہیں، اگر ان کو میں GLORIFY کردوں یا ان کو نظر انداز کروں تو بھی وہ حقیقت نگاری نہیں ہوگی۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں جس تہذیب کو پیش کررہا ہوں اس کی پیش کش سچی ہو۔ اس میں دونوں باتیں آئیں گی، تو یہ جو سوال ہے آپ کا اس میں جواب موجود ہے۔

اختر بستوی: اب میں آپ کے تاریخی ناولوں کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ اردو میں تاریخی ناول نگاری کی صورتِ حال یہ رہی ہے کہ جن لوگوں نے تاریخی ناول لکھے ہیں اور جو تاریخی ناول لکھے گئے ہیں، ان کو کوئی خاص ادبی اہمیت نہیں دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال امید افزا نہیں کہی جا سکتی۔ آپ نے اس غیر حوصلہ افزا صورتِ حال میں تاریخی ناول لکھنے کی طرف توجہ کیوں کی؟ وہ کون سے اسباب و عوامل تھے جنھوں نے آپ کو تاریخی ناول

لکھنے کی ترغیب دی؟

قاضی عبدالستار: اختر صاحب! یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ لیکن جواب میں آپ کو دوں گا۔ اصل میں ہوا یہ کہ میں نے جو اردو کے تاریخی ناول پڑھے تو مجھے یہ احساس ہوا کہ تاریخ کے ساتھ ان ناول نگاروں نے انصاف نہیں کیا ــــ اس کے بعد جب میں نے یورپین تاریخی ناول پڑھے تو مجھے محسوس ہوا کہ انھوں نے تاریخ کے ساتھ بھی انصاف کیا اور ناول کے ساتھ بھی انصاف کیا.....

اختر بستوی: قطع کلام ہوتا ہے قاضی صاحب ــــ تو شاید یہی وجہ ہوگی کہ تاریخی ناول نگاری کو ہمارے یہاں بہت زیادہ ادبی اہمیت نہیں دی گئی۔

قاضی عبدالستار: جی ہاں! ــــ تو میں نے چاہا کہ میرے ناول یورپین تاریخی ناولوں کی صف میں رکھے جائیں اسی کی میں کوشش کروں، کامیابی یا ناکامی میرے اختیار میں نہیں تھی مجھے خوشی ہے کہ اردو کی ایک بہت ابرو ناول کی نقاد ممتاز شیریں نے اور پروفیسر احسن فاروقی نے مجھے یہ سرٹیفکیٹ دیا۔ آج سے بارہ سال پہلے کہ میرے تاریخی ناول عالمی تاریخی ناولوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔

یہ انھوں نے میری محبت میں یا.....

اختر بستوی، تو گویا آپ تاریخی ناول نگاری کی طرف اس لیے راغب ہوئے کہ آپ نے محسوس کیا کہ ہمارے یہاں اس کا معیار پست ہے اور آپ اسے عالمی معیار کا بنانا چاہتے تھے۔

قاضی عبدالستار:۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ــــ دیکھیے تاریخی ناول لکھنا جھگڑے کا کام ہے ــــ ناول لکھنا ہی جھگڑے کا کام ہے ــــ تاریخی ناول جب آپ لکھنا چاہتے ہیں تو پورے ایک عصر کی زندگی کو دوبارہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس پورے عصر کی زندگی کو آپ اپنی ہتھیلی پر دیکھ سکنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ کسی زمانے کی زندگی کا وہ انتخاب جو آپ ناول میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک ایک سطر کے لئے آپ تاریخ کی عدالت میں جواب دہ ہیں۔ اس کے لئے آپ کو بہت زیادہ مطالعہ کرنا پڑے گا۔ میرے پاس تقریباً چھ سو صفحے میں صلاح الدین ایوبی پر نوٹس (NOTES) ہیں۔ میرے پاس تقریباً سات سو صفحے میں داراشکوہ پر نوٹس (NOTES) ہیں۔ ناول دو ڈھائی سو صفحے کا ہے۔ میں نے محنت کی ہے ــــ

اختر بستوی: یعنی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، پھر اسے تخلیق بنانے کی کوشش کی ہے....

قاضی عبدالستار: "....اس لئے کہ میں چاہتا تھا کہ میرا پڑھنے والا اس عہد کا پورا PROJECTION محسوس کر سکے میرے صفحات پر۔ اب میں اس میں کامیاب ہوا یا نہیں یہ تو وقت بتائے گا۔

اختر بستوی: آپ نے اپنے ایک تاریخی ناول کے مرکزی کردار کے لیے صلاح الدین ایوبی کا انتخاب کیا اور دوسرے کے لیے داراشکوہ کا۔ یہ دونوں ہی شخصیتیں بلاشبہ تاریخ کی عظیم شخصیتیں ہیں۔ لیکن یہ دونوں مزاج کے اعتبار سے علمی اور نظریات کے لحاظ سے بھی، بظاہر ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ کیا ان دونوں شخصیتوں میں آپ کو کوئی قدر مشترک نظر آئی جو وجہ پسندیدگی اور وجہ انتخاب بنی۔؟

قاضی عبدالستار، پھر آپ نے بڑا ٹیڑھا سوال کیا ہے۔ لیکن جواب میں دوں گا آپ کو۔

اختر بستوی، بہت بہت شکریہ!

قاضی عبدالستار: یہ مسئلہ اصل میں اس کا ہوتا ہے کہ آپ کس زمانے میں کیا پڑھ رہے ہیں۔ اس میں کون سی STRIKING شخصیت ایسی ہے جو آپ کو متاثر اور مرعوب کرتی ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں میں اسلامی تاریخ پڑھ رہا تھا تو مجھے صلاح الدین ایوبی کا کیریکٹر بہت عجیب و غریب محسوس ہوا۔ کتنے چھوٹے سے دائرے سے نکل کر اس نے عالمی تاریخ میں اپنی حیثیت منوالی، اور جو کچھ وہ کرتا تھا یا جو کچھ اس کے زمانے

میں تھا اس کی بہت سی چیزیں برعکس اس کے مجھے اس
زمانے میں نظر آتی تھیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے جب
"صلاح الدین ایوبی" پڑھی تو مجھ سے ایک بھری محفل میں
سوال کیا کہ آپ نے اس میں جو زبان کا مسئلہ پیش کیا ہے
کیا اس کا کوئی Relevance ہندستان سے ہے؟
آج سے ہے؟ تو میں نے کہا کہ حضور والا! میں تاریخی
ناول میں کوئی چیز ایسی لکھتا ہی نہیں جس کا اس زمانے
سے Relevance نہ ہو۔ بہت سی چیزیں میں
Bluntly نہیں کہہ سکتا میں ان کو تاریخ کے
حوالے سے کہتا ہوں دارا شکوہ کی بہت سی باتیں مجھے
پسند ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہیرو تہذیب کے اس عظیم الشان
سرمایہ کے ساتھ آج کی تاریخ انصاف کرے۔ لیکن
وہ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے میں اس کا پروجکشن
(Projection) دے کر گزارش کرتا ہوں کہ آپ
اس سے انصاف کیجئے۔

اختر بستوی: یہ ایک نیا گوشہ آپ کے تاریخی ناولوں کا سامنے آیا۔
آپ نے ایک تو، اردو کے تاریخی ناولوں کے معیار
کو بلند کرنے کے لیے "تاریخی ناول لکھے" دوسرے آپ نے
ایسے کرداروں کا انتخاب ان کے مرکزی کرداروں کے طور
پر کیا جن میں آپ کو کوئی بہت بڑی خصوصیت نظر آئی۔
اور جنھوں نے آپ کو "بقول آپ کے" مرعوب کیا۔ اس کے
ساتھ ہی ساتھ آپ نے اس کا خیال رکھا کہ وہ ہمارے
دور کے ساتھ کتنا R.elevance رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: جی ہاں!

اختر بستوی: قاضی صاحب! آپ کا اسلوب نگارش آپ کے ہر
ناول اور افسانے میں کچھ مختلف سا لگتا ہے۔ اس کا
اعتراف خود آپ نے بھی ابھی حال میں ہی اپنے تازہ
ترین ناول "غالب" کے مقدمے میں کیا ہے جو اس
ناول میں "گزارش احوال واقعی" کے عنوان سے شامل ہے
اس میں آپ نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنے تمام ناولوں میں
ان کے موضوعات کے مطابق اسلوب نگارش کی تخلیق
کی کوشش کی ہے"۔ تو کیا آپ کے خیال میں ناول نگاروں
یا افسانہ نگاروں کا اپنا ایک مخصوص اور منفرد اسلوب نگارش
نہیں ہونا چاہئے۔؟

قاضی عبدالستار: آپ نے جو یہ سوال کیا ہے، یہ ذرا دوسرے طریقے
سے ہو گیا ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ دنیا
کا کوئی بڑا ادیب ایسا نہیں ہوا جو صاحب طرز نہ ہو۔ اور
سب سے ... سے آج تک کوئی اردو ادیب ایسا نہیں ہوا
جس نے دو styles میں لکھا ہو۔ میں یہ چاہتا ہوں
کہ جب میں مروں تو میرا نقاد یہ کہے کہ ایک ایسا شخص مرا جو
کئی اسٹائل میں لکھنے کی قدرت رکھتا تھا۔ یہ میرا خواب ہے
اس لئے میں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ "صلاح الدین
ایوبی" کی زبان "دارا شکوہ" کی زبان "غالب" کی زبان اور
"خالد بن ولید" کی زبان۔ ان چاروں ناولوں کی زبانوں میں
فرق پیدا کروں۔

اختر بستوی: قاضی صاحب! یہ تو آپ کی ایک ایسی کوشش تھی جو
شعوری طور پر اپنے لیے تھی لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں
کہ کیا آپ اصولاً یہ سمجھتے ہیں کہ فکشن لکھنے والوں کا،
یعنی ناول اور افسانے لکھنے والوں کا کوئی اپنا ایک مخصوص
منفرد اسٹائل نہیں ہونا چاہیے۔

قاضی عبدالستار: ضرور ہونا چاہیے۔ اگر اس میں صلاحیت ہو
اگر وہ شناخت پیدا کر سکتا ہے تو ضرور کرے۔ جیسے
قرۃ العین حیدر۔ قرۃ العین حیدر کا اپنا اسٹائل ہے
جمیلہ ہاشمی کا اپنا اسٹائل ہے۔ شوکت صدیقی کا اپنا
اسٹائل ہے۔ ممتاز مفتی کا اپنا اسٹائل ہے۔ لیکن
فرق یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر تک اپنے ایک ہی اسٹائل
میں چار ناول لکھتی ہیں۔ مجھ میں اور ان میں فرق یہ ہے
کہ میں چار ناولوں کے لیے الگ اسٹائل لاتا ہوں۔

معاف کیجیے گا ـــ اسے خودستائی نہ سمجھیے گا ـــ دیکھیے۔ میرا انٹرویو لینے والا جب مجھ سے پوچھے گا کہ تمہاری Qualifications کیا ہیں تو میں ضرور کہوں گا کہ جناب میں لکھنؤ یونیورسٹی کا ٹاپر ہوں بی۔ اے آنرز میں بھی اور ایم۔ اے میں بھی، اور پی ایچ۔ ڈی میں نے کیا ہے، اور ڈی۔ لٹ جب چاہوں کر سکتا ہوں ـــ تو اس کو خودستائی مت سمجھیے گا۔

اختر بستوی: نہیں صاحب! یہ خودستائی نہیں بلکہ یہ تو ایک طرح کی تشریح ہے۔

قاضی عبدالستار: نہیں۔ میں بڑی انکساری اور بڑی خاکساری کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں آپ مجھے اس کا ....

اختر بستوی: قاضی صاحب! آپ نے جتنے ناول اور افسانے لکھے ہیں وہ سب ادبی اعتبار سے بلاشبہ انتہائی قابل قدر ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا لیکن ایک بات میں نے محسوس کی ہے کہ آپ نے اپنے کسی بھی ناول یا کسی بھی افسانے میں تکنیک کا کوئی نیا تجربہ نہیں کیا۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ آپ ناولوں اور افسانوں میں تکنیک کے نئے تجربوں کی افادیت کے قائل نہیں ہیں۔؟

قاضی عبدالستار: اقبال نے کوئی تجربہ نہیں کیا تکنیک میں۔ غالب نے کوئی تجربہ نہیں کیا۔ میر نے کوئی تجربہ نہیں کیا۔ انیس نے کوئی تجربہ نہیں کیا۔ تکنیک میں تجربے چھٹ بھیے کرتے ہیں۔ وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا، جن کو اپنے قلم کی طاقت پر، صلاحیت پر بھروسہ نہیں ہوتا، جو صرف تکنیک کی کرتب بازیوں سے ادبی تاریخ کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کسی حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں ......

اختر بستوی: تو گویا آپ کی نظر تکنیک کے تجربوں سے زیادہ ادب کی عظمت پر رہی۔؟

قاضی عبدالستار: میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ جو کچھ جس طرح بہتر سے بہتر کہہ سکتا ہوں، وہ میں کہوں۔ دو ایک جگہ میں نے کوشش کی ہے بعض افسانوں یا ناولوں میں بھی کہ Flash back کی تکنیک یا Stream of consciousness کی تکنیک سے کام لوں۔ میں نے سمجھا کہ یہاں بہت سے صفحات لکھنے کے بجائے میں Stream of Consciousness کی تکنیک کے ذریعے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ سکتا ہوں۔

اختر بستوی: ابھی آپ کے تازہ ترین ناول "غالب" میں بھی Flash back کی تکنیک ہے۔

قاضی عبدالستار: جی ہاں ملے گی آپ کو۔ "صلاح الدین ایوبی" میں بھی ملے گی آپ کو۔ "دارا شکوہ" میں بھی ملے گی آپ کو وہ ضروری ہے۔ اس کا سبب ہے اختصار ـ دُنیا کے جو عظیم نقاد ہیں ناول کے ـ بلکہ فکشن کے نقاد ـ ان کا کہنا ہے کہ بڑا ناول وہ ہے جو اگر تین سو صفحے کا ہے تو تین صفحے اس ناول سے نکالے نہ جا سکیں یعنی اگر تین صفحے نکال دیئے جائیں تو کہانی ٹوٹ جائے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ میں ڈھائی سو صفحے کا ناول لکھوں تو آپ میرے ڈھائی صفحے نہ نکال سکیں۔ اگر آپ نکالیں گے تو کہانی ٹوٹ جائے گی۔

اختر بستوی: اور اب آخر میں قاضی صاحب، میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ آجکل فکشن میں کیا کچھ لکھ رہے ہیں اور کیا لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: میں جناب والا ....

اختر بستوی: اس سوال کو تھوڑا اور واضح کر دوں۔ خالد بن ولید کے متعلق آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ "تہذیب الاخلاق" میں بالقسط شائع ہو رہا ہے۔ آپ کچھ اس پر روشنی ڈالیں کہ وہ مکمل ہونے کے بعد کس قسم کی چیز ہوگی، کیونکہ ابھی وہ مجموعی طور پر ہمارے سامنے نہیں آئی ہے۔

(باقی ص ۲۷ پر)

قسمت میں اپنی موجِ شرر بار ہی سہی
سایہ نہیں تو دھوپ کا آزار ہی سہی

کچھ تو علاجِ آبلہ پائی ضرور ہے
قسمت میں گل نہیں تو نہ ہوں خار ہی سہی

حاصل کبھی تو رفعتِ کردار ہو ہمیں
کچھ تو ملے عروجِ سرِ دار ہی سہی

راہِ وفا کی کوئی نشانی تو چاہیے
تلوے وفورِ زخم سے گلنار ہی سہی

راہِ وفا سے ہٹ نہ سکیں گے ہم اہلِ حق
گردن پہ اپنی وقت کی تلوار ہی سہی

ہے دل کو دل سے راہ تو کوئی نہیں ہے غیر
حائل ہماری راہ میں دیوار ہی سہی

کچھ تو نشاطِ کج کلہی بھی ضرور ہے
دل میں سرورِ بادۂ پندار ہی سہی

مہر و وفا کے بندوں کو مہر و وفا سے کام
شارق زمانہ بر سرِ پیکار ہی سہی

محمد مشتاق شارق
۵۹ - کوٹلہ
میرٹھ

لکھنے والے نے بھی کیا کیا لکھ دیا
اس کو شبنم مجھ کو شعلہ لکھ دیا

دن کی پیشانی پہ لکھ کر سرکشی
رات کے ماتھے پہ سجدہ لکھ دیا

غور سے دیکھو کہ وہ شہتیر ہے
رو میں جس کو تم نے تنکا لکھ دیا

اس کی بذلہ سنجیاں تو دیکھئے
جس نے جگنو کو پتنگا لکھ دیا

خشک ہونٹوں پر مچلتی پیاس نے
قطرۂ دریا کو دریا لکھ دیا

یہ مصور کا ہنر بھی خوب ہے
آئینے کے رخ پہ چہرا لکھ دیا

پتھروں کا بھی ہے صورت گر وہی
جس نے دل کو آبگینہ لکھ دیا

جب قلم نے کی وفاداری نذیر
ماجرا ہم نے بھی دل کا لکھ دیا

نذیر فتحپوری
مدیر اسباق، اپّا ینتا پارک
ایروڈ۔ پونہ

حکیم محمد حسین خاں شفا
رضا لائبریری، رامپور

مولانا شوکت علی — حیات اور نگارشات

تحریک آزادی کے قائدین میں علی برادران کا نام بہت ممتاز ہے اس سے مراد مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی ہیں۔ دونوں کی پیدائش رامپور میں ہوئی۔ ان کا خاندان شیخوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ ان کے دادا علی بخش خاں (م ۱۸۶۷ء) نواب محمد سعید خاں (م ۱۸۵۵ء) کے عہد حکومت میں لگ بھگ ۱۸۴۲ء میں رامپور آئے اور اپنی ذاتی صلاحیت سے جلد ہی نوابین رام پور کے معتمد خاص ہوگئے۔ علی بخش خاں کے ایک لڑکے عبدالعلی خاں (م ۱۸۸۰ء) تھے۔ ان کی شادی امروہہ کے ایک معزز خاندان کی خاتون آبادی بیگم سے ہوئی تھی جو تاریخ میں بی اماں کے نام سے مشہور ہیں آبادی بیگم کے پانچ لڑکے ہوئے — بندے علی۔ ذوالفقار علی۔ شوکت علی۔ نوازش علی اور محمد علی — تاریخ میں غیر معمولی شہرت محمد علی اور شوکت علی کو حاصل ہوئی۔

شوکت علی محمد علی سے عمر میں پونے چھ سال بڑے تھے اور محمد علی کے سرپرست و مربی تھے۔ شوکت علی میں تنظیمی صلاحیت بے پناہ تھی جو تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں کام آئی۔ شوکت علی ۱۰ر مارچ ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ۱۸۸۲ء کے لگ بھگ بریلی کالج میں داخل کرا دیئے گئے جہاں سے اعلا تعلیم کے لئے جولائی ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ والدہ نے تعلیم کے ساتھ صحت کا بھی خیال رکھا۔ یہ ورزش کے شوقین تھے اور بہت صحت مند تھے۔ کھیل کے میدان میں غیر معمولی شہرت حاصل کی اور علی گڑھ کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ شوکت علی نے اپنی اس عہد کی یادوں اور یادگاروں کو ایک طویل مضمون علی گڑھ کے کھیلنڈرے میں محفوظ کر دیا ہے۔

۱۸۹۴ء میں شوکت علی نے تعلیم سے فارغ ہو کر محکمۂ آبکاری میں ملازمت کرلی اور محمد علی کی تعلیم و دیگر ضروریات کے کفیل رہے۔ سماجی کاموں سے دلچسپی اور علی گڑھ سے عشق فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ اس دوران علی گڑھ تحریک میں سرگرم رہے۔ اولڈ بوائے ایسوسی ایشن قائم کی اور چند احباب کے تعاون سے بنارس سے ماہنامہ "اولڈ بوائے" جاری کیا۔ جب مدرستہ العلوم علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک سر آغا خاں کی زیر قیادت شروع ہوئی تو شوکت علی سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ کر تن من دھن سے اس میں لگ گئے۔ یونیورسٹی کے لیے سرمایہ کی فراہمی اولڈ بوائے کی عمارت اور دیگر کام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اس کے ساتھ شوکت علی سرگرم سیاست میں شریک ہوگئے تھے لیکن ان کا مقصد سماج کی اصلاح، مخلوق خدا کی خدمت اور حصول آزادی تھا۔

انھوں نے ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ قائم کی اور انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل ہوگئے۔ ۲ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو ان کی بیوی بسم اللہ بیگم کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیاں مزید تیز ہوگئیں اور انھوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کی حمایت

اور انگریزوں کی بالادستی کے خلاف فضا تیار کرنا شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے ۱۹۱۵ء میں ان کو گرفتار کر کے پہلے مہرولی اور پھر ۲۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو چھندواڑہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ محمد علی بھی تھے جو جیل کے قانون کے خلاف برابر تحریری و سیاسی جد و جہد کرتے رہے۔

جیل میں محمد علی نے گاندھی جی و دیگر سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کے واسطے حکام سے اجازت چاہی جو نہیں ملی۔ اس کے بعد انھوں نے دسمبر ۱۹۱۸ء اور پھر مارچ ۱۹۱۹ء میں کچھ عرصہ کے لیے پیرول پر رہائی حاصل کی اور رامپور آ گئے۔ جہاں گاندھی جی اور دیگر سیاسی قائدین ان کے یہاں آتے رہے۔ اخبار دبدبہ سکندری اور بزرگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ مارچ میں جب گاندھی جی علی برادران سے ملاقات کے لئے رامپور آئے تو نواب حامد علی خاں نے ان سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ جب گاندھی جی نواب صاحب سے ملاقات کو آنے لگے تو درباری آداب کے تحت سر ڈھکنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اس وقت رامپور میں مخمل والوں کی بریشی ٹوپیوں کا رواج تھا۔ لیکن بی اماں نے گاندھی جی کے لیے فوری تھیلا نما کھدر کی ٹوپی سی کر دی، جو گاندھی جی نے پسند کی۔ اور پھر وہ کانگریس کے یونیفارم میں داخل ہو گئی۔

اس دوران ممالک اسلامیہ اور ہندستان کی آزادی کے لئے جد و جہد کرنے کے واسطے خلافت کمیٹی تشکیل دینے کی تجویز ہوئی جس کا باقاعدہ اعلان مارچ ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ سے ہوا۔ مولانا عبدالباری کو اس کا صدر بنایا گیا اور مولانا شوکت علی زندگی بھر اس کے روح رواں رہے۔ تحریک خلافت کے تحت انھوں نے بہت کام انجام دیئے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو شوکت علی جیل سے رہا ہو کر امرتسر اجلاس کانگریس میں شریک ہوئے اور تحریک آزادی و ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو عیدگاہ کراچی میں انگریزوں کے خلاف مکمل بائیکاٹ پر تقریر کی۔ آپ مدراس کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے کہ راستے میں ۱۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور دو سال کی سزا ہو گئی۔


محمد علی، شوکت علی تحریک خلافت کے قائد کی حیثیت سے

۱۸ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کا ایک اہم اجلاس سیتاپور میں ہوا جس میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا محمد علی وغیرہ موجود تھے لیکن اہم خدمات کی بنا پر کرسی صدارت مولانا شوکت علی کو تفویض ہوئی۔ شوکت علی سیاسی و سماجی بہت سے اداروں سے وابستہ رہے اور بحیثیت سیاسی قائد بیباک صحافی، شعلہ بیان مقرر اور شگفتہ نثر نگار اپنے عہد میں ممتاز رہے۔ ۱۹۳۲ء میں امریکہ یونیورسٹی نے انھیں اسلام و ہندستان کے موضوع پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔

شوکت علی دوستوں کے دوست اور ہمدردوں کے کام آنے والے انسان تھے۔ ان کی سیاسی و سماجی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ آخری عمر میں ایک یوروپین لیڈی سے دوسری شادی کر لی تھی۔ شوکت علی نے دہلی میں ۶۶ سال کی عمر میں ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا اور جامع مسجد دہلی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا شوکت علی اور حکیم اجمل خاں کے مزارات پر تاریخ وفات

غلط کندہ ہے۔

مولانا شوکت علی کا کتبۂ مزار، جس پر تاریخ وفات غلط کندہ ہے

یا حیُّ یا قیُّوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت

فاتحہ مرقد ویراں پہ بھی پڑھتے جائیں ان سے کہہ دو جو یہاں اس رستے گزرنے والے

مرقد پاک

خادم کعبہ ضیغم اسلام

حضرت مولانا شوکت علی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ وصال

۱۸ نومبر سنہ ۱۹۳۸ء بمقام دہلی جامع مسجد

کندہ افروز بن احمد بن فدا لال کنواں دہلی

مولانا شوکت علی کے ایک لڑکے زاہد علی تھے جنھوں نے کافی عرصہ باپ کے مشن کو جاری رکھا اور خلافت اخبار خلافت ہاؤس بمبئی سے نکالتے رہے۔ ان کا بھی ۱۹ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بمبئی میں انتقال ہوگیا۔

شوکت علی کرکٹ اور سیاست دونوں کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ وہ جہاں علی گڑھ کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے وہیں سیاست میں بھی ان کو قائدانہ حیثیت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل ایک اہم بیان میں فرمایا تھا:

"میں ۹۹ رنیں بنا چکا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آؤٹ ہونے سے پہلے میں ۳۳ رنیں اور بنا لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستان میں سفید فام ٹیم کو شکست دے کر ہندوستان کو آزاد کرالوں گا اور پھر دیر یا سویر ہماری ٹیم سب قوموں کے افراد پر مشتمل ہوگی اور اس طرح سے ہماری ٹیم بہت مضبوط ہو جائے گی اور پھر ہم ایک دل ہو کر فتح کی سنچریاں بنائیں گے۔"



شوکت علی اپنے دوستوں عبداللہ اور علی حسن کے ساتھ کرکٹ کے یونیفارم میں

افسوس کہ شوکت علی کی زندگی میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور پھر فتح مند ٹیموں نے ان کو بھلا دیا۔

مولانا شوکت علی کی شخصیت بہت متنازعہ ہوگئی ہے۔ کچھ لوگوں نے ریاست رامپور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مشاہیر سے تعلقات کو بنیاد بنا کر ان کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کا ایک انتہائی اہم خط ہدیۂ ناظرین ہے۔

اس خط میں مذکورہ واقعات اور اشخاص سے بحث ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب "علی برادران۔ خاندان اور خدمات" میں کی ہے شوکت علی کے وہ خطوط جو انھوں نے احباب رامپور یا حکام رامپور

کو لکھے ہیں۔ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں لیکن ان کا بڑا حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

مولانا شوکت علی کا خط
نواب رامپور رضا علی خاں کے نام



THE CENTRAL KHILAFAT COMMITTEE (INDIA)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اکبر Bombay 10-5-1935.

حضور والا! السلام علیکم

جب میں رامپور سے لکھنؤ اور علی گڑھ ہوتا ہوا دہلی اس غرض سے پہنچا کہ بمبئی کا عزم کروں، تو مجھے یہ اطلاع ملی کہ حضور کو کذب اور غلط بیانی سے کام لے کر میرے خلاف بر انگیختہ کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے میرے بڑے لڑکے زاہد علی سے دہلی میں یہ کہا کہ حضور والا مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے حضور والا کی علی گڑھ کی چانسلری کے معاملہ میں مخالفت کی اور یہ کہ حضور نے فرمایا کہ حضور نے میری آٹھ ہزار روپئے سے مدد کی اور یہ کہ میں نمک حرام تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان صاحب نے سچ کہا یا واقعی حضور کو کسی بہتان تراش نے غلط بیانی سے کام لے کر اس غلط بات کا یقین دلایا۔ پانچ پشت سے میں نے اور میرے خاندان نے حضور کا نمک کھایا ہے، جس کے اعتراف کرنے میں میں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا، اور میرا دعویٰ ہے کہ میں اور میرا خاندان اس کا پختہ ثبوت بارہا دے چکے ہیں کہ ہم نے اپنے آقاؤں کے ساتھ ہمیشہ نمک حلالی کی۔

حضور نے میری اور محمد علی مرحوم کی ہمیشہ امداد فرمائی اور محبت کا برتاؤ فرمایا۔ جو کچھ مجھے مرحمت ہوا اس میں نصف میرا تھا اور نصف محمد علی مرحوم اور اس کے انتقال کے بعد اس کی اہلیہ بیگم محمد علی کو میں ہمیشہ دیتا رہا۔ چار برس کے عرصے میں چار ہزار کا مجھے عطیہ، ایسا نہ تھا جو مجھے کافی ہوتا۔ حضور والا کے والد ماجد نے جو ہمیشہ مجھ پر عنایت فرماتے تھے، جلاوطنی کے زمانے میں بھی میری برابر مدد کی تھی، اور قرآن پاک اپنے سر پر رکھ کر جب ہم نظر بندی کے زمانے میں چند دنوں کے لیے رامپور آئے تھے، وعدہ فرمایا تھا کہ جب تک میرے اور میرے خاندان کے پاس کھانے کو ہوگا، میں تم دونوں بھائیوں کو دنیوی اور مالی تفکرات سے سبک دوش کروں گا۔

میں نے بارہا صرف حضور کے پاس آکر درخواست کی کہ میرے اور محمد علی مرحوم کی اہلیہ کی گزر اوقات کے لیے ماہانہ مقرر فرمادیں مگر مجھے یہ گمان نہ تھا کہ حضور ایسے لوگوں کے سامنے، جو میرے بھائی مرحوم کے سخت دشمن تھے، اور آج مجھ سے باوجود میری بے اعتنائی کے بار بار اس غرض سے آکر ملتے ہیں کہ مسلمانوں میں اور دیگر ہندوستان کی اقوام میں اور حکومت میں میری کچھ عزت ہے، ان کے سامنے یہ طعنہ دیں گے۔ یہ واقعہ صحیح ہے تو ضرور میرے لیے تکلیف دہ تھا اور حضور کے شایان شان بھی نہ تھا۔

میں حضور کی طبیعت سے واقف ہوں کہ نیک دل ہیں۔ مگر دوسروں کی کہی سنی باتوں پر اشتعال قبول کر لیتے ہیں اور ایسی کارروائی فرما دیتے ہیں جس سے حضور کی نیک نامی نہیں ہوتی اور بعد کو خود حضور کو بھی تکلیف پہونچتی ہے۔ اگر کچھ اصحاب میرے خلاف حضور سے کچھ کہیں، تو اپنے دیرینہ خادم کو حضور طلب فرما کر، جواب لے سکتے ہیں۔ میں جھوٹ بولنے کا

عادی نہیں ہوں اور اپنے آقا کی وفاداری کا اتنا بڑا ثبوت دے چکا ہوں جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

۱۶ برس ہم اپنے وطن سے دور رہے، مگر اخبارات میں، تقریروں میں، کسی موقع پر بھی اپنے آقا کے خلاف نہ خود ایک لفظ کہا، نہ کسی کو کہنے دیا۔ حضور اس کی تحقیق کر سکتے ہیں۔

رہا یہ من گھڑت علی گڑھ کا قصہ، تو ان بے ایمان بہتان تراشوں کو اس کا بھی علم نہیں کہ میں ان لوگوں میں ہوں جو قطعی طور پر چاہتے ہیں کہ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال ہرگز اپنا استعفا واپس نہ لیں اور ان کی جگہ کسی دوسرے والیِ ملک کا انتخاب عمل میں آئے

..... جیسے علی گڑھ کے بدنام کرنے والے شخص سے وائس چانسلر مقرر ہونے کے بعد ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کا رہنا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ لارڈ ریکٹر وائسرائے ہند، لارڈ اروِن کی فرمائش پر ایک آزاد کمیشن، جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ تھے اور ممبر دو بڑے ماہرین تعلیم انگریز، یعنی مسٹر فلپ ہارٹوگ اور سر جارج اینڈرسن، بٹھا لگیا۔ اس کمیشن نے کامل تحقیقات اور تقریباً سو تحریری و زبانی شہادتوں کے بعد ۱۲۱ صفحے پر ایک فیصلہ صادر کیا، جس میں مسلم یونیورسٹی کی بے قاعدگیوں اور خرابیِ تعلیم و اخلاق کا ذکر کر کے یہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ پرو وائس چانسلر فوراً الگ کر دیے جائیں۔ چنانچہ یہ سفارشات کورٹ نے قبول کیں اور لارڈ اروِن نے ہز ہائی نس چانسلر کو تاکیدی الفاظ کے ساتھ متوجہ کیا کہ پرو وائس چانسلر کو فوراً الگ کیا جائے۔

آج بھی حضرات جو حضور سے میری جھوٹی شکایتیں کرتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ اول حضور نظام کا اس عہدہ کے لیے انتخاب کیا جائے ورنہ ہز ہائی نس آغا خاں کا اگر یہ بھی نہ ہو تو ہز ہائی نس نواب صاحب بھاولپور کا۔ اور اگر وہ بھی منظور نہ کریں تو ہز ہائی نس نواب صاحب جوناگڑھ کا اور ان کی نامنظوری کی صورت میں حضور والا کا نام آتا ہے، یہ تو ان کی قدردانی اور دوستی کا ثبوت ہے۔

مجھے نہایت خوشی ہوگی اگر ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی جگہ حضور کا تقرر ہو جائے۔

جو مقصد ہمارے آقا اور ہمارے درمیان فرق ڈالنا چاہتا ہو، میں اس سے آسانی سے سمجھ لوں گا ان لوگوں کو بار بار ناکامی ہوئی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ذلیل و خوار ہوں گے۔ مگر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایک مرتبہ اور حضور والا کے گوش گزار کردوں کہ میں نے ہمیشہ سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی ریاست رامپور کے والیانِ ملک سے کبھی بھی مقابلہ نہیں کروں گا خواہ وہ مجھ پر کسی اثر کے ماتحت زیادتی ہی کیوں نہ کریں۔

چنانچہ مسوری اور ظفر علی خاں کے واقعہ پر میں نے ایسا ہی عمل کیا اور بعد کو جب اہل رامپور اپنے آقا کے مقابلہ میں آئے، میں نے ان سے یہی کہا کہ اگر وہ لوگ یا خود حضور مجھے باعزت سمجھوتے کے لیے بیچ میں ڈالیں گے تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔ مگر جھگڑے کو بڑھانے کی سعی کے گناہ سے میرا دامن ہمیشہ پاک رہے گا۔

میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ میرے ساتھ رامپور میں بعض ممبران اسٹاف کی طرف سے بے اعتنائی کا برتاؤ کیا گیا۔ مگر میں نے پھر بھی اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کی۔ جب رامپور آتا ہوں، قلعہ معلیٰ میں حاضر ہو کر سلام کرنے کی کوشش کرتا

ہوں۔ لڑائی کے لیے دو لڑنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انشاء اللہ ایک میں چاہے مجھے حضور والا دوسرے روپیہ کے لوٹنے والوں کے سامنے بُرا بھلا کہیں، انشاء اللہ میں دیرینہ اور روایتی طرز عمل جاری رکھوں گا۔ جیسا کہ اب تک رہا ہے۔ میں نے حضور والا اور حضور کے بزرگوں کا نمک کھایا ہے اور نمک حرامی کا مجھے کوئی الزام نہیں دے سکتا۔

چار ہزار کی رقم کوئی ایسی بڑی رقم نہ تھی جسے میں دوستوں سے مانگ کر حضور کو واپس نہ دے سکتا۔ مگر پانچ پشتوں سے خدمات و وفاداری کے صلے میں جو نمک کھایا ہے اسے میں کس طرح ادا کر سکوں گا۔ حضور مجھے انشاء اللہ ایک بہادر، ایمان دار، آپ سے اور رامپور سے محبت کرنے والا شخص پائیں گے۔ اور اگر کچھ امتحان اور باقی رہ گئے ہیں تو ان مراحل کو بھی حضور طے فرالیں۔ انشاء اللہ میں سرخرو اور کامیاب ثابت ہوں گا۔

جولائی میں حاضری کا قصد ہے اور اگر قدم بوسی کا موقع نہیں ملے گا تو خط کے ذریعہ اپنی عقیدت مندی کا اظہار کروں گا۔ ہندوستان میں اور عالم اسلام میں میری بھی کچھ عزت ہے۔ میں اوروں کے مقابلے میں آ سکتا ہوں مگر حضور والا اور اہل رامپور کے مقابلے میں سخت سے سخت تکلیف کو بھی میں صبر و ہمت کے ساتھ برداشت کروں گا۔

میں ہندوستان کے اکثر والیان ملک سے تعلقات رکھتا ہوں، عالم اسلام کے تمام بادشاہ مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور بھائی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ حضور والا سے توقع ہے کہ مجھے اپنا سمجھ کر ان سے بدرجہا زائد محبت اور عزت کا برتاؤ فرمائیں گے۔ اس میں حضور کی بھی ناموری ہے اور میرے دل کی خوشی بھی۔

میں ممنون ہوں گا اگر حضور والا مسعود الحسن صاحب یا زیدی صاحب کے ذریعہ سے مجھے مطلع فرمائیں گے کہ حضور کو غلط بیانیوں سے کسی نے مشتعل کیا تھا۔ مجھے حضور کے سوا کسی سے واسطہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا میں آسانی سے قلع قمع کر سکتا ہوں اور انشاء اللہ میں اپنے ارادوں میں ثابت قدم رہوں گا اور دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی۔

حضور کا خادم و نمک خوار

شوکت علی

(خادم کعبہ)

علی برادران کے بارے میں

مہاتما گاندھی کا مکتوب

گاندھی جی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو کسی زمانے میں ایک مکتوب اُردو میں ارسال کیا تھا۔ دُنیائے انسانیت و محبت کے سب سے بڑے داعی کا وہ خط بجنسہ پیش کیا جا رہا ہے:

مولانا صاحب!

آپکا مہبت سے بھرا ہوا خط مجھے ملا ہے

مہبتہ کا راستہ ہی یہ ہے کہ ہم ایک دُسرے کو کھوسے

دلسے نکو ہیکے، دونوں علی بھائی یہاں دو دن سے

رہے ہر ایک سوال کے متعلق ہم نے بہت باتیں

کی ہیں ہیں ابی۔ رسالہ میں کچھ لکھنے کی کوشش کرونگا

میں چاہتا ہوں کہ ہم جلدی سے ملے

ایکا اجازا اچھا ہوگا۔ ایکو عید مبارک ہو

آپکا خادم

گاندھی

اندھیری سی ہم اتوار

غزلیں

کس کو معلوم تھا اک روز کہ یوں ہونا تھا
مستقل ضبط کا انجام جنوں ہونا تھا

عمر بھر زیست کے کاغذ پہ مشقت لکھنا
یعنی اک شخص کا اس طرح بھی خوں ہونا تھا

بے حسی ملتی مجھے شہر میں جینے کے لئے
یا مرا دستِ ہنر دستِ فسوں ہونا تھا

فاصلہ قرب کی ساعت میں سمٹ سکتا تھا
سر جھکا تھا تو ترا دل بھی نگوں ہونا تھا

بُنتے رہنا تھا رئیس آس کے تانے بانے
کچھ تو جینے کے لئے وجہ سکوں ہونا تھا

رئیس الدین رئیس
۱۴۲۵ دہلی گیٹ۔ علی گڑھ

ہر ایک لمحہ بدلتی فضا کا منظر ہے
ابھی چمن ابھی دشتِ بلا کا منظر ہے

لہو لہو ہے زمیں اور فضا کا منظر ہے
حسینؑ کوئی نہیں کربلا کا منظر ہے

چراغ پھر بھی یہاں میں جلائے بیٹھا ہوں
یہ جانتا بھی ہوں ہر سو ہوا کا منظر ہے

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی مجھ کو
قدم قدم پہ شکستِ انا کا منظر ہے

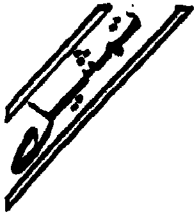
مہک رہی تھی جہاں زندگی گلوں کی طرح
اسی مقام پہ جلتی چتا کا منظر ہے

یہ پیاس میرا مقدر ہے کیا کروں اسکو
چہار سمت برستی گھٹا کا منظر ہے

کھنڈر مکینوں کو اپنے تلاش کرتے ہیں
عجیب ہُو کا ہے عالم فنا کا منظر ہے

لہو میں ڈوبا ہوا زندگی کا چہرا ہے
ظفر میں کیسے کہوں ارتقا کا منظر ہے

ظفر اقبال ظفر
۱۰۰۔ خیلدار۔ فتح پور



زینُ الدّین حبیبؔ

مولانا محمد علی میموریل اسکول کیمپس، بکن گنج بجنور

پیردارس

منظرِ اوّل

(خانقاہ اوّل۔ پیر مرد اپنے چار مریدوں کے ساتھ بیٹھا ہے اور
تعلیم معرفت حق دے رہا ہے)

پیرمرد :۔ سب کچھ الحمدللہ میں ہے مستقیم
الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم
تمام بسم اللہ کا معنی ایک نقطے میں رکھا ہے کریم
مختصر میں یوں سمجھو کہ
"اگر در خانہ کس است یک حرف بس است"
پیاترا، گن کے گراں بات کو یوں کھولے ہیں یوں بولے ہیں؛
پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی آکھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے
قدرت کا دھنی سبھی۔ جو کرتا سو سب وہی۔ خدا کی صفت کرے
کوئی کتنیک۔ وحدہٗ لاشریک، ماں نہ باپ۔ آپیں آپ
پروردگار۔ سنسار کا سرجنہار۔ ایک ہی سرجنہار۔ کریم۔
رحیم۔ مہروان۔ کرتار۔

مُرید ۱ : احد
مُرید ۲ : احد
مُرید ۳ : صمد
مُرید ۴ : لَم یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ
مُرید ۱ : خدا قادر
مُرید ۲ : خدا حاضر
مُرید ۳ : خدا ناظر
مُرید ۴ : خدا باطن خدا ظاہر

پیرمرد : سات زمین سات آسمان میں اس کا کھیل
اس کے حکم کوں کون سکے ٹھیل
عجائب عجائب اس کے کام۔ اسے انسان
پیدا کیا زمین، پیدا کیا آسمان
یاں چرا نہ چُوں
کُن فیکوں

(سب مل کر ضرب لگاتے ہیں)

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

منظرِ دوم

خانقاہ دوم۔ (پیر مرد اپنے چاروں مُریدوں کے ساتھ بیٹھا
عشق کی تعلیم دے رہا ہے)

(سب مل کر ضرب لگاتے ہیں)

العشق ہُوَالحق العشق ہُوَالحق العشق ہُوَالحق

پیرمرد : عزیزاں! یوں سمجھو کہ
عاشق کوں عشق دیا۔ معشوق کوں حُسن بخشیا
دونوں میں اپنا بھید پرکٹ کیا
ایک ہی سرجنہار۔ کریم، رحیم، مہروان، کرتار
عشق و حسن۔ میں کیا بولوں انسان۔ شان نہ گمان
جان نہ پہچان۔ انکیں کو دیکھ انکیں حیران۔ پریشان
سرگردان ــــ قربان کرے دین ایمان۔

دیکھے منہ دکھلائے ۔ ایکس کو ایکس بھلائے

دل سوں دل، پران سوں پران

جانو قدیم آشنا۔ جانو قدیم پہچان

لگے ماں باپ سوں ہوتے بیزار

جس یار سوں جیو لگیا، اس یار سوں اختیار

جیو لگیا اودھر۔ بے چارے ماں باپ آناں کیدھر

ماں باپ کوں سمجھے جیوں خیال ہور خواب

بھائی تو بے چارا گنے میں حساب

مُرید ۱: پیر و مرشد! عشق کوں صفات کوں نسبت جاتراں، صاحب دلاں کیا فرماتے ہیں؟

پیر مرد: عشق ہم باطن، ہم ظاہر

عشق سب جا کا حاضر ناظر

عشق نڈر عشق کوں کس کا ڈر

عاشقاں کوں عشق دیا۔ معشوقاں کوں حسن بخشیا

دونوں میں اپنا بھید پرگٹ کیا

مرید ۲: پیر و مرشد! عاشقاں و عابداں بیچ کیا فرق گردانتے ہیں۔؟

پیر و مرشد: عشق والے کوں عاشق گردانتے ۔ ایک بات ہے لن ترانی، عاشق کوں اس پر ہزار نشانی۔

عبادت والے کو عابد گردانتے

عاشق ہور شے، عابد ہور شے

عاشق سمجھتا ہے کہ معشوق کی کیا خواہش ہے

عابد کوں کیا نسبت جو عاشق کی بات میں آکر دخل کرے

جیوں اپنے کام میں خلل کیا تیوں دوسرے کے کام میں خلل کرے

عاشق بلند ۔ عابد پست

عابد ہشیار ۔ عاشق مست

عابد دین خاطر جنم کھویا ہے

عاشق خدا خاطر دین دنیا سے ہتھ دھویا ہے

اس بات کا کون پایا کھوج

پوچھو ہو عابد عاشق کا کھوج

کہاں گنگو تیلی کہاں راجا بھوج

مرید ۳: پیر و مرشد! عشق و حسن بیچ کیا نسبت ہے

پیر و مرشد: عشق نیاز! عشق انتظار

حسن دیدار

معشوق دیدار دکھلاتا تو ہے، دلے ٹک ترپھا کر دکھلاتا ہے

گھونگھٹ میں منہ چھپا کر دکھلاتا ہے۔

عاشق کوں تپانا معشوق کا کاج

عاشق کے دلاں پر معشوق کا راج

حسین صورت کیا شے ہے۔ واللہ۔ سبحان اللہ۔ الحمدللہ۔

بعضے کہتے ہیں حضرت کا حدیث ہے:

رایت ربی فی صورۃ احسن امردہ

یعنی امرد کی صورت میں دیکھا ہوں خدا کی تجلیات

حسین مرداں کی صورت میں رب اپس جھلک دکھاوے

ناداں کوں کیا سمجھ آوے

عشق راجا، عشق بادشاہ، عشق سلطان

عشق سے خالی نہیں یہ جہان

چھتر اس کا رسوائی عشق کا تخت استغنائی

عشق کا حشم بے پروائی

عشق لاابالی

عشق کا جنوں لازوالی

مختصر یوں جانیو کہ عشق منے رب کو پہچانیو

(سب مل کر ضرب لگاتے ہیں)

العشق ہو الحق ۔ العشق ہو الحق ۔ العشق ہو الحق

منظر سوم

(خانقاہ اوّل ۔ پیر مرد اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھا تعلیم معرفت دے رہا ہے)۔

پیر مرد: یوں جانیو کہ:

نور تے آفتاب ہے ۔ نیں تو آفتاب کوں آفتاب کون کتا
نشہ تے شراب ہے ۔ نیں تو شراب کوں شراب کون کتا
باس تے پھول ہے ۔ نیں تو پھول کوں پھول کون کتا
عشق جوت ہے دل جوہر ہے
جوت تے جوہر ۔ نیں تو جوہر کوں جوہر کون کتا
صفات تے ذات ہے ۔ نیں تو ذات کی پہچان کیا
تفکروا فی صفات اللہ، ولاتفکروا فی ذات اللہ
عزیزاں ! باتاں سنو ۔ اک شے عقل ہست
لوگاں صاحبانِ عقل و دماغ کہتے ہیں :
عقل کے نور تے سب جگ نے نور پایا ہے
جنے جو علم سیکھا سو عقل تے آیا ہے
صاحبانِ عقل و دماغ کے نزدیک ۔ عقل کوں خدا کہنا
کچھ دور نہیں ۔

ولے چیزے کہ دل ہست ۔ بلند و بالا
سب تے فوقیت دھرتا ۔ سب تے ارفع و اعلیٰ
کیوں نہ ہووے کاشانۂ باری تعالیٰ
عقل ہے باز دلے بازے بلند پرواز
شکار گاہ ہے اس کا حقیقت ہور مجاز
سمرن کرو شام و بگاہ
کلمہ لا الٰہ الا اللہ
(سب مل کر ضرب لگاتے ہیں)
لا الٰہ الا اللہ لا الٰہ الا اللہ لا الٰہ الا اللہ

منظر چہارم

خانقاہِ دوم ۔ (پیرمرد اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھا عشق کی تعلیم دے رہا ہے)
پیرمرد : طفلانِ مہر، نوجوانانِ گبرو
باتاں سنو ۔ سچے کی باتاں سنو
عاشق کا دل نرم ، یعنی تو باد سموم بہت گرم

راگ یک شے ہست ۔ راگ میں عجب ہے تاثیر
عاشق کے دل کوں یوں لگتا جوں تیر
بہتے پانی کوں کھڑا کرے ۔ اڑتے جناور کوں پاڑے
عاقل کوں دیوانہ کرے ۔ ہشیار کوں مست کر پچھاڑے
راگ سن عاشق زار زار روتا
بے اختیار روتا ۔ ہنکا مار مار روتا
پکار پکار روتا
درویشاں کوں حال آتا ۔ ہزار ہزار دل میں خیال آتا
عاشق کا رنگ زرد ہوتا
دل بیچ ہر وقت ٹیس اٹھتی
دل بیچ شیریں درد ہوتا
آنکھاں بیچ سرسوں پھولتی
رُخ زرد ہوتا
رنگ بسنتی ہوتا
بسنت دل بیچ یک لطف پیدا کرتا
بسنت بہار ہست
دل عاشق نثار ہست
بسنت کا کیا گفتار ہست
مہرو پسر، گبرو پسر بسنت سنا ۔
(مرید انتہائی شیریں آواز میں بسنت گاتا ہے)
شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لایا بسنت
نین پتلی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت
سارے پھولاں کی بسنت کا پھول مہانی کیا
گل پیالا بن کے خدمت کے لیے آیا بسنت
جوت مانک سے بسنت کے گل کھلے عالم منے
اپنے پھولوں سے فلک پر لال رنگ چھایا بسنت
شکر ایزد کہ معانی رات دن آنندسے
تیرے مندر میں خوشی آنندسے آیا بسنت
(سب مل کر ضرب لگاتے ہیں)، العشق ہو الحق، العشق ہو الحق

غزلیں

دیا وہ درد کہ آنسو گہر لگے ہیں مجھے
ترا یہ طرزِ ستم اک ہنر لگے ہیں مجھے

لُٹی ہے راہ میں شاید براتِ ماہ و نجوم
لہو سے مانگ بھرے یہ سحر لگے ہیں مجھے

مجھی میں کوئی درندہ نہ چُھپ کے بیٹھا ہو
نہ آؤ پاس خود اپنے سے ڈر لگے ہیں مجھے

شہید کوئی بھی ہو حق کا نام لے کے یہاں
فرازِ دار پہ اپنا ہی سر لگے ہیں مجھے

اُجالا ایک ہی پل کا، مگر ہے شانِ جنوں
حیات اپنی تو رقصِ شرر لگے ہیں مجھے

فروغ جس سے ہے رنگینوں کا گلشن میں
وہ عندلیب کا خونِ جگر لگے ہیں مجھے

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل، سندیلہ
ہردوئی

لائیں گے رنگ حادثات آج نہیں تو کل سہی
بدلے گا نظمِ کائنات آج نہیں تو کل سہی

وقت سہی ہزار دُور، ہو کے رہیں گے حل ضرور
اُلجھے ہوئے معاملات آج نہیں تو کل سہی

آئے گا ایک انقلاب پھر سے جہانِ عشق میں
پھر سے سجے گی کائنات آج نہیں تو کل سہی

لائے گی جو پیامِ یار، گزرے گی جو بنامِ یار
آئے گی وہ حسین رات آج نہیں تو کل سہی

کارگہِ حیات میں عزم و یقیں بھی ہو اگر
مٹ کے رہیں گی مشکلات آج نہیں تو کل سہی

جوہرِ بے نوا تجھے دیں گے نئی مسرتیں
غم کے تمام واقعات آج نہیں تو کل سہی

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۰۔ ریوا بلڈنگ، لیڈر روڈ
الہ آباد

غافل تھا سوچنے کا ہنر دے گیا مجھے
پتھر کسی کے ہاتھ کا سر دے گیا مجھے

سر تا پا خیر تھا تو مری خیریت نہ تھی
اچھا ہوا وہ تھوڑا سا شر دے گیا مجھے

سب رنج لکھ دیئے ہیں انھیں راحتوں کے نام
غم کا وجود جن کی خبر دے گیا مجھے

بہلا گیا وہ پھر مجھے لے کر وفا کا نام
آئینہ کہہ کے داغِ جگر دے گیا مجھے

پرواز خود تو کر گیا "چھونے کو آسماں"
یادوں کے کچھ شکستہ سے "پر" دے گیا مجھے

سب لے گیا وہ وقت کی دولت سمیٹ کر
شب دے گیا مجھے نہ سحر دے گیا مجھے

ٹوٹا یہیں سے خوابِ رفاقت کا سلسلہ
آئینہ لے گیا وہ نظر دے گیا مجھے

اقبال ٹانڈوی
حیات گنج ٹانڈہ
فیض آباد

غزلیں

یوں دیا روشن ہے تیرے نام سے
شہرِ دل میں روشنی ہے شام سے

وحشتوں کی زد میں پھر ہم آ گئے
پھر ٹپکتی ہے اُداسی بام سے

وہ بھی سنجیدہ نہیں اپنے لئے
اور ہم بھی بے خبر انجام سے

تم بھی تنگ آجاؤ گے میری طرح
اک نہ اک دن گردشِ ایام سے

اے غمِ دوراں تجھے کیا چاہیئے
بول میری صبح سے اور شام سے

یہ بھی اے آفاق کوئی بات ہے
مضمحل بیٹھے ہوئے ہو شام سے

ڈاکٹر آفاق فاخری
جلال پور
ضلع فیض آباد

آپ کا مجھ پہ کوئی تازہ کرم ہو جائے
مدعا یہ ہے کہ پھر کوئی ستم ہو جائے

روشنی اور بھی کم اور بھی کم ہو جائے
صرف دامن نہیں احساس بھی نم ہو جائے

عافیت میں کئی دن سے ہیں زمانے والے
آؤ کچھ تذکرۂ دیر و حرم ہو جائے

بے زبانی کو زباں کیسے بناؤں یارو
کوئی افسانہ نہیں ہے کہ رقم ہو جائے

وہ جو آسان سمجھتا ہے وفا کی منزل
میرے ہمراہ وہ دو چار قدم ہو جائے

تُربتِ اہلِ محبت پہ یہ لکھا ہے قمر
جس کو جینا ہو وہ پامالِ قدم ہو جائے

(مولانا) قمر شاہجہانپوری
۹۶/۳۳ کونبل گنج، لکھنؤ

دوش پر زندگی کے سر بھی نہیں
اس لئے حادثے کا ڈر بھی نہیں

سب کے ہاتھوں میں سورجوں کے بدن
میرے حصے میں اک شرر بھی نہیں

مان لوں اس کو میں خدا کیسے
جس کی قسمت میں اک کھنڈر بھی نہیں

کون کس کو یہاں تسلی دے
سب ہیں مجبور، بال و پر بھی نہیں

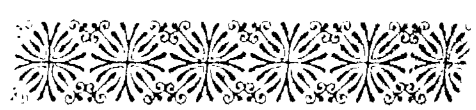
شہر کا شہر بے سماعت ہے
اور تحریر میں اثر بھی نہیں

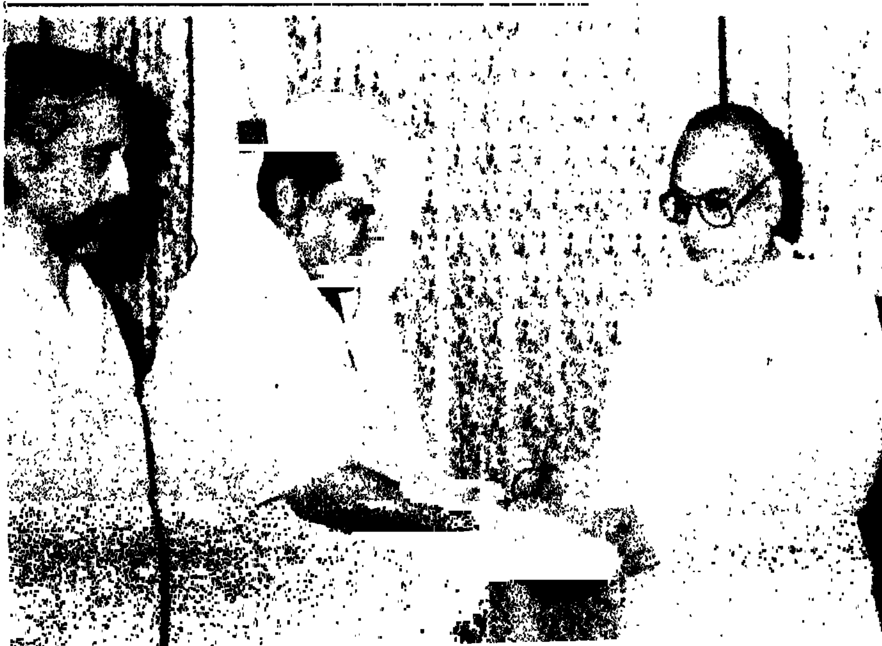
جس سے ملتا تھا حوصلہ مجھ کو
آج ساجد وہ ہمسفر بھی نہیں

ساجد حمید
معرفت ایچ کے ایم بشیریت
سوالاپلیا
کوڈ ۵۱۱۲۰۱



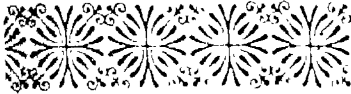
[illegible] یوم اسلم ۹ر اپریل ۱۹۹۲ء کو راج بھون میں منایا [illegible] شری عمر ریمانی کو اُردو صحافت ایوارڈ شری عثمان غنی کو، اُردو شاعری ایوارڈ [illegible]
تقریب کی صدارت مجاہد آزادی شری رام کرشن کھتری نے کی۔



وزیر توانائی
شری لال جی ٹنڈن
کو
[illegible] بینک
[illegible]
[illegible]





وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ ۲۰ مارچ ۱۹۹۲ء کو ڈاکٹر امبیڈکر یونیورسٹی پراجیکٹ کے لئے رقم کی فراہمی کے سلسلے میں میٹنگ کرتے ہوئے۔





وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ ۱۴ اپریل ۱۹۹۲ء کو ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر صدی کے موقع پر فیلڈ پبلسٹی ڈائرکٹریٹ کی جانب سے منعقدہ تقریری اور تصویری مقابلے کے شرکا کو انعام دیتے ہوئے۔



راج بھون میں ۲۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو منعقدہ روزہ افطار پارٹی میں گورنر اترپردیش شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی وزیراعلا شری کلیان سنگھ اور سابق وزیراعلا شری نرائن دت تیواری۔



وزیراعلا کی رہائش گاہ پر روزہ افطار پارٹی میں حصہ لیتے ہوئے گورنر اترپردیش شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی

گورنر اتر پردیش شری بی۔ ستیہ نارائن ریڈی ۲۳ مارچ ۱۹۹۲ء کو راج بھون میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کے بلیدان دیوس پر شہیدوں کی مورتیوں کی گل پوشی کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا
شری کلیان سنگھ
ودھان بھون
لکھنؤ میں
پریس کانفرنس
سے
خطاب کرتے
ہوئے

ایم جمال علوی
آشیانہ ۲۹۹/۹۹ پُرانا نخاس۔ لکھنؤ

منشی پریم چند سے ایک تقابلی مطالعہ

اس بات میں اب کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا کا پہلا ناول سروانٹس (CERVANTES) کا "ڈان کوئکزاٹ" ہے۔ یہ ناول ۱۶۰۵ء میں اسپین میں پرانی داستانوں کا مذاق اڑانے کے مقصد سے شائع کیا گیا تھا۔ انگریزی میں ناول نویسی کی ابتدا رچرڈسن کی "پامیلا" اور فیلڈنگ کے "جوزف اینڈریوز" سے ہوتی ہے۔ اُردو میں ناول نگاری کا اولین نمونہ ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات ہیں۔ "توبۃ النصوح" اور "مرآۃ العروس" کے شائع ہوتے ہی ہمیں "فسانۂ آزاد" بھی قسط وار "اودھ پنچ" میں طبع ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ تمام کہانیاں ایک مکمل ناول کے زمرے میں نہیں آتیں۔ ان میں بیان کردہ تمام تر قصص اپنے اندر موجود کمیوں کی وجہ سے، ناول کی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ انھیں ابتدائی ناولوں سے تعبیر ضرور کیا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا اور عبدالحلیم شرر کے بعد اُردو ناول نگاری میں، ہمارے سامنے علامہ راشد الخیری، منشی پریم چند اور نیاز فتحپوری سرفہرست ہیں۔ لیکن منشی جی کے علاوہ تمام مصنفین کی تحریریں نقائص سے پُر ہیں۔ یا تو وہ لفاظی کے اعلا نمونے ہیں یا پھر ان کے کرداروں پر بے جا ڈرامائیت اور مصنوعیت کا غلبہ ہے۔ سرشار کا ایک کردار "خوجی" البتہ اس دور کی زندگی کا ایک خوبصورت، حقیقت سے قریب اور مزاح کا عمدہ نمونہ ہے۔ شرر اپنے دور میں کافی مقبول ہوئے۔ ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کے قصوں کی تھیم تھی، جس کا موضوع ہمیشہ سنزیت پر اسلام کی فتح تھا۔ علاوہ ازیں ان کے کردار بھی ڈرامائیت سے پُر اور حقیقی زندگی سے کوسوں دور، بے جان کٹھ پتلیاں سی معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا رسوا کی کردار نگاری بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ "مجھے کردار کو اس قسم کا دکھانا ہے اور میں اسے اسی قسم کا دکھا کر رہوں گا" ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ "شریف زادہ" میں جعفر حسین کی پھوہڑ بیوی کے کردار کے علاوہ ان کے پیش کردہ تمام کردار اقلیدس کی کسی گتھی کا حل نظر آتے ہیں۔

راشد الخیری نے ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی مشن کو ہی آگے بڑھایا، اسی لئے ان کی تحریروں پر جابجا واعظانہ طوالت کا غلبہ اور مشرقی عورتوں کی بہتری واخلاقی تعلیم کا جذبہ پوری طرح حاوی نظر آتا ہے، نتیجتہً ہم انھیں ایک ناول نگار کے بجائے لڑکیوں کا سرسید کہنے پر مجبور ہیں۔ ان کے ناولوں کی انشا پردازی اور منظر کشی اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن بطور مصور غم ان کا درجہ ایک سطحی مصنف سے آگے نہیں ہے۔ ان کے کرداروں میں سوائے نانی عشو کے مزاحیہ کردار کے اور کوئی بھی کردار زندگی سے قریب نظر نہیں آتا۔

دوسری جانب اسی دور میں پریم چند کے بعد، نیاز فتحپوری ہیں۔ ان کے ناول "شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" اپنے خوبصورت اور شاعرانہ انداز بیان، رومانیت اور شباب کی فلسفیانہ رنگینیوں اور کرداروں کو عام سطح سے اونچا دکھانے کی وجہ سے یاد تو کئے جائیں گے لیکن بحیثیت ناول نگار ان کی صرف یہی باتیں انھیں ایک کامیاب مصنف تسلیم نہیں کرا سکتیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" بھی شائع ہوئے ہیں۔ جن میں وہ نفسیات

کے نکات اور سماجی تاثرات بڑی چابک دستی سے پیش کرتے ہیں
۔ سب میں ان کے یہاں مقصدیت کا فقدان ضرور ہے ۔ اخلاقیات
سے ان کی چیزوں کا مبرا ہونا ان کی دوسری بڑی خامی ہے ۔ وہ
اب بھی صرف جذباتی اقدار پر انحصار کرتے ہیں اور کہانیوں کو بھی
زندگی کی تشنگی کا ایک بعد ہی رہنے دیتے ہیں ۔

ان سب کے قطعی برعکس منشی پریم چند اردو میں ایک
مکمل ناول نگار اور افسانہ نویسی کے فنی اصولوں پر پورے اترنے والے
مصنف کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ
اردو میں مکمل ناول نویسی اور فطری افسانہ نگاری کی ابتدا منشی جی کی
تحریروں سے ہی ہوتی ہے ۔ ان کے ناول "بیوہ" "چوگان ہستی" "نرملا"
"میدانِ عمل" "بازارِ حسن" "گوشۂ عافیت" "پردۂ مجاز" "جلوۂ
ایثار" اور "غبن" وغیرہ ہیں مکمل ناول نگاری کی نہج پر
تقریباً ہر اعتبار سے پورا اترنے والا ایک اکیلا ناول "گئودان"
ہے ، جسے ہم اردو کا پہلا مکمل ناول تسلیم کرنے پر مجبور ہیں ۔

منشی پریم چند کے یہاں مشاہدہ ، وسعتِ نظر ، فطرت اور
انسانی افعال کا مطالعہ ، واقعیت سے قربت اور قدرتی جذبات
و فطری احساسات کی عکاسی اپنے بے حد سادہ اور دلنشین
اندازِ بیان کے ساتھ موجود ہے ۔ ان کے ناول روزمرہ کی زندگی
سے کافی قریب ہیں ۔ وہ اپنے کرداروں سے متعلق چھوٹے چھوٹے
واقعات کو اسی عمومی طریقے سے پیش کر دیتے ہیں ۔ بالکل ایسے
ہی جیسے کہ وہ اپنی جیتی جاگتی زندگی میں سانس لے رہے ہوں ۔
ماحول کی تصویر کشی کرنے میں انھیں ملکہ حاصل ہے ۔ وہ جہاں
بھی کسی گاؤں کی منظر کشی کرتے ہیں تو قاری کو کھیت ، کھلیان ، کھلی
اور سانی کی بو تک محسوس کرا دیتے ہیں ۔ وہ جو کچھ خود دیکھتے ہیں ،
قاری کو بھی دکھا دیتے ہیں ، جو کچھ خود سوچتے ہیں ، قاری میں بھی ویسا
ہی احساس پیدا کر دیتے ہیں ۔ ان کے یہاں اخلاقی مقصدیت بھی
ہے لیکن زیادہ تر وہ پس پردہ کام کرتی رہتی ہے ۔ ویسے کہیں کہیں
مقصدیت کی یہ خود ساختہ پابندی ان کی کردار نگاری میں کچھ کمیاں
ضرور پیدا کر دیتی ہے ۔ لیکن اس میں قطعی دو رائے نہیں ہیں کہ وہ
ایک مکمل ناول نگار اور حقیقی افسانہ نویس کی صورت میں ہمارے سامنے
آتے ہیں ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے ناول "گئودان" سے ہی
اردو میں ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے ۔

یہ ناول اس زمانے کے حالات کی سچی عکاسی کرتا ہے جب گاؤں
والے اپنا دیہی سکھ چین چھوڑ کر گاؤں کا رخ کر رہے تھے ۔ کیونکہ کاروبار
کھل جانے کی وجہ سے شہر میں روزگار کے زیادہ مواقع میسر تھے ۔
"گئودان" دیہی سماج کی اونچ نیچ کی عکاسی بڑی سادگی سے کرتا ہے
اس ناول کا مرکزی کردار "ہوری" ایک بے حد قدیم روایات کا حامل
وضع دار بوڑھا کسان ہے ۔ اس کی بیوی دھنیا ایک شوہر پرست ، وفا
شعار ، خدمت گزار بیوی اور اپنے بیٹے سے محبت کرنے والی ، ہر حالت
میں اس کی بہتری کی خواہش مند ، اس پر جان نثار کرنے والی ممتا کی پتلی
ایک ایسی ماں ہے جو اپنے بیٹے "گوبر" کی بہتری کے لیے ہر وقت
دیوانی سی نظر آتی ہے ۔ دوسری جانب لڑکے کے دل میں زمیندارانہ نظام
کے خلاف بغاوت کے جذبات کروٹیں لیتے رہتے ہیں ۔ اس کا باپ
ہوری قسمت کو دوش دینے والا اور حالات پر شاکر رہنے والا ایک
ایسا دیہی انسان ہے جو ایک گائے خریدنے کا ارمان دل میں لیے ہوئے
اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے ۔

اس ناول کے تقریباً سب ہی کردار زندگی سے قریب ہیں
مینا کشی اور مالتی کے کردار جیتی جاگتی زندگی میں روزانہ ہمیں ملتے رہتے
ہیں ۔ رائے صاحب اور خورشید مرزا کے کردار بھی زمیندارانہ ماحول
کے پروردہ اس دور کے حقیقی انسان تھے ، جو اس ناول میں سانس
لیتے ہوئے محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔

منشی جی کے ناولوں کا ماحول خالص ہندستانی اور زیادہ تر دیہاتی
ہوتا ہے ۔ ان دیہی مناظر کا نقشہ وہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری
خود کو بھی اسی ماحول کا ایک فرد سمجھتے ہوئے ، ان کرداروں کے ساتھ سانس
لیتا ہوا تصور کر لیتا ہے ۔ ان کی تحریر کی یہی خوبی انھیں اپنے تمام ہمعصروں
میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل قرار دیتی ہے ۔

پریم چند کے دوسرے ناولوں میں گئودان کے بعد "گوشۂ عافیت"
سب سے بہتر ہے ۔ "چوگان ہستی" کا پہلا حصہ کامیاب لیکن دوسرا غیر ضروری

طور پر طویل ہے۔ ان کے یہاں ہندستانی معاشرت، غربت، سیاست اور معیشت کی زندہ تصویر کشی تو ہے لیکن محبت کے جذبات میں وہ پاکی کے بہرحال قائل ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کوئی ایسا کردار پیش کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے جسے ابدی اقدار کا حامل قرار دیا جا سکتا۔ وہ اپنی سادہ اور عام سی تحریر میں بیشتر مقامات پر ہندی، عربی یا فارسی کے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ان تمام کمیوں سے قطع نظر، مجموعی طور پر وہ ایک اول درجہ کے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

طویل افسانوں میں پریم چند کی پریم پچیسی اور پریم بتیسی نے بھی اس دور کے بیشتر افسانہ نگاروں کو متاثر کیا لیکن کلی طور پر ان کی تقلید کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔ ان کا اسلوب، طرزِ تحریر اور انداز بیان ان کا اپنا ہے۔ "کفن" کی کہانی اس دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہر اور فطری و فنی پلاٹ کی بڑی چابک دستی سے عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کے سب ہی افسانوں میں ہمیں، ماحول کی تنگی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے کیونکہ وہ صرف اسی دیہی ماحول کی تصویر کشی کرتے ہیں، جو رومان سے یکسر خالی ہو اور کرداروں کی تعمیر اخلاقی اصولوں کے تحت ہو۔ پھر بھی ان خشک موضوعات کو اپنے دلچسپ اندازِ بیان اور ہلکے پھلکے طنز و مزاح کی چاشنی سے مزین کر کے قاری کے انہماک کو وہ کسی بھی حالت میں کم نہیں ہونے دیتے۔

نمک کا داروغہ۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ روشنی۔ بڑے بھائی صاحب۔ اور غریب کی عید وغیرہ افسانے ان کی اعلا کردار نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ جبکہ ان کے آخری افسانے "کفن" کو دنیا کے بہترین افسانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ متاخرین میں سدرشن۔ علی عباس حسینی اور عادل رشید وغیرہ نے منشی جی کی تقلید کی کامیاب کوششیں کیں، اور افسانوی ادب میں کچھ نئے تجربے اور اضافے کر کے اسے نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ سادگی سے عام لوگوں کی کہانیاں کہنے والے منشی پریم چند اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے خواہ ان کے یہاں ڈرامائیت کی کمی اور چونکا دینے والے کرداروں کا فقدان ہی کیوں نہ ہو۔ سچ بات یہ ہے کہ ایک ناول نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے ان کی منفرد اور حقیقت کی ترجمان تحریریں، ہر دور میں اہم اور مسلم قرار دی جائیں گی۔

□□

ایک گفتگو —— صفحہ ۱۱ کا بقیہ

قاضی عبدالستار: میں بالکل روشنی نہ ڈالوں گا (ہنستے ہوئے) وہ بالا قساط چھپ رہا ہے۔ میں روشنی ڈالوں گا تو اس کا سسپنس کم ہو جائے گا۔

اختر بستوی: ہاں یہ تو ہے — اچھا قاضی صاحب! اس کے علاوہ یعنی "خالد بن ولید" کے علاوہ کیا کوئی اور ناول یا کوئی نیا اہم افسانہ لکھنے کا منصوبہ ہے؟

قاضی عبدالستار: نہیں۔ اس وقت تو صرف "خالد بن ولید" میں مبتلا ہوں اور جب وہ ختم ہو جائے گا تو....

اختر بستوی: قاضی صاحب! "مبتلا" ہوئے بغیر کوئی عظیم تخلیق وجود میں نہیں آتی۔

قاضی عبدالستار: بعض لوگ تو شام کو کہانی لکھتے ہیں، صبح کو چھپوا دیتے ہیں۔ چھ مہینے میں بھلا دی جاتی ہے۔

اختر بستوی: لیکن اس طرح کے لوگ قاضی عبدالستار تو نہیں ہوتے —— قاضی صاحب بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں گفتگو کا موقع عطا کیا۔

قاضی عبدالستار: آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے اس قدر محنت اور توجہ کے ساتھ بہت اہم سوالات کیے۔ میں رسمی آدمی نہیں ہوں، میرے دوست اور میرے شاگرد اور میرے بزرگ جانتے ہیں کہ میں رسمی آدمی مطلق نہیں ہوں، اور آپ یہ یقین مانیے کہ ایسے سوالات مجھ سے زندگی میں پہلی بار کیے گئے۔

اختر بستوی: قاضی صاحب! ذرہ نوازی ہے — بہت بہت شکریہ!

□□

لئیق رضوی
ڈی۔۱۴۴۸ - کریلی ۔ الہ آباد

اُردو میں شخصی مرثیہ کی روایت

(۱)

یہ سچ ہے کہ اُردو مرثیہ ابتداہی سے واقعات کربلا کے بیان کے لیے مخصوص رہا ہے اور اس کا بیشتر حصہ حضرت امام حسینؑ ان کے اقربا اور اصحاب کی شہادتوں کے پُردرد تذکروں پر مبنی ہے۔ لیکن اسکے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو ادب کے شعری سرمایہ میں ایسی نظمیں کثیر تعداد میں موجود ہیں، جن میں شعراء نے اپنے کسی عزیز یا سماج کی کسی اہم شخصیت کی وفات پر اظہارِ غم کے اشعار نظم کیے ہیں؎۱ یہ نظمیں بھی بلا شبہ مرثیہ نگاری کی تاریخ کا جزو ہیں۔

مرثیہ عربی لفظ رثا سے مشتق ہے جس کے معنی میت پر آنسو بہانے کے ہیں۔ لہٰذا ادب کی اصطلاح میں مرثیہ سے وہ اشعار مراد ہوتے ہیں جن میں کسی کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہو۔ حالی نے مرثیہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر جی کڑھانا اور اس کے محامد اور محاسن بیان کرکے اس کا نام دنیا میں زندہ کرنا"؎۲

مرثیہ کی اس جامع تعریف کے پیش نظر اس میں لفظ شخصی کا اضافہ بے معنی سا لگتا ہے اور شعوری طور پر افہام و تفہیم کے نئے مراحل سامنے آتے ہیں لیکن چونکہ واقعات کربلا اُردو مرثیہ کا بنیادی موضوع رہے ہیں اور اس تاریخی واقعہ پر اتنی بڑی تعداد میں مرثیے لکھے گئے ہیں کہ یہ صنف شاعری انھیں واقعات کے لئے مخصوص ہوگئی لہٰذا ان مرثیوں کو جو مختلف ادوار میں اہم شخصیتوں کی وفات پر لکھے گئے شخصی مرثیہ کے باب میں رکھا گیا ہے۔ الغرض شخصی مرثیہ سے ایسی نظمیں مراد ہوتی ہیں، جن میں شاعر نے اپنے کسی عزیز دوست یا رہنما کی موت پر اظہار غم کیا ہو، اس کے اوصاف بیان کیے ہوں اور اس کی موت سے ہونے والے نقصانات کی نشان دہی کی ہو۔ شخصی مرثیہ کا مقصد مرنے والے کی ذات سے اظہار عقیدت کے ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے دلوں میں اس کے لیے احترام و عقیدت کے جذبات پیدا کرنا بھی ہوتا ہے ڈاکٹر شارب ردولوی نے اچھی بات لکھی ہے:

> "مرثیے کے سلسلے میں شخصی مرثیے کی تفریق اور تقسیم بہت بعد کی ہے۔ اور یہ اصطلاحات صرف اُردو میں مستعمل ہیں۔ اس لیے کہ اُردو میں واقعہ کربلا پر اس کثرت سے مرثیے لکھے گئے کہ مرثیہ اُردو شاعری میں ایک اہم صنف بن گیا اور یہ اصطلاح واقعہ کربلا کے لیے مخصوص ہوگئی۔ اس واقعہ سے الگ اہم شخصیتوں کی وفات پر جو مرثیے لکھے گئے وہ شخصی مراثی میں شمار کیے گئے اس طرح مرثیے کی صنف دو حصوں میں منقسم ہوگئی"؎۳

شخصی مرثیہ کی نہ تو کوئی ہیئت مخصوص ہے اور نہ ہی اس کے اجزاء ترکیبی ہی مقرر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہر شاعر نے اپنی پسند کے فارم میں خیالات نظم کیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ رباعی، غزل، مثنوی، مخمس، مثلث، مسدس، مستزاد، ترکیب بند اور ترجیع بند تقریباً ہر مروجہ ساخت میں اس کے نمونے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ہیئتی تجربوں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور عہد حاضر کے بہت سے شعراء نے عروضی بندشوں کی نفی کرتے ہوئے آزاد اور نثری نظموں کے فارم

میں بھی شخصی مرثیے نظم کیے ہیں۔

دُنیا بھر کی تمام زبانوں میں شخصی مرثیہ کی روایت کسی نہ کسی رُوپ میں ضرور موجود رہی ہے۔ اگرچہ تاریخی طور پر بتا پانا کہ پہلا شخصی مرثیہ کب اور کس زبان میں لکھا گیا؟ بہت مشکل ہے۔ البتہ اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کا سلسلہ شاید اسی وقت شروع ہو گیا ہو جب انسان پہلی مرتبہ موت جیسی تلخ حقیقت سے آشنا ہوا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرثیہ نگاری کی تاریخ کم و بیش اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود نسلِ انسانی۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی:

"مرثیہ کو دنیا کی قدیم ترین اور نسلِ انسانی کی مشترک صنفِ کلام قرار دینا شاید غلط نہ ہوگا۔"[۴]

ڈاکٹر فضل امام نے صنفِ مرثیہ کی قدامت کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت آدم کو پہلا مرثیہ نگار قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ابتدائے آفرینش سے انسان میں فطری طور پر رنج و غم کا جذبہ رہا۔ اسے موت جیسی تلخ حقیقت سے بھی دوچار ہونا پڑا ہوگا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی زبان سے وفورِ الم و غم میں جو لفظیں نکلی ہوں گی وہی مرثیہ کی اولیں شکل ٹھہری ہوگی۔ تاریخِ شعر پر ایک ہلکی سی اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے پر پہلے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا نام سرِ فہرست آتا ہے جو بہ اعتبارِ تخلیق اور بحیثیت شاعر پہلے مرثیہ گو ہیں۔ جنھوں نے اپنے فرزند ہابیل کا مرثیہ کہا ہے"[۵]

اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی ادبیات میں بھی شخصی مرثیہ کی ایک باقاعدہ روایت رہی ہے۔ اور ان دونوں زبانوں میں ایسے بہت سے اشعار کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو اپنے مضمون کے لحاظ سے شخصی مرثیے کے زمرے میں آتے ہیں۔

عربی میں، جو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے، شخصی مراثی کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ بلکہ عربی کے رثائی ادب کا بیشتر سرمایہ شخصی مراثی پر ہی مبنی ہے۔ عربی شاعری کے جو اولین نمونے دستیاب ہیں، ان سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عرب میں شخصی مرثیے کی روایت بہت پُرانی ہے اور اس کا سلسلہ دورِ جاہلیت کی شاعری سے ملتا ہے۔ اس دور کے ایک اہم شاعر مہلہل نے اپنے بھائی کلیب کی موت پر انتہائی دردناک مرثیہ نظم کیا تھا۔ اسلامی دور کے شاعر مُتمّم بن نُویرہ کا مرثیہ، جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت سے متاثر ہو کر لکھا تھا، عربی رثائی شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ محض چار اشعار پر مشتمل یہ مرثیہ اپنے اندر درد و غم کی ایک پوری دنیا آباد کیے ہوئے ہے اور قاری یا سامع بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔

بعمری وما دهری بتابيان مالك
ولا جزعاً مما السمر فارجعا

وما كان وقافا اذالخيل اجمت
ولا طائيا من خشيه الموت مفزعا

لقد غيب المنهال تحت رواله
فتى غير صبطان العشيات اردعا

وارمله قدعوبا شعت محثل
كفرخ الحبارى ريشه قدتمتوبما

اس مرثیہ کے تعلق سے ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب حضرت عمر فاروق کو ان اشعار کی بابت معلوم ہوا تو انھوں نے متمم کو بلا کر اپنے بھائی زید کے لیے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔ متمم نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن بعد میں خلیفۂ وقت کے اصرار پر راضی ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد متمم نے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر چند اشعار سنائے۔ اگرچہ ان اشعار میں فنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا تھا، مگر مرثیہ حقیقت میں "درد" کی باتوں سے خالی تھا۔ اشعار سننے کے بعد حضرت عمر نے جب متمم سے اس بابت دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ:

"امیرالمومنین! زید آپ کے بھائی تھے میرے بھائی

: تھے : ۔

عربی مرثیہ کی تاریخ میں خنساء کے مرثیے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خنساء کو اپنے بھائی صخر سے بے انتہا الفت تھی۔ وہ ایک جنگ میں کام آیا تو بہن کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اسی جنون اور دیوانگی کے عالم میں خنساء نے صخر کا انتہائی غم انگیز مرثیہ کہا۔[۵] نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

اهاج حزنك ام بالعين عوار
آدم ذرفت ام خلت من اهلها الدار

ياصخر ووراد ماء قد تناذره
اهل الموارد ماغي ورده عار

كان عيني لذى اذا خطرت
فيض يسيل على الخدين مدار

اغروا بانا تيهم هذاه به
كانه علم في راسيه نار

فارسی میں بھی شخصی مرثیہ کی روایت، شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی قائم ہو گئی تھی۔ رودکی نے، جو فارسی کے قدیم شعراء میں سے ایک ہے، اپنے ہم عصر اور مشہور و معروف شاعر ابوالحسن شہید بلخی کی وفات (۳۲۵ھ) پر مرثیہ نظم کیا تھا[۶] ملاحظہ فرمائیں ؎

کاروان شہید رفت از پیش
وان ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم
وز شمار خرد ہزاران بیش

رودکی کے علاوہ بھی بہت سے ممتاز اور نامور شعرائے فارس کے یہاں شخصی مراثی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں عمارہ، روزبا فرخی، انوری اور فردوسی کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہنامہ کی تصنیف کے دوران فردوسی کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اسے سخت رنج ہوا۔ چنانچہ اس واقعہ کا ذکر شاہنامہ میں موجود ہے۔[۷]

فردوسی کے یہ اشعار اس کے رنج و غم کے آئینہ دار ہیں ؎

مگر بہرہ گیرم من از پند خویش
براندیشم از مرگ فرزند خویش

زبدہا تو بودی مرا دستگیر
چرا راہ جستی ز ہمراہ پیر

فرخی نے سلطان محمود کی وفات پر جو نظم کہی تھی اس میں مرثیہ کے تمام لوازم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار
چہ فتاد ست کہ امسال دگرگوں شد کار

ان چند اشعار کے علاوہ بھی عربی اور فارسی ادبیات میں شخصی مراثی کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور جن پر بحث بھی ہونا چاہیے تھی لیکن چونکہ یہ مضمون اردو کے شخصی مرثیوں سے متعلق ہے۔ لہٰذا اختصار کے پیش نظر ان تمام مرثیوں کا تذکرہ نہ ضروری ہے اور نہ ممکن۔ اس باب میں الگ سے کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔

اردو میں شخصی مرثیہ کے آغاز کا سہرا عام طور سے غالب اور مومن کے سر جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی اور فارسی ہی کی طرح اردو میں بھی شخصی مرثیہ کی روایت بہت پرانی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے محققین اور ناقدین نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی اور نتیجے کے طور پر ہم اس عظیم ادبی ورثہ سے کٹتے چلے گئے۔

اس بے توجہی سے ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ شخصی مراثی کا بیشتر قدیم سرمایہ یا تو ضائع ہو گیا یا تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں کھو گیا لیکن اس کے باوجود اردو کے قدیم شعری سرمایہ میں اب بھی ایسے اشعار تلاش کیے جا سکتے ہیں جو شخصی مرثیہ کے باب میں آتے ہیں۔

اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت دکن سے شروع ہوتی ہے جہاں شاہ برہان الدین جانم (وفات ۹۹۰ھ) نے اپنے والد شاہ

میراں جی، جو خود بھی شاعر تھے' کی وفات (۹۰۲ھ) پر ایک طویل نظم لکھ کر اُردو میں شخصی مرثیہ نگاری کا آغاز کیا۔ مربع کے فارم میں لکھے جانے والے اس مرثیہ میں کل ۴۲ بند ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ۱۵ دوہے بھی شامل ہیں۔ مرثیہ میں میراں جی کی تاریخ وفات کا مادہ بھی نکالا گیا ہے۔

اس مرثیہ کے متعلق اگرچہ ڈاکٹر عبدالحقؒ نے بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ اطلاعات ادھوری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرثیہ سے بے خبری کے باوجود مرثیہ نگار کی شخصیت سے بے خبر تھے۔ اس کے برخلاف محمد اکبرالدین صدیقی کی فراہم کردہ اطلاعات مکمل اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"مرثیہ مربع کی صنف میں ہے۔ اس میں ۴۲ بند ہیں اور درمیان میں جگہ جگہ دوہرے بھی کہے گئے ہیں، جن کی تعداد ۱۵ ہے۔ یہ مرثیہ حضرت شمس العشاق کے صاحبزادے برہان الدین جانم کا ہے وہ دوہرے اور کبت وغیرہ لکھنے میں ماہر تھے۔" [۱۱]

اکبرالدین صدیقی نے مرثیہ کے جو چند اشعار درج کیے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

شاہ میراں جی، جگ رتن، سو ہے رتن منج دل کندن
لیتا چھونا اپنی اِذن، جے کچھ حکم الہٰی کا

سو ہے میراں مج پیر ہے' اوس روز کا دستگیر ہے
تج بن میں سیر ہے، جے کچھ حکم الہٰی کا

دوھرا

بن نیل دیوا کیوں جلے دو نکھ بیکھی جوں پھرے
یو جیو بادل تج بنا، بن جل مچھی تڑپیا کرے

تجھ سوز بر ہے داغ پر، جوں موم گلتا آگ پر
یوں دکھ لکھیا تج بھاگ پر جے کچھ حکم الہٰی کا

منج باج ناکچ غم کرو، توکل تجہ اسی پر دھرو
بولیا چالیا تم معاف کرو، جے کچھ حکم الہٰی کا

دوھرا

کوئی نار ہیں ات جگ دوئی سب جگ مرن ہار
کوئی آنگیں کوئی پیچھیں پنتھ لگے سیتن چلن ہار

جے کوئی ولی ہور اولیا سب کوئی پیالہ یہ پیا
جس جیو دیا اوس موت دیا، جے کچھ حکم الہٰی کا

جے غوث قطب وے بڑے جن کے مکٹ رتن جڑے
سو ہے اندھارے گور پڑے' جے کچھ حکم الہٰی کا

منج ہے دیو مشغول سوں، ناکوئی اٹھو تم غول سوں
خوشنود رب کے قول سوں، جے کچھ حکم الہٰی کا

دوھرا

جسے کوئی جیوین سب مریں دائم جیوٹے ناکوے
قیامت لگ جسے جیویں تو آخر مرنا ہوئے

تاریخ ومقام

تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو
دو دن مدت وفا شو، جے کچھ حکم الہٰی کا

اربع سوں یو سال ہے ماہ ہے کود شوال ہے
رحلت کیے اس حال ہے، جے کچھ حکم الہٰی کا

تاریخ بست وپنج بود، بسیار گریاں رنج شد
درحال واصل گنج خود، جے کچھ حکم الہٰی کا

شب پنجشنبہ روشن کیا، ہجرت منور پور کیا
جیوڑا قبض کر آن لیا، جے کچھ حکم الہٰی کا

دُنیاں کا پنج پدرا ہے، اور دین منج لنگرا ہے
اس دکھ کا منج عذرا ہے، جے کچھ حکم الہٰی کا

دنیا تھے منج فاضل کیا، اور دین منج کامل کیا
باحق مجھے حاصل کیا، جے کچھ حکم الہٰی کا

دوھرا

جگ چنتاؤں من تو میراں قلب دکھ ایسا توں دسے
سو ہیچ جینا سایخ کر سنگت ترے جی بسے

تج بن شکوہ نا پاؤں منج دکھ گھیرا ہوئے
اکھر مرے یوں لکھے بیٹ نا سکے لوئے

مقام کا ذکر

روضہ منور پور ہے ، مقام تج شاہ پور ہے
دین دنیا میں ظہور ہے ، ہے کچھ حکم الہی کا

اس سلسلے کا دوسرا اہم مرثیہ جعفر زٹلی کا ہے ، جو اس نے مغل بادشاہ اورنگ زیب کی وفات پر نظم کیا تھا ۔ اس مرثیہ میں جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے کردار اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے علاوہ اس عہد کے سماجی اور سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ :

"اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں جعفر نے مختلف انداز سے تین نظمیں اور ایک قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے ۔ اور ان حالات پر روشنی ڈالی ہے جو عالم گیر کی زندگی میں اس کے بیٹوں نے اس کے لئے پیدا کر دیئے تھے .....

...... تیسری نظم میں اورنگ زیب کا مرثیہ لکھا ہے ۔ اس کے کردار ، شجاعت و بہادری ، تدبر و حکمت ، تقویٰ و پاکبازی کی تعریف کر کے اس صورت حال پر روشنی ڈالی ہے ، جس سے سارا ملک دوچار تھا ۔" ۱۲

یہ مرثیہ جعفر زٹلی کے دیوان کے بعض قلمی نسخوں میں موجود ہے ، جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی مشہور کتاب " اردو شہ پارے " میں شامل کر کے شائع کر دیا ہے ۔ اس مرثیہ میں چھ اشعار ہیں جن میں پہلا شعر فارسی میں ہے ۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

اکل بے کل ہوا سنسار سارا
سنجوں طیار شد مریخ تارا

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

درکت کی انجھوؤں جگ روتا ہے
نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

(جاری)

حواشی

۱۔ تذکرہ اردو مرثیہ ۔ علی عباس حسینی (لکھنؤ ۱۹۷۲ء) ص ۲۱۴
۲۔ مقدمہ شعر و شاعری (الہ آباد) ص ۳۳
۳۔ سہ ماہی فکر و آگہی (رفعت سروش نمبر ۱۹۹۰ء) ص ۲۰۸
۴۔ دبستان دبیر (لکھنؤ ۱۹۶۴ء) ص ۲۶
۵۔ انیس شخصیت اور فن (۱۹۸۲ء دہلی) ص ۱۸-۱۱
۶۔ موازنہ انیس و دبیر : شبلی نعمانی (الہ آباد ۱۹۸۱ء) ص ۲۴
۷۔ " " " ص ۲۵
۸۔ تاریخ ادبیات ایران (دہلی ۱۹۸۵ء) ص ۵۵
۹۔ شعر العجم جلد اول ص ۱
۱۰۔ رسالہ اردو ۔ اپریل ۱۹۲۷ء ص ۹
۱۱۔ مقدمہ کلمۃ الحقائق ص ۴
بحوالہ مقدمہ معز مرغوب و چہار شہادت
مرتب محمد ہاشم علی (حیدر آباد ۱۹۶۶ء) ص ۲۶
۱۲۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول ص ۱۰۴

ایجنٹ حضرات کو نیا دور بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جاتا ہے ۔ اکثر ایجنٹ حضرات وی۔پی نہیں چھڑاتے جس سے ادارے کو دوہرا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ اس لیے براہ کرم وی۔پی ضرور چھڑا لیا کریں ۔ وی۔پی واپس کرنے کی صورت میں ایجنسی ختم کی جا سکتی ہے ۔

(ادارہ)

غزلیں

یہاں سکون بھی اب اضطراب جیسا ہے
یہ زندگی کا سمندر سراب جیسا ہے
جو بادلوں میں چھپا ہے چمک نہیں سکتا
مرا نصیب اسی ماہتاب جیسا ہے
مری حیات کے صفحوں پہ خوشبوؤں سے لکھا
ہر ایک لفظ تمھارے شباب جیسا ہے
تمھیں یہ لوگ صلیبوں پہ نصب کر دیں گے
تمھارا چہرہ مقدس کتاب جیسا ہے
کرم کی بھیک سے بہتر تو موت ہے ثروت
کرم اب اہلِ کرم کا، عذاب جیسا ہے

ثروت صدّیقی

۵/۴۴۔ گوزری۔ امروہہ
۲۴۴۲۲۱

آخر یہ تو نے کیا ستم ایجاد کر دیا
اک شہرِ غم سا آنکھوں میں آباد کر دیا
مجھ کو گراں گزرنے لگی قیدِ جسم بھی
اس نے کرم کیا مجھے آزاد کر دیا
فطرت کی طرح وہ بھی تلوّن پسند تھا
گہہ شاد کر دیا گہے ناشاد کر دیا
تعمیرِ نو ہماری ہے اس کے خیال میں
دُنیا سمجھ رہی ہے کہ برباد کر دیا
ملتے رہی اس سے کیا یہ ہوا تم کو واحدی
شکوے کو بھی بصورتِ فریاد کر دیا

ڈاکٹر ایس اے واحدی

۱۸ اے قلی بازار۔ کانپور

سُنا گئیں تری یادیں کہانیاں کیا کیا
تڑپ اُٹھی ہیں نگاہوں میں بجلیاں کیا کیا
بہت قریب سے گزرے تھے زندگی کے کبھی
حسین خوابوں نے بخشے تھے آشیاں کیا کیا
سوال آج بھی کرتی ہے گردشِ دوراں
حسین لمحوں نے دی تھیں نشانیاں کیا کیا
کبھی جو ہم کسی دردآشنا کے ساتھ چلے
اٹھیں نہ ہم پہ زمانے کی انگلیاں کیا کیا
عمل پذیر ہیں تنویر کی تباہی کو
امیرِ شہر کی ریشہ دوانیاں کیا کیا

سیّد عباس رضا تنویر ہالی

آر۔ ایس ٹی ۱۳۵/
شکیت رائے گورنمنٹ کالونی
لکھنؤ

روح سے زندگی کے اُجالے گئے
خلد سے جب سے آدم نکالے گئے
ان کی یادوں کا جب سلسلہ مل گیا
زخم دل کے ہم اپنے سجالے گئے
میرے ارماں کی کشتی تھی منجدھار میں
غم کے طوفان اٹھے اور بہالے گئے
اس نے وعدہ کیا وہ ہے وعدہ شکن
ہم نے وعدہ کیا اور نبھالے گئے
شیخ جی میکدے میں گئے رات کو
ہوش میں تھے کہاں جب سنبھالے گئے

ڈاکٹر ہنومان پرشاد سریواستو جگن بستوی

گاندھی نگر
بستی

افسانہ

شاهد صبیح الزماں
ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ

انتساب

[illegible] ـــــ تن پر پڑے چلن کے پردوں کے [illegible] روایتی علامتیں نہیں تھیں بلکہ [illegible] ـــــ ان بوسیدہ ٹوٹی محرابوں کے نام [illegible] ـــــ ان دالانوں کے نام جس کی دیت [illegible] زخمی [illegible] اب بھی [illegible] دکھائی دیتی ہیں ـــــ اس [illegible] ... چھک چھک کرتی ریل گاڑی کے نام جو اس [illegible] دالانوں کو پار کرتی زندگی کی [illegible] کی کش مکشوں سے بے نیاز اس زینے [illegible] اتر کر پھر دالان در دیچے صحن [illegible]

آج اندازہ ہو رہا ہے کہ کہانی، کتاب ... آپ بھی ابھی تک [illegible] انتساب کے ۔ کہانی پوری ہو جاتی ہے [illegible] لیکن انتساب ادھورا ہی رہتا ہے [illegible] اپنے جذبات کا نچوڑ ان چند سطروں میں سمونا چاہتا ہے [illegible] جذبات کا نچوڑ لفظوں میں ڈھل نہیں پاتا ـــ جیسے اس آٹھ [illegible] ... چھک چھک کرتی ریل گاڑی کی بات ہے ۔

[illegible] میں دم کر دیا ہے اس ہر وقت کے کھیل نے ارے کسی وقت تو چین سے بیٹھا کرو ۔

" اُف نوہ ـــ دیکھو انگنی کے سارے کپڑے زمین پر آگئے ابھی بتاتی ہوں تم سب کو ۔"

" ٹھہر تو جا انجن کے بچے ! ابھی خبر لیتی ہوں ـــ جتنا بڑا ہوتا جا رہا ہے، ہڑدنگا بڑھتا جا رہا ہے ۔"

کیوں ـ اسے کیوں نہیں کھلا رہے ہو تم لوگ ـ الگ کھڑا [illegible]

" ہاں ! یہ دوڑ پاتا نہیں، بار بار گر پڑتا ہے ۔"

" تو دھیرے سے چلو ـ کون سی جلدی ہے ـ مگر اسے بھی کھلاؤ ۔ چھوٹا ہے، اپنی عمر کے ہی حساب سے تو چلے گا ۔

اچھا چلو ـ تم پہلا ڈبہ ـ تم دوسرا ڈبہ ہوگی ـ اس کے پیچھے تم کھڑے ہو ـــ پھر تم ـ نہیں تم پانچواں ڈبہ ہو ـ یہ ڈاک کا ڈبہ ہے ـــ ابھی چوتھا ڈبہ تم بن جاؤ ـــ یہ فرسٹ کلاس ہے نا، تم فرسٹ آئی تھیں نا ـ اور آخر میں تم آجاؤ ـ گارڈ کا ڈبہ بن کر ـــ مگر بھئی تیز تیز دوڑنا ـــ ورنہ گاڑی آگے نکل جائے گی اور گارڈ صاحب پیچھے رہ جائیں گے ـــ اچھا ریڈی ـــ ارے چوٹی چھوڑو، نہیں یار نہیں [illegible] پکڑو ـــ چلو تم بنیان پکڑ لو ـــ ہاں تو ریڈی ـــ گو ... چھک چھک ۔

دور تک زمینوں کے سلسلے، کچھ سرسبز، کچھ بنجر ـــ کچھ دور تک پیڑوں کے جھنڈ ـ پھر چٹیل میدان ـــ کہیں آسمان پیڑوں کی اوٹ میں ہو گیا تو کہیں زمین پر جھک کا سرگوشی کرتا لگ رہا ہے ـــ شاید اپنے سرزد زمین پر مظالم کے لئے اپنی مجبوریاں بتا رہا ہو ـ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی بہت بھیڑ ہے ـــ مختلف چہرے، مختلف لباس، مختلف لہجے ـــ مگر پھر بھی بہت سناٹا ہے ـــ ہر شخص تنہا ہے ـــ اس سناٹے سے اکتایا ہوا ـ کیسے منزل آئے اور وہ اس تنہائی سے نجات پائے لوہے کی پٹریوں پر دوڑتے پہیوں کی رگڑ، ہوا کی ٹکریں، لوہے کے

مختلف زاویوں کے ٹکڑے۔ ایک میں ایک جڑے ہوئے، ایک سے ایک ٹکراتے، ریل گاڑی کی حرکت میں کتنی آوازیں تھیں جو مل کر ایک مستقل آواز بن کر کانوں سے ٹکرا رہی ہیں ـــ ایک تال میں، ایسی تال جو ڈھیر سے ڈھیر سے دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ آوازوں کا احساس ختم ہو گیا ـــ بس دل کی دھڑکنیں رہ گئیں ـــ اور جب گاڑی اچانک رکی تو لگا دل کی دھڑکنیں رک گئیں ــــــ ...
رکیں تو نہیں، مگر اس تال کا سہارا اچانک ختم ہو جانے سے سنبھلنے میں تھوڑا وقت تو ضرور لگا۔

اُف فوہ۔ پتہ نہیں یہ لڈو کیوں ہمارے ساتھ لگ جاتا ہے۔ بار بار پیچھے چھوٹ جاتا ہے ... ساری ریل خراب ہو جاتی ہے ..
ارے ارے روئے مت۔ ذرا سی بات ہوئی اور رونا شروع ۔ چلو پکڑو قمیص پیچھے سے ـــ ہاں تو ٹھیک ہے۔ چلیں ' ــ کو "

ایک ساتھ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر چیز مختلف ہے۔ پیڑوں کی قسمیں، کھیتوں کی پوھدیاں ـ کہیں کہیں پر گھر ـ کہیں ایک کہیں دو، کہیں زیادہ ـــ بکھرے بکھرے ہوئے، بے ترتیب۔ دیکھنے میں پُرسکون ـــ مگر اس ہر لمحہ بدلتے منظر میں عجیب اکتا دینے والی یکسانیت تھی۔ گاڑی کی حرکت سے پیدا تال پر منظر بدل رہے ہیں۔ سامنے بیٹھے زیادہ تر لوگ گردو پیش سے بے نیاز اونگھ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے انھیں کسی منزل پر پہونچنا تو ہے مگر وہ جانتے ہیں کہ وہاں پہونچ کر بھی وہ کہیں نہیں پہونچ پائیں گے۔

شاید سینے کی جکڑن تھی یا کچھ اور ـــ یقین نہیں آتا کہ اتنے چھوٹے سے گلے سے ایسی کرخت آوازیں نکل سکتی ہیں ـ اتنی تیز آواز ہوتے ہوئے بھی گھٹی گھٹی سی لگتی تھی ـ یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ گلے یا سینے کے کس حصے سے یہ کرخت آوازیں پیدا ہو رہی ہیں۔ خود اپنا دم گھٹا جا رہا تھا یہ دل خراش آوازیں سُن کر ـ نرم و نازک پسلیاں کمزور سینے کے اندر سانس بھرنے میں اپنی پوری محنت صرف کر رہی تھیں پھر بھی ضرورت بھر کی ہوا اندر نہ پہنچا پا رہی تھیں ـ مضمحل چہرے پر نیلے نیلے ہونٹ ـــ ایک پر ایک بھینچے ہوئے ـ پھر بھی نہ معلوم کہاں سے وہ آوازیں نکل کر دور دور تک ماحول کو کرب ناک بنا رہی تھیں ـــ اب وہ رو نہیں رہا تھا، شاید تکلیف کا احساس ختم ہو گیا ہو یا پھر رونے کی سکت نہ رہی ہو ـــ اور پھر اچانک وہ آوازیں بند ہو جانے سے ماحول اور کرب ناک ہو گیا۔

اس بار بار پیچھے رہ جانے والے ڈبے کے بغیر وہ ریل گاڑی پھر نہ دوڑ سکی ... سب سے بڑا ہونے کے ناتے دل نہ چاہتے ہوئے بھی کئی بار کوشش کی ۔ " آؤ بھی آج ریل گاڑی بنائی جائے .. ہم ہیں انجن اور تم چلو انجن کے پیچھے مال کا ڈبہ بن جاؤ ـــ میری قمیص زور سے پکڑ لو ... تم دوسرا ڈبہ بن جاؤ، فراک کا کونا پکڑ لو کس کے، کہیں چھوٹ نہ جائے ... تم تیسرا ڈبہ ـــ . . . ارے ادھر کھڑی کیا کر رہی ہو۔ چلو پکڑو اس کی بشرٹ چلو آج تم فرسٹ کلاس بن جاؤ ـــ اور گارڈ کا ڈبہ ـــ ۔ چلو چلو ریڈی ہو جاؤ، گاڑی چلتی ہے ، ہاں تو کو .... مگر آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی ۔ ـــ آج یہ ریل گاڑی تیز دوڑ سکتی تھی ـــ آج شاید اماں بھی نہ بگڑتیں انگنی سے الجھنے پر ـــ مگر سب ایک دوسرے کے کپڑوں کے کونے پکڑے خاموش کھڑے تھے۔ کسی کے پیروں کو جنبش نہ ہوئی ... پھر دھیرے دھیرے ہاتھوں کے کپڑے چھوٹتے گئے اور میں، انجن کیا کھڑا رہ گیا، بے بس!

گاڑی کی چال کچھ دھیمی ہو رہی ہے ـــ شاید کوئی اسٹیشن آ رہا ہے ... گاڑی بڑے سے موٹے لکڑی کے دروازے سے ہوتی ہوئی چلمن کو پار کر کے آدھی آنگن میں اور آدھی دالان میں جا کر رک گئی ـــ انجن میں بیٹھا میں ـــ ڈر کے مارے کانپ اٹھا ـ ابھی اماں ڈانٹیں گی ـ مگر ان کی کوئی بات نہیں، اگر ابا گھر پر ہوئے تو شامت ہی آ جائے گی ـ... پھر خیال آیا کہ ابا کہاں؟ وہ تو عرصہ ہوا انتقال کر چکے ہیں ـــ ان کے انتقال کے بعد ہی تو میری شادی ہوئی تھی اور اب تو میرا لڑکا پندرہ سال کا ہونے کو تھا ـــ ڈرتے ڈرتے انجن سے قدم نکالا تو سب کچھ ویسا ہی تھا ـــ اماں کمرے کے در میں تخت پر بیٹھی پاندان سامنے رکھے ڈلی کاٹ رہی ہیں ـ یا شاید آنکھوں پر وہی سیاہ فریم کا گول چشمہ لگائے کوئی کتاب یا اخبار پڑھ رہی ہیں ـــ اخبار وہ بہت پابندی سے پڑھتی ہیں اور ان کی سیاسی معلومات کے سبھی قائل ہیں ـــ ابا بھی ـــ اماں نے

ایک اچٹتی سی نظر انجن پر ڈالی اور ڈولی کاٹنے یا کوئی کتاب یا اخبار پڑھنے میں مصروف رہیں — شاید دالان میں تازہ سفیدی ہوئی تھی — زمین پر ابھی بھی چونے کے دھبّے دکھائی دے رہے ہیں — دروازوں پر بھی چونے کی چھینٹیں صاف نظر آ رہی ہیں — میں نے آگے بڑھ کر دالان سے ملحق کمرے کا پردہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا — مگر وہاں پردہ نہیں تھا۔ دروازہ بھی نہیں تھا۔ وہاں ایک بڑی سی لکڑی کی الماری رکھی ہے — اسی طرف سے ابّا آتے تھے۔ ان کی آرام کرسی گرد سے اٹی ہوئی اس لکڑی کی الماری کے برابر ہی رکھی ہے — معلوم نہیں کیوں احساس ہوا کہ ابا اس الماری کے اندر بیٹھے ہیں۔ کہیں ان کا دم نہ گھٹ رہا ہو۔ میں نے بڑھ کر الماری کا پٹ کھول دیا۔ ہزاروں کاغذ کے ٹکڑے، گرد کی تہوں میں لپٹے زمین پر آ رہے — میں نے انھیں اٹھا کر دیکھنا چاہا، مگر ہاتھ میں کاغذ نہیں آئے۔ صرف گرد ہاتھ آئی۔ نہ معلوم کیوں یہ احساس پھر بھی بنا رہا کہ ان گرد آلود کاغذ کے ٹکڑوں کے پیچھے یہاں ابّا تھے۔

میں اماں کے پاس آیا۔ کچھ پوچھنے جا رہا تھا کہ دیکھا چوکی پر اماں نہیں ابّا بیٹھے ہیں — وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے — میں نے گھبرا کر مڑ کے انجن کی طرف دیکھا۔ اور میری جان میں جان آئی۔ انجن وہاں نہیں تھا — میرا خیال غلط تھا۔ ابا کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا، پہلے تو اماں کا انتقال ہوا تھا کتنے خاموش ہو گئے تھے ابا تب۔ اندر آتے ہی بہت کم تھے۔ آج معلوم نہیں کیسے یہاں آ کر بیٹھے لکھ رہے تھے — مگر وہ یہاں آئے کیسے؟ وہ تو چل ہی نہیں پاتے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں پاتے۔ اتنا تیز ذہن، اتنا قوی حافظہ — معلوم نہیں کیا کیا یاد تھا۔ ہم لوگ سنتے سنتے پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ عجیب بات تھی۔ لوگ دور دور سے آتے تھے ان سے باتیں کرنے۔ پتہ نہیں کیا کیا لکھ کر لے جاتے تھے یہاں سے، اور ہم ان کے علم سے پریشان ہو جاتے تھے۔ کچھ کمزور سے، چھوٹے سے لگے ابا — میں نے غور کیا تو ان کے پیر ہی نہیں تھے — اسی لیے وہ لیٹے تھے۔ پتلے پتلے کمزور ہاتھ، قلم ہی کی طرح پتلے۔ میں نے بڑھ کر دیکھا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ مگر کاغذ سادہ تھا، یا شاید کوئی ایسی تحریر تھی جس سے میں واقف نہیں تھا۔ ان کے اردگرد ایسی ہی تحریروں کے انبار نظر آئے۔ مگر ان پر کوئی تحریر نہیں تھی — یہ دیمکوں کی راہ گزر کے نشان تھے۔ کاغذوں سے ہوتی ہوئی دیمکیں ابّا کے جسم کو کھوکھلا کر رہی ہیں — اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں اب بھی چمک تھی، مگر ہر طرح کے تفکر سے عاری۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں، وہ کسی کو بھی نہیں پہچان رہے تھے۔ میں بیکار ہی ڈر رہا تھا۔ ابّا تو کسی کو ڈانٹنے کے قابل ہی نہیں تھے — بہت جی چاہ رہا تھا کہ ابّا کچھ بولیں — کوئی قصّہ سنائیں۔ کوئی شعر گنگنائیں۔ بگڑیں۔ مگر یہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ بس لاشعوری طور پر لوہے کی پٹریوں پر دوڑتی ریل گاڑی کی آواز ذہن پر مسلط رہی — میری زندگی کا بڑا حصّہ اسی آواز کے ساتھ گزر رہا ہے — ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اور آواز ہے ہی نہیں اس زندگی میں — یا پھر دنیا کی ساری مختلف آوازیں یکجا ہو کر ایک آواز پیدا کر رہی ہیں۔

زمین پر تازہ سفیدی کے دھبّے نہ تھے۔ بوسیدہ دیوار اور کمزور چھت سے پرانا پلاسٹر جھڑ کر جگہ جگہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ زینے پر اچانک آہٹ کا احساس ہوا — اور بغیر کسی آواز کے بچوں کی قطار اترتی دکھائی دی — میں گھبرا کر ابّا کی طرف مڑا۔ مگر وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ شاید اپنے کمرے میں ہوں گے، ورنہ سب کی ابھی شامت آ جاتی۔ زینے کی دو تین نیچے کی سیڑھیاں تو بالکل ٹوٹ کر غائب ہو چکی تھیں۔ آج اس آٹھ بچوں کی ریل گاڑی کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں لپک کر انجن کی جگہ پہونچ گیا اور آگے آگے دوڑنے لگا۔

آنگن سے ہوتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا ہی دوڑ رہا ہوں، آنکھیں بند کیے — میں نے آنکھیں کھول کر مڑ کے دیکھا — دور تک پھیلے زمینوں کے سلسلے کچھ سرسبز، کچھ بنجر، کچھ دور تک پیڑوں کے جھنڈ، پھر چٹیل میدان سامنے کچھ چہرے بدلے ہوئے لگے — چہرے بدلے تھے مگر چہروں کی کیفیتیں وہی تھیں — وہی اکتاہٹ۔ وہی بے کیفی — وہی اردگرد سے بے تعلقی — وہی بے منزل سفر کا احساس۔ جیسے سب

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

جیوتی سروپ سنگھ
بروقہ۔ اعظم گڑھ

شیرازِ ہند — جون پور

کسی زمانے میں مشرقی ہندستان میں جون پور اور بنگال دو ہی خاص صوبے تھے۔ آج کا صدر، کیراکٹ، مچھلی شہر، مڑیاہوں اور شاہ گنج تحصیلوں والا جون پور تو بہت چھوٹا ہے۔ صوبہ جون پور کی سرحدیں ترہت (بہار) سے لے کر قنوج اور علی گڑھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسے دہلی کے بادشاہ فیروز تغلق نے اپنے چچازاد بھائی محمد جونا کی یاد میں (۹۴-۱۳۹۳ء) میں بسایا تھا۔ فیروز شاہ نے فیروز آباد، فیروز پور اور حصار شہر آباد بھی بسائے تھے۔ لیکن جون پور کی حیثیت ہی کچھ دوسری تھی۔ یہ علم و ادب کا مرکز تھا۔ یہاں عالمی شہرت کے لوگ رہتے تھے تاریخ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری کے مصنف ضیاء الدین برنی نے اس شہر کی تعریف کی ہے۔

جون پور کے شرقی حکمرانوں نے جون پور کو شیرازِ ہند بنا دیا تھا۔ رعایا بہت ہی خوش حال تھی فنکاروں کی بڑی عزت تھی۔ اس زمانے میں فن، ادب، علم اور موسیقی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ گائیکی اور طبلہ نوازی کے فن کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ جونپور کی ٹھمری اور توڑی آج تک مشہور ہے۔

شرقی حکمرانوں نے دہلی کے بادشاہ کو شکست دینے کے ہمیشہ منصوبے باندھے، جب دہلی کا بادشاہ بہلول لودی (۸۹-۱۴۵۱ء) سرہند پر حملہ کرنے گیا تو موقع اچھا پاکر جون پور کے شرقی حکمراں محمود شاہ نے ایک لاکھ ستر ہزار گھڑ سوار اور چودہ سو ہاتھیوں کی فوج لے کر دھاوا بول دیا۔ اس کی فتح یقینی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن سپہ سالار دریا خاں لودی کی غداری کی وجہ سے بے چارہ شکست کھا گیا بعد کے شرقی حکمرانوں محمد شاہ اور حسین شاہ نے بھی بہلول لودی سے اپنی دشمنی برقرار رکھی اور اسے شکست دینے کے لیے کوشاں رہے۔ حسین شاہ نے جمنا ندی کو پار کرکے بہلول لودی کی فوج کو شکست بھی دے دی۔ بعد میں دونوں میں معاہدہ ہو گیا۔ لیکن جب حسین شاہ واپس جانے لگا تو بہلول لودی نے اس پر اچانک حملہ کرکے جون پور کو اپنی ریاست میں ملا لیا۔ اس طرح مسلسل ۲۵ سال تک جنگ کرنے کے بعد بہلول لودی جون پور پر قبضہ کر سکا۔

جون پور کے تذکرے میں ابراہیم شرقی اور حسین شاہ شرقی کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ابراہیم شرقی اتنا سخی اور علم دوست تھا کہ اس کی فیاضی سے متاثر ہوکر دور دراز سے علماء و فضلاء آکر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان عالموں میں دہلی کے قاضی ملک العلماء شہاب الدین خاص تھے۔ اسی زمانے میں "سنگیت شرومنی" جیسی موسیقی کی کتاب کی تخلیق ہوئی۔

حسین شاہ شرقی (۱۵۰۰-۱۴۶۲ء) موسیقی کا اتنا ماہر تھا کہ اسے 'خیال' کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہی نہیں، اس نے بارہ راگوں کو بھی ایجاد کیا۔ نواب واجد علی شاہ نے اسے خیال کا "نایک" کہا ہے۔

جون پور کی تاریخ دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ان میں سے چند واقعات کا ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں چوگان کھیلتے ہوئے بادشاہ سکندر لودی کے کچھ سردار جب آپس میں جھگڑا کرنے لگے، تو بادشاہ نے جو وہاں موقع پر موجود تھا

اس میں سے سرکشی کرتے عالم گاڑوں سے بچوایا۔

اسی جون پور میں ایک بار بادشاہ اپنے خاص امرا کے ساتھ آیا۔ اس ملاقات میں شیخ بہلول بھی ساتھ تھے۔ بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ موسیقی کے استاد تھے۔ اتفاق سے وہ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ بیس دن تک بغیر کچھ کھائے بستر پر پڑے رہے۔ جون پور کے مشہور صوفی شیخ [illegible] نے مشورہ دیا کہ موسیقی کی ایک محفل آراستہ کی جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ [illegible] شیخ بہلول کے دل پر [illegible] ایسا اثر ہوا کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ان کا بخار اتر گیا۔ اس کے بعد آرام سے انھوں نے کھانا کھایا۔

شیخ بہلول کی موسیقی اور [illegible] کے پیچھے ایک بار جہاں [illegible] بادشاہ [illegible] کے ساتھ جون پور میں تشریف لائے۔ ایک رات [illegible] موسیقی کی محفل آراستہ کی۔ جب کسی گلوکار کا گانا [illegible] اور سامعین پر کوئی اثر نہیں ہوا تو شیخ بہلول خود گانے بیٹھے۔ انھوں نے ایسی [illegible] کہ سننے والے [illegible] جن میں کچھ صوفیا بھی شامل تھے [illegible] مورخ ملا عبدالقادر بدایونی [illegible]

انھیں شیخ بہلول کے شاگرد شیخ محمد نے ۱۵۷۵ء میں اکبری دربار کے گنونتوں کو [illegible] اکبر نے ان کے گانے پر خوش ہو کر انعام و اکرام سے نوازا تھا۔ اسی جون پور میں سید محمد جون پوری نام کے ایک صوفی رہتے تھے۔ ان کی باتیں عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ بے چارے کی ساری زندگی سفر میں گزری۔

ہندستان کے اس شیراز (جون پور) سے افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ اسی شہر میں وہ ۲۲ سال کی عمر میں فرید نام سے آیا تھا۔ اپنے والد حسن خاں اور سوتیلی ماں کی سختیوں سے تنگ آکر اس نے شیراز ہند میں پناہ لی۔ یہیں رہ کر اس نے گلستاں، بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس نے عربی اور فارسی زبانوں کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ اس کی ذہانت اور دوسرے اوصاف سے جون پور کا گورنر جمال خاں اتنا متاثر ہوا کہ اس نے والدین سے میل ملاپ کرا دیا۔ بہار لوٹنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی فرید پھر جون پور کے گورنر زبیر خاں کے یہاں چلا آیا۔ زبیر خاں نے اس کا تعارف بابر بادشاہ سے کرا دیا۔ بابر اس کی خوش خلقی اور اوصاف حمیدہ سے بہت متاثر ہوا۔

خود بادشاہ بننے پر شیر شاہ سوری نے دہلی سے سڑکوں کے ذریعے برہان پور اور جون پور کو جوڑ دیا۔ اس نے یہاں قلعہ بھی بنوایا۔ جون پور کی شاہی عمارتیں فن تعمیر کے اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں مسلم اور راجپوت دونوں ہی فن تعمیر کے بہترین نمونوں کی جھلک ملتی ہے۔

جون پور کے ذکر میں اکبر بادشاہ کے بنوائے ہوئے شاہی پل کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ اس شہر کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بادشاہ نے عبدالرحیم خان خاناں کو دریائے گومتی پر ایک پل بنوانے کا حکم دیا۔ خان خاناں نے ۱۵۶۰ء میں جون پور کے شاہی پل کی تعمیر کرائی۔ کابل کے انجینیر افضل علی کی زیر نگرانی اور انھیں کے نقشے کے مطابق پل بن کر تیار ہوا۔ سارے ملک میں یہ پل اپنی ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ جون پور ایک ایسا شہر ہے جسے دریائے گومتی بیچوں بیچ کاٹتا ہے۔ اس پر بنے ہوئے پل کی بیچ سڑک کے برابر ہے۔ اسی کے ساتھ شہر کی مسجد ہے جس میں صوفی سنت شیخ شاہ کا مزار ہے۔ اس کے سامنے شیر اور ہاتھی کے مجسمے ہیں۔ پل کے شمال میں حضرت لال شاہ کا مزار ہے اور اسی سے ملا ہوا ہنومان جی کے مندروں کا سلسلہ۔

آزادی کے بعد شاہی پل کے مقابل مشرقی جانب ایک نیا پل تعمیر ہو گیا ہے لیکن اس کا اکبری پل سے کیا مقابلہ؟ اس شاہی پل پر اب بڑی گاڑیاں نہیں چلتیں لیکن مسافروں کا آنا جانا برابر جاری ہے۔ کبھی یہ شہر عمدہ عطر کے لئے مشہور تھا۔ شہر سے متصل گاؤں ہرکھ پور میں بیلے بیلے کی باغبانی ہوتی تھی۔ عطر کی دکانوں پر ایک تولے وزن سے لے کر ڈھائی سیر وزن تک کی چمڑے کی کپیاں دکھائی دیتی تھیں جن میں لوگ عطر یا خوشبو دار تیل خریدتے تھے۔ اب کانوں میں عطر کے بجائے لگائے سر پر دو پلی ٹوپیاں پہنے اور آنکھوں میں سرمہ رچائے بانکے چھیلوں کے کہیں دیدار نہیں ہوتے۔ اب تو یہ شیراز ہند (جون پور) اپنے شاندار ماضی کو یاد کر کے سر دھنتا اور سرد آہیں بھرتا ہے۔ اب نہ علم و ادب

کی محفلیں ہیں اور نہ شعر و سخن کی [illegible]

شاہد علوی
۱۲۲- پرکاش لوک، 'بی' بلاک، سیکٹر ۸،
اندرا نگر، لکھنؤ

بیسویں صدی میں لکھنؤ کی شعری روایت

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری نے جب بیسویں صدی میں قدم رکھا تو اسے مختلف تحریکوں سے سابقہ پڑا۔ واجد علی شاہ کی گرفتاری اور ۱۹۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھنؤ کی سیاسی حیثیت بھی پامال ہو چکی تھی۔ ملکی حالات کے اس تغیر سے لکھنؤ کی شاعری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس دوران مولانا محمد حسین آزاد اور حالی کی کوششوں سے جدید شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ شعرا نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہنا شروع کر دی تھیں جن میں سیاسی اور سماجی موضوعات کے علاوہ قدرتی مناظر اور مذہبی موضوعات بھی نظم کیے جاتے تھے۔ سرسید کی تحریک نے اس رجحان کو مزید تقویت پہونچائی۔ حالی نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' لکھ کر نئے زاویوں سے شاعری کو پرکھنے کے پیمانے مقرر کیے نیز نئی نظموں اور مثنوی کے توسط سے صحت مند ادب تخلیق کرنے کی بنا ڈالی۔

اکبر الہ آبادی نے قدامت پسند ہونے کے باوجود کسی حد تک جدید رجحانات بھی قبول کیے۔ اقبال نے قدیم تشبیہات و استعارات کو نئے مفاہیم عطا کیے اور شاعری کو سیاسی، تہذیبی اور ملی افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ فانی نے میر کی سوئی ہوئی جادو بیانی میں جدید عناصر شامل کر کے اسے پھر سے جگا دیا۔ اصغر، یگانہ، حسرت اور جوش نے بھی اپنا اثر قائم کرنا شروع کر دیا تھا جو آگے چل کر بیسویں صدی کے ایک وسیع حصے پر محیط رہا اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی ادب میں اقتصادی پہلو پر بھی زور دیا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ لکھنؤ کی روایتی شاعری ان تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر پہلے ہی کنگھی چوٹی اور لفظی صناعی والی شاعری ہونے کے الزامات عائد ہو چکے تھے۔ لہذا شعرائے لکھنؤ نے محسوس کیا کہ اب شعری روایت میں زمانے کے اعتبار سے تبدیلی کرنا ناگزیر ہو گیا ہے چنانچہ اس زمانے کے بیشتر اساتذہ نے لکھنوی شاعری کو عصری رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اختر انصاری لکھتے ہیں:-

> "لکھنؤ کے مزعومہ جذباتی اسکول کا ماتمی و قنوطی اسلوب تھا جو دبستانِ دہلی کا رنگ اڑانے اور سوز و گداز پیدا کرنے کی مصنوعی کوشش کا نتیجہ تھا اور سینہ کوبی، ماتم سرائی، مرثیت اور نسائی جذباتیت کے انداز اس کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس اسلوب کے مؤثرات میں اگر ایک طرف اساتذۂ لکھنؤ کا یہ احساس کہ لکھنؤ کی شاعری کے ماتھے سے بے اثری یا فقدانِ جذبات کے دھبے کو دھونا ضروری ہے تاکہ دہلوی شعرا کی جذبات نگاری سے آنکھیں چار کی جا سکیں۔ پیارے صاحب رشید، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور بے خود موہانی جیسے اساتذہ نے اس اسلوب کی پیدائش اور پرورش میں اپنا زورِ طبع صرف کیا اور کچھ آگے چل کر جگت موہن لال رواں، جعفر علی خاں اثر اور عبدالباری آسی جیسے شعرا نے اس

معتدل، متوازن اور گوارا بنانے کی بھی کوشش کی۔[1]

مذکورہ کوششوں کے باوجود لکھنوی مزاج شاعری کا امتیاز کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہا جس کی طرف کرشن بہاری نور لکھنوی کے شعری مجموعے 'کوشش' کی ۱۹۷۷ء میں اشاعت پر اخبار مشرق نے اشارہ کیا ہے کہ:

> "نور کے پیش لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ گئے گزرے حالات میں بھی مرحوم لکھنؤ میں اب بھی بڑی حد تک تہذیبی و لسانی قدریں باقی ہیں جو کبھی اس کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھیں۔"[2]

اس طرح ناسخ، آتش اور دیگر لکھنوی اساتذہ نے لکھنؤ کی جس شعری روایت کو قائم کیا تھا اور ان اساتذہ کے تلامذہ نے جسے بیسویں صدی تک پہونچایا تھا اس میں انیسویں صدی کے نصف آخر سے ملک میں رونما ہونے والے سیاسی، اقتصادی حالات اور ادبی تحریکات نے کچھ تغیر پیدا کیا۔ اسی تغیر کو قدیم شعری روایت کے ساتھ ہم آہنگ کرکے بیسویں صدی کے لکھنوی شعراء نے اپنی شاعری میں بحسن و خوبی برت کر دکھا دیا۔ □□

حواشی

[1] غزل کی سرگزشت میں۔ اشاعت ۱۹۷۵ء۔ مطبع مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔

[2] ہفت روزہ اخبار "خواتین" کراچی (پاکستان) ۱۹ تا ۲۱ مئی ۱۹۷۵ء

جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ لگا لفافہ ارسال کریں۔

★ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (ایڈیٹر)

غزل

گاؤں گھر کے لوگوں سے آپ بچ کے چلتے ہیں
شہر آنے والے کیا یوں ہی رُخ بدلتے ہیں

زخم ہوں تمنا کے یا جہان کے بخشے
سچ کے ہونٹ پر میرے سب ہنسی میں ڈھلتے ہیں

کل مری قیادت نے جن کو راہ دکھلائی
وہ بھی میرے سائے سے آج بچ کے چلتے ہیں

آپ کی محبت کا راز کھل گیا جب سے
دشمنوں کی کیا کہیے دوست مجھ سے جلتے ہیں

کس کو اتنی فرصت ہے یاد رکھے ماضی کو
حال سے اُلجھتے ہیں حال سے بہلتے ہیں

آپ کی نگاہوں کو بچ گیا ہمارا دل
ہم اسی تصور میں رات دن بہلتے ہیں

خواب کی فضاؤں میں خوب اڑتے ہیں محمود
اور آنکھ کھلتے ہی لوگ ہاتھ ملتے ہیں

محمود الحق صدیقی محمود
اے ۶۸ - بی، برڈ ریلوے کالونی
لکھنؤ

نئے سرکار جنتا کے دوار

اُترپردیش کا ترقیاتی منظرنامہ

ادارہ

مرکز سے عازمین حج کے لئے مزید سہولتوں کا مطالبہ

اترپردیش کے وزیر مسلم اوقاف شری اعزاز رضوی نے ودھان سبھا میں شری شیام دیو چودھری کے اصل سوال سے متعلق ایک ضمنی سوال کے جواب میں بتایا کہ ریاست کے وزیر اعلا نے ۲۴ جنوری ۱۹۹۲ء کو وزیراعظم کو عازمین حج کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر بحری جہاز کی تعداد ایک سے دو کرنے اور عازمین حج کے کوٹے میں اضافہ کرنے، ہوائی جہاز سے جانے والوں کو سیاحتی گروپ کے مساوی سہولت دینے، عازمین حج سے وصول کی جانے والی رقم کم کرنے اور نئی دہلی میں حج ہاؤس کی تعمیر کے لیے جگہ کے مطالبہ پر مبنی ایک خط لکھا ہے۔

شری رضوی نے اصل سوال کے جواب میں بتایا کہ ریاست کے عازمین حج کو درپیش مشکلات کے فوری ازالہ کے لئے انھوں نے وزیراعظم کو کوئی خط تحریر نہیں کیا ہے۔

ایڈہاک اساتذہ کو باضابطہ کرنے کیلئے تشکیل شدہ کمیٹی کی مدت کار میں توسیع

حکومت اترپردیش نے ڈگری کالجوں، یونیورسٹیوں میں ایڈہاک اساتذہ کو باضابطہ کرنے کے لیے سلیکشن کمیٹی کی مدت کار کو ۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء سے بڑھا کر ۳۰ جون ۱۹۹۲ء کر دیا ہے۔

وزیر برائے اعلا تعلیم ڈاکٹر گور نے کہا کہ کمیٹی کی جانب سے مقررہ مدت کے اندر سفارشات پیش کرنا ممکن نہیں تھا، اسی لیے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے۔

بین ریاستی اوقاف سمینار ۱۴، ۱۵ مئی کو لکھنؤ میں

وقف املاک کے تحفظ اور ترقی کے لئے نیز اوقاف کے نظم ونسق اور بندوبست کو مستحکم بنانے اور اوقاف سے متعلق ریکارڈ کے رکھ رکھاؤ کی جدید کاری کے موضوع پر ایک بین ریاستی سمینار ۱۴ اور ۱۵ مئی کو لکھنؤ میں منعقد ہوگا۔

اترپردیش کے وزیر مسلم اوقاف اور غذا و رسد شری اعزاز رضوی کی صدارت میں ودھان بھون میں منعقدہ محکمۂ اوقاف کے اعلا افسران کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔

وزیر اوقاف نے کہا کہ اس سمینار کے انعقاد سے جہاں ایک جانب عوام اوقاف کی کارکردگی سے واقف ہوں گے وہیں اوقاف کی آمدنی میں اضافہ کر کے بے سہارا لوگوں، غریبوں اور بیواؤں کو واقف کے منشاء کے مطابق فائدہ پہونچانے میں مدد بھی ملے گی۔

سمینار میں سبھی ریاستوں کے وزرائے مسلم اوقاف، مسلم ممبران پارلیمنٹ اور ممبران ریاستی قانون ساز ایوان اور اوقاف سکریٹریوں کے علاوہ وقف املاک کے بندوبست سے وابستہ افراد اور دیگر ممتاز لوگوں کو مدعو کیا جائے گا۔

چینی کارپوریشن کی ملوں کی جانب سے
۵۲ لاکھ ٹن گنّے کی پیرائی

ریاست کے گنا ترقی اور چینی صنعت وزیر شری ہنومنت سنگھ نے بتایا کہ ریاستی چینی کارپوریشن کی چینی ملوں کی جانب سے ۲۱ مارچ ۱۹۹۲ء تک ۵۲ لاکھ ٹن گنّے کی پیرائی کر کے ۴ر۲۲ لاکھ ٹن شکر تیار کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ سال اسی مدت میں ۴۹ لاکھ ٹن گنے کی پیرائی کر کے چینی کارپوریشن کی ملوں کی جانب سے ۴ر۳۹ لاکھ ٹن شکر تیار کی گئی تھی۔ اس طرح گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال ...۲۰ ٹن زیادہ شکر تیار کی گئی۔

اس سال ۱،۱۰۰ اسکولوں کو
گرانٹ ملے گی

کسی بھی ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لئے لائق، تعلیم یافتہ اور باصلاحیت شہری ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کو تعلیمی سہولت مہیا کرا کے انھیں خود کفیل بنائے۔

ان خیالات کا اظہار وزیر ریاست برائے بیسک، تعلیم بالغان اور زبان شری شیو پرتاپ شکلا نے ارجن میموریل ششو ودیا مندر لطیف نگر لکھنؤ کے چھٹے سالانہ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔

انھوں نے کہا کہ موجودہ حکومت کی جانب سے ہر شہری کو تعلیمی سہولت مہیا کرانے کے واسطے ایک وسیع پالیسی تیار کی گئی جس کے مطابق آئندہ پانچ برسوں کے درمیان ہر منظور شدہ اسکول کو حکومت کی گرانٹ کی فہرست میں شامل کیا جائے گا۔ موجودہ مالیاتی سال میں ایک ہزار سو اسکولوں کو جلد ہی گرانٹ دی جائے گی۔

شری شکلا نے اس موقع پر لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے خصوصی کوشش کرنے کے عزم کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کا نشانہ آئندہ پانچ برسوں میں ریاست کے ہر ترقیاتی بلاک میں ایک گرلس ہائی اسکول کھولنے کا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری مالیاتی بندوبست کیا جارہا ہے۔

درج فہرست اقوام کے لوگوں کو ہلکی گاڑیاں
خریدنے کیلئے قرض

قومی درج فہرست اقوام و قبائل مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کی ٹرانسپورٹ اسکیم کے تحت اترپردیش اقوام درج فہرست مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے درج فہرست اقوام کے ایسے افراد کو ہلکے ٹرک، ٹیمپو، ٹیکسی، بجاج ٹیمپو اور وکرم ٹیمپو خریدنے کے لئے آسان شرح سود پر قرض مہیا کرایا جارہا ہے۔

کارپوریشن کے منیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر سورج پرشاد نے بتایا کہ اس کے لیے متعلقہ شخص کے پاس گاڑی چلانے کا لائسنس ہونا لازمی ہے اور اسے گاڑی کی قیمت کا ۱۰ فیصد خود برداشت کرنا ہوگا، ۲۴ فیصد کارپوریشن کی جانب سے ۴ فیصد شرح سود پر اور ۶۶ فیصد رقم قومی درج فہرست اقوام و قبائل مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے چھ فیصد شرح سود پر فراہم کرایا جائے گا۔ قرض کی وصولی ۶ ماہ بعد ۲۰ سہ ماہی قسطوں میں کی جائے گی۔

بس حادثہ امدادی اسکیم کے تحت ۶۷ر۶۸ لاکھ
روپئے کا الاٹمنٹ

اترپردیش کے محکمۂ نقل و حمل کی جانب سے بس حادثہ میں ہلاک ہونے والوں کے پس ماندگان اور زخمی مسافروں کو گزشتہ فروری کے آخر تک ۶۷ر۶۸ لاکھ روپئے کی مالی امداد مہیا کرائی گئی۔

ریاست کے وزیر نقل و حمل شری ستیہ پرکاش وکل نے اس سلسلے میں بتایا کہ اس مدت میں کارپوریشن کی بسوں کے سڑک حادثوں میں ۴۳۴ افراد ہلاک ہوئے اور پانچ مسافر زخمی ہوئے۔

انھوں نے کہا کہ مسافر بس حادثہ امدادی اسکیم کے تحت

امدادی رقم ضلع مجسٹریٹ کے توسط سے دی جاتی ہے۔

کسان سہایکوں کو ذمہ داریاں سنبھالنے کے احکامات

محکمہ زراعت کے ذرائع نے بتایا ہے کہ وزیر زراعت شری گنگا بھگت سنگھ نے ڈائرکٹر زراعت کو یہ ہدایت کی ہے کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق نئے کسان سہایکوں کو فوری طور پر ان کی ذمہ داریاں سپرد کرادیں۔ یہ حکم انھوں نے عوامی نمائندوں کی درخواست پر کسان سہایکوں کے عہدوں پر مقرر کردہ افراد کی مشکلات اور ریاست کے کاشت کاروں کے مفاد کے پیش نظر دیا ہے۔

یاد رہے کہ اس سلسلے میں امیدواروں کی جانب سے ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی گئی تھی جس میں ہائی کورٹ نے ریاستی حکومت کو یہ احکامات جاری کیے تھے کہ ان امیدواروں کو اپنے عہدوں پر فائز کیا جائے۔

وزیر زراعت شری گنگا بھگت سنگھ نے انسانی نقطۂ نظر کے تحت اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل نہ کرنے اور کسان سہایکوں کو اپنے عہدہ پر فائز کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

مہارانی باغ پل کی تعمیر کا کام آخری مرحلے میں

اترپردیش کے وزیر تعمیرات عامہ ڈاکٹر سرجیت سنگھ ڈنگ نے نئی دہلی میں واقع وگیان بھون میں منعقدہ "جمنا ٹول برج پروجیکٹ" سے متعلق میٹنگ میں اترپردیش کے محکمہ تعمیرات عامہ کی نمائندگی کی۔ دلی نظم ونسق نوائیڈا اتھارٹی اور انفرا اسٹرکچر لیزنگ اینڈ فائنینشیل سروسیز لمیٹڈ کی مشترکہ کوششوں سے دلی میں جمنا ندی پر مہارانی باغ پل کی تعمیر کے لئے سمجھوتے کو حتمی شکل دے دی گئی ہے۔

اس موقع پر وزیر تعمیرات عامہ نے اپنی مختصر تقریر میں کہا

نقل وحمل کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور صنعتی ترقی کے پیش نظر حکومت اترپردیش نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عوامی اور نجی اداروں کے تعاون سے پلوں، فلائی اوورں اور مضبوط سڑکوں کی تعمیر کرائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت اترپردیش روڈ ٹیکس ایکٹ میں ضروری ترمیم بھی کر رہی ہے۔

وزیر تعمیرات عامہ نے کہا کہ تقریباً ۵۰ کروڑ روپے کی تخمینی لاگت سے تعمیر ہونے والے اس پل سے گزرنے والی گاڑیوں پر روڈ ٹیکس نافذ کرکے لاگت کی رقم وصول کی جائے گی۔

اترپردیش کے ۲۱۰۷ مواضعات میں آراضی اندراجات مکمل

اترپردیش کے ۳۰ اضلاع میں ۲۷۴۸ مواضعات میں سے ۲۱۰۷ مواضعات میں آراضی اندراجات درست کر دیئے گئے ہیں، بقیہ ۶۴۱ مواضعات میں آراضی اندراجات کو درست کرنے کا کام ترقی پر ہے ریاست کے وزیر مال شری برہم دت دویدی نے اس سلسلے میں بتایا کہ ان ۲۷۴۸ مواضعات میں کیمور سروے ایجنسی کے تحت آنے والے ۴۳۳ گاؤں بھی شامل ہیں۔

نوتعمیر پانچ اسکولوں کی عمارتوں کا ڈاکٹر ڈنگ نے افتتاح کیا

اترپردیش کے وزیر تعمیرات عامہ ڈاکٹر سرجیت سنگھ ڈنگ نے ضلع سیتاپور کے محمود آباد ترقیاتی علاقہ کے تحت ۱۴،۵ لاکھ روپے کی لاگت سے نوتعمیر شدہ پانچ پرائمری اسکولوں کا افتتاح کیا۔ یہ اسکول محمود آباد ترقیاتی بلاک کی ہریا، حاجی پور، بھنسار، بن گوان گرام سبھاؤں میں قائم ہیں۔

اس موقع پر منعقدہ عوامی جلسوں کو علاقائی ممبر اسمبلی شری نریندر کمار سنگھ اور بھاجپا کے ضلع صدر شری پردیپ کمار گپت

نے بھی خطاب کیا۔

سابق فوجیوں کی پیکیج اسکیم کے لئے
۲،۰۵ لاکھ روپئے منظور

حکومت اترپردیش نے سابق فوجیوں کی بہبود و بازآبادکاری کے واسطے بروئے کار لائی جارہی روزگار اور خود روزگار (پیکیج) اسکیم کے لئے ۲،۰۵ لاکھ روپئے منظور کیے ہیں۔

یہ اطلاع ریاست کے وزیر سماجی بہبود و فوجی بہبود شری رمایتی شاستری نے دی۔ انھوں نے بتایا کہ اس اسکیم کے تحت تربیت کے دوران ۲۵۰ روپئے ہر ماہ بطور وظیفہ اور ۵۰ روپئے سفری بھتہ امیدواروں کو دیا جاتا ہے۔ تربیت کے بعد امیدوار کو خود روزگار کے واسطے ۵۰ ہزار روپئے تک کے قرضے دیئے جانے کا بندوبست ہے۔ اور اس پر ۳۳ فی صد یا ۳۰۰۰ روپئے کی زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی جاتی ہے۔

حکومت نے پیکیج اسکیم کے تحت آگرہ ضلع کو ۲۵۰۰۰ روپئے، میرٹھ کو ۵۵۰۰۰، لکھنؤ کو ۵۰۰۰، غازی پور کو ۵۵۰۰۰ روپئے اور گورکھپور کو ۵۵۰۰۰ روپے الاٹ کیے ہیں۔

وزیر گنا ترقی کی جانب سے بے سہارا افراد کو امداد

ریاست کے وزیر برائے گنا ترقی اور شکر صنعت شری ہنومنت سنگھ نے گزشتہ دنوں ضلع گونڈہ کے بلرام پور کے تحت بسنوئی پور گرگا پور اور جھپی مواضعات کے بے سہارا افراد کو کمبل، دھوتی، کرتے کا کپڑا اور ۲۰۰ روپئے نقد تقسیم کیے۔

شری سنگھ نے موضع امرہوا میں کپڑا اور گیہوں خریدنے کے لئے رقم تقسیم کی۔ اس کے علاوہ شری سنگھ نے مہاراج گنج نیائے پنچایت کے تحت موضع درجی ڈیہہ میں آتش زنی سے متاثرہ افراد کو ایک ہزار روپئے فی خاندان کی شرح سے امداد دی۔ اس موقع پر شری ہنومنت سنگھ نے محکمہ جنگلات کے افسران کو ہدایت کی کہ وہ آتش زنی سے متاثرہ خاندانوں کو مکانوں کی تعمیر کے لیے لکڑی بھی مہیا کرائیں۔

کسانوں کے مفاد میں نئی گنا سپلائی پالیسی

اترپردیش کے وزیر گنا ترقی و شکر صنعت نے بتایا کہ سال ۹۳-۱۹۹۲ء کی گنا سپلائی پالیسی میں اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں شکر ملوں کی ضرورت کے مطابق گنا سپلائی کی مقدار مقرر کرنے اور کسانوں کے مفاد میں کی گئی ہیں۔

شری سنگھ نے کہا کہ اس کے تحت اصل زمین کی ملکیت اور حقیقی گنا پیداوار کی بنیاد پر بیسک کوٹا مقرر کرنے کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب تک دو برسوں کی اوسط پیداوار کو بنیادی کوٹا مانا جاتا تھا لیکن نئی پالیسی کے تحت سال ۹۲-۱۹۹۱ء کی سپلائی کو ہی سال ۹۳-۱۹۹۲ء کا بنیادی کوٹا تصور کیا جائے گا۔

□□

انتساب .... صـ ۳۶ کا بقیہ

کو اندازہ ہے کہ وہ ایک وسیع دائرے میں گھوم رہے ہیں، جس کا کوئی آغاز نہیں اور انجام تک کوئی نہیں پہونچ پاتا ــــ کوئی بھی دائرہ پورا نہیں کر پاتا ہے ــــ دائرہ پورا ہونے سے پہلے کسی کا دل ساتھ چھوڑ دیتا ہے، کسی کا جگر اور کسی کا حوصلہ ــــ اور وہ دائرہ اس کی شخصیت کی طرح ہی ادھورا رہ جاتا ہے ــــ اس دائرے سے میں کب سے بچنا چاہ رہا ہوں ــــ میں اسے پورا کرنا نہیں چاہتا۔ بس اس سے بچ کر چلنا چاہتا ہوں ــــ مگر شاید یہ ناممکن ہے کیونکہ یہ دائرہ ہی مستقل ہے ــــ باقی سب عارضی ــــ اور ہر عارضی کو اس مستقل کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ چاہے وہ دریچے ہوں یا ان پر پڑے چلمن کے پردے۔ یا ان میں پوشیدہ خلوص، محبت، ممتا اور ایثار ــــ یا وہ آٹھ بجوں کی کو ...... چھک چھک کرتی ریل گاڑی ــــ !!

□□



نام کتاب: "فردوسِ گم شدہ"
شاعر: محور سلطان پوری　　قیمت: پندرہ روپئے
ملنے کے پتے: (۱) شریمتی پدماوتی سکسینہ۔ دولت بھون، سلطانپور
(۲) مالویہ پبلیکیشنز۔ سول لائن۔ الہ آباد

"فردوس گم شدہ" کہنہ مشق شاعر محور سلطان پوری کا مجموعہ کلام ہے۔ ان کی یہ کاوش اس تازہ کاری کی یاد دلاتی ہے جس سے ہماری کلاسیکی شاعری آج بھی صفحۂ قرطاس پر خوشبوؤں سے مملو ہے۔

اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں اور قطعات بھی۔ لیکن ان کی معنوی تہ داری اور شعری کیفیت میں خارجیت کے ساتھ ساتھ جو داخلیت ہے وہ محور سلطان پوری کے شعور اور سلیقہ کی بھرپور عکاس ہے۔ وہ روایتی شاعری جو عہد بہ عہد ان تک پہونچی ہے اس کو زندہ و تابندہ رکھنا ان ہی جیسے پاسدارانِ سخن کا کام ہے۔ وہ سخن طراز ہونے کے ساتھ ساتھ سخن فہم بھی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعری وہی ہے جس کو پڑھ کر یا سن کر یہ محسوس ہو کہ یہ اس زندگی کی ترجمان ہے، جس میں محبتیں، رقابتیں اور خود زندگی آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے۔ سلطان پور جیسے چھوٹے شہر میں رہنے کے باوجود ان کی فکری اساس اتنی وسعت رکھتی ہے، جس میں کائنات منظر بہ منظر افق در افق پھیلتی نظر آتی ہے۔

محور سلطان پوری کی غزلوں کا شعری پیراہن اتنا خوبصورت ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ طویل بحروں کی غزلوں میں جو ترنم اور آہنگ ہے اس سے ان کی فنی پختگی اور معیار کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے جو طویل بحروں سے لے کر عام مروجہ بحروں کو محیط ہیں ع

مقید ہیں زمانے بھر کے نظارے نگاہوں میں
مری چشمِ تمنا ہے محیطِ آسمان جیسے

رہی سنوار سکے زلف ہائے لیلیٰ شب
تمام رات جو خوابِ سحر سے ٹکرائے

جب وعدۂ فردا کو میں نے دیکھا بھالا سوچا سمجھا
تو جیسے کسی نے مجھ سے کہا یہاں ہی تو تھا یہاں ہی تو ہے

آرام برائے خندہ لبی، تکلیف برائے نوحہ گری
یہ بھی ہے خطا وہ بھی ہے خطا اے دیدۂ نم اے دیدۂ نم

"فردوس گم شدہ" کے قطعات بھی لائق توجہ ہیں۔ یہ قطعہ دیکھئے ع

ہزار ہچکیاں لیتی حیات کھو جائے
یہ مہر و ماہ تو کیا کائنات کھو جائے
شبِ فراق کی تاریکیاں معاذ اللہ
وہ تیرگی کہ اندھیرے میں رات کھو جائے

قطعات کے علاوہ اس مجموعہ میں کچھ نثری نظمیں بھی ہیں۔ نثری نظم بظاہر تو بہت آسان ہے مگر بحیثیت ایک صنف کے اس کو برتنے میں محور سلطانپوری تو کیا دوسرے "بڑے" شاعر بھی عاری ہیں کیونکہ ابھی تک نثری نظم کا وجود موضوعِ بحث ہے اور اس کا معیار متعین نہیں ہے۔ افضال احمد سید اور ذیشان ساحل نے تھوڑا بہت جو نام نثری نظم کو دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ نظمیں یونہی سی ہیں۔

ان نثری نظموں سے قطع نظر فردوس گم شدہ میں قارئین کے لئے وہ شاعری بھی ہے جس کی تلاش انہیں اکثر رہا کرتی ہے۔ امید ہے کہ قارئین محور سلطان پوری کے اس مجموعۂ کلام کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور لطف اندوز ہوں گے۔

——— وقار ناصری

نام کتاب: "سبز موسم کی صدا"

شاعر: ظہیر غازی پوری — قیمت: ۲۵/- روپئے

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکٹ، امین آباد، لکھنؤ

"سبز موسم کی صدا" بہار کے معروف شاعر ظہیر غازی پوری کا چوتھا مجموعہ غزلیات ہے جس میں روایتی آن بان اور جدید لہجے کے تیکھے پن کا امتزاج جھلکتا ہے۔ ظہیر غازی پوری عرصے سے مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ جدید حسیت کے ساتھ کلاسیکی عناصر کی موجودگی ظہیر غازی پوری کی خصوصیات شاعری میں شامل ہیں۔ ان کے کلام میں روح عصر کی عکاسی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انسانیت کے دکھ درد، معاشرے کی ناآسودگیوں اور محرومیوں کو اجاگر کرنے میں انھوں نے خاصی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو خوبصورتی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا زیر نظر مجموعہ کلام خوب سے خوب تر کی تلاش کی سمت چوتھا خوش آیند قدم ہے، جو شائقین شعر و ادب کو دعوت فکر و نظر دیتا ہے۔

عرفان عباسی

نام کتاب: "شفاف"

شاعر: جوشش آدیب — قیمت: ۱۵/- روپئے

ملنے کا پتہ: جوشش آدیب۔ پارسی ٹکلی۔ ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

جوشش آدیب ادبی حلقوں میں متعارف اور جانے پہچانے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے بچوں کی نظموں پر اور ایک مجموعہ ہندوپاک کے ممتاز اور مقتدر شعرا کی غزلوں پر تضمینوں پر مشتمل، شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں کو ادبی حلقوں میں اچھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا نیا مجموعۂ کلام "شفاف" (جس کی معنوی حیثیت قابل غور ہے) ہمارے پیش نظر ہے جو مختلف بامقصد اور مفید موضوعات پر لکھی گئی نظموں پر مشتمل ہے۔

"شفاف" کی نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم جناب شارق جمال کی اس رائے سے متفق ہیں کہ:

"جوشش ادیب ایک حساس شاعر ہیں جو ایک عجب ذہن کی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نظر جو کچھ دیکھتی ہے اسے وہ اپنے شاعرانہ فن کے توسط سے مخلصانہ انداز سے قرطاس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی بہت سی روانی اور توی نظمیں ایسی ہیں جن میں جوشش ادیب کی غائر نظر کا مشاہدہ ہے"۔

یہ مجموعہ اس بات کا مستحق ہے کہ ارباب ذوق اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں۔

(ڈاکٹر) تسخین فہمی

نام کتاب: "تابوت کی صدا" (اڑیا نظمیں)

قیمت: ۴۰/- روپئے

شاعر: نرنجن پاڑھی — مترجم: حفیظ اللہ نیولپوری

ملنے کا پتہ: کامران پبلی کیشنز۔ رحمت علی بلڈنگ۔ دیوان بازار کٹک (اڑیسہ)

نرنجن پاڑھی کو اڑیا زبان کے جدید شاعروں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے ان کی بیشتر تخلیقات اڑیا سے انگریزی، سنسکرت اور اردو میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ نرنجن کی شاعری میں افکار کی تازہ کاری اور زبان کی سلاست کے ساتھ ہی درد و غم سے پیدا ہونے والا وہ تاثر بھی موجود ہے جو الفاظ کو زندگی عطا کرتا ہے۔ وہ خود بھی لکھتے ہیں کہ "اپنے ایک دوست کی مرگ ناگہانی کی خبر سن کر میں رات بھر جاگتا رہا، پریشانی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ جوٹ ہی سے تو تخلیقی عمل کا آغاز ہوتا ہے، چوٹ ہی سے ذہن میں جو کرب ناک خاکے ابھرے اسی سے میری شاعری کی پہلی نظم "تابوت کی صدا" معرض وجود میں آئی"۔

زندگی اور موت کا فلسفہ ان کی تخلیقی زندگی کا مقصد ثابت ہوا۔ اور اب وہ موت کو زندگی کا آغاز تصور کرنے لگے ہیں۔ ان کے یہاں موت میں بھی مسکراہٹ اور نشاط کا عنصر ملتا ہے۔ وہ غم ذات کو غم زمانہ بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی اڑیا شاعری کے تین مجموعے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ترجمے کے مسائل شاعری سے کم دشوار نہیں۔ ترجمہ کے لئے

دونوں زبانوں پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ مزید برآں ترجمے کے پورے آداب سے آگاہی شرط ہے۔ ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ بذات خود تخلیق بن جائے۔

"تابوت کی صدا" کا اُردو ترجمہ حفیظ اللہ نیولپوری نے کیا ہے۔ ترجمہ شدہ نظموں پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ زبان سادہ اور تاثیر سے پُر ہے۔

امید ہے کہ یہ ترجمہ اُردو کے سرمائے میں اضافہ ثابت ہوگا۔

——— سلیم عُمر

نام کتاب: "یادِ وجیہ" (شخصیت)
مرتب: ڈاکٹر شعائر اللہ خاں
قیمت: قسم اول: ۵۰/- روپے۔ قسم دوم: ۴۰/- روپے
ملنے کا پتہ: ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ رام پور۔

مولانا وجیہ الدین خاں (۱۸۹۹ء – ۱۹۸۰ء) رام پور کی علمی فکری، تہذیبی و تمدنی تاریخ کی ایک مضبوط کڑی تھے۔ وہ ایک معروف خطیب، عالم باعمل، صوفی صافی، مفسر قرآن، ماہر تعلیم نیز شاعر و ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ صحیح معنوں میں حضرت مولانا رام پوری ایک سچے مسلمان اور نیک انسان تھے۔

۲۱۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت مولانا کے احوال، آثار اور افکار سے متعلق ہے۔ جس میں ۳۳ سے زائد مشاہیر کی قلمی کاوشیں شامل ہیں۔ مقالے مختلف عنوانات و موضوعات کے تحت اس طور سے پیش کیے گئے ہیں جس سے حضرت مولانا کی شخصیت و سیرت اور فکر و فن کا کوئی پہلو اچھوتا نہ رہ جائے۔ ان تحریروں سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ کے عالم، مفسر قرآن نیز شاعر و ادیب تھے حضرت مولانا نے آٹھ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض تصانیف مثلاً حدیثی اصول، تفسیری اصول بہت مشہور ہوئیں۔ مضمون نگار حضرات کا اعتراف ہے کہ وہ علوم مشرقیہ میں بحر العلوم تھے۔

کتاب میں شامل سبھی مضامین متوازن انداز میں لکھے گئے ہیں واقعات یا حالات بیان کرنے میں محض عقیدت مندی کا مظاہرہ نہیں ہوا ہے بلکہ ان تحریروں میں علم و فکر کی گہرائی و گیرائی اور تنقیدی بصیرت نمایاں طور سے جلوہ گر ہے۔

مولانا ابو اللیث اصلاحی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا عبید الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا محمد یوسف اصلاحی، پروفیسر محمد اسلم، ڈاکٹر ماجد علی خاں، ڈاکٹر حامد علی خاں اور ڈاکٹر کبیر احمد جائسی جیسے معتبر و مستند حضرات کے گرانقدر مضامین سے کتاب زیادہ وقیع اور مفید ہوگئی ہے۔

مولانا وجیہ الدین خاں جیسی ہستی سے آنے والی نسلیں روشناس ہونے سے محروم رہ جاتیں اگر مولانا کے نواسے ڈاکٹر شعائر اللہ خاں توجہ نہ کرتے انھیں کی محنت کا ثمرہ ہمیں "یادِ وجیہ" کی صورت میں ملا ہے۔ کتاب سلیقے سے پیش کی گئی ہے جس کے لئے فاضل مرتب لائق تحسین و مستحق مبارکباد ہیں۔

——— انور حسین خاں

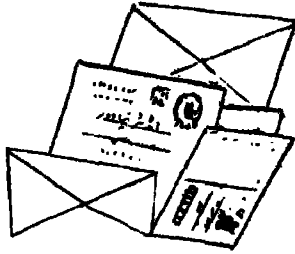
نام کتاب: ہندوستانی اقتصادی مسائل
مصنف: سید ساجد علی ٹونکی قیمت: ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: علی پبلی کیشنز، علی منزل، محلہ رجبن، ٹونک، راجستھان

علم الاقتصاد ایک ایسا علم ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے، ادب اگر زندگی کا آئینہ ہے تو اقتصادیات زندگی کا تقاضہ۔ اس تقاضہ کو سید ساجد علی نے محسوس کرتے ہوئے "ہندوستانی اقتصادی مسائل" لکھی ہے جو اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔

پوری دُنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً اقتصادی مسائل اتنی برق رفتاری سے بڑھتے جا رہے ہیں کہ ان کا بیان مشکل ہے۔ سید ساجد علی نے ان مسائل کے مدوجزر کو خوبصورت عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک کتاب کے عنوان کا تعلق ہے اگر "ہندوستانی اقتصادی مسائل" کے بجائے "ہندوستان کے اقتصادی مسائل" ہوتا تو شاید قواعد کی رو سے اور زیادہ فصیح ہوتا۔ بہرحال یہ کتاب نہ صرف اقتصادیات کے طلبہ و طالبات کے لیے مفید ہے بلکہ اردو داں حضرات کے لیے ایک خوبصورت تحفہ بھی ہے۔

——— ڈاکٹر رفعت اختر خاں





ہمارے نام.....

نیا دور کے شمارے ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔
آپ کی ادارت میں نیا دور نے ترتیب و تزئین میں نئے باب کا خوشگوار اضافہ کیا ہے ؎

لازم ہے نظامِ نو کے لئے نقاش نئے فنکار نئے
تصویر یقیناً بدلے گی جب ہاتھ بدلتے جائیں گے

دُعاگو ہوں کہ تادیر آپ کی ادارت میں نیا دور تشنگانِ ادب کو سیراب کرتا رہے۔ آمین

——— عبدالمتین نیاز
بھوپال

نیا دور مل رہا ہے۔ شکریہ۔ اس میں شائع ہونے والے افسانے اور مضامین بہت مستند ہوتے ہیں۔
کاش کہ آپ رسالے کے کاغذ، ٹائٹل اور مضامین کو پھر پہلے کے معیار پر واپس لانے میں کامیاب ہوں۔

——— (مولانا) اسحاق سنبھلی
سابق ممبر پارلیمنٹ

آپ نے نیا دور کو ایک باوقار اور کارآمد ادبی جریدہ بنا دیا۔ یہ میں برنائے تعریف نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ جنوری اور فروری کے شمارے ثبوت کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ شیخ علی حزیںؔ پر جنوری کے شمارے میں اچھے اور معلوماتی مضامین چھاپ کر آپ نے ایک اچھا ادبی کام کیا ہے جس کے لیے آپ تعریف کے مستحق ہیں۔ فارسی کے شعراء پر اردو رسائل میں عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی۔ آپ نے پہل کی ہے اسے جاری رکھیے۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ اگر شیخ حزیںؔ کی دو تین غزلیں بھی شامل کر لی جاتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔

فروری کے شمارے میں ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر اکبر حیدری کے مضامین پسند آئے۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ اعتراف کہ ان کی کتاب ہلکی ہے، اگر ایک طرف ان کے بڑے پن کی دلیل ہے تو دوسری طرف ہم جیسے لوگ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اردو والوں نے مصلحتوں کے پیش نظر کیسے کیسے لوگوں کے سروں پر عظمت و فضیلت کا تاج رکھ کر ادب کا امین بنا دیا ہے۔
سوانحی مضامین کا سلسلہ خوب ہے۔ اسے جاری رکھیے اور دوسرے بزرگ قلم کاروں سے بھی مضامین لکھوائیے۔ آپ ادبی تاریخ قلم بند کرنے کا ایک اہم کام انجام دے رہے ہیں۔

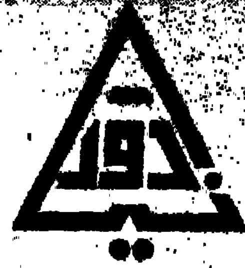
——— عظیم اختر
نئی دہلی

جنوری ۱۹۹۲ء کا شمارہ ملا۔ آپ کی لگن اور کوششوں سے مولانا شیخ علی حزیںؔ کی شخصیت اور کارناموں سے تعارف حاصل ہوا۔ اس آب و گل میں کیسے کیسے آفتاب چمکے اور معدوم ہو گئے۔ گوشۂ حزیںؔ کے مضمون نگار حضرات کاظم رضوی، عزیز الحسن جعفری، ڈاکٹر تقی علی عابدی، سید رضا ساجد رضوی اور محترمہ آصفہ زمانی صاحبہ قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے سخت محنت کے بعد بڑے مفید اور معلوماتی مضامین تحریر فرمائے۔

——— نفیس تقی
سرونج (ایم پی)

جنوری کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ نیا دور کے حسنِ ترتیب و تزئین پر دلی مبارکباد! شیخ علی حزیںؔ پر مضامین بے حد بصیرت افروز تھے۔
کیا تصاویر کو رنگین چھاپنا ممکن نہیں ہے۔؟

——— کرار اصغر
لکھنؤ



جلد ۴۷ | نمبر ۳

جون ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون: ۲۳۵۶۶۰

معاونین:
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون ۲۴۷۱۰۸

پیشکش
آسل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: تین روپے
زرِ سالانہ: تیس روپے

ترسیلِ زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
یو پی، لکھنؤ



کتابت و تزئین: حسن اختر
سرورق: ابوالفضل



نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہندوستان کی یہ عظیم روایت رہی ہے کہ یہاں جو بھی تہوار منائے جاتے ہیں، ان میں سبھی مذاہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ہولی ہو یا دیوالی، عید ہو یا بقرعید۔ سبھی فرقے کے لوگ مل جل کر ان میں شرکت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں شامل ہوتے ہیں۔

عیدِ قرباں کا فلسفہ ہمیں اس بات کا سبق دیتا ہے کہ انسان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے قربانی کا جذبہ رکھنا چاہیئے۔ وہ قربانی جو محض اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو۔ انسان جو قربانی پیش کرتے ہیں، وہ دوسرے انسانوں کے لئے بھی مشعل راہ اور سبق آموز ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم سب کو بلند اصولوں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا احترام کرنا چاہیئے۔

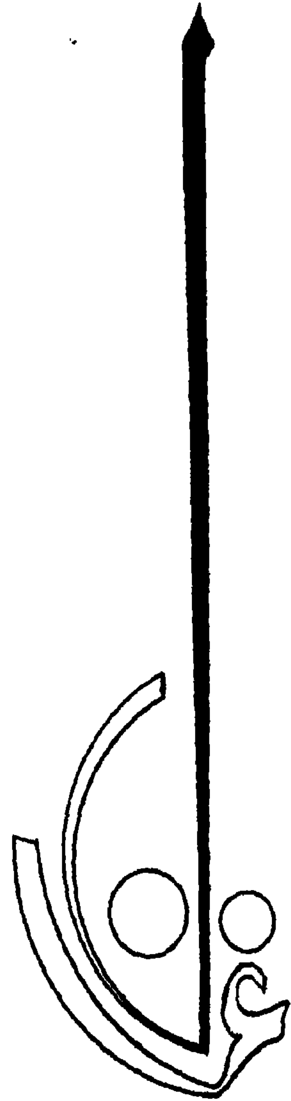
عیدالاضحیٰ اس عظیم قربانی کی یاد دلاتی ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اللہ کے حکم سے اپنے نورِ نظر جناب اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں باپ نے بیٹے سے خواب بیان کیا۔ بیٹے نے جواب دیا کہ جو کچھ خدا کی طرف سے حکم ہوا ہے آپ اس کی تعمیل کریں، میں تیار ہوں۔

ادارۂ نیا دور، اس عظیم تہوار کے موقع پر اپنے تمام قارئین کو خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔

گذشتہ دنوں حسین آباد کے تاریخی امامباڑے میں توحید المسلمین ٹرسٹ لکھنؤ کے زیر اہتمام میر انیس پر سہ روزہ سیمینار جس شاندار طریقے سے منعقد کیا گیا وہ ایک مثال ہے اس سیمینار میں دنیائے اردو کی متعدد ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر میر انیس کی ادبی خدمات پر تنقیدی و تحقیقی کام کرنے کے لئے میر انیس ایوارڈ بھی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ایک اچھا قدم ہے اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔

ادارۂ نیا دور ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی کے علمبردار کرنل بشیر حسین زیدی، اور اردو کے مشہور مرثیہ گو علامہ شمر ہلوری کے انتقال پُرملال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے

ایڈیٹر



فضا ابنِ فیضی

جمال پورہ
مئو ناتھ بھنجن
275101

نہیں اچھا، کھلی آنکھوں کو بے ناموس لکھنا
مجھے خوشبو کو بھی، رنگِ پرِ طاؤس لکھنا

زبانوں پر نہیں، احساس کا وہ ذائقہ بھی
بدن کو اب ہے آساں، کربِ نامحسوس لکھنا

گنوا بیٹھے ہیں اس سے مل کے سب اپنا تشخص
یہ قطرے اپنے دریا سے ہیں کیوں مایوس؟ لکھنا

اسی کے دم سے، بامعنی ہے منظر نامۂ شب
شفق کو ڈوبتے خورشید کا فانوس لکھنا

یہ راتیں، زندگی بھر جاگ کر اب کاٹنا ہیں
ان آنکھوں میں، ہمارے خواب کو محبوس لکھنا

وہ سر سے پاؤں تک، تجرید کا پیکر ہے اس کو
جو لکھنا ہو، تو سارے حرف نامانوس لکھنا

یہ لگتا ہے، سفر ذہنوں کا، پیچھے کی طرف ہے
نئی دانش کو لوگو! دانشِ معکوس لکھنا

ہمارے حرف بھی، اب کیوں رہیں شبنم گزیدہ
تم ان کو شعلۂ آواز کا ملبوس لکھنا

یہ الفاظ و معانی سب پرانے ہو گئے ہیں
فضا اب لازمی ٹھہرا نیا قاموس لکھنا

□□

ڈاکٹر مظفر حنفی
اقبال پروفیسر، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

کچھ اپنے بارے میں

مانُ پُور (فتحپور) کے لُٹے پٹے زمیندار عبدالشکور صاحب ہسوہ (فتحپور) کے میاں جی حسین بخش کی اکلوتی بیٹی زیب النساء سے منسوب تھے اور میاں جی کے انتقال کے بعد انھوں نے ہسوہ میں ہی سکونت اختیار کرلی تھی۔ عبدالقدوس صاحب ان کے بیٹے اور اس خاکسار کے والد تھے۔ میری والدہ (خاتون فاطمہ) کے دادا ایرایان سادات (فتحپور) کے شیعہ عالم سید میر تقی علی تھے۔

میرا اصل نام محمد ابوالمظفر ہے۔ دنیائے ادب میں مظفر حنفی کے نام سے مشہور ہوں۔ کچھ دن نام کے ساتھ ہسوی بھی لکھتا رہا۔

میں یکم اپریل ۱۹۳۶ء کی صبح تولد ہوا۔ میری ولادت کے وقت خاندان میں جو تھوڑی بہت زمینداری مان پور میں رہ گئی تھی اس کا بیشتر حصہ مہاجنوں کے سود در سود کے چکر میں تھا، اور باقی ماندہ پر شکمی کاشت کار قابض تھے۔ چنانچہ میں نے آنکھ کھولی تو والد صاحب مرحوم کو کھنڈوا (سی۔پی) کے ایک اُردو اسکول میں پڑھاتے ہوئے پایا۔ غالباً اس وقت چالیس روپیہ ماہانہ کے قریب پاتے تھے لیکن سستے کا زمانہ تھا۔ والد، والدہ، تین بہنیں (عزیز فاطمہ، شفیق فاطمہ، انیس فاطمہ) اور میں، چھ افراد پر مشتمل کنبہ ایک کرائے کے مکان میں خاصی کشادگی سے زندگی بسر کر رہا تھا، کوئی تیوہار پھیکا گزرتا تھا، نہ گرمیوں کی تعطیلات میں خاندان سمیت وطن کا سفر بار ہوتا تھا۔

۱۹۳۹ء میں والدہ کے دل میں وطن کی محبت نے وہ زور مارا کہ میری بہنوں سمیت ایرایان (فتحپور) میں جا بسیں۔ مجھے والد صاحب نے اپنے پاس ہی روک لیا۔ ان کے ساتھ تنہا رہنے میں بھی ایک لطف تھا۔ دونوں ہوٹلوں میں کھاتے، اسکول میں دن بتاتے اور رات گئے گھر آتے تھے۔ مرحوم بڑے مزے کے آدمی تھے۔ ٹھیٹ اور رکھ رکھاؤ سے رہنے کے عادی۔ استری ٹوٹی نہیں کہ کپڑے ناقابل استعمال ہو جاتے۔ قمیص، پاجامہ، شیروانی اور ٹوپی پہنتے تھے۔ لیکن پاجامے میں گھٹنا نکلا کہ دھوبی کو دے دیا گیا قمیص تو کجا، شیروانی میں بھی کہیں چھوٹا سا سوراخ ہو جاتا تو وطن کے پرجوں میں تقسیم کرنے کے لیے رکھ دی جاتی۔ جوتے ہمیشہ چمچماتے رہتے اور ٹوپی ہر دوسرے مہینے نئی خریدی جاتی۔ خط نہایت عمدہ تھا اپنے زمانے کے مقبول استاد تھے۔ شاعری کا ذوق بھی تھا، منشی تخلص فرماتے تھے، لیکن ان کی تخلیقات کلاس روم کے ظرفوں اور شاگردوں کے سینوں میں ہی جگہ پاتی تھیں۔ اس زمانے میں کھنڈوہ کے تمام اُردو اسکولوں میں ان کی مناجات پڑھی جاتی تھی۔ پہلی سے چوتھی تک تمام درجوں میں نظم خوانی کا ایک پیریڈ ہوا کرتا تھا جس میں والد صاحب کی نظمیں ــــ تتلی، جامن، بکری، چڑیا اور آم وغیرہ باقاعدگی سے پڑھی جاتیں۔ ایک اور ایک ہوتے دو، آم ہیں میٹھے چکھ کر لو، قسم کی منظوم گنتی بھی تھی۔ میں اس وقت

بمشکل چار سال کا تھا جس درجے میں جی چاہتا جا بیٹھتا۔ لیکن کوشش یہ ہوتی کہ سبھی کلاسوں کی نظم خوانی میں شرکت کروں۔

سال بھر مائکے میں رہ کر والدہ صاحبہ کھنڈوہ آئیں تو میرا نام دانستہ ایسے اسکول میں لکھوایا گیا جہاں والد صاحب نہ ہوں۔ اب ذرا باقاعدگی سے پڑھنا پڑا اور اس کل وقتی نظم خوانی سے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ ایک دن والد صاحب سے شکایت کی تو انھوں نے بچوں کے دو تین رسالے جاری کرا دیئے۔ ان میں ایک "پھول" بھی تھا، جس کے ایڈیٹر اس وقت شاید احمد ندیم قاسمی ہوا کرتے تھے۔ میرے لیے ان رسالوں کی منظومات اور کہانیوں سے زیادہ دلکشی کسی کھیل میں نہ تھی۔

میں تیسری جماعت میں تھا کہ ۱۹۴۳ء میں والدہ اور بہنوں کے ساتھ ایرایاں (فتح پور) بھیج دیا گیا۔ نماڑ سے بہت دور پورب کی یہ بستی، جہاں کے 'ہم کا'، 'تم کا' بولنے والے بچے میرے 'ہمارے کو'، 'تمہارے کو' کہنے پر خوب ہنستے تھے۔ مجھے اول اول بہت عجیب سی جان پڑی۔ اجنبی نانا، ماموں' مجھے کسی بھی گلی، کھیت یا میدان میں کھیلتے دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے سرزنش کرتے۔ گھر میں والدہ کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ مرحومہ صوم صلوٰۃ کی پابند، بڑی سادہ لوح بی بی تھیں۔ خود بیس کے آگے گنتی نہیں گن سکتی تھیں، لیکن بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ مستعد واقع ہوئی تھیں۔ ہم سب کو ٹوٹ کر چاہتیں اور تعلیم و تربیت کے معاملے میں جم کر سختی کرتی تھیں۔ میری دونوں بڑی بہنیں اس وقت تک مڈل پاس کر چکی تھیں۔ انھیں پردے بٹھا دیا گیا تھا اور امور خانہ داری کی تربیت دی جا رہی تھی۔ چھوٹی بہن ابھی بہت چھوٹی تھی اس لئے دن بھر مزے کرتی۔ گھوم پھر کر میں والدہ صاحبہ کی توجہ کا مرکز بنتا۔ تیسری جماعت میں میرے تمام ساتھی گیارہ سے چودہ سال کی عمر کے تھے، صرف میں سات سال کا تھا، چنانچہ خود کو عجیب کشمکش میں پاتا تھا اور دبکا دبکا سا رہتا تھا۔ ساتھی بھی چھوٹا جان کر میرے ساتھ بڑا تحکمانہ رویّہ اختیار کرتے۔ مزید برآں صبح و شام مجھے ایک مکتب میں بھیجا جانے لگا، جہاں کے مولوی صاحب غالبًا ذہنی طور پر ایک آدھ چول ڈھیلی رکھتے تھے۔ صبح سات بجے سے دن کے دس بجے تک اور شام کے ۵ بجے سے ساڑھے سات بجے تک ان کی خدمت میں حاضر رہ کر طوطے کی طرح مختلف دعائیں رٹتا اور عربی پڑھتا۔ موصوف نے مار مار کر مجھے کلام پاک کے ابتدائی کچھ پاروں کا حافظ بنا دیا۔ مغرب کی نماز ہم مکتب میری امامت میں ادا کرتے۔ اس زمانے کے قریبی دوستوں میں اعجاز اور بقر عیدی کے نام اب تک یاد ہیں۔

میرے چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد ہمارا خاندان ددہال کے آبائی مکان میں ہسوہ (فتح پور) منتقل ہو گیا۔ یہاں بھی پانچویں جماعت میں میرے ساتھی عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی شبراتی میرے والد صاحب کے کلاس فیلو تھے اس لیے مجھ پر خصوصی توجہ فرماتے، بالفاظ دگر سخت گیر رہتے تھے۔ یہاں میری دوستی شریف الحسن صاحب سے ہو گئی تو لائبریری سے بھرپور استفادہ کرنے کا موقع ملا کیونکہ اس کی نگرانی انھیں کے سپرد تھی۔ باہر کے دوستوں میں سب سے زیادہ قریب معین الدین جگنو اور محمود حسن رہے۔ یاد آتا ہے کہ مڈل اسکول کے زمانے میں ہی میں نے پہلا شعر گڑھا تھا۔ منجھلی بہن شفیق فاطمہ کی کسی سہیلی کے خط میں ایک شعر آیا ؎

نہ کاغذ کی گرانی ہے نہ سیاہی بیش قیمت ہے
اسی سے صاف ظاہر ہے کہ ہم سے کم محبت ہے

بیچاری جوابی شعر کے لیے پریشان تھیں، میں نے پہلا ادبی معاوضہ مبلغ ایک آنہ اُن سے وصول کر کے یہ شعر گڑھ دیا ؎

نہ سیاہی بیش قیمت ہے نہ کاغذ کی گرانی ہے
عدیم الفرصتی آخر گناہ کا مرانی ہے

اس طرح اُلٹے سیدھے شعر کہنے کی ابتدا میں نے ۹ سال کی عمر سے کی۔ مڈل فائنل میں پہونچا تو محسوس ہوا کہ شاید اس کے بعد کوئی اور امتحان زندگی میں دینے کی نوبت نہ آئے گی۔ تمام طلبار کو پابند کیا گیا کہ اسکول میں کل وقتی اقامت اختیار کریں۔ امدگرد کے دیہاتوں کے لڑکے اسکول کے چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس

میں مقیم تھے۔ مقامی طلباء کو صبح ۹ بجے سے ۱ بجے تک اور شام کو سات بجے سے آٹھ بجے تک بستی میں جانے کی اجازت تھی تاکہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہولیں۔ صبح چار ساڑھے چار بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک ہم لوگ کولھو کے بیل کی طرح نصابی کتب کے گرد پھرائے جاتے۔ ہم تو نو دس ماہ میں ہی چیں بول گئے۔ اس وقت مولوی شبراتی، پنڈت سندر لال، منشی برج بھوشن اور ماسٹر یادو پر دل ہی دل میں غصہ آتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو احترام کا ایک فوارہ سا ان لوگوں کے لیے دل میں اُبلتا ہے کہ ان کے لیے تو ہمیشہ ایک مڈل فائنل کی کلاس پُل صراط بنی رہتی تھی۔ گویا فنا فی التدریس تھے یہ لوگ۔ سیشن کے خاتمہ پہ ضلع بھر کے تمام مڈل فائنل کے طلبا فتح پور میں جمع ہو کر یو۔پی بورڈ کے امتحانات میں شریک ہوئے۔ نتیجہ آیا تو مہوہ مڈل اسکول کے دو لڑکے پچیس طلباء کی امتیازی فہرست میں شامل تھے۔ شبراتی صاحب کے میاں جیبن بٹاخ (یعنی یہ خاکسار) اور مولوی صاحب (شریف الحسن)

اب والد صاحب کی شفقت پدری نے جوش مارا اور وہ مجھے اپنے ہمراہ پھر کھنڈوہ لے گئے۔ کھنڈوہ میں بورڈ کے مڈل اسکول کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہاں پانچویں جماعت سے انگریزی کی تعلیم شروع ہو جاتی تھی اور میں انگلش قطعی نہ جانتا تھا۔ اس لیے ایک سال تک پرائیویٹ ٹیوٹر سے انگریزی سیکھنی پڑی۔ دوسرے سال انگریزی صلاحیت کا امتحان لیا گیا اور مجھے دوبارہ ساتویں کلاس میں داخلہ دیا گیا۔ پھر وہاں ہائر سکنڈری ایجوکیشن کا رواج تھا، جو گیارھویں جماعت میں مکمل ہوتی تھی۔ اس طرح ہوا کہ ہم جماعتوں کے مقابلے میں مجھے تین سال کا نقصان ہوا لیکن ساتھ ہی انگریزی کی صلاحیت مقابلتاً ان سے زیادہ ہو گئی۔ کچھ دوسرے فائدے بھی ہوئے مثلاً انگریزی کے علاوہ میں دیگر تمام مضامین میں اپنے ہم جماعتوں سے بہت تیز رہتا خصوصاً ریاضی اور اردو میں۔ داخلے کے ایک ماہ بعد ہی اردو میں خصوصی استعداد کے باعث مجھے ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ مراٹھی، ہندی اور اردو سیکشنوں کے طلباء کی تعداد مل جل کر ہزار سے تجاوز کر جاتی۔ ان چھوٹے چھوٹے ہفتہ وار جلسوں میں شرکت سے میری

قوت اظہار میں خاصا اضافہ ہوا۔ سالانہ امتحانات ہوئے تو میں ساتویں کے تمام سیکشنوں میں اوّل آیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس بار کھنڈوہ میں والد صاحب نے میرے قیام و طعام کا انتظام اپنے بھتیجے مظہر الدین صاحب کے یہاں کر دیا تھا۔ مظہر بھائی کا فروٹ کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ چوتھی پانچویں جماعت تک پڑھے ہوئے بے حد سادہ لوح اور جذباتی آدمی تھے۔ کھنڈوہ کے بگر سیٹھوں میں گنتی تھی۔ کاروبار درجنوں ملازمین اور منشی سنبھالتے تھے۔ مذہب سے ان کا واسطہ بڑا دلچسپ قسم کا تھا۔ گیارھویں میں سیکڑوں بکرے ذبح ہوتے اور پورے شہر کی عام دعوت ہوتی۔ اجمیر شریف کے عرس میں بمبئی سے بہت قیمتی چادر بنوا کر لے جاتے۔ پڑھنے لکھنے کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ لیکن نیوز ایجنٹ کو ہدایت تھی کہ جو بھی اخبار یا رسالہ آئے اس کی ایک کاپی دکان پر دی جائے۔ گھر پر ایک بڑی نمائشی لائبریری تھی جس کے لیے وقتاً فوقتاً مجھ سے کچھ دوسرے احباب سے پوچھ کر ناشروں کو کتابوں کے آرڈر بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح مجھے ان کے یہاں تقریباً تمام اہم لکھنے والوں کی کتابیں دیکھنے کو ملیں اور ہندوپاک کے سبھی اچھے رسائل کے مطالعہ کا موقع ہاتھ آیا۔ اکثر مشاعروں کا اہتمام کرتے۔ ایک بار موصوف نے بہت بڑے پیمانے پر آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا جو تین دن تک چلا۔ صدارت شور علیگ نے کی۔ شعراء میں ماہر القادری، ساغر نظامی، ناطق گلاوٹھی، طرفہ قریشی، ادیب سہارن پوری، شعری بھوپالی وغیرہ کے نام یاد آتے ہیں۔ شاعروں کی خاطر تواضع میں میں پیش پیش رہا۔ اس کچی عمر میں یہ حضرات میرے لیے الف لیلوی شہزادوں سے کم نہ تھے۔

آٹھویں جماعت میں بھی میں ضلع کھنڈوا کے تمام ہندی، مراٹھی، اردو اسکولوں کے طلباء میں اول پوزیشن لے کر کامیاب ہوا اور صاحب کمشنر ایم ایس چودھری کے ہاتھوں بی۔ بی۔ سونی پرائز حاصل کی۔

نویں جماعت سے میری تعلیم میں رخنے پڑنے شروع ہوئے۔ بیشتر ساتھیوں کی تو پڑھائی کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا کہ اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کے لئے کسی اسکول میں کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے سبھاش ہائی اسکول

میں داخلہ لیا جہاں ریاضی، سائنس، جغرافیہ اور انگلش کے ساتھ اردو کی جگہ ایڈوانس ہندی بھی لینی پڑی۔ شبھاشش ہائی اسکول کے انگلش ٹیچر سین صاحب، ہندی کے مودی جی اور بطور خاص ریاضی کے سکرگائے صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے اور آج بھی یاد آتے ہیں۔ اکثر جلسوں میں ہندی کے مشہور بزرگ شاعر ماکھن لال چترویدی کو بلایا جاتا اور ہم سب انھیں بڑے احترام اور شوق سے سنتے۔

ہمارے مظہر بھائی کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کہتے تھے پڑھ لکھ کر لوگ کرسی توڑتے اور تنگ دستی کا شکار ہوتے ہیں۔ تجارت میں مہارت حاصل کرنی چاہیئے۔ ۱۹۵۰ء میں والد صاحب ریٹائر ہو کر مہوہ چلے گئے تو مظہر بھائی کو موقع مل گیا۔ بلا وقفہ مجھے کیلے یا سنگترے کے ویگنوں کے ساتھ دہلی، کلکتہ، آگرہ، پٹنہ، جے پور، وجے واڑہ وغیرہ بھیجنے لگے۔ ابتدا میں تو سخت جھلاہٹ ہوئی لیکن رفتہ رفتہ سیر و سیاحت کی دلچسپیوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس اثنا میں دو تین بار غیر حاضر رہنے کی بنا پر اسکول سے میرا نام کٹ گیا اور باہر سے واپس آ کے پھر میں نے رجوع ہو کر دوبارہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ طرفہ یہ ہوا کہ ہائر سکنڈری کا امتحان سنگتروں سے بھرپور سیزن میں پڑا۔ امتحان سے دو ماہ قبل مجھے آگرہ بھیج دیا گیا، جہاں کھنڈوہ سے روز دو تین ویگن سنگترے پہونچ رہے تھے۔ امتحانات میں صرف بیس دن رہ گئے تو میں مالی نقصان اور مظہر بھائی کی خفگی کا لحاظ کیے بغیر کھنڈوا پہونچا۔ گھر میں ہدایت کی کہ مجھے چھیڑا نہ جائے اور امتحان ختم ہونے تک اپنے قریبی دوستوں موہن لال سیٹھی اور رام کرشن جوشی کے ساتھ لکھتا پڑھتا رہا۔ نتیجہ ظاہر ہے میں زندگی میں پہلی بار سکنڈ ڈویژن سے پاس ہوا۔

آگے چل کر جولائی ۱۹۵۲ء میں مظہر بھائی سے لڑ بھڑ کر مقامی نیل کنٹھیشور ڈگری کالج میں داخلہ تو لے لیا لیکن دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ سالانہ حساب فہمی کے سلسلے میں مجھے آگرہ بھیجنے پر اصرار کیا جانے لگا۔ میں چپ چاپ کالج سے اپنا ٹی سی لے کر آگرہ کے لیے روانہ ہوا اور جھانسی میں ٹرین تبدیل کر کے مہوہ جا پہونچا۔

والد صاحب کو حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے مظہر بھائی کو خط لکھ دیا کہ میں اب مہوہ میں ہی رہوں گا وہ آگرہ کسی دوسرے شخص کو بھیج دیں۔ کالج میں داخلہ کی تاریخیں گزر چکی تھیں۔ بدقت تمام داخلہ ملا تو پہلے سیشن کے چار ماہ بیت چکے تھے۔ قطعی نیا کالج اور نیا نصاب، اجنبی ساتھی اور پچھڑی ہوئی تعلیم۔ مجھے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنا مشکل ہو گیا۔ نو بجے مہوہ سے سائیکل پر فتحپور کے لئے روانہ ہوتا جو آٹھ میل دور تھا، شام کو سائیکل سے ہی واپسی ہوتی۔ خاصی تھکان ہو جاتی۔ گھر اور کالج میں طبیعت اچٹی رہتی۔ جی بہلانے کے لیے نصاب کی جگہ بیشتر ادبی کتب مطالعہ میں رہتیں۔ ایک بار والد صاحب نے رات کو بارہ ایک بجے تک طلسم ہوشربا پڑھتے دیکھ کر خاصا طول طویل لیکچر پلایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے اپنی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے تاکہ آگے چل کر اس لائق ہو جاؤں کہ دوسروں کی کتابیں پڑھنے کی جگہ خود دوسروں کے لئے کتابیں لکھ سکوں۔

ناپختہ ذہن پر بات کا الٹا اثر ہوا اور میں فی الفور دوسروں کے لیے لکھنے پر تل گیا۔ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں، بڑوں کے لئے افسانے دھڑا دھڑ ڈھلنے لگے اور خوش بختی سے رسائل میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جلد ہی میرے پاس مدیروں کے تعریفی خطوط آنے لگے اور میں اپنی تعلیم سے مزید بے توجہی برتنے لگا۔ اس اثنا میں زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے گھر میں پریشانی اور افلاس کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ میں نے چوری چھپے ملازمتوں کے لیے مختلف مقامات پر درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں۔ سالانہ امتحانات شروع ہونے میں دس پندرہ دن باقی رہ گئے تھے کہ ایر فورس کی ایک ملازمت کے سلسلے میں مجھے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے ساتھ انٹرویو کے لیے کانپور طلب کیا گیا۔ اپنے منتخب ہونے کا پورا یقین تھا اس لیے والد صاحب کی شدید خفگی کے باوجود کالج سے نام کٹوا کر کانپور جا پہونچا۔ وہاں انتخاب کے لئے مقابلے کے امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے کامیاب بھی ہوا لیکن میڈیکل بورڈ میں رد کر دیا گیا کہ سینہ ایک انچ کم تھا۔ چونکہ امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی تھی، اس لیے رعایت یہ رکھی گئی کہ عمر کے بیس سال پورے ہونے سے قبل تک جب بھی سینہ ۳۲ انچ کا ہو جائے میں ملازمت کے لیے حاضر

ہو سکتا تھا۔ بے نیل و مرام ہسوہ پلٹنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کان پور میں ڈیرہ ڈالا۔ کچھ ٹیوشن بھی مل گئے جن سے کسی طرح اپنا خرچ پورا کر لیتا۔ بچوں کو پڑھانے کے بعد جو وقت ملتا اس میں افسانے تخلیق کیے جاتے جو ہند و پاک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے وہیں انگریزی سے ایک ناول بھی اُردو میں ترجمہ کیا، جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ ہر چھ ماہ کے وقفہ سے ایئر فورس کے دفتر میں حاضر ہو کر اپنا طبی معائنہ کراتا۔ ۱۹۵۵ء کے اوائل میں بورڈ نے مجھے حتمی طور پر رد کر دیا۔ کیونکہ ادب تخلیق کرتے ہوئے میں نے اپنی بینائی گھٹالی تھی اور سینہ مزید نصف انچ کم کر لیا تھا!!

اچانک ایک دن اشتیاق عارف مدیر "افکار" (بھوپال) کا خط ملا جن کا تعلق ہسوہ سے ہے۔ ہم وطن ہونے کی بنا پر ازراہ ہمدردی انھوں نے مطلع کر دیا تھا کہ اگر میں ملازمت کرنا چاہوں تو بھوپال میں امکانات روشن ہیں کیونکہ وہاں سیکڑوں نئے اسکول کھل رہے تھے۔ چنانچہ میں بھوپال آ گیا اور پندرہ دن کے اندر ہی لاڈکوئی مڈل اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے میرا تقرر بھی ہو گیا ——

یہ ملازمت تین سال تک چلی۔ قیام والد صاحب کے دوست سید باسط حسین صاحب کے ہاں رہا جو لاڈکوئی میں فارسٹ رینج افسر تھے۔ اس اثنا میں میرے ہزار سر مارنے کے باوجود چونکہ محکمہ کی طرف سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی اس لیے میں نے اپنے طور پر جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کر لیے۔

۱۹۵۸ء کے اوائل میں مجھے لاڈکوئی سے ایک ایسے مقام پر تبدیل کر دیا گیا جہاں تک پہنچنے کے لیے پچیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا یہ بس سے باہر کی بات تھی اس لیے مجبوراً مستعفی ہو گیا۔ مظہر بھائی کو علم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور بہ اصرار مجھے کھنڈوہ لے گئے۔ اور اپنے کاروبار میں شریک کر لیا۔

اس بار مجھے کھنڈوہ میں باعمل اور پُرخلوص ساتھیوں کی بڑی اچھی ٹیم مل گئی۔ حسن رضا۔ علی احمد۔ حسن بشیر۔ قاضی انصار۔ منشی جلیس، ناصر حسین وغیرہ بڑے جذبے کے نوجوان تھے۔ ان احباب کے تعاون سے میں نے وہاں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کی، جس کے پُرجوش کارکنان نے بہت قلیل عرصے میں قرب و جوار کے دیہاتوں اور قصبوں میں متعدد ایسے پرائمری اور مڈل اسکول جاری کیے جن میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ عرض کر چکا ہوں کہ کھنڈوہ میں صرف مڈل تک اردو ذریعہ تعلیم کا بندوبست تھا۔ ہم نے بڑے سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے بعد اردو میڈیم ہائر سکنڈری اسکول جاری کیا، جو کامیابی سے چل رہا ہے۔

مذکرہ بالا ساتھیوں میں سے حسن رضا، حسن بشیر اور قاضی انصار کے اشتراک سے میں نے ایک ادبی ماہنامہ "نئے چراغ" بھی کھنڈوہ سے جاری کیا جسے اپنے اولین شمارے سے ہی ہند و پاک کے معیاری ادبی جرائد میں شمار کیا جانے لگا۔ جناب ہاشمی بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ میری زیر ادارت اس رسالے کے دس شمارے شائع ہوئے جن میں چوٹی کے فن کاروں کی تخلیقات شریک اشاعت تھیں۔ کاروبار کی مصروفیات کچھ اتنی اینڈی بینڈی تھیں کہ مجھے صبح ۶ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک دم مارنے کی فرصت نہ ملتی۔ انجمن کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور رسالے کے کام کو نمٹانے کے لیے مجھے آٹھ بجے رات سے نصف شب تک دفتر "نئے چراغ" میں بیٹھنا پڑتا۔ چوبیس گھنٹوں میں بمشکل چار یا پانچ گھنٹے آرام کرنے کا موقع ملتا۔ بس ایک جذبہ تھا جو ہم لوگوں کو ہر قسم کی تھکان سے بے نیاز رکھتا۔ اس طرح مجھ میں شب و روز کام کرنے کی جو سکت پیدا ہوئی وہ آگے چل کر تخلیقی کاموں میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ "نئے چراغ" ہی کے وسیلے سے شاد عارفی مرحوم سے میرا تعلق پیدا ہوا جس نے ۱۹۶۲ء میں بڑھ کر باقاعدہ استادی شاگردی کے رشتہ کی حیثیت اختیار کر لی۔

نومبر ۱۹۵۹ء میں میری شادی کرہ الٰہ آباد کے سید محمد احمد کاظمی مرحوم کی اکلوتی دختر عاصمہ خاتون سے ہوئی (عنفوان شباب کی چھوٹی موٹی لغزشوں سے قطع نظر یہی میرا پہلا اور تا حال آخری عشق بھی ہے) اپنی شادی کے سلسلے میں ہسوہ گیا تو کھنڈوہ واپس ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ والد صاحب، مظہر بھائی کے عادات و اطوار

سے واقف تھے اور ان کے خیال میں کسی کے ساتھ شرکت میں تجارت کر کے میں کامیاب زندگی نہیں بسر کر سکتا تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ مجھے ملازمت کرنی چاہیئے۔ مارچ ۱۹۶۰ء میں دوبارہ بھوپال آکر میں نے محکمہ جنگلات میں ملازمت کر لی۔ اب تک تقریباً ڈیڑھ سو افسانے لکھ چکا تھا اور بحیثیت افسانہ نگار ادبی دنیا میں اپنے لیے جگہ بنا چکا تھا۔ میرے ترجمہ کردہ چار ناول بھی شائع ہو چکے تھے۔ شاعری کبھی کبھار منہ کا مزہ بدلنے کے طور پر ہو جاتی تھی۔ موجودہ ملازمت کی مصروفیات نے مجھے فکشن سے شعر کی طرف موڑ دیا، اور اب گاڑی ناؤ پر آ گئی یعنی میں بیشتر شعر اور کبھی کبھار نثر لکھنے لگا۔ اس کی کچھ دیگر ادبی وجوہات بھی ہیں۔ اب میں نے ۱۹۶۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر بی۔ اے پاس کیا۔

۱۹۶۵ء میں والد صاحب چل بسے اور اس کے چند ماہ بعد میری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اپنے استاد شاد عارفی کے انتقال (۱۹۶۴ء) کے بعد میں نے ان کے کلام کی ترتیب و تدوین اور ان کے ادبی مقام کے حصول کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کیا سلسلۂ شاد عارفی کی چار یا پانچ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ ان پر جم کر کام ہو اور ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھا جائے۔ اپنے مختلف احباب کو اس کام کی جانب مائل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ۱۹۶۹ء میں خود ہی طے کیا کہ اردو میں ایم اے کروں تاکہ شاد عارفی مرحوم پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے کا استحقاق حاصل ہو سکے۔ قیام چونکہ سیہور میں تھا جہاں مقامی کالج میں ایم۔ اے اردو کا انتظام ہی نہ تھا۔ اس لیے ششش و پنج میں تھا۔ اسی سال وہاں ایل ایل بی کی کلاسیں کھل گئیں تو میں نے اسی میں داخلہ لے لیا۔ کچھ دن بعد پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے ملاقات کے دوران ذکر آیا کہ میں اردو میں ایم اے کرنا چاہتا تھا لیکن مقامی طور پر کوئی انتظام نہ ہونے کے باعث مجبوراً ایل۔ ایل۔ بی کر رہا ہوں۔ موصوف نے کچھ ایسے انداز میں میری ہمت افزائی کی کہ میں نے سیفیہ کالج بھوپال میں ایم۔ اے اردو میں بھی داخلہ لے لیا۔ جان توڑ محنت کے نتیجے میں اپنے ۵ ساتھیوں میں سے صرف میں ایل ایل بی فائنل میں پاس ہوا، اور ایم۔ اے اردو میں فرسٹ کلاس کے ساتھ یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ سال بھر کے اندر ہی مکمل کر کے داخل کر دیا لیکن مدت کے سلسلے میں یونیورسٹی کی جانب سے رعایت ملنے کے باوجود ڈاکٹریٹ ۱۹۷۴ء میں ہی تفویض ہو سکی۔

اس موقع پر اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی میں جن دو شخصیتوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہیں میرے استاد شاد عارفی مرحوم اور استاذی پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ ایک کا فن اور دوسرے کی شخصیت میرے لئے منارۂ نور بنی۔

بھوپال کے قیام نے میری ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ یہاں میرے دوستوں میں پروفیسر عبدالودود (مرحوم)، عشرت قادری، واحد پریمی (بخشش عباس مرحوم)، میاں سلطان محمد خاں (ڈپٹی اسپیکر) مشتاق افغانی اور پروفیسر عبدالباقی کے نام لائق ذکر ہیں۔

جولائی ۱۹۷۴ء میں مجھے نئی دہلی کی نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اسسٹنٹ پروڈکشن آفیسر (اردو) کے منصب پر تقرر مل گیا۔ اور میں نے اردو یونٹ کی بنیاد رکھی جہاں بعد میں مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین بھی میرے رفیق کار رہے۔ یہاں خدائے برتر نے مجھ حقیر کو اردو کی ایک اہم خدمت کرنے کا موقع عطا کیا، جس کا علم اردو دنیا کو نہیں ہے۔ NCERT بارھویں جماعت تک کے لیے نصابی کتابیں 'نہ منافع نہ نقصان' کے اصول پر تیار کرتی ہے۔ اردو میں چونکہ تعدادِ اشاعت کتابوں کی محدود رہتی اس لیے انگریزی اور ہندی کی بہ نسبت اردو کتاب کی قیمت پانچ چھ گنا زیادہ بیٹھتی تھی۔ میں نے بیس ماہ تک مسلسل جدوجہد کی اور آخر طے پایا کہ اردو کتاب کی قیمت بھی ہندی کے مساوی رہے گی۔

کچھ دن بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو لیکچرار کی اسامی نکلی میں بھی امیدوار تھا۔ سلکشن کمیٹی میں پروفیسر آل احمد سرور بھی تھے موصوف NCERT میں میرے سلکشن بورڈ میں بھی ایکسپرٹ رہے تھے فرمانے لگے تم تو لیکچرار کے اسکیل میں کام کر ہی رہے ہو۔ وہاں کا رہو

گھر بیٹھے ہو۔ کاؤنسل نے بڑا فلیٹ دے رکھا ہے:

عرض کیا۔ "افسری تو میں جنگلات میں چودہ برس کر آیا ہوں۔ اب یکسوئی سے لکھنا پڑھنا چاہتا ہوں" الغرض فروری ۱۹۷۶ء میں جامعہ کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گیا۔ ادھر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بھی ایسوسی ایٹ شپ منظور کر دی۔ لیکن بوجوہ میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ جامعہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر صغریٰ مہدی اور دیگر رفقائے کار کے ساتھ درس و تدریس، تقریر و تحریر اور نشست و برخاست کے دوران بہت کچھ سیکھا۔ کئی کل ہند اور عالمی سیمناروں کے انعقاد میں حصہ لیا۔ گوپی چند نارنگ کے ساتھ ترقی اردو بیورو کے لئے وضاحتی کتابیات کی نو جلدیں تیار کیں اور طلباء میں اپنی باقاعدگی، خلوص کار، بے لوثی اور دیانت داری کے لیے مشہور رہا۔ چار پانچ ریسرچ اسکالروں کے تحقیقی کام اپنی نگرانی میں پایۂ تکمیل تک پہونچائے اور اپنی تصنیفات میں بھی معتدبہ اضافہ کیا۔ ۱۹۸۴ء میں ریڈر ہو گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہاں میں ہاں نہ ملانے اور صاحبان اقتدار کے ہاں حاضری نہ دینے کی وجہ سے غیبتوں اور منافقتوں کا شکار ہوتا چلا گیا۔

اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے ایک اور دروازہ کھول دیا۔ ۱۹۷۸ء میں حکومت مغربی بنگال نے کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم کی اور اس پر بحیثیت پروفیسر فیض احمد فیض کا تقرر کرنا چاہا۔ لیکن موصوف نے بوجوہ اسے قبول نہ کیا۔ اس دوران کئی اور لوگ اس پر فائز ہونے کے لیے تگ و دو کرتے رہے لیکن ۱۹۸۹ء میں ممتاز دانشوروں پر مشتمل ایک بڑے بورڈ نے فیصلہ اس خاکسار کے حق میں کیا اور بغیر کسی گزارش و سفارش کے اور انٹرویو وغیرہ کی رسم سے بالاتر ہو کر یونیورسٹی نے یہ منصب میری طلب کردہ بہت سی رعایتوں کے ساتھ مجھے پیش کیا، چنانچہ ستمبر ۱۹۸۹ء کو میں دہلی سے کلکتہ منتقل ہو گیا۔ دو بڑے بیٹے (فیروز اور پرویز) ملازمت میں تھے، سو دہلی رہ گئے۔ چھوٹا بیٹا (عرفان مظفر) جامعہ سے بی ایس سی انجینئرنگ کر رہا ہے اسے بھی وہاں چھوڑنا پڑا۔ پوتا (راین قدسی) اور بہو (صدف فیروز) ان کے ساتھ ہے۔ کلکتہ میں عاصمہ، دو بیٹے (سہیل اور نفیل) نیز سب سے چھوٹی اکلوتی بیٹی صبا تسنیم میرے ساتھ یونیورسٹی کے عنایت کردہ فلیٹ میں مقیم ہیں۔ کلکتہ کے عوام و خواص نے صحیح معنوں میں مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ آتے ہی اردو اکاڈمی مغربی بنگال اور متعدد دوسری ادبی انجمنوں نے اعزازی جلسے اور استقبالیہ تقریبات منعقد کیں۔ سپاس نامے پیش کر کے عزت افزائی کی اور ڈھائی برس گزرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

مقام شکر ہے کہ شعبۂ اردو کے ساتھیوں کی مدد سے ایم اے کی کلاسوں میں سیٹیں کافی بڑھ گئی ہیں۔ طلباء کی حاضری میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ اساتذہ باقاعدگی سے کلاسیں لیتے ہیں۔ نصاب ہندوستان کی اعلیٰ دانش گاہوں کے مساوی کر لیا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ہماری اجتماعی کوششیں رنگ لا رہی ہیں۔

پلٹ کر گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر چند کہ اس اعتبار سے بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے بڑے ادبی کام کرنے سے رہ گئے جنھیں موجودہ بڑھی ہوئی مصروفیات اور خانگی ذمہ داریوں کے پیش نظر اب مکمل کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن یہ سوچ کر قدرے تسکین ہوتی ہے کہ زندگی بھر پڑھنے لکھنے اور پڑھانے کے علاوہ کوئی اور کار فضول نہیں کیا۔ کبھی اہل اقتدار کے آگے سر نہیں جھکایا، کسی قسم کی سفارش کو آگے بڑھنے کا زینہ نہیں بنایا۔ قرض لینے سے ہمیشہ دامن بچایا اور لوگوں کے احسانات قبول نہیں کیے۔ حتی المقدور والدین کی خدمت کی۔ نادار اعزا و احباب اور باصلاحیت شاگردوں کی حتی الوسع اعانت کی۔ چھوٹی بہن، بھانجے، بھانجی اور بیٹے وغیرہ کی شادیاں کیں۔ بچوں کو اچھی تعلیم دلائی۔ ان کے لیے دہلی میں دو مکان محنت کی کمائی سے تعمیر کیے۔ بیرونی ممالک سے ادبی تقریبات میں شرکت کے لئے کئی دعوت نامے ملے لیکن وطن عزیز کو ایک دن کے لیے بھی چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ہندوستان بھر کے سیمیناروں اور مشاعروں میں خالص ادبی تخلیقات کے وسیلے سے مقبولیت حاصل کی اور مقام شکر ہے کہ اپنی صاف گوئی اور حق بیانی کے باوصف ماننے اور چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ رکھتا ہوں۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی پر بھی طلب کیا جاتا ہوں

مسلسل لکھتا پڑھتا ہوں اور خداوند کریم سے دُعا کرتا ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک مجھے علمی اور ادبی کام کرتے رہنے کی توفیق و استطاعت عطا فرمائے۔ آمین۔

کچھ اور باتیں

پیشہ ور نقادوں سے میری نہیں بنتی۔ ترقی پسند اور جدید نقاد دونوں مجھ سے خفا رہتے ہیں کہ مصلحت ناآشنا ہوں۔ ہر چند کہ جدید شاعروں میں گنا جاتا ہوں لیکن فن میں ابلاغ و ترسیل کا قائل ہوں اور مقصدیت سے منحرف نہیں ہوں۔ سرکاری ضلع کمیٹی میں اُردو فن کاروں کا نمائندہ رہا ہوں۔ آل انڈیا یونیورسٹی اُردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کا نائب صدر، ورلڈ ہیومینٹی کونسل کی ریاست بنگال کا صدر، مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کی جنرل کونسل، گورننگ باڈی اور ایوارڈ کمیٹی کا ممبر ہوں۔ حکومت مدھیہ پردیش نے اپنے اقبال سمان کی جیوری کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ متعدد بین الاقوامی بایوگرافیکل ڈکشنریوں نے سوانحی حالات شامل اشاعت کیے اور ہندستان کی کئی یونیورسٹیوں کی مختلف کمیٹیوں میں مختلف خدمات انجام دے رہا ہوں۔ ڈاکٹر محبوب راہی میری تنقیدی علمی و ادبی خدمات پر تحقیق کرکے ناگپور یونیورسٹی سے سات آٹھ برس بیشتر ڈاکٹریٹ لے چکے ہیں اور ان کا مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ دو اور یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام جاری ہے

مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں نے وقتاً فوقتاً میری بیس کتابوں کو انعامات سے نوازا ہے اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اردو ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ مرحمت کیا۔ علاوہ ازیں نیشنل کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن (نئی دہلی) کلچرل اکیڈمی (گیا)، آل انڈیا میر اکاڈمی (لکھنؤ)، غالب کلچرل سوسائٹی (بنگلور) وغیرہ نے اپنے انعامات کا مستحق سمجھا ہے۔

میری تصنیفات و تالیفات حسبِ ذیل ہیں:۔

شعری مجموعے

تیکھی غزلیں۔ صریرِ خامہ۔ عکس ریزہ۔ پانی کی زبان۔ دیپک راگ۔ طلسم حرف۔ کھلی جاسم سم۔ یم بہ یم۔ پردہ سخن کا۔ جگ جگ تارا۔

افسانوی مجموعے

اینٹ کا جواب۔ دو غنڈے۔ دیدۂ حیراں

تالیف و تدوین

ماہنامہ نئے چراغ (دس شمارے)۔ ایک تنہا شاعر۔ شوخیٔ تحریر نثر و غزل دستہ۔ شاد عارفی کی غزلیں۔ کلیات شاد عارفی۔ شاد عارفی، ایک مطالعہ۔ دہلی میں اردو طنز و مزاح۔ جدیدیت: تفہیم و تجزیہ۔

ترجمے

پانچ ناول۔ گلاگ۔ مجمع الجزائر (تین دفتر) گجراتی کے یک بابی ڈرامے۔ اڑیا افسانے۔ بیداری۔ بنکم چندر چٹرجی۔ بھارتیندو ہرش چندر۔

تحقیق

شاد عارفی: شخصیت اور فن۔ وضاحتی کتابیات (نو جلدیں) حسرت موہانی۔ انتخاب غزلیات میر حسن (زیرِ طبع)

تنقید

نقد ریزے۔ جہات و جستجو۔ تنقیدی ابعاد۔ جائزے۔ تنقیدی فیچر۔ باتیں ادب کی (زیرِ طبع)

بچوں کا ادب

بندروں کا مشاعرہ۔ نیلا ہیرا

رہائش: ۲/اے یونیورسٹی ٹیچرس کوارٹرس، کانکرگاچی
پی۔ ۱/۷، سی آئی ٹی اسکیم VII ایم
کلکتہ۔ ۷۰۰۰۵۴

جوابِ طلب امور کے لئے ٹکٹ لگا لفافہ ضرور روانہ کریں۔
خطوط صاف اور خوش خط تحریر فرمائیں۔ (ایڈیٹر)

غزلیں

داورا اتنی بڑی آخر سزا دینے سے کیا
مجھ کو رازِ ابتدا و انتہا دینے سے کیا

شورشِ خاکسترِ خوں کو ہوا دینے سے کیا
لمس آنکھوں کو بدن کو ذائقہ دینے سے کیا

لامکاں میں پہلے میری ذات کا عقدہ تو کھول
بے مسافت ورنہ سمتِ ماورا دینے سے کیا

ہو چکی ہے گم صدائے بازگشتِ غیب بھی
پتھروں کو اب کوئی نقشِ نوا دینے سے کیا

ایک دن کھا جائے گی موسم کی سنگینی انھیں
خوشبوؤں کو خواہشِ سیلِ صبا دینے سے کیا

دُھند کی گہری تہوں میں سارے پیکر دفن ہیں
اجنبی بچھڑی آہٹوں کو اب صدا دینے سے کیا

اک نہالِ خستہ کی صورت کھڑا ہوں راہ میں
مجھ کو آنے والی رُت کا آسرا دینے سے کیا

کون سمجھے گا مجھے تصویر ادھوری چھوڑ دوں
رنگ کوئی دائرہ در دائرہ دینے سے کیا

بن گئی ہے بیعتِ باطل اساسِ وقت رمزؔ
عرصۂ امکاں کو ذہنِ کربلا دینے سے کیا

محمد احمد رمزؔ
۱۴۹/ه ترلوک پوری . دہلی ۹۱..۱۱

زائچے سب سیاہ بخت ہوئے
وقت کے ہاتھ ایسے سخت ہوئے

وقفۂ ہجر کی یہ زرخیزی
ننھے پودے گھنے درخت ہوئے

گرمیٔ حرف بڑھتی رہنے سے
اپنے لہجے ذرا کرخت ہوئے

اب کے بے چہرگی کی یورش میں
آئینے سارے لخت لخت ہوئے

منفعت میں شریک ہوتے ہی
ہم بھی حامیٔ تاج و تخت ہوئے

کیسی یہ صورتِ سزا ہے کہ ہم
اس پہ آسان خود پہ سخت ہوئے

اب حسنؔ کوئی بھی نہیں خالی
سب یہاں اہلِ مال و رخت ہوئے

حسن عزیز
۱۲۵/۳۰ پٹکا پور، کان پور
۲۰۸۰۰۱

(پروفیسر) اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱ ۔ نیا گاؤں (ایسٹ) لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

مکتوبِ اقبال بنام ممنون

(غیر مطبوعہ)

یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے کہ میں آج تک اقبال کے ایک قدردان، مہربان، بیش بہا درویش صفت انسان اور اہم مکتوب الیہ حضرت ممنون حسن خاں صاحب (بھوپال) سے کوئی فیض نہ اٹھا سکا۔ سال گزشتہ میں نے ایک مضمون "یادگار دربار ۱۹۱۱ء میں اقبال کا تذکرہ" کے عنوان سے ہماری زبان دہلی (۱۵ جولائی - ۱۸ اگست ۱۹۹۱ء) میں چار قسطوں میں شائع کیا تھا۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ اقبال کے جدِ اعلا "لولی حاجی" کی بھی اصلیت بیان کی گئی تھی۔ موصوف نے ہماری زبان مطبوعہ ۸ اگست ۱۹۹۱ء کے گرامی نامہ سے اقبال کی برہمنیت کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ میں اس مضمون کو اپنے لیے اس قدر اہم قرار دیتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک قابلِ احترام ہستی سے روشناس کرایا۔ خاں صاحب کی شخصیت میرے لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ برصغیر میں ان دو تین ہستیوں میں، اللہ کے کرم سے بقیہ حیات ہیں جنھیں اقبال کے ساتھ نہ صرف خط و کتابت ہی تھی بلکہ انھیں قریب سے دیکھنے اور گفتگو کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ اقبال جب بھوپال آتے تو ان کے قیام و طعام وغیرہ کا اہتمام خاں صاحب ہی کیا کرتے تھے۔

میری اور خاں صاحب کی مراسلت کا آغاز ہماری زبان میں اقبال کے مضمون سے ہی ہوا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند مکتوبات کے اقتباسات درج کیے جائیں۔ چنانچہ ۱۲ ستمبر ۹۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"رب کریم خلیق انجم سلمہٗ کا بھلا کرے کہ انھوں نے آپ کو میرا پتہ بتلایا اور اس طرح مجھے آپ کی خدمت میں عریضۂ ادب پیش کرنے کی عزت حاصل ہو رہی ہے ... مختصر یہ کہ ایک طویل مدت سے لیلیٰ اقبال کا تعاقب کر رہا ہوں لیکن اپنی کم علمی کے باعث ابھی تک "محمل" کا پردہ نہیں پکڑ سکا ہوں۔ "غبارِ ناقہ" میں گم ہوں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں۔ مجھے اکثر داغ کا یہ شعر یاد آتا ہے جو میرے حال پر صادق آتا ہے ؎

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

طبیعت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ نہیں

علامہ اقبال: انتقال سے کچھ پہلے کی ایک نایاب تصویر

لکھ سکتا ہوں۔ معافی کا خواستگار ہوں۔"

۳۰ ستمبر ۱۹۹۱ء

"..... میں نے آپ کا لاجواب مضمون پڑھ کر حضرت علامہ کے آباؤ اجداد کے مذہب کے متعلق اپنا ایک مختصر سا خط عزیز گرامی قدر خلیق انجم سلمہ کے ذریعہ شائع کرانے کی جرأت کی تھی۔ میرا سوال حضرت علامہ کے اُردو اور فارسی اشعار کی بنا پر تھا۔ حضرت علامہ نے تو خود ارشاد فرمایا ہے کہ وہ "برہمن زادہ" تھے۔ ان کے آباؤ اجداد لاتی اور مناتی تھے۔ اس سوال کا جواب مجھے صاف صاف نہیں ملا۔ بہر حال میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا ہوں۔"

"...... آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ کو حضرت علامہ کی تاریخ ولادت یعنی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت علامہ نے اپنے .M.A مقالے کے دیباچے میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ ہے۔ اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء قرار پاتی ہے۔ بہر حال میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا ہوں۔"

"مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ آپ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطا اللہ مرحوم پر مضمون تیار کر رہے ہیں۔ پروفیسر عطا اللہ مرحوم نے اقبال نامہ جلد اول کا سب سے پہلے شائع ہونے والا ایڈیشن مجھے بھی عطا فرمایا تھا۔ میری یہ کتاب پروفیسر اخلاق اثر کے پاس ہے اور اسی کتاب کی مدد سے شاید انھوں نے دو کتابیں لکھی ہیں، ایک کا نام "اقبال نامے" ہے اور دوسری کا نام "اقبال اور ممنون" ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ عطا اللہ مرحوم کی کتاب میں تحریف کی گئی ہے اور یہ کارنیک "پاکستان" میں کیا گیا ہے۔ علامہ کے وہ خطوط جو میرے نام شائع ہو چکے ہیں، اخلاق اثر نے بھوپال میں اور جناب صہبا لکھنوی نے کراچی میں اپنی اپنی کتابوں میں میرے خطوط کا ذکر کیا ہے۔ میں نے جناب عطا اللہ مرحوم کو ان کی فرمائش پر وہی خطوط دیئے تھے جو شائع کرائے جا سکتے تھے جو خط شائع نہیں کرائے جا سکتے ہیں وہ میں کسی کو نہیں دوں گا۔ ان ایک خط جو شائع نہیں کیا گیا ہے اور جو شائع ہو سکتا ہے اس کی فوٹو کاپی میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ علامہ مرحوم نے مجھے جو خطوط ازراہ بندہ نوازی ارسال فرمائے تھے وہ انھوں نے میاں محمد شفیع (م۔ش) کو dictate کرائے تھے کیونکہ اس زمانے میں ڈاکٹروں نے ان کو خود لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ خدا کے فضل سے میاں محمد شفیع (م۔ش) بقید حیات ہیں اور لاہور میں تشریف رکھتے ہیں۔"

جن دنوں اقبال ۱۹۳۴ء میں بیماری سے دوچار ہوئے تھے تو ڈاکٹروں نے انھیں لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) شیو لال شوری کے خط میں مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں: (مکتوب اقبال بنام جناب صابر کلوروی ص۱۲ رسالہ اقبالیات لاہور)۔

"مجھے نہایت ہی تاسف سے آپ کو اطلاع دینا پڑتی ہے کہ آپ کے مرسلہ کاغذات کا مطالعہ میرے لیے ناممکن ہے۔ میری آنکھوں کی تکلیف بڑھ رہی ہے اور میرے معالجین نے مجھے لکھنے پڑھنے سے قطعاً ممانعت کر دی ہے۔"

(۲) شیخ اعجاز احمد کے نام ۲۲ اپریل ۱۹۳۴ء کو لکھتے ہیں،

"یہ خط میں نے ایک دوست سے لکھوایا ہے کیونکہ ڈاکٹر نے مجھ کو آنکھ کے دوسرے معائنہ تک لکھنے پڑھنے سے منع کردیا ہے۔"

(مظلوم اقبال ص۳۶۷)

(۳) عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی کے نام لکھتے ہیں:

"جناب من! ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کردیا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے دستخط سے آپ کو خط نہیں لکھ سکتے۔"

(یہ خط محمد شفیع (م۔ش) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے)

——— اقبال نامہ جلد اول ص۲۹۸

(۴) نور حسین کے نام ایک خط مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں:

"میں خرابی صحت اور کمزوری بصارت کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتا۔"

——— انوار اقبال ص۲۱۵

(۵) ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو اقبال کی طرف سے جو خط قاضی نذیر احمد کو لکھا گیا تھا اس پر بجائے اقبال کے محمد شفیع (م۔ش) کے دستخط ہیں، لکھتے ہیں:

"جناب من! ڈاکٹر صاحب کو آپ کا خط مل گیا ہے وہ خود علیل ہیں اس واسطے آپ کے سوالات کا مندرجہ ذیل جواب لکھوایا ہے۔"

——— اقبال نامہ جلد دوم ص۲۳۸

(۶) ایک خط جو اقبال نے سر سید راس مسعود کو ۸ جون ۱۹۳۷ء کو لکھا تھا اور جو اقبال نامہ جلد اول ص۳۸۵ میں موجود ہے وہ اصل میں محمد شفیع (م۔ش) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اصل خط جناب ممنون حسن خاں کے پاس موجود ہے۔ خط میں اقبال کے بچوں کی نگہداشت کے لئے ایک جرمن خاتون کا ذکر کیا گیا ہے خط اخلاق اثر صاحب نے اپنی کتاب "اقبال نامے" میں بھی شائع کیا ہے۔

(۷) اقبال نامہ جلد اول ص۳۸۶ میں ایک اہم خط جاوید اور منیرہ کے وصیت نامے کے سلسلے میں موجود ہے۔ اس میں تحریف کی گئی ہے اصل خط جناب ممنون حسن خاں صاحب کے پاس موجود ہے، جو سید راس مسعود صاحب کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ خط بھی محمد شفیع (م۔ش) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اقبال نامہ سے ذیل کی عبارت خارج کردی گئی ہے:-

"افسوس کہ (شیخ اعجاز احمد) دینی عقائد کے رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والا آیا مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے۔"

جناب ممنون حسن خاں کے پاس اقبال کے اس خط کی اصل کاپی بھی ہے جو ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء کو اقبال کی طرف سے سر سید راس مسعود کو لکھا گیا تھا اور جس میں یہ جملے بھی لکھے گئے تھے،

"آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں .....
میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں وہ یہ کہ ہز ہائنس آغا خاں یہ پنشن جاوید کو عطا کردیں اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے ....."

یہ خط اور اس کا عکس اقبال نامہ جلد اول سے حذف کیا گیا ہے۔ خط م۔ش کے دستخط سے ہے۔ جناب اخلاق اثر صاحب نے یہ خط اپنی کتاب "اقبال نامے" ص۹۲-۱۹۱ میں شائع کیا ہے۔

(۸) اقبال ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں راس مسعود صاحب کو لکھتے ہیں:

"میں نے یہ خط ایک دوست سے لکھوایا ہے۔ معاف رکھنا آنکھ کا معائنہ کرایا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دوسرے معائنہ تک لکھنا پڑھنا بند کردو۔"

(اقبال نامے ص۸۱)

بقول صابر کلوروی صاحب:

"علامہ کی طرف سے جو حضرات خط لکھنے پر مامور تھے ان میں نذیر نیازی، محمد شفیع (م۔ش)، منشی طاہر الدین، جاوید اقبال اور غلام رسول کے بارے میں دستاویزی ثبوت مل جاتے ہیں۔"

(مکتوب اقبال بنام جناح مطبوعہ رسالہ اقبالیات ص ۹-۱۰
اقبال اکیڈمی لاہور)

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ممنون حسن خاں نے اقبال کو بہت قریب سے دیکھا تھا ان سے مراسم وروابط اور خط وکتابت بھی تھی۔ خاں صاحب اقبال کے اہم مکتوب الیہ ہیں۔ اخلاق اثر صاحب اقبال نامے ص ۲۴۲ میں لکھتے ہیں:-

"ممنون حسن خاں کے والد کا نام مولوی اصغر خاں والدہ کا نام لطف النساء بیگم تھا۔ مشہور انقلابی اشفاق اللہ خاں ان کے عزیز تھے۔ ممنون حسن ریاست بھوپال میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ پورے دورِ حمیدی کو دیکھا مشہور شخصیتوں کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ اور مشہور عالم ماہر مالیات مسٹر غلام محمد کے ساتھ بطور اسپشل اسسٹنٹ کام کیا۔ ان دونوں نامور حضرات کو نواب بھوپال نے ریاست کے اقتصادی جائزے کے لیے مدعو کیا تھا سر راس مسعود کی بھوپال تشریف آوری کے بعد ممنون صاحب موصوف کے معتمد مقرر کیے گئے۔ اس دوران جب بھی اقبال بھوپال تشریف لائے، ممنون صاحب نے ان کی خدمت بطور سکریٹری انجام دی۔ راس مسعود کے انتقال کے بعد محمد شعیب قریشی معتمد مقرر ہوئے۔ ممنون صاحب انڈر سکریٹری، سول ڈیفنس کنٹرولر، ٹیکسٹائل کمشنر، لائبریرین حمیدیہ لائبریری، ڈائرکٹر آثار قدیمہ، سکریٹری پبلک سروس کمیشن، ڈائرکٹر انڈسٹریز اور لیبر کمشنر جیسے معزز عہدوں پر فائز رہے۔ جب مشہور عالم ماہر قانون سر ظفر اللہ خاں کو نواب بھوپال نے اہم آئینی کاموں کے لئے مدعو کیا تھا تو ممنون صاحب کو ان کے ساتھ اسپشل آفیسر مقرر کیا تھا۔ ممنون صاحب کی خدمات کے اعتراف میں نواب صاحب نے ان کو "بہادر" کے خطاب سے نوازا تھا۔"

اقبال نامہ جلد اول مطبوعہ ۱۹۴۵ء میں جناب ممنون حسن خاں کے نام اقبال کے دس خطوط موجود ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں تاکہ مکتوب الیہ کی قدر ومنزلت معلوم ہو سکے۔ پانچواں خط اقبال نامے سے ماخوذ ہے:

(۱) لاہور

۱۴ جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ میں بہت متردد ہوں۔ بارہ دن کا ملیریا اور اس پر مسلسل سر درد۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مسعود بہت کمزور ہو گئے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان کو بہت جلد صحت کامل عطا فرمائے۔ میرا یہ خط وصول کرتے ہی آپ ان کی خیریت سے آگاہ کریں تاکہ تردد رفع ہو۔ امید کہ لیڈی مسعود اور بچی دونوں تندرست ہوں گی۔ میری طرف سے دعا کہیے۔

اب کے لاہور میں بھی بخار کا زور رہا، اور اب بھی گو نسبتاً کم ہے۔ لیکن اب برسات شروع ہو گئی ہے اور موسم بدل گیا ہے۔ باقی خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ سید مسعود کی خیر خیریت سے بہت جلد آگاہ کریں تاکید مزید ہے۔

بھوپال میں آج کل خوب بارش ہوتی ہوگی۔ جاوید میاں اچھے ہیں۔ آج کل ان کو آم کھانے سے کام ہے، صبح و شام یہی شغلہ ان کا ہے۔ امتحان میں عربی میں فیل اور انگریزی میں فرسٹ۔ علی بخش کی طرف سے سید صاحب کو لیڈی مسعود صاحبہ کو آداب عرض کیجیے۔ جاوید بھی سلام عرض کرتا ہے۔

والسلام

محمد اقبال

(۲) لاہور

۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون!

سید مسعود مرحوم کے انتقال کی ناگہانی خبر صبح اٹھتے ہی اخبار "زمیندار" سے معلوم ہوئی میں نے اس خبر کو مشتبہ سمجھ کر آپ کے نام تار لکھا کہ اتنے میں سول ملٹری گزٹ سے مرحوم کے انتقال کی سرکاری اطلاع معلوم ہوئی۔ سخت پریشان ہوں۔ مفصل حالات سے مجھے آگاہ کیجئے۔ میرے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے۔ مرحوم کے ساتھ جو قلبی تعلقات میرے تھے وہ آپ کو معلوم ہیں۔ ابھی ان کی والدہ اور لیڈی مسعود کے نام تار دیے ہیں۔ آپ کے خط کا مجھے بے چینی سے انتظار ہے۔

والسلام

محمد اقبال

(۳) لاہور

۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون

صبح میں آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج صبح سے دوپہر تک مرحوم کے جاننے والے اور ان کے غائبانہ معترف تعزیت کے لیے آتے رہے۔ راس مسعود کا رنج عالمگیر ہے۔ یہ تار جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں سردار صلاح الدین سلجوقی قونصل جنرل افغانستان مقیم شملہ کا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ مرحوم کے اعزا تک پہونچا دیا جائے۔ مہربانی کرکے یہ تار لیڈی مسعود اور مرحوم کی والدہ کو دکھا دیں۔

والسلام

محمد اقبال

(۴) لاہور

۲ر اگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون۔ میں آپ کے خط کا کئی دن سے منتظر ہوں۔ مہربانی کر کے مفصل خط لکھئے۔ علی گڑھ کے خطوط سے معلوم ہوا کہ راس مسعود کے صاحبزادے انور ہندوستان میں ہیں۔ مجھے یہ بات پہلے معلوم نہ تھی۔ آج میں نے انھیں بھی خط لکھا ہے۔ اطلاع دیجئے کہ آیا انور اپنے مرحوم باپ سے مل سکا یا نہیں۔ نیز یہ کہ لیڈی مسعود صاحبہ کیسی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے خدانخواستہ وہ علیل نہ ہوں ان کی صحت و عافیت سے جلد اطلاع دیں۔ میں ذرا سفر کے قابل ہولوں تو سید مسعود کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے علی گڑھ جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ وہاں سے انشاءاللہ تعالیٰ ایک دو روز کے لیے شاید بھوپال میں بھی آسکوں زیادہ کیا لکھوں، سوائے اس کے کہ بہت پریشان ہوں خط کا جواب بہت جلد دو۔

والسلام

محمد اقبال

(۵) ۷ر اگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون صاحب

مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لئے میں نے مندرجہ ذیل رباعی انتخاب کی ہے ؎

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بند ایں و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

یہ رُباعی میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لئے لکھی تھی لیکن تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ رُباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہو گا ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک دان مرگ را خواب گراں

باقی خیریت ہے۔ مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں۔ میرے پہلے خط کا مفصل جواب دیجئے

والسلام
محمد اقبال

(۶) لاہور
۲۳ر اگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون! مسعود مرحوم کی وفات پر جو اشعار میں نے لکھے تھے وہ آج میں نے رسالہ اردو میں چھپنے کے لئے حیدرآباد (دکن) بھیج دیئے ہیں۔ مدیر رسالہ مولوی عبدالحق مسعود نمبر نکالنے والے ہیں امید کہ یہ رسالہ آپ کو بھوپال میں مل جائے گا۔ خود بھی پڑھئے اور لیڈی مسعود کو بھی سنایئے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خیریت سے آگاہ کیجئے۔ اکبر ولایت سے آیا یا نہیں، اور انور کیا اس وقت بھوپال میں ہے؟ رشید صاحب بھوپال میں ہیں یا اندور چلے گئے۔ تمام حالات و کوائف سے مفصل آگاہ کیجئے۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت بھوپال میں ہیں یا شملہ میں۔ آپ محکمہ تعلیم میں رہیں گے یا اعلیٰ حضرت کے اسٹاف میں لے جائیں گے۔ سو خدا کرے جو آپ کے لئے بہتر ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے سب خیریت ہے

والسلام۔ آپ کا
محمد اقبال

(۷) لاہور
۴ر ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لئے بہت شکریہ میں لیڈی مسعود صاحبہ کی طرف سے بہت متفکر رہتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی صحت پر مرحوم کی موت کا بہت خراب اثر پڑے گا۔ بچّی کی صحت اور پرورش کے لیے ان کا تندرست رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس خیال نے کہ راس مسعود کوئی وصیت نہ کر سکے، میرے افکار میں اور اضافہ کر دیا ہے آپ مجھ کو باقاعدہ خط لکھتے رہیئے۔ انور ریاض منزل ہی میں ہیں یا کسی اور جگہ۔ میری طرف سے انھیں دعا کہیئے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر میری جانب سے بہت بہت سلام کہیے اور جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے عرض کر دیجئے۔ جاوید سلمہ تندرست ہے اور آداب کہتا ہے۔ لاہور میں یکم اگست سے لے کر اس وقت تک کہ ۴ر ستمبر ہے مطلق بارش نہیں ہوئی۔ ہاں شعیب صاحب کی خدمت میں بھی سلام کہیے گا۔

والسلام۔ مخلص
محمد اقبال

(۸) لاہور
۲۵ر ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون

میں نے آپ کو جو رباعی مرحوم مسعود کے کتبۂ مزار کے لیے بھیجی تھی اس کی ایک نقل مجھے بھیج دیں۔ شاید آپ نے وہ رباعی اب تک علی گڑھ نہیں بھیجی۔ میاں انور ملیں تو ان سے کہیئے کہ میں نے جو کچھ ان کو لکھا تھا اس کے جواب کا منتظر ہوں۔ امید کہ لیڈی مسعود کا مزاج اب اچھا ہو گا۔ میری طرف سے بہت بہت دعا کہیئے۔ باقی سب خیریت ہے۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

(۹) لاہور
۲ر اکتوبر ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون صاحب۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔

الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ میری حالت بھی خدا کے فضل و
کرم سے بہتر ہے۔ لیکن ابھی طویل سفر کے لائق نہیں
انور کا خط بھی آج آیا تھا (ابھی اس کا بھی جواب لکھا ہے)
رباعی اور شعر جو آپ نے خط میں لکھے ہیں والدہ ماجدہ
مسعود مرحوم کی خدمت میں بتوسط خواجہ غلام السیدین
بھیج دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ سیدین صاحب کا خط
اس بارے میں چند روز ہوئے آیا تھا۔

شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ریاست بھوپال میں
اسلامی علماء کے مشورہ کے بعد ایک Enactment
وضع کیا گیا تھا۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو شعیب صاحب
سے معلوم کیجیے اور اس کی ایک کاپی لے کر مجھے بھیج دیجیے۔
زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ مسعود نہیں بھولتا
ڈاکٹر عبدالباسط کہیں مل جائیں تو ان سے میرا سلام
کہہ دیجیے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ خان بہادر ڈاکٹر
احمد بخش اور ڈاکٹر رحمان سے بھی۔ والسلام

محمد اقبال

(۱۰) جاوید منزل لاہور

۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء

آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ افسوس
ہے کہ شدید علالت کی وجہ سے میں جواب نہ لکھوا سکا
دمے کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً
مایوس کر دیا تھا۔ مگر اب خدا کے فضل سے کچھ افاقہ
ہے۔ گو کلی طور پر ابھی صحت نہیں ہوئی۔ آنکھوں کا
آپریشن مارچ میں ہونے والا تھا مگر دمے کی وجہ سے
اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب بشرط زندگی ان شاء اللہ ستمبر
میں ہوگا۔

حیات صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہیے
آپ کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ کیا آپ اعلیٰ حضرت
کی پیشی میں ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ امید کہ آپ
خیریت سے ہوں گے۔

مخلص

محمد اقبال

جناب ممنون حسن خاں صاحب کو اقبال کے جملہ مکتوب الیہم کے
مقابلے میں غالباً یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال
نے مرنے سے قبل جو آخری خط لکھا تھا وہ انہی کے نام تھا۔ اس کے
بعد ۴۲ گھنٹوں کے اندر اندر ہی اقبال کا انتقال ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔

اب اقبال کے اس خط کا ذکر کیا جاتا ہے جو مکتوب الیہ
کے مطابق غیر مطبوعہ ہے۔ یہ اقبال نے ۵/اگست ۱۹۳۷ء کو جناب
ممنون حسن خاں کے نام لکھا تھا۔ چونکہ اقبال نے اسے confiden-
tial رکھنے کی فرمائش کی تھی، اس لیے خاں صاحب موصوف نے
مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ اسے دیگر خطوط کے ساتھ اقبال نامہ (جلد اول)
میں شائع کریں۔ ہمارے پیہم اصرار پر اب یہ خط شائع کیا جاتا ہے
اس کے کاتب میاں محمد شفیع ہیں جو ماشاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں
خط کے اختتام کے بعد مکتوب الیہ نے اپنے قلم سے اس بات کی
تصدیق کی ہے کہ:

"فوٹو اسٹیٹ کاپی مکتوب گرامی شاعر مشرق
علامہ اقبال بنام ممنون حسن خاں آف بھوپال بقلم میاں
محمد شفیع آف لاہور (م۔ش۔ آف لاہور)

ممنون حسن خاں عفی عنہ

۲۲/فروری ۱۹۹۲ء

خط سے پہلی مرتبہ اس مرض کا نام معلوم ہوا جس سے راس مسعود صاحب
کی موت واقع ہوئی تھی، وہ تھا کالا آزار۔ بر دوان بخار (اردو) حمّیٰ
اَسْوَدُ (طبی) لیشمینیاسس (ڈاکٹری) Kala Azar
Leishmaniasis اقبال نے اس کا علاج بھی لکھا
تھا اس لیے خط کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور اسے عام ہونا چاہیے۔

خط سے راس مسعود کی بیوی اور بچوں کے بارے میں اقبال
کو جو تشویش بطور ایک ہمدرد اور مخلص دوست کے لاحق ہوئی تھی وہ
بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال نے خط میں جن اشعار کا ذکر کیا ہے وہ

"مسعود مرحوم" کے عنوان سے پہلے "اُردو" سہ ماہی جلد ۱۶ حصہ ۶۸ ص ۶۷۹ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء میں "از ڈاکٹر سر اقبال مدظلہٗ" ۱۴ شعر میں چھپی تھی ——— اس کے بعد یہ نظم بہت معمولی اختلاف کے ساتھ انہی اشعار میں "ارمغان حجاز" میں شامل کی گئی ہے نظم میں اقبال نے موت و حیات پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ یہ اشعار قابل ذکر ہیں ؎

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

مکتوبِ اقبال غیر مطبوعہ

لاہور
۵ راگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون صاحب!

آپ کا خط کل ملا، جس سے مفصل حالات مرحوم کی بیماری کے معلوم ہوئے۔ آپ کے خط کے ساتھ ہی لیڈی مسعود کے والد کا خط بھی ملا، جس سے معلوم ہوا کہ مرحوم کی موت "کالا آزار" سے ہوئی۔ "کالا آزار" مشرقی افریقہ کی بیماری ہے۔ بھوپال میں اس کا ظاہر ہونا تعجب کی بات ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ شاید اور کسی کو نہ ہو جائے میں آپ کو اس کا ایک سہل نسخہ جو مجھ کو میرے ایک دوست سے معلوم ہوا ہے، لکھتا ہوں۔ مریض کو پیٹھ کے بل سیدھا لٹا دیتے ہیں اور اس کو کسی قسم کی حرکت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہیں دیتے۔ صرف ناریل کا پانی پلائے چلے جاتے ہیں۔ بسا اوقات اس پانی کے چودہ گھنٹے تک استعمال کرنے سے مریض کامیاب صحت ہو جاتا ہے۔ مشرقی افریقہ میں یہی علاج اس بیماری کا کیا جاتا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر اس علاج پر بھروسہ نہیں کرتے اور بالعموم اپنے سائنٹفک علاج میں ناکام رہتے ہیں۔ بہرحال اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مرحوم کے دوستوں کو اس کی بیوہ اور بچی کے ساتھ عملی ہمدردی کا کوئی طریق سوچنا چاہیے اس غرض کے لئے میں آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں اگر ذاتی طور پر آپ کو علم ہو تو لکھ بھیجیے، کسی سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس خط کو Confidential تصور کیجیے۔

(۱) مجھے معلوم ہے کہ مرحوم کو آپ پر بڑا اعتماد تھا اور غالباً ان کی کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہ تھی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا انھوں نے موت سے پہلے کوئی وصیت کی یا کسی اور طریق سے اپنے بیوہ اور بچی کے لیے Provide کیا۔ ان کے بینکنگ اکاؤنٹ کا آپ کے علم میں کیا حال ہے۔ ان کے اخراجات بہت تھے جس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید وہ اپنی بیوہ اور بچی کے لئے کوئی Provision کر سکے ہوں گے۔

(۲) علی گڑھ کے خطوط سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کا بڑا بیٹا انور علی گڑھ میں ہے۔ کیا وہ بھوپال پہونچ سکا اور باپ کی کچھ خدمت کر سکا۔

(۳) میرا خیال تھا کہ لیڈی مسعود اور ان کے والد جنازہ کے ہمراہ علی گڑھ چلے گئے ہوں گے مگر معلوم ہوتا ہے کہ نہیں جا سکے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس خط کا جواب مجھے جلد دیجئے۔ ان کے کتبہ مزار کے لئے اشعار منتخب کر کے بھیجوں گا۔ ان کی وفات پر چند اشعار لکھ رہا ہوں جو میرے دوسرے مجموعہ میں شائع ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہی شائع ہو جائیں۔

والسلام محمد اقبال

جناب ممنون حسن خاں اقبال کا خط ارسال کرنا بھول گئے تھے
میری یاد دہانی پر انھوں نے فوراً بحفاظت روانہ کیا۔ اس کے ساتھ
انھوں نے اپنا جو مفصل خط مضمون کی صورت میں لکھا ہے اس کے
لئے میں خاں صاحب کا انتہائی ممنون ہوں اور دل کی گہرائیوں سے
ممنون کی قوتِ ارادی کی داد دیتا ہوں۔ چونکہ خط میں اقبال کے
بارے میں کچھ نئی باتوں کا بھی اضافہ ہوتا ہے اس لئے مناسب سمجھا کہ
اسے من وعن نقل کرکے محفوظ کرلیا جائے۔

بھوپال (رجسٹرڈ پوسٹ)

۲۲ر فروری ۱۹۹۲ء

عزیز من پروفیسر اکبر حیدری صاحب

سلام مسنون

میں نے آپ کے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کے نامۂ گرامی
کے جواب میں آپ کی خدمت میں ارسال کرنے کے لئے
جو مکتوب ۲۴ دسمبر ۱۹۹۱ء کو تحریر کیا تھا وہ نہ معلوم
کس طرح میرے کاغذات میں دب گیا۔ میں یہ سمجھتا رہا
کہ وہ خط آپ کی خدمت میں ارسال کرچکا ہوں۔ آج
وہ عریضہ اب مجھے ملا اور اس کو آپ کو بھیج رہا ہوں۔ امید
ہے ضرور مطلع فرمائیں گے نوازش ہوگی۔

ہماری زبان میں آج میں نے آپ کا لاجواب
مضمون "مرحوم لمعہ*" کی نظم کی بابت پڑھا۔ آپ نے
تو بڑی محنت سے یہ مضمون قلم بند کیا ہے "اللہ کرے
زورِ قلم اور زیادہ"

امید ہے کہ آپ کا مزاج گرامی ہر طرح بخیر ہوگا۔

زیادہ ادب۔

آپ کا نیازمند
ممنون حسن خاں عفی عنہ
(کفش بردار اور حلقہ بگوش حضرت علامہ اقبال)

کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز
"آل انڈیا علامہ اقبال ادبی مرکز" (انگریزی میں)
گھر کا پتہ (بحروف انگریزی)
"کیلاس" ۲ سول لائنز
مقابل بھول پارک (اوپر)
"بنک آف انڈیا" بھوپال ۴۶۲۰۰۲

۲۴ر دسمبر ۱۹۹۱ء

عزیز گرامی قدر، والا گہر، پروفیسر اکبر حیدری صاحب

سلام مسنون از طرف ممنون

سب سے پہلے آنے والے سال ۱۹۹۲ء کی مبارکباد
قبول فرمایئے۔ اللہ کرے نیا سال آپ کے لئے اور آپ
کے جملہ متعلقین اور احباب کے لیے مسرت، صحت، اطمینانِ
قلب اور عزت افزائی کے پیغامات لائے۔ اللہ کی رحمت کاملہ
آپ پر نازل ہو۔ رب کریم آپ کے قلب اور قلم میں اور
زیادہ صداقت و طاقت عطا فرمائے۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء مجھے مل گیا
تھا۔ علالت کی وجہ سے اب تک جواب نہیں دے سکا
معافی کا خواستگار ہوں۔ کیونکہ مجھے ہر حالت میں کم از کم
آپ کے سلام مسنون کا فوراً اپنے سلام سے جواب دینا
لازمی تھا۔ میری مرحومہ و مغفورہ والدہ ماجدہ کی نصیحت
تھی کہ چونکہ خط ارسال کرنے والا تم کو سب سے پہلے سلام
لکھتا ہے، اس لئے تم کو لازمی طور پر فوراً سلام کا جواب
تو دے ہی دینا چاہیے۔

آپ نے اپنے مکتوب گرامی میں مجھ ناچیز کو جس
خلوص اور محبت سے یاد فرمایا ہے اس کے لئے میں اپنے
مرشد کامل کے الفاظ میں "سراپا سپاس" ہوں۔ لیکن آپ نے
جن الفاظ میں میری تعریف کی ہے اس کا میں ہرگز ہرگز
مستحق نہیں ہوں۔ یقین فرمایئے میں تو بہت ہی کم علم
اور بے نام اور بے نشان آدمی ہوں۔ میں اپنے متعلق تو

---

* یہ مضمون اصل میں پروفیسر اکبر رحمانی کا ہے (ا۔ح)

خود کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں نہ کسی دوسرے کو مبتلا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں دراصل یہ لیاقت کہاں ہے کہ میں اقبال شناس کہلایا جا سکوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے صرف چند روز بھوپال میں حضرت علامہ کے جوتوں کے بند کھولے اور باندھے تھے۔ ان کا کفش بردار رہا تھا ان کا ادنیٰ سفرِ کوش تھا۔ میری حیثیت علی بخش صاحب مرحوم سے بھی بہت کم تھی۔ میں بھلا کس طرح اقبال شناس یا اقبال اسکالر ہو سکتا ہوں۔ میں تو ایک رسوائے زمانہ شخص ہوں اور بقول۔

برایں سامان رسوائی سرِ بازاری رقصم

میرے ایک بھائی نے تو ازراہِ اقبال شناسی مجھ ناچیز پر کرم فرماتے ہوئے اپنی ایک کتاب میں میری غلط بیانیوں اور میری بے علمی کو کھول کر بیان کیا ہے اور اس طرح اقبالیات میں قابلِ قدر اضافہ فرمایا ہے۔ میں نے اس کتاب کو نہیں پڑھا ہے اور نہ میں پڑھنا چاہتا ہوں لیکن جب مجھے اس کتاب کی بابت بتلایا گیا تو میرے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے ان "الزامات" کے متعلق کیا کہنا ہے تو میں نے ادب کے ساتھ یہ عرض کیا کہ میرا بھائی خدا کے فضل و کرم سے مسلمان ہے اور مسلمان غلط بیانی نہیں کرتا ہے۔ اس لیے میرے عزیز نے جو کچھ میرے متعلق ارشاد فرمایا ہو گا وہ صحیح ہو گا۔ میں تو رب کریم سے دعا کرتا ہوں کہ اس نوازش کے لئے ان پہ بے شمار رحمتیں نازل ہوں۔ کیوں کہ انھوں نے مجھے میری غلط بیانیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کیا ہے۔ مجھے میرا صحیح مقام بتایا ہے۔ میں تو دراصل "آوارگانِ عشق" کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میر کا یہ شعر میرے حال پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

میں نے شاید پہلے بھی آپ کو لکھا تھا کہ میں ساری عمر "لیلائے اقبال" کا تعاقب کرتا رہا ہوں تاکہ کم از کم محمل کا پردہ پکڑ سکوں۔ لیکن اب تک "خبازتاتہ" ہی میں گم ہوں۔ میں بھلا حضرت علامہ کی کیا تعریف کروں۔ وہ تو تعریف سے بالاتر ہیں۔ ان کو یاد کر کے میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتا ہوں جو میرے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے ؎

حق نے کھولے اس پہ رازِ معنیٔ ام الکتاب
فیض تھا روح القدس کا جس سے تھا وہ فیض یاب

ہمارے سرکارِ رسالت مآب ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ بعض ایسے شعراء ہیں جن کی زبانیں کائنات کے پوشیدہ خزانوں کی کلید ہیں۔ حضرت علامہ کی زبان مبارک بھی ایسی ہی الہامی صفات عالیہ کی حامل تھی۔ وہ تو دانائے ضمیرِ کائنات تھے، دانائے راز تھے۔

آپ نے اپنے گرامی نامہ میں جناب اعجاز احمد مرحوم کے میرے نام کسی خط کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کا کوئی مکتوب مجھے نہیں ملا تھا۔ ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ حضرت علامہ نے سر سید راس مسعود کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اعجاز احمد مرحوم قادیانی تھے۔ یہ خط میرے پاس تھا اور میں نے اس کو ڈاکٹر اخلاق اثر کو دے دیا تھا۔ اس کی فوٹو کاپی انھوں نے اپنی کتاب "اقبال اور ممنون" میں شامل کر لی ہے آپ کو اس کتاب کے صفحہ ۱۸ پر یہ فوٹو کاپی مل جائے گی۔ یہ خط حضرت علامہ نے م بش (میاں محمد شفیع) کو ڈکٹیٹ dictate کرایا تھا۔

حضرت علامہ نے سر سید راس مسعود کے انتقال پُرملال کے بعد مجھے ایک خط م بش سے لکھوایا تھا۔ اس میں انھوں نے "کالا آزار" کا علاج بتلایا تھا۔ آجکل یہ بیماری ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے اس لیے میں

چاہتا ہوں کہ اس خط کی اچھی طرح اشاعت ہو جائے خط کی فوٹو کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اس مکتوب کو "نیا دور" لکھنؤ میں شائع کرا دیں تا کہ لوگوں کو "کالا آزار" کے علاج کے متعلق آگاہی ہو جائے۔ میں چاہوں گا کہ "ہماری زبان" میں بھی یہ خط نمایاں طور پر شائع ہو جائے۔

صہبا لکھنوی نے اپنی کتاب "اقبال اور بھوپال" میں حضرت علامہ کے وظیفہ کا پوری طرح ذکر کیا ہے۔ آپ اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ صہبا صاحب اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع کر رہے ہیں۔ بحید افسوس بلکہ ڈوب مرنے کی بات ہے کہ کچھ لوگ حضرت علامہ کے وظیفہ کے متعلق عجیب قسم کی باتیں کرتے ہیں حضرت علامہ نے تو نواب صاحب بھوپال کو ان کا یہ ادنیٰ ادبی وظیفہ منظور فرما کر نواب صاحب کو عالمی ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ حضرت علامہ نے تو خود اپنے متعلق ارشاد فرمایا ہے ؎

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی او را دہم
تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
کم نظر بیتابی جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید
برگ گل رنگین ز مضمون من است
مصرع من قطرۂ خون من است

بات دراصل یہ ہے کہ جب کسی قوم میں زوال آتا ہے تو اس میں اقدار اعلیٰ کا فقدان ہو جاتا ہے اور اس طرح رب کریم کی رحمت سے وہ پوری طرح محروم ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ آج یہی حال ہمارا ہے۔ رب کریم بقول علامہ ؎

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے

آج کل ہمارے بعض اقبال شناس تحقیق اور تنقید کے میدان میں کارنمایاں انجام دے رہے ہیں۔ گڑے مُردے قبروں سے نکال کر ان پر کوڑے برسا رہے ہیں۔ اور اس طرح اقبالیات میں قابل قدر اضافہ ہو رہا ہے۔ میں تو اقبالیات کا مطلب اپنے محدود علم کی روشنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال کے زندگی بخش فلسفہ پر زیادہ سے زیادہ مضامین لکھے جائیں۔ ان کی علمی شاعری کے محاسن پوری طرح بیان کیے جائیں۔ اب تک تقریباً تین ہزار کتابیں اور بے شمار مضامین اور مقالات حضرت علامہ کے فلسفہ اور شاعری پر لکھے جا چکے ہیں لیکن میری رائے میں ابتک اقبال کو پوری طرح کھول کر بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اقبال تو قرآن حکیم کے رازداں اور اقبال تو ہمارے سرکار رسالت مآبؐ کے غلام اور شاعر ہیں۔ نہ تو علم قرآن کو پوری طرح بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ حضورؐ کی پوری طرح تعریف کی جا سکتی ہے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق ہی ہم اس بحر بے کراں میں غوطہ زن ہو سکتے ہیں۔ شاید ہندستان اور پاکستان سے زیادہ بہتر طور پر تو بعض یورپین اور انگریزی عالموں نے اپنی اپنی زبان میں اقبال کو پیش کیا ہے۔ ابھی تو ہمارا اقبال اور بہت زیادہ بلند ہوتا ہے۔ میرے مرحوم دوست حفیظ جالندھری نے اقبال کے انتقال پر کیا خوب کہا تھا ؎

"اقبال بلند تھا ہمارا اب اور بلند ہو گیا ہے"

میرے مرحوم کرم فرما فیض احمد فیض ایک بار بھوپال تشریف لائے تھے اور مجھ سے مل کر انھوں نے فرمایا تھا کہ بھوپال کے شیش محل کو علم و دانش کی زیارتگاہ ہونا چاہیے، مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے سر پر

اپنا ہاتھ رکھ دوں۔ میں نے کہا تھا کہ بھائی نہ تو میں کوئی بزرگ ہوں، نہ پیغمبر نہ پیر ہوں کہ میں آپ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھوں۔ یہ سُن کر انھوں نے اپنا یہ شعر پڑھا تھا۔

جنداک کو یاد ہے کوئی اس کی ردائے خاک
دراک لگا اس چند عزیزوں کے پاس ہیں

یہ شعر پڑھ کر انھوں نے فرمایا تھا کہ ان چند عزیزوں میں ہندستان میں ایک میں ہی باقی ہوں۔ تو میرے عزیز میں نے تو جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اقبال کی "نظر سے" حاصل کیا ہے۔ "خبر سے" بالکل نہیں۔ بس یہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔

میرا یہ عریضہ طویل ہوگیا ہے، کیا کروں یہ تو میرے عشق کا قصّہ ہے جو ایک دفتر میں بھی سما نہیں سکتا ہے۔ بقول حسن ؎

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حسن این قصّۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

گا ہے گا ہے خیریت مزاج سے ضرور آگاہی کی جائے۔ میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ درد دل کی دولت سے مالا مال ہوں اور دردِ سر بھی میرا ساتھی ہے۔ جب دردِ سر زیادہ ہوتا ہے تو غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

بہر حال اللہ کے کرم سے میرے "دن گزر رہے ہیں"

نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

اگر "نیا دور" کے فاضل مدیر آپ کو مل جائیں تو ان کی خدمت میں میرا آداب نیاز ضرور پہنچا دیا جائے۔ انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں اپنی سوانح حیات لکھ کر ان کو ارسال کروں۔ میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ

ع بے نام و نشاں کا ٹھکانا نہ پوچھئے

زیادہ آداب۔ عشم یہ دل اور شکر بہ لب بیٹھا ہوں۔

نیاز مند

ممنون حسن خاں عفی عنہ

---

۱۵ اگست سنہ ۱۹۳ [illegible]

[illegible]

اسی قدر کا جواب مجھے جلدی دیجئے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] اقبال

[illegible]

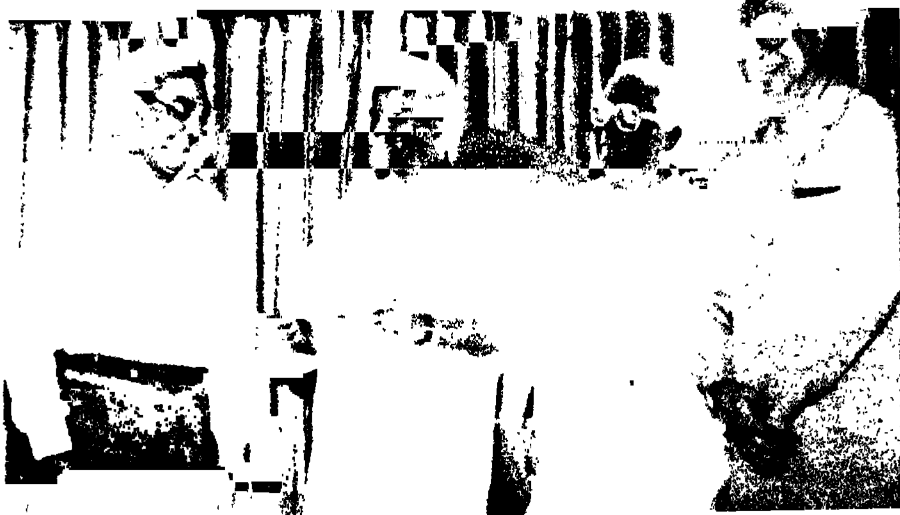
[illegible]

حواشی:-

لہ یہ خط اقبال کے کسی مجموعہ خطوط "اقبال نامہ" یا "روح المکاتیب اقبال" وغیرہ میں نہیں ہے۔ مکتوب الیہ کا کہنا ہے کہ غیر مطبوعہ ہے۔ (ا۔ح)

لہ کالا آزار، کتب طب میں منقول ہے کہ "یہ گرم ممالک کا ایک متعدی






KAZMI
KAZMI







غزلیں

یہ رُخ بھی انساں کی زندگی کا بہت نمایاں رہا زمیں پر
بگولہ بن کر اُٹھا زمیں پر ، زمیں کا ذرّہ گرا نہ زمیں پر

نظر سے کیا کچھ ملا ہے اب تک، سمجھنا مشکل، بتانا مشکل
کسی کو اپنا بنا کے دیکھو، یہ اک اشارہ ملا زمیں پر

وہ صبح ایسی کہ رات کالی ، وہ رات جیسے جنوں کا جنگل
کھڑا ہوا تھا دہی کنارے ، وہ میرا تیرا خدا زمیں پر

اجل کی صُورت بہت دنوں سے فساد برحق سمجھ لیا ہے
سبھی کو کارِ جہاں کی خاطر، قرار تھوڑا ملا زمیں پر

سوال یہ ہے کہ زندگی کو خراب ہونا تھا ہو چکی ہے
علاجِ ہستی کی کوئی صورت نکال سکتے ہو کیا زمیں پر

وہ دیکھتا ہے، نہ سوچتا ہے، کتابِ ہستی کھُلی پڑی ہے
وہی تو انورؔ سے پوچھتا ہے ندیمؔ دیکھا ہے کیا زمیں پر

انور ندیم
۲۶۱ - پانچویں گلی، نشاط گنج
لکھنؤ ۔

یہ مانا ایسا ہوتا ہے مگر کس سے کہا جائے
تڑپ تسکین دے جائے کہ کک دل کو ہنسا جائے

اتر جائے جو نظروں سے وہ پھر اُٹھ ہی نہیں سکتا
گرے جو آنکھ سے آنسو وہ مٹی میں سما جائے

فریب و مکر کے اس دور میں میرا عقیدہ ہے
اُسے انسان مت سمجھو نہ خود کو جو لٹا پائے

یہی انداز تو اس کا مری ہستی کا حاصل ہے
جہاں وہ دیکھ لے مجھ کو وہیں دامن بچا جائے

سمندر جس کو کہتے ہو وہ گہرا لاکھ ہو لیکن
فلک پر چاند جب دیکھے تو وہ بھی ڈگمگا جائے

عجب شے ہے جسے ہم انتظارِ یار کہتے ہیں
ذرا سی دیر ہو جائے کسی کی موت آ جائے

تمہاری زندگی میں سوزؔ ہم نے وہ تڑپ دیکھی
کہ جس کو دیکھ کر خورشید کو بھی نیند آ جائے

جگدیش چندر بدھا سوزؔ
اے ۶۰۲، او. سی. آر. کامپلکس
ودھان سبھا مارگ
لکھنؤ

ولایت جعفری
۲۳۔ گلستاں کالونی۔ لکھنؤ

تہذیب وادب کا گہوارہ۔ آگرہ

جب آگرے کا نام زبان پر آتا ہے تو ہر اس شخص کے ذہن میں، جسے حسن وعشق سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے، تاج محل کا خیال آتا ہے۔ وہ تاج محل جسے ٹیگور نے محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو کہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ آنسو جمنا کے لبوں تک آکر ٹھہر گیا ہے۔ چودھویں کے چاند تلے دیکھنے والوں کو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے فرہاد کی بنائی ہوئی دودھ کی نہر میں ابال آگیا ہو۔

اس آگرے کو پہلے لوگ اکبرآباد کے نام سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ اکبرآباد یعنی اکبر کا شہر، وہ اکبر جو ہر مذہب کا احترام کرنا اپنا دھرم سمجھتا تھا، وہ اکبر جو دینِ الٰہی بن کر ساری دنیا پر چھا جانا چاہتا تھا۔ وہ اکبر جو صلح کل کا پیغامبر تھا۔ وہ اکبر جس نے دل کے آئینے میں اس ایشور کی تصویر بڑے جتن سے محفوظ کر لی تھی جس نے سب کو بنایا ہے اور اس تصویر کا نور اکبر نے فتحپور سیکری کی پہاڑی پر اس طرح سے بکھیر دیا ہے کہ آج بھی فتحپور سیکری جانے والوں کے دل صلح وآشتی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

یہ لال پتھر کا شہر ہندو مسلم تہذیب اور فن کا بہترین نمونہ ہے۔ آج بھی جب سورج دن بھر کا کام ختم کر کے شام کے وقت اس شہر پر اپنی تمام سرخی لنڈھا دیتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس شہر میں چاروں طرف سرخ پریاں چھم چھم ناچ رہی ہیں، اور خود اکبر کبھی بلند دروازے پر کھڑا ہو کر اذان دے رہا ہے اور کبھی "پنج محل" کی آخری منزل پر کھڑا سنکھ پھونک رہا ہے۔ اور اس کے نورتن، جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے، سر جھکائے کھڑے ہیں اور تان سین نے نیا راگ چھیڑ دیا ہے۔ چاروں طرف محبت کی بارش ہو رہی ہے اور فضاؤں میں پرندے امن کے گیت گاتے ہوئے ساری دنیا میں پھیل جانے کے لئے اڑتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ شہر اکبر کے ارادوں کی طرح مضبوط اور اس کے دل کی طرح محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے پیاروں کے مکان اور محل اب تک قائم ہیں۔ بیربل کا محل، ٹوڈرمل کا مکان وغیرہ دیکھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ وہ بیربل جو اپنی ذہانت اور ظرافت کی وجہ سے اکبر کی رگ جاں کے قریب تھا۔ وہ ٹوڈرمل جو زمین کی پیمائش کا خالق تھا۔ مہارانی جودھا بائی کا محل، سہانے کا تالاب پوجا کی جگہ آج بھی دنیا والوں کو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں سما جانے کی داستان سنا رہے ہیں۔ مان سنگھ کی وفادار تلوار کی جھنکار آج بھی فتح پور سیکری سے چلنے والی ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر ہم تک پہونچ رہی ہے

اکبر وہ انسان تھا جو ہندستان کی مٹی کی خوشبو میں سما جانا چاہتا تھا، اس کو معلوم تھا کہ ہندستان وہ عظیم ملک ہے کہ اس میں جو بھی آیا وہ اس طرح سے اس میں رہ سکتا ہے جیسے عاشق کے دل میں محبت۔ اس کو گنگا کی عظمت کا احساس تھا۔ گنگا ماں اس طرح سے ہر چھوٹی بڑی ندی کو اپنے میں سمو لیتی ہے کہ ہر ندی گنگا

ہوجاتی ہے۔ اور جس نے بھی ایک بار سچے دل سے گنگا میں غوطہ لگایا، وہ ماں کی ممتا کی طرح پاک صاف ہو کر گنگا ماں کا بیٹا بن گیا۔

اکبر کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جب دو بڑی قومیں آپس میں ملتی ہیں تو جہاں گیر بنتا ہے۔ انصاف پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہانگیر سے بڑا انصاف پسند بادشاہ کوئی نہیں گزرا۔ جہانگیر میں اتنا دم تھا کہ وہ انصاف کو زندہ رکھنے کے لیے اپنا گلا کاٹ سکتا تھا۔ جہانگیر کے خون میں انصاف کے لیے وفاداری کہاں سے آ گئی تھی۔ ؟ کیا یہ اس کی ماں جودھا بائی کے دودھ کا اثر نہیں تھا۔ ؟

اکبر نے ہندستان کو اکبر آباد دیا تھا اور اکبر آباد نے ہندستان کو ایسے ایسے فن کار دیئے جو وقت کے زہر کو پی کر بھی زندہ ہیں۔ وقت اپنی پوری قوت کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے مگر وہ اپنی جگہ پر اٹل ہیں اور ہر دل کو گرما رہے ہیں۔

میر تقی میر اردو شاعری کے ستون، اکبر آباد میں ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے وہ میر جن کے لیے ذوق جیسے استاد نے کہا ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

آپ سب جانتے ہیں۔ غالب نے میر کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب اور ذوق تو میر کی پیدائش کے ساٹھ ستر سال بعد کے شاعر ہیں کل کی بات ہے۔ ڈھائی، پونے تین سو سال کے بعد رگھو پتی سہائے فراق کہہ اٹھے ؎

نذرِ میر سناؤ بہت اداس ہے رات

یہ رات جو اداس ہے، بہر حال وہ نہیں جو سورج کے ڈوبتے ہی شروع ہو جاتی ہے اور سورج کے نکلتے ہی ختم ہو جاتی ہے یہ رات وہ ہے جس کی تعریف فراق نے خود کی ہے۔

اس دور میں زندگی بشر کی   بیمار کی رات ہو گئی ہے

زندگی رات جیسی، وہ بھی بیمار کی، تڑپتی ہوئی، اداس اداس۔ تو اس تڑپ اور اداسی کو ختم کرنے کے لئے میر کے شعر کافی ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زندگی کی اداسی کو ختم کرنے کے لیے لوگ میر کے زمانے میں میر کے اشعار ایک شہر سے دوسرے شہر، اپنے احباب اور عزیزوں کو نذر کرنے کے لیے لے جاتے تھے۔ یہ میر کون تھے جو اکبر آباد میں پیدا ہو کر آج تک اردو شاعری پر حکومت کر رہے ہیں۔ میر خود بتائیں گے ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

آخر ماتھے پر تلک لگا کر مندر میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود جواب دیتے ہیں ؎

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے
حسن زنّار ہے تسبیح سلیمانی کا

غزل کے ایک شعر میں خدا تک پہونچنے کا راستہ بتاتے ہیں ؎

پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

اگر انسان خود کو ڈھونڈ لے تو اسے خدا مل جاتا ہے۔ یعنی اگر ہم خود کو پہچان لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اونچ نیچ ایک دوسرے سے نفرت، دنیا کا لالچ۔ سب کو چھوڑ کر اگر ہم اپنے اندر بیٹھے ہوئے خدا کو پہچان لیں تو ہمیں "ئنروان" ملے اور دنیا جنت ہو جائے۔

اس طرح کی باتیں میر نے اشعار بدل بدل کے کئی بار کی ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب، جو میر کو استاد ماننے میں فخر محسوس کرتے تھے وہ بھی اکبر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ غالب انسان کی بلندی کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کیا یہ شعر اس فلسفہ کی طرف اشارہ نہیں کرتا جس میں آتما اور پرماتما کی بات کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ سب میں رام ہے یہی وہ فلسفہ

ہے جس کی وکالت ہر عظیم مذہب کرتا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کاش ملتیں مٹ جاتیں اور ایمان کا ظہور ہوتا

دُنیا کے تمام مذاہب یہی کہہ رہے ہیں۔ ہر دور کے پیغمبر اور اوتار یہی سبق سکھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رام چندر جی نے اچھوت عورت کے بیر کھائے تھے اور آنحضرتؐ نے اپنی مسجد کا موذن ایک حبشی حضرت بلالؓ کو مقرر کیا تھا۔ ہر مذہب کی برابری کا دعویٰ غالب نے اس طرح کیا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

غالب نے ایک مثنوی فارسی میں کاشی پر بھی لکھی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں انھوں نے ایک سادھو سے زندگی گزارنے کا سبق سیکھا ہے۔ سادھو نے غالب کو دکھوں سے نجات پانے کا راستہ دکھایا ہے کہ تم اپنے اندر سے نکل کر ساری دنیا میں اس طرح بکھر جاؤ جس طرح پھول سے خوشبو نکل کر ساری دُنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یعنی تم دنیا کو سنوارنے کے لئے پیدا کیے گئے ہو۔ تم ساری دنیا کے لیے ہو۔ اسے خوشبوؤں سے بھر دو اسے جنت بناؤ، جہنم نہیں۔ ــــــ ذرا سوچیے اس دنیا کو جنت کون بنائے گا؟ وہی انسان جو اس میں رہتے ہیں۔!

اکبرآباد میں ایک زبردست شاعر اور بھی تھے جو ۱۷۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا۔ نام ان کا ولی محمد تھا۔ تخلص نظیر کرتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی۔ جو قومی یک جہتی کی مثال آپ تھے۔ ان کے لکھے ہوئے بھجن اور کیرتن اب بھی گائے جاتے ہیں۔

کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بال پن

ان کی ایک نظم سے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ بھگوان شنکر کے بھگت ہوں۔ اس میں انھوں نے مہادیو کے بیاہ کا ذکر کیا ہے ــــــ شروع کرتے ہیں،

پہلے ناؤ گنیش کا لیجے سیس نوائے

کام شروع کرنے سے پہلے سر جھکا کر گنیش جی کا نام لو تاکہ شبھ ہو آخر میں لکھتے ہیں ؎

جس نے اس بیاہ کی میلا کہی بنائے
اس کے بھی ہر حال میں شیو جی رہیں سہائے
خوش رہے دن رات وہ کبھی نہ ہو دلگیر
میلا اس کی بھی رہے جس کا ناؤ نظیر

نظیر کی شاعری میں ہندستان کی بوباس ہے۔ ہندستان کے موسم، چڑیاں، جانور، میلے ٹھیلے، تیج تہوار کا ذکر بھرپور ملتا ہے۔ یہ شاعر جنتا کا تھا اس لیے پوری آن بان سے آج بھی زندہ ہے۔ اپنے زمانے سے لے کر آج تک کون ایسا ہے جس کے اوپر ان کے کلام کا اثر نہ ہوا ہو۔ سامنے کی بات ــــ اس طرح سے سنوار کر کہتے ہیں کہ دل میں سیدھی اُتر جائے۔ جو نظم آگرے کی ککڑی پر لکھی ہے اسی کو لے لیجیے ؎

فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں

زندگی بھر آگرہ چھوڑ کر کہیں نہیں گئے۔ اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتے تھے ایک نظم میں خود کہتے ہیں ؎

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملّا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

ایک بار کا ذکر ہے کہ نظیر کو نواب سعادت علی خاں نے اپنے پاس بلوا بھیجا اور آدمی کے ہاتھ روپئے کی تھیلی بھی بھیجی۔ رات بھر روپیہ ان کے گھر میں پڑا رہا۔ رات بھر سو نہ سکے۔ صبح کو تھیلی آدمی کو واپس کر دی اور کہلا دیا کہ جب ذرا سے تعلق سے یہ حال ہے، اگر زندگی بھر کا ساتھ ہو گیا تو نہ جانے کیا ہو گا۔

گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

فراق کہتے ہیں ؎

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

بالکل ایسی ہی اُداسی نظیر کی نظم "بنجارہ" پڑھ کر ہوتی ہے۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

انسان کی برابری کی بہترین مثال نظیر کی نظم "آدمی نامہ" ہے ؎

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہے بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بدشکل بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

کالے گورے، ذات پات تو ہم نے بنائے ہیں۔ بنانے والے نے تو آدمی بنایا تھا بس۔ اب حالت یہ ہے کہ آدمی آدمی سے ڈرتا ہے۔ ایک دوسرے سے یہ خوف یہ ڈر دلوں سے اسی وقت نکلے گا جب انسان اپنے دل میں جھانک کر دیکھے۔

نظیر کہتے ہیں ؎

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

آگرے کا احسان اُردو ادب پر ہمیشہ رہے گا جس نے ایسے ایسے مہ پارے عطا کیے جن سے ادب کا چمن ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ یہ ادیب اور شاعر ہندستانی عوام کے دل کی دھڑکنوں میں زندہ رہیں گے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہمیشہ عوام کے دل کی بات کہی ہے اور ہمیشہ انسان کی برابری، آزادی، امن اور آشتی کی بات کی ہے بقول غالب ؎

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

یہ بات غالب نے جب کہی تھی تب بھی سچ تھی اور آج بھی سچ ہے۔ ہم واقعی آزادی اور صلح کل میں یقین رکھتے ہیں۔ ہمیں خود اپنے سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ذرا سی دل کی کتاب پڑھنی ہے۔ □□

مکتوب اقبال —— ص۲۴ کا بقیہ

اور لمبا بخار ہے جس میں مریض لاغر و کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کا رنگ مٹیالا یا کالا ہو جاتا ہے اسی لئے اس کو "کالا آزار" کہتے ہیں۔ سردی کے موسم میں بیس برس سے کم عمر والے اشخاص اس بیماری میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ مرض آسام اور بنگال میں بکثرت ہوا کرتا ہے اور پنجاب میں تو یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ پہلے اس مرض کو خراب قسم کا ملیریا سمجھا جاتا تھا لیکن دراصل یہ مختلف مرض ہے کیونکہ اس میں خون کے اندر ملیریا کے خاص کرم موجود نہیں ہوتے۔ اور کونین کے استعمال سے اس بخار کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ انڈین کالا آزار کمیشن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دراصل ایک خاص قسم کے کھٹملوں کے ذریعہ یہ مرض پھیلتا ہے۔ یہ مریض کا خون چوسنے کے بعد تندرست اشخاص کو کاٹتے ہیں اور کالا آزار کے کرموں (Germs) کو مریض کے خون سے لے کر تندرستوں میں داخل کر دیتے ہیں، اس لئے ان کے گزند سے محفوظ رہنا ضروری ہے کسی ایسے مکان میں جہاں کالا آزار کا مریض رہ چکا ہو، بود و باش اختیار کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔

علامات

جاڑے سے بخار چڑھتا ہے۔ دوران بخار میں جگر اور خاص کر تلی بڑھ کر پیٹ پھول جاتا ہے، مریض نہایت لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے اور جلد پر سیاہی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ناک منھ سے جریانِ خون ہو یا پاؤں اور ٹخنوں پر آماس آ جائے تو نتیجہ اچھا نہیں ہوتا!

(ماخوذ ڈاکٹری اور گھر کا حکیم ص۳۰۴ مؤلفہ حکیم مظفر حسین اعوان و ڈاکٹر اختر حسین اعوان مطبوعہ کتب خانہ لطف زندگی۔ موچی دروازہ لاہور طبع پنجم جون ۱۹۵۱ء)

نوٹ: اس کا زیراکس پروفیسر حکیم کمال الدین حسین سابق چیرمین حکیم اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مجھے بھیجا میں ان کا شکر گزار ہوں۔ (اکبر حیدری)

کاظم علی خاں
۲۷/بی/۱۰- جاپلنگ روڈ، لکھنؤ

عزیز لکھنوی کی صحیح تاریخ ولادت

جدید تحقیق کی روشنی میں

شیعہ کالج میگزین لکھنؤ کے ۹۲-۱۹۹۱ء کے حالیہ شمارے میں شامل زیر طبع "گوشۂ عزیز لکھنوی" کے مرتب و مدیر کی حیثیت سے میں اپنی چھان بین کی بدولت مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (متوفی اواخر جولائی ۱۹۳۵ء) کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں اس تازہ انکشاف سے دوچار ہوا کہ سوانح نگاروں نے عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے ماتحت اب تک جو کچھ معلومات فراہم کی ہیں وہ ان مضحکہ خیز فروگزاشتوں" کا نمونہ ہیں جو انگریزی میں "ہاؤلرز" (Howlers) یا "ہمالین بلنڈرز" (Himalian Blunders) کے خطاب سے سرفراز ہوا کرتی ہیں۔
عزیز لکھنوی کی صحیح تاریخ ولادت کی تلاش میں کم و بیش ایک درجن مصادر و ماخذ کی ورق گردانی میں میری عرق ریزی کے جو نتائج نکلے وہ ادبی حلقوں کی دل چسپی کے لیے زیر نظر مختصر مقالے کے ذریعہ پیش کیے جاتے ہیں۔

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے لیے میں نے اردو کے جن مشہور و معروف اہل قلم کی نگارشات کا جائزہ لیا ان میں یہ نام شامل ہیں:-

(۱) سید احتشام حسین رضوی
(۲) رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
(۳) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
(۴) لالہ سری رام
(۵) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی
(۶) مالک رام
(۷) ڈاکٹر امرناتھ جھا
(۸) رحم علی الہاشمی (تلمیذ عزیز لکھنوی)[۲]
(۹) ڈاکٹر مصطفےٰ نظرت
(۱۰) ڈاکٹر سید سکندر آغا
(۱۱) ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی۔ (ڈاکٹر صاحب نے عزیز لکھنوی کے احوال اور ادبی آثار پر تحقیق کرکے نومبر ۱۹۸۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے)

ان تمام اہل قلم کے نوشتہ جات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے سے یہ عبرت ناک اور پریشان کن انکشاف ہوا کہ مذکورہ بالا اہل قلم نے عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے ماتحت جو مختلف و متضاد بیانات پیش فرمائے ہیں وہ سب کے سب حقائق پر مبنی ہونے کے بجائے ایسی گمراہ کن قیاس آرائی کا نمونہ ہیں جو ادبی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے دردسر اور سرگرانی کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ ادبی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی دل چسپی کے لئے ہم بطور ذیل میں اپنی اس بے سود تحقیقی تگ و دو کی روداد پیش کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک اس سعی لاحاصل کی مثال ہے جسے انگریزی میں "این اکسرسائز ان فیوٹیلٹی" — (AN EXERCISE IN FUTILITY) کہا جاتا ہے۔

(۱) ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین رضوی نے اپنی ہندی و اردو کی دو عدد کتابوں میں بہ تکرار مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا سن ولادت ۱۸۸۰ء لکھا ہے[۳] ہماری تازہ تحقیق اس بے حوالہ

اندراج کو نظرِ ثانی کا محتاج ثابت کرتی ہے جس کی تفصیل اپنے مناسب مقام پر آگے آ رہی ہے۔

(۲) فراق گورکھپوری نے عزیز لکھنوی کا سالِ ولادت ۱۸۸۲ء تحریر فرمایا ہے۔ سید احتشام حسین رضوی اور فراق گورکھپوری کے ایسے محترم اہلِ قلم کے اقوال میں یہ واضح تضاد ہمیں جس مضحکہ خیز صورتِ حال میں ڈال رہا ہے اس کے بطن سے ہمارے ذہن میں یہ چند دلچسپ سوالات جنم لیتے ہیں۔

(الف) پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کے ایسے بزرگ و قابلِ احترام اہلِ قلم کا احترام کرتے ہوئے ان دونوں حضرات کے اقوال کو درست مان لیں تو اس کے نتیجے میں یہ دلچسپ صورتِ حال سامنے آئے گی کہ عزیز لکھنوی اس عالمِ آب و گل میں ایک کے بجائے دو بار پیدا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ کسی فردِ واحد کا ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۲ء میں "دو بار" پیدا ہونا قولِ محال کی ایک ایسی دلچسپ مثال ہوگی جو منطق و استدلال کی کسوٹی پر کسی طرح کھری نہ ثابت ہوگی۔

(ب) اس صورتِ حال سے دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں محترم اہلِ قلم میں سے اگر کسی ایک کا قول درست اور دوسرے کا بیان غلط ہے تو ہم ان دونوں حضرات میں سے کس کے ارشاد کو صحیح اور کس کے خیال کو غلط مانیں۔؟

(ج) اس دوسرے سوال کے جواب کے لیے ہماری چھان بین نے جو ایک تیسری دلچسپ صورتِ حال پیدا کی وہ یہ ہے کہ عزیز لکھنوی کے سالِ ولادت کے سلسلے میں ان دونوں اہلِ قلم کے اقوال مبنی بر حقیقت نہ ہو کر ناقابلِ قبول و گمراہ کن قیاس آرائی کی مثال ہیں، جس کی وضاحت مناسب مقام پر کی جائے گی۔

(۳) پاکستانی اہلِ قلم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں عزیز لکھنوی کے زمانۂ ولادت کے ماتحت "۵ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء" کے جو ہجری اور عیسوی سنین تحریر فرمائے ہیں وہ تقویم کی رو سے باہمی مطابقت نہیں رکھتے۔ (اس تقویمی عدم مطابقت کی وضاحت کے لئے قدرے انتظار فرمائیں) اور یہ اندراج کم از کم عیسوی سنہ کی حد تک تو ناقابلِ قبول ہے۔

(۴) تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد پنجم) مولفہ لالہ سری رام۔ مرتبہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی میں عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں ۵ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۲ء کا اندراج بھی ہجری و عیسوی سنین میں "باہمی تقویمی عدم مطابقت" کے باعث نظرِ ثانی کا طالب ہے۔

(۵) تذکرۂ ماہ و سال، مرتبہ مالک رام میں عزیز لکھنوی کی تاریخِ ولادت کے ماتحت "۱۴ مارچ ۱۸۸۲ء (۵ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ)" کا اندراج بھی عیسوی اور ہجری تاریخوں میں باہمی تقویمی عدم مطابقت کی بنیاد پر نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔

(۶) ڈاکٹر امرناتھ جھا کی انگریزی کتاب "اُردو پوئٹس اینڈ پوئٹری" میں عزیز لکھنوی کا سنِ ولادت ۱۸۸۲ء بھی ترمیم و تصحیح کا طالب ہے۔

(۷) عزیز لکھنوی کی غزلوں کے دیوان گل کدہ کے مقدمے میں رحم علی الہاشمی نے اپنے استاد عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں "۵ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۲ء" کے جو ہجری اور عیسوی سنین درج کئے ہیں وہ بھی باہمی تقویمی عدم مطابقت کے باعث کم از کم عیسوی سنہ کی حد تک درست نہیں (وضاحتی تفصیل آگے آئے گی)

(۸) ڈاکٹر مصطفٰے نظرت نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے میں عزیز لکھنوی کے سالِ ولادت کے ماتحت کم از کم ۱۸۸۲ء کا جو عیسوی سنہ تحریر کیا ہے وہ بھی میری تازہ تحقیق کی بنیاد پر تصحیح طلب ہے۔

(۹) ڈاکٹر سید سکندر آغا نے بھی ادبی حلقوں کے عام بے بنیاد قیاس کی بنیاد پر عزیز لکھنوی کا سنہ ولادت ۱۸۸۲ء ہی لکھا ہے جو میری جدید تحقیق کی بنیاد پر خلافِ واقعہ ثابت ہوتا ہے۔

(۱۰) مضامین عزیز: مولفہ ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی میں عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں "۱۴ر فروری ۱۸۸۲ء (۵ر ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ھ)" کا بے حوالہ اندراج اپنی عیسوی و ہجری دونوں تاریخوں کے اعتبار سے میری تازہ تحقیق کی بنیاد پر یک سر بے بنیاد ثابت ہوتا ہے جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔[۲۳]

(۱۱) ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی کے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے "عزیز لکھنوی۔ حیات اور کارنامے" میں عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے تحت "۵ر ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۴ر فروری ۱۸۸۲ء)" کا اندراج "دیباچہ گل کدہ ص۲" کے حوالے پر مبنی ہے۔[۲۴] یہ ایک سطری اندراج میری تازہ تحقیق کی روشنی میں خلاف تقویم ہونے کے ساتھ ساتھ خلاف اصل بھی ہے۔

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی نے عزیز لکھنوی کی ولادت کی جو ہجری و عیسوی تاریخیں تحریر کی ہیں وہ جس باہمی تقویمی عدم مطابقت کا شکار ہیں اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ "مفتاح التقویم" مصنفہ حبیب الرحمان خاں صابری کی رو سے ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی کی درج کردہ ۵ر ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ھ کی ہجری تاریخ "۱۴ر فروری ۱۸۸۲ء" کے بجائے ۱۳ر فروری ۱۸۸۳ء کے مطابق ملتی ہے۔[۲۵]

یہاں اس حقیقت کا انکشاف بھی افادیت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ "تقویم ہجری و عیسوی" مرتبہ ابو النصر محمد خالدی بہ نظر ثانی مولوی محمود احمد خاں ڈی۔ اے۔ ڈیسائی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی طبع مارچ ۱۹۷۷ء (ص۹۵) میں ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ھ کی پہلی تاریخ جو کتابت کی غلطی سے ۶ر فروری ۱۸۸۳ء درج ہوگئی ہے اسے ۹ر فروری ۱۸۸۳ء ہونا چاہئے — جیسا کہ مفتاح التقویم ص۲۰ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ابو النصر محمد خالدی کی مرتب کردہ تقویم میں کتابت کی یہ پہلی غلطی ہے جو برسوں بعد میرے علم میں آئی ہے۔ اس غلطی سے علمی اور تحقیقی حلقوں کا باخبر رہنا یوں ضروری ہے کہ آئندہ یہ غلط اندراج تسامحات کا سبب نہ بنے اور ذمہ داران انجمن ترقی اردو (ہند) اس تقویم کی اگلی اشاعت میں اس سہو کی تصحیح فرمالیں۔

ڈاکٹر مسعود حسن ردولوی نے عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے لیے اپنے مذکورہ اندراج میں "دیباچہ گل کدہ ص۲" کا جو نامکمل حوالہ دیا ہے اس کے تحقیقی محاکمے کے نتیجے میں یہ انکشاف ہوا کہ گل کدہ (دیوان غزلیات عزیز لکھنوی۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ طبع ۱۹۳۱ء) میں سرے سے کوئی ایسی تحریر تو موجود نہیں جس کا عنوان "دیباچہ" ہو لیکن اس دیوان کے آغاز میں رحم علی الہاشمی کا "مقدمہ" ضرور شامل ہے۔ اس مقدمے (ص۲) میں عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسن ردولوی کی تحریر کردہ تاریخ ۵ر ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ھ کے برخلاف ۵ر ربیع الاول سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء کا اندراج ملتا ہے جو ہجری اور عیسوی سنین میں باہمی تقویمی عدم مطابقت کے باعث تصحیح کا طالب ہے۔ مفتاح التقویم (ص۲۷) نیز تقویم ہجری و عیسوی (ص۹۵) کی روشنی میں مقدمہ گل کدہ (ص۲) میں عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت "۵ر ربیع الاول سنہ ۱۳۰۰ھ" میری تازہ تحقیق کے بموجب ۱۴ر جنوری ۱۸۸۳ء کے مطابق نکلتی ہے۔

اس تمام طولانی اور تفصیلی بحث کا اجمالی نتیجہ یا "حاصل بحث" یہ ہے کہ میری تازہ تحقیق کی بنیاد پر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی صحیح تاریخ ولادت ۵ر (پنجم) ربیع الاول سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۴ر (چہاردہم) جنوری سنہ ۱۸۸۳ء ثابت ہوتی ہے اور مجھے افسوس کے ساتھ یہ انکشاف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک ہمارے مشاہیر اہل قلم کم از کم عیسوی سنہ کی حد تک عزیز لکھنوی کی صحیح تاریخ ولادت بتانے سے قاصر رہے ہیں۔

□□

حواشی:

۱۔ رجوع کیجیے: (۱) عزیز لکھنوی۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی۔ نظامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۸۴ء ص۵

(باقی ص۳۶ پر)

وہ ایک عجیب لمحہ

بند کمرے کے اندر
گہری گہری سانسوں کی مہک سے اُٹھتی
حقیر سی چنگاری
اس کے کھلیان کو ڈرا رہی تھی

اس نے یہ کھلیان بہت سے شعلوں سے بچایا تھا
مگر آج
اسے ایک حقیر سی چنگاری سے
ڈر لگ رہا تھا
بے پناہ ڈر

اس کا کھلیان
گیلی لجلجی گھاس سے بنا تھا
پھر بھی آج
وہ ڈر رہا تھا
کہیں اس کی گیلی لجلجی گھاس
پڑوسی دُودھ والے کے بھُوسے کی طرح
جل نہ اٹھے

دُودھ والے کی دیسی شراب کے سُرخ نشے میں ڈوبی
آنکھیں
گیلی لجلجی گھاس کو
خشک کیے ڈال رہی تھیں

اس کے ہر بن مُو سے پھُوٹتا لہو کا چشمہ تک
اس کے وجود کو گیلا رکھنے میں
ناکام ہوا جا رہا تھا
←

اچانک وہ اُٹھا
اور اپنے کھلیان کے خشک ہوتے ہوئے تنکے سے
دُودھ والے کی آنکھیں پھوڑ دیں

اب اس کا کھلیان
پھر اسی گیلی لجلجی گھاس سے عبارت تھا
اور گہری گہری سانسوں کی مہک سے اٹھتی چنگاری
سرد ہو چکی تھی !!
□□

اظہر مسعود
معرفت اترپردیش اردو اکاڈمی
قیصر باغ لکھنؤ

مشورہ

آؤ دیکھیں
ان اندھیروں سے پرے اک راستہ ہے
صاف ہموار و کشادہ
ان کمیں گاہوں سے نکلیں
آؤ ہم سب اس کو ڈھونڈھیں
مل کے پتھر بنیں ہم،
مشعلیں بن جائیں ہم اس راستے کی
راستہ سب کو دکھائیں
کلپنا کے اس نئے بھارت کا،
جس میں ایکتا ہو
اور خوشیاں جس میں سب کے پاؤں چومیں
آؤ دیکھیں !

وقار طاہر
۹۹/۲۲۳ اے، نالہ روڈ
چمن گنج۔ کانپور

اسرار سیّد
نوچندا بھون۔ بنارسی باغ۔ لکھنؤ

مچھّی بھون یا مچھّی باون

نوابین عہد کے باقیات میں آج بھی شہر لکھنؤ میں متعدد ایسی عمارتیں موجود ہیں جو تاریخی اعتبار سے تو اہم ہیں ہی، اپنی نزاکت حسن اور دل کشی سے دنیا کے سیّاحوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ فن تعمیر اور تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ عمارتیں دنیا کی اعلا اور مشہور عمارتوں کے مقابل پیش کی جا سکتی ہیں۔ یادگار عمارتوں کے باقیات میں آج بھی متعدد محل سرائیں، حویلیاں، امام بارگاہیں، مقابر، مزارات اور درگاہیں محفوظ ہیں۔ لیکن ان عمارتوں کے علاوہ بہت سی عمارتیں ایسی بھی اس شہر میں تھیں جو مختلف وقتوں میں بدلتے ہوئے سماجی رجحان کے تحت یا سیاسی بحران اور افراتفری کے نتیجے میں یا تو تباہ کر دی گئیں یا ان کی شکل و صورت کو یکسر تبدیل کر دیا گیا۔ ایسی ہی عمارتوں میں ایک عمارت مچھی بادن یا قلعۂ لکھنا بھی ہے۔ اب اس عمارت کا فقط نام ہی تاریخ میں محفوظ ہے۔

مچھی بادن میر امین الدین برہان الملک سے تقریباً ایک سو برس قبل کی عمارت تھی جس کی تعمیر شیخ عبدالرحیم خاں نے کرائی تھی۔

شیخ عبدالرحیم خاں بجنور کے رہنے والے تھے اور بے انتہا مفلسی اور تنگ حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب اپنے وطن بجنور میں وہ اپنے حالات سے بہت پریشان ہوئے تو تلاش معاش کے لئے دہلی آ گئے۔ یہ شہنشاہ محمد اکبر کا عہد تھا۔ قسمت نے یاوری کی اور چند رؤسا اور منصب داروں کی معرفت شیخ عبدالرحیم کی رسائی دربار شاہی تک ہو گئی جہاں پہلے تو ایک معمولی سی ملازمت پائی لیکن اپنی محنت اور جاں فشانی کے سبب اکبر کے منصب داروں کی صف میں کھڑے ہونے لگے [1]

اکبر کی فوج جب ۱۵۸۶ء میں کابل سے لوٹ رہی تھی تو فوج شاہی کے ساتھ شیخ بھی تھے۔ سیال کوٹ کے قیام کے دوران کثرت مے نوشی کے باعث شیخ عبدالرحیم نے اپنی ہی تلوار سے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی لیکن قدرت کو ابھی ان کی موت منظور نہ تھی۔ اس لئے اس کاری ضرب کے باوجود وہ جلد ہی ٹھیک ہو گئے [2]

شیخ عبدالرحیم اس حادثہ کے بعد بھی اکبر کے منصب داروں میں شامل رہے۔

اکبر کو نجومیوں پر بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن دربار کے تمام نجومیوں نے بہ اتفاق رائے بادشاہ سے عرض کیا کہ دو دن دس ساعت تک شہنشاہ کا تخت پر بیٹھنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس بیچ کوئی بھی آفت ناگہانی آ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی نجومیوں نے اکبر کو یہ بھی مشورہ دیا کہ اس مدت میں تخت شاہی پر کسی اور کو بٹھایا جائے تو بہتر ہو گا۔ [3]

اکبر نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے شیخ عبدالرحیم کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اسے حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر قبول کر لیا۔ منحوس مدت ختم ہونے سے دو ساعت قبل بادشاہ نے پوشاک شاہی طلب کی۔ ایک خواجہ سرا نے پوشاک حاضر کی۔

اتفاقاً تاجِ شاہی میں ایک کالا سانپ تھا جس نے خواجہ سرا کی انگلی میں کاٹ لیا اور کچھ ہی لمحوں میں اس کا دم نکل گیا۔

اس واقعہ کے سلسلے میں شیخ محمد عظمت علی کاکوروی نے اپنی تصنیف مرقعِ خسروی میں لکھا ہے کہ ـــــ "پوشاک کے ساتھ جو نعلین آئے تھے ان میں سے ایک میں کالا سانپ تھا"۔

بہرحال کالے سانپ کا نکلنا دونوں کتابوں سے ثابت ہے حالانکہ اس واقعہ کا "اکبرنامہ" میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔

وقت مجوزہ تک شیخ عبدالرحیم کے تخت نشین رہنے کے بعد جب اکبر پر سے منحوس گھڑی ٹل گئی تو بادشاہ نے ایک جشن کے ساتھ شیخ کو لکھنؤ اور پرگنہ کورج ضلع بہرائچ کی جاگیر عطا کی۔ شیخ عبدالرحیم تزک و احتشام اور کر و فر کے ساتھ اپنی جاگیر میں آکر مقیم ہوئے اور بڑے جاہ و جلال اور خوش اسلوبی کے ساتھ لکھنؤ کا انتظام سنبھالا۔

شیخ عبدالرحیم نے اپنے رہنے کے لئے گومتی کے کنارے ٹیلہ شاہ پیر محمد پر ایک قلعہ بنوایا جس کا نام قلعۂ لکھنا رکھا۔ قلعہ کی چوحدی آصف الدولہ کے امام باڑے کے اندر تک تھی۔ قلعۂ لکھنا میں داخل ہونے کے لئے ایک بڑا سا دروازہ بنوایا گیا تھا جس کا نام شیخن دروازہ تھا۔ جس پر شیخ عبدالرحیم کے انتقال کے بعد ان کے ورثا شیخ زادوں نے نخوت و غرور کے زیر اثر ایک ننگی تلوار لٹکا دی تھی۔ یہ شیخن دروازہ شیخ زادوں کی طاقت کی علامت بن گیا تھا اور شیخ زادوں کے زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ جس کا مچھی بادن اس کا لکھنؤ"۔ شیخ زادوں کے زمانے میں ہر خاص و عام کو یہ حکم تھا کہ شیخن دروازہ میں جو شخص بھی داخل ہوگا، اسے اس ننگی تلوار کو سلام کرنے کے بعد جھک کر ہی مچھی بادن میں داخل ہونا ہوگا۔ یہ تلوار لکھنؤ پر شیخ زادوں کے تسلط کی غمازی ۱۷۲۰ء تک کرتی رہی، جسے نواب میر امین الدین سعادت خاں برہان الملک نے کاٹ کر گرا دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی لکھنؤ سے شیخ زادوں کا جاہ و جلال، رعب و دبدبہ اور تسلط ختم ہوگیا۔

"قلعۂ لکھنا" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس قلعہ کو لکھنا نام کے ایک امیر نے بنایا تھا۔ شیخ عبدالرحیم کو یہ قلعہ اس قدر پسند آیا کہ خوش ہو کر اس قلعہ کا نام انھوں نے قلعۂ لکھنا رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہوگیا۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لچھمن پوری سے لکھنؤ ہوا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد ہی پایا ہے۔ ؎

قلعۂ لکھنا کا نام ایک تھوڑے عرصہ کے بعد ہی مچھی بادن رکھ دیا گیا۔ اس قلعہ کے نام کی تبدیلی کی وجہ شاید یہ تھی کہ شیخ عبدالرحیم کو مغل دربار سے علم ماہی مراتب کا خطاب ملا تھا اور شاید اسی خطاب کی مناسبت سے شیخ عبدالرحیم نے اس قلعہ کے دروازوں پر معمار کو حکم دے کر مچھلیاں بنوائی تھیں۔ اس قلعہ میں ۲۶ محرابیں یا دروازے تھے اور ہر دروازے کی محراب پر دو دو مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح پورے قلعہ کے باہری حصے میں معماروں نے باون مچھلیاں بنا دی تھیں۔ اسی مناسبت سے اس قلعہ کا نام مچھی بادن پڑا جو کثرتِ استعمال سے "مچھی بھون" ہوگیا۔

شیخ محمد عظمت علی کاکوروی اپنی تصنیف "مرقعِ خسروی" میں مچھی بھون کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"دروازوں پر دو دو مچھلیاں کاریگروں نے بڑی بڑی موجھوں کی بنائی تھیں۔ جب گنوار دیہاتی انھیں دیکھتے تو انھیں مچھی کی بھوں کہتے چیز نئی تھی ـــ تماشا ہوگئی۔ آخر کو کثرت استعمال سے خود اس کا نام مچھی بھون ہوگیا"۔

شیخ محمد کاکوروی کی اس دلیل کو زیادہ صحیح اس لیے نہیں مانا جاسکتا کہ جس عہد میں شیخ عبدالرحیم نے اس قلعہ کی تعمیر کرائی اس وقت سارے ہندوستان کی درباری اور عوامی زبان فارسی تھی اور ہندی یا سنسکرت زبانوں کا اتنا چلن نہیں تھا کہ مسلمان حکمراں یا نواب اپنے قلعہ یا رہائش کو بھون سے نسبت دیتا۔ یہ بھی اگر مان لیا جائے کہ بعد کو نوابین اودھ نے اس کا نام تبدیل کر دیا تو یہ بات بھی کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہے کیونکہ اس دور میں بھی درباری اور عوامی زبان یا تو فارسی تھی یا اردو۔ اور اگر اس کا نام کسی وجہ سے تبدیل بھی ہوتا تو وہ مچھی قلعہ

مچھی بھون یا مچھی منزل میں سے کوئی ایک نام ہوتا۔ اس لیے یہ بات بڑے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شیخ عبدالرحیم نے اس قلعہ کا نام مچھی بادن ہی رکھا تھا جو بعد میں کثرت استعمال سے بگڑ کر مچھی بھون ہو گیا۔

شیخ عبدالرحیم نے مچھی بھون کے پاس دو اور عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں سے ایک کا نام 'مبارک محلہ' اور دوسرے کا نام 'پنچ محلہ' تھا۔ پنچ محلہ کو شیخ عبدالرحیم نے اپنی پانچ بیویوں کے رہنے کے لیے بنوایا تھا۔[5] یہ پنچ محلہ بعد کو داخل حصار قلعہ مچھی بادن ہو گیا تھا اور یہ آصف الدولہ کے عہد میں آصفی اما باڑے کی تعمیر کے بعد تو صفحۂ ہستی سے بالکل معدوم ہو گیا۔

اب تو قلعہ مچھی بادن، مبارک محلہ، پنچ محلہ اور شیخن دروازے کا خیال آتے ہی صرف یہی مصرعہ زبان پر آتا ہے:

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

□□

حواشی:۔

1. سوانح حیات سلاطین اودھ ص ۲۴
2. اکبر نامہ جلد ۳ ص ۴۷
3. سوانح حیات سلاطین اودھ
4. گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر
5. سوانح حیات سلاطین اودھ ص ۳۴

عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت ص ۲۳ کا بقیہ

(۲) تذکرہ ماہ و سال: مالک رام۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی طبع نومبر ۱۹۹۱ء ص ۲۷۳

۳۔ بہ حوالہ تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۲۴

۵۔ ر.ک: (۱) ہندی کتاب اردو ساہتیہ کا اتہاس: سید احتشام حسین انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۲۴۲

(۳) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی طبع ۱۹۸۳ء ص ۲۴۵

۴۔ ہندی کتاب اردو بھاشا اور ساہتیہ: فراق گورکھپوری۔ سوچنا وبھاگ لکھنؤ طبع ۱۹۶۲ء ص ۲۶

۵۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مکتبۂ علم و فن دہلی طبع اپریل ۱۹۶۵ء ص ۴۹۶

۶۔ خم خانۂ جاوید (جلد پنجم) مولفہ لالہ سری رام۔ مرتبہ برج موہن کیفی۔ دہلی طبع ۱۹۴۰ء ص ۵۹۲

۷۔ تذکرہ ماہ و سال، مالک رام ص ۲۷۳

۸۔ انگریزی کتاب اردو پرنٹس اینڈ پوئٹری: ڈاکٹر امرناتھ جھا لیڈر پریس الہ آباد طبع ۱۹۵۶ء ص ۱۳۷

۹۔ گل کدہ: عزیز لکھنوی۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ طبع ۱۹۳۱ء (مقدمہ ص ۔)

۱۰۔ صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۸۹ء ص ۹۲

۱۱۔ بیخود موہانی۔ حیات و شاعری: سید سکندر آغا۔ نامی پریس لکھنؤ۔ طبع نومبر ۱۹۷۴ء ص ۲۶

۱۲۔ مضامین عزیز: مولفہ ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۸۷ء ص ۸

۱۳۔ عزیز لکھنوی۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی۔ نظامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۸۴ء ص ۲۶

۱۴۔ دیکھیے، مفتاح التقویم، مصنفہ حبیب الرحمٰن خاں صابری ترقی اردو بیورو نئی دہلی طبع ۱۹۷۷ء ص ۲۰

مضمون نگار حضرات

ارسال کردہ تخلیقات صاف، خوشخط فل اسکیپ سائز کاغذ پر ایک ہی طرف تحریر کریں۔ اور ادارہ کو اصل کاپی ہی روانہ کریں۔ کاربن یا زیراکس کاپی قابلِ اشاعت نہ ہوگی۔

(ادارہ)

لئیق رضوی
بی - ۱۴۴۸ - کریلی - الہ آباد

اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت

(۲)

ان اشعار کے علاوہ شخصی مرثیے کے جو اوّلین نمونے دستیاب ہوسکے ہیں ان میں سے بیشتر قطعاتِ تاریخ کی صورت میں ہیں۔ جن میں مرنے والے کے پُردرد تذکرہ کے علاوہ اس کی تاریخِ وفات کا مادہ بھی نکالا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس قسم کی کسی بھی شعری کاوش کا واحد اور بنیادی مقصد تاریخ وفات کا مادہ نکالنا ہوتا ہے مگر اس ضمن میں مرنے والے کی شخصیت کا تذکرہ اور اس کی موت پر اظہارِ غم کے اشعار بھی شامل ہوتے ہیں اور اسی رعایت سے ان قطعات کو شخصی مرثیے کے باب میں شامل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ اب تک جن قدیم شعرا کے یہاں اس طرح کے اشعار مل سکے ہیں۔ ان میں سودا، انشا، ناسخ، مصحفی، ناسخ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مرزا سودا نے اپنے ہم عصر شاعر مظہر جان جاناں کے قتل پر قطعہ تاریخ نظم کیا تھا ؂

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتد شوم
اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ از روئے درد یہ سن کے کہی
سودا نے کہا ہائے جان جاناں مظلوم

اس کے علاوہ سودا نے اپنی غزل کے ایک شعر میں شیخ شرف الدین مضمون کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی کو سراہا ہے اور ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے۔ میرے نزدیک سودا کا یہ شعر مضمون کا مرثیہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؂

بنائیں اُٹھ گئیں یا رو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے، رہا سودا سو مستانہ

اس ضمن میں میر تقی میر کے اس مقطع کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے میر عبدالحی تاباں کی موت سے متاثر ہوکر کہا تھا۔ تاباں، میر تقی میر کے دوستوں میں سے تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ دوستی پائیدار نہ ہوسکی تھی۔ شعر ملاحظہ فرمائیں ؂

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر
ہو نجات اس کی بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

خود عبدالحی تاباں نے بھی اپنے استاد محمد علی حشمت کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا۔ مرثیہ کا، جو مخمس کے فارم میں کہا گیا تھا، مکمل متن دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ البتہ سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس کا آخری بند شامل کیا ہے[۱]۔ بند کے آخری مصرع سے حشمت مرحوم کی تاریخ وفات بھی نکلتی ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا نے شاہ عالم ثانی کی وفات پر قطعہ تاریخ نظم کیا تھا ؂

ہے فوت شاہ عالم فخرِ جہانیاں
وہ غم کہ جس سے ہر بنی آدم کو غم ہوا
دوبارہ سر جھکا کے کہا آفتاب نے
تاریخ بادشاہ کی "عالم کو غم ہوا"

مصحفی نے میر تقی میر کی وفات پر ایک مرثیہ نظم کیا تھا اور ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا تھا ؎

ہند جنت نشاں میں رکھتی تھی
غزل عاشقانہ اوس سے رواج

اسی دور میں عبدالغفور نساخ نے کئی شخصی مراثی لکھے۔ نساخ اپنے عہد کے ممتاز شاعر تھے۔ انھوں نے "سخن شعراء" نام سے شعرائے اُردو کا تذکرہ بھی تصنیف کیا ہے۔ نساخ نے اپنے استاد مولوی حافظ رشید النبی وحشت کی وفات پر ایک درد انگیز مرثیہ لکھا تھا۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

مرگئے حیف حضرتِ وحشت
یا خدا وہ ہوں داخلِ جنت

گوہر درج علم و فضل تھے وہ
نیّر برج علم و فضل تھے وہ

عالم باعمل تھے اور کامل
علم میں بے بدل بڑے فاضل

جب کہ استاد کا وصال ہوا
مجھ کو تاریخ کا خیال ہوا

بہ خدا دی سروش نے ناگاہ
مرگئے آہ ایسے فاضل آہ

اس کے علاوہ نساخ نے میر سوز، نواب علی اصغر بہادر ناصر جنگ اور میر تقی میر کی وفات پر بھی مرثیہ کے اشعار نظم کیے ہیں۔

نساخ نے محمد تقی خاں ترقی کی وفات پر ایک مرثیہ نظم کیا تھا، اس مرثیہ میں کل ۷ اشعار ہیں اور آخری شعر سے تاریخ وفات کا مادہ بھی نکلتا ہے۔ نساخ قیام فیض آباد کے زمانے میں موصوف کے یہاں ملازم تھے۔ یہ مرثیہ نساخ کے مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی[۲] اور ڈاکٹر گیان چند جین[۳] نے بعض قلمی نسخوں کے حوالوں کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

تھے حاتم زمانہ مرزا تقی ترقی!
ایسے کہیں جہاں میں صاحب کرم نہ ہوں گے
تاحشر اس امیر فیاض کے برابر
اہل حشم نہ ہوں گے، عالی ہمم نہ ہوں گے
پائی وفات اس نے، ماتم سرا ہیں سینے
ہے کون دل کہ جس میں سو خارِ غم نہ ہوں گے
ہوں گے اگر نیستاں ہر قلم میسر
اوصاف اس کے نساخ پھر بھی رقم نہ ہوں گے
لے لیں گے ساتھ اس کو جب تک نہ روز محشر
خلد بریں میں داخل شاہِ امم نہ ہوں گے
گن اس بلیغ کا یوں مطلع برائے تاریخ
بس ایک سے زیادہ اعداد کم نہ ہوں گے
"دنیا کے جو نرے ہیں باللہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے اے وائے کم نہ ہوں گے"

اس کے علاوہ نساخ نے جرأت کی وفات پر بھی ایک قطعہ نظم کیا تھا، جس کے آخری مصرع سے جرأت کی تاریخ وفات کا مادہ بھی نکلتا ہے ؎

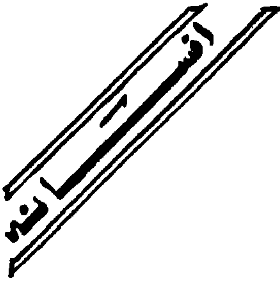
جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے
گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ نساخ نے کہا
ہائے ہندوستان کا شاعر موا

(باقی آئندہ)

حواشی

۱۔ بحوالہ نگار۔ مارچ ۱۹۵۱ء ص ۳۰
۲۔ نساخ: تجزیہ و تعارف ص ۱۳۹
۳۔ ذکر و فکر (الہ آباد ۱۹۸۰ء) ص ۱۵۵

□□



ڈاکٹر بشیشر پردیپ
اے ۵۵۵۔ اندرا نگر۔ لکھنؤ

مسـ اہٹ

اس سپر فاسٹ گاڑی کی رفتار اچانک سست ہونے لگی تو مسافر حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ــــ اس گاڑی کا ادھر تو کوئی اسٹاپ نہیں ہے ۔ پھر یہ دھیمی کیوں ہو گئی؟ کہیں پٹری تو خراب نہیں ہے ۔؟

" آج تو یہ وقت پر پہونچنے سے رہی ۔ چلی بھی تو بیس منٹ دیر سے تھی " اس مسافر کے لیے وقت پر پہونچنا بہت ضروری تھا

آہستہ ہوتے ہوتے گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی ــــ اس گاڑی کے ڈبے اندر سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے ۔ یعنی یہ گاڑی ویسٹی بیول (Vestibule) تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی ایک شور سنائی دیا۔ اگلے ڈبے کے کچھ مسافر گاڑی کے اس ڈبے کے دروازے کی طرف لپکے۔

" سب دروازے کھول دو ــــ باہر نکل جاؤ ــــ جلدی کرو ــــ جلدی ــــ دروازے کھول دو۔ باہر نکل جاؤ"۔

گاڑی کے اندر ایک کہرام سا مچ گیا "اٹھو ــ اٹھو ــــ نکلو باہر ــ جلدی"۔

چند ہی سکنڈ میں یہ بات ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے اور دوسرے سے تیسرے ــ اور اس طرح تمام ڈبوں میں پہونچ گئی ــــ آواز کی اپنی رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتار سے ــ اور اب جو بھی دروازہ کھلا مسافر اس سے اترنے لگے ــ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ایک خوف سا پھیل گیا ــ شاید کسی اگلے ڈبے میں آگ لگ گئی ــ؟! شاید کسی ڈبے میں دہشت پسند گھس آئے اسٹین گنوں سے لیس ــ؟! شاید سامنے سے کوئی گاڑی آرہی ہے اور چند ہی منٹوں میں ٹکر ہو جائے گی ۔؟!

دروازوں سے دور بیٹھے کچھ مسافروں نے سراسیمگی کی حالت میں کھڑکیوں کی سلاخوں کو ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی پوری طاقت کے ساتھ اندر باہر، اوپر نیچے کھینچا لیکن سلاخیں کہاں ہل سکتی تھیں ــــ مایوس ہو کر وہ پھر دروازوں کی طرف بڑھے ۔ ہاتھ پیر پھول جانے کی وجہ سے اگر کوئی دروازہ نہ کھول پائے تو پھر ڈبے میں گرتے پڑتے کسی دوسرے کھلے دروازے کی طرف لپکے ــ دروازوں کے پاس بھیڑ اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ لوگ اس بھیڑ میں پسے جا رہے تھے ــ خاص طور پر عورتیں اور بچے ــــ چھوٹا اسٹیشن ہونے کی وجہ سے پلیٹ فارم کافی نیچے تھا ــ جلدی سے اترا نہیں جا سکتا تھا ــ آخری سیڑھی پر سے تو زیادہ تر کود کر ہی جانا پڑ رہا تھا ــ بعض لوگ پلیٹ فارم کی طرف نہ اتر کر دوسری طرف بھی اتر رہے تھے اور پٹری سے باہر بچھی گٹی کے اوپر گر رہے تھے ــ ایک بوڑھے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی ــ ایک عورت منہ کے بل گری اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا ــ ایک بچہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ــ سامان تو کوئی بھی مسافر اٹھا نہ سکا تھا ــ سامان اٹھانے کا ہوش بھی کس کو تھا ــ جان ہے تو جہان ہے ۔ کئی مسافروں کی چپلیں اور جوتے بھی گاڑی کے اندر رہ گئے۔

ابھی گاڑی پوری طرح خالی نہیں ہوئی تھی کہ گاڑی سے ذرا فاصلے پر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گارڈ نظر آیا ــ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مسافروں سے کہہ رہا تھا ــــ

" آپ سب لوگ اتر آیئے ــ لیکن زیادہ گھبرانے کی

ضرورت نہیں ہے ۔ اطمینان سے اُتریئے ۔ گاڑی چیک ہوگی ۔ خبر ملی ہے کہ گاڑی میں ٹائم بم رکھا گیا ہے ۔ اگلے اسٹیشن یا آخری اسٹیشن تک پہونچنے سے پہلے کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے ۔"

گارڈ کے ان جملوں سے گاڑی کے باقی مسافروں میں گھبراہٹ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی ۔ وہ اور بھی حواس باختہ ہوگئے اور جلد سے جلد اترنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگے ۔ اور پھر چند منٹ اور لگے اور پوری گاڑی خالی ہوگئی ۔

اور اب سب مسافر گاڑی سے دُور جاکر کھڑے ہوگئے ۔ پلیٹ فارم سے کافی دُور دوسری طرف اترنے والے مسافر لائنوں سے پرے جاکھڑے ہوئے ۔ دوسری طرف پلیٹ فارم نہیں تھا ۔ ان میں بعض گھوم کر ادھر پلیٹ فارم کی طرف آگئے ۔ کہیں کہیں کراہنے اور رونے کی آوازیں بھی آرہی تھیں ۔ یہ ان مسافروں کی آوازیں تھیں جو اترنے میں زخمی ہوگئے تھے ۔

خوش قسمتی سے مسافروں میں ایک ڈاکٹر بھی تھا اس نے خود ہی زخمی لوگوں کو دیکھنا شروع کردیا ۔ جس مسافر کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی ڈاکٹر نے اس کی ٹانگ کپڑے سے باندھ دی تھی اور اسے درد کی دوا بھی دے دی تھی ۔ بے ہوش بچے کو وہ ہوش میں لے آیا تھا، اور اب دوسروں کی مرہم پٹی کر رہا تھا ۔ مسافروں سے خالی لیکن ان کے سامانوں سے بھری گاڑی ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھی ۔ اپنے اپنے ڈبوں سے دُور، لیکن ان ہی ڈبوں کے سامنے مسافر کچھ اس طرح کھڑے تھے جیسے اپنے گھروں کے پھونکے جانے کا تماشہ دیکھنے جارہے ہوں ۔ بے چارگی ۔ ڈر ۔ تجسس اپنے چہروں پر لیے ہوئے ۔

لیکن ۔

ان سب باتوں سے بے پروا تھا ایک نوجوان مسافر جو گاڑی کے بیچ والے ایک ڈبے میں کھڑکی کے پاس ابھی تک بیٹھا تھا وہ باہر نہیں آیا تھا اور نہ ہی باہر نکلنے کی سوچ رہا تھا ۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا گاڑی میں سے نکلتے ہوئے مسافروں کو دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا ۔ اس نے اپنے ڈبے میں بیٹھی ایک بوڑھی عورت کی باہر نکلنے میں مدد بھی کی تھی اور پھر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا تھا ۔ اور اب اسی مسکراہٹ کے ساتھ دور کھڑے مسافروں کو دیکھ رہا تھا مسافر بھی اسے دیکھ رہے تھے ۔ حیرت سے، دلچسپی سے ۔ جیسے وہ کوئی انوکھی شے ہو ۔ اتنے بڑے خطرے کی پروا نہ کرنے والا انسان ایک انوکھی شے ہی ہوسکتا ہے ۔ خدا پر بھروسہ رکھنے والا ۔ موت سے نہ ڈرنے والا ۔ ایک زبردست قوتِ ارادی کا مالک ۔ ایک سنیاسی ! ۔

آس پاس کے ڈبوں کے مسافر بھی اس کے ڈبے کے سامنے اکٹھے ہورہے تھے اسے دیکھنے کے لیے ۔

" اسے زندگی پیاری نہیں ہے کیا ۔ ؟"

"کیوں نہیں ہے ۔ لیکن ڈرنے سے فائدہ بھی کیا ہے ؟ جب موت آئے گی نا ۔ تو کسی کے روکے نہیں رُکے گی ۔ تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی ۔ ہاں"

" اور بھئی، جہاں ہم لوگ کھڑے ہیں ۔ بم کا کوئی ٹکڑا یہاں بھی تو آسکتا ہے ۔ اور ہم میں سے کسی کی بھی جان لے سکتا ہے ایک کی نہیں کئی لوگوں کی جانیں لے سکتا ہے ۔ کون جانے کتنا طاقت ور ہے بم ۔ ؟"

" یہ تو آپ صحیح فرما رہے ہیں ۔ لیکن پھر بھی کیا یہ ضروری ہے کہ جان بوجھ کر خطرہ مول لیا جائے ۔ ؟"

" وہاں گاڑی میں بیٹھے رہنا تو جان بوجھ کر موت کے منھ میں جانا ہے ۔ کیا پتہ اسی ڈبے میں، اسی شخص کی سیٹ کے پاس ہی کہیں بم رکھا گیا ہو ۔ یہ تو سراسر خودکشی کے مترادف ہے ۔"

" لیکن جناب عالی ! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بم اس کے ڈبے سے دُور کسی دوسرے ڈبے میں رکھا ہو اور وہ ساتھ والے کئی ڈبوں کو تباہ کرتا ہوا سامنے کھڑے ہوئے مسافروں کو بھی زخمی کردے اور یہ شخص صاف بچ جائے !"

لوگوں کی باتیں اسے سُنائی تو نہیں دے رہی تھیں لیکن

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات
اور ان کی حرکتوں سے ان کے خیالات کے بارے میں صحیح
اندازہ لگا سکتا تھا۔۔۔ وہ یقیناً سمجھ رہا تھا کہ لوگ اس کے
بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ نہایت اطمینان
سے بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب طنز بھری
مسکراہٹ تھی۔

وقت گزرنے لگا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لوگ بار بار اپنی گھڑی
دیکھ رہے تھے۔۔۔

"نہ جانے کب پھٹے گا بم۔؟ اب پھٹ بھی جائے! کیا
مصیبت ہے۔"

"بھئی! زیادہ سے زیادہ دو تین ڈبوں ہی کو تو اپنی زد میں
لے گا۔۔ کوئی ایٹم بم تو ہوگا نہیں کہ سارا اسٹیشن یا یہ سارا چھوٹا
سا شہر اڑا کر رکھ دے۔۔۔ پھٹ جائے تو ہم بھی دیکھ لیں کہ
بم کیسے پھٹتا ہے؟"

"کیسا دھماکہ ہوگا؟ بڑا خوفناک دھماکہ ہوگا۔۔ کیوں؟۔۔ دھواں
بھی بہت ہوگا۔۔ شاید آگ بھی لگ جائے۔"

"تم نے کبھی بم پھٹتے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا نا۔۔۔ تو
اب دیکھ لینا۔"

"ایسا بہت کم ہوا ہوگا کہ لوگ کھڑے ہیں اور بم پھٹنے کا انتظار
کر رہے ہیں۔ یہ آتنک وادی بھی کیا غضب کی پلاننگ
کرتے ہیں۔۔۔ ٹرین میں ٹائم بم لگا دیا۔۔ اور ٹائم رکھ دیا گاڑی
کے چلنے کے بعد کا اور آخری اسٹیشن پر پہونچنے تک کا۔"

"ذرا دور کھڑے ہو جاؤ بھائی۔ کہیں بم کا کوئی ٹکڑا ادھر
ہی نہ آگرے۔۔۔!"

اور وقت گزرتا رہا۔۔۔ اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا
ان کے دلوں سے ڈر نکلتا جا رہا تھا۔۔۔ اور پھر سب نے دیکھا
کہ دو مسافر اپنے ڈبے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔۔۔ آہستہ آہستہ
کچھ ڈرتے ہوئے، کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے۔۔۔ جیسے ہی
وہ اپنے ڈبے کے پاس پہونچے، جلدی سے اندر گئے اور
جتنا بھی اپنا سامان اٹھا سکے، اٹھا کر باہر لے آئے۔۔۔ اور باہر آنے
کے بعد قریب قریب دوڑتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر پہونچ گئے۔۔۔
ان کو دیکھ کر چار پانچ اور مسافر اپنے اپنے ڈبوں میں گئے اور اپنا
سامان اٹھا کر باہر لے آئے۔۔۔ اور پھر تو ایک سلسلہ سا بن گیا۔۔۔
لوگ آہستہ آہستہ اپنے ڈبوں میں جاتے اور اپنا اپنا سامان نکال کر باہر
لے آتے۔۔۔

اپنے ڈبے میں بیٹھا وہ نوجوان مسافر بڑے اشتیاق سے لوگوں کو
اپنے ڈبوں کے اندر داخل ہوتے اور پھر سامان اٹھا کر باہر نکلتے
دیکھ رہا تھا۔۔۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ بکھر رہی
تھی وہ ان سب سے کچھ یوں کہتی معلوم ہوتی تھی:

"اب آپ کیوں موت کے منہ میں آنے کی کوشش کر رہے
ہیں جناب؟ بم تو اب بھی وہیں کا وہیں پڑا ہے۔ آپ کے ڈبے میں
داخل ہوتے ہی پھٹ سکتا ہے۔ کون جانے آپ میں سے کس کے
ڈبے میں اور کس کی سیٹ کے نیچے پڑا ہے؟ جیسے ہی آپ اپنے ڈبے
میں داخل ہوں، اپنی سیٹ کے پاس پہونچیں بم پھٹ جائے! اور اپنے
اس تھوڑے سے سامان کی خاطر آپ جان سے ہی چلے جائیں۔۔۔
کیا آپ کی زندگی کی قیمت یہی تھوڑا سا سامان ہے؟ بس۔۔؟
لیکن نہیں جناب! اب آپ کا ڈر کم ہو گیا ہے۔۔۔ وقت نے ڈر
کا احساس کم کر دیا ہے۔۔۔ یا ڈر کے اوپر حاوی ہونے والی آپ کی
قوت بڑھ گئی ہے۔۔۔ یا پھر آپ کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے؟
ورنہ ہے تو سب ویسے کا ویسا ہی۔۔۔ یہی ہے "آتنک واد" کی اور
"آتنک واد" میں زندگی گزارنے کی فلاسفی۔۔۔ جب دہشت پھیلے تو
دہشت کے سوا کچھ نظر نہ آئے اور آدمی سب کچھ چھوڑ جانے پر مجبور ہو
جائے اور پھر دہشت میں بھی زندگی ایسے گزر سکے کہ جیسے اب یہی نارمل
اور روزمرہ کی زندگی ہے۔"

تقریباً تمام مسافروں نے سامان اتار لیا تھا۔۔۔ ایک چکر۔۔
دو چکر۔۔ یا کئی چکر لگا کر۔۔۔ اگر کوئی مسافر ڈر رہے تھے گاڑی
کے نزدیک جانے میں یا اپنے ڈبے کے اندر جانے میں تو ان کی
عورتیں انھیں اکسا رہی تھیں۔۔۔

"سب لوگ اپنا سامان نکال لائے ہیں — آپ بھی نکال لائیے نا۔!"

"اجی، میرا سنگل سوٹ پڑا ہے میرے اٹیچی کیس میں — میں نے ڈر کے مارے اسے اتار کر اٹیچی کیس میں رکھ لیا تھا کہ سفر میں کسی چور کی نظر نہ پڑ جائے — جائیے نا پلیز! — اتار لائیے وہ اٹیچی کیس۔"

"اور اگر میں وہاں پہونچا — اور بم پھٹ گیا تو —؟"

"نہیں پھٹتا بم — جائیے نا۔"

اور پھر تمام گاڑی سامان سے خالی ہو گئی — کھلے دروازے — کھلی کھڑکیاں — خالی — ویران سی — ایک ایسے مکان کی طرح کہ جیسے لوٹ کر جانے والے ایک تنکا بھی نہ چھوڑ گئے ہوں۔

اب تمام مسافر گاڑی سے دور اپنے اپنے ڈبوں کے سامنے اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب ان کے دلوں سے ڈر بالکل ہی جاتا رہا تھا — لوگوں نے دریاں اور چادریں زمین پر بچھائی تھیں اور اب وہ ان پر بیٹھے پک نک منانے کے موڈ میں آ گئے تھے۔ اپنے سامان کے پاس بیٹھے کچھ تاش کھیل رہے تھے تو کوئی اخبار، رسالے یا کتابیں پڑھ رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹرانزسٹر بج گانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو لیٹے ہوئے شروع دسمبر کی دھوپ سینک رہے تھے — اس چھوٹے سے اسٹیشن پر جتنے بھی خوانچے والے تھے سب کا سامان بک گیا تھا — مسافر یوں پیٹ بھر کر کھا رہے تھے جیسے اب تین چار گھنٹے تو گاڑی چلنے سے رہی۔

آخری اسٹیشن پر گاڑی کے پہونچنے کا وقت ساڑھے دس بجے تھا اور اب ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

اچانک گاڑی کے چلنے کا سگنل دے دیا گیا — اور اعلان کر دیا گیا کہ بم کی خبر غلط تھی — اگر ٹائم بم رکھا ہوتا تو گاڑی کے آخری اسٹیشن پر پہونچنے کے وقت تک یعنی ساڑھے دس بجے تک ضرور پھٹ جاتا — اور اب تو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔

لوگ اب اپنے اپنے ڈبوں میں واپس آ رہے تھے — وہ نوجوان مسافر جو باہر نہیں نکلا تھا۔ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ دوسرے ڈبوں میں بیٹھے مسافروں کا تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن اس ڈبے میں بیٹھنے والے مسافر اسے دیکھ کر واقعی شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ اور اس سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ اس نوجوان مسافر کا ایک ساتھی بھی تھا جو اسے چھوڑ کر نیچے اتر گیا تھا۔ اور اب واپس اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ گاڑی چلی تو پاس بیٹھے ایک مسافر سے نہ رہا گیا۔

"آپ کا یہ ساتھی بہت بہادر ہے جناب — اسے بالکل ڈر نہیں لگا۔"

"جی ہاں — یہ بہت بہادر ہے۔ ڈر کیا چیز ہے — یہ جانتا ہی نہیں ہے۔" اور وہ زور سے ہنس دیا۔

اور پھر اس نے اپنے سر کی طرف ہاتھ لے جا کر، اپنی کنپٹی کے پاس اپنی انگلی گھما دی —

"کیا —؟!"

"جی ہاں۔"

"اوہو!"

اور وہ نوجوان مسافر اب بھی مسکرا رہا تھا — اور اب دیکھنے والوں کو اس کی مسکراہٹ بے معنی سی لگ رہی تھی — بے مطلب کی —

□□

ہمارے نام ...... ص۴۸ کا بقیہ

نہ فکر کی گیرائی ہے نہ فن کی گہرائی۔

عرصہ بعد معمول سے ہٹ کر، احمد ابراہیم علوی کے تبصرہ میں، عطیہ پروین کے ناول میں موجود، چند بڑی خامیوں کی جانب واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ راجندر بہادر موج نے بھی "نقش دوام" کے چند اشعار کے لیے بڑی ہمت سے "بعید العقل منگی" کی اصطلاح استعمال کر ڈالی ہے۔ بحیثیت مجموعی آپ کی یہ محنت دل کے نرم گوشوں کو چھو گئی ہے جس کے لئے آپ بہرحال داد کے مستحق ہیں۔

—— ایم۔ جمال علوی

لکھنؤ

اُترپردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

ماہر تعلیم شری شیروانی کے انتقال پر گورنر کا اظہار تعزیت

اترپردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرائن ریڈی نے معروف ماہر تعلیم شری حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے انتقال پر دلی رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔

گورنر نے اپنے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ مرحوم شیروانی ایک ہر دلعزیز سیاست داں، باصلاحیت منتظم اور ماہر تعلیم تھے جو متعدد تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے، خاص طور سے مسلم یونیورسٹی کے انتظامی اور تعلیمی بندوبست کو مستحکم بنانے میں ہمیشہ بے غرض انداز میں سرگرم عمل رہے۔ تعلیمی میدان میں ان کی بے مثال خدمات ناقابلِ فراموش رہیں گی۔

شری ریڈی نے مرحوم کی روح کے سکون کے لیے دعا کرتے ہوئے سوگوار خاندان کے تئیں دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

ریاست میں بجلی سپلائی کو یقینی بنایا جائے گا

اترپردیش کے وزیر توانائی شری لال جی ٹنڈن نے ودھان پریشد میں وقفہ سوالات کے دوران اپنے تحریری جواب میں بتایا کہ ۹۰-۱۹۸۹ء، ۹۱-۱۹۹۰ء اور ۹۲-۱۹۹۱ء میں ریاستی بجلی بورڈ میں پیداوار بالترتیب ۔ ۱۸۵۶ ملین یونٹ، ۱۹۴۷۸ ملین یونٹ اور ۱۸۲۰۳ ملین یونٹ رہی ہے گزشتہ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۲۰۹۱ ملین یونٹ بجلی درآمد کی گئی ہے۔

شری ٹنڈن نے بتایا کہ ریاست میں بجلی کی مانگ پوری کرنے کے لئے کئی قدم اٹھائے گئے ہیں جن میں مشینوں کا بہتر رکھ رکھاؤ اور کوئلے کی متواتر سپلائی وغیرہ شامل ہیں۔

نوجوان صنعت کاروں کو حکومت کی جانب سے ہر ممکن امداد

اترپردیش کے وزیر سماجی بہبود شری راجپتی شاستری نے کہا کہ ریاستی سرکار صنعت کاروں کو صنعتوں کے قیام کے لیے ہر ممکن سہولتیں اور گرانٹ مہیا کرے گی۔

وزیر موصوف نے یہاں اندرا نگر میں اکائی پالی کرافٹ ایسوسی ایشن کے آڈیٹوریم میں صنعتی ترقیاتی تربیتی پروگرام کے اختتامی جلسہ کے موقع پر زیر تربیت افراد کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صنعت کاری کے بغیر نہ تو ریاست کا فروغ ممکن ہے اور نہ ہی بے روزگاری دور ہو سکتی ہے۔

شری شاستری نے تربیت حاصل کرنے والے افراد سے اپیل کی کہ تربیت سے ہونے والے فوائد دیگر افراد کو بھی پہنچائیں اور ملک کی اقتصادی ترقی میں اپنا تعاون دیں۔

ریاست میں شکر پیداوار کا نیا ریکارڈ

اترپردیش کی شکر ملوں میں گزشتہ ۳۰ اپریل ۱۹۹۲ء تک

کل ۳۲ء۳۱۸ لاکھ میٹرک ٹن گنّے کی پیرائی کرکے ۳ء۲۸ لاکھ میٹرک ٹن شکر تیار کی گئی، جوکہ ایک ریکارڈ ہے۔ اس سے قبل سال ۹۰-۸۹ میں ۳۰ء۰۸ لاکھ میٹرک ٹن شکر تیار ہوئی تھی۔

یہ اطلاع دیتے ہوئے وزیر گنا ترقی شری ہنومنت سنگھ نے بتایا کہ ریاست کی کل ۱۰۷ شکر ملوں میں سے ۹۱ ملوں میں گنے کی پیرائی کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ سال ۹۳-۹۲ء میں ریاست میں ۵ لاکھ میٹرک ٹن زائد شکر تیار کی جا سکے گی۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ سال پورے سیزن میں کل ۵۷ء۳۲۷ لاکھ ٹن گنے کی پیرائی کی گئی ہے اور ۲۹ء۱۷ لاکھ ٹن شکر تیار ہوئی۔ جبکہ سال ۹۲-۹۱ء میں ۳۱ لاکھ ٹن گنے کی پیرائی کر کے ۶۶ء۳ لاکھ ٹن شکر تیار کی گئی۔

ریاست وبائی امراض سے پاک رہی

اترپردیش کے محکمۂ صحت کے صدر دفتر سے موصولہ اطلاع کے مطابق گزشتہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۲ء کو ختم ہونے والے ہفتے میں ریاست چیچک، ہیضہ اور پلیگ جیسے وبائی امراض سے پاک رہی۔

موصولہ اطلاع کے مطابق اس مدت میں پیلیا، مینگو کوکل مینجائٹس، انسفلائٹس اور کالا آزار سے کسی کے بیمار پڑنے کی کوئی خبر نہیں ہے۔

اس ہفتے ریاست میں گیسٹرو انٹائٹس سے دس افراد بیمار ہوئے۔ اس دوران ریاست میں ہیضہ کی روک تھام کے لیے ۴۹ ٹیکے لگائے گئے اور ۳۲۹۶ کنوؤں میں جراثیم کش دوائیں ڈالی گئیں۔

شجرکاری کے لئے ۲۰۹۷ ایکڑ آراضی الاٹ

شجرکاری کے واسطے آراضی الاٹ کرنے کی اسکیم کے تحت حکومت اترپردیش نے گزشتہ مالیاتی سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲۰۹۷ ایکڑ آراضی کمزور طبقے کے ۲۳ ہزار ۱۳۶ بے زمین افراد کو الاٹ کی ہے اس میں سے ۹ ہزار ۶۸۶ افراد اقوام درج فہرست اور ۶۸۹ء۱ افراد درج فہرست قبائل کے ہیں۔

ریاست کے وزیر مال شری برہم دت دویدی نے اس سلسلے میں بتایا کہ درج فہرست اقوام و قبائل اور کمزور طبقوں کے افراد کے لکڑی کے چارے کے متعلق مسائل سے نپٹنے اور ماحولیاتی آلودگی کم کرنے کے مقصد سے شجرکاری کی اس اسکیم کے تحت گزشتہ سال قابل ذکر کامیابی حاصل کی گئی ہے۔

شہید اسمارک کے لئے ۵۰ ہزار روپئے

حکومت اترپردیش نے فوجیوں کی یاد میں لکھنؤ کے کینٹ علاقے میں ایک شاندار شہید اسمارک کی تعمیر کے لیے ۵۰ ہزار روپئے منظور کیے ہیں۔

یہ اطلاع ریاست کے وزیر سماجی بہبود شری رامپتی شاستری نے دی۔ انھوں نے بتایا کہ سابق فوجیوں کے لیے اترپردیش سابق فوجی بہبود کارپوریشن کے توسط سے ٹیکنیکل خدمات سے متعلق اسکیموں کی عمل آوری کے لیے ریاستی حکومت نے ایک لاکھ روپئے منظور کیے ہیں

جی۔بی۔پنت پالی ٹکنک محکمہ ٹیکنیکی تعلیم کے سپرد کرنے کا سوال زیرغور

اترپردیش کے وزیر سماجی بہبود شری رامپتی شاستری نے دوران سبھا میں شری رام اوتار شاکیہ کے سوال کے تحریری جواب میں بتایا کہ اقوام درج فہرست اور سماج کے کمزور طبقوں کے طلبا کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹیکنیکی پیشوں میں تربیت دے کر ان کے سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے مقصد کے تحت لکھنؤ کے راجکیہ گووند ولبھ پنت پالی ٹکنک کو محکمہ ٹیکنیکی تعلیم کے سپرد کئے جانے کا سوال زیر غور ہے۔

وزیر سماجی بہبود نے بتایا کہ اقوام درج فہرست کے طلباء کے لیے مناسب تربیتی بندوبست اور ان کے علم اور مہارت میں اضافہ کرنے کے مقصد سے اس ادارے کو محکمہ ٹیکنیکی تعلیم کے سپرد کرنا ہی مناسب ہوگا۔ کیونکہ محکمہ ٹیکنیکی تعلیم میں اس قسم کے ادارے کو بہتر طور پر چلانے

اور اس کی مناسب نگہداشت کے بندوبست کے لیے کافی اسٹاف اور ماہرین موجود ہیں۔ اس سے ادارہ کے انتظام کے زیادہ بہتر ہونے کا امکان ہے۔

۵۰ ہزار مواضعات کو خاص سڑکوں سے مربوط کیا گیا

اترپردیش کے ۴۳،۰۵۰ مواضعات کو خاص سڑکوں سے مربوط کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع محکمہ تعمیرات عامہ کی جانب سے ایک رپورٹ میں دی گئی ہے۔

سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں محکمہ تعمیرات عامہ کی جانب سے ۶۰۵ مواضعات کو رابطہ سڑکوں اور خاص سڑکوں سے مربوط کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جس کے مقابلے میں گزشتہ جنوری تک ۴۳۰ مواضعات کو خاص سڑکوں سے مربوط کیا گیا۔

گاؤں کی اقتصادی حالت میں سدھار لانے اور کسانوں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے میں نقل و حمل کی خاص اہمیت ہے اس لیے سڑکوں اور قصبوں کے دور افتادہ مواضعات کو رابطہ سڑکوں سے مربوط کرنے کا کام اولیت کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے۔

وزیر سماجی بہبود کے ہاتھوں رانا پرتاپ کے مجسمہ کی نقاب کشائی

اترپردیش کے وزیر سماجی بہبود شری رامایتی شاستری نے کہا ہے کہ ریاستی حکومت نے تھارو قبیلے کی فلاح اور ان کی اقتصادی ترقی کے لیے مالیاتی سال رواں میں ۷۷،۷۶ لاکھ روپے کا بندوبست کیا ہے۔

وزیر سماجی بہبود چندن چوکی (لکھیم پور کھیری) کے آشرم طرز اسکول میں مہارانا پرتاپ کے مجسمے کی نقاب کشائی کرنے کے بعد تھارو قبیلے کے لوگوں کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مہارانا پرتاپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہی ان کے تئیں سچا خراج عقیدت ہوگا۔

شری شاستری نے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ سماجی تفریق و امتیاز سے بالاتر ہو کر ریاست کی ترقی میں اپنا تعاون دیں۔

وزیر سماجی بہبود نے پلیا کلاں میں درج فہرست اقوام کے افراد کو دودرجن سے زیادہ رہائشی پٹے بھی تقسیم کیے۔

اس موقع پر ضلع مجسٹریٹ کے علاوہ ممتاز شہری اور عوامی نمائندے بھی موجود تھے۔

اترانچل میں آراضی جنگلات اور جنگلاتی ریسرچ اسکیموں کے لئے ۵۹ر۱۳ کروڑ روپیے

حکومت اترپردیش نے اترانچل میں جنگلات کی آراضی کے تحفظ اور جنگلاتی ریسرچ اسکیموں کے لئے مالی سال ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۵۹ر۱۳ کروڑ روپیے کی اسکیم منظور کی ہے اور پہلے دوماہ کے اخراجات کے لئے ۲۶ر۲ کروڑ روپیے کی رقم فراہم کردی گئی ہے۔

وزیر ریاست برائے اترانچل وکاس شری پورن چندر شرما نے بتایا کہ یہ رقم سندھو گنگا گھاٹی میں سیلاب سے متاثرہ علاقوں کے لیے واٹر شیڈ مینجمنٹ اسکیم، رام گنگا علاقے کے ندی گھاٹ پراجکٹ انٹگریٹیڈ ویسٹ لینڈ ڈیولپمنٹ پراجکٹ، اقوام درج فہرست کے واسطے خصوصی کمپونینٹ پلانٹ وغیرہ اسکیموں کے نفاذ پر صرف کی جائے گی۔

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کا ریڈیو پروگرام
"نیا یُگ نئی کرانتی"

جمعرات: ۶-۴۵ شام - دلّی دوردرشن بھارتی
جمعہ: ۹-۳۰ رات لکھنؤ دوردرشن بھارتی
ایضاً الٰہ آباد دوردرشن بھارتی
جمعہ: ۹-۴۵ رات کانپور دوردرشن بھارتی



نام کتاب: **یادبسیرے** (افسانے)
مصنف: انور خاں قیمت: چالیس رُوپے
ملنے کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

افسانہ بنیادی طور سے واقعہ کا فن کارانہ بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ واقعہ انسانی سماج ہی میں نمودار ہوتا ہے، اس لئے افسانہ زندگی کے گوناگوں تجربات کا آئینہ بن جاتا ہے اور قاری کے ذہن اور سوچ کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ طاقت ور میڈیا کے موجودہ دور میں ذہن انسانی کو متاثر کرنے کی جتنی صلاحیت فکشن میں ہے اتنی کسی اور صنف سخن میں نہیں ہے۔ انسانی ذہن شاعری سے بھی متاثر ہوتا ہے مگر اس تاثر میں غالب عنصر احتراز کا ہے۔ انسان کی پوری فکر، اس کی سیرت اور شخصیت پر اثر ڈالنے اور اس کو کوئی جہت دینے میں شاعری کا رول کچھ زیادہ سودمند نہیں ہے جبکہ فکشن اس پر قادر ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

افسانے کے بارے میں اس جملۂ معترضہ کے بعد معروف افسانہ نگار انور خاں کی نئی کتاب "یادبسیرے" کے بارے میں اگر گفتگو کی جائے تو اس کا ماحصل یہی ہوگا کہ انور خاں افسانے کا موضوع اپنی گرد و پیش کی زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور اسے فن کارانہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کا افسانہ انسانی زندگی کی پیچ در پیچ آگہی کا منظرنامہ بن جاتا ہے۔ 'یادبسیرے' ہو یا 'پوز' 'کمپیوٹر' ہو یا 'چند لمحے نشاط کے' 'حسرت حاصل' ہو یا 'دلبر او دلبر' انور خاں کا تیز مشاہدہ زندگی کے ایسے لمحوں کو گرفت میں لے لیتا ہے جنھیں معروضی طور سے کوئی نام دینا مشکل ہے، مگر جو زندگی کی ماہیت کو نئی معنویت سے روشناس کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انور خاں افسانے کی تکنیک سے بخوبی واقف ہیں اس لیے وہ زبان اور انداز بیان کے سارے وسائل کو افسانے کی تخلیق میں کامیابی سے استعمال کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چار پانچ برسوں میں انور خاں کا نام جدید افسانہ نگاروں کی فہرست میں خاص امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ سلام بن رزاق اور علی امام نقوی کی طرح انور خاں بھی بمبئی کی مہانگری کے باسی ہیں۔ بینک میں ملازم ہیں اور اس عروس البلاد کی زندگی کی تمام پیچیدگیوں کا نہ صرف گہرا شعور رکھتے ہیں بلکہ افسانوں میں ان کو کامیابی سے برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ یہ تینوں افسانہ نگار پرکشش بیانیہ کے توسط سے اُردو افسانوں کو ایک نئی جہت دینے میں کوشاں ہیں۔

یادبسیرے" میں شامل افسانہ "چند لمحے نشاط کے" سیکس کے ایک نئے پہلو اور ازدواجی تعلقات کی ایک نئی جہت کا آئینہ دار ہے بات بہت گہری یا ابنارمل نہیں ہے مگر انور خاں کے بیانیہ کے رچاؤ نے اسے ایک نازک مگر دل چسپ افسانہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح "دلبر او دلبر" میں ہیرو کا جو عجیب و غریب کردار انھوں نے پیش کیا ہے وہ اگرچہ محض تخیل بیان سے مرکب ہے مگر اتنا دل چسپ ہے کہ آپ اسے جلد فراموش نہیں کر سکتے۔ انور خاں کوئی انوکھے کردار نہیں پیش کرتے مگر ان کے کرداروں کے عمل اور ردعمل میں کوئی ایسا انوکھا پن ضرور ہوتا ہے جو ان کو عمومیت سے بچا لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیانیہ اور صرف بیانیہ ہی انور خاں کی طاقت ہے اور اسی سے ان کی پہچان بنتی ہے مگر جب وہ افسانے میں علامتیت کا پیوند لگاتے ہیں تو یہ افسانے گھٹ کر انشائیہ یا مضمون بن جاتے ہیں ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

بلاوا، گلدان کا پھول، تارا اور کرنیں، جو "یادبسیرے" کے آخر میں ٹانک دیئے گئے ہیں، اس محفل میں ناخواندہ مہمانوں کی طرح بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔

افسانوں کی نگری میں انور خاں کی پہچان روز بروز معتبر ہوتی جارہی ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ ان کا یہ نیا افسانوی مجموعہ قارئین کرام

اور ناقدین عظام دونوں کو متوجہ کرے گا۔

کتابت نفیس، چھپائی خوبصورت، سرورق خوش گوار اور پیش کش باوقار ہے۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: "خموشی بول اٹھی ہے" (شعری مجموعہ)

شاعر: عبدالاحد ساز　قیمت: چالیس روپے

ملنے کے پتے: (۱) قلم پبلی کیشنز۔ باپو کھوٹے اسٹریٹ۔ بمبئی

(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی

"خموشی بول اٹھی ہے" عبدالاحد ساز کا ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس میں الفاظ کا جو جہان بسیط آباد ہے وہ بے آب و رنگ مناظر کا امانت دار نہیں بلکہ الفاظ کی بے کراں زمینوں کی تہوں میں شعلوں کی کاشت کی گئی ہے اور وہ فصل اب سبز قباؤں میں ملبوس ہو کر بساطِ ذہن کو شادابی سے ہم کنار کر رہی ہے۔

اس شعری مجموعے میں پچاس غزلیں، اڑتالیس نظمیں اور انیس رباعیات ہیں۔ نظموں میں سے بارہ تاثراتی ہیں اور چھ ابتدائی عہد کی نظمیں ہیں۔ یہ وہ تخلیقی سرمایہ ہے، جو "خموشی بول اٹھی ہے" کے تقریباً ۱۹۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

خطِ ترسیل کے عنوان سے شاعر نے خود ہی پیش لفظ تحریر کیا ہے جس میں اپنے شعری عقیدے کی تفصیلات بیان کی ہیں، پیش لفظ کے مطالعہ سے عبدالاحد ساز کے ذہن کی بہت سی تہیں سامنے آجاتی ہیں، اس بات کا سراغ مل جاتا ہے کہ فن کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے، آیا اس بحر کے شناور ہیں یا پھر ساحل سے ہی اس بساطِ بے کراں کا نظارہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کے کلام کو پڑھنا ضروری ہے تاکہ خطِ ترسیل میں جو نظریہ پیش کیا گیا ہے اس کی تصدیق ہو سکے چنانچہ "خموشی بول اٹھی ہے" کو مدنظر رکھتے ہوئے جب اس بے کنار سمندر میں پہلا قدم پڑتا ہے تو اس گوہر آبدار کی چھوٹ نگاہوں میں بجلیاں بھر دیتی ہے جو اپنے قبیلے میں منفرد ہے ؎

دیوار نہیں پردۂ فن بند قبا ہے
اک جنبشِ انگشت کہ مہتاب کھلیں گے

لیکن دبیز پردے کو ہٹانے کے لئے یا بند قبا میں پڑی ہوئی ریشمی گرہ کو کھولنے کے لئے اگر انگلیوں کی ماہرانہ جنبش درکار ہے تو اس بحرِ بے کنار میں سفر کرنے کے لئے ایسے اعصاب کی ضرورت ہے جو بے کرانی کے منظر سے شکستہ نہ ہوں اور تلاش کے عمل سے پوری طرح آشنا ہوں، ان تمام خوبیوں کے ساتھ اگر اس بحر میں اترا جائے تو واقعی احساس ہوتا ہے کہ جب سکوت آب صورت و صدا کے پیکر تراشتا ہے تو اس سے کیا کیا الفاظ بساطِ سماعت پر تراوش کرتے ہیں ؎

خطوط و رنگ کے روزن سے جھانکنے والے
درِ آگہی کہ یہ تصویر لازوال سے بنے

سکوتِ بحر میں کس غم کا راز پنہاں تھا
بس ایک موج اٹھی اور آنکھ بھر آئی

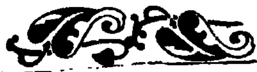
یہ عکس عکس تصادم یہ انجذاب کی دھن
میں آئینے کی طرف مستقل کھنچاؤ میں ہوں

پہلی کرن کی دھار سے کٹ جائیں گے یہ پر
اظہار کی اڑان فقط رات بھر کی ہے

تخلیقیت کی آتش تر صرف عبدالاحد ساز کی غزلوں میں ہی نہیں بلکہ ان کی نظمیں بھی ایک ایسی ارضِ لامحدود کی طرح ہیں جس کی ہر تہہ میں شعلوں کی فصل لہلہا رہی ہے۔ نظموں میں متضاد زاویے، دل دہی، حریفِ موجِ ہوا، کہاں جانا ہے اور آرزو اہم حیثیت رکھتی ہیں۔

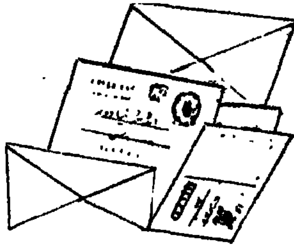
خموشی بول اٹھی ہے، ایک اہم اور خوبصورت کتاب ہے۔ کتابت و طباعت دامنِ دل کو گرفت میں لیتے ہیں۔ سرورق کا لاجوردی رنگ طمانیتِ قلب و نظر کا سامان فراہم کرتا ہے۔

——— عشرت ظفر





همارے نام.....



آپ کے ماہنامہ نیا دور کا مطالعہ عرصہ سے کر رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ رسالہ اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر پسند کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

فروری ۱۹۹۲ء سے آپ نے ادیبوں کی مختصر آپ بیتی کا سلسلہ شروع کیا ہے جو نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ آپ بیتی کے ساتھ ادیب کی تازہ تصویر بھی ہو تو بہت خوب۔

——— عبد القوی دسنوی

بھوپال

نیا دور آپ کی وجہ سے اسم بامسمیٰ بن گیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تیزی سے اس مجلہ کا معیار ترقی کرتا جا رہا ہے۔

فروری ۱۹۹۲ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا مقالہ میرے خیال میں ان کا شاہکار علمی ادبی کارنامہ ہے۔ اس مقالہ کو کالجوں کے نصاب میں شامل کرنا چاہیے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔

——— (پروفیسر) محبوب پاشا

مدراس

اپریل ۱۹۹۲ء کا شمارہ صوری اور معنوی اعتبار سے یقیناً لائق صد تحسین ہے۔ ابوالفضل نے سرورق پر اپنی مشاقی کا مظاہرہ کیا ہے۔ محمد حسن کی آپ بیتی میں کوئی خاص رمز یا تکنک نہیں ہے۔ اس لئے مختلف الاقسام آپ بیتیوں کے درمیان نہ اس کی کوئی نئی حیثیت ہے اور نہ اہمیت۔ انھیں سوانحی ادب کے برخلاف جذبات پر گزری حکایات کو آپ بیتی سے خارج بلکہ دور رکھنا چاہیے تھا۔

عنوان چشتی کے یہاں ماسوا طویل ابتدائیہ کے، بہ اعتبار موضوع "عبدالحق کے تنقیدی افکار کی معنویت" پر بات بے حد مختصر کر دی گئی ہے۔ البتہ مولوی صاحب کے اختیار کردہ تنقیدی زاویوں پر یہ مضمون سیر حاصل روشنی ڈالتا ہے۔

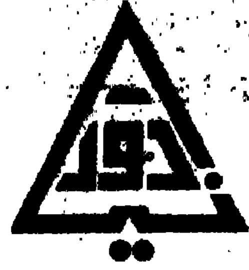
ہائیکو اور اردو شاعری" ایک بے حد تشنہ مضمون ہے کیونکہ اردو شاعری میں ہائیکو لکھنے والوں کی تعداد آج بہت زیادہ ہے جبکہ ڈاکٹر رحمت نے صرف دو تین شعراء پر تنقید کر کے اور خود سے موازنہ کرتے ہوئے انھیں کم تر بتا کر بات ختم کر دی ہے۔

"ساخت شکن تنقید" میں فاضل مضمون نگار نے ان دقیق اور تکنیکی اصطلاحوں کا سہارا لیا ہے جو عام اشخاص کے سروں سے گزر جانے والی ہیں۔ لیکن خواص کے لئے یہ تحریر یقیناً خاصے کی چیز ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی بیان کردہ De-construction کے لئے "لاتشکیل" اور "اوف گرامیٹولوجی" کے لئے "لاتقریری تحریرات" کی اصطلاحیں حقیقتاً درست نہیں۔ لیکن خود نظام صاحب نے بھی کچھ اسی طرح کے تراجم کئے ہیں مثلاً "کیفیات" کے لئے "رس کا تصور" (جبکہ کیفیات کا لفظ بہتر اور وسیع تر مفہوم کا حامل ہے) "ایک نظر میں پورا منظر" کے بجائے "ایک فلیش میں پورا پیٹرن"، Arch-Writings کے لئے "اکبری تحریر"، "لذت خلاپری" کی اصطلاح بمعنی بتدریج لذت، انگریزی کے لاروا کا نعم البدل اردو میں پیوپا، Parole کے لئے اصری گفتار Force of Expression یعنی "ارادۂ نمائش" Dictation کے لیے تلقین اور Philosophia کے لیے قیدنظر وغیرہ کا استعمال بہرحال قابل اعتراض ہے۔ بحیثیت کلی، ماسوا بشیر بدر کی منظوم تخلیق پر پیش کردہ تفسیر کے، یہ ایک طویل اور اعلا علمی کاوش ہے۔

افسانہ "روشنی کا مینار" تاریکیوں کا گنبد ثابت ہوا۔ اس میں

(باقی ص ۴۲ پر)

عنوانات



جلد ۴۷ | نمبر ۴

جولائی سنہ ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون : ـــــــ ۲۴۵۶۶۰

معاونین :
○ ـ نجیب انصاری
○ ـ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون ـــــــ ۲۴۷۱۰۸

پبلشر
آسل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

فی شمارہ : ـــــ تین روپیے
زرسالانہ : ـــــ تیس روپیے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن بِبھاگ "انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۹ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش اُن سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

موجودہ حکومت نے جب کام سنبھالا تو اترپردیش کے چاروں طرف عدم تحفظ اور عدم اعتماد کا ماحول تھا۔ فرقہ پرستی اپنی انتہا پر تھی۔ ریاست کے عوام دُکھی تھے۔ حکومت پر نظم و نسق کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تھی۔ ایسی حالت میں سماج دشمن طاقتوں کی بن آئی تھی۔ اس لیے امن اور قانون کے محاذ پر مکمل فتح حاصل کرنے اور سماجی برائیوں نیز عدم تحفظ کا ماحول ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے فسادات سے پاک ریاست اور خوف سے پاک سماج کی تعمیر کا عہد کیا گیا۔

گذشتہ ایک سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ بغیر کسی ذات، مذہب کی تفریق کے، ریاست کے کروڑوں لوگوں کو خوف سے نجات دلانے کے لئے حکومت نے بہت کامیابی کے ساتھ کام کیا۔ اس ریاست کو پُرامن اور بے خوف بنانے کا اہم کام اس سرکار نے تھوڑے ہی دنوں میں کردکھایا۔ لیکن پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت اور انتظامیہ نے صحیح راستہ اختیار کیا، اور ریاست میں اقتصادی ترقی نیز تحفظ کے نقوش سماج میں نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں۔

موجودہ حکومت نے اپنا نظریہ یہ رکھا کہ مسلسل جدوجہد سے کام کیا جائے تبھی ریاست کی فلاح و بہبود ممکن ہوسکے گی۔

اسی جولائی کے مہینے میں ماہ محرّم کا آغاز بھی ہورہا ہے۔ یہ مہینہ بنی نوع انسان کو جگر گوشۂ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السّلام کی عظیم ترین قربانی کی یاد دلاتا ہے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے سچ کہا ہے ؎

موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہہ جائیگا
ہاں مگر نام حسینؓ ابن علیؓ رہ جائے گا

ادارہ نیا دور امام عالی مقام کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

پروفیسر بدرالحسن عابدی
سے ۲۶/۳ پھاٹک تقی علی خاں، مقیم گنج
وارانسی ۲۲۱۰۰۱

سوانحی کوائف

نام: سیّد بدرالحسن عابدی ابن سید علی محمد صاحب
وطن: شہر فیض آباد (اودھ)
خاندان: پیش نماز، امام باڑہ
تعلیم: بی۔ اے، بی۔ اے آنرز، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (عربی)
منشی، کامل، ادیب کامل وغیرہ

جیسا کہ میرے نام سے ظاہر ہے، جناب حسین اصغر فرزند امام زین العابدین علیہ السلام کی اولاد میں ہوں۔ جدّ اعلیٰ سید مسعود غازی ہیں جنھوں نے محمد تغلق کے زمانے میں غازی پور کے راجہ مندھاتا کو شکست دے کر ضلع غازی پور کے مختلف گانوں میں اپنی ذرّیت کو آباد کیا۔

میرے پرنانا مولانا سید محمد باقر صاحب زنگی پور ضلع غازی پور اور پردادا مولانا سید منظر علی صاحب گنگولی، ضلع غازی پور کے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی شادی مولانا سید محمد صاحب، امام جمعہ و جماعت شہر فیض آباد کی دو صاحبزادیوں سے ہوئی تھی۔ مولانا سید محمد صاحب درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور وہ مولانا سید عبدالعلی صاحب کے فرزند تھے۔ موخرالذکر دیوکٹھیا ضلع غازی پور سے فیض آباد عہد نوابی میں طلب کیے گئے اور وہاں کے امام جمعہ و جماعت مقرر کیے گئے۔

خاندان غفرانمآب اور خاندان پیش نماز فیض آباد دونوں ایک ہی زمانہ اور ایک ہی وقت سے چلے آرہے ہیں۔ میرے جد اعلا سید عبدالعلی صاحب کے بڑے فرزند سید علی اکبر صاحب نے مولانا دلدار علی غفرانمآب سے اکتساب فیض کیا اور نوجوانی میں وفات پا گئے۔ اس طرح میرا پورا خاندان علوم دینیہ کا حامل رہا ہے۔

میری ماں اچھی خاصی پڑھی لکھی تھیں۔ حدیث و تاریخ اسلامی سے بڑی واقفیت رکھتی تھیں۔ ان کی تربیت میں سخت گیری تھی، جس نے مجھ کو مؤدب و مہذب بنانے میں کوئی کمی نہیں کی اور میری سیرت کو سنوارا۔

میرے والد اگرچہ عربی داں نہ تھے، مگر انگریزی و فارسی اچھی طرح جانتے تھے، بڑے ہی خوش خط اور نہایت ہی مومن، دیندار اور بلند پایہ قصیدہ گو تھے۔ قصیدوں کی تشبیب غزل سے بھری ہوتی تھی فیض آباد کے استاد شعراء میں شمار ہوتا تھا۔

میرے نانا بھی شاعر تھے اور ماموں سید محمد سجاد صاحب مرحوم یحییٰ جو کوثر تخلص کرتے تھے۔

مجھے بچپن سے شاعری کا ماحول ملتا رہا اور مذہبی و دینی اشغال رکھنے والوں کے سایہ میں پرورش پانے کی نعمتیں میسر ہوتی رہیں۔ میری کردار سازی میں میرے سب سے بڑے بھائی مولانا سید نجم الحسن مرحوم کا ہاتھ ہے جنھوں نے تقریباً چار سال کی عمر سے اپنے ساتھ رکھا۔ پہلے بدایوں میں، اس کے بعد جب وہ کالون ہائی اسکول محمود آباد میں پرشین ٹیچر ہو کر ۱۹۳۶ء میں آئے تو وہاں بھی اپنے ساتھ رکھا۔ اس وقت ریاست محمود آباد کا پُربہار موسم تہذیب و اخلاق اور ادبی ماحول کے لحاظ سے چھوٹا لکھنؤ کہلانے کا مستحق تھا۔ میں نے ۱۹۴۳ء میں وہاں سے ہائی اسکول کیا۔ شمس العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب سرکار ناصر الملت، عزیز صاحب، ظریف صاحب، ثاقب صاحب، فائق صاحب (یادگار انیس)، مولانا اکبر مہدی صاحب سلیم جرولی،

حکیم تبغی حسین صاحب۔ ان سب مرحومین کو پہلی بار وہیں دیکھا۔ ایک موقع پر کالون ہائی اسکول کے مشاعرے میں سید مسعود حسن صاحب ادیب بھی تشریف لے گئے، اور افتتاحی تقریر کی جو "ہماری شاعری" کے اجزا پر مشتمل تھی۔

میرے عربی کے استاد شیخ ناظر حسین صاحب مرحوم مظفر نگر کے تھے جنہوں نے ساتویں درجے سے مجھے عربی پڑھائی اور عربی قواعد میں مجھے پکا کر دیا۔ فارسی مجھے اچھی آتی تھی۔ اردو کے کلاس میں جو مضمون کاپی پر لکھتا تھا اس میں شاعرانہ انداز ہوتا تھا۔ اب بھی مقفی اور مسجع عبارت لکھنے میں مجھے بڑا مزا ملتا ہے۔

فیض آباد گورنمنٹ کالج سے انٹر کیا۔ وہاں اس زمانے میں ایک سے ایک ماہرین فن موجود تھے جن میں سید محمد مہدی تسکین مرحوم ایک نمایاں ادیب تھے، قصیدے کہتے تھے، نثر مقفی مسجع ایسی لکھتے تھے کہ سبحان اللہ۔ فارسی گویا ان کی مادری زبان تھی، فارسی ناولوں کا اردو زبان میں بہترین ترجمہ کرتے تھے۔ "تعمیر" اخبار جس کے ایڈیٹر سید محمد عابد صاحب تھے، اس کی سرپرستی فرماتے تھے۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ میرے پاس اس کی متعدد فائلیں موجود ہیں۔ فیض آباد کی شہرۂ آفاق مجالس کے پوسٹر کی عبارت وہی لکھتے تھے۔

فیض آباد وثیقہ عربی کالج میں اعجاز احمد صاحب معجز سہوانی سکنڈ ماسٹر تھے، عربی زبان و ادب کی بڑی صلاحیت رکھتے تھے فیض آباد کی محفلوں میں طرح پر قصیدے کہتے تھے اور ان کی طرف سے ان کا کوئی شاگرد ان کی موجودگی میں پڑھتا تھا۔

حکیم مرزا افضل علی عرف پیارے صاحب طبیب حاذق تھے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان بڑی شستہ خداوند عالم کا ان کے لیے عطیہ ثابت ہوئی جس کی وجہ سے ان کے قصائد اور نوحے فیض آباد میں آج تک مقبول ہیں۔ نواب محمد رضا صاحب مرحوم بڑے ہی خوش لحن و جاذب لہجے میں ان کے قصائد محفلوں میں اور نوحے جلوس عزا میں پڑھا کرتے تھے۔

میرے جد امجد سید ضیاء اللہ صاحب مرحوم درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور ان کا ایک رسالہ وجوب نماز جمعہ پر بطور مخطوطہ وثیقہ عربی کالج میں تھا جو دستبرد زمانہ ہو گیا۔

میرے سب سے بڑے بھائی نجم الحسن صاحب بھی بہت عمدہ شاعر تھے۔ قصیدے بھی کہتے تھے اور محمود آباد کے مقامی شعرا کی غزلوں کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے، بہترین ذاکر تھے۔ دسویں درجے میں انھوں نے مجھ کو اردو پڑھائی اور اسی وقت سے اردو ادب اور اردو شاعری کے محاسن میں مجھ کو درک حاصل ہو گیا۔

بھائی نجم الحسن صاحب سے چھوٹے اور مجھ سے بڑے بھائی آیۃ اللہ مولانا سید محمد وصی صاحب مرحوم جو ناصریہ کالج جون پور اور وثیقہ عربی کالج فیض آباد کے پرنسپل رہ چکے تھے اور آخر عمر میں واعظین لکھنؤ کے پرنسپل ہوئے، نجف اشرف سے اجتہاد کر کے ۱۹۴۰ء میں آچکے تھے۔ میرے سب سے چھوٹے بہنوئی آیۃ اللہ مولانا سید ظفر الحسن صاحب مرحوم بھی نجف اشرف سے اجتہاد کر کے تشریف لے آئے۔ ان حضرات کی وجہ سے نہ صرف دینی و شرعی پابندیوں میں حوصلہ بڑھا بلکہ ان کے علمی و ادبی ذوق اور تحقیقات علمیہ میں شغف بھی مجھے متاثر کرتا رہا۔ چنانچہ لکھنؤ یونیورسٹی پہونچتے ہی میں نے انگریزی اور اردو میں مضامین لکھنا شروع کیے جو مسلم ریویو (واعظین کا آرگن) جو انگریزی زبان میں تھا اور سرفراز ہفتہ وار میں شائع ہوئے۔ فیض آباد کے بعد لکھنؤ میں بھی علماء و شعراء و ادباء و فضلاء و رؤسا کے مابین برابر آنا جانا رہا، جن کی فہرست طویل ہے۔

میرے مہربان اور شفیق استاد ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایک متبحر شخصیت تھے جنھوں نے مجھے بہت کچھ دیا اور بڑی ہمت افزائی فرمائی۔ میرے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کا عنوان ہے "دور عباسیہ میں علم کلام کی نشو و نما اور ارتقا" اس سے ناظرین میرے ذہن اور میری فکر و نظر کو سمجھنے میں چوک نہیں کر سکتے۔ میرے بہت ہی قریبی دوست اور میرے اقرباء جانتے ہیں کہ میں جس طرح طالب علمی کے دور میں ظاہری آثار رکھتا تھا وہی آج تک اسی طرح برقرار ہیں اور باطنی حیثیت سے ان تمام باتوں سے اپنے کو بچاتا رہا ہوں جو دامن شرافت پر بدنما داغ ثابت ہوتی ہیں اور انسانیت کش کہے جانے کی مستحق ہیں۔ مذہبی عقائد

میرا کافی تحقیق و تدقیق اور باہمی موازنہ اور کتب بینی کے طفیل میں اس قدر راسخ ہوں کہ عقلی و نقلی دلائل میرا خوب ساتھ دیتے ہیں مگر میرے دوستوں میں ہر مکتب فکر اور ہر فرقہ و مذہب کے لوگ رہے ہیں۔ البتہ میں نے گھناؤنی ذہنیت والوں سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور کرتے رہنے پر مصر ہوں۔

سنہ ۵۰ء تک لکھنؤ میں رہا۔ سنہ ۴۴ء میں بی، اے میں داخلہ لیتے ہی قصیدہ گوئی کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علامہ سید ابن حسن صاحب نونہروی کے دولت کدہ اور سرکار سعید الملت کے شریعت کدہ اور سلیم پور ریاست کے مقاصدوں میں طرحی اور غیر طرحی قصیدے پڑھے اور صف اول کے شعراء و علماء و ذاکرین و فاضلین نے ان قصیدوں کے بارے میں جو اظہار خیال فرمایا وہ قلم بند کرنے کے لائق ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے سلسلہ میں جو قصائد علامہ نونہروی طاب ثراہ کے یہاں کی محافل میں میں نے پڑھے وہ میرے لیے ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ اکثر اشعار زبان زد ہو چکے ہیں۔ وہاں کے ایک قصیدے کا مطلع ہے ؎

شمع عصمت سے قریں کرکے ولا کا دامن
مسکراتا ہوں جو جلتا ہے خطا کا دامن

ایک اور قصیدہ جس کی تشبیب کے چند اشعار یہ ہیں۔ اسی جگہ کی دوسرے سال کی محفل میں پڑھا ؎

تھے کچھ ایسے جن میں ہم شانِ خدا دیکھا کیے
صبر کے پیکر میں عزم کبریا دیکھا کیے

لوحِ پیشانی پر ان کی تھے مشیت کے نقوش
یعنی خود تحالِ تسلیم و رضا دیکھا کیے

آفتابی چہرے گویا تھے بیاضِ معرفت
دستِ وحدت کا مثالی آئینہ دیکھا کیے

کاکل پیچاں میں تھا لطفِ سوادِ حق رسی
ختم ہوتا ہے کہاں یہ سلسلہ دیکھا کیے

طائر ایماں اسیرِ حلقۂ گیسو رہا
یہ کشش از ابتدا تا انتہا دیکھا کیے

دیکھنی تھی جن کو شکل حد استقلال نفس
سید سجادؑ کا وہ نقشِ پا دیکھا کیے

صبر میں سجادؑ کا ہے کس قدر پایہ بلند
اٹھ کے نیزے پر شہیدِ کربلا دیکھا کیے

ایک اور قصیدہ جو وہیں کی محفل میں پڑھا تھا اس کے حسب ذیل شعر پر مولانا سید وزیر حسن صاحب واعظ مرحوم نے فرمایا تھا کہ ضرب المثل ہے ؎

ہو بے ریا تو بنے بوریا بھی مسندِ جم
کسی کا حق جو نہ چھینے ہے بادشاہ وہی

وہیں کے ایک قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں ؎

جو نکالیں ید تسخیر سے زنجیر کے بل
حریت ایسوں کی منت کشِ حداد نہیں

تیشۂ عزم جواں کہتا تھا باطل کا غرور
چور کر ڈالو کہ یہ شیشہ ہے فولاد نہیں

دردِ کہتا تھا ہلا دو درو دیوارِ دمشق
امن و ایمان پہ جب اس شہر کی بنیاد نہیں

آتشِ غم نے کہا کر دو اسے خاکستر
فرشِ ابلیس سے کم مسندِ جلاد نہیں

بے کسی کہتی تھی دکھلاؤ یہ اللہ کا زور
کوئی کیوں سمجھے کہ تم وارثِ اجداد نہیں

ظلم کہتا تھا کرو آہ زمانہ جل جائے
صبر کہتا تھا "نہیں سید سجاد نہیں

امام زمانہ علیہ السلام کی شان میں جو میرے قصائد ہیں، خالص تغزل ان کی تشبیب میں ملے گا۔ "تجلیات بدر" کے نام سے ایک مجموعہ قصائد سنہ ۸۲ء میں چھپ چکا ہے۔

۱۹۵۱ء سے میری ملازمت کا دور شروع ہوا اور بالآخر ۱۹۵۷ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوا اور میں نے عربی، فارسی اور اردو کے متحدہ شعبہ کو ترقی دینی شروع کی اور بالآخر ۱۹۷۲ء میں تینوں

زبانوں کے شعبے الگ الگ ہوگئے۔ میں شروع سے شعبۂ عربی و فارسی و اُردو کا صدر رہا، پھر ۱۹۷۰ء میں شعبۂ عربی کا صدر ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہوا۔ ریڈر بھی ہوا اور پروفیسر بھی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد تحریر و تقریر اور بیرون جات کے اسفار کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے اس لیے کہ ابھی تک قوت نے جواب نہیں دیا ہے۔

میری اسلامی مذہبیات پر کئی کتابیں چھپ کر منظرِ عام پر آگئی ہیں جو انگریزی اور اُردو میں ہیں۔ تجلیاتِ بدر میں فنِ قصیدہ گوئی پر میرا ایک مقالہ بھی شامل ہے اور تجلیاتِ بدر میں پروفیسر احتشام حسین صاحب مرحوم اور سرکار ظفر الملّۃ کی تقریظ اور تبصرہ بھی شامل ہیں۔

اپنے ان مقالوں کو جو میں نے انگریزی زبان میں لکھ کر آسٹریلیا کی بین الاقوامی قرآنی کانفرنس اور نئی دہلی میں ہمدرد انسٹی ٹیوٹ کی بین الاقوامی قرآنی کانفرنس میں پڑھا تھا، کتابی صورت میں خوشنما چھپوا دیا ہے اور اس میں رشدی کے ناول "شیطانی آیات" کا مکمل جواب موجود ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۲ء میں رشدی کی کتاب کا وجود بھی نہ تھا مگر اصولِ تفسیرِ قرآن کے ذیل میں ان تمام مہمل روایتوں کی رد کر دی گئی ہے جو منافی شانِ رسالت ہے اور قرآن مجید کو ثابت کیا ہے کہ عہدِ رسولِ اکرم میں مرتب و مدون ہوا اور آج تک بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے من و عن ہمارے درمیان موجود ہے۔

"فیضانِ ابو طالب" میری ایک مبسوط کتاب ہے جس میں حضرت ابو طالب، جو حضرت علیؑ کے والد ماجد اور رسولِ خدا کے چچا اور محافظ تھے، کی خدمات کو یکجا کیا گیا ہے اور ان کے تقریباً سبھی عربی کے اشعار جمع کر دیے ہیں اور حتی المقدور ان کے اُردو ترجمے نہایت عمدہ پیرایے میں فراہم کیے ہیں۔

میرے یہاں ہر سال حضرت فاطمہ زہراؑ کی ولادت باسعادت کے موقع پر جمادی الثانیہ کے آخری اتوار کو اول وقت نمازِ ظہرین باجماعت کے بعد محفلِ میلاد ہوتی ہے۔ امسال اس کا ۳۵واں دور تھا۔ اس کا اشتہار ہر سال ایک نئے طریقے اور طرز کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی عبارت آرائی، کبھی مقامی شعراء کے نام عبارت میں کھپا دیے۔ کبھی حضرت فاطمہ زہرا کے جملہ القاب عبارت میں سمو دیے۔ کبھی قرآنی آیات عبارت میں کھپا دیں۔ کبھی صنائع معنوی و صوری معنی ان سے عبارت بنا دی۔ کبھی آیۂ نور کی تفسیر نظم کر دی۔ امسال پوری حدیثِ کساء کا ترجمہ نظم کر دیا۔ اس اشتہار کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

(۱) "فاطمہ زہرا نگارخانۂ بدیع کی وہ یکتا صنعتِ فضل و کمال تھی کہ جسے صناعِ ازل نے خلوت کدۂ نور میں زیورِ محاسن سے اس طرح آراستہ و پیراستہ کیا کہ طبعِ سخن سنج اس کی تعریف و توصیف سے عاجز و پشیمان ہے اور فکرِ ہنرمند اس کی تطبیق و تعلیق سے نادم و حیران ہے۔ فصحاء و بلغائے دہر صنائع و بدائع کے ہزار لفظی و معنوی جوہر دکھائیں اور شعراء و ادبائے زمانہ ایجاد و اختراع کے لاکھ معنوی و نثری گوہر لٹائیں مگر اس شاہکارِ مشیت کو نہ تجنیس کا حسن رونما کر سکے گا نہ تضاد کا لطف روشناس۔ اس عدیم المثال کنیزِ خدا کے خفاء و ظہور کو لیل و نہار کے لف و نشر سے کیا سروکار جبکہ ادھر اصلِ حقیقت ہے اور ادھر عینِ مجاز، اُدھر آئینہ ہے اور ادھر عکس۔ انسیۂ حورا کو قدرتِ کاملہ نے حسنِ التفات سے وہ شکل و صورت عطا کی کہ مشاکلت اپنا منہ دیکھتی رہ گئی اور مناسبت لفظوں میں الجھ کر گم ہوگئی۔ خاتونِ جنت کی شان نہ مبالغہ و اغراق و غلو کی محتاج ہے نہ اس کا عرفان رہینِ استخدام و تعلیل و ادماج۔ اگر جانِ پیغمبرؐ کا قرب بعنوانِ حسنِ طلب ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ہے تو نفسِ پیغمبر کی نمود بصورتِ ایہام میانِ آیۂ هٰذا صراط علیٍّ مستقیم ہے۔ دخترِ ختم المرسلینؐ کے دہن کا جملہ زینتِ قرآنِ مبین نہ ہوتا تو سورۂ دھر کو مسلسل تضمین کا موقع نہ ملتا۔ محدثہ کے در پر مسکین و یتیم و اسیر کے بھیس میں فرشتوں کا آنا تعجب خیز نہیں۔ اسی طرح سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً میں

برعایت تخفہ' معراج براعت استہلال کا پایا جانا حیرت انگیز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔" الخ

(۲) "اسلام شاہد ہے کہ امتِ مسلمہ کی شاہزادی، ایمان ناز اں کہ ملّت حقّہ کی نورزادی المسمّیٰ بہ فاطمہ زہرا، المخاطب بہ انسیۂ حوراء المقلب بہ صدیقۂ طاہرہ المعروف بہ امّ الائمہ، مروّجِ شریعتِ نسواں، مفسّر مصحفِ یزداں، تہذیب و اخلاق میں صحیفۂ حجتِ ناطقہ، تدبیر منزل میں ملیکہ، قوتِ عاقلہ۔ اصول دین جس کے افکار صحیحہ سے محکم، فروعِ دین جس کے اعمال صالحہ سے مستحکم، اثبات توحید باری تعالیٰ میں جو مصباح دلائل کا اعلام عدل ربانی میں جو مشکوٰۃ حقائق، کاشانۂ رسالت میں سیدۃ النساء، نگار خانۂ امامت میں عصمتِ کبریٰ، عرصۂ قیامت میں شفیعۂ روز جزا۔ صلاۃ جس کی محویت کی گرویدہ صوم جس کی ریاضت سے بالیدہ، حج کو جس کی سعی کا اشتیاق، زکوٰۃ کو جس کی دریادلی کا اعتراف، خمس میں شش و پنج کرنے والا اس کا معاند، جہاد میں پس و پیش کرنے والا اس کا مخالف، پردہ جس کا تحفہ' ھل اتٰی جس کا قصیدۂ عطا، کفر میں طاقت نہیں کہ اس کے قریب آسکے، رجس میں ہمت نہیں کہ اس کا دامن چھو سکے، اس کی تکذیب کرنے والا منافق، اس کی تصدیق کرنے والا مومن، اس کی دوستی کا انعام شرابِ تسنیم، اس کی دشمنی کا انجام نارِ جحیم۔"

(۳) " ہر فرد و بشر حمد باری تعالیٰ کو زینِ عین جانے ہر صاحب فکر و نظر نعت سرور انبیاء کو نصب العین بنالے۔ اہل بیت رسالت کی منقبت زندگی کا شعار ہو تو ہر بیت کی قسمت سے جناں میں ایک گھر تیار ہو، ہجو میں ہجائے دشمنانِ دین خدا سفاہت نہیں فراست ہے۔ مرثیہ یعنی رثائے شہدائے راہ صبر و رضا بدعت نہیں عبادت ہے، مثنوی میں معجز ری کی داستان اور ریختی حوروں کی ہم زبان ہو، قصیدہ کے میدان میں بہ قصد اخلاص قدم رکھے، مدح کے دوران مبالغہ و غلو سے گریز کرے۔ مطلع زوردار ہو تو سبحان اللہ مقطع شان دار ہو تو ماشاء اللہ۔ تشبیب میں مطلوب اصلی حسن ازل ہو، تو نسیب غزل میں مقصود دل عشق حقیقی، انداز تغزل ابتذال سے مبرا ہو پیمانۂ تخیل پستی خیال سے معرا، ترکیب بند کا موضوع بند شِ مودتِ قربیٰ سے باہر نہ ہو اور ترجیع بند کا مضمون رجعت قائم آل عبا کا محور ہو، مثمن میں ہشت بہشت کا نقشہ کھینچ دے۔ ہفت بند میں چودہ طبق کی رونق سمیٹ لے۔ گلستانِ مسدس میں بلبل سدرۃ المنتہیٰ چہکے تو بوستان مخمس میں گلِ مرادِ طوبیٰ مہکے، مربع میں اقانیم ثلاثہ کا ابطال ہو اور مثلث میں اصنام باطلہ کا استیصال بھی ہو۔

کفر کا ہوش رباعی سے دھواں ہو جائے
قطع اک قطعہ سے باطل کی زباں ہو جائے

ساقی نامہ پڑھنے والو! آبادیٔ میخانہ کی دعا کرنے والو! خمخانۂ صداقت کھل گیا ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

الغرض ۱۹۸۶ء کے اشتہار میں ڈاکٹر اقبال نے اسرار خودی میں جناب فاطمہ زہرا کی جو فارسی اشعار میں مدح و ثنا کی ہے، اس کا نظم میں ترجمہ اردو میں نے درج کیا ہے۔

جس محفل کا اس تفصیل سے ذکر کیا ہے وہ ابتدا سے آج تک "گوہر شب چراغ عصمت" کے عنوان سے ہوتی ہے اور اسی عنوان سے اشتہار نکلتا ہے۔

اس محفل میں جن صف اول کے قصیدہ گویوں نے شرکت فرما کر رونق بخشی ہے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

جناب موثر جون پوری مرحوم، حکیم کاظم مرحوم، جناب نذیر بنارسی صاحب زادِ شر نہ، جناب قاسم شبیر نصیر آبادی، جناب کوثر فیض آبادی مرحوم، جناب میکش غازی پوری مرحوم، جناب زوار حسین الہ آبادی مرحوم

جناب مہر چاکسی مرحوم، جناب سید علی مہدی بلرامپوری، جناب رضا مرسوی جناب نسیم واسطی جون پوری، جناب معجز جلال پوری، جناب خورشید غازی پوری، ڈاکٹر ناظم بنارسی، جناب مہدی نظمی مرحوم، جناب ست نام سنگھ خمار پنجابی، ڈاکٹر عزیز حیدر بنارسی وغیرہم۔

میرے لڑکوں میں سید عین الحسن حسن سلمہٗ اور نجم اصغر نجمی سلمہٗ اور میرے حقیقی بھانجے پروفیسر سید علی احسن سلمہٗ جو میرے خویش بھی ہیں، ان محفلوں میں داد تحسین حاصل کرتے رہتے ہیں ۔ بنارس میں تقریباً سبھی محفلیں طرحی ہوتی ہیں جن میں میں طرح پر اپنا قصیدہ پڑھتا رہا ہوں۔

آسٹریلیا، ہانگ کانگ، بنگلہ دیش، شام، لندن، امریکہ کناڈا، ایران، پاکستان، کویت، دبئی، ابوظبی، عراق، سعودی عرب وغیرہ کے سفر کیے۔ کہیں تقریر کے لیے گیا اور کہیں مقالہ پڑھنے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا اور یونیورسٹی کی طرف سے گیا۔ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس جہاں جہاں ہوئی، شرکت کرکے اپنا مقالہ پڑھا۔ ہندوستان اور بیرون ملک کے انگریزی و اردو جریدوں میں میرے بکثرت مضامین طبع ہو چکے ہیں۔

اپنی "تجلیات بدر" میں میں نے فن قصیدہ گوئی پر جو مقالہ شامل کیا ہے اس کا ایک اقتباس جو تشبیب کے تحت ہے، یہ ہے:

"... خلاصہ یہ کہ اگر اردو اور فارسی و عربی قصائد کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو تشبیب کے مضامین مختلف النوع ملیں گے، کہیں موسم بہار کی مرقع کشی ہے تو کہیں دورِ خزاں کی پردہ داری، کہیں شمع و پروانہ کے سوز و گداز میں سخن سازی تو کہیں گل و بلبل کے راز و نیاز میں دخل اندازی، کہیں حسن و عشق کے چٹکلے تو کہیں وصل و ہجر کے تذکرے۔ کہیں گردشِ لیل و نہار کی حکایتیں کہیں نیرنگیِ روزگار کی شکایتیں، کہیں ذاتی تجربات و مشاہدات کی تحسین و تعلی، کہیں مذہبی معتقدات و نظریات کی تلقین و تحدی، کہیں جدید رجحانات کی تبلیغ و تشویق کہیں فلسفیانہ تصورات کی تصدیق و تطبیق، کہیں نصیحت و موعظت کا عنوان، کہیں علم و حکمت کا بیان، کہیں ساقی و صہبا کی جستجو، کہیں جام و مینا کی آرزو، کہیں نسبی شرافت کا اظہار، کہیں نوعی سیادت پر افتخار، بایں ہمہ تشبیب میں براعت استہلال کا لطف تاثر کے لحاظ سے اہل نظر اور صاحبان ذوق کے لیے کافی جاذب اور خوش گوار ہوتا ہے۔ اس صنعت خاص کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیدی اشعار میں ممدوح کی ذات و صفات نیز اس کے حالات و واقعات کا جو ممدوح کی شخصیت سے متعلق ہیں اشارتاً و کنایتاً بغیر اس کا نام لیے ذکر کیا جائے تاکہ آغاز کلام ہی سے اذہان ممدوح کی طرف مڑ جائیں۔"

□□

نیر سلطانپوری ...... صہ کا بقیہ

وفات سے کچھ پہلے منظر عام پر آیا اور جس میں ان کی نظموں اور غزلوں کا ایک بہت بڑا حصہ موجود ہے، ان کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ نہایت دل کش اور دلنواز ہے۔ ان کے ہر شعر سے ان کا فن کارانہ خلوص ضیابار ہے۔

یہاں فکر و فن کے ایسے دل کش مرقعے موجود ہیں جو ہمارے تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں اور ایک روشن مستقبل کی بشارت بھی دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے اشعار حال کے درد و اضطراب کو کیف و انبساط میں بدل دینے اور افسردہ دلی کو رجائیت میں منقلب کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک سچے انسان اور سچے شاعر ہیں جو موجودہ آشوب و اندوہ میں انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔

اس صدی کی اردو غزل کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو یقیناً حضرت نیر کو فراموش نہ کیا جا سکے گا جنھوں نے بہرحال اپنی انفرادیت کے دیرپا نقوش اس صنف سخن پر مرتسم کیے ہیں۔

■■

غزلیں

اس کے عارض پہ نکھر آتے ہیں جذبات کے پھول
ہم نے دیکھے ہیں مہکتے ہوئے برسات کے پھول

مجمرِ شہرِ غزل ہیں مری آہوں کے چراغ
کوئی سازوں پہ سجا دے مرے نغمات کے پھول

اس کو یوں کہئے کہ خوشبو نے وطن چھوڑ دیا
ورنہ باسی تو نہیں ہوتے کبھی رات کے پھول

جب تری یاد جواں اور جواں ہوتی ہے
ذہن کی شاخوں پہ کھلتے ہیں خیالات کے پھول

ہم نے کانٹوں کی طرف گھوم کے دیکھا ہی نہیں
ہم تو چنتے ہوئے پھرتے رہے حالات کے پھول

قدرداں پاؤں بھی رکھدے تو بہت ہے تسنیم
فرشِ عالم پہ سجاتے رہو خدمات کے پھول

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

اس کے قدموں کی دھمک اس کی صداؤں کی کھنک
گونجا کرتی ہے خیالوں کے تلے صبح تلک

پھُوٹ کے شاخوں سے، ہواؤں میں ملیں گے اب کے
زندہ ہوگی جہاں سُوکھے ہوئے پھولوں کی مہک

دل ترے طرزِ تغافل کو دُعا دیتا ہے
جب زمانہ مرے زخموں پہ چھڑکتا ہے نمک

سرد کردے گی تجھے آج شبِ وصل کی آگ
راکھ کردے گی ہمیں ہجر کے شعلوں کی لپک

دھڑکنیں چاندنی راتوں کی ہوا سُنتی ہے
اور ہم لوگ سلگتی ہوئی راتوں کی سسک

رنگ در رنگ نظر آتا ہے خوابوں کا بدن
تیرا پیکر ہے کہ اتری ہے نگاہوں میں دھنک

کوئی پتھر ہے نہ شیشہ، سبھی مہ پارے ہیں
کہاں لے آئے ہو راھی یہ زمیں ہے کہ فلک

ایم۔ کوٹھاوی راھی
اڈیٹر "اشتراک" ریکلی۔ قاضی پور خورد
گورکھپور

ڈاکٹر سید عبد الباری
جمیل منزل، شاہ گنج، سلطانپور
۲۲۸۰۰۱

نیر سلطانپوری = ایک روشن ضمیر و ہنرمند فنکار

اودھ کے ممتاز شہر سلطان پور نے اس صدی کے اوائل سے اب تک اردو شعر و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں جنگ آزادی کے دوران شاعروں کی ایک بڑی کھیپ منظر عام پر آئی۔ یہاں کے قصبات اور مضافات کی بستیوں میں علم و ادب کے بڑے بڑے قدرداں پیدا ہوئے۔ اس صدی کی چوتھی دہائی پر شہر کی ادبی و شعری فضا کے جو شاہدین موجود ہیں وہ اس دور کی ادب نوازیوں اور ثقافتی مشغلوں کی تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں گویا یہ شہر خود لکھنؤ کا ہم رتبہ بن گیا تھا۔ اس عہد کی ایک یادگار جناب توکل حسین نیر بھی تھے جو ایک طویل عمر گزار کر ۱۹۸۵ء میں اپنے خالق سے جا ملے۔

نیر سلطان پوری نے کم و بیش ۴۵ سال تک سلطان پور بلکہ پورے اودھ کی فضا کو علم و ادب کی شمعوں سے منور بنائے رکھا۔ ان کی ادارت میں اسی شہر سے اس صدی کی ساتویں دہائی میں ایک مشہور و معروف ادبی جریدہ "شمع ادب" مدت دراز تک شائع ہوتا رہا۔ نیر صاحب اس سرزمین میں ایک معتبر و مخلص فن کار اور ایک شریف انسان کی حیثیت سے بے شمار لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے رہے۔ اور یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا محور بنے رہے۔

نیر سلطان پوری نے ضلع سلطان پور کے قصبہ دوستپور کے شرفا کے ایک خاندان میں ۱۹۰۸ء میں آنکھیں کھولیں اور وہیں پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے تشریف لے گئے۔ لکھنؤ میں حضرت صفی لکھنوی اور ظریف لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہاں کے علمی و ادبی ماحول نے ان کے آئینہ فکر و تخلیق پر صیقل کا کام کیا اور ان کی فنی صلاحیتیں برگ و بار لانے لگیں۔ جلد ہی وہ اپنی پُراثر اور دلکش نظموں کے ذریعہ ادبی منظر نامہ پر جلوہ گر ہو گئے۔

اس نوعمر فن کار کی لکھنؤ میں پذیرائی ہوئی۔ اس عہد میں لکھنؤ آزادی کی جد و جہد اور مختلف سیاسی، ثقافتی اور اصلاحی تحریکوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ حضرت نیر ایک روشن ضمیر اور بیدار مغز فن کار کی حیثیت سے سامنے آئے اور ان کے عہد کی دھڑکنوں کو ان کے کلام نے اس طرح پیش کیا کہ وہ ایک دلنواز اور درد مند فن کار کی حیثیت سے روشناس ہونے لگے۔ آزادئ وطن خود ان کے دل کی آرزو بن گئی اور وطن کی سرزمین پر بسنے والے تمام لوگوں میں اتحاد و توافق کا وہ خواب دیکھنے لگے۔ خاص طور پر اپنی ملت کے مختلف فرقوں کے اندر ہم آہنگی ان کی سب سے بڑی تمنا بن گئی۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان انھوں نے متعدد جوشیلی نظمیں لکھیں۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء کو شمالی بہار کے قیامت خیز زلزلے سے متاثر ہو کر جس کے شدید اثرات خود یوپی میں بھی محسوس کیے گئے تھے، نیر صاحب نے نظم "زلزلۂ عظیم" لکھی۔ اس نظم میں قوت بیان، قدرت کلام اور استادانہ مہارت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے اس مخمس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

کیا قہر کیا تیری موج ستم افزا نے
سہمے ہوئے انساں ہیں اجڑے ہوئے کاشانے

ہیں دفن مکانوں میں کتنے ہی خدا جانے
سڑکیں ہیں نہ بازار ہیں باقی ہیں اب افسانے
اک شان نظر آتی ہے قدرتِ یزداں کی

زلزلے کی ہیبت ناکی کی اتنی سچی تصویر یہ شاعر نے الفاظ کی مدد سے بنائی ہے کہ محاکات کا لطف اپنے نقطۂ عروج پر ہے ؎

رفتار کو اک میں ہنگامۂ ناز آیا
افسانۂ محشر یا بیرونِ حجاز آیا
یا مادرِ گیتی کا طوفاں میں جہاز آیا
یا غیض میں اے نیرؔ وہ بندہ نواز آیا
لرزاں ہے زمیں ساری کیوں عالمِ امکاں کی

نیرؔ نے اس عہد میں جب کہ اردو شاعری میں پابند اور آزاد نظموں کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا، اپنی نظم نگاری کی ایک شناخت اپنی فن کاری اور فکر انگیزی کی مدد سے قائم کی۔ ۱۹۴۵ء میں اپنی نظم "پیغامِ حیات" میں وہ اپنے ہم وطنوں کو پیامِ بیداری دیتے ہیں اور ان قوم فروش رہنماؤں کو نشانۂ طنز بناتے ہیں جو اپنے شخصی مفادات پر ملت اور قوم کے مفاد کو قربان کر دیتے ہیں اور اتحاد کے شیرازہ کو اپنی انا کی خاطر پراگندہ کر دیتے ہیں۔ نیرؔ صاحب اپنی نظم "ناخدائے قوم کے نام" میں ان کے قول و عمل کے تضاد پر اس طرح فریاد کرتے ہیں ؎

اپنی اپنی بانسری ہے اپنا اپنا راگ ہے
دیدنی ہے آپ کے نقار خانے کا نظام
جھومتی ہے ایک دنیا آپ کی تقریر پر
مانتی ہے بزمِ ملت آپ کا زورِ کلام
ایک میدانِ عمل پنڈال کے باہر بھی ہے
اس میں بھی سرگرمیاں دکھلایئے عالی مقام
آ رہی ہے دھیرے دھیرے اب بھی آوازِ جرس
جا رہا ہے سوئے منزل کاروانِ تیز گام
آپ کو جو کا سکا نہ اب بھی کوئی انقلاب
شورشِ بزمِ جہاں دیتی رہی لاکھوں پیام

اور آخر میں جھنجھلا کر کہتے ہیں ؎

چھوڑیئے عہدِ بقا سعیِ فنا ہی کیجیے
اپنی جڑ خود کھود دیجیے جب تک نہ ہو قصہ تمام

اس نظم میں حضرت نیرؔ اکبرؔ الہ آبادی اور ظریفؔ لکھنوی کے ہم زبان و ہم آواز نظر آتے ہیں اور فنی اعتبار سے انھیں کی طرح جان دار و چوبند محسوس ہوتے ہیں۔ ایک دوسری نظم میں اپنی ملت کی زبوں حالی اور اہلِ زمانہ کی تیز گامی کا اسی انداز میں ذکر ہے۔ ان کی نظموں کی مترنم بحریں خاص طور پر ہمارے لیے دلکش ہیں ؎

دے رہی ہے گردِ رہ اٹھ اٹھ کے منزل کا نشاں
کارواں گرمِ سفر ہے سامنے ہے آفتاب
حریت کی منزلوں میں عزم کے میدان میں
کاش یارانِ وطن ہوں ہر قدم پر کامیاب
نیرؔ ان ملت فروشوں سے خدارا دور بھاگ
اپنے ساتھ اوروں کو لے ڈوبیں گے یہ خانہ خراب

شہر لکھنؤ میں بدقسمتی سے اس عہد میں شیعہ و سنی فرقوں کے درمیان زبردست کشیدگی موجود تھی اور ذرا ذرا سی بات پر وہ برسرِ جنگ تھے۔ نیرؔ اس منافرت پر بے حد افسردہ خاطر ہیں اور ظریفؔ لکھنوی کی طرح دونوں فرقوں کو ملامت کرتے ہیں ؎

ننگِ پیمانِ اخوت اے گروہِ سین شین
تیرے فتنوں میں الجھ کر رہ گیا دینِ مبین
غیر ہنستے ہیں تمھیں کچھ شرم ہی آتی نہیں
غیرتِ قومی تمھارے دل کو تڑپاتی نہیں
رخ ہے اپنوں کی طرف کیوں تیغِ خوں آشام کا
خانہ جنگی جانتے ہو مدعا اسلام کا
ہاں کبھی حق کی طرف تھے جادہ پیما دل دماغ
تھے کبھی سینوں میں روشن ربط و الفت کے چراغ

تم مسلماں تھے کبھی لیکن مسلماں اب نہیں
سچ ہے دنیا میں غلاموں کا کوئی مذہب نہیں

اس نظم کے آخری شعر میں حضرت نیر اقبال کے ہم آواز ہو جاتے ہیں جنھوں نے اس روشن حقیقت کو واشگاف کیا تھا ؎

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس صدی کی چوتھی دہائی بڑی پر آشوب تھی اور اس وقت ہندستان کے مقدر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اپنے عہد کے عالی مرتبت مفکروں و فن کاروں کی طرح اس نوجوان شاعر کے سینے میں بھی ایک حساس دل موجود تھا۔ اسے یہ شدید احساس تھا کہ وقت بے حد فیصلہ کن ہے۔ اسی کے الفاظ میں ؎

برق پیہم کوندتی ہے صحن گلشن کی طرف
گاہ خرمن کی طرف گاہے نشیمن کی طرف

مسلمانوں کے سماجی، مذہبی اور سیاسی افتراق کو دیکھ کر ۱۹۴۰ء میں اپنی نظم "مسلم دیوانہ" میں اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

کس قدر وحشت نے مجھ پر اپنا ڈالا ہے اثر
جیب و دامن کی تجرت مسلہ تو پر رہے
جا رہا ہے کس طرف اے بے خبر دیوانہ وار
کوئی منزل ہے نہ جادہ ہے نہ کوئی راہبر
سوئے منزل گامزن اے کاش تجھ کو دیکھ لوں
یہ تمنا لے کے آیا ہوں قریب رہ گزر

دوسری جنگ عظیم کے اٹھتے ہوئے شعلوں کی طرف قوم کو متوجہ کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں ؏

آپ نے کیا طے کیا اپنی حفاظت کیلئے

غرض ۱۹۴۰ء تک حضرت نیر اپنی اعلا تعلیم کی منزلیں بھی طے کرتے رہے اور اپنے فن و فکر کے ہفت خواں بھی طے کرتے رہے۔ اس عہد کی نظموں میں گہرا طنز، عالمگیر ہمدردی، وسعتِ نظر، سوز و گداز، روشن ضمیری اور سیاسی بصیرت کی جھلک حضرت نیر کی شخصیت کو ہمارے لئے بے حد دلآویز بنا دیتی ہے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی وہ ۲ سال تک لکھنؤ ہی میں مقیم رہے اور کسی دفتر میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں مرحوم نے ایک رسالہ "فردوس" جاری کیا۔ پھر ۱۹۴۲ء سے سلطان پور کے قیام کا دور شروع ہوا اور شہر کے ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں اردو فارسی ٹیچر کی حیثیت سے ۴۲ روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیے گئے۔ آزادی کے بعد جب فارسی کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اسی ادارہ میں اردو اور انگریزی کے استاد ہو گئے اور اسی کالج سے ۱۹۷۰ء میں لکچرار کے عہدہ سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں سلطان پور سے "شمع ادب" جاری کیا۔ نظم نگاری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۹۵۰ء میں آزادیٔ وطن پر ان کے جذبات اس مترنم بحر میں "عہد جمہور" کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیں ؎

رات آخر ہوئی اور صبح کا تارا چمکا
بند غم ٹوٹ گیا بخت ہمارا چمکا
آج ہے ساری فضا حب وطن سے روشن
مادر ہند کے ماتھے پہ ستارا چمکا
دور تک پھیلی ہے آزادیٔ کامل کی فضا
ایشیا والوں کی قسمت کا ستارا چمکا

اسی طرح جب ہندستان و پاکستان کے درمیان ایک تلخ جنگ کے بعد دوستی و محبت کی فضا قائم ہوئی اور تاشقند میں صلح کا معاہدہ ہوا تو نیر کا دل باغ باغ ہو گیا اور انھوں نے "صلح تاشقند" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ؎

عشق نے پائی فتح جنوں پر مل بیٹھے دیوانے دو
اپنی حد میں لوٹ رہے ہیں عالم کے فرزانے دو
اصلاً نسلاً دونوں ہندی ایک تصور ایک مزاج
ایک زباں ہے ایک ہے عنواں کہنے کو افسانے دو
صلح اسے حل کرتی ہے جو جنگ نہیں حل کر پاتی
عقل و خرد کی راہ یہی ہے دشمن کو بہکانے دو

نیر سلطان پوری کے مجموعۂ کلام "ریزۂ مینا" کے آخری پچاس صفحات میں جو نظمیں موجود ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی دو ممتاز اصناف سخن غزل اور نظم میں شاعر کو مہارت حاصل ہے اور اپنی نظموں میں وہ وقت کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیتے ہیں۔ اپنے

عہد کے ایک نہایت اہم موضوع پر، جو اس صدی کی درمیانی دہائیوں میں دوسری عالمگیر جنگ کے بعد خاص طور پر موضوعِ گفتگو تھا، نیّر نے بھی خامہ فرسائی کی ہے اور ان کی نظم " عالمی ایکتا " اپنے فکر وفن کا ایک دل کش مرقع بن کر سامنے آئی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ایک سے ہیں خد و خال
ایک سی تصویر ہے
ایک ہی لوحِ جبیں
ایک ہی تقدیر ہے
ایک مصوّر کا ہے
ایک ہی انداز کار
تم بھی ہو اک شاہکار
میں بھی ہوں اک شاہکار
یوں نہ کھنچے جایئے
میرے قریب آیئے

ان نظموں میں بعض مقامات پر زندگی کی تھرتھراہٹ، حرکت وعمل اور ولولہ و سرور کی وہ کیفیات نقش بند ہیں کہ ان مرقعوں پر ہم کھو جاتے ہیں جیسے اجنتا و ایلورا کی حسین گپھاؤں میں داخل ہو گئے ہوں ۔ نیّر کی نظم " رقاصہ " کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آنکھیں ہیں کہ بھنورے کا کنول میں ہے بسیرا
زلفیں ہیں کہ ساون کا گھٹا ٹوپ اندھیرا
غازے نے ترے رخ پہ عجب رنگ بکھیرا
یخ بستہ پہاڑوں پہ ہوا جیسے سویرا

لیکن حضرت نیّر کا اصل فنی و ادبی کارنامہ ان کی دل کش غزلیں ہیں جنھیں دیکھ کر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ شاعر انسانی جذبات کی گہرائیوں میں اترنے کا آرٹ بھی جانتا ہے اور اس نے انسانی کیفیات کے غاروں میں جھانک کر بڑے پر اسرار حقائق سے آنکھیں چار کی ہیں۔ نیّر کے تغزل میں کلاسیکی آہنگ موجود ہے۔ انسانیت کی اعلا اقدار کے پختہ شعور نے ان کے موضوع و مواد میں آفاقیت پیدا کر دی ہے اور ہم انھیں اردو کے سکہ بند اساتذہ میر، درد، آتش، فانی، حسرت اور اصغر کی صف میں کھڑا ہوا پاتے ہیں۔

غزل میں زہر خند کے بجائے بذلہ سنجی اور تجاہلِ عارفانہ سے زیادہ نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کڑوے کسیلے لہجے کی گنجائش زیادہ نہیں ہے نہ جلی کٹی سنانے کی اجازت ہے۔ یہاں فن کار کو سماج کی بہت سی ناہمواریوں پر صرف ایک معنی خیز مسکراہٹ اور ایک رمزیہ نرم گفتاری کی اجازت ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسی منزل بھی آتی ہے جہاں تبسم زیرلب اور نگاہِ غلط انداز بھی بوجھ بن جاتی ہے اور مکمل بے نیازی اور عارفانہ لاتعلقی کا اظہار ہی شاعر کے شایانِ شان ہوتا ہے ؎

دیکھا نہ آنکھ اٹھا کے کبھی اہلِ درد نے
دنیا گزر گئی غمِ دنیا لئے ہوئے

اس میں شک نہیں کہ غزل کے اس کلاسیکی مزاج کو تبدیل کرنے اور اس میں ماحول کی تلخیوں کو زیادہ سے زیادہ بے تکلف اور کھرے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مرزا یاس یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی نے آج سے ۴۰، ۵۰ سال قبل اس طرح کے تجربات بڑے بےباکانہ انداز میں شروع کر دیئے تھے۔ ان کی کاوشوں کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی۔ انھوں نے غزل کے جدید لہجے و آہنگ کو نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ لیکن میرے خیال میں غزل اس بوجھ کو سلیقے سے اٹھا نہ سکی اور ہمیشہ اس طرح کے تجربات کو دیکھ کر محسوس ہوتا رہا ہے کہ یہ غزل کے ساتھ شاید انصاف نہیں اور اسے نظم کے دائرے میں کھینچ لانے کی کوشش ہے۔ غزل راست اندازی کی زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ زمانہ کی ہزار گردشوں کے باوجود آج بھی وہی شعرا لوگوں کے دلوں کے تاروں کو چھیڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو غزل کے منجھے منجھائے لہجے میں نئے موضوعات اور جدید تقاضوں کو اپنی فکر کا محور بنا کر ہم سے مخاطب ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جاگیردارانہ ماحول کی لطافتیں اور دورِ عیش وعشرت کا کیف و سرور رخصت ہونے کے بعد اب انسان ایسے استعاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے جو اس کے لئے مانوس ہوں اور اس کے گرد و پیش کے ماحول سے متعلق ہوں۔ لیکن غزل کے نقاب پوش

آرٹ کی ساخت اس دورِ آتش و آہن کی کثافتوں کی کس حد تک متحمل ہو سکے گی یہ سوال ابھی جواب طلب ہے۔ پھر بھی غزل نے گزشتہ ڈھائی صدیوں میں وقت کی گردشوں اور زمانے کے انقلابات سے جس طرح آنکھیں چار کی ہیں اس سے اس کی زندگی و توانائی کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب کے شعر سے

ترے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

سے جب شاد عارفی کے اس شعر تک آتے ہیں ؎

ضبطِ نادکِ غم سے بات بن تو سکتی ہے
آدمی کی انگلی میں پھانس بھی کھٹکتی ہے

تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل کے آبگینے میں نئے انسان کے تیور کی جھلک نظر آرہی ہے لیکن تغزل کی چاشنی کی طلب ہمیں بار بار ماضی کی طرف مڑکر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے اور شاد عارفی کے اس شعر کے مقابلہ میں ؎

حجاب سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

غالب کا یہ شعر ہمیں زیادہ دل رُبا محسوس ہوتا ہے ؎

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اس پس منظر میں جب ہم حضرت نیر سلطان پوری کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے کاروبارِ عشق کو بازیچۂ اطفال یا مشغلہ اربابِ ہوس بننے نہیں دیا۔ ان کے نزدیک غزل تفریحِ طبع کا سامان نہیں بلکہ فکر و نظر کی بالیدگی اور جذبات کی تطہیر کا وسیلہ ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے اس قول سے حضرت نیر متفق نظر آتے ہیں کہ اعلا ادب کی تخلیق کے لیے اعلا درجہ کی متانت اور سنجیدگی درکار ہوتی ہے چنانچہ ان کی غزلوں میں شائستگی اور متانت کی ایک فضا شروع سے آخر تک نظر آتی ہے۔ اپنے مجموعۂ کلام کے آغاز ہی میں وہ اپنے نظریۂ فن کا تعارف ان اشعار کے ذریعہ کراتے ہیں ؎

تیز کر دیتا ہوں میں جہدِ بقا کے حوصلے
ڈوبنے والوں کو عزم ناخدا دیتا ہوں میں
فکر کی پروردہ ہے میری بلندیٔ نظر
پست ذہنوں کو شعور آگہی دیتا ہوں میں

نیر سلطان پوری اپنی بالیدگیٔ فکر اور بلندیٔ نگاہ کا ثبوت قدم قدم پر دیتے ہیں۔ میر کی طرح تحیر اور تفکر ان کے کلام میں جگہ جگہ جھلکتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعۂ حیات و کائنات کس قدر وسیع ہے ؎

زندگی آج بھی ہے تشنۂ تعبیر ہنوز
چشم بیدار نے کیا خواب پریشاں بخشا
میری وحشت تری نیرنگ کرم کے صدقے
ذوقِ گلشن تو کبھی ذوقِ بیاباں بخشا

نیر کے نزدیک عشق و عاشقی نہایت مہتم بالشان معاملہ ہے۔ اسے وہ دماغ کا خلل، مزاج کی برگشتگی یا دل کی ترنگ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ وہ اس کا سلسلہ سوزِ دروں یا داغِ جگر سے جوڑتے ہیں۔ اور زندگی کی سب سے بڑی متاع قرار دیتے ہیں۔ وہ عشق کو زندگی کا آزار ماننے پر تیار نہیں۔ انھیں عشق کی محرومیوں پر منہ بسورنے اور فریاد کرنے کی عادت نہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

عشق کو کرکے عطا سوزِ دروں داغِ جگر
ہم سے اک بے سروساماں کو بھی ساماں بخشا

جہاں سے عشق میں پیدا ہوا احساس ناکامی
وہیں سے اے کتابِ دل تری تفسیر بدلی ہے

حضرتِ نیر اس منزل تک بڑے صبر آزما مراحل کے بعد پہنچے ہیں۔ ان کے کلام میں وہ سوز و گداز نہیں جو میر اور فانی کی شناخت بن گیا ہے لیکن وہ بصیرت و آفاقیت ضرور موجود ہے جو غزل کو زندگی کی ادا نہیں ادا شناس بنا دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تحمل اور استقلال موجود ہے جو آلامِ روزگار کو بے حقیقت بنا دیتی ہے ؎

آلامِ روزگار سے نیر رہے بے نیاز
غم آزما سرشت ہے صبر آزما مزاج

نیرؔ کے کلام میں ان کے تجربات کی وسعت اور مشاہدہ کی آفاقیت جلوہ گر ہے۔ حکمت و بصیرت کے گہرہائے آبدار ہر شعر میں آویزاں ہیں ہماری تہذیب کی تابناک اقدار ان کے اشعار کے غزلوں سے جھانکتی ہیں اور ہمارے دل و نگاہ کو تازگی عطا کرتی ہیں ؎

ہائے لے ڈوبی انھیں جامہ دری کی آرزو
پھول سمجھے تھے ادائے دلبری بڑھ جائے گی

خندۂ گل ہی کے پردے میں مآلِ گل بھی تھا
ہم زمانے کے تغیّر کو ہنسی سمجھا کیے

ہے ساری فضا نغمہ و آواز سے معمور
ہر موجِ ہوا یار کا پیغام لیے ہے

نیرؔ یہ جہاں معرکۂ سود و زیاں ہے
مشکل ہی سے جمتے ہیں یہاں پاؤں اکھڑ کر

مدت سے میں سفر میں ہوں وہم و گماں کے ساتھ
یہ راستہ تمام فریبِ نظر نہ ہو

خیر اتنا تو ہوا حاصلِ سوزِ دروں
آئینہ جان گیا آپ کو حیراں کرنا

حضرت نیرؔ غزل کی رمزیت و اشاریت کے ادا شناس ہیں۔ قدم قدم پر نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں کا جادو جگاتے ہیں۔ ایمائیت و رمزیت کو وہ غزل ہی نہیں زندگی اور عشق کا بھی حاصل قرار دیتے ہیں ؎

ہے زندگی غزل کی طرح جانِ رمزیات
اس کو نفس نفس پہ ہے تفسیر سے گریز
عشق کو پہنائیے رمز و کنایہ کا لباس
کھل کے ان سے نامہ و پیغام ہے زحمت طلب

اسی کنایہ پسندی اور ایمائیت کا فیض ہے کہ وہ اردو غزل کو اس طرح کے اشعار عطا کرتے ہیں ؎

صبح تک مچلا جبینِ حسن پر بن کر شکن
ہائے وہ نالہ کہ جس کو نارسا کہنا پڑا

اللہ رے چشمِ تر کا شبِ غم پہ اعتبار
ڈوبا نہ آفتاب چراغاں ابھی سے ہے

شریکِ انجمن میری پریشاں خاطری بھی تھی
نہ جانے کیا کہا تم نے نہ جانے کیا سنا میں نے

اک عجب حیرت ہے یہ جبیں کہاں رکھ دی
ہر صنم کے چہرے پر داوری جھلکتی ہے

جب بھی جھک گئیں نظریں ڈھل گئے صنم خانے
شرمگیں نگاہوں سے آزری جھلکتی ہے

غزل ایک ایسا پیچیدہ آرٹ ہے جو فن کار سے بیک وقت کئی طرح کی مہارتوں کا طالب ہوتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے بڑا وصف جو غزل کے شاعر کے لئے لازمی ہے وہ ہے ذکاوت اور ذہانت جس کے بغیر شوخی و ظرافت ہو یا نفاست و لطافت، الفاظ و تراکیب کی میناکاری ہو یا رمز و کنایہ کی دھوپ چھاؤں، سب بے لطف ہو جاتی ہے۔ غالبؔ نے اپنی فطری شوخی اور ذکاوت کی مدد سے اردو غزل کو بے کراں وسعت و آفاقیت عطا کی تھی اور اسے جرأت، انشاؔ و رنگینؔ کی مبتذل شوخی اور لفاظی سے اوپر اٹھا کر ایک مقام شائستگی و وقار تک پہونچا دیا تھا لیکن بذلہ سنجی و ظرافت سے اسے محروم نہیں ہونے دیا۔ حضرت نیرؔ کے کلام میں بھی شوخی و ظرافت کی جوئے نرم سیر موجود ہے۔ ان کے طنز کی آنچ دھیمی و معتدل ہے جو تہذیب کے پردے سے چھن چھن کر باہر آتی ہے۔ نیرؔ شادؔ عارفی کی اس جرأتِ گفتار یا کرختگی کے قائل نہیں ؎

ہے تو احمق چونکہ عالی شان کاشانے میں ہر
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

نیر کے خندہ زیرلب کا لطف ان کے ان اشعار سے حاصل کیجیے ؎

مدتوں دیکھا کیے اعجازِ مرہم کا اثر
چارہ گر اپنی جگہ زخمِ جگر اپنی جگہ

ان دنوں کو جب جاناں کی مخالف ہو ہوا
میری خاکسترِ دل بھی کہیں برباد نہ ہو

کچھ بس و پیش ہے نیر کو جو چپ ہے ورنہ
عندلیب اور گلستاں کا سبق یاد نہ ہو

جب فصلِ بہار آئی کیا چاک گریباں
دیوانہ بھی اس کام میں ہشیار ہو جیسے

یہ لذتِ دردر اور کہاں فکرِ مداوا
احساں ہی مسیحا کا اٹھانا ہو تو چلیے

جاتے نہ کبھی محفلِ اغیار میں نیر
لیکن یہی رضائے زمانہ ہو تو چلیے

کیا بتائیں بے خودی میں ہم کو کیا کہنا پڑا
جام کو تقدیر ساقی کو خدا کہنا پڑا

اک فسانہ بن گئی ساری حدیثِ احتیاط
وہ مقام آیا کہ ہر بت کو خدا کہنا پڑا

کچھ بارگاہِ ناز کے آئین بھی ہیں سخت
کچھ ہے مری دعا کو بھی تاثیر سے گریز

حضرت نیر ردیفوں کے معاملہ میں اپنی طبع دشوار پسند سے ہمیں حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ انشاؔ، شاہ نصیرؔ اور ظفرؔ کی طرح طویل ردیفوں کے تو عادی نہیں لیکن کبھی کبھی اس وادی میں ضرور جا نکلتے ہیں اور کمالِ فن کاری کے ساتھ اس سنگلاخ راستے کو طے کرتے ہیں۔ پھر بھی کہیں شعر برائے شعر یا ردیف برائے ردیف کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے اشعار کی معنویت و آہنگ دونوں کے معاملہ میں اپنی ردیفوں سے پوری مدد لیتے ہیں۔ طویل ردیفیں عام طور پر بقول ڈاکٹر عبدالحق غزل کے مزاج کے خلاف رہی ہیں اور اکثر تغزل کی طبع نازک پر گراں ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن حضرتِ نیر اس فن کاری سے اس وادی میں بھی سبک خرامی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ کسی طرح کی غیر آہنگی پیدا نہیں ہوتی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ بارِ گراں جن و ملک سے نہ اٹھے گا
کونین میں ہوں جتنے بھی غم لاؤ ادھر لاؤ

ہر گام پہ لغزش بھی ہے ہر جام پہ ضد بھی
یہ شیوۂ اربابِ خمستاں ہی غلط ہے

آؤ اے نیر ذرا دیکھیں تو کیا ہے میکدہ
ہم خدا کے گھر سے آئے ہیں یہاں پہلے پہل

جب بات چھڑی ان کی مسیحا نفسی کی
ہر زخمِ جگر دل میں ہنسا کوئی نہ بولا

تشریح کسی نے بھی نہ کی چینِ جبیں کی
پوچھا کیے ہم اپنی خطا کوئی نہ بولا

حسن خود کرتا ہے کلیوں کو تبسم آشنا
آپ اس کو شوخیِ بادِ صبا کہہ لیجیے

حضرت نیر کی شاعری میں بے بسی، انفعالیت اور افسردگی کی جھلک

نہیں ملتی۔ وہ ایک خوش طبع، خوش مزاج انسان ہیں اور زندگی کے بڑے سے بڑے غم کو بھی مسکراتے ہوئے جھیلنے کے عادی نظر آتے ہیں۔ حکیم مشرق علامہ اقبال کی طرح وہ بھی حرکت و عمل کا پیغام دیتے ہیں ؎

نیّر سکوت موت ہے، طوفاں ہے زندگی
وہ موج ہی نہیں ہے جو آشفتہ سر نہ ہو

وہ مسلسل سفر اور گردش مدام کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں ؎

راس آئی ہمیں دیوانگیٔ شوقِ سفر
خضر بیدار ہوا جادۂ صحرا چمکا

زبان و فن کے معاملے میں نیّر ماضی کے تجربات سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور شعر و ادب کے مسلمہ اصولوں سے فقط جدّت پیدا کرنے کی خاطر انحراف گوارا نہیں کرتے اس لیے کہ اس طرح کی بے ہنگم جدّت طرازی اکثر آدمی کی صورت و سیرت دونوں کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے الفاظ کے صوتی آہنگ کا ان کو پوری طرح شعور ہے۔ وہ اپنی تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے اور الفاظ کے صوتی اثرات سے کام لے کر جذبات و احساسات کی چلتی پھرتی تصویریں آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کرتے ہیں۔ ان کی فنی استعداد قابل داد ہے اور جب وہ اس میں اپنی بصیرت، شائستگی ذوق اور وسعتِ نگاہ کو شامل کر دیتے ہیں تو اس طرح کے اشعار ان کی کارگاہ فن سے ڈھل کر سامنے آتے ہیں ؎

دے گئی تازہ جراحت تری پیماں شکنی
یک بیک جیسے کسی زخم کا ٹانکا ٹوٹا

جنوں کے موڑ پہ پہونچا ہے کاروانِ حیات
متاعِ دل جو لیے ہے وہ ہوشیار چلے

نہ جانے کتنے ساغر منتظر ہیں چشم ساقی کے
ہم اک ہی جام کو تقدیر میخانہ نہیں کہتے

اس دور میں جب کہ نئے نئے فنی تجربات اور فکری اجتہادات کا ایک سیلِ رواں ٹھاٹھیں مار رہا ہے، فکر و تخلیق کے جادۂ قدیم پر بچتے بچاتے، زبان و فن کے شیشۂ نازک کی حفاظت کرتے کراتے، تاثر انگیز پیرائے میں انسانی جذبات کے مختلف پہلوؤں کی دل کش ترجمانی نیّر صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ ہم نئے دور کے تقاضوں سے ان کو بیگانہ قرار دیں اور مجاز کے الفاظ میں یہ تبصرہ کر بیٹھیں ؎

زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں
یہ نوّاب جعفر علی خاں اثر ہیں

یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں روح کے موجودہ کرب، نئی نسل کی جھنجھلاہٹ و احساس محرومی، اقدار و عقائد کے بارے میں اس مشینی دور کے تھکے ہارے انسان کا معاندانہ رویہ، نظریہ دتعطب العین سے اس کی وحشت اور نئی علامتوں اور جدید ترین استعاروں میں اپنی دل شکستگی کے اظہار کی اس کی کوششوں کی کوئی جھلک حضرت نیّر کے کلام میں نہ دیکھ سکیں تو اس میں قصور ان کا نہیں بلکہ خود ہماری فہم کا قصور ہے۔ حضرت نیّر اسی صدی کے نصف اول سے تعلق رکھنے والی اس نسل کے چشم و چراغ تھے جو سب کچھ کھو دینے کے باوجود اپنے دامن میں ایک رچی ہوئی تہذیب، ایک توانا ثقافت، اقدار و عقائد کا ایک مستحکم نظام رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے کلام میں عہد جدید کی نفسیاتی پیچیدگیوں، جذباتی انتشار اور روحانی کرب کا انعکاس نظر نہیں آتا یہ سچ ہے کہ وہ بھی اسی صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں سانس لے رہے تھے اور اپنے گرد و پیش کے اسی ماحول سے ان کا بھی سابقہ تھا جس نے ہمارے جدید شعراء کے ایک گروہ کو از خود رفتہ بنا رکھا تھا لیکن انھیں یہ اعتماد تھا کہ اس جدید تر دور کے مسائل اسی وقت حل ہوں گے جب وہ ماضی کی درخشاں اقدار کی بازیافت کی طرف مڑے گا اور بہر حال وہ وقت آ کر ہی رہے گا جب اقدار کی شکست و ریخت کا مرثیہ لکھنے والے اقدار کی بازیافت کی بات کریں گے۔ حضرت نیّر مغربی معاشرے کی شکست و ریخت سے جو کیفیات وہاں کی جدید نسلوں میں پیدا ہو رہی ہیں ان کو درآمد کر کے خود اپنے اوپر طاری کرنے کو آمادہ نہ تھے یا اس طرح کے کرب و اضطراب کو برائے شعر گفتن اپنے اوپر مسلط کرنے میں انھیں لطف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

غرض نیّر سلطان پوری کے مجموعۂ کلام "ریزۂ مینا" سے جوان کی

(باقی ص ۸۲)

بھارت کو ایکتا کی ضرورت ہے دوستو

جو کہہ رہا ہوں ایک حقیقت ہے دوستو
یہ ایکتا فرازِ محبت ہے دوستو
یہ سربلندیٔ بشریت ہے دوستو
جو خرچ سے نہ کم ہو وہ دولت ہے دوستو
اور ایکتا میں دیش کی عزت ہے دوستو
بھارت کو ایکتا کی ضرورت ہے دوستو

اپنے وطن کو ہم نے سنوارا ہے ساتھیو
یہ ہم کو زندگی سے بھی پیارا ہے ساتھیو
ہم دیش کے ہیں دیش ہمارا ہے ساتھیو
انسانیت نے ہم کو پکارا ہے ساتھیو
باپو کی بھی یہی تو نصیحت ہے دوستو
بھارت کو ایکتا کی ضرورت ہے دوستو

ہر گام پر نشانِ قدم چھوڑتے چلو
ٹوٹے ہوئے دلوں کو ذرا جوڑتے چلو
طوفانِ ظلم و جور کا منھ موڑتے چلو
ظالم کی تیغ و تیر و کماں توڑتے چلو
اس دور کی یہی تو ضرورت ہے دوستو
بھارت کو ایکتا کی ضرورت ہے دوستو

آپس کی دشمنی کو مٹاؤ اٹھو اٹھو
بھارت سے بھکمری کو مٹاؤ اٹھو اٹھو
جو سو رہے ہیں ان کو جگاؤ اٹھو اٹھو
ہندوستاں کو خلد بناؤ اٹھو اٹھو
بغض و حسد سے فخرؔ کو نفرت ہے دوستو
بھارت کو ایکتا کی ضرورت ہے دوستو

□□

فخرؔ دولوی
۲۹، نعل بند ٹولہ
برن تلہ ۔ الہ آباد

شکر ادا کرکے سوجاؤ

سونے والی راتیں ہوتی ہی کتنی ہیں
شکر ادا کرکے سو جاؤ
سو جاؤ
اور خواب نگر میں دیر تلک گلگشت کرو
جاگ کے بھی
خوابوں کا تسلسل جاری رکھو
مُندے پپوٹوں پر سورج کی سینک تلک
خوابوں کا تسلسل جاری رکھو

راشد جمال فاروقی
سی ۱۵۲۸، آئی ڈی پی ایل
ویر بھدر (رشی کیش) دہرہ دون

غیاث ادیب
نزد دروپدی کنیا انٹر کالج۔ قلعہ۔ رائے بریلی

حسرت اور احیاءِ غزل

ادیب، شاعر، مفکر، نقاد، صوفی، مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، اُردو ادب میں مختلف اوصاف کے حامل اور بیک وقت متضاد کمالات کا نمونہ ہیں۔ یعنی حسرت اگر عاشق ہیں تو بھی شاعر ہیں، صوفی ہیں تو بھی شاعر ہیں، قوم پرست ہیں تو بھی شاعر ہیں، وطن پرست ہیں تو بھی شاعر ہیں، سرگرم سیاست ہیں تو بھی شاعر، پابند سلاسل ہیں تو بھی شاعر، قید ہیں تو بھی شاعر اور آزاد ہیں تو بھی شاعر۔

جہاں تک حسرت کی غزل گوئی کے جائزہ کا سوال ہے، اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل اور معیارِ غزل پر ایک نگاہ ڈالی جائے جو کہ موصوف کی شاعری سے قبل ادب کا ایک جزو لاینفک بن چکی تھی۔

ڈاکٹر اشٹین گاس کی نگاہ میں "غزل" کے معنی سوت کاتنے یا بٹنے کے ہیں۔ یعنی جس طرح متعدد سوت کے تار یکجا کر کے بٹ کر ایک ڈوری کی صورت میں اکٹھا کر دیئے جاتے ہیں اسی طرح غزل مختلف مضامین کا مرقع ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار مختلف موضوعات کو سموئے ہوئے دعوتِ فکر دیتے ہیں مگر ضرورت ادراک کی ہے۔

اُردو لغات میں غزل کے معنی ہیں وہ کلام جس میں عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف اور عشق و عاشقی کا تذکرہ ہو۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ عرب میں ایک شخص جس کا نام غزال تھا، اس نے اپنی تمام عمر حسن و عشق کی تعریف، رند مشربی و عاشقی میں گزاری اور ہمیشہ عاشقانہ شعر گوئی اس کا مشغلہ رہا۔ اس لیے وہ اشعار جن میں حسن و عشق کا ذکر ملتا ہو انھیں غزل کا نام دے دیا گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں :۔

"غزل انسانی دل کے لطیف جذبات اور کیفیات کے لیے مخصوص ہے جس کے اظہار میں تخیل کی باطنی توجیہ و تعبیر درکار ہے۔ تخیل ہی جذبہ کا راز دار ہے غرض کہ یوں کہیے کہ غزل جذبہ کا بیان ہے تخیل کی زبانی۔" [1]

ڈاکٹر رفیق حسین کا خیال ہے :۔

"غزل کے الفاظ ڈھکے مندے نہ جانے کیا سے کیا بات پیدا کر دیتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے غزل کی جامعیت اور ہمہ گیری مسلم ہے اسی وجہ سے ہر دل عزیز ہے۔ باوجود آسان ہونے کے مشکل ہے، باوجود مختصر ہونے کے وسیع ہے۔ جذبات نگاری، فطرت نگاری، صداقت پسندی، مصوری، تصوف، فلسفہ، انسانیت و اخلاقیات کے خشک مسائل سب کچھ اس میں ہے اچھے شاعروں نے اچھی غزل کہہ کر اسے عام پسند کیا، برے شاعروں نے اسے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جنھوں نے غزل کے اصولوں سے لاپروائی نہیں برتی وہ بے شک شاعر ہوئے جب جو بہکے وہ خود ہی بھٹکے غزل اپنی جگہ رہی۔" [2]

پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں :۔

"غزل صنفِ سخن ہی نہیں معیارِ سخن بھی ہے غزل غزل ہونے کے علاوہ ایک نقطۂ نظر، ایک اندازِ فکر

ایک اصول تلخیص ایک سلیقۂ اظہار بھی ہے اردو شعر و
ادب میں غزل کا درجہ ام الاسالیب کا ہے۔"

ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق عشق کا جذبہ ہر دل میں پایا جاتا ہے جو کہ Abstract ہے جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جذبۂ عشق خلوص و ایثار کا آئینہ دار ہے اور ہر دل پر اپنا اثر کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

"Poetry comes from heart
and goes into heart"

حسرت نے بھی کہا ہے

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

غزل میں ایک ہمہ گیر جذباتی اثر ہوتا ہے اسی وجہ سے ہر فرد اس کا شیدائی ہے کیونکہ اس سے محفلوں میں گرمی، زندگی میں سوز و ساز دل میں امنگیں اور ولولے، آداب زندگی، لحاظ محفل کا درس اور راز و نیاز حیات کا آئینہ سامنے آتا ہے۔ اسی لیے رندوں سے لے کر صوفیوں تک اور مردوں و عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور عالموں سے لے کر جاہلوں تک بلا قید مذہب و ملت دنیا کے طول و عرض میں اسے رسائی و مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔

غزل کی مقبولیت کا دوسرا راز اس کا اختصار و ایجاز ہے۔ مصوری جذبات نگاری، اخلاقی تعلیم، پند و نصائح، مناظر فطرت کی جھلک، عشقیہ شاعری کی صداقت سبب عام پسندی ہے۔ اس میں عشق کے لطیف کیف آور، پاکیزہ واردات اور آفاقی جذبات کیفیات کو اشارے کنایوں، استعاروں اور تشبیہوں سے صحیح و سلیس و شیریں و شستہ و شائستہ زبان میں نئے اور اچھوتے انداز میں نظم کیا جاتا ہے۔

غزل معیار ہے تہذیب کی، معاشرہ کی، سماج کی، شرافت کی کلچر کی۔ غرض کہ کسی بھی دور کے عطر کو حاصل کرنے کے لیے اس دور کی غزل کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اسی لئے غزل کو معیاری ہونا چاہیے اس میں صحیح و صادق جذبہ ہو، جولانیِ فکر ہو، اہم و بلیغ نظریات و افکار جامعیت اور ہمہ گیری کے ساتھ نظم ہونا چاہیے۔

معشوق کے جسمانی اوصاف کی تعریف اور ہرجائی و بازاری معشوق کے ذکر جیسے رکیک خیالات سے برتر ہونا چاہیے۔ غزل میں عشق و محبت کی شیفتگی، فریفتگی اور سوز و گداز کا بھی لحاظ بخوبی رکھنا چاہیے۔

اردو غزل امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی، شاہ آبرو، آرزو، حاتم سے ہوتی ہوئی درد، سوز، سودا، میر تقی میر کے عہد تک پہونچی میر کا زمانہ اردو غزل کا عہد زریں کہلاتا ہے کیونکہ اس دور میں اردو غزل باعتبار مضامین و زبان دونوں اس قدر نکھاری اور سنواری گئی کہ فارسی غزل کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ اردو غزل کی انفرادیت کی تعمیر و تشکیل اسی عہد میں ہوئی۔ ایہام گوئی کو مسترد کیا گیا اور اس میں عشق و عاشقی کے مختلف کیفیات و احساسات، حیات و کائنات کے مسائل، سماجی و سیاسی حالات کی عکاسی کر کے اس کے دائرے کو وسیع کیا گیا۔ گو کہ غزل کو ایک ایسا پیمانہ بنا دیا جس کو سامنے رکھ کر معیار ادب و تاریخ، تہذیب و تمدن و معاشرہ اور کلچر کو دیکھا و سمجھا جا سکتا ہے۔

میر سے لے کر ہمارے زمانے تک اردو غزل روایات و تجربات سے گزرتی رہی جس کی تاریخ دراصل ہماری پوری تہذیبی تاریخ کا پرتو ہے۔ چنانچہ غزل کا مطالعہ اس تہذیبی و ثقافتی ورثہ کا مطالعہ ہے جو ہمیں اسلاف سے ملتا ہے۔ اس غزل میں ہمیں نادر شاہ ابدالی کے حملوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میں دلی کی تباہی و بربادی ارباب کمال کی ناقدری اور زمانے کی سفلہ پروری کا نقشہ نظر آتا ہے یا پھر اس روحانیت کا پرتو نظر آتا ہے جو صوفیوں کی خانقاہوں اور درویشوں کے کنج عافیت میں ملتی ہے۔ یہ میر سودا، میر حسن کا دور ہے، جسے دہلی کا دبستان شاعری کہا جاتا ہے لیکن جب زمانہ ایک ورق پلٹتا ہے تو غزل پھر ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ اس دور کی تصویریں انشا، جرأت، مصحفی اور رنگین سے لے کر ناسخ و آتش کے یہاں ملتی ہیں۔

اس دور کی غزل آفاقیت کے ان عناصر سے محروم ہے جو میر کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی جگہ سطحی جذبات بلکہ محض وقتی ہیجانات نے لے لی۔ عشق و عاشقی کی پاکیزہ اور لطیف داستانوں کی جگہ معاملہ بندی اور چوما چاٹی آ گئی۔ ناسخ اور امانت کی غزلوں کو پڑھ کر غزل کے زوال کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں غزل اور نظم کی محاذ آرائی شروع ہوئی۔ لاہور کا تاریخی مناظرہ ایک نئے دور کا نقیب ہے جس کے علمبردار آزاد اور حالی ہیں۔ انھوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تھا اور محسوس کیا تھا کہ غزل زندگی کی حقیقت سے دور ہوتی جارہی ہے۔ حالی اردو غزل سے بہت بیزار رہے اور دل کھول کر اس پر تنقید کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو غزل کے خلاف پورا محاذ تیار ہوگیا اور غزل کی قدیم روایات کے علمبردار ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگے اور جو باقی بچے ان کے نغموں کی آواز مدھم ہوگئی۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو غزل کے دم نزع کا یقین ہونے لگا۔

لکھنؤ والوں نے عشق حقیقی پر عشق مجازی کو ترجیح دے کر عشق مجازی کے مضامین نظم کیے۔ عشق مجازی کی منزل اگر عشقِ حقیقی نہ ہو تو یہ افسوسناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ چونکہ لکھنوی شعراء نے شعر و شاعری کی دنیا میں ہوسناکی اور عشق کے درمیان حد فاصل قائم کرنا ضروری نہ سمجھا، نتیجۃً لکھنوی شاعری معاملہ بندی اور اس کے متعلقات پر گامزن رہی اور ان کیفیات کے بیان کرنے کے بجائے کہ جن کا تعلق حسن کے اثر سے دل پر گزرنے والی کیفیات سے ہو، شعراء لکھنؤ محض گداب حسن اور خارجی متعلقات میں پھنس کر رہ گئے اور غزل میں (حیا و شرم سے بالاتر) ان آلودگیوں کو فروغ ملا جو کشاں کشاں زوال کی طرف لے چلیں۔ مندرجہ ذیل اشعار بطور مثال درج کیے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ غزل کا معیار کتنا گر چکا تھا۔ بازاری زبان و بیان اور عامیانہ اشعار سے وہ جذبات فروغ نہیں پاتے جن کا تعلق حسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے ہے بلکہ نفسانی خواہشات برانگیختہ ہوتی ہیں اور حیوانی جذبات غالب ہوتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عاشق کے کام آتی ہے اکثر یہ وصل میں
غیروں کے منہ میں دیکھے نہ کیجے زبان خراب

——— امانت

جوبن ابھار پر ہے جمن کو نہ جائیے
بادِ صبا لگائے گی چوری انار کی ——— امیر

اکیلے گھر میں جو میں اس سے دوڑ کر لپٹا
کہا کہ ہٹ در و دیوار و بام دیکھتے ہیں

——— امانت

جلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مرے نکلے
پریشاں باندھ کر جوڑا دوپٹہ اوڑھ کر الٹا

——— امیر

ذوق پر گراں گزرنے والے ان اشعار سے جہاں اس دور کے ادب کی نشاندہی ہوتی ہے وہیں پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ شعراء لکھنؤ معاملہ بندی میں تقلید و تتبع کے سبب تقریباً سبھی ایک حمام میں برہنہ ہیں بلکہ بعض شعراء تو بدذوقی کی حد سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالیں بار خاطر تو ضرور ہیں مگر کیا کیا جائے یہ بھی ایک دور کی یادگار ہیں۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

——— جرأت

چھپتا نہیں چھپائے سے عالم ابھار کا
آنچل کی تہ سے دیکھو نمودار کیا ہوا

——— ریاض

ڈر گئے چیخ اٹھے بات تھی کیا کہیے تو
کیا شبِ وصل کسی کا کوئی ارماں نکلا

——— ریاض

اس لعنت سے دہلی کے شعراء بھی نہ بچ سکے۔ داغ کی شاعری کے سلسلے میں ایک ناقد کا خیال ہے کہ داغ کی شاعری میں عریانیت و عیاشی نمایاں ہے۔ زبان بازاری ہے بیان عامیانہ ہے۔ داغ کا معشوق بھی بازاری ہے ان کے نزدیک عشق نفس پرستی کا نام ہے ——— ملاحظہ ہو ؎

وصل کا وعدہ اشارے میں کہیں ہوتا ہے
میں ترے سر کی قسم کچھ نہ مری جاں سمجھا

——— داغ

چھوڑوں گا میں نہ ہاتھ چلے آؤ ساتھ ساتھ
نازک کلائی دکھتی ہے تو آستیں سہی

——— داغ

غزل کا موضوع عشق ہے جس میں عشقیہ مضامین ہوتے ہیں اور محبوب کا ذکر ہوتا ہے لیکن مخاطب انسان ہی ہوتا ہے۔ انسان کی لطیف ترین جنس عورت ہے جو شرافت کی آئینہ دار ہے کلچر کی یادگار ہے، تہذیب و تمدن معاشرہ و سماج کی روح ہے اور جس آدم کا وہ پھول ہے جس کی خوشبو شام غزل سے ملتی ہے۔ آداب تہذیب اخلاق اجازت نہیں دیتے تھے کہ اس کا ذکر برسر محفل ہو اس لئے غزل نے بطور علامت اپنا مخاطب مرد کو قرار دیا تھا تاکہ شاعری دائرہ تہذیب میں بھی رہے اور محبوب کے لیے اپنے جذبات کا ذریعہ اظہار بھی ہو سکے۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو ؂

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

زمانہ ترقی کی طرف گامزن ہوا تو شعراء نے اپنا تخاطب بھی تبدیل کیا۔ مرد کے بجائے عورت سے مخاطب ہونے پر شعراء اس کی کنگھی چوٹی، ناز و ادا، عارض و رخسار تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ غرض کہ شعراء اپنی صلاحیتوں کا استعمال ایسا کر سکے جن سے معاشرہ اور تمدن کو فروغ ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جوہر اصلی ماضی کے قبرستان میں خاک چاٹتے رہے اور غزل اپنی حالت زار پر اشک باری کرتی رہی۔

حسرت سے قبل اگر لکھنوی معاشرے کا مطالعہ کیا جائے اور لکھنؤ کی تہذیبی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت مرثیہ گوئی لکھنوی تہذیب کا اعلیٰ معیار قرار پا گئی تھی۔ چونکہ امراء و روساء کی ادبی نشستوں اور محافل و مجالس وغیرہ میں مرثیہ کو ایک خاص مقام حاصل تھا اس وجہ سے شعراء کا رجحان بھی غزل گوئی سے مرثیہ گوئی کی طرف کافی حد تک مبذول ہو گیا تھا۔ مرثیے کے اثرات کی بنا پر رنج و غم کی وہی علامات غزل میں شامل ہونے لگیں جو مرثیہ میں رائج تھیں۔ اس وجہ سے غزل کے اپنے مخصوص انداز میں حد درجہ تبدیلی آگئی۔

غرض کہ مندرجہ بالا مثالوں اور دلائل کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسرت سے قبل آزاد و حالی کی نظم گوئی کی تحریک لکھنوی شعراء کی معاملہ بندی، ابتذال، رعایت لفظی کا غیر معیاری ہونا نیز سماجی بندشوں کی وجہ سے امرد پرستی اور لکھنؤ کے رؤسا و امراء کے مرثیہ گوئی کے رجحانات کی بنا پر غزل گوئی اپنے معیار سے کافی گر چکی تھی اور روایتی صنف سخن بن کر رہ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اسی طرز کے ساتھ غیر معیاری اشعار غزل کی صورت میں کچھ عرصہ اور جاری رہتے تو غالباً غزل کی روح بھی پرواز کر جاتی اور غزل غزل کہلانے کے لائق بھی نہ رہ جاتی اور مذکورہ عیوب و کراہت کی بنا پر غزل ادب کی متروک صنف سخن قرار پاجاتی اور موجودہ دور میں جو اہمیت و مقبولیت اسے حاصل ہے ہرگز یہ عروج اسے حاصل نہ ہوتا۔

اب ایک نگاہ اس پہلو پر بھی ڈال لی جائے کہ غزل جو کہ تقریباً مرحومیت یا مردودیت کے دہانے پر پہونچ گئی تھی تو عالم نزع میں اس کا مسیحا کون تھا جس نے اس میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ بہتر ہوگا کہ کچھ ناقدین ادب کے نظریوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے تاکہ بآسانی صحیح نتیجے تک پہونچ سکیں۔ اس سلسلے میں صف اول میں حسرت کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنی کاوشوں سے غزل کا احیاء کیا اور اپنی دانشمندی و ذہنی وسعتوں کا استعمال اس ڈھنگ سے کرتے رہے کہ غزل کے دھارے کا رخ ہی بدل گیا۔

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:۔

"حسرت کے عصری شعراء میں تین شعراء کو ہی شاعر سمجھتا ہوں۔ حسرت۔ فانی۔ فراق۔ یہی حضرات غزل کے لیے پیدا ہوئے ہیں لیکن موجودہ شعراء متقدمین میں حسرت ایک امتیازی شخصیت کے حامل ہیں۔"

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

"غزل میں جو کچھ نئی تحریک کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کے موجد حسرت ہیں اور اردو غزل میں نئی نسل کی ابتدا حسرت سے ہی ہوتی ہے۔"

پروفیسر حامد حسین رقمطراز ہیں :-

" حسرت کے کلام میں صحیح تغزل جو اصلاً دہلی کا طرز ہے ، نہایت اعلیٰ ہے ۔ صحیح جذبات ، واردات جوشش و شوق ، لطافت بیان ، جدت ، اسلوب سبھی نہایت دلکش اور موثر شکل میں موجود ہے ۔"

نیاز فتحپوری کی تحریر ملاحظہ ہو :-

" حسرت کی شاعری قطعاً ادب برائے زندگی ہے ۔ ان کے یہاں محبت کا بیان ہے لیکن عشق کی شکست خوردگی سے بالکل پاک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی شاعری ایک خاص کلچر کی حامل ہے جو ہمارے مشرقی ماحول اور خاص شائستہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے ۔ ۔ ۔ جذبات کے لحاظ سے ان کی شاعری ہوسناکی اور ابتذال سے پاک ہے اور بڑی حد تک خودداری لیے ہوئے ہے ۔"

پروفیسر احتشام حسین رقمطراز ہیں :

" حسرت موجودہ دور کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے ہیں اور اردو شاعری کے مسلسل ارتقاء میں ان کا ایک خاص مقام ہے ۔"

مندرجہ بالا ناقدین کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کے یہاں غزل کی رکاکت و کراہت اور ابتذال سے احتراز و اجتناب کیا گیا ہے اور حیات آمیزی و آموزی کا عنصر ان کی غزلوں میں نمایاں ہے ۔ سنجیدگی ، درد ، اثر ، سوز و گداز ، الفت ، محبت ، خلوص و نیاز طہارت و پاکیزگی ، انسانیت و روحانیت ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔

غزلیات حسرت نے غزل کو حیات تازہ بخش کر زندگی سے منسلک کر دیا

حسرت نے یوں تو متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن انہوں نے غزل کے علاوہ کسی اور صنف سخن کو جولانگاہ بنانا مناسب نہیں سمجھا چونکہ غزل میں محبت کے مضامین خاص ہوتے ہیں اور حسرت اس کی ترجمانی کا ملکہ بھی رکھتے تھے ـــــ اسی لیے کہتے ہیں ؎

شعر حسرت نے سارے کھول دیے
عشق بازی کے عقدہ ہائے ادق

کلام حسرت کے معیار کا اندازہ کرنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ انہوں نے کن اساتذہ سے استفادہ کیا ہے کیونکہ اگر شاگرد باصلاحیت ہے تو اچھے اساتذہ کی سرپرستی کم از کم اپنی جیسی صلاحیتوں کا مالک تو بنا ہی دیتی ہے ۔ بالخصوص اعلیٰ ذہنی بھی اساتذہ کی کد و کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ یوں کہا جائے کہ صنعت سے صانع کا پتہ چلتا ہے ۔ آیئے دیکھیں کہ حسرت کی اعلیٰ ذہنی اور معراج تخیل پر کن اساتذہ کی علمی جولانیوں کے نقش ثبت ہیں ۔ متعدد مقطعوں میں حسرت نے اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے جو کہ سب کے سب بلند پایہ سمجھے جاتے ہیں ؎

پیرو تسلیم ہوں شیدائے انداز نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعار حسرت خیز کا

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت اثر و حسن بیاں کی رونق

طرز مومن میں مرحبا حسرت
تری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

لہٰذا میر کا سوز و گداز ، نسیم کی شیرینیٔ کلام ، مومن کے تخیل کی معراج اور غالب کی جدت کا حسرت کے کلام میں پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں عشق حیات انسانی کا سرمایہ ہے اور غزل اس کی ترجمان ہے ۔

حسرت کی غزلیں بھی روایتی نہیں ہیں بلکہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے فن سے ذہنوں میں ایسی تصویر ابھار دے کہ حقیقت معلوم ہونے لگے۔ حسرت کی غزل ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے البم کی ورق گردانی کے ساتھ تصویر بھی حرکت کر رہی ہے۔ گویا چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ یا دامنِ حقیقت کی ایک ایک تصویر نظر کے سامنے لے آتی ہے اور ایسی لطیف مطابقت محسوس کراتی ہے کہ سامع غزل میں ایسا مدہوش ہو جاتا ہے کہ خود کو حسرت کے ساتھ چلنے پر مجبور پاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

حسرت کی یہ غزل پڑھ کر عشق کے مشاہدے کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ عاشق و محبوب کے حقیقی، پاکیزہ جذبات، حرکات و سکنات حسرت کی شاعری کا منفرد پہلو ہے ان کا محبوب حساس ہے درد جگر محسوس کرتا ہے اپنے عاشق کو منا کر روٹھ جانے کا انداز بھی رکھتا ہے۔ چپکے چپکے آنسو بھی بہاتا ہے، چوری چھپے ملنے بھی آتا ہے کبھی دوپٹے سے منہ چھپاتا ہے تو عالمِ تنہائی میں بیباکی سے آنکھیں بھی لڑاتا ہے غرضکہ ان کے محبوب میں زندگی کی فطری علامت ملتی ہے۔ شعرائے متقدمین کے محبوب کی طرح نہ تو وہ بے وفا ہے اور نہ ہی طوائفوں کے کوٹھے کی زینت۔ حسرت کا محبوب شرم و حیا کا پیکر بھی ہے اور عشق بھی کرتا ہے ان کی غزل میں مہذب سماج کی ترجمانی ملتی ہے نیز عشق کی لطیف و پاکیزہ جذبات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کی غزل آج ہر گھر میں سنی اور پڑھی جاتی ہے۔

حسرت کے اشعار سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شاعری تنقیدِ حیات ہے اس لیے وہ دنیا سے اجتناب کر کے عالمِ بالا کی جانب مائل پرواز نہیں ہوئے۔ ملاحظہ ہو ؎

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

راہ میں ملئے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جایئے

حسرت کی کیفیت انتظار کی منظر کشی کتنی حقیقی ہے ؎

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال
کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

میر اردو غزل کے شہنشاہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے نمایاں جوہر شدتِ جذبات، سادگیٔ بیان اور سوز و گداز کی لے ہے میر کی انفرادیت انھیں سے مختص ہے جس کی مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ یہی خصوصیت حسرت کے یہاں بھی اسی رنگ و آہنگ سے پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عشق میں جان سے گزر جائیں
اب یہی تمنا میں ہے کہ مر جائیں

جامہ زیبی نہ پوچھیے ان کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائیں

میر سے مماثلت ہونے میں حسرت کے ذاتی واقعات اور حادثات کا بھی بڑا دخل ہے۔ حسرت کے یہاں الم پرستی بھی ایسی ہے کہ اسے صرف لذت سمجھ کر گوارہ ہی نہیں کرتے بلکہ طلب کرتے ہیں ؎

تری نوازشِ پیہم سے ڈر یہی ہے کہ دل
کچھ اور بھی نہ کہیں ناصبور بن جائے

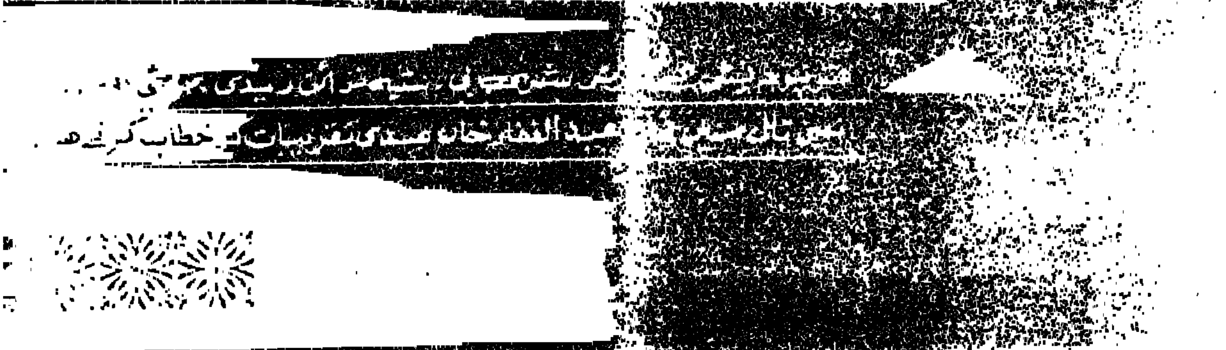
عاشق محبوب کی نوازش کے لیے تڑپتا ہے، بے قرار ہوتا ہے لیکن حسرت کے یہاں نوازشِ پیہم بھی سامانِ ناصبوری ہے کیونکہ ان کا دل نوازشِ پیہم سے سکون پانے کے بجائے بے قرار ہوتا ہے ایسی صورت میں ناصبور ہونے کے اندیشے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو ؎

ترے خیال سے باتیں ہزار ہم کرتے
غمِ فراق کو یوں خوش گوار ہم کرتے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو غزل کا خمیر عشق ہی سے



[illegible] زیدی [illegible]
[illegible] عبداللہ خان [illegible] تقریبات سے خطاب کرتے ہوئے





[illegible] شری کلیان سنگھ ۱۰ر مئی ۱۹۹۲ء کو اتر پردیش قانونی امداد مشاورتی بورڈ
کی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ [illegible] مئی [illegible]ء کو بجٹ بھون لکھنؤ میں ڈویژنل کمشنروں کو خطاب کرتے ہوئے

[illegible] مئی ۱۹۹۲ء کو
[illegible] تے ہوئے

हिन्दी पत्रकारिता दिवस समारोह

यू.पी. प्रेस [illegible] ला सूचना कार्यालय, लखनऊ

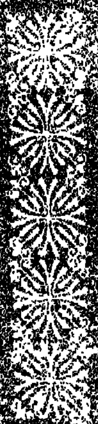
وزیر توانائی
جناب تفسیر
میں منعقد

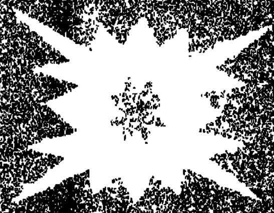
وزیر اعلا شری کلیان سنگھ
۳ مئی ۱۹۹۲ء کو گنا سنستھان
لکھنؤ میں ریاستی دستکاری
و ... ...
... انعامات میں ایک
دستکار کو انعام دیتے ہوئے



وزیر اعلا شری
کلیان سنگھ کو
۱۹ مئی ۱۹۹۲ء کو
جل نگم کے چیرمین
زلزلہ زدگان کی
کے لیے









اٹھا ہے لہٰذا حسرت کے کلام کی خصوصیت بھی عشق و محبت کی روداد و حکایات ہیں۔ حسرت کا عشق گھریلو ہے بازاری نہیں۔ انسانی ہے ماورائی نہیں، مجازی ہے، ماورائی نہیں۔ رشید احمد صدیقی کی نظر میں انھیں خصوصیات کی بنا پر دنیائے اردو غزل میں حسرت کا مقام منفرد ہے کیونکہ انھوں نے اپنے دور کے شعرا کا اتباع نہ کرکے غزل کے لئے ایک ایسی راہ ہموار کی جو تہذیب یافتہ ادب کا شاہکار بن گئی۔ آدابِ عشق کے معاملے میں حسرت دوسرے عشاق سے بہت آگے ہیں۔ انھوں نے رسم عاشقی کی تہذیب کی ہے وہ محبوب کا نظارہ حالات کے مطابق دور سے کرتے ہیں تاکہ رسوائی دامن گیر نہ ہو ؎

تو نے کی حسرت عیاں تہذیب رسم عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

وفا کی پاسداری اور احتیاطِ عشق ملاحظہ ہو ؎

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلہ نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

محبوب کی بے وفائی کا گلہ بھی نہیں کرتے اور اس کے عشق سے باز بھی نہیں آتے اور پاسداریِ وفا ایسی کہ اس کے غم کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہیں ؎

نگہِ یار سے پیکانِ قضا کا مشتاق
دلِ مجبور نشانہ پہ کھلا رکھا ہے

محبوب سے خفا ہونے کا انداز اور دل کی مجبوری کا حقیقی جذبہ دیکھئے ؎

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے
ہائے رے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

حسرت نے متقدمین و متوسطین کی غزلوں کے رنگ بڑی خوبی سے اپنے کلام میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی غزلوں میں حادثات و واقعات کے ساتھ ساتھ خیال و بیان کی رنگینی بھی نکھر آئی ہے۔ حسرت و یاس قید و بند کے مضامین میں بھی وہ کبھی یاس و ناامیدی کا شکار نہیں ہوئے۔ سیاسی اثرات کی آدائیگی میں بھی ان کی شعریت کہیں مجروح نہ ہو سکی۔ فن شعری میں ان کی منکسر المزاجی ہی تو ہے کہ تغزل میں آمد کے قائل ہیں آورد کے نہیں اور مختلف موضوعات کو دامنِ غزل میں اس خوبی سے سمویا ہے کہ غزل دائرۂ غزل سے خارج بھی نہ ہوئی اور زندگی کے مختلف مسائل، حقیقی جذبات صداقت و پاکیزگی کے ساتھ پیش کر دیئے۔ حسرت کی ان تمام صفات کے پیش نظر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منفرد اسلوب نہ صرف ان کے معاصرین کے لیے بلکہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے شعرا کے لیے بھی ایک معیار تغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین۔ اُردو غزل مع انتخاب صفحہ ۲۰
۲۔ ڈاکٹر رفیق حسین۔ اُردو غزل کی نشو و نما صفحہ ۹۸
۳۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ جدید غزل مطبوعہ ۱۹۵۵ء

□□

قلمی معاونین سے

گزارش ہے کہ اپنی تخلیقات فل اسکیپ کاغذ کے ایک طرف چوڑا حاشیہ چھوڑ کر صاف صاف تحریر کریں اور تخلیقات کی اصل کاپی ہی ارسال کریں، نقل اپنے پاس محفوظ کر لیں۔

کاربن یا زیراکس کاپی ہرگز روانہ نہیں کریں، ورنہ اشاعت ممکن نہ ہوگی۔

——— ایڈیٹر

درسِ آزادی

حسینؑ ہی نے دیا ہم کو درسِ آزادی
حسینؑ ہی نے سکھائی ہے ہم کو یک جہتی

حسینؑ ہی کی عطا ہے شعورِ بیداری
لگادی قصرِ رعونت میں ایک چنگاری

شررفشاں ہوا تاجِ شہنشہی اک بار
چیخ کے دینے لگے یوں صدا درو دیوار

حسینؑ امن و مساوات کا پجاری ہے
اکیلا ہو کے بھی فرعونیت پہ بھاری ہے

اسی حسینؑ کا سینہ ہے کائنات کا دل
یہی حسینؑ ہے آبِ حیات کا ساحل

اسی نے ہم کو بتلائے ہیں رازِ الفت کے
اصول اس نے بنائے ہیں سب محبت کے

حسینؑ ہی کو تو خواہش تھی ہند آنے کی
حسینؑ ہی نے تو بدلی روش زمانے کی

مثالِ گنگ و جمن پاک جس کی طینت تھی
علیؑ کا زہد تھا اور مصطفےٰ کی سیرت تھی

فاطمہ وصیہ ہاشمی
۴۷، ساتویں گلی، نشاط گنج، لکھنؤ

موجیں تڑپ رہی ہیں کہ پیاسا حسینؓ ہے

آنکھوں کا نور دل کا اُجالا حسینؓ ہے
یوں ہے کہ زندگی کا سہارا حسینؓ ہے

پرتو سے جس کے شوخ ہوا رنگِ کائنات
وہ نقشِ دل نواز و دل آرا حسینؓ ہے

ذوق و یقین و عزم کا وہ جادۂ بلند
انسانیت کا شیوۂ زیبا حسینؓ ہے

جس کے لہو سے کون و مکاں سرخرو ہوئے
سرمایۂ شہادتِ عظمیٰ حسینؓ ہے

ہیں اشک بار آج بھی آنکھیں فرات کی
موجیں تڑپ رہی ہیں کہ پیاسا حسینؓ ہے

سب کچھ مرے لئے ہے محبت حسینؓ کی
دنیا ہو کچھ بھی، حاصلِ دنیا حسینؓ ہے

دوشِ رسولؐ جس کی سواری رہی کلیم
محبوبِ حق کی آنکھوں کا تارا حسینؓ ہے

مسعود کلیم
بلسنڈ
جمال پورہ۔ مئوناتھ بھنجن

لئیق اختر فیض آبادی
امام باڑہ - فیض آباد (یو پی)

ایک زمانہ وہ بھی تھا

وہ فارغ البالی کا زمانہ تھا، زمینداری اور تعلقہ داری کا عہد تھا ہر طرف سکھ چین کی نبسی بجا کرتی تھی، دیوان خانے سجے رہتے تھے — باہری بیٹھکیں آباد رہا کرتی تھیں۔ نہ گردش روزگار کا دھڑکا تھا نہ پیر فلک کی ستم ظریفیوں کا جھمیلا۔ قصباتی زندگی کی پیشانی پر ازلی نے چین ہی چین لکھ دیا تھا — بزم آرائیاں اپنے عروج پر تھیں۔

ایک رئیس ابن رئیس ابن رئیس تھے۔ ایک دن اپنی عالی شان کوٹھی کی ہوادار بالکنی میں بیٹھے ہوئے تھے، دو چار ضلعوں تک ان کی مونچھوں کی شہرت پہونچ چکی تھی —— ان کی مونچھ ہمیشہ ریس بج کر دس منٹ بتاتی رہتی تھی۔ مونچھ کی دونوں نوکوں پر وہ کاغذی لیمو اس طرح رکھ لیتے تھے کہ کوئی لیمو ہلنے جلنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا بالکنی کے سامنے ایک کچی سڑک تھی۔ اس سڑک سے ایک دوسرے گاؤں کا نوجوان اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا گزرنے لگا۔ رئیس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ملازم کو آواز دی۔ وہ باادب حاضر ہوا۔

جلالت مآب رئیس نے فرمایا: "پکڑ لاؤ اس مردود بارگاہ کو"

دوڑ پڑے کوٹھی کے مشٹنڈے اور پکڑ لائے اس نووارد کو۔

جلالت مآب کی آنکھوں میں شعلے اتر آئے — کرخت آواز کے ساتھ پوچھا: "کیا تجھے نہیں معلوم کہ اس قصبے میں مابدولت کے سوا کوئی اور مونچھ نہیں رکھ سکتا۔؟"

نووارد تھر تھر کانپنے لگا۔

حکم صادر ہوا —— "بلاؤ حجن کو، مونڈ دے اس بدبخت دنا ہنجار کی مونچھ اور پھر اس کی مونچھوں کے بالوں پر خود اس سے تھکوا کر پھینک دو سنڈاس میں۔"

ایک اور پشتینی رئیس تھے، جن کے محل سرا کے سامنے نصف درجن ہاتھی ہمہ وقت جھومتے رہتے تھے۔ وہ صدری پھاٹک کے بالاخانے پر ایک دن تشریف فرما تھے۔ جی حضوریوں کا پرا بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں صدری پھاٹک کے سامنے سے دو بچے بستہ لٹکائے گزرے۔ رئیس نے دریافت کیا:

"یہ لونڈے کہاں جا رہے ہیں۔؟"

ایک مصاحب نے جواب دیا "پڑھنے"

رئیس نے پہلے تو ایک انتہائی غلیظ گالی دی۔ پھر فرمایا:

"بلاؤ"

وہ دونوں حاضر خدمت کیے گئے۔ ننگے پیر، ننگے سر، بوسیدہ لباس جسم پر —— رئیس نے سر سے پاؤں تک ان دونوں کو گھورا پھر دریافت کیا: "کہاں جا رہے ہو؟"

ڈرے سہمے بچوں نے جواب دیا۔ "پڑھنے!"

"کیا نام ہے؟"

"پھکو اور کھنکو"

رئیس مسکرائے۔ گاؤ تکیہ کے پاس منقش ہاتھی دانت کے کٹورے سے دو ٹکے نکالے، ایک ایک ٹکا دونوں کو دے کر فرمایا:

"یہ لو، بتاشے خریدو، کھاؤ اور گھر جاؤ۔ اور دیکھو روزانہ اسی وقت ہم سے ٹکے لے لیا کرو، بتاشے خرید کر گھر چلے جایا کرو"

بچے چلے گئے —— ایک مصاحب نے دریافت کیا:

"سرکار! یہ کیا۔؟"

سرکار نے جواب دیا: "جس دن یہ گڈے پڑھ لیں گے اسی

دن سے یہ ہمارے سروں پر پیشاب کرنے لگیں گے۔ اب تو ہمیں اس اسکول کو جڑ بنیاد سے اکھاڑنا ہے، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

قصبہ میں رہتے تھے ایک صاحب۔ روسائے قصبہ کی آفریدگاہ۔ گنجی معفاچٹ چندیا پر رئیسوں سے فی پیت آٹھ آنے مقرر تھے ایک آنکھ کھو چکے تھے ـــــ پچاس کے پیٹے تک پہونچ گئے تھے لیکن کنوارے بالے تھے۔ ایک آنکھ ہونے کی وجہ سے عورتیں آنکھ چُرانی تھیں۔ ایک آدھ جگہ بات چلی بھی تو کانا پن سدّ راہ ہوگیا۔ جہاں نیند آئی سو رہے، جہاں بھوک لگی کھالیا۔ رئیسوں کی اُترن ان کے اَیڑے بیڑے بدن کی پردہ پوشی کرتی رہتی تھی۔ عید کے دن رئیسوں کی ایک دیوان خانے میں بیٹھک تھی۔ ایک منچلے رئیس کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے سب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کانے میاں کی شادی کرادی جائے۔ سب نے تائید کی۔ اسی بیٹھک میں حسبِ ذیل امور بھی طے کیے گئے۔

(۱) دولہا بائیں آنکھ سے محروم ہیں، دُلہن بھی بائیں آنکھ سے محروم ہونا چاہیئے۔

(۲) جتنے باراتی جائیں گے وہ بھی بائیں آنکھ کے کانے ہوں گے۔

(۳) مجرا پیش کرنے والی اور اس کے سازندے بھی بغیر بائیں آنکھ کے ہوں گے۔

بڑے آدمیوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ فرستادے اِدھر اُدھر بھیجے گئے۔ بائیں آنکھ کے کانوں کو تلاش کرنے۔ بیس پچیس دن کے بعد فرستادے واپس آئے۔ سب کی سعی مشکور ہوچکی تھی۔ دن تاریخ طے ہوئی۔ برات منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئی۔ ہر طرف سے اس انوکھی برات کو دیکھنے کے لئے ایک خلقت امنڈ آئی ـــــ دولہا صاحب جس گھوڑی پر سوار تھے وہ بھی بائیں آنکھ کی کانی تھی۔ بہار سے جو گانے والی آئی تھی وہ بھی اسی برادری کی تھی ـــــ جو گانا گایا گیا تھا اس کا مکھڑا یہ تھا ؎

سجنیا ہمری طرح توری بھی بائیں انکھیا کانی
سجنیا ہمری طرح توری بھی عمریا سہانی

کوئی ہرگز یقین نہیں کرے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جس مولوی جی نے نکاح پڑھا تھا اور دعوتِ ولیمہ میں جو ڈیڑھ سو افراد شریک ہوئے تھے وہ سب بائیں آنکھ کے کانے تھے۔

ایک تھے میر صاحب اور ایک تھے خاں صاحب ـــــ ایک جان دو قالب ـــــ دوستی کے چہرے پر دو آنکھیں، چولی دامن کا ساتھ ـــــ ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ ساتھ اٹھنا، ساتھ بیٹھنا۔ ایک کے پسینے پر دوسرا اپنا خون بہانے کو تیار ـــــ دو چار ضلعوں میں ان دونوں کی دوستی کے چرچے تھے۔ روز کا معمول تھا کہ میر صاحب کے دیوان خانے میں دن کا قیلولہ کرنے خاں صاحب ٹھیک ایک بجے آجاتے۔ ملازم خاص خانہ ساز تمباکو پیچوان بھر کر لگا دیتا۔ پہلے خاں صاحب گڑگڑاتے پھر میر صاحب اسے منھ لگاتے۔ جب تک تمباکو میں دم رہتا رہ پیچوان گردش میں رہتا۔

ایک دن نیم کے ایک درخت کی ملکیت پر دونوں کے ضلعداروں میں کچھ تو تکار ہوگئی۔ وہ تو تکار آگے بڑھ کر مقدمے بازی میں تبدیل ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان بات چیت کے دروازے بند ہوگئے ـــــ لیکن خاں صاحب کی وضعداری اور میر صاحب کی خاطر مدارات میں فرق نہیں آیا۔ خاں صاحب اپنے وقت پر میر صاحب کے دیوان خانے آتے، ملازم خاص اسی طرح پیچوان لگاتا۔ بستر اسی طرح بچھتا۔ ایک داہیں کروٹ لیٹتا دوسرا بائیں کروٹ ـــــ جب خاں صاحب حقہ پی چکتے تو ملازم خاص کو آواز دیتے وہ آتا اور پیچوان میر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ جب میر صاحب کا دل بھر جاتا تو وہ ملازم خاص کو آواز دے دیتے۔

پانچ سال تک مقدمہ چلا، دونوں کے ہزاروں خرچ ہو گئے۔ میر صاحب مقدمہ جیت گئے تو خاں صاحب نے اپنے خون سے کاغذ پر "مبارک ہو" لکھ کر میر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ میر صاحب نے اپنے لہو سے کاغذ پر لکھا:

"درخت تمھارا ہے، تم مالک ہو، چاہے کاٹ کر پھینک دو، چاہے باقی رکھو۔"

بات چیت کے دروازے بند رہے۔ وضع داریاں باقی رہیں۔ ایک صبح میر صاحب کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا دوپہر میں ٹھیک ایک بجے خاں صاحب کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ دونوں جنازے ساتھ ساتھ اُٹھے۔ دونوں کی قبریں ایک قبرستان میں برابر برابر بنیں ___ دونوں کی قبروں کے درمیان جو دیوار تھی اس میں ایک جالی لگوا دی گئی، تاکہ جب دونوں کے دل صاف ہو جائیں تو باتیں کر سکیں۔

ایک تھے آم والے سرکار ___ باون مرضعے ان کی ملکیت۔ فینس، پالکی، شکرم، ہاتھی ___ کیا نہیں تھا ان کے پاس قلمی آم، تخمی آم، کٹھل، امرود، شہتوت، لیچی، فالسے اور انار کے بڑے بڑے باغ ___ ہر سال جب آموں پر شباب آتا تو دو باغوں کے آم قصبے میں، قرب و جوار میں گھر گھر کثیر تعداد میں تحفتہً بھیجتے تھے راہ گیروں کی خدمت میں آم پیش کیے جاتے ___ حد یہ تھی کہ قصبے سے تین میل کے فاصلے پر ایک ریلوے اسٹیشن پر رُکنے والی ریل کے تمام مسافروں کو پندرہ دن تک ڈھیروں آم مہذب کارندے یہ کہہ کر پیش کرتے تھے :

"آم والے سرکار کا سلام بھی قبول کیجیے اور یہ حقیر تحفہ بھی۔"

اُن دیکھے آم والے سرکار کی دریا دلی دور دور تک ہر کس و ناکس کی زبان پر تھی ___

ایک تھے کوٹھے والے میاں ___ سُرخ و سفید، بوٹا سا قد، جامہ زیب، کلین شیو۔ اتنے آہستہ خرام کہ رہ گزر بھی قدموں کی چاپ سننے کے لیے ترس جاتی تھی ___ ان کی زندہ دلی، بذلہ سنجی، زیرِ لب تبسم ریزی اور مہمان نوازی کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ اولاد کے سوا اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ بیوی چندے آفتاب چندے ماہتاب بڑی اللہ والی۔ آنے جانے والوں کے لیے وہ پلکیں نہیں دل بچھا دیتی تھیں۔ میاں سخاوت میں ایک ہاتھ تو وہ دو ہاتھ تھیں ___ دونوں میں محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ مردانے میں لوگوں سے بات کرتے کرتے ہر پانچ دس منٹ کے بعد میاں اندر حویلی جاتے، بیوی سے دو ایک بات کہتے اور پھر واپس آجاتے۔

ایک دن چٹ سے بیوی بیمار ہوئیں اور پٹ سے مر گئیں۔ میاں کو سکتہ لگ گیا۔ نہ آہیں بھریں نہ آنسو گرائے۔ جنازہ جب حویلی کے باہر آیا تو دہلیز پر کھڑے کھڑے "خدا حافظ فی امان اللہ" کہا اور حویلی کے کشادہ اور ہوادار کوٹھے پر چڑھ گئے ___ بیوی کے بعد تیس سال تک زندہ رہے ان تیس برسوں میں نہ کسی عورت (محرم رہی ہو یا نامحرم) سے بات کی، نہ کبھی کسی بات پر ہنسے اور نہ کوٹھے سے اُترے ___ تیس سال کے بعد خود سے نہیں چار کندھوں کے سہارے اُترے۔

ایک تھے ماما جی ___ کیسی باغ و بہار شخصیت تھی۔ زعفران کا کھیت۔ نیک دل، نیک صفات، بذلہ سنج، چٹکلے باز، رونقِ بزم زینتِ محفل ___ خالص چنبیلی کے تیل میں بسی ہوئی زلفیں، گیروا لباس عطرِ حنا میں نہایا ہوا۔ صبح دم قصبے کے بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک جوتا فروش دوست شوکیس میں جوتے ٹانگ رہے تھے۔ چلتے چلتے ماما جی رُکے۔ دوست سے پوچھا ___

"میاں! کیا کر رہے ہو ___؟"

دوست نے کہا۔ "جوتے لگا رہا ہوں۔"

برجستہ فرمایا۔ "باپ دادا کا نام بھی لیتے جاؤ۔"

ایک تھے حکیم چٹکلی مسجع مرصع، مقفٰی شخصیت۔ کشادہ پیشانی غلافی آنکھیں، ترشے ترشائے پیٹے، ابرو نما مونچھیں، خشخشی داڑھی ___ ان کے ہاتھ میں قدرت نے وہ شفا عطا کی تھی کہ جس کو ایک چٹکی خاک دے دیتے وہ بھلا چنگا ہو جاتا تھا۔ نباضی کا یہ عالم تھا کہ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مرض کا حسب نسب معلوم کر لیتے تھے ___ آج کل کے معالج ٹکے کے مرض کو دور کرنے کے لیے نو ٹکے کی دوائیں لکھتے ہیں۔ حکیم چٹکلی نو ٹکے کے مرض کو آدھے ٹکے کی دوا سے بھگا دیتے تھے ___ دردِ گردہ سے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا ہوا مریض ایک چٹکی سفوف سے ہشاش بشاش

ہو جاتا۔ حکیم صاحب کی چٹکی کا شہرہ دور دور تک تھا۔ نماز فجر کے بعد وہ اپنے مطب میں بیٹھ جاتے اور بلا تفریق امیر و غریب وہ سلسلہ وار مریضوں کو دیکھتے۔ ایک بجے دن تک مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ان کی راتیں عبادت الٰہی میں اور دن خدمت خلق میں گزرتے تھے۔

ایک مہاراجہ برسوں سے مرگی کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ نہ جانے کتنے معالجین کی چوکھٹ چومی، کتنے سنتوں، پیروں اور فقیروں کے در کی خاک چھانی لیکن مرض ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہمدردوں نے حکیم چٹکی کا پتہ بتایا ـــ ہارے ہوئے جواری کی طرح آئے حکیم صاحب کے مطب میں ـــ دیکھا ان کو حکیم صاحب نے۔ مہاراجہ میلوں کا سفر طے کرکے آئے تھے، حکیم صاحب نے کہا ـــ

"آج شب قیام فرمایئے، چٹنی روٹی نوش فرمایئے، کل صبح تشریف لے جایئے گا۔"

شب میں دسترخوان بچھا۔ ہمہ خوش ذائقہ نعمتیں سجادی گئیں جب مہاراجہ ماحضر تناول فرماچکے تو حکیم صاحب نے ایک چٹکی سفوف مہاراجہ کے منہ میں ڈال دیا۔

دوسرے دن جب حکیم صاحب مہاراجہ کی مزاج پرسی کے لیے آئے تو مہاراجہ نے کہا ـــ "دواؤں کے ساتھ مجھے اجازت سفر مرحمت فرمایئے۔"

حکیم صاحب نے جواب دیا۔ "دوا تو کل رات دے چکا ـــ آج سے ساتویں دن آپ کو دس بار استفراغ ہوگا۔ استفراغ کے بعد کچھ دیر تک آپ پر غشی طاری رہے گی۔ اس کے بعد انشاء اللہ پھر کبھی آپ پر دورہ نہیں پڑے گا۔"

چھ ماہ بعد مہاراجہ توشے اور تحائف کے ساتھ مع لاؤ لشکر کے حاضر ہوئے۔ قیمتی خلعتیں، نایاب جواہرات، سونے کے بھاری توڑے حکیم صاحب کی خدمت میں اپنی صحت یابی کی خوشی میں پیش کیے حکیم صاحب نے مسکراکر دریافت کیا۔

"اجی حضرت! یہ کیا؟"

"نذرانہ۔"

"شکریہ! یہ دولت دنیا آپ اپنی ریاست کے غریب غرباء میں تقسیم کر دیجیے۔"

ایک بزرگوار نے جو حکیم صاحب کے بڑے منہ لگے تھے، ان سے خلوت میں پوچھا ـــ

"اس سفوف میں کون کون سے مفردات تھے؟"

حکیم صاحب نے جواب دیا ـــ "وہ سفوف دراصل ایک خاص قسم کی سن رسیدہ چھپکلی کا تھا۔"

جس ضلع میں وہ قصبہ واقع تھا اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر تھا ایک سنکی، بجھلا، لال بھبھوکا انگریز۔ ضلع حکام اور سرکاری ملازمین اسکے نام سے کانپتے تھے۔ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتا وہ ڈانٹ پلاتا کہ پتہ پانی ہوجاتا۔ اس کے سر میں اٹھنے لگا درد۔ اتنا شدید کہ اپنے بدن کی بوٹیاں نوچنے لگتا۔ زمانے بھر کے ڈاکٹروں سے علاج کرایا۔ کوئی افاقہ نہ ہوا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ـــ یہ طے پایا کہ حکیم چٹکی کو دکھایا جائے حکیم صاحب نے اپنے شعلہ مزاج اور آتش پا مریض کو دیکھا۔ پھر کہا،

"کل آپ ٹھیک ۲ بجے میرے مطب میں تشریف لایئے۔"

جون کا مہینہ، سوا نیزے پر آفتاب، دھوپ کی چلچل، حکیم صاحب نے ایک پرانا غیر استعمالی چھپر کھٹ دھوپ میں صبح صبح ڈلوا دیا۔ ڈپٹی کمشنر وقت پر تام جھام کے ساتھ آیا۔ حکیم چٹکی نے اس کے بدن کے سارے کپڑے انڈرویر کے علاوہ اتروا دیئے۔ اس چھپر کھٹ پہ چاروں شانے چت اسے لٹاکر ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے۔ اس چھپر کھٹ میں خون کے پیاسے ہزاروں کھٹمل بسیرا لیے ہوئے تھے۔ دیسی کھٹملوں نے ولایتی خون کی جو بو باس پائی تو ہر طرف سے ٹوٹ پڑے ـ جھنڈ کے جھنڈ کھٹملوں نے جب اسے کاٹنا شروع کیا تو وہ اور بھی بورا گیا۔ ایک سے ایک طبعزاد مغلظات اس نے حکیم چٹکی کو سنانا شروع کر دیں۔

خوف زدہ چپراسیوں، تحصیلدار و دیگر ماتحت ملازمین نے ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ پاؤں کھولنے چاہے لیکن حکیم صاحب نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

دو گھنٹے تک خون چوستول جاری رہی۔ ڈپٹی کمشنر ادھ مرا ہوکر نیم غشی میں مبتلا ہوگیا ـــ دو گھنٹے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں کھلے، سارا بدن

غزلیں

آج کے دور کے انسان کو پتھر لکھیں
آؤ ہم اپنے زمانے کا مقدر لکھیں

وقت کا کام گزرنا ہے گزر جائے گا
ہم کو تو لکھنا ہے ہم سوچ سمجھ کر لکھیں

اتنے ظالم ہیں مرے دور میں، اتنے ظالم
سوچنا پڑتا ہے کس کس کو ستمگر لکھیں

لفظ تاریخ کی پہچان ہوا کرتے ہیں
لکھنا آجائے تو لفظوں کا سمندر لکھیں

حشر کے روز کی مانند ہے ہر روز رشید
جی میں آتا ہے کہ ہر لمحہ کو محشر لکھیں

رشید قریشی
۳۰۔ محمد علی لین۔ امین آباد
لکھنؤ۔ ۱۸

تمھاری زلف جو مہکی مرے خیالوں میں
اندھیرے پھیل گئے ذہن کے اجالوں میں

مرا وجود ہے کچھ ایسے ہندسوں کا سفر
الجھ گیا ہو جو خود اپنے ہی سوالوں میں

اٹھے گا جب کبھی تاریخ یا سیت پہ قلم
زمانہ پیش کرے گا مجھے مثالوں میں

حسین طرز نگارش کے سائے میں اے دوست
پڑھا ہے میں نے تجھے بارہا رسالوں میں

اک ایسا جملۂ نافہم ہوں جسے اب تک
کہیں جگہ نہ ملی وقت کے مقالوں میں

ہمارے اشک بھی شبنم وہ ٹوٹے تارے ہیں
جو بجھ کے رہ گئے خود اپنے ہی اجالوں میں

شبنم گورکھپوری
۱۵۴۔ رودر پور
گورکھپور۔ ۱

دل کسی بیدرد کی باتوں سے بہلاتے نہیں
آئینہ ہے ہم اسے پتھر سے ٹکراتے نہیں

کام لینا ہے تو لے لو پرفشاں لمحات سے
یہ وہ پنچھی ہیں کہ اڑ جائیں تو پھر آتے نہیں

کاش اتر جائے دلوں میں ایک دیوانے کی بات
زندگی ان کی ہے جو مرنے سے گھبراتے نہیں

اپنا چہرہ دیکھ کر ہم کو بھی رونا آئے گا
آئینے کے سامنے ہم اس لیے جاتے نہیں

کیوں انھیں ابر کرم کا نام دیتے ہو حفیظ
تشنہ کاموں پر جو کوئی لطف فرماتے نہیں

حفیظ بنارسی
مٹی محلہ
آرہ ۔ ۸۰۲۳۰۱

لئیق رضوی
بی - ۱۴۴۸ - کریلی - الہ آباد

اُردو میں شخصی مرثیے کی روایت

(۳)

پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی شہرۂ آفاق تحقیقی تصنیف "پنجاب میں اُردو" میں دو شخصی مرثیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو نامدار خاں دت اور محمد غوث بٹالوی کی یادگار ہیں۔

نامدار خاں دت کا مرثیہ چترت سنگھ نامی ایک سالار کی موت پر لکھا گیا ہے، جو ۱۷۰۴ء میں ایک جنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مرثیہ کے متعلق پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے کہ:

"یہ نظم اس کی معاصر نظموں سے جو دہلی اور لکھنؤ میں ان ایام میں لکھی جا رہی تھیں، زبان کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ بیان حقیقت اور جذبات کی ادائیگی میں انتہا درجہ کی سادگی سے کام لیا گیا ہے اور مبالغہ نام کو بھی نہیں ہے۔ واقعات ایسے پیرایہ میں ادا ہوئے ہیں، جو بالکل قدرتی اور فطری ہیں۔" [۱]

پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب میں مرثیہ کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔

دوسرا مرثیہ غوث محمد بٹالوی نے اپنے حاکم گوربخش سنگھ کی وفات (۱۷۸۳ء) پر تصنیف کیا تھا، جو دشمنوں کے خلاف ایک جنگ میں کام آیا۔ پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے کہ "یہ مرثیہ گوربخش سنگھ کی وفات کے عین بعد لکھا گیا ہے۔" [۲] موصوف نے مرثیہ چند اشعار کتاب میں شامل کیے ہیں۔

مرزا غالب کا نام شخصی مرثیہ نگاری کی راہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالب کے مرثیے اظہار غم اور تاثر کے تعلق سے قدرے کمزور ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے شخصی مرثیے کے ارتقا میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اور شخصی مرثیہ کا کوئی بھی تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر ادھورا اور نامکمل رہے گا۔

غالب نے دو مرثیے کہے۔ پہلا مرثیہ مرزا زین العابدین خاں عارف کی موت پر اور دوسرا اپنی کسی معشوقہ کی موت پر۔ مرثیۂ عارف غزل کے فارم میں ہے اور اس میں کل دس اشعار ہیں۔ غالب کو عارف کی ذات سے بے انتہا لگاؤ تھا اور ان کی اچانک موت نے غالب کو بے حد متاثر کیا، جس کا اظہار مرثیے میں جا بجا نظر آتا ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

البتہ کہیں کہیں غالب کے مزاج کی شوخی اور ان کا طنزیہ لب و لہجہ غم کی مجموعی فضا کو متاثر کرتا ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

مرزا غالب کا دوسرا مرثیہ "درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے" بھی خاصے کی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غالب نے یہ مرثیہ اپنی کسی ڈومنی معشوقہ کی موت پر لکھا تھا۔ یہ مرثیہ بھی غزل کے فارم میں ہے اور اس میں ۱۲ اشعار ہیں۔ اس نظم میں غالب مرثیہ کی فضا قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں ؎

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

شخصی مرثیہ نگاری کے ارتقا میں مومن کا نام بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ان کا مرثیہ، جو انھوں نے اپنی محبوبہ کی وفات پر کہا تھا زبان و بیان اور اپنی پیش کش کے اعتبار سے نمائندہ شخصی مرثیہ ہے۔ مومن نے ان اشعار میں شعری محاسن اور فنی نزاکتوں کا بھرپور اہتمام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، جن اشعار میں دل کی کیفیات کا اظہار ہے، ان میں سادگی بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ غالباً یہ اردو کا پہلا مرثیہ ہے جو ترکیب بند کے فارم میں لکھا گیا ہے ؎

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج
آغوشِ رشکِ حلقۂ اہلِ عزا ہے آج

برباد شورِ رعد ہوا آپ اشک پر
کیسا وفورِ شیون و جوش و بکا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

مرثیہ کے بعض اشعار درد و غم کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

تشبیہ آئینہ سے جو ہوتا تھا آب آب
مل جائے خاک میں وہ بدن وا مصیبتا

پھرنا نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب
نعش اس کی جائے ہے سرِ بازار ہائے ہائے

اسی عہد میں داغ دہلوی، منیر شکوہ آبادی اور امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے بھی شخصی مرثیے لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا۔
داغ نے امیر مینائی کی موت پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ اس مرثیہ میں داغ نے امیر مینائی سے اپنے ذاتی تعلق کے اظہار کے علاوہ ان کے مزاج کی سادگی کا بیان بھی کیا ہے۔ مرثیہ غزل کے نام میں ہے اور اس میں کل ۷ اشعار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ
جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر

ہے دعا بھی، داغ کی تاریخ بھی
قصرِ عالی پائے جنت میں امیر

منیر شکوہ آبادی نے بھی کئی شخصی مرثیے لکھے ہیں، جن میں ذوق اور دبیر کی موت پر لکھے جانے والے مرثیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

رحلتِ ذوقِ سخن پیرا سے
ہے بلند آہ و فغاں دہلی میں

واقعی شاعرِ خوش گو تھا وہ
روئے ہیں پیر و جواں دہلی میں

نظم کی میں نے یہ تاریخ بیسر
شہ رہ ذوقِ زباں دہلی میں

آہ واویلا وفاتِ حضرتِ مرزا دبیر
جامعِ فضل و کمالِ دین و دنیا ہائے ہائے

آج وہ ہے قصرِ نور افشاں جنت میں مکیں
جس سے حاصل تھا قلم کو اوجِ طوبیٰ ہائے ہائے

امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے، جو اپنے عہد کے ممتاز شاعروں میں سے تھے، نواب رمضان علی خان بہادر لکھنوی کی زوجہ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا، جو ان کے دوسرے دیوان "نظمِ دل افروز" میں شامل ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ہزار افسوس و آہ و حسرت نیا یہ صدمہ دیا فلک نے
کہ داغ جس کا نیا سویدا جہاں میں دل ہائے مرد و زن کا

(باقی آئندہ)

حواشی:

[1] پنجاب میں اردو (لکھنؤ ۱۹۷۰ء) صہ ۲۴۱-۲۴۲

[2] پنجاب میں اردو صہ ۲۴۶

جوابِ طلب امور کے لئے براہ کرم ٹکٹ لگا ہوا لفافہ روانہ فرمائیں۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

—— ایڈیٹر

غزل

آئی برکھا کسانوں کے آنسو اُگے
جھونپڑوں کے منڈیروں پہ جگنو اُگے

کیا برس جائیں بادل بھروسہ نہیں
وھاں بوؤ تو ممکن ہے بالو اُگے

ناچنے کا ارادہ زمیں نے کیا
چرخ پر چاند تاروں کے گھونگھرو اُگے

ہم تھے صحرا کے پودے تو سب دوست تھے
لوگ جلنے لگے جب لبِ جو اُگے

عہدِ حاضر کی مٹی کی زرخیزیاں
پیار بویا گیا اور چاقو اُگے

سر کو بو کر زمینِ وطن سے کہا
میری ماں تیرے آنچل کے پلو اُگے

آؤ اک بار پھر خود کو بو ڈالیں ہم
مہکے مٹی کہ پھر میں اگوں تو اُگے

تم چھپا آئے قاتل کو بیکل جہاں
اُن گپھاؤں میں پھر کیسے سادھو اُگے

پدم شری بیکل اُتساھی
۱۶ - مہادیو روڈ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

غزلیں

میں نہیں رسم و روایات نبھانے والا
میں ہوں دنیا کو نئی راہ دکھانے والا

عہدِ حاضر نے دیے ہیں ہمیں دانش کے زبر
ہے کوئی ہم کو تباہی سے بچانے والا

خود تو محفوظ رہا پھینک کے اک چنگاری
جل مرا گھر کی مرے آگ بجھانے والا

کیسے پڑھ سکتا ہے چہروں پہ لکھی تحریریں
محبسِ ذات میں اپنے کو چھپانے والا

اک زمانے سے الگ ہے مرا مسلک مہدیؔ
"اپنی بربادی کا میں جشن منانے والا"

مہدی پرتاپگڑھی
۲۶۔ اسکول وارڈ
پرتاپ گڑھ

کچھ برا بھی لکھا ہے قسمت میں
ورنہ کیسی کشش سیاست میں

کچھ نہ بگڑا کبھی کہیں جس کا
لٹ گیا جادۂ مروت میں

وہ کہ تھا ایک پیکرِ آہن
جل گیا آتشِ کدورت میں

کون اپنے عیوب کھلوائے!
مجھ کو رہنے دو قعرِ ظلمت میں

خود کو کتنا بڑا سمجھتے ہیں
ہم جو کچھ بھی نہیں حقیقت میں

احترام اسلام
۵۴۷۔ حسن منزل، اترسوئیا
الٰہ آباد

وہ زندگی کے بہانے تلاش کرتا ہے
کسی کے خط جو پرانے تلاش کرتا ہے

حقیقتوں سے ہوا یوں اس قدر انساں
ادھر ادھر سے فسانے تلاش کرتا ہے

وہ اپنے جسم پہ رکھتا نہیں کوئی چہرہ
مگر وہ آئینہ خانے تلاش کرتا ہے

قدم قدم پہ وہ بے چینیاں بکھیر کے آج
مسرتوں کے خزانے تلاش کرتا ہے

یہ کیسا دور ہے خود اپنے گھر میں بھی اشرفؔ
سکون بخش ٹھکانے تلاش کرتا ہے

اشرف مالوی
پوسٹ مال
ضلع لکھنؤ

افسانہ

ناہید جعفری
۸۵/۲۲۵، محمود نگر لکھنؤ

لمحہ لمحہ تیری صورت

تم سے جدا ہوئے چار سال ہو گئے، لیکن تمھاری یادیں آج بھی میرے ساتھ ہیں، تمھاری صورت ہر پل میرے سامنے رہی ہے جسے کوشش کے باوجود میں بھلا نہیں سکی، بلکہ جب بھی بھلانے کی کوشش کی، تم پہلے سے کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگے۔ ان چار سالوں میں ایک پل کے لئے بھی تم میرے ذہن سے نہیں ہٹ سکے ایسا لگتا ہے کہ میں تمھیں کبھی بھول نہیں سکوں گی۔ رات دن میں جلتی رہتی ہوں، کڑھتی رہتی ہوں، تمھاری یادیں مجھے تڑپاتی رہتی ہیں۔

—— لیکن کیوں؟ ... کیا گناہ کیا ہے میں نے؟ ... کیا قصور ہے میرا؟ ... کاش تم اپنے ساتھ اپنی یادیں بھی لے جاتے .....

کم سے کم میں مر تو سکتی سکون سے۔ تم نے تو مجھ سے ہنسنے اور رونے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ نہ تو تم مجھے ہنسنے دیتے ہو، کیونکہ تمھاری نظروں میں قصوروار میں ہوں، میرا مسکراتا ہوا چہرہ تمھیں پسند نہیں —— تبھی تو تم فوراً میرے سامنے آ جاتے ہو، اور کہتے ہو——

"مجھے اتنی دور بھیج کر تم ہنس رہی ہو"... !؟

اور اگر میں روتی ہوں تو تم بھی رونے لگتے ہو، کیونکہ میری آنکھ میں آنسو تم برداشت نہیں کر سکتے —— میں کیا کروں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا .... تم نے تو مجھے غم کے ایسے سمندر میں ڈھکیل دیا ہے، جہاں موجوں کے تھپیڑے تو مجھے زخمی کرتے رہتے ہیں، لیکن کنارہ دور تک نظر نہیں آتا....

مجھے یاد ہے۔ جب میں نے پہلی بار تمھیں دیکھا تھا، میرے گھر کے سامنے ایک کھنڈر نما مکان تھا، جس کو تم نے خرید لیا تھا اور بنوا رہے تھے۔ تم اسکوٹر سے آئے تھے اور مزدوروں کو نقشہ دکھا کر کچھ سمجھا رہے تھے۔ میں سمجھی تھی شاید تم انجینئر ہو، یا پھر ٹھیکیدار—— اس دن پہلی بار ہی تم مجھے بہت اچھے لگے تھے، بہت خاموش خاموش۔ نہ زیادہ بولنا نہ ہنسنا، نہ چکر کر ادھر ادھر دیکھنا اپنے کام سے کام۔ کتنی گہرائی تھی تمھاری طبیعت میں۔ بالکل فلاسفر لگ رہے تھے۔ یا پھر... کسی آرٹ فلم کے ہیرو.... تھوڑی دیر تم ان لوگوں کو سمجھاتے رہے، پھر اسکوٹر اسٹارٹ کی اور چلے گئے۔

مکان کی تعمیر شروع ہو گئی تھی اس لئے تم روز صبح آٹھ بجے آ جاتے اور دس بجے چلے جاتے تھے، پھر شام کو پانچ بجے آتے۔ میں نے سوچا شاید تم کہیں سروس کرتے ہو.... اور پرائیویٹ طور پر یہ کام کرتے ہو... بڑی محنت کرنا پڑتی ہے شاید اسی لیے خاموش رہتے ہو.... یا پھر گھر کی ساری ذمہ داری تم ہی پر ہو—— کوئی نہ کوئی تو پریشانی ہو گی تمھارے ساتھ—— تبھی تو اتنا سنجیدہ رہتے ہو—— ہر وقت کام میں دھیان رہتا ہے...... طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں آتے تھے۔ لیکن تم سے بات کبھی نہیں ہوئی—— ہاں .... تم کبھی کبھی پانی ضرور منگا لیتے تھے۔

تمھارے علاوہ ایک بزرگ اور بھی آتے تھے۔ شاید وہ اس مکان کے مالک ہوں۔ کیونکہ وہ تم سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ دس سوال کرتے ہوں گے تب تم ایک جواب دیتے ہو گے۔ وہ بھی سوچتے ہوں گے کہ کس کو ٹھیکہ دے دیا۔ بیچارہ بولنا ہی نہیں جانتا۔

پھر ایک دن تین لڑکیاں آئیں۔ وہ کافی دیر تک مکان میں اوپر نیچے دیکھتی رہیں۔ پھر سامنے مجھے دیکھ کر مسکرا دیں۔ میں نے ان کو اپنے گھر میں بلا لیا۔ پھر باتوں باتوں میں میں نے پوچھا —

"یہ فلاسفر صاحب کون ہیں۔؟"

وہ سب ایک ساتھ ہنس پڑیں —"یہ فلاسفر نہیں — میرے بھیا ہیں۔"

"کیا یہ بالکل نہیں بولتے۔" میں نے تعجب سے پوچھا تھا۔

"ہاں! کم بولتے ہیں، لیکن اچھا بولتے ہیں۔" — تمھاری ایک بہن نے بتایا تھا۔

"کیا یہ سروس کرتے ہیں۔؟" میں نے پوچھا تھا

"ہاں! یہ انجینئر ہیں۔" تمھاری بہنوں نے بتایا تھا۔

تھوڑی دیر ہم لوگ یونہی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ لوگ چلی گئیں۔

اس کے بعد وہ جب بھی مکان دیکھنے آتیں ہم سے ضرور ملتیں کم دنوں میں ہی وہ کافی مانوس ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ لیکن تم کبھی کچھ نہ بولے۔ تمھاری ممی اور پاپا بھی ہمارے یہاں آنے لگے۔ وہ لوگ بہت خوش تھے کہ ان کو ہمارے جیسے پڑوسی مل رہے تھے۔ ... لیکن تم ..... صرف خاموش ..... اِں کبھی کبھی ٹھنڈا پانی منگوا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ نہ تم کبھی ہمارے گھر آئے اور نہ کبھی کسی سے بات کی۔ تمھاری صورت سے ہی تمھاری عظمت اور شرافت نظر آتی تھی۔ نہ کبھی کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا، نہ بات کرنا، اتوار کو تو تم سارا سارا دن اپنے مکان کی دیکھ بھال کرتے رہتے۔ نہ تمھیں بھوک لگتی تھی اور نہ تھکن کا احساس ہوتا تھا۔

اس دن مجھے تم پر بہت ترس آیا تھا۔ تم صبح آٹھ بجے کے آئے ہوئے تھے اور پانچ بج چکے تھے۔ نہ تم نے کھانا کھایا تھا اور نہ چائے پی تھی۔ امی سے پوچھ کر میں نے تم کو چائے بھیج دی تھی۔ لیکن تم کو شاید اچھا نہیں لگا تھا۔ تبھی تو تم نے کہلایا تھا:

"پریشان نہ ہوا کریں۔ میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔"

یقین جانو۔ میرا خون کھول گیا تھا۔

دو مہینے میں تمھارا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ اور تم لوگ اس میں رہنے بھی لگے تھے۔ تمھاری بہنیں ہر وقت آتی جاتی تھیں۔" دیدی! یہ بات دیدی! وہ بات ... لیکن تم ..... صرف خاموش — تمھاری یہ خاموشی ہی تو مجھے پسند تھی۔ تم اکثر اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے غزلیں سنا کرتے تھے — شاید تمھیں غزلوں کا بہت شوق تھا۔ مجھے تم اچھے ضرور لگتے تھے لیکن .....

اچانک تمھاری یہ خاموشی ٹوٹ گئی — اس روز — جب تمھاری بہن نے کہا —

"دیدی! بھیا نے ڈکشنری مانگی ہے۔"

"اچھا" میں نے اسے ڈکشنری دے دی تھی۔ اس کے دوسرے دن وہ واپس کر گئی تھی۔ میں نے یونہی الماری میں رکھ دی تھی۔ شام کے وقت جب میں پڑھنے بیٹھی تو ڈکشنری کی ضرورت پڑی۔ میں نے الماری سے اٹھائی اور جیسے ہی کھولا، تمھاری ایک چھوٹی سی تحریر ملی، جس میں تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا —

"وشواس کرو۔ میں تمھیں بہت پیار کرتا ہوں.....
یہ جذبات، یہ احساسات تمھارے ہی دئیے ہوئے ہیں .... ورنہ میں تو بالکل بے جان تھا — جب سے تمھیں دیکھا ہے، دن رات تم میرے خیالوں میں رہتی ہو....."

میں نے جلدی سے اس کے پُرزے پُرزے کر کے پھینک دیا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کاش تم میرے ذہن میں وہی پُرانے فلاسفر بنے رہتے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تم نے اچانک یہ حرکت کیوں کی — تمھارے ذہن میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا۔ تم مجھے اچھے ضرور لگتے تھے لیکن میں نے تمھیں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

اس روز میں بہت گھبرا گئی تھی اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اگر تم نے کوئی کتاب منگوائی تو صاف انکار کر دوں گی، لیکن.... تم کسی نہ کسی بہانے اپنے عشق کا اظہار کرتے رہے اور میں ایک پتھر کی مورت بنی سب کچھ سنتی رہی، سہتی رہی۔ میں نے کبھی کوئی

جواب نہیں دیا۔ اور جواب دیتی بھی کس طرح کیونکہ .... میرے اور تمھارے درمیان مذہب کی ایک بلند دیوار حائل تھی، جس کو گرانا میرے لیے ناممکن تھا۔

لیکن تم کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ تمھاری حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ بڑھی ہوئی داڑھی، اداس اداس چہرہ ویران آنکھیں، اس بات کی گواہ تھیں کہ تم عشق میں پوری طرح گرفتار ہو چکے ہو۔

اچھا تم ہی بتاؤ۔ تمھاری ان باتوں کا کیا میرے پاس کوئی جواب تھا۔؟ تم یہ بھی جانتے تھے کہ تمھاری یہ حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں، پھر بھی تم من مانی کرتے رہے۔ روز میرے پیچھے پیچھے کالج جانا، دن دن بھر اپنے دروازے پر کھڑے رہنا۔ تم نے آفس جانا بھی کم کر دیا تھا اور تو اور۔ رات کو بھی اپنے کمرے میں ٹہلتے رہنا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے جھانکنا کہ شاید میں کہیں نظر آجاؤں۔ کیونکہ تمھارے کمرے کی کھڑکی ہمارے ڈرائنگ روم کے سامنے تھی۔

تم میری خاموشی سے تنگ تھے، اور میں تمھاری ان بیجا حرکتوں سے عاجز۔ تم تو ٹھہرے مرد۔ تم مذہب کی اس اونچی دیوار کو گرانے کے لیے تیار تھے۔ لیکن میں .... میں ... کیا ایسا کر سکتی تھی۔؟ شاید ... مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس دیوار کو گرا سکتی۔ ... اور ۔ اور .. اگر کوشش کرتی بھی تو شاید ....

شاید خود اس میں دب کر مر جاتی۔

تمھارے اوپر تو عشق کا بھوت سوار تھا، اس لیے تمھیں اپنے ماں، باپ، بہنیں، ذات، برادری اور سماج کا کوئی پاس نہیں تھا لیکن ..... میرے سامنے تو میرے والدین، بھائی بہن، خاندان اور سماج سبھی کچھ تھا۔ میں کس طرح سب کچھ ٹھکراتی۔ شاید میں ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔ جو اپنی محبت پر اپنے خاندان کو قربان کر دیتی ہیں اور سب کی عزت کو خاک میں ملا کر گھر سے فرار ہو جاتی ہیں۔

میں تم کو سمجھانا چاہتی تھی، لیکن ایسا کر نہ سکی، کیوں کہ تم اتنے جذباتی ہو رہے تھے کہ تمھاری صورت دیکھ کر مجھے خوف لگتا تھا۔ ڈرتی تھی کہ اچانک تم کوئی نئی حرکت نہ کر بیٹھو، اسی لیے میں نے باہر آنا جانا بھی ترک کر دیا تھا، تاکہ تم میری صورت ہی نہ دیکھ سکو شاید ... یہ بات تمھیں اور بھی ناگوار لگی تھی۔

اس روز جب میں کالج جا رہی تھی اور تم اپنے دروازے پر کھڑے تھے، مجھے دیکھتے ہی تم دوڑے تھے اور آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا تھا۔

"تم اتنے دن سے کہاں تھیں۔؟ کالج کیوں نہیں جا رہی تھیں چھت پر بھی نظر نہیں آئیں ..... اتنا ظلم مت کرو پلیز .... جانتی ہو جب سے تمھیں نہیں دیکھا، ایک پل کے لیے بھی سو نہیں سکا ہوں ... بھگوان کے لیے اتنا انیائے مت کرو۔ میں تمھیں ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتا ہوں۔ میرا وشواس کرو۔ میں تمھارے بنا زندہ نہیں رہ سکتا۔"

تم نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ میرا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے کچھ باتیں سنیں اور کچھ سن ہی نہیں سکی اور جلدی سے تم سے بچ کر نکل گئی تھی۔

سچ جانو۔ اس دن تمھاری اس حرکت نے میرا دل توڑ دیا تھا تم روز ایک نئی حرکت کر بیٹھتے اور میں چپ چاپ سہہ جاتی۔ میں کیا کروں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تم آخر سمجھتے کیوں نہیں کہ میں کتنی مجبور ہوں۔ تم مجھے رسوا کرنا چاہتے تھے ....؟ میں دن رات اسی الجھن اور خوف میں رہتی تھی، کہ کہیں ان باتوں کا چرچا محلے میں نہ ہونے لگے۔ جتنے منھ اتنی باتیں بن جائیں گی۔ میں کس کس کو بتاؤں گی کہ یہ سچ نہیں ہے.....

اس دن کے بعد میں اپنے بھائی کے ساتھ کالج جانے لگی تھی تاکہ تم کو اتنا موقع ہی نہ ملے۔ میری اس حرکت نے تمھیں اور بھی پاگل بنا دیا تھا۔... پتہ نہیں کیوں تمھاری حالت جاننے کی خواہش دل میں رہتی تھی اور کسی نہ کسی بہانے تمھاری بہنوں سے تمھارے بارے میں معلوم کر لیتی۔

مجھے معلوم تھا تم بہت پریشان ہو گئے۔ لیکن میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ تمھاری محبت کا میرے

پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے تم سے ہمدردی ضرور تھی، لیکن ..
تمہاری غلط حرکتوں پر غصہ بھی آنے لگا تھا۔ کیونکہ مجھے اپنے
والدین کی عزت سے زیادہ عشق پر کوئی چیز نہیں تھی اور ... تم
اس کو ہی نیلام کرنے پر آمادہ تھے تبھی تو .....

۲۸ دسمبر کی اس برفیلی رات کو جب میں لحاف
اوڑھے لیٹی تھی، سرد ہوائیں چل رہی تھیں، لحاف سے باہر
منہ نکالنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ محلے میں شادی تھی، میرے
علاوہ گھر کے سارے لوگ شادی میں شریک تھے۔ میں لیٹی ہوئی
تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ اچانک باجے کی آواز مجھے
سنائی دی۔ شاید بارات آگئی —

میں نے جلدی سے لحاف کے باہر منہ نکالا کہ بارات دیکھیں
پھر سوچا، ہشت کون سردی میں باہر نکلے، پتہ نہیں کیوں لوگ
اتنی سردی میں شادی کرتے ہیں، میں نے دل ہی دل میں سوچا
پھر لیٹ گئی۔ لیکن باجے کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی — شاید
بارات نزدیک آگئی ہے۔ میں جلدی سے لحاف کے باہر نکلی
پلنگ سے کود کر چھت پر بھاگی۔

میں دیوار پر لٹکی بارات دیکھ رہی تھی۔ لڑکے گانے کی دھن
پر ڈانس کر رہے تھے۔ میں ڈانس دیکھنے میں مصروف تھی کہ
اچانک مجھے اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا — میرا پورا جسم
ایک انجانے خوف سے لرز اٹھا — میں نے پلٹ کر دیکھا —
تم کھڑے تھے۔

میں دم بخود رہ گئی۔ شاید تم اپنی چھت سے پھاند کر آئے
تھے — میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا — میں پھٹی پھٹی
آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہی تھی.... تم نے آج کتنا غلط کام کیا تھا۔
میرے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔
— تم میرے قریب آرہے تھے — اور — اور.. میں پیچھے
ہٹتی جا رہی تھی — تمہاری آنکھوں سے دیوانگی ٹپک رہی تھی۔
— تمہاری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ تم پاگلوں کی طرح
میرے قریب آ رہے تھے اور میں پیچھے ہٹتی جا رہی تھی .....

میں پیچھے ہٹتی گئی۔ ہٹتی گئی — اور... اور دیوار سے لگ گئی.... تم
نے آگے بڑھ کر میرے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی سے
تھام لیا۔ تمہاری سانسوں کی تپش میرے سرد جسم کو پگھلا رہی تھی —
میں نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تمہاری آواز میرے
کانوں میں آرہی تھی۔

"آنکھیں کھولو ... پلیز آنکھیں کھولو... ڈرو نہیں ...
میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں .... آج اس خاموشی کو توڑ دو..
ورنہ .... ورنہ میں مر جاؤں گا"..

تمہاری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

"دیکھو .... میں مذہب اور سماج کو نہیں مانتا .... میں
تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں... سب کچھ.... بس ایک بار
.... صرف ایک بار مجھے اپنا کہہ دو... پلیز!"

تم میرے اور قریب آگئے تھے۔ تمہاری گرم سانسیں میرے
چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں خاموش تھی۔ خوفزدہ تھی۔

"کیا گونگی ہو .... ؟ بولتی کیوں نہیں .... کچھ تو بولو "۔
تم نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا — " تمہارا ایک لفظ بھی
میرے لیے قیمتی ہوگا۔ بہت قیمتی — بولو..... پلیز — کچھ تو بولو —
اگر آج تم کچھ نہ بولیں تو یاد رکھنا میں آتم ہتیا کرلوں گا۔"

تمہاری گرفت اور مضبوط ہوگئی تھی — پھر اچانک پتہ نہیں کہاں سے
مجھ میں طاقت آگئی تھی۔ نفرت اور غصے سے میرے ہونٹ
کھلے تھے —

"مرنے والے کہا نہیں کرتے — مر جاتے ہیں..."

میرے ان الفاظ نے آگ پر پانی کا کام کیا تھا۔ تمہارا سارا
نشہ دور ہو گیا تھا۔ تمہاری گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تمہارے ہاتھ بے جان
ہو کر نیچے لٹک گئے تھے — میں اپنا ڈوپٹہ سنبھالتے ہوئے نیچے
بھاگی تھی۔ تم وہیں کھڑے رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا
کہ تم کیا کر رہے ہو — میں دوڑ کر اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ
بند کر لیا۔ سخت ٹھنڈک کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا
تھا۔ میں نے گلاس میں پانی لیا اور ایک ہی سانس میں پی گئی —

اور کچھ دیر یونہی بے جان سی پلنگ پر پڑی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود پر قابو پا سکی تو لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

اس رات میں سو نہ سکی تھی۔ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ گھر کے سبھی لوگ شادی سے واپس آکر نیند کی آغوش میں پناہ لے چکے تھے۔ لیکن میں دیوار پر لگی گھڑی کے ساتھ رات بھر جاگتی رہی کہ پتہ نہیں اب کیا ہوگا ـــــ میں نے ایسا کیوں کہہ دیا لیکن تم نے بھی تو غلطی کی تھی ـــــ نہیں.... میں تم سے معافی ضرور مانگ لوں گی ـــ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا ـــــ میں نے آج بہت بڑی بھول کی تھی ـــــ صبح ہی میں تم سے ملوں گی ـ تب تو تم مجھے ضرور معاف کر دو گے .. ... پتہ نہیں کیوں مجھے اتنا خوف لگ رہا ہے ... کہیں کچھ انہونی نہ ہو جائے ...

اسی طرح چار بج گئے تھے ـ پھر پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی، اور صبح ایک دردناک چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی ـــ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی ـــــ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی ـــــ میں نے غور کیا .. نہیں.... یہ کوئی ڈراؤنا خواب نہیں تھا ـــــ تمہارے گھر سے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

□□

ایک زمانہ وہ بھی تھا.......

ص۳۴ کا بقیہ

دَردوَروں سے اٹھا ہوا تھا ـ گالیاں دیتا رہا وہ اور کپڑے پہنتا رہا ـ عالم غیظ و غضب میں جب وہ جانے لگا تو حکیم صاحب نے کہا، ـــــ

"اب کبھی درد کا دورہ نہیں پڑے گا"

ڈیڑھ سال تک وہ انگریز ڈپٹی کمشنر اس ضلع میں رہا۔ درد کا دورہ کبھی نہیں پڑا ـــــ جب تک رہا حکیم جی کا مُرید بن کر رہا ـ

□□

غزل

درد اور بڑھے گا تو کسک اور بڑھے گی
تم تیر نکالو گے کھٹک اور بڑھے گی

یہ شاخِ نشیمن ہے ابھی بات ہی کیا ہے
آئیں گی بہاریں تو لچک اور بڑھے گی

ساحل سے جھجکتے ہو تو آگے نہ بڑھو تم
دیکھو گے تلاطم تو جھجک اور بڑھے گی

کلیوں نے ابھی کھولی ہیں آنکھیں ابھی کیا ہے
آئے گا نکھار ان پہ مہک اور بڑھے گی

دردِ غمِ جاناں ہے ذرا ضبط سے لو کام
تڑپو گے تو نس نس میں چمک اور بڑھے گی

یہ سوچ کے میخانے چلا جاتا ہوں اکثر
یاد آؤ گے تم غم کی لپک اور بڑھے گی

دیوانہ ہے جانے دو غبارؔ اس سے نہ بولو
چھیڑو گے اسے اس کی کسک اور بڑھے گی

پتہ اسرار حسین غبارؔ سندیلوی
۲۶۲/۹۱ کٹرہ اعظم بیگ ـ لکھنؤ

غزلیں

لہو دے کر بھی یہ سودا نہ ہوگا
زمانے میں کوئی اپنا نہ ہوگا

جسے سن کر زمانہ رو دیا تھا
حقیقت ہوگی، افسانہ نہ ہوگا

کبھی ایسا بھی وقت آئے گا یارب
کوئی جب شہر میں بھوکا نہ ہوگا

مرے ہاتھوں میں جب آئینگے پیسے
کھلونے بیچنے والا نہ ہوگا

کمی مخمورؔ کی محسوس ہوگی
تری محفل میں ورنہ کیا نہ ہوگا

—— مخمورؔ کاکوروی
کاکوری لکھنؤ، ۲۲۷۱۰۷

بجھا سکی نہ تشنگی شراب انقلاب کی
جدھر بھی ہم گئے ادھر فضا ملی سراب کی

ہماری زندگی اسی فریب نے خراب کی
کرم کا ان کے آسرا مصوری تھی خواب کی

ہمارے دل کی آرزوئیں امیدیں جاگنے لگیں
نظر ہے ان کی یا کوئی کرن ہے آفتاب کی

غرورِ شوقِ دید پہ گریں ہزاروں بجلیاں
نہ تاب لا سکی نظر جمالِ بے نقاب کی

نہ پوچھو طارقؔ آج کل ہے کیا مآلِ دوستی
کسی کو بھی خبر نہیں کسی کے اضطراب کی

—— ڈاکٹر طارقؔ ایرانی
مکان نمبر ۴۸/۴ چمن گنج، نالہ روڈ
کان پور

زندگی کھو گئی کتابوں میں
ہر خوشی کھو گئی کتابوں میں

عشق کا نام ہے زبانوں پر
عاشقی کھو گئی کتابوں میں

خود نمائی جہاں میں عام ہوئی
سادگی کھو گئی کتابوں میں

ذہن پر چھا گئی ہے تاریکی
روشنی کھو گئی کتابوں میں

سر جھکاتے ہیں ہم فقط اخترؔ
بندگی کھو گئی کتابوں میں

—— سلیم اخترؔ سیتاپوری
شیخ سرائے۔ سیتاپور

کہاں اب ایسے اربابِ گلستاں دیکھنے والے
پسِ پشتِ خزاں رنگِ بہاراں دیکھنے والے

ذرا دیکھیں جنونِ فتنہ ساماں دیکھنے والے
لگا کر آگ دامن میں گریباں دیکھنے والے

سبک سارانِ ساحل کر نہیں سکتے ہیں اندازہ
وہ کوئی اور ہی ہیں نبضِ طوفاں دیکھنے والے

بکھر جائے گا یونہی ایک دن شیرازۂ ہستی
کتابِ دل کے اوراقِ پریشاں دیکھنے والے

صداؔ خاموش ہے اور گوش بر آواز ہے عالم
یہ منظر ہے سبق آموز دوراں دیکھنے والے

—— صداؔ لکھنوی
تکیہ پیر جلیل (شمال)
گولہ گنج۔ لکھنؤ

نئی سرکار جنتا کے دوار

اُتر پردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

موجودہ حکومت نے جب کام سنبھالا تو اتر پردیش کے چاروں جانب عدم تحفظ اور عدم اعتماد کا ماحول تھا۔ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں سے نبرد آزما تھے۔ فرقہ پرستی اپنی انتہا پر تھی اس غیر یقینی اور عدم تحفظ کے ماحول میں سماج کی آخری قطار میں کھڑا ہوا بے سہارا آدمی سب سے زیادہ مصیبت میں تھا۔ حکومت کی نظم و نسق پر گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ایسی حالت میں سماج دشمن طاقتوں اور مافیہ سرداروں کی بن آئی تھی۔ اسی لیے امن اور قانون کے محاذ پر مکمل فتح حاصل کرنے اور سماجی برائیوں نیز عدم تحفظ کا ماحول ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے فسادات سے پاک ریاست اور خوف سے پاک سماج کی تعمیر کا عہد کیا گیا۔

گزشتہ ایک سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ بغیر کسی ذات، مذہب اور جنس کی تفریق کے ریاست کے کروڑوں لوگوں کو خوف سے نجات دلانے کے لئے حکومت نے بہت کامیابی کے ساتھ کام کیا۔ اتر پردیش ایک طرح سے فرقہ وارانہ فسادات کے لیے بدنام ہو گیا تھا اور اشیائے ضروریہ کے لئے عام آدمی ترس رہا تھا۔ اس ریاست کو پر امن اور بے خوف بنانے کا اہم کام اس سرکار نے تھوڑے ہی دنوں کے اندر کر دکھایا۔

کسی سماج یا نظام کے لیے دس گیارہ مہینے یا ایک سال کا وقت بہت کم ہوتا ہے۔ سماجی ناانصافیوں اور مظالم نیز ترقی کی رفتار میں رکاوٹ ڈالنے والی جو طاقتیں ایک طویل عرصے سے اپنی جڑیں مضبوط کیے بیٹھی تھیں، ان کی الگ حکمرانی ہوتی ہے۔ انھیں اکھاڑنے اور انصاف و مساوات نیز ترقی کا پودا لگانے کے لیے ایک سال کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ حکومت اور انتظامیہ نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے اور اتر پردیش میں اقتصادی ترقی نیز تحفظ کے نقوش سماج میں نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔

گزشتہ سال ۲۴ جون ۱۹۹۱ء کو جب بے حد نامساعد حالات میں موجودہ سرکار نے اقتدار سنبھالا تو وہ ایسا وقت نہیں تھا کہ سیاسی یا انتظامی سطح پر لمبے چوڑے اعلانات کیے جاتے۔ سابقہ تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ "اعلان کلچر" نے ایک طرح سے ریاست کو نقصان ہی پہونچایا۔ اسی لئے موجودہ سرکار نے اپنا معیار اعلانات کو نہ بنا کر کام کو بنایا ہے اس سرکار کا نظریہ یہ رہا ہے کہ مسلسل جد و جہد سے "کام کے کلچر" کے وجود میں آنے سے ریاست کی فلاح و بہبود ممکن ہو سکے گی۔

ریاست میں مافیہ نظام کی بالادستی کو ختم کر دیا گیا ہے۔ فرقہ پرستی سے کامیابی کے ساتھ ٹکر لی گئی اور گزشتہ تیس برسوں میں پہلی بار سبھی تیوہار پر امن طور پر منائے گئے۔ دہشت گردی سے نپٹنے کے لئے "اسپیشل ٹاسک فورس" بنائی گئی ہے اور درج فہرست ذات اور قبیلے کے لوگوں کو پریشان کرنے کے واقعات کو روکنے کے لئے ضلع مجسٹریٹوں کو سخت ہدایات دی گئی ہیں۔

ریاست میں خصوصی کوشش کے نتیجے میں گزشتہ سال کے مقابلہ میں دودھ کی پیداوار میں ۲۰ فیصد کا اضافہ کیا گیا۔ زراعت کے زمرے میں ۱۰ سے ۱۲ گھنٹے تک مسلسل بجلی سپلائی کر کے نہروں سے پانی کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بجٹ کا ساٹھ فیصد دیہی علاقے کے لیے

مختص کیا گیا ہے۔ گاؤکشی پر مکمل پابندی لگا دی گئی ہے۔ صنعت کاری کو نئی جہت دی گئی ہے۔ نئی راشٹی پالیسی کے تحت ۵۰ فیصد نجی زمرے کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ نجی زمرے کے سامنے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ انھیں ۳۰ فیصد مکانات غریب طبقے کے لیے بنانے ہوں گے۔ سیلس ٹیکس نظام کو آسان بنا کر ٹیکسوں میں کمی کی گئی ہے۔
آٹھویں منصوبے میں ریاست کے نوجوانوں کے لیے ۵۰ لاکھ کے بقدر مزید روزگار پیدا کرنے کے نشانے کے تحت ۶ فیصد شرح نمو مقرر کی گئی ہے۔ اس منصوبے میں خط افلاس کے نیچے زندگی گزارنے والوں کی آبادی ۳۵٫۴ فیصد سے گھٹا کر ۳۴٫۲ فیصد کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ علاقائی عدم توازن کو ختم کرنے کا عہد کیا گیا ہے۔
یہ سرکار "سیکولرازم" پر یقین نہ کرتے ہوئے پنڈت دین دیال اپادھیائے کے خوابوں کے مطابق "وحدت انسانی" پر یقین کرتی ہے۔ پنڈت دین دیال اپادھیائے کے فلسفے کو عملی جامہ پہنانا ہی حکومت اتر پردیش کا مقصد ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کا جو عہد حکومت اتر پردیش نے کیا ہے اس کے کچھ نتائج اور کچھ امکانات درج ذیل ہیں:

آٹھواں پنجسالہ منصوبہ: نئی ترجیحات

- عمومی آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے اخراجات ۲۱۰۰۰ کروڑ روپئے مقرر۔ جو عمومی ساتویں منصوبے سے ۱۰۱ فیصد زیادہ ہے خصوصی مرکزی امداد کے طور پر ۱۰۰۵ کروڑ روپے ملنے کا اشارہ۔
- آٹھویں منصوبے کی مدت میں معیشت کا محور "فرد" اور معاشی ترقی کا مقصد "جنتا کے دوار، جنتا کے لیے، جنتا کی ترقی"۔
- خصوصی پانچ نکاتی پروگرام پر زور:
  ۱. گاؤں، غریب، کسان
  ۲. جھگی جھونپڑی کے انسان
  ۳. بے روزگار نوجوان
  ۴. ناری کا سمان (عورتوں کا احترام)
  ۵. دلتوں، پچھڑوں، شرمکوں اور شوشتوں کا اتھان (دبے

پچھلے، پسماندہ، محنت کش اور استحصال زدہ افراد کی فلاح و ترقی)

- چھ فیصد سالانہ شرح نمو جس میں زراعت کی شرح کا سالانہ نشانہ ۳٫۴ فیصد۔
- خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد کو آبادی کے ۳۵٫۴ فیصد سے گھٹا کر منصوبے کے آخر تک ۳۴٫۲ فیصد کرنے کا نشانہ۔
- ۵۰ لاکھ افراد کے لئے خود روزگاری کے مواقع پیدا کرنا۔ زراعت کے زمرے میں نیم بے روزگاری میں خاطر خواہ کمی کرنے کی کوشش۔
- مجموعی بجٹ کا کم سے کم ۶۰ فیصد دیہی علاقے کے پراجیکٹوں کے لیے مختص۔
- خواتین کی تعلیم کو خصوصی اہمیت۔
- اضافہ آبادی کی شرح میں کمی کی کوشش۔

امن و قانون: ہر محاذ پر کامیابی

- فسادات سے پاک ریاست اور خوف سے پاک سماج کی تعمیر کا عزم۔
- مافیہ نظام کی بالادستی ختم۔
- فرقہ پرستی پر قابو
- دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے موثر اقدامات
- دہشت گردوں اور فسادیوں سے مقابلہ آرائی میں فوت ہونے والے پولیس والوں کے پسماندگان کے لیے امداد کی رقم کو بڑھا کر اب ایک لاکھ روپیہ کرنے کا بندوبست۔ متوفی پولیس والوں کے وارث کو سرکاری ملازمت میں لینے کی پالیسی میں اب اور نرمی۔ کنبے کو اس وقت تک پوری تنخواہ، جب تک اس کا وارث سرکاری ملازمت کی عمر کو نہ پہونچ جائے۔
- جمہوری نظام کے مطابق نومبر ۱۹۹۱ء میں سبھی ضمنی انتخابات پُرامن طور پر منعقد۔ نہ کہیں تشدد۔ نہ کہیں بوتھ کیپچرنگ۔

- درج فہرست ذات / قبیلے کے لوگوں کو پریشان کرنے کے واقعات کو روکنے کو ترجیح۔
- جرائم کا درست رجسٹریشن اور تفتیش کے معیار کو بلند کرنے کے لیے سخت احکامات۔
- نشہ آور اشیاء سے متعلق جرائم پر موثر کنٹرول۔
- کاسہ لیسی اور جسم فروشی جیسی سماجی برائیوں پر موثر کنٹرول۔
- ڈاکوؤں کی سرکوبی کی مہم میں تیزی۔

دیہی ترقی: سرمائے کا رخ گاؤں کی جانب

- کسانوں کے مسائل کو مقامی سطح پر ہی فوری طور سے حل کرنے اور ہر ممکن سہولت ایک ہی مقام پر مہیا کرانے کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۲۵ ستمبر ۱۹۹۱ء سے ہر گاؤں پنچایت میں کسان سیوا کیندر قائم کر کے ان کے مسائل کو ہفتہ وار حل کرنے کی راہ میں پیش رفت۔
- گزشتہ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں جواہر روزگار یوجنا کے تحت سبھی پنچایتوں کا احاطہ کر کے ۴۸۱۴۶۶۸۳ لاکھ روپے کے وسائل بروئے کار لائے گئے جو گزشتہ سال کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔
- اترانچل کے زلزلہ سے متاثرہ تین اضلاع میں پانچ ہزار مزید اندرا مکانات کے لیے نیز دو اضلاع میں جواہر روزگار اسکیم کے تحت مزید رقم کی تقسیم۔

دین دیال ترقیاتی اسکیم: روزگار چھتری کا تصور

- روزگار کے ذریعے میں نئی پیش رفت کو ظاہر کرنے کے لئے ایک نئی شروعات۔
- غریبی اور بے روزگاری دور کرنے کے لیے پوری ریاست میں "روزگار چھتری" بنانے کے عہد کے مطابق ۱۰۵۸۹۱۱۶۸ لاکھ روپے خرچ کر کے ۱۲ منظور شدہ اسکیموں کے توسط سے ۱۳۵۸۲۶ افراد کو مستقل روزگار دلانے کے مقصد کے تحت دیہی ترقیاتی اسکیم کے ذریعہ ۴۶ اضلاع منتخب
- نیوماڈل چرخہ اسکیم کے تحت اسکیم کے لئے ۲۲۱۹۵ لاکھ روپے تقسیم۔ ۸۰۰۰ چرخوں اور ۱۰۰۰ امبیڈ لوموں کی تقسیم ۱۵۰۰۰ افراد کے لیے روزگار کے مواقع۔
- آٹھ اضلاع میں مربوط ترقی مویشیاں کی خود روزگار اسکیم شروع کر کے ۱۱۵ نوجوانوں کو روزگار کے مواقع مہیا کرانے کا آغاز۔

زراعت: ہر ممکن سہولت دینے کی کوشش

- ماہ جون، جولائی اور اگست ۱۹۹۱ء میں ۱۰ سے ۱۲ گھنٹے تک مسلسل بجلی سپلائی، نہروں سے پانی کا مسلسل بندوبست نیز ڈیزل کی بلا رکاوٹ سپلائی۔
- آب پاشی سے متعلق کسانوں کے مختلف مسائل کا ہر ممکن حل ضلع کی سطح پر ہی نکالنے کے لئے ضلع صدر دفتر پر "جن پد سینچائی بندھو" کی پہلے سے مقررہ تاریخ کو باقاعدہ طور پر ہر ماہ میٹنگ کا انعقاد جس کے نتیجے میں آب پاشی سے متعلق مسائل کا اب ضلع کی سطح پر ہی حل۔

صنعت: خصوصی سہولتیں

- صنعتوں پر نافذ مختلف قوانین وضوابط نرم۔ اس سلسلے میں کی گئی کوششوں کی مرکز کی جانب سے تعریف۔
- یک مقامی بندوبست کے توسط سے لال فیتہ شاہی کو ختم کرنے کی کوشش۔
- صنعتوں کے لئے بجلی کی دستیابی کو یقینی بنانے اور انھیں توانائی پلانٹ لگانے کی منظوری۔
- سیلس ٹیکس کے ڈھانچے میں سدھار اور اس کا طریقہ کار آسان۔
- نئے واحدوں کے قیام اور پرانے صنعتی واحدوں کی توسیع، ان کی جدید کاری وغیرہ کے لیے سیلس ٹیکس میں چھوٹ کی نئی پالیسی کا اعلان۔ مختلف زمروں کے تحت آٹھ سے ۱۰ برسوں کی مدت کے لیے سیلس ٹیکس سے چھوٹ کی سہولت۔

- ریاست میں سرمایہ کاری کے خواہش مند ہندستانیوں کی سہولت کے پیش نظر کمشنر غیر مقیم ہندستانی کے عہدہ کی تشکیل۔
- سوتی۔ اونی۔ ریشمی اور پالیسٹر کپڑوں میں اچھا سدھار لانے کے لیے ہینڈلوم انعام اسکیم کی شروعات۔
- بنکر فلاحی فنڈ کے توسط سے غریب دستکاروں کو ۱۸ لاکھ روپئے کی گرانٹ تقسیم، جس سے ۳۳۲۵ بنکر مستفید۔

سیلس ٹیکس: آسان طریقہ کار کے فوائد

- مختلف اشیائے صرف پر سیلس ٹیکس کی شرحوں میں کمی اور کچھ اشیاء مکمل طور سے ٹیکس سے مستثنیٰ۔
- سیلس ٹیکس کے طریقہ کار کو آسان بنانے کے مقصد سے سمری ڈسپوزل اسکیم کا دائرہ عمل ۱ لاکھ روپئے سے بڑھا کر ۲۵ لاکھ روپئے کیا گیا۔

توانائی: نیا بندوبست

- بجلی کنکشن دینے کے طریقہ کار کو آسان بنانے اور مقررہ مدتی عمل آوری کے ذریعہ تقریباً ۲۸۵ نئی صنعتوں کے لئے بجلی لوڈ منظور کیا گیا۔
- صارفین کی جانب سے اپنی صنعت چلانے کے واسطے ڈیزل جنریٹنگ سیٹ لگانے کی اجازت بلا تاخیر دیئے جانے کے لئے آسان طریقہ کار۔
- سال ۱۹۹۱ء میں جون سے اگست تک کی مدّت میں تاخیر سے ہونے والی بارش کی وجہ سے تشویشناک خشک سالی کا بجلی کی کمی ہونے کے باوجود مقابلہ کیا گیا۔ زرعی زمرے کو آبپاشی کے واسطے اوسطاً ۱۱ سے ۱۲ گھنٹے یومیہ بجلی کی سپلائی۔
- خراب اقتصادی صورت حال کے باوجود اس سال ۴۴۸۳۰ ناقص سپلائی ٹرانسفارمر تبدیل کیے گئے جو کہ اس سے قبل کے برسوں میں اتنی بڑی تعداد میں کبھی تبدیل نہیں کیے گئے تھے۔
- سال ۹۲۔۱۹۹۱ء میں اوسطاً ۸۲٫۸ ملین یونٹ یومیہ کی سپلائی کی گئی جو سال ۹۱۔۱۹۹۰ء میں ۷۷٫۷ ملین یونٹ بجلی سپلائی کے مقابلے میں ۶٫۵ فیصد زیادہ۔ اس سال ۴۵۰۵ میگاواٹ کا ریکارڈ "پیک لوڈ" دیا گیا۔
- ریاستی حکومت کی نجی زمرے میں بجلی کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کرنے کی پالیسی کے تحت جگدیش پور اور شاہجہاں پور میں بالترتیب ۲۱۰ اور ۶۰۰ میگاواٹ کی صلاحیت کے گیس پر مبنی بجلی گھر کی تعمیر کے واسطے صنعت کار کا انتخاب۔

صحت: قابل ذکر کامیابیاں

- خالی عہدوں کو پر کرنے کی مہم بروئے کار لاکر مجموعی طور پر ۲۰۷۸ میڈیکل افسروں کی تقرری۔
اترانچل میں برسرکار ۵۹۱ جز وقتی ڈاکٹروں کی باضابطہ شرح تنخواہ میں ایڈہاک تقرری کا فیصلہ۔
- وٹامن۔ سیرپ۔ کم فائدہ مند اور مہنگی دواؤں کی خریداری پر پابندی۔
- ایلوپیتھک اسپتالوں میں آیورویدک دواؤں کی خریداری پر بندش۔ دواؤں کے لیے باضابطہ طور پر رقم کا الاٹمنٹ۔

سب کے لیے تعلیم

- تعلیمی خدمات کمیشن کی دفعہ ۱۶ ختم۔ انتظامیہ کی ایڈہاک تقرریاں کرنے کا اختیار ختم۔ ایڈہاک ازم کا خاتمہ۔
- جز وقتی اساتذہ کی کم سے کم تنخواہ ۳۵۰ روپے سے بڑھا کر ۱۱۰۰ روپے۔ اترانچل میں سبکدوش اساتذہ کی جز وقتی استاد کے طور پر تقرری کرنے کا بندوبست۔
- بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی کو ۱۰ کروڑ روپئے کی امداد دینے کا فیصلہ۔
- ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحانات میں نقل اور اس سلسلے میں غیر مطلوب سرگرمیوں پر بندش عاید کرنے کے واسطے آرڈی ننس جاری کر کے اسے جرم قرار دیا گیا۔ ہائی اسکول اور انٹرمیجیٹ کے سال ۱۹۹۲ء کے امتحانات میں نقل کرنے پر کنٹرول کرنے میں

کامیابی۔ امتحانات پوری طرح پُرامن طور پر ہوئے۔

- بجٹ کی تقسیم کے بندوبست کو دیہی سطح پر مرکوز کرکے گرام سبھا کے ذریعہ سے وظائف کی منظوری اور تقسیم۔
- غیر سرکاری جونیئر اسکولوں کو تسلیم شدہ اسکول بنانے کی شرائط میں اہم تبدیلیاں۔
- پردیش میں حرف شناسی کی شرح کو توسیع کے پیش نظر چند اضلاع میں "حرف شناسی مہم" چلانے کا فیصلہ۔ اس مہم کے ذریعہ ایک مقررہ مدت میں خصوصی شہر میں تمام حرف ناشناس افراد کو حرف شناس بنائے جانے کا منصوبہ تیار۔
- پردیش کے غیر سرکاری کالجوں میں خالی اسامیوں پر باضابطہ تقرری کے لیے ضابطۂ ملازمت کو حتمی شکل دی گئی۔
- انسٹ کی مدد سے ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے تعلیم کے پیش نظر پردیش میں پہلے سے چل رہے ریاستی تعلیمی تکنیکی ادارے کے معیار میں سدھار اور جدید ترین تعلیمی تکنیک کی نشر و اشاعت کے پیش نظر آزاد ادارے کی شکل میں کام کرنے اور فروغ دینے کا فیصلہ۔
- تعلیم کی صد فیصد توسیع اور اس کا فائدہ عوام کو دلانے کے لئے "تعلیم سب کے لیے" کے عنوان سے ایک پروگرام ورلڈ بینک کی امداد سے چلائے جانے کے لیے ابتدائی مرحلے میں دس اضلاع کو منتخب کیا گیا ہے۔

غذا و رسد کی تقسیم میں سُدھار

- کسانوں کی راحت کے لیے سرکاری گیہوں خرید میں کسی بھی طرح کٹوتی پر پابندی۔
- عوامی تقسیم کے نظام کے تحت سدھار لانے کے پیش نظر اگست ۱۹۹۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء تک خصوصی مہم چلا کر ۸۷ء۲ کروڑ فرضی یونٹ رد۔
- پردیش میں اناج اور اشیاء ضروری کی قیمتوں میں توسیع کے رجحان پر قابو پانے کے پیش نظر ضلعی سطح / گرام سبھائی سطح نیز بلاک سطح پر نگراں کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی۔
- اشیاء ضروری کی دستیابی کو قائم رکھنے اور بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پانے اور اناج یا دیگر ضروری اشیاء کی جمع خوری اور کالا بازاری کو روکنے کے لیے ۲۹ جنوری ۱۹۹۲ء کو ایک خصوصی جانچ مہم چلا کر ۱۸۰۲ چھاپے مارے گئے۔ ۹۳، ایف۔ آئی۔ آر درج کرائی گئیں، ۹۲ افراد گرفتار کیے گئے، ۲ لائسنس رد کیے گئے۔ ۲۸۵، ۲۹، ۹۶ روپے قیمت کی چیزیں ضبط کی گئیں

آواس وکاس : ہر ایک کو گھر فراہم کرنے کی پالیسی

- ہر خاندان کو ایک گھر فراہم کرنے کے لیے آواس پالیسی میں ضروری ترمیم کا فیصلہ
- رہائش تعمیر کے لیے زمین سے متعلق دشواریوں کو حل کرنے کے لیے شہروں میں دستیاب نزول زمین کے انتظام اور ان کی تقسیم کا بندوبست کیا گیا۔ نزول زمین کو پٹے پر مقررہ رقم جمع کرا کے فری ہولڈ زمین میں تبدیل کر دیا جائے گا۔
- نزول زمین کے اس طرح کے بندوبست سے دستیاب رقم خصوصی طور سے شہری ترقیاتی اور عوام کے راحت کے کاموں پر خرچ کی جائے گی۔
- مکان تعمیر اسکیم کے لیے تمام ذرائع کا مکمل استعمال کیا جائے گا جس میں سرکاری اتھارٹی نجی اور امداد باہمی علاقوں کا تعاون بھی ہوگا۔
- نجی کالونائزر کے ذریعہ تعمیر شدہ کل رہائشی واحدوں میں ۳۰ فیصد مکان مالی طور سے پس ماندہ افراد کو فراہم کرائے جائیں گے جن کی قیمت ہڈکو کے ذریعہ ایسے مکانوں کے لئے مقررہ سیلنگ زیادہ نہ ہوگا۔
- آواس وکاس پریشد کے ذریعہ گزشتہ ۳۱ مارچ تک تیار تمام مکانوں کا الاٹمنٹ مئی کے آخر تک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں پریشد کے ذریعہ سب سے زیادہ ۲۳۵۰۰ مکان الاٹ کیے گئے جن میں سے دس ہزار مکانات گزشتہ فروری / مارچ میں الاٹ کیے گئے ■■



نام کتاب: معترضین ابوالکلام آزاد
مصنف: عبداللطیف اعظمی
قیمت: ۳۶/- روپئے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

آزاد صدی تقریبات کے حوالے سے اردو میں تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، اس کے زیر اثر مولانا ابوالکلام آزاد پر بعض اچھی اور معیاری کتابیں وجود میں آئیں ۔ زیر نظر تصنیف "معترضین ابوالکلام آزاد" کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے جو دراصل عبداللطیف اعظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مولانا موصوف پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب کے طور پر مختلف موقعوں پر لکھے تھے ۔

عبداللطیف اعظمی کو مولانا آزاد کی ذات سے کچھ اتنی عقیدت رہی ہے کہ انھوں نے مولانا کی شخصیت نیز افکار و نظریات کو ایک مستقل موضوع کے طور پر اپنایا، اور اس ضمن میں متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ماہنامہ "جامعہ" (نئی دہلی) اور سہ ماہی "صبح" (دہلی) کے آزاد نمبر شائع کیے ۔ بقول مالک رام:-

"انھوں نے (عبداللطیف اعظمی) مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق جتنا تحقیقی کام کیا ہے، وہ کیفیت و کمیت کے لحاظ سے کسی اور آزاد شناس سے کم نہیں ہے۔"

جیسا کہ زمانے کا دستور ہے کہ ہر سرگرم اور فعال لیڈر کے جہاں بہت سے حامی و پرستار ہوتے ہیں وہیں ایک صف اس کے معترضین اور مخالفین کی بھی ہوتی ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ بقول مصنف :-

"جہاں انھیں (مولانا آزاد کو) ملک و ملت نے بڑے سے بڑا اعزاز دیا اور ان کے بہت سے معاصرین نے کھلے دل کے ساتھ ان کی عظمت و مقبولیت کا اعتراف کیا، وہاں ان کی زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے ان کے افکار و خیالات کی شدید مخالفت کی اور ان کی ذات پر اور ان کے بعض بزرگوں پر بے بنیاد الزامات لگائے ۔" (ص۸)

فاضل مصنف نے مولانا پر کیے جانے والے اعتراضات کے مدلل اور تسلی بخش جوابات فراہم کر کے یقینی طور پر ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ بھی اس کمال احتیاط کے ساتھ کہ لہجہ کہیں بھی ترش نہیں ہوا ہے ۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے یوں تو سبھی مضامین معلوماتی ہیں لیکن اس سلسلے کا سب سے اہم مضمون "انڈیا ونس فریڈم ۔ ایک تحریری مباحثہ" ہے، جس میں عبداللطیف اعظمی نے بعض حلقوں سے بلند کیے جانے والے اس خیال کو کہ "انڈیا ونس فریڈم مولانا آزاد کی تصنیف نہیں ہے"، کو بڑی خوبصورتی سے آئینہ دکھایا ہے ۔ یہ بحث درحقیقت غلام رسول مہر کے ایک مضمون "آزادی ہند کی کہانی اور مولانا آزاد مرحوم" سے شروع ہوئی تھی. جو انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے "صبح" (جنوری فروری ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا تھا، جس کے جواب میں عبداللطیف اعظمی نے یکے بعد دیگرے کئی مضامین سپرد قلم کیے ۔ مذکورہ مضمون انھیں تحریروں کا مجموعہ ہے جس کے آخر میں بعض دوسرے ادیبوں کی رائیں بھی شامل کر دی گئی ہیں ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں جہاں ادب دوستوں کی دلچسپی کا سبب ہوں گی وہیں مولانا آزاد پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مفید اور کارآمد بھی ثابت ہوں گی ۔

کتاب زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک ہے البتہ ایک دو مقام پر اشعار کی نقل میں سہو ہوا ہے ۔ کتابت اور طباعت صاف اور قیمت مناسب ہے ۔

—————— سید ظفر حسین

نام کتاب: "کیا گھر، نگر کیا خانقاہ"
مصنف: سکندر توفیق   قیمت: تیس روپئے
ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو چارکمان، حیدرآباد ۲

"کیا گھر، نگر، کیا خانقاہ" سکندر توفیق کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں چھ ڈرامے ہیں۔ پانچ طبع زاد اور ایک ڈرامہ "گڑیا گھر" ابسن کے ڈرامہ کی ریڈیائی شکل ہے۔

سکندر توفیق کتاب کے پیش لفظ میں یوں رقمطراز ہیں:

اظہار کی لامحدود وسعتوں میں بھٹکنے کے باوجود ؎

ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ طراز

یعنی طبیعت کی سادگی کے ساتھ ہی وہ ادب میں بھی سیدھی سادی تحریر کے قائل ہیں۔ سکندر توفیق کی فکر اور زاویہ نگاہ مثبت ہے وہ سماج اور معاشرے کو پرسکون اور سادہ لوحی سے برتنے اور سمجھنے کے قائل ہیں، اس میں وہ کوئی الجھاؤ یا تصادم پسند نہیں کرتے، اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے بے جا تغزل یا سسپنس پیدا نہیں کرتے۔

کسی فن پارے یا ادب پارے کا تنقیدی تجزیہ کرنے سے قبل ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ اس فنکار یا ادیب کے سماجی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس کے حصار میں اس کے فن یا ادب کا ذہنی سفر شروع ہوتا ہے ہر فنکار یا ادیب کے فن میں قدم قدم پر اس کے معاشرے اور سماج کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

سکندر توفیق کے ڈراموں میں بھی معاشرے کی ترجمانی ملتی ہے وہ ادب میں وابستگی کے قائل ہیں اور ان کی یہ وابستگی کسی ادبی یا سیاسی تحریک سے نہیں بلکہ ان کی وابستگی اصولوں سے ہے۔ اصول جو زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں، اصول جو انسان کی تسکین قلب کا باعث ہیں۔

سکندر توفیق کا نظریہ حیات انسانوں میں محبت اور ہمدردی کے رشتے کو استوار کرنا ہے۔ ان کے ڈراموں کے موضوعات بھی عام انسانوں کی کہانیاں ہیں جو شب و روز اس سماج میں دہرائی جا رہی ہیں۔

فنی اعتبار سے "کیا گھر، نگر کیا خانقاہ" فن ڈرامہ کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے گو کہ اس کے موضوعات میں کوئی نیا پن نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بات چونکانے والی ہے۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ کے اعتبار سے اس مجموعے کو اور زیادہ توجہ درکار تھی

——— صفیہ اسرار حسین

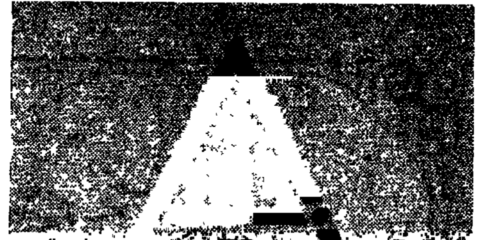
نام: ماہنامہ **الفلاح** بھیکم پور
مدیر: سراج الحق سلفی   زر سالانہ: ۴۰/- روپئے
پتہ: دفتر ماہنامہ **الفلاح** بھیکم پور، کرہ شنکر نگر، بلرامپور
گونڈہ - ۲۷۱۲۰۱

اس پرآشوب دور میں جب مادیت کا سیلاب ہمارے دینی و روحانی ماحول کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے اور اقدار کی شکست و ریخت کا سلسلہ اس طرح جاری ہے کہ ہمارا اخلاقی تشخص مشکوک ہو گیا ہے یہی نہیں بلکہ ہمارے گھروں کی فضا ماضی سے اپنا رشتہ توڑتی چلی جا رہی ہے۔ دردمند دل مضطرب ہیں کہ آخر اس "سحر سامری" کا توڑ کیا ہو۔ الفلاح کے نام سے یہ جریدہ ایسے مضطرب دلوں کی آواز ہے۔ دسمبر ۱۹۹۱ء کا ایک شمارہ میرے پیش نظر ہے۔

آداب تعلقات، آداب معاشرت، عقیدہ سنت و شرع کی روشنی میں، اور یہ تسبیح کے دانے، اسلام ایک کامل و شامل دین، مشکلات اسباب اور علاج، تثلیث سے توحید تک، مسئلہ ولایت نکاح، خیابان سیرت، حرف دانش وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت انتہائی مفید و فکر انگیز مضامین ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ بہترین کتابت و طباعت سے آراستہ یہ ماہنامہ وقت کی ضرورت ہے۔ ایسے رسائل کی ہمارے گھروں میں موجودگی تعلیم و تربیت کا ماحول بیدار رکھے گی۔ ہم اس کی بقا کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اب آخر میں ایک بات زبان کے سلسلے میں۔ مذہب و نظر کے تحت ڈاکٹر فضل الرحمٰن مدنی کی ایک کتاب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جس میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے فاضل مبصر نے نشوونما کو مذکر بتایا ہے۔ لیکن یہ دونوں طرح صحیح ہے۔ صاحب نور اللغات نے تانیث کو ترجیح دی ہے۔

——— رباب رشیدی



جلد ۴۷ نمبر ۵

اگست ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

ٹیلیفون : ـــــــ ۲۴۵۹۹۰

معاونین :

○ ـ نجیب انصاری
○ ـ محمد الیاس خان

ٹیلیفون ـــــــ ۲۴۷۱۰۸

پبلشر ـــ

آنل سروپ

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ

یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

ـــ شائع کردہ ـــ

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

فی شمارہ : ـــ تین روپے

زر سالانہ : ـــ تیس روپے

ـــ ترسیل زر کا پتہ ـــ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

ـــ خط و کتابت کا پتہ ـــ

ایڈیٹر نیا دور ، پوسٹ بکس ۱۴۶ لکھنؤ

ـــ ورسید وصولی ـــ

ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

اے وطن تیرے پرچم اڑاتے ہیں آج　　فتح کے گیت گاتے ہیں آج
ہم کو تیرے سارے شہید　　کس قدر یاد آتے ہیں آج

ہر سال ۱۵ اگست کا دن ہماری تاریخ، ہماری قومی عظمت، وقار، استقلال، جدوجہد اور ایثار و قربانی کی یاد دلاتے ہوئے ایک مقدس عہد کی بھی یاد دلاتا ہے اور ہم سب کو یہ مقدس عہد اپنی قومی تاریخ کے سورما اور نامور شہیدوں کے سامنے کرنا پڑتا ہے۔
ان شہیدوں میں کنور سنگھ، بیگم حضرت محل، رانی لکشمی بائی، بخت خاں، تاتیہ ٹوپے، رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خاں، بھگت سنگھ، ویر ساورکر، برکت اللہ بھوپالی، اونتی بائی، منگل پانڈے، لعل پدم دھر، مہاتما گاندھی ـــ غرض کہ ناموں کی یہ کہکشاں جن کے خون کی سرخی آج بھی صبح و شام شفق بن کر مسکراتی ہے اور ہمیں یاد دلاتی ہے کہ مادر وطن کے ہر ذرے کے لئے ہمیں اپنے کو وقف کر دینا ہے۔
اس تصور کے ساتھ کہ یہ چمن اسی وقت تک سرسبز و شاداب باعظمت و سربلند ہے جب تک ہر کلی نغمہ خواں ہو، نوحہ خواں نہ ہو اور بزم میں سب زندہ ہوں کوئی تشنہ لب نہ ہو۔

آج دنیا بڑی مشکل سے امریکہ جنگ سے چھٹکارہ پا سکی ہے اور ہندوستان اپنی عظیم سنہری روایات اور شاندار تہذیبی وراثت کے ساتھ نہ صرف عالمی امن قائم رکھنے کے لئے اپنا کردار ادا کر رہا ہے بلکہ اس خوبصورت دھرتی کی حفاظت کے لئے بھی اپنی کوشش جاری رکھے ہے۔

تو آیئے آج کے مقدس دن ہم سب مل کر یہ مقدس عہد کریں کہ اپنے ان شہیدوں کے خون کو رائیگاں نہ جانے دیں گے اور اپنے پرچم کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیں گے اور اسے ہمیشہ سربلند رکھیں گے۔

■ اردو کے زبردست عاشق اور ممتاز شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا ۱۷ جولائی کو انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۳ برس کی تھی۔ وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ بیدی صاحب ایک اعلا افسر تھے اور پنجاب و دہلی میں متعدد عہدوں پر فائز رہنے کے بعد کمشنر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ وہ آخری عمر تک دہلی کی ادبی زندگی پر چھائے رہے۔
ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ایڈیٹر

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

خیابان و وادی و صحنِ چمن
گل و لالہ و نرگس و نسترن
شگوفوں کا ہے اس جگہ بانکپن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

ہے رضوانِ فطرت کا ہم پر کرم
ہر اک تختۂ گل ہے باغِ ارم
ہر اک سنگریزہ ہے دُرِّ عدن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہ کوہِ ہمالہ ہے گردوں نشاں
یہی سرحدوں کا بھی ہے پاسباں
جبیں جس کی چھوتا ہے جھک کر گگن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہ سیراب کرتی ہوئی ندیاں
یہ سونا اُگلتی ہوئی کھیتیاں
یہاں خوش خرامیِ گنگ و جمن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

اشوک اور اکبر نے کی ہے عطا
وہ دولت جسے کہتے ہیں ایکتا
یہاں شیخ کے ساتھ ہیں برہمن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

کلیسا یہاں گردوارے یہاں
اٹھی مسجدوں سے صدائے اذاں
الاپا گیا مندروں میں بھجن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہ نانک یہ چشتی یہ خسرو کبیر
یہاں میر و غالب ہیں اکبر نظیر
ہے امن واماں کی یہاں انجمن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

ہیں آزاد و گاندھی و نہرو یہاں
ہیں ٹیگور و حالی و نیڈو یہاں
یہ جگدیش چندر یہ بھابھا رمن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہاں ہستناپور، سانچی، مگدھ
یہ پریاگ، دلی، بنارس، اودھ
یہ تاج و اجنتا کا معیارِ فن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہ گجرات سے ہے منی پور تک
یہ پنجاب سے ارضِ میسور تک
یہ کشمیر و لداخ سے تا دکن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہاں اہلِ دیر و حرم شاد ہیں
اسی در پہ صدیوں سے آباد ہیں
ہے قرنوں سے جاری دلوں کا ملن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

نئی منزلیں بھی ہیں بڑھتے رہو
ترقی کے زینے پہ چڑھتے رہو
ہر اک دل میں تعمیر کی ہو لگن
یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

اقبال ماہر
۲۲۶، نخاس کہنہ۔ الہ آباد

رام لعل

شانتی نکیتن، ڈی۔۲۲۹۔ اندرانگر

لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

خود نوشت سوانحی خاکہ

میں نے خود نوشت سوانح کا ایک سلسلہ "کوچۂ قاتل" کے عنوان سے عرصہ دو سال سے شروع کر رکھا ہے جس کی سترہ قسطیں لکھ چکا ہوں۔ پندرہ کے قریب قسطیں اور ہوں گی۔

اپنے بارے میں لکھتے ہوئے یہ خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے کہ سوانح نگار خود کو ہیرو نہ ثابت کر دے۔ جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ گرد و پیش کے بہت بڑے سماج میں محض ایک ذرّے کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ذرّہ زیادہ چمکدار بھی ہو سکتا ہے اور کم تابناک بھی۔ میرے خیال میں سوانح نگار کے بیان کی صداقت ہی اس کی سوانح کو قابل مطالعہ بناتی ہے اور اس کے تخلیقی کاموں کو سمجھنے میں مدد بھی دے سکتی ہے یعنی تخلیقی کام اور خود نوشت مل کر اس کے ادبی پیکر کو مکمل کرتے ہیں۔

پیدائش۔ تعلیم اور شادی

اسکول کے سرٹیفکیٹ کے مطابق میری پیدائش ۳ر مارچ ۱۹۲۳ء کو میانوالی (مغربی پنجاب) میں ہوئی تھی۔ راجہ رام موہن رائے ہندو ہائی اسکول، میانوالی سے میں نے سکنڈ ڈویژن میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا اس زمانے میں یہ امتحان پنجاب یونیورسٹی کے تحت ہوتا تھا۔ جس کا اوریجنل سرٹیفکیٹ میرے پاس محفوظ ہے۔

میری شادی ۵ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو شکنتلا دیوی (دختر بابو روپ چند اسٹیشن ماسٹر، لارنس پور مغربی پنجاب) کے ساتھ میانوالی میں ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھی میانوالی کے رہنے والے تھے۔ میرے پاس شادی کا چھپا ہوا دعوت نامہ بھی محفوظ ہے۔

آبا و اجداد اور اُن کا وطن

میرے والد صاحب کا نام لچھمن داس چھابڑا تھا۔ وہ بھی ہائی اسکول پاس تھے۔ انھوں نے تاریخ جغرافیہ اور دوسرے مضامین انگریزی زبان کے توسط سے پڑھے تھے۔ وہ انگریزی کے علاوہ صرف اردو جانتے تھے ۱۹۰۴ء میں میانوالی کے قریب ایک موضع وتہ خیل میں پیدا ہوئے تھے۔ انتقال ۱۰ر اپریل ۱۹۷۲ء میں دہلی میں ہوا تھا۔ میرے دادا چھتر رام چھابڑہ تھے۔ ان کا انتقال ۸ر دسمبر ۱۹۵۴ء میں دہلی میں ہوا تھا۔



میرے پردادا کا نام ٹوکر داس چھابڑہ تھا۔ اگرچہ وہ بھی وتہ خیل کے رہنے والے تھے اور وتہ خیل سے میانوالی میں اپنے خاندان کو لاکر بسانے کا سہرا میرے دادا کے سر ہے لیکن میرے اجداد کا حقیقی وطن کہیں اور

تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں اپنی دادی کو راجستھانی لباس میں دیکھا تھا۔ میرے کچھ اور ہم عمر ساتھیوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے گھر کی بڑی بوڑھیوں کو راجستھانی لباس ہی میں دیکھا تھا۔ میانوالی کے علاوہ مغربی پنجاب کے سرائیکی بولی بولنے والے دیگر اضلاع سرگودھا، ملتان، مظفرگڑھ، جھنگ، ڈیرہ غازی خاں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے سارے ہندو جو مختلف ذیلی ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے سب کے سب اروڑونش سے تعلق رکھتے تھے۔ راجہ داہر کے بیٹے کا نام اروڑ تھا۔ دونوں باپ بیٹے کی حکومت میں سندھ اور راجپوتانہ کے بڑے حصے شامل تھے۔ انھیں جب ساتویں صدی ہجری میں محمد قاسم نے شکست دی اور دونوں جنگ میں مارے گئے تو ان کی رعایا نے شمال مغرب کی طرف بڑی تعداد میں ہجرت کی تھی اور وہ مذکورہ بالا مغربی پنجاب کے اضلاع میں جاکر بس گئے تھے۔ راجپوتانہ کے بعض قصبوں کے نام اروڑونش کے لوگوں کی ذیلی ذاتوں کے ساتھ وابستہ رہے ہوں گے۔ کوٹہ اور بینا کے درمیان ایک ایسا قصبہ اب بھی چھابڑا کے نام سے موسوم ہے جس کے ریلوے اسٹیشن کا نام گگو چھابڑا ہے۔ اگر میرے اجداد کی اصلاً بودوباش راجپوتانے کی تسلیم کرلی جائے تو میری دادی اور ہمارے شہر کی دوسری بڑی بوڑھیوں کا راجستھانی لباس پہننا ہمارے راجپوت ہونے کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

میانوالی کے ایک بزرگ، جو اب اودے پور میں مقیم ہیں، کی ایک ہندی زبان کی تصنیف میں ڈیڑھ سو سے زائد اروڑوں (اروڑونش) کی ذیلی ذاتوں کا ذکر ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سارے اروڑے اصلاً راجپوت ہیں لیکن ان کے یہاں اپنے نام کے ساتھ سنگھ لکھنے یا کہلانے کا رواج کبھی نہیں تھا۔

میانوالی میں جو مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کے درمیان دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے، کئی اروڑے ہندو ایسے بھی آباد تھے جو خود کو شمالی اروڑے کہلاتے تھے اور وہ بعد میں وہاں آکر بسنے والوں اروڑوں کو جنوبی اروڑے کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود کو شمالی اروڑے کہلانے والے کہیں شمال سے آکر وہاں بس گئے تھے۔ میرے بچپن تک شمالی اور جنوبی اروڑوں میں رشتے ناتے نہیں ہوتے تھے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ فرق مٹتا چلا گیا۔

ایک روایت کے مطابق سندھ و راجپوتانے کے راجہ اروڑا کے نام کا ایک اور راجہ بہت پہلے وزیرستان اور کشمیر کے درمیان کسی علاقے پر حکومت کیا کرتا تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا راج کب اجڑا تھا لیکن قیاس ہے کہ اس کا راج اجڑنے کے بعد اروڑوں نے پہاڑوں سے اتر کر میدانوں کی طرف ایک بڑے قافلے کی صورت میں ہجرت کی تھی۔ راستے میں وہ قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک قافلہ سیدھے مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کے بعض اضلاع میں آباد ہو گیا اور دوسرا قافلہ راجپوتانہ اور سندھ کی طرف نکل گیا اور وہاں ڈیڑھ دو صدی تک رہنے کے بعد محمد بن قاسم کے حملے کے بعد پھر شمال مغرب کی طرف گیا اور اس طرح قافلے کے پہلے حصے کے لوگوں کے ساتھ جا ملا۔ شمالی اروڑوں اور جنوبی اروڑوں کی تفریق کا یہی معاشرتی سبب ہو سکتا ہے۔

میانوالی کے اصل نام کے بارے میں کئی طرح کی روایتیں ہیں۔ ایک نام وردھن بتایا گیا ہے۔ لیکن مورخین ابھی تک کسی ایک نام پر متفق نہیں ہو سکے۔ میانوالی کے قرب و جوار میں کئی ٹیلوں سے ایسی چھوٹی بڑی شکستہ مورتیاں اب تک مل جاتی ہیں جن کے ناموں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دریائے سندھ کا جب سیلاب اترتا ہے تو ایسی مورتیاں مٹی میں سے جھانکنے لگتی ہیں جنھیں وہاں کے بعض پڑھے لکھے لوگ جمع کر کے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں ......

....

مئی ۱۹۹۱ء میں جب میں آزادی کے بعد دوسری بار میانوالی گیا تو گورنمنٹ کالج کے پروفیسر سلیم احسن نے اپنے گھر پر رکھی ایسی تین مورتیاں دکھائیں جن میں سے ایک پر ایک ایسی زبان میں کوئی تحریر لکھی ہوئی تھی جسے میں پڑھ نہیں سکتا تھا۔ انھیں یہ مورتیاں میانوالی کے ایک موضع روکھڑی کے ایک ٹیلے سے ملی تھیں۔ یقیناً یہ علاقہ بھی ہڑپہ تہذیب کا حصہ رہا ہوگا۔

میانوالی سے لاہور

میرے والد صاحب کپڑے کا کاروبار کرتے تھے جو انھیں

میرے دادا سے وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں میانوالی میں پہلا سینما گھر بھی تعمیر کرایا تھا۔ اور اسی کے ذریعے پہلی بار میانوالی کو بجلی کی روشنی سے بھی روشناس کرایا تھا۔ چونکہ بچپن میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور والد صاحب نے دوسری شادی کر لی تھی اس لیے جب میں بڑا ہوا تو میرے لیے اپنے گھر میں سکون سے رہنا دو بھر ہو گیا۔ میری وجہ سے ہمارے گھر میں میری والدہ اور میری دادی کے درمیان جھگڑا رہتا تھا۔ جب میں نے ہائی اسکول پاس کر لیا تو مجھے لاہور بھجوا دیا گیا۔ جہاں مجھے مغلپورہ کی ریلوے ورک شاپ میں بطور اپرنٹس بھرتی کرایا گیا۔ وہاں رہ کر میں نے خراد پر کام کرنا سیکھا اور پانچ سال کا کورس اڑھائی سال میں پاس کر لیا۔ یہ کورس مقررہ مدت سے پہلے پاس کرنے کی رعایت اس لیے دی گئی تھی کہ دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے ورک شاپ میں ٹرینڈ ورک مینوں کی سخت ضرورت تھی۔ کچھ تربیت یافتہ اپرنٹسوں کو اعلیٰ تربیت کے لیے کینیڈا بھیجنے کی بھی ایک اسکیم بنائی گئی تھی جس کے لیے میں بھی منتخب کر لیا گیا تھا لیکن جنگ کی وجہ سے والد صاحب نے مجھے سمندر پار جانے کی اجازت نہیں دی۔

لاہور میرے لیے کئی وجوہ سے بڑی کشش رکھتا تھا۔ پنجاب کا دارالحکومت ہونے کے علاوہ یہ تاریخی شہر تہذیبی، تفریحی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ چوں کہ میں تیرہ چودہ برس کی عمر سے ہی ادبی تحریروں خصوصاً افسانوں کے مطالعے کی طرف راغب تھا اس لیے مجھے لاہور پہنچ کر نہ صرف زیادہ مطالعہ کرنے کا موقع ملا بلکہ میں اردو کے بعض اہم ادیبوں اور ادبی رسائل کے مدیران کے بھی قریب ہو گیا۔ جن میں احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، شیر محمد اختر، قیوم نظر، قمر جلال آبادی، مولانا صلاح الدین احمد، امتیاز علی تاج، چودھری برکت علی، آغا شورش کاشمیری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں میں نے افسانہ نگاری شروع کی تھی۔

۱۹۴۳ء میں میری شادی ہو گئی تو میں میانوالی سے لاہور واپس جانے کے بجائے سائیکلوں کا کاروبار کرنے کے لیے راولپنڈی چلا گیا، وہاں لگ بھگ ایک سال رہا۔ لیکن میں تجارت کے پیشے کے لیے موزوں نہیں تھا، چناں چہ کاروبار سمیٹ کر لاہور واپس چلا گیا۔ ورکشاپ میں لوٹنے کے بجائے ۱۹۴۵ء میں ریلوے کمرشیل محکمے میں چلا گیا، جس کی وجہ سے مجھے لاہور سے باہر مشرقی پنجاب کے بعض ریلوے اسٹیشنوں پر ملازمت کرنے کا موقع ملا لیکن میرا مستقر لاہور ہی بنا رہا۔ اور پھر ایک آدھ سال بعد لاہور میں پوسٹ ہو گیا میں لاہور میں ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ملک تک مقیم رہا۔ اور وہیں سے میں نے آزاد ہندستان کی طرف ہجرت کی تھی۔

لاہور سے لکھنؤ

آزادی کے بعد میں بھیانک فسادات کے دوران جالندھر، انبالہ اور دہلی میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے مقیم رہا اور ۴ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو بنارس پہونچا، جہاں محکمۂ ریلوے نے مجھے اس کے کمرشیل کلیمز آفس میں ملازمت دے دی تھی۔ بنارس میں ڈیڑھ دو سال تک رہنے کے بعد میں لکھنؤ آ گیا تھا، غالباً ۱۹۵۰ء کے اواخر میں۔ اس کے بعد سے میں لکھنؤ میں ہی مقیم ہوں۔ یہاں پہنچتے ہی میری ملاقاتیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ سے سید احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، مجازؔ اور رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ سے ہوئیں۔ میرے ہم عمر افسانہ نگاروں اور شاعروں کا بھی ایک بڑا حلقہ تھا۔

تصانیف

لکھنؤ میں رہ کر میں نے متعدد افسانے، ڈرامے، ناول اور مضامین لکھے۔ یہاں آنے سے پہلے میرے دو افسانوی مجموعے لاہور اور بنارس میں قیام کے دوران شائع ہو چکے تھے۔ مثلاً آسیئے (۱۹۴۵ء)، انقلاب آنے تک (۱۹۴۹ء)۔ میری دیگر تصانیف وقفے وقفے سے اس طرح اشاعت پذیر ہوئیں:

وہ مسکرائے گی (۱۹۵۲ء)۔ نئی دھرتی پرانے گیت (۱۹۵۸ء) گلی گلی (۱۹۶۰ء)۔ آواز تو پہچانو (۱۹۶۳ء)، چراغوں کا سفر (۱۹۶۶ء)، انتظار کے قیدی (۱۹۶۶ء)، کل کی باتیں (۱۹۶۶ء)، اکھڑے ہوئے لوگ (۱۹۷۲ء)، گزرتے لمحوں کی چاپ (۱۹۷۴ء)، معصوم آنکھوں کا جہنم (۱۹۶۹ء)، مٹھی بھر دھوپ (۱۹۷۲ء) کہرا اور مسکراہٹ

(۱۹۷۳ء)، نیلی دھارا (ناول) ۱۹۸۰ء۔ زرد پتوں کی بہار (سفرنامہ پاکستان ۱۹۸۳ء)۔ خواب خواب سفر (سفرنامہ یورپ ۱۹۸۳ء)۔ رام لعل کے منتخب افسانے (۱۹۸۴ء)، سورج جیسی رات (ناول ۱۹۸۸ء) ڈوبتا ابھرتا آدمی (۱۹۸۸ء)، اُردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا (تنقید ۱۹۸۵ء۔ سدا بہار چاندنی (۱۹۸۷ء)، ایک اور دن کو پرنام (۱۹۸۸ء)، حرفِ شیریں (خطوط۔ ۱۹۸۹ء)، دریچوں میں رکھے چراغ (خاکے ۱۹۹۱ء)۔

پاکستان سے میری یہ کتابیں منظرِ عام پر آئیں: زرد پتوں کی بہار (۱۹۸۳ء)، ڈوبتا ابھرتا آدمی (۱۹۸۶ء)۔ گزرتے لمحوں کی چاپ (۱۹۹۱ء)۔ سورج جیسی رات (۱۹۹۱ء)۔ وہاں ایک درجن کے قریب اور کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔

سوئیڈن سے میری یہ کتابیں چھپیں:۔ رام لعل کے منتخب افسانے (۱۹۸۵ء)۔ سورج جیسی رات (۱۹۸۵ء)۔ دی برننگ ٹائر (The Burning Tyre) ۱۹۸۸ء (میرے اُردو افسانوں کا انگریزی ترجمہ)۔

۱۹۷۴ء میں کنڑ زبان میں بھی میرے افسانوں کا ایک مجموعہ "تیلی الداگوتما" شائع ہوا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان میں نے انگریزی کے میگزین نیو جنریشن (New Generation) کے چار شمارے شائع کیے تھے۔

میری کہانیاں اُردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، آسامی، کنڑ، تامل، تیلگو، گجراتی، ملیالم، مراٹھی اور پنجابی زبانوں میں خاصی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔ پنجابی زبان میں دو کتابیں بھاشا وبھاگ پنجاب گورنمنٹ پٹیالہ سے شائع ہو رہی ہیں۔

ہندستان اور پاکستان کے علاوہ لندن، ناروے اور ڈنمارک کے اُردو، انگریزی کے قریب قریب سارے اہم و معیاری رسائل میں میری کہانیاں چھپی ہیں۔ میری کہانیوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ ناول پانچ اور سفرنامے دو ہیں۔ ریڈیو و اسٹیج کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "آتش خورد" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

روسی زبان میں بھی کچھ کہانیاں چھپ چکی ہیں: اوسی، سیو ادار، فائلیں، چاپ اور اکھڑے ہوئے لوگ۔

غیر ملکی سفر

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۱ء میں میں نے پاکستان کا سفر کیا اور وہاں دونوں بار ایک ایک ماہ قیام کیا۔ ۱۹۹۱ء میں کراچی میں عالمی فیض سیمنار میں شرکت کی اور وہاں مجھے نشانِ سپاس فیض ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۴ء اور پھر ۱۹۸۵ء میں میں نے ناروے کا سفر کیا۔ ۱۹۸۴ء میں ناروے اور سوئیڈن کے علاوہ ڈنمارک، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور انگلینڈ کا بھی دورہ کیا۔ ۱۹۸۵ء میں ایک ماہ کے لیے سوئیڈن گیا اور وہیں سے گیارہ روز کے لیے سوویت رائٹرز یونین کی دعوت پر ماسکو کا دورہ کیا۔

۱۹۸۸ء میں ایک ماہ کے لیے ڈینش رائٹرز یونین اور ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن کی دعوت پر ڈنمارک میں مقیم رہا۔ ڈنمارک میں مجھے ملیحے شاہ ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

دیگر اعزازات، ایوارڈ اور انعامات

پاکستان اور ڈنمارک کے علاوہ مجھے پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ السنہ نے ۱۹۸۸ء میں شرومنی اُردو ساہتیہ کار کا ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے غالب مودی ایوارڈ اور پنجاب نے ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا۔ اسی سال عالمی اُردو کانفرنس نئی دہلی نے بھی مجھے رتن ناتھ سرشار ایوارڈ دیا۔

اترپردیش گورنمنٹ، یوپی اردو اکاڈمی، بہار اردو اکاڈمی اور بھاشا وبھاگ پنجاب نے میری کئی تصانیف پر انعامات دیئے ہیں جن میں مٹی دھرتی پرانے گیت، گلی گلی، آواز تو پہچانو، اکھڑے ہوئے لوگ، گزرتے لمحوں کی چاپ۔ معصوم آنکھوں کا بھرم اور ڈوبتا ابھرتا آدمی شامل ہیں۔

بہار اُردو اکاڈمی اور اترپردیش اُردو اکاڈمی نے میری مجموعی ادبی خدمات کے لیے بھی مجھے گرانقدر انعامات سے نوازا ہے۔ ۱۹۸۱ء

میں مجھے میر اکادمی کا ایوارڈ دیا گیا۔

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۵ء تک میں اتر پردیش اردو اکادمی کی جنرل کونسل کا ۱۹۸۳ - ۱۹۸۵ء میں مجلس انتظامیہ کا رکن رہا اور ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک وائس چیئرمین بنایا گیا۔

مارچ ۱۹۹۱ء سے مجھے فخرالدین علی احمد کمیٹی اتر پردیش کا چیئرمین نامزد کیا گیا ہے۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک میں انجمن ترقی اردو ہند کی مرکزی کونسل کا بھی رکن رہا۔

اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے میں نے اردو اکادمی اتر پردیش کی وائس چیئرمین شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ تقریباً پانچ سال تک اردو رابطہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے میں نے اتر پردیش کے طول و عرض کا دورہ کیا۔

۱۹۸۹ء میں ریاست کی کانگریسی حکومت نے اردو رابطہ کمیٹی کے ۳۴ ساتھیوں سمیت مجھے گرفتار کیا تھا اور اسی سال کے آخر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا، جس پر ابھی تک عمل درآمد ہونا باقی ہے۔

۱۹۹۰ء میں گجرال اردو کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کرانے کے لیے جو کمیٹی علی سردار جعفری کی سربراہی میں بنائی گئی تھی اس میں میں بطور رکن شامل تھا جس کی رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ اس کمیٹی کی میٹنگیں دہلی میں شاستری بھون میں ہوتی تھیں۔ اس کمیٹی کی ایک سب کمیٹی کے ساتھ جس میں پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم شامل تھے میں نے حکومت اتر پردیش اور بہار کے ساتھ اردو کے مسائل پر مذاکرات میں حصہ لیا۔

۸۹ - ۱۹۸۸ء میں دو سال کے لئے حکومت ہند کے محکمہ ثقافت و انسانی وسائل نے مجھے اردو لٹریچر میں ریسرچ کے لیے ایمریٹس فیلوشپ دی تھی۔

مگدھ یونیورسٹی سے سید احمد قادری اور ایک اور طالب علم بھاگلپور یونیورسٹی سے بھی پی ایچ۔ ڈی کے لیے مجھ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ جنوبی یونیورسٹی مدراس سے میرے بارے میں ظہیر آفاق ایم فل کے لیے مقالہ لکھ کر گولڈ میڈل حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا مقالہ دہلی سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جموں یونیورسٹی سے کرشن چندر نامی اسٹوڈنٹ بھی مجھ پر ایم۔ فل کر چکا ہے۔

میرے بارے میں ظہیر آفاق کے ایم۔ فل کے مقالے کے علاوہ مسٹر نریندر ناتھ سوز بھی "رام لعل۔ شخصیت اور فن" کے عنوان سے میرے بارے میں اٹھارہ نقادوں کے مضامین کا ایک مجموعہ ۱۹۸۵ء میں شائع کرا چکے ہیں۔ شاعر بمبئی۔ توازن مالیگاؤں۔ پرواز ادب پٹیالہ طلوع افکار کراچی اور تخلیق لاہور میں گوشے شائع کر چکے ہیں۔

ہندوستان، پاکستان اور یورپی ممالک میں مجھ سے لیے گئے انٹرویوز کا ایک جامع انتخاب "باقی سوالات" کے عنوان سے ڈاکٹر صبیحہ انور نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا تھا۔

میرے پاس بے شمار ادیبوں کے خطوط ہیں، ان میں سے مرحوم ادیبوں کے خطوط کا ایک مجموعہ حرف شیریں کے عنوان سے میں نے شائع کرایا تھا۔ اب زندہ شخصیات کے ایک سو کے قریب اہم خطوط کا ایک انتخاب مع حواشی مسٹر خورشید ملک شائع کرا رہے ہیں۔

سمینار اور کانفرنسیں

سمیناروں اور کانفرنسوں سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ ادبی مسائل اور خصوصاً افسانے پر میں نے لکھنؤ، مراٹھواڑا، جموں، پنجاب جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور آل انڈیا ریڈیو گورکھپور و لکھنؤ کے سمیناروں میں مقالے پیش کیے ہیں۔ فراق اور فیض سیمنار اس کے علاوہ ہیں جو لکھنؤ اور کراچی میں ہوئے۔ ایفرو ایشین کانفرنس دہلی میں بھی میں نے شرکت کی تھی اور اردو زبان کے تحفظ کے لیے میں نے خود دو کانفرنسیں لکھنؤ میں غیر مسلم اردو ادیبوں کی ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۱ء میں منعقد کرائی تھیں۔

صحافتی ذمہ داریاں

انگریزی کے میگزین نیو جنریشن کے علاوہ میں نے اردو روزنامہ آفتاب عالم، لکھنؤ اور ہفت روزہ صبح اودھ، لکھنؤ کی بھی کچھ

عرصہ تک بطور مدیر اعلیٰ ادارت کی تھی۔ پانچویں دہائی میں رام پور سے شائع ہونے والے ہندی کے رسالے 'نئی لیکھ'، میں اکبر علی خاں کے ساتھ شریک مدیر رہا۔ آج کل ماہنامہ 'معلم اردو' لکھنؤ کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہوں۔

اولادیں

میرے تین بچے ہیں، جن میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ تینوں شادی شدہ ہیں۔ میری بڑی بیٹی شیل موہنی نے اردو کی کچھ کہانیاں ہندی میں منتقل کی تھیں جو ہندی کے رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ میرا بیٹا دیرونود سچا بڑا ہندی کا فلم اور اسپورٹس کا فری لانس جرنلسٹ ہے اس کے درجنوں مضامین ملک کے اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے ہندی افسانوں کا ایک مجموعہ اور ایک ناول بھی شائع ہو چکا ہے میری بڑی بیٹی شیل موہنی اروڑا کی اولادوں میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ چھوٹی بیٹی کرن سبھروال کا ایک بیٹا ہے اور میرے بیٹے کی اولادوں میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ یعنی نانا اور دادا بننے کی مسرت حاصل ہے۔

زیرِ تصنیف کتابیں

آگے اور پیچھے (دو ناول)، ٹکڑے ٹکڑے زندگی (ناول) حریفِ آتشِ پنہاں (ناول)، روبرو (ڈائری کے اوراق جو عرصۂ پچاس برسوں پر محیط ہیں)۔ داستانِ اردو (اردو زبان کے مسائل پر دیگر دانشوروں کے مضامین کا انتخاب)۔ آدھا آدمی (ڈراموں کا دوسرا مجموعہ) اور مضامین کا ایک مجموعہ جس کا ابھی عنوان نہیں رکھا۔ "پکھیرو" اور "ابھی نہ آنا" افسانوں کے دو مجموعے دہلی میں زیر اشاعت ہیں۔

ہندی زبان میں کتابیں

میں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے رسائل میں بھی اپنے افسانوں کو منتقل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اب تک 'نیند نہیں آتی' - 'درد کی سیما'، 'آدھا آدمی'، 'انتظار کے قیدی'، 'سیڑھیوں والا گھر'، 'مٹھی بھر دھوپ'، 'زرد پتوں کی بہار' کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک اور مجموعہ 'رام لعل کی ایکاون کہانیاں' زیر اشاعت ہے۔

بچوں کا ادب

ڈبیا کی چوری۔ آنے والے کل کے سپاہی (اردو)

دادی اماں۔ اڑتا ہوا سردار۔ پانچ مصیبتیں۔ بھیانک مونچھوں والا پوسٹ مین۔ رام لعل کی اچھی اچھی کہانیاں (ہندی)

تالیف

- خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے
- اوپندر ناتھ اشک کے منتخب افسانے

دو اہم سوال

مجھ سے بار بار ایک سوال پوچھا گیا ہے۔ میں نے اب تک جتنا کچھ لکھا ہے کیا اس سے مطمئن ہوں۔ میرا جواب ہمیشہ یہی رہا ہے کہ میں بے حد مطمئن ہوں۔ بہت سی کہانیوں کو سراہا گیا ہے۔ جنھیں اب تک نہیں سراہا گیا، آئندہ ضرور سراہی جائیں گی، اس کا مجھے یقین ہے۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ میں اس عمر میں بھی اتنا زیادہ سفر کیونکر کر لیتا ہوں۔ میرا جواب ہوتا ہے کہ سفر در سفر یا ہجرت کی خو میرے خون میں شامل ہے۔ سفر میرے لیے ہمیشہ ایک نئی دنیا پانے یا نئے دیوں کی دریافت کے مترادف ہوتا ہے۔ میں ریلوے کی ملازمت کے دوران ہندستان کے ہر ایک صوبے میں گھومتا رہا ہوں اور کبھی اکتایا نہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ سفر ہی مجھے جوان اور توانا رکھتا ہے۔ پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں سے مجھے خاص عشق ہے۔ بچپن میں پہلی بار میں نے ۵ برس کی عمر میں سفر کیا تھا۔ پندرہ برس کی عمر تک میں شمالی ہند میں میانوالی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور تک گھوم چکا تھا۔ لاری سے اور اونٹوں، گھوڑوں پر بھی میں نے چھوٹے چھوٹے سفر کیے تھے۔ ابھی حال میں میں کراچی سے بلوچستان کے بارڈر تک چلا گیا تھا اور وہاں کے کوہساروں اور جھیلوں کو دیکھ کر بہت راحت محسوس کی تھی۔ □□

اگست آیا ہے نغموں کا قافلہ لے کر

وہ جگمگاتی ہوئی آئی شامِ آزادی
ہوا وہ جشنِ چراغاں بنامِ آزادی

فضا میں نور ہے، پُروا ہوا میں مستی ہے
زمیں پہ کیف ہے اور دورِ جامِ آزادی

وہ اِک کتاب جو لکھتے رہے ہیں مُدت سے
چمک رہی ہے وہ زیرِ نظامِ آزادی

سبھی کو آکے یہ ساون کی رُت بھگو آئی
دھنک کے رنگ ہوئے ہمکلامِ آزادی

اگست آیا ہے نغموں کا قافلہ لے کر
جدھر بھی دیکھیے رقصاں ہے نامِ آزادی

یہاں وہاں یہ اُمیدوں کے خوش نُما منظر
لیے ہوئے ہیں نقوشِ دوامِ آزادی

کہاں کہاں نہ ملیں روشنی کی تحریریں
کہاں کہاں نہ ہوا اہتمامِ آزادی

رگوں میں اس کی شہیدوں کا ہے لہو شامل
عجیب ہے تُزک و احتشامِ آزادی

یہ چاند تارے، یہ خورشید یہ ثُریا کیا
کہیں بلند ہے ان سے مقامِ آزادی

خوشی مناؤ کہ پابندیوں کا دَور گیا
مُبارک اہلِ وطن کو قیامِ آزادی

ملے گی جلد بزرگوں کے خواب کی تعبیر
اگر دلوں میں رہا احترامِ آزادی

بڑھو بڑھو کہ قدم سے قدم مِلائے ہوئے
سُنو سُنو کہ یہی ہے پیامِ آزادی

رباب آنکھوں میں آنسو ہیں اور دُعا یہ ہے
ہمارا ملک ہو دارُالسّلامِ آزادی

رباب رشیدی
۶۵، تارین۔ شاہجہاں پور

پروفیسر ثمینہ شوکت
بیت ثمین ۲/۱۱۰۸-۲۰۲-۲ تلک نگر
حیدر آباد

علی گڑھ تحریک : ایک چیلنج

کسی نقّاش کے نقش، مصوّر کے موقلم اور بت تراش کی مورت گری کو صحیح طور پر دیکھنے کے لئے فاصلہ ایک اہم قدر ہے۔ نہ ہم نقش سے اتنے قریب ہوں کہ اس کے خدوخال ہی حیطۂ نگاہ سے باہر جا پڑیں اور نہ اتنی دور کہ رنگ و نور ہی دھندلا جائے اور نقش نقشِ فریادی بن جائے۔

فاصلے کے ساتھ ساتھ وقت بھی دوسرا اہم عنصر ہے جو طائرِ نگاہ اور تابِ نظر کو موزوں اور مناسب بنانے میں ممد و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جو بات مصوّر کے ثمرۂ موقلم پر صادق آتی ہے وہی بات رہنما کی تحریک پر بھی منطبق کی جاسکتی ہے۔

سرسیّد قوم کے رہنما تھے اور علی گڑھ تحریک ان کے ذہن کی اپج تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ ابھی تک ہم کو وہ نفسیاتی فاصلہ (Psychic distance) حاصل نہیں ہوا ہے اور نہ وہ موزوں وقت کہ سرسید اور علی گڑھ تحریک کے بارے میں کوئی دوٹوک فیصلہ کرسکیں مرورِ ایام نے اتنے ورق الٹے اور اتنے دھندلکے روشن کردیے ہیں کہ اب بلاجھجک اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ علی گڑھ تحریک سرتاسر بازآبادکاری Rehabilitation کی تحریک تھی۔ یہ کوئی ٹھوس انقلابی یا Revolutionary تحریک نہیں تھی۔ سائنٹیفک تجزیے سے نشاۃ الثانیہ (Renaisance) کا لیبل بھی اس پر مشکل ہی سے چسپاں کیا جاسکتا ہے۔ انقلاب اور بازآبادکاری میں جو بین فرق اور امتیاز اور تفاوت راہ ہے وہ کسی بھی دانشور سے پوشیدہ نہیں۔ اس اندیشے سے میں ناآگاہ بھی نہیں ہوں جو علی گڑھ تحریک کو بازآبادکاری کی تحریک کہنے میں ہے۔ شاید یہ بات بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے سے کم نہیں ہے۔ اقطاعِ عالم میں پھیلے ہوئے ان گنت "علی گیرین" اس جرعۂ تلخ و تند کو خاموشی کے ساتھ نہ پی سکیں گے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ بات خدنگِ جستہ ہوتی ہے کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح واپس نہیں لوٹائی جاسکتی۔

سرسید نے جس وقت اپنا کام شروع کیا، پرانا نظامِ حیات دم توڑ چکا تھا، پرانی روایات، پرانا طرزِ فکر، پرانی قدریں وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہونے کو تھیں، کاروانِ زندگی کو نئے انداز سے ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ برطانوی سامراج کا طوفان تیزی سے امڈ رہا تھا، سیاسی اداروں میں کوئی جان باقی نہ تھی جاں سوز قنوطیت چھائی ہوئی تھی۔ علی گڑھ تحریک نے بلاشبہ دماغی سانچوں کو بدلنے کی کوشش کی۔ مخالفتوں سے ہنستے ہوئے ٹکرانے کی اسپرٹ پیدا کرنا چاہی۔ سرسیّد کا مقصد انگریز دوستی سے صرف اس قدر تھا کہ مسلمان ان سے علم و تہذیب سیکھ کر وقت کی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز دوستی کے بجائے انگریز پرستی شروع ہوگئی۔ فرنگ کے بُتِ طنّاز کی عشوہ طرازیاں مسحور کر گئیں۔ پارسایانِ مشرق کی نگاہوں پر خوشنودیِ طبعِ یار کے حسین پردے پڑ گئے۔ فکر و عمل کی جگہ سہل انگاری نے لے لی۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصدِ اولین میں سیاسی بیداری کا تصوّر مصلحت اور مصالحت

بڑھتی ہوئی عقلیت پسندی نے بے شک انگریز کی چیرہ دستیوں کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ لیکن آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے سے گلزارِ خلیل کی جو امید ہو سکتی تھی، دور تک اس جذبۂ فراواں کا گزر بھی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ آہِ مظلوماں کارگر ہو سکی اور نہ نصرتِ ربِ مہرِ استقبال آ سکی۔ ٹیپو سلطان کی "شیر کی ایک روزہ زندگی" کے بجائے گیدڑ کی صد سالہ حیات مسلمانوں کا مقدر ٹھہری، اور علی گڑھ تحریک اپنے تمام افادی اور عقلی مقاصد کے باوجود عملاً محض باز آبادکاری ہی کی تحریک ثابت ہوئی۔

باز آبادکاری کی تحریک بھی قومی حکومت کے سائے میں ہو تو قابلِ تحسین ہوتی ہے لیکن اجنبی حکومت کے تحت ہو تو ع

سخن درین است

علی گڑھ تحریک کو اگر مُردہ تحریک نہ سمجھ کر آج کے لئے بھی مفید مطلب بنانا ہو تو اس کے منفی پہلوؤں پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ اس تحریک کا ایک اور منفی پہلو علم کے حصّے بخرے ہیں۔ مسلمان جن کے ہاتھوں میں کبھی علمِ مطلق کا پرچم تھا، خود انھوں نے ہی اسے دینی اور دنیوی خانوں میں بانٹ دیا۔ آج کا تقاضا یہ ہے کہ علم کی جو غیر مفید بلکہ نقصان رساں تقسیم عمل میں آئی ہے اسے یکسر کالعدم کر دیا جائے۔

یہ بڑی حسرت کی بات ہے کہ اس جانب پہلا مثبت قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ علمائے دین اور ماہرین سائنس دونوں ہی یہ بات محسوس کر رہے ہیں کہ ایک مکمل زندگی دین اور سائنس کے امتزاج ہی سے ممکن ہے، افتراق سے نہیں۔ سر سید احمد خاں اسلام دینِ فطرت کی بنیاد پر تفسیر قرآن لکھتے ہوئے یہ بنیادی نکتہ فراموش کر گئے تھے کہ اسلام کی اولین شرط ایمان بالغیب ہے۔ یہی وہ نازک موڑ ہے جہاں پہونچ کر راہ غلط ہو جاتی ہے کیونکہ عقلیت کی حدِ آخر پر رسائی بھی منزل تک رسائی نہیں ہوتی۔

ضرورت ہے کہ مستقبل کے سید احمد خاں اور شبلی نعمانی شانہ بہ شانہ چلیں۔ آج کی علی گڑھ تحریک ع "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے بجائے "تو با زمانہ ستیز" کا نعرہ بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کرے۔ سر سید کی نیت کا خلوص اور شبلی کی نگاہِ دوررس کو اب ایک ہی پیکر میں مجتمع ہو کر فردِ واحد کی طرح مصروفِ عمل ہو کر وقت سے پیکار کرنی ہوگی کیونکہ ناپختہ ذہن اور یک رخے Lop sided انسان نے دنیا کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ ادھورے انسانوں یعنی روح فراموشوں کی یہ بستی اب محض کریہہ المنظر ہی نہیں بئیس المقر ہو گئی ہے۔ اسے جنت نگاہ و فردوسِ گوش بنانے کے لئے علی گڑھ تحریک میں نیا خون پہونچانے کی ضرورت ہے۔

علی گڑھ تحریک سے شعورِ حیات ضرور ملا ہے لیکن اس کا ماسکہ معاش ہے معاد نہیں۔ یہاں مولانا روم کا یہ انتباہ کہ

علم را بر تن آنی مارے بود

بے اختیار یاد آ جاتا ہے۔ لا مساوی ہے انسان کی جگہ ما یعنی معاش مساوی ہے انسان کی جس مساوات کا علی گڑھ نے جھنڈا اٹھایا تھا اس سے مسلمانوں کو کارزارِ حیات میں بلا شبہ نبرد آزما ہونے کا موقع ضرور ملا ہے اور اسی نے انھیں مسابقت میں سرگرم رکھا لیکن کس قیمت پر؟

علی گڑھ تحریک کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں — مسلمانوں کی باز آبادکاری اور خواتین کی بیداری — علی گڑھ نہ ہوتا تو مملکت پاکستان اور بنگلہ دیش کو ایک بھی ایڈمنسٹریٹر (Administrator) نہ ملتا اور نہ کہیں مسلمان لیڈر ڈاکٹر وغیرہ کا وجود ہوتا۔ یہ مثبت اور منفی پہلو اب بھی موثر ہیں اور اشتراکی جدلیت کے Thesis اور Anti thesis کا روپ دھارے تشکیلِ جدید یا Synthesis کے متقاضی بھی ہیں گویا علی گڑھ تحریک "ختم فسانہ ہو گیا" یا "پارینہ" کا حکم نہیں رکھتی۔ یہ آج بھی چیلنج ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علی گڑھ تحریک داستانِ پارینہ نہیں ہے اور نہ کوئی مسدود راستہ۔ یہ تو ایک شاہراہ ہے ——

شاہراہِ بقا اور ارتقا!

لیکن شرط یہی ہے کہ یہ مقتل سے گزر کر نہ جائے بلکہ علمِ مطلق کے مخزن سے مالا مال ہو۔

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

غزلیں

ہم دُکھ بھری رُتوں کو سہانی لکھا کریں
وہ چاہتے ہیں خون کو پانی لکھا کریں

وعدے تو پورے ہوں گے یقیں کیجیے مگر
جب خط لکھیں تو یاد دہانی لکھا کریں

بچپن کے بعد ہم کو بڑھاپا ہوا نصیب
کیا واقعات عہدِ جوانی لکھا کریں

بازار کے خداؤں پہ آتی نہیں ہے آنچ
ہم لاکھ احتجاجِ گرانی لکھا کریں

ننگی حقیقتوں کو ملے گا حسیں لباس
اب جی میں ہے کہ ہم بھی کہانی لکھا کریں

جی چاہتا ہے گزرے زمانوں میں پھر جئیں
اب ڈائری میں یادیں پُرانی لکھا کریں

ہر زخم کو نصیب کا تحفہ کہیں نیازؔ
ہر داغِ دل کو اس کی نشانی لکھا کریں

عبدالمتین نیازؔ
۳۶۔ صوفیہ ہاؤس موتیا پارک
بھوپال ۱

جی ترنّم سے تو ہم ہرگز سُنانے کے نہیں!
غور کے قابل ہیں اپنے شعر، گانے کے نہیں

لے اُڑے آندھی تو پھر واپس یہ آنے کے نہیں
اور کیا تنکے بھی اب تو آشیانے کے نہیں

آسماں پر حکم کس کا چل رہا ہے ان دنوں
جانتے ہیں خوب ہم لیکن بتانے کے نہیں

لے لیے تھے شہر تو پہلے ہی فرزانوں نے سب
اب یہ سُنتے ہیں کہ صحرا بھی دوانے کے نہیں

دوستوں کو تو یہ منصب ہم نے بخشا ہے مگر
دشمنوں کے ہاتھ سے ہم زخم کھانے کے نہیں

آج لے آئے ہیں تو اس پر توجہ کیجیے
عرش سے پیغام تو ہم روز لانے کے نہیں

برملا کہنے میں ہم بھی خوش خدا بھی خوش میاں
شعریت کے رُعب میں بالکل ہم آنے کے نہیں

بیش قیمت نقد لکھی جا رہی ہے آج کل
ایسے شعروں پر جو ویسے چار آنے کے نہیں

شجاع خاورؔ
۱۔ پارک لین۔ نئی دہلی ۱

دلیپ سنگھ
پتہ راجندر نگر، نئی دہلی - ۶۵

میرا یار فکرؔ تونسوی

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، فکرؔ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی، جب وہ 'ملاپ' اخبار کی ملازمت کے سلسلے میں دلی آچکا تھا۔ میں اور میرے کچھ دوست شام کو کناٹ پلیس دلی کے ایک ریستوراں میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہمارے گروہ میں بلراج کومل بھی شامل تھا۔ فکرؔ اور اس کے دوست مخمور جالندھری نے بھی اسی ریستوراں میں آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ بلراج کومل ان کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے جب فکرؔ سے میرا تعارف کرایا تو مجھے کچھ اس طرح محسوس ہوا کہ جیسے کوئی سترہ اٹھارہ برس کا لڑکا کسی فلمی ستارے سے مل رہا ہو۔ حالانکہ فکرؔ کے نقش و نگار کو اگر مدنظر رکھا جائے تو یہ تشبیہ کچھ بے ڈھنگی سی لگتی ہے۔

فکرؔ کے چہرے کے نقش و نگار ایسے کبھی نہیں تھے جنھیں دیکھ کر کوئی خواہ مخواہ مرعوب ہو جائے۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ فکرؔ کی در پردہ کوشش رہی ہے کہ کچھ ایسا ہو جائے۔ کئی سال اس نے اپنی پرسنیلٹی میں جاذبیت پیدا کرنے کے لئے باقاعدہ نکٹائی باندھی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب اس نے گھر سے نکلنا تقریباً بند کر دیا تھا تب بھی نکٹائی باندھنا ترک نہ کیا۔ کئی بار جب میں اس کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ اپنے ہی ڈرائنگ روم میں اکیلا نکٹائی باندھے اس طرح بیٹھا ہے جیسے وہ اس گھر کا مالک نہ ہو بلکہ مہمان بن کر آیا ہو، اور ابھی گھر کا کوئی آدمی آکر اس سے پوچھے گا کہ صاحب آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم۔

فکرؔ کے ساتھ میرے تیس سال سے اوپر کے تعلقات ہیں۔ ان تیس برسوں میں یہ تعلقات کئی منزلوں سے گزرے۔ شروع شروع میں میں اس کا ایک ادنیٰ سا پرستار تھا۔ پھر بے حد قریبی دوست بنا۔ اتنا قریبی کہ سالہا سال ہم ہر شام چار پانچ گھنٹے اکٹھے بتاتے۔ اور پھر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ہم ایک ہی منزل کے دو راہی ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سفر میں میرا شمار روایتی پانچویں سوار کا سا تھا اور آخری منزل ان تعلقات کی یہ تھی کہ اسے کوئی خصوصی نام نہیں دیا جا سکتا۔ میں اس کے گھر کا ممبر تھا۔ دوست بھی تھا اور بیشتر کبھی ہماری دوستی کا عالم کچھ اس طرح کا تھا کہ اس کی وفات پر لوگ میرے یہاں یوں پرسہ دینے آتے رہے جیسے میرا کوئی بے حد قریبی رشتہ دار چلا گیا ہو۔

کچھ تنقید نگار طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب کہتے ہیں لیکن فکرؔ نے اسی دوسرے درجے کے ادب میں ایک ایسا مقام پیدا کیا جسے پانے کے لیے بیشتر تنقید نگار، شاعر اور افسانہ نگار اپنے اپنے چہروں سے ایک نمبر کا غازہ ہٹا کر دو نمبر کا گرد و غبار ملنے کو تیار رہیں۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ ایک ادیب رکشا چلانے والوں میں بھی اتنا ہی پاپولر ہو جتنا وزیروں اور گورنروں میں، اور اس کے روزانہ اخبار میں چھپنے والے کالموں کو بھی قارئین اسی محبت سے پڑھیں جیسے کسی اعلیٰ پائے کے ادبی رسالے میں چھپنے والے مضامین کو۔

ہم دوستوں کو فکرؔ کی مقبولیت پر ناز تھا اور اکثر اس مقبولیت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ وہ جوانی کے دن تھے اور ہم لوگ کناٹ پلیس میں ایک بند دوکان کے

برآمدے میں بیٹھ کر مے نوشی کیا کرتے تھے۔ ایک بار پولیس کے ایک سپاہی نے ہمیں آپکڑا اور پوچھا۔

"کون لوگ ہو تم؟"

ہم سب نے بیک وقت فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ فکر تونسوی ہیں"

سپاہی نے کہا "یہ کوئی بھی ہو، تھانے چل کر بات کرو"

فکر نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سالو! تم تو کہتے ہو میں بڑا مشہور آدمی ہوں۔ تو پھر یہ سپاہی مجھے کیوں نہیں جانتا۔؟"

مخمور جالندھری نے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ آدمی اتنا زیادہ ان پڑھ ہو کہ اس نے "پیاز کے چھلکے" پڑھنا تو کجا دیکھے بھی نہ ہوں"

اُردو ادیبوں سے مجھے ایک شکایت رہی ہے کہ وہ اکثر جس زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں اس کے متعلق انھیں رتی بھر علم نہیں ہوتا۔ میں نے ایک بڑے ادیب کی ایک کہانی میں پڑھا تھا کہ ایک دن اس کی کہانی کا ہیرو کھانا کھانے کے لیے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں گیا۔ راقم الحروف کو بھی سرکاری خرچ پر کئی بار فائیو اسٹار ہوٹلوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جن کھانوں کا ذکر ادیب کی کہانی میں تھا، وہ کھانے تو وہاں سرے سے ہوتے ہی نہیں۔ کہانی پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ ادیب نے اپنے ہیرو کو پہونچا تو فائیو اسٹار ہوٹل میں دیا ہے لیکن کھانے وہاں وہ رکھوا دیئے ہیں جو خود وہ "گلی پراٹھے والی" کے نکڑ والے نان بائی سے کھاتا رہا ہے۔ فکر کے یہاں آپ کو ایسا تضاد نہیں ملے گا، کیونکہ اس نے وہی زندگی جی ہے جس کے بارے میں اس نے لکھا ہے۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ کسی زمانے میں ہم کناٹ پلیس کی ایک دکان کے برآمدے میں محفل سجایا کرتے تھے۔ ایک بار مخدوم محی الدین دلی آئے ہوئے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کی دعوت کی جائے چنانچہ فکر کی معرفت انھیں وہیں مدعو کیا گیا۔ ہم چاہتے تو اتنے بڑے شاعر کو بلانے کے لیے، جو اس وقت لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر بھی تھا، کسی کا ایک خوبصورت ڈرائنگ روم ایک شام کے لئے مانگ سکتے تھے، لیکن فکر کا خیال تھا کہ ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں نشہ نہ مخدوم کو ہوگا نہ ہمیں۔

میں نے سڑکوں پر بیٹھ کر مے نوشی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے قارئین کو ہمارے بارے میں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان محفلوں میں جو کچھ میں نے سیکھا ہے وہ شاید یونیورسٹی میں کبھی نہیں سیکھا۔ مے نوشی تو سڑکوں پر ہزاروں لوگ کرتے ہیں لیکن ایسے کتنے ہیں جنھوں نے وہاں بیٹھ کر ادب کی باریکیوں پر غور کیا ہو۔؟ مجھے یاد ہے، ایک دفعہ ہماری ادبی بحث لڑائی کی حد تک پہونچ گئی تھی، جس طرح ہر جھگڑے اور بحث میں ہوتا ہے، ہم لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ شاید کسی پولیس پارٹی نے ہمیں دیکھ کر ایک سپاہی کو بھیجا کہ پتہ کرو ماجرا کیا ہے۔ اس نے تھانیدار کو بعد میں جو رپورٹ دی وہ کچھ اس طرح تھی کہ صاحب یہ لوگ جھگڑ تو رہے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جھگڑا کس بات پر کر رہے ہیں۔ کچھ کہہ رہے ہیں کہ ادب میں جمود ہے کچھ کہہ رہے ہیں کہ نہیں ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ ادب کیا ہے اور جمود کیا ہے لیکن اس کے ہونے یا نہ ہونے سے ان شرابیوں کو کیا فرق پڑ رہا ہے۔؟

فکر کے ساتھ میں نے بیسیوں راتیں دلی کی سڑکوں پر گزاری ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ عوام کی رات کیسے بسر ہوتی ہے۔

فکر نے ہم سب دوستوں کے بارے میں ایک ناول بھی لکھا۔ ہماری اس زندگی کے بارے میں جب دلی کو ابھی پر نہیں لگے تھے۔ اور ریاں نام کی کوئی چیز ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جب ہم ہر روز ملتے تھے اور ادب اور زندگی کے بارے میں بڑے بڑے فیصلے کیا کرتے تھے۔ اس ناول کا اس نے نام رکھا تھا "سارسوں کا قافلہ"۔ ناول کے مواد کے بارے میں تو ہم سب کو علم ہے لیکن فکر ہی اسے لکھ سکتا تھا کیونکہ اس کا سا اسلوب کوئی کہاں سے لائے۔

تنقید نگاری کا کمبل اوڑھ کر میں فکر کے فن پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا۔ ہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فکر کی دو چیزوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ایک اس کی ادبی دیانت داری نے اور دوسری اس کی انکساری نے۔ مجھے یاد ہے جب فکر کی آپ بیتی کی پہلی قسط "میں" شائع ہوئی تھی تو سب سے پہلی کاپی اس نے مجھے بھجوائی تھی، میں خود ان دنوں اسپتال میں دل پر حملہ روکنے کی کوشش میں تھا۔

پڑھنے کے بعد میں نے اسے خط لکھا کہ میں نے اس قدر دل چسپ آپ بیتی پہلے کبھی نہیں پڑھی۔

آپ بیتی کا دوسرا حصہ "میری بیوی" مجھے بھیجتے ہوئے اس نے لکھا کہ بس یہ مقلد بھی دو چار سطریں لکھ بھیجو بطور تبرک۔ انکساری ملاحظہ ہو یعنی بطور تبرک۔ میں نے شاید جواب میں لکھا تھا کہ آپ بیتی کا دوسرا حصہ پہلے حصے کی بلندیوں کو چھو نہیں پایا۔ اس میں تمھاری ذاتی داستان زیادہ ابھری ہے۔ معاشرہ اتنا زیادہ نہیں۔

جواب میں اس نے لکھا ــــ

"تمھارا تجزیہ ٹھیک ہے۔ "میری بیوی" میں میں نے بزعم خود یہ کمال دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بیوی کی آڑ میں معاشرہ ابھر آئے نہیں ابھرا تو معاشرہ جائے جہنم میں۔"

کسی اور ادیب کی کتاب پر میں اس طرح کی رائے لکھتا تو شاید زندگی بھر کے لیے ہمارے تعلقات کشیدہ ہو جاتے۔ کیونکہ ادیب ایک دوسرے کے بارے میں سچ بولنا اس وقت شروع کرتے ہیں جب تعلقات کشیدہ کرنے کی ٹھان لی ہو۔ لیکن فکر تونسوی کی عظمت ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے خط میں لکھا کہ "میری خواہش ہے کہ اگر تم میں استطاعت ہو تو ان کتابوں پر تبصرہ لکھ کر کسی رسالے کو بھیج دو۔"

اس ادبی دیانت داری کی ایک اور مثال مجھے یاد آتی ہے۔ کئی سال پہلے فکر کا ناول "پروفیسر بدھو" شائع ہوا تھا۔ فکر نے ہم سب دوستوں کو ایک ایک جلد دے کر کہا تھا کہ اگلی محفل میں اس کتاب پر بحث ہونی چاہیے۔

مخمور جالندھری نے کہا ــ "یار فکر! کیوں ان لوگوں کا وقت برباد کرتے ہو۔ میں نے تمھاری کتاب پڑھ لی ہے، اس میں بحث کے لائق کچھ ہے ہی نہیں۔"

اس پر فکر مخمور سے بہت الجھا۔ لیکن اگلے ہفتے جب کتاب پر بحث کی بات چھڑی تو فکر پہلا شخص تھا جس نے کہا کہ کتاب کو قاری کی حیثیت سے پڑھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ مخمور کی رائے بالکل درست ہے۔

آخری ایک دو سال میں فکر نے گھر سے نکلنا تقریباً بند کر رکھا تھا۔ مجتبیٰ حسین اور میں اس خیال سے کہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو کچھ دوستوں کو گھیر گھار کر ہفتے میں ایک بار فکر کے گھر لے جاتے تھے لیکن شاید زندگی کی صراحی سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والی مے اسے پسند نہیں تھی۔ وہ تو بھرپور زندگی جینے کا قائل تھا۔ اور اگر بھرپور زندگی میسّر نہیں تو پھر کیا جینا اور کیسا جینا۔ چنانچہ ایک دن ہم سادہ لوحوں کے قافلے کا یہ سردار تنہا ایک ایسی اڑان اڑ گیا، جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

□□

پندرہ ۱۵ اگست

کیف افزا ہے جشنِ آزادی
روشنی ظلمتوں نے پائی ہے
یہ وہ تاریخ ہے جو اے زخمی
ملک بھر میں بہار لائی ہے

ہم کو جس کا تھا انتظار وہی
دل کا صبر و قرار لائی ہے
ہو مبارک چمن کی آزادی
جو خزاں میں بہار لائی ہے

ــــــــــــــ

آزادئ بہار کا عنواں ہر زندگی
میری نظر میں رشکِ بہاراں ہر زندگی
کل بھی نثار غنچہ و گل پر کیا لہو
زخمی ہماری آج بھی قرباں ہر زندگی

صغیر زخمی سیہوری
معرفت عارف الکٹریشین
نزد پٹرول پمپ چھپل روڈ
بھوپال

غزلیں

جب دل کسی کی زلفِ گرہ گیر میں نہ تھا
آزاد تھا بندھا ہوا زنجیر میں نہ تھا

اک بار مجھ سے مل کے نہ وہ پھر کبھی ملا
دو چار دن کا ساتھ بھی تقدیر میں نہ تھا

تم نے ہی اس کو حرفِ غلط جان کر پڑھا
ورنہ غلط تو کچھ مری تحریر میں نہ تھا

گلنار کر گئی مجھے میرے لہو کی آگ
یہ رنگ تو کبھی مری تصویر میں نہ تھا

اس بار کوئی سینہ سپر کیوں نہیں ہوا
اب کے تو دم بھی سینۂ شمشیر میں نہ تھا

ظاہر میں کچھ ہے اور تو ہے زائچے میں اور
ایسا لکھا ہوا مری تقدیر میں نہ تھا

دیکھا تھا خود کو عکس کی صورت بس ایکبار
پھر میں کسی بھی پیکرِ تصویر میں نہ تھا

محسن اسے بھی میری نگاہوں نے پڑھ لیا
وہ بات جس کا ذکر بھی تحریر میں نہ تھا

محسن زیدی
۱۸۸، راؤز ایونیو
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جاہ و جلال دبدبہ خواب و خیال ہو گئے
رُو بہ زوال کتنے ہی اہلِ کمال ہو گئے

رُخ کی کشش نے ان کو بھی شوقِ نظارہ دے دیا
آئینہ دیکھ کر وہ خود محوِ جمال ہو گئے

عشرتِ رفتہ کے لیے تم سے بھی کچھ نہ بن پڑا
ہم ہیں سو ہم بھی مرکزِ رنج و ملال ہو گئے

فاصلہ اب جو ہے وہ خود منزلِ شوق طے کرے
راہروانِ راہِ غم تھک کے نڈھال ہو گئے

سائل در سے مت اُلجھ اس کو حقیر مت سمجھ
تیرے بھی ہاتھ کل اگر دستِ سوال ہو گئے

غیر سے کج روی کا اب شکوہ کریں تو کیا کریں
اپنے ہی کون سے یہاں شاملِ حال ہو گئے

حاصلِ عمرِ آرزو اور ہے کیا، وہ دن ہیں بس
جو تری یاد بن گئے تیرا خیال ہو گئے

کتنے رُخوں کی آب و تاب وقت کی دھوپ پی گئی
کتنے ہی آئینے وقارؔ گردِ مثال ہو گئے

وقار مانوی
۳۰۳۹۔ گلی سوشیلا، ترکمان گیٹ
دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی
گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ

راجہ بلرام پور۔ حیات اور شاعری

نام، ولدیت، پیدائش، انتقال

(راجہ) دگ وجے سنگھ نام اور راجہ تخلص تھا۔ آپ کے والد راجہ ارجن سنگھ تھے جو ۱۸۳۰ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ راجہ کی ولادت ۱۸۱۹ء میں ہوئی اور ۲۷ فروری ۱۸۸۲ء میں سنیچر کا دن گزرنے کے بعد رات ۱۲ بجے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

نسب

آپ کا سلسلۂ نسب مہابھارت کے مشہور ہیرو ارجن پانڈو تک پہونچتا ہے۔ ارجن کی اکتالیسویں پشت میں مہاراجہ سکھ دیو تھے۔ ان کے چھ لڑکوں میں آخری بریار شاہ تھے۔ یہ اکونہ ضلع بہرایچ کے پاس دھرساواں گاؤں گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ۱۳۷۴ء میں جب فیروز شاہ تغلق دہلی آئے تو بریار شاہ نے ان سے اکونہ کا علاقہ مانگا۔ بادشاہ نے درخواست منظور کر لی اور بریار شاہ کا قبضہ علاقے پر ہو گیا، اور بھر قوم کو پسپا ہونا پڑا۔ اکونے کا علاقہ بہت بڑا تھا۔ اس علاقے پر بریار شاہ کی اولاد یکے بعد دیگرے راج کرتی رہی۔ یہاں تک کہ آپ کی ساتویں یا آٹھویں پشت میں بھیا بلرام شاہ ہوئے۔ پھر ان سے گدی نشینی کا جو سلسلہ چلا وہ حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ بھیا بلرام شاہ (۵۸-۱۵۵۳ء)
۲۔ راجہ پورن چند (۸۱-۱۵۵۸ء)
۳۔ راجہ تیغ شاہ (۱۶۱۸-۱۵۸۱ء)
۴۔ راجہ ہربنس سنگھ (۱۶۴۳-۱۶۱۸ء)
۵۔ راجہ چھتر سنگھ (۱۶۹۰-۱۶۴۳ء)
۶۔ راجہ نرائن سنگھ (۱۷۳۰-۱۶۹۰ء)
۷۔ راجہ پرتھی پال سنگھ (۱۷۸۱-۱۷۳۰ء)
۸۔ راجہ نول سنگھ ۹۔ راجہ ارجن سنگھ
۱۰۔ راجہ جے نرائن سنگھ
۱۱۔ راجہ دگ وجے سنگھ (۱۸۸۲-۱۸۳۵ء)

ان کے بعد مہارانی اندر کنور ہوئیں۔ مہارانی نے مہاراجہ بھگوتی سنگھ کو متبنیٰ کیا مگر نابالغ ہونے کی وجہ سے علاقہ کورٹ آف وارڈس کی نگرانی میں رہا، جو ۱۹۰۰ء میں مہاراجہ کے قبضے میں آیا اور وہ ۱۹۲۱ء تک گدی نشین رہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک علاقہ پھر کورٹ آف وارڈس کی نگرانی میں رہا۔ مہاراجہ پاٹیشوری پرشاد سنگھ جب بالغ ہوئے تو علاقہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۴ء تک آپ کے زیرِ نگیں رہا۔ آپ نے مہاراجہ دھرمیندر سنگھ کو گود لیا جو ۱۹۶۴ء سے اس علاقے کے مہاراجہ ہیں۔

دگ وجے سنگھ کا بچپن

آپ بچپن میں بہت زیادہ پھرتیلے اور شرارتی تھے۔ گھوڑوں اور بندروں کے پالنے کے بہت شوقین تھے۔

بچپن میں انھیں دو جان لیوا حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ صرف آٹھ مہینے کے تھے جب اپنے کھلونے گھوڑے سے گر پڑے۔ بہت کافی چوٹ آئی۔ ٹھوڑی کی چوٹ کا نشان مرتے دم تک باقی رہا۔ جب مہاراجہ چار سال کے تھے تو دوسرا حادثہ پیش آیا۔ ایک کھولتے ہوئے

دوده کے کڑھاؤ میں پیر پھسلنے سے گر پڑے ۔ جسم بری طرح جل گیا۔ مگر.... جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

تعلیم

آپ کی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کیا گیا ۔ راج محل میں ہی آپ نے ہندی ، اردو اور فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کی ۔ شہ سواری ، شمشیر زنی ، بندوق چلانے ، فوج کو کمانڈ کرنے اور فنون جنگ سے آپ کو زیادہ دل چسپی تھی ۔ دشمنوں سے مورچہ لینا آپ کے شوق میں داخل تھا تیر اندازی ، لکڑی ، پاٹا ، پیراکی ، موسیقی ، بانک ، بنوٹ ، بھالا کشی کبڈی ، تتلی مثل ، چیونٹی کی چال ، لاچی ڈنڈی ، شطرنج اور شکار وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کی ۔ ۱۴ سال کی عمر میں شیر کا شکار کھیلا ۔

شکار کا شوق

آپ کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا ۔ کئی کئی مہینوں کے لیے آپ شکار پر نکل جاتے ۔ ایک مرتبہ ۱۸۶۵ء میں چیف کمشنر ونگ فیلڈ کے ساتھ ۲۰ فروری کو شکار پر نکلے اور ۱۸ جون کو واپس ہوئے ۔ اس دوران انھوں نے ۴۷ شیر ، ۵۱ سانڈ ، ۴ ارنا بھینسے ۸۳ ہرن اور چیتل ، ۲۵ پاڑھے ، ۳۷ خرگوش اور بہت سی چڑیوں کا شکار کیا ۔ آپ نے اپنی زندگی میں ۸۷۸ شیر مارے اور لاتعداد جنگلی ہاتھی پکڑے ۔

بیویاں

آپ کی پہلی بیوی سلطان پور کے تعلقدار کی دختر تھیں ۔ دوسری بیوی راجہ کرشن کشور چند آف گولہ گوپال پور کی دختر ، تیسری بیوی راجہ گونڈہ دیبی سنگھ کے خاندان کی مہارانی اندر کنور چوتھی بیوی مہارانی اندر کنور کی چھوٹی بہن تھیں تاکہ بڑی بہن کی تنہائی دور ہوسکے ۔ پانچویں شریک حیات بھیا بانکے سنگھ بسین کی دختر مہارانی بجے پال کنور تھیں ۔ آپ کے وصیت نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ایک بیوی مسلمان بھی تھیں جن سے بھیا جنگ بہادر پیدا ہوئے تھے ۔ دونوں کے لئے مہاراجہ نے ۱۲ ہزار روپے سالانہ مقرر کر دیا تھا ۔

تعلقہ و جائداد

آپ کے تعلقے میں دو ہزار آٹھ سو چودہ گاؤں تھے ، جن کا کل رقبہ تیس لاکھ بیس ہزار ایک سو نواسی بیگھہ تھا ۔ آپ کی جائداد جو مکان ، باغات اور آراضی کی شکل میں ہے وہ گونڈہ ، بہرائچ ، بستی ، لکھنؤ ، کلکتہ ، الہ آباد اور بنارس میں پھیلی ہوئی ہے جسے آپ نے خود خریدا تھا ۔

مذہبی عقائد

آپ شکتی دیوی کی پوجا کرتے تھے ۔ پنڈت بشرام پانڈے کو اپنا مذہبی گرو مانتے تھے ۔ دنیا کے دیگر مذاہب کی عزت کرتے تھے ۔ آپ سناتن دھرمی تھے ۔ ہندستان کے سبھی مقدس مقامات پر کئی کئی بار حاضری دیتے تھے ۔ مہنتوں ، پنڈتوں اور پجاریوں کو مفت آراضیاں دیں تاکہ وہ مہاراجہ کی طرف سے پوجا پاٹھ اور تیوہاروں پر روپے خرچ کر سکیں ۔ سنسکرت پاٹھ شالاؤں اور بھوگ وغیرہ پر ہزاروں روپے خرچ کیا کرتے تھے ۔ چوتھی رانی کے مرنے پر دس ہاتھی ، دس گھوڑے اور دس گائیں دان کیں تاکہ رانی کی روح کو سکون پہونچے ۔

خیر و خیرات

آپ اپنی بیماری کے زمانے سے صحت یاب ہونے کے بعد تک روزانہ گائیں ، گھوڑے ، ہاتھی ، سونے چاندی کے سکے ، اناج اور ہزاروں تھان رنگ برنگے قیمتی کپڑے غریبوں اور حاجت مندوں کو برابر تقسیم کرتے رہے ۔ اپنے معالج ڈاکٹر چکرورتی کو مبلغ پچیس ہزار روپے ، بیش قیمت خلعت ، بہت سی شالیں ، قیمتی زیورات ، زرنگار جھول اور نقری ہودے کے ساتھ ایک ہاتھی ، سونے کا خول چڑھی ہوئی کاٹھی اور نقرئی زیورات سے آراستہ ایک گھوڑا ، ایک اعزازی تلوار اور چاندی کے برتن نذر کیے ، ساتھ ہی ساتھ مبلغ سو روپیے ماہوار پنشن بھی مقرر کر دی ۔ اسی زمانے میں افغان جنگ چھڑ گئی ۔ آپ نے افغان مجاہدین کے امدادی فنڈ میں ایک لاکھ روپیے عنایت کیے ۔

قومی اور سماجی خدمات

آپ نے نو سڑکیں بنوائیں ، بلرام پور میں اسکول اور کالج کھلوائے ۔ بچوں کو کھانا ، کپڑا اور کتابیں مفت تقسیم کرائیں ۔ بلرام پور میں اسپتال بنوایا ۔ ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ میں بلرامپور اسپتال کھلوایا اور دو لاکھ روپیے بلڈنگ کی دیکھ ریکھ اور تعمیر کے لیے جمع کر دیے ۔

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی
گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ

راجہ بلرام پور ـ حیات اور شاعری

نام، ولدیت، پیدائش، انتقال

(راجہ) دگ وجے سنگھ نام اور راجہ تخلص تھا۔ آپ کے والد راجہ ارجن سنگھ تھے جو ۱۸۳۰ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ راجہ کی ولادت ۱۸۱۹ء میں ہوئی اور ۲۷ فروری ۱۸۸۲ء میں سنیچر کا دن گزرنے کے بعد رات ۱۲ بجے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

نسب

آپ کا سلسلۂ نسب مہابھارت کے مشہور ہیرو ارجن پانڈو تک پہونچتا ہے۔ ارجن کی اکتالیسویں پشت میں مہاراجہ سکھ دیو تھے۔ ان کے چھ لڑکوں میں آخری بریارشاہ تھے۔ یہ اکونہ ضلع بہرائچ کے پاس دھرساواں گاؤں گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ۱۳۷۴ء میں جب فیروز شاہ تغلق دہلی آئے تو بریار شاہ نے ان سے اکونہ کا علاقہ مانگا۔ بادشاہ نے درخواست منظور کر لی اور بریار شاہ کا قبضہ علاقے پر ہو گیا، اور بھر قوم کو پسپا ہونا پڑا۔ اکونے کا علاقہ بہت بڑا تھا۔ اس علاقے پر بریار شاہ کی اولاد یکے بعد دیگرے راج کرتی رہی۔ یہاں تک کہ آپ کی ساتویں یا آٹھویں پشت میں بھیا بلرام شاہ ہوئے۔ پھر ان سے گدی نشینی کا جو سلسلہ چلا وہ حسب ذیل ہے:-

۱. بھیا بلرام شاہ (۵۸-۱۵۵۳ء)
۲. راجہ پورن چند (۸۱-۱۵۵۸ء)
۳. راجہ تیج شاہ (۱۶۱۸-۱۵۸۱ء)
۴. راجہ ہربنس سنگھ (۱۶۸۲-۱۶۱۸ء)
۵. راجہ چھتر سنگھ (۱۶۹۰-۱۶۸۴ء)
۶. راجہ نرائن سنگھ (۱۷۳۶-۱۶۹۰ء)
۷. راجہ پرتھی پال سنگھ (۱۷۸۱-۱۷۳۶ء)
۸. راجہ نول سنگھ ۹. راجہ ارجن سنگھ
۱۰. راجہ جے نرائن سنگھ
۱۱. راجہ دگ وجے سنگھ (۱۸۸۲-۱۸۳۵ء)

ان کے بعد مہارانی اندر کنور ہوئیں۔ مہارانی نے مہاراجہ بھگوتی سنگھ کو متبنیٰ کیا مگر نابالغ ہونے کی وجہ سے علاقہ کورٹ آف وارڈس کی نگرانی میں رہا، جو ۱۹۰۰ء میں مہاراجہ کے قبضے میں آیا اور وہ ۱۹۲۱ء تک گدی نشین رہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک علاقہ پھر کورٹ آف وارڈس کی نگرانی میں رہا۔ مہاراجہ پاٹیشوری پرشاد سنگھ جب بالغ ہوئے تو علاقہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۴ء تک آپ کے زیر نگیں رہا۔ آپ نے مہاراجہ دھرمیندر سنگھ کو گود لیا جو ۱۹۷۴ء سے اس علاقے کے مہاراجہ ہیں۔

دگ وجے سنگھ کا بچپن

آپ بچپن میں بہت زیادہ پھرتیلے اور شرارتی تھے۔ گھوڑوں اور بندروں کے پالنے کے بہت شوقین تھے۔

بچپن میں انھیں دو جان لیوا حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ صرف آٹھ مہینے کے تھے جب اپنے کھلونے گھوڑے سے گر پڑے۔ بہت کافی چوٹ آئی۔ ٹھڈی کی چوٹ کا نشان مرتے دم تک باقی رہا۔ جب مہاراجہ چار سال کے تھے تو دوسرا حادثہ پیش آیا۔ ایک کھولتے ہوئے

معدے کے گراماؤ میں پیر پھسلنے سے گر پڑے۔ جسم بری طرح جل گیا۔
مگر.... جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

تعلیم

آپ کی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کیا گیا۔ راج محل میں ہی آپ نے ہندی، اردو اور فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کی۔ شہسواری، شمشیر زنی، بندوق چلانے، فوج کو کمانڈ کرنے اور فنون جنگ سے آپ کو زیادہ دلچسپی تھی۔ دشمنوں سے مورچہ لینا آپ کے شوق میں داخل تھا۔ تیر اندازی، لکڑی، پالٹا، پیراکی، موسیقی، بانک، بنوٹ، بھالا، کشتی، کبڈی، تتلی مٹل، چیونٹی کی چال، لاچی ڈنڈی، شطرنج اور شکار وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کی۔ ۱۴ سال کی عمر میں شیر کا شکار کھیلا۔

شکار کا شوق

آپ کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ کئی کئی مہینوں کے لیے آپ شکار پر نکل جاتے۔ ایک مرتبہ ۱۸۶۵ء میں چیف کمشنر ونگ فیلڈ کے ساتھ ۲۰ فروری کو شکار پر نکلے اور ۱۸ جون کو واپس ہوئے۔ اس دوران انھوں نے ۳۴ شیر، ۵۱ سانڈ، ۳ ارنا بھینسے، ۸۳ ہرن اور چیتل، ۲۵ پاڑھے، ۳۷ خرگوش اور بہت سی چڑیوں کا شکار کیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں ۸۷۸ شیر مارے اور لاتعداد جنگلی ہاتھی پکڑے۔

بیویاں

آپ کی پہلی بیوی سلطان پور کے تعلقدار کی دختر تھیں۔ دوسری بیوی راجہ کرشن کنور جنید آف گوکا گوپال پور کی دختر، تیسری بیوی راجہ گونڈہ دیبی سنگھ کے خاندان کی مہارانی اندر کنور، چوتھی بیوی مہارانی اندر کنور کی چھوٹی بہن تھیں تاکہ بڑی بہن کی تنہائی دور ہو سکے۔ پانچویں شریک حیات بھیا بابکے سنگھ بسین کی دختر مہارانی ججے پال کنور تھیں۔ آپ کے وصیت نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ایک بیوی مسلمان بھی تھیں جن سے بھیا جنگ بہادر پیدا ہوئے تھے۔ دونوں کے لئے مہاراجہ نے ۱۲ ہزار روپے سالانہ مقرر کر دیا تھا۔

تعلقہ و جائداد

آپ کے تعلقے میں دو ہزار آٹھ سو چودہ گاؤں تھے جن کا کل رقبہ تیس لاکھ بیس ہزار ایک سو نواسی بیگھہ تھا۔ آپ کی جائداد جو مکان، باغات اور آراضی کی شکل میں ہے وہ گونڈہ، بہرائچ، بستی، لکھنؤ، کلکتہ، الہ آباد اور بنارس میں پھیلی ہوئی ہے جسے آپ نے خود خریدا تھا۔

مذہبی عقائد

آپ شکتی دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ پنڈت بلرام پانڈے کو اپنا مذہبی گرو مانتے تھے۔ دنیا کے دیگر مذاہب کی عزت کرتے تھے۔ آپ سناتن دھرمی تھے۔ ہندوستان کے سبھی مقدس مقامات پر کئی کئی بار حاضری دیتے تھے۔ مہنتوں، پنڈتوں اور پجاریوں کو مفت آراضیاں دیں تاکہ وہ مہاراجہ کی طرف سے پوجا پاٹھ اور تیوہاروں پر روپے خرچ کر سکیں۔ سنسکرت پاٹھ شالاؤں اور بھوگ وغیرہ پر ہزاروں روپے خرچ کیا کرتے تھے۔ چوتھی رانی کے مرنے پر دس ہاتھی، دس گھوڑے اور دس گائیں دان کیں تاکہ رانی کی روح کو سکون پہونچے۔

خیر و خیرات

آپ اپنی بیماری کے زمانے سے صحت یاب ہونے کے بعد تک روزانہ گائیں، گھوڑے، ہاتھی، سونے چاندی کے سکے، اناج اور ہزاروں تھان رنگ برنگے قیمتی کپڑے غریبوں اور حاجت مندوں کو برابر تقسیم کرتے رہے۔ اپنے معالج ڈاکٹر چکرورتی کو مبلغ پچیس ہزار روپئے، بیش قیمت خلعت، بہت سی شالیں، قیمتی زیورات، زرنگار جھول اور نقرئی ہودے کے ساتھ ایک ہاتھی، سونے کا خول چڑھی ہوئی کاٹھی اور نقرئی زیورات سے آراستہ ایک گھوڑا، ایک اعزازی تلوار اور چاندی کے برتن نذر کیے، ساتھ ہی ساتھ مبلغ سو روپے ماہوار پنشن بھی مقرر کر دی۔ اسی زمانے میں افغان جنگ چھڑ گئی۔ آپ نے افغان مجاہدین کے امدادی فنڈ میں ایک لاکھ روپے عنایت کیے۔

قومی اور سماجی خدمات

آپ نے نو سڑکیں بنوائیں، بلرام پور میں اسکول اور کالج کھلوائے۔ بچوں کو کھانا، کپڑا اور کتابیں مفت تقسیم کرائیں۔ بلرام پور میں اسپتال بنوایا۔ ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ میں بلرام پور اسپتال کھلوایا اور دو لاکھ روپئے بلڈنگ کی دیکھ ریکھ اور تعمیر کے لیے جمع کر دیے۔

بلرامپور لیتھو گراف پریس کھلوایا جس میں اُردو ہندی کی کتابیں چھاپی گئیں اور مفت تقسیم کی گئیں۔ عوام کے لیے کنوئیں، تالاب اور باغ بڑی تعداد میں فراہم کیے۔

بلرام پور "غریب خانہ" سے تقریباً دس ہزار سالانہ خیرات تقسیم ہوتی تھی۔ غریب بیواؤں کے لیے چرخہ پٹی کا انتظام کیا، جس میں وہ سوت کات کر اپنا پیٹ پالتی تھیں۔ آپ نے مبلغ اڑتالیس ہزار روپے سالانہ جنوار لڑکیوں کی شادی کے لیے مقرر کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ جو حاجت مند یا سائل پہونچا اس کی حاجت روائی کی گئی۔

جنگیں

راجہ اترولہ اور راجہ تلسی پور سے جنگیں بھی لڑنی پڑیں جن میں آپ کو خاطر خواہ فتح حاصل ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے مورچے تو کئی بار سر کیے۔

قومی یک جہتی

آپ کے پاس سات باڈی گارڈ تھے۔ تین ہندو اور چار مسلمان: (۱) جنرل بینی مادھو پانڈے (۲) بھیا سری رت سنگھ (۳) بھیا سورج بلی سنگھ چوہان (۴) غفور خاں (۵) میرزا خواجہ جان (۶) عظیم الدین خاں (۷) علی محمد خاں۔

ایک مرتبہ آپ اپنے ایک عزیز کے یہاں سے واپس آ رہے تھے۔ بھیا نل سنگھ نے موقع غنیمت جان کر تین سو سپاہی بھیج دیئے کہ راستے ہی میں راجہ کا کام تمام کر دیں۔ مگر ان ساتوں محافظین نے ان تین سو کو شکست دے دی۔

خطابات، اعزازات و انعامات

آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے "راجہ بہادر" کا خطاب اور چودہ پارچے کا خلعت، ایک تلوار، ایک ڈھال اور موتیوں کا ایک ہار عطا کیا۔

برطانوی حکومت کی طرف سے وائسرائے نے "مہاراجہ بہادر" کا خطاب ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء کو دیا۔ اس کے علاوہ مبلغ سات ہزار روپے کا خلعت اور سند وفاداری بخشی۔ کلکتہ نمائش کے موقع پر ایک فرسٹ کلاس میڈل اور مبلغ دو ہزار تین سو چھیالیس روپے انعام ملے۔ وائسرائے لارڈ لارنس نے ۱۸۶۶ء میں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب مرحمت فرمایا۔ عدالت کی حاضری سے بری کیے گئے۔ گورنمنٹ لیجس لیٹو کونسل کے اڈیشنل ممبر مقرر کیے گئے۔ وائسرائے لارڈ ڈلفن کے حکم سے ۱۸۷۷ء میں نو توپوں کی سلامی دی گئی۔ انجمن ہند اودھ کے تاحیات نائب صدر رہے۔

شاعری

لالہ سری رام اپنے مشہور و معروف تذکرے "خم خانۂ جاوید" کی تیسری جلد کے صفحہ ۲۹ پر لکھتے ہیں:

"...... اُردو شعر و سخن کی طرف بھی توجہ تھی اور صاحب دیوان تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر سے تلمذ تھا۔ اشعار صاف اور شستہ، فصیح و بلیغ ہیں"۔

جوہر کے علاوہ سید آغا حسن عرف میرن صاحب نامی لکھنوی ثم بلرامپوری مصاحب خاص سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے نامی نے سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ "احسن التواریخ" کے نام سے چار جلدوں میں راجہ صاحب موصوف کے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں یہ جلدیں بہت ضخیم ہیں۔ ہر جلد میں تقریباً سات سو صفحات ہیں جن کی تقطیع $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۴}$ ہے۔ یہ چاروں جلدیں مطبوعہ ہیں۔ یہ جلدیں راجہ صاحب موصوف کے حالات میں سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دیگر فنون کے ذکر سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

نمونۂ کلام

("خم خانۂ جاوید" جلد سوم صفحہ ۲۹ و صفحہ ۳۰ سے ماخوذ)

تیری صورت دیکھ کر لیلیٰ کو آئے گا حجاب
میری صورت دیکھ کر مجنوں بہت شرمائے گا

گئے وہ دن کہ حسینوں کو پیار کرتے تھے
نہ ولولے رہے اپنے نہ وہ شباب رہا

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

دانش لکھنوی
۳۲۷/۱۲۴ انیس ہاؤس، چوک لکھنؤ ۳

کلامِ انیس میں ہندستان

ہندستان اپنی جن اعلیٰ تہذیبی قدروں کی بدولت ساری دنیا میں مشہور ہے، وہ قدریں صدیوں کی ریاضت، تفکر، جہاد علم اور انسانی اخلاق و اخوت کی مسلسل تحریکوں کا ثمرہ ہیں۔ ہندستانی صنعت و حرفت نے عام انسانوں کے لیے مادی زندگی کی راحتوں کے اسباب مہیا کیے اور ہندستان کے فکری ارتقاء نے نہ صرف روحانی آسائش کے لیے سرمایہ فراہم کیا بلکہ انسان اور انسان کے درمیان تفریق پیدا کرنے والی تمام شناختوں کو بھی ختم کر دیا۔

ہندستان میں آریوں کی آمد سے ایک نئے عہد کی بنیاد پڑی وہ لوگ جو سماج سے کٹ کر معرفت کی گپھاؤں میں زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے تھے، سماج کا جزو بننے لگے۔ خلقِ خدا کی خدمت کے جذبات کی نشو و نما کی رفتار تیز ہوئی۔ اس طرح سادھوؤں اور سنتوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جو دوسروں کے لیے آئیڈیل سمجھا جانے لگا۔ ان کے افکار و خیالات میں، ان کی سیرت و عمل میں ان صالح اقدار کی آمیزش ہونے لگی جو آریہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

انسان چونکہ احسن تقویم کی تخلیق ہے اور اس کی طینت میں نیکی اسی طرح موجود ہے جس طرح پھول میں خوشبو یا کرنوں میں رنگ اسی لیے انسانی اعمال میں اس کا اظہار ایک لازمی امر ہے۔ آریوں کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کی آمد نے اس رنگ و نکہت کو متحد کرنے میں ایک خاص رول ادا کیا۔ وہ بھی اسی خدائے واحد کے ماننے والے تھے جس کی شریعت نے تقویٰ اور پرہیزگاری کو سب سے بلند درجہ دے رکھا ہے۔ مسلمان اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ اسی راستے پر گامزن تھے جو اتحاد و اتفاق کا راستہ تھا، جہاں رنگ و نسل کی تفریق، زبان اور خطے کا امتیاز، سرمایہ پرستی اور غربت کا تصور کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ وہ انسان کو اس کی نیکیوں اور خوبیوں کے آئینے میں دیکھنے کے متمنی تھے، اسی لیے انھوں نے ہندستان کے قدیم تمدن و تہذیب سے متصادم ہوئے بغیر ہندستانی معاشرے میں اپنی جگہ بنا لی اور نیکیوں سے نیکیوں کا تبادلہ کیا۔ خوبیوں کو خوبیوں کی کسوٹی پر پرکھا بالآخر معاشرہ میں ہنرمند، محنتی اور جفاکش انسانوں کی قدر کا جذبہ عام ہو گیا۔ علماء اور حکماء کی عزت کا تصور، گنگا اور جمنا کی پاکیزہ لہروں کے ساتھ عام انسانوں کو سیراب کرنے لگا۔ سادھوؤں، صوفیوں اور مصلحین قوم کے شانہ بشانہ ہندستانی شعراء نے بھی اپنے جذبۂ خدمت کے جوہر دکھائے تلسی داس، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور امیر خسرو وغیرہ نہ جانے کتنے شاعروں نے ہندستانیت کے جذبات کو فروغ دیا۔ اسی مشترکہ تہذیبی میراث کو فروغ دینے والوں میں میر حسن کے پوتے اور میر خلیق کے بیٹے میر ببر علی انیس بھی تھے۔

انیس کے نشو و نما اور عروج کا زمانہ دراصل مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ وہ مشترکہ تہذیبی اساس جسے ہندو مسلم اتحاد نے مہیا کیا تھا، انگریزوں کی شرپسند سیاست کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

انگریز دور دیس سے آئے تھے لیکن ہندستان کی آب و ہوا، سوسائٹی اور ماحول سے ان کو کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنے بندھے ٹکے منصوبے کے تحت ہندستانی ریاستوں میں ابتری پھیلانے اور ریاست کے حکمرانوں کو بدنام کرنے کی ناپاک کوششیں کرتے رہے چونکہ ہر عمل میں ردعمل کی توانیں بھی پوشیدہ ہوتی ہیں چنانچہ انگریزوں کی ان کوششوں نے جہاں غدارانِ وطن کی حوصلہ افزائی کی، وہیں ہندستان کی سرزمین سے والہانہ عشق کرنے والوں کو ایک رشتے میں پرو دینے کی ضرورت کا احساس بھی لمحہ بہ لمحہ کرایا۔ چنانچہ اس عہد کے شعراء نے شہر آشوب لکھ کر احساس کی اس رو کو اور تیز کیا۔ اردو مرثیہ نے بھی ہندستان کی مشترکہ تہذیبی علامتوں کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ اس کے موضوعِ سخن افراد و واقعات اگرچہ ہندستان کی سرزمین سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ لیکن اردو مرثیہ نے ان کے بیان میں ان تشبیہات، استعارات وعلامات کا بھرپور سہارا لیا جو ہندستان کی تہذیبی میراث تھیں۔

میر انیس اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے ہی اس مشترکہ تہذیبی سرمایہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے جو بعد میں ان کے مرثیہ کی اساس بنا۔ علی محمد شاد عظیم آبادی کا بیان ہے:

"... محلہ میں ایک مندر تھا، وہاں ایک سادھو کسی قدر فارسی عربی پڑھا ہوا بیٹھا کرتا تھا۔ آپ گھڑیوں ٹہل ٹہل کر فارسی اشعار اور دوہے اس کو سنایا کرتے تھے وہ بھی دوہے پڑھا کرتا تھا۔ اجودھیا میں کسی دوست کی تقریب میں گئے، وہاں سیتا جی کی رسوئی اور بہت سے مندر ہیں۔ وہاں کسی سنیاسی سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ تین دنوں تک وہاں اس سے گھڑیوں بات چیت ایسی رہی کہ وہ بھی معترف ہوگیا اور کہنے لگا کہ آپ تو حقیقت میں جوگی اور سنیاسی ہیں"۔ بلہ

ہندی دوہوں سے میر انیس کی دل چسپی، پنڈتوں سے براہِ راست علمی گفتگو، تارک الدنیا افراد سے معرفت آمیز مکالمہ ان کے علمی رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک سنسکرت کے شاعر کا قول ہے:

"حسن جہاں بھی ہے میرا کھویا ہوا کنگن ہے"

میر انیس نے اپنی ساری زندگی اسی کھوئے ہوئے کنگن کی تلاش میں گزاری اور اس تگ و دو میں جو سرمایہ ہاتھ آیا اسے مرثیے کی زینت اس طرح بنایا کہ حسن نکھر کر جب سامنے آیا تو تابِ نظارہ باقی نہ رہی ہے

تیغ و ترنج اگر ہوں ہلال اور آفتاب
سرکائے چہرۂ علی اکبر سے پھر نقاب
گر دیکھ لیں وہ حسنِ ملیح اور وہ شباب
حوریں گلوں کو کاٹ کے تڑپیں رہے نہ تاب

پریاں تو ان کے سائے کا پیچھا نہ چھوڑتیں
دامن کبھی جنابِ زلیخا نہ چھوڑتیں

میر انیس نے قدیم فارسی داستانیں بھی پڑھی تھیں اور ممکن ہے کہ مہابھارت اور رامائن بھی ان کے مطالعے میں رہے ہوں۔ انھوں نے اودھی باقاعدہ نہ بھی پڑھی ہو مگر وہ اس کے اصولوں سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ ہندی ادب کی بعض کتابوں میں انیس کے نام سے ایک کبت بھی ملتا ہے ۲۴

اس کبت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ میر انیس کا کہا ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک روایت یہ بھی وابستہ ہے کہ انیس خود کو غیر مسلم ظاہر کرکے ایک پنڈت سے وید پڑھنے جایا کرتے تھے جب پنڈت جی کو ان کے مسلمان ہونے کا علم ہوا تو انھوں نے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ اس پر انیس نے یہ کبت کہا۔ یہ دلچسپ روایت مزید تحقیق چاہتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ انیس کو اودھی زبان سے خاصی دل چسپی اور واقفیت تھی۔ اس سلسلے میں نوبت رائے نظر لکھنوی رقمطراز ہیں:۔

"..... غالباً بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انھیں اس زبان کی شاعری سے کسی قدر دلچسپی تھی۔ معتبر اشخاص کا بیان ہے کہ انھیں ہزاروں دوہے یاد تھے اور ان کی لطافت کا اثر خاص طور پر محسوس

کرتے تھے ......" ؎

شاد عظیم آبادی بھی بتاتے ہیں کہ انیس کو خوب خوب دوہرے یاد تھے
ایک موقع پر انھوں نے شاد کے سامنے عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

شرف العيون على السيوف لانها
قتلت ولم تخرج من اجفان

پھر اسی موضوع پر یہ دوہرا پڑھا ؎

تیر تفنگ کی چوٹ سے اوٹ ہوت بچ جائے
جالم چوٹ نین کی کراوٹ ہوت بچ جائے

میر انیس کے کلام میں مختلف زبانوں کا استعمال ان کے مزاج کا آئینہ دار ہے۔ بھاکا میں بھائی کو بیرن بھی کہتے ہیں مگر اس کا استعمال کس محل پر درست ہوگا، انیس اس سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت علی اکبر کی شہادت کے بعد اہل حرم رو رہے ہیں۔ چھوٹی بہن کی زبان سے یہ لفظ اس طرح ادا ہو رہا ہے ؎

بہنیں پکارتی تھیں کہ بیرن ترے نثار
اب تک تو گھر میں آئے تھے میداں سے چند بار
بھیا سنگھاؤ نکہت گیسوئے مشک بار
اس بھینی بھینی بو کے لیے دل ہے بے قرار
آئے نہ عموجان کا پرسہ بھی دینے کو
کیا بے کہے چلے گئے صغرا کے لینے کو ؎

چند شعر اور ملاحظہ فرمائیں ؎

دانتوں میں وہ چمک کہ نظر کو نہیں ہے تاب
خود جس کی برق وشرق سے آکاس کو حجاب

چھیدیں وہی گلا یہ لعینوں کے جی میں تھا
یاں کنٹھ بیٹھ جانے سے دم دھکدھکی میں تھا

ساونت بے حواس ہراساں دھمنی بلی
جاگا گرز و کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں

مذکورہ اشعار میں انیس نے ساونت۔ آکاس۔ کنٹھ۔ دھکدھکی۔ کوکھ۔ دھمنی۔ بلی وغیرہ الفاظ استعمال کر کے اپنے زور قلم کا جلوہ دکھایا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں ان رسوم کا بھی ذکر کیا ہے جو کسی طرح عربی تمدن سے ہم آہنگ نہ تھے۔ وہ ہماری مشترکہ تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ انھوں نے مختلف بیاہ شادی کے رسوم اسی طرح نظم کیے ہیں جیسے ہمارے ملک میں رائج ہیں۔ مثلاً کنگنا، سہرا، طرہ، بدھی، افشاں، مہندی، نتھ، نیگ، صندل، چوتھی، چالے وغیرہ کا بیان بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ مثال میں چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

مہندی تمھارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھاؤ تو رخ کا نور
پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور

آنکھوں پہ یہ ہتھیلیاں رقت کا ہے وفور
نرگس کے پھول ہاتھ میں ملنا ہے کیا ضرور

جینے کو اس چمن میں خوشی دل سے فوت ہے
بلبل جو گل کی شکل نہ دیکھے تو موت ہے

جناب قاسم کی شہادت پر ان کی زوجہ جناب صغریٰ کے بین کو انیس نے اس طرح نظم کا جامہ پہنایا ہے ؎

دولھا بنے ہیں خون کی مہندی لگائے ہیں
سہرا کہیں دکھانے کو مقتل میں آئے ہیں
ندی لہو کی چاند سی چھاتی سے بہہ گئی
بہنوں کی نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی
یہ کہہ کے نوچنے لگی سہرا وہ سوگوار
افشاں چھڑا کے خاک ملی منہ پہ چند بار

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

نتھ چوڑیاں پہنتے نہ پائی میں نوحہ گر
جو آج ٹھنڈی کرتی میں صاحب کی لاش پر

قائم سہاگ مانگ رہتی بڑی بہت
قسمت نے مانگ چوٹی سے کوری بھری رہے

کٹ کٹ گئیں وہیں سہرے کی لڑیاں لڑائی میں
بدھی گلے میں اب ہے، کنگنا کلائی میں

رات کو بیاہ ہو اور صبح تئیں رانڈ ہے
جیسے چوتھی کے عوض شام کو چالا ہو جائے

ہوئے مہندی کے بدلے سرخ دست و پا ترے خوں سے
ہوا ظاہر سے کی جانم کو میسر زخم سے دولھا
سوائے آرسی مصحف نہ صورت دیکھنے پائی
نہایت تم نے جلدی باندھی مرنے پر کمر دولھا

دلھن نے کہا رو کے صندل چھڑاؤ
بس اب خاک افشاں کی جا چاہیے
بڑھائے مری ناک سے نتھ کوئی
مجھے سرخ پوشاک کیا چاہیے

کنگنے کی جگہ ہاتھوں میں اب دوہری رسن ہے
افشاں کی جگہ خاک پڑی ہے مرے سر پر
گودوں سے ہوئی چوکتی رسن سے ہوئے چھالے
جب منھ کی دکھائی میں پھرائی گئی در در

درج بالا اشعار سے یہ صاف ظاہر ہے کہ میر انیس نے ہندستانی رسوم کی وضاحت جس انداز سے کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ الفاظ کی مناسبت اور ان کے برمحل استعمال نے اشعار میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ جب اور جس وقت ان کا مطالعہ کیا جائے ان کی تازگی برقرار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کلام انیس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی ایک فوج ہے جو میر انیس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے انھوں نے اس میں سے جسے جس جگہ مناسب سمجھا لگا دیا، تو غالباً غلط نہ ہوگا اور اسی کے پیش نظر میر انیس کے بارے میں رام بابو سکسینہ کا ارشاد ہے۔

"...... ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون کو اس سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صدہا بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے ان کی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رائے میں اس وقت تک ترقی کرتی جائے گی جب تک زبان اردو ترقی کرے گی بلکہ اسی وقت انیس کی واقعی قدر کی جائے گی۔" ۶؎

اور یہ حقیقت ہے انیس کے انتقال کو تقریباً ایک سو سترہ (۱۱۷) برس گزر گئے لیکن ان کے کلام کی عطر بیزی آج بھی ہمارے مشام کو تازگی اور روح کو فرحت بخشتی ہے۔

□□

حواشی:

۱؎ پیمبرانِ سخن۔ مولفہ خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی۔ مرتبہ سید نقی احمد ارشاد کاظمی، ڈاکٹر سید صفدر حسین ص۸۵-۱۸۴ مطبوعہ اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور ۱۹۷۳ء

۲؎ ملاحظہ ہو "انیس (ابتدائی دور)": ڈاکٹر نیر مسعود رضوی۔ مطبوعہ دوماہی "اکادمی" جنوری۔ فروری ۱۹۸۷ء

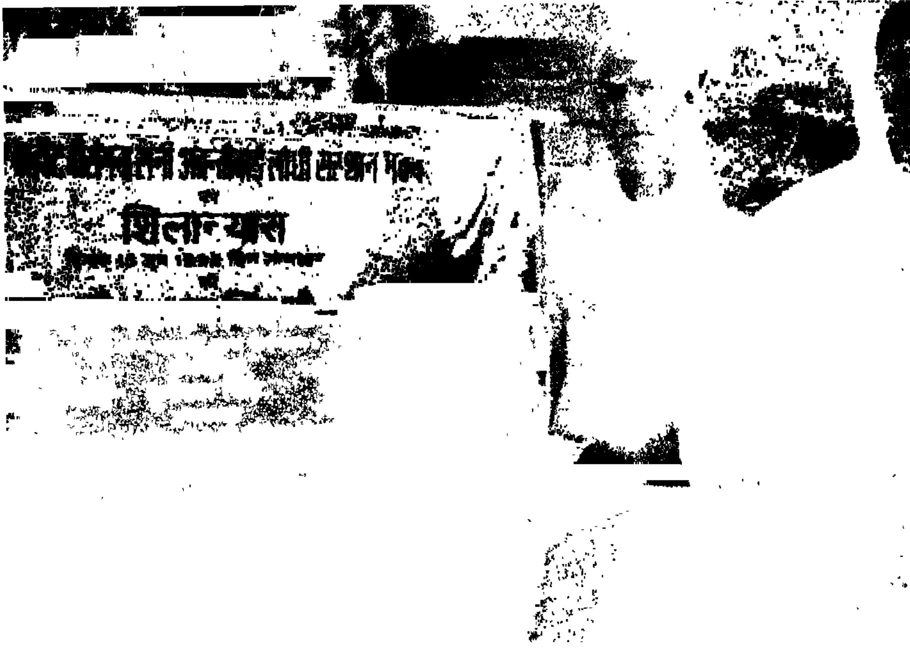
۳؎ منظومہ میر انیس مغفور۔ نوبت رائے نظر لکھنوی۔ "زمانہ" کانپور شمارہ جنوری فروری ۱۹۰۸ء (ایڈیٹر دیا نرائن نگم)

۴؎ فکر بلیغ۔ شاد عظیم آبادی ص۲۲۶ ۵؎ ایضاً ص۳۳۴-۳۵

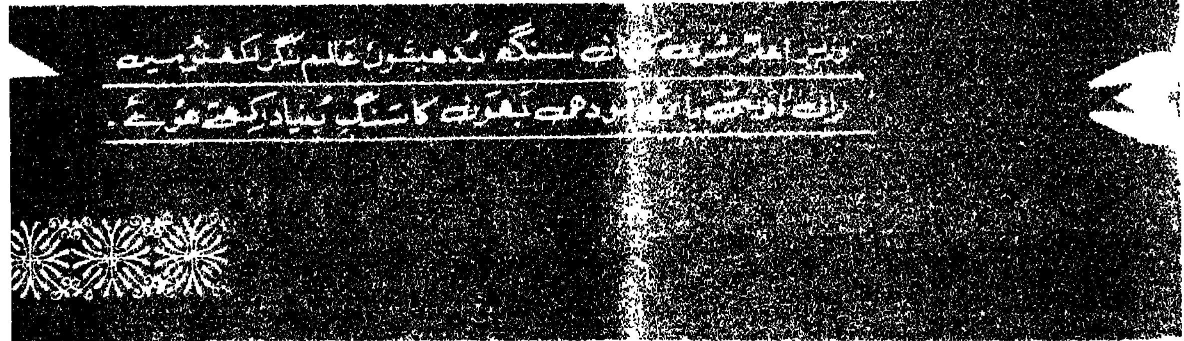
۶؎ تاریخ ادب اردو۔ مترجمہ مرزا محمد عسکری ادیب۔ مطبوعہ تیج کمار پریس لکھنؤ ۱۹۶۹ء (جدید ایڈیشن) ص۲۶۹-۷۰

وزیر اعلا شری کلیان سنگھ ۱۲ر جولائی ۱۹۹۲ء کو سچیوالیہ اینکسی میں
خشک سالی سے متعلق میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے

وزیر ریاست شری برہم دت دویدی ۲۸ر جون ۱۹۹۲ء کو ضلع کلکٹریٹ میں
منسٹیریل ملازمین کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے







شری ... سنگھ بدھیشور عالم نگر لکھنؤ میں
... دھی بھون کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔



صدر شری جگدمبا
یکم جولائی ۱۹۹۲ء کو
اکیڈمی کے رئیس دوم
کی ملازمت سے
کے موقع پر انھیں
کرتے



لائق ہے کلیان سنگھ ۱۵ رجون ۱۹۹۲ء کو لکھنؤ میں
مہاتما منتظمات میوزیم کے کوپن
لے شانلاے غدر ہند کے زائرین
کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ ... کی
ایکسپریس بس کا افتتاح کرتے ہوئے



نذرِ جوش

شکیب رضوی
کرائسٹ چرچ انٹر کالج
کان پور

کیسی مغموم فضا ہے یہ الم کیسا ہے
صبح کے دوش پہ اُجلا سا کفن کس کا ہے

چشم پیمانہ میں لرزاں ہیں یہ کیسے آنسو
کس کے ماتم میں پریشاں ہیں ادب کے گیسو

دفعتاً شور ہوا جوش نہیں عالم میں
اور صدی گونج گئی شاہِ ادب کے غم میں

جانبِ عرش مرا خاک نشیں جاتا ہے
آئینہ حال کا ماضی کا امیں جاتا ہے

تیری نظموں میں ہے بیدار کہانی تیری
نطقِ الفاظ پہ ہے شعلہ بیانی تیری

ملکِ فرہنگ پہ ہے اب بھی تسلّط تیرا
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں الفاظ توسط تیرا

منتظر ہیں تری شہزادیاں جنگل کی ابھی!
زیل کی اب بھی چمکتی ہے روپہلی پٹری

شیخ کے سینوں میں ایمان بھی لرزاں ہے ابھی
خانقاہوں میں وہی فتنہ خراماں ہے ابھی

فخرِ تہذیب ہے اصلاح کا تیری شیوہ
تجھ کو دیتی ہے دعا اب بھی سہاگن بیوہ

اور خاتون ہے مشرق کی ابھی مست حجاب
زیب دیتا ہے اسے 'مادرِ آدم' کا خطاب

ایک کونے میں تری یاد لیے بیٹھی ہے
نظم سے تیری 'انگیٹھی' میں ابھی گرمی ہے

درس نقاد کو دیتی ہے یہ نقدِ سخن
نظم 'نقاد' عطا کرتی ہے آگاہیِ فن

قید خانوں کے در و بام سے اٹھتا ہے دھواں
ذہن پر نقش ہر وہ خوابِ شکستِ زنداں

بھول سے بھی نہیں چلتے وہ 'دو رنگی' اب تک
نام سے تیرے لرزتے ہیں 'فرنگی' اب تک

ہند پر جب بھی حکومت کا خیال آتا ہے
دل 'بغاوت' کے تصوّر سے لرز جاتا ہے

مرحبا فخرِ سخن سوگ نشینوں کے امام
ہند کا 'شاہِ شہیداں' تجھے کہتا ہے سلام

حاملِ قوتِ تقریر ہیں تیری نظمیں
چلتی پھرتی ہوئی تصویر ہیں تیری نظمیں

ان کی رگ رگ میں ترا خون رواں ہو جیسے
طرزِ گفتار کہ ہر شعر میں جاں ہو جیسے

کتنے نیرنگ مرقعے ہیں ترے دیواں کے
تجربے ہیچ ہیں سب کارگہِ انساں کے

تیرے افکار پہ کیوں اہلِ خرد برہم ہیں
اس درِ کفر پہ ایماں کی جبینیں خم ہیں

زیرِ لب زمزمۂ حمدِ خدا جاری ہے
سینۂ کفر میں ایمان کی چنگاری ہے

طبعِ بیمار کو راس آئے نہ جب کوئی دعا
'ترجمہ سورۂ رحماں' کا پڑھے بہرِ شفا

لے گئے ہوں گے تجھے قادرِ مطلق کے حضور
تو نے رحمت کا قصیدہ بھی پڑھا ہوگا ضرور

اک تبسّم کی ضیا عرش پہ چھائی ہوگی
پردۂ غیب سے آواز یہ آئی ہوگی

خاص بندوں میں مرے اس کو بھی شامل کر لو
بخش دی اس کی خطا خلد میں داخل کر لو

محوِ گریاں ہیں ترے غم میں ملیح آبادی
فرشِ ماتم ہے ترے سوگ میں وادی وادی

گود پھیلائے ہے اب بھی یہ وطن کی دھرتی
دفن ہونے کی جہاں تجھ کو بڑی حسرت تھی

ہے شکیب اپنا یقیں ہوگا یہیں کنج نشیں
جوش کی روح یہیں ہوگی کہیں اور نہیں

□□

غزلیں

گُل سے غنچے بنے پھر سے خار ہو کر رہ گئے
ہائے وہ اقرار جو انکار ہو کر رہ گئے

کل جہاں رہتے تھے ہم اب ہیں وہاں پر راستے
وقت یوں بدلا کہ گھر بازار ہو کر رہ گئے

دیکھ کر چلنے لگے اوروں کے جب نقشِ قدم
سب ہمارے راستے دیوار ہو کر رہ گئے

آنے والا وقت لے لیتا ہے خود ہی انتقام
جتنے دشمن تھے چمن کے خار ہو کر رہ گئے

ہم کو بھی دیکھے زمانہ دل میں یہ حسرت لیے
سیکڑوں چہرے پسِ دیوار ہو کر رہ گئے

میٹھے میٹھے بول بھی کچھ ایسے طنز آمیز تھے
ان کے سب جملے چھری کی دھار ہو کر رہ گئے

اصلیت کچھ بھی نہیں بدنام سارے شہر میں
نام شارب رکھ لیا مے خوار ہو کر رہ گئے

—— شارب لکھنوی
۳۹۰/۱۱۰ ک-۲، رستم نگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

اتنا جاگے ہیں تیری یادوں میں
چاندنی چبھ رہی ہے آنکھوں میں

سُرخ آنکھوں میں اب نہیں آنسو
خون جلتا ہے ان چراغوں میں

انگلیاں لمس کو مچلتی ہیں
تم نہ آیا کرو خیالوں میں

مے کشی بھی نہ راس آئی مجھے
غم جھلکنے لگا شرابوں میں

زندگی خود ہی خواب بن جائے
اس قدر آیئے نہ خوابوں میں

دل مُصر ہے کہ تھام لے دامن
اتنی ہمت کہاں ہے ہاتھوں میں

کس سے اب انتقام لوں میکشؔ
میرا قاتل ہے میرے اپنوں میں

—— میکش یوسفی
۳۹/۲۹۹- پرانا نخاس، لکھنؤ

جو درد ہے منسوب محبت کی انا سے
ہوتی ہے شفا اس کو دعا سے نہ دوا سے

کچھ تجھ کو بھی احساس تھا رُسوائی کا شاید
کچھ ہم بھی تھے انجان ترے شہرِ وفا سے

گر جاؤں تو شاید نہ رہے اُٹھنے کی طاقت
کیوں تو نے نوازا ہے مجھے ایسی سزا سے

ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں سرابوں میں سمندر
اور لوگ سمندر سے پلٹ آئے ہیں پیاسے

خوشبو سے بدل دیتے ہیں ماحول فضا کا
جو قطرے ترے جسم کو چھوتے ہیں گھٹا سے

ملتے ہیں کہاں پھر وہ اُجالوں کے بھنور میں
منظر جو بکھر جاتے ہیں پلکوں کی ہوا سے

—— منصور عثمانی منظر
سی ۲۷۷، منٹو روڈ کامپلکس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



افسانہ

خان عزمی رُدولوی
ارشاد منزل، رُدولی ضلع بارہ بنکی

ایک بُوند دودھ کی!

"ہے رام!" چھمن استاد کی بیوی پاربتی سرد آہ بھر کر اٹھ بیٹھی۔

"تم جاگ رہی ہو پاربتی؟" چھمن استاد نے حیرت سے پوچھا

"ایسے میں کسی کٹھور ہی عورت کو نیند آئے گی ـــ اور تم! سو گئے کیا۔؟" پاربتی نے جل بھُن کر کہا۔

"میں نے سوچا چار دن شہزادی کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا، ممکن ہے نیند آگئی ہو؟"

"تم بھی تو چار دن بشیرا کے آگے پیچھے لگے رہے ـــ تم کیوں نہیں سو گئے۔؟" پاربتی اپنے شوہر سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔

مجھے نیند کیسے آتی ـــ؟ اپنے شاگرد کے دُکھ میں کلیجہ پھٹا جا رہا ہے میرا۔ غریب کی بیوی ہزار جتن کے باوجود بچ نہ سکی۔ اور سات دن کا بچہ!۔ بھگوان اسے زندہ رکھے۔ اور تم کسی موقع پر تو سیدھے منہ بات کیا کرو"۔ چھمن استاد سنجیدہ ہو گئے۔

"تو پھر!۔ اپنے جیسا دوسرے کو بھی جانو۔!" پاربتی بھی چیخ مار کر رو پڑی اور اپنے بچے رامو کو گود میں اٹھا لیا ـــ "میری بھی تو چھاتی پھٹی جا رہی ہے۔ دودھ ہے کہ اُمنڈا چلا آرہا ہے اور ادھر ایک بچہ بھوک سے ہلکان ہو رہا ہے"۔ پاربتی نے دودھ سے تر کرتی ہٹا کر اپنے بچے کے منہ میں دودھ رکھ دیا۔

"بابو! اب بشیرا چاچا بھی رو رہا ہے"۔ چھمن استاد کی چھ سال کی بچی شانتی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں بیٹی بشیرا رو رہا ہے۔ بھگوان نے ایسا وقت ہی ڈالا ہے اس پر"۔ چھمن استاد کھڑے ہو گئے۔

"اب کہاں چلے؟" پاربتی نے پوچھا۔

"بشیرا کے پاس"ـــ چھمن استاد دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکل گئے۔

ان کے پیچھے پاربتی بھی رامو کو شانتی کی گود میں دے کر باہر نکل آئی اور بجلی کے بلب کی مدھم اور سوگوار روشنی میں اپنے شوہر کو بشیرا کے گھر کی طرف سست رفتاری سے بڑھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ دونوں گھروں کے درمیان صرف ایک چوڑی سڑک حائل تھی۔ بشیرا کے احاطہ کا دروازہ اور چھمن استاد کا دروازہ اور صحن آمنے سامنے تھے۔

بشیرا پہلوان کا سات دن کا بچہ کسی طرح چُپ نہیں ہو رہا تھا آدھی رات کے مہیب سناٹے میں گھٹی گھٹی اور مرتعش چیخیں آس پاس کے ہر گھر میں پہونچ رہی تھیں مگر کسی گھر سے کھانسنے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ یہ بچہ پیدا ہونے کے بعد تین دن گھر میں رہا اور چار دن اسپتال میں ـــ کیونکہ بشیرا کی بیوی شہزادی کو چوتھے دن نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے ہاتھ پیر ڈال دیئے اور باوجود تمام کوششوں کے ساتویں دن چل بسی۔ جب تک اس کی تدفین نہیں ہو گئی محلہ اور برادری کی عورتیں اور مرد ٹھہرے رہے، عورتیں بچے کو سنبھالے رہیں مگر رات بھیگنے کے ساتھ ساتھ سب مرد و زن چلے گئے ـــ اور اکھاڑے میں اترتے ہی نامی گرامی پہلوانوں کو چشم زدن میں چِت کر دینے

والے بشیرا پہلوان سے ایک کمزور ناتواں بچہ نہیں سنبھل رہا تھا۔ دودھ کی شیشی کے نپل کو منہ ہی نہیں لگا رہا تھا، لگتا تھا رو رو کر اپنی جان دے دے گا۔

بشیرا کو روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا، وہ یہ سب کیا جانے۔ مگر غیر اختیاری طور پر ہاں ہوں، ہشر ہشر، راجہ بیٹا، میرا بیٹا، راج دلارا اور پیارا دولہا وغیرہ کہہ کر بچے کو تھپک رہا تھا ـــــ مگر دولہا کہتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کے ذہن میں جیسے کوندا سا لپکا۔ سونے، چاندی، پھولوں اور کلیوں کے گہنوں سے لدی، زرتار گھونگھٹ میں شہزادی کا حسین اور منور چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ یہ اس کی پہلی رات تھی، اور بشیرا نے دھڑکتے ہوئے دل، لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا تھا ـــــ

"شہزادی! جب پچھمن استاد میری بات پکی کرنے گئے تھے تو واپس آکر کہا تھا۔ بشیرا! اپنی پارو بھابھی سے پوچھ لے تیری جورو کا نام شہزادی ہے۔ اور وہ چال ڈھال ناک نقشے ہی سے نہیں، دیکھنے میں بھی شہزادی لگتی ہے۔ بھگوان قسم! وہ دمکتا ہوا چہرہ تیرے گھر میں اجالا ہو جائے گا۔ اور میں سمجھا تھا کہ وہ میرا دل رکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ مگر تو، تو تو واقعی شہزادی ہے۔ میں تجھ کو اپنی بھینسوں کا گوبر نہ اٹھانے دوں گا۔ یہ چوڑیوں سے بھری ہوئی گوری کلائیاں۔ یہ مہندی لگے نازک ہاتھ ......" اور شہزادی نے سجا کر اپنا جھکا ہوا چہرہ بشیرا کے کشادہ اور سخت سینے میں چھپا لیا تھا۔

اور ـــ شادی کے بہت دنوں بعد ایک دن جب شہزادی نے بشیرا کو بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ بڑی دیر تک بے سر پیر کی باتیں کرتا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا۔ پھر اچانک آبدیدہ ہو کر کہنے لگا:

"شہزادی! میری ماں مجھے جنم دے کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ابا نے دوسری شادی نہیں کی۔ اور میں ہوش سنبھالتے ہی دودھ کے کاروبار میں ابا کا ہاتھ بٹانے لگا۔ جب سیانا ہوا تو ابا نے مجھے پچھمن استاد کے سپرد کر دیا کہ میرے بیٹے کو پہلوان بنا دو۔ پھر ابا بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چل بسے۔ سارا کام میرے سر آن پڑا۔ نہ بہن، نہ بھائی۔ کرتا رہا سارا کام ـــ ابا کے ایک بھینس تھی تو میں ایسا پہلوان نکلا ـــ اور اب میرے چار بھینسیں ہیں۔ میرا بیٹا چار بھینسوں کا دودھ پئے گا تو کیسا پہلوان نکلے گا ـــ اللہ قسم اپنے وقت کا گاما ہوگا ـــ گاما!" اچانک وہ مجسم سوال بن گیا ـــ "اور اگر بیٹی ہوئی تو ـــ؟!"

"میری کسی بہن کے پلوٹھی کی بیٹی نہیں ہوئی۔" شہزادی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"اور اگر ہو بھی گئی تو ـــ دوبارہ ...."

"ہٹ ـــ" شہزادی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ "میں ایک بات بتاؤں ـــ؟" شہزادی نے جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا۔

"کیا ـــ؟"

"میں ـــ اپنے بیٹے کو پہلوان نہ بناؤں گی۔"

"پھر ـــ؟!" بشیرا کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"میں اسے خوب پڑھاؤں گی ـــ اور بالسٹر بناؤں گی" ـــ شہزادی کا حسین چہرہ تمناؤں اور عزم کے نور سے جگمگا اٹھا۔

"با ـــ لش ـــ ٹر!!" بشیرا نے شہزادی کے چہرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر مذاق اڑایا ـــ "میرا کرے گا دودھ کا کام اور بنے گا بالشٹر! ارے اللہ کی بندی! بھینسوں کا دودھ نکالتے نکالتے خود بے چارے کا بھرکس نکل جائے گا ـــ بھلا انگریزی میں گٹ پٹ گٹ پٹ کب کرے گا۔" بشیرا طویل قہقہہ لگاتے ہوئے یکبارگی سنجیدہ ہو گیا ـــ

"نہیں نہیں ـــ میں اپنے بیٹے کو غریبوں اور مظلوموں کا خون نہ چوسنے دوں گا ـــ میرا لال۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح بھینسوں کا کھرا دودھ نکال کر بیچے گا ـــ بالکل کھرا دودھ ـــ ملاوٹ کا نام نہیں۔"

شہزادی نے بشیرا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، مگر اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

آج بشیرا کو اس کا غم زدہ اور سنولایا ہوا چہرہ بُری طرح

یاد آیا۔ اسے بڑا دکھ ہوا ۔۔۔ وہ بڑبڑانے لگا ۔

" میں نے اس کی بات کیوں کاٹ دی؟ جب اسے زندہ ہی نہیں رہنا تھا تو کہہ دیتا کہ اچھا تیرے بیٹے کو بالسٹر بنوادوں گا ماں میں ہاں ملا دینے میں کیا حرج تھا، جب تک زندہ رہتی خوش رہتی ۔" اچانک وہ چیخ اٹھا ۔

" شہزادی! میں تیرے اس روتے بلکتے بچے کی قسم کھاتا ہوں ۔۔۔ میرے ہاتھ میں یہ کٹورے دودھ سے بھری شیشی گواہ ہے کہ میں تیرے بچے کو بالسٹر ضرور بناؤں گا ۔۔۔ چاہے میری ساری بھینسیں بک جائیں ۔۔۔ یا میرا گھر بک جائے ۔"

درد سے اس کا کلیجہ چھلنی ہوا جا رہا تھا ۔ اس کو رونا بھی نہیں آتا تھا مگر بے ہنگم آواز میں رونے لگا ۔

بشیرا رو رہا تھا، بچہ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا بستی خاموش تھی، جیسے سب کو خود غرضی کا سانپ سونگھ گیا ہو ۔ بھینسیں جاگ رہی تھیں اور سب کا رخ بشیرا کی طرف تھا ۔ ان کی ناندوں میں پار بھی چارہ بھوسہ اور کھلی ڈال گئی تھی ۔ مگر وہ منہ نہیں مار رہی تھیں ۔ حد یہ ہے کہ جگالی بھی نہیں کر رہی تھیں ۔ بالکل ساکت، حیرت زدہ ۔ جیسے انسان اور حیوان کا موازنہ کر رہی ہوں ۔

" تم کیوں مری جا رہی ہو ۔ میں تو ابھی زندہ ہوں ۔ تمہاری چھیتی چلی گئی تو کیا ہوا ۔ تمہیں اپنا لاڈلا تو دے گئی ہے ۔۔۔ لو دیکھ لو ۔" بشیرا نے بچہ کو ایک بھینس کے آگے کر دیا ۔ اس بھینس کو شہزادی " رانی " کہتی تھی، اسے وہ اپنے جہیز میں لائی تھی، یہ اس کی بہت دُلاری تھی ۔۔۔ اور جب بھینس نے بچہ کو سونگھ کر ایک دردناک آواز نکالی تو بشیرا ابھی دھاڑیں مار کر رونے ہی جا رہا تھا کہ کسی نے بشیرا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ۔

وہ سانس روک کر رہ گیا ۔ اس نے گھوم کر بھی نہیں دیکھا کہ یہ کس کا ہاتھ ہے ۔۔۔ کیونکہ یہ ہاتھ ۔۔۔ اگر ہزاروں ہاتھوں کے ساتھ اس کی پیٹھ پر رکھا ہوتا تو وہ بتا سکتا تھا کہ یہ ہاتھ چھمن استاد کا ہے ۔ یہ ہاتھ بارہا ہزاروں کے مجمع میں اس کی پیٹھ ٹھونک کر اس کے دم خم اور طاقت کی ستائش کر چکا تھا ۔۔۔ اور اس وقت جب وہ دیوانگی اور فرزانگی کی نازک سرحد پر کھڑا اپنے جذباتی ہیجان سے جنگ میں مصروف تھا ۔ اس صبر آزما گھڑی پر جانے پہچانے، نرم و نازک اور شفیق لمس نے اس کی رگوں میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی ۔

" لاؤ بچے کو مجھے دے دو ۔ تم غم سے نڈھال ہو رہے ہو ۔" سامنے آ کر چھمن استاد نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ۔

" استاد! تم کو بھی تو آرام کی ضرورت ہے ۔ مگر تم پھر آ گئے ۔" بشیرا نے عاجزانہ سرگوشی کی ۔

" تیری مت ماری ہے بشیرا ۔ ؟! زندگی بھر کے ساتھ میں بھی مجھے نہیں پہچانا ۔ تجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے تو تیرے ساتھ میں ریزہ ریزہ نہیں ہو جاؤں گا ۔ تو خود کو مجھ سے الگ سمجھتا ہے کیا ۔ ؟" چھمن استاد کا لہجہ سخت ہو گیا ۔

اور ۔۔۔ بشیرا کا دل جیسے سینے سے نکل کر باہر آ گیا اس کے پپڑائے ہوئے خشک ہونٹ کانپنے لگے ۔ اسے لگا کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے کہ اس مہر و وفا کے مقدس مجسمے پر امتنان و تشکر کے دو بول تو قربان کر دے ۔۔۔ بگجے اندھیرے میں وہ چھمن استاد کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا کہ کہیں آسمان سے زمین پر کوئی فرشتہ تو نہیں اتر آیا ہے ۔۔۔ وہ پھر بہک گیا ۔

" نہیں! نہیں!! اس بستی میں فرشتہ کیسے آ سکتا ہے ۔ ؟! کبھی نہیں آ سکتا ۔ جس محلہ میں ایک آدمی تڑپتا رہے اور کوئی مدد کو نہ آئے وہاں فرشتہ کا کیا کام ۔ ؟ مولانا بتاتے ہیں کہ اسلام میں ہمسایہ کے بڑے حقوق ہیں ۔ ہمسایہ اگر پریشان ہے تو حج کی اجازت نہیں ۔۔۔ مگر ۔۔ !!"

" مگر " اس نے اتنی زور سے کہا کہ چھمن استاد چونک پڑے

" بشیرا! بھگوان کے لئے اب آگے کچھ نہ کہنا ۔ تم اپنے ہوش میں نہیں ہو ۔ لاؤ! بچہ مجھے دے دو ۔" چھمن استاد نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے ۔

بشیرا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں ۔ وہ یہ سوچ کر ٹوٹا جا رہا تھا کہ اس کے وہ ہمسائے جن کی دیواریں اس کی دیوار سے ملی ہیں، اور جن پر وہ الطاف و کرم کی بارشیں کرتا آیا ہے، جن کے ہر دکھ سکھ میں

برابر کا شریک رہا ہے، انھوں نے اسے کس طرح نظر انداز کر دیا۔ مگر پچھمن استاد !! ــ کس طرح اس کے آگے پیچھے لگے ہوئے ہیں ــــ اس کے منہ میں جیسے ریت بھر گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ساری بستی میں آگ لگا دے ــ اس نے پہلے ایک بھیانک قہقہہ لگایا پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی ــ اور پچھمن استاد کو محسوس ہوا کہ بشیرا واقعی پاگل ہو گیا ہے۔

"استاد! ایک بات بتاؤں ــ؟" اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا ـــــ "میں نے ایک دن شہزادی سے کہا کہ میں کتنا بدقسمت ہوں کہ نہ میرے باپ ہیں اور نہ ماں ــ نہ کوئی بھائی نہ بہن ــ تیرے لیے آگے پیچھے کوئی بھی تو نہیں ــ مگر میں اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور خفا ہو کر کہنے لگی کہ کیسی فضول باتیں کرتے ہو ــ! تم خدا کا شکر کیوں نہیں ادا کرتے؟ تمھارے استاد اور پاربتی بھابھی ماں باپ اور بھائی بہن سے کیا کم ہیں ــ! تم ان عظیم ہستیوں پر فخر کیوں نہیں کرتے ــــ یاد ہے جب تمھاری کشتی جگرام سے ہونے والی تھی ــ تم سے دوگنا جیٹھا تھا ــ یہی سوچ سوچ کر ان سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ سارا شہر اس تاریخی کشتی کے انتظار میں تھا ــ اور تمھارے پچھمن استاد کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کتنا خاموش رہتے تھے ــ گم سم ــ کسی انجانے خطرے سے خوف زدہ ــــ ہر وقت تمھیں داؤں پیچ سمجھاتے رہتے۔ دیکھو! جگرام وہ سا داؤ لگائے تو تم فوراً اس طرح اپنا بچاؤ کر کے یہ کرنا ــ وہ یہ کرے تو تم وہ کرنا ــ استاد تاکید کر کے جو کشمش تمھیں کھلاتے تھے وہ کیسی تھیں؟! شانتی بٹیا کو مغرب کے وقت مسجد بھیجتے تھے وہ کشمش کی پڑیا لیے باہر کھڑی رہتی تھی، جب نمازی باہر نکلتے تھے تو اس پر پھونک ڈالتے تھے ــــ اور کشتی کے دن یاد ہے ؟! جب پاربتی بھابھی پوجا کی تھالی لیے ہوئے کسی دیوی کی طرح مندر سے لوٹی تھیں، تمھارے ماتھے پر تلک لگایا تھا، پرشاد کھلا کر تھالی تمھیں تھمادی تھی اور آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر دعا مانگی تھی ــ بجرنگ بلی! ہمارے بشیرا کا سر اونچا رکھیو ــ یہ دیکھ کر مارے خوشی کے سب کی آنکھیں چھلک آئی تھیں ــ لگتا تھا پاربتی بھابھی نے تمھیں اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے ــــ اور بتاؤں! پچھمن استاد پر تو اتنا کٹھن وقت پڑتے شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جب کشتی کا وقت قریب آیا تھا تو تمھارا بازو تھام کر آبدیدہ ہو گئے تھے۔ بہت کوشش کر کے یہ کہہ پائے کہ۔ بشیرا! ہمیشہ کی طرح مولا علیؑ کا نام لے کر اکھاڑے میں اُتریو۔ بس بھگوان چاہے گا تو بیڑا پار ہے ــ یہ سمجھنا کہ یہ میری آن اور عزت کا سوال ہے ــــ اتنا کہنے میں استاد کو کتنی طاقت صرف کرنا پڑی تھی، ان کا گلا رندھ گیا تھا ــ کیا تمھارے سگے سمبندھی اتنا پریشان ہوتے؟ تم ہی بتاؤ اپنے کیسے ہوتے ہیں ــ؟!"

بشیرا کے ساتھ پچھمن استاد بھی رونے لگے ــ

ـــ اور بچے کے رونے میں کوئی کمی نہیں تھی۔

اس کے متعلق اب کوئی سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ دونوں جذبات کی لہروں میں بہتے چلے جا رہے تھے ــ درد، کسک اور فرحت و انبساط کی متلاطم لہریں استاد کو بہت پیچھے بہا لے گئیں ــ

ایک مرتبہ شہزادی اپنے چوپال میں جھاڑو لگا رہی تھی ــ پچھمن استاد تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، جب وہ تخت کے پاس آئی اور استاد کی چپلیں اٹھا کر جھاڑو لگانے لگی تو پچھمن استاد نے ٹوک دیا

شہزادی! تجھے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ چھوٹے بھائی کی بیوی اپنے جیٹھ کے جوتے اور چپل کو ہاتھ نہیں لگاتی ہے؟!

"بتایا کیوں نہیں" شہزادی کے گھونگھٹ میں گلنار چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس کے موتی جیسے دانت چمک اٹھے۔ اس نے اپنا گھونگھٹ اور لمبا کر دیا ــ "مگر آپ جیٹھ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے استاد بھی تو ہیں ــ اور استاد کا درجہ باپ کے برابر ہوتا ہے اس کے علاوہ باپ بن کر ہی تو آپ مجھے بیاہ کر لائے تھے۔ کون تھا میری ڈولی کے آگے پیچھے ــ" اور اس وقت پچھمن استاد کا سینہ فخر و غرور سے تن کر اور چوڑا ہو گیا تھا۔

بچے کی دل خراش چیخیں اور بشیرا کی سرد آہیں استاد پچھمن کو خیالوں کی دنیا سے واپس لے آئیں۔

"بشیرا! رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمت سے

کام لو۔ بھگوان جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے"

"تم نے دیکھا استاد! شہزادی کو بچانے کے لئے میں نے پانی کی طرح روپیہ بہادیا۔ کتنا خون چڑھایا گیا ___ مگر!! ___ وہ آبدیدہ ہوگیا ___" مگر! یہ بچہ !! میں اس کو کیا کروں ؟!" ___ بشیرا پھر رونے لگا۔ اور اس سوال نے استاد کو بھی ریزہ ریزہ کردیا۔ بشیرا کا ایک ایک لفظ کانٹا بن کر ان کے بے قرار دل میں چبھ گیا۔

" لاؤ! بچے کو مجھے دے دو۔ تم دیتے کیوں نہیں ___ میں بھی تو چپ کرانے کی کوشش کروں "۔ کچھمن استاد کی گمبھیر مگر سخت آواز سناٹے میں تحلیل ہوگئی ___ اور بشیرا نے روتے ہوئے بچے کو کچھمن استاد کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر رکھ دیا ___ اور دودھ کی شیشی آگے بڑھائی۔

"جب تم سے شیشی کا دودھ نہیں پیا تو۔ مجھ سے کیا پئے گا"۔ کچھمن استاد بچے کو سینے میں دبا کر طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔

مگر بچہ دم نہیں مار رہا تھا۔ اب روتے روتے اس کی آواز بھی بیٹھ چلی تھی۔

"کبھی تمہارے پرکھوں نے بھی بچہ کھلایا ہے۔؟ تم نے اپنی شانتی اور رامو کو کبھی ہاتھ لگایا ہے۔؟! لاؤ مجھے دو!"۔ پاربتی کی کرخت آواز سن کر دونوں چونک پڑے ___ اور پاربتی نے بچے کو استاد سے چھین لیا۔

"کبھی تو ٹھیک سے بات کیا کرو پاربتی!" استاد نے دبے لہجہ میں شکوہ کیا۔

پاربتی بچے کو لے کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کا رخ ان دونوں سے مخالف سمت تھا۔ بچے نے دو چار لمبی لمبی سانسیں اور ہچکیاں لیں ـ اور خاموش ہوگیا۔

گہرے سکوت نے آسمان کے ستاروں کی اداسی میں جیسے اور اضافہ کردیا ___ کچھمن استاد کو شک ہوا کہ کہیں بچے نے دم تو نہیں توڑ دیا اگر ایسا ہوگیا تو کیا وہ بشیرا کو منھ دکھا سکے گا ـ؟

بشیرا کو بھی اسی قسم کے متعدد شبہات نے گھیر لیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا ـ کہیں ___ میرا لال... !! اسے بچے کی خاموشی کچھ اچھی نہیں لگی ـ

"رامو کی ماں، بچہ صحیح سلامت تو ہے ؟" کچھمن استاد کی سرگوشی نے گہرے سکوت پر جیسے ضرب سی لگائی ـ ان کی آواز اور سراپا کپکپا کر رہ گیا۔

"ہائے رام! تمہارے منھ میں خاک !! ارے تمہارے منھ سے کبھی تو اچھی بات نکلتی ـ!!"

"تو پھر ___! بھابھی !! میرا بچہ خاموش کیوں ہوگیا ؟ کون سا جادو کر دیا ہے تم نے "۔ بشیرا مارے خوشی کے دیوانہ ہو رہا تھا۔ دوڑ کر پاربتی کے پاس آگیا ـ اور ہاتھ بڑھا کر پاربتی کی ساری کے آنچل میں چھپے ہوئے بچے کو دیکھنا چاہا ـ اور پاربتی بچا کر دوہری ہوگئی۔

"ارے بے شرم! ادھر ہٹ !! میں نے تیرے لاڈلے کو اپنا دودھ دے دیا ہے ___ کس بری طرح پی رہا ہے "۔

پاربتی کا یہ کہنا تھا کہ بشیرا کی روح جیسے پرواز کرگئی ـ وہ جیسے پتھر ہوگیا ـ اس کے ہونٹوں میں لرزش تو تھی، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو ___ مگر اسے لگا کہ وہ جنم جنم سے گونگا ہے ___ صدیوں سے اس کی قوت گویائی سلب ہے۔ اس کے پاس لفظوں کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے ___ وہ خود نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کی یہ حالت کیوں ہوگئی ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ ایک حقیر انسان جب انسانیت سے بالاتر ہو کر کوئی اقدام کرتا ہے تو وہ عام انسانوں سے عظیم تر ہو جاتا ہے۔ آسمانی رفعتیں اس کے قدم چومتی ہیں۔ اس کی شان اس کی ستائش میں ہر زبان کے خوبصورت ترین الفاظ بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ اس کے لہجے، اس کی شخصیت اور اس کے ہر فعل میں ایک غیر معمولی نیاپن رچ بس جاتا ہے۔ اس کے مقدس وجود پر رنگ و نور کی بارش ہوتی ہے اور یہی عالم پاربتی کا تھا۔

"رامو کی ماں! جو بات شام سے میرے دل میں تھی ___ تو نے کر دکھائی "۔ کچھمن استاد کی آواز فرطِ مسرت سے گلوگیر ہوگئی۔ وہ سراپا عجز و انکسار بن کر جیسے پاربتی پر نثار ہوگئے۔

"شام سے میرے دل میں تھی "۔ پاربتی نے ان کا منھ چڑایا۔" اور مجھ سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی ___ تم پہلوان ہو؟! بزدل کہیں کے ___ تم تو مجھ سے بات نہ کرو"۔

"بھابھی ۔۔۔ !" بشیرا کی آواز پھنس کر رہ گئی۔

"ہاں !۔ کیا !!۔ اب تو بول۔" پاربتی نے پیار بھری آواز میں ڈانٹا۔

"پر تم نے کیا کر دیا بھابھی ۔ ؟!"

"میں نے کیا کر دیا رے ۔ ! تیرے بچے کو دودھ کیوں دے دیا ؟ میں ہندو ہوں ۔۔۔ اور یہ مسلمان !۔ ہندو دھرم میں کسی بچے کی جان بچا لینا پاپ ہے کیا ۔ ؟!" پاربتی آگ بگولہ ہو گئی ۔ "تو نے اور تیرے استاد نے شہزادی کے لئے خون کی کتنی بوتلیں خریدیں ؟ ڈاکٹر سے کہا تھا کہ مسلمان خون چاہیئے ۔ ؟ شہزادی اپنی رگوں میں جو خون لے کر گئی ۔۔۔ وہ کس کا تھا ۔۔۔ ؟ بتا سکتا ہے ۔ ؟ مسلمان کا ، ہندو کا ، سکھ کا یا عیسائی کا ۔۔۔ ؟! تیرے ہاتھ کا کوئی ہندو کھانا نہ کھائے گا ۔۔۔ مگر تیرے ہاتھ کا دودھ ......"

بھابھی میں یہ نہیں کہتا ۔۔۔" بشیرا نے تھکے اور شکست خوردہ لہجے میں کہا ۔

"تو کیا کہے گا ۔۔۔ ؟ بس اتنا سمجھ لے کہ پاربتی کا کوئی مذہب ضرور ہے مگر ماتا کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔۔۔ وہ تو خود ایک مذہب ہے ۔۔۔ بھید بھاؤ کی کچی دیواریں تو ہم خود کھڑی کرتے ہیں ۔۔۔ اپنے فائدے کے لئے ۔ جو ایک نہ ایک دن خود گر جاتی ہیں "۔ پاربتی کا پر اعتماد لہجہ اور پیار محبت میں ڈھلا ہوا ایک ایک لفظ بشیرا کے دل میں اترتا چلا جا رہا تھا ۔

"بھابھی ! جہاں اتنا کیا ہے' مجھ پر ایک احسان اور کر دے میری دلی آرزو پوری کر دے "۔ وہ پاربتی کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھ گیا ۔

"کیا ۔ ؟!" پاربتی کو تشویش ہو گئی ۔

"تو ۔ اپنے پیر ادھر کر دے ۔ میں آنکھوں سے لگا لوں ۔ صرف ایک بار بھابھی "!

"دیا رے دیا ۔ !! سنتے ہو ! ۔ یہ بے ایمان کیا کہہ رہا ہے ۔ ؟! اسے اندر لے جاؤ ۔ میں بچے کو لیے جا رہی ہوں "۔ پاربتی بچے کو سنبھال کر کھڑی ہو گئی ۔

بجلی کے پول کی مدھم روشنی میں پاربتی بچے کو لیے چلی جا رہی تھی ۔ بشیرا کا بازو تھامے ہوئے پچھن استاد گھر کے اندر چلنے کے لیے اصرار کر رہے تھے ، مگر وہ صرف پاربتی کو دیکھ رہا تھا ۔ اسے لگ رہا تھا کہ پاربتی کے مقدس جسم سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں ۔ اس کے وجود کے ساتھ ساتھ شعاعوں کا ہالہ بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔

رات آخری منزلیں طے کر رہی تھی ۔ ستارے جھلملا کر کسلمند ہو رہے تھے ۔ پاربتی کی پُر وقار اور سچے دل سے نکلی ہوئی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔۔۔ کس طرح پاربتی نے بھید بھاؤ کی کچی دیوار کو مسمار کر دیا ۔۔۔ اپنے پوتر قدموں سے روند ڈالا ۔ آج اس نے پاربتی بھابھی کے دل کو دیکھا ۔۔۔ جیسے اس نے نکال کر باہر رکھ دیا تھا ۔ جیسے شفاف آئینہ ! اور اس آئینے میں بشیرا نے جب اپنا چہرہ دیکھا تو اسے کراہیت ہونے لگی ۔۔۔ بھید بھاؤ کا اس کا پرانا چور صاف پکڑا گیا ۔ وہ شرم و ندامت کے بوجھ سے دب کر رہ گیا ۔

"استاد ! مجھے معاف کر دو ۔۔۔ میں بھابھی سے شرمندہ ہوں ۔۔۔ میرے دل میں چور تھا ۔ بھید بھاؤ کا چور ۔ ! جب بھابھی میرے ماتھے پر ٹِکا لگاتی تھی اور میں مجمع پر نگاہ ڈالتا جس میں ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی ، تو مجھے لگتا کہ میری پیشانی پر لگا ہوا تِلک انگارے کی طرح دہک رہا ہے ۔۔۔ صرف یہ سوچ کر مسلمان بھائی کیا سوچتے ہوں گے اور کسی نے اعتراض بھی کیا ۔۔ ۔ مگر "... مگر اس نے اتنے کرخت لہجے میں کہا جیسے پاگل ہو گیا ہو ۔

استاد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔۔۔ وہ سسک اٹھا ۔

"مگر کسی نے دودھ کی ایک بوند نہ دی ۔۔۔ اور پاربتی بھابھی نے ....."

وہ پچھن استاد کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا ۔

□□

غزلیں

پہاڑ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہے
مگر یہ جبر بھی کتنا بڑا ہے

میں اس سے روٹھنا چاہوں بھی کیسے
کہ وہ میرے لیے مجھ سے لڑا ہے

کسی نے دی نہیں آواز مجھ کو
مگر پھر بھی یہاں رکنا پڑا ہے

مکیں ان کے کہاں آباد ہوں گے
جہاں تھے گھر وہاں پانی کھڑا ہے

بہت چاہا مگر کب مانگ پائی
کہ وہ میری دعاؤں سے بڑا ہے

اسی کے حکم سے بستی لٹی ہے
اسی کے نام کا جھنڈا گڑا ہے

فاطمہ حسن
گلشن اقبال
کراچی

لالہ و گل نہ ہوں بہار نہ ہو
میرا دامن جو تار تار نہ ہو

تیرا غم کب مجھے عزیز نہیں
شرط ہے کوئی غم گسار نہ ہو

بے گناہی کی پا رہے ہیں سزا
کوئی ہم سا گناہگار نہ ہو

ہاں وہ ہے اعتبار کے قابل
جس کو اپنا بھی اعتبار نہ ہو

تیری تاکیدِ ضبطِ غم تسلیم
اور اگر دل پہ اختیار نہ ہو

یہ بھی تیری نظر کا پرتو ہے
زندگی کیوں فریب کار نہ ہو

یادؔ رونے کا لطف تو جب ہے
ایک آنسو بھی آشکار نہ ہو

شاہجہاں بانو یادؔ دہلوی
سحر منزل، گولہ گنج، لکھنؤ

گرے جاتے ہیں آنسو چشمِ تر سے
کہاں فرصت چراغوں کو سفر سے

نہ گھبراؤ اندھیروں کے سفر سے
کبھی ٹکرائے گا سورج نظر سے

چھپی رہتی نہیں خصلت کسی کی
کہ سایا پھوٹتا ہے خود شجر سے

خرد پر راز کھل جائے خرد کا
کبھی الجھے کسی شوریدہ سر سے

چھپا رکھا ہے سینے میں خزانہ
صدف کے ظرف کو پوچھو گہر سے

بلندی کا سبب ہمت ہے جامیؔ
سہارا کیا ملے گا بال و پر سے

سید معراج جامی
منگھو پیر روڈ
کراچی

لئیق رضوی
بی۔۱۴۴۸، کریلی، الہ آباد

اردو میں شخصی مرثیے کی روایت

(۴)

الطاف حسین حالی سے شخصی مرثیہ نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شخصی مرثیہ کو ایک علاحدہ صنف سخن کے طور پر اپنایا، اور دوسروں کو بھی اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ حالی شخصی مرثیہ نگاری کو سوسائٹی کے لیے اہم اور ضروری قرار دیتے تھے وہ اس بات کے حامی تھے کہ مرثیے کو محض شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ دیگر مشاہیر قوم کی اموات پر بھی مرثیے لکھے جائیں' ان کے اوصاف بیان کیے جائیں اور ان کی وفات سے ہونے والے سماجی اور ملی نقصانات کی نشان دہی کی جائے۔ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی :-

"حالی نے نئی طرز کے مرثیوں سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا اور اس امر پر زور دیا کہ مرثیہ کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس میں مشاہیر قوم اور ارباب کمال کی موت پر بھی ان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا جائے۔ قوم کو ان کی پیروی پر ابھارا جائے۔

مولانا حالی نے اسی قسم کے خیالات اپنی ایک تقریر میں ظاہر کیے تھے، جو انھوں نے حکیم محمود خاں کے تعزیتی جلسے میں اپنا مرثیہ پڑھنے سے قبل کی تھی۔" [۱]

اردو میں حالی کے پانچ شخصی مرثیے ملتے ہیں، مرثیۂ غالب، مرثیہ حکیم محمود خاں، مرثیہ ملکہ وکٹوریہ، مرثیہ محسن الملک اور اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کا مرثیہ۔ ان مراثی میں مرثیۂ غالب کو نمایاں مقام حاصل ہے جس میں حالی نے غالب کی موت پر آنسو بہانے کے بجائے ان ادبی اور سماجی نقصانات کا ماتم کیا ہے جو اس موت کا لازمی نتیجہ تھے۔ وہ غالب کی موت کو ایک فرد کی موت نہیں ایک دور کی موت تصور کرتے ہیں۔ مرثیہ ترکیب بند کے فارم میں ہے اور اس میں کل سو اشعار شامل ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

بلبل ہند مر گیا ہیہات   جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس   پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج   رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

خاکساروں سے خاکساری تھی   سربلندوں سے انکسار نہ تھا
بے ریائی تھی، زہد کے بدلے   زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب   ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

غالب کی ادبی اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎
نثر حسن و جمال کی صورت   نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی — شکل امکان محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگ ہجران وصال کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالب بے مثال کی صورت

اس مرثیہ کے بارے میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے لکھا ہے کہ:—

" اس مرثیے سے اردو میں ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی۔ اردو میں پہلی مرتبہ ترکیب بند میں مرثیہ لکھا گیا۔" ؎

موصوف کا یہ بیان حقیقت سے دور ہے اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ حالی سے قبل مومن نے ترکیب بند کے فارم میں مرثیہ تصنیف کیا تھا۔

حکیم محمود خاں کے مرثیہ میں بھی حالی نے ذاتی رنج و غم کے اظہار کے بجائے ان کی موت سے ہونے والے سماجی خلا کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ابتدائی اشعار میں دہلی کی عظمت رفتہ کا ماتم ہے۔ مرثیہ مسدس کے فارم میں ہے اور اس میں کل ۵۴ بند شامل ہیں۔ صرف ۲ بند ملاحظہ فرمائیں ؎

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانے کا تھا اس کو نہ شکرانے کا تھا
اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

تاثر اور شدت احساس کے لحاظ سے خواجہ امداد حسین کا مرثیہ کمزور ہے اور یہ رنج و غم کے ان شدید احساسات سے عاری ہے جو بھائی کی موت کا فطری تقاضا تھا۔ مرثیہ غزل کے فارم میں ہے، جس میں ۴۰ اشعار ہیں۔ چند اشعار دیکھئے ؎

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کہ کس دل کی عزیزوں کو دکھائی
آئے ہیں صدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آئی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی سا بھائی
غم بھائی کے مر جانے کا ہے اس کی نشانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھائی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

مولانا محمد علی جوہر نے بھی کئی شخصی مرثیے لکھے ہیں، ان میں مرثیہ سر سید احمد خاں اور مرثیہ غلام حسین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سرسید احمد خاں کے مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

تم ہو زندۂ جاوید باقی مرنے والے ہیں
ہم نہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیلِ بقا تم ہو

مولانا جوہر جن دنوں چھندواڑہ میں نظر بند تھے ان کے ایک عزیز دوست غلام حسین کا انتقال ہو گیا۔ مولانا کے لیے یہ خبر سخت صدمہ کا باعث بنی۔ نتیجے میں انھوں نے ایک پر درد مرثیہ لکھا چند اشعار آپ بھی دیکھیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیتے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کا — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
اے مرے رندِ بادۂ حق کے — ابھی دو چار خم پیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ
ساتھ ہم کو بھی کر لیے ہوتے

شخصی مرثیے کے حوالے سے شبلی نعمانی کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں مرثیہ نگاری کے تمام لوازم کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ایک ایک شعر ان کے غم کا آئینہ دار ہے ؎

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا
وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لیے رحمتِ یزدانی تھا
قوتِ دست و دلِ شبلیٔ نعمانی تھا
جوش اسی کا تھا جو مرے سرِ پُرشور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پُر زور میں تھا
آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہیں گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اسی دور میں درگا سہائے سرور جہان آبادی، میر مہدی مجروح اور اکبر الہ آبادی نے بھی شخصی مرثیے تصنیف کیے۔

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی نے جو شخصی مرثیے لکھے ہیں ان میں داغ دہلوی اور سوامی رام تیرتھ کے مرثیوں کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ سرور نے اپنے مرثیوں میں ذاتی رنج و غم کے اظہار کے بجائے مرنے والے کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ اس کے تمام تر خد و خال نمایاں ہو گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر حکم چند نیر:

"سرور کے مراثی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف آنسوؤں کا سیلاب یا سینہ کوبی یا نالہ و شیون کی دعوت نہیں بلکہ مرحومین کی شخصیت کا اس انداز سے تجزیہ کیا گیا ہے کہ اس کے تمام پہلو روشن ہو گئے اور اس ماحول اور فضا کی تصویر سامنے آ گئی جس میں یہ لوگ سانس لے رہے تھے۔" ۳

داغ دہلوی کا مرثیہ، جس کا عنوان سرور نے "داغ کے پھول" رکھا ہے، مسدس کے فارم میں ہے جس میں کل ۲۰ بند ہیں۔ چند بند پیشِ خدمت ہیں ؎

اے نظم! تیرا عشوۂ دل جو کدھر گیا؟
سر چڑھ کے بولتا تھا وہ جادو کدھر گیا؟
شانہ وہ کیا ہوا، خمِ گیسو کدھر گیا؟
چوٹی کا پھول، داغِ سمن بو کدھر گیا؟
کلیاں کدھر گئیں ترے دامانِ ناز کی
بو بھینی بھینی کیا ہوئی زلفِ دراز کی
اے حسن! تیرا نغمۂ اعجاز کیا ہوا؟
اے عشق! تیرا سوز فزا ساز کیا ہوا؟
وہ طوطیٔ جناں کا ہم آواز کیا ہوا؟
وہ عندلیب زمزمہ پرواز کیا ہوا؟
وہ صحبتیں، وہ انجمن آرائیاں کہاں
وہ آہ داغ کی سخن آرائیاں کہاں

اُردو کے باغ میں گلِ رنگیں ادا تھا ایک
سارے چمن میں بلبلِ رنگیں نوا تھا ایک
داغوں میں داغِ عشق کا لذت فزا تھا ایک
تاجِ سخن وری میں دُر بے بہا تھا ایک
بن کر وہ چشمِ دہر سے آنسو ٹپک گیا
اے دل ٹپک کہ داغِ وفا خو ٹپک گیا

سوامی رام تیرتھ کی وفات پر سرور جہاں آبادی نے ایک طویل مرثیہ لکھا تھا، جس میں ان کے علم و فضل کے تذکرہ کے ساتھ ہی ساتھ ان کی وفات سے ہونے والے خلا کی جانب اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ بھی مسدس کے فارم میں ہے۔ چند بند پیشِ خدمت ہیں ۔

کون سا موتی ہے گنگا تیرے دامن میں نہاں
قطع ہے قامت پہ کس کے چادرِ ابرِ رواں
حلقۂ گرداب ہے کیوں آج چشمِ خوں فشاں
کس کے ماتم میں لبِ ساحل ہیں سرگرمِ فغاں
تیری موجوں نے یہ کس کو لے لیا آغوش میں
جوشش گریہ کا جو عالم ہے تیرے جوش میں

کس کے غم میں تیرے ساحل کا ہے دامن تار تار
تیری موجیں آج کیوں ہیں رام گنگا بے قرار
شاہدِ خوابِ اجل سے آج ہو کر ہمکنار
سو گیا یہ کون جاں بازِ وطن زیرِ مزار
لینے آئی آسماں سے رحمتِ باری کسے
تھی گراں اے موج! ساحل کی سبکساری کسے

اس کے علاوہ سرور نے نواب محسن الملک اور مولانا محمد حسین آزاد کی وفات پر بھی شخصی مرثیے لکھے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جستجو میں تیری ہیں واماندگاں کا رواں
او عدم کے جانے والے تیری منزل ہے کہاں
مرنے والے دادرس اب بھی یتیموں کا ہے تو
لے رہی ہیں ان کی آہیں تیرے دل میں چٹکیاں

--- مرثیہ محسن الملک

تو کہاں ہے آہ اب اے نازشِ بزمِ سخن
محشرستانِ عزاداری ہے تیری انجمن

آہ یوں کھینچے گا نظم و نثر کی تصویر کون
اپنے دیوانوں کو اب پہنائے گا زنجیر کون

--- مرثیہ مولانا آزاد

میر مہدی مجروح نے اپنے استاد مرزا غالب کی وفات پر ایک پردرد مرثیہ لکھا تھا، جس میں ان کے شاعرانہ کمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ ترجیع بند کے فارم میں ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں ۔

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن
مر گیا آج تاجدارِ سخن
بلبلِ خوش ترانۂ معنی
گلِ رنگین و شاخسارِ سخن
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

مرزا غالب کے ایک دوسرے شاگرد محمد حبیب اللہ ذکا نے بھی ان کی وفات پر ایک مرثیہ نظم کیا تھا۔ دس اشعار پر مشتمل یہ مرثیہ غزل کے فارم میں ہے۔ چند اشعار بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمائیں ۔

میرے استاد معنوی غالب
جس کا ہر لفظ معنئ اعجاز

ہاں سنا ہے کہ اس کے تھے کردار
جیسے گفتار حافظِ شیراز

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

نغمۂ آزادی

ہند کو اب رشکِ جنّت بنانا ہے ہمیں
پھر وہ ماضی کا سنہرا دَور لانا ہے ہمیں

پھر سے سب اس کو کہیں سونے کی چڑیا دوستو
عظمتوں کا اس کی دُنیا میں ہو چرچا دوستو

ہر طرف بہنے لگیں پھر دُودھ کی نہریں یہاں
ہر بشر خوش حال ہو اور ہر بشر ہو شادماں

سب یہاں مِل کر رہیں اور دل سے نفرت دُور ہو
رنج کے بادل چھٹیں اور ہر بشر مسرور ہو

چشتی و نانک سے رہبر پھر سے ہوں پیدا یہاں
گل یہاں خوشیوں کے مہکیں ہر سو ہو امن واماں

غالب و اقبال جیسے پھر مُدبّر ہوں یہاں
نہرو و ٹیگور جیسے پھر مُفکّر ہوں یہاں

گاندھی و آزاد کی اب پھر ضرورت ہے ہمیں
بسمل و اشفاق کی اب پھر سے حاجت ہے ہمیں

ہر طرف امن واماں ہو ہر بشر ہو شادماں
ملک ایسا جگمگائے جیسے رُوئے کہکشاں

دُور ظلمت کا دُھواں ہو چپّہ چپّہ جگمگائے
گل مسرّت کے کھلیں اور بچّہ بچّہ مسکرائے

سُلیمان صدیقیؔ
"آشیانہ" سی۔ ۲۱۱ راجہ جی پورم۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۱۷

پیار کا مندر

یہ میرا وطن امن و محبّت کا چمن ہے
یہ گوتم و چشتی کی ریاضت کا چمن ہے
یہ ارجن و ٹیپو کی شجاعت کا چمن ہے
یہ میرا وطن علم کی دولت کا چمن ہے
اس ملک میں نفرت کا چلن رہ نہیں سکتا
یہ بغض و عداوت کا چلن رہ نہیں سکتا

یہ روز کے فتنے یہ فسادات مٹا دو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے دن رات مٹا دو
دُنیا کو محبّت کا، اہنسا کا سبق دو
چنگیز و ہلاکو کی روایات مٹا دو
یہ دھرم کا مذہب کا فسوں کام نہ دے گا
یہ فرقہ پرستی کا جنوں کام نہ دے گا

اس باغ میں کچھ فرق نہیں سرو سمن کا
توقیرِ بہاراں ہے ہر اک پھول چمن کا
پنجاب کا، بنگال کا، یوپی کا دکن کا
اس ملک کا ہر فرد ہے معمار وطن کا
ہندو کے لئے ہے نہ مسلماں کے لئے ہے
یہ پیار کا مندر ہر اک انساں کے لئے ہے

وفا صدیقیؔ
نزد بھوپال ٹاکیز
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ان دنوں اہلِ ہوس کچھ ایسے دیوانے ہوئے
پیار کے عشرت کدے غم کے عزا خانے ہوئے

میرے پیچھے پتھروں کے ساتھ سارا شہر ہے
ایک دیوانے کی خاطر کتنے دیوانے ہوئے

کون پھر کس کی سُنے سب سوئے ہوں جس جگہ
اپنی اپنی غفلتوں کی چادریں تانے ہوئے

کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا اب غموں کا فیصلہ
ہم بھی ہیں سینہ سپر وہ بھی کماں تانے ہوئے

بچ تو سکتے تھے قمر لیکن ہم اپنے قتل سے
روکتے کس کو کہ سب چہرے تھے پہچانے ہوئے

——— قمر رائے بریلوی
۱۸۰/۳۴۷۔ شکور کھیت کالونی
پُرانا بھدیواں۔ لکھنؤ

شدتِ احساس بھی ہے گرمیٔ جذبات بھی
قربتوں کی دھوپ سے پیدا ہوئے حالات بھی

کاغذوں کی کشتیاں لے کر چلے بچے سبھی
ان کی آنکھوں کی روانی سے ہوئی برسات بھی

زندگی شاید کسی گردش کا کوئی نام ہے
جھیلتی رہتی ہے کیا کیا الجھنیں اک ذات بھی

اب بھی تنہائی کی چیخیں گونجتی ہیں کان میں
ذہن بوجھل ہو گیا ہے گم ہوئے نغمات بھی

ایک بیجا سی اَنا جو شخصیت پر چھا گئی
اک فریبِ ذات اعظم دے گئی ہر بات بھی

——— ڈاکٹر امام اعظم
اُردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ
دربھنگہ



ہمیشہ قوتِ بازو کے جوہر کام آئے ہیں
کسی مشکل میں کب پھولوں کے بستر کام آئے ہیں

بھری برسات میں جاتے کہاں ہم سر چھپانے کو
چھتیں جن کی شکستہ تھیں وہی گھر کام آئے ہیں

بنائی ہے وفا کی سرزمیں تک کہکشاں ہم نے
ستارے جب نہ مل پائے تو پتھر کام آئے ہیں

بھٹکتی کشتیوں کو لا کے ساحل پر لگانے میں
تھپیڑے تیز موجوں کے بھی اکثر کام آئے ہیں

کہانی میں ہماری رنگ بھرنے کے لیے انجم
کئی ڈھلتی ہوئی شاموں کے منظر کام آئے ہیں

——— انجم فاروقی
محلہ گھبن پوروا۔ ہردوئی

نہ جانے دیکھئے ناکامیوں کی خو دل سے
نکل نہ جائے تڑپنے کی آرزو دل سے

وہ آنسوؤں کو سمجھتے ہیں اس گھڑی آنسو
ٹپکنے لگتا ہے دامن پہ جب لہو دل سے

انھیں ہماری مسرت سے رنج ہوتا ہے
چلو نکال دیں ہنسنے کی آرزو دل سے

وہ اپنے ڈھونڈھنے والے کو کب نہیں ملتا
کوئی کرے تو ذرا اس کی جستجو دل سے

نہ جانے کتنی تمناؤں نے کیے شکوے
کبھی ہوئی ہے جو تعزیر گفتگو دل سے

——— تعزیر بستوی
وزڈم ہائیر اسکول۔ رحمت گنج
گاندھی نگر۔ بستی

اتر پردیش
ترقیاتی سفر کا ایک سال

بے خوف سماج اور فساد سے پاک ریاست کی تعمیر کے لئے بڑھتے قدم

— ادارہ —

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ کی قیادت میں تشکیل شدہ اتر پردیش کی موجودہ حکومت نے ایک سال قبل ریاست کے عوام کے تبدیلی کے حق میں دیئے گئے ووٹ کے مطابق محبت و اخوت اور مساوات پر مبنی سماج کی تعمیر کا عہد کیا تھا۔ اس عہد کی تکمیل کے واسطے جہاں ایک طرف مخلصانہ کاوشوں کی ضرورت تھی وہیں دوسری جانب دشوار حالات بھی سامنے تھے۔ سابقہ حکومتوں سے وراثت میں ملے مسائل میں مبتلا ریاست کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ کمزور معیشت، فسادات کا سلسلہ، باہمی بے اعتمادی، امن و قانون کی دگرگوں صورت حال، مافیا گروہوں کی روز افزوں سرگرمیاں اور دہشت گردی کا سیاہ سایہ ریاست پر مسلط تھا۔ ایسے نامساعد حالات میں نئی حکومت نے ریاست کو روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے واسطے عوام میں نظم و نسق کے تئیں یقین و اعتماد پیدا کر کے ایک نئی تہذیبِ عمل کو جنم دیا۔

ایک سال کی قلیل مدت میں ریاستی حکومت نے مذہب ذات پات، جنس اور طریق عبادت کی تفریق کے بغیر سماج کے سبھی فرقوں کے لیے بے خوفی کا ماحول دینے اور ریاست کو فسادات سے پاک کرنے کے لئے موثر اقدام کیے ہیں جن کے امید افزا نتائج برآمد ہوئے۔ ریاست میں پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اہم تیوہار امن، بھائی چارہ اور خیر سگالی کے ماحول میں منائے گئے۔ یہ بجائے خود ایک کامیابی ہے کیونکہ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے سماج میں خوف و دہشت کی حکمرانی تھی۔ حالات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۳۳ سے بھی زیادہ شہروں میں کرفیو نافذ تھا اور ضروری اشیاء کے لیے عام آدمی ترس گیا تھا۔ شری کلیان سنگھ نے اقتدار سنبھالتے ہی ریاست کی فرقہ وارانہ صورت حال پر سختی سے کنٹرول کیا اور انتظامیہ کو احکامات جاری کیے کہ فسادیوں سے سختی سے نپٹا جائے۔ انھوں نے کہا کہ فسادی صرف فسادی ہیں، ان کی کوئی ذات یا مذہب نہیں ہوتا۔ فساد میں مرنے والا ہر شخص انسان ہوتا ہے۔

امن و قانون کی صورت حال کو بہتر بنانے اور دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں پر موثر طریقہ سے قابو پانے کے کام کو اولیت دی گئی، جس سے امن پسند عوام کے جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کی جا سکے۔ ریاست میں مافیا سرداروں اور شاطر مجرموں کے خلاف مہم چلا کر عوام میں احساس تحفظ پیدا کیا گیا۔

ریاست کے ترائی والے علاقوں میں دہشت گردوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا موثر طریقے سے مقابلہ کرنے کے لیے پولیس فورس کو فعال بنایا گیا ہے۔ دہشت گردی کے مسئلہ پر پوری توجہ دینے کے لیے "اسپیشل ٹاسک فورس" کی تشکیل کی گئی ہے اور اس کام میں لگی پولیس کو بہتر تربیت دی جا رہی ہے نیز اسے جدید اسلحہ مہیّا

کرائے جا رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ نے گاؤں، غریب اور نادار لوگوں اور کاشت کاروں کی بہبود کے تئیں موجودہ حکومت کے عزم کا اعادہ کیا، جس کے نتیجے میں دیہی ترقیاتی پروگراموں کو مؤثر بنا کر سماج کے کمزور اور غریب طبقوں کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کسان سیوا کیندروں کے توسط سے دیہی عوام کو ضروری معلومات فراہم کرانے کے علاوہ ان کے مسائل وہیں حل کیے جا رہے ہیں۔

عظیم مفکر اور مدبر پنڈت دین دیال اپادھیائے کے خصوصی نظریے کی بنیاد پر دین دیال ترقیاتی اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے، جس سے کمزور طبقوں کے لوگوں کو " روزگار چھتری " کے توسط سے خود روزگاری کے مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ حکومت کے بجٹ کا ساٹھ فیصد دیہی علاقوں کی ترقی پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافے کے لئے ۱۰ سے ۱۲ گھنٹے تک مسلسل بجلی سپلائی کو یقینی بنایا گیا اور نہروں کے توسط سے آبپاشی سہولت کو اور بہتر بنایا گیا۔

زرعی آراضی پر دباؤ کم کرنے کے لیے صنعتوں کو فروغ دیا جا رہا ہے تاکہ لوگوں کو روزگار مہیا کرایا جا سکے اور ریاست کی ہمہ جہت ترقی ہو سکے۔ صنعت کاروں کو ریاست میں صنعتی واحدے قائم کرنے کے واسطے راغب کرنے کے لیے حکومت اور نظم و نسق کی سطح پر انھیں در پیش مشکلات کے فوری ازالے کے لیے حکومت نے سیلس ٹیکس کے طریقۂ کار کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

ہر خاندان کو ایک گھر مہیا کرنے کے واسطے نئی رہائشی پالیسی نافذ کی گئی ہے۔ ریاست میں رہائشی مسئلہ حل کرنے کے لیے مکان کی تعمیر کے کام سے نجی زمرے کو بھی وابستہ کیا جا رہا ہے۔ صحت حفاظتی پروگراموں اور طبی سہولتوں کا فائدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانے کے مقصد سے اسپتالوں میں خالی عہدوں پر میڈیکل افسران کی تقرری کی گئی ہے۔

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ کی کوششوں سے ریاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ منصوبہ بندی کمیشن نے ریاست کے ۹۳-۱۹۹۲ء کے سالانہ منصوبہ کا حجم ۳۸۵۳ کروڑ روپئے کے بقدر کر دیا ہے۔

آٹھویں منصوبے میں فرد کو معیشت اور ترقی کا محور تسلیم کیا گیا ہے ریاست کی معاشی ترقی کی بنیاد "عوام کے ذریعہ عوام کے لیے عوام کی ترقی" ہے۔ اس منصوبے کی مدت میں ریاست میں نوجوانوں کے لئے روزگار کے ۵۰ لاکھ مزید مواقع پیدا کیے جائیں گے۔

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ کے "سب کو روٹی سب کو انصاف" مہیا کرانے کے عزم کی تکمیل کے لیے حکومت کی جانب سے سماج کے غریب ترین افراد کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے واسطے اسکیمیں نافذ کی جا رہی ہیں۔ ریاست میں ترقی کے ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا ہے۔

آٹھواں پنجسالہ منصوبہ:

معیشت کو نئی شکل

ریاست کی معیشت کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے کے لئے عمومی آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے اخراجات ۲۱۰۰۰ کروڑ روپئے مقرر کیے گئے ہیں جو ساتویں منصوبے سے ۱۰۱ فیصد زیادہ ہے۔ خصوصی مرکزی امداد کی شکل میں ۵۰۰۰ کروڑ روپئے کی رقم حاصل ہونے کا امکان ہے۔ اس منصوبے کی مدت میں فرد کو معیشت کا محور تسلیم کیا گیا ہے نیز معاشی ترقی کا مقصد ہے "عوام کے ذریعہ۔ عوام کے لئے۔ عوام کی ترقی"

موجودہ سرکار نے وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ کی فعال قیادت میں ہمہ جہت ترقی کو یقینی بنانے کے مقصد سے خصوصی پانچ نکاتی پروگرام کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ نکات ہیں:-

۱۔ گاؤں، غریب کسان ۲۔ جھونپڑی کے انسان
۳۔ بے روزگار نوجوان ۴۔ ناری کا سمّان (عورتوں کا احترام)
۵۔ دلتوں، پچھڑوں، مزدوروں اور استحصال زدہ افراد کا اتھان (فلاح و ترقی)

امن اور قانون:

فساد سے پاک اور بے خوف سماج کی تعمیر کا عہد

۲۴ جون ۱۹۹۱ء کو عنان حکومت سنبھالتے ہی ریاست کے وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ نے ریاست کو فساد سے پاک کرنے اور سماج

کو خوف سے نجات دلانے کا عہد کیا گیا تھا۔ اس عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نئی سرکار نے موثر اقدامات کیے۔ گزشتہ تیس سالہ تاریخ میں پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کے سبھی تہوار پرامن طور پر اور خوشگوار ماحول میں منائے گئے۔ سرکار کی چوکسی اور بیداری کے نتیجے میں وارانسی کے کچھ واقعات کو چھوڑ کر بقیہ ریاست گزشتہ ایک سال کے دوران فساد سے پاک رہی۔

بجلی:

پیداوار اور سپلائی میں تال میل

ترقی کے عمل کو نئی جہت دینے میں بجلی کا اہم رول ہے۔ حکومت نے بجلی کے بندوبست کو بہتر بنانے کے لیے پیداوار اور ترسیل در تقسیم میں تال میل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

بجلی کنکشن دینے کے طریقۂ کار کو آسان بنانے کے تحت ۵۸۲ نئی صنعتوں کو بجلی لوڈ منظور کیا گیا جن کا مجموعی بجلی لوڈ تقریباً ۲۲۵ کیلوواٹ تھا۔ صارفین کو اپنی صنعت چلانے کے لئے ڈیزل جنریٹنگ سیٹ لگانے کی فوری منظوری دینے کے طریقۂ کار کو آسان بنایا گیا ہے۔

زرعی پیداوار کو اوّلین ترجیح

ریاست کی دیہی معیشت کا دارومدار زراعت پر ہے۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کاشتکاروں کو زرعی آلات فراہم کرانے کے علاوہ اوسر سدھار پروگرام پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

ریاست میں کم بارش کے باوجود اوسر سدھار پروگرام کے تحت تقریباً ۲۰۰۰۳ ہیکٹر رقبہ میں سطحی آبروصان کی روک تھام کی گئی۔ اسی طرح سے ۱۱۱۳۴۹۹۳ ہیکٹر رقبہ میں سنگ سیھوں کی بھرائی کا کام مکمل کیا گیا۔

مرکزی حکومت کی جانب سے یوریا کھاد کی شرحوں میں اضافے کے باوجود ریاستی حکومت نے اپنے وسائل سے کسانوں کو ۹۱ر۱۳ روپے فی بوری کی شرح سے گرانٹ دی۔

آب پاشی:

ہر کھیت کو پانی مہیا کرنے کا عزم

کسانوں کے آب پاشی سے متعلق مسائل حل کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے موثر اقدام کیے ہیں، جس کے تحت کسانوں کے آبپاشی مسائل کو ہر ممکن طریقے سے ضلع کی سطح پر حل کرنے کے لیے ضلع صدر مقام پر ضلع سنچائی بندھو، کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

ریاست کے مختلف اضلاع میں سرکاری آب پاشی وسائل اور نجی وسائل سے قابل کاشت آراضی کے تقریباً ۵۴ فیصد کو آب پاشی کی سہولت دستیاب ہو پائی۔ ہر کھیت کو پانی دینے کے مقصد کی تکمیل کے لیے دین دیال اسکیم کے تحت پہلے مرحلے میں ریاست کے ۰۰ ترقیاتی بلاکوں میں نیز دیگر آب پاشی وسائل سے صد فیصد آبپاشی سہولتیں مہیا کرانے کے لئے حکومت پرعزم ہے۔

دیہی علاقوں کی ترقی کے لئے مؤثر قدم

ریاست کی اکثریت دیہاتوں میں بستی ہے چنانچہ دیہاتوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ریاستی سرکار پرعزم ہے۔

مقامی سطح پر ہی کسانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے انھیں تمام سہولتیں ایک ہی مقام پر دلانے کی غرض سے ۲۵ ستمبر ۱۹۹۱ء سے تمام گاؤں پنچایتوں میں (کسان سیوا کیندر) قائم کیے گئے ہیں۔

سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں جواہر روزگار یوجنا کے تحت ریاست کی تمام پنچایتوں کو مستفید کرنے کی غرض سے ۳۸ر۶۴۱۴۸ لاکھ روپیوں کے وسائل بروئے کار لائے گئے۔

مفت بورنگ اسکیم کے تحت ۲۹ر۲ لاکھ مفت بورنگیں کی گئیں اور ۱۸۷۶ر۴ ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کی گئی جو نشانہ سے ۱۰۰ سے بھی زیادہ ہے۔

اندرا آواس اسکیم کے تحت ۲۱۱۴ر۳۸۹ لاکھ روپے خرچ کرکے ۱۹۳۸۲ مکانات کی تعمیر کرائی گئی جو مقررہ نشانہ سے ~ ہے۔

دین دیال ترقیاتی اسکیم :

بے روزگاروں کے لئے روزگار چھتری

عظیم مفکر و مدبر پنڈت دین دیال اپادھیائے کے انسان دوستی پر مبنی خصوصی اقتصادی نظریے کو عملی شکل دینے کی غرض سے دین دیال ترقیاتی اسکیم شروع کی گئی ہے۔

غریبی اور بے روزگاری دور کرنے کے لیے روزگار چھتری کے تحت ریاست میں خود روزگاری کی مختلف اسکیمیں چلائی جاری ہیں۔ ان اسکیموں کے توسط سے ۱۳۵۸۲۶ افراد کو مستقل نوعیت کا روزگار فراہم کر دیا گیا۔ سرکار اب تک ان اسکیموں پر ۱۴۸ر۱۰۵۸۹ لاکھ روپئے کی رقم خرچ کر چکی ہے۔

امداد باہمی

امداد باہمی زمرے کا ریاست کی ترقی میں اہم رول رہا ہے۔ دیہی عوام، کاشت کار اور مالی طور سے کمزور طبقوں کے افراد کو امداد باہمی تحریک سے کافی فائدہ پہونچا ہے۔

ریاست میں سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲۲ر۶۰۸ کروڑ روپئے کے قلیل مدتی قرضے تقسیم کیے گیے جو گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۷ر۲۰۶ فیصد ہے۔ اسی طرح ۹۳ر۲۸ کروڑ روپے کے وسط مدتی قرضے تقسیم کیے گئے جو گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۲۱ر۱۰۹ فیصد ہے۔

سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۹۳ر۱۸۰ کروڑ روپئے کے طویل مدتی قرضے تقسیم کیے گئے جو گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۸۱ر۱۱۸ فیصد ہے۔

تحفظ صحت اور علاج کے بہتر طریقے

ریاستی حکومت صحت عامہ کے تحفظ کے لیے پوری طرح چوکس ہے۔ لوگوں کو علاج کی بہتر خدمات مہیا کرانے کے پیش نظر خالی اسامیوں پر بھرتی کی مہم چلائی گئی اور ۲۷۷۸ ڈاکٹروں کی تقرری کی گئی۔ اسی طرح اس سلسلے میں برسرکار ۵۹۱ جز وقتی ڈاکٹروں کی تقرری عارضی طور پر

کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے۔

حکومت کی کامیاب کاوشوں کے نتیجے میں بچوں کی شرح اموات میں کمی ہوئی ہے۔ یہ ۱۱۸ فی ہزار سے گھٹ کر ۹۰ فی ہزار ہو گئی ہے۔

وزیر اعلا شری کلیان سنگھ کی ہدایت پر اسپتالوں کو فراہم کردہ دواؤں کے معیار پر خصوصی توجہ دی ہے

سماجی فلاح و خواتین بہبود پر خصوصی توجہ

سماج کے مظلوم، پس ماندہ اور نظر انداز کیے گئے طبقوں کے لیے معاشی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانے کے لیے موجودہ حکومت پر عزم ہے۔ چنانچہ درج فہرست/پسماندہ ذاتوں اور ڈی نوٹیفائڈ ذات کے طلبا و طالبات کو وظیفہ منظور کرنے کے طریقہ کار میں انقلابی تبدیلی لائی گئی ہے۔

طریقہ کار کو آسان بنانے سے گزشتہ سال کے ۸۷ر۴۴ کروڑ روپے کے مقابلے میں موجودہ حکومت کے دور میں ۵۵ر۱۷ کروڑ روپے کے وظائف دیئے گئے۔

ریاستی حکومت کی جانب سے بے سہارا بیواؤں کو گزارے کے واسطے گزشتہ سال کے ۵۴ر۲۰ کروڑ روپے کے مقابلے میں اس سال ۴۰ر۲۸ کروڑ روپے کی گرانٹ دی گئی۔ اسی طرح معذور افراد کو گزشتہ سال کے ۹۳ر۴ کروڑ روپے کے مقابلے میں ۵۱ر۵ کروڑ روپئے کی گرانٹ گزارہ بھتہ دینے کے لیے دی گئی۔

سب کے لیے تعلیم کا نشانہ

ریاستی حکومت نے موجودہ نظام تعلیم میں بڑے پیمانے پر اصلاح کی ہے۔ تعلیم کو کردار سازی کے لیے ضروری تسلیم کر کے نقل کے رجحان کی مؤثر روک تھام کی گئی ہے۔

حکومت نے بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی کو ضرورت کے مطابق دس کروڑ روپئے کی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

حکومت کے ایک دیگر انقلابی فیصلے کے تحت ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحانات میں نقل/غیر مطلوبہ سرگرمیوں پر پابندی لگانے کے لیے آرڈیننس جاری کر کے نقل کو تعزیری جرم قرار دیا گیا ہے۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ



نام کتاب : **دُوب** (شعری مجموعہ)
شاعر : عنبر بہرائچی . قیمت : ساٹھ روپے
ملنے کا پتہ : دانش محل . امین آباد . لکھنؤ

عنبر بہرائچی کا دوسرا مجموعۂ کلام " دوب " پڑھ کر ان کے دروں اور ماضی سے واقفیت ہوئی . یہ عرفان نظموں سے زیادہ ہوتا ہے . لیکن میں سردست غزلوں تک محدود رہتا ہوں . میں نے ان کی غزلوں کا ایک ایک شعر پڑھا اور ان سے متعارف ہوا . بظاہر عنبر شہر کے باسی ہیں ، جدید وضع کے نوجوان اور ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہیں لیکن یہ باطن عنبر آج بھی گاؤں کا ایک لڑکا ہے جو کھیت ، تالاب ، گیلی مٹی ، زرد بالو ، دوب ، کچی بالیوں ، کچنار ، املتاس ، سرکنڈے اور بیا کے بیو نسلے میں مگن رہتا ہے . اردو کے کم شاعروں نے غزل کے آئینہ خانے میں اپنی ذات کو اس طرح افشا کیا ہوگا . ان کے کتنے ہی اشعار میں 'ہمارے گاؤں' یا 'میرے گاؤں' کا فقرہ ملتا ہے ؎

ہر نفس پیاسا تھا لیکن عادتاً مجبور تھا
دودھ کا دریا ہمارے گاؤں سے کچھ دُور تھا

مٹی ، دھوپ ، ہوا ، پانی کی اشکوں بھری دعائیں لیکر
میرے گاؤں کی بیٹی اپنے بابل سے رخصت ہوتی ہے

عنبر کو گاؤں سے اکھاڑ کر شہر میں بو دیا گیا ہے لیکن اس کا جی جان تو اب بھی گاؤں ہی میں ہے . بہرائچ کے کسی گاؤں سے لاکر انھیں لکھنؤ میں پٹک دینا ایک ہجرت عظیم ، ایک مہا بھنشکرمن ہے . کیسی ناسٹلجیا بسی ہے اس غریب الدیار کے ان شعروں میں ؎

بیلوں کے سنہرے پھول ، بنسواری کے الغوزے
مجھے کل رات عنبر اپنی بستی یاد آئی تھی

دودھ کے سوندھے کٹورے ، باجرے کی روٹیاں
سبز یادوں کے جھکے چہرے اُٹھا کر دیکھنا

گیلی مٹی ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوں ذہن میں ایک دھندلے پیکر سے اُلجھا ہوں

ہاتھوں نے مٹی سے آخر توڑ لیا اپنا رشتہ
دھانی رُت سونے کا جھومر کھیتوں کو پہنائے کیوں

میرے لڑکپن میں مشترکہ خاندان کا رواج تھا ، سب ساتھ رہتے تھے اگرچہ کبھی کبھی لڑتے تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے . تہذیب ، تعلیم ، ملازمتوں کے چکر نے بیٹے کو باپ سے اور بھائی کو بھائی سے دور پھینک دیا . عنبر نے تہذیب کے ہاتھوں خاندانوں کی شکست و ریخت کا ماتم کیا ہے ؎

وہ سادہ دل بزرگ ، ایک خاندان تھے ، مگر
ہمیں الگ الگ بسے کہ ہم ذہین تھے بہت

ڈھلی عمر بچے سیانے ہوئے مرے کھیت کے چار ٹکڑے ہوئے

بچپن میں تو سارے بھائی شیر و شکر تھے ہوئے جواں تو آپس میں دیوار کھنچی ہے

موجودہ طمع زدہ زندگی ، اس کی بے خلوصی ، تہذیب کی ظاہرداری اور معاشرے کے نشیب و فراز کی کتنی داستانیں ہیں جو عنبر نے محض ایک ایک شعر میں سمو دی ہیں ، جس طرح کہاوت کے پیچھے ایک اصلی یا خیالی واقعہ ہوتا ہے اسی طرح ان اشعار کی تشریح میں ایک پورا واقعہ لکھا جا سکتا ہے . بغیر تبصرے کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

گاؤں سے میرے سڑک نکلی مگر پیڑ جو چھتنار تھے سب کٹ گئے

اسی کے ہاتھ میں تمغے ہیں کل جو میداں میں
ہماری چھاؤں میں اپنا بچاؤ کرتا تھا

ہر اک مکان میں خدا ترس مکین تھے بہت
لٹے تھے راہ گیر جب، تماش بین تھے بہت

بُت کی قیمت آنک رہا تھا ویسے وہ   مندر میں تو پوجا کرنے آیا تھا

زمیں کے زعم تو اس کی نظر سے دور ہیں لیکن۔
خلا کے سرد سناٹوں میں سیارے اڑاتا ہے

طیاروں سے باڑھ کا منظر دیکھا ہے شہزادوں نے
اپنی بدحالی اس جشنِ لطف و کرم پر حیراں ہے

یہ ذکر کرتا چلوں کہ انھوں نے متعدد غزلیں ۲۲ حرفی وزن میں اور ان سے کم ۲۴ حرفی وزن میں کہی ہیں یہ اردو کے وزن نہیں، ہندی کے ہیں میں نے ان کی ماترائیں شمار کر کے دیکھیں، کہیں جھول نہ پایا۔ یہ نہ تھا کہ ۲۲ حرفی غزل میں کوئی مصرع ۲۴ حروف کا یا ۲۴ حرفی میں ۲۲ حروف کا آجائے اسی طرح وہ ہندی کے دوہے کے وزن پر بھی عبور رکھتے ہیں۔

شاعری بلکہ انسانی فطرت کے سب سے مقبول موضوع حسن و عشق پر بھی عنبر نے لکھا ہے مگر کم کم۔ جہاں لکھا ہے اس لیے دبے انداز میں لکھا ہے کہ محبوبہ کا محض پنسل کا خاکہ (silhouette) دکھاتے ہیں، وہ بھی کسی پردہ پوش ربیکا (Rebecca) کی طرح حجاب اندر حجاب۔ ان کے اپنے واردات قلبی اس قدر طاہر و اطہر ہیں کہ جس پر نہ افلاطون کو اعتراض ہوگا نہ حالی و نذیر احمد کو ؎

بے نمک آب و ہوا میں بھی لہو کا جاگنا
سرخ ریتی پہ بہار رنگ و بو کا جاگنا

سارے موسم خال و خد کے سامنے ہیں بے اثر
برف رُت کی دھڑکنوں میں تند لُو کا جاگنا

دم بہ دم خوش رنگیوں کی یہ سہانی بارشیں
ایک چہرہ میرے احساسات پر چھایا ہوا

ہنس رہا تھا وہ ہری رُت کی سہانی چھاؤں میں
دفعتاً ہر اک شجر کے پیرہن میلے ہوئے

ان اشعار پر کوئی محتسب، کوئی قاضی گرفت نہیں کر سکتا۔

آخر میں دو لفظ عنبر کی لفظیات کے بارے میں۔ وہ گوتم بدھ کے سوانح نگار ہیں۔ انھیں کسی قدر سنسکرت بھی آتی ہے۔ دوب کی ابتدا ہی سنسکرت شریات کے دو سنسکرت مقولوں سے ہوتی ہے۔ تمہید میں جہاں مشرق و مغرب کے کئی اہل فکر کے اقوال درج کیے ہیں وہیں آچاریہ آنند وردھن کے مقولے بھی ہیں۔ رادھا کرشنن اور سی۔ پی۔ راما سوامی ایئر سے بھی روشنی لی ہے۔ 'ستیم شوم سندرم' کی اہمیت بھی جتائی ہے۔ نہ صرف قدیم ہندوستانی افکار ان کی سوچ کا حصہ ہیں بلکہ وہ اودھی اور بھوجپوری کے بھی عاشق ہیں۔ اودھ کے گھاٹ کے تالاب کی گیلی مٹی اور بالو کا دلدادہ ہندی الفاظ کے بغیر کیونکر لقمہ توڑ سکتا ہے۔ نظموں کے حصے میں تو ہر نظم کے بعد انھوں نے ایک ہندی دوہا بھی تصنیف کر کے لکھا ہے۔ ہر دوہا تکنیکی اور شعری اعتبار سے بے عیب ہے۔

ان کے چولے پر ہندوستان کا بسنتی رنگ اتنا گہرا چڑھا ہوا ہے کہ نعتوں، غزلوں اور گیتوں کے اردو مجموعے کا نام 'روپ انوپم' رکھنے کی سوچتے تھے۔ "دوب" کی ابتدا میں غزلوں سے پہلے ایک نعت نظم کی ہے۔ اس کے کچھ مصرعے یہ ہیں ؎

انوپم جوت کے پونم، ضیائے مہر تابانی
پریت و ریت کے سنگم، مجسم حسنِ ایمانی
دُھر سندیش کے سرگم، پیامِ لطفِ سبحانی
سُگھڑ من موہنی چھب، منبع تنویر زیبائی
مدُھر امرت بھری بانی، ہمہ در عقل و دانائی
سلونی پریت کے مدھوبن، چمن زارِ مسیحائی

بہرحال عنبر اردو اور ہندی کے درمیان ایک پل بنانا چاہتے ہیں۔ مبارک ہے ان کا یہ اقدام۔ —— ڈاکٹر گیان چند

نام کتاب: "شہرِ خوباں"

شاعر: عاصی فائقی   قیمت: چالیس روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی

شہرِ خوباں، جناب عاصی فائقی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور مختلف اصنافِ شعری پر محیط ہے۔ مثلاً حمد نعت، غزل، سہرا اور رخصتی وغیرہ۔ کلام قدیم طرزِ شاعری کی نمائندگی کرتا ہے مگر فکر میں جدت اور لفظیات کے استعمال میں ندرت ہے۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ ان کی شاعری میں غمِ دوراں سے زیادہ غمِ جاناں کا اظہار ملتا ہے۔ مزاج پر جمالیات کا غلبہ ہے ؎

زلفِ جاناں کی عجب چھاؤں سے بھینی بھینی
زندگی آتی حسیں ہو تو غزل ہوتی ہے

نگہِ یار سے بچ پائے گا کوئی کیسے؟
اس سے بڑھ کر بھی کہیں تیغ کی زد ہوتی ہے

دوشیزہ کے ہاتھوں سے ساون کے مہینے میں
کچھ اور مزا آیا دو آتشہ پینے میں

جانے کیا کہہ گئیں چپکے سے شرابی آنکھیں
اوڑھ کر سو گئیں خوابوں کو غلافی آنکھیں

بیشتر غزلوں میں مترنم بحور کا استعمال ہوا ہے جس سے کلام میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ اسلوبِ نگارش سادہ مگر پرکشش ہے۔

——— زین الدین حیدر

علی گڑھ تحریک .... ص۱۲ کا بقیہ

علی گڑھ تحریک کے علمبردار خود تو متوازن افراد تھے اور روح و جسم کی دوہری اہمیت سے واقف بھی تھے، لیکن اس تحریک کی پروردہ پیڑھیاں یہ توازن کھوتی گئیں اگر ہم علی گڑھ تحریک کو مردہ تحریک سمجھ کر بیٹھ رہیں، جس کا محض ماضی کے جھروکے سے نظارہ کیا جا سکتا ہے تو یہ یقیناً ایک بہت بڑی بھول ہوگی۔

علی گڑھ تحریک نے اپنی پہلی منزل کی جانب سفر کا پہلا مرحلہ طے کر لیا ہے لیکن علی گڑھ تحریک کا یہ سفر ابھی جاری اور نا تمام ہے اور اس وقت تک یہ سفر جاری رہے گا۔ ع

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

□□

شخصی مرثیے .... ص۳۷ کا بقیہ

ہند کا انوری و سعدی تھا
متفق اس پہ ہیں سخن پرداز
اسد اللہ خاں تمام ہوا
وا دریغا وہ رندِ شاہد باز

شاعرِ طنز و مزاح اکبر الہ آبادی نے بھی کئی شخصی مرثیے لکھے ہیں۔ اپنے نوعمر بیٹے ہاشم کی موت پر انھوں نے انتہائی دردناک اشعار نظم کیے تھے [۴] جس سے ان کے رنج و غم کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

وہ چمن ہی مٹ گیا آئی تھی کہ جس میں بہار
اب تجھے پا کر میں لے بادِ بہاری کیا کروں

بزمِ عشرت میں بٹھانا تھا جسے وہ اٹھ گیا
اب میں اے فردا تری امیدواری کیا کروں

□□

حواشی:

۱ حالی بحیثیت شاعر (لکھنؤ ۱۹۷۰ء) ص۲۲۶

۲ " " " ص۲۲۹

۳ سرور جہاں آبادی: حیات اور شاعری (لکھنؤ ۱۹۶۸ء) ص۲۲۵، ص۲۶۶

۴ تاریخ ادب اردو - رام بابو سکسینہ (لکھنؤ ۱۹۲۹ء) ص۴۳۰



جلد ۴۷ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین

ٹیلیفون: ــــــ ۲۴۵۶۶۰

معاونین:
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس عثمانی

ٹیلیفون ــــــ ۲۴۴۱۰۸

پبلشر
انیل سروپ
(ڈائرکٹر اطلاعات ورابطہ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرز لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: ــــ تین روپے
سالانہ: ــــ تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس ۱۴۶ لکھنؤ

ایک شمارہ صباح الدین عمر کے نام

عنوانات

کتابت و تزئین: حسن اختر * سرورق: ابوالفضل

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے ہر حال میں متفق ہو

اپنی بات

موجودہ حکومت نے اترپردیش میں اقتدار سنبھالنے کے بعد ایک نئی تہذیب اور نئی قدر کی بنیاد ڈالی۔ نیز کام کرنے کا ایک نیا لائحہ عمل مرتب کیا جس کے نتیجے میں پردیش میں ایک مستعد اور چوکس نظم ونسق کی بنیاد پڑی۔ حکومت نے پورے خلوص اور نیک نیتی سے ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ 'بے خوف سماج اور فسادات سے پاک ریاست' اب صرف نعرہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ حکومت کے خلوص اور نیک نیتی کا ہی نتیجہ ہے کہ گزشتہ سال ریاست میں پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام تہوار پُرامن فضا اور خوشگوار ماحول میں منائے گئے۔ حکومت نے قلیل مدت میں ہی ریاست میں امن و قانون کی صورت حال کو بحال کر کے لوگوں کو راحت کی سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔

نیادور کا یہ شمارہ صباح الدین عمر مرحوم کے نام سے موسوم ہے۔ صباح الدین صاحب کا نام لکھنؤ کے علمی، ادبی سیاسی، سماجی اور ثقافتی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ انھوں نے اپنا کیریر محکمۂ اطلاعات کی ملازمت سے شروع کیا تھا اور بعد میں نیادور کی ادارت بھی کی۔ اسے ایک خاص مزاج عطا کرنے میں ان کے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے زمانے میں 'نیادور' کا معیار بہت بلند ہوگیا تھا۔

صباح الدین عمر صاحب اترپردیش اُردو اکاڈمی کے بانی سکریٹری بھی رہے اور اسے پروان چڑھانے اور ایک مثالی ادارہ بنانے میں انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا۔

ستمبر کے مہینے میں عید میلاد النبیؐ کی تقریبات ملک کے طول و عرض میں جوش و خروش کے ساتھ منائی جائیں گی۔ ہم اس تقریب سعید کے موقع پر اپنے قارئین کو مبارک باد اور پیغمبر اسلامؐ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

——— ایڈیٹر

پروفیسر محمود الٰہی
۴۔ پروفیسر کالونی۔ گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور

فرہاد کے ذمّے بھی عجب کوہ کنی تھی

اس کا انکار کون کرسکتا ہے کہ شمعیں بجھتی رہتی ہیں اور انجمن باقی رہتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعض انجمنیں کسی خاص شمع سے اس طرح کسبِ نور کرتی ہیں کہ شمع کی تابناکی انجمن کی تابناکی کا درجہ اختیار کرلیتی ہے۔ اترپردیش اُردو اکاڈمی کے سیاق و سباق میں صباح الدین عمر صاحب کی حیثیت اسی شمع کی تھی جس کی ضیا باری سے اکاڈمی ایک امتیازی شان کی حامل رہی ہے۔ وفات سے مہینوں پہلے وہ اکاڈمی سے الگ تھلگ ہو چکے تھے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ان کے دستِ حنائی کے تصوّر سے اکاڈمی میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی تھی!

میں نے اکادمی کے حوالے سے صباح الدین عمر مرحوم کا ذکر اس لیے شروع کیا کہ ان سے میرے تعلقات اکاڈمی کے توسط سے استوار ہوئے ـــــ اور اس استواری کی کوئی حد نہیں رہ گئی تھی۔

یوں تو پہلی بار میں ان کی شخصیت سے اس وقت متاثر ہوا جب وہ نیا دور لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے۔ میں نے اترپردیش کے مشرقی علاقے کے ایک گمنام مگر قدیم ہفتہ وار اخبار پر تعارفی نوٹ لکھا تھا اور اشاعت کے لئے نیا دور میں بھجوا دیا تھا۔ ایک آدھ مہینے کے بعد جب اس تعارفی نوٹ کی رسید آئی تو معاً بعد مرحوم کا ایک طویل خط موصول ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ تعارفی نوٹ کے بعض نکات وضاحت طلب ہیں۔ میں نے ان نکات کی وضاحت کردی۔ جب وہ میرے جواب سے مطمئن ہوگئے تو انھوں نے لکھا کہ اخبار کی فائل میرے پاس بھجوا دی جائے جو بحفاظت واپس کردی جائے گی

میں نے امتثالِ امر میں یہ کام بھی کیا ـــــ پھر تعارفی نوٹ شائع ہوا اور اخبار کے سرورق کا عکس بھی۔ میں نے جتنی حفاظت کے ساتھ اخبار کی فائل بھیجی تھی، اس سے کہیں زیادہ حفاظت کے ساتھ مجھے فائل واپس ملی۔ میں جہاں مرحوم کی دقتِ نظر اور ان کے ذوقِ تحقیق کا قائل ہوا، وہاں ان کی دیانت اور احساسِ فرض کا بھی اعتراف کیا۔ میں کبھی کبھار لکھنؤ ہو آتا تھا مگر مرحوم سے بس دو ایک بار دانش محل میں ملاقات ہوئی، وہ بھی انتہائی سرسری۔

۱۹۷۱ء کے آس پاس اخبارات میں اس بات کا ذکر آنے لگا کہ اترپردیش میں اردو اکاڈمی قائم ہونے والی ہے لیکن مجوزہ اکادمی کے مقاصد کیا ہوں گے، اس کا بس موہوم سا خاکہ سامنے آتا تھا۔ ایک دن اخبارات سے اطلاع ملی کہ اکاڈمی قائم ہوگئی ہے ـــــ اور پھر چند یوم کے بعد مجھے اس کی پہلی میٹنگ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ یہ دعوت نامہ مجھ پر بہت گراں گزرا۔ میں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہوگیا اور آخر ش میں اس نتیجے پر پہونچا کہ اس میٹنگ میں میری شرکت مناسب نہیں ہے۔ جب صباح الدین صاحب نے سکریٹری کی حیثیت سے گزشتہ میٹنگ کی کارروائی کی ایک نقل مجھے بھجوائی تو انھوں نے مجھے ایک خط بھی لکھا کہ اگلی میٹنگ میں ضرور شرکت کروں۔

میں ایک سب کمیٹی کی میٹنگ میں پہونچا۔ جلد ہی فرصت مل گئی لیکن مرحوم نے مجھے روک لیا۔ دوپہر کا کھانا بھی ان کے ساتھ کھایا۔ اور پھر سلسلۂ گفتگو جو شروع ہوا تو شام ہوگئی۔ انھوں نے بڑی

تفصیل سے بتایا کہ اکاڈمی کی تشکیل کن حالات میں ہوئی اور اسے قول سے فعل میں لانے کے لیے انھیں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ انھوں نے اپنے اس احساس کی بھی ترجمانی کی کہ اکاڈمی اُردو کے مسائل کا حل نہیں ہے لیکن یہ ہمارے مقاصد کی نفی بھی نہیں کرتی۔

اکاڈمی کی میٹنگیں ہوتی رہیں جن میں میں شریک ہوتا رہا، اس کے دفتری امور بڑھتے گئے عملے میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ دفتر پر ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ہر کاغذ کے بارے میں انھیں علم تھا کہ کس فائل میں ہے اور اس میں کیا تحریر ہے۔ اب مختلف کمیٹیوں کے ضوابط بھی مرتب ہو گئے تھے۔ وہ میٹنگوں میں ہر اعتراض کا مطول مگر مدلل جواب دیتے تھے اور دستور و ضوابط سے حوالہ بھی پیش کرتے جاتے تھے۔ وہ اسی وقت خاموش ہوتے تھے جب اکاڈمی کے چیرمین آنند نرائن ملّا صاحب مداخلت کرتے اور کہتے تھے کہ ہم لوگ آپ کے جواب سے مطمئن ہو گئے۔ کبھی کبھی تو مداخلت کے باوجود وہ بعض فائلوں کے اقتباسات سنانے سے باز نہیں آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میٹنگوں میں اراکین سے زیادہ صباح الدین عمر صاحب اظہار خیال کرتے تھے۔ وہ ہر میٹنگ سے پہلے متعلقہ فائلوں کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیتے تھے۔ سب کمیٹیوں کی سفارشیں اور ان سے متعلق کاغذات کی چھان بین بھی کر لیتے تھے۔ ہر سفارش پر وہ مختصر نوٹ تیار کر لیتے تھے اور جب اس نوٹ کی وہ وضاحت کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب کمیٹی نے کسی خاص نکتے سے ضرور صرفِ نظر کر لیا ہے۔ صباح الدین صاحب کے اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سب کمیٹی موضوع کے مالہ و ماعلیہ کے مطالعے کے بعد ہی سفارشیں پیش کرتی تھی۔ اس طریقۂ کار نے اکاڈمی کے فیصلوں کو وقیع، منطقی اور منصفانہ بنا دیا تھا۔

ایک بار مجلسِ انتظامیہ کی میٹنگ شروع ہوتے ہی صباح الدین صاحب نے کہا کہ ایک بہت نازک معاملہ پیش آ گیا ہے، پہلے اسے سُن لیجیے۔ بات صرف اتنی تھی کہ کسی تعلیمی ادارے کے سربراہ نے وظیفے کے ایک امیدوار کے فارم کو فارورڈ کر دیا تھا مگر فارم کے اندراجات میں جو غلط بیانیاں تھیں، ان سے صرفِ نظر کر لیا تھا ملّا صاحب نے کہا کہ متعلقہ سربراہ کو خط لکھ دیجیے کہ وہ اندراجات کے بارے میں اپنی قطعی رائے ظاہر کریں اور امیدوار کے وظیفے کی کارروائی ملتوی کر دی جائے۔

دو ماہ کے وقفے کے بعد جب مجلسِ انتظامیہ کا جلسہ ہوا تو صباح الدین عمر صاحب کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ حضرات کے حسب الحکم وظیفے کی کارروائی ملتوی کر دی گئی ہے اور سربراہ سے جو مراسلت ہوئی ہے وہ پیش کر رہا ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ سربراہ نے اقرار کر لیا ہے کہ انھوں نے اندراجات کو ملحوظ رکھے بغیر فارم فارورڈ کر دیا تھا۔ صحیح اندراجات یہ ہیں۔ ملّا صاحب نے کہا کہ معاملے کو وظائف سب کمیٹی کے سامنے برائے غور پیش کر دیا جائے صباح الدین صاحب نے کہا کہ آپ کو فیصلہ تعلیمی ادارے کے سربراہ کے بارے میں کرنا ہے کہ اس کی سرزنش کس طرح کی جائے۔

قاضی عدیل عباسی مرحوم نے اپنا فیصلہ سنایا کہ "اگر آپ کے اختیار میں ہو تو اسے پھانسی دے دیجیے۔"

اس کے بعد صباح الدین صاحب خاموش ہو گئے۔ مگر انھیں مدتوں اس کی خلش رہی کہ اکاڈمی نے اس سربراہ کی سرزنش نہیں کی، جس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔!

وظیفے کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک طالب علم نے الٰہ آباد کے کسی کالج سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ اکاڈمی کے ضوابط کے مطابق طالب علم کو یا تو اس کالج سے وظیفے کا فارم فارورڈ کرانا ہوتا تھا جہاں سے اس نے انٹر کا امتحان پاس کیا تھا اور یا پھر جس تعلیمی ادارے میں اس نے بی۔اے میں داخلہ لیا تھا، اس کے سربراہ سے —— امیدوار نے انٹر کالج کے پرنسپل سے فارورڈ کرا کے وظیفے کا فارم اکاڈمی میں داخل کر دیا تھا۔ صباح الدین صاحب نے اس طالب علم کو لکھا کہ یونیورسٹی کے سربراہ سے فارم فارورڈ کرایا جائے۔ اس نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو سے فارم فارورڈ کرا لیا۔ پھر صباح الدین صاحب نے اسے لکھا کہ یونیورسٹی میں بی۔اے

کے معاملات ڈین فیکلٹی آف آرٹس دیکھتا ہے، اس لئے اپنے ڈین سے فارورڈ کرا کے فارم بھجوائیے۔ طالب علم نے اس حکم کی بھی تعمیل کی، لیکن فارم کے ساتھ جو خط اس نے لکھا تھا، وہ بڑا دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ خط کا متن کچھ اس طرح کا تھا:

"اکاڈمی کے ضابطے کے مطابق میں نے فارم فارورڈ کرا کے بھیجا تھا، آپ نے حکم دیا کہ یونیورسٹی کے سربراہ سے فارورڈ کراؤں، چونکہ میں اُردو کا طالب علم ہوں اور اُردو کے نمبروں کی بنیاد پر وظیفے کا خواہاں ہوں اس لیے میں نے شعبۂ اُردو کے سربراہ سے فارم فارورڈ کرالیا۔ پھر آپ نے لکھا کہ فارم ڈین فیکلٹی آف آرٹس سے فارورڈ ہونا چاہیئے، سو اس حکم کی بھی تعمیل ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اب آپ یہ لکھیں گے کہ فلاں مرحوم سے فارم فارورڈ کرا کے بھیجوں تب کہیں جاکر درِ گنجینۂ اکاڈمی وا ہوگا۔!"

جب یہ خط صباح الدین صاحب کو ملا تو میں اس کے دوسرے یا تیسرے دن اکاڈمی پہنچا علیک سلیک کیا، انھوں نے خط میرے سامنے رکھ دیا اور کہا: "ملاحظہ کیجئے"!

میں نے خط پڑھا تو بے اختیار "بہت خوب، بہت خوب!" کے ساتھ خط کی داد دی۔ اب تو مرحوم کی برہمی دیکھنے کے لائق تھی انھوں نے کہا "بہت خوب کا کیا مطلب!؟"

میں نے جواب دیا کہ بی۔ اے کا طالب علم اور اتنا ادبی خط!

انھوں نے کہا۔ "آپ اس لڑکے کی گستاخی کی داد دے رہے ہیں۔ خط کو غور سے پڑھیے"

میں نے جواباً کہا کہ میں نے خط پڑھ لیا ہے، اس لڑکے کو وظیفے کے ساتھ کچھ انعام بھی ملنا چاہیے۔

انھوں نے کہا: "یونیورسٹیوں کے لوگ اس گستاخی کو برداشت کر سکتے ہیں، اکاڈمی اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ جناب، دیکھیے کوئی فقرہ گستاخی سے خالی نہیں ہے"

مجھے خط کے آخری جملے نے بے حد محظوظ کیا تھا ــــ میں ہنسنے لگا۔ کہا: "جناب! یہ رونے کا مقام ہے۔ ایک طرف وظیفہ کے طلب گار اور دوسری طرف بے حیائی اور گستاخی۔!"

بہر حال بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن صباح الدین صاحب کا غصہ اس وقت فرو ہوا جب اکاڈمی کے بعض اراکین نے کہا کہ یہ لڑکا ہے، اس سے غلطی ہوگئی، آپ اسے معاف کر دیجئے اور اس کا وظیفہ بھجوا دیجئے۔

یہ واقعات بظاہر لطیفوں کے ذیل میں آتے ہیں لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ صباح الدین صاحب اکاڈمی کے دفتر کو فعال، بے لوث اور نظم و ضبط کا پابند بنانا چاہتے تھے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اکاڈمی کو جو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی، اس میں مرحوم کی قوت کارکردگی کا بڑا حصّہ ہے۔ اکاڈمی کے سکریٹری کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا ہے، وہ چیرمین کی رہنمائی میں مجلس انتظامیہ کے فیصلوں کو نافذ کرتا ہے۔ فیصلوں کا نفاذ اسی وقت ممکن ہے جب اکاڈمی کا عملہ سکریٹری کے ساتھ بھرپور تعاون کرے۔ مرحوم کو عملے کا تعاون حاصل تھا۔ وہ بہت سخت گیر تھے، کیا مجال کہ دفتری امور میں کوئی تاخیر و تعویق سے کام لے۔ کسی نے تساہل و تغافل برتا تو پھر اس کی خیر نہیں۔ مرحوم اس پر بری طرح برس پڑتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی حسب موقع ہر فرد کو بڑے پیار سے سمجھاتے رہتے کہ اگر اس نوجوانی میں تم نے کام کرنا نہ سیکھا تو عمر بھر موردِ الزام اور ہدفِ ملامت بنتے رہو گے ــــ لیکن دفتروں کا کام صرف تہدید و تلقین سے نہیں چلتا منتظم اعلا کو خود بھی رات دن کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ صرف دفتر کی ایک ایک فائل سے واقف نہیں ہوتا بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کس فائل میں کتنی پیش رفت ہوئی ہے۔ صباح الدین صاحب بلا کے منتظم تھے۔ وہ خود بھی کام کرتے تھے اور دفتر والوں سے بھی کام لیتے تھے۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ جب کتابت کی کاپیوں کا پروف پڑھ لیا جاتا تو پریس کے سپرد کرنے سے پہلے وہ خود بھی ایک بار پروف دیکھ لینا چاہتے تھے۔ دو چار غلطیاں تو نکل ہی آتیں: وہ دوبارہ پروف پڑھواتے۔ اس طرح پروف پڑھنے والے یہ سمجھ گئے کہ ان کا بھی احتساب ہو سکتا ہے۔ وہ اور زیادہ توجہ اور انہماک کے ساتھ مفوضہ خدمت

انجام دیتے۔

انھیں اکاڈمی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ علالت کے زمانے میں بھی اکاڈمی سے رخصت نہیں لیتے تھے، کسی نہ کسی طرح دفتر آجاتے اور کاغذات دیکھنے سے باز نہ آتے۔ ایک بار ان کے معالج نے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ مجلس انتظامیہ کی میٹنگ تھی، دیکھا گیا کہ وہ گرتے پڑتے میٹنگ میں شریک ہوگئے۔۔۔ ملا صاحب نے یہ حال دیکھا تو انھوں نے سختی سے کہا:

"آپ کو جبری رخصت دی جاتی ہے اور یہ رخصت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک آپ کو صحت تام نہ ملے۔"

دو ایک دن تو انھوں نے حکم کی تعمیل میں دفتر کا رُخ نہیں کیا، لیکن پھر وہی دفتر اور دفتری کاروبار جن کے باعث رگ رگ سے کھنچ کر دم نکل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔!!

ریاستی حکومت اپنے افسروں میں سے کسی کو اکاڈمی کا سکریٹری مقرر کرتی ہے۔ صباح الدین عمر صاحب بھی سرکاری ملازم تھے، جب اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے مگر ان کے ریٹائرمنٹ میں شاید تین چار سال باقی تھے۔ سکریٹری شپ کے دوران وہ ریٹائر ہوگئے لیکن انھیں دو ایک سال کی توسیع مل گئی اور [illegible] میں توسیع کی مدت بھی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد وہ اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کے رکن نامزد کیے گئے۔ مستثنیات سے قطع نظر اکاڈمی کی ہر نئی تشکیل میں ان کا نام ضرور نظر آتا۔ وہ اکاڈمی کے رکن ہوں یا نہ ہوں، انھوں نے اکاڈمی سے کبھی رشتہ نہیں توڑا۔ اکاڈمی میں ان کے نام کا سکہ چلتا رہا اور وہ کسی نہ کسی روپ میں اکاڈمی کی خدمت کرتے رہے۔ اکاڈمی آئے دن کسی نہ کسی عقدۂ لاینحل سے دوچار ہوتی رہتی اور اکاڈمی والے بجا طور پر یہ سمجھتے کہ اس کا حل صباح الدین عمر صاحب تلاش کرلیں گے۔ انھیں اکاڈمی میں زحمت دی جاتی اور وہ اکثر اکاڈمی کی فائلوں کی مدد سے اس عقدے کو حل کردیتے۔ وہ کبھی کبھی کہتے تھے کہ اعزا اور بعض احباب چاہتے ہیں کہ اکاڈمی سے میں کم سے کم ربط رکھوں لیکن ع

درمن این عیب قدیم ست و بدرمی نرود

اعزا اور اقربا کی پروا کون کرتا، انھیں ادائے فرض کے علاوہ اور کسی چیز کا لحاظ نہیں تھا۔ انھیں کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ بازار میں کس چیز کا بھاؤ کیا ہے۔ میں نے کبھی انھیں خریداری کرتے نہیں دیکھا۔ کہتے تھے کہ اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ اس طرح کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیر اختیار کروں۔ ایک بار انھوں نے عجیب حقیقت کا اظہار کیا۔ ان کی کسی بیٹی نے امتحان میں کامیابی کا مژدہ انھیں سنایا تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اب بی۔ اے میں داخلہ لے لو۔ بیٹی نے کہا کہ میں بی۔ اے میں کامیابی کی بات کر رہی ہوں۔!

اتر پردیش میں واقع ہر ریاستی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر بلحاظ عہدہ اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کا رکن ہوتا ہے۔ ایک بار اکاڈمی دستوری بحران کا شکار تھی۔ یونیورسٹیوں سے متعلق اکاڈمی کے اراکین نے دستور کی بحالی کے لیے جدوجہد شروع کی۔ دشواری یہ پیش آئی کہ ہم لوگ جب لکھنؤ آئیں تو کہاں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں اور جدوجہد کی صورتِ حال کا جائزہ لیں۔ ہم لوگوں نے مرحوم کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو انھوں نے فوراً کہا کہ میری قیام گاہ حاضر ہے۔ جدوجہد مہینوں جاری رہی اور اس دوران مرحوم ہمارے مربی تھے اور ان کی قیام گاہ مستقر۔ وہ بڑی فراخ دلی سے ہمارے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتے رہے اور حسب موقع اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ آخر میں ایسا ہوا کہ زمام کار انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور دستور کی بحالی کے لیے شب و روز تگ و دو کرنے لگے۔

اکاڈمی کی تشکیل سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک انھوں نے اکاڈمی کو فعال اور موثر بنانے کے لیے جدوجہد جاری رکھی وہ اکاڈمی سے سرکاری طور پر وابستہ ہوں یا نہ ہوں، وہ اس کے لیے اپنا خون جگر صرف کرتے رہے۔ جب کبھی اکاڈمی کی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کی محنتِ شاقہ اور خلوص بے پایاں کے نقوش زیادہ واضح انداز میں نظر آئیں گے۔

صباح الدین عمر کا مطالعہ کم وسیع نہیں تھا، وہ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر مضامین لکھتے رہے اور کبھی کبھی

وہ مضامین رسالوں میں شائع بھی ہوتے تھے۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ وہ منتشر مضامین کو کتابی صورت میں مرتب کردیں لیکن یہ سچ ہے کہ اس کی فرصت ہی انھیں نہیں ملتی تھی۔

وہ جب کوئی مضمون لکھنے کا ارادہ کرتے تو مواد کی فراہمی کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس موضوع پر بھی وہ لکھیں اس میں کوئی نیا پہلو ضرور نکالیں۔ ایک بار اصغر گونڈوی پر مضمون لکھنا چاہتے تھے۔ کچھ کتابیں فراہم ہوئیں لیکن بعض اہم مواد تک رسائی نہیں ہو سکی۔ انھوں نے مجھے لکھا:

"اصغر گونڈوی کی مرتبہ گلزار نسیم کا کوئی نسخہ مجھے تلاش بسیار کے باوجود یہاں نہیں مل سکا ہے۔ آپ نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت فرمایا تھا کہ کتاب نہ ملی تو میں اپنے یہاں یا یونیورسٹی میں دیکھوں گا اگر مل جائے تو زحمت فرما کر لیتے آئیے۔ ہندوستانی اکاڈمی کا رسالہ بھی نہیں دستیاب ہے۔ اس کی فائل اگر مل جائے تو اصغر کی ادارت پر کچھ لکھا جا سکتا ہے بہرحال آپ سے بات ہو جائے، تبھی کچھ لکھوں گا۔ اگر کچھ نہیں ملتا تو ایک پیش پا افتادہ یا فرسودہ مضمون تیار ہو جائے گا جو میں نہیں چاہتا۔ اصغر صاحب کا کوئی نیا پہلو تو سامنے آئے۔"

انھیں جب اصغر گونڈوی پر مواد مل گیا تو بڑی محنت سے مقالہ لکھا جس میں یہ بھی تحریر کیا:-

"یہ ضروری نہیں کہ اچھا محقق یا ناقد جو ایڈیشن مرتب کرے گا، وہ ایڈیٹنگ یا تدوین کے لحاظ سے بھی ہر طرح مکمل ہوگا۔ مگر یہ بہرحال ضروری ہے کہ مدوّن یا ایڈیٹر اصل مصنف کے حالات، اس کے عہد، اس کے معاشرے، اس دور کی زبان، متروکات، صحت الفاظ سے بھی واقف ہو اور متن کے اہم نسخوں کا علم بھی رکھتا ہو، نیز ان کا حوالہ دے سکتا ہو۔ اسی کے ساتھ اس میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ مختلف نسخوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی مرتبہ کتاب میں کس لفظ یا کس شعر یا کس مصرعے یا کس عبارت کو شامل کیا جائے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ کسی بھی نسخے کو سامنے رکھ کر ایک دیباچہ لکھ دیا جائے، چاہے وہ کتنا ہی فاضلانہ کیوں نہ ہو مگر متن کی غلطیوں کا خیال نہ رکھا جائے ـــــ اصغر گونڈوی نے "گلزار نسیم" کی تدوین میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے۔" (دوماہی اکاڈمی۔ مارچ اپریل ۱۹۸۷ء)

جب اکاڈمی نے مولانا آزاد صدی کے موقع پر ان اخبارات کے انتخاب کا منصوبہ مرتب کیا جن کا تعلق جنگ آزادی سے تھا تو مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" کے انتخاب کا کام صباح الدین عمر صاحب کے سپرد کیا گیا۔ "ہمدرد" کی فائلوں کی دستیابی آسان نہیں تھی مگر مرحوم نے یہ ہفت خواں طے کیا اور انتخاب کی کتابت بھی ہو گئی۔ وہ مقدمہ لکھنے والے تھے کہ غیر ممالک کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ مایوسی اور بے یقینی کی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ لیکن جلد ہی ان کے خطوط کی آمد شروع ہوئی، مقدمہ ملا، پھر حذف و اضافہ کی تفصیلات ملیں اور آخر میں یہ ہدایت بھی ملی کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو فلاں جملے یا فقرے کو بدل دوں۔ انھوں نے وہ فقرے اور جملے بھی لکھ دیے جنھیں وہ نعم البدل سمجھتے تھے۔

زیر بحث مقدمہ انھوں نے حالت سفر میں اس وقت تحریر کیا تھا جب ان کی آنکھوں کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اس واقعے سے ان کے احساس ذمہ داری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مرحوم کی زندگی کے آخری بیس سال اتر پردیش اردو اکاڈمی کی نذر تھے۔ ان کے بارے میں میری گفتگو بھی اکاڈمی کے سیاق و سباق تک محدود ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے اردو اور اردو اکاڈمی کے علاوہ اور کسی بات کو موضوع بحث نہیں بنایا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی طویل رفاقت کے باوجود ہمیں کبھی اپنی نجی زندگی کے بارے میں گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ ہم پر کیا کیا بلائیں نازل نہ ہوئی ہوں گی اور مسرت و ابتہاج کی کون سی منزلیں نہیں نہ ملی ہوں گی لیکن ہم نے کبھی ان پر تبادلۂ خیال نہیں کیا۔ میں اس حصار کو توڑنا چاہتا تھا لیکن وقت کی کمی اور اکاڈمی کے مصروفیات کی کثرت [illegible]

□□

رشید حسن خاں
ڈی ۔ ۹۰ / گویر ال۔ دہلی یونیورسٹی
دہلی

گذشتہ لکھنؤ کی آخری یادگار

"فسانۂ عجائب" (مرتبہ راقم الحروف) ۱۹۹۰ء میں چھپی تھی اس کے صفحۂ انتساب پر میں نے یہ عبارت لکھی تھی :-

"لکھنؤ کے ایک فدائی جناب صباح الدین عمر کی نذر"

اب خیال آتا ہے کہ میں نے مناسب تر الفاظ کا انتخاب نہیں کیا تھا مجھے یہ لکھنا چاہیے تھا : "گزشتہ لکھنؤ کی آخری یادگار جناب صباح الدین عمر کی نذر"

اس کتاب کی تدوین کے دوران بہت سے سخت مقام آئے اور ایسی کئی مشکلیں، مرحوم کے بے نہایت تعلق خاطر کے نتیجے میں حل ہو پائیں۔ ان کو لفظوں کے محل استعمال، تلفظ اور تذکیر و تانیث سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ آپ نے ان سے ذرا سا اختلاف کیا اور سمجھ لیجیے کہ بحث کا دروازہ کھل گیا۔ بحث کے دوران اکثر وہ پرانے زمانے کے کٹر قسم کے لکھنؤ والے کے روپ میں سامنے آتے تھے۔ خوب بحث کرتے تھے اور اس زور و شور سے کہ ناواقف شخص بآسانی یہ سمجھے کہ لڑ رہے ہیں۔ بحث مباحثے کے بعد وہ پھر پہلے والے صباح الدین صاحب ہو جایا کرتے تھے، ویسے ہی مخلص و غمگسار اور ویسے ہی یار باش اور دوست نواز۔

ایک بات یاد آئی : "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں ایک جملہ ہے :

"کدھر لینے والے ہیں، نمش کی قفلیاں، کھیر کے پیالے ہیں"

فرہنگ آصفیہ میں "نمش" (بہ فتح اول و دوم) ہے۔ اس کے برخلاف نور اللغات میں اسے "بہ فتح اول و کسر دوم" یعنی "نمِش" لکھا گیا ہے لیکن آثر مرحوم نے فرہنگ آثر میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : "لکھنؤ میں بہ فتح اوّل و دوم بولتے ہیں"۔ میں نے صباح الدین صاحب کو خط لکھا۔ فوراً جواب آیا کہ فصحائے لکھنؤ "نمش" کہتے ہیں۔ دو حضرات کے نام خاص طور پر لکھے کہ ان سے میں نے خود جا کر پوچھا ہے۔ ان میں سے ایک عالم دین تھے اور دوسرے صاحب معروف شاعر۔ میں نے پھر خط لکھا کہ ـــــ" یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ میں نے فتویٰ نہیں منگایا تھا اور "گومتی پار" کی سند نہیں مانگی تھی "ـــــ کئی دن کے بعد لمبا چوڑا خط آیا۔ لکھا تھا :

" آپ کی خاطر بھی اور اپنی معلومات کے لئے بھی کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد نواب صاحب شیش محل کے یہاں جا کر معلوم کیا۔ معلوم ہوا کہ بیگمات کی زبان پر "نمش" ہے (نون اور میم دونوں پر زبر) اب اگر اس سند کو ماننے میں ذرا بھی تامل کیا تو پھر میں سمجھوں گا کہ آپ خواہ مخواہ معرکۂ چکبست و شرر کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں "

شعر و ادب کی نسبت سے مرحوم نے ذہن رسا پایا تھا اور طبیعت معنی یاب تھی، مگر ان کے یہ جوہر کم اور بہت کم سامنے آپاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ چونکہ لڑنے کے قائل تھے یا یوں کہیے کہ عادی ہو چکے تھے۔ اس کے بغیر انھیں چین ہی نہیں پڑتا تھا۔ مقامی سیاست ہو، شاعرانہ گروہ بندی ہو یا ادبی اختلافات ہوں ـ وہ ان سب میں جی لگا کر حصہ لیا کرتے تھے۔ بحث کرتے تھے۔ دوسروں کو آمادۂ بحث کرتے تھے، مراسلے لکھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر مضمون لکھنے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ اردو اکیڈمی بننے کے بعد یہ ادارہ

سب سے زیادہ ان کی توجہات کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ اس ادارے کے چلانے والوں میں تھے۔ پرانا دفتری تجربہ ان کا قابلِ اعتماد رفیق تھا، قاعدے قانون پر بہت اچھی نظر تھی۔ تقریباً ساری دفعات گویا ازبر تھیں، پچھلی نشستوں کی کارروائیاں اور مختلف کمیٹیوں کی کارگزاریاں ان کی یادداشت میں محفوظ رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ ضمنی تفصیلات بھی ذہن میں گردش کرتی رہتی تھیں۔ اس لحاظ سے ان کا ذہن گویا کمپیوٹر تھا۔ کچھ بھولتے ہی نہیں تھے۔ ہاں جن باتوں کو ضرورتاً یا مروتاً بھلانا چاہتے تھے، وہ انھیں یاد نہیں آتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا موقع آجاتا تھا اور زمانۂ بیوروکریسی کی تربیت ایسی مشکلوں کو ان کے لیے بہ حسن و خوبی آسان بنادیا کرتی تھی۔

اکیڈمی کے صدر اور چیرمین صاحبان ہمیشہ اپنے آپ کو ان کے مشوروں کا محتاج پایا کرتے تھے۔ مجلس عام کا جلسہ ہو یا کسی سب کمیٹی کا، ان کی موجودگی اچھے اچھوں کے لیے کبھی الجھن کا اور کبھی مصیبت کا سبب بن جاتی تھی۔ اختلاف کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتے تھے اور اختلاف کرتے وقت بہ طور عموم یہ نہیں دیکھتے تھے کہ یہ ہیں کون صاحب۔ چوں کہ قاعدے قانون کی تفصیلات ان کی زبان پر رہتی تھیں، اس لیے اکثر موقعوں پر لوگ برہمی اور بیزاری کے باوجود کچھ کر نہیں پاتے تھے، سامنے تو خیر کیا کہتے، پیچھے برا کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ لیکن پھر سابقہ انھی سے پڑتا تھا اور مرحوم بھی، کسی تکلف کے بغیر، پچھلی باتوں کو بھلا کر نئے سرے سے مشیر اور مددگار بن جایا کرتے تھے۔ یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آتا تھا ؎

بامن آویزشِ او، الفتِ موج است و کنار
دم بہ دم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من

میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرحوم بہت دیر تک ایسی مصروفیتوں سے اپنے کو علاحدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایسے معاملات میں حصہ لینے اور ذہنی یا عملی طور پر مصروف رہنے کا ذوقِ بے نہایت انھیں مجبور کردیا کرتا تھا۔

صباح الدین صاحب کو مشتعل کرنا شاید سب سے آسان کام تھا۔ جلد بھڑک اٹھتے تھے اور پھر گل افشانیِ گفتار کے جوہر دکھانے لگتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کو منانا بھی مشکل نہیں تھا۔ مخاطب نے ذرا اپنے انداز کو بدلا اور وہ نرم پڑنے لگے اور پھر پگھلتے چلے گئے۔ میں نے کئی بار یہ تماشہ دیکھا کہ بے طرح گرج برس رہے ہیں، اچانک ٹیلیفون آیا اور چند جملوں نے ان کی ناراضگی کو ہلکا کردیا یا محو کردیا اور وہ حسبِ معمول ان موصوف یا محترمہ کے کسی کام کو سرانجام دینے میں جی جان سے لگ گئے۔

ایسی غیر علمی مصروفیات میں جان کھپانے اور دل لگانے کا یہ نتیجہ تھا کہ سخن فہمی اور سخن سنجی کی صلاحیتیں پوری طرح اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرپاتی تھیں اور یوں ان کی شخصیت کا یہ رُخ بہت سے لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہا۔ وہ بات کی تہہ تک خوب پہنچتے تھے مجھے فسانۂ عجائب کی تدوین کے دوران اس کا بارہا اندازہ ہوا۔ ایک بات اسی سلسلے کی یاد آئی۔ فسانۂ عجائب کے دیباچے میں ایک جگہ یہ عبارت ہے:-

"اور تو اور، شہدا پیر بخارا کا، ٹماسا، سید الشہدا کا شیدا..... یہ اک رنگی مزاج میں سمائی، تمام سن جُوا کھیلا، دُوے کے داؤں پر اڈّھی نہ لگائی۔ ایک روپیہ ہوا خواہ سو، کہہ دیا پَو۔ سیکڑوں داؤں سنجے گئے، منھ سے نہ پنجے گئے۔..."

ایسی اصطلاحوں سے میں پوری طرح باخبر نہیں تھا، جب کہ مرحوم کے لیے یہ اجنبی نہیں تھیں۔ میں نے خط لکھا۔ مفصل جواب آیا جس میں اس کی بھی صراحت تھی کہ پیر بخارا کا وہ شہدا، آخر سیکڑوں بار داؤں خالی جانے کے باوجود، کسی اور عدد پر رقم کیوں نہیں لگاتا تھا۔ مرحوم نے صحیح طور پر وضاحت کی تھی کہ دُوے (دُگّی، مُراد ہے دو) پر تو وہ یوں نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ "یک رنگی" کے خلاف ہوتا۔ تین اور چار کے عدد اُس معاشرے میں، مذہبی نسبت کے لحاظ سے گویا برکت سے خالی فرض کر لیے گئے تھے۔ بس پانچ کا عدد (پنجتن کی رعایت سے) ایسا تھا جو ہر لحاظ سے اس کے کام کا تھا، یوں وہ ہر بار اسی پر داؤں لگاتا تھا۔

"تلفظ اور تذکیر و تانیث کے معاملے میں وہ "چلن" کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ اساتذہ کے مختارات کو مانتے تھے بشرطیکہ وہ اساتذہ لکھنوی ہوں۔ ایک بار ملاقات ہوئی تو سلام دعا کے بعد ہی ذرا تیکھے لہجے میں پوچھنے لگے:

"کیوں صاحب! "پتنگ" مذکر ہے یا مؤنث۔۔؟"

مجھے کچھ زیادہ حیرانی نہیں ہوئی، سمجھ گیا کہ کسی صاحب نے گفتگو میں اس لفظ کو بہ تانیث استعمال کیا ہوگا؛ بس تب سے بھرے بیٹھے ہیں (یہ ان کا خاص انداز تھا) میں نے تفریحاً کہا کہ

"اب تو یہ زیادہ تر بہ تانیث سننے میں آتا ہے۔"

بس بپھر گئے، بہت ناراض ہوئے۔ میں خاموش رہا ذرا دیر کے بعد میں نے کہا،

"یہ آپ پتنگ کے پیچھے اس طرح پڑ گئے ہیں کہ آج چائے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔!" فوراً معذرت کی اور ساری بحث کو بھلا کر اہتمام میں لگ گئے۔ چائے پینے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اب وہ بحث کو ختم کر چکے ہیں اور سکون کے ساتھ بات سُن لیں گے، تو میں نے کہا کہ:

"پتنگ ہے تو مذکر، دہلی اور لکھنؤ دونوں مقامات کے اساتذہ نے اسے مذکر ہی استعمال کیا ہے، لیکن اب کچھ دنوں سے زبانوں پر بہ تانیث بھی آنے لگا ہے، اب اس تبدیلی کو بھی تسلیم کر لینا چاہیئے۔"

بس پھر کیا تھا، بھڑک اُٹھے اور کہنے لگے، "تو گویا اب آپ بھی "پتنگ اڑ رہی ہے" کہیں گے اور لکھیں گے۔؟"

میں نے فوراً کہا "نہیں جناب! میں تو "پتنگ اڑ رہا ہے"— کہوں گا اور لکھوں گا، لیکن کوئی شخص اگر "پتنگ اڑ رہی ہے" کہے گا، تو میں اسے غلط نہیں کہوں گا۔ کراچی میں ترقی اُردو بورڈ کا جو لغت مرتب ہو رہا ہے، اس کی تیسری جلد میں اسے "مذکر، مؤنث" اسی بنا پر لکھا گیا ہے۔"

کہنے لگے: "کراچی والے جو چاہے لکھیں، آپ کسی استاد کی سند پیش کیجئے۔ ایسے استاد کی جو معتبر ہو، یعنی اہلِ زبان ہو۔ ایرے غیرے کی بات کا اعتبار نہیں۔" غرضکہ وہ دیر تک ناراضی کا اظہار کرتے رہے۔

رفیع احمد خاں سے کون واقف نہیں ہوگا (نوواردانِ بساطِ ادب سے بحث نہیں) ان سے اپنے مراسم کا احوال ایک بار تفصیل سے سنایا تھا۔ رفیع احمد خاں سینیئر تھے، مگر انھوں نے صباح الدین صاحب کو کبھی جونیئر نہیں سمجھا۔ رفیع احمد خاں "شیوۂ رندانِ بے پروا خرام" کے قائل تھے اور اسی کے ذیل میں "طوافِ کوئے ملامت" سے بھی بیگانہ نہیں تھے۔ صباح الدین صاحب نے بھی ان کے ساتھ ان مقامات کی سیر کی، وہاں کے آداب و اطوار کو دیکھا اور سمجھا، مگر اس کی صراحت کر دی کہ ایسے سارے مقامات پر بیگانہ آشنا کی حیثیت سے رہے اور اکبرؔ کے اس مصرعے کے مصداق بنے رہے ؎

میرا حصّہ دُور کا جلوہ

رفیع احمد خاں کے کلام بلاغت نظام کا بڑا حصّہ صباح الدین صاحب کے پاس تحریری طور پر محفوظ تھا۔ آخر میں وہ اس پر تیار ہو گئے تھے کہ اس کلام کو مرتب کر کے دے دیں، جسے "نسخۂ بیاضِ مسیحا" کے طور پر عکسی صورت میں باذوق حضرات تک پہونچا دیا جائے — شمس الرحمان فاروقی اور ڈاکٹر نیر مسعود کی کوششوں کو اس میں بہت کچھ دخل تھا (معلوم نہیں وہ ذخیرہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے)۔ ان تفصیلات کو انھوں نے خود مجھ سے بیان کیا تھا۔

لکھنؤ کی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں وہ سرگرمی سے حصّہ لیا کرتے تھے۔ اکثر مجلسوں میں بھی وہ بہت خشوع و خضوع کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں شیعہ سنّی اختلافات بارہا جھگڑوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتے رہتے تھے، مگر صباح الدین صاحب ایسے قضیے قضیوں سے ہمیشہ الگ رہتے تھے۔ وہ بعض اختلافات تو تسلیم کرتے تھے مگر صرف علمی سطح پر، عملی طور پر ان کے اظہار کے مخالف تھے۔ ان کے بعض سنّی احباب طنزاً ان کو "آدھا سنّی" یا یوں کہئے کہ "آدھا شیعہ" کہا کرتے تھے۔ مرحوم نے کبھی اس کا برا نہیں مانا۔

ایک زمانے میں نیاز فتحپوری، مسعود حسن رضوی، جعفر علی خاں اثر

جیسے اساطینِ زبان و ادب سے لکھنؤ کی محفلوں کی رونق رہتی تھی۔ وہ ایسی بہت سی محفلوں میں شریک رہے تھے۔ اس زمانے کی بہت سی ایسی تفصیلات بیان کرتے تھے جن کو سن کر اس زمانے کی ادبی اور علمی محفلوں کی فیض بخشیوں کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ آنند نرائن ملا کی وضعداری، معقولیت اور بعض اعتبارات سے ان کی بے لوچ شخصیت کی بہت تعریف کرتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ان اساطین کے انداز و اطوار ان کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے اور ان محفلوں کی پرچھائیاں ان کے ذہن کے افق پر کانپتی رہتی تھیں، مگر آخری زمانے میں جب ایسے سلسلے ادیب و شاعر اور عالم و زبان داں یا تو اللہ کو پیارے ہو گئے تھے یا پھر لکھنؤ سے باہر چلے گئے۔ اکثر و بیشتر ان کا سابقہ پڑتا تھا ایسے عافیت آشوب لوگوں سے جن کی خفیف الحرکاتی اور بے تکی کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کا مزاج ان سب باتوں سے میل نہیں کھاتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ان سب سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا میں مگن رہنے کے خوگر نہیں تھے۔ وہ

ع ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

کے قائل تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر شکوہ بہ لب رہتے تھے لیکن نسبتوں سے قطع تعلق نہیں کر پاتے تھے۔

ان کے بڑھاپے اور جوانی کے دنوں میں کچھ ایسا فرق نہیں پایا گیا، وہ ہر زمانے میں بے حد و بے حساب معروف رہے اور یہ معروفیت فرائضِ منصبی سے زیادہ محفل آرائی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کئی بچوں کے باپ تھے لیکن بچوں کی پڑھائی لکھائی اور تربیت کے سارے فرائض بیوی کے ذمے تھے۔ خدا سب کو ایسی بیویاں دے۔

صباح الدین صاحب ایک زمانے میں رات گئے گھر آیا کرتے تھے۔ دن کو تو دفتر میں رہتے ہی تھے۔ مجھ سے ایک بار یہ واقعہ بیان کیا کہ امتحان کا زمانہ تھا، لڑکی یہ کہہ کر سو گئی کہ اُسے بارہ بجے کے ذرا بعد اٹھا دیا جائے، امتحان کی تیاری کے سلسلے میں پڑھنا ہے۔ اس رات اتفاق سے صباح الدین صاحب بارہ بجے کے قریب گھر آ گئے۔ لڑکی نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پھر رونے لگی۔ پوچھنے پر اس نے ماں سے کہا: "چار بج گئے ہیں آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں، اب میں کل کے پرچے کی تیاری کیسے کروں گی۔؟"

ماں نے کہا کہ ابھی تو بارہ بجے ہیں۔ لڑکی نے کہا: "بارہ کیسے بجے ہیں، ابا تو آ گئے، چار بجے ہوں گے۔" بہت مشکل سے اس بچی کو یقین آیا کہ ابھی چار نہیں بجے ہیں۔ ابا (غلطی سے) آج پہلے آ گئے ہیں۔

مرحوم ہی کا سنایا ہوا ایک واقعہ اور یاد آیا۔ کسی رسالے کی فرمائش پر صباح الدین صاحب نے بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ایک مضمون لکھا اور بہ قول خود مختلف کتابوں اور رسالوں میں لکھی ہوئی باتیں عمومی انداز سے مرتب کر دیں۔ وہ رسالہ گھر پر بھی آیا۔ بیگم صاحبہ نے بھی اسے پڑھا، کہا کچھ نہیں۔ دوسرے دن دیکھا کہ بیگم صاحبہ پھر اسی مضمون کو پڑھ رہی ہیں۔ مرحوم نے خلافِ معمول لہجے میں ضرورت سے زیادہ نرمی شامل کر کے پوچھا:

"کیا مضمون بہت پسند آیا؟"

جواب ملا: "میں تو یہ دیکھ رہی تھی کہ آپ لکھنے میں بھی جھوٹ بول لیتے ہیں۔"

دیر تک مرحوم "لکھنے میں بولنے" کا لطف لیتے رہے۔

لکھنؤ کے متعدد مشہور افراد سے متعلق بہت سی ایسی معلومات ان کی یادداشت میں محفوظ تھیں جو تحریری صورت میں شاید ہی کہیں موجود ہوں۔ بہت سے واقعات ان کے چشم دید تھے یا وہ ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان میں شخصی اختلافات کی تفصیلات قابلِ ذکر حیثیت رکھتی تھیں۔ اب اتنی باتیں یک جا طور پر شاید ہی کسی کے ذہن میں ہوں۔

لکھنؤ کے بہت سے ادبی و غیر ادبی ہنگاموں اور قصوں قضیوں کی جزئیات ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں۔ بہت سی نئی پرانی عمارتوں کے متعلق انہیں بہت کچھ معلوم تھا۔ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کے متعلق وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ لکھنؤ ان کا آبائی وطن نہیں تھا، اس کے باوجود وہ لکھنؤ کے طرفدار اور پرستار تھے اور اس قدر کہ بلا تکلف فدائیوں کے ذیل میں ان کا نام شامل کیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب، زبان، آداب، رسم و رواج۔ وہ ان سب کے پرستار تھے اور

اس سلسلے میں ذرا سا بھی اختلاف برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یو.پی اُردو اکیڈمی کی طرف سے نیازؔ اور جوشؔ سے متعلق دو سیمینار ہوئے۔ ان دونوں اشخاص سے متعلق وہ بہت سی ایسی باتیں بتاتے تھے جو شاید کم لوگوں کو معلوم ہوں گی۔ نیازؔ سے متعلق جو مضمون انھوں نے پڑھا تھا اس میں وضاحت کے ساتھ اس کا اعتراف کیا تھا کہ نیازؔ فتح پوری سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ نیازؔ اور مجنوںؔ نیازی میں جو اختلاف آخر میں پیدا ہو گیا تھا، اس کی اہم تفصیلات سے وہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر طور پر واقف تھے۔

وضعداری ان کے مزاج کا حصہ تھی اور اس کے نتیجے میں ان کے وقت کا بڑا حصہ دوسروں کے کاموں کو سرانجام دینے میں صرف ہوتا تھا۔ مثلاً ایک بار ملاقات ہوئی تو اس زمانے کے صدر اکیڈمی سے اپنے اختلافات بیان کرنے لگے اور اچھی خاصی بیزاری کا اظہار کیا۔ اتفاق سے میرے سامنے صدر صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ کسی فرمائش کی تعمیل کا معاملہ ہے میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ کہنے لگے کہ ان کی ایک کتاب چھپوانا ہے، اسی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ ابھی تو آپ برہم تھے اور بہت۔ کہنے لگے کہ پرانے مراسم ہیں، انکار نہیں کر سکتا۔ اختلاف اپنی جگہ، یہ کام اپنی جگہ۔

ایک زمانے میں جب لکھنؤ جانا ہوتا تھا تو یہ سوچنا پڑتا تھا کہ کہاں کہاں جانا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نیازؔ صاحب موجود تھے حکیم صاحب عالم تھے، اثرؔ صاحب اور پروفیسر مسعود حسن رضوی تھے، سراجؔ اور قدرؔ زندہ تھے اور متعدد ایسے حضرات تھے جن سے ملنا یا جن کے گھر پر حاضری دینا حصولِ مسرت کا بہترین ذریعہ تھا۔ اس کے بعد وہ دن بھی آئے جب ایسے لوگوں سے لکھنؤ خالی ہو گیا اور لکھنؤ جا کر بار بار یہ سوچنا پڑتا تھا کہ اب کس سے ملنا ہے اور کہاں جانا ہے۔

پرانے لوگوں میں، جنھیں یادگارِ زمانہ کہا جا سکے، میرے لیے صباح الدین صاحب کی ذات وجہِ تسکین بن کر رہ گئی تھی۔ ان سے مل کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ لکھنؤ کا پرانا انداز ابھی زندہ ہے۔ ایک ان کے گھر بیٹھ کر پورے لکھنؤ کے بہت سے واقعات، ہنگامے، اختلافات شخصی معرکہ آرائیاں، ان سب کی ضروری تفصیلات معلوم ہو جایا کرتی تھیں اور جب پچھلے دنوں کا تذکرہ آجاتا تھا تو پرانے واقعات کی بہت سی جزئیات نظر کے سامنے آجایا کرتی تھیں۔ اب پھر سے لکھنؤ میں مجھے ایک بھی ایسی شخصیت دکھائی نہیں دیتی جو ویسی جامع صفات ہو۔ اس قدر زندہ دل، اس قدر فعّال، اس قدر وضعدار اور اس قدر مخلص و غمگسار ہو اور جو ہمہ وقت دوسروں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے اس طرح آمادہ و مستعد رہ سکے۔ جو میلاد کے جلسے اور محرم کی مجلس میں یکساں دلچسپی اور تعلق خاطر کے ساتھ شرکت کرنا ضروری سمجھتا ہو اور انداز لکھنؤ کی پرستاری جس کے انداز فکر کا حصہ ہو اور عقیدت کے درجے میں داخل ہو چکی ہو۔

□□

"میرے کرم فرما اور دیرینہ مشفق صباح الدین عمر کا حادثۂ وفات میرے لیے ایک ایسا دل شکن واقعہ ہے جس پر اظہارِ افسوس کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ وہ ایک مشّاق صحافی، اُردو کے تجربہ کار خادم، کہنہ مشق اہلِ قلم، دکھ درد میں دوستوں کے کام آنے والے بہت اچھے دوست لفظ و معنی کی باریک بینیوں کے شناسا، معلوماتی ادبی اور سماجی مضامین لکھنے والے کامیاب اہلِ قلم اور میرے حال پر توجہ کرنے والے، میرے ایسے بزرگ تھے جن کو بھولنا آسان نہیں ہے۔

میں مصروفیتوں کے ہجوم میں فرصت تلاش کر رہا ہوں کہ مرحوم پر ایک بھرپور مضمون لکھ سکوں۔"

——— کاظم علی خاں
لکھنؤ

آہ! صباح الدین عمرؔ

سمائی دل میں وہ کیا، چل دیا صباح الدین — اُٹھو اے عمرؔ! کہ جہاں سے اُٹھا صباح الدین
کہیں بزرگ، کہیں نوجواں، کہیں بالک — عجیب شخص تھا یارو! مرا صباح الدین
ہو کوئی دوست کہ دشمن، ہو غیر یا اپنا — کسی سے رکھتا نہ تھا فاصلا صباح الدین
رُکا تو چشمِ زدن میں کھلا دیئے گلشن! — چلا تو صورتِ بادِ صبا صباح الدین
ہر اک کا مونس و ہمدم، ہر اک کا محرمِ راز — تھا بے نواؤں کے دل کی نوا صباح الدین
طریقِ زندگی و رسمِ دوستی کیا ہے — فصیلِ شہر پہ سب لکھ گیا صباح الدین
وہ امن جو کہ ہے حفظِ دوستاں تا عمر — ہر ایک جبر سے لڑتا رہا صباح الدین
یقین ہے کہ وہاں سے بھی روشنی دے گا — کہانیوں کی تہوں میں چھپا صباح الدین
مثال کیا دے کوئی اس کی بے مثالی کی — وہ عشق تم کو جو اُردو سے تھا صباح الدین
منا منا کے ہم ایسوں کو یار، آخر کار — تمہیں بھی آ ہی گیا روٹھنا صباح الدین

عطا کرے تمہیں باغِ عدن وہاں بھی خدا
عمرؔ کے دل کی یہی ہے دعا صباح الدین

عمر انصاری
۲۰۔ امین آباد پارک، لکھنؤ

پروفیسر ولی الحق انصاری
دار الامان، ۲۷۔ فرنگی محل، لکھنؤ

....وہ اکثر یاد آتے ہیں

۲۳ نومبر ۱۹۹۱ء کو بعد فجر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ریسیور اٹھانے پر پتہ چلا کہ صلاح الدین عثمان صاحب مجھ سے مخاطب ہیں. چند لمحے توقف کے بعد انھوں نے فرمایا:

" بھائی جان کا رائے بریلی میں انتقال ہوگیا ہے اور بعد ظہر وہیں تدفین ہوگی "

یہ جانکاہ خبر اگر کسی اور ذریعہ سے ملی ہوتی تو کسی حالت میں بھی اس پر یقین نہ آتا، اس لئے کہ دو روز قبل ہی میری ان سے طویل ملاقات رہی تھی جس میں حسب معمول ڈانٹ پھٹکار، محبت، پیار، دھمکی اور خوشامد کے انداز میں گھنٹوں ان سے اہم اور غیر اہم موضوعات پر باتیں ہوتی رہی تھیں، جن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ۱۹۹۵ء تک ہر سال ان کے کچھ ایسے پروگرام تھے جن میں ان کی موجودگی ضروری ہوگی۔ البتہ اس سال کے بعد انھیں دنیا میں کرنے کے لئے کچھ نہ بچے گا اور تب وہ اپنے رب کے سامنے جانے کی تیاری کریں گے اور اس سلسلے میں انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس سال کے بعد کے تین برسوں تک کی ان کی وفات کی تاریخیں نکال دوں ــــــ لیکن کیا معلوم تھا کہ فقط دو روز کے بعد وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے.

صباح الدین عمر صاحب سے میں اس وقت سے واقف تھا جب مسلم لیگ کے مقابلے میں انھوں نے اپنے چند ساتھیوں کے تعاون سے آزاد مسلم لیگ بنائی تھی اور جناح صاحب کے لکھنؤ آنے کے موقع پر ان کا سیاہ جھنڈوں سے استقبال کرنے کے سلسلے میں انھیں مسلم لیگی حضرات کے تشدد آمیز غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا تھا.

محکمۂ اطلاعات میں ان کی ملازمت اور اس سلسلے میں میرے عزیز مولوی فرحت اللہ صاحب سے ان کی دوستی نے مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیا اور ان کی عجیب و غریب اور متضاد عناصر سے تربیت یافتہ شخصیت مجھے مرعوب کیے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن اس وقت میرے اور ان کے بزرگی اور خردی کے تعلقات تھے. صباح الدین صاحب کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع اردو اکاڈمی کے قیام کے بعد ملا. جب یہ برسوں سے قائم بزرگی اور خردی کے تعلقات دوستانہ تعلقات میں تبدیل ہوگئے اور اس زمانے میں مجھے واقعی ان کی باغ و بہار طبیعت کو صحیح طور سے سمجھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں ان سے میرے اختلافات بھی ہوئے، لڑائیاں بھی ہوئیں، لیکن بنیادی دوستانہ تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ ہم دونوں لڑتے تھے، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے تھے اور یہ عہد کیا جاتا تھا کہ آئندہ بات چیت بند رہے گی ــــ لیکن دوسرے ہی روز دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم میں کبھی لڑائی ہوئی ہی نہ تھی۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ کسی کا بھی ان سے لڑنا ممکن نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے انھیں دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی حرکتوں اور مصاحبت سے باز نہ آئے تو بات چیت بند اور تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ جس پر ان کا ردعمل صرف یہ ہوتا تھا کہ ــــــ

" تم سے بات ہی کون کرے گا میں دار الامان (میرا مکان) جاؤں گا، کچھ کھانے پینے کو منگواؤں گا، کھاؤں پیوں گا اور چلا آؤں گا" کیا ایسے شخص سے کسی کی لڑائی ہو سکتی ہے۔ ؟

صباح الدین صاحب کی شخصیت ہمیشہ متنازعہ رہی ہے اور اسکی وجہ یہ تھی کہ جس بات کو وہ غلط سمجھتے تھے اس پر اپنے اختلاف کا برملا اظہار کر دیا کرتے تھے خواہ وہ بات ان کے دوست کی ہو یا مخالف کی اور اس بیباکانہ تنقید نے ان کے مخالفین بھی پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن ان کی لفظی یا قلمی لڑائی اصولوں کی بنیاد پر ہوتی تھی، اسکے باوجود لڑنے والوں سے ان کی بنیادی دوستی برقرار رہتی تھی۔

میری ایک کتاب پر اردو اکاڈمی سے اشاعتی مدد منظور ہوئی۔ لیکن کتاب چھپنے پر جب اکاڈمی میں داخل کی گئی تو بحیثیت سکریٹری صباح الدین صاحب کو اس پر ایک اعتراض ہوا اور جب تک کتاب کا ایک فارم تبدیل نہ کر دیا گیا۔ انھوں نے امدادی رقم مجھے ملنے نہ دی۔ مرزا جعفر حسین مرحوم سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے لیکن ان کی مالی امداد کی درخواستوں میں انھوں نے سقم پایا اور تمام کوششوں کے باوجود مرزا صاحب مطلوبہ رقم اکاڈمی سے حاصل نہ کر سکے۔ پروفیسر رضوان علوی کو وہ اپنا چھوٹا بھائی کہا کرتے تھے لیکن ان کے اردو اکاڈمی کے چیرمین ہونے کے بعد ان کے خلاف جو تحریک چلی اس کے روح رواں صباح الدین صاحب ہی تھے اسلئے کہ ان کا کہنا تھا کہ رضوان صاحب وہ شرائط پوری نہیں کرتے جو اردو اکاڈمی کے چیرمین کے لیے لازمی ہیں۔ اس تمام کارروائی کے باوجود ہر صبح کو رضوان صاحب اور صباح الدین صاحب امین آباد پارک میں ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے دیکھے جاتے تھے اور یہ سلسلہ مرحوم کی زندگی کے آخری دنوں تک برقرار رہا۔

عراق پر امریکی حملہ کے سلسلے میں مجھ میں اور صباح الدین صاحب میں اختلاف تھا اور میرے چند مراسلوں کے جواب میں انھوں نے طویل مراسلے لکھے لیکن مروت کے طور مجبور ہو کر انھیں یہ مراسلے "حق گو" کے نام سے لکھنا پڑے۔ پہلے ہی مراسلے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ لکھنے والا کون ہے۔ اور جب اپنے مخصوص انداز میں ہم دونوں کی گفتگو ہوئی تو بند الفاظ میں انھوں نے اقرار تو کر لیا لیکن 'قومی آواز' کے ایڈیٹر، میرے عزیز عثمان غنی کو انھوں نے فوراً تنبیہ کی کہ انھیں یہ راز مجھ پر افشا نہ کرنا چاہیئے تھا کہ مراسلہ نگار کون ہے۔ لیکن عثمان غنی کے جواب سے وہ فوراً مطمئن ہو گئے کہ ان کی طرف سے مراسلہ نگار کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عمر انصاری کے مکان پر جب چند احباب نے ان کی کھنچائی شروع کی تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مزاحیہ جملوں سے سب کا مقابلہ کرتے رہے۔

چودھری وجاہت علی سندیلوی کے ایک مضمون کے چند الفاظ پر انھوں نے گرفت کی جن میں لفظ "دار الخلافت" بھی تھا اور بے دھڑک ان کے خلاف مراسلہ نگاری شروع کر دی اور لطف یہ ہے کہ مراسلے وجاہت صاحب کے داماد خواجہ انور الدین کے مکان پر لکھے جاتے اور ان کی بیٹی صبیحہ انور کو سنا کر 'قومی آواز' بھیجے جاتے تھے۔ صباح الدین صاحب کی طبیعت کے ان متضاد عناصر نے ان میں وہ دلکشی پیدا کر دی تھی کہ کوئی شخص بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

رشید حسن خاں صاحب جب اردو اکاڈمی کے ممبر ہوئے تو چند ہی ملاقاتوں میں غالباً وہ رشید صاحب کے لکھنؤ میں سب سے عزیز دوست ہو گئے۔ ان کی شخصیت کے دلچسپ اور متضاد پہلوؤں سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ "صباح الدین صاحب! آپ ہجو کے لئے بہترین ماڈل ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس صنف میں آپ پر طبع آزمائی کی جائے"۔

وہ اس تجویز پر انتہائی خوش ہوئے اور جب چند اشعار ان کی خدمت میں پیش کیے گئے تو ہر محفل میں انھوں نے انھیں اس انداز میں سنانا شروع کیا کہ گویا وہ ان کی مدح میں ہیں اور اس کے بعد یہ سلسلہ خاصا طویل ہو گیا اور اس کے کچھ سال کے بعد بھی اپنی وفات سے تقریباً ایک سال قبل انھوں نے اسے پھر سے شروع کیا اور جو نتائج برآمد ہوئے انھیں ظہور رضوی صاحب کی اعانت سے انھوں نے "خارزار ہجو" کے عنوان سے کتابی شکل میں ترتیب دے کر میری مخالفت کے باوجود تمام احباب میں تقسیم کیا اور اسی سلسلے میں ان کی ذات میں چھپا شاعر پردے سے باہر آ گیا۔ اور احباب میں تقسیم ہونے والی ایک ہجو کے متعلق انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ خود انھیں کی لکھی ہوئی ہے جو مجھے اور عمر انصاری دونوں کو اس نیت سے بھیجی گئی تھی کہ ہم دونوں اسے اپنے خلاف سمجھیں اور اس کا جواب دے کر صباح الدین صاحب کے اس مقصد

کو پورا کریں کہ گزشتہ ایام کی طرح لکھنؤ میں ایک تازہ معرکۂ سخن گرم ہو (اور یہ ہوا بھی جس کے نتیجے میں "خارزارِ ہجو" وجود میں آیا)۔ ان کی یہ ہجو ذیل میں درج کی جا رہی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ شعر کے میدان میں بھی ان کی صلاحیتیں کچھ کم نہ تھیں ؎

سُن اے شاعرِ بے ہُنر یہ سخن
جسے ہجو کہتے ہیں نازک ہے فن

عرب اور ایران کے باکمال
رہے راہ میں اس کے شمشیر زن

مقابل نہ آتا تھا ان کے کوئی
وہ تھے عرصۂ ہجو کے صف شکن

بالآخر یہ فن ہند میں آگیا
یہاں بھی رہے شہسوارانِ فن

یہاں بھی رہا ہجو کا دبدبہ
دکھاتی رہی اپنا وہ بانکپن

بہت معرکے پیش آئے لیے
بہت ہند میں اس نے جھیلے ہیں رن

یہاں گرچہ تھا ایک سے بڑھ کے ایک
مگر ان میں سودا تھا شاہِ زمن

ہوئی اس کی شہرت در اطرافِ ہند
وہ دہلی ہو یا لکھنؤ یا دکن

تھی اشعار میں اس کے ایسی مہک
کہ شرمندہ ہو جس سے مشکِ ختن

قلم سے لیا اس نے تیشے کا کام
وہ تھا ہجو کے کوہ کا کوہکن

بلندی عطا کی غرض ہجو کو
بجا ہے اسے کہیے فخرِ وطن

نہیں رہ گیا ہجو کا اب وہ زور
مگر پھر بھی باقی ہے اس کا چلن

ولیکن ہے مردوں کی وہ رزم گاہ
یہاں راہ پاتے نہیں گلبدن

یہاں خارزاروں میں کھلتے ہیں پھول
نہیں ہے یہ میدانِ زاغ و زغن

نہیں ہنہناتے ہیں گھوڑے یہاں
نہیں ہے یہ بھانڈوں کی اک انجمن

نہ ڈھولک بجلتے ہیں زنخے یہاں
نہ کہتا ہے شاعر انھیں جانِ من

کہاں وادیِ ہجو میں تو گھسا
اٹھائے گا آخر میں رنج و محن

مقابل نہ آ اوستادوں کے تو
مقدر میں ہے ورنہ دار و رسن

کہاں آفتاب اور ذرہ کہاں
کہاں تو کہاں صاحبِ فکر و فن

نہ ڈھولک بجا اور نقلیں نہ کر
گویا نہ بن اور ہجنیا نہ بن

نہ آ محفل میں جو رُو کے منھ کو چھپا
دکھا کچھ تو مردوں میں مردانہ پن

بہت ہو چکی خود فریبی بہت
خرافات پر اپنی اتنا نہ تن

بہت ہرزہ گوئی کی اب بند کر
بہت بک چکا اب نہ دیوانہ بن

نصیحت پہ سعدی کی اب کر عمل
نہ جھنجھلا نہ ما تھے پہ آئے شکن

"نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن"

صباح الدین صاحب کی زبان سے میں نے کبھی کسی کام کرنے کے سلسلے میں انکار نہیں سُنا۔ وہ اپنے کام چھوڑ کر دوسروں کے کاموں میں اس طرح منہمک ہو جاتے تھے گویا وہ انھیں کے کام ہوتے تھے۔

باوا کرشن گوپال مغموم، ایک پنجابی شاعر، لکھنؤ میں بحیثیت ایک اجنبی وارد ہوئے۔ وہ یہاں اپنا ایک مجموعۂ کلام چھپوانا چاہتے تھے۔ کسی نے انھیں صباح الدین عمر صاحب کا نام بتا دیا اور اس کے بعد صباح الدین صاحب ان کا مجموعۂ کلام چھپوانے میں اس طرح منہمک ہوئے گویا وہ خود انھیں کا مجموعہ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے پچاسوں چکر رضی صاحب خوشنویس کے یہاں لگائے۔ خود کاغذ خریدا اور بیسیوں چکر نامی پریس میں لگائے اور لطف یہ کہ اس تمام دوڑ دھوپ میں مغموم صاحب ان کے یہاں کم اور صباح الدین صاحب ان کے ہوٹل زیادہ جایا کرتے تھے۔

میری معلومات کے مطابق آنند نرائن ملا کے مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" کی طباعت میں بھی کتابت کی منزل سے لے کر کتاب کے بِکوانے کی منزل تک صباح الدین صاحب شریک رہے۔ علی جواد زیدی صاحب صباح الدین صاحب کے "ہمدمِ دیرینہ" تھے۔ زیدی صاحب کے لکھنؤ آنے کے بعد ان کی جو بھی کتابیں شائع ہوئیں ان کی طباعت صباح الدین صاحب کے ذریعہ ہی ہوئی اور اس سلسلے میں ان کا آخری کام نسیم اقتدار علی کے مقالۂ تحقیق کی اشاعت ہے صباح الدین صاحب یہ تمام خدمات بے لوث انجام دیتے رہے اس لیے کہ یہ ان کی طبعی بھی تھی۔

کتابت کے سلسلے میں ان کی نگاہ انتہائی گہری تھی۔ کتابت کی وہ معمولی سے معمولی غلطی بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کے سب ہی اچھے کاتب ان سے گھبراتے تھے۔ دوسروں کے کام انجام دینے کے سلسلے میں صباح الدین صاحب کی "یادگارِ انیس کمیٹی" کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ یہ کمیٹی استادِ محترم

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے بنائی تھی اور صباح الدین صاحب کو اس کا سکریٹری مقرر کیا تھا۔ اس کمیٹی کے کاموں کی انجام دہی میں صباح الدین صاحب کا نام سرِ فہرست رہا۔

صباح الدین صاحب لکھنؤ کے اصل باشندہ نہ تھے لیکن ان کی تمام عمر لکھنؤ میں گزری اور ہمیشہ یہاں کی ثقافتی اور ادبی محفلوں کی روحِ رواں بنے رہے۔ امیر حسن صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے اپنے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ایک ثقافتی انجمن "اودھ کلچرل ایسوسی ایشن" قائم کی تھی جس میں راقم الحروف، پروفیسر مرزا رفیع اور دیگر حضرات شامل تھے۔ صباح الدین صاحب کو بھی اس کا ممبر بنایا گیا اور اس انجمن کے وہ سب سے زیادہ فعال ممبر ثابت ہوئے۔ امیر حسن صاحب کے تبادلہ کے بعد اس انجمن کے کام سست پڑ گئے لیکن سریندر موہن صاحب آئی۔ اے۔ ایس (موجودہ اسپیشل سکریٹری ٹرانسپورٹ) اور کچھ دوسرے دوستوں نے ایک دوسری انجمن "ہم نوائے لکھنؤ" کے نام سے قائم کی۔ صباح الدین صاحب اس انجمن کے بھی سب سے زیادہ سرگرم رکن رہے۔ ایسی تمام انجمنوں کے روحِ رواں ہونے کے علاوہ صباح الدین صاحب کی دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز اترپردیش اردو اکاڈمی تھی۔ اس اکاڈمی کا وجود ہی صباح الدین صاحب کا مرہونِ منت ہے۔ ایک میز اور ایک کرسی سے بحیثیت سکریٹری انھوں نے اس اکاڈمی کی بنیاد ڈالی اور اسے انھوں نے دوسرے صوبوں میں بعد کو قائم ہونے والی اکاڈمیوں کے لیے ایک ماڈل بنا دیا۔ اس اکاڈمی کا کانسٹی ٹیوشن بھی انھوں نے ہی بنایا تھا۔ اس اکاڈمی سے انھیں اتنی دلچسپی تھی کہ اپنا تمام وقت وہ وہاں ہی صرف کیا کرتے تھے۔ اس حد تک کہ ان کے عزیزوں کو بھی یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ اکاڈمی سے منسلک رہے اور اس کی پالیسیاں متعین کرنے میں مختلف صدور اور چیرمینوں کو نہ صرف مشورے دیتے رہے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔ اکاڈمی کی کارکردگی کے سلسلے میں مختلف حضرات سے ان کے اختلافات بڑھ کر مخالفتوں کی شکل اختیار کر گئے لیکن ان کے احباب اور مخالفین میں کوئی ایسا نہیں تھا جو انھیں اکاڈمی کے لئے Indispensable نہ سمجھتا ہو۔ افسوس ہے کہ اپنے آخری زمانے میں انھیں اکاڈمی سے بے دخل ہونا پڑا لیکن ان کی شگفتہ طبیعت نے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھائی ہوئی اس اکاڈمی سے بے دخلی کو بھی بہت ہی اسپورٹنگ انداز میں لیا اور اس کے بعد بھی اردو اکاڈمی کا اگر کوئی کام ان کے سپرد ہوتا تھا تو وہ اس کی انجام دہی سے انکار نہ کرتے تھے۔

صباح الدین صاحب کے حلقۂ احباب میں عمر کا کوئی تعین نہ تھا ان کے بڑے بھی ان کے دوست تھے، ان کے ہم عمر بھی ان کے دوست تھے، ان کے بیٹوں کے ہم عمر بھی ان کے دوست تھے اور ان کے پوتے نواسوں کے ہم عمروں سے بھی ان کا یارانہ تھا۔ اشتیاق عباسی صاحب، ان کی بیگم بیگم اختر، آنند نرائن ملا صاحب اور رفیع احمد خاں صاحب' وہ حضرات تھے جنھیں وہ اپنا بڑا مانتے تھے۔ لیکن ان حضرات کے سامنے بھی ان کی چہلیں جاری رہتی تھیں۔ رفیع احمد خاں صاحب ایک انتہائی زندہ دل شخص اور ایک مخصوص انداز میں شعر کہنے والے تھے۔ رندی کے میدان میں وہ صباح الدین صاحب کے پیرِ مغاں تھے۔ لیکن اس کے لیے خاں صاحب نے کچھ اصول متعین کر دیے تھے اور صباح الدین صاحب نے ان کی حدوں سے کبھی تجاوز نہ کیا۔ خاں صاحب کے کلام سے لطف اندوز ہونے والے ہر طبقے کے لوگ تھے لیکن ان کے کلام کے جامع صرف صباح الدین عمر صاحب ہی تھے۔ غالباً صباح الدین صاحب کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عمر کی آخری منزل پر پہونچ گئے ہیں چنانچہ اپنی وفات سے چند مہینے قبل انھوں نے مخصوص احباب کی ایک محفل منعقد کی اور رفیع احمد خاں صاحب کے کلام کو اپنی آواز میں باقاعدہ طور رضوی صاحب کو ٹیپ کرایا اور اس طرح ان کی وفات کے بعد بھی یہ جواہر پارے محفوظ ہیں۔

اشتیاق عباسی صاحب کے یہاں عمر صاحب کی بیٹھک روز ہوتی تھی اور خود بقول ان کے اگر وہ ڈرتے تھے تو صرف دو خواتین سے — ایک بیگم اختر صاحبہ اور دوسری بیگم قدسیہ ہاشمی صاحبہ۔ بیگم اختر سے ان کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ اس خاتون نے زمانۂ رندی میں ان سے نماز تک پڑھوالی۔ بیگم قدسیہ ہاشمی صاحبہ

سکے وہ مخلص مشیر تھے لیکن ان کی ڈانٹ سے ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے اپنے ہم عمروں میں ان کے خصوصی تعلقات مولوی فرحت اللہ صاحب اور مفتی رضا انصاری صاحب سے تھے اور انھیں تعلقات کی بنا پر وہ کبھی فرحت اللہ صاحب کے رشتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے چچا بن جاتے تھے اور کبھی مفتی رضا انصاری کے رشتے کی مناسبت سے میرے بھتیجے بن جاتے تھے۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ کے وہ بہت قریب تھے لیکن آخری زمانے میں ایک صاحب کی، بیگم صاحبہ کی موجودگی میں، بدتہذیبی اور بدتمیزی سے دل گیر ہو کر وہ بیگم حامدہ سے خفا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ خفگی بھی عارضی تھی اور اس کے بعد حسب معمول بیگم صاحبہ کے ہر چھوٹے بڑے کام کو وہ انجام دینے کو تیار رہتے تھے۔ عمر انصاری صاحب ان کے ہم عمر ہیں اور یہی حال پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب کا ہے۔ ان حضرات سے بھی ان کا خلوص آخر دم تک برقرار رہا۔ انھیں کی ایک تفریح کے سلسلے میں راقم الحروف اور عمر انصاری صاحب کے درمیان کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی جس کا ان کو شدید احساس تھا اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب ہم دونوں کے تعلقات کی اس کشیدگی کو انھوں نے ختم کرا دیا تب انھیں چین پڑا۔ ان کے چھوٹے دوستوں میں میرے دس سالہ بھتیجے میاں سعید بھی شامل تھے جو صباح الدین صاحب کو دیکھتے ہی ایک پلیٹ میں ہری مرچ لا کر ان کے سامنے رکھ دیتے تھے اور وہ ان کی خوشی کے لیے بے تکلف ان مرچوں کو چبا چبا کر کھا جاتے تھے۔ وہ اپنے جس ملنے والے کے گھر پہونچ جاتے، بچے بوڑھے جوان سب اکٹھے ہو جاتے اور ان کی دلچسپ باتوں سے لطف لیا کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کے ساتھ یہ صحبتیں بھی ختم ہو گئیں۔

صباح الدین صاحب رند پارسا تھے بیگم اختر کے یہاں موسیقی کی محفلوں میں بھی وہ شریک رہا کرتے۔ ان کے مخصوص دن تھے جب وہ حلیم الدین ایڈوکیٹ مرحوم کے یہاں اور ان کے انتقال کے بعد دوسرے دوستوں کے یہاں تاش کھیلنے جایا کرتے تھے۔ مذاقاً وہ اپنے آپ کو شیطان کا پیمبر بھی کہا کرتے تھے لیکن شیطان کا یہ پیمبر حقوق عباد کی ادائیگی میں کبھی نہ چوکتا تھا۔ ہر شخص کے دکھ درد میں وہ ہمیشہ شریک رہتے تھے اور اس کا ذاتی تجربہ خود راقم الحروف کو ہے۔ اپنے ایک کرم فرما کی ستم ظریفی سے کچھ عرصہ قبل جب مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا تو صباح الدین صاحب ہی تھے جو نہ صرف ہر قسم کی اخلاقی مدد کرتے رہے بلکہ حالات کو درست کرنے میں انھوں نے اہم حصہ لیا۔ اس "شیطان کے پیمبر" کو خدا نے بھی ہر طرح نوازا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں انھیں زیارت حرمین کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور اس سلسلے میں ان کی رندانہ طبیعت کو دیکھتے ہوئے راقم الحروف نے ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا جس کا آخری شعر جس سے تاریخ نکلتی تھی، یہ تھا ؎

کعبہ جاتے ہو تم! "صباح الدین
(۱۹۶)
شرم تم کو مگر نہیں آتی"
۴۱۱ + ۱۱۵ + ۲۶۰ + ۴۶۶ + ۵۴۰

۱۹۸۸ عیسوی

وہ ایک بڑا خاندان چھوڑ کر رخصت ہوئے اور سوائے ایک داماد کی موت کے غم کے وہ اپنی ہر اولاد کی طرف سے مطمئن تھے۔

صباح الدین صاحب ایک ادبی شخصیت ہوتے ہوئے بھی کوئی مستقل تالیف نہ چھوڑ سکے۔ ان کا تعلق صحافت سے ہمیشہ رہا۔ وہ نیاز فتح پوری کے مشہور زمانہ "نگار" سے بھی متعلق رہے اور مدت تک نیا دور کے ایڈیٹر رہے۔ اردو اکاڈمی کے جرنل "اکاڈمی" اور "خبر نامہ" کے ایڈیٹر نہ ہونے کے باوجود ان کے معیار کے تعین میں ان کا ہاتھ رہا۔ سمیناروں میں البتہ انھوں نے مقالات پیش کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی زبان میں بھی مضامین لکھے۔ لیکن افسوس کہ یہ تمام مضامین اب تک شائع نہ ہو پائے۔ ان کی وفات پر راقم الحروف نے جو چند قطعاتِ تاریخ کہے تھے وہ ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں ؎

دل اس کا ساتھ دے نہ سکا ازم زیست میں
آخر کیا صباح نے دُنیا سے انتقال
اس خانہ زادِ دہر سے پرواز کر گیا
باغِ جناں کی سمت وہ مرغِ خجستہ بال

زندوں کی انجمن کا سرافراز پیر مرد
اور صوفیوں کی بزم کا سردارِ اہلِ حال
وہ پیکرِ خلوص، سویدائے قلبِ لطف
وہ چہرۂ وفا کا حسین و جمیل خال
وہ جانِ بزمِ دوستاں وہ پیر زندہ دل
وہ مردِ پُر مذاق، وہ خوش طبع خوشخصال
وہ مردِ پاک زاد وہ مجموعۂ تضاد
سنجیدگی میں فرد، ظرافت میں بے مثال
خوش خوئی کے چمن کا خوش الحان عندلیب
زندہ دلی کے دشت کا پاکیزہ رو غزال
خود اپنے مسئلوں سے سوا دوسروں کی فکر
اوروں کا اپنی ذات سے بڑھ کر اسے خیال
احباب کی خوشی سے میسّر اسے خوشی
احباب کے ملال سے دل اس کا پُر ملال
سنجیدگی سے اس نے نہ ان کو کبھی لیا
وہ جانتا تھا شادی و غم کا ہر کیا مآل
ذلّت نتیجہ جس کا ہو کرتا نہ تھا وہ کام
کرتا نہ تھا وہ بات کہ جس سے ہو انفعال
اس مُرغِ زیرک کو دام میں لانا محال تھا
ڈالے گئے حیات میں کتنے ہی اس پہ جال
مرعوب کر نہ پایا اسے کوئی گورڈھ معتہ
اس پر اثر نہ کر سکی بیہودہ قیل و قال
میدانِ علم و فضل میں وہ صاحبِ قلم
پائے اگر کسی کی عبارت میں جھول جھال
دشمن ہو یا ہو دوست وہ کوئی ہی کیوں نہ ہو
اس کے قلم کی نوک سے بچ پائے یہ محال
ساتھ اپنے وہ خلوص و محبت بھی لے گیا
جانے سے اس کے مہر و وفا کا ہوا زوال

رخصت ہوا وہ جب تو ہوئی فکرِ سالِ فوت
اس ضمن میں جو ہم نے ولی سے کیا سوال
کہنے لگا وہ بادلِ غمگین و چشمِ نم
"رخصت ہوئے صباح" ہے تاریخِ انتقال
۱۰۱ + ۲۱ + ۱۲۹۰

۱۴۱۲ ہجری

دیگر

غمگیں دلوں کو روشنی دیتا رہا عمر
افسوس وہ سراجِ جہاں سے چلا گیا
وہ، جو تھا سب کا یار، جو سب کا تھا غمگسار
وہ اپنا دوست آج جہاں سے چلا گیا
جانے سے اس کے ہو گئے اب ہزل و جد یتیم
دونوں کا امتزاج جہاں سے چلا گیا
رہتا تھا جانِ انجمنِ دوستاں جو! آہ
"وہ مرد خوش مزاج جہاں سے چلا گیا"
۶۵ + ۷۰ + ۶۹ + ۵۱ + ۹۰۶ + ۲۴۴ + ۱۱

۱۴۱۲ ہجری

دیگر

یاروں کو چوٹ دے ہی گئے کیوں میاں عمر
آباد کرنے چل ہی دیئے دوسرا جہاں
کیا جانے زندگی نے کیا تم سے کیا سلوک
دنیا کی رزم گاہ سے بھاگے جو لے کے جاں
وعدہ تھا پانچ سال نہ جاؤ گے تم ابھی
پھر سب کو چھوڑ چھاڑ کے تم چل دیے کہاں
وعدہ خلاف تم کو کہیں گے تمہارے دوست
اس کا بھی کچھ خیال نہ تم کو رہا میاں
تاریخ کہہ رہا ہے ولی با سرِ "ہنر"
"آباد کر رہے ہو جو تم گلشنِ جناں"
۱۰۴ + ۳۰۰ + ۴۴۰ + ۹ + ۱۱ + ۲۱۵ + ۲۲۰ + ۸

۱۴۱۲ ہجری

حواشی: لہ ٢ہ عمر انصاری صاحب کی ایک ہجو کے اشعار کی طرف اشارہ ہے۔

عبدالمجیب سہالوی
سہالی ہاؤس، محلہ کھدرا، سیتاپور روڈ
لکھنؤ

میرے دوست صباح الدین عمر

میرے اور صباح الدین صاحب کے تعلقات عرصے سے تھے وہ جب یو، پی کے محکمۂ اطلاعات میں تھے تو نیا دور میں مضامین کے سلسلے میں ان کے پاس جانا آنا ہوتا تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ دفتروں میں لوگ وقت کی پابندی سے بہت کم آتے ہیں اور جب جاؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی نہیں آئے۔ لیکن صباح الدین صاحب کے پاس میں جب بھی گیا تو وہ اپنی سیٹ پر موجود ملے۔ انھوں نے ہمیشہ بڑی مستعدی اور محنت سے کام کیا۔ نیا دور پابندی سے بہت کم نکلتا تھا لیکن ان کے زمانے میں یہ خرابی قریب قریب دور ہو گئی تھی۔ پرچہ نہ صرف وقت سے نکلنے لگا تھا بلکہ ہم لوگوں کو وقت سے ملنے بھی لگا تھا۔ نیا دور میں جو مضامین بھیجے جاتے تھے ان کی اشاعت کے لیے عرصہ دراز تک انتظار کرنا پڑتا تھا، لیکن صباح الدین صاحب کے دور میں اس انتظار کی مدت میں کافی کمی آ گئی تھی۔

ان سے میری ملاقات اکثر 'دانش محل' میں بھی ہوا کرتی تھی۔ دانش محل میں شام کے وقت اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات آ جاتے اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا کرتا تھا وہاں آنے والوں میں احتشام صاحب، باقر حسین، مسیح الحسن رضوی کے علاوہ صباح الدین عمر صاحب بھی تھے۔ احتشام صاحب تو پابندی سے آتے تھے لیکن صباح الدین صاحب کبھی کبھی آ جاتے تھے۔

صباح الدین صاحب جب نعمت اللہ روڈ والے مکان میں آئے تو ان سے دو تین مرتبہ ملاقات ہو جاتی۔ میں نعمت اللہ بلڈنگ میں عرصہ دراز سے رہ رہا تھا۔ اتفاق سے وہاں اردو سے دلچسپی رکھنے والے کئی لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ صباح الدین صاحب سے ملا ہوا مکان عبدالاحد خاں خلیل کا تھا۔ ان کے مکان کے پیچھے اطہر حسین ہاشمی کا مکان تھا۔ میں ہمیشہ سے صبح جلد اٹھنے اور ٹہلنے کا عادی تھا۔ روز سویرے امین الدولہ پارک ٹہلنے کے لیے جاتا۔ وہاں چہل قدمی کے لیے آنے والوں میں پروفیسر رضوان علوی، علی رضا اور یونیورسٹی کے ایک صاحب تھے۔ صباح الدین صاحب بھی ٹہلنے آتے تھے لیکن بہت دیر میں کیونکہ وہ ہمیشہ سے دیر میں سونے اور دیر میں اٹھنے کے عادی تھے۔ کسی کسی دن ہم لوگ واپسی میں صباح الدین صاحب کو جگانے کے لیے ان کے گھر جاتے۔ وہ سوتے ہوئے ملتے۔ جگانے پر شرمندگی کا اظہار کرتے اور ہم لوگوں کی کافی خاطر مدارات کرتے۔ صباح الدین صاحب ٹہلنے آتے تو کافی دلچسپ قصے سناتے۔ رضوان علوی اور علی رضا صاحب میں کچھ دور کا رشتہ تھا۔ رضوان صاحب علی رضا صاحب کو دولہا بھائی کہتے تو وہ بہت محظوظ ہوتے۔ صباح الدین صاحب بھی کبھی کبھی علی رضا صاحب کو دولہا بھائی کہہ کر لطف اندوز ہوتے۔

میں جب قومی آواز میں تھا تو اکثر رات کی ڈیوٹی کر کے واپس ہونے میں مجھے صباح الدین صاحب کے کمرے کی لائٹ جلتی ہوئی ملتی۔ وہ رات دیر تک مطالعے میں مصروف رہتے۔ اس مکان میں پہلے صباح الدین عمر صاحب کے بھائی صلاح الدین عثمان صاحب رہتے تھے۔ جب وہ یہاں سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلے گئے تو صباح الدین عمر صاحب اس مکان میں رہنے لگے، اس سے پہلے وہ صدیق بک ڈپو کی پشت پر ایک مکان میں رہتے تھے وہ مکان ان کے لیے ناکافی تھا کیونکہ ان کے یہاں

(باقی [illegible])

امیر احمد صدیقی
سابق ایڈیٹر نیا دور۔ لکھنؤ

صباح الدین عمر صاحب

کچھ یادیں، کچھ باتیں

صباح الدین عمر صاحب میرے ایک بزرگ مخلص دوست، سینیر رفیق کار اور مشفق ناصح تھے۔ ان سے میرے تقریباً بائیس سال کے روابط تھے جو آخر وقت تک قائم رہے۔ ان کی اچانک موت میرے لیے ایک سانحۂ عظیم سے کم نہیں ہے۔ انتقال سے تین دن ہی قبل مرحوم سے ان کے مکان واقع نعمت اللہ روڈ، امین آباد، پر ملاقات ہوئی تھی۔ بہت دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ قضا و قدر کے فیصلے بعض اوقات کتنے بے رحم ہوتے ہیں۔ کیا معلوم تھا کہ میری ان سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔

مرحوم گوناگوں صفات کے حامل تھے، دل کے کھرے، بات کے کھرے اور زبان کے کھرے۔ کبھی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، جو دل میں آتا تھا کہہ ڈالتے تھے۔ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ نہ صرف ایک اچھے دوست تھے بلکہ دوستی کو نبھانا بھی جانتے تھے۔ آخر عمر تک وہ لکھنؤ کی ادبی، سماجی اور تہذیبی فضا پر چھائے رہے۔ نیا دور کی ادارت سے لے کر اُردو اکاڈمی کی سکریٹری شپ تک ان کا لاتعداد ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سرکاری افسروں سے رابطہ رہا جو سبکدوش ہونے کے بعد بھی جوں کا توں قائم رہا۔ اتر پردیش ہی نہیں ملک بھر میں شاید ہی کوئی ایسا ممتاز ادیب، شاعر یا صحافی ہو جس سے ان کے مراسم نہ ہوں یا ان کے نام سے وہ واقف نہ ہو۔

صباح الدین صاحب ایک اصول پرست اور سخت گیر افسر تھے۔ اپنی خداداد صلاحیت، ایمانداری اور خوش اخلاقی کا بہت جلد لوہا منوا لیتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ لکھنوی تہذیب کے پروردہ تھے۔ انتہائی غصے کی حالت میں بھی بہت ہی لگن اور محنت سے اپنے سرکاری فرائض انجام دیتے تھے اس لیے اپنے ماتحتوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ اگر کوئی ماتحت اپنے کام میں تساہلی برتتا تو وہ اسے سخت لہجہ میں تنبیہ ضرور کرتے تھے لیکن کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تقریباً سبھی لوگ خواہ وہ ان کے ماتحت ہوں یا اعزا یا ملاقاتی، ان کے مزاج سے واقف تھے، اس لیے وہ ان کی ڈانٹ پھٹکار کا برا نہیں مانتے تھے۔

محکمہ اطلاعات، اتر پردیش میں وہ ایک عرصے تک نیا دور کے مدیر رہے اور اس کو ادبی حیثیت دینے میں فرحت اللہ انصاری صاحب کے بعد انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس دوران انھوں نے نیا دور کے کئی خصوصی نمبر نکالے جن میں مہاتما گاندھی نمبر، جواہر لال نہرو نمبر اور لال بہادر شاستری نمبر قابل ذکر ہیں۔ ان نمبروں کی ادبی اور سیاسی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی اور جو اب بھی ایک مستند ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیا دور کی ادارت کے زمانے سے ہی مرحوم کے، ملک کے نامور اور ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے گہرے مراسم قائم ہوگئے تھے۔ تخلیقات کی اشاعت میں وہ کبھی مروت یا جانبداری سے کام نہیں لیتے تھے۔ ایڈیٹنگ کے فن سے بھی وہ بخوبی واقف تھے اس لیے کسی مضمون کو اس کی نوک پلک درست کرنے کے بعد ہی اسے شامل اشاعت کرتے تھے۔ اردو زبان کے ساتھ ہی ساتھ ان کو انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ محکمہ میں انگریزی مطبوعات کے بعد بھی انچارج

...رہے۔

...کی جانب سے جب ماہنامہ "آجکل" ... کیا اور اس کے مدیر کے لئے جب اخبارات میں اشتہار نکلا تو ایک امیدوار کی حیثیت سے عمر صاحب بھی دہلی انٹرویو دینے گئے۔ لیکن اس عہدے کے لیے جوش ملیح آبادی کا انتخاب کیا گیا۔ فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جوش صاحب بھی اس کے لیے امیدوار ہیں تو میں ہرگز اس کے لئے درخواست نہ دیتا۔ محکمہ اطلاعات اترپردیش میں جب بھی کوئی اسامی اُردو سیکشن میں نکلتی اس کے انٹرویو بورڈ میں عمر صاحب کو ضرور شامل کیا جاتا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ بہت مزہ لے لے کر سناتے تھے۔ ایک اُردو مترجم کی پوسٹ نکلی جس کے امیدواروں میں سید مسرت حسین ہاشمی مرحوم بھی شامل تھے۔ عمر صاحب نے ہاشمی صاحب سے سوال کیا کہ آپ کو "آجکل" اور "نیادور" میں کون رسالہ زیادہ پسند ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ عمر صاحب نیادور کے مدیر بھی ہیں، ہاشمی صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ مجھے تو "آجکل" زیادہ پسند ہے۔ لیکن عمر صاحب کا کردار دیکھئے کہ انھوں نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور ہاشمی صاحب کو ہی اُردو مترجم کے لیے منتخب کیا۔

صباح الدین صاحب ایک وضعدار اور شریف انسان تھے۔ وہ انتہائی لگن سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں سیکولر اور نیشنلسٹ تھے۔ ان کے مخلص دوستوں میں سنی بھی تھے شیعہ بھی تھے اور غیر مسلم حضرات بھی۔ محرم کے زمانے میں شہر کی بڑی مجلسوں میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے اور اکثر ان میں مدعو بھی کیے جاتے تھے۔ متعدد ذاکروں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے ان میں فرقہ واریت یا مذہبی عصبیت نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ خلوص شرافت اور صلاحیت کے قدرداں تھے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں ان کے قریب ترین اور مخلص ترین بے تکلف دوستوں میں پروفیسر رشید حسن خاں، پروفیسر شبیہ الحسن، پروفیسر رضوان علوی، مقبول احمد لاری صاحب، گپتا صاحب (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پریس) بیگم حامدہ حبیب اللہ اور للو بابو (بھارگوا پریس) قابلِ ذکر ہیں۔

عمر صاحب دفتر ہمیشہ وقت پر آتے اور دفتر کے اوقات کے بعد بھی اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ دفتر (محکمہ اطلاعات) سے فارغ ہونے کے بعد وہ بلاناغہ بیگم اختر صاحبہ کی کوٹھی پر حاضری دیتے اور رات کا کھانا عام طور پر وہیں تناول فرماتے۔ اپنے گھر (محلہ بجھ گھامی شاہ۔ سالومن کمپنی کی پشت پر) تقریباً دس بجے کے بعد ہی پہونچتے۔ خوش قسمتی سے شریک حیات انتہائی وفاشعار، سلیقہ مند اور نیک بی بی تھیں، اس لیے ازدواجی زندگی میں کہیں کھانچے نہیں آئے بلکہ یوں کہیے کہ بہت ہی خوش گوار گزری۔ سبکدوش ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ بیگم صاحب کے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اگرچہ ۸۰ سال کے پیٹے میں آگئے تھے لیکن اس عمر میں بھی وہ چاق و چوبند اور متحرک نظر آتے تھے۔

عمر صاحب محکمہ اطلاعات سے ریٹائر ہونے ہی والے تھے کہ ریاستی حکومت نے اترپردیش میں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے اُردو اکاڈمی قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور عمر صاحب کو اس کا سکریٹری نامزد کیا۔ مرحوم کو شروع ہی سے اُردو سے والہانہ محبت تھی اس لیے انھوں نے اس عہدے کو قبول کر لیا اور محکمہ اطلاعات ہی کے ایک کمرے میں اس وقت کے ڈائرکٹر انفارمیشن شری منی شرما جی کی اجازت سے اس کی داغ بیل ڈالنا شروع کر دی۔ اس وقت اکاڈمی کے اسٹاف میں عمر صاحب کے علاوہ ان کا ایک چپراسی تھا جس کا نام غالباً عشرت تھا۔ کچھ دنوں بعد اکاڈمی کا یہ برائے نام دفتر بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ کی عالی شان کوٹھی واقع حضرت گنج میں منتقل ہو گیا۔ اکاڈمی کے سپرنٹنڈنٹ کے لیے عمر صاحب کی نظر انتخاب بابو دیاشنکر پر پڑی۔ موصوف بھی محکمہ اطلاعات سے سبکدوش ہونے کے بعد میوزک کالج کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ بابوجی تجربہ کار اور دفتری پیچیدگیوں سے واقف کار ایک انتہائی باصلاحیت اور شریف انسان تھے اور جو اب بھی بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں لیکن صاحب فراش ہیں۔ چونکہ عمر صاحب کے ان سے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے بابوجی کالج کی ملازمت ترک کر کے اکاڈمی تشریف لے گئے۔ بابو دیاشنکر جی کو ہندی، انگریزی اور اُردو تینوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ انھوں نے اکاڈمی کے قواعد

عنوان بنائے اور اس کو پروان چڑھانے میں عمر صاحب کی بڑی مدد کی۔ حالانکہ دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا مگر واہ رے بابو جی کی شرافت و انکساری کہ عمر صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ بھی خندہ پیشانی سے سن لیتے اور ہمیشہ عمر صاحب کو حضور اور سر ہی کہتے رہے۔ چونکہ وہ عمر صاحب کے مزاج سے پہلے ہی سے واقف تھے اس لیے اس کا کبھی برا نہیں مانتے تھے۔ اب کہاں ایسے لوگ دیکھنے کو ملیں گے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ عمر صاحب کو ادبی مباحث میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ ایک با اصول اور حق پرست انسان تھے۔ اس لئے اگر کوئی بھی خبر یا مراسلہ ان کے مزاج کے خلاف اخبار میں شائع ہوتا تو سودا کی طرح فوراً قلم ہاتھ میں لے کر میز پر بیٹھ جاتے اور اس کا جواب جلد از جلد اخبار میں شائع کرا دیتے۔

ایک بار مجھ پر بھی ان کا عتاب نازل ہو چکا ہے۔ جب میں نے نیا دور کا "عثمان عارف نمبر" نکالا تو اس پر سب سے پہلے اعتراض کرنے والوں میں عمر صاحب ہی تھے۔ مجھ سے کچھ دریافت کیے بغیر کہ میں نے کن حالات میں یہ نمبر شائع کیا ہے، عمر صاحب نے اس کے خلاف "ٹائمس آف انڈیا" میں ایک مراسلہ شائع کرا دیا، اور اس کی بھی پروا نہ کی کہ ان کے اس جرأت مندانہ اقدام سے موجودہ گورنر صاحب کے زمانے میں اردو اکاڈمی کی انتظامیہ کمیٹی میں شمولیت ممکن نہ ہو سکے گی۔ اسی خصوصی نمبر کے سلسلے میں ایک دن فون پر مجھ پر بھی برس پڑے۔ میں نے ان کا ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح احترام کیا۔ میں نے لاکھ عذر پیش کیے لیکن مرحوم نے ایک بھی عذر درخور اعتنا نہ سمجھا سنتے رہے اور بڑبڑاتے رہے ـــــ جیسا کہ ان کی عادت تھی ـــــ لیکن اس کے باوجود ان کے خلوص و محبت میں کوئی کمی نہیں آئی اور میں حسب معمول دسویں پندرھویں دن جب بھی امین آباد جاتا، ان کی مزاج پرسی کے لئے ان کے دولت کدہ پر ضرور حاضری دیتا اور اگر کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا تو مرحوم خود ہی فون کر کے یاد فرما لیتے۔

صباح الدین عمر صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔ اے کیا تھا اور یگانۂ روزگار ڈاکٹر وحید مرزا صاحب مرحوم ان کے مشفق استاد تھے جو اپنی شرافت، نیکی اور اعلیٰ ظرفی کے لئے یونیورسٹی میں مقبول خاص و عام تھے۔ اعلیٰ ظرفی، شرافت، نیکی اور دوسروں سے ہمدردی کا جذبہ جیسی خوبیاں عمر صاحب نے غالباً اپنے استاد سے حاصل کیں، جو آج کل کے مادّی زمانے میں قریب قریب ناپید ہیں۔

مرحوم جب ۱۹۸۸ء میں اپنے بیٹوں سے ملنے کے لیے اپنی اہلیہ کے ساتھ کراچی اور مسقط کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے اور اپنے احباب سے اس دوران عمرہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ایک دوست نے برجستہ کہا ؎

مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ تبصرہ مرحوم کے حسب حال تھا یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرحوم اس تبصرہ سے بہت ہی محظوظ اور لطف اندوز ہوئے اور اپنے دوستوں سے بھی اس تبصرے کا ذکر خوب مزہ لے لیکر کرتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ موصوف لکھنؤ واپس آگئے ہیں تو ایک دن ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ دوران گفتگو انھوں نے اپنا ایک اثر انگیز واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے کہ:

"جب میں عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد مدینہ منورہ پہنچا اور در اقدس پر حاضری دی تو مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور میں کافی دیر تک روتا رہا۔ خدام بار بار آکر ٹوکتے تھے کہ اللہ دینے والا ہے اس سے طلب کرو۔ مگر وہ غلط سمجھ رہے تھے۔ یہاں کچھ مانگنے اور کہنے کے لئے الفاظ ہی کہاں تھے بس اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں پر پشیمان تھا، نیز یہ کہ سرکارؐ نے اس نالائق کو کیسے اذنِ حضوری بخش دیا"!

عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اب تو مرحوم کے دل میں حج بیت اللہ شریف کی تمنائیں انگڑائیاں لے رہی تھیں اور مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

عمر صاحب نے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو زیور طبع سے آراستہ کرانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ وہ کتابت

اور صحافت کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔ اس لیے ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر عمر صاحب کی صلاحیتوں کا سہارا لیتے تھے اور عمر صاحب انکار نہ کر پاتے تھے۔ بابو اکرشن گوپال مغموم صاحب تو چنڈی گڑھ سے لکھنؤ اسی لیے تشریف لاتے تھے اور عمر صاحب ان کو ساتھ لیے لکھنؤ کی گلیوں میں کاتبوں کے گھروں کے چکر لگاتے پھرتے تھے۔ لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ خود عمر صاحب کے ادب، موسیقی اور اہم شخصیتوں پر درجنوں مضامین مختلف رسالوں کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ان کو یکجا کر کے زیور طبع سے آراستہ نہ کیا گیا تو وہ گردشِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ میری تجویز ہے کہ اردو اکادمی ان کے چھوٹے بھائی محترم صلاح الدین عثمان صاحب کی نگرانی میں ان کی ساری گرانقدر تحریروں کو یکجا کر کے جلد از جلد شائع کرانے کا اہتمام کرے۔ یہ ان کے تئیں اکادمی کا خراجِ عقیدت بھی ہوگا، اور ہم سب کے جذبات کا لحاظ بھی۔ دوم یہ کہ اُردو اکادمی ان کی ایک تصویر بھی یادگار کے طور پر اپنے یہاں آویزاں کرے۔ سوم یہ کہ اردو اکادمی ہر سال ادیبوں اور شاعروں کی نئی تخلیقات پر انعامات دیتی ہے، ایک انعام صباح الدین عمر صاحب کے نام پر، ایسے شخص کو دیا جایا کرے جو ادیب بھی ہو، ادب نواز بھی ہو اور صحافی بھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اراکینِ کمیٹی ان تجاویز کو ضرور عملی جامہ پہنائیں گے کیونکہ مرحوم کی خدمات سے اربابِ نظر کبھی روگردانی نہیں کر سکتے۔

سچ تو یہ ہے کہ صباح الدین عمر صاحب ایسی جگہ پہونچ گئے ہیں کہ اب ان سے کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ لیکن ان کی عنایات فراواں اور خُرد نوازی کی خوشگوار یادیں باقی رہ جائیں گی۔ ان کی موت سے لکھنؤ کی نہ صرف ادبی، سماجی اور تہذیبی محفلیں سونی ہوگئیں بلکہ ہمارا شہر نگاراں ایک دلنواز اور ادب نواز شخصیت کی خدمات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا ؎

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اُٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

□□

قدر دانِ سخن صباح الدین

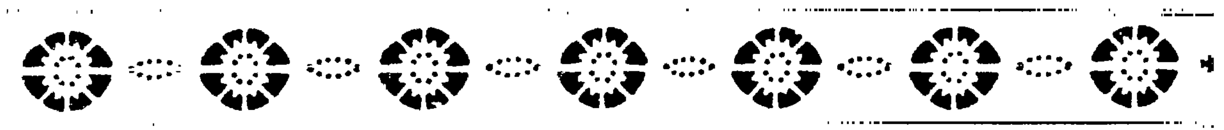
راجندر بہادر موجؔ

موج ارگ۔ نشگدہ۔ بڑاپلی

صاحبِ فکر و فن صباح الدین
تھے خود اک انجمن صباح الدین
تھے نگہدارِ گلشنِ اُردو
تھے فدائے چمن صباح الدین
خلق و انس و وفا کے سنگم تھے
مثلِ گنگ و جمن صباح الدین
ان کا غصّہ تھا پیار کی تمہید
تھے لیے بھولا پن صباح الدین
دوستوں دشمنوں سبھی کے دوست
ایسے تھے خوش چلن صباح الدین
نیچی نظروں کے ساتھ رہتے تھے
زیرِ لب خندہ زن صباح الدین
ٹوپی اور شیروانی میں ملبوس
تھے نشانِ کہن صباح الدین
نکتہ داں، عالم اور خوش گفتار
قدر دانِ سخن صباح الدین
یو.پی اُردو اکاڈمی کے لئے
نور کی تھے کرن صباح الدین
اور اس کے فروغ کی خاطر
کرتے تھے ہر جتن صباح الدین
ہو نیا دَور کا بلند مقام!
رکھتے تھے یہ لگن صباح الدین
ہر سیاست سے دُور تھے لیکن
تھے محبِ وطن صباح الدین
آخری سانس تک رہے ہر وقت
فکر و فن میں مگن صباح الدین
موجؔ یہ خلد میں جگہ پائیں
بندۂ ذوالمنن صباح الدین



وزیر اعلا اتر پردیش شری کلیان سنگھ ۱۵ اگست ۱۹۹۲ء کو کانپور کے پھول باغ میں جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے



وزیر اعلا شری کلیان سنگھ ۲۰ اگست ۱۹۹۲ء کو محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ میں انفارمیشن افسران کو خطاب کرتے ہوئے





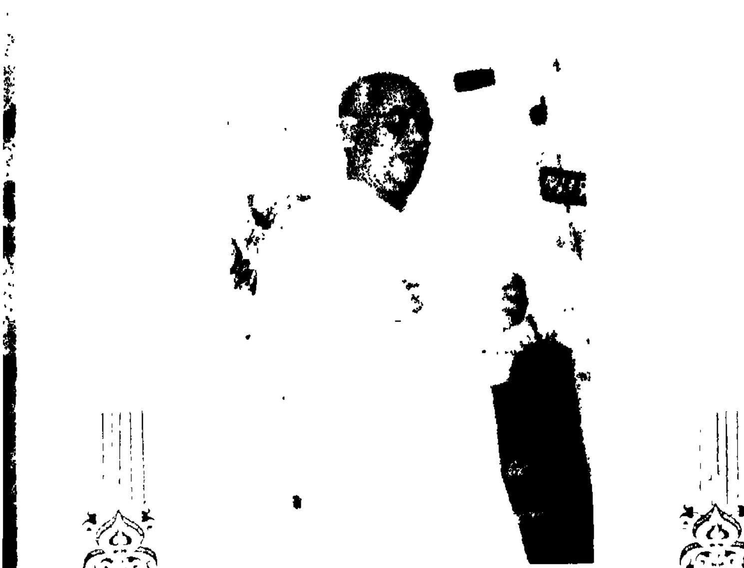
[illegible]







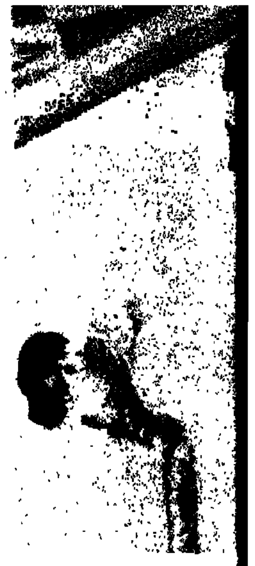




[illegible]



[illegible]



نا بال چند مشرا



شری گریش نرائن پانڈے



شری رام کمار











شری راجندر سنگھ





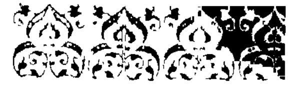


صباح الدین عمر مرحوم





...دیش کے گورنر شری بی ستیہ نارائن ریڈی ۱۰ اگست ۱۹۹۲ء کو ممتاز انقلابیوں کھودی رام بوس، [illegible] اور مدن لال ڈھینگرا کے یومِ شہادت پر اُن کی تصویروں کی گل پوشی کرتے ہوئے۔



صباح الدین عمر مرحوم ۲۶ جولائی ۱۹۹۵ء کو ادارۂ ماہنامہ [illegible] میں ڈاکٹر محمد نقی علی عابدی کی کتاب جدید فارسی شاعری کی رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے۔ تصویر میں ڈاکٹر نیر مسعود (بائیں) اور ڈاکٹر سید طلب صادق (دائیں) بیٹھے ہوئے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔







صلاح الدین عثمان
۴۴۔ راج بھون کالونی۔ لکھنؤ

صحبتِ شب کی آخری شمع

میرا اور برادرِ محترم صباح الدین عمر صاحب کا معاملہ کچھ عجیب سا رہا۔ اودھ کی تہذیب میں بزرگ اور خُرد کا رشتہ ادب و احترام کا ہوتا ہے، اس رشتے کی اپنی خوبیاں ہیں مگر اس میں بے تکلفی کے امکان بہت کم ہیں۔ میرے اور بھائی جان کے تعلقات میں احترام کا رشتہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ شاید تفاوت عمر کی وجہ سے، حالاں کہ ان کے بہت سے دوست جن کی عمریں مجھ سے بھی کم تھیں ان سے بہت بے تکلف تھے۔ پرانی تہذیب کے بندھن ان سے نئے دوستوں سے بے تکلفی کو روک نہ سکے۔ تہذیب کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ وہ خود کو بدلنا بھی جانتے تھے۔ وہ بدلے مگر میرے ادب و احترام نے ان کو قریب سے سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ ان کی علمیت اور بلندی کا احساس تو ضرور رہا مگر اسی طرح جیسے اس شخص کو قطب مینار کی بلندی کا احساس ہوتا ہے جو اس سے متصل ہو کر کھڑا ہو جائے۔

اس دور میں بہت کم لوگ ہوں گے جن کو اُردو زبان اور محاورہ اس کے صرف و نحو پر اتنی قدرت حاصل ہو جتنی صباح الدین صاحب کو تھی، مگر میں اس کا فیض نہ اٹھا سکا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد میں صحافت میں چلا گیا مگر زبان غیر میں۔ نہ اس زبان میں شرح آرزو کرنا سیکھ سکا نہ اپنی زبان میں۔ صباح الدین صاحب کی علمیت کا اندازہ تو ان تمام حضرات کو ہے جن سے ان کے علمی اور ادبی تعلقات تھے۔ یہ حلقہ کافی وسیع ہے۔ علم عروض پر ان کی قدرت بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھی اور ان کی وسیع معلومات کا علم بھی ان کے حلقۂ احباب کو تھا۔ مگر شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان میں ایک اچھے شاعر ہونے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ چند متفرق اشعار جو انھوں نے کہے تھے وہ ان صلاحیتوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ مگر معلوم نہیں کیوں وہ ہمیشہ اس صلاحیت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایسے بہت سے اشعار اور ایک نظم کا مجھے علم ہے، مگر انھوں نے ان کو جان بوجھ کر ضائع کر دیا۔

صباح الدین صاحب کو بچپن سے ہی مضمون نگاری کا شوق تھا۔ وہ نویں یا دسویں درجہ میں تھے جب ان کا ایک مضمون ایک مقامی اخبار میں شائع ہوا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس مضمون کی اشاعت پر وہ بہت خوش تھے۔ مضمون والد صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اس کی تعریف کی۔ صباح الدین صاحب صرف ادیب اور صرف و نحو اور عروض و قافیہ کے ماہر نہ تھے نہ محض صحافی تھے بلکہ وہ لکھنؤ اور اودھ کی تہذیب کے دلدادہ تھے اور ان کو ہر اس چیز سے لگاؤ تھا جس کا اس تہذیب سے ذرا بھی تعلق تھا۔ وہ جدید ہندستان کی ہر چیز پر ماہرانہ نظر بھی رکھتے تھے اور مؤقر اخبارات کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ سیاست پر بھی نظر رکھتے تھے اور رقص و موسیقی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ لکھنؤ کی تاریخ کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ انھوں نے اپنے کو صرف اُردو تک محدود نہیں رکھا تھا، انگریزی رسائل کی بھی برسوں ایڈیٹری کی تھی۔

اپنے دور کے ہر مشہور شاعر اور ادیب سے ان کے قریبی مراسم تھے، چاہے وہ نیاز فتحپوری ہوں یا پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

اور چاہے پروفیسر احتشام حسین صاحب۔ ان کو مذہبیات سے بھی دلچسپی تھی اور وہ عربی کی تعلیم بھی حاصل کر چکے تھے۔ وہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ دونوں مولانا عبدالحلیم صدیقی شیخ التفسیر ندوۃ العلماء کے شاگرد تھے۔ صباح الدین صاحب کے تعلقات مولانا علی میاں سے بھی تھے (جن کے وہ ہم وطن تھے) اور مولانا سید کلب عابد صاحب سے بھی۔ آخرالذکر سے تو وہ اتنے نزدیک تھے کہ اکثر لوگ انھیں مولانا کلب عابد صاحب کا مقلد سمجھنے لگے تھے۔ وہ ذات واحد میں ایک محفل تھے اور ان کی خوبیاں ہر محفل میں نمایاں تھیں مگر جو چیز ان کو سب سے زیادہ پسند تھی وہ صحافت اور اردو ادب تھا۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا کیونکہ والد صاحب چاہتے تھے کہ وہ وکالت کریں۔ اگرچہ ان کی ادبی مصروفیات اس دور میں زیادہ ہو گئی تھیں تاہم انھوں نے وکالت کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اس وقت وہ نیاز فتحپوری کے رسالہ 'نگار' میں مستقل طور پر لکھنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں "ہمدم" لکھنؤ کا ایک اہم اخبار تھا اگرچہ اس کا انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا وہ نواب عبداللہ خاں کی ملکیت میں اور انھی کی زیر ادارت پہونچ چکا تھا ان کو "ہمدم" کے لیے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت تھی، صباح الدین صاحب اس وقت تک شہر میں مضمون نگار کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ عبداللہ خاں نے ان کو عملاً ادارت میں شرکت کے لیے مدعو کیا اور صباح الدین صاحب نے ان کی پیش کش قبول کر لی۔ وہ نصف شب تک ہمدم کے دفتر میں رہتے صبح یونیورسٹی ایل۔ ایل۔ بی کے درجہ میں شرکت کے لیے جاتے۔ دن احباب کے لیے وقف رکھتے۔

صباح الدین صاحب نے وکالت کا امتحان پاس کرنے سے قبل ہی "ہمدم" سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے اس وقت کے مشہور وکیل نذیرالدین صاحب سے عملی وکالت کی تربیت لینا شروع کی، جو اس زمانے میں بہت ضروری تھی۔ جب تک ایک سال کی ٹریننگ کا سرٹیفکیٹ نہ ہوتا، وکیل کی حیثیت سے رجسٹریشن نہیں ہوتا تھا۔ ٹریننگ تو انھوں نے مکمل کر لی مگر وکالت ایک دن بھی نہ کی۔ اس وقت تک ان کی ادب اور صحافت سے دلچسپی اتنی گہری ہو چکی تھی کہ وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے تھے اردو اخبارات اس لائق نہ تھے کہ ان کے عملۂ ادارت میں کوئی مستقلاً شرکت کی بات سوچ سکتا۔ مگر صباح الدین صاحب کے ذہن میں یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ ان کو اپنی زندگی ایک صحافی اور ادیب کی حیثیت ہی سے بسر کرنا ہے۔

اس زمانے میں تین نئے صحافیوں کا لکھنؤ میں بڑا شہرہ تھا یہ تھے شوکت تھانوی۔ امین سلونوی اور نسیم انہونوی۔ آخرالذکر نہ صرف اچھے افسانہ نویس اور ناول نگار تھے بلکہ کتابوں اور رسالوں کے کامیاب پبلشر بھی تھے۔ انھوں نے اپنا دارالاشاعت نسیم بک ڈپو کے نام سے قائم کیا تھا (جو اب ان کے صاحبزادے فہیم صاحب کامیابی سے چلا رہے ہیں) خواتین کے لیے ایک رسالہ "حریم" شروع کیا تھا جو اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ہفتہ وار "سرپنچ" نکالا۔ شوکت تھانوی صاحب جو اس وقت مزاح نگار کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے، "سرپنچ" کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی مزاح نگاری اخبار کی کامیابی کی ضامن تھی۔ امین سلونوی صاحب شاعر اور انشاپرداز تھے پیشہ اخبار نویسی کا اختیار کیا تھا اور اردو کی پہلی خبر رساں ایجنسی انڈی پنڈنٹ نیوز سروس (ا۔ ان۔ س) کے نام سے قائم کی تھی جو وہ آخری عمر تک چلاتے رہے۔ صباح الدین صاحب ان تینوں حضرات کے دوست تھے۔ (امین سلونوی صاحب کی نیوز ایجنسی سے ان کا تھوڑا سا تعلق بھی تھا۔ یعنی وہ امین صاحب کی خبروں کو انگریزی میں لکھتے تھے جو پانیر اخبار میں شائع ہونے کے لیے بھیجی جاتیں۔ مگر صباح الدین صاحب کے خصوصی تعلقات شوکت تھانوی صاحب سے تھے جو رفیع احمد خاں کے دوست تھے اور اس طرح صباح الدین صاحب کے رفیع احمد خاں سے بھی مراسم ہو گئے، جو بعد میں بہت گہرے ہو گئے۔ رفیع احمد خاں یوں تو سرکار کے ملازم تھے مگر بہت ذی علم آدمی تھے۔ سرکاری نوکری سے پہلے وہ کیننگ کالج (لکھنؤ یونیورسٹی) میں انگریزی کے لیکچرر تھے۔ کالج کے انگریز پرنسپل

سے کسی بات پر ان بن ہو گئی تو کالج سے استعفادے دیا اور سرکاری ملازمت کر لی۔ رفیع احمد خاں رند مشرب اور زندہ دل آدمی تھے مگر رند مشربی میں بھی علم و ادب کا دامن نہیں چھوڑا۔ شاعر بہت اچھے تھے مگر ان کی شاعری کو سنجیدگی سے کرتی تھی اور احباب کی مخصوص محفلوں سے باہر نہ جا سکی۔ ان کی منتخب غزلوں کا ایک مجموعہ صباح الدین صاحب کے پاس تھا جس کو وہ بہت پوشیدہ رکھتے تھے۔ معلوم نہیں اب کہاں ہے۔

۱۹۳۰ء کا ابتدائی زمانہ ہندستان میں سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا، سیاسی ماحول بہت گرم تھا۔ کانگریس نے ستیہ گرہ تحریک شروع کی اور پھر ملتوی کر دی تھی۔ ہندستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے انقلابی لیڈروں سردار بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کے نام ہر ہندستانی نوجوان کے لب پر تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ صباح الدین صاحب جو لکھنؤ کی زندگی کے ہر عمل میں شریک تھے اس سے متاثر نہ ہوں۔

صباح الدین صاحب نے کبھی کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں کی مگر تحریک آزادی میں شامل جماعتوں کے ہمیشہ ہمدرد رہے۔ کانگریس اور مجلس احرار کے بہت سے لیڈروں سے ان کی دوستی بھی تھی۔ ان میں کانگریس کے ایک اہم لیڈر بابو موہن لال سکسینہ بھی تھے جو آزادی کے بعد حکومت ہند میں وزیر ہوئے۔ احرار کے لیڈروں میں ان کے گہرے تعلقات مولانا انور صابری سے تھے۔ مولانا شاعر تھے اور اشعار بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔

۱۹۳۶ء کے اواخر میں یو، پی پبلک سروس کمیشن نے محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن افسروں کی کچھ اسامیوں کا اعلان کیا۔ یہ ملازمت ویسی ہی تھی جیسی صباح الدین صاحب عرصہ سے چاہتے تھے اس میں سرکاری فائلوں پر نوٹنگ اور ڈرافٹنگ نہیں تھی۔ اگرچہ اس میں زیادہ تر کام حکومت وقت کی کارگزاریوں کی پبلسٹی کا تھا مگر اس میں ادبی خدمات کا بھی موقع تھا۔ صباح الدین صاحب مقابلہ کے امتحان میں شامل ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ ملازمت میں اردو سکشن کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ اس ملازمت میں کسی کی سعی اور سفارش شامل نہیں تھی۔ ان کو اردو رسالہ کی ادارت اور اردو کتابوں کی اشاعت کا من پسند کام مل گیا تھا اس پر وہ مطمئن تھے۔ ان کے لیے اہم بات یہ تھی کہ وہ جس رسالہ کے مدیر تھے وہ معیاری اور دیدہ زیب ہو۔ اخباروں میں حکومت کی کارکردگی کے بارے میں جو مضامین بھیجے جائیں وہ معیاری ہوں اور جو کتابیں شائع ہوں وہ نوک پلک سے درست ہوں۔ جن لوگوں نے پہلے سرکاری رسالہ "اطلاعات" دیکھا تھا اور پھر اس کو صباح الدین صاحب کے اڈیٹر ہونے کے بعد دیکھا وہ محو حیرت رہ گئے کہ اس خشک پرچے میں، جس میں سرکاری زبان میں سرکاری اعلانات کے علاوہ کچھ نہ ہوتا تھا، نئے برگ و بار کیسے پیدا ہو گئے اور خوش رنگ پھول کیسے کھلنے لگے۔

کچھ دنوں بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور کانگریس حکومت نے استعفادے دیا۔ برطانوی گورنر کا دوبارہ راج ہوا۔ جنگ کی وجہ سے پبلسٹی کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور اس کے لئے خصوصی رقوم مختص کی گئی تھیں۔ کتابچے شائع ہوئے۔ اگرچہ یہ سب وقتی اشاعتیں تھیں مگر ان اشاعتوں میں صباح الدین صاحب نے کسی خوبی کو نظر انداز نہیں کیا۔ انھیں کتابوں میں جنگ کے موضوع پر ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہوا، جس کا تذکرہ عرصہ تک ادبی محفلوں میں رہا۔ صباح الدین صاحب نے بڑی کاوش سے اس مجموعہ کے لیے نظمیں حاصل کی تھیں۔

ہندستان آزاد ہوا تو صباح الدین صاحب کی مصروفیتیں اور بڑھ گئیں۔ اردو رسالہ "اطلاعات" "اتر پردیش" ہوا پھر صباح الدین صاحب کی مساعی جمیلہ سے اس کا نام "نیا دور" ہوا اور وہ اردو ادب کا ایک مقبول اور ممتاز رسالہ بن گیا۔ نیا دور کی کامیابی صرف صباح الدین صاحب کی محنت اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ان کی مسلسل محنت اور جدوجہد سے اسے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہی کی کاوشوں سے یہ اتنا دیدہ زیب بنا کہ ہندستان میں اس کا کوئی حریف نہ بن سکا۔ جب پرچہ طباعت کے لیے گورنمنٹ پریس جاتا تو وہ کئی کئی دن اور راتیں گورنمنٹ پریس میں گزارتے تاکہ طباعت میں کوئی خامی نہ رہ جائے حالانکہ یہ کام وہ اپنے ماتحتوں سے بھی لے سکتے تھے۔ اتنی ہی محنت وہ مضمون نگاروں سے اچھے مضامین حاصل کرنے میں کرتے۔ مضامین

خود منتخب کرتے اور اکثر لکھنے والوں کو یہ بھی بتاتے کہ اس مضمون کو کس انداز میں پیش کیا جائے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے کن کن کتابوں سے مدد لی جائے۔ یہ سب یوں کیا کرتے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

۱۹۷۲ء میں جب یوپی اُردو اکاڈمی قائم کی گئی تو صباح الدین عمر صاحب اکاڈمی کے پہلے سکریٹری مقرر کیے گئے۔ اور اکاڈمی کو بنیاد سے بنانے کا کام صباح الدین صاحب پر آپڑا۔ مہینوں وہ اکاڈمی کے دفتر کے لئے عمارت کی تلاش میں گھومے۔ مشکل سے عمارت کرایے پر ملی۔ پھر دفتر کے عملے کی تلاش ہوئی۔ مہینوں کے بعد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ سارے کام صباح الدین صاحب نے تنہا انجام دیئے۔ اکاڈمی نے ان کا دل کچھ ایسا موہ لیا تھا کہ وہ دنیا کے ہر کام کو چھوڑ کر اسی میں لگے رہے اور ایسی تنظیم بنائی جو دوسری ریاستوں میں قائم ہونے والی اُردو اکاڈمیوں کے لیے نمونہ بن گئی۔

لکھنوی تہذیب کا ایک جُز رقص و موسیقی بھی تھا۔ صباح الدین صاحب کو اس سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی ادب سے۔ ان فنون کا ادب سے ایک قریبی رشتہ ہے۔ ان فنون کے فن کاروں سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے۔ مشہور گلوکارہ بیگم اختر ان کو اپنا بھائی کہتی تھیں اور انتہائی خلوص و محبت سے پیش آتی تھیں۔ عہد واجدی کے مشہور رقاص بندادین کے خاندان سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اور کتھک رقص کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں، اسی لئے ان کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کا صلاح کار مقرر کیا گیا اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے موسیقی کے پروگراموں کی اسکریننگ کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ وہ فخر الدین علی احمد کمیٹی کے بھی ممبر رہے اور ریاستی قومی یک جہتی کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔

صباح الدین عمر صاحب کی ذات میں لکھنؤ کی گزشتہ اور موجودہ ثقافت سموئی ہوئی تھی۔ انھوں نے یہاں کی گزری ہوئی تہذیب کا ہر رنگ دیکھا اور برتا تھا۔ ان کے جانے سے عہد گزشتہ کی کتنی باتیں تھیں جو گم ہوگئیں اور ان کی تلاش ناممکن بن گئی۔ وہ ان خاصانِ مے خانہ میں تھے جنھیں جام و پیمانہ مدتوں یاد کرتے رہیں گے۔

□□

لکھنوی تہذیب کے آئینہ دار

اپنی شخصیت سے تھے باغ و بہار
ان کے اندر خوبیاں تھیں بے شمار
سادگی تھی ان کی ہستی کا شعار
عشق سے وہ عشق ان سے ہمکنار
زندہ دل فعّال مخلص درد مند
ان سے ہر اک انجمن تھی لالہ زار
عصرِ حاضر کی غبیر تھی ان کی فکر
نثر کے وارث غزل کے رازدار
اک صحافی، اک ادارہ، ایک دَور
ذات تھی ان کی عمل کا شاہکار
روز و شب ملحوظ رہتی تھی انھیں
آبروِ اُردو کی، اُردو کا وقار
جان دیتے تھے وطن کے نام پر
تھے وہ قومی ایکتا کے جاں نثار
بزمِ موسیقی ہو یا نغموں کی رات
دوست دارِ دوستاں یاروں کے یار
ان کا چہرہ کیا ہوا ہم سے جُدا
سونے سونے ہوگئے لیل و نہار
اگلے وقتوں کی شرافت کے امیں
لکھنوی تہذیب کے آئینہ دار
یاد رہ جاتے ہیں ایسے پیارے لوگ
کیونکہ کم ہوتے ہیں اتنے وضعدار
ہے یہی مرحوم کے حق میں دُعا
مغفرت ان کی کرے پروردگار

تسنیم فاروقی

تلسی داس مارگ لکھنؤ ۳-۲۲۶۰۰

محمد اسحاق صدیقی
۵۔ اے گوئن تالاب لکھنؤ

صباح الدین عمر (مرحوم): میرے استاد

امین آباد کے بجلی گھر کے قریب چودھری نعمت اللہ روڈ پر اس سڑک پر آگے بڑھ کر دائیں جانب مشہور زنانہ پارک ہے۔ اس سے ملی ہوئی سلطان حسن نواب بہادر کی مسجد ہے جس کے نیچے کئی دکانیں ہیں۔ آخری دکان "سلکشن ٹیلرس" کی ہے۔ ٹھیک اس کے سامنے سڑک کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا ایک منزلہ سفید مکان ہے، ابھی کل کی بات ہے میرے استاد اسی مکان میں رہتے تھے۔

میں برسوں اس مکان کے سامنے سے روزانہ گزرتا رہا ہوں۔ کیونکہ چودھری نعمت اللہ کی کوٹھی سے ذرا آگے دائیں جانب میلا ودیالیہ کی پشت پر محلہ گوئن تالاب میں میرا آبائی مکان ہے۔ جب میں لائف انشورنس کارپوریشن (ڈویژنل آفس حضرت گنج) میں ملازم تھا تو دفتر جانے سے پہلے اکثر صباح الدین عمر صاحب سے ملنے جایا کرتا تھا۔ نومبر ۱۹۸۹ء میں ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد کھلے ماحول اور سکون کی تلاش میں میں نے علی گنج میں نیا مکان بنوالیا۔ اور جولائی ۱۹۹۰ء میں وہاں منتقل ہوگیا اس طرح رفتہ رفتہ صباح الدین صاحب کے یہاں میری آمد و رفت کم ہوگئی۔

اب بھی میں کبھی کبھی اپنے پرانے مکان جاتا ہوں کیوں کہ میرے عزیز و اقارب اور خاص کتب خانہ وہیں ہے۔ مکان کی تبدیلی کے بعد میرا یہ معمول تھا کہ جب میں اپنے پرانے مکان جاتا تو پہلے صباح الدین عمر صاحب کے یہاں حاضری دیتا۔ اب جب بھی میں ان کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوں میرے قدم سست پڑ جاتے ہیں۔ ایک حسرت بھری نگاہ ان کے مکان پر ڈالتا ہوں اور ٹھنڈی سانس بھر کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

کیوں کہ یہی وہ مکان ہے جہاں میرے مشفق استاد میرا اکثر انتظار کیا کرتے تھے حد یہ ہے کہ کئی بار دروازے کا پٹ کھلا رکھا کہ شاید میں سامنے سے گزروں اور وہ مجھے بلالیں۔ ایک بار وہ دروازے پر کھڑے کسی کو رخصت کر رہے تھے میں انھیں دیکھ کر رک گیا تو فرمایا۔

"مجھے دیکھ کر تو آپ ایسے رک گئے جیسے بلّی راستہ کاٹ گئی ہو۔"

افسوس! مجھے یہ امید نہ تھی کہ میں اتنی جلد ان کے سائے سے محروم ہو جاؤں گا۔[1]

اس سے پہلے کہ میں اپنے اور مرحوم کے دیرینہ مراسم کا ذکر کروں بہتر ہوگا کہ ان کی رہائش گاہ کا اندرونی منظر بھی بیان کردوں تاکہ اس پس منظر میں ان کی شخصیت اجاگر ہو سکے۔

دروازے کے سامنے تین قدمچے ہیں، ان پر چڑھ کر بائیں پٹ پر لگی بجلی کی گھنٹی بجانے پر اگر صباح الدین صاحب موجود ہوتے تو ان کی آواز سنائی دیتی:

"آئیے!"

آنے پر جالی والا دروازہ کھولنے سے پہلے اندر کا لوہے کی چادر والا پلا پٹ کھولتے۔ آنے والے کے اندر پہونچنے کے بعد باہر والا دروازہ بند کرکے ڈھیلی ڈھالی چٹخنی لگادیتے۔ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو بوڑھی ملازمہ (جسے وہ بوا کہتے تھے) باہر جھانک کر اطلاع دیتی:

"نہیں ہیں، کہیں گئے ہیں!"

اگر وہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوتے تو کچھ دیر انتظار کرنا پڑتا۔ وہ معذرت کرکے آتے۔ آنے والے کے اندر پہونچنے کے بعد وہ پھر محو گفتگو

[illegible] اس قدر [illegible] بنا بنا کر باتیں کرتے کہ میں ان کی باتیں سنتے سنتے بیزار ہو جاتا اور چاہتا کہ کسی طرح یہ سلسلہ ختم ہو تاکہ میں اپنے مطلب کی بات کروں اور دفتر بلا تاخیر پہونچ سکوں۔

بہرحال اندر داخل ہونے پر دائیں طرف دیوار سے لگے دو صوفے ان کے سامنے ایک گرد آلود آفس ٹیبل پر لیمپ۔ قلم دان اور بے ترتیب کاغذات کے انبار نظر آتے۔ میز کے پیچھے دیوار سے ملی ان کی کرسی تھی جس پر بیٹھ کر وہ اکثر دن میں بھی لیمپ جلائے میز پر جھکے لکھتے نظر آتے۔ ان کے دائیں طرف کتابوں سے بھری ایک الماری اور بائیں طرف کاغذات سے لدا اور گرد سے اٹا ایک ریک نظر آتا۔

اس مختصر برآمدے کے بعد جسے کمرے کا روپ دے دیا گیا تھا کسی قدر بلند چوکی پر ان کا خاص کمرہ تھا جس کے فرش پر خوش نما لینولیم (LINOLEUM) بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دائیں طرف زنان خانے میں جانے کا دروازہ ہے جس پر پردہ پڑا رہتا۔ دروازے کے قریب دیوار سے ملی ایک چھوٹی میز پر ٹیلی فون رکھا رہتا۔ اس سے ملا ایک نیچا تخت بچھا تھا جس کی چادر پر گاؤ تکیے کا سہارا لیے صباح الدین صاحب لیٹے یا بیٹھے نظر آتے۔ تخت کے نیچے سے ان کے کئی جوڑے سیاہ جوتے جھانکتے نظر آتے۔ تخت کے پیچھے دیوار میں دو الماریاں کتابوں سے سجی اور بائیں طرف تخت کے کنارے دیوار سے ملا ایک ریک کتابوں سے آراستہ نظر آتا۔ تخت کے سامنے کمرے کے بیچ میں ایک نیچی میز بچھی تھی جو عموماً کتابوں اور اخبارات سے بھری رہتی۔ اس میز کے دونوں طرف دیواروں سے لگے صوفے بچھے تھے۔ زنان خانے والے کمرے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے پر سامنے والے صوفے کے بائیں جانب ٹی۔وی رکھا نظر آتا۔

مجھے امید ہے کہ صباح الدین صاحب کے احباب اور ان کے پاس مختلف ضرورتوں سے آنے والے اصحاب ان کی رہائش گاہ کا یہ نقشہ نہ بھولے ہوں گے لیکن اب نہ یہ منظر دیکھنے کو ملے گا اور نہ اس کی جان یعنی صباح الدین عمر صاحب کی ذاتِ بابرکات۔

قدرت کا یہ قانون ہے کہ ادنا سے ادنا انسان سے بھی اگر کام لینا منظور ہوتا ہے تو وہ اسے ذرائع فراہم کرتی ہے۔ چناں چہ جب مجھے کسی غیر معمولی استاد کی شاگردی کے لائق سمجھا گیا تو میری علامہ نیاز فتح پوری تک رسائی ہو گئی تھی اور جب میرے اور ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تو مجھے صباح الدین عمر صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں میں اپنا دوسرا استاد تسلیم کرتا ہوں اور جب میں اس کا برملا اعتراف کرتا تو وہ خوش ہوتے۔ استادی شاگردی کی یہ داستان اس قابل ہے کہ اسے قلم بند کیا جائے۔

۱۹۵۷ء کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں صباح الدین عمر صاحب اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات (لکھنؤ) میں ملازم تھے اور رسالہ نیا دور کے ایڈیٹر۔ حسنِ اتفاق کہ انھوں نے پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم) سے اس بات کا ذکر کیا کہ اردو زبان میں سائنسی مضامین کی بہت کمی ہے۔ کیا ان کے علم میں کوئی ایسا شخص ہے جو سائنسی موضوعات پر نیا دور کے لیے مضامین لکھ سکے۔ احتشام صاحب میرے علمی شاغل سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے میرا نام تجویز کیا۔ صباح الدین عمر صاحب کو میری تلاش ہوئی اور میں حسبِ ارشاد "دانش محل" (امین آباد) میں ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا۔ ان کی فرمائش پر میں نے اپنا پہلا سائنسی مضمون "چاند کی دنیا" لکھا جو نیا دور کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ تب سے میں نے مختلف موضوعات ـــ فلکیات، خلا کا سفر، علم طبقات الارض، علم نباتات، حیوانیات، لسانیات اور مذاہب عالم ـــ پر نیا دور کے لیے ۱۹۹۱ء تک ۹۲ مضامین لکھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

جب میرے مضامین نیا دور میں شائع ہونا شروع ہوئے تو کتابت سے پہلے صباح الدین عمر صاحب مجھے تبادلۂ خیال کے لیے اپنے پرانے مکان (واقع محلہ نیا گاؤں غربی۔ لکھنؤ) پر طلب فرماتے۔ میں دفتر جانے سے پہلے ان سے ملا کرتا تھا اور جب اپنا ترمیم شدہ مسودہ دیکھتا تو سخت ندامت ہوتی کیونکہ ہر صفحہ میدان کارزار کا منظر پیش کرتا جس میں لاشوں کے بجائے لال روشنائی سے کٹے ہوئے الفاظ اور صفوں کے بجائے سطروں کی سطریں صاف نظر آتیں۔ کہیں عبارت بدلی ہوئی، کہیں حاشیے پر سوالیہ نشان اور کہیں مختصر سوال۔ جب وہ وضاحت طلب کرتے تو یہ ماننا پڑتا تھا کہ اعتراضات معقول

نہیں یا یہ میرا بیان مبہم یا غیر ضروری۔ ان کی ان تھک محنت اور توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں رفتہ رفتہ پہلے سے کہیں بہتر لکھنے لگا۔

مجھے یہ تسلیم کرتے ہوئے ذرا بھی عار نہیں کہ باوجود کہنہ مشقی کے وہ میری ہر تحریر میں، جو میں ان کے ملاحظے کے لئے پیش کرتا، آخر وقت تک اصلاح و ترمیم کرتے رہے۔ خود اس مضمون کے پہلے مسودے پر جو میں نے ان کی فرمائش پر ۲۵ر اگست ۱۹۹۱ء کو لکھا تھا، انھوں نے آخری بار اصلاح فرمائی تھی۔ ("قدرت کا یہ قانون ہے"..... سے پہلے کا حصہ ان کے انتقال کے بعد اضافہ کیا گیا ہے) میں ہمیشہ ان کی باریک بینی، زبان دانی اور حاضر دماغی پر رشک کرتا رہا۔ اسی لیے میری تمنا تو یہ تھی کہ شاگردی کا یہ سلسلہ میری حیات تک چلتا رہتا لیکن افسوس کہ وہ مجھ سے پہلے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ صباح الدین عمر صاحب میرے مضامین کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر یہ سب مضامین ایک جلد میں شائع کر دیئے جائیں تو اُردو زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا کیونکہ ان کے علم میں اس سے قبل اتنے متنوع موضوعات پر کسی ایک شخص نے اتنی محنت سے ایسے مضامین نہیں لکھے۔ ان کے پیہم اصرار پر میں نے اپنے مضامین کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا جسے اترپردیش اردو اکاڈمی نے دسمبر ۱۹۹۰ء میں اشاعت کے لئے منظور تو کر لیا لیکن اب تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

یہاں میں اپنے ایک خاص مضمون کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا عنوان تھا "مذاہب عالم کی تخلیق اور قطب شالی" یہ مضمون رسالہ "نگار" میں قسط وار شائع ہوا تھا مجھے افسوس ہے کہ یہ مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ "نگار" کے بند ہو جانے کے بعد ہندستان میں کوئی ایسا رسالہ نہیں رہا جس میں تاریخ مذہب پر مروجہ مذہبی عقائد سے ہٹ کر اظہار خیال کیا جا سکے۔ دراصل جس مذہبی اور ذہنی آزادی کے نیاز صاحب علم بردار تھے وہ اردو والوں خصوصاً مسلمانوں کے حصے میں آئی ہی نہیں۔ اسی لیے مجھے اپنی مذہبی تحقیقات کو بالائے طاق رکھ کر سائنس کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ تاہم میں نے اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ اپنی تحقیقات کا بنیادی حصہ بجائے اردو کے انگریزی زبان میں قلم بند کر دوں تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو اور شاید قدرت کسی کو یہ توفیق دے کہ میرے کام کو آگے بڑھا سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۹ مضامین لکھے جنھیں میں نے خود پہلے رسائل کی صورت میں اور بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان مضامین کو بھی صباح الدین عمر صاحب نے ازراہ کرم ایڈٹ کیا اور تب مجھے پتہ چلا کہ انھیں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ میں اس غلط فہمی میں تھا کہ وہ ان زبانوں میں ایم۔اے ہوں گے لیکن مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے عربی میں ایم۔اے کیا تھا۔ البتہ تقریباً ۳ سال تک محکمۂ اطلاعات کے انگریزی ماہنامے "اترپردیش" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔

عربی زبان دانی کے سلسلے میں ان کی قرآن فہمی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہاں مجھے آنجہانی نند کمار اوستھی کی یاد آتی ہے جنھوں نے پہلی بار دیوناگری رسم خط میں قرآن شریف کا ہندی ایڈیشن شائع کر کے عربی اور اردو سے بے بہرہ موجودہ اور آئندہ نسلوں پر بڑا احسان کیا۔ انھیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ دیوناگری حروف میں عربی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کیا جا سکے۔ اس کے لیے انھوں نے دیوناگری کے ٹائپ میں متعدد بار تبدیلیاں کیں اور مروجہ حروف میں نقطے اور نشانات لگا کر عربی کی مخصوص آوازوں کے لئے نئے حروف، اشارے اور علامتیں وضع کیں۔ وہ اکثر صباح الدین عمر صاحب کے یہاں ان کے پرانے مکان پر تشریف لاتے تھے۔ انھیں دیوناگری حروف میں لکھی ہوئی عربی آیات پڑھ کر سناتے تھے اور صباح الدین عمر صاحب ان کے تلفظ کی حسب ضرورت اصلاح کرتے تھے۔ نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلتا رہا۔ بہر حال بیس سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۹۷۹ء میں "قرآن شریف — ہندی" شائع ہو گیا جس کی صحت کے لئے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ کافی ہے۔ اب تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس ہندی قرآن شریف میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ دیوناگری عبارت کے مقابل اصل متن عربی رسم خط میں دیا گیا ہے آیات کے ہندی ترجمے کے ساتھ ساتھ حواشی بھی دیے گئے ہیں۔

ہوجاتے۔ ٹیلی فون پر وہ اس قدر اطمینان سے پہلو بدل بدل کر باتیں کرتے کہ میرا جی ان کی باتیں سنتے سنتے بیزار ہوجاتا اور چاہتا کہ کسی طرح یہ سلسلہ ختم ہو تاکہ میں اپنے مطلب کی بات کروں اور دفتر بلا تاخیر پہونچ سکوں۔

بہرحال اندر داخل ہونے پر دائیں طرف دیوار سے لگے دفتر صوفے ان کے سامنے ایک گرد آلود آفس ٹیبل پر لیمپ۔ قلم دان اور بے ترتیب کاغذات کے انبار نظر آتے۔ میز کے پیچھے دیوار سے ملی ان کی کرسی تھی جس پر بیٹھ کر وہ اکثر دن میں بھی لیمپ جلائے میز پر جھکے لکھتے نظر آتے۔ ان کے دائیں طرف کتابوں سے بھری ایک الماری اور بائیں طرف کاغذات سے لدا اور گرد سے اٹا ایک ریک نظر آتا۔

اس مختصر برآمدے کے بعد جسے کمرے کا روپ دے دیا گیا تھا کسی قدر بلند چوکی پر ان کا خاص کمرہ تھا جس کے فرش پر خوش نما لنولیم (LINOLEUM) بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دائیں طرف زنان خانے میں جانے کا دروازہ ہے جس پر ...

دیوار ...

... صباح الدین ... جب مجھے ...

... کے بعد۔ چنانچہ جب ...

سے ... کی جاتی یا کوئی اخبار و رسالہ ...

کا طلب گار ہوتا تو ان کی میز پر کتب خانے اور مختلف کتب خانوں سے لائی ہوئی کتابوں کے ڈھیر نظر آتے۔ انھوں نے نہ جانے کتنے مقالوں اور تقریروں کے لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میں نے بارہا اصرار کیا کہ اپنے مقالات ... کے بعد کتابی صورت میں شائع کرکے بقائے دوام کی تدبیر کریں لیکن بے سود۔ ہمیشہ ایک ہی عذر پیش کرتے رہے یعنی دوسروں کے کاموں سے فرصت نہیں۔

یہ افسوس کا مقام ہے کہ جس شخص نے درجنوں ادیبوں کی رہنمائی کی ہو ان کی تحریروں کو بنایا اور سنوارا ہو، جس نے تحقیق کی ابتدا سے لے کر انتہا تک بلکہ کتابی صورت میں اشاعت تک ہر منزل پر مصنف یا محقق کی مدد کی ہو وہ خود کسی یادگار کتاب کا مصنف نہیں۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کی فرمائش پر انھوں نے

جب مجھے کسی غیر معمولی استاد کی شاگردی کے لائق سمجھا گیا تو میری علامہ نیاز فتحپوری تک رسائی ہوگئی تھی اور جب میرے اور ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تو مجھے صباح الدین عمر صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں میں اپنا دوسرا استاد تسلیم کرتا ہوں اور جب میں اس کا برملا اعتراف کرتا تو وہ خوش ہوتے۔ استادی شاگردی کی یہ داستان اس قابل ہے کہ اسے قلم بند کیا جائے۔

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں صباح الدین عمر صاحب اترپردیش کے محکمۂ اطلاعات (لکھنؤ) میں ملازم تھے اور رسالہ نیا دور کے ایڈیٹر۔ حسن اتفاق کہ انھوں نے ...

...) سے اس بات کا ... کی ہے۔ کیا ان کے علم میں کوئی ایسا ... پر نیا دور کے لیے مضامین ...

... کے بعد پر بھی ایسا ہی ... گا۔

ARTICLES ON ATLANTOLOGY:

AN ATTEMPT TO RECONSTRUCT MAN'S PRIMITIVE PHILOSOPHY

(1981- 1983)

MYTHICAL GEOGRAPHY OF THE HINDUS: ITS NORTH POLAR ORIGIN (1984)

PUBLISHED BY

ACADEMY OF ATLANTOLOGY

5-A GWYNNE TALAB, LUCKNOW 226 018.

ہیں اور میرا ایمان ہے

نتیجہ یہ نکلا کہ میں رفتہ رفتہ پہلے سے

مجھے یہ تسلیم کرتے ہوئے ذرا بھی عار نہیں

کے وہ میری ہر تحریر میں، جو میں ان کے ملاحظے کے لئے

آخر وقت تک اصلاح و ترمیم کرتے رہے۔ خود اس مضمون

پہلے مسودے پر جو میں نے ان کی فرمائش پر ۲۵ ، اگ

لکھا تھا، انھوں نے آخری بار اصلا

قا

سی

بد رشک

...مرحوم کے ... ملنے والوں ... تعزیتیں نے

...ان اور ڈاکٹر ... الدین وغیرہ شامل تھے، یہ طے کیا کہ

...صاحب پر کچھ مضامین لکھوائے جائیں، مجھ سے کہا گیا کہ آپ بھی کچھ لکھئے

یہ مضمون میں نے اسی وقت لکھا تھا۔ لکھنے کے بعد میں نے صباح الدین صاحب سے عرض کیا،

... ایک مضمون یونہی معمولی سا لکھا ہے آپ مکمل نہیں ہے، دیکھ لیجیے" خلاف معمول اُس

... غمگین سے تھے کہنے لگے، "کیا دیکھیں، آپ ہمارے مرنے کے بعد لکھیے گا"

...ال کے بعد اب نے کچھ لکھنے پر خود کو آمادہ نہیں کرسکنے ہوئے لہٰذا یہ

میں لکھا ہوا مضمون ارسال ہے۔ ______ نسیم اقتدار علی

کچھ نہیں تو کوئی پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے، ہمارے ایک دیرینہ دوست منظور الامین صاحب کئی سال بعد لکھنؤ آئے پہلے سے ان کی آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ اچانک ایک روز گھر آئے کچھ سامان بھی ساتھ نہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی روز دہلی سے آئے ہیں اور امین آباد میں صباح الدین عمر صاحب کے گھر قیام پذیر ہیں۔ اسی روز پہلی مرتبہ اس نام سے تعارف ہوا۔ امین صاحب چلے گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔

اس کے چند سال بعد لکھنؤ میں ٹیلی ویژن مرکز قائم ہوا اور اتفاق سے اس کے پہلے ڈائرکٹر امین صاحب مقرر ہوئے۔ دلکشا کالونی میں انھیں بنگلہ ملا اور ان کے بیوی بچے بھی آگئے۔ ان کی بیوی رفیعہ میری عزیز سہیلی ہیں۔ پرانی صحبتیں لوٹ آئیں اور ہر وقت کا ساتھ رہنے لگا اب صباح الدین صاحب کی صورت سے رفیعہ کے گھر میں تعارف ہوا

لیکن ذاتِ شریف اس وقت تک پردۂ راز میں تھی۔ ہر مرتبہ ملاقات اتنی سرسری اور رسمی ہوئی کہ بات چیت کی نوبت بہ مشکل ہی آئی۔ اگر کوئی ان کا چہرہ مہرہ پوچھتا تو بتایا نہ جاسکتا تھا۔

رفتہ رفتہ شکل واضح ہونے لگی۔ گہرا سانولا رنگ بلکہ اگر پکا کہا جائے تو کھپ جائے گا۔ موٹی ناک، اس کے دبے ہوئے بانسے پر موٹے شیشوں کی عینک، عینک سے ڈھکی چھپی بڑی بڑی آنکھیں، چہرہ پر کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنا ایک الگ رنگ اور جاذبیت۔ سر کے بالوں کا حال معلوم نہیں البتہ شیروانی کے جوڑ کی کشتی دار ٹوپی کے باہر خضاب سے کالی رنگی ایک جھالر نظر آتی ہے۔ بڑے پائنچے کا سفید جھا لٹین یا پھر ٹیری کاٹ کا پائجامہ زیب تن فرماتے ہیں جو نیچے سے ناخنی مڑا ہوتا ہے پیر میں عمدہ قسم کے پالش کیے ہوئے جوتے۔ پان، تمباکو اور ولایتی سگریٹ کے شوقین۔ اور ان دونوں شوقوں میں نفاست کے قائل۔

صباح الدین عمر صاحب مرحوم صوم وصلوٰۃ کے طرف سے جزوی طور پر پابند تھے۔ وہ عمرہ بھی کر آئے تھے لیکن مسلمانوں کی مکمل وضع اختیار نہیں کر سکے۔ تاہم سچے مرد مومن تھے۔ بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنا حق کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہونا اور مستحق کی حتی الامکان مدد کرنا، یہ ان کی وہ خوبیاں تھیں جو مرد مومن ہونے کی دلیل تھیں۔ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اسی لیے اکثر مذہبی لوگوں [illegible] اور عقلی پہلو کے بغیر نہیں رہتے تھے۔

یہ ایک خاص بات ہے کہ مذہبی ماحول میں تعلیم و تربیت پانے کے باوجود وہ مذہبی تعصب سے بالاتر تھے۔ اس لیے ان کے دوستوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے اور ان میں بعض ایسے بھی تھے جو انھیں ہم مذہب یا ہم مسلک ہونے کے باوجود اپنوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ زندگی بھر حق کے جویا رہے۔ اسی لیے دوسرے مذاہب کے عقائد، ریت، رواج، تاریخ اور مقدس صحائف کے بارے میں اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہتے تھے چنانچہ جس شوق سے وہ ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھتے تھے۔ اسی ذوق و شوق سے "رامائن" اور "مہابھارت" سیریل بھی دیکھے اور بارہا مجھ سے تبادلۂ خیال کیا۔

صباح الدین عمر صاحب بہت کم لکھتے تھے لیکن جب لکھتے تو خوب تحقیق کر کے اور گہرا مطالعہ کرنے کے بعد۔ چنانچہ جب 'آکاش وانی' سے کسی ریڈیو ٹاک کی فرمائش کی جاتی، یا کوئی اخبار، رسالہ یا ادارہ مضمون کا طلب گار ہوتا تو ان کی میز پر لائبریری کتب خانے اور مختلف کتب خانوں سے لائی ہوئی کتابوں کے ڈھیر نظر آتے۔ انھوں نے نہ جانے کتنے مضامین اور تقریریں لکھیں لیکن انھیں محفوظ رکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میں نے بارہا اصرار کیا کہ اپنے مضامین کو نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع کر کے بقائے دوام کی تدبیر کریں لیکن بے سود۔ ہمیشہ ایک ہی عذر پیش کرتے رہے یعنی دوسروں کے کاموں سے فرصت نہیں۔

یہ افسوس کا مقام ہے کہ جس شخص [illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد [illegible] کا انتخاب (انتخاب جمہور) مرتب کیا تھا جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔

شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیتوں کا اپنے لیے بھرپور استعمال کرتے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی۔ دوسروں کے غم و خوشی میں برابر کا شریک۔ محفلوں کی رونق حق کا حامی، ضرورت مندوں کا حاجت روا۔ اس طرح چل بسا کہ مرنے کا یقین نہیں ہوتا۔ بس ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ کہیں چلے گئے ہوں اور پھر آجائیں گے ؎

نزدیک [illegible]
مگر [illegible]

حواشی:

۱۔ ۲۲ نومبر ۱۹۹۱ء کی رات کو اپنے آبائی وطن رائے بریلی میں قلبی دورہ پڑنے سے انتقال ہوا۔ دوسرے دن وہیں تدفین ہوئی۔ ۸۰ سال کی عمر پائی۔ (سن پیدائش ۱۹۱۱ء)۔

۲۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون "نیاز فتح پوری۔ جن کی شاگردی پر مجھے ناز ہے" مطبوعہ دو ماہی 'اکادمی' مارچ/اپریل ۱۹۸۵ء۔ اس شمارے میں صباح الدین عمر صاحب کا بھی ایک مضمون شامل ہے

"نذر نیاز" یہ مقالے اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ نیاز فتح پوری سیمینار میں پڑھے گئے [illegible] مضمون [illegible] کے بعد مجھ پر بھی ایسا ہی مضمون لکھے [illegible]

۳۔ [illegible]ERS ON ATLANTOLOGY: [illegible]FLICT MAN'S

[illegible]

ڈاکٹر نسیم اقتدار علی
۲۱۔ نیوبیری کا روڈ۔ لکھنؤ

صباح الدین عمر

کئی سال پہلے کی بات ہے صباح الدین صاحب مرحوم کے کچھ بے تکلف ساتھیوں نے جن میں جناب رشید حسن خاں اور ڈاکٹر محمود الٰہی وغیرہ شامل تھے، یہ طے کیا کہ صباح الدین صاحب پر کچھ مضامین لکھوائے جائیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ آپ بھی کچھ لکھئے یہ مضمون میں نے اسی وقت لکھا تھا۔ لکھنے کے بعد میں نے صباح الدین صاحب سے عرض کیا، "آپ پر ایک مضمون یونہی معمولی سا لکھا ہے ابھی مکمل نہیں ہے، دیکھ لیجئے"۔ خلافِ معمول اُس روز وہ کچھ غمگین سے تھے کہنے لگے: "کیا دیکھیں، آپ ہمارے مرنے کے بعد لکھئے گا"۔ اُن کے اچانک انتقال کے بعد ابھی کچھ لکھنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکی ہوں لہٰذا یہ اُن کی زندگی میں لکھا ہوا مضمون ارسال ہے۔ ——— نسیم اقتدار علی

قطعۂ تاریخ وفات

نازتھا اُردو کو جس کی ذات پر
وہ صباح الدین عمر بھی اُٹھ گیا
لکھ دو ساجدؔ یہ عیاں سالِ وفات
خادمِ اُردو حقیقت میں وہ تھا
۱۹۹۱ء

سید محمد رضا ساجد رضوی
۸۱۔ مقبرۂ عالیہ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

یاد ش بخیر یہی کوئی پندرہ سولہ سال [illegible] اس وقت تک [illegible]
ایک [illegible]
پہلے [illegible]
کچھ سالان [illegible] برس دو برس
[illegible] مدت یوں زیادہ گراں نہیں گزرتی ہر
[illegible] اور حسین دلاسوں سے آپ کی ہمت بندھائے
[illegible] بزم اُردو، کے کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری
[illegible] لی۔ کئی ہفتے گزر گئے کارڈوں کا پتہ نہیں۔
[illegible] پر یاد دہانی کراتی رہی۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔
"اب تو ساتواں شان دار ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔ کارڈ چھپ کر کب ملیں گے۔؟"
بہت ہنسے اور کہنے لگے "آپ اخبار میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع

دلچسپ ہے اکثر دیر تک ان کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ بیچ بیچ میں قہقہے لگاتیں۔ یقین نہ آتا کہ ان صاحب کی باتوں پر ہنس رہی ہیں کبھی کبھی وہ ان سے صلاح مشورہ بھی کرتیں۔ صباح الدین صاحب اس زمانے میں اُردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔ سچ پوچھیے تو اکاڈمی کی جو بنیاد وہ ڈال چکے تھے اور جس محنت و جاں فشانی سے انھوں نے یہ اکاڈمی قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں اکاڈمی کا دفتر قیصر باغ میں شیو نیر کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا اور میرے شوہر کا دفتر اسی عمارت کی نچلی منزل پر تھا۔ میرے شوہر وقت کے انتہائی پابند اور بے حد فرض شناس انسان ہیں۔ لیکن ان محترم سے وہ بھی ہار مان گئے تھے۔ خدا معلوم صبح کس وقت دفتر پہونچ جاتے اور شام ڈھلے بلکہ رات کے قریب بادل ناخواستہ دفتر سے اٹھتے، اس امید پر کہ جلد صبح ہو اور پھر دفتر میں جا بیٹھیں۔

ایک کرسی میز اور صباح الدین صاحب کی ذات سے اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی ابتدا ہوئی تھی، جو اس وقت ایک بے حد معتدر ادارہ بن چکی ہے اور ہندستان کی دوسری ریاستوں میں اسی کے نمونے اور دستورالعمل کو سامنے رکھ کر اردو اکاڈمیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ صباح الدین صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران ہی اُردو اکاڈمی ترقی کی تمام منزلیں طے کرکے بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ میں اتفاق سے اس زمانے میں خواتین کی تنظیم "بزمِ اُردو" کی صدر تھی۔ بزم کے چھوٹے جلسے تو اِدھر اُدھر ہو جاتے لیکن بڑے جلسوں کے لیے کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اُردو اکاڈمی اب جس عمارت میں ہے اس کا ہال اس کے لیے مناسب تھا۔ صباح الدین صاحب سے اب باضابطہ تعارف ہو چکا تھا میں نے ہال میں جلسہ کرنے کے لیے ان سے ٹیلی فون پر اجازت مانگی۔ بہت ہی ترش روئی کے ساتھ انھوں نے اجازت دے دی۔

جب میں نے عرض کیا کہ " دری اور چاندنی بھی مل جاتی تو اچھا تھا"۔ جواباً اسی اکھڑے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

" دری اور چاندنی ہم کرایے پر تو دیتے نہیں ہیں۔ خیر چلیے اگر دے بھی دیں تو آپ لوگوں کو دریاں جھڑوا کر بچھوانا ہوں گی اور چاندنی کی دھلائی بھی کرنا ہوگی۔"

ہم راضی ہو گئے۔ جلسے والے دن عین وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچی تھی، دیکھا تو ہال فرش فروش سے آراستہ ہے اور بعد میں بھی دھلائی دینے کا کوئی تقاضا نہ ہوا۔ ذاتِ شریف اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

منظور الامین صاحب نے گومتی ندی پر ایک سانیٹ لکھا۔ اکاڈمی میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں منظور الامین صاحب کو اپنا سانیٹ سنانا تھا اور پھر اس پر گفتگو ہونا تھی۔ اس وقت جناب شمس الرحمٰن فاروقی بھی لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ آغاز صباح الدین صاحب کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا،

" ایک صاحب اس پروگرام کے سخت خلاف تھے، مجھے ٹیلیفون بھی کیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے"۔ پھر زیرِ لب تبسم کے ساتھ شرکائے محفل کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "صاحب! ستم تو یہ ہے کہ وہ حضرت یہاں موجود ہیں۔"

سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے پھر سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

" سوچتا ہوں ان کا نام بتا ہی دوں"۔ دیدے ان کے چشمے کے اندر گردش کی اور ایک جگہ ٹک گئے۔ جب تک کوئی دیدہ ور سمجھتا، وہ بول پڑے "یہ ہیں بیگم رفیعہ منظور الامین !"

ہر طرف قہقہے لگنے لگے کہ یہ حریف فن تو شریک فن نکلا۔ اس تہ دار شخصیت کا ایک اور رُخ سامنے آیا۔

صباح الدین صاحب کی مدت ملازمت پوری ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کا وقت آیا۔ اردو اکاڈمی ہال میں ایک بڑا شاندار رخصتی جلسہ ہوا اور صباح الدین صاحب کو اکاڈمی نے رسمی طور پر رخصت کر دیا۔ لیکن اکاڈمی اور صباح الدین صاحب لازم و ملزوم تھے۔ وہ بھلا کیسے رخصت ہوتے۔ اکاڈمی ان کی عادت بن گئی تھی جو چھوڑے نہ چھوٹی تھی ۔ اور ادھر معاملہ یہ کہ اس دانائے راز کے بغیر اکاڈمی کا کام بھی نہ چلتا تھا اور بغیر صباح الدین صاحب اکاڈمی کا تصور ہی ناقص تھا۔ ایک اردو اکاڈمی ہی پر کیا منحصر، شہر میں کوئی بھی ادبی یا نیم ادبی تقریب ہو، بغیر ان کی شمولیت اسے ناقص ہی سمجھئے۔ وہ ڈائس پر تشریف فرما ہوں یا نہ ہوں، حاضرین میں شامل ہوں یا نہ ہوں پس پردہ ان کی کارگزاری اس میں ضرور شامل ہوتی۔ کبھی کبھی تو صدارتی تقریر انھیں کی تحریر کردہ

ہوتی۔ اور اگر یہ نہیں تو صلاح مشورہ اور یہ بھی نہیں تو پھر نستعلیق قسم کی
میٹھی تیغ! اور سب ہی کچھ جاتے ہیں

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

شہر بھر میں وہ کسی سے ناخوش نہیں، لیکن کھری کھری سنانے میں کسی کو بخشتے بھی نہیں، کسی گروپ یا تحریک سے وابستہ نہیں جو چاہے ان کو اپنے گروپ میں شمار کر لے اور جو چاہے اپنے گروپ سے انھیں خارج سمجھے ان کی بلا سے۔ یہاں بھی ایک لطیفہ سناتی چلوں۔ ایک مرتبہ میری کوئی تحریر دیکھ رہے تھے بعض الفاظ کے ساتھ ہمزہ لکھنے پر انھیں اعتراض تھا۔ اتفاق سے اس تحریر میں ہمزہ کئی مرتبہ آیا تھا۔ جھنجھلا کر سُرخ روشنائی والے قلم سے بار بار ہمزہ کاٹتے ہوئے کہنے لگے:

"آخر یہ ہر جگہ ہمزہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

میں بھی چڑ گئی۔ عرض کیا، "جی! یہ ہمزہ آپ ہی کی طرح بے ضرورت ہو یا نہ ہو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔"

بہت ہنسے۔ اور پھر جہاں واقعی ہمزہ ہونا ضروری تھا، وہاں دوبارہ اپنے قلم سے بنا دیا۔

صباح الدین صاحب ہر کام نک سک سے کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کام کرنے والا ہمت ہار جائے۔ ہاتھ جوڑے معافی مانگے کہ للہ ہمیں بخش دیجئے ہم ایسے کام سے باز آئے۔ لیکن اب وہ ہیں کہ کام پورا کروائے بغیر چھوڑنے کا نام نہیں لیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ آٹھ دن کا کام برس دو برس میں پورا ہو۔ لیکن یہ برس دو برس کی مدت یوں زیادہ گراں نہیں گزرتی ہے کہ وہ خوبصورت وعدوں اور حسین دلاسوں سے آپ کی ہمت بندھائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ 'بزم اُردو' کے کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی۔ کئی ہفتے گزر گئے، کارڈوں کا پتہ نہیں۔ میں بار بار ٹیلی فون پر یاد دہانی کراتی رہی۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔

"اب تو ساتواں شان دار ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔ کارڈ چھپ کر کب ملیں گے۔؟"

بہت ہنسے اور کہنے لگے "آپ اخبار میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع کر دیجئے۔"

اپنا ایک اور لطیفہ وہ خود مزے لے لے کر سناتے اور اس سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ خواتین کی تنظیم 'بزم اُردو' کے کاموں میں ہم لوگوں کی درخواست پر بہت دلچسپی لیتے اور صلاح مشورہ دیتے رہتے ایک مرتبہ کسی نے کہا۔

"صباح الدین صاحب! آپ زنانی تنظیم میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟"

محترمہ قدسیہ ہاشمی کے صاحبزادے سن رہے تھے، وہ بولے:

"اس لیے کہ چچا زنانہ پارک کے پاس رہتے ہیں۔"

صباح الدین صاحب یہ جملہ سُن کر پھڑک اُٹھے۔ جب تک کسی سے تکلف ہو، وہ خاموش نظر آئیں گے۔ ذرا بے تکلف ہوئے پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار۔ بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں اور شاید اسی لیے کوئی اُن کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کسی کی رورعایت نہیں کرتے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ عیب واضح کرنے سے نہیں چوکتے لیکن ان سب کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔

□□

قطعۂ تاریخ وفات

ناز تھا اُردو کو جس کی ذات پر
وہ صباح الدین عمر بھی اُٹھ گیا
لکھ دو ساجد ہے عیاں سالِ وفات
خادمِ اُردو حقیقت میں وہ تھا

۱۹۹۱ء

سید محمد رضا ساجد رضوی
۸۱ ۔ مقبرۂ عالیہ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

وغیرہ سے اکثر وہ چونکہ ان کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ بیچ بیچ میں قہقہے لگاتیں۔ یقین نہ آتا کہ ان صاحب کی باتوں پر ہنس رہی ہیں کبھی کبھی وہاں سے صلاح مشورہ بھی کرتیں۔ صباح الدین صاحب اس زمانے میں اُردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔ سچ پوچھیے تو اکاڈمی کی بنیاد وہی تھے اور جس محنت و جاں فشانی سے انھوں نے یہ اکاڈمی قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں اکاڈمی کا دفتر قیصر باغ میں تیسو نمبر کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا اور میرے شوہر کا دفتر اسی عمارت کی نچلی منزل پر تھا۔ میرے شوہر وقت کے انتہائی پابند اور بے حد فرض شناس انسان ہیں، لیکن ان محترم سے وہ بھی ہار مان گئے تھے۔ خدا معلوم صبح کس وقت دفتر پہونچ جاتے اور شام ڈھلے بلکہ رات کے قریب با دل ناخواستہ دفتر سے اٹھتے، اس امید پر کہ جلد صبح ہو اور پھر دفتر میں جا بیٹھیں۔

ایک کرسی میز اور صباح الدین صاحب کی ذات سے اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی ابتدا ہوئی تھی، جو اس وقت ایک بے حد مقتدر ادارہ بن چکی ہے اور ہندستان کی دوسری ریاستوں میں اسی کے نمونے اور دستور العمل کو سامنے رکھ کر اردو اکاڈمیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ صباح الدین صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران ہی اُردو اکاڈمی ترقی کی تمام منزلیں طے کرکے بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ میں اتفاق سے اس زمانے میں خواتین کی تنظیم "بزم اُردو" کی صدر تھی۔ بزم کے چھوٹے جلسے تو ادھر ادھر ہو جاتے لیکن بڑے جلسوں کے لیے کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اُردو اکاڈمی اب جس عمارت میں ہے اس کا ہال اس کے لیے مناسب تھا۔ صباح الدین صاحب سے اب باضابطہ تعارف ہو چکا تھا میں نے ہال میں جلسہ کرنے کے لیے ان سے ٹیلی فون پر اجازت مانگی۔ بہت ہی ترش روئی کے ساتھ انھوں نے اجازت دے دی۔

جب میں نے عرض کیا کہ " دری اور چاندنی بھی مل جاتی تو اچھا تھا"۔ جواباً اسی اکھڑے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

" دری اور چاندنی ہم کرایے پر تو دیتے نہیں ہیں۔ خیر چلیے اگر دے بھی دیں تو آپ لوگوں کو دریاں جھڑواکر، بچھوانا ہوں گی اور چاندنی کی دھلائی دینا ہوگی۔"

پھر راضی ہو گئے۔ جلسے والے دن میں وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئی تھی، دیکھا تو ہال فرش فروش سے آراستہ ہے اور بعد میں بھی دھلائی دینے کا کوئی تقاضا نہ ہوا ۔۔ ذات شریف اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

منظور الامین صاحب نے گومتی ندی پر ایک سانیٹ لکھا۔ اکاڈمی میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں منظور الامین صاحب کو اپنا سانیٹ سنانا تھا اور پھر اس پر گفتگو ہونا تھی۔ اس وقت جناب شمس الرحمن فاروقی بھی لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ آغاز صباح الدین صاحب کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا،

" ایک صاحب اس پروگرام کے سخت خلاف تھے، مجھے ٹیلیفون بھی کیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے"۔ پھر زیر لب تبسم کے ساتھ شرکائے محفل کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "صاحب! ستم تو یہ ہے کہ وہ حضرت یہاں موجود ہیں۔"

سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے پھر سوگ کی صورت بنا کر کہا۔

" سوچتا ہوں ان کا نام بتا ہی دوں۔" دیدوں نے چشمے کے اندر گردش کی اور ایک جگہ ٹک گئے۔ جب تک کوئی دیدہ ور سمجھتا، وہ بول پڑے " یہ ہیں بیگم رفیعہ منظور الامین!"

ہر طرف قہقہے گونجنے لگے کہ یہ حریف تو شریک فن نکلا۔ اس تہ دار شخصیت کا ایک اور رخ سامنے آیا۔

صباح الدین صاحب کی مدت ملازمت پوری ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کا وقت آیا۔ اردو اکاڈمی ہال میں ایک عظیم الشان الوداعی جلسہ ہوا اور صباح الدین صاحب کو اکاڈمی نے رسمی طور پر رخصت کر دیا۔ لیکن اکاڈمی اور صباح الدین صاحب لازم و ملزوم تھے۔ وہ بھلا کیسے رخصت ہوتے۔ اکاڈمی ان کی عادت بن گئی تھی جو چھڑائے نہ چھوٹی تھی ۔۔ اور ادھر معاملہ یہ کہ اس دانائے راز کے بغیر اکاڈمی کا کام بھی نہ چلتا تھا اور بغیر صباح الدین صاحب اکاڈمی کا تصور ہی ناقص تھا۔ ایک اردو اکاڈمی ہی پر کیا منحصر، شہر میں کوئی بھی ادبی یا نیم ادبی تقریب ہو، بغیر ان کی شمولیت اسے ناقص ہی سمجھئے۔ وہ ڈائس پر تشریف فرما ہوں یا نہ ہوں، حاضرین میں شامل ہوں یا نہ ہوں پس پردہ ان کی کارگزاری اس میں ضرور شامل ہوتی۔ کبھی کبھی تو صدارتی تقریر انھیں کی تحریر کردہ

ہوتی۔ اور اگر یہ نہیں تو صلاح مشورہ اور یہ بھی نہیں تو کچھ نستعلیق قسم کی میں میخ! اور سب ہی کچھ جانتے ہیں کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

شہر بھر میں وہ کسی سے ناخوش نہیں، لیکن کھری کھری سنانے میں کسی کو بخشتے بھی نہیں، کسی گروپ یا تحریک سے وابستہ نہیں جو چاہے ان کو اپنے گروپ میں شمار کر لے اور جو چاہے اپنے گروپ سے انھیں خارج سمجھے ان کی بلا سے۔ یہاں بھی ایک لطیفہ سناتی چلوں۔ ایک مرتبہ میری کوئی تحریر دیکھ رہے تھے بعض الفاظ کے ساتھ ہمزہ لکھنے پر انھیں اعتراض تھا۔ اتفاق سے اس تحریر میں ہمزہ کئی مرتبہ آیا تھا۔ جھنجھلا کر سُرخ روشنائی والے قلم سے بار بار ہمزہ کاٹتے ہوئے کہنے لگے:

"آخر یہ ہر جگہ ہمزہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

میں بھی چڑ گئی۔ عرض کیا، "جی! یہ ہمزہ آپ ہی کی طرح ہے ضرورت ہو یا نہ ہو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔"

بہت ہنسے۔ اور پھر جہاں واقعی ہمزہ ہونا ضروری تھا، وہاں دوبارہ اپنے قلم سے بنا دیا۔

صباح الدین صاحب ہر کام نک سُک سے کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کام کرنے والا ہمت ہار جائے۔ ہاتھ جوڑے معافی مانگے کہ للہ ہمیں بخش دیجیے ہم ایسے کام سے باز آئے۔ لیکن اب وہ ہیں کہ کام پورا کروائے بغیر چھوڑنے کا نام نہیں لیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ آٹھ دن کا کام برس دو برس میں پورا ہو۔ لیکن یہ برس دو برس کی مدت یوں زیادہ گراں نہیں گزرتی ہے کہ وہ خوبصورت وعدوں اور حسین دلاسوں سے آپ کی ہمت بندھائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ 'بزمِ اُردو' کے کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی۔ کئی ہفتے گزر گئے کارڈوں کا پتہ نہیں۔ میں بار بار ٹیلی فون پر یاد دہانی کراتی رہی۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔

"اب تو ساتواں شاندار ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔ کارڈ چھپ کر کب ملیں گے۔؟"

بہت ہنسے اور کہنے لگے "آپ اخبار میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع کر دیجیے۔"

اپنا ایک اور لطیفہ وہ خود مزے لے لے کر سناتے اور اس سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ خواتین کی تنظیم 'بزمِ اُردو' کے کاموں میں ہم لوگوں کی درخواست پر بہت دلچسپی لیتے اور صلاح مشورہ دیتے رہتے ایک مرتبہ کسی نے کہا۔

"صباح الدین صاحب! آپ زنانی تنظیم میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟"

محترمہ قدسیہ ہاشمی کے صاحبزادے سُن رہے تھے، وہ بولے:

"اس لیے کہ چچا زنانہ پارک کے پاس رہتے ہیں۔"

صباح الدین صاحب یہ جملہ سُن کر پھڑک اُٹھے۔ جب تک کسی سے تکلف ہو، وہ خاموش نظر آئیں گے۔ ذرا بے تکلف ہوئے پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار۔ بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں اور شاید اسی لیے کوئی اُن کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ عیب واضح کرنے سے نہیں چوکتے لیکن ان سب کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے ع

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔

□□

قطعۂ تاریخِ وفات

نازتھا اُردو کو جس کی ذات پر
وہ صباح الدین عمر بھی اُٹھ گیا

لکھ دو ساجدؔ ہی عیاں سالِ وفات
خادمِ اُردو حقیقت میں وہ تھا

۱۹۹۱ء

سید محمد رضا ساجدؔ رضوی
۸۱۔ مقبرۂ عالیہ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

بہت اکثر و بیشتر ان کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ بیچ بیچ میں قہقہے لگاتیں۔ یقین ہو آتا کہ ان صاحب کی باتوں پر ہنس رہی ہیں کبھی کبھی وہ ان سے صلاح مشورہ بھی کرتیں۔ صباح الدین صاحب اس زمانے میں اُردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔ سچ پوچھیے تو اکاڈمی کی جڑ بنیاد وہی تھے اور جس محنت وجاں فشانی سے انھوں نے یہ اکاڈمی قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں اکاڈمی کا دفتر قیصر باغ میں چھوٹی سی کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا اور میرے شوہر کا دفتر اسی عمارت کی نچلی منزل پر تھا۔ میرے شوہر وقت کے انتہائی پابند اور بے حد فرض شناس انسان ہیں۔ لیکن ان محترم سے وہ بھی ہار مان گئے تھے۔ خدا معلوم صبح کس وقت دفتر پہونچ جاتے اور شام ڈھلے بلکہ رات کے قریب بادل ناخواستہ دفتر سے اٹھتے، اس امید پر کہ جلد صبح ہو اور پھر دفتر میں جا بیٹھیں۔

ایک کرسی میز اور صباح الدین صاحب کی ذات سے اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی ابتدا ہوئی تھی، جو اس وقت ایک بے حد مقتدر ادارہ بن چکی ہے اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں اسی کے نمونے اور دستورالعمل کو سامنے رکھ کر اردو اکاڈمیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ صباح الدین صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران ہی اُردو اکاڈمی ترقی کی تمام منزلیں طے کرکے بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ میں اتفاق سے اس زمانے میں خواتین کی تنظیم "بزم اُردو" کی صدر تھی۔ بزم کے چھوٹے جلسے تو ادھر ادھر ہو جاتے لیکن بڑے جلسوں کے لیے کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اُردو اکاڈمی اب جس عمارت میں ہے اس کا ہال اس کے لیے مناسب تھا۔ صباح الدین صاحب سے اب باضابطہ تعارف ہو چکا تھا میں نے ہال میں جلسہ کرنے کے لیے ان سے ٹیلی فون پر اجازت مانگی۔ بہت ہی ترش روئی کے ساتھ انھوں نے اجازت دے دی۔

جب میں نے عرض کیا کہ " دری اور چاندنی بھی مل جاتی تو اچھا تھا۔ جواباً اسی اکھڑے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

" دری اور چاندنی ہم کرایے پر تو دیتے نہیں ہیں۔ خیر چلیے اگر دے بھی دیں تو آپ لوگوں کو دریاں جھڑوا کر بچھوانا ہوں گی اور چاندنی کی دھلائی دینا ہوگی۔"

ہم راضی ہو گئے۔ جلسے والے دن مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئی، دیکھا تو ہال فرش فروش سے آراستہ ہے اور بعد میں بھی دھلائی دینے کا کوئی تقاضا نہ ہوا۔ ذات شریف اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

منظور الامین صاحب نے گومتی ندی پر ایک سائینٹ لکھا۔ اکاڈمی میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں منظور الامین صاحب کو اپنا سائینٹ سنانا تھا اور پھر اس پر گفتگو ہونا تھی۔ اس وقت جناب شمس الرحمن فاروقی بھی لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ آغاز صباح الدین صاحب کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا،

" ایک صاحب اس پروگرام کے سخت خلاف تھے، مجھے ٹیلیفون بھی کیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے"۔ پھر زیر لب تبسم کے ساتھ شرکائے محفل کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "صاحب! ستم تو یہ ہے کہ وہ حضرت یہاں موجود ہیں۔"

سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے پھر سوکھی صورت بنا کر کہا۔

" سوچتا ہوں ان کا نام بتا ہی دوں۔" دیدوں نے چشمے کے اندر گردش کی اور ایک جگہ ٹک گئے۔ جب تک کوئی دیدہ ور سمجھتا، وہ بول پڑے

" یہ ہیں بیگم رفیعہ منظور الامین!"

ہر طرف قہقہے لگنے لگے کہ یہ حریف فن تو شریک فن نکلا۔ اس تہ دار شخصیت کا ایک اور رخ سامنے آیا۔

صباح الدین صاحب کی مدت ملازمت پوری ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کا وقت آیا۔ اردو اکاڈمی ہال میں ایک بڑا شاندار رخصتی جلسہ ہوا اور صباح الدین صاحب کو اکاڈمی نے رسمی طور پر رخصت کر دیا۔ لیکن اکاڈمی اور صباح الدین صاحب لازم وملزوم تھے۔ وہ بھلا کیسے رخصت ہوتے۔ اکاڈمی ان کی عادت بن گئی تھی جو چھڑائے نہ چھوٹتی تھی۔ اور ادھر معاملہ یہ کہ اس دانائے راز کے بغیر اکاڈمی کا کام بھی نہ چلتا تھا اور بغیر صباح الدین صاحب اکاڈمی کا تصور ہی ناقص تھا۔ ایک اردو اکاڈمی ہی پر کیا منحصر، شہر میں کوئی بھی ادبی یا نیم ادبی تقریب ہو، بغیر ان کی شمولیت اسے ناقص ہی سمجھیے۔ وہ ڈائس پر تشریف فرما ہوں یا نہ ہوں، حاضرین میں شامل ہوں یا نہ ہوں پس پردہ ان کی کارگزاری اس میں ضرور شامل ہوتی۔ کبھی کبھی تو صدارتی تقریر انھیں کی تحریر کردہ

ہوتی۔ اور اگر یہ نہیں تو صلاح مشورہ اور یہ بھی نہیں تو کچھ نستعلیق قسم کی میٹھی میخ! اور سب ہی سمجھ جاتے ہیں کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

شہر بھر میں وہ کسی سے ناخوش نہیں، لیکن کھری کھری سُنانے میں کسی کو بخشتے بھی نہیں، کسی گروپ یا تحریک سے وابستہ نہیں جو چاہے ان کو اپنے گروپ میں شمار کرلے اور جو چاہے اپنے گروپ سے انھیں خارج سمجھے ان کی بلا سے۔ یہاں بھی ایک لطیفہ سناتی چلوں۔ ایک مرتبہ میری کوئی تحریر دیکھ رہے تھے بعض الفاظ کے ساتھ ہمزہ لکھنے پر انھیں اعتراض تھا۔ اتفاق سے اس تحریر میں ہمزہ کئی مرتبہ آیا تھا۔ جھنجھلا کر سُرخ روشنائی والے قلم سے بار بار ہمزہ کاٹتے ہوئے کہنے لگے:

"آخر یہ ہر جگہ ہمزہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

میں بھی چڑ گئی۔ عرض کیا، "جی! یہ ہمزہ آپ ہی کی طرح ہے ضرورت ہو یا نہ ہو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔"

بہت ہنسے۔ اور پھر جہاں واقعی ہمزہ ہونا ضروری تھا، وہاں دوبارہ اپنے قلم سے بنا دیا۔

صباح الدین صاحب ہر کام نک سُک سے کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کام کرنے والا ہمت ہار جائے۔ ہاتھ جوڑے معافی مانگے کہ لِلّٰہ ہمیں بخش دیجیے ہم ایسے کام سے باز آئے۔ لیکن اب وہ ہیں کہ کام پورا کروائے بغیر چھوڑنے کا نام نہیں لیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ آٹھ دن کا کام برس دو برس میں پورا ہو۔ لیکن یہ برس دو برس کی مدت یوں زیادہ گراں نہیں گزرتی ہر کہ وہ خوبصورت وعدوں اور حسین دلاسوں سے آپ کی ہمت بندھائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ 'بزم اُردو' کے کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی۔ کئی ہفتے گزر گئے' کارڈوں کا پتہ نہیں۔ میں بار بار ٹیلی فون پر یاد دہانی کراتی رہی۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔

"اب تو ساتواں شاندار ہفتہ شروع ہوگیا ہے۔ کارڈ چھپ کر کب ملیں گے۔؟"

بہت ہنسے اور کہنے لگے "آپ اخبار میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع کر دیجیے۔"

اپنا ایک اور لطیفہ وہ خود مزے لے لے کر سناتے اور اس سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ خواتین کی تنظیم 'بزمِ اُردو' کے کاموں میں ہم لوگوں کی درخواست پر بہت دلچسپی لیتے اور صلاح مشورہ دیتے رہتے ایک مرتبہ کسی نے کہا۔

"صباح الدین صاحب! آپ زنانی تنظیم میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟"

محترمہ قدسیہ ہاشمی کے صاحبزادے سُن رہے تھے، وہ بولے:

"اس لیے کہ چچا زنانہ پارک کے پاس رہتے ہیں۔"

صباح الدین صاحب یہ جملہ سُن کر پھڑک اُٹھے۔ جب تک کسی سے تکلف ہو' وہ خاموش نظر آئیں گے۔ ذرا بے تکلف ہوئے پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار۔ بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں اور شاید اسی لیے کوئی اُن کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ عیب واضح کرنے سے نہیں چوکتے لیکن ان سب کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ

با دوستاں تلطف با دُشمناں مدارا

اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔

□□

قطعۂ تاریخِ وفات

نازتھا اُردو کو جس کی ذات پر
وہ صباح الدین عمر بھی اُٹھ گیا

لکھ دو ساجدؔ یہ عیاں سالِ وفات
خادمِ اُردو حقیقت میں وہ تھا

۱۹۹۱ء

سید محمد رضا ساجدؔ رضوی
۸۱۔ مقبرۂ عالیہ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

اکثر دیر تک ان کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ بیچ بیچ میں قہقہے لگاتیں۔ یقین نہ آتا کہ اللہ صاحب کی باتوں پر ہنس رہی ہیں۔ کبھی کبھی وہ ان سے صلاح مشورہ بھی کرتیں۔ صباح الدین صاحب اس زمانے میں اُردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔ سچ پوچھیے تو اکاڈمی کی جڑ بنیاد وہی تھے اور جس محنت و جاں فشانی سے انھوں نے یہ اکاڈمی قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں اکاڈمی کا دفتر قیصر باغ میں سیو نمبر کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا اور میرے شوہر کا دفتر اسی عمارت کی نچلی منزل پر تھا۔ میرے شوہر وقت کے انتہائی پابند اور بے حد فرض شناس انسان ہیں۔ لیکن ان محترم سے وہ بھی ہار مان گئے تھے۔ خدا معلوم صبح کس وقت دفتر پہونچ جاتے اور شام ڈھلے بلکہ رات کے قریب بادلِ ناخواستہ دفتر سے اٹھتے، اس امید پر کہ جلد صبح ہو اور پھر دفتر میں جا بیٹھیں۔

ایک کرسی میز اور صباح الدین صاحب کی ذات سے اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی ابتدا ہوئی تھی، جو اس وقت ایک بے حد مقتدر ادارہ بن چکی ہے اور ہندستان کی دوسری ریاستوں میں اسی کے نمونے اور دستور العمل کو سامنے رکھ کر اردو اکاڈمیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ صباح الدین صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران ہی اُردو اکاڈمی ترقی کی تمام منزلیں طے کر کے بامِ عروج پر پہونچ چکی تھی۔ میں اتفاق سے اس زمانے میں خواتین کی تنظیم "بزمِ اُردو" کی صدر تھی۔ بزم کے چھوٹے جلسے تو ادھر ادھر ہو جاتے لیکن بڑے جلسوں کے لیے کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اُردو اکاڈمی اب جس عمارت میں ہے اس کا ہال اس کے لیے مناسب تھا۔ صباح الدین صاحب سے اب باضابطہ تعارف ہو چکا تھا میں نے ہال میں جلسہ کرنے کے لیے ان سے ٹیلی فون پر اجازت مانگی۔ جھٹ ہی ترش روئی کے ساتھ انھوں نے اجازت دے دی۔

جب میں نے عرض کیا کہ "دری اور چاندنی بھی مل جاتی تو اچھا تھا"۔ جواباً اسی اکھڑے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

"دری اور چاندنی ہم کرایے پر تو دیتے نہیں ہیں۔ خیر چلیے اگر ... تو آپ لوگوں کو دریاں جھڑوا کر بچھوا دوں گی اور چاندنی ... ہو گی"

ہم راضی ہو گئے۔ جلسے والے دن جس وقت سے کچھ پہلے ہی جا پہنچی تھی، دیکھا تو ہال فرش فروش سے آراستہ ہے اور بعد میں بھی دھلائی دینے کا کوئی تقاضا نہ ہوا۔ ذاتِ شریف اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

منظور الامین صاحب نے گومتی ندی پر ایک سانیٹ لکھا۔ اکاڈمی میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں منظور الامین صاحب کو اپنا سانیٹ سنانا تھا اور پھر اس پر گفتگو ہونا تھی۔ اس وقت جناب شمس الرحمٰن فاروقی بھی لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ آغاز صباح الدین صاحب کی تعارفی تقریر سے ہوا دوران گفتگو انھوں نے فرمایا:

"ایک صاحب اس پروگرام کے سخت خلاف تھے، مجھے ٹیلیفون بھی کیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے"۔ پھر زیرِ لب تبسم کے ساتھ شرکائے محفل کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "صاحب! ستم تو یہ ہے کہ وہ حضرت یہاں موجود ہیں۔"

سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے پھر سوکھی صورت بنا کر کہا۔

"سوچتا ہوں ان کا نام بتا ہی دوں"۔ دیدوں نے چشمے کے اندر گردش کی اور ایک جگہ ٹک گئے۔ جب تک کوئی دیدہ ور سمجھتا، وہ بول پڑے "یہ ہیں بیگم رفیعہ منظور الامین!"

ہر طرف قہقہے لگنے لگے کہ یہ حریفِ فن تو شریک فن نکلا۔ اس تہ دار شخصیت کا ایک اور رُخ سامنے آیا۔

صباح الدین صاحب کی مدتِ ملازمت پوری ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کا وقت آیا۔ اردو اکاڈمی ہال میں ایک پُرشان دار رخصتی جلسہ ہوا اور صباح الدین صاحب کو اکاڈمی نے رسمی طور پر رخصت کر دیا۔ لیکن اکاڈمی اور صباح الدین صاحب لازم و ملزوم تھے۔ وہ بھلا کیسے رخصت ہوتے۔ اکاڈمی ان کی عادت بن گئی تھی جو چھڑائے نہ چھوٹتی تھی۔ اور ادھر معاملہ یہ کہ اس دانائے راز کے بغیر اکاڈمی کا کام بھی نہ چلتا تھا اور بغیر صباح الدین صاحب اکاڈمی کا تصور ہی ناقص تھا۔ ایک اردو اکاڈمی ہی پر کیا منحصر، شہر میں کوئی بھی ادبی یا نیم ادبی تقریب ہو، بغیر ان کی شمولیت اسے ناقص ہی سمجھتے۔ وہ ڈائس پر تشریف فرما ہوں یا نہ ہوں، حاضرین میں شامل ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی کارگزاری اس میں ضرور شامل ہوتی۔ کبھی کبھی تو ... تقریب ... کی ...

ہوتی۔ اور اگر یہ نہیں تو صلاح مشورہ اور یہ بھی نہیں تو پھر نستعلیق قسم کی میٹنگ! اور سب ہی سمجھ جاتے ہیں کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

شہر بھر میں وہ کسی سے ناخوش نہیں، لیکن کھری کھری سُنانے میں کسی کو بخشتے بھی نہیں، کسی گروپ یا تحریک سے وابستہ نہیں جو چاہے ان کو اپنے گروپ میں شمار کر لے اور جو چاہے اپنے گروپ سے انھیں خارج سمجھے ان کی بلا سے۔ یہاں بھی ایک لطیفہ سناتی چلوں۔ ایک مرتبہ میری کوئی تحریر دیکھ رہے تھے بعض الفاظ کے ساتھ ہمزہ لکھنے پر انھیں اعتراض تھا۔ اتفاق سے اس تحریر میں ہمزہ کئی مرتبہ آیا تھا۔ جھنجھلا کر سُرخ روشنائی والے قلم سے بار بار ہمزہ کاٹتے ہوئے کہنے لگے:

"آخر یہ ہر جگہ ہمزہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

میں بھی چڑ گئی ــــ عرض کیا: "جی! یہ ہمزہ آپ ہی کی طرح ہے ضرورت ہو یا نہ ہو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔"

بہت ہنسے۔ اور پھر جہاں واقعی ہمزہ ہونا ضروری تھا، وہاں دوبارہ اپنے قلم سے بنا دیا۔

صباح الدین صاحب ہر کام نک سک سے کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کام کرنے والا ہمت ہار جائے۔ ہاتھ جوڑ کے معافی مانگے کہ لِلّٰہ ہمیں بخش دیجیے ہم ایسے کام سے باز آئے۔ لیکن اب وہ ہیں کہ کام پورا کروائے بغیر چھوڑنے کا نام نہیں لیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ آٹھ دن کا کام برس دو برس میں پورا ہو۔ لیکن یہ برس دو برس کی مدت یوں زیادہ گراں نہیں گزرتی ہے کہ وہ خوبصورت وعدوں اور حسین دلاسوں سے آپ کی ہمت بندھائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ 'بزم اُردو' کے کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی۔ کئی ہفتے گزر گئے کارڈوں کا پتہ نہیں۔ میں بار بار ٹیلی فون پر یاد دہانی کراتی رہی۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔

"اب تو ساتواں شان دار ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔ کارڈ چھپ کر کب ملیں گے۔؟"

بہت ہنسے اور کہنے لگے "آپ اخبار میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع کر دیجیے۔"

اپنا ایک اور لطیفہ وہ خود مزے لے لے کر سناتے اور اس سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ خواتین کی تنظیم 'بزم اُردو' کے کاموں میں ہم لوگوں کی درخواست پر بہت دل چسپی لیتے اور صلاح مشورہ دیتے دیتے ایک مرتبہ کسی نے کہا۔

"صباح الدین صاحب! آپ زنانی تنظیم میں اتنی دل چسپی کیوں لیتے ہیں؟"

محترمہ قدسیہ ہاشمی کے صاحبزادے سُن رہے تھے، وہ بولے:

"اس لیے کہ چچا زنانہ پارک کے پاس رہتے ہیں۔"

صباح الدین صاحب یہ جملہ سُن کر پھڑک اُٹھے۔ جب تک کسی سے تکلف ہو، وہ خاموش نظر آئیں گے۔ ذرا بے تکلف ہوئے پھر دیکھئے اندازِ گُل افشانیِ گفتار۔ بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں اور شاید اسی لیے کوئی اُن کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ عیب واضح کرنے سے نہیں چوکتے لیکن ان سب کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے ؎

با دوستاں تلطف با دُشمناں مدارا

اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔

□□

قطعۂ تاریخِ وفات

نازتھا اُردو کو جس کی ذات پر
وہ صباح الدین عمر بھی اُٹھ گیا

لکھ دو ساجدؔ یہ عیاں سالِ وفات
خادمِ اُردو حقیقت میں وہ تھا

۱۹۹۱ء

سید محمد رضا ساجدؔ رضوی
۸۱۔ مقبرۂ عالیہ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

وجہ سے اکثر دیر تک ان کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ بیچ بیچ میں قہقہے لگاتیں۔ یقین نہ آتا کہ ان صاحب کی باتوں پر ہنس رہی ہیں کبھی کبھی وہ ان سے صلاح مشورہ بھی کرتیں۔ صباح الدین صاحب اس زمانے میں اُردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔ سچ پوچھیے تو اکاڈمی کی جڑ بنیاد وہی تھے اور جس محنت وجاں فشانی سے انھوں نے یہ اکاڈمی قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں اکاڈمی کا دفتر قیصر باغ میں تیوہ نمبر کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا اور میرے شوہر کا دفتر اسی عمارت کی نچلی منزل پر تھا۔ میرے شوہر وقت کے انتہائی پابند اور بے حد فرض شناس انسان ہیں۔ لیکن ان محترم سے وہ بھی ہار مان گئے تھے۔ خدا معلوم صبح کس وقت دفتر پہونچ جاتے اور شام ڈھلے بلکہ رات کے قریب بادل ناخواستہ دفتر سے اٹھتے، اس امید پر کہ جلد صبح ہو اور پھر دفتر میں جا بیٹھیں۔

ایک کرسی میز اور صباح الدین صاحب کی ذات سے اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی ابتدا ہوئی تھی، جو اس وقت ایک بے حد معتدر ادارہ بن چکی ہے اور ہندستان کی دوسری ریاستوں میں اسی کے نمونے اور دستورالعمل کو سامنے رکھ کر اردو اکاڈمیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ صباح الدین صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران ہی اُردو اکاڈمی ترقی کی تمام منزلیں طے کرکے بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ میں اتفاق سے اس زمانے میں خواتین کی تنظیم "بزم اُردو" کی صدر تھی۔ بزم کے چھوٹے جلسے تو ادھر ادھر ہو جاتے لیکن بڑے جلسوں کے لیے کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اُردو اکاڈمی اب جس عمارت میں ہے اس کا ہال اس کے لیے مناسب تھا۔ صباح الدین صاحب سے اب باضابطہ تعارف ہو چکا تھا میں نے ہال میں جلسہ کرنے کے لیے ان سے ٹیلی فون پر اجازت مانگی۔ بہت ہی ترش لہجے کے ساتھ انھوں نے اجازت دے دی۔

جب میں نے عرض کیا کہ " دری اور چاندنی بھی مل جاتی تو اچھا تھا"۔ جواباً اسی اکھڑے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

" دری اور چاندنی ہم کرایے پر تو دیتے نہیں ہیں۔ خیر چلیے اگر دے بھی دیں تو آپ لوگوں کو دریاں جھڑوا کر بچھوانا ہوں گی اور چاندنی کی دُھلائی دینا ہوگی۔"

ہم راضی ہو گئے۔ ... تھی، دیکھا تو ہال فرش فروش سے آراستہ ... دینے کا کوئی تقاضا نہ ہوا۔ ذات شریف اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ...

منظور الامین صاحب نے گومتی ندی پر ایک سائیٹ لکھا۔ اکاڈمی میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں منظور الامین صاحب کو اپنا سائیٹ سنانا تھا اور پھر اس پر گفتگو ہونا تھی۔ اس وقت جناب شمس الرحمن فاروقی بھی لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ آغاز صباح الدین صاحب کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا،

" ایک صاحب اس پروگرام کے سخت خلاف تھے، مجھے ٹیلیفون بھی کیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے"۔ پھر زیر لب تبسم کے ساتھ شرکائے محفل کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "صاحب! ستم تو یہ ہے کہ وہ حضرت یہاں موجود ہیں۔"

سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے پھر سوگ کی صورت بنا کر کہا۔

" سوچتا ہوں ان کا نام بتا ہی دوں۔" دیدوں نے چشمے کے اندر گردش کی اور ایک جگہ ٹک گئے۔ جب تک کوئی دیدہ ور سمجھتا، وہ بول پڑے " یہ ہیں بیگم رفیعہ منظور الامین!"

ہر طرف قہقہے لگنے لگے کہ یہ حریف فن تو شریک فن نکلا۔ اس تہ دار شخصیت کا ایک اور رُخ سامنے آیا۔

صباح الدین صاحب کی مدت ملازمت پوری ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کا وقت آیا۔ اردو اکاڈمی ہال میں ایک بڑا شاندار رخصتی جلسہ ہوا اور صباح الدین صاحب کو اکاڈمی نے رسمی طور پر رخصت کردیا۔ لیکن اکاڈمی اور صباح الدین صاحب لازم وملزوم تھے۔ وہ بھلا کیسے رخصت ہوتے۔ اکاڈمی ان کی عادت بن گئی تھی جو چھوڑے نہ چھوٹتی تھی۔ اور ادھر معاملہ یہ کہ اس دانائے راز کے بغیر اکاڈمی کا کام بھی نہ چلتا تھا اور بغیر صباح الدین صاحب اکاڈمی کا تصور ہی ناقص تھا۔ ایک اردو اکاڈمی ہی پر کیا منحصر، شہر میں کوئی بھی ادبی یا نیم ادبی تقریب ہو، بغیر ان کی شمولیت اسے ناقص ہی سمجھئے۔ وہ ڈائس پر تشریف فرما ہوں یا نہ ہوں، حاضرین میں شامل ہوں یا نہ ہوں پس پردہ ان کی کارگزاری اس میں ضرور شامل ہوتی۔ کبھی کبھی تو صدارتی تقریر انھیں کی تحریر کردہ

... [illegible] قسم کی ...

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

شہر بھر میں وہ کسی سے ناخوش نہیں، لیکن کھری کھری سنانے میں کسی کو بخشتے بھی نہیں، کسی گروپ یا تحریک سے وابستہ نہیں جو چاہے ان کو اپنے گروپ میں شمار کر لے اور جو چاہے اپنے گروپ سے انھیں خارج [illegible] ہوں۔ ایک مرتبہ میری کوئی تحریر دیکھ [illegible] پر انھیں اعتراض تھا۔ اتفاق سے [illegible] آیا تھا۔ جھنجھلا کر سرخ روشنائی والے قلم سے بار بار ہمزہ کاٹنے لگے:

"آخر یہ ہر جگہ ہمزہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

میں بھی چڑ گئی ـــ عرض کیا، "جی! یہ ہمزہ آپ ہی کی طرح ہے ضرورت ہو یا نہ ہو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔"

بہت ہنسے۔ اور پھر جہاں واقعی ہمزہ ہونا ضروری تھا، وہاں [illegible] اپنے قلم سے بنا دیا۔

صباح الدین صاحب ہر کام نک سک سے کرنا چاہتے ہیں اور [illegible] میں اُسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کام کرنے والا ہمت ہار جائے۔ ہاتھ جوڑے معافی مانگے کہ بلّہ ہمیں بخش دیجیے ہم ایسے کام سے باز آئے۔ لیکن اب وہ ہیں کہ کام پورا کروائے بغیر چھوڑنے کا نام نہیں لیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ آٹھ دن کا کام برس دو برس میں پورا ہو۔ لیکن یہ برس دو برس کی مدت یوں زیادہ گراں نہیں گزرتی کہ وہ خوبصورت وعدوں اور حسین دلاسوں سے آپ کی ہمت بندھائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ 'بزمِ اُردو' کے کارڈ چھپوانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی۔ کئی ہفتے گزر گئے کارڈوں کا پتہ نہیں۔ میں بار بار ٹیلیفون پر یاد دہانی کراتی رہی۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔

"اب تو ساتواں شان دار ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔ کارڈ چھپ کر کب ملیں گے۔؟"

بہت ہنسے اور کہنے لگے "آپ اخبار میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع

[illegible] کیجیے"

اپنا ایک اور لطیفہ وہ خود مزے لے لے کر سناتے اور اس سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ خواتین کی تنظیم 'بزمِ اُردو' کے کاموں میں ہم لوگوں کی درخواست پر بہت دل چسپی لیتے اور صلاح مشورہ دیتے رہتے ایک مرتبہ کسی نے کہا۔

"صباح الدین صاحب! آپ زنانی تنظیم میں اتنی دل چسپی کیوں لیتے ہیں؟"

محترمہ قدسیہ ہاشمی کے صاحبزادے سُن رہے تھے، وہ بولے:

"اس لیے کہ چچا زنانہ پارک کے پاس رہتے ہیں۔"

صباح الدین صاحب یہ جملہ سُن کر پھڑک اُٹھے۔ جب تک کسی سے تکلف ہو، وہ خاموش نظر آئیں گے۔ ذرا بے تکلف ہوئے پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار۔ بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں اور شاید اسی لیے کوئی اُن کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ عیب واضح کرنے سے نہیں چوکتے لیکن ان سب کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے ؎

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔

□□

قطعۂ تاریخِ وفات

نازتھا اُردو کو جس کی ذات پر
وہ صباح الدین عمر بھی اُٹھ گیا
لکھ دو ساجدؔ یہ عیاں سالِ وفات
خادمِ اُردو حقیقت میں وہ تھا

۱۹۹۱ء

سید محمد رضا ساجدؔ رضوی
۸۱ ـ مقبرۂ عالیہ ـ گولہ گنج ـ لکھنؤ

ذریعہ سے اکثر دیر تک ان کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ بیچ
بیچ میں قہقہے لگاتیں۔ یقین نہ آتا کہ ان صاحب کی باتوں پر ہنس رہی ہیں
کبھی کبھی وہ ان سے صلاح مشورہ بھی کرتیں۔ صباح الدین صاحب
اس زمانے میں اُردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔ سچ پوچھیے تو اکاڈمی
کی عزّ بنیاد وہی تھے اور جس محنت و جاں فشانی سے انھوں نے یہ اکاڈمی
قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں اکاڈمی کا دفتر قیصر باغ
میں تیبو نمبر کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا اور میرے شوہر کا دفتر اسی عمارت
کی نچلی منزل پر تھا۔ میرے شوہر وقت کے انتہائی پابند اور بے حد
فرض شناس انسان ہیں۔ لیکن ان سے ہم سے وہ بھی ہار مان گئے تھے۔
خدا معلوم صبح کس وقت دفتر پہونچ جاتے اور شام ڈھلے بلکہ رات کے
قریب بادل ناخواستہ دفتر سے اٹھتے۔ اس امید پر کہ جلد صبح ہو اور پھر
دفتر میں جا بیٹھیں۔

ایک کرسی میز اور صباح الدین صاحب کی ذات سے اتر پردیش
اُردو اکاڈمی کی ابتدا ہوئی تھی، جو اس وقت ایک بے حد مقتدر ادارہ بن چکی
ہے اور ہندستان کی دوسری ریاستوں میں اسی کے نمونے اور دستور العمل
کو سامنے رکھ کر اردو اکاڈمیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ صباح الدین صاحب
کی سکریٹری شپ کے دوران ہی اُردو اکاڈمی ترقی کی تمام منزلیں طے
کرکے بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ میں اتفاق...

... اور گرما گرم بحثیں ہو جائیں، تو

... سے عزت کو گھورتے ہوئے کہا۔
"یہ سنگترے لائے ہو۔!؟"

ہم راضی ہو گئے۔ جلسے والے دن ہم وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئی
تھی، دیکھا تو ہال فرش فروش سے آراستہ ہے اور بعد میں بھی ڈھلائی
دینے کا کوئی تقاضا نہ ہوا۔ ذات شریف اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔
منظور الامین صاحب نے گومتی ندی پر ایک سانیٹ لکھا۔ اکاڈمی
میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں منظور الامین صاحب کو اپنا سانیٹ
سنانا تھا اور پھر اس پر گفتگو ہونا تھی۔ اس وقت جناب شمس الرحمٰن
فاروقی بھی لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ آغاز
صباح الدین صاحب کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا،
" ایک صاحب اس پروگرام کے سخت خلاف تھے، مجھے ٹیلیفون بھی
کیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے "۔ پھر زیر لب تبسم کے ساتھ شرکائے
محفل کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "صاحب! ستم تو یہ ہے کہ وہ حضرت
یہاں موجود ہیں۔"
سب ایک دوسرے کا منہ ...
پھر سرگوشی کی صورت ...
"سوچتا ہوں ان کا نام بتا ہی دوں ..."
گردش کی اور ایک جگہ ٹک ...

ان کی قرابت ہوتی تھی۔ ان لوگوں سے بھی یاد اللہ ہو گئی اور اسی ہر کر
میرے لیے "ادبستان" اور کوٹھی کرار حسین ایک ہو گئیں۔

دل چسپ معلوم ہوئی۔ ...

کی نظروں سے نہیں گزرا ہے ان کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ
امداد کیوں نہ ملی۔ صباح الدین صاحب سے قرابت جو ٹھہری ۔۔۔ مگر
جو لوگ صباح الدین صاحب سے قرار واقعی واقف ہیں وہ ایسا نہیں

شہر بھر میں وہ کسی سے
کسی کو بخشتے بھی نہیں، کسی گروپ
ان کو اپنے گروپ میں شمار کر لے اور جو چاہے
خارج سمجھے ان کی بلا سے۔ یہاں بھی ایک
مرتبہ میری کوئی تحریر دیکھ رہے تھے بعض
پر انہیں اعتراض تھا۔ اتفاق
آیا تھا۔ جھنجھلا کر ...
ہے گئے۔
"[illegible]
[illegible]

... جانے بس
سب سب جانے بغیر گلوری منہ میں رکھ لی۔
"آخ تھو!!" کر کے اگالدان میں تھوک دی۔
... ہوئے بولے،
"... یہ بھی کوئی پان تھا!"
پان ... دسا وری کھاتے تھے وہ بھی کتھے چونے کے موافق
مزاج تناسب کے ساتھ — اور یہ تناسب گھر کے اور گھر میں بھی کسی
دستِ خاص کے لگائے ہوئے پانوں میں ہی انہیں ملتا۔
پان کے تئیں ان کی نازک مزاجی بلکہ کٹر پن کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ
پان کھانے والے کو، جب تک اس کے باب میں تعقد ہو
... اپنی ڈبیا سے پان کبھی نہ پیش کرتے۔
... سے اندازہ ہوتا ہے کہ ... موسیقی ... بہت
... ۔ اردو اکادمی اشاف کلب کی افتتاحی تقریب
"غزل راگ" کے عنوان سے ۲۸ مارچ ۱۹۸۰ء کو منعقد ہوئی تھی۔ اس کے
لئے اچھے غزل گانے والوں کے انتخاب کا معاملہ درپیش تھا۔ عمر صاحب
سے مشورہ کیا گیا۔ کئی نام بتائے اور بیگم اختر کی لائق شاگردہ بلکہ شاید

... موسیقی کا اظہار کے
... بھی عنایت کیا، جس میں تقریب کی مناسبت
سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ مضمون ...
... الدین صاحب ہندوستانی موسیقی کے رموز و
... کسی ماہرِ فن کی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ مگر — کم از کم
اپنی ذات تک پورے وثوق کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ عمر صاحب سے
بیس پچیس برس کی ملاقاتوں کے دوران انہیں بلا سبب کبھی موسیقی،
موسیقاروں یا گلوکاروں وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتے نہیں سنا۔
اور نہ ہی کبھی اپنے گھر پر موسیقی سے لطف اندوز ہوتے دیکھا۔

بیگم اختر کا نام ان کی زبان پر برابر آتا تھا مگر ان کی گائیکی کے
سلسلے میں نہیں بلکہ آدابِ محفل، طرزِ گفتار، نفاستِ مزاج وغیرہ کے حوالے
سے۔ بتاتے تھے کہ بیگم اختر کو کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ یہ ان کو اکثر
کہانیاں سناتے تھے مگر اوروں کو ان سے کہانی سننے کا موقع نہیں ملتا تھا
البتہ جب کسی واقعہ کی جزئیات بیان کرتے تو ان کی زبان اور لہجے کے اتار
چڑھاؤ سے قصہ گوئی کے فن میں ان کی دست گاہ کا اندازہ ہونے لگتا۔

مرزا جعفر حسین مرحوم کی دو کتابیں اکاڈمی نے شائع کیں۔ ان میں
سے ایک "بیسویں صدی کے لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں"
ہے۔ ظرافتِ لکھنوی کے حال میں لکھنؤ کے مشہور و ممتاز طبیب شفاء الملک
حکیم خواجہ شمس الدین کا ذکر بھی آ گیا ہے[1] ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں حکیم صاحب
نے لکھنؤ میونسپل بورڈ کا الیکشن لڑا تھا اور جیتے بھی تھے۔ کتاب کے مسودے
میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ حکیم صاحب کے مقابلے میں لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف

اظہر مسعود
" ادبستان " دین دیال روڈ، لکھنؤ ۳

صباح الدین عمر ۔۔ کچھ منتشر یادیں

صباح الدین عمر صاحب اچھے ادیب، اچھے صحافی، اچھے منتظم اچھے دوست، اچھے بزرگ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نہایت اچھے انسان تھے۔ سیمابیت ان کی شخصیت کا غالب پہلو تھا۔ کبھی وہ بہت ٹھنڈے دل کے آدمی نظر آتے، کبھی مجسم شعلہ بن جاتے۔ کبھی محسوس ہوتا ان سے بڑا اپنا کوئی نکتہ چیں نہیں۔ کبھی لگتا ان سے بڑھ کر حمایتی کوئی نہیں۔ اپنے اوپر سخت سے سخت نقد
مگر احمقانہ بات دوسروں ...

... بھیج دیا

... میں شجاع الدولہ کا حال دیکھ کر بتایئے کہ ...

... کتاب ہے جس سے ... کہ شاہان اودھ کے زمانے میں دیوالی کے موقع پر ... رہتا تھا۔ 'تاریخ لکھنؤ' اور 'لکھنؤ کی تہذیبی میراث' میں دیکھ چکا ہوں۔"

"پرانے لکھنؤ میں چکن کے کام کی تاریخ بتانے والا بھی کوئی ہے!"

"'معارف التغات' میں نواب علی نے چھتے کے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

"یہ شعر مجھے یوں یاد ہے۔ فلاں صاحب نے یوں لکھا ہے۔ دیوان دیکھ کر بتایئے کہ صحیح کیا ہے" وغیرہ وغیرہ

۱۶، ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں اردو اکادمیوں کی کل ہند کانفرنس کا اہتمام صباح الدین صاحب نے کیا تھا۔ چھپائی کا ہنگامی نوعیت

غرض صباح الدین صاحب کی ... میں بڑی دقتیں کھڑی کر دیتی ہے۔ اس لیے مناسب ... زندگی سے متعلق چند ایسے واقعات کا ذکر ... طبع اور شخص ...

... کا اعلان بھی کیا تھا، جیسا کہ انتظام و انصرام کی ذمہ داری اردو اکادمی ... پانچ دن بعد ۱۱ر فروری ۱۹۷۷ء کو ... داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے

... تشکیل ہوئی۔

استاذی ڈاکٹر ... سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) اعلا پائے کے ادیب اور خطیب ہیں۔ اس کے علاوہ شیعہ عالم دین اور ذاکر اہلبیت اطہار کی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔ کافی دنوں سے علالتوں کا سلسلہ لگا ہوا ہے مگر علاج کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کرتے۔ پچھلے برس ریڑھ کی ہڈی میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں شدید زحمت محسوس ہونے لگی تھی۔

سوچیں گے کہ
نہیں تھے

... پیارہ
... موجودہ سکریٹری بشیر احسن صاحب اور میں
... ال تعزیت کے لیے گئے۔ انھوں نے چند جملوں میں
... مقال کی بات ختم کی اور پھر بے اختیار بولے کہ ایک
... ایسا ہیں اب تک سوگوار ہوں۔ آواز بھرّا گئی ـــــ
... وقفہ کے بعد فرمایا، وہ ہے صباح الدین عمر کی موت!
ڈاکٹر نیر مسعود کہتے ہیں کہ صباح الدین عمر کی موت کی خبر سن کر
... کر جتنا شاید کوئی اپنے کسی قریبی

... محترم ... یہاں حاضر ہوا ...
... اندازہ ہوا کہ صباح الدین عمر کا داغ ان کے دل
... ... ہے۔

اردو اکاڈمی کے آفس سپرنٹنڈنٹ مرزا محمد کاظم نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے اپنے نزدیک صباح الدین صاحب کو خوش کرنے کے لیے ان سے کہا کہ حضور میری ایک بات کی بڑی خواہش ہے۔ عمر صاحب نے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ جو اکاڈمی ہال میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تصویریں آویزاں ہیں جی چاہتا ہے کہ ان میں آپ کی تصویر بھی ہو۔

وہ بگڑ کر بولے۔ "کیا مطلب! آپ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں؟"

... رہا ہوا تھا کہ سرٹیفکیٹ کی وجہ سے ... بہت تیزی سے گرنے لگی۔ آپریشن طے پایا۔ پاکستان ... بلا بھیجا کہ آپریشن یہیں کر لیجیے تاکہ اچھی طرح تیمار داری ہو سکے۔ ... پاکستان چلے گئے مگر جانے سے پہلے ترتیب کا بیشتر کام مکمل کیا اور ایک آدمی کو اسٹیشن بلوا کر ٹرین چھوٹنے سے پہلے مسودہ اس کے سپرد کر دیا۔ مقدمہ ابھی نامکمل تھا۔ اسے ساتھ لیتے گئے اور آپریشن سے قبل کسی نہ کسی طرح مکمل کرکے وہیں سے بھجوا دیا اور کتاب وقت پر شائع ہو گئی۔

یوں تو صباح الدین صاحب تقریر میں بھی محتاط رہتے تھے مگر تحریر کے معاملے میں شاید کچھ زیادہ ہی احتیاط برتتے تھے۔ کئی مرتبہ کی نظر ثانی اور ترمیم و تنسیخ، حذف و اضافہ کے بعد مسودہ صاف کی شکل ... ... مگر کچھ خیال آیا، لفافہ کھلوا کر پھر اصلاح کی گئی۔ اکثر ان کا بیضہ مسودے کا ہی ابتدائی شکل اختیار کرتا نظر آتا تھا۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کا افتتاح دسمبر ۱۹۷۱ء میں گورنر ہاؤس (لکھنؤ) میں ہوا تھا اور باقاعدہ دفتر جون ۱۹۷۲ء میں اکاڈمی کی اولین صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ کے گھر حبیب اللہ اسٹیٹ حضرت گنج میں قائم ہوا۔ وہاں سے ۱۳ آر، کے، ٹنڈن روڈ قیصر باغ۔ پھر ... ہو کر بلرو ہاؤس میں منتقل ہوا۔ صباح الدین صاحب ... محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ انھیں اکاڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا (۱۹۷۶ء میں محکمہ تعلیم اور محکمہ قومی یک جہتی کے باعتبار عہدہ ڈپٹی سکریٹری بھی مقرر ہوئے)۔ ان کی قیادت میں اکاڈمی نے

بھی کھڑی ہوئی تھی

[illegible]

(... کا آخری سفر ثابت ہوا) اس دن بھی اکاڈمی کے موجودہ چیرمین ڈاکٹر عزیزالرحمٰن سے اکاڈمی کے بارے میں ٹیلی فون پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور انھوں نے وعدہ کیا کہ واپس آکر وہ بعض اہم نکات پر ان سے تبادلۂ خیال کریں گے۔

صباح الدین صاحب جب تک اُردو اکاڈمی کے سکریٹری رہے، اس کے ہر کام پر پوری طرح حاوی رہے۔ ان کی نگرانی میں اکاڈمی مثالی نظم و ضبط کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ دفتری امور یا ڈسپلن میں کسی طرح کا جھول برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ذرا سی غفلت پر جواب طلب ہو جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے اکثر جواب بھی خود ہی لکھوا دیا کرتے۔ وہ بہ یک وقت سخت گیری اور نرم دلی کا عجیب و غریب مرقع تھے۔

صباح الدین صاحب محکمۂ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اُردو) اور ماہنامہ 'نیا دور' کے ایڈیٹر اور پھر چیف ایڈیٹر رہے تھے۔ 'نیا دور' کے علاوہ اور بھی طباعتی کام ان کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ کتابت کے معاملے میں نوک پلک کا بڑا دھیان رکھتے۔ نتیجے میں اچھے اچھے کاتب ان سے پناہ مانگتے تھے۔ مگر — ان کے زمانے میں جن کاتبوں نے نیا دور کی کتابت کی ہے وہ اپنی خوش خطی اور سلیقے کے لیے آج بھی مشہور ہیں اور اس معاملے میں غالباً وہ صباح الدین صاحب کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محکمۂ اطلاعات سے رشتہ منقطع ہو جانے کے باوجود جس کاتب سے کہتے وہ بے چون و چرا ان کا کام کرنے پر راضی ہو جاتا' بھلے ہی اکیلے میں پیر پٹکتا ہوا یا سر پیٹتا ہو

... حقائق پر ایک فیچر کا ... صباح الدین صاحب کے سپرد کیا گیا تھا، انھوں نے وہ اسکرپٹ لکھ کر جمع بھی کر دی تھی۔ مگر نہ جانے کس وجہ سے وہ فیچر تیار نہ ہو سکا۔ کہتے تھے مجھ سے دوسری بار پھر ٹی۔ وی سنٹر آنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر غرض ان کی ہے میں کیوں دوڑوں؟ (اس وقت تک ان کی آنکھ کا آپریشن نہیں ہوا تھا)

صباح الدین صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ کان پور میں ان کے ایک دوست کے کسی عزیز کی مجلس چہلم تھی۔ لکھنؤ سے مولانا سید کلب عابد مجتہد کو کار کے ذریعہ کان پور پہونچانے کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی۔ اثنائے سفر ایک صاحب نے ان کو شیعہ سمجھ کر کچھ اختلافی مسائل چھیڑ دیئے۔ یہ پوری توجہ سے صبر و سکون کے ساتھ سنتے رہے۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد انھوں نے ان کا نام پوچھا۔ معلوم ہوا صباح الدین عمر! نام سن کر تو جیسے ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ (اور اب جو خاموش ہوئے تو عمر صاحب کے چھیڑنے کے باوجود دوبارہ زبان نہیں کھولی۔

صباح الدین صاحب انگریزی میں بھی مضامین لکھتے تھے۔ ان کی ہندی بھی اچھی تھی۔ اُردو میں سیکڑوں صفحات پر مشتمل مضامین لکھ ڈالے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی کے مذاکروں اور فیچروں کو بھی شامل کر لیجئے تو تعداد اور بڑھ جائے گی اور اگر ان صفحات کو بھی شمار میں لے لیں جو انھوں نے دوسروں کے لیے لکھے تھے تو یہ تعداد ہزاروں تک پہونچے گی۔

کئی دفعہ ذکر کیا کہ دوسروں کے چکر میں اپنا سارا کام رہا جاتا ہے

... میں شائع

... ہوں ... کہ ... شید

... مرتب کر رہے ہیں اور فرہنگ بھی

... بارے میں انھوں نے دریافت کیا ہے

... نے فلاں فلاں کتاب دیکھ لی ہے۔

... صاحب عہد ٹوٹ گیا۔ پچھلی بار نہیں۔

... ہوا۔

کبھی باہر سے آنے والوں کو تاریخی مقامات کی سیر کرا رہے ہیں۔ کبھی کسی کے لیے تقریر تیار کر رہے ہیں۔ کوئی غزل لا کر مرتب کرا رہا ہے۔ کسی کو شادی کا دعوت نامہ چھپوانا ہے تو صباح الدین صاحب کو پکڑا جا رہا ہے۔ یہی نہیں۔ کسی چاہنے والے کو اپنی کتاب چھپوانا ہے تو الف سے ے تک سارا کام ان کے سر ہے۔

اُردو اکاڈمی کی پہلی کتاب 'انیسیات' میں مسعود حسن رضوی ادیب کے میر انیس سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ادیب مرحوم نے اپنے یہ مضامین صباح الدین صاحب کے اصرار پر اس شرط کے ساتھ اکاڈمی کو دیئے تھے کہ مطبوعہ کتاب میں صباح الدین صاحب کا نام مرتب کی حیثیت سے درج ہو۔ انھوں نے اپنے قلم سے ایک خاکہ بھی بنا دیا تھا کہ اس طرح درج ہو۔ عمر صاحب نے ازراہ انکسار کتاب کے کور پر اپنا نام نہیں چھپوایا لیکن ادیب صاحب کی خواہش کے احترام میں اسی خاکے کا عکس کتاب کے ٹائٹل کے طور پر چھاپ دیا۔

صباح الدین صاحب ادیب مرحوم کا بے حد احترام کرتے تھے اور ادیب مرحوم بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ ان کی صلاحیتوں کے معترف بھی تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں جب میر انیس صدی کے موقع پر صد سالہ تقریبات کے انعقاد کے لیے انیس میموریل کمیٹی (لکھنؤ) نے ایک ذیلی کمیٹی بنائی تو ادیب صاحب کی تجویز پر ہی صباح الدین عمر صاحب کو اس کا سکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔

ادیب صاحب کے انتقال (۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء) کے فوراً بعد اترپردیش اردو اکاڈمی خبرنامہ کا جو شمارہ شائع ہوا اس میں صباح الدین صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل کے درد کا ... نظر آتا ہے۔

صباح الدین عمر صاحب، جن کی ظاہری حالت پچھلی ربع صدی سے ایک نقطے پر قائم تھی، نہ جانے اندر سے کتنا ٹوٹ چکے تھے کہ ۲۲ر نومبر ۱۹۹۱ء کی رات کو اچانک اس کالبد خاکی کو چھوڑ دیا ؎

رو پس نہ کرد ہر چہ ازیں خاکداں گزشت

□□

حواشی:

۱ے بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں۔ (طبع دوم ۱۹۸۲ء) صـ ۳۳۴

۲ے مصنفہ مولانا آغا مہدی ۳ے مصنفہ سید صفدر حسین۔ یہ دونوں کتابیں پاکستان میں شائع ہوئی تھیں۔

۴ے یہاں صباح الدین صاحب مدتِ دراز سے کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔

۵ے یہاں ان کی بیٹی ریحانہ سہیل نے اپنا مکان بنوایا تھا، صباح الدین صاحب کی طبیعت جب زیادہ ناساز ہوتی تو بیٹی انھیں اپنے گھر لے جاتی تھیں۔

۶ے نیا دور کے علاوہ ہندی/اردو پندرہ روزہ 'دیش کی پکار' اور انگریزی ماہنامہ 'اترپردیش' کے ایڈیٹر بھی رہے تھے اور شعبۂ مطبوعات کے انچارج بھی۔ (اترپردیش اردو اکاڈمی خبرنامہ شمارہ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۷۷ء)

۷ے ڈاکٹر نیر مسعود

۸ے یہاں پر پنڈت آنند نرائن ملا کی دو کتابوں "میری حدیث عمر گریزاں" اور "سیاہی کی ایک بوند"۔ اطہر حسین آئی اے ایس کی "جام شعور"، علی جواد زیدی کی "نسیم دشت آرزو"۔ روشن صدیقی کی کتاب "روشن روشن" اور ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کی کتاب "تذکرۂ طبقاتِ سخن" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔



بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ بعد میں ملک کی کئی اور ریاستوں میں بھی اسی اکاڈمی کے نقشِ قدم پر اردو اکاڈمیاں قائم کی گئیں۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۱ء کو صباح الدین صاحب اردو اکاڈمی سے سبک دوش ہوئے۔ اس وقت تک اکاڈمی ملک کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ فعال اُردو اکاڈمی کی حیثیت سے مستحکم ہو چکی تھی۔

علاحدگی کے بعد بھی اکاڈمی سے ان کا قلبی تعلق ختم نہیں ہوا تھا وہ کئی برس اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے۔ اکاڈمی کے معاملات میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جس دن انھوں نے رائے بریلی کا سفر اختیار کیا اور جو ان کا آخری سفر ثابت ہوا) اس دن بھی اکاڈمی کے موجودہ چیرمین ڈاکٹر عزیزالرحمٰن سے اکاڈمی کے بارے میں ٹیلی فون پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور انھوں نے وعدہ کیا کہ واپس آکر وہ بعض اہم نکات پر ان سے تبادلۂ خیال کریں گے۔

صباح الدین صاحب جب تک اُردو اکاڈمی کے سکریٹری رہے، اس کے ہر کام پر پوری طرح حاوی رہے۔ ان کی نگرانی میں اکاڈمی مثالی نظم و ضبط کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ دفتری امور یا ڈسپلن میں کسی طرح کا جھول برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ذرا سی غفلت پر جواب طلب ہو جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے اکثر جواب بھی خود ہی لکھوا دیا کرتے۔ وہ بہ یک وقت سخت گیری اور نرم دلی کا عجیب و غریب مرقع تھے۔

صباح الدین صاحب محکمۂ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اُردو) اور ماہنامہ 'نیا دور' کے ایڈیٹر اور پھر چیف ایڈیٹر رہے تھے۔ نیا دور کے علاوہ اور بھی طباعتی کام ان کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ کتابت کے معاملے میں نوک پلک کا بڑا دھیان رکھتے۔ نتیجے میں اچھے اچھے کاتب ان سے پناہ مانگتے تھے۔ مگر ان کے زمانے میں جن کاتبوں نے نیا دور کی کتابت کی ہے وہ اپنی خوش خطی اور سلیقے کے لیے آج بھی مشہور ہیں اور اس معاملے میں غالباً وہ صباح الدین صاحب کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محکمۂ اطلاعات سے رشتہ منقطع ہو جانے کے باوجود جس کاتب سے کہتے وہ بے چون و چرا ان کا کام کرنے پر راضی ہو جاتا، بھلے ہی اکیلے میں پیر پٹکتا ہو یا سر پیٹتا ہو

کتابت شروع ہوتی اور صباح الدین صاحب پنسل پٹری اٹھاتے ــــ "یہ سطر حوض تک پہونچنے سے پہلے کیوں ختم ہو گئی؟ خوش' ایک سطر میں اور 'گو' دوسری سطر میں چلا گیا! تیسری سطر میں 'نون' دیکھئے اور ساتویں سطر میں دیکھئے۔ ہے نا چھوٹا بڑا۔ اسے ٹھیک کیجئے۔" غرض پوری پوری سطریں، پورے پورے پیراف حتیٰ کہ پورے پورے صفحے تک بدلوائے جاتے۔ مگر مجال نہیں جو ان کے سامنے کسی کاتب کے ماتھے پر شکن آجائے۔ سعادت مند شاگردوں کی طرح عمر صاحب کی باتیں سنی جاتیں اور ان پر عمل کیا جاتا۔

خطاطی پر ایک فیچر کی اسکرپٹ تیار کرنے کا کام دوردرشن سے صباح الدین صاحب کے سپرد کیا گیا تھا، انھوں نے وہ اسکرپٹ لکھ کر جمع بھی کر دی تھی۔ مگر نہ جانے کس وجہ سے وہ فیچر تیار نہ ہو سکا ــــ کہتے تھے، مجھ سے دوسری تیسرے ٹی۔ وی سنٹر آنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر غرض ان کی ہے میں کیوں دوڑوں؟ (اس وقت تک ان کی آنکھ کا آپریشن نہیں ہوا تھا)

صباح الدین صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ کان پور میں ان کے ایک دوست کے کسی عزیز کی مجلس چہلم تھی۔ لکھنؤ سے مولانا سید کلب عابد مجتہد کو کار کے ذریعہ کان پور پہونچانے کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی۔ اثنائے سفر ایک صاحب نے ان کو شیعہ سمجھ کر کچھ اختلافی مسائل چھیڑ دیے۔ یہ پوری توجہ سے صبر و سکون کے ساتھ سنتے رہے۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد انھوں نے ان کا نام پوچھا۔ معلوم ہوا صباح الدین عمر! نام سُن کر تو جیسے ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور اب جو خاموش ہوئے تو عمر صاحب کے چھیڑنے کے باوجود دوبارہ زبان نہیں کھولی۔

صباح الدین صاحب انگریزی میں بھی مضامین لکھتے تھے۔ ان کی ہندی بھی اچھی تھی۔ اُردو میں سیکڑوں صفحات پر مشتمل مضامین لکھ ڈالے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی کے مذاکروں اور فیچروں کو بھی شامل کر لیجئے تو تعداد اور بڑھ جائے گی اور اگر ان صفحات کو بھی شمار میں لے لیں جو انھوں نے دوسروں کے لیے لکھے تھے تو یہ تعداد ہزاروں تک پہونچے گی۔

کئی دفعہ ذکر کیا کہ دوسروں کے چکر میں اپنا سارا کام رہا جاتا ہے

اب میں نے طے کرلیا ہے کہ اپنے مضامین کو یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کرادوں گا۔" معلوم ہوا دوسرے ہی دن فون چلا آرہا ہے کہ رشید حسن خاں 'فسانہ عجائب' کا متن مرتب کررہے ہیں اور فرہنگ بھی تیار کررہے ہیں۔ فلاں فلاں لفظ کے بارے میں انھوں نے دریافت کیا ہے ذرا ادیب سے بھی پوچھیے گا۔ میں نے فلاں فلاں کتاب دیکھ لی ہے۔ وہاں تو نہیں ملا ــــ لیجیے صاحب عہد ٹوٹ گیا۔ پہلی بار نہیں۔ ایسا نہ جانے کتنی بار ہوا۔

کبھی باہر سے آنے والوں کو تاریخی مقامات کی سیر کرا رہے ہیں۔ کبھی کسی کے لیے تقریر تیار کررہے ہیں۔ کوئی فولڈر مرتب کرا رہا ہے۔ کسی کو شادی کا دعوت نامہ چھپوانا ہے تو صباح الدین صاحب کو پکڑا جارہا ہے۔ یہی نہیں۔ کسی چاہنے والے کو اپنی کتاب چھپوانا ہے تو الف سے ے تک سارا کام ان کے سر۔[۵]

اُردو اکاڈمی کی پہلی کتاب 'انیسیات' میں مسعود حسن رضوی ادیب کے میر انیس سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ادیب مرحوم نے اپنے یہ مضامین صباح الدین صاحب کے اصرار پر اس شرط کے ساتھ اکاڈمی کو دیے تھے کہ مطبوعہ کتاب میں صباح الدین صاحب کا نام مرتب کی حیثیت سے درج ہو۔ انھوں نے اپنے قلم سے ایک خاکہ بھی بنا دیا تھا کہ اس طرح درج ہو۔ عمر صاحب نے ازراہ انکسار کتاب کے کور پر اپنا نام نہیں چھپوایا لیکن ادیب صاحب کی خواہش کے احترام میں اسی خاکے کا عکس کتاب کے اندر ٹائٹل کے طور پر چھاپ دیا۔

صباح الدین صاحب ادیب مرحوم کا بے حد احترام کرتے تھے اور ادیب مرحوم بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ ان کی صلاحیتوں کے معترف بھی تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں جب میر انیس صدی کے موقع پر صد سالہ تقریبات کے انعقاد کے لیے انیس میموریل کمیٹی (لکھنؤ) نے ایک ذیلی کمیٹی بنائی تو ادیب صاحب کی تجویز پر ہی صباح الدین عمر صاحب کو اس کا سکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔

ادیب صاحب کے انتقال (۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء) کے فوراً بعد اترپردیش اردو اکاڈمی خبر نامہ کا جو شمارہ شائع ہوا اس میں صباح الدین صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل کے درد کا ترجمان نظر آتا ہے۔

صباح الدین عمر صاحب، جن کی ظاہری حالت پچھلی ربع صدی سے ایک نقطے پر قائم تھی، نہ جانے اندر سے کتنا ٹوٹ چکے تھے کہ ۲۲ر نومبر ۱۹۹۱ء کی رات کو اچانک اس کالبد خاکی کو چھوڑ دیا کہ

روں پس نہ کرد ہر چہ ازیں خاکداں گزشت

□□

حواشی :

۱؎ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں۔ (طبع دوم ۱۹۸۲ء) ص ۲۳۴

۲؎ مصنفہ مولانا آغا مہدی ۳؎ مصنفہ سید صفدر حسین۔ یہ دونوں کتابیں پاکستان میں شائع ہوئی تھیں۔

۴؎ یہاں صباح الدین صاحب مدتِ دراز سے کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔

۵؎ یہاں ان کی بیٹی ریحانہ سہیل نے اپنا مکان بنوایا تھا، صباح الدین صاحب کی طبیعت جب زیادہ ناساز ہوتی تو بیٹی انھیں اپنے گھر لے جاتی تھیں۔

۶؎ نیا دور کے علاوہ ہندی/اردو پندرہ روزہ 'دیش کی پکار' اور انگریزی ماہنامہ 'اترپردیش' کے ایڈیٹر بھی رہے تھے اور شعبۂ مطبوعات کے انچارج بھی۔ (اترپردیش اردو اکاڈمی خبر نامہ شمارہ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۷۷ء)

۷؎ ڈاکٹر نیّر مسعود

۸؎ یہاں پر پنڈت آنند نرائن مُلّا کی دو کتابوں "میری حدیث عمر گریزاں" اور "سیاہی کی ایک بوند"۔ اطہر حسین آئی۔اے۔ایس کی "جام شعور" علی جواد زیدی کی "نسیم دشت آرزو"۔ روش صدیقی کی کتاب "روش روش" اور ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کی کتاب "تذکرۂ طبقاتِ سخن" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

[illegible]

عمروں میں تقریباً چار دہائیوں کے تفاوت کے باوجود — صباح الدین عمر صاحب — میرے دوست، بھائی، ہمدرد، ہم ذوق اور بعض معاملات میں حریف و رقیب ہونے کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ جب سوچتا ہوں کہ خردی اور بزرگی کا یہ آہنی رشتہ آخر موم کی طرح پگھل کیوں گیا تھا تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ تو پڑوسی ہونے کے ناطے، کچھ میرے اور ان کے مشترکہ دوستوں کی وجہ سے اور سب سے زیادہ پائیدار سبب یہ تھا کہ وہ خود بلا کے ذہین، محنتی اور فعال واقع ہوئے تھے اسلیے اسی قسم کے لوگوں کو پسند کرتے تھے اور بہت جلد ان میں خلط ملط بھی ہو جاتے تھے۔ خصوصاً کسی نوجوان میں اگر انھیں ان خوبیوں کا شائبہ نظر آجاتا تو بہت جلد "من و تو" کی آہنی دیواریں ریت کی طرح ڈھیر ہو جایا کرتی تھیں۔ چونکہ ان کی مردم شناسی، مزاج آشنائی اور "شاہین نگاہی" زمانے بھر میں مشہور ہے اس لیے مجھ جیسے کم مایہ اور بے بضاعت کا ان کی "شکاری آنکھوں" سے بچ نکلنا بھی ایک امر محال سے کم نہ تھا۔

یاد ش بخیر — صباح الدین صاحب مشہور زمانہ اردو ماہنامہ نیا دور کے مدیر اور محکمۂ اطلاعات میں افسر اطلاعات کے عہدے پر فائز تھے کہ ۱۹۶۲ء میں پڑوسی ملک چین نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔ صرف ہندستان ہی نہیں بلکہ تمام ترقی پذیر ممالک میں چین کے اس اقدام کے خلاف واویلا مچ گیا اور ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔

چنانچہ محکمۂ اطلاعات کی جانب سے بھی لکھنؤ کے مرکزی علاقے حضرت گنج (سوچتا کیندر) میں ایک "نشرگاہ" صباح الدین عمر اور ندیم الرحمٰن قدوائی مرحوم کی سربراہی میں قائم کی گئی، جس میں شام کے وقت اردو ہندی دونوں زبانوں کے ادیب و شاعر شانے سے شانہ ملا کر چین کی جارحیت کے خلاف اپنی نثری اور شعری تخلیقات کے ذریعہ آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے اور نیچے وسیع و عریض سڑک پر موجود ہزاروں لوگ ان کی آواز میں آواز ملا کر نعرۂ تحسین بلند کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو مجمع اتنا جذباتی اور پرجوش ہو جاتا تھا کہ سرحد کے بجائے حضرت گنج کے بازار ہی میں جنگ کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں اپنے بزرگ اور محترم دوست لکشمن پرشاد بھارگو (عرف للو بابو جو صباح الدین صاحب کے گہرے دوستوں میں تھے) کے پریس "مڈرن کلا بھون" واقع محلہ نیا گاؤں (میرے مکان سے ملحق) میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک صباح الدین صاحب آگئے۔ ابھی ٹھیک سے علیک سلیک بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھ پر برس پڑے:

"اماں! دنیا بھر میں تیر اندازی کرتے پھرتے ہو۔ اپنے ملک کی حفاظت کے موضوع پر بھی کچھ شعر و عر کہے ہیں یا نہیں؟ اگر کہے ہوں تو شام کو نشرگاہ میں آجاؤ۔"

ہر چند کہ میں نے اس موضوع پر کوئی نظم نہیں کہی تھی لیکن دروغِ مصلحت آمیز کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا اس لیے میں نے ہامی بھر لی اور شام کو حسبِ حکم اپنی نظم لے کر ان کی خدمت میں

بالا واقعہ میرے اس مختصر سے مضمون کا
تحریک محرک ہے۔ بات بالکل چھوٹی سی ہے لیکن اس میں
کی سرشاری، سرحد پر آئی ہوئی مصیبت کے وقت اس کی
کے عمل میں ماننے نظروں اور مدبروں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی
داری اور ان کی شمولیت کا نازک اور فکر انگیز احساس ہی صباح الدین صاحب
کی ذات کا وہ گراں قدر خاصہ ہے جو انھیں دوسرے انسانوں، مدبروں
دانش وروں اور ادیبوں سے ممتاز و میز کرتا ہے۔ ان کی فعال و متحرک
طبیعت انھیں کسی بھی ہنگامہ پرور اور شور انگیز تحریک کے وقت کبھی نچلے
بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ ہمیشہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ
ساتھ سماجی، ثقافتی، ادبی اور اجتماعی زندگی میں بھی نمایاں اور پیش پیش
رہتے تھے۔

صباح الدین عمر۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کے بانی سکریٹری
قرار پائے۔ بقول شخصے ان کی کلاہ امتیاز میں ایک کلغی کا اور اضافہ
ہوا۔ لیکن اکاڈمی کے قیام میں انھیں کس کس قسم کی دشواریوں کا سامنا
کرنا پڑا اور کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑے اس کا اندازہ صرف انھیں لوگوں کو ہو
سکتا ہے جنھوں نے ان کی کسمپرسیوں کو بذات خود دیکھا ہو اور ان پر چشم خود
آنسو بہائے ہوں۔ کاش اُردو زبان و ادب کو دو چار ایسے ہی اور بے لوث
اور جانباز سپاہی مل جاتے تو ریاست میں اس کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔
بدقسمتی سے اس کے جرنلوں اور کمانداروں کی فہرست تو بہت طویل ہے
لیکن سپاہیوں کا شمار بس انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ صباح الدین صاحب
کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اُردو تحریک اور اکاڈمی کے قیام میں جرنلوں
اور کمانداروں کو تو اعتماد میں لیے رکھا تھا لیکن اصل کام "پیادوں" سے
لیتے رہے۔ ان کی تجربہ کاری، دانش و بینش، انتھک محنت اور جانکاہی
کی بدولت ۱۹۷۲ء میں اترپردیش کی کملاپتی ترپاٹھی حکومت کا جاری کردہ
ایک سرکاری نوٹیفکیشن اُردو اکاڈمی کی عملی شکل اختیار کر گیا۔ وہ بھی اس
طرح کہ عرصے تک یہ حکم نامہ ایک فائل کی شکل میں اپنی بغل میں دبائے
ہوئے عمر صاحب یوپی سول سکریٹریٹ کے برآمدوں اور کمروں میں پوری
خود اعتمادی کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ کام رواں دواں تھا لیکن رفتار نہایت

سست اور مدھم۔ اس لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ سب کچھ خود انھیں
کو کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف سرکار کے مختلف محکموں سے خط و کتابت اور
دوسری طرف اردو دنیا کے اہم افراد سے رابطے۔ ہر خط کا مسودہ وہ خود
تیار کرتے، خود ہی اسٹینسل کاٹتے اور پھر دفتر کے درجہ چہارم کے ملازمین سے
خوشامد درآمد اور اپنے ذاتی تعلقات کا استعمال کر کے اس کی سائکلو اسٹائل
نقلیں نکلوا کر لفافوں میں بھرواتے اور پھر اپنے ہاتھ سے لفافوں پر پتے لکھ کر
ڈاک کی نذر کر دیتے۔

اس محنت و جانفشانی کے بعد وہ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ"
کے ساتھ ساتھ خود "رند سبوکش" بھی ثابت ہوئے۔ اکاڈمی کا دفتر قائم
کرنے کے لئے اس کی پہلی نامزد صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ (جو اس وقت
حکومت اترپردیش میں ثقافت و قومی یکجہتی کی وزیر ریاست تھیں) نے اپنی کوٹھی
حبیب اللہ اسٹیٹ کا ایک کمرہ بطور تعاون استعمال کرنے کی اجازت دے
دی، جہاں پہلی بار صباح الدین صاحب دو عارضی کلرکوں کے ساتھ
بطور سکریٹری اپنی کرسی پر بیٹھے۔

اب تک معاملہ صرف دفتر کے قیام کا تھا، لیکن دفتر قائم ہو جانے
کے بعد اس کے استحکام اور توسیع کا مسئلہ درپیش تھا۔ صدر اکاڈمی بیگم
حامدہ حبیب اللہ کے علاوہ اولین چیرمین پنڈت آنند نرائن ملا (ریٹائرڈ
جج الہ آباد ہائیکورٹ) کی مدبرانہ صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے
صباح الدین صاحب نے ریاست اترپردیش میں قائم ہونے والی ملک
کی پہلی اُردو اکاڈمی کے دستور کا مسودہ اپنی سوجھ بوجھ اور صوابدید کے
مطابق تیار کر کے ایک بے جان ڈھانچے کو جسم و جان، دل و دماغ اور
ہاتھ پاؤں کی نعمتوں سے مالامال کر دیا۔ چونکہ داغ بیل صحیح انداز سے
پڑی تھی لہذا جلد ہی اکھوے پھوٹے اور شاخیں پھیلنے لگیں۔

اب اکاڈمی کا دفتر پہلے سے زیادہ عملے کے ساتھ قیصر باغ کی
ایک چھوٹی سی عمارت میں آگیا، جہاں سے منتقل ہو کر "بہرہ ہاؤس" کی خاصی
بڑی عمارت میں واقع ہے۔ جب اکاڈمی اپنے شباب پر آگئی تو صباح الدین
صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ؎

مردی از غیب بروں آید و کاری بکند

کے مصداق انھوں نے اس کا غذی خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا کر ہی

دم لیا۔ وہ ملازمت سے تو سبکدوش ہو گئے مگر ان فرائض اور ذمہ داریوں سے تا عمر قطعی طور پر سبکدوش یا بری الذمہ نہیں ہوئے جن کا بوجھ اکادمی کی فلاح و بہبود کے لیے از خود انھوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔

صباح الدین عمر صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بڑی مرنجاں مرنج اور بذلہ سنج شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اپنی خوش مزاجی، وسیع القلبی اور اعلا اخلاقی قدروں کی وجہ سے ہر بزم کی زینت اور ہر محفل کی جان بن جاتے تھے۔ مسلسل چھ دہائیوں تک شعر و سخن، ادب و صحافت رقص و موسیقی اور نہ جانے کیسی کیسی بے تکلف صحبتوں سے خود مستفید ہوتے رہے اور دوسروں کو فیضیاب ہونے کے مواقع فراہم کرتے رہے۔ وہ صفی، ثاقب، یگانہ، جوش، جگر، مجاز کے علاوہ مسعود حسن رضوی ادیب، جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور مرزا جعفر حسین جیسے علمی ادبی حضرات کے ساتھ ساتھ رفیع احمد خاں اور بیگم اختر کے بھی معتمد خاص سمجھے جاتے تھے۔ غرضیکہ وہ عجب باغ و بہار اور پر اسرار شخصیت کے مالک تھے عمر صاحب زندگی کے "بعد المشرقین" کے درمیان واقعتاً ایک منارۂ نور کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

چند مستثنیات کے علاوہ وہ اپنے بزرگوں کا ادب و احترام اور چھوٹوں کا پاس و لحاظ رکھنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ ان ہی مستثنیات میں نوجوانوں کی ایک گستاخ ٹولی بھی شامل تھی جس کا اتفاق سے میں ہی سرگروہ تھا۔ دراصل یہ ٹولی صباح الدین صاحب کے مداحوں میں تھی اس لیے اس کا ہر فرد ناپسندیدہ ہونے کے باوجود انھیں بے حد عزیز تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ اس ٹولی کی فروگذاشتوں، شرارتوں اور حرکتوں (Activities) کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اکثر ڈانٹ پھٹکار کے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ اپنا قبضہ جمائے رہتی تھی جسے وہ باوجود کوشش کے کبھی چھپا نہیں سکتے تھے۔ پھر جب "رشد و ہدایات" کا سلسلہ جاری ہوتا تو غصے کی گرمی کے دبیز پردوں میں چھپا ہوا تبسم رفتہ رفتہ اپنی اصلی شکل میں نمودار ہوتا اور خود خجل ہو جاتے۔

ایک بار اسی ٹولی کی ایک سازش کے تحت ان کے گھر پر دفتر کی طرف سے فرضی ٹیلیفون کیا گیا کہ کچھ مہمان آ گئے ہیں اس لیے آج کا کھانا کچھ زیادہ ہی بھیجا جائے۔

چونکہ دوپہر کے کھانے کا وقت بالکل قریب تھا اس لیے تعمیل حکم میں بازار سے انواع و اقسام کے کھانے دو ناشتے دانوں میں بھر کر بھیج دیئے گئے یہ ٹولی کھانے کے وقت سے کچھ قبل چند نام نہاد اور خود ساختہ "مسائل" لے کر ان کے کمرے میں جم گئی۔

خاصی طویل بحث و تکرار سے عاجز آ کر انھوں نے کہا، "اگر اجازت ہو تو میں جلدی سے کھانا کھا لوں، پھر بات ہوگی۔

جواب دیا گیا۔ "کوئی جلدی نہیں ہے اطمینان سے کھانا کھا لیجیے"۔ وہ اپنے چیمبر میں چلے گئے اور ہم لوگ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکراتے رہے۔

تھوڑی دیر میں آواز آئی۔ "ارے بھئی تم لوگ بھی یہیں آ جاؤ۔ آج کھانا بہت زیادہ آ گیا ہے، کھا لو"۔

ہم سب بے تکلفی سے ان کے دستر خوان پر جم گئے اور تھوڑی ہی دیر میں کباب، پراٹھے، قورمہ روٹی، بریانی اور فرینی وغیرہ سے سیر ہو کر چلے آئے۔

شام کو انھوں نے گھر پہونچنے کے بعد جب اس مخصوص کھانے کی وجہ دریافت کی تو انھیں ٹیلیفون کے بارے میں پتہ چلا۔ دوسرے روز سے ٹولی کے سارے لوگ ان سے چھپتے پھر رہے تھے لیکن جو بھی سامنے پڑ جاتا وہ یہی مصرع دہراتا ہوا اٹھتا ؎

آج وہ شوخ کچھ اس طرح سے برہم ہے کہ بس

۴ار اکتوبر ۱۹۹۱ء کو میں ایک خاصے طویل ادبی سفر پر امریکہ، کناڈا اور برطانیہ وغیرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں اتفاق سے ان کے نسبتی عزیز پروفیسر عبد القوی ضیا اور بیگم نسیم ضیا سے ملاقات ہوئی اور چند لمحوں میں ہم لوگ باہم شیر و شکر ہو گئے۔ دوران گفتگو صباح الدین صاحب کا ذکر بڑے شغف اور تفصیل سے ہوتا ــــ اور اس گفتگو سے ہم سب لوگ خوب محظوظ ہو کر وطن سے دوری کا غم غلط کرتے رہتے۔

۶ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو وطن واپسی پر دہلی کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے سے باہر نکل کر جیسے ہی ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھے، میری بیوی

شہانہ سلطان (جنھیں صباح الدین صاحب بہت عزیز رکھتے تھے) نے بتایا کہ "ایک بری خبر ہے"۔

میرے اوپر بجلی گر گئی کہ اے خدا! میرے والد اور والدہ تو پہلے ہی داغ مفارقت دے چکے ہیں۔ اب آخر کون سی بری خبر ہے۔؟ میری بدحواسی دیکھ کر انھوں نے کہا۔

"صباح الدین صاحب نہیں رہے"۔

میں کوشش کے باوجود ضبط نہیں کر سکا اور میرے آنسو ٹپکنے لگے۔

—— ذہن پر زور دیتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ مجھ جیسے سنگدل آدمی نے اپنی زندگی میں تیسری بار اس قسم کی بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔!!

□□

میرے دوست ...... صفحہ ۲۰ کا بقیہ

آنے جانے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ان کے بھائی صلاح الدین عثمان صاحب سے میری ملاقات اس وقت سے تھی جب وہ نیشنل ہیرالڈ میں کام کرتے تھے اور میں قومی آواز میں تھا۔ صباح الدین صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ میں جب بھی ان کے یہاں گیا، وہاں اردو سے تعلق رکھنے والے کوئی نہ کوئی صاحب ضرور بیٹھے ملتے۔

صباح الدین عمر صاحب میرے ہم عمر تھے۔ ان کی صحت خراب نہ تھی وہ ہمیشہ خوش رہتے تھے اور اپنے ملنے جلنے والوں سے ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ میں نے جب ان کو اپنی کتاب "مفلسی میں آٹا گیلا" پیش کی تو دیکھ کر مسکرائے اور بولے:

"آپ مفلس تو نہیں ہیں۔ شاید بھابھی نے آٹا گیلا کر دیا"۔

اب میں نعمت اللہ بلڈنگ سے منتقل ہو کر سیتاپور روڈ پر اپنے مکان سہالی ہاؤس چلا آیا ہوں۔ میری صحت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ نعمت اللہ روڈ پر بہت کم جانا ہوتا ہے۔ مگر جب بھی ادھر جاتا ہوں آنکھیں بے اختیار صباح الدین صاحب کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔

□□

اک چراغ اور بجھ گیا یارو

یہ جو انسان اُٹھ گیا یارو!
اب کہاں ایسا دوسرا یارو!
وضعداری میں بھی مثال اپنی
غم گساری کی بھی ضیاء، یارو!
وہ زبان و ادب کا رمز شناس
زیست کا درد آشنا یارو!
جس کو کہتے تھے سب صباح الدین
یعنی وہ مردِ بے ریا یارو!
محفلیں اس کے دم سے تھیں روشن
محفلوں کی وہ جان تھا یارو!
مصلحت، منفعت کے عالم میں
تھا وہی شخص کام کا یارو!
جس کو سچ جانے بس اسی کو کہے
کس میں اب ایسا حوصلہ یارو!
روشنی پہلے ہی سے کیا کم تھی
اک چراغ اور بجھ گیا یارو!
آج حامد وہ چل دیا فردوس
چھوڑ کر کوچۂ فنا یارو!

حامد مینائی
تاروں والا باغ۔ تارین ٹکلی
شاہجہاں پور

اتر پردیش : شاہراہِ ترقی پر

نئی پیش قدمی

— (ادارہ) —

ریاست میں آزادی کا ایک اور اہم سال بیت گیا۔ ایک نئے اعتماد اور نئے عزم کے ساتھ نئے سال میں داخل ہو کر عوام کی حکومت خدمت کے بے لوث جذبے کے ساتھ عوام کی دہلیز پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس ایک سال کے درمیان موجودہ حکومت نے سابقہ حکومتوں سے وراثت میں ملے مسائل سے نپٹنے اور ریاست کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے سلسلے میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرنے میں زبردست کوششیں کی ہیں۔

آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے حجم میں اضافہ

ریاست کی معیشت کو مستحکم بنیاد فراہم کرنے کے لیے آٹھویں عوامی پنج سالہ منصوبے کے اخراجات ۲۱۰۰۰ کروڑ روپے مقرر کیے گئے ہیں۔ اس منصوبے میں زر کو معیشت کا محور تسلیم کیا گیا ہے نیز معاشی ترقی کا مقصد ہے عوام کے ذریعہ عوام کے لیے، عوام کی ترقی۔

ریاست کی معیشت کو ٹھوس بنیاد فراہم کرنے کے لیے چھ فی صد سالانہ شرح نمو مقرر کی گئی ہے۔ اور خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد گھٹا کر ۲۴٫۱۳ فیصد کرنے کی حکمتِ عملی تیار کی گئی ہے۔

فسادات سے پاک ریاست اور بے خوف سماج

موجودہ حکومت نے قلیل مدت میں ہی ریاست میں امن قانون کی صورت حال کو بحال کر کے لوگوں کو راحت کی سانس لینے کا موقع دیا۔ سرکار نے ریاست میں مافیا سماج کی کمر توڑنے کا ارادہ کر کے مافیا گروہوں کے خلاف منظم مہم چلائی جس کے تحت بڑے بڑے مافیا سرغناؤں کو قومی رفاعی قانون کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

ترائی کے علاقوں میں سرگرم پنجاب کے دہشت گردوں کے داخلے کو روکنے کے واسطے ایک ٹاسک فورس کی تشکیل کی گئی ہے۔ دہشت گردوں اور فسادیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہونے والے پولیس ملازمین کے پسماندگان کے لیے امدادی رقم کو بڑھا کر اب ایک لاکھ روپے کر دیا گیا ہے اور ان کے کنبے کو ان کے پس ماندگان جب تک سرکاری ملازمت میں لیے جانے کی عمر تک نہ پہنچ جائیں پوری تنخواہ دی جائے گی۔

سیلز ٹیکس میں آسانی اور نرمی

چھوٹے ٹیکس دہندگان کے بارے میں ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء تک جاری کردہ ٹیکس تعین احکامات سے متعلق ایک ہزار روپے تک اصل بقایا اور اس پر واجب الادا مکمل سود اور جرمانہ معاف کرنے کے احکامات دیے گئے ہیں۔

بڑے ٹیکس دہندگان کے سلسلے میں اصل بقایا ایک ہزار روپے سے زائد لیکن دس ہزار تک ہونے کی صورت میں پورا بقایا جمع کر دینے پر مکمل سود معاف کر دینے کا حکم دیا گیا ہے اور بقایا دس ہزار روپے سے زیادہ ہونے پر پورا بقایا جمع کرنے کی صورت میں نصف سود معاف

کرنے کے احکامات دیے گئے ہیں۔

نیا صنعتی ماحول

صنعتوں کو درپیش مشکلات کے ازالے کے واسطے لال فیتہ شاہی ختم کر کے سنگل ونڈو سسٹم نافذ کیا گیا ہے۔

صنعتوں کو یقینی طور سے مسلسل بجلی سپلائی کرنے کے مقصد سے صنعتی واحدوں کو اپنے کیپٹیو پاور پلانٹ نصب کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔

صنعتوں کے سلسلے میں منظوری ضلع کی سطح پر دینے کی غرض سے ضلع مجسٹریٹوں کی سربراہی میں تشکیل شدہ مجاز کمیٹیوں کو سو ہارس پاور تک بجلی لوڈ منظور کرنے، تعمیر کے کام کے واسطے عارضی بجلی کنکشن دینے، صنعتی واحدوں کو زمین الاٹ کرنے، سیلس ٹیکس میں چھوٹ دینے اور مارجن منی قرض منظور کرنے کا مجاز کیا گیا ہے۔

بجلی فراہمی میں سدھار کے لئے مؤثر اقدام

زرعی رقبہ آراضی کی آبپاشی کے لئے اوسطاً ۱۱ سے ۱۲ گھنٹے یومیہ بجلی فراہمی کو یقینی بنایا گیا۔ بجلی سے متعلق خرابیوں کے سبب بند پڑے سرکاری عالمی بینک ٹیوب ویلوں کو دوبارہ شروع کرنے کے نتیجے میں خراب ٹیوب ویلوں کا فی صد مارچ ۱۹۹۲ء میں گھٹ کر ۲۱.۰۷ رہ گیا۔ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۸۵۰۰ نجی ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کا نشانے کے مقابلے میں ۲۱۳۱۲ نجی ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کی گئی۔ دشوار اقتصادی حالات کے باوجود اس سال ۳۸۴۴ ٹرانسفارمر تبدیل کیے گئے۔

زرعی پیداوار کا نیا ریکارڈ

گزشتہ ربیع میں اناج کی ۱۳۲.۵ لاکھ ٹن اور تلہن کی ۳۵.۱۲ لاکھ ٹن پیداوار کا ریکارڈ قائم ہوا۔

باسمتی چاول کی برآمد کے زیادہ امکانات کے پیش نظر کسانوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اعلا قسم کے بیج مہیا کرائے گئے۔ کسانوں اور کسان مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے لیے کسان حادثہ بیمہ اسکیم نافذ کی گئی ہے۔ منڈی فیس دو فی صد سے گھٹا کر ڈیڑھ فی صد کر دی گئی ہے۔

مستحکم آبپاشی سہولت

کسانوں کے آب پاشی سے متعلق مختلف مسائل حتی الامکان ضلع کی سطح پر ہی حل کرنے کی غرض سے ضلع صدر مقام پر "ضلع سینچائی بندھو" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ حکومت نے ہر کھیت کو پانی دینے کے مقصد کی تکمیل کے لیے دین دیال اسکیم کے تحت پہلے مرحلہ میں ریاست کے ۱۰۰ ترقیاتی بلاکوں میں صد فی صد آب پاشی سہولت مہیا کرانے کی اسکیم شروع کی ہے۔

درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی کثرت والے ۱۰۰ مواضعات کا انتخاب کر کے ہر گاؤں میں ایک سرکاری ٹیوب ویل لگانے کے فیصلے کو نافذ کرنے کے سلسلے میں ۶۶ ٹیوب ویلوں کی بورنگ کا کام مکمل کرایا گیا۔

بے روزگاروں کے لئے روزگار چھتری

دین دیال ترقیاتی اسکیم کے تحت روزگار چھتری کے نام سے خود روزگاری کے لیے مختلف اسکیمیں نافذ کی جا رہی ہیں۔ ان اسکیموں کے توسط سے ۱۳۵۸۲۶ افراد کو مستقل روزگار مہیا کرانے کے مقصد سے ۳۶ اضلاع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مربوط مویشی ترقیات کی خود روزگاری اسکیم کے تحت ۱۷۵ نوجوانوں کو روزگار کے مواقع مہیا کرانے کا آغاز کیا گیا جس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

امداد باہمی

زرعی قرض امداد باہمی کمیٹیوں اور امداد باہمی بینکنگ اداروں نے کسانوں کو سب سے زیادہ فصلی قرض اور زرعی آلات کی فراہمی میں ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ریاست میں مجموعی طور پر ۶۶۹.۶۹ کروڑ روپئے کے قلیل مدتی قرضے، ۲۸.۹۳ کروڑ روپئے کے وسط مدتی قرضے اور ۱۸۰.۹۳ کروڑ روپئے کے طویل مدتی قرضے تقسیم کیے گئے۔

دین دیال ترقیاتی اسکیم کے تحت ۱۷ اضلاع میں ۱۱۱۷ منی ڈیریاں قائم کرنے کے لیے ۱.۲۸۹ کروڑ روپئے کے قرضے مہیا

کرائے گئے۔

سماجی تحفظ

سماج کے استحصال زدہ پس ماندہ اور نظر انداز کیے گئے طبقوں کے لیے اقتصادی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانے کے عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی قدم اٹھائے گئے ہیں۔ بے سہارا بیواؤں کی کفالت کے لیے امسال ۲۸٫۰۴ کروڑ روپئے اور معذوروں کو ۱۵٫۵ کروڑ روپئے کی گرانٹ دی گئی ہے۔

محنت کش خواتین کے لیے متعدد اضلاع میں ہاسٹلوں کی تعمیر کرائی گئی ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں نیز غریب طبقے کی ۶۰۰۰ خواتین کے لیے زراعت، مویشی پروری، ڈیری، دست کاری وغیرہ زمروں میں خواتین روزگار پروگرام سہارا اسکیم شروع کی گئی ہے۔

تعلیم کے ساتھ کردار سازی

حکومت اتر پردیش نے تعلیم کو کردار سازی کے لیے ضروری تسلیم کر کے نقل جیسی حرکتوں پر موثر طور سے پابندی لگائی ہے۔

جز وقتی اساتذہ کی کم از کم تنخواہ ۱۱۰۰ روپئے کر دی گئی ہے۔

وظائف کی تقسیم کے بندوبست کو گاؤں کی سطح پر لامرکزی بنا کر گاؤں سبھا کے توسط سے وظائف کی منظوری اور تقسیم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے۔

ریاست میں خواندگی میں اضافہ کرنے کے مقصد سے ۶ اضلاع میں مکمل خواندگی مہم چلائے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

عوامی نظام تقسیم کی وسیع پیمانے پر اصلاح

ریاست کے باشندوں کے لیے ضروری اشیاء کی مناسب قیمت پر فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت نے عوامی نظام تقسیم کو موثر بنایا ہے۔ اس میں اصلاح کی غرض سے پانچ مہینے کی خصوصی مہم چلا کر ۲٫۱۸ کروڑ فرضی یونٹوں کو مسترد کیا گیا ہے۔ اناج اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کے رجحان پر قابو رکھنے کے لیے ضلع، گاؤں سبھا اور ترقیاتی بلاکوں کی سطح پر نگراں کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔

بہتر رہائشی سہولتیں

مکانات کی تعمیر کے لیے آراضی سے متعلق مسائل کے حل کی خاطر کیے گئے فیصلے کے مطابق نزول آراضی کو پٹے پر لینے والوں کی جانب سے مقررہ رقم جمع کرنے پر فری ہولڈ میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

مکانات کی تعمیر کے لیے حاصل کردہ آراضی کا ۵۰ فی صد پرائیوٹ بلڈرز کے لیے محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پرائیوٹ بلڈرز کے ذریعہ تعمیر شدہ مجموعی رہائشی یونٹوں میں سے ۳۰ فیصد پسماندہ/غریب طبقے کے لیے ترقیاتی اتھارٹیوں کے سپرد کیے جائیں گے۔

مال نظم و نسق میں سدھار

ریاست میں پہلی بار مال نظم و نسق کو موثر بنایا گیا ہے۔ طویل مدت سے غیر فیصل معاملات کو تیزی سے نپٹانے کے لیے ۹۲-۱۹۹۱ء کو ریونیو سال قرار دیا گیا اور خصوصی مہم چلا کر وراثت کے ۱۱۲۳۸۹۱ غیر متنازعہ اور ۱٫۴۴۴۳ متنازعہ معاملات نپٹائے گئے۔

سیلنگ سے فاضل قرار دی گئی زمین کی تقسیم کے واسطے مقرر کردہ ۱۲۵۰۰ ایکڑ کے مقابلے میں ۵۰۰۶۰ ایکڑ آراضی تقسیم کر کے اتر پردیش نے ملک میں اولین مقام حاصل کیا ہے۔

بہتر علاج و صحت خدمات

اسپتالوں کو مہیا کرائی جانے والی دواؤں کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیہی علاقوں کی یونٹوں سے لے کر ریاستی سطح کی مختلف یونٹوں کے واسطے دواؤں کا ایک معیار مقرر کیا گیا۔

پہلی مرتبہ ڈپٹی چیف میڈیکل افسر کی تعیناتی تحصیل کی سطح پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ابتدائی صحت مرکزوں کی کارکردگی پر ٹھیک سے نظر رکھی جا سکے۔

مویشی پالن اور دودھ ترقیات

حکومت نے ریاست میں دودھ مصنوعات کو فروغ دینے کے مقصد سے ۵۰۰ لیٹر تک صلاحیت والے تاجروں کو لائسنس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ دودھ کی پیداوار کے زمرے میں گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال ۲ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ "آپریشن فلڈ" علاقے میں دودھ کی پیداوار میں ۱۶ فیصد اور دودھ بورڈ اضلاع میں ۴۵ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ◻◻

جلد ۴۷ — نمبر (۷)

اکتوبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون — ۲۲۵۶۶۰

معاونین :
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون — ۲۲۷۱۰۸

پیشکش —
آنند سروپ
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ پبلک پرنٹرز لکھنؤ

شائع کردہ
محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

فی شمارہ — تین روپے
زر سالانہ — تیس روپے

[illegible]

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

کرائے گئے۔

سماجی تحفظ

سماج کے استحصال زدہ پس ماندہ اور نظرانداز کیے گئے طبقوں کے لیے اقتصادی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانے کے عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی قدم اٹھائے گئے ہیں۔ بے سہارا بیواؤں کی کفالت کے لیے امسال ۴.۲۸۶ کروڑ روپئے اور معذوروں کو ۵.۵۱ کروڑ روپئے کی گرانٹ دی گئی ہے۔

محنت کش خواتین کے لیے متعدد اضلاع میں ہاسٹلوں کی تعمیر کرائی گئی ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں نیز غریب طبقے کی ۶۰۰ خواتین کے لیے زراعت، مویشی پروری، ڈیری، دست کاری وغیرہ زمروں میں خواتین روزگار پروگرام سہارا اسکیم شروع کی گئی ہے۔

تعلیم کے ساتھ کردار سازی

حکومت اترپردیش نے تعلیم کو کردار سازی کے لیے ضروری تسلیم کرکے نقل جیسی حرکتوں پر موثر طور سے پابندی لگائی ہے۔

جز وقتی اساتذہ کی کم از کم تنخواہ ۱۱۰۰ روپئے کر دی گئی ہے۔

وظائف کی تقسیم کے بندوبست کو گاؤں کی سطح پر لامرکزی بنا کر گاؤں سمیتی کے توسط سے وظائف کی منظوری اور تقسیم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے۔

ریاست میں خواندگی میں اضافہ کرنے کے مقصد سے ۹ اضلاع میں مکمل خواندگی مہم چلائے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

عوامی نظام تقسیم کی وسیع پیمانے پر اصلاح

ریاست کے باشندوں کے لیے ضروری اشیاء کی مناسب قیمت پر فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت نے عوامی نظام تقسیم کو موثر بنایا ہے۔ اس میں اصلاح کی غرض سے پانچ مہینے کی خصوصی مہم چلا کر ۲.۰۸ کروڑ فرضی یونٹوں کو مسترد کیا گیا ہے۔ اناج اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کے رجحان پر قابو رکھنے کے لیے ضلع، گاؤں سبھا اور ترقیاتی بلاکوں کی سطح پر نگراں کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔

بہتر رہائشی سہولتیں

مکانات کی تعمیر کے لیے آراضی سے متعلق مسائل کے حل کی خاطر کیے گئے فیصلے کے مطابق نزول آراضی کو پٹے پر لینے والوں کی جانب سے مقررہ رقم جمع کرنے پر فری ہولڈ میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

مکانات کی تعمیر کے لیے حاصل کردہ آراضی کا ۵۰ فی صد پرائیوٹ بلڈرز کے لیے محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پرائیوٹ بلڈرز کے ذریعہ تعمیر شدہ مجموعی رہائشی یونٹوں میں سے ۲۰ فیصد پسماندہ و غریب طبقے کے لیے ترقیاتی اتھارٹیوں کے سپرد کیے جائیں گے۔

مال نظم ونسق میں سدھار

ریاست میں پہلی بار مال نظم ونسق کو موثر بنایا گیا ہے۔ طویل مدت سے غیر فیصل معاملات کو تیزی سے نپٹانے کے لیے ۹۲-۱۹۹۱ء کو ریونیو سال قرار دیا گیا اور خصوصی مہم چلا کر وراثت کے ۱۱۲۳۸۹۱ غیر متنازعہ اور ۱،۴۴۴۳ متنازعہ معاملات نپٹائے گئے۔

سیلنگ سے فاضل قرار دی گئی زمین کی تقسیم کے واسطے مقررہ کردہ ۱۲۵۰۰ ایکڑ کے مقابلے میں ۵۰۶۰ ایکڑ آراضی تقسیم کرکے اترپردیش نے ملک میں اولین مقام حاصل کیا ہے۔

بہتر علاج و صحت خدمات

اسپتالوں کو مہیا کرائی جانے والی دواؤں کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیہی علاقوں کی یونٹوں سے لے کر ریاستی سطح کی مختلف یونٹوں کے واسطے دواؤں کا ایک معیار مقرر کیا گیا۔

پہلی مرتبہ ڈپٹی چیف میڈیکل افسر کی تعیناتی تحصیل کی سطح پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ابتدائی صحت مرکزوں کی کارکردگی پر ٹھیک سے نظر رکھی جا سکے۔

مویشی پالن اور دودھ ترقیات

حکومت نے ریاست میں دودھ مصنوعات کو فروغ دینے کے مقصد سے ۵۰۰ لیٹر تک صلاحیت والے تاجروں کو لائسنس سے مستثنیٰ کر دیا ہے دودھ کی پیداوار کے زمرے میں گزشتہ سال کے مقابلے میں امسال ۲۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ "آپریشن فلڈ" علاقے میں دودھ کی پیداوار میں ۱۶ فیصد اور دودھ بورڈ اضلاع میں ۵۴ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ □□

عنوانات

جلد ۴۷ نمبر (۷)

اکتوبر سنہ ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون: ۲۴۵۶۶۰

معاونین:
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس خان
ٹیلیفون: ۲۴۷۱۰۸

پبلشر
انیل مسروپ
(ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ
نجمانشیہ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

فی شمارہ — تین روپے
سالانہ — تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ اطلاعات و رابطہ عامہ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے ہر حال میں متفق ہو

کرائے گئے۔

سماجی تحفظ

سماج کے استحصال زدہ پسماندہ اور نظرانداز کیے گئے طبقوں کے لئے اقتصادی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانے کے عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی قدم اٹھائے گئے ہیں۔ بے سہارا بیواؤں کی کفالت کے لیے امسال ۴۰ء۸۶ کروڑ روپئے اور معذوروں کو ۵،۱۵ کروڑ روپئے کی گرانٹ دی گئی ہے۔

محنت کش خواتین کے لیے متعدد اضلاع میں ہاسٹلوں کی تعمیر کرائی گئی ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں نیز غریب طبقے کی ۶۰۰۰ خواتین کے لیے زراعت، مویشی پروری، ڈیری، دست کاری وغیرہ زمروں میں خواتین روزگار پرور سہارا اسکیم شروع کی گئی ہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ کردار سازی

حکومت اترپردیش نے تعلیم کو کردار سازی کے لیے ضروری تسلیم کر کے نقل جیسی حرکتوں پر موثر طور سے پابندی لگائی ہے۔

جز وقتی اساتذہ کی کم از کم تنخواہ ۱۰۰۰ روپئے کر دی گئی ہے۔

وظائف کی تقسیم کے بندوبست کو گاؤں کی سطح پر لامرکزی بنا کر گاؤں کمیٹی کے توسط سے وظائف کی منظوری اور تقسیم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے۔

ریاست میں خواندگی میں اضافہ کرنے کے مقصد سے ۶ اضلاع میں مکمل خواندگی مہم چلائے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

عوامی نظام تقسیم کی وسیع پیمانے پر اصلاح

ریاست کے باشندوں کے لیے ضروری اشیا کی مناسب قیمت پر فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت نے عوامی نظام تقسیم کو موثر بنایا ہے۔ اس میں اصلاح کی غرض سے پانچ مہینے کی خصوصی مہم چلا کر ۸،۱۹،۲ کروڑ فرضی یونٹوں کو مسترد کیا گیا ہے۔ اناج اور دیگر ضروری اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کے رجحان پر قابو رکھنے کے لیے ضلع، گاؤں سبھا اور ترقیاتی بلاکوں کی سطح پر نگراں کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔

بہتر رہائشی سہولتیں

مکانات کی تعمیر کے لیے آراضی سے متعلق مسائل کے حل کی خاطر کیے گئے فیصلے کے مطابق نزول آراضی کو پٹے پر لینے والوں کی جانب سے مقررہ رقم جمع کرنے پر فری ہولڈ میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

مکانات کی تعمیر کے لیے حاصل کردہ آراضی کا ۵۰ فی صد پرائیوٹ بلڈرز کے لیے محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پرائیویٹ بلڈرز کے ذریعہ تعمیر شدہ مجموعی رہائشی یونٹوں میں سے ۳۰ فیصد پسماندہ/غریب طبقے کے لئے ترقیاتی اتھارٹیوں کے سپرد کیے جائیں گے۔

مال نظم ونسق میں سدھار

ریاست میں پہلی بار مال نظم ونسق کو موثر بنایا گیا ہے۔ طویل مدت سے غیر فیصل معاملات کو تیزی سے نپٹانے کے لیے ۹۲-۱۹۹۱ء کو ریونیو سال قرار دیا گیا اور خصوصی مہم چلا کر وراثت کے ۱۱۲۳۸۹۱ غیر متنازعہ اور ۳۴۴۴۷۱ متنازعہ معاملات نپٹائے گئے۔

سیلنگ سے فاضل قرار دی گئی زمین کی تقسیم کے واسطے مقرر کردہ ۱۲۵۰۰۰ ایکڑ کے مقابلے میں ۷۰۰۰۵ ایکڑ آراضی تقسیم کر کے اترپردیش نے ملک میں اولین مقام حاصل کیا ہے۔

بہتر علاج وصحت خدمات

اسپتالوں کو مہیا کرائی جانے والی دواؤں کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیہی علاقوں کی یونٹوں سے لے کر ریاستی سطح کی مختلف یونٹوں کے واسطے دواؤں کا ایک معیار مقرر کیا گیا۔

پہلی مرتبہ ڈپٹی چیف میڈیکل افسر کی تعیناتی تحصیل کی سطح پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ابتدائی صحت مرکزوں کی کارکردگی پر ٹھیک سے نظر رکھی جا سکے۔

مویشی پالن اور دودھ ترقیات

حکومت نے ریاست میں دودھ مصنوعات کو فروغ دینے کے مقصد سے ۵۰۰ لیٹر تک صلاحیت والے تاجروں کو لائسنس سے مستثنا کر دیا ہے دودھ کی پیداوار کے زمرے میں گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال ۱۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے "آپریشن فلڈ" علاقے میں دودھ کی پیداوار میں ۱۶ فیصد اور دودھ پور ڈاضلاع میں ۳ء۵ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ □□

جلد ۴۷ | نمبر (۷)

اکتوبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سیّد امجد حسین
ٹیلیفون: ـــــــ ۲۴۵۶۶۰

معاونین:
○ ـ نجیب انصاری
○ ـ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون ـــــــ ۲۴۷۱۰۸

پبلشر
آسل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

ـــــ شائع کردہ ـــــ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

فی شمارہ: ـــــ تین روپے
زرِسالانہ: ـــــ تیس روپے

ـــــ ترسیلِ زر کا پتہ ـــــ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

ـــــ خط و کتابت کا پتہ ـــــ
ایڈیٹر نیادور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

ـــــ بذریعہ رجسٹری ـــــ
ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی، لکھنؤ

عنوانات

نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا

عنوان چشتی
(پروفیسر شعبۂ اردو)
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔ ۲۵

مقابل ہے آئینہ

اگر دوسروں پر لکھنا مشکل کام ہے تو اپنے بارے میں اظہارِ خیال کرنا اس سے زیادہ مشکل بلکہ محال کام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فن کار کو سچ کے جاں گسل لمحات سے گزرنا پڑتا ہے یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے۔ اگر یہ کام ایک طرف خود احتسابی کا عمل ہے تو دوسری طرف خود انکشافی کا فن بھی۔ اس لیے اس میں اعتدال، توازن اور ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ فن کار پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کون سے گوشوں کا انتخاب کرتا ہے اور انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گوشے اس کے فکر و فن کی شکل میں پہلے سے روشنی میں ہیں، ان کو سامنے لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے فن کار اپنے مزاج اور فن کے ان گوشوں کو زینت قرطاس بناتا ہے جو عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہیں ؎

یہ فردِ جرم نہیں خود نوشت ہے میری
عدو کا نام نہیں اس میں وہ دہائی نہ دے

میں نے اوسط درجے کے ایک ادبی اور دینی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میرے والد ماجد پیرزادہ شاہ سید انوار الحسن انوار منگلوری کی شخصیت میں کئی خوبیاں جمع تھیں۔ ایک طرف مرحوم پرانے علوم مثلاً تصوف، رمل، جفر، نجوم، قواعد، عروض اور بدیع و بیان پر بھرپور دست رس رکھتے تھے اور دوسری طرف بہت اچھے شاعر بھی تھے مرحوم شاعری میں حضرت اسیر لکھنوی کے صاحبزادے حضرت افضل لکھنوی کے تلامذہ میں شامل تھے اس لیے شاعری کے سلسلے میں لکھنؤ کے اساتذہ کی پیروی کرتے تھے۔ مرحوم کا کلام "حسنِ ادب" "لکھنؤ" اور اس دور کے دیگر رسائل میں ابوالافتخار انوار منگلوری کے نام سے شائع ہوتا رہتا تھا۔ میری والدہ سیدہ زبیدہ خاتون بھی موزوں طبع ہیں اور انھیں اساتذہ اردو، خاص طور پر عزیز لکھنوی اور فانی بدایونی کے صدہا اشعار یاد ہیں جنھیں وہ حسب موقع استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر میں ایک ایسا ماحول ملا، جو علم و فن اور شاعری کی خوشبو سے معطر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ میرے آبائی وطن قصبہ منگلور ضلع ہردوار میں شاعری کا ذوق عام تھا۔ وہاں ماہانہ مشاعرے بھی ہوتے اور سالانہ بڑے مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے۔ میں نے اپنے بچپن میں مشاعرے کے چند مقبول شاعروں مثلاً انور صابری، فنا نظامی اور رحل لکھنوی وغیرہ کو سنا تھا۔ میری خوش بختی تھی کہ مجھے اسکول کے زمانے میں ایسے دو اساتذہ میسر آئے جو میرے شعر و سخن کے مشغلے کو



پسند فرماتے تھے وہ ہیں مولانا انعام الحق اور پنڈت سدا ما رام زوٹیال اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے گھر اور قصبے کے شعری ماحول کے علاوہ اسکول میں بھی سازگار ماحول ملا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض حضرات شعر و سخن سے بڑھتی ہوئی میری دلچسپی کی وجہ سے مجھ سے کبیدہ خاطر رہتے۔ وہ لوگ کبھی طعن اور تشنیع کے ذریعہ کبھی میرے اشعار پر بے رحمانہ تنقید کے ذریعہ میری دل شکنی کرتے، کبھی میرا امتحان لینے کی غرض سے مجھ سے مصرع پر مصرع لگانے کی فرمائش کرتے اور کبھی فی البدیہہ غزل کہنے پر مجبور کرتے۔ یوں بھی ہوتا کہ مجھ سے اشعار کا مطلب پوچھتے اور بعض عروضی و فنی مسائل میں بے وجہ الجھانے کی کوشش کرتے۔ ماحول کے اس رویّے کو میں منفی اور مخالفانہ رویہ قرار دیتا ہوں، جس کو ماحول کی ناسازگاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ غرض مجھے بچپن ہی میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ان دونوں کے درمیان ٹوٹتا اور بنتا رہا۔ مگر ان حالات میں اپنے ضمیر کی روشنی میں، جو کچھ درست ہوتا اس کو اپنے دل و دماغ میں جذب کر لیتا، اور جو غلط ہوتا اس کو حرفِ غلط کی طرح ذہن سے مٹا دیتا۔ میں اپنے فنی سفر کے ابتدائی مرحلے میں لگاتار ردّ و قبول کے اسی عمل سے گزرتا رہا۔ آج پلٹ کر اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اپنے ماحول کے سازگار اور مثبت رویوں کی طرح ناسازگار اور منفی و تخریبی رویے بھی بھلے لگتے ہیں۔ اگر ان دنوں صرف پذیرائی ہوتی اور میری مخالفت نہ ہوتی تو شاید میں بچ کر چلنے کا عادی نہ بنتا۔ احتیاط، توازن اور اعتدال کی راہ سے ہٹ جاتا، محنت و ریاضت کے اصول کو چھوڑ دیتا۔ اچھے برے خوب اور خراب کی تمیز کھو دیتا۔ بقول شاعر ؎

گلوں کو چومنا چاہوں تو ٹوک دیتے ہیں
بہت عزیز ہیں کانٹوں کو اپنے ہمسائے

میرے والد ماجد حضرت انگار منگلوری میرے جدِّ اعلیٰ حضرت شاہ ولایت منگلوری کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن موصوف نے میری پرورش ایک خاص انداز سے کی ہے۔ عام طور سے والدین اپنے بچوں پر کڑی پابندیاں رکھتے ہیں اور ان کی آزادی کو تقریباً سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو بجائے محبت ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں۔ جسے والدین اچھا سمجھتے ہیں اس کام کو کرنے دیتے ہیں جس کو اچھا نہیں سمجھتے، اس کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دیتے ہیں۔ اور بچوں کی نفسیات کو بھول کر اپنی نفسیات کے تحت اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ میرے والد نے ایک دوسرا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے میری پرورش کرنے میں بظاہر سماج کے بعض رائج طریقوں سے انحراف کیا مگر اپنے طرزِ عمل کو میرے بچپن کی نفسیات سے ہم آہنگ رکھا۔ اس بات کی وضاحت میں ایک واقعے سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر ابنِ کنول کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا تھا، وہی واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرا وطن منگلور ہے جو ضلع سہارن پور میں شرفا کی ایک قدیم بستی ہے منگلور کا ماحول خالص قصباتی ہے۔ میرے بچپن میں وہاں وہی کھیل کھیلے جاتے تھے جو شہروں سے دور آباد قصبوں کا مقدر ہیں، کچھ بازیاں موسم کے ساتھ آتیں۔ مثلاً کبوتر بازی اور پتنگ بازی وغیرہ۔ چنانچہ پتنگ بازی کا موسم تھا۔ میں اس وقت مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ میرے دل میں پتنگ بازی کے لیے شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی، لیکن گھر کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میرے بچپن میں پتنگ بازی تہذیب و اخلاق کے منافی سمجھی جاتی تھی اور اسے مخرب اخلاق فعل تصوّر کیا جاتا تھا۔ ان اقدار کی گرفت کے باوجود میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ چھپ کر پتنگ اڑانی شروع کر دی، جس کی خبر میرے والد ماجد کو ہو گئی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے والد صاحب نے بازار سے چرخی، ڈور اور پتنگ منگوائی اور گھر کے سامنے میدان میں میرے ساتھ جا کر اس کو چڑھایا اور مجھ سے کہا کہ اب تم پتنگ اڑاؤ۔ اس وقت میری عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ میں بہت خوش ہوا کہ واقعی اب تو مزہ آ گیا۔ اب

عنوان چشتی
(پروفیسر شعبۂ اردو)
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی-۲۵

مقابل ہے آئینہ

اگر دوسروں پر لکھنا مشکل کام ہے تو اپنے بارے میں اظہار خیال کرنا، اس سے زیادہ مشکل بلکہ محال کام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فن کار کو سچ کے جاں گسل لمحات سے گزرنا پڑتا ہے یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے۔ اگر یہ کام ایک طرف خود احتسابی کا عمل ہے تو دوسری طرف خود انکشافی کا فن بھی۔ اس لیے اس میں اعتدال، توازن اور ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ فن کار پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کون سے گوشوں کا انتخاب کرتا ہے اور انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گوشے اس کے فکر و فن کی شکل میں پہلے سے روشنی میں ہیں، ان کو سامنے لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے فن کار اپنے مزاج اور فن کے ان گوشوں کو زینت قرطاس بناتا ہے جو عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہیں ؎

یہ فرد جرم نہیں خود نوشت ہے میری
عدو کا نام نہیں اس میں وہ دہائی نہ ڈرے

میں نے اوسط درجے کے ایک ادبی اور دینی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میرے والد ماجد پیرزادہ شاہ سید انوار الحسن انوار منگلوری کی شخصیت میں کئی خوبیاں جمع تھیں۔ ایک طرف مرحوم پرانے علوم مثلاً تصوف، رمل، جفر، نجوم، قواعد، عروض اور بدیع و بیان پر بھرپور دست رس رکھتے تھے اور دوسری طرف بہت اچھے شاعر بھی تھے مرحوم شاعری میں حضرت امیر لکھنوی کے صاحبزادے حضرت افضل لکھنوی کے تلامذہ میں شامل تھے اس لیے شاعری کے سلسلے میں لکھنؤ کے اساتذہ کی پیروی کرتے تھے۔ مرحوم کا کلام حسنِ ادب، لکھنؤ اور اس دور کے دیگر رسائل میں ابوالافتخار انوار منگلوری کے نام سے شائع ہوتا رہتا تھا۔ میری والدہ سیدہ زبیدہ خاتون بھی موزوں طبع ہیں اور انھیں اساتذہ اردو، خاص طور پر عزیز لکھنوی اور فانی بدایونی کے صدہا اشعار یاد ہیں جنھیں وہ حسب موقع استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر میں ایک ایسا ماحول ملا، جو علم و فن اور شاعری کی خوشبو سے معطر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ میرے آبائی وطن قصبہ منگلور ضلع ہردوار میں شاعری کا ذوق عام تھا۔ وہاں ماہانہ مشاعرے بھی ہوتے اور سالانہ بڑے مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے۔ میں نے اپنے بچپن میں مشاعرے کے چند مقبول شاعروں مثلاً انور صابری، فنا نظامی اور دل لکھنوی وغیرہ کو سنا تھا۔ میری خوش بختی تھی کہ مجھے اسکول کے زمانے میں ایسے دو اساتذہ میسر آئے جو میرے شعر و سخن کے مشغلے کو



پسند فرماتے تھے وہ ہیں مولانا انعام الحق اور پنڈت سدا ما رام نوٹیال اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے گھر اور قصبے کے شعری ماحول کے علاوہ اسکول میں بھی سازگار ماحول ملا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض حضرات شعر و سخن سے بڑھتی ہوئی میری دلچسپی کی وجہ سے مجھ سے کبیدہ خاطر رہتے۔ وہ لوگ کبھی طعن اور تشنیع کے ذریعہ کبھی میرے اشعار پر بے رحمانہ تنقید کے ذریعہ میری دل شکنی کرتے، کبھی میرا امتحان لینے کی غرض سے مجھ سے مصرع پر مصرع لگانے کی فرمائش کرتے اور کبھی فی البدیہہ غزل کہنے پر مجبور کرتے۔ یوں بھی ہوتا کہ مجھ سے اشعار کا مطلب پوچھتے اور بعض عروضی و فنی مسائل میں بے وجہ الجھانے کی کوشش کرتے۔ ماحول کے اس رویّے کو میں منفی اور مخالفانہ رویہ قرار دیتا ہوں، جس کو ماحول کی ناسازگاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ غرض مجھے بچپن ہی میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ان دونوں کے درمیان ٹوٹتا اور بنتا رہا۔ مگر ان حالات میں اپنے ضمیر کی روشنی میں، جو کچھ درست ہوتا اس کو اپنے دل و دماغ میں جذب کر لیتا، اور جو غلط ہوتا اس کو حرفِ غلط کی طرح ذہن سے مٹا دیتا۔ میں اپنے فنی سفر کے ابتدائی مرحلے میں لگاتار ردّ و قبول کے اسی عمل سے گزرتا رہا۔ آج پلٹ کر اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اپنے ماحول کے سازگار اور مثبت رویوں کی طرح ناسازگار اور منفی و تخریبی رویے بھی بھلے لگتے ہیں۔ اگر ان دنوں صرف پذیرائی ہوتی اور میری مخالفت نہ ہوتی تو شاید میں بچ کر چلنے کا عادی نہ بنتا۔ احتیاط، توازن اور اعتدال کی راہ سے ہٹ جاتا، محنت و ریاضت کے اصول کو چھوڑ دیتا۔ اچھے بُرے خوب اور خراب کی تمیز کھو دیتا۔ بقول شاعر ؎

گلوں کو چومنا چاہوں تو ٹوک دیتے ہیں
بہت عزیز ہیں کانٹوں کو اپنے ہمسائے

میرے والد ماجد حضرت انوار منگلوری میرے جدِّ اعلا حضرت شاہ ولایت منگلوری کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن موصوف نے میری پرورش ایک خاص انداز سے کی ہے۔ عام طور سے والدین اپنے بچوں پر کڑی پابندیاں رکھتے ہیں اور ان کی آزادی کو تقریباً سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو بربنائے محبت ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں۔ جسے والدین اچھا سمجھتے ہیں اس کام کو کرنے دیتے ہیں، جس کو اچھا نہیں سمجھتے، اس کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دیتے ہیں۔ اور بچوں کی نفسیات کو بھول کر اپنی نفسیات کے تحت اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ میرے والد نے ایک دوسرا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے میری پرورش کرنے میں بظاہر سماج کے بعض رائج طریقوں سے انحراف کیا مگر اپنے طرزِ عمل کو میرے بچپن کی نفسیات سے ہم آہنگ رکھا۔ اس بات کی وضاحت میں ایک واقعے سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر ابن کنول کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا تھا، وہی واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں؛

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرا وطن منگلور ہے جو ضلع سہارن پور میں شہر خار کی ایک قدیم بستی ہے منگلور کا ماحول خالص قصباتی ہے۔ میرے بچپن میں وہاں وہی کھیل کھیلے جاتے تھے جو شہروں سے دور آباد قصبوں کا مقدر ہیں، کچھ بازیاں موسم کے ساتھ آتیں۔ مثلاً کبوتر بازی اور پتنگ بازی وغیرہ۔ چنانچہ پتنگ بازی کا موسم تھا۔ میں اس وقت مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ میرے دل میں پتنگ بازی کے لیے شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی، لیکن گھر کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میرے بچپن میں پتنگ بازی تہذیب و اخلاق کے منافی سمجھی جاتی تھی اور اسے مخربِ اخلاق فعل تصور کیا جاتا تھا۔ ان اقدار کی گرفت کے باوجود میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ چھپ کر پتنگ اڑانی شروع کر دی، جس کی خبر میرے والد ماجد کو ہو گئی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے والد صاحب نے بازار سے چرخی، ڈور اور پتنگ منگوائی اور گھر کے سامنے میدان میں میرے ساتھ جا کر اس کو چڑھایا اور مجھ سے کہا کہ اب تم پتنگ اڑاؤ۔ اس وقت میری عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ میں بہت خوش ہوا کہ واقعی اب تو مزہ آ گیا۔ اب

عنوان چشتی
(پروفیسر شعبۂ اُردو)
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

مقابل ہے آئینہ

اگر دوسروں پر لکھنا مشکل کام ہے تو اپنے بارے میں اظہارِ خیال کرنا اس سے زیادہ مشکل بلکہ محال کام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فن کار کو سچ کے جاں گسل لمحات سے گزرنا پڑتا ہے یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے۔ اگر یہ کام ایک طرف خود احتسابی کا عمل ہے تو دوسری طرف خود انکشافی کا فن بھی۔ اس لیے اس میں اعتدال، توازن اور ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ فن کار پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کن گوشوں کا انتخاب کرتا ہے اور انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گوشے اس کے فکر و فن کی شکل میں پہلے سے روشنی میں ہیں، ان کو سامنے لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے فن کار اپنے مزاج اور فن کے ان گوشوں کو زینت قرطاس بناتا ہے جو عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہیں ؎

یہ فردِ جرم نہیں خودنوشت ہے میری
عدو کا نام نہیں اس میں وہ دہائی نہ دے

میں نے اوسط درجے کے ایک ادبی اور دینی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میرے والد ماجد پیرزادہ شاہ سید انوار الحسن انوار منگلوری کی شخصیت میں کئی خوبیاں جمع تھیں۔ ایک طرف مرحوم پرانے علوم مثلاً تصوف، رمل، جفر، نجوم، قواعد، عروض اور بدیع و بیان پر بھرپور دست رس رکھتے تھے اور دوسری طرف بہت اچھے شاعر بھی تھے مرحوم شاعری میں حضرت آسیر لکھنوی کے صاحبزادے حضرت افضل لکھنوی کے تلامذہ میں شامل تھے اس لیے شاعری کے سلسلے میں لکھنؤ کے اساتذہ کی پیروی کرتے تھے۔ مرحوم کا کلام حسنِ ادب، لکھنؤ اور اس دور کے دیگر رسائل میں ابوالافتخار انوار منگلوری کے نام سے شائع ہوتا رہتا تھا۔ میری والدہ سیدہ زبیدہ خاتون بھی موزوں طبع ہیں اور انھیں اساتذہ اردو، خاص طور پر عزیز لکھنوی اور فانی بدایونی کے صدہا اشعار یاد ہیں جنھیں وہ حسب موقع استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر میں ایک ایسا ماحول ملا، جو علم و فن اور شاعری کی خوشبو سے معطر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ میرے آبائی وطن قصبہ منگلور ضلع ہردوار میں شاعری کا ذوق عام تھا۔ وہاں ماہانہ مشاعرے بھی ہوتے اور سالانہ بڑے مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے۔ میں نے اپنے بچپن میں مشاعرے کے چند مقبول شاعروں مثلاً انور صابری، فنا نظامی اور دل لکھنوی وغیرہ کو سنا تھا۔ میری خوش بختی تھی کہ مجھے اسکول کے زمانے میں ایسے دو اساتذہ میسر آئے جو میرے شعر و سخن کے مشغلے کو



پسند فرماتے تھے وہ ہیں مولانا انعام الحق اور پنڈت سدا ما رام نوٹیال اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے گھر اور قصبے کے شعری ماحول کے علاوہ اسکول میں بھی سازگار ماحول ملا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض حضرات شعر و سخن سے بڑھتی ہوئی میری دلچسپی کی وجہ سے مجھ سے کبیدہ خاطر رہتے۔ وہ لوگ کبھی طعن اور تشنیع کے ذریعہ کبھی میرے اشعار پر بے رحمانہ تنقید کے ذریعہ میری دل شکنی کرتے، کبھی میرا امتحان لینے کی غرض سے مجھ سے مصرع پر مصرع لگانے کی فرمائش کرتے اور کبھی فی البدیہہ غزل کہنے پر مجبور کرتے۔ یوں بھی ہوتا کہ مجھ سے اشعار کا مطلب پوچھتے اور بعض عروضی و فنی مسائل میں بے وجہ الجھانے کی کوشش کرتے۔ ماحول کے اس رویے کو میں منفی اور مخالفانہ رویہ قرار دیتا ہوں، جس کو ماحول کی ناسازگاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ غرض مجھے بچپن ہی میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ان دونوں کے درمیان ٹوٹتا اور بنتا رہا۔ مگر ان حالات میں اپنے ضمیر کی روشنی میں جو کچھ درست ہوتا اس کو اپنے دل و دماغ میں جذب کر لیتا، اور جو غلط ہوتا اس کو حرفِ غلط کی طرح ذہن سے مٹا دیتا۔ میں اپنے فنی سفر کے ابتدائی مرحلے میں لگاتار ردّ و قبول کے اسی عمل سے گزرتا رہا۔ آج پلٹ کر اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اپنے ماحول کے سازگار اور مثبت رویوں کی طرح ناسازگار اور منفی و تخریبی رویے بھی بھلے لگتے ہیں۔ اگر ان دنوں صرف پذیرائی ہوتی اور میری مخالفت نہ ہوتی تو شاید میں بچ کر چلنے کا عادی نہ بنتا۔ احتیاط، توازن اور اعتدال کی راہ سے ہٹ جاتا، محنت و ریاضت کے اصول کو چھوڑ دیتا۔ اچھے برے خوب اور خراب کی تمیز کھو دیتا۔ بقول شاعر؎

گلوں کو چومنا چاہوں تو ٹوک دیتے ہیں
بہت عزیز ہیں کانٹوں کو اپنے ہمسائے

میرے والد ماجد حضرت انوار منگلوری میرے جدّ اعلیٰ حضرت شاہ ولایت منگلوری کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن موصوف نے میری پرورش ایک خاص انداز سے کی ہے۔ عام طور سے والدین اپنے بچوں پر کڑی پابندیاں رکھتے ہیں اور ان کی آزادی کو تقریباً سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو بربنائے محبت ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں۔ جسے والدین اچھا سمجھتے ہیں اس کام کو کرنے دیتے ہیں جس کو اچھا نہیں سمجھتے، اس کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دیتے ہیں۔ اور بچوں کی نفسیات کو بھول کر اپنی نفسیات کے تحت اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ میرے والد نے ایک دوسرا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے میری پرورش کرنے میں بظاہر سماج کے بعض رائج طریقوں سے انحراف کیا مگر اپنے طرزِ عمل کو میرے بچپن کی نفسیات سے ہم آہنگ رکھا۔ اس بات کی وضاحت میں ایک واقعے سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر ابن کنول کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا تھا، وہی واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں،

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرا وطن منگلور ہے جو ضلع سہارن پور میں شرفا کی ایک قدیم بستی ہے منگلور کا ماحول خالص قصباتی ہے۔ میرے بچپن میں وہاں وہی کھیل کھیلے جاتے تھے جو شہر والوں سے دور آباد قصبوں کا مقدر ہیں، کچھ بازیاں موسم کے ساتھ آتیں جیسے کبوتر بازی اور پتنگ بازی وغیرہ۔ چنانچہ پتنگ بازی کا موسم تھا۔ میں اس وقت مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ میرے دل میں پتنگ بازی کے لیے شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی، لیکن گھر کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میرے بچپن میں پتنگ بازی تہذیب و اخلاق کے منافی سمجھی جاتی تھی اور اسے مخربِ اخلاق فعل تصور کیا جاتا تھا۔ ان اقدار کی گرفت کے باوجود میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ چھپ کر پتنگ اڑانی شروع کر دی، جس کی خبر میرے والد ماجد کو ہو گئی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے والد صاحب نے بازار سے چرخی، ڈور اور پتنگ منگوائی اور گھر کے سامنے میدان میں میرے ساتھ جا کر اس کو چڑھایا اور مجھ سے کہا کہ اب تم پتنگ اڑاؤ۔ اس وقت میری عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ میں بہت خوش ہوا کہ واقعی اب تو مزہ آ گیا۔ اب

پتنگ بازی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ میں نے نہ صرف یہ کہ پتنگ اڑائی بلکہ لڑائی اور اپنی پتنگ کٹوا دی۔ یہ سارا تماشہ محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک بیٹا اپنے والد ماجد کی موجودگی میں پتنگ لڑا رہا ہے، وہ بھی ایک مذہبی وادبی گھرانے کا فرد.... پورے محلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں شام ہوتے ہی محلے کے ایک مولوی صاحب میرے والد محترم کے پاس تشریف لائے اور پتنگ بازی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے — جب شرفاء ہی اپنے بچوں کو پتنگ بازی کرائیں گے اور خود انھیں ایسے مخرب اخلاق فعل پر آمادہ کریں گے تو پھر نئی نسلوں کا خدا ہی حافظ ہے ... ان کے خیال میں میرے والد صاحب نے ناقابل معافی جرم کیا تھا۔ وہ بہت تلخ انداز میں اظہار خیال کر رہے تھے ... والد صاحب نے فرمایا کہ مولوی صاحب اس موسم میں پورا قصبہ پتنگ بازی کی لپیٹ میں ہوتا ہے اور ہر بچہ، خواہ وہ امیر کا ہو یا غریب کا، نام نہاد شرفا کا ہو یا گنوار کا، کھل کر یا چھپ کر پتنگ بازی کرتا ہے۔ ٹولیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرا بچہ پوری طرح اس وبا سے محفوظ نہیں رہ سکتا — اب میرے سامنے صرف دو راستے تھے، ایک یہ کہ میں پرانی ڈگر پر قائم رہوں اور ڈرا دھمکا کر پتنگ بازی سے باز رکھوں۔ اس میں یہ خدشہ تھا کہ اگر اس نے چوری چھپے پتنگ بازی کی تو یہ مخرب اخلاق لوگوں کے ساتھ مل کر پتنگ بازی کرے گا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودگی میں پتنگ بازی کراؤں اور اس کو اس طرح بری صحبت سے دور رکھوں۔ پتنگ بازی تو ہر صورت فعل مشترک ہے۔ لیکن پہلی صورت میں جاہل ہم نشین سے بگڑنے کا خطرہ ہے۔ دوسری صورت میں اس خطرے کا امکان نہیں ہے۔"

میرے والد صاحب کی یہ دلیل سن کر مولوی صاحب تو چلے گئے پتہ نہیں وہ مطمئن ہوئے یا نہیں، لیکن رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میری طلبی ہوئی اور والد صاحب نے سارا قصہ سنایا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا..." پتنگ بازی سے ایک طرف خاندانی وقار مجروح ہوتا ہے، تہذیب و اخلاق پر ضرب لگتی ہے سماج میں بدنامی ہوتی ہے اور دوسری طرف وقت اور پیسے کا بے جا اسراف ہوتا ہے۔ اگر تم اس پر بھی پتنگ بازی کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں خود تمھیں اپنی موجودگی میں پتنگ بازی کراؤں گا اور اسی طرح محلے والوں کے طعنے برداشت کروں گا اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ واقعی یہ شوق نہ صرف یہ کہ فضول ہے بلکہ بدترین بھی ہے تو تم اس سے باز آجاؤ..."

اس تقریر کا میرے دل پر عجیب سا اثر ہوا میں نے والد صاحب سے معذرت کی اور پتنگ بازی ترک کر دی۔ وہ دن اور آج کا دن — میں نے کبھی پتنگ بازی نہیں کی، بلکہ ایسے اشغال سے بھی دور رہا جو ہمارے قدیم اخلاقی نظام کے منافی ہیں۔ مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے والد محترم کا طریقہ تربیت نفسیاتی تھا۔ وہ خاص لمحوں میں خاص انداز سے جو باتیں کہتے، ان کا گہرا اثر ہوتا..."

(ماہنامہ خاتون مشرق۔ دہلی دسمبر ۱۹۸۶ء)

بچپن کے اس واقعے اور ایسے ہی دوسرے واقعات کی بنا پر میرے اندر خوب وزشت، اچھے برے اور حق و باطل کی تمیز پیدا ہو گئی اور میرا شعور بیدار ہوتا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے بچپن کی تربیت اس انداز کی نہ ہوتی تو میرا مزاج بھی اس انداز کا نہ ہوتا۔ وہ کچھ اور نہ ہوتا

"کیا ہوتا؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میں ۱۹۴۹ء سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، ۱۹۵۰ء میں میں مقامی نشستوں میں شرکت کرنے لگا تھا اور ۱۹۵۱ء سے میری غزلیں دہلی کے اُردو اخباروں مثلاً "ملاپ" "پرتاپ" اور پھر "نئی دنیا" اور "الجمعیۃ" وغیرہ اخبارات میں شائع ہونے لگی تھیں۔ جہاں تک میرے ابتدائی شعر گوئی کے محرکات کا تعلق ہے وہ دو ہیں۔ (۱) ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے اندوہناک اثرات (۲) فطری جمال پسندی۔ میں نے ایک جگہ ان دونوں محرکات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"برصغیر کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک ایک بحرانی دور رہا ہے۔ تقسیم ملک کے سانحے سے لے کر فرقہ وارانہ فسادات تک زندگی کے منظر نامے پر سیکڑوں رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے تھے۔ سرحد کے دونوں طرف آگ اور خون کا کھیل جاری تھا۔ انسانیت سر بہ گریباں تھی۔ میرا بچپن اسی خوفناک ماحول کی آغوش میں پروان چڑھا۔ یاد آتا ہے کہ ۱۹۴۹ء کو میرے قصبے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قریب کے ایک میلے میں سیکڑوں بے گناہ فرقہ پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ مجھ پر اس لرزہ خیز واقعے کا گہرا اثر ہوا۔ میری زبان پر بے اختیار چند پُر آہنگ اور کسی قدر مترنم جملے رقص کرنے لگے۔ اسی کو میں اپنا پہلا تخلیقی اور شاعرانہ ردِ عمل یا اظہار قرار دیتا ہوں۔ پھر یوں ہوا کہ ایک انجان جلوہ خوابوں کے افق پر طلوع ہونے لگا، اور میں اپنے آپ کو سوتے جاگتے ایک ہالۂ نور میں محصور پانے لگا۔ یادش بخیر کیا دن تھے کہ اس کی یاد سے مشامِ جان معطر رہتا۔ یہ ایک غیر مرئی ہیولا تھا جو میرے ذہن و ضمیر پر چھایا رہا۔ میری نگاہیں اسی جلوہ کو تلاش کرتی رہیں، جس کی جھلک زندگی کے ہر مظہر میں پائی۔ لیکن اس کو کبھی مجسم دیکھنے کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ اس صورت حال نے مجھے حسن کا ایک بے کراں تصور عطا کیا جس کی بنیاد حسی کیفیات سے شروع ہو کر جمالِ بے کراں تک پھیلی ہوئی ہے، اور اسی اندازِ فکر نے میرے فن کو شدید جمالیاتی احساس فراہم کی۔"

(ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی۔ مئی ۱۹۸۷ء)

جیسے جیسے میں اپنی عمر کی سیڑھیوں پر چڑھتا گیا، میرے ذہن و ضمیر پر ان دونوں محرکات کی گرفت بڑھتی رہی، یا یوں کہوں کہ ان دونوں محرکات کی خوشبو نے میرے مشامِ جاں کو شدید انداز سے معطر کیا اسی لیے میں نے ایک جگہ لکھا تھا:

"آدمی پر آدمی کے قہر نے مجھے ظلم، حق تلفی، ناانصافی، معاشی ناہمواری، فرقہ پرستی، زرگری، کمزور اور غریبوں کے استحصال، خود غرضی اور مکر و ریا سے متنفر کیا اور حق پرستی، عالمگیر انسانیت، مساوات، معاشی انصاف، عظمتِ آدم پر میرا ایمان تازہ کیا۔ جمالیاتی احساس نے زندگی کے حسن، خیر اور صداقت کو ایک تجربہ بنا کر پیش کیا، جس سے میرے احساسات ہی نہیں بلکہ وجدان اور شعور کی آبیاری بھی ہوئی۔ میرا ذہن و ضمیر سات رنگوں کی دھنک میں جھولتا رہا اور ایک نئی اخلاقی اور روحانی بصیرت سے ہمکنار ہوا۔ ان کیفیات کو زندگی کے شدید اور جاں گُسل تجربات نے وسیع اور بامعنی بنا دیا۔ مذہبیات، تصوف، اخلاقیات، نفسیات اور متعدد فلسفوں کے مطالعہ نے ایک نئی روشنی عطا کی۔ یہ وہ پس منظر ہے جس پہ میری شاعری رقص کرتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ میری شاعری سے اس نوع کی کیفیات کی کرنیں سی پھوٹتی ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ؂

یہ میرے دور کا انسان ہے کہ تشنگو
بھٹک رہا ہے خلا میں مری صدا کی طرح

تو محض ایک دیومالا کا اظہار کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ

آج کے انسان کی شدید مادی اور روحانی کشمکش اور اس کے زوال کا استعارہ ہوتا ہے ۔۔۔ یا یہ شعر ۔۔

جو اپنے خون کے رشتوں کے نام پوچھتے ہوں
تو دشمنوں کو بھی اللہ ایسے بھائی نہ دے

محض برائے بیت نہیں بلکہ تاریخ انسانی کے پس منظر میں خون کے رشتوں کی بے حرمتی اور بے معنویت کا مرثیہ ہے۔"

(ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ء)

میرے مزاج کی تشکیل پر ایک طرف میرا خارجی ماحول اثر انداز ہوا ہے اور دوسری طرف بعض خاندانی اور وراثتی خصوصیات اثر انداز ہوئی ہیں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مجھے غلط اور بری بات پر شدید غصہ آتا ہے، اس لیے میں ان لوگوں سے مختلف ہوں جو مصلحت اور مفاد کی خاطر سمجھوتہ کر لیتے ہیں یا حق و باطل کے معرکے میں غیر جانب دار ہو جاتے ہیں۔ میری اخلاقی لغت میں غیر جانبداری جیسی کوئی قدر نہیں ہے۔ میں نے اپنے مزاج کی اس کیفیت کی وجہ سے کئی دوستوں کو ناراض کیا ہے اور کئی بار بلکہ بار بار مادی نقصانات برداشت کیے ہیں، مگر مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے حق کے مقابلے میں باطل سے کبھی ہاتھ نہیں ملایا۔ میری زندگی کا ایک ایک پل شاہد ہے کہ اپنی تمام تر انکساری اور عاجزی کے باوجود اقتدار اور طاقت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا اور ہمیشہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔

میرے مزاج پر تصوف، شاعری اور تدریس نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ تصوف نے بے نیازی، قناعت اور فقر سے آشنا کیا۔ انسان کی عظمت اور مساوات پر ایمان تازہ کیا۔ تصوف کے دائرے میں "انسان" زبان، نظریے اور کلچر سے عظیم ہے۔ یہ کائنات میں بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کچھ ہے انسان کے لیے ہے اور انسان خدا کے لیے ہے۔ اس لیے میرے مزاج میں انسان دوستی، رواداری اور صلح جوئی کے عناصر شامل ہیں۔ مجھے شاعری یا تخلیقی احساس نے غم شناس اور خود دار بنایا۔ تدریس نے علمی وقار کے ساتھ سنجیدگی، معروضی انداز فکر اور وسیع المشربی عطا کی۔ غرض تصوف، تخلیق اور تدریس نے میرے مزاج کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے۔ جس کا انعکاس میرے تخلیقی اور غیر ادبی کاموں میں ہوتا ہے۔

مجھے سلیقہ مندی دل سے عزیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس سلیقہ مندی کے ساتھ جینا چاہتا ہوں اس انداز سے زندگی نہ کر سکا۔ میں اپنے سن شعور سے تادم تحریر سلیقہ مندی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میں اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی حفاظت سے رکھتا ہوں۔ میرے گھر میں میری کتابوں، کپڑوں اور دیگر اشیاء کے لیے جگہ متعین ہے۔ اگر میں اپنی کسی چیز کو اس کی متعین جگہ پر نہیں پاتا تو پریشان ہو جاتا ہوں
مجھے گرمی بہت ستاتی ہے۔ برسات اور سردی کے موسم میں خوش رہتا ہوں۔ مگر گرد گرمی سے بھی زیادہ پریشان کرتی ہے۔ مجھے بچپن میں بہت نیند آتی تھی، لیکن تعلیم کے ساتھ مشق سخن جاری رکھنے کی وجہ سے نیند کو ارادی طور پر اپنی آنکھوں سے دور کرنا پڑا۔ اب یہ حال ہے کہ نیند کم آتی ہے۔ صاف کیوں نہ کہوں کہ میں گزشتہ تیس سال میں ہر رات ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سو پایا۔ دو سال قبل عارضۂ قلب لاحق ہو گیا تھا، ڈاکٹر کے مشورے سے آرام کے نام پر گھنٹوں بستر پر لیٹا ہوا خواب کے جگنو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہوں۔

میں نے اپنی بے خوابی یا شب بیداری کو رائیگاں نہیں کیا بلکہ اس کو بامعنی اور تخلیقی بنانے کی کوشش کی۔ میں نے نظم و نثر کی شکل میں اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ ان ہی جاگتی راتوں اور بے خواب آنکھوں کے تال میل کا نتیجہ ہے۔ میں اب سے دو سال قبل تک رات کے نو بجے سے تین بجے تک باقاعدگی سے لکھتا پڑھتا تھا۔ دن کو فرائض منصبی ادا کرتا ہوں۔ احباب سے ملاقات کرتا ہوں اور گھر کے غیر ادبی کاموں میں بسر کرتا ہوں۔ رات لکھنے پڑھنے میں گزارتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے مضامین اور کتابوں کے علاوہ خطوط بھی رات کو ہی لکھے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ رات کو یکسوئی اور وارفتگی کے وہ لمحات مل جاتے ہیں جو علمی اور تخلیقی کاموں کے لیے ضروری ہیں۔
جب میں کوئی تحقیقی مضمون لکھتا ہوں تو نوٹس اور حوالے کے

سکتا ہوں چاروں طرف پھیلا لیتا ہوں اور ان کے درمیان میں بیٹھ کر لکھتا ہوں۔ تنقیدی مضمون یا کتاب لکھنے کے لیے گہرے غور و فکر کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مطالعے کے دوران جو تاثر اور انکشافات ہوتا ہے یعنی جو پہلو ذہن میں آجاتے ہیں انھیں نکات کی شکل میں حوالوں اور مثالوں کے ساتھ ایک کاغذ پر لکھ لیتا ہوں اور ان کی مدد سے مضمون یا کتاب مرتب کرتا ہوں۔ مضمون اگر مختصر ہے تو عام طور پر ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ طویل ہے یا کتاب ہے تو پھر اس کو قسطوں میں لکھتا ہوں۔ مضامین کی طرح کتابوں کا خاکہ بھی مرتب کرتا ہوں۔ اس کے ابواب اور ابواب کے ذیلی عنوانات قائم کرتا ہوں اور ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔
جہاں تک شاعری کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے یہ دو صورتوں میں بیدار ہوتا ہے
(۱) رات گئے۔ سونے کے وقت ذہن پر اشعار کا نزول ہوتا ہے۔ میں اندھیرے میں سونے کا عادی ہوں، اس عالم میں جب ذہن پر اشعار کا نزول ہوتا ہے تو انھیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے بار بار سوئچ آن کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی شب میں عام طور پر غزل مکمل ہو جاتی ہے۔ چار پانچ اشعار کے بعد فیضانِ شعر کا سرچشمہ خشک ہونے لگتا ہے۔ اس لیے میری ہر غزل کا ایک خاص موڈ یا ذائقہ ہوتا ہے اور ہر غزل جداگانہ مزاج کی ہوتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ایک نشست میں غزل پوری نہ ہو سکی تو پھر وہ برسوں ادھوری رہتی ہے اور جب پوری ہوتی ہے تو اس میں اضافہ شدہ اشعار دوسرے موڈ کے ہوتے ہیں۔
(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بس کے سفر میں میری تخلیقی تحریک بیدار ہوتی ہے۔ ریل کے سفر میں تو مجھے نیند آتی ہے۔ لیکن بس کے سفر میں شاعری کی سوجھتی ہے۔ وہ نظمیں جو ریڈیو کے لیے کسی خاص موضوع پر سنانی پڑیں یا وہ غزلیں جو طرحی مشاعروں میں پیش کرنی پڑیں وہ عام طور پر بس کے سفر کی دین ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بس کے سفر میں دو دو یا تین تین غزلیں مکمل ہو جاتی ہیں۔ جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوتی ہے تو دنوں اور ہفتوں تخلیقی موڈ قائم رہتا ہے۔ غزلیں ہوتی چلی جاتی ہیں اور جب طبیعت ادھر سے پلٹتی ہے تو کئی کئی مہینے شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذہن بنجر یا بانجھ ہو گیا ہے۔

میں ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا ہوں جس کی ماحول نے میرے بچپن کی توقیر بڑھائی ہے۔ سنِ شعور کے بعد مجھے شہروں کی خاک چھاننی پڑی۔ ۱۹۵۸ء میں میرا تقرر آگرے کے شعبۂ تحریۂ کالج میں ہوا۔ میری زندگی کا یہ بہت بڑا جذباتی تجربہ تھا۔ مجھے اپنے قصبے سے اکھڑ کر آگرے میں نصب ہونا تھا۔ دوسرا بڑا جذباتی تجربہ ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اس سال آگرے نے دہلی آگیا۔ منگلور سے مفارقت کے بعد آگرے میں دل لگنے کی کوشش کی تھی۔ وقت نے ایک اور مختصر سی ہجرت پر مجبور کر دیا۔ دہلی آکر از سرِ نو زندگی کرنے کی نیو ڈالی۔ اس عمل میں اگرچہ گاؤں میرے تحت الشعور میں زندہ رہا۔ مگر شہر اور اس کی حشر سامانیاں میرے شعور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری غزلوں میں لفظ 'شہر' اپنی تخلیقی جہات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ کام میرا نہیں کہ میں ان اشعار کا تجزیہ بھی کروں جو "شہر" کے کرب و کیف اور جہات و کیفیات کے امین ہیں۔ یہ کام میرے پرخلوص قاریوں اور نقادوں کا ہے کہ وہ ان اشعار کے ذریعہ میرے ردِ عمل کے اسلوب اور میرے ذہنی رویے کی شناخت کرنے کی کوشش کریں۔ میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے "شہر" ایک تخلیقی محرک ہی نہیں بلکہ منظر نامہ بھی ہے، جہاں سے میری تخلیقی تخیل رنگ اور خوشبو حاصل کرتی ہے "شہر" کے ماحول کی کیفیات پر چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کی شانِ نزول خود ان اشعار کی بُنت میں شامل ہے ؎

ضمیر بیچنے والے ضمیر بیچتے ہیں
اگرچہ شہر میں دل کی دکاں نہیں ہے کوئی
بھرا پڑا ہے بہت شہر، آرزو کی طرح
مگر یہ دل ہے کہ جیسے یہاں نہیں ہے کوئی

جنگل کی فضائیں بھی دل آویز ہیں لیکن
جنگل کے لیے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا

گلے میں باہوں کا ہالہ اگر نہیں نہ سہی مگر فصیل ضروری ہے شہرِ جاں کے لیے

آج کے انسان کی شدید مادی اور روحانی کش مکش اور اس کے زوال کا استعارہ ہوتا ہے ـــــ یا یہ شعر ؎

جو اپنے خون کے رشتوں کے نام پوچھتے ہوں
تو دشمنوں کو بھی اللہ ایسے بھائی نہ دے

محض برائے بیت نہیں، بلکہ تاریخ انسانی کے پس منظر میں خون کے رشتوں کی بے حرمتی اور بے معنویت کا مرثیہ ہے۔"

(ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ء)

میرے مزاج کی تشکیل پر ایک طرف میرا خارجی ماحول اثر انداز ہوا ہے اور دوسری طرف بعض خاندانی اور وراثتی خصوصیات اثر انداز ہوئی ہیں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مجھے غلط اور بری بات پر شدید غصہ آتا ہے، اس لیے میں ان لوگوں سے مختلف ہوں جو مصلحت اور مفاد کی خاطر سمجھوتہ کر لیتے ہیں یا حق و باطل کے معرکے میں غیر جانب دار ہو جاتے ہیں۔ میری اخلاقی لغت میں غیر جانبداری جیسی کوئی قدر نہیں ہے۔ میں نے اپنے مزاج کی اس کیفیت کی وجہ سے کئی دوستوں کو ناراض کیا ہے اور کئی بار بلکہ بار بار مادی نقصانات برداشت کیے ہیں، مگر مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے حق کے مقابلے میں باطل سے کبھی ہاتھ نہیں ملایا۔ میری زندگی کا ایک ایک پل شاہد ہے کہ اپنی تمام تر انکساری اور عاجزی کے باوجود اقتدار اور طاقت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا اور ہمیشہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔

میرے مزاج پر تصوف، شاعری اور تدریس نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ تصوف نے بے نیازی، قناعت اور فقر سے آشنا کیا۔ انسان کی عظمت اور مساوات پر ایمان تازہ کیا۔ تصوف کے دائرے میں "انسان" زبان، نظریے اور کلچر سے عظیم ہے۔ یہ کائنات میں بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے یہ جو کچھ ہے انسان کے لیے ہے اور انسان خدا کے لیے ہے۔ اس لیے میرے مزاج میں انسان دوستی، رواداری اور صلح جوئی کے عناصر شامل ہیں۔ مجھے شاعری یا تخلیقی احساس نے غم شناس اور خود دار بنایا۔ تدریس نے علمی وقار کے ساتھ سنجیدگی، معروضی انداز فکر اور وسیع المشربی عطا کی۔ غرض تصوف، تخلیق اور تدریس نے میرے مزاج کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے، جس کا انعکاس میرے تخلیقی اور غیر ادبی کاموں میں ہوتا ہے۔

مجھے سلیقہ مندی دل سے عزیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس سلیقہ مندی کے ساتھ جینا چاہتا ہوں اس انداز سے زندگی نہ کر سکا۔ میں اپنے سن شعور سے تادم تحریر سلیقہ مندی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میں اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی حفاظت سے رکھتا ہوں۔ میرے گھر میں میری کتابوں، کپڑوں اور دیگر اشیاء کے لیے جگہ متعین ہے۔ اگر میں اپنی کسی چیز کو اس کی متعین جگہ پر نہیں پاتا تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ مجھے گرمی بہت ستاتی ہے۔ برسات اور سردی کے موسم میں خوش رہتا ہوں۔ مگر گرد گرمی سے بھی زیادہ پریشان کرتی ہے۔ مجھے بچپن میں بہت نیند آتی تھی، لیکن تعلیم کے ساتھ مشق سخن جاری رکھنے کی وجہ سے نیند کو ارادی طور پر اپنی آنکھوں سے دور کرنا پڑا۔ اب یہ حال ہے کہ نیند کم آتی ہے۔ صاف کیوں نہ کہوں کہ میں گزشتہ تیس سال میں ہر رات ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سو پایا۔ دو سال قبل عارضۂ قلب لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے سے آرام کے نام پر گھنٹوں بستر پر لیٹا ہوا خواب کے جگنو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہوں۔

میں نے اپنی بے خوابی یا شب بیداری کو رائیگاں نہیں کیا بلکہ اس کو بامعنی اور تخلیقی بنانے کی کوشش کی۔ میں نے نظم و نثر کی شکل میں اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ ان ہی جاگتی راتوں اور بے خواب آنکھوں کے تال میل کا نتیجہ ہے۔ میں اب سے دو سال قبل تک رات کے نو بجے سے تین بجے تک باقاعدگی سے لکھتا پڑھتا تھا۔ دن کو فرائض منصبی ادا کرتا ہوں۔ احباب سے ملاقات کرتا ہوں اور گھر کے غیر ادبی کاموں میں بسر کرتا ہوں۔ رات لکھنے پڑھنے میں گزارتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے مضامین اور کتابوں کے علاوہ خطوط بھی رات کو ہی لکھے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ رات کو یکسوئی اور ارتکاز کے وہ لمحات مل جاتے ہیں، جو علمی اور تخلیقی کاموں کے لیے ضروری ہیں۔

جب میں کوئی تحقیقی مضمون لکھتا ہوں تو نوٹس اور حوالے کی

سمٹا ہیں چاروں طرف پھیلا لیتا ہوں اور ان کے درمیان میں بیٹھ کر لکھتا ہوں۔ تنقیدی مضمون یا کتاب لکھنے کے لیے گہرے غور و فکر کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مطالعے کے دوران جو تاثر اور انکشافات ہوتا ہے یعنی جو پہلو ذہن میں آ جاتے ہیں انھیں نکات کی شکل میں حوالوں اور مثالوں کے ساتھ ایک کاغذ پر لکھ لیتا ہوں اور ان کی مدد سے مضمون یا کتاب مرتب کرتا ہوں۔ مضمون اگر مختصر ہے تو عام طور پر ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ طویل ہے یا کتاب ہے تو پھر اس کو قسطوں میں لکھتا ہوں۔ مضامین کی طرح کتابوں کا خاکہ بھی مرتب کرتا ہوں۔ اس کے ابواب اور ابواب کے ذیلی عنوانات قائم کرتا ہوں اور ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔

جہاں تک شاعری کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے یہ دو صورتوں میں بیدار ہوتا ہے (۱) رات گئے۔ سونے کے وقت ذہن پر اشعار کا نزول ہوتا ہے۔ میں اندھیرے میں سونے کا عادی ہوں، اس عالم میں جب ذہن پر اشعار کا نزول ہوتا ہے تو انھیں منتقل قرطاس پر منتقل کرنے کے لئے بار بار سوئچ آن کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی شب میں عام طور پر غزل مکمل ہو جاتی ہے۔ چار پانچ اشعار کے بعد فیضانِ شعر کا سرچشمہ خشک ہونے لگتا ہے۔ اس لیے میری ہر غزل کا ایک خاص موڈ یا ذائقہ ہوتا ہے اور ہر غزل جداگانہ مزاج کی ہوتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ایک نشست میں غزل پوری نہ ہو سکی تو پھر وہ برسوں ادھوری رہتی ہے اور جب پوری ہوتی ہے تو اس میں اضافہ شدہ اشعار دوسرے موڈ کے ہوتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بس کے سفر میں میری تخلیقی تحریک بیدار ہوتی ہے۔ ریل کے سفر میں تو مجھے نیند آتی ہے۔ لیکن بس کے سفر میں شاعری کی سوجھتی ہے۔ وہ نظمیں جو ریڈیو کے لیے کسی خاص موضوع پر سنانی پڑیں یا وہ غزلیں جو طرحی مشاعروں میں پیش کرنی پڑیں وہ عام طور پر بس کے سفر کی دین ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بس کے سفر میں دو دو یا تین تین غزلیں مکمل ہو جاتی ہیں۔ جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوتی ہے تو دنوں اور ہفتوں تخلیقی موڈ قائم رہتا ہے۔ غزلیں ہوتی چلی جاتی ہیں اور جب طبیعت ادھر سے پلٹتی ہے تو کئی کئی مہینے شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذہن بنجر یا بانجھ ہو گیا ہے۔

میں ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا ہوں جس کی دھول نے میرے بچپن کی توقیر بڑھائی ہے۔ سنِ شعور کے بعد مجھے شہروں کی خاک چھاننی پڑی۔ ۱۹۵۸ء میں میرا تقرر آگرے کے شعیب محمدیہ کالج میں ہوا۔ میری زندگی کا یہ بہت بڑا جذباتی تجربہ تھا۔ مجھے اپنے قصبے سے اکھڑ کر آگرے میں نصب ہونا تھا۔ دوسرا بڑا جذباتی تجربہ ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اس سال آگرے سے دہلی آ گیا۔ منگلور سے مفارقت کے بعد آگرے میں دل لگانے کی کوشش کی تھی۔ وقت نے ایک اور مختصر سی ہجرت پر مجبور کر دیا۔ دہلی آ کر از سرِ نو زندگی کرنے کی خو ڈالی۔ اس عمل میں اگرچہ گاؤں میرے تحت الشعور میں زندہ رہا۔ مگر شہر اور اس کی حشر سامانیاں میرے شعور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری غزلوں میں لفظ 'شہر' اپنی تخلیقی جہات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ کام میرا نہیں کہ میں ان اشعار کا تجزیہ بھی کروں جو "شہر" کے کرب کیف اور جہات و کیفیات کے امین ہیں۔ یہ کام میرے پرخلوص قاریوں اور نقادوں کا ہے کہ وہ ان اشعار کے ذریعہ میرے ردعمل کے اسلوب اور میرے ذہنی رویے کی شناخت کرنے کی کوشش کریں۔ میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے "شہر" ایک تخلیقی محرک ہی نہیں بلکہ منظر نامہ بھی ہے، جہاں سے میری تخلیقی تخیل رنگ اور خوشبو حاصل کرتی ہے "شہر" کے ماحول کی کیفیات پر چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کی شان نزول خود ان اشعار کی بُنت میں شامل ہے ؎

ضمیر بیچنے والے ضمیر بیچتے ہیں
اگرچہ شہر میں دل کی دکان نہیں ہے کوئی

بھرا پڑا ہے بہت شہر، آرزو کی طرح
مگر یہ دل ہے کہ جیسے یہاں نہیں ہے کوئی

جنگل کی فضائیں بھی دل آویز ہیں لیکن
جنگل کے لئے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا

گلے میں باہوں کا ہالہ اگر نہیں نہ سہی   مگر فصیل ضروری ہے شہرِ جاں کے لیے

آج کے انسان کی شدید مادی اور روحانی کشمکش اور اس کے زوال کا استعارہ ہوتا ہے ـــــ یا یہ شعر ؎

جو اپنے خون کے رشتوں کے نام پوچھتے ہوں
تو دشمنوں کو بھی اللہ ایسے بھائی نہ دے

محض برائے بیت نہیں، بلکہ تاریخ انسانی کے پس منظر میں خون کے رشتوں کی بے حرمتی اور بے معنویت کا مرثیہ ہے۔"

(ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ء)

میرے مزاج کی تشکیل پر ایک طرف میرا خارجی ماحول اثر انداز ہوا ہے اور دوسری طرف بعض خاندانی اور وراثتی خصوصیات اثر انداز ہوئی ہیں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مجھے غلط اور بری بات پر شدید غصہ آتا ہے اس لیے میں ان لوگوں سے مختلف ہوں جو مصلحت اور مفاد کی خاطر سمجھوتہ کر لیتے ہیں یا حق و باطل کے معرکے میں غیر جانب دار ہو جاتے ہیں۔ میری اخلاقی لغت میں غیر جانبداری جیسی کوئی قدر نہیں ہے۔ میں نے اپنے مزاج کی اس کیفیت کی وجہ سے کئی دوستوں کو ناراض کیا ہے اور کئی بار بلکہ بار بار مادی نقصانات برداشت کیے ہیں، مگر مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے حق کے مقابلے میں باطل سے کبھی ہاتھ نہیں ملایا۔ میری زندگی کا ایک ایک پل شاہد ہے کہ اپنی تمام تر انکساری اور عاجزی کے باوجود اقتدار اور طاقت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا اور ہمیشہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔

میرے مزاج پر تصوف، شاعری اور تدریس نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ تصوف نے بے نیازی، قناعت اور فقر سے آشنا کیا۔ انسان کی عظمت اور مساوات پر ایمان تازہ کیا۔ تصوف کے دائرے میں "انسان" زبان، نظریے اور کلچر سے عظیم ہے۔ یہ کائنات میں بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے یہ جو کچھ ہے انسان کے لیے ہے اور انسان خدا کے لیے ہے۔ اس لیے میرے مزاج میں انسان دوستی، رواداری اور صلح جوئی کے عناصر شامل ہیں۔ مجھے شاعری یا تخلیقی احساس نے غم شناس اور خود دار بنایا۔ تدریس نے علمی وقار کے ساتھ سنجیدگی، معروضی انداز فکر اور وسیع المشربی عطا کی۔ غرض تصوف، تخلیق اور تدریس نے میرے مزاج کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے۔ جس کا انعکاس میرے تخلیقی اور غیر ادبی کاموں میں ہوتا ہے۔

مجھے سلیقہ مندی دل سے عزیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس سلیقہ مندی کے ساتھ جینا چاہتا ہوں اس انداز سے زندگی نہ کر سکا۔ میں اپنے سن شعور سے تادم تحریر سلیقہ مندی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میں اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی حفاظت سے رکھتا ہوں۔ میرے گھر میں میری کتابوں، کپڑوں اور دیگر اشیاء کے لیے جگہ متعین ہے۔ اگر میں اپنی کسی چیز کو اس کی متعین جگہ پر نہیں پاتا تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ مجھے گرمی بہت ستاتی ہے۔ برسات اور سردی کے موسم میں خوش رہتا ہوں۔ مگر گرد گرمی سے بھی زیادہ پریشان کرتی ہے۔ مجھے بچپن میں بہت نیند آتی تھی، لیکن تعلیم کے ساتھ مشق سخن جاری رکھنے کی وجہ سے نیند کو ارادی طور پر اپنی آنکھوں سے دور کرنا پڑا۔ اب یہ حال ہے کہ نیند کم آتی ہے۔ صاف کیوں نہ کہوں کہ میں گزشتہ تیس سال میں ہر رات ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سو پایا۔ دو سال قبل عارضۂ قلب لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے سے آرام کے نام پر گھنٹوں بستر پر لیٹا ہوا خواب کے جگنو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہوں۔

میں نے اپنی بے خوابی یا شب بیداری کو رائیگاں نہیں کیا بلکہ اس کو بامعنی اور تخلیقی بنانے کی کوشش کی۔ میں نے نظم و نثر کی شکل میں اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ ان ہی جاگتی راتوں اور بے خواب آنکھوں کے تال میل کا نتیجہ ہے۔ میں اب سے دو سال قبل تک رات کے نو بجے سے تین بجے تک باقاعدگی سے لکھتا پڑھتا تھا۔ دن کو فرائض منصبی ادا کرتا ہوں۔ احباب سے ملاقات کرتا ہوں اور گھر کے غیر ادبی کاموں میں بسر کرتا ہوں۔ رات لکھنے پڑھنے میں گزارتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے مضامین اور کتابوں کے علاوہ خطوط بھی رات کو ہی لکھے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ رات کو یکسوئی اور ارتکاز کے وہ لمحات مل جاتے ہیں جو علمی اور تخلیقی کاموں کے لیے ضروری ہیں۔

جب میں کوئی تحقیقی مضمون لکھتا ہوں تو نوٹس اور حوالے کی

کتابیں چاروں طرف پھیلا لیتا ہوں اور ان کے درمیان میں بیٹھ کر لکھتا ہوں۔ تنقیدی مضمون یا کتاب لکھنے کے لیے گہرے غور و فکر کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مطالعے کے دوران جو تاثر اور انکشافات ہوتا ہے یعنی جو پہلو ذہن میں آ جاتے ہیں انھیں نکات کی شکل میں حوالوں اور مثالوں کے ساتھ ایک کاغذ پر لکھ لیتا ہوں اور ان کی مدد سے مضمون یا کتاب مرتب کرتا ہوں۔ مضمون اگر مختصر ہے تو عام طور پر ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ طویل ہے یا کتاب ہے تو پھر اس کو قسطوں میں لکھتا ہوں۔ مضامین کی طرح کتابوں کا خاکہ بھی مرتب کرتا ہوں۔ اس کے ابواب اور ابواب کے ذیلی عنوانات قائم کرتا ہوں اور ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔

جہاں تک شاعری کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے یہ دو صورتوں میں بیدار ہوتا ہے

(۱) رات گئے۔ سونے کے وقت ذہن پر اشعار کا نزول ہوتا ہے۔ میں اندھیرے میں سونے کا عادی ہوں، اس عالم میں جب ذہن پر اشعار کا نزول ہوتا ہے تو انھیں منقولہ کاغذ پر منتقل کرنے کے لئے بار بار سوئچ آن کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی شب میں عام طور پر غزل مکمل ہو جاتی ہے۔ چار پانچ اشعار کے بعد فیضانِ شعر کا سرچشمہ خشک ہونے لگتا ہے۔ اس لیے میری ہر غزل کا ایک خاص موڈ یا ذائقہ ہوتا ہے اور ہر غزل جداگانہ مزاج کی ہوتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ایک نشست میں غزل پوری نہ ہو سکی تو پھر وہ برسوں ادھوری رہتی ہے اور جب پوری ہوتی ہے تو اس میں اضافہ شدہ اشعار دوسرے موڈ کے ہوتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بس کے سفر میں میری تخلیقی تحریک بیدار ہوتی ہے۔ ریل کے سفر میں تو مجھے نیند آتی ہے۔ لیکن بس کے سفر میں شاعری کی سوجھتی ہے۔ وہ نظمیں جو ریڈیو کے لیے کسی خاص موضوع پر سنانی پڑیں یا وہ غزلیں جو طرحی مشاعروں میں پیش کرنی پڑیں وہ عام طور پر بس کے سفر کی دین ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بس کے سفر میں دو دو یا تین تین غزلیں مکمل ہو جاتی ہیں۔ جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوتی ہے تو دنوں اور ہفتوں تخلیقی موڈ قائم رہتا ہے۔ غزلیں ہوتی چلی جاتی ہیں اور جب طبیعت ادھر سے پلٹتی ہے تو کئی کئی مہینے شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذہن بنجر یا بانجھ ہو گیا ہے۔

میں ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا ہوں جس کی دھول نے میرے بچپن کی توقیر بڑھائی ہے۔ سنِ شعور کے بعد مجھے شہروں کی خاک چھاننی پڑی۔ ۱۹۵۸ء میں میرا تقرر آگرے کے شعیب محمدیہ کالج میں ہوا۔ میری زندگی کا یہ بہت بڑا جذباتی تجربہ تھا۔ مجھے اپنے قصبے سے اکھڑ کر آگرے میں نصب ہونا تھا۔ دوسرا بڑا جذباتی تجربہ ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اس سال آگرے سے دہلی آ گیا۔ منگلور سے مفارقت کے بعد آگرے میں دل لگنے کی کوشش کی تھی۔ وقت نے ایک اور مختصر سی ہجرت پر مجبور کر دیا۔ دہلی آ کر از سرِ نو زندگی کرنے کی خو ڈالی۔ اس عمل میں اگرچہ گاؤں میرے تحت الشعور میں زندہ رہا۔ مگر شہر اور اس کی حشر سامانیاں میرے شعور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری غزلوں میں لفظ 'شہر' اپنی تخلیقی جہات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ کام میرا نہیں کہ میں ان اشعار کا تجزیہ بھی کروں جو "شہر" کے کرب کیف اور جہات و کیفیات کے امین رہا۔ یہ کام میرے پرخلوص قاریوں اور نقادوں کا ہے کہ وہ ان اشعار کے ذریعہ میرے ردِ عمل کے اسلوب اور میرے ذہنی رویے کی شناخت کرنے کی کوشش کریں۔ میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے "شہر" ایک تخلیقی محرک ہی نہیں بلکہ منظر نامہ بھی ہے، جہاں سے میری تخلیقی تخیل رنگ اور خوشبو حاصل کرتی ہے "شہر" کے ماحول کی کیفیات پر چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کی شانِ نزول خود ان اشعار کی بُنت میں شامل ہے ؎

ضمیر بیچنے والے ضمیر بیچتے ہیں
اگرچہ شہر میں دل کی دکاں نہیں ہے کوئی

بھرا پڑا ہے بہت شہر، آرزو کی طرح
مگر یہ دل ہے کہ جیسے یہاں نہیں ہے کوئی

جنگل کی فضائیں بھی دل آویز ہیں لیکن
جنگل کے لیے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا

گلے میں باہنوں کا ہالہ اگر نہ [illegible] فصیل ضروری ہے شہرِ جاں کے لیے



میکس بھی ... [illegible]

[illegible]

شامل ہیں

(۳) ۱۹۸۰ء میں پاکستان کے صدر جنرل [illegible]

انہیں علم نوازی ... [illegible]

[illegible] کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔

(۴) ۱۹۸۹ء میں غالب کلچرل سوسائٹی دہلی نے علمی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔

(۵) ۱۹۸۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم فل کا مقالہ بعنوان "عنوان چشتی، شخصیت اور ادبی کارنامے" داخل ہوا۔

(۶) متعدد ریسرچ اسکالرز علمی و ادبی خدمات پر پی ایچ۔ ڈی کے مقالے مرتب کر رہے ہیں۔

(۷) کئی کتابیں یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہیں۔

(۸) ہندستان اور پاکستان کے متعدد ادیبوں اور دانشوروں نے تعلیمی کام اور ادبی خدمات کو تحریری طور پر سراہا۔

کتابوں پر انعامات و اعزازات

(۱) تنقید سے تحقیق تک۔ ۱۹۷۳ء میں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام۔

(۲) اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت (۱۹۷۷ء) یوپی اردو اکادمی کا انعام

(۳) مکاتیبِ احسن مع مقدمہ و حواشی (جلد اول)۔ ۱۹۷۸ء میں یوپی اردو اکادمی کا انعام۔

(۴) تنقید سے تحقیق تک۔ ۱۹۸۱ء میں میر اکادمی لکھنؤ کا اعزاز (میر ایوارڈ)

(۵) معنویت کی تلاش۔ ۱۹۸۴ء یوپی اردو اکادمی لکھنؤ، مغربی بنگال اردو اکادمی کلکتہ اور دہلی کے انعامات۔

۱. پہلا شعر ... ۱۹۴۸ء [illegible]

۲. پہلی غزل کی تخلیق ۱۹۵۰ء میں

۳. پہلی غزل کی اشاعت روزنامہ "ملاپ" دہلی (۱۹۵۰ء)

۴. پہلی نظم کی تخلیق ۱۹۵۱ء میں

۵. پہلی نظم کی اشاعت ماہنامہ "شاعر" بمبئی (۱۹۵۲ء) "سلام اے مسافر"

۶. پہلی نثری تخلیق (ڈرامہ) ماہنامہ "تحفہ" لدھیانہ (۱۹۵۲ء) بچوں کا ڈرامہ

۷. پہلی تنقیدی تحریر ماہنامہ "ہادی" دیوبند (۱۹۵۳ء) الماس منگوری کی شاعری پر مضمون۔

مطبوعہ کتابیں

(۱) ذوقِ جمال (شاعری کا مجموعہ) اردو سماج جامعہ نگر نئی دہلی۔

(۲) نیم باز (شاعری کا مجموعہ) اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی (۱۹۶۸ء)

(۳) عکس و شخص (تنقید) ادارۂ عارض، مادی پور، نئی دہلی (۱۹۶۸ء)

(۴) تنقیدی پیرائے (تحقیق و تنقید) چمن بک ڈپو۔ جامع مسجد دہلی (۱۹۶۹ء)

(۵) تنقید سے تحقیق تک (تحقیق) اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی (۱۹۷۵ء)

(۶) اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے (تحقیق) انجمن ترقی اردو

... [illegible] تعدات (ادب نکھار کا خاص نمبر)
... شونامہ بھبن. اعظم گڑھ (۱۹۷۷ء)
... مع مقدمہ وحواشی (جلداول). (تحقیق و
[illegible]) اُردو سماج، جامعہ نگر. نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

(۹) سازِ مغرب (حصّہ دوم) (ترتیب وتہذیب) باشتراک
حسن الدین احمد (مرتبہ) ولا اکادمی. حیدر آباد (۱۹۷۷ء)

(۱۰) اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت (تحقیق وتنقید)
اردو سماج، جامعہ نگر. نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

(۱۱) میاد صدا (ترتیب وتہذیب) مرتبہ دارالمصنفین، جامع مسجد
دہلی (۱۹۸۱ء)

(۱۲) معنویت کی تلاش (تحقیق وتنقید) رنگ محل پبلی کیشنز،
انصاری روڈ مظفر نگر (۱۹۸۳ء)

(۱۳) مکاتیبِ احسن مع مقدمہ وحواشی (جلد دوم) اُردو سماج،
جامعہ نگر. نئی دہلی (۱۹۸۳ء)

(۱۴) عروضی اور فنی مسائل. اُردو سماج. جامعہ نگر، نئی دہلی
(۱۹۸۵ء)

(۱۵) اُردو میں کلاسیکی تنقید. مکتبۂ جامعہ. جامعہ نگر. نئی دہلی
(۱۹۸۵ء)

(۱۶) آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل. اردو اکادمی. دریا گنج
نئی دہلی. (۱۹۸۹ء)

(۱۷) حرفِ برہنہ. اُردو سماج، بی ۱۱۱. جامعہ نگر. نئی دہلی
(۱۹۸۹ء)

(۱۸) آبر احسنی اور اصلاحِ سخن. اُردو سماج، جامعہ نگر. نئی دہلی
(۱۹۹۰ء)

زیرِ ترتیب واشاعت

۱. اُردو ادب پر تصوف کے اثرات (تنقیدی وتحقیقی مطالعہ)
۲. اُردو عروض کی تشکیل جدید (عروض کا تحقیقی مطالعہ)
۳. اصلاحِ سخن کی روایت (تحقیق وتنقید)
۴. استناد (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
۵. اظہار (شعری مجموعہ)
۶. دفینے (مرتبہ) (حضرت آبر احسنی گنوری کا غیر مطبوعہ کلام مع مقدمہ)
۷. مطلع انوار (حضرت شاہ سید انوار احسن انوار منگلوری کا غیر مطبوعہ کلام مع مقدمہ)

دیگر غیر مطبوعہ تحریریں

۱. تقریباً ۲۵۰ مقالات، متعدد رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔
۲. تقریباً ۱۵۰ کتابوں پر تبصرے اور تجزیے رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔
۳. متعدد کتابوں میں مقدمے، دیباچے اور آرا شامل ہیں۔

دیگر خدمات

۱. ملک کے طول وعرض میں صدہا جلسوں کو سیرت وتصوف اور تہذیب کے متعدد موضوعات پر خطاب کیا۔
۲. نیشنل اور انٹرنیشنل سیمناروں میں صدارتی خطبے پڑھے اور مقالہ خوانی کی۔
۳. صدہا مشاعروں میں شرکت کی، افتتاحی تقریریں کیں اور صدارتی خطبے پڑھے۔
۴. ریڈیو پر تبصرے اور فیچر نشر کیے اور ٹی.وی پر ادبی پروگرام پیش کیے۔
۵. جذباتی، لسانی، ملکی اور تہذیبی اتحاد کے لیے کام کیا۔



قدرشناسی

(۱) الفا پبلشرز کی کتاب "ہوا بُو" (۱۹۷۷ء) میں سوانحی خاکہ شامل ہے۔

(۲) ۱۹۸۰ء میں پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ازراہ علم نوازی شرف مہانی بخشا اور "مرقع چغتائی" کی ایک جلد اپنے دستخط سے بطور تحفہ عطا فرمائی۔

(۳) ۱۹۸۸ء میں ایجوکیشنل انٹگریشن کونسل نئی دہلی نے علمی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔

(۴) ۱۹۸۹ء میں غالب کلچرل سوسائٹی دہلی نے علمی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیا۔

(۵) ۱۹۸۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم فل کا مقالہ بعنوان "عنوان چشتی: شخصیت اور ادبی کارنامے" داخل ہوا۔

(۶) متعدد ریسرچ اسکالرز علمی و ادبی خدمات پر پی ایچ۔ڈی کے مقالے مرتب کر رہے ہیں۔

(۷) کئی کتابیں یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہیں۔

(۸) ہندستان اور پاکستان کے متعدد ادیبوں اور دانش وروں نے تعلیمی کام اور ادبی خدمات کو تحریری طور پر سراہا۔

کتابوں پر انعامات و اعزازات

(۱) "تنقید سے تحقیق تک" ۱۹۷۳ء میں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام۔

(۲) "اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" (۱۹۷۷ء) یوپی اُردو اکادمی کا انعام

(۳) "مکاتیب احسن مع مقدمہ و حواشی (جلد اول)" ۱۹۷۸ء میں یوپی اُردو اکادمی کا انعام۔

(۴) "تنقید سے تحقیق تک" ۱۹۸۱ء میں تیر اکادمی لکھنؤ کا اعزاز (تیر ایوارڈ)

(۵) "معنویت کی تلاش" ۱۹۸۳ء یوپی اردو اکادمی لکھنؤ، مغربی بنگال اردو اکادمی کلکتہ اور دہلی کے انعامات۔

(۶) "مکاتیب احسن مع مقدمہ و حواشی (جلد دوم)" ۱۹۸۲ء میں بہار اردو اکادمی کا انعام

(۷) "عروضی اور فنی مسائل" (۱۹۸۶ء) یوپی اُردو اکادمی لکھنؤ کا انعام اور بہار اُردو اکادمی کا قاضی عبدالودود انعام۔

(۸) "اُردو میں کلاسیکی تنقید" (۱۹۸۹ء) یوپی اُردو اکادمی، بہار اُردو اکادمی اور مغربی بنگال اُردو اکادمی کے انعامات۔

تخلیقی سفر کا آغاز و ارتقاء

۱. پہلے شعر کی تخلیق ۱۹۴۹ء میں
۲. پہلی غزل کی تخلیق ۱۹۵۰ء میں
۳. پہلی غزل کی اشاعت روزنامہ "ملاپ" دہلی (۱۹۵۰ء)
۴. پہلی نظم کی تخلیق ۱۹۵۱ء میں
۵. پہلی نظم کی اشاعت ماہنامہ "شاعر" بمبئی (۱۹۵۳ء) "سلام اے مسافر"
۶. پہلی نثری تخلیق (ڈرامہ) ماہنامہ "تحفہ" لدھیانہ (۱۹۵۳ء) بچوں کا ڈرامہ
۷. پہلی تنقیدی تحریر ماہنامہ "ہادی" دیوبند (۱۹۵۳ء) الاحسن منگلوری کی شاعری پر مضمون۔

مطبوعہ کتابیں

(۱) ذوقِ جمال (شاعری کا مجموعہ) اُردو سماج، جامعہ نگر نئی دہلی۔

(۲) نیم باز (شاعری کا مجموعہ) اردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۶۸ء)

(۳) عکس و شخص (تنقید) ادارۂ عارض" ماڈل پور، نئی دہلی (۱۹۶۸ء)

(۴) تنقیدی پیرائے (تحقیق و تنقید) چمن بک ڈپو۔ جامع مسجد دہلی (۱۹۶۹ء)

(۵) تنقید سے تحقیق تک (تحقیق) اُردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۷۵ء)

(۶) اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے (تحقیق) انجمن ترقی اُردو

راؤز ایونیو۔ نئی دہلی۔ (۱۹۷۵ء)

(۷) گزشتہ چند، حیات و خدمات (ادب نکھار کا خاص نمبر) "ادب نکھار" ماہنامہ سخن۔ اعظم گڑھ (۱۹۷۷ء)

(۸) مکاتیبِ احسن مع مقدمہ و حواشی (جلد اول)۔ (تحقیق و تنقید) اُردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

(۹) سازِ مغرب (حصہ دوم) (ترتیب و تہذیب) بہ اشتراک حسن الدین احمد (مرتبہ) ولا اکادمی۔ حیدر آباد (۱۹۷۷ء)

(۱۰) اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت (تحقیق و تنقید) اردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

(۱۱) عیادِ صدا (ترتیب و تہذیب) مرتبہ دار المصنفین، جامع مسجد دہلی (۱۹۸۱ء)

(۱۲) معنویت کی تلاش (تحقیق و تنقید) رنگ محل پبلی کیشنز، انصاری روڈ مظفر نگر (۱۹۸۳ء)

(۱۳) مکاتیب احسن مع مقدمہ و حواشی (جلد دوم) اُردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۸۳ء)

(۱۴) عروض اور فنی مسائل۔ اُردو سماج۔ جامعہ نگر، نئی دہلی (۱۹۸۵ء)

(۱۵) اُردو میں کلاسیکی تنقید۔ مکتبۂ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۸۵ء)

(۱۶) آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل۔ اردو اکادمی۔ دریا گنج نئی دہلی۔ (۱۹۸۹ء)

(۱۷) حرفِ برہنہ۔ اُردو سماج، بی ۱۱/۷۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۸۹ء)

(۱۸) آبر احسنی اور اصلاحِ سخن۔ اُردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۱۹۹۰ء)

زیرِ ترتیب و اشاعت

۱. اُردو ادب پر تصوف کے اثرات (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)

۲. اُردو عروض کی تشکیل جدید (عروض کا تحقیقی مطالعہ)

۳. اصلاحِ سخن کی روایت (تحقیق و تنقید)

۴. استناد (تحقیقی و تنقیدی مقالات)

۵. اظہار (شعری مجموعہ)

۶. دفینے (مرتبہ) (حضرت آبر احسنی گنوری کا غیر مطبوعہ کلام مع مقدمہ)

۷. مطلع انوار (حضرت شاہ سید انوار الحسن انوار منگوری کا غیر مطبوعہ کلام مع مقدمہ)

دیگر غیر مطبوعہ تحریریں

۱. تقریباً ۲۵۰ مقالات، متعدد رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲. تقریباً ۱۵۰ کتابوں پر تبصرے اور تجزیے رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

۳. متعدد کتابوں میں مقدمے، دیباچے اور آرا شامل ہیں۔

دیگر خدمات

۱. ملک کے طول و عرض میں صدہا جلسوں کو سیرت و تصوف اور تہذیب کے متعدد موضوعات پر خطاب کیا۔

۲. نیشنل اور انٹرنیشنل سیمناروں میں صدارتی خطبے پڑھے اور مقالہ خوانی کی۔

۳. صدہا مشاعروں میں شرکت کی، افتتاحی تقریریں کیں اور صدارتی خطبے پڑھے۔

۴. ریڈیو پر تبصرے اور فیچر نشر کیے اور ٹی وی پر ادبی پروگرام پیش کیے۔

۵. جذباتی، لسانی، مسلکی اور تہذیبی اتحاد کے لیے کام کیا۔



تمہارا خیال کیا۔



بلور کا جام —
سرخ پھولوں سے بھرا
ٹھیس لگتے ہی گرا —
— ٹوٹ گیا
ریزہ ریزہ ہوا
وہ جلوۂ صد رنگ
کہ جیسے کہ کرنیں
رقص کرتے ہوئے اتری تھیں
نہاں خانۂ ہستی میں کبھی

○

خوں چکاں ہاتھوں سے یہ کرچیاں
سوچو تو — چنو گے کب تک
ان کو ہاتھوں سے سمیٹو کہ چنو پلکوں سے
پھر کسی جامِ تخیل میں سنبھالو ان کو
اور کچھ دیر بسائے رکھو خوشبو سے
یہ سونی محفل،
اس سے پہلے —
کہ یہ سب پھول بھی مرجھا جائیں
اس سے پہلے کہ بکھر جائیں یہ سب پتیاں
اسی جام بلوریں کی طرح
اور رہ جائیں فقط خار
خلش جن کی —
رگ و پے میں رہے گی — تا عمر

□□

زاہدہ زیدی
۲ آبشار، ۱۰ - ایچ آئی جی فلیٹس
سرسید نگر، علی گڑھ

کانپور

مولانا آزاد کا بچپن اور مادری زبان

مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کے بارے میں دو متضاد احوال ملتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ دونوں احوال خود انھیں کے بیانات سے منسوب ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زبانی سُنے ہوئے بچپن کے واقعات کو اپنی مشہور کتاب "آزاد کی کہانی : خود آزاد کی زبانی" میں اس طرح تحریر کیا ہے :-

"مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات' ابتدائے طفولیت سے یاد ہیں۔ مجھے بارہا خیال ہوا ہے کہ میں اپنی چار برس کی عمر کے چند نمایاں واقعات اچھی طرح یاد رکھتا ہوں"۔ [1]

"مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی۔ اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور مرحوم شیخ عبداللہ مراد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی"۔ [2]

"والد مرحوم نے جب آخری سفر ہندوستان کا کیا تو اس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی اور اسی زمانے میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا"۔ [3]

"عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔ میری بہنیں تو ٹھیک سے اُردو بول بھی نہ سکتی تھیں۔ بڑی اور منجھلی بہن تو اکثر عربی ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔ بچپن کا ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں ایسا گزرا کہ گھر میں اُردو میں بات چیت تو ہوتی تھی لیکن والدہ مرحومہ کو اس درجہ اُردو زبان اور بول چال ناپسند تھی کہ والد سے بھی وہ کوئی بات اُردو میں نہ سنتی تھیں۔ والد مرحوم ہم لوگوں سے اُردو میں باتیں کرتے اور ہمیں اُردو سکھاتے"۔ [4]

"ان اسباب سے ہم لوگ بچپن ہی سے حجاز کی غلط اور محرف عربی بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس سے بلا شبہ عربی کی تحصیل میں ہمیں مدد ملی اور وہ عدم مناسبت پیش نہ آئی جو غیر مانوس زبان کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالا کرتی ہے، بلکہ ہمیں یہی محسوس ہوا کہ گویا ہم اپنی مادری زبان پڑھ رہے ہیں"۔ [5]

آزاد کی کہانی ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی تھی مگر اس کی اشاعت ۱۹۶۰ء میں یعنی مولانا آزاد کی رحلت کے دو برس بعد ہوئی۔ ۳۹ سال تک یہ کتاب کیوں پردۂ خفا میں رہی، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی۔ تاہم یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، کیونکہ اب تک کسی اور کتاب میں مولانا آزاد کی نجی زندگی کے حالات و واقعات اتنی تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے تھے جتنے اس کتاب میں درج ہوئے اور چوں کہ یہ واقعات خود مولانا آزاد کی زبان سے سن کر لکھے گئے تھے اس لیے کم و بیش ان کو درجۂ استناد بھی مل گیا۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے جو تھیسس لکھی اس میں بھی مولانا کے بچپن کے انہی واقعات کا اعادہ کیا جو اوپر درج ہوئے ہیں۔ ملک زادہ کی عبارت اس طرح ہے :

بلّور کا جام

وہ جو کمرے میں سجایا تھا
بڑے شوق سے
بلّور کا جام ——
سُرخ پھولوں سے بھرا
ٹھیس لگتے ہی گرا ——
—— ٹوٹ گیا
ریزہ ریزہ ہوا
وہ جلوۂ صد رنگ
کہ جس کی کرنیں
رقص کرتی ہوئی اُتری تھیں
نہاں خانۂ ہستی میں کبھی

○

خوں چکاں ہاتھوں سے یہ کرچیاں
سوچو تو — چنو گے کب تک
ان کو ہاتھوں سے سمیٹو کہ چنو پلکوں سے
اَب یہ وہ جام بلوریں تو نہیں بن سکتیں

○

فرش پر بکھرے ہیں ہر سمت
لہو رنگ گلاب ——
اِس سے پہلے کہ یہ کمھلائیں
اُٹھالو ان کو ——
پھر کسی جامِ تخیل میں سجالو ان کو
اور کچھ دیر بسائے رکھو خوشبو سے
یہ سونی محفل،
اِس سے پہلے ——
کہ یہ سب پھول بھی مرجھا جائیں
اِس سے پہلے کہ بکھر جائیں یہ سب پتیاں
اس جام بلوریں کی طرح
اور رہ جائیں فقط خار
خلش جن کی ——
رگ و پے میں رہے گی —— تا عمر

□□

زاہدہ زیدی
۷ آبشار، ۱۲- ایچ آئی جی فلیٹس
سرسید نگر، علی گڑھ

ناقی انصاری
۲۹۵/۹۹ - نالہ روڈ، چمن گنج
کانپور ۲۰۸۰۰۱

مولانا آزاد کا بچپن اور مادری زبان

مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کے بارے میں دو متضاد احوال ملتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ دونوں احوال خود انھیں کے بیانات سے منسوب ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زبانی سُنے ہوئے بچپن کے واقعات کو اپنی مشہور کتاب "آزاد کی کہانی : خود آزاد کی زبانی" میں اس طرح تحریر کیا ہے :-

"مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات، ابتدائے طفولیت سے یاد ہیں۔ مجھے بارہا خیال ہوا ہے کہ میں اپنی چار برس کی عمر کے چند نمایاں واقعات اچھی طرح یاد رکھتا ہوں"۔ [۱]

"مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی۔ اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور مرحوم شیخ عبداللہ مراد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی"۔ [۲]

"والد مرحوم نے جب آخری سفر ہندوستان کا کیا تو اس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی اور اسی زمانے میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا"۔ [۳]

"عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔ میری بہنیں تو ٹھیک سے اُردو بول بھی نہ سکتی تھیں۔ بڑی اور منجھلی بہن تو اکثر عربی ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔ بچپن کا ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں ایسا گزرا کہ گھر میں اُردو میں بات چیت تو ہوتی تھی لیکن والدہ مرحومہ کو اس درجہ اُردو زبان اور بول چال ناپسند تھی کہ والد سے بھی وہ کوئی بات اُردو میں نہ سنتی تھیں۔ والد مرحوم ہم لوگوں سے اُردو میں باتیں کرتے اور ہمیں اُردو سکھاتے"۔ [۴]

"ان اسباب سے ہم لوگ بچپن ہی سے حجاز کی غلط اور محرّف عربی بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس سے بلا شبہ عربی کی تحصیل میں ہمیں مدد ملی اور وہ عدم مناسبت پیش نہ آئی جو غیر مانوس زبان کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالا کرتی ہے، بلکہ ہمیں یہی محسوس ہوا کہ گویا ہم اپنی مادری زبان پڑھ رہے ہیں"۔ [۵]

آزاد کی کہانی ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی تھی مگر اس کی اشاعت ۱۹۶۰ء میں یعنی مولانا آزاد کی رحلت کے دو برس بعد ہوئی۔ وسو سال تک یہ کتاب کیوں پردۂ خفا میں رہی، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی۔ تاہم یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، کیونکہ اب تک کسی اور کتاب میں مولانا آزاد کی نجی زندگی کے حالات و واقعات اتنی تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے تھے جتنے اس کتاب میں درج ہوئے اور چوں کہ یہ واقعات خود مولانا آزاد کی زبان سے سن کر لکھے گئے تھے اس لیے کم و بیش ان کو درجۂ استناد بھی مل گیا۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے جو تھیسس لکھی اس میں بھی مولانا کے بچپن کے انہی واقعات کا اعادہ کیا جو اوپر درج ہوئے ہیں۔ ملک زادہ کی عبارت اس طرح ہے :

بلّور کا جام

وہ جو کمرے میں سجایا تھا
بڑے شوق سے
بلّور کا جام ——
سرخ پھولوں سے بھرا
ٹھیس لگتے ہی گرا ——
ٹوٹ گیا ——
ریزہ ریزہ ہوا
وہ جلوۂ صد رنگ
کہ جیسے کہ کرنیں
رقص کرتے ہوئے اتری تھیں
نہاں خانۂ ہستی میں کبھی

○

خوں چکاں ہاتھوں سے یہ کرچیاں
سوچو تو — چنو گے کب تک
ان کو ہاتھوں سے سمیٹو کہ چنو پلکوں سے
اب یہ وہ جام بلوریں تو نہیں بن سکتیں

○

فرش پر بکھرے ہیں ہر سمت
لہو رنگ گلاب ——
اس سے پہلے کہ یہ کمھلائیں
اٹھا لو ان کو ——
پھر کسی جام تخیل میں سجا لو ان کو
اور کچھ دیر بسائے رکھو خوشبو سے
یہ سونی محفل،
اس سے پہلے ——
کہ یہ سب پھول بھی مرجھا جائیں
اس سے پہلے کہ بکھر جائیں یہ سب پتیاں
اسی جام بلوریں کی طرح
اور رہ جائیں فقط خار
خلش جن کی ——
رگ و پے میں رہے گی —— تا عمر

□□

زاہدہ زیدی
"آبشار" ۱۵/۶، ایچ آئی جی فلیٹس
سر سید نگر، علی گڑھ

ناطق انصاری
۲۹۵/۹۹ - نالہ روڈ، چمن گنج
کانپور ۲۰۸۰۰۱

مولانا آزاد کا بچپن اور مادری زبان

مولانا **ابوالکلام** آزاد کے بچپن کے بارے میں دو متضاد احوال ملتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ دونوں احوال خود انھیں کے بیانات سے منسوب ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زبانی سنے ہوئے بچپن کے واقعات کو اپنی مشہور کتاب "آزاد کی کہانی : خود آزاد کی زبانی" میں اس طرح تحریر کیا ہے :-

"مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات، ابتدائے طفولیت سے یاد ہیں۔ مجھے بارہا خیال ہوا ہے کہ میں اپنی چار برس کی عمر کے چند نمایاں واقعات اچھی طرح یاد رکھتا ہوں۔" [۱]

"مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی۔ اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور مرحوم شیخ عبداللہ مراد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی۔" [۲]

"والد مرحوم نے جب آخری سفر ہندوستان کا کیا تو اس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی اور اسی زمانے میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا۔" [۳]

"عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔ میری بہنیں تو ٹھیک سے اردو بول بھی نہ سکتی تھیں۔ بڑی اور منجھلی بہن تو اکثر عربی ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔ بچپن کا ابتدائی زمانہ مکۂ معظمہ میں ایسا گزرا کہ گھر میں اردو میں بات چیت تو ہوتی تھی لیکن والدہ مرحومہ کو اس درجہ اردو زبان اور بول چال ناپسند تھی کہ والد سے بھی وہ کوئی بات اردو میں نہ سنتی تھیں۔ والد مرحوم ہم لوگوں سے اردو میں باتیں کرتے اور اردو سکھاتے۔" [۴]

"ان اسباب سے ہم لوگ بچپن ہی سے حجاز کی غلط اور محرف عربی بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس سے بلا شبہ عربی کی تحصیل میں ہمیں مدد ملی اور وہ عدم مناسبت پیش نہ آئی جو غیر مانوس زبان کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالا کرتی ہے، بلکہ ہمیں یہی محسوس ہوا کہ گویا ہم اپنی مادری زبان پڑھ رہے ہیں۔" [۵]

آزاد کی کہانی ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی تھی مگر اس کی اشاعت ۱۹۶۰ء میں یعنی مولانا آزاد کی رحلت کے دو برس بعد ہوئی۔ ۳۹ سال تک یہ کتاب کیوں پردۂ خفا میں رہی، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی۔ تاہم یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، کیونکہ اب تک کسی اور کتاب میں مولانا آزاد کی نجی زندگی کے حالات و واقعات اتنی تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے تھے جتنے اس کتاب میں درج ہوئے اور چونکہ یہ واقعات خود مولانا آزاد کی زبان سے سن کر لکھے گئے تھے اس لیے کم و بیش ان کو درجۂ استناد بھی مل گیا۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد پر پی ایچ. ڈی کے لیے جو تھیسس لکھی اس میں بھی مولانا کے بچپن کے انھی واقعات کا اعادہ کیا جو اوپر درج ہوئے ہیں۔ ملک زادہ کی عبارت اس طرح ہے :

بلّور کا جام

وہ جو کمرے میں سجایا تھا
بڑے شوق سے
بلّور کا جام —
سرخ پھولوں سے بھرا
ٹھیس لگتے ہی گرا —
— ٹوٹ گیا
ریزہ ریزہ ہوا
وہ جلوۂ صد رنگ
کہ جیسے کہ کرنیں
رقص کرتے ہوئے اتری تھیں
نہاں خانۂ ہستی میں کبھی

○

خوں چکاں ہاتھوں سے یہ کرچیاں
سوچو تو — چنو گے کب تک
ان کو ہاتھوں سے سمیٹو کہ چنو پلکوں سے
اب یہ وہ جامِ بلوریں تو نہیں بن سکتیں

○

فرش پر بکھرے ہیں ہر سمت
لہو رنگ گلاب —
اس سے پہلے کہ یہ کمھلائیں
اٹھا لو ان کو —
پھر کسی جامِ تخیل میں سجا لو ان کو
اور کچھ دیر بسائے رکھو خوشبو سے
یہ سونی محفل،
اس سے پہلے —
کہ یہ سب پھول بھی مرجھا جائیں
اس سے پہلے کہ بکھر جائیں یہ سب پتیاں
اس جام بلوریں کی طرح
اور رہ جائیں فقط خار
خلش جن کی —
رگ و پے میں رہے گی — تا عمر

□□

زاہدہ زیدی
"آبشار" ۱۲- ایچ آئی جی فلیٹس
سر سید نگر، علی گڑھ

مولانا آزاد کا بچپن اور مادری زبان

مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کے بارے میں دو متضاد احوال ملتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ دونوں احوال خود انھیں کے بیانات سے منسوب ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زبانی سُنے ہوئے بچپن کے واقعات کو اپنی مشہور کتاب "آزاد کی کہانی : خود آزاد کی زبانی" میں اس طرح تحریر کیا ہے :-

"مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات، ابتدائے طفولیت سے یاد ہیں۔ مجھے بارہا خیال ہوا ہے کہ میں اپنی چار برس کی عمر کے چند نمایاں واقعات اچھی طرح یاد رکھتا ہوں۔"[1]

"مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی۔ اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور مرحوم شیخ عبداللہ مراد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی۔"[2]

"والد مرحوم نے جب آخری سفر ہندوستان کا کیا تو اس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی اور اسی زمانے میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا۔"[3]

"عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔ میری بہنیں تو ٹھیک سے اُردو بول بھی نہ سکتی تھیں۔ بڑی اور منجھلی بہن تو اکثر عربی ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔ بچپن کا ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں ایسا گزرا کہ گھر میں اُردو میں بات چیت تو ہوتی تھی لیکن والدہ مرحومہ کو اس درجہ اُردو زبان اور بول چال ناپسند تھی کہ والد سے بھی وہ کوئی بات اُردو میں نہ سنتی تھیں۔ والد مرحوم ہم لوگوں سے اُردو میں باتیں کرتے اور اُردو سکھاتے۔"[4]

"ان اسباب سے ہم لوگ بچپن ہی سے حجاز کی غلط اور محرّف عربی بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس سے بلاشبہ عربی کی تحصیل میں ہمیں مدد ملی اور وہ عدم مناسبت پیش نہ آئی جو غیر مانوس زبان کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالا کرتی ہے، بلکہ ہمیں یہی محسوس ہوا کہ گویا ہم اپنی مادری زبان پڑھ رہے ہیں۔"[5]

آزاد کی کہانی ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی تھی مگر اس کی اشاعت ۱۹۶۰ء میں یعنی مولانا آزاد کی رحلت کے دو برس بعد ہوئی۔ ۳۹ سال تک یہ کتاب کیوں پردۂ خفا میں رہی، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی۔ تاہم یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، کیونکہ اب تک کسی اور کتاب میں مولانا آزاد کی نجی زندگی کے حالات و واقعات اتنی تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے تھے جتنے اس کتاب میں درج ہوئے اور چوں کہ یہ واقعات خود مولانا آزاد کی زبان سے سن کر لکھے گئے تھے اس لیے کم و بیش ان کو درجۂ استناد بھی مل گیا۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے جو تھیسس لکھی اس میں بھی مولانا کے بچپن کے انہی واقعات کا اعادہ کیا جو اوپر درج ہوئے ہیں۔ ملک زادہ کی عبارت اس طرح ہے :

"پانچ سال کی عمر میں مولانا کی تقریب بسم اللہ شیخ عبداللہ مراد کے ہاتھوں ادا ہوئی جو حرم شریف کے خطیب تھے۔ قرآن ختم کرنے کے بعد ابھی حرم کے سب سے بڑے قاری شیخ حسن کے پاس قرأت کے لیے جانا ہی شروع کیا تھا کہ ہندوستان کا سفر پیش آگیا۔" ۷

"آزاد کی کہانی" سے اردو داں طبقے میں یہ خیال عام طور سے رائج ہو گیا کہ مولانا آزاد کا بچپن (سات آٹھ سال کی عمر تک) مکے میں گزرا اور وہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی نیز ان کی مادری زبان عربی تھی۔

غلام ربانی تاباں نے مولانا آزاد پر ایک مختصر کتاب تالیف کی تھی جو ۱۹۸۷ء میں حکومت ہند کے پبلی کیشنز ڈویژن کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس میں بھی مولانا آزاد کے بچپن کے بارے میں انہی خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔

"مولانا آزاد ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کے ابتدائی دن وہیں گزارے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ وہاں ظاہر ہے کہ اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیے وہ محض عربی اور فارسی پڑھ سکے۔ بقول مولانا آزاد: پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ کی تقریب حرم شریف میں ہوئی۔" ۸

یہ خیال کہ مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی مکے میں بسر ہوئی اور ان کی مادری زبان عربی تھی، عوام و خواص، سب کے ذہنوں میں اتنا مستحکم ہو گیا کہ جب "انڈیا ونس فریڈم" (اردو ترجمہ ہماری آزادی) میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے خود مولانا آزاد کی زبان سے سنی ہوئی یہ عبارت لکھی کہ "میں مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا۔ دو سال بعد میرے والد پورے خاندان کے ساتھ کلکتہ آئے۔ ایک سال بعد میری والدہ نے وفات پائی اور انھیں وہیں (کلکتہ میں) دفن کیا گیا" تو جناب عبداللطیف اعظمی کو اس پر یقین نہیں آیا اور انھوں نے اپنے مضمون "سوانح ابوالکلام آزاد" مطبوعہ آجکل دہلی، مولانا آزاد نمبر بابتہ نومبر ۱۹۸۸ء میں حاشیے پر اس کی تردید ان الفاظ میں کی:

"واپسی کا صحیح سن ۱۸۹۸ء ہے، غالباً پروفیسر ہمایوں کبیر کو سننے میں غلطی ہوئی۔"

موصوف نے وہی بات پھر دہرا دی کہ مولانا آزاد جب پہلی مرتبہ اپنے والد اور خاندان کے ساتھ کلکتہ آئے تو ان کی عمر دس سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مولانا آزاد کے بچپن کے مکہ معظمہ میں بسر ہونے اور ان کی مادری زبان کے عربی ہونے کا جواز پیدا ہو گیا۔ اس تطابق میں ان کو اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے پروفیسر ہمایوں کبیر کے بارے میں یہ شبہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان سے سننے میں غلطی ہوئی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد جتنا ہمایوں کبیر کو بتاتے تھے اتنا وہ انگریزی میں لکھ کر دوسرے دن مولانا آزاد کو دکھاتے تھے اور مولانا ایک ایک لفظ کو خود پڑھ کر اور حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ کر کے ہی اس کو پاس کرتے تھے۔ اس کتاب کی تالیف کے طریق کار کے بارے میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں ان کے غلط سننے، غلط اندراج کرنے اور مولانا آزاد کی نظر سے اس غلط اندراج کے پھسل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ مشکل یہ آن پڑی کہ انڈیا ونس فریڈم کی اشاعت سے قبل ہی مولانا آزاد چل بسے اور اس طرح اس کتاب کا درجہ استناد صد فی صد سے کم ہو گیا۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مولانا آزاد کے بچپن کے دونوں طرح کے واقعات کے راوی خود مولانا آزاد ہیں مگر ان کو تحریر کرنے والی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں، یعنی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور پروفیسر ہمایوں کبیر۔ اور دونوں مسودوں پر مولانا آزاد کے دستخط ثبت نہیں ہیں۔

دو سال کی عمر میں کلکتہ آنے کی تصدیق صرف انڈیا ونس فریڈم کی عبارت سے ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کی بڑی بہن، فاطمہ بیگم کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے:

"مولانا آزاد مجھ سے چار سال چھوٹے تھے۔ مکہ شریف میں ہم دونوں پیدا ہوئے۔ جب مولانا آزاد دو سال کے ہوئے تو ہمارے والد ہم دونوں کو لے کر کلکتہ چلے آئے، جہاں ہمارے والد کے ہزاروں ماننے والے تھے۔"

فاطمہ بیگم سے ملاقات کرنے والے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی تھے اور یہ ملاقات مولانا آزاد کی رحلت کے فوراً بعد ہوئی تھی۔ ۹

دو سال کی عمر میں کلکتہ مراجعت کرنے کی تصدیق مزید خود مولانا

آزاد کے ایک غیر مطبوعہ خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۱۵ر جولائی ۱۹۰۲ء کو بہ عمر ۱۷ سال، رنجور عظیم آبادی کو لکھا تھا اور جسے شائستہ خاں (خدابخش لائبریری پٹنہ) نے ماہنامہ کتاب نما، دہلی کے ستمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع کروایا ہے۔ شائستہ خاں کے مضمون " مولانا آزاد کے صحیح سال پیدائش کا انکشاف " میں اصل خط کا عکس اور نستعلیق میں اس کی عبارت، دونوں شامل ہیں۔ یہ خط بعض وجوہات سے بے حد اہم ہے۔ اول یہ کہ اس خط میں مولانا آزاد نے اپنا سال پیدائش ۱۳۰۲ھ لکھا ہے۔ جبکہ 'تذکرہ' میں اپنا سال پیدائش ۱۳۰۵ھ قرار دیا ہے۔ 'تذکرہ' میں مولانا کی اصل عبارت اس طرح ہے:

" یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانہ خویش
نمک پروردۂ ریش، خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد
مدعو بہ ابی الکلام، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ
میں ہستی عدم سے عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت
حیات سے متہم۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے سال پیدائش میں، دو سال کا یہ واضح فرق کس کھاتے میں ڈالا جائے۔ اس لیے کہ دونوں سنین خود انھیں کے تحریر کردہ ہیں۔ اس خط میں اپنے دیگر بھائی بہنوں کے سن پیدائش کا جو خاکہ انھوں نے درج کیا ہے وہ بھی غور طلب ہے:

۱۔ خدیجہ	۱۲۹۱ھ
۲۔ فاطمہ	۱۲۹۷ھ
۳۔ حنیفہ	۱۲۹۹ھ
۴۔ غلام یٰسین	۱۳۰۱ھ
۵۔ محی الدین	۱۳۰۳ھ

اس خاکے میں خدیجہ کو چھوڑ کر، باقی سب بھائی بہنوں کے سن پیدائش میں دو سال کا وقفہ توجہ طلب ہے۔ حد یہ ہے کہ اس خط میں مولانا نے اپنا نام "محی الدین" تحریر کیا ہے مگر تذکرہ کی محولہ بالا عبارت میں محی الدین کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ "موسوم بہ احمد، مدعو بہ ابی الکلام" سے سارا کام چلا لیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی ناواقف شخص مثلاً کوئی غیر ملکی اردو اسکالر ان دونوں تحریروں کو دیکھے تو یہی سمجھے گا کہ محی الدین کوئی اور شخص ہے اور " موسوم بہ احمد، مدعو بہ ابی الکلام" کوئی دوسرا شخص ہے

دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس خط کے مطابق ان کی والدہ کا انتقال ۱۳۰۵ھ میں ہوا یعنی ۱۸۸۸ء میں۔ جبکہ یہی سن مولانا آزاد کا مستند سن پیدائش سمجھا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس خط میں لکھا ہے کہ والدہ کے انتقال کے وقت خدیجہ کی عمر ۱۴ سال اور خود ان کی عمر دو سال تھی۔ انڈیا ونس فریڈم میں انھوں نے اپنے والد کے ہندوستان آنے کا سن ۱۸۹۰ء بتایا ہے اور اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۹۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال کلکتے میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئیں۔ "ہماری آزادی" (مکمل مع ۳۰ صفحات) مترجمہ ڈاکٹر شمیم حنفی مطبوعہ ۱۹۹۱ء میں صفحہ دو اور تین پر متعلقہ عبارت اس طرح ہے:

"میں ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں
میرے والد پورے کنبے کے ساتھ کلکتہ آئے۔ کچھ عرصہ
پہلے جدہ میں وہ گر پڑے تھے اور ان کی پنڈلی کی ہڈی
ٹوٹ گئی تھی، اسے بٹھا تو دیا گیا تھا مگر اچھی طرح نہیں
اور انھیں مشورہ دیا گیا تھا کہ اسے کلکتہ کے سرجن ٹھیک
کر سکتے ہیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ صرف مختصر مدت تک
یہاں قیام کریں گے لیکن ان کے مداح اور مرید انھیں
جانے ہی نہیں دیتے تھے۔ ہمارے کلکتہ آنے کے ایک
سال بعد میری والدہ انتقال فرما گئیں اور وہیں دفن کی
گئیں۔"

اس عبارت اور نو دریافت خط کی عبارت میں والدہ کے انتقال کے سن میں تین سال کا نمایاں فرق موجود ہے۔ نو دریافت شدہ خط کی متعلقہ تحریر اس طرح ہے:

" ۱۳۰۴ (ہجری) کے اواخر میں اجمیر، اکبر آباد وغیرہ
مقامات کی سیر کرتے ہوئے (والد) کلکتہ پہنچے اور حاجی واحد نا
جو یہاں کے مشہور رئیس اور والد صاحب کے معتقد تھے
انھیں اپنے گھر لے گئے۔ کلکتہ پہنچے ہوئے تھوڑا ہی
عرصہ ہوا تھا کہ میری والدہ یکایک سخت بیمار ہو گئیں اور

بیماری سے ۱۵ ہفتے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔"

اسی خط میں آگے چل کر والدہ کے انتقال کا سن بھی متعین کر دیا ہے:۔

"اس سے تم کو معلوم ہوگا کہ بڑی اولاد خدیجہ ہے ۱۲۹۱ ہجری میں پیدا ہوئی تھی اس لیے جب والدہ کا انتقال ہوا یعنی ۱۳۰۵ ہجری میں (اس وقت) خدیجہ کی عمر چودہ برس کی تھی مگر خدا جانے کیوں اس زمانے میں شادی نہ ہوئی اور اسی نہ ہونے نے آج وہ فساد اور جھگڑا پیدا کردیا جس نے میری زندگی تلخ کر دی ہے اور (میں) خودکشی پر آمادہ ہوں۔"

ان متضاد بیانات کی موجودگی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ جس وقت مولانا آزاد کی والدہ کا انتقال ہوا، وہ نومولود تھے، دو سال کے تھے یا تین سال کے، اس لیے کہ ان تینوں باتوں کا تعین خود ان کی اپنی تحریروں میں موجود ہے۔

حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہرحال واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کی مادری زبان عربی نہیں تھی اور حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کا قصہ محض اتنا ہے کہ یہ تقریب (اگر واقعی کوئی تقریب منعقد ہوئی تھی) تو ان کے بھائی غلام یٰسین کی بسم اللہ کی تقریب تھی جس میں ممکن ہے کہ "موسوم بہ احمد" کو بھی بٹھا دیا گیا ہو۔ اس موقع پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ مادری زبان سے میری مراد "زبان مادر" نہیں ہے بلکہ وہ زبان ہے جو بچہ اپنی ماں کی گود میں یا اپنے کنبے کے درمیان سیکھتا اور بولتا ہے اور آگے چل کر یہی اس کی اصل زبان بنتی ہے۔ اس لحاظ سے دو سال کی عمر سے مستقلاً ہندستان میں رہنا اور نشو و نما پانا اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ مولانا آزاد کی مادری زبان اُردو تھی، عربی نہ تھی۔ اُردو ہی میں انھوں نے بولنا سیکھا اور یہی زبان ان کا اصل ذریعۂ اظہار تھی۔ عربی فارسی کا علم انھوں نے اپنے شوق، ذہانت اور محنت سے حاصل کیا، اور اس میں اتنی دست گاہ بہم پہونچائی کہ ان کا شمار ان دونوں زبانوں کے عالموں میں ہونے لگا۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا آزاد کے کنبے کی اُردو زبان اتنی فصیح و سلیس نہ ہوگی کہ جتنی اس زمانے میں شمالی ہند کے دیگر مسلمان گھرانوں میں ہوتی تھی۔ اس پر عربی اور فارسی کا غلبہ معمول سے کچھ زیادہ ہی رہا ہوگا شاید اسی لیے ان کی جوانی کی تحریروں میں عربی و فارسی کا غلبہ بہت قوی نظر آتا ہے۔

مولانا آزاد کی بہن فاطمہ بیگم نے ان کے بچپن کے جو واقعات بتائے ہیں ان میں، "سات آٹھ سال کی عمر" کا ذکر واضح طور سے کیا ہے اور جائے وقوع کلکتہ کا مکان معلوم ہوتا ہے۔ ان کا متعلقہ بیان اس طرح ہے:

"بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہ تھا جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ برس کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے کہ تم لوگ صندوق پر چلّا چلّا کر کہو "ہٹو ہٹو، راستہ دو، دلّی کے مولانا آرہے ہیں۔" ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے، ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔ تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔ پھر بھائی صندوق پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔" ۵۹

فاطمہ بیگم کے بیان میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہیں اول یہ کہ ان کے بچپن کا زمانہ کلکتے میں گزرا اور اوپر لکھا ہوا یہ فقرہ "ہٹو ہٹو راستہ دو، دلّی کے مولانا آرہے ہیں" ٹھیٹھ اردو زبان کا ہے جو مولانا کی زبان سے روانی سے ادا ہوتا تھا۔ اس فقرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد بچپن ہی سے اُردو بولتے تھے، عربی فارسی نہیں بولتے تھے دوئم یہ کہ اس قسم کے مناظر مولانا آزاد کلکتہ میں بارہا دیکھ چکے ہوں گے۔ ممکن ہے خود مولانا خیرالدین کے لیے یہ فقرہ تعظیماً بولا جاتا ہو اور وہیں سے مولانا آزاد نے اسے سیکھا ہو۔ اگر مندرجہ بالا واقعہ صحیح ہے (اور اس کے غلط ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے) تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کے دس برس کی عمر میں ہندستان آنے اور کلکتہ میں

پیسے کی روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ مگر اس غلط بیانی کا ذمہ دار کون ہے؟ خود مولانا ابوالکلام آزاد یا پھر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی؟ اب یہ دونوں حضرات اس دنیا میں نہیں ہیں اس لیے اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ بتانے والے نے کیا بتایا اور لکھنے والے نے کیا لکھا۔ مگر تمام قرائن کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا ملیح آبادی کو غلط واقعات بیان کرنے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور اس سے ان کا دینی یا دنیاوی کیا فائدہ ہوتا؟ اسی لیے گمان غالب ہے کہ انھوں نے آزاد کی کہانی میں وہی باتیں لکھیں جو مولانا آزاد نے ان سے بتائی تھیں۔ اس کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۱ء میں جب مولانا آزاد نے اپنے حالات لکھوائے، اس وقت وہ ۳۳ یا ۳۴ برس کے پختہ کار سیاست داں، مدبر اور مصنف بن چکے تھے اور اپنی شخصیت کو ابھارنے اور اپنی امیج بنانے میں ان کی دلچسپی بام عروج پر تھی۔ دس سال کی عمر میں ہندستان کو مراجعت کرنے سے ان کی مادری زبان کے عربی ہونے کا جواز پیدا ہو گیا اور دینی حیثیت سے ان کے وقار میں اضافہ ہو گیا۔ یہ دونوں باتیں ان کے جذبہ افتخار اور پرورش انا کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے بوجوہ ضروری تھیں۔ اپنی شخصیت اور انانیت کے بارے میں ان کا جو مزاج تھا اس کا اظہار تذکرہ سے لے کر غبار خاطر کی تحریروں تک اور انڈیا ونس فریڈم میں ان کے سیاسی تبصروں تک ہر جگہ، قدم قدم پر ہوا ہے اس کے علاوہ عربی کے مادری زبان ہونے کے فقرے میں لفظ "گویا" بھی درمیان میں موجود ہے یعنی "عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔" اس گویا نے صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں' والی کیفیت پیدا کر دی اور مولانا کی بات قطعیت سے دور جا پڑی۔ "آزاد کی کہانی" کے برعکس پٹنہ کا نو دریافت خط ۱۹۰۳ء کا تحریر کردہ ہے جب مولانا کی عمر پندرہ یا سترہ سال تھی اور ان کی شہرت اور عظمت ابھی اپنے ابتدائی دور تشکیل میں تھی۔ اس عمر کی تحریر میں واقعات کا نیک نیتی اور صدق دلی سے بیان کرنا زیادہ فطری اور قابلِ فہم ہے۔ اس کے علاوہ یہ خط اگر واقعی رنجور عظیم آبادی کے نام ہے جن سے مولانا کے انتہائی قریبی اور نجی تعلقات تھے، تو اس میں مصلحت آمیز سنین اور واقعات تحریر کرنے کا کوئی قرینہ نہیں بنتا۔ بعض لوگ تو ان کے مکہ میں پیدا ہونے کو ہی مشکوک سمجھتے ہیں مگر چوں کہ اس کے قطعی شواہد دستیاب نہیں ہیں اس لیے قطعیت سے کچھ نہیں کہہ پاتے۔ کمال احمد صدیقی نے اپنی ایک حالیہ تحریر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"غالب اور اقبال کی طرح ابوالکلام آزاد کا سنہ پیدائش بھی مشکوک ہے سنہ پیدائش ہی نہیں عرب میں ان کی ولادت بھی مشکوک ہے۔ عرب سے ہندستان آنے کے دو مختلف سن "تذکرہ" اور "انڈیا ونس فریڈم" میں درج ہیں۔ اقبال اور ابوالکلام کی بے باکی بہت سوچی سمجھی اور موقع محل کا لحاظ کر کے ہوتی تھی"۔ [10]

اوپر کے مباحث سے جو تحریری شواہد مولانا آزاد کے بچپن اور مادری زبان کے بارے میں سامنے آئے ہیں، ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد اور کنبے کے دیگر افراد کے ساتھ محض ۲ برس کی عمر میں کلکتہ پہونچے تھے اور یہی ان کا مستقل وطن تھا نیز ان کی مادری زبان اردو تھی، عربی نہ تھی جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ تحقیق میں بہر حال کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کچھ ایسے نئے شواہد سامنے آجائیں جس سے صورتِ حال بالکل عیاں یا منقلب ہو جائے مگر فی الحال ہمیں مولانا آزاد کے بارے میں ان شواہد کو خوش دلی سے تسلیم کر لینا چاہیے۔

□□

حواشی:

1. آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی ص ۱۹۷
2. ، 3. " " " " ص ۱۹۸
4. " " " ص ۲۰۱
5. " " " ص ۲۰۲
6. مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن نسیم بک ڈپو ص ۳۰
7. ابوالکلام آزاد۔ از غلام ربانی تاباں ص ۷
8. ، 9. ماہنامہ آجکل دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۵۹ء ص ۱۵-۱۴ بحوالہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عرش ملسیانی ص ۱۲-۱۱
10. ہماری زبان دہلی بابتہ یکم مارچ ۱۹۹۲ء ص ۱

بیماری سے دو ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔"
اسی خط میں آگے چل کر والدہ کے انتقال کا سن بھی متعین کر دیا ہے:۔

"اس سے تم کو معلوم ہوگا کہ بڑی اولاد خدیجہ ہے ۱۲۹۱ ہجری میں پیدا ہوئی تھی اس لیے جب والدہ کا انتقال ہوا یعنی ۱۳۰۵ ہجری میں (اس وقت) خدیجہ کی عمر چودہ برس کی تھی مگر خدا جانے کیوں اس زمانے میں شادی نہ ہوئی اور اسی نہ ہونے نے آج وہ فساد اور جھگڑا پیدا کر دیا جس نے میری زندگی تلخ کر دی ہے اور (میں) خودکشی پر آمادہ ہوں۔"

ان متضاد بیانات کی موجودگی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ جس وقت مولانا آزاد کی والدہ کا انتقال ہوا، وہ نومولود تھے، دو سال کے تھے یا تین سال کے، اس لیے کہ ان تینوں باتوں کا تعین خود ان کی اپنی تحریروں میں موجود ہے۔

حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہر حال واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کی مادری زبان عربی نہیں تھی اور حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کا تذکرہ محض اتنا ہے کہ یہ تقریب (اگر واقعی کوئی تقریب منعقد ہوئی تھی) تو ان کے بھائی غلام یسین کی بسم اللہ کی تقریب تھی جس میں ممکن ہے کہ موسوم بہ احمد کو بھی بٹھا دیا گیا ہو۔ اس موقع پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ مادری زبان سے میری مراد "زبان مادر" نہیں ہے بلکہ وہ زبان ہے جو بچہ اپنی ماں کی گود میں یا اپنے کنبے کے درمیان سیکھتا اور بولتا ہے اور آگے چل کر یہی اس کی اصل زبان بنتی ہے۔ اس لحاظ سے دو سال کی عمر سے مستقلاً ہندستان میں رہنا اور نشوونما پانا اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ مولانا آزاد کی مادری زبان اُردو تھی، عربی نہ تھی۔ اُردو ہی میں انھوں نے بولنا سیکھا اور یہی زبان ان کا اصل ذریعۂ اظہار تھی۔ عربی فارسی کا علم انھوں نے اپنے شوق، ذہانت اور محنت سے حاصل کیا اور اس میں اتنی دست گاہ بہم پہنچائی کہ ان کا شمار ان دونوں زبانوں کے عالموں میں ہونے لگا۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا آزاد کے کنبے کی اُردو زبان اتنی فصیح و سلیس نہ ہوگی کہ جتنی اس زمانے میں شمالی ہند کے دیگر مسلمان گھرانوں میں ہوتی تھی۔ اس پر عربی اور فارسی کا غلبہ معمول سے کچھ زیادہ ہی رہا ہوگا شاید اسی لیے ان کی جوانی کی تحریروں میں عربی و فارسی کا غلبہ بہت قوی نظر آتا ہے۔

مولانا آزاد کی بہن فاطمہ بیگم نے ان کے بچپن کے جو واقعات بتائے ہیں ان میں "سات آٹھ سال کی عمر" کا ذکر واضح طور سے کیا ہے اور جائے وقوع کلکتہ کا مکان معلوم ہوتا ہے۔ ان کا متعلقہ بیان اس طرح ہے:

"بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہ تھا جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ برس کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے کہ تم لوگ صندوق پر چلا چلا کر کہو "ہٹو ہٹو، راستہ دو، دلّی کے مولانا آرہے ہیں" ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔ تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔ پھر بھائی صندوق پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔" ۵۹

فاطمہ بیگم کے بیان میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہیں اول یہ کہ ان کے بچپن کا زمانہ کلکتے میں گزرا اور اوپر لکھا ہوا یہ فقرہ "ہٹو ہٹو راستہ دو، دلّی کے مولانا آرہے ہیں" ٹھیٹھ اردو زبان کا ہے جو مولانا کی زبان سے روانی سے ادا ہوتا تھا۔ اس فقرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد بچپن ہی سے اُردو بولتے تھے، عربی فارسی نہیں بولتے تھے دوئم یہ کہ اس قسم کے مناظر مولانا آزاد کلکتہ میں بارہا دیکھ چکے ہوں گے۔ ممکن ہے خود مولانا خیرالدین کے لیے یہ فقرہ تعظیماً بولا جاتا ہو اور وہیں سے مولانا آزاد نے اسے سیکھا ہو۔ اگر مندرجہ بالا واقعہ صحیح ہے (اور اس کے غلط ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے) تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کے دس برس کی عمر میں ہندستان آنے اور کلکتہ میں

بسنے کی روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ مگر اس غلط بیانی کا ذمہ دار کون ہے؟ خود مولانا ابوالکلام آزاد یا پھر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی؟ اب یہ دونوں حضرات اس دنیا میں نہیں ہیں، اس لیے اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ بتانے والے نے کیا بتایا اور لکھنے والے نے کیا لکھا۔ مگر تمام قرائن کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا ملیح آبادی کو غلط واقعات بیان کرنے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور اس سے ان کا دینی یا دنیاوی کیا فائدہ ہوتا؟ اس لیے گمان غالب ہے کہ انھوں نے آزاد کی کہانی میں وہی باتیں لکھیں جو مولانا آزاد نے ان سے بتائی تھیں۔ اس کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۱ء میں جب مولانا آزاد نے اپنے حالات لکھوائے، اس وقت وہ ۳۳ یا ۳۴ برس کے پختہ کار سیاست داں، مدبّر اور مصنف بن چکے تھے اور اپنی شخصیت کو ابھارنے اور اپنی امیج بنانے میں ان کی دلچسپی بام عروج پر تھی۔ دس سال کی عمر میں ہندستان کو مراجعت کرنے سے ان کی مادری زبان کے عربی ہونے کا جواز پیدا ہو گیا اور دینی حیثیت سے ان کے وقار میں اضافہ ہو گیا۔ یہ دونوں باتیں ان کے جذبہ افتخار اور پرورش انا کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے بوجوہ ضروری تھیں۔ اپنی شخصیت اور انانیت کے بارے میں ان کا جو مزاج تھا اس کا اظہار تذکرہ سے لے کر غبار خاطر کی تحریروں تک اور انڈیا ونس فریڈم میں ان کے سیاسی تبصروں تک ہر جگہ، قدم قدم پر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ عربی کے مادری زبان ہونے کے فقرے میں لفظ "گویا" بھی درمیان میں موجود ہے یعنی "عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔" اس گویا نے صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، والی کیفیت پیدا کر دی اور مولانا کی بات قطعیت سے دور جا پڑی۔ "آزاد کی کہانی" کے برعکس پٹنہ کا نودریافت خط ۱۹۰۳ء کا تحریر کردہ ہے جب مولانا کی عمر پندرہ یا سترہ سال تھی اور ان کی شہرت اور عظمت ابھی اپنے ابتدائی دور تشکیل میں تھی۔ اس عمر کی تحریر میں واقعات کا نیک نیتی اور صدق دلی سے بیان کرنا زیادہ فطری اور قابل فہم ہے۔ اس کے علاوہ یہ خط اگر واقعی رنجور عظیم آبادی کے نام ہے جن سے مولانا کے انتہائی قریبی اور نجی تعلقات تھے، تو اس میں مصلحت آمیز سنین اور واقعات تحریر کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ بعض لوگ تو ان کے مکّہ میں پیدا ہونے کو ہی مشکوک سمجھتے ہیں مگر چوں کہ اس کے قطعی شواہد دستیاب نہیں ہیں اس لیے قطعیت سے کچھ نہیں کہہ پاتے۔ کمال احمد صدیقی نے اپنی ایک حالیہ تحریر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

> "غالب اور اقبال کی طرح ابوالکلام آزاد کا سنہ پیدائش بھی مشکوک ہے۔ سنہ پیدائش ہی نہیں عرب میں ان کی ولادت بھی مشکوک ہے۔ عرب سے ہندستان آنے کے دو مختلف سن "تذکرہ" اور "انڈیا ونس فریڈم" میں درج ہیں۔ اقبال اور ابوالکلام کی بے باکی بہت سوچی سمجھی اور موقع محل کا لحاظ کر کے ہوتی تھی۔" [10]

اوپر کے مباحث سے جو تحریری شواہد مولانا آزاد کے بچپن اور مادری زبان کے بارے میں سامنے آئے ہیں، ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد اور کنبے کے دیگر افراد کے ساتھ محض ۲ برس کی عمر میں کلکتہ پہونچے تھے اور یہی ان کا مستقل وطن تھا نیز ان کی مادری زبان اردو تھی، عربی نہ تھی جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ تحقیق میں بہرحال کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کچھ ایسے نئے شواہد سامنے آ جائیں جس سے صورتِ حال بالکل عیاں یا منقلب ہو جائے مگر فی الحال ہمیں مولانا آزاد کے بارے میں ان شواہد کو خوش دلی سے تسلیم کر لینا چاہیے۔

□□

حواشی:

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص۱۶۷
[2،3] " " " " ص۱۶۸
[4] " " " ص۲۰۱
[5] " " " ص۲۰۲
[6] مولانا ابوالکلام آزاد ـ فکر و فن نسیم بک ڈپو ص۳۰
[7] ابوالکلام آزاد ـ از غلام ربانی تاباں ص۷
[8،9] ماہنامہ آجکل دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۵۹ء ص۱۵-۱۴ بحوالہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عرش ملسیانی ص۱۲-۱۱
[10] ہماری زبان دہلی بابتہ یکم مارچ ۱۹۹۲ء ص۱

قدرت نے ایک ایسا رومانی اور دل چسپ ماحول مرتب کیا ہے جو انسانی تخلیق و تعاون عمل میں ایک ترتیبی نظام یا باہمی ہمکاری کا ایک ایسا پائیدار بندھن جذبات کے سہارے سے پیدا کر دیتا ہے جس کو ہمسر کے علاوہ کسی دوسرے نام سے یاد کرنا غیر مدلل ہوگا۔ مگر چوں کہ انسان اپنی دماغی صلاحیت کی بنا پر اپنے ماحول کی ہر شے کو اپنی امکانی کوشش بھر استحصال کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش میں مبتلا ہے اس لیے اس کے ہاتھوں خود اپنی ہی برادری میں جو ردجانی کشش نظر آتی ہے اس کی سب سے بھیانک اور ظالمانہ کوشش خود اس کی ہمسر جو بیشتر وفادار، مونس و غمگسار، شریک حیات، معاشرہ میں مردوں سے زیادہ پیچیدہ اور ذمہ دار امور کو انجام دینے والی ذی روح عورت ہے۔

اگر ہم انسان کی سماجی زندگی کی ابتدا سے عورت کے مرد کے ساتھ تعلق اور رویہ پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ جسمانی طاقت اور دماغی صلاحیت کے اعتبار سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ مرد کے اعتبار سے عورت میں زیادہ ذمہ داری اور محنت و توجہ سے سماجی زندگی کی بہتری کے لیے ایک لگن ہے جو وہ ازل سے آج تک انجام دے رہی ہے اور اگر اس زمانہ کی تشخیص مرد نے مناسب طور سے انجام دی ہوتی تو ممکن تھا آج کا معاشرہ جو اپنے میں بے چینی محسوس کرتا ہے یا تناؤ اور بے اعتمادی کے جس ماحول سے دوچار ہے، وہ نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اگر مرد نے اپنی ہی برادری میں استحصال کرنے کے عمل کی ابتدا عورت سے نہ کی ہوتی تو انسانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ بے اعتمادی اور فریب کاری کا ماحول شروع ہی نہ ہوا ہوتا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنسیت ایک ایسا تعصب (prejudice) یا اختلاف ہے جو مردوں اور عورتوں کے درمیان سماج میں تصور کیا جاتا ہے، عام طور پر کسی بھی تعصب کے تین اجزا ہوتے ہیں:

(الف) منفی نقطۂ نظر

(ب) ایک ایسی صورت جس میں چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا عنصر پایا جائے۔

(ج) وہ صورت جہاں کسی چیز کی بہت سی اہم خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ان تعصبات کے عام طور پر دو بہت اہم (NORMS) ہوتے ہیں جن کو ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں جیسے:

(۱) بے تعصبی یا عقل پسندی (Rationality) کا رویہ۔

(۲) انصاف کا رویہ، جس سے فرد کی ذاتی صلاحیت کے رویہ کی پہچان ہوتی ہے۔ اسی صلاحیت کی نفی کر دینے سے ہم اس کو انسانیت کے درجہ میں بھی برابر کا شریک نہیں کرتے۔

اس طرح اگر ہم جنسیت کے مختلف پہلوؤں اور ساتھ ہی ساتھ اہم پیسی سے عورتوں کے خلاف تفریق کے تصور کا جائزہ لیں تو فری مین (Freeman) کے اندازوں کے مطابق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دو خاص امور کی بنا پر عورتوں کو مردوں سے کمتر اور پست تصور کیا جاتا ہے۔ اول یہ کہ مرد عورتوں سے زیادہ اہم ہیں۔ دوسرے یہ کہ جن کاموں کو مرد انجام دیتے ہیں وہ زیادہ اہم ہیں۔ اسی طرح کچھ اور اندازوں سے فری مین کے خیال کے مطابق عورتوں کا وجود گویا مردوں کی تفریح و عیش کے علاوہ ان کی اعانت کرنا ہے۔ ہم اس کو ہندستانی معاشرے کے بندھوا مزدور یا قرون وسطیٰ کے معاشرہ میں غلاموں یا لونڈیوں کے درجہ سے ملتا جلتا تصور کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے یہی مفروضہ ہو جس کی بنا پر عورتوں کی نفسیات میں ایک خاص طرح کی تبدیلی رونما ہوئی ہو جس سے انھوں نے اپنا مقدر مردوں کے التفات و توجہ کو بنا لیا ہو جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ وہ اپنی زیبائش اور مسحورکن اندازے یا ان دیگر عارضی سہاروں سے مردوں کو اپنانے کی کوشش میں لگ جائیں۔

ان صدیوں کے دباؤ اور کاملاً مصنوعی انداز سے خواتین ایک احساس ناپائیداری اور عدم خود اعتمادی کے باعث نفسیاتی طور پر مردوں کے ماتحت رہنے میں ایک احساس عزت محسوس کرتی ہیں اور اپنی شخصیت کی پہچان مردوں کے زیر سایہ مکمل تصور کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی عورتیں اپنی تمامتر معاشی خصوصیات کی موجودگی کے باوجود اپنی تمام تر صلاحیتیں کند ہونے سے نہیں روک پاتیں جس کے نتیجے میں وہ معاشی حیثیت سے یا تو مردوں سے پست ہو جاتی ہیں یا پھر ذہنی طور پر خود کو ان سے کمتر محسوس کرتی ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی انھیں نفسیاتی طور پر اسی احساس کا پیکر سمجھا جا سکتا

۴۔

Sandra اور Darylben نے اپنی تحقیق کے ذریعے یہ بات محسوس کی ہے کہ جنسیات ایک بے شعوری آئیڈیولوجی (Uncons-cious Ideology) ہو گئی ہے۔ ہم اپنی زندگی کے رویہ میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم اسی طرح کی زندگی گزار سکتے ہیں، جبکہ فطری طور پر ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم اپنے اسی یقین کی بنا پر بچوں کے تعلیمی نظام میں بھی اس طرح انتخاب کرتے ہیں کہ انھیں اسی مفروضہ کے اعتبار سے تربیت ملے چنانچہ بہت سے حالات میں ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بچوں کو اس طرح کی تعلیم میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود، ان کو انھیں علوم کو حاصل کرنا پڑتا ہے۔

امریکہ میں نیگرو اور عورتوں کے عادات واطوار کا جائزہ لیا گیا تو ان میں بہت سی باتوں میں مماثلت نظر آئی اور کچھ امور میں تضاد بھی۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں میں عام طور پر stereo type رویہ پایا جاتا ہے، جبکہ اختلافی صورت حال میں عورتیں باوجود کمتر حیثیت کے اوّل تو اکثریت میں ہیں دیگر یہ کہ بالاسطحی سماج سے رابطہ ہونے کی بنا پر وہ مکمل محرومی کا شکار نہیں ہونے پاتیں۔

ان دونوں صورتوں میں مماثلت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سماج کے بالادست گروہ کی زیادتیوں کی بنا پر ایک شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں جن سے سماج میں انھیں طاقت اور آزادی کا ظاہری روپ مل سکے۔ اسی بنا پر وہ اشتباہی کیفیت (False Defer-ential) تعلّی و خوشامدانہ انداز اختیار کرتی ہیں۔ ہندستانی معاشرہ میں بھی اس سماجی پستی کا اظہار مختلف جملوں، کہاوتوں وغیرہ سے ہوتا ہے، جیسے تریا چلتر، تریا ہٹ وغیرہ۔

سماجی ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ درست و مناسب معاشرہ میں یقین رکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ انسان جو کچھ چاہے وہ جائز طور پر حاصل کر سکتا ہے اور یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہوگا، وہ جائز طور پر ہی حاصل کیا ہوگا۔ اس لیے اگر ہم چاہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ عادلانہ برتاؤ اور برابری کا رویہ اختیار کر سکتے ہیں ایسی صورت میں ہر شخص کو اس کی صلاحیتوں اور سخت محنت کا پھل میسر ہوگا مگر کبھی کبھی ان دیکھے حادثات اور انہونی باتیں ایسے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیتیں اور ان لوگوں کی خواہشیں ان کے سامنے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔

ماہرین نفسیات نے اپنی تحقیقات سے اس بات کے شواہد جمع کر دیئے ہیں کہ just world کا جذبہ اسی وقت لوگوں کے دلوں میں موہوم ہونے لگتا ہے جب وہ اپنے مشاہدوں میں دنیا کی بے اعتدالیوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

سماج کے چند استحصال کنندوں نے جس طرح معاشی اور جنسیاتی درجہ بندی کا عمل جاری کر دیا ہے اسی طرح عورت کی جنس کو جو پست مقام دیا گیا ہے اس کو وہ افراد یا گروہ کسی طرح تبدیل کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا ہر روز کا مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زبردستی منہ کالا کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ مرد کو سماج سے وہ سزا نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہے بلکہ وہ عورت معاشرہ میں اور بھی پست شمار کی جانے لگتی ہے اس لیے کہ اس میں بہر حال مرد کی بے راہ روی کی تشہیر ہوتی ہے اور گویا دوسرا مرد اس کو پست تصور کرتے ہوئے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا یعنی اس تشہیر سے اگر مرد عارضی طور پر ملوث ہوتا بھی ہے تو عورت اپنی بے قصوری کے باوجود اس سے زیادہ شکار ہو جاتی ہے یعنی ظالم صرف خفیہ شریک کار تصور کیا جاتا ہے اور مظلوم ایک مستقل گناہگار ٹھہرتا ہے۔ یہ تصور رہی اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ معاشرہ عورت کو ہمیشہ پست تصور کرتا ہے اور اسے کسی طرح برابری کا درجہ دینا نہیں چاہتا۔

B.F. Skinner کے Beyond Freedom-and dignity- سے ایک اور دلچسپ بات ظاہر ہوتی ہے جس کو ہم آج کے ترقی یافتہ معاشرہ میں بھی خاص طور پر محسوس کرتے ہیں، کہ جب ہم عورتوں کو آزادی یا حریت کے نام پر کچھ ظاہری مراعات دینے کا ڈھونگ رچاتے ہیں تو ان پر اندرونی دباؤ یا گرفت اور سخت کر دیتے ہیں۔ ہم انسانوں میں افراد کو ان کے گزشتہ ماحول یا موجودہ حالات کے بغیر ان کی اپنی ذمہ داریوں کے لیے جوابدہ

سکتے ہیں۔ گویا ان کے اچھے یا بُرے ہونے کی یہی کسوٹی ہے۔ مگر عورتوں کے بارے میں پہلے سے ہی ہمارا رویہ بنا ہوا ہے کہ ان میں امور کو انجام دینے اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی مناسب صلاحیت نہیں ہے۔

عورتوں کے بارے میں ماہرین نفسیات نے ... پیچیدہ تجربات نہیں کیے ہیں مگر پھر بھی نفسیاتی طریقہ ... سلسلے میں ماہرین جن نتائج پر پہونچے ہیں ان سے ہمیں ... کہ عورتیں اپنی شادی شدہ زندگی میں سماجی مجبوری اور روایتی طریقہ کار کی بنا پر عموماً ایک مریضانہ انداز فکر پیدا کرلیتی ہیں جو depression یا خستگی کی شکل میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ مریضانہ کیفیت ان میں شادی کی بنا پر پیدا ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب تو کوئی ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے مگر بظاہر سماجی طریقہ کار کی طرح ہم یہاں بھی اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ زندگی میں جس طرح سماجی دباؤ برداشت کرنے اور ایسے حالات میں ان پر قابو پانے کے طریقے ایک شخص کو اچھا انسان اور دوسرے شخص کو برا ثابت کرتے ہیں اسی طرح دو افراد کے ملن، ان کے اپنے رویوں اور مفاہمت پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے۔ روایتی طرز فکر اور دوسروں کے بنائے ہوئے قاعدے ان کے اپنے مشاہدے تک محدود ہوتے ہیں، البتہ انھیں سمجھنے اور ان پر اپنی موجودہ صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک صحت مند اور تجزیاتی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات اس میں خوش نمائی اور رعنائی ضرور پیدا کر دیتے ہیں مگر فیصلوں میں جذبات کا مسئلہ ثانوی ہو جاتا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماجی قوانین سماج میں ہم آہنگی کے لیے جہاں ضروری ہوتے ہیں وہاں ان میں وقتاً فوقتاً سماج کے شیرازہ کو باقی رکھتے ہوئے تحریکی عمل بھی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افراد کی اپنی صحت، ان کی اپنے کاموں کو انجام دینے کی مشق کے علاوہ ہم کاری کو سراہنے کی صلاحیت کی ملی جلی آمیزش سے ہی خاندان میں خوش بختی کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اس کو تنہائی میں طے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں وہ تمام عوامل کارفرما ہوں گے جو معاشرہ کی پہچان کے ساتھ ساتھ افراد کی باہمی مفاہمت سے بھی متعلق ہوں جس میں عورت کو ایک ہمکار اکائی کے طور پر قبول کیا جائے۔

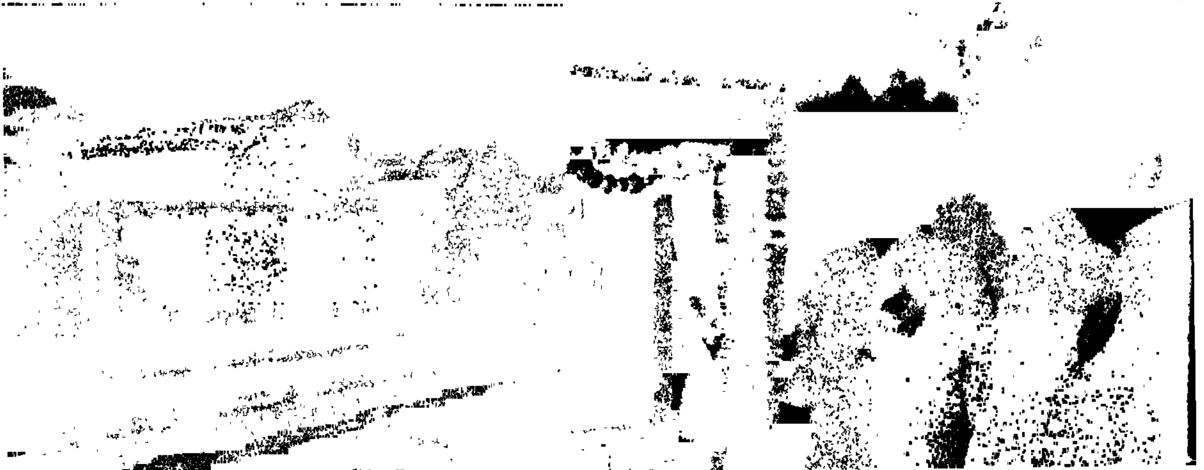
ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اپنے خیالات کی کمند اس پہلی عورت پر ڈالتے ہیں جو پہلے مرد کے شانہ بشانہ سب امور میں برابر کی شریک ہوتے ہوئے جسمانی لذتوں اور کلفتوں سے ہمکنار تھی، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ملن کا انعام لینے کے لیے پہلی بار مرد سے علحدہ ہوتے ہوئے دونوں کو الگ الگ کلفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور باوجودیکہ ان مشترکہ لذتوں کا انعام عورت ہی کی گود میں آیا مگر اس کی نیک نیتی یا جذبۂ اشتراکیت دیکھیے کہ اس نے اس مشترکہ انعام کو دونوں ہی کا سرمایہ مانا۔ اسی دوران جب عورت اپنے اس مشترکہ سرمایہ کو پالنے پوسنے میں لگی ہوئی تھی اور اس ننھی سی جان کو تنہا چھوڑنے کے لیے مجبور تھی، مرد پہلی مرتبہ تنہا ان کے لیے جسمانی بھوک کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ اسی عمل کے جاری رہتے ہوئے عورت میں بنیادی انسانی خصوصیات باقی رہیں اور مرد کی مروت و جوانمردی مادیت میں مرکوز ہونے لگی۔ اب اسے ہر شے کو حاصل کرلینے اور ہر چیز کو دوست سمجھنے کے بجائے غلام گردانے کا جنون سوار ہو گیا۔ یہی عمل نسائیت دشمنی کا پیش خیمہ بننے لگا۔ سب سے پہلا وار اس کے سب سے قریبی دوست یعنی عورت کو جھیلنا پڑا۔ ممکن ہے ابتداً اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ عورت مرد کے مقابلہ میں اقلیت میں تھی۔ ہم کو اس عددی فرق کا ذکر آسمانی صحائف یا مذہبی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ دیگر یہ کہ آج کے زمانے میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کے بڑھتے ہوئے احساس عدم خوداعتمادی نے اس کو اندرونی طور پر اپنی بقا کے لیے اپنی تعداد کی زیادتی اور اپنی جمعیت کی ترویج کا شعوری عمل پیدا کرایا ہو تاکہ اس کی بقا ممکن رہ سکے۔

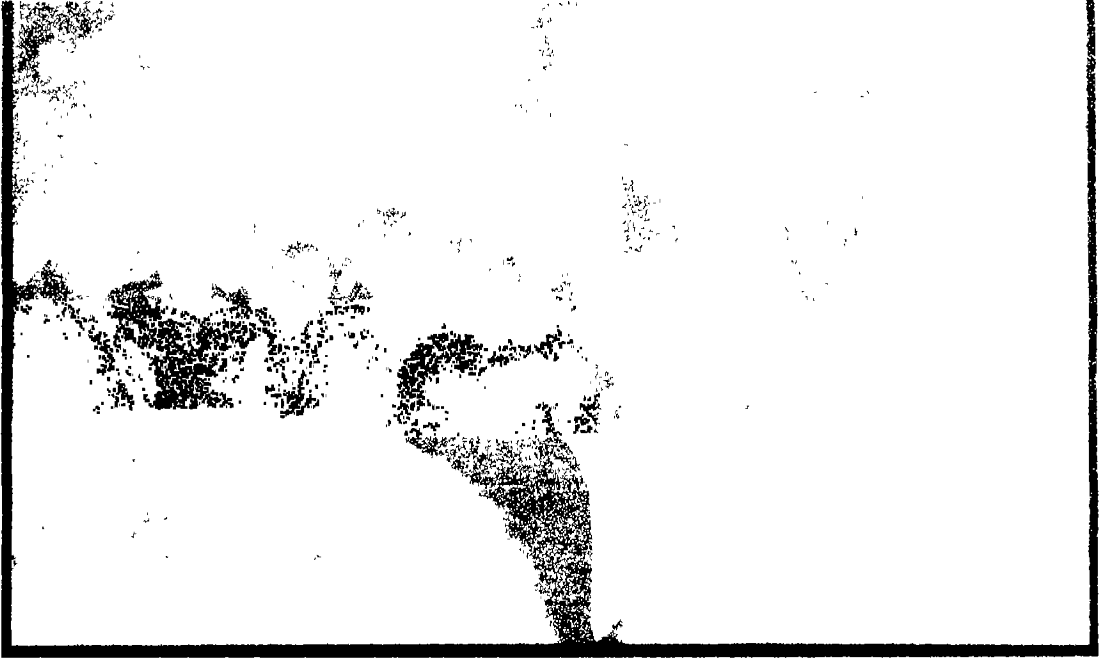
عورتوں کی کمتری کا یہ نفسیاتی عمل اتنا کہنہ ہو چکا ہے کہ اس کو عورتوں کی فطرت شمار کیا جا سکتا ہے مگر وہ تمام غیر فطری عمل جو فطری قوانین سے میل نہیں کھاتے، بنیادی طور پر فطرت کی حیثیت سے قبول نہیں کیے جا سکتے



اترپردیش کے گورنر شری بی ستیہ نرائن ریڈی مجاہدین آزادی کو اعزاز دیتے ہوئے

اترپردیش کے وزیراعلا شری کلیان سنگھ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء کو اناؤ میں ٹرائسیم اسکیم کے تحت تعمیر شدہ عمارتوں کا افتتاح کرتے ہوئے۔





[illegible] کے موقع پر [illegible] خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے

[illegible] اوقاف و [illegible] رضوی ۹ ستمبر ۱۹۹۲ کو [illegible] لکھنؤ میں [illegible]
[illegible] کا افتتاح کرتے ہوئے۔

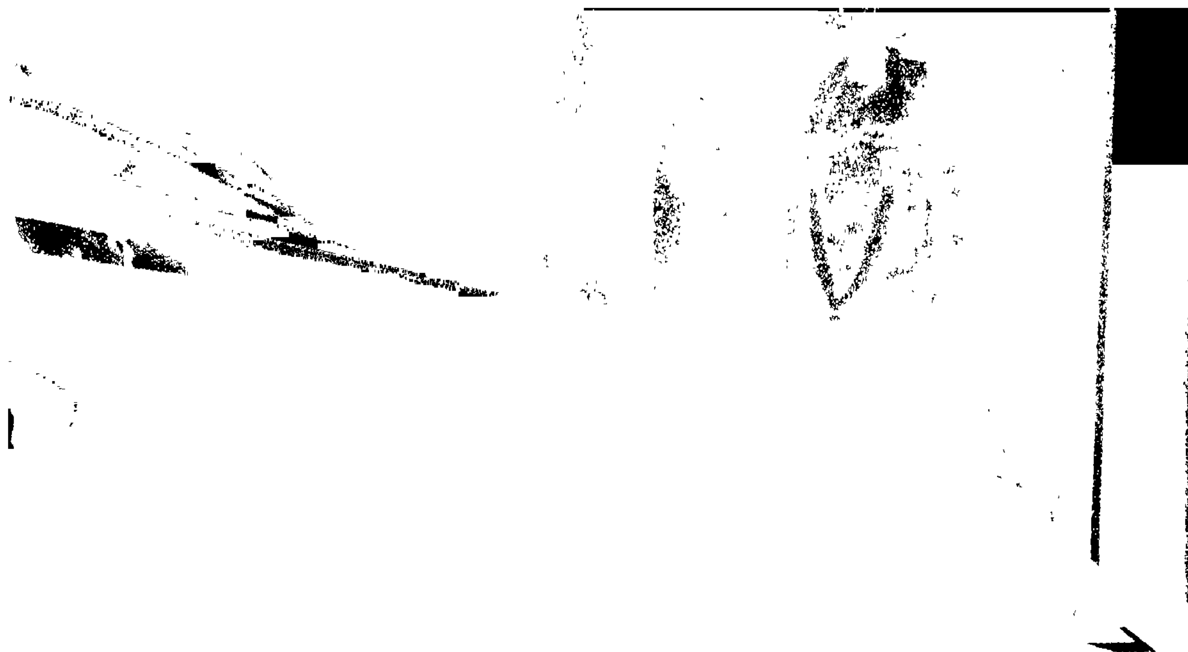


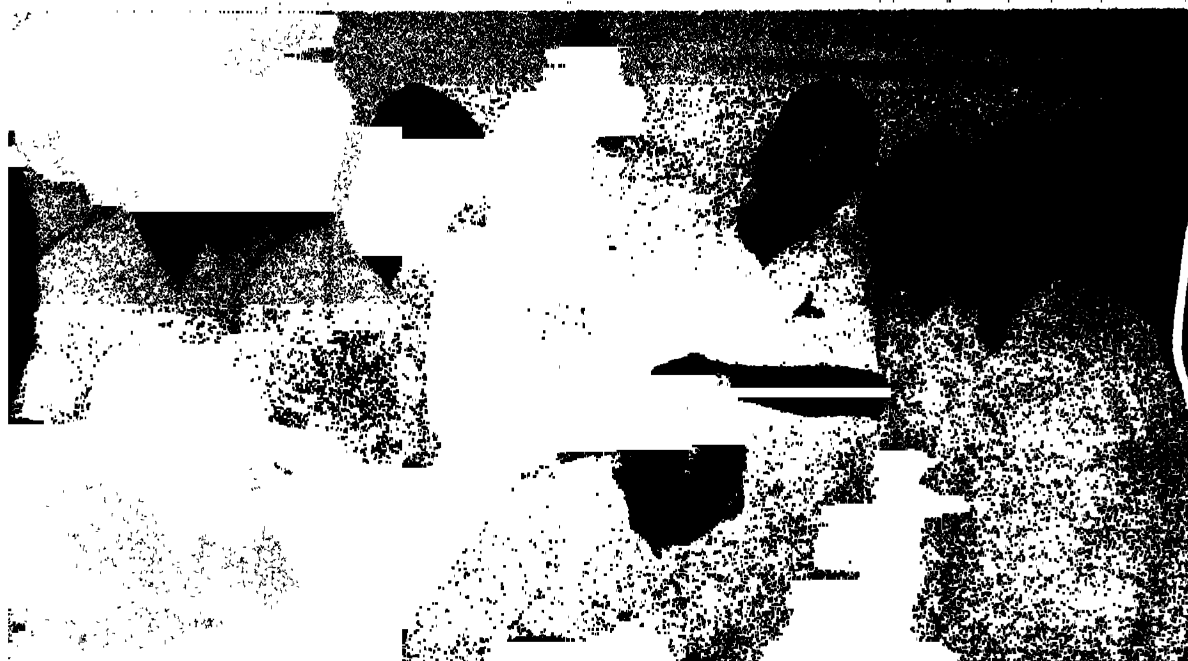


وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ گورکھپور میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ سلطان پور میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے







... ور یا خود اپنے
... ان رویے میں تبدیلی لانے پر آمادہ ہوں۔
... اپنی صلاحیت کو تولنا اور اپنے طریقۂ کار کو
... اپنی ساجھے داری وغیرہ کو پہچاننا ہوگا تاکہ
... صلاحیت سے ہم آہنگ ہو سکے، ورنہ عورتیں
... سماج میں وہ کردار ادا نہیں کر سکیں گی جس کی وہ
... ان کی ذمہ داری بھی ہے۔

... شواہد سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عورتیں
... کے لیے وہ تمام امور انجام دے سکتی ہیں جو مرد انجام دے
... ہمارے سماج کے استحصالی رویے نے انھیں ایک
... سے نکلنے نہیں دیا اور ایک طویل مدتی دباؤ نے ان کے
احساسات و فکر میں بظاہر وہ قنوطی کیفیت پیدا کر دی ہے جس میں
زندگی کا مقصد واضح نہیں ہوتا۔ نفسیات کا یہی عمل انھیں پستی کا شکار
بنائے ہوئے ہے۔ نئی روشنی کے اقتصادی دباؤ نے تمام انسانی
برادری کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ عورت بھی اپنی تمام تر مجبوریوں
کے ساتھ چھلانگ لگانے کی کوشش کرتی ہے مگر مغرب ایسی دنیا
میں بھی اس کو اعتماد کی اس روشنی کا کوئی احساس نہیں ہو پا رہا ہے جو
اس کی راہ متعین کر سکے۔ مشرق میں تو اس صنف نازک کی حالت اور بھی
نازک ہے اس لیے کہ یہاں تو ابھی مردوں کو بھی اعتماد کامل میسر
نہیں۔ یہاں تو عورتوں کو صرف مردوں کی نظر اور راہ ہدایت کا انتظار
رہتا ہے جس کے بغیر عموماً ان کے خواب بھی نہیں ابھرتے پھر بھلا
ان کی تعبیر کا سوال کیسے پیدا ہو۔ ابھی تو وہ اسی حالت میں ہیں کہ جو
باتیں سنتی چلی آ رہی ہیں وہی حقیقت سے بھرپور ہیں اور جن کا انجام
نہ دیا جانا صداقت سے پرے ہے یا ان میں کسی طرح کی ترمیم بغیر مرد کی
پشت پناہی کے ممکن نہیں۔

دنیا میں زندگی کی پہچان تحریک ہے مگر جب تک تحریک اپنی
صلاحیت سے شکست ہوتی ہے وہ تحریک کے ضمن میں نہیں آتی بلکہ

... ہوتی ہے۔ جب تحریک اپنی صلاحیتوں سے
... جاتی ہے تو اس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں
بہت سی ایسی تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں جو ہماری آزمائی اور جانی پہچانی باتوں کی بھی
نفی کر دیتی ہیں۔ یہ باتیں ضرورتاً وقتی طور پر ٹھیک ہو سکتی ہیں مگر ان کی حیثیت
کلچر میں بالکل عارضی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم اور طولانی ورثے والے
کلچروں میں مثبت یا تحریکی عمل ضرورت کے اعتبار سے خاصا سست
ہوتا ہے لیکن اگر یہ روایتی دباؤ زندگی کے بنیادی مسائل سے براہ راست
ٹکراتا ہے تو کبھی کبھی پورا معاشرہ بکھر جاتا ہے، جس کو پھر سے مرتب
ہونے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ اس لیے زندگی کے تحریکی عمل میں
ہم کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تحریک کی طاقت ہم کو کہاں تک لیے جا
رہی ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ہمنوائی کر سکتی ہیں تو
ہماری ترقی معنیٰ خیز ہوگی نہیں تو پھر اس کو ترقیٔ معکوس کے سوا کچھ
بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ معاشرہ میں باہوش عورتوں کو حالات کے
تحت جب بھی اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کے مواقع میسر ہوئے ہیں،
انھوں نے توقع سے زیادہ بحسن و خوبی اس کا اظہار کیا ہے۔ ہر چند کہ
وہ ایک گروہ کی حیثیت سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں یا انسانوں کے
گروہ میں برابر کی شریک نہیں ہیں پھر بھی افراد کی حیثیت سے ہمیں
دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ اسی لیے اگر ہم ایک سلامتی کی دنیا کے تصور کو عملی
جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو ہم کو ان تمام امور پر غور کرنا ہوگا جو انسانیت و
سلامتی کی بقا کے لئے لازم ہوں۔ ہم کو ایک عادلانہ رویہ اپنانا ہوگا، ہمیں
کوشش کرنا ہوگی کہ ایک ایسے کلچر اور انسانی رویے کو جنم دیں جس میں کسی بھی
ذی روح کو گھٹن نہ محسوس ہو یا کم از کم بہت کم محسوس ہو۔ ایسا کلچر اس معاشرہ
کا پیش خیمہ ہوگا جس میں انسانوں کی تہوں میں اعانت و ہمدردی لازمی
ہوگی۔ جب تک ہم دونوں پیروں پر برابر وزن دینے اور برابر دوران خون
کو ہم پہونچانے کے عمل کو انجام نہیں دیں گے، ہماری یہ بیمار دنیا
پھر سے صحت مند نہیں ہو سکتی۔

□□

غزل

زندگی آگ کے دریا کی روانی مانگے
بزمِ جاں پھول سے لمحوں کی کہانی مانگے

عشق پر عشق ہے اندوہِ وفا کہیئے جسے
جل بجھے شمع تو خونِ نابہ فشانی مانگے

منجمد خواب کی صورت ہے شبستانِ وجود
دل کی دھڑکن ہے کہ آشفتہ بیانی مانگے

کون دہرائے گا یہ رقصِ لہو کا قصہ
موم کا پھول جہاں شعلہ بیانی مانگے

ریشمی رات میں رُک جائے ستاروں کا سفر
گردشِ وقت بھی ساعت وہ سہانی مانگے

بجھ چکے ہیں سرایوانِ وفا شمع و چراغ
کس سے دل گم شدہ سورج کی نشانی مانگے

دل کے اوراق پہ تنویر یہ تحریر جنوں!
حرفِ بے رنگ سے خوشبوئے معانی مانگے

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۳۷۴۶ - چوڑی والان
دہلی ۱۱۰۰۰۶

اسی شجر کو جو بے برگ و بار راہ میں ہے
نہ جانے کب سے مرا انتظار راہ میں ہے

لہو کی بوندوں کا اب کیا شمار راہ میں ہے
کہ ہر قدم پہ تو خنجر کی دھار راہ میں ہے

شکستہ پائی کی پایل، تھکن کا پیراہن
دلہن کی طرح سجا میرا یار راہ میں ہے

ملے تو کیسے ملے اجر جادہ پیمائی؟
خزاں کے پھول نہ کانٹوں کا ہار راہ میں ہے

ترا بگاڑیں گے کیا جسم و جاں کے یہ رہزن
کہ ساتھ ساتھ ترے میرا پیار راہ میں ہے

قدم سنبھال کے اے آہوئے خیالِ یار!
ابھی کسی کا دلِ بے قرار راہ میں ہے

بھٹک نہ جائے ڈگر سے کہیں وہ اے شاکر
بساطِ فکر کا جو شہسوار راہ میں ہے

شاکر جرولی
اونچا مکان۔ قصبہ جرولی
ضلع بہرائچ

نفیسہ حیدر ہلوری
نیشنل روڈ - ہلوری ۲۷۲۰۹۱
(سدھارتھ نگر)

ثمر ہلوری — فن اور شخصیت

ثمر ہلوری ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے اُردو شاعری کو اتنا کچھ دیا ہے کہ کوئی ادبی مؤرخ اس نام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں. صاحبِ طرز خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی. تقریباً تمام اصنافِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ایک صاحبِ فکر شاعر تھے اور فنی مسائل پر کامل دسترس رکھتے تھے. تصوّف کی طرف بھی ان کا رجحان تھا۔

میں دیکھتا ہوں نگاہوں سے اپنی جو منظر
نگاہِ اہلِ خرد سے وہ آج تک ہیں نہاں

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

مجھ پہ وحشت کا نہ جانے کس لیے الزام ہے
کھینچتا ہے اپنی جانب خود سے ویرانہ مجھے

ان کے ابتدائی دور کی شاعری میں جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل خیالات کی پختگی، جذبہ کی متانت، زبان کی طہارت اور بیان کی سادگی کے نقوش صاف نظر آجاتے ہیں. محرومی و مایوسی کے باوجود ان کی غزلوں میں شوخی و رنگینی نمایاں ہے، ملاحظہ ہو ؎

تنہائی میں اکثر مجھے محسوس ہوا ہے
یادوں کے دریچوں سے کوئی جھانک رہا ہے

اے چارہ گرو تم نے سنا ہو بتاؤ
آخر مرضِ عشق کی کیا کوئی دوا ہے

میں شہر کے حکام سے انصاف طلب ہوں
دلی میں کسی نے مرا دل جیت لیا ہے

شروع میں انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے کامیاب نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اُردو کے الفاظ کے ساتھ ہندی کے خوبصورت الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے. ان کی مشہور نظم "۲۶ جنوری کا عہد نامہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بھارتی ہوں کہ جنم بھومی ہے بھارت میری
اپنے لفظوں کی صداقت کی قسم کھاتا ہوں
عہد کرتا ہوں وفادارِ وطن ہونے کا
اپنے اس قول کی عزت کی قسم کھاتا ہوں
رکھوں گا پیشِ نظر اپنا مقدس دستور
اپنے جمہور کی عظمت کی قسم کھاتا ہوں
ہر طرح دیش کی عزت کا مجھے ہوگا خیال
دوستو! سُن لو میں بھارت کی قسم کھاتا ہوں

یوں تو ان کی لاتعداد نظمیں حبِّ وطن کے موضوع پر ہیں لیکن جو سوز و گداز "جنگِ آزادی کے شہدا کے نام" میں ہے، اس کی مثال خود ان کے یہاں مشکل سے ملے گی ؎

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
قید ہے رنگ میں خود اپنے یہاں کا گُلِ تر

غزلیں

زندگی آگ کے دریا کی روانی مانگے
بزمِ جاں پھول سے لمحوں کی کہانی مانگے

عشق پر عشق ہے اندوہِ وفا کہیئے جسے
جل نہ بجھے شمع تو خونابہ فشانی مانگے

منجمد خواب کی صورت ہے شبستانِ وجود
دل کی دھڑکن ہے کہ آشفتہ بیانی مانگے

کون دہرائے گا یہ رقصِ لہو کا قصّہ
موم کا پھول جہاں شعلہ بیانی مانگے

ریشمی رات میں رُک جائے ستاروں کا سفر
گردشِ وقت بھی ساعت وہ سہانی مانگے

بجھ چکے ہیں سرِ ایوانِ وفا شمع و چراغ
کس سے دل گم شدہ سورج کی نشانی مانگے

دل کے اوراق پہ تنویر یہ تحریرِ جنوں !
حرفِ بے رنگ سے خوشبوئے معانی مانگے

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۳۷۴۶ - چوڑی والان
دہلی ۱۱۰۰۰۶

اسی شجر کو جو بے برگ و بار راہ میں ہے
نہ جانے کب سے مرا انتظار راہ میں ہے

لہو کی بوندوں کا اب کیا شمار راہ میں ہے
کہ ہر قدم پہ تو خنجر کی دھار راہ میں ہے

شکستہ پائی کی پایل، تھکن کا پیراہن
دلہن کی طرح سجا میرا یار راہ میں ہے

ملے تو کیسے ملے اجر جادہ پیمائی ؟
خزاں کے پھول نہ کانٹوں کا ہار راہ میں ہے

ترا بگاڑیں گے کیا جسم و جاں کے یہ رہزن
کہ ساتھ ساتھ ترے میرا پیار راہ میں ہے

قدم سنبھال کے اے آہوئے خیالِ یار !
ابھی کسی کا دلِ بے قرار راہ میں ہے

بھٹک نہ جائے ڈگر سے کہیں وہ اے شاکر
بساطِ فکر کا جو شہسوار راہ میں ہے

شاکر جرولی
اونچا مکان۔ قصبہ جرول
ضلع بہرائچ

نفیس حیدر ہلوری
نیشنل روڈ - ہلور ۲۷۲۰۹۱
(سدھارتھ نگر)

ثمرؔ ہلوری — فن اور شخصیت

ثمرؔ ہلوری ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے اُردو شاعری کو اتنا کچھ دیا ہے کہ کوئی ادبی مؤرخ اس نام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ صاحبِ طرز خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔ تقریباً تمام اصنافِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ایک صاحبِ فکر شاعر تھے اور فنی مسائل پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ تصوف کی طرف بھی ان کا رجحان تھا ؎

میں دیکھتا ہوں نگاہوں سے اپنی جو منظر
نگاہِ اہلِ خرد سے وہ آج تک ہیں نہاں

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

مجھ پہ وحشت کا نہ جانے کس لیے الزام ہے
کھینچتا ہے اپنی جانب خود سے ویرانہ مجھے

ان کے ابتدائی دور کی شاعری میں جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل خیالات کی پختگی، جذبہ کی متانت، زبان کی طہارت اور بیان کی سادگی کے نقوش صاف نظر آجاتے ہیں۔ محرومی و مایوسی کے باوجود ان کی غزلوں میں شوخی و رنگینی نمایاں ہے، ملاحظہ ہو ؎

تنہائی میں اکثر مجھے محسوس ہوا ہے
یادوں کے دریچوں سے کوئی جھانک رہا ہے

اے چارہ گرو تم نے سنا ہو بتاؤ
آخر مرضِ عشق کی کیا کوئی دوا ہے

میں شہر کے حکام سے انصاف طلب ہوں
دلی میں کسی نے مرا دل جیت لیا ہے

شروع میں انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے کامیاب نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اُردو کے الفاظ کے ساتھ ہندی کے خوبصورت الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم "۲۶ جنوری کا عہد نامہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بھارتی ہوں کہ جنم بھومی ہے بھارت میری
اپنے لفظوں کی صداقت کی قسم کھاتا ہوں
عہد کرتا ہوں وفادارِ وطن ہونے کا
اپنے اس قول کی عزت کی قسم کھاتا ہوں
رکھوں گا پیشِ نظر اپنا مقدس دستور
اپنے جمہور کی عظمت کی قسم کھاتا ہوں
ہر طرح دیش کی عزت کا مجھے ہوگا خیال
دوستو! سن لو میں بھارت کی قسم کھاتا ہوں

یوں تو ان کی لاتعداد نظمیں حبّ وطن کے موضوع پر ہیں لیکن جو سوز و گداز "جنگِ آزادی کے شہدا کے نام" میں ہے، اس کی مثال خود ان کے یہاں مشکل سے ملے گی ؎

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
قید ہے رنگ میں خود اپنے یہاں کا گلِ تر

غزلیں

زندگی آگ کے دریا کی ... مانگے
بزم جاں پھولوں سے ... مانگے

عشق پر ... ہے اندوہِ وفا کہیے جسے
جل بجھے شمع تو خونابہ فشانی مانگے

منجمد خواب کی صورت ہے شبستانِ وجود
دل کی دھڑکن ...

اسی شجر کو جو بے برگ و بار راہ میں ہے
نہ جانے کب سے مرا انتظار راہ میں ہے

لہو کی بوندوں کا اب کیا شمار راہ میں
کہ ...

شکستہ پائی کی پایل ...

... ثبات

چلو چلو تو ... ہی زندگی کی ...

... کی نظم "صدائے دل" پر انھیں سید کلب ...
... "علامہ" کا خطاب دیا تھا۔ اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو

یہ زمیں قصبۂ ہتور کی پُر نور زمیں
حسنِ فطرت کے تقاضوں سے بھرپور زمیں
جلوۂ حق سے بہر طور ہے معمور زمیں
اہلِ بینش کے لیے آئینۂ طور زمیں
دامنِ آلِ عبا سایہ فگن ہے اس پر
ناز فرمائے جہاں میرا وطن ہے اس پر

پروفیسر سید احتشام حسین کے انتقال پر شمر ہتوری نے اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا

... انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوگا۔

انھوں نے نوحے، سوز، سلام، قصیدے، رباعی اور مرثیہ کے ساتھ ساتھ حمد و نعت بھی کہی ہیں

قادرِ مطلق خدا خلاقِ عالم بالیقیں
مخزنِ اوصاف ہے پروردگارِ زندگی
مصطفٰے بعدِ خدا ہیں مالکِ ہر خشک و تر
باعثِ ایجادِ عالم افتخارِ زندگی

ثمر ہلوری

ثمر ہلوری ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس ...

... دیکھ کر

تھا تو کچھ ضرور ہے لیکن ملا جلا

... خصوصیات کے حامل ہیں۔ مرثیہ گوئی کی شاعری ... شوکت، تخیل کی بلندی، ایک بات کو مختلف انداز میں کہنا اور اپنے پسندیدہ انداز بیان (خطابت) ... ثمر ہلوری نے اس مردہ صنفِ سخن کو ایک بار

... خاص میں ثمر ہوتا نہ گر سینہ سپر
فن کا ہوتا حال کیا اے گردشِ ایام سوچ

ثمر ہلوری بحیثیت انسان بھی متعدد خوبیوں کے حامل تھے۔ پاک طینت، مخلص، متقی، مومن، احباب و اقربا نواز، ظاہر و باطن یکساں، نہ بناوٹ نہ تصنع، رشک و حسد سے پاک، محبت و مروت کا سراپا، دل میں قومی درد، ملت کی ترقی کے لیے کوشاں، نیک اور سچے انسان۔ ۳۰ اپریل ۱۹۹۲ء بروز جمعرات اچانک باغ ہستی کا گراں قدر ثمر جب ٹوٹ کر گرا تو اہلِ دانش سے یہ غم سنبھالے نہ سنبھل سکا۔ اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو اس کرب سے چیخ پڑے۔

یوں تو اس عالم گزرگاہ میں لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں مگر بعض ہستیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں کے سبب قومی سرمایہ بن جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ

... ہیں۔ الہ آباد میں ... ادبی ادارے ثمر ہلوری کی قائم کردہ یادگار ہیں۔

ثمر ہلوری آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے سچی لگن اور انتھک محنت کی جو مثال پیش کی وہ آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت رہے گی۔

غزل

قصے لوگوں نے وفا کے جو سنائے ہوں گے
اس گھڑی یاد ہم اُن کو بہت آئے ہوں گے

اس کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے ہونگے
جس نے حالات مرے اُن کو بتائے ہونگے

شہر میں اس کو بھی رہنے کے لیے گھر نہ ملا
جس کے ہاتھوں نے کئی شہر بسائے ہوں گے

مجھ کو اس شخص کی عظمت کا خیال آتا ہے
جس نے اوروں کے لیے پیڑ لگائے ہونگے

کس کو معلوم تھا یہ وقت بھی آئے گا عقیل
غیر تو غیر ہیں اپنے بھی پرائے ہوں گے

ڈاکٹر عقیل اعظمی
شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ

غزلیں

چہروں پر زرپوش اندھیرے پھیلے ہیں
اب جینے کے ڈھنگ بڑے ہی مہنگے ہیں

ہاتھوں میں سورج لے کر کیوں پھرتے ہو
اس بستی میں اب دیدہ ور کتنے ہیں

قدروں کی شب ریزی پر حیرانی کیوں
ذہنوں میں اب کالے سورج پلتے ہیں

پھولوں والے ٹاپو تو غرقاب ہوئے
آگ اگلتے نئے جزیرے ابھرے ہیں

ہرے بھرے جنگل کٹ کر اب شہر ہوئے
بنجارے کی آنکھوں میں سناٹے ہیں

اس کے بوسیدہ کپڑوں پر مت جاؤ
مست قلندر کی جھولی میں ہیرے ہیں

ذکر کرے ہو مجھ سے کیا طغیانی کا
ساحل پر ہی اپنے رین بسیرے ہیں

اس وادی کا تو دستور نرالا ہے
پھول، سروں پر کنکر پتھر ڈھوتے ہیں

عنبر لاکھ سوا بنکھی موسم آئیں!
اولوں کی زد میں انمول پرندے ہیں

عنبر بہرائچی
راجیہ کرمچاری کلیان نگم
گلزار بھون لکھنؤ

آئینہ ایسا کبھی ٹوٹا نہیں
کوئی بھی میری طرح بکھرا نہیں

تھا بہت گہرا بدن دریا مگر
یہ غنیمت ہے کہ میں ڈوبا نہیں

آ گئی ہے راس جنگل کی فضا
بستیوں میں یوں بھی کچھ رکھا نہیں

یہ بدن کیسا محاذِ جنگ ہے
جیتنے والا یہاں جیتا نہیں

اب ہنرمندی یہاں بھی عام ہے
اب یہاں جادو مرا چلتا نہیں

کون حائل ہو گیا ہے راہ میں
میرا خود سے سامنا ہوتا نہیں

لطف یوں دینے لگے چہرے حسن
میں نے اندر جھانکنا چاہا نہیں

حسن عزیز
۱۶۵/۳ چکاپور، کان پور

پرندہ

بے تکاں
بے ساز و ساماں
اُڑ رہا ہوں
قید بھی کوئی نہیں
بندشیں کوئی نہیں
شرط بس اتنی کہ اڑتا ہی رہوں
کب سے کب تک کچھ پتہ مجھ کو نہیں
اور مقصد ـــــ ؟
علم اس کا بھی مجھے اب تک نہیں
زادِ رہ کشکول میں کچھ بھی نہیں
پر مرا رختِ سفر
آدم و حوّا کو دیکھا ہے یہیں ۔
جودی کی چوٹی پہ چڑھ کر دیکھا ہے طوفانِ نوحؑ
اور پھر غرقاب بستی اور نگر
غم میں یوسف کے بلکتے باپ کو
ہجرتِ ختم الرسلؐ اور واقعاتِ کربلا
سب کو دیکھا ہے یہیں ۔

شادمانی زندگی کی ہو یا ہو غم کا مقام
ہر جگہ موجود رہ کر اس طرح موجود تھا
جس طرح عاشق کے دل میں صورتِ محبوبِ یار
پر مری پرواز کا لمبا سفر
کب سے کب تک ؟
کچھ پتہ مجھ کو نہیں !!

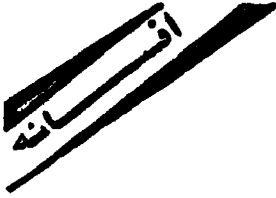
اسرار سعید
ممتاز ہاؤس
نیپیر روڈ ۔ لکھنؤ

□□

سہمے سہمے
کچھ بات

جسم کی گرتے ہوئے
دیوار کے سائے میں بیٹھا
وہ سپاہی
رزم گاہِ زندگی کا
جو پکڑتا تھا کبھی
اُڑتے پرندے
آج اپنی ہی نظر سے
گر گیا ہے ......
اُس کی اونچی ناک پر
بیٹھی ہوئی مکھی نے
شاید !
اُس کے تمغوں پر کوئی
چھینٹا کسا ہے ۔ !!

اندر سروپ دت نادان
بی۔۳/۲۶۹
پچھم وہار
نئی دہلی
۱۱۰۰۶۳



قائد حسین کوثر
۲۹۹/۵۵ حسین گنج، کانپور ۲۰۸۰۰۱

عذاب

جب تم اتنے قدآور ہوجاتا کہ تمہارے قدم زمین پر ہوتے ہوئے بھی آسمان تمہاری دسترس میں آجائے تو اپنے پنجے کو کاٹ کر اندھی خلاؤں میں اچھال دینا ....."

"پ .... پن .... پنجہ .... ؟" عصر جان کے لہجے میں تذبذب تھا: مرٹ تھی۔

"ہاں .... پنجہ !" اس نے اپنی بائیں مٹھی عصر جان کی آنکھوں کے سامنے کردی، اور جب عصر جان کی پوری توجہ اس کی مٹھی کی طرف مرکوز ہوگئی تو اس نے اپنی مٹھی کو دھیرے دھیرے کھولنا شروع کردیا۔ چند لمحوں میں ہی اس کی پانچوں انگلیاں تن گئیں اور ان پر کھنچی ہوئی اور ہاتھ کی لکیروں کا گہرا سا جال بہت واضح ہوگیا۔ عصر جان کے لئے ہاتھ کی لکیروں کا وہ جال حیرت انگیز تھا۔ اس نے بہت سے ہاتھوں اور ان کی لکیروں کو دیکھا تھا۔ مگر یہ جال ....

"پنجہ" اس نے ایک طویل سانس لی اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں کمر کے بائیں جانب اڑسے ہوئے بینٹ دار منقش اور نوکیلے خنجر کو داہنے ہاتھ سے کھینچ کر بوسہ دیا اور بولا۔

"اگرچہ یہ ایک اذیت ناک عمل ہے .... مگر ...."

عصر جان کے لیے وہ بینٹ دار منقش ہلالی خنجر کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ خنجر شہر کے مذبح کے بڑے چودھری کا خاص اور متبرک اوزار تھا۔ مذبح میں قدم رکھنے والے نوسیکھیے کمیلا شروع کرنے سے پہلے اسے بوسہ دیتے، آنکھوں سے لگاتے اور بڑے چودھری سے دعائیں لینے کے بعد ہی راس گرانے کا کام شروع کرتے۔

"مگر ...." عصر جان چکر میں پڑ گیا۔ "بڑے چودھری کے خنجر سے اس شخص کا کیا تعلق .... ؟"

"یہ بہت مہربان شے ہے .... اس نے خنجر کو پھر ایک طویل بوسہ دے کر کمر میں اڑس لیا اور پہلے سے کچھ تیز لہجہ میں بولنے لگا۔

" اور تم دیکھو گے کہ تمہارا کٹا ہوا پنجہ بے جان گوشت کا لوتھڑا نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اندھی خلاؤں میں ادھر ادھر ڈولے گا .... اور پھر ایک متعین سمت میں سفر بھی کر سکے گا .... مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس کا آغاز بہر حال اذیت ناک ہے .... بے حد اذیت ناک ..

اذیت کا تصور کرتے ہی عصر جان کی نظریں مذبح کے بڑے چودھری کے خنجر پر مرکوز ہوگئیں۔ مگر کان بھرپور توجہ کے ساتھ اس کے بیان کی طرف لگے رہے۔

"یہ سچ ہے کہ مٹی کے ڈھیر سے اٹھنے کے بعد بھی تم طویل عرصے تک تہذیب سے بیگانہ رہے .... مگر .... پھر وہ وقت بھی آیا جب تم نے پتھروں سے ایک دوسرے کو مارنا اور آگ جلانا سیکھا .... لوہے سے ہل بنایا مگر .... ہل بنانے سے پہلے تم مختلف قسم کے آلاتِ قتل بھی بنا چکے تھے .... بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ تمہیں برہنہ جسموں کو ڈھانپنے کا شعور بھی آیا اور پھر تم ارتقاء کی اس منزل پر بھی پہونچے کہ تہذیب کے نام پر تمام کپڑوں کو اتار پھینکا۔"

عصر جان کبھی اس کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی اس خنجر کو جو اس کی کمر میں اڑسا ہوا تھا۔

لئیق رضوی
بی ۔ ۱۴۴۸ ۔ کریلی ۱۰ الہ آباد

اُردو میں شخصی مرثیے کی روایت

(۵)

عزیز لکھنوی نے نواب مشتاق حسین خاں وقار الملک کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ قلم بند کیا تھا۔ غزل کے فارم میں لکھے جانے والے اس مرثیہ میں کل پندرہ اشعار ہیں۔ آخری مصرع سے مرحوم کی تاریخ وفات کا مادّہ بھی نکلتا ہے، چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

اے وقارِ ملک اے مشتاقِ اقلیم بقا
خادمانِ قوم تیرے میکدے کے جرعہ نوش

یادِ رفتگاں بانگ درائے کارواں
ہستیٔ پرجوش سر سید کی موج پرخروش

کشتیٔ ہندوستاں کا ناخدا اک تو بھی تھا
بحرِ ہستی میں ترے فقدان سے ہے اک خروش

یادگارِ ہستیٔ پیرِ مغاں کوئی نہیں
میکدہ ویران، بے رونق ہے بزمِ ناؤ نوش

دمِ غنیمت تھا زمانے میں وقار الملک کا
ہر صدا کو جس کی سمجھے لوگ آوازِ سروش

دل سے نکلا اک دھواں پڑھتے ہی تاریخ عزیزؔ
ہے جہاں میں آج شمعِ بزمِ سرسید خموش

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کے شعری سرمائے میں بھی کئی شخصی مرثیے شامل ہیں جو کیفیت اور تاثر کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اس سلسلے کا پہلا مرثیہ داغؔ دہلوی کی وفات پر لکھا گیا ہے۔ اس میں اقبالؔ نے داغؔ کے خصوصیات شاعری پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی موت سے ہونے والے نقصانات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ زبان وبیان کی چستی اور اشعار کی برجستگی اس مرثیے کا خاص وصف ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چل بسا داغؔ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیٔ طرزِ بیاں!
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلّی! داغؔ کو روتا ہوں میں

آہ اے بیت الحرام مذہبِ اہلِ سخن!
ہوگیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
یعنی خالی داغؔ سے کاشانۂ اُردو ہوا

اقبالؔ کا دوسرا مرثیہ "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" جیساکہ نام ہی سے ظاہر ہے، ماں کی وفات سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے۔ اس مرثیے میں اقبالؔ نے ذاتی رنج وغم کے اظہار سے قطع نظر موت کی حقیقت اور فلسفۂ غم کی وضاحت کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس مرثیے کی "ماں" کو محض اپنی والدہ کے روپ میں پیش کرنے کے بجائے اقبالؔ نے ایک زندہ علامت کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں ہر شخص نہ صرف اپنی ماں کو دیکھ سکتا ہے بلکہ اس کی شفقتوں کو بھی محسوس

ہو سکتا ہے۔ اور یہی چیزیں اقبال کے اس مرثیے کو آفاقیت بخشتی ہیں۔ زبان و بیان اور کیفیت کے اعتبار سے بھی یہ مرثیہ بے پناہ ہے جس میں کبھی جذبہ اور کبھی تخیل کے دھارے نمایاں نظر آتے ہیں۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں
نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

ذیل کے اشعار میں اقبال نے زندگی اور موت کے تعلق سے کس قدر سچی باتیں کہی ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

آہ یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے

آگے کہتے ہیں ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

ان مراثی کے علاوہ اقبال کے یہاں دو شخصی مرثیے اور بھی ملتے ہیں ان میں پہلا سوامی رام تیرتھ کی موت پر اور دوسرا فاطمہ بنتِ عبداللہ نام کی ایک عرب لڑکی کی وفات پر کہا گیا ہے۔ سوامی رام تیرتھ کے مرثیے کے صرف دو اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

فاطمہ بنتِ عبداللہ کی موت پر اقبال نے ایک پُر درد مرثیہ تصنیف کیا تھا۔ یہ لڑکی، جیسا کہ خود شاعر کا قول ہے، طرابلس کی جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔ مرثیہ مثنوی کے فارم میں ہے اور اس میں کل بارہ اشعار ہیں۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

(باقی آئندہ)

□□

چار مختصر نظمیں

کاغذات

درج تھی
جس پہ
داستاں میری
کھو گئے ہیں
وہ
کاغذات
کہیں!
●

دُعا

آخرِ شب
سکون کی خاطر
کس نے
تنہائیوں سے
پوشیدہ
زیرِ لب
موت کی
دُعا
مانگی؟
●

زخم

گولیاں
سب
لگی تھیں
سینے پر
زخم
کیوں
پیٹھ پر
اُبھر آئے۔؟
●

حجاب

کیا
گھنے بادلوں نے
افسردہ
پیکروں
کا
حجاب
دیکھا ہے؟
●

جابر حسین
اقلیتی کمیشن بہار
پٹنہ

افسانہ

قائد حسین کوثر
۵۰/۳۹۹ حسن گنج۔ کانپور ۲۰۸۰۰۱

عذاب

"جب تم اتنے قدآور ہو جاتا کہ تمہارے قدم زمین پر ہوتے ہوئے بھی آسمان تمہاری دسترس میں آجائے تو اپنے پنجے کو کاٹ کر اندھی خلاؤں میں اچھال دینا۔۔۔۔"

"پ۔۔۔ پن۔۔۔ پنجہ۔۔۔؟" عصر جان کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔

"ہاں۔۔۔۔ پنجہ!" اس نے اپنی بائیں مٹھی عصر جان کی آنکھوں کے سامنے کردی، اور جب عصر جان کی پوری توجہ اس کی مٹھی کی طرف مرکوز ہوگئی تو اس نے اپنی مٹھی کو دھیرے دھیرے کھولنا شروع کردیا۔ چند لمحوں میں ہی اس کی پانچوں انگلیاں تن گئیں اور ان پر کچی پکی اور کالی لکیروں کا گہرا سا جال بہت واضح ہوگیا۔ عصر جان کے لئے ہاتھ کی لکیروں کا وہ جال حیرت انگیز تھا۔ اس نے بہت سے ہاتھوں اور ان کی لکیروں کو دیکھا تھا۔ مگر یہ جال۔۔۔۔

"پنجہ۔" اس نے ایک طویل سانس لی اور ڈھیلے ڈھالے لبادے میں کرکے بائیں جانب اُڑسے ہوئے بینٹ دار منقش اور نوکیلے خنجر کو داہنے ہاتھ سے کھینچ کر بوسہ لیا اور بولا۔

"اگرچہ یہ ایک اذیت ناک عمل ہے۔۔۔ مگر۔۔۔"

عصر جان کے لیے وہ بینٹ دار منقش ہلالی خنجر کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ خنجر شہر کے مذبح کے بڑے چودھری کا خاص اور متبرک اوزار تھا۔ مذبح میں قدم رکھنے والے نوسکھیے کھیلا شروع کرنے سے پہلے اسے بوسہ دیتے، آنکھوں سے لگاتے اور بڑے چودھری سے دعائیں لینے کے بعد ہی راس گرانے کا کام شروع کرتے۔

"مگر۔۔۔" عصر جان چکر میں پڑ گیا۔ "بڑے چودھری کے خنجر سے اس شخص کا کیا تعلق۔۔۔؟"

"یہ بہت مہربان شے ہے۔۔۔" اس نے خنجر کو پھر ایک طویل بوسہ دے کر کمر میں اڑس لیا اور پہلے سے کچھ تیز لہجہ میں بولنے لگا۔

"اور تم دیکھوگے کہ تمہارا کٹا ہوا پنجہ بے جان گوشت کا لوتھڑا نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اندھی خلاؤں میں ادھر ادھر ڈولے گا۔۔۔۔ اور پھر ایک متعین سمت میں سفر بھی کر سکے گا۔۔۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس کا آغاز بہر حال اذیت ناک ہے۔۔۔۔ بے حد اذیت ناک۔۔"

اذیت کا تصور کرتے ہی عصر جان کی نظریں مذبح کے بڑے چودھری کے خنجر پر مرکوز ہوگئیں۔ مگر کان بھرپور توجہ کے ساتھ اس کے بیان کی طرف لگے رہے۔

"یہ سچ ہے کہ مٹی کے ڈھیر سے اُٹھنے کے بعد بھی تم طویل عرصے تک تہذیب سے بے گانہ رہے۔۔۔ مگر۔۔۔۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب تم نے پتھروں سے ایک دوسرے کو مارنا اور آگ جلانا سیکھا۔۔۔ لوہے سے ہل بنایا مگر۔۔۔ ہل بنانے سے پہلے تم مختلف قسم کے آلاتِ قتل بھی بنا چکے تھے۔۔۔۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ تمہیں برہنہ جسموں کو ڈھانپنے کا شعور بھی آیا اور پھر تم ارتقاء کی اس منزل پر بھی پہونچے کہ تہذیب کے نام پر تمام کپڑوں کو اتار پھینکا۔"

عصر جان کبھی اس کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی اس خنجر کو جو اس کی کمر میں اڑسا ہوا تھا۔

"...... وہ وقت بھی آیا کہ کریہہ و قبیح ترین عمل میں تمہارے لیے آسودگی کی ایک بوند بھی نہیں بچ سکی ..... یہی وہ منزل ہے کہ جب ماضی میں تم پر عذاب نازل ہوئے تھے ..... سوچو ... ٹھنڈے دل سے سوچو ....."

بولتے بولتے اچانک وہ رک گیا اور ٹھہر ٹھہر کر گمبھیر لہجے میں بولا ــــ

اب بھی وقت ہے ـــــ سوچ لو ــــ اپنا محاسبہ کرلو ـــ عذاب آنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی ہے۔"

عصر جان دن چڑھے تک سوتا رہا۔

رات گئے تک جاگنے کے باعث وہ بہت تھک چکا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ تیار ہو کر تیز تیز قدموں سے دربار شاہی کی طرف چل دیا۔ آج اس کی پیشی تھی۔

جہاں پناہ تختِ شاہی پر رونق افروز تھے اور صف بہ صف ایستادہ، دست بستہ درباریوں کے علاوہ وزرا بھی بر اعتبار منصب کرسیوں پر موجود تھے۔

معلن نے اس کا نام پکارا اور عصر جان ملزموں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے خلاف فرد جرم بلند آواز سے پڑھی گئی ـــ

"تم نے مذبح کے بڑے چودھری کا متبرک خنجر چرایا جس کے نتیجے میں غم و غصہ کے اظہار کے طور پر مذبح کے کارندوں نے ہڑتال کردی اور ظلِ الٰہی و تمام باشندگان شہر اپنی مرغوب ترین غذا سے محروم رہے اور ....."

عصر جان پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس ایک سمت دیکھے جا رہا تھا۔ فرد جرم اور مقدمے کی کارروائی اور درباریوں کی ملی جلی آوازیں اس کی سماعت سے دور ہوتی جا رہی تھیں، اور وہ صرف ایک آواز سن رہا تھا ـــ

"کریہہ و قبیح ترین عمل میں تمہارے لیے آسودگی کی ایک بوند بھی نہیں بچ سکی ....."

"تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ......" دربار میں سوئی گرنے کی آواز سن لینے والی خاموشی طاری تھی ..... "عدالت اس نتیجے پر پہونچی ہے کہ مذبح کے بڑے چودھری کا خنجر چرانے کے جرم میں تمہارے بائیں ہاتھ کے پنجے کو ..."

عصر جان کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی ـــ "تمہارے بائیں ہاتھ کے پنجے کو یعنی پانچوں انگلیوں اور ہتھیلی کو باقی ماندہ جسم سے الگ کر دیا جائے ..... تاکہ تمہارا کٹا ہوا ہاتھ دوسروں کے لیے عبرت ..."

عصر جان کی سماعت سے فیصلے پر مشتمل آواز پوری طرح معدوم ہو گئی ـــ وہ بہت صاف طور پر سن رہا تھا ـــ "تمہارا کٹا ہوا پنجہ بے جان گوشت کا لوتھڑا نہیں ..... وہ اندھی خلاؤں میں ..... اذیت ناک ..... بے حد اذیت ناک ....."

"تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے ....." عدالت کے کارندے نے اس کا کندھا ہلایا ــ "ظلِ الٰہی پوچھتے ہیں کہ ...."

عصر جان کہتا بھی کیا؟ تمام روداد سنا کر اگر وہ یہ بتا بھی دے کہ بڑے چودھری کا خنجر کس شخص کے پاس ہے تو اس کا یقین کون کرے گا؟

"نہیں ... مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ...." عصر جان کا لہجہ جذبات سے عاری تھا ـــ "ہاں! میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے بریدہ پنجے کو ایک تیر کی نوک پر رکھ کر، مرکزی مینار کی بالائی منزل سے پوری طاقت کے ساتھ اندھی خلاؤں کی طرف پھینک دیا جائے .... تاکہ .... تاکہ ....." اور عصر جان نے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے دانتوں کو اس زور سے بھینچا کہ کنپٹی کی تمام رگیں ابھر آئیں ـــ "وہ تیر واپس نہیں آئے گا ..." لفظ اس کے گلے میں گھٹ گئے۔

اور پھر ـــ ایک روز غروب آفتاب کے بعد عذاب کی پہلی نشانی کا ظہور ہو گیا۔

اماوس کی شب میں وسط آسمان پر ایک ایسا روشن ستارہ نمودار ہوا جس کی دُم مذبح کے بڑے چودھری کے مسروقہ خنجر سے

سب لوگ بڑے میدان میں جمع ہوگئے اور دم دار ستارے کے بارے میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں ۔ مگر گزرتے وقت نے ان کے ذہنوں سے مذہب کے بڑے چودھری کے خنجر کی چوری اور اس کی پاداش میں عصر جان کی دست بریدگی کا واقعہ بھلا دیا تھا۔ خود عصر جان کی آل بھی فراموش کر چکی تھی کہ ان کا دست بریدہ بزرگ قبرستان میں کس جگہ ابدی نیند سو رہا ہے۔ استبداد زمانہ سے اس کی قبر کا نشان تک مٹ چکا تھا۔

جیسے جیسے رات گہری ہورہی تھی، ستارے کی چمک، اس کی دم کی طوالت اور جھاڑو کی سیکوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سے کمزور دل والے منحوس ستارے کی تباہ کاریوں کے واقعات سن سن کر کانپنے لگے اور لڑکھڑاتے ہوئے عبادت گاہوں کی طرف بھاگے۔ بعض میدان ہی میں سجدہ ریز ہوگئے۔

نصف شب کے قریب انھیں جنگلوں کی سمت سے ڈھیلے ڈھالے لبادے والا ایک دراز ریش بوڑھا آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر انھوں نے اسے حیرت و احترام کے ملے جلے جذبات سے اس طرح دیکھنا شروع کیا گویا وہ انھیں دم دار ستارے کی نحوست سے بچ جانے کی کوئی تدبیر سمجھا دے گا۔ بوڑھے کے تمام بال چاندی کی طرح چمکیلے تھے ۔۔۔ اس کٹھن گھڑی میں اس بزرگ کی آمد ان کے لیے تقویت کا موجب تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کی چمکتی ہوئی مڑی تڑی سی ایک لکڑی تھی جسے وہ زمین پر ٹیک کر چل رہا تھا۔ وہ ایک جیسی چال چلتا ہوا ان کے قریب آیا اور ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔

پورا مجمع دم سادھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔۔ اور پھر اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہنا شروع کیا۔۔۔

" یہ چمکتی ہوئی جھاڑو ۔" اس نے اپنی لکڑی کو دُم دار ستارے کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ " تمھاری غلاظت کا علاج ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔ سامعین کے دلوں کی دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگا۔

" اس سے قبل کہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے تمھاری قوتِ سماعت ختم ہو جائے اور یہ چمکتی ہوئی جھاڑو لمحہ بہ لمحہ نیچے کی طرف سرکنے لگے، میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ "

اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں تک انھیں دیکھتا رہا، اس کی تیز نظریں ان سب کو اپنے جسم کے پار ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور پھر اس کے بعد وہ ایک ایسی کہانی بیان کرنے لگا جو ان کی اپنی داستان تھی۔ ان کی بداعمالیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان سے بار بار یہ ضرور پوچھتا ۔۔۔

" کیا تم اپنی بداعمالیوں پر کبھی شرمندہ بھی ہوئے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ "

بوڑھے کا بیان جاری تھا اور ان سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں

دھیرے دھیرے سارا میدان عورتوں اور مردوں سے بھر گیا۔ اس مجمع میں ہر عمر کے لوگ موجود تھے ۔۔۔ صرف بچے تمام ہنگامے سے بیگانہ آرام کی نیند سو رہے تھے۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ دُم دار ستارے کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی جھاڑو نما دُم متحرک ہو چلی تھی اور دھیرے دھیرے چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ دُم دار ستارہ اب اتنا اونچا نہیں رہ گیا تھا جتنا غروب آفتاب کے بعد نظر آیا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ نیچے اتر رہا تھا۔

رات اپنے خاتمہ کے قریب تھی کہ مشرق سے آنے والی ہواؤں میں کچھ تیزی آگئی اور دور کہیں بادلوں کی گرج اور بارش کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دینے لگا۔

بوڑھے کا سلسلۂ کلام جاری تھا۔ سب ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے اور اس کا بیان سن رہے تھے۔

" کیا تم اپنی بداعمالیوں پر کبھی شرمندہ بھی ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ " یہ کہتے ہوئے اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے دائیں ہاتھ میں دبی ہوئی لاٹھی کو زور سے پٹکا اور ڈھیلے ڈھالے لبادہ میں چھپا بایاں ہاتھ مجمع کی طرف اٹھا کر اپنے سوال کو پھر دہرایا ۔۔۔

" کیا تم اپنی بداعمالیوں پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میدان میں موجود تمام لوگ خوف و حیرت سے چیخ پڑے ۔۔۔ اس کا بایاں ہاتھ انگلیوں اور ہتھیلی سے محروم تھا۔ !!

□□

غزلیں

آشیاں ہے نہ گلُ و سرو سمن باقی ہے
پھر بھی جینے کی ہوس اہلِ چمن باقی ہے

اب قرینہ کوئی باقی نہ چلن باقی ہے
صرف اک نام روایاتِ کہن باقی ہے

ایک عرصہ ہوا تاراج چمن کو لیکن
آج تک ذہن میں تصویرِ چمن باقی ہے

عشق طے کر چکا ہر جادۂ ہستی لیکن
صرف اک مرحلۂ دار و رسن باقی ہے

اب محبت ہے کسی سے نہ تعلق پھر بھی
دل میں احساس کی ہلکی سی چبھن باقی ہے

چھُپ گیا وقت کا خورشید تو ماتم کیسا!
صبحِ فردا کی تصور میں کرن باقی ہے

برہمی دہر کی بے وجہ نہیں ہے اے فوق
اُن کے ماتھے پہ ابھی کوئی شکن باقی ہے

ڈاکٹر فوق کریمی
کریمی بلڈنگ۔ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

تم ڈر رہے ہو ساتھ میں لشکر لیے ہوئے
تنہا کھڑا ہے سر کو قلندر لیے ہوئے

مُدت سے کر رہے تھے مسیحا کا انتظار
آیا ہے وہ تو قتل کا محضر لیے ہوئے

شیشے کے سب کے گھر ہیں یہاں شہر میں مگر
پھرتے ہیں لوگ ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے

شبنم کی ہم ہیں بوند گلستاں کی آبرو!
صحرا کی تم مثال سمندر لیے ہوئے

اس سیلِ بیکراں میں بہے گا زمانہ اب
قطرے چلے ہیں آج سمندر لیے ہوئے

اخلاق و مصلحت کے تکلف بھی اب کہاں؟
پھرتے ہیں لوگ ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے

تاریکیوں میں شب کی جلاؤ چراغِ دل
آتی ہے صبح مہر منور لیے ہوئے

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل۔ سندیلہ۔ ہردوئی

ظلمتوں کے شہر میں موجِ ضیا کب آئے گی
جس کی حسرت ہے وہ صبحِ خوش ادا کب آئیگی

پھر رتیلی گھاٹیوں کے قافلے ہیں منتشر
پھر پہاڑوں کی بلندی سے صدا کب آئیگی

کب تلک زندہ رہیں گے مجلسِ دوراں میں ہم
کب کھُلیں گی کھڑکیاں تازہ ہوا کب آئیگی

آگیا ہے کاروانوں کے لئے وقتِ رحیل
ہر نفس ہے منتظر بانگِ درا کب آئیگی

کب تلک چھائے رہیں گے یہ سحابِ اشک و غم
زندگی کو مسکرانے کی ادا کب آئے گی

کیا یونہی سہتے رہیں گے یہ عذابِ تشنگی
کیف میرے گھر میں ساون کی گھٹا کب آئیگی

ڈاکٹر کیف رضوی لکھنوی
(شعبۂ ایشین کلچر)
ڈی اے وی ڈگری کالج،
لکھنؤ



عربی کہانی

اسیمہ قصاص

ترجمہ: ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی

شعبۂ عربی۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

آکسفورڈ کی سڑک پر عرب خاتون

موسم گرما کی ایک دوپہر جب آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ دنیا کو منور کررہا تھا، ماں اپنی بیٹی کے ساتھ زباب شہر کی سیر کو نکل پڑی۔ ماں نے اب تک اپنی زندگی میں اس شہر کے بارے میں ہزاروں کہانیاں سن رکھی تھیں حالانکہ اس وقت تک اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کسی بھی یورپی شہر کی سیر کا خیال نہیں آیا تھا اور اب اس کے دماغ میں وہ مناظر مسلسل گھوم رہے تھے جنھیں اس نے ان ممالک سے واپس آنے والے سیاحوں سے سنا تھا۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران اس کے شوق نے اس کے تخیل کو پرواز کرنا سکھا دیا تھا۔ اسی شوق اور تجسس کا نتیجہ تھا کہ آج وہ اپنے داماد کے گھر میں بیٹی اور نواسے نواسیوں میں گھری ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ سب جاگتی آنکھوں کے خوابوں کی مانند اپنی مکمل حقیقت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھے۔

اسے اپنے داماد کے گھر آئے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ لیکن اب تک اسے گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔ آج صبح جب مرد اپنے دفتر اور بچے اپنے اسکول روانہ ہو گئے تو ماں اور بیٹی نے سیر پر نکلنے کا فیصلہ کیا۔

بیٹی اسیمہ بولی، "ہم لندن کے سب سے مشہور بازار دیکھیں گے جہاں اتنی شاندار عمارتیں ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسیمہ اور اس کی ماں شارع آکسفورڈ پر پہونچیں اور وہاں سے اس عرب خاتون کی سیر کی ابتدا ہوئی جو اپنی مشرقی پوشاک میں انفرادی حیثیت کی حامل تھی۔ راہ گیر اس کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر وہ اپنی مشرقی روایات اور تہذیب کی برتری کے احساس کی بدولت ان سے بے پروا تھی۔

دوکانوں میں کام کرنے والی خواتین کو دیکھ کر ماں نے اپنی بیٹی سے کہا۔ "تمھیں خدا کا شکرگزار ہونا چاہیے جس نے تمھیں اپنے بال بچوں اور گھر کی نگہداشت کے لیے یہ خالی وقت عطا کیا ہے۔ یہ خواتین زندگی کے حقیقی لطف سے محروم ہیں۔ کیوں کہ زندگی کا اصل لطف تو خود کو بچوں کے لیے پوری طرح وقف کر دینے ہی میں ہے جبکہ اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے یہ لوگ بادل ناخواستہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا کام غیروں کے سپرد کرتی ہیں۔ شاید وہ سمجھتی ہیں کہ بچوں کی پرورش کی ذمہ داری محض کھانا پکانے اور کپڑے دھونے تک ہی محدود ہوتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پرورش کا اہم جز تو یہ ہے کہ بچوں کو پیار دیا جائے اور ان کی شخصیت کو نکھارا جائے"....

لوگوں کے اژدہام اور باتوں کے شور سے ماں کا سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا تھا لیکن اس کے احساس برتری نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو نصیحتیں کرتی رہے۔ بھیڑ کے باعث اس نے اپنا بیگ بھی بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کیونکہ اس نے سنا تھا کہ یہاں چوری اور رہزنی کے واقعات (بالخصوص عربوں کے ساتھ) بڑی شدت سے ہوتے ہیں کیونکہ عرب چیک کے بجائے زیادہ تر نقد رقم لے کر چلتے ہیں۔

اسیمہ کی ماں نے ان بورڈوں پر توجہ نہیں دی جو جگہ جگہ نصب تھے

اور جن پر چھوٹوں اور بزرگوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت لکھی تھی کیونکہ وہ انگریزی زبان سے قطعی نابلد تھی۔ جبکہ اسیمہ کو ایسی کوئی تشویش نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کے بیگ میں ایک پنس سے زیادہ رقم نہیں ہے۔ زبان نہ جاننے کی وجہ سے ماں کو اپنی پسند کی پوشاکوں کی تعریف کرنے اور خریدنے میں دشواری ہورہی تھی لیکن وہ اپنی بیٹی سے چیزوں کی عمدگی، پائیداری اور قیمتوں کے بارے میں مسلسل دریافت کررہی تھی۔ مسئلہ اس وقت زیادہ سنگین ہوجاتا جب وہ کسی چیز کی قیمت اپنے ملک کے سکہ میں دریافت کرتی۔ اسیمہ ہر چیز سے منسلک قیمت کارڈ پر پہلے نظر ڈال لیتی تاکہ حساب کرکے اپنی ماں کو عربی سکے میں قیمت بتاسکے جب انھیں تکان کا احساس ہونے لگا تو دونوں ایک چائے خانے میں داخل ہوگئیں۔ وہاں کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد ماں نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے اسیمہ سے کہا:

"ہماری نسل میں تعلیم کی کمی تھی۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ مغرب کے مقابلے میں ہمارے طور طریقے اور رسم ورواج بہتر ہیں۔ تاہم وہ کیا چیز تھی جو ہمیں بہتر تعلیم حاصل کرنے سے روکتی تھی۔ میرے دکھ کا اندازہ کرو جب میں حروف کو ایسے دیکھتی ہوں جیسے وہ جادوئی نشان ہوں۔ میں اپنے ہم عمر افراد کو یہی مشورہ دیتی ہوں کہ وہ کسی غیر ملک کا سفر اس وقت تک نہ کریں جب تک کہ وہ اس ملک کے باشندوں کی زبان سے بخوبی واقف نہ ہوجائیں۔"

انھوں نے چائے ختم کی اور دوبارہ سیر کے لیے نکل پڑیں۔

ماں کے دماغ میں اپنی عمر کے گزشتہ چالیس پینتالیس برس کے مناظر گردش کررہے تھے جب کہ لوگ اسکولوں کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پھر ماں اپنے آپ سے سوال کرتی کہ کون سی چیز لوگوں کو علم سے دور رکھتی ہے؟ اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کے ذہن میں ان دانش وروں اور فلسفیوں کے نام گھوم رہے تھے جنھوں نے نئی نئی چیزوں کی دریافت کی یا نئے نظریات قائم کیے۔ ان میں سے ہر ایک کے نظریات یہ ثابت کرتے ہیں کہ عصری علوم کو اگر نظر انداز کردیا جاتا ہے تو فکری تسلسل میں ایک جمود پیدا ہوجاتا ہے جو سماج کو پس ماندگی کی جانب لے جاتا ہے۔

زنانہ ملبوسات کی ایک دکان نے ان کے قدم روک لیے۔ ایک سیلس گرل نے عربی زبان میں ان دونوں کو خوش آمدید کہا۔ اس نے ان سے ان کی پسند کے بارے میں دریافت کیا اور ان کے لیے موزوں لباس نکالنے لگی۔

اسیمہ نے کہا: "ہم آپ کے خیر مقدم اور اخلاق کے لیے شکر گزار ہیں، لیکن فی الوقت ہم محض ایک نظر مختلف اشیا پر ڈالیں گے۔"

سیلس گرل نے برجستہ کہا۔ "یہاں ہر چیز انتہائی دل کش ہے آپ ہمیں اپنی پیمائش بتائیں۔ میں فوراً آپ کی پسندیدہ چیز پیش کردوں گی۔"

اسیمہ بولی۔ "ہم کچھ تحائف خریدنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں ان لوگوں کی صحیح پیمائش کا علم نہیں ہے جنھیں ہم ملبوسات بطور تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم معافی چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر سیلس گرل بولی: "خدا کرے آپ لوگ ہر دکان پر ایک گھنٹہ سے زیادہ صرف کریں، تب ایک یا دو پوشاکیں خریدنے کا فیصلہ کریں۔"

عرب خاتون نے پوچھا۔ "تمھارا کیا نقصان ہے؟ کیا دکانیں گاہکوں کے لیے نہیں ہیں؟"

سیلس گرل نے غصے سے جواب دیا: "ہم یہاں تمھارے جسموں کا طول وعرض دیکھنے کے لیے بیٹھے ہیں۔؟"

ماں نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کے کانوں تک سیلس گرل کے کہے ہوئے آخری الفاظ پہنچ رہے تھے — جو وہ بڑبڑا رہی تھی —

"لندن کی سڑکوں پر جھاڑو دو تاکہ تم اپنے لیے خریداری کرسکو۔"

انھوں نے اپنی رفتار بڑھادی۔ عرب خاتون کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے اس وقت بھی اتنا برا نہیں لگا تھا جب دوسری دکانوں پر اس کی بیٹی اور سیلس گرلز کے درمیان کسی چیز کے معیار یا قیمت پر تکرار ہوئی تھی۔ انگریزی زبان سے ناواقفیت کے باعث اسے سیلس گرلس سے اپنی بیٹی کی تکرار زیادہ سخت محسوس ہورہی تھی — اسیمہ کو ایسی صورت حال کا سامنا اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ وہ اس

سیلس گرل کے برتاؤ سے کافی ملول اور رنجیدہ تھی۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہی، یہاں تک کہ دونوں ایک بھیڑ والی جگہ پر پہونچ گئیں۔ وہ دونوں ایک اسٹور میں داخل ہوگئیں اور اس گوشے کی جانب بڑھ گئیں جہاں ویسے ہی ملبوسات نمائش کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ جیسے وہ خریدنا چاہتی تھیں۔ بجلی کی سیڑھی پر ماں بولی:

"یہ بہت بڑی دکان ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہاں ہمارے سامنے بڑی تعداد میں ملبوسات رکھے جائیں گے۔"

اسیمہ بولی: "میں ایسا نہیں سمجھتی ہوں۔"

ماں نے پھر خدشہ ظاہر کیا۔ "اگر اس اسٹور سے کچھ خریدے بغیر ہم لوگ نکلنا چاہیں گے تو یہ ہمارے لیے ممکن نہ ہوگا۔"

لیکن مطلوبہ گوشے میں پہونچ کر ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا انگریز سیلس گرل نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں ___؟"

"شکریہ!" اسیمہ نے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں اسٹور میں گھومنے لگیں۔ آپس میں کافی بحث و مباحثہ کے بعد دونوں نے چند ملبوسات پسند کیے۔ ماں ان میں سے ایک پوشاک کو اپنے جسم پر رکھ کر دیکھ رہی تھی کہ سیلس گرل دوبارہ نمودار ہوئی ___

"یہاں پیمائش کے لیے ایک خاص کمرہ موجود ہے۔"

اور وہ ان کی مدد کے لیے ان کے ہمراہ ہوگئی ___ اس دوران اسیمہ نے اپنی ماں کی جانب دوسری پوشاک بڑھائی تو ماں بولی:

"بس بس بیٹی! ان میں سے کوئی بھی میرے بدن پر ٹھیک نہیں ہوگی اور ہم اس لڑکی کی وجہ سے ایک بار پھر مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

لیکن اسیمہ اور سیلس گرل کے درمیان ہونے والی گفتگو نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔

اسیمہ پیمائش دیکھ کر واپس آچکی تھی اور اب وہ دونوں کیش کاؤنٹر کی جانب بڑھیں۔ ماں نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میں خریداری میں عجلت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میرے خیال میں اب یہ ممکن نہیں ہے۔"

اسیمہ نے سیلس گرل کی جانب دیکھا اور بولی۔ "ہم لوگ دوبارہ آئیں گے مدد کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ!"

سیلس گرل نے بڑی دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ضرور بڑی خوشی سے! خدا آپ کی حفاظت کرے۔"

ماں نے اسیمہ کی بات کی تائید کی کہ وہ دونوں دوبارہ آئیں گی ___ اب وہ لوگ نیچے جانے والی بجلی کی سیڑھی پر کھڑی تھیں۔ ماں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی اور یقین کرنا چاہتی تھی کہ سیلس گرل ان کے پیچھے آتو نہیں رہی ہے۔ اس کے ذہن میں پچھلی دکان کی سیلس گرل کے الفاظ گونج رہے تھے ___

"لندن کی سڑکوں پر جھاڑو دو تاکہ کچھ خریدنے کے قابل ہوسکو ___!!"

ماں نے دروازے کے قریب پہونچ کر بیٹی سے دریافت کیا ___

"اسیمہ! کیا ہم لوگوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس بڑے اسٹور میں دوبارہ آئیں اور کچھ نہ خریدیں ___؟"

اس دوران وہ دونوں باہری دروازے تک پہونچ گئی تھیں الیکٹرانک دروازہ خودبخود کھل گیا اور وہ دونوں باہر نکل گئیں ___

غزل

مضطر تاج پوری
تاج پور ڈیہمہ
غازی پور

ہو کے بارِ دوش کس کا سر اُٹھا
دستِ نازک میں جو پھر خنجر اُٹھا
اپنے شیشے کے مکاں پر کر نظر
پھر کسی ایوان پر پتھر اُٹھا
آئی جب منجدھار میں کشتی مری
ڈوبنے کا شور ساحل پر اُٹھا
چشمِ حسرت سے فقط دیکھا کیا
جب نہ ہاتھوں سے مرے ساغر اُٹھا
جبہ سا پھر کون ہوگا اس طرح
آپ کے در سے اگر مضطر اُٹھا

نئی سرکار جنتا کے دوار

اُترپردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

ذہنی ترقی کے لئے تعلیم ضروری
گورنر کے ہاتھوں خواندگی ریلی کا آغاز

اترپردیش کے گورنر شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی نے آج یہاں ریزرو پولیس لائن میں ضلع خواندگی کمیٹی کے زیر اہتمام یوم خواندگی کے موقع پر منعقدہ ریلی کو خطاب کیا اور زیادہ سے زیادہ ناخواندہ افراد کو خواندہ بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

گورنر نے کہا کہ انسان کے لیے تعلیم حاصل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شعور سے کام کرے اور بھلے بُرے کی پہچان کر سکے۔ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ بغیر تعلیم کے لوگوں کی ذہنی ترقی نہیں ہو پاتی جس سے وہ جاہلیت اور غیر یقینی کے اندھیرے میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

انھوں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تاریخی اور ثقافتی شہر لکھنؤ میں ضلع خواندگی کمیٹی کے ذریعہ صد فی صد شہریوں کو خواندہ بنانے کے لیے "خوبصورت لکھنؤ، خواندہ شہر" کی ایک مہم چلائی جا رہی ہے۔ انھوں نے اس کے لیے ضلع مجسٹریٹ، کمیٹی کے سکریٹری اور دیگر کارکنوں کو مبارک باد دی۔

گورنر نے اس موقع پر یہ اپیل کی کہ تمام شہری اس مہم کو کامیاب بنانے کے واسطے اپنا تعاون دیں اور یہ عہد کریں کہ وہ اگر خواندہ ہیں تو زیادہ سے زیادہ ناخواندہ افراد کو خواندہ (تعلیم یافتہ) بنانے کا کام کریں گے۔

گورنر کے ہاتھوں یوم ہندی کے موقع پر
شعری نشست کا افتتاح

گورنر شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی نے سکریٹریٹ میں منعقدہ اترپردیش سکریٹریٹ ملازمین/افسر تنظیم نیز اترپردیش سکریٹریٹ ہندی پریشد کے مشترکہ اہتمام میں یوم ہندی کے موقع پر منعقدہ شعری نشست کا افتتاح کیا۔

گورنر نے اس موقع پر منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندی صرف قومی زبان ہی نہیں بلکہ عوامی زبان بھی ہے جسے سارے ہندستان میں تمام فرقوں کے لوگ ذوق و شوق کے ساتھ لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں۔ آئین ساز کونسل نے ہندی کو عوامی زبان کے ساتھ ہی قومی زبان بنایا اس لیے سرکاری اور نجی کاموں میں ہندی کا استعمال کرنا ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ شری ریڈی نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندی کے ساتھ ہی دوسری ہندستانی زبانوں کو بھی سیکھنا چاہیے تاکہ ایک ریاست کے خیالات دوسری ریاست کے افراد کی سمجھ میں آسانی سے آسکیں اس سے قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا۔

گورنر نے کہا کہ عام بول چال نیز دفاتر میں استعمال ہونے والی ہندی آسان ہونا چاہیے تبھی یہ ملک کے تمام باشندوں میں مقبول ہو سکے گی۔

اس موقع پر منعقدہ شعری نشست میں شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا۔

منطقائی کمشنروں کو مزید اختیارات

حکومت اترپردیش منطقائی کمشنروں کو مزید اختیارات دے گی جس سے

وہ حکومت کے فلاحی و ترقیاتی اسکیموں کی موثر عمل آوری، نگرانی، کنٹرول اور تحقیق کو یقینی بنا سکیں۔

اتر پردیش کے وزیر اعلا شری کلیان سنگھ نے گورکھ پور میں منطقائی ترقیاتی سمینار کو خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

انھوں نے کہا کہ منطقائی کمشنر، منطقہ کے متعلق جو بھی تجزیہ پیش کریں گے ان کی منظوریوں کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ یہی اختیارات ضلع سطح پر ضلع مجسٹریٹوں کو ہوں گے۔ ضلع مجسٹریٹ ضلع کی سطح پر ترقیاتی کام کو نوڈل افسر کی حیثیت سے کریں گے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ محکمہ جاتی میٹنگوں، بلاک ترقیاتی کمیٹی (بی۔ ڈی۔ سی) کسان سیوا مراکز، سینچائی بندھوا اور عوامی مسائل کو حل کرنے کے لئے منعقدہ میٹنگوں میں غیر حاضر رہنے والے افسران اور ملازمین کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے افسران سے اپیل کی کہ وہ محکمہ جاتی تال میل قائم کر کے ریاست میں ترقی کی رفتار کو ایک نئی سمت دیں اور ایک نئے طریقہ کار کو فروغ دیں جس سے عوام کو حکومت کی واضح پالیسی اور منصوبہ بندی سے واقفیت ہو سکے۔

منطقائی سطح پر ضلع اسکیم کے مصارف، منظوریاں اور مجوزہ کاموں کے جائزے کے دوران وزیر اعلا کو بتایا گیا کہ کچھ محکموں جیسے علاج و معالجہ، تعلیم، سیاحت، چھوٹی صنعت، باغبانی، گنا ترقیات، رہائشی اور کمزور طبقہ کا رہائشی بجٹ ابھی جاری نہیں ہو پایا ہے۔ اس پر وزیر اعلا نے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جن محکموں میں مالیاتی منظوریاں جاری کرنے میں تاخیر ہوئی ہے اس کا جائزہ لیا جائے گا اور تاخیر کی ذمہ داری متعین کی جائے گی۔

منطقہ میں کسانوں کے گنا ملوں پر بقایا جات کی ادائیگی کی صورت حال کے متعلق زراعت کمشنر نے وزیر اعلا کو واقف کرایا۔ وزیر اعلا نے متعلقہ ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت دی ہے کہ شکر ملوں پر کسانوں کے بقایا جات کی وصولی کے لیے سخت قدم اٹھائے جائیں، اس کے لیے ریکوری سرٹیفکیٹ جاری کیے جائیں اور متعلقہ شکر ملوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

منطقہ میں پرائمری اسکولوں میں خالی اسامیوں کا جائزہ لینے کے بعد وزیر اعلا نے اسکولوں میں طلبا و اساتذہ کی حاضری، اور درس و تدریس پر نگرانی رکھنے کے احکامات دیئے۔ محکمہ علاج و صحت کا جائزہ لینے کے بعد وزیر اعلا شری کلیان سنگھ نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی خالی اسامیوں پر تقرری کی جا چکی ہے انھوں نے نئی ادویات پالیسی کے تحت دوا کی خریداری، پرائمری صحت مراکز پر ادویات کی مسلسل دستیابی اور ڈاکٹروں کی حاضری پر نگرانی رکھنے پر زور دیا۔

پوروانچل ترقیاتی فنڈ میں مہیا رقم کے استعمال کی صورت حال پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعلا نے کہا کہ اس فنڈ میں اب تک مہیا کرائی گئی رقم پوری طرح استعمال نہیں کی گئی۔ مالیاتی وسائل کی کمی کے باوجود ریاستی حکومت نے پوروانچل کی ترقی کے لیے اس فنڈ میں اس سال چالیس کروڑ روپئے کی رقم الاٹ کی ہے۔ وزیر اعلا نے اس فنڈ کو پوروانچل میں رہنے والے افراد کی بنیادی ضرورتوں جیسے تعلیم کا بندوبست، اسکولوں اور اسپتالوں کی تعمیر، بجلی کے ذیلی اسٹیشنوں اور صنعتی واحدوں کے قیام پر خرچ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

وزیر اعلا نے کہا کہ گورکھ پور منطقہ میں نئے بنائے گئے تینوں اضلاع جیسے مہاراج گنج، سدھارتھ نگر اور مئو کے صدر دفاتر کی ترقی اور مختلف محکموں کی عمارتوں کی تعمیر کے واسطے چیف ٹاؤن پلانر ان اضلاع کی مستقبل میں ضرورتوں کے سلسلے میں جلد ہی ایک وسیع اسکیم کو آخری شکل دیں گے۔ منطقائی کمشنر گورکھ پور اس سلسلے میں نوڈل افسر ہوں گے

وزیر اعلا نے یہ بھی ہدایت دی کہ افسران ضلع کے دور دراز علاقوں میں جا کر عوام کے مسائل سے واقفیت حاصل کریں اور ان کو حل کریں۔ ریاستی حکومت کے گرام سویرالیہ کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے میں اعلا افسران اپنے ماتحت افسران اور ملازمین کی مضبوط، باصلاحیت اور حوصلہ مندانہ قیادت کریں۔ انھوں نے یہ امید بھی ظاہر کی اس کے نتائج نچلی سطح تک پہونچیں گے۔

شری سنگھ نے افسران سے اپیل کی کہ وہ اپنی صلاحیت، قابلیت اور دور اندیشی سے عوام میں موجودہ حکومت کے تئیں یقین و اعتماد پیدا کریں کیونکہ حکومت اور نظم و نسق ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

وزیر اعلا نے منطقائی کمشنر احاطہ میں دو کروڑ روپئے کی لاگت سے گورکھ پور ترقیاتی اتھارٹی کے ذریعہ تعمیر کیے جانے والے وکاس بھون کا سنگ بنیاد

رکھا اور شجر کاری بھی کی۔

ساسنی (علی گڑھ) میں فیڈر ڈیری کا قیام
وزیر اعلا نے سنگ بنیاد رکھا

اتر پردیش کے وزیر اعلا شری کلیان سنگھ نے علی گڑھ ضلع کے ساسنی میں ریاستی امداد باہمی دودھ ادارے کی جانب سے ۸۸ر۵ کروڑ روپے کی لاگت سے قائم کی جانے والی فیڈر ڈیری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ ڈیری ۵۰ ایکڑ زمین پر قائم کی جائے گی۔

اس موقع پر منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلا نے کہا کہ ساٹھ ہزار لیٹر روزانہ کی صلاحیت والی اس ڈیری کے لیے ٹیوب ویل، چہار دیواری اور توانائی کے کاموں کے لئے ۴۰ر۳ لاکھ روپے کی رقم مہیا کرادی گئی ہے۔ انھوں نے اس پروجیکٹ کو پابندیٔ وقت کے ساتھ مکمل کرنے کی ہدایت دی۔

شری سنگھ نے کہا کہ حکومت بدعنوانی اور بھائی بھتیجاواد کو روکنے اور تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔ انھوں نے کہا کہ بے روزگاری غریبی کو جنم دیتی ہے، اسی لیے حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے روزگار مہیا کرانے والی اسکیمیں بنائی ہیں۔

وزیر اعلا نے ہاتھرس میں مقامی باگلا ڈگری کالج کے میدان میں منعقدہ شہری استقبالیہ جلسے میں کہا کہ ہاتھرس کو ضلع بنانے کا کوئی ارادہ حکومت کے زیرِ غور نہیں ہے۔ انھوں نے باگلا ڈگری کالج کے وگیان بھون کے لیے ۵ لاکھ روپے، نگر پالیکا کی سڑکوں کے لیے ۱۵ لاکھ روپے اور ہاتھرس میں پانی فراہمی کے لیے دس لاکھ روپے اور باگلا اسپتال اور ٹی بی اسپتال کے لیے ساڑھے تین لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔

تعلیمی بیداری ہفتہ
وزیر اعلا اور وزیر تعلیم کے پیغامات

اتر پردیش کے وزیر اعلا شری کلیان سنگھ نے "سب کے لیے تعلیم" عوامی بیداری ہفتہ اور یوم اساتذہ کے موقع پر، سبھی ۲ لاکھ ۲۵ ہزار پرائمری اور سکنڈری اساتذہ کے نام اپنے پیغام میں اس عہد کا اعادہ کیا ہے کہ ایک خواندہ اور تعلیم یافتہ ریاست ۲۱ ویں صدی کا استقبال کرے گی۔

انھوں نے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ ابتدائی تعلیم کی ترویج و توسیع کی مہم کی قیادت کریں اور ایسے لڑکے اور لڑکیوں کا پتہ لگائیں جو اسکول نہیں جاتے ہیں اور انھیں حرف شناس بنانے کے لیے رجسٹرڈ کریں۔

اس موقع پر اپنے پیغام میں وزیر تعلیم شری راج ناتھ سنگھ نے یاد دلایا کہ اس صدی کے ختم ہونے میں اب صرف ۲۶۷۳ دن رہ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اسکولوں کو مستحکم بنانا ہے، اس لیے اساتذہ کو اسے یقینی بنانا ہے کہ لڑکا اپنی پرائمری تعلیم مکمل کیے بغیر اسکول نہ چھوڑے۔

تعلیم کے ذریعہ ہندستانی تہذیب کے تئیں رغبت پیدا کریں

اتر پردیش کے وزیر شہری ترقی شری لال جی ٹنڈن نے کہا ہے کہ ہمیں غیر ممالک کی نقل نہ کرکے اپنی اصل ہندستانی تہذیب کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے طلبا، کو ایسی تاریخ پڑھانا چاہیے جس سے ان میں حب الوطنی اور قربانی کا جذبہ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہندستانی تہذیب میں بھی دلچسپی پیدا ہو۔

وزیر شہری ترقی نے کہا کہ دنیا بھر میں ہندستان ہی ایسا پہلا ملک ہے جہاں ہمیشہ سے اساتذہ کو سماج میں سب سے اونچا مقام دیا جاتا رہا ہے۔ شری ٹنڈن نے کہا کہ آج ہم غیر ملکی یونیورسٹیوں کے نصاب سے اثر قبول کر رہے ہیں لیکن ہمارے ملک میں ہی تکشلا اور نالندہ جیسی اہم یونیورسٹیاں تھیں جہاں سخت امتحان کے بعد داخلہ ہوپاتا تھا۔

ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے لیے حکومت پُرعزم

اتر پردیش کے وزیر مالیات و پلاننگ شری کا راجندر کمار گپتا نے ڈمریاگنج

رسول آباد ضلع جگھا میں منعقدہ ایک بڑے عوامی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ریاستی حکومت ہمہ جہت ترقی کے لیے پوری کوشش کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس کام کے لیے بجٹ کا ساٹھ فیصد حصہ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔

وزیر ریاست برائے جنگلات شری دمن راج یادو نے ڈمریا گنج علاقے میں ڈگری کالج کے قیام پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ندی پر واقع چندو دیپ گھاٹ پر پل کی تعمیر اور پمپ کینال کی بجلی کاری جلد ہی کرائی جائے گی۔

ہندی کے فروغ کے لیے سالانہ گیارہ ہزار روپئے

ریاست کے وزیر توانائی شری برہم دت دویدی نے اعلان کیا ہے کہ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ ہندی کی نشر و اشاعت اور ہندی میں تکنیکی لغت کے لیے سالانہ گیارہ ہزار روپے کا بندوبست کرے گا۔

وزیر موصوف نے یہ اعلان ہندی دیوس کے موقع پر شکتی بھون میں منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔ اس موقع پر شری دویدی نے کہا کہ ہندی ہی واحد زبان ہے جس کا سائنسی ڈھانچہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہندی زبان لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔

وہ دن اب دور نہیں ہے جب ہندی ترقی کی بلندیوں پر ہوگی۔

اقوام درج فہرست کے نوجوانوں کے لیے مفت تربیت

ریاست میں خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے اقوام درج فہرست کے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو ان کی دلچسپی کے مطابق مفت تربیت دے کر انھیں خود کفیل بنانے کی غرض سے اتر پردیش اقوام درج فہرست مالیاتی ترقیاتی کارپوریشن کی جانب سے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ، ہتھ کرگھا اور بڑھئی کے چھ چھ ماہ کے تربیتی پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔

شہریوں کے تعاون سے شہر کی ترقی

"آپ کے تعاون سے آپ کے شہر کی ترقی" کی ایک اسکیم بنائی گئی ہے۔ اس کے تحت لکھنؤ شہر کو صاف ستھرا رکھنے اور ناجائز قبضوں سے پاک کرنے کے لیے ایک مہم چلائی جائے گی۔ پہلے مرحلے میں کان پور روڈ پر اس کام کا آغاز ہوگا، جس کے لیے بیوپاریوں اور معزز شہریوں کا تعاون بھی حاصل کیا جائے گا۔

یہ اطلاع دیتے ہوئے ریاست کے وزیر شہری ترقی شری لال جی ٹنڈن نے بتایا کہ اس اسکیم کے تحت کان پور روڈ کے دونوں کناروں پر یہاں کے باشندے اپنے مکانوں کی ایک رنگ میں پتائی کرائیں گے۔ دو نئی شاہراہوں اور چھ پارکوں کی حسن کاری یہاں کے عوام آپسی تعاون سے کریں گے۔

قیدیوں کے لیے کاروباری تربیت کا بندوبست جلد

اتر پردیش کے وزیر برائے جیل اور شہری تحفظ شری اعزاز رضوی نے کہا ہے کہ اتر پردیش کے جیلوں میں مقیم قیدیوں کو خود کفیل بنانے کے مقصد سے روزمرہ کے استعمال میں آنے والی اشیا کی تربیت دینے کا بندوبست جلد ہی شروع کیا جائے گا۔

وزیر جیل نے بتایا کہ ریاست میں اس وقت چھوٹے بڑے ۶۵ جیل ہیں۔ ان جیلوں میں لوہار اور بڑھئی، بجلی وائرنگ مکینک، پلمبر، راج مستری، کٹائی و سلائی، سائیکل و اسکوٹر مرمت، پمپ مکینک، جوتا چپل بنانے، ٹیلی ویژن کی مرمت وغیرہ کی تربیت دینے کی اسکیم ہے۔

شری رضوی نے بتایا کہ تربیت کے زمرے میں ۳۰ لاکھ روپیہ ضلع جیلوں کے لیے الاٹ کیا گیا ہے۔ اس تربیت سے قیدی سماج میں دوبارہ چھوٹی پونجی سے نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔

□□



نام کتاب، "شہرِ صدا" (شعری مجموعہ)
شاعر: پیام فتحپوری، قیمت، بیش روپئے
ملنے کا پتہ، دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

"شہرِ صدا" پیام فتحپوری کا چھٹا شعری مجموعہ ہے، اس سے پہلے ان کے پانچ اور شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں، اور اردو کے علمی و ادبی حلقے سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوا ہے کہ پیام فتحپوری جہاں ایک جانب شعری روایات اور جمالیات کا احترام کرتے ہیں وہیں عصری زندگی کی ضرورتوں، تقاضوں اور مسائل سے چشم پوشی نہیں کرتے بلکہ ان سے گہرائی کے ساتھ وابستہ ہو کر ان کا اظہار اپنے اشعار میں خوبصورتی و شاعرانہ کمالات کے ساتھ کرتے ہیں۔ یوں تو جہاں پیام فتحپوری کے شاعرانہ مزاج اور ذہن کی تربیت و تراش خراش روایتی شعری ماحول میں ہوئی ہے وہیں ان کی فکر پر ترقی پسند ادبی تحریک کے گہرے اثرات ہیں جس کے نقوش ہمیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انسانی زندگی اور عصری مسائل کی جانب توجہ اور اس کا شاعری میں اظہار ان کے ترقی پسندانہ ادبی نظریات کی غمازی کرتا ہے۔ اس کیفیت نے پیام کی شاعری میں حسن، کشش اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ چند شعر مثال کے طور پر پیش ہیں ؎

صلیب و دار ہو، صحرا ہو یا کہ مقتل ہو
جہاں ہو میری ضرورت، مجھے صدا دینا

روشنی یوں ہی زمانے میں نہیں آئی ہے
خون دل اپنا چراغوں میں جلایا ہے کیا کیا

اس اندھیرے میں لہو دل کا بڑے کام آیا
روشنی میں نے چراغوں کی بڑھا دی کچھ اور

محنتوں کا بھی صلہ کس کو یہاں ملتا ہے
محنتیں جا کے کسی جام میں کھو جاتی ہیں

پیام فتحپوری کی شاعری میں جو مقصدیت کے عناصر ہیں، وہ ان کی شاعری کو اہم بنانے کے ساتھ ساتھ اسے ادب برائے زندگی کے نظریے سے بھی جوڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہمارے دل و دماغ اور فکر پر گہرا اثر چھوڑتی ہے ؎

کیا جانے زندگی میں یہ کیسی ہوا چلی   ہر خواب ریزہ ریزہ ہوا اور بکھر گیا

حادثوں میں ہی پلے ہیں رات دن   حادثوں سے کس لیے گھبرائیں ہم

سب مسیحا ہیں تو پھر قاتل ہے کون
فیصلہ دشوار ہوتا جائے ہے

پیام فتحپوری حالات کی سنگینیوں اور زندگی کی نیرنگیوں کا اظہار لطیف اور پر اثر طریقے سے کرتے ہیں۔ ترسیل اور ابلاغ کی دشواریوں سے بھی ان کی شاعری پاک ہے وہ اپنی بات سیدھے سادے اور صاف انداز میں کہتے ہیں جس کی وجہ سے ہم ان کے خیال کی گہرائی تک آسانی سے پہونچ جاتے ہیں ؎

کھلتا نہیں اب پھول کوئی دل کے چمن میں
کیا موجِ صبا زخم کھلانے کے لیے ہے

دل کی تاریک فضائیں نہ ہوں روشن جس سے
ایسے بیمار اُجالوں میں بھی کیا رکھا ہے

پیام فتحپوری کی زبان سادہ، پاکیزہ اور دل نشین ہے، ان کے یہاں جذبہ اور خیال ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک دل کش شعری فضا کی تعمیر کرتے ہیں۔ تجربے اور مشاہدے کی گہرائی نے پیام کے کلام میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ عصری زندگی کی مایوسیوں، گھٹن، تلخیوں، ناہمواریوں اور

خود غرضیوں کے عکس بھی ہمیں ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آج کی ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی زندگی نے بھی انھیں اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ زندگی کی خوبصورت اور صالح قدروں کے فنا ہونے کا درد بھی پیام کی شاعری میں ہے۔ وہ انسانیت کی شکست و ریخت سے صرف حیرت زدہ ہی نہیں بلکہ رنجیدہ بھی ہیں۔

مجموعی طور پر "شہر صدا" اُردو کے شعری سرمایے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

——— (ڈاکٹر) سعید عارفی

نام کتاب: زخم و مرہم (شعری مجموعہ)
شاعر: امیر چند بہار   قیمت -/۵۰ روپیہ
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو ہند۔ اُردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی

"زخم و مرہم" امیر چند بہار کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل بہار صاحب کی ۵ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ پہلی کتاب "نسیم مغرب" منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب "نسیم بہار" تین سو پچاس رباعیات کا مجموعہ ہے۔ تیسری "ارمغان بہار" نظموں و غزلوں کا مجموعہ ہے۔ چوتھی "دین و دنیا" ۳۰۰ رباعیات پر اور پانچویں کتاب "نشیب و فراز" منظومات و غزلیات پر مشتمل ہے۔ زیر نظر کتاب "زخم و مرہم" قطعات کا مجموعہ ہے۔

امیر چند بہار نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور خوب جی بھر کر شاعری کی ہے لیکن اب شاید عمر کی اس منزل میں شاعری سے جی بھر گیا ہے۔ آخر انھیں خود کہنا پڑا ؎

زمانے سے کوئی شکوہ نہیں ہے   کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے
جو کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ گیا ہوں   مجھے اب اور کچھ کہنا نہیں ہے

اس قطعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کو اب کچھ کہنے کی خواہش باقی نہیں رہ گئی ہے۔

بہار صاحب کی شاعری ایک حساس شاعر کی آپ بیتی ہے، جسے جگ بیتی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک حساس شاعر زمانے کے نشیب و فراز سے متاثر ہوتا ہے اور نظام کی خرابی کو درست کرنے کی کوشش میں ناکامی اسے قنوطیت کی طرف لے جاتی ہے ؎

حکم پروردگار کے آگے   کچھ مری پیش چل نہیں سکتی
یاس و حسرت اگر ہیں قسمت میں   میری قسمت بدل نہیں سکتی

ماہ پاروں میں دلبری نہ رہی
لالہ و گل میں تازگی نہ رہی
ٹمٹمانے لگا ہے دل کا چراغ
اب کسی شے میں دلکشی نہ رہی

امیر چند بہار کی تربیت روایتی اساتذہ کے زیر سایہ ہوئی ہے لیکن روایتی شاعری کے ساتھ ساتھ بہار صاحب نے آج کے مشینی دور سے بھی آنکھیں ملانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہی ہے مگر یہی سادگی کبھی کبھی شاعری کے دائرے سے باہر نکل جاتی ہے ان کے یہاں کچھ قطعات ایسے بھی ہیں جو بحر میں ہونے کے باوجود شاعری کی تعریف میں نہیں آتے۔ بہر حال ان کا قطعات کا مجموعہ اُمید ہے کہ مقبول ہوگا۔

——— (ڈاکٹر) رفیق احمد خاں

نام کتاب: "کہکشاں بھارتی" (افسانوی مجموعہ)
مصنف: قیصر رشید بھارتی
ملنے کا پتہ: ادبی بورڈ اسٹریٹ شیر علی خاں، امیر گنج۔ ٹونک (راجستھان)

آل انڈیا ریڈیو جے پور کے اُردو پروگرام کہکشاں سے نشر شدہ گیارہ افسانوں کا یہ مجموعہ قیصر بھارتی کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ۱۹۸۴ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'دردانے' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کے سارے افسانے چونکہ کہکشاں پروگرام کے تحت نشر ہو چکے ہیں۔ اسی لیے اس کا نام کہکشاں بھارتی رکھا گیا ہے۔ مجموعے میں شامل تمام افسانے اپنے موضوعات کے اعتبار سے قابل تحسین ہیں۔ آدمی کا زہر۔ میں کون ہوں؟۔ اُجالوں کی منزل۔ اُسے کیا خبر تھی۔ بنجر دھرتی کا پھول۔ کیا یہی پیار ہے؟ وغیرہ افسانوں میں سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور تعلیمی پسماندگی پر طنز کیا گیا ہے۔

قیصر رشید بھارتی جو پیشے کے لحاظ سے صحافی ہیں، افسانوں کے علاوہ غزلوں اور گیتوں میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ پسندیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ——— سید طیب کوکب

نام کتاب: "ریزۂ مینا" (شعری مجموعہ)
مصنف: نیر سلطان پوری قیمت: ۲۵/ روپئے
ملنے کا پتہ: تاج بک ڈپو۔ سلطان پور

"ریزہ مینا" نیر سلطان پوری کا شعری مجموعہ ہے۔ نیر ایک پختہ کار شاعر ہیں۔ عشق ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ویسے وہ فکر انگیز شاعری کے بھی قائل ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا مزاج کلاسیکی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری شمع و پروانہ اور گل و بلبل کے حصار سے نکل کر غم دوراں کا آئینہ نہ بن سکی ہے۔

نیر سناؤ عارض و گیسو کی داستاں
تسکین زندگی اسی شام و سحر میں ہے

دے گئی تازہ جراحت تری پیماں شکنی
یک بیک جیسے کسی زخم کا ٹانکا ٹوٹا

نیر کی شاعری میں اخلاقیات کے درس بھی اکثر نظر آ جاتے ہیں ؎
زندگی راحت طلب ہے غم سکوں ناآشنا
اے حوادث کے شناور غم کی طغیانی سے ڈر
عشق کا سوز دروں ہے علم و عرفاں کی دلیل
جو خودی سے ہو گریزاں اس جہاں بانی سے ڈر

بجھا دے جن کی آوارہ مزاجی شمع روشن کو
ہم ایسے عشق کے ماروں کو پروانہ نہیں کہتے

ان کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کی بھرمار ہے ؎
ہم وقت کے ہاتھوں میں دیکھا آئینۂ روز و شب نیر
لیلائے مقدر کے گیسو ہر وقت سنوارا کرتے ہیں

ان کے اشعار میں کہیں کہیں معرفت کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے ؎
دو لکیروں سے غلط رنج دل دیوانہ تھا
اک خط لوح جبیں تھا اک خط پیمانہ تھا
ارتقائے معرفت پر ختم سب افسانہ تھا
شمع کے سائے میں نیر کشتۂ پروانہ تھا

نیر کے یہاں تغزل اپنی پوری شکل میں موجود ہے ان کو عشق کے ناز و پیچیدہ فلسفے سے کافی دلچسپی ہے جو ان کے اشعار کی خوبیوں کو دو بالا کر دیتی ہے۔ نیر نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں جیسے زلزلۂ عظیم بہار ۱۹۳۴ء رقاصہ۔ نیا موڑ۔ کل اور آج۔ عالمی ایکتا اور قومی یکجہتی وغیرہ۔

——— (ڈاکٹر) خلیل اللہ خاں

نام کتاب: "عکس دل" (شعری مجموعہ)
شاعر: حسینی کرہانی قیمت: ۵۰/ روپئے
ملنے کے پتے: (۱) سی ۱۹۰۔ آرام باغ کوارٹرز۔ چترگپت روڈ۔ نئی دہلی
(۲) دانش محل امین آباد لکھنؤ

حسینی کرہانی مشہور ناول نگار علی عباس حسینی کے پوتے اور ممتاز شاعر شمیم کرہانی کے بھتیجے ہیں۔ گویا ادبی و شعری ذوق انھیں وراثت میں ملا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "عکس دل" میں ۸۵ غزلیں، ۱۰ نظمیں اور چند قطعات شامل ہیں۔ حسینی صاحب نے نظم، غزل اور قطعات کے علاوہ قصائد، نوحے اور سلام بھی کہے ہیں۔ نوحوں اور سلام کا ایک مجموعہ "عزائے حسینی" کے نام سے پہلے ہی منظر عام پر آ چکا ہے۔

حسینی کی غزلوں میں فکر کی بلندی اور فن کی پختگی کے ساتھ تجربات و مشاہدات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلام میں جدید و قدیم اقدار کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں:۔

"حسینی محبت اور خلوص کے شاعر ہیں، مگر وہ غم جہاں کی تلخیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔"

وطن سے محبت کا جذبہ، شہروں کے مقابلے گاؤں کی اہمیت کا احساس، اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ، غریبی پر فخر، اسلاف کی یادوں کو برقرار رکھنے کا حوصلہ ان کی شاعری کا خاصہ ہے ؎

انگلیاں تھام کے غیروں کی چلوگے کب تک
زندگی آپ ہی بنتی ہے سہاروں سے نہیں

"عکس دل" کی نظموں میں بہادر شاہ ظفر، فراق گورکھپوری، شمیم کرہانی مرحوم اور "مرثیۂ اختتام" بے حد متاثر کرتی ہیں۔ زبان رواں اور انداز بیان دلکش ہے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں "عکس دل" کی پذیرائی ہوگی۔

——— مخمور کاکوروی

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۷ نمبر ۸

نومبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

ٹیلیفون: ـــــ ۲۴۵۰۶۶

معاونین:

- نجیب انصاری
- محمد الیاس خان

ٹیلیفون ـــــ ۲۴۶۱۰۸

پبلشر

انل سروپ

(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ

یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: ـــــ تین روپے

چندہ سالانہ: ـــــ تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس ۱۴۶ لکھنؤ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

سماج کے ہر طبقے کے افراد اور ملک کی سرحدوں کے پاسبان، غرضکہ ہر شخص کسان کی محنت پر ہی اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ ہندستان کی تقریباً ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے اور کھیتی سے براہ راست وابستہ ہے پھر بھی ان بے چارے کسانوں کو سماج میں ایک طویل عرصے تک بے وقعت رکھا گیا۔

وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ کا عقیدہ ہے کہ کسان ہی ملک کے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ کسان ہی ہمارے دیہات کی بنیاد ہے اور دیہات پر پورا ملک منحصر ہے۔ اگر کسان کی ترقی نہیں ہو رہی ہے تو دیہات کی ترقی ناممکن ہے اور دیہات کی ترقی کے بغیر ملک کی ترقی ہو ہی نہیں سکتی — ہندستان بنیادی طور پر زرعی ملک ہے لہٰذا دیہات جاگے گا تو ملک جاگے گا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت نے ترجیحی بنیاد پر گاؤں، غریب کسان، کی بہبود کے لیے کئی اہم قدم اٹھائے ہیں۔

موجودہ حکومت نے ریاست کے کسانوں کو "کسان بہی" مہیا کرانے کا تاریخ ساز قدم اُٹھایا ہے۔ یہ قدم کسانوں کی عملی مشکلات اور ان کے مسائل حل کرنے کے مقصد سے اٹھایا گیا ہے۔ حکومت کا یہ اقدام انتظامیہ کو چاق و چوبند بنانے اور بدعنوانی کو ختم کرنے کی سمت میں ایک مثبت قدم ہے۔ وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ انتظامیہ کو عوام کے تئیں ذمہ دار بنانے اور "نئی سرکار جنتا کے دوار" کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں پورے طور سے منہمک ہیں۔ کسان سیوا کیندر، ضلع پنچایت بندھو اور اب کسان بہی، اسی فکر و نظر کے نتائج ہیں۔ □

اسی نومبر کے مہینے میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اس عالم آب و گل میں آئے۔ انھوں نے ہم سب کو امن و اتحاد اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ لہٰذا ہم سب کو چاہیے کہ ہم متحد ہو کر اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے مل جل کر کام کریں۔ مولانا موصوف کو ہمارا یہی سچا خراجِ عقیدت ہوگا۔

ایڈیٹر

گیان چند
۹/۴۵ - اندرا نگر، لکھنؤ

مالک رام صاحب کا تذکرۂ ماہ و سال

عرشی ملسیانی نے اپنے مضمون "نگارشاتِ مالک رام" میں پہلی بار اس کتاب کے وجود کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا:

"ہر ایک شخص کے مقام و تاریخ ولادت، مقام و تاریخ وفات، مدفن وغیرہ کی نشان دہی کی گئی ہے اس میں کوئی تین ہزار اشخاص کا تذکرہ ہے۔"

ارمغانِ مالک۔ جلد اول (دہلی ۱۹۷۱ء) ص۵۱

جی ڈی چندن نے اس کتاب کے تعارف میں اطلاع دی ہے کہ اس میں تقریباً ۳۴۰۰ دانش وروں اور ادیبوں کی تاریخ وفات و ولادت میسّر ہے۔ (کتاب نما. فروری ۱۹۹۲ء ص۱۰) گویا ۲۱ سال کے عرصے میں تقریباً چار سو شخصیتوں کا اضافہ ہوا۔ صحیح تعداد کون جان سکتا ہے کیونکہ اس میں مکرّر اندراجات بہت کثرت سے ہیں. مالک رام صاحب نے ذاتی استعمال کے لیے وفیات کو کارڈوں پر درج کر لیا تھا. کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں،

"گزشتہ تین چار برس میں کئی دوستوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان کارڈوں کو شائع کردوں۔ چونکہ یہ بہت پراگندہ حالت میں تھے اور مجھے اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ ان کی اشاعت عام طور پر مفید ہو سکتی ہے یا کسی کو ان سے دلچسپی ہوگی میں ان احباب کا حکم ماننے سے گریز کرتا رہا. پارسال بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ اگر تم خود انھیں نہیں چھاپنا چاہتے تو یہ کارڈ ہمارے پاس بھیج دو. ہم انھیں مرتب کر کے شائع کردیں گے۔ میری رائے اب بھی یہی تھی۔ میں اب بھی انھیں عام قاری کی ضرورت نہیں خیال کرتا لیکن احباب کے اصرار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔"

(ص۸)

تاریخ ولادت و وفات معلوم کرنا کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ قارئین میں کتنے اپنے والدین کی تاریخ ولادت اور اپنے والدین کے والدین کی تاریخ وفات جانتے ہیں؟ اگر نہیں جانتے تو اسے کیونکر معلوم کر سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ ادیبوں کے سنین سے متعلق اختلافی بیانات ملتے ہیں، ان میں کس کو صحیح ٹھہرایا جائے حد یہ ہے کہ کسی شخص نے اپنی جو تاریخ ولادت لکھی ہو وہ بھی لازماً صحیح نہیں ہوتی. غالب اور اقبال کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اگلے وقتوں میں یہ رواج تھا کہ اسکول میں داخلہ لیتے وقت عمر کم لکھا دی جاتی تھی تاکہ بعد میں ملازمت میں اس کا فائدہ اٹھایا جا سکے. یہی تاریخ قانونی اور سرکاری تاریخ بن جاتی ہے۔ ہمارے اکثر معاصرین دورانِ ملازمت اسی اختیار کردہ تاریخ کو اپنی صحیح تاریخ ولادت ظاہر کرتے ہیں۔ سچ بولنے میں اندیشہ ہوتا ہے کہ ملازمت سے جلد سبک دوش نہ کر دیے جائیں۔ میری سرکاری تاریخ بھی کئی سال کم لکھی ہے لیکن میں عواقب کی پروا نہ کرتے ہوئے ادبی تحریروں میں ہمیشہ اپنی اصلی تاریخ لکھتا رہا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے مجھے بتایا کہ انھوں نے مختلف موقعوں پر اپنی ولادت کی تین تاریخیں لکھی ہیں۔

مجھے بارہا ڈاکٹر محمد عقیل اور ڈاکٹر اسحر حیدری نے خط لکھ کر بعض

معاصرین کی تاریخ وفات دریافت کی۔ میں بعض صورتوں میں بتا پایا بیشتر میں نہیں۔ اب کہاں تک 'ہماری زبان' کے اوراق الٹتا۔ قدما کا سنہ وفات اور بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اکثر صورتوں میں ان کی تاریخ ولادت قیاساً اخذ کی جاتی ہے۔ تاریخ درج کرنے کے ساتھ ساتھ طولانی دلائل دینے پڑتے ہیں۔ اسی لیے کسی نے ادیبوں کے سنہ ولادت و وفات کا اشاریہ مرتب کرنے کی ہمت نہیں کی۔ مالک رام صاحب نے ذاتی استعمال کے لیے تذکرہ بنایا تھا، ممکنہ اغلاط کے اندیشے سے اسے منظرعام پر نہیں لائے تھے۔ اب ان کی صحت کا یہ عالم ہے کہ دیگر امراض کے علاوہ ان کی بینائی اتنی کمزور ہے کہ آتشی شیشے کی مدد ہی سے بہ وقت کچھ پڑھ سکتے ہیں۔ ایسے میں اس کتاب کی درستی ممکن نہ تھی۔ جو کچھ موجود تھا اسے شائع کردیا اور تشنگان تحقیق کو مستفید کیا۔ اس میں انھوں نے تاریخ ولادت و وفات، مرض الموت اور مدفن میں سے جو کچھ معلوم ہوسکا، درج کردیا ہے۔ اس پر جم کر گہری تحقیق نہیں کی۔ اگر ایسا کرتے تو یہ کتاب تیار ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ اب اس میں جو غلطیاں راہ پاگئی ہیں ان کی ذمہ داری محض مرتب کی نہیں بلکہ ان مشتاقوں کی بھی ہے جنھوں نے اصرار کرکے مرتب کو شائع کرنے پر مجبور کیا۔ شاذ مرتب نے کچھ اور معلومات بھی فراہم کردی ہیں مثلاً والیان ملک کے جلوس کی تاریخ، بعض لوگوں کی تبدیلی مذہب کا سنہ۔ بعض شعرا کے استاد کی نشان دہی وغیرہ۔ ان سے کتاب کی افادیت گراں تر ہوگئی ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ گوناگوں تسامحات کے باوجود، اس کتاب میں تحقیقی معلومات کا جو خزانہ ہے وہ کم کتابوں میں ملے گا۔ مصنف کی کبر سنی اور بینائی کے زوال کو دیکھتے ہوئے کتاب کی فروگزاشتوں پر انھیں معذور رکھنا ہوگا۔

تذکرے میں وہ اردو کے ادیبوں تک محدود نہیں رہے بادیان دین اور والیان ملک کو بھی شامل کرلیا ہے۔ مثلاً دہلی کے تمام مغل حکمراں، حیدرآباد کے جملہ نظام، تمام سالار جنگ، اودھ اور رامپور کے بیشتر فرماں روا وغیرہ بھی۔ ایسے مشاہیر کو لے لیا ہے جن کا تعلق دور دور تک اردو سے نہیں۔ مثلاً لن یوتانگ، مہاتما رام کرشن پرم ہنس، راجا رام موہن رائے، سورداس، تلسی داس، ایشور چند ودیا ساگر، رسولن بائی، کے۔ ایل۔ سہگل، سہراب مودی، امرتا شیرگل، سر گنگا رام اور ڈاکٹر گوپال سنگھ وغیرہ۔ ان کے شمول سے کتاب کی افادیت بڑھی ہے، خسارہ نہیں ہوا۔

اشاعت کے وقت انھوں نے اسے جامع بنانے کی کوشش میں بیشتر حروف کے اندراجات کے بعد استدراک کے عنوان سے اضافے کیے ہیں۔ تمام حروف مکمل ہوجانے کے بعد ضمیمہ کے عنوان سے پھر متعدد اضافے ہیں۔ مقدمۂ کتاب پر ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کی تاریخ درج ہے۔ ناشر نے تاریخ اشاعت نومبر ۱۹۹۱ء لکھی ہے لیکن ضمیمے میں کئی اندراجات کے لیے ہماری زبان ۲۲ر نومبر ۱۹۹۱ء کا حوالہ ہے۔ ص ۴۲۷ پر صباح الدین عمر کی تاریخ وفات ۲۳ر نومبر ۱۹۹۱ء اور ص ۴۲۴ پر ڈاکٹر حسینی شاہد کی تاریخ وفات ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۱ء درج کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ کتاب جنوری ۹۲ ۱۹ء میں شائع ہوئی۔ مالک رام صاحب نے مجھے یہ کتاب ۱ر فروری ۱۹۹۲ء کو دستخط کرکے روانہ کی۔

ذیل میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ مطالعہ کرنے سے مجھے جو اندازہ ہوا اس کو قلم بند کردیا۔ تصحیح کے لیے کوئی تحقیق نہیں کی بجز اترپردیش اردو اکادمی کی کتاب 'دستاویز' (لکھنؤ ۱۹۸۳ء) سے استفادے کے۔ چوں کہ اس کتاب میں مصنفوں نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اس لیے وہ معتبر ہیں بجز دو قباحتوں کے:

۱۔ بعض مصنفین کی سرکاری تاریخ ولادت اور اصل تاریخ مختلف ہوتی ہیں، انھوں نے سرکاری تاریخ لکھی ہے۔

۲۔ سہو کتابت نے بہت سی تاریخوں کو مسخ کردیا ہے۔ مثلاً ۲ کو ۳ لکھ کر۔

اردو میں متعدد ایسے شعرا ہیں جو اپنے تخلص سے مشہور ہیں لیکن ان کا نام معلوم نہیں۔ ہمارے معاصرین میں نہ صرف شاعروں کے تخلص بلکہ نثر نگاروں کے قلمی نام نے ان کے اصلی نام کو اس طرح محو کردیا ہے کہ اسے دریافت کرنا خاصا تحقیق طلب ہے۔ میں نے کئی رفقا سے پوچھا کہ کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری کا اصل نام کیا ہے؟ کوئی نہ بتا سکا۔ مجھے بھی معلوم نہ تھا۔ مالک رام صاحب نے ہر شخص کا پورا نام درج کردیا ہے۔ قلمی نام کی قبائے گل پہن کر ہر اہل قلم طلسم ہوش ربا کا

باسی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی گل پیرہن چاک کی جاتی ہے تو اندر سے محض پڑوس کا عبداللہ یا محمد عمر برآمد ہوتا ہے۔ چند قابلِ ذکر مثالیں۔

پہلے تخلص یا قلمی نام، بعد میں اصلی نام۔

ابنِ انشا (شیر محمد خاں)۔ ابنِ فرید (ڈاکٹر محمود مصطفےٰ صدیقی) احمق پھپھوندوی (منشی مصطفےٰ خاں)۔ اختر شیرانی (محمد داؤد خاں) آغا حشر کاشمیری (محمد شاہ)۔ آغا خلش کاشمیری (طفیل احمد یا غلام احمد)۔ آدج یعقوبی (سید عبدالسلام)۔ بجنوق (شیخ ولایت علی)۔ بوگس حیدرآبادی (خواجہ نصیر الدین احمد)۔ بیکل اُتساہی (محمد شفیع خاں لودی)۔ پیارے صاحب رشید (سید محمد مصطفےٰ)۔ جمیل مظہری (میر کاظم علی)۔ حرمت الاکرام (سید انصار حسین) حسن نظامی (قاسم علی)۔ حسن نعیم (شاہ سید حسن)۔ رفیعہ سلطانہ (رفیعہ سردار مرزا)۔ رفعت سروش (سید شوکت علی)۔ ملّا رموزی (صدیق ارشاد توحیدی)۔ روشن صدیقی (شاہد عزیز)۔ ساحر لدھیانوی (عبدالحی)۔ سحر عشق آبادی (بھگوان چندر بھٹناگر)۔ صہبا مجددی (ممتاز احمد)۔ شاد عارفی (احمد علی خاں)۔ شعری بھوپالی (محمد اصغر خاں) شمیم جے پوری (فہیم الحسن)۔ فرّان فتحپوری (سید دلدار علی)۔ فلک پیما (عبدالعزیز)۔ فنا نظامی (نثار علی بیگ)۔ فکر تونسوی (رام لال بھاٹیا)۔ قتیل شفائی (اورنگ زیب خاں)۔ کمار پاشی (شنکر دت کمار) شمیم کرہانی (شمس الدین حسین)۔ شوکت تھانوی (محمد عمر)۔ دولھا صاحب عروج (سید خورشید حسن)۔ کیفی اعظمی (سید اطہر حسین رضوی)۔ کیف بھوپالی (محمد ادریس خواجہ)۔ مجروح سلطان پوری (اسرار حسن خاں)۔ مخمور جالندھری (گوربخش سنگھ)۔ مشفق خواجہ (عبدالحی)۔ میناکماری (مہ جبین)۔ نازش پرتاب گڑھی (محمد احمد)۔ ندا فاضلی (مقتدیٰ حسین) نشور واحدی (حفیظ الرحمٰن)۔ ملّا واحدی (سید محمد ارتضیٰ)۔ وسیم خیرآبادی (سید محمد عسکری)۔

اس کتاب سے کئی شخصوں کے شاعر ہونے کا پہلی بار علم ہوتا ہے خواص کو رہا ہوگا، عام قارئین کو نہیں۔ مثلاً

صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی حسرت۔ بہادر یار جنگ خلق۔ پروفیسر سید حسن سرمد۔ حکیم اجمل خاں شیدا۔ سید علی جواد زیدی صابر۔ میناکاری ناز۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ناظر۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ندیم۔

ان میں سے بعض کے بارے میں مجھے علم تھا۔ کئی شعراء کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ پہلے کچھ اور تخلص کرتے تھے۔ مثلاً:

حالی (خستہ)۔ حیرت بدایونی (حسن)۔ جذبی (ملال)۔ دلاور فگار (شباب)۔ رند (وفا)۔ سالک (قربان)۔ سحر عشق آبادی (قمر)۔ مجاز (شہید) محوی صدیقی (رنگین)۔ قیصر زیدی (رضوان)۔

کئی شعراء کے اساتذہ کا انکشاف ہوا مثلاً منوہر سہائے انور حالی کے شاگرد تھے۔ عبدالماجد دریابادی ناظر اکبر الہ آبادی کے، سردار عبدالرب نشتر بھی اکبر الہ آبادی کے اور میناکاری ناز کیفی اعظمی کی شاگرد تھیں۔

دوسری کئی دلچسپ معلومات ملتی ہیں مثلاً جان نثار اختر کا پورا نام سید جان نثار حسین رضوی تھا۔ میں نے اس سے پہلے 'رضوی' کا لاحقہ نہیں سنا تھا۔ ڈاکٹر کشور سلطان کی کتاب "جان نثار اختر حیات و فن" نکال کر دیکھی تو ان کے والد کا نام سید محمد افتخار حسین رضوی مضطر پایا۔ (صـ۳۲)

یہ بھی معلوم ہوا کہ پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری۔ شیخ عبداللہ بانی گرلس اسکول علی گڑھ اور عبیداللہ سندھی نومسلم تھے۔ ان میں سے آخر الذکر کا معاملہ سب سے زیادہ حیران کن ہے۔ دوسری دلچسپ معلومات یہ ہیں:۔

عبدالرحمٰن بجنوری ۴۲ سال۔ دیاشنکر نسیم ۳۴ سال، میراجی ۳۷ سال اور عظمت اللہ خاں محض ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ خواجہ حسن نظامی شمس العلماء تھے۔ میرے لڑکپن میں ایک مصنف اپنا نام شبلی بی۔کام لکھتے تھے۔ بعد میں وہ شبلی ایم کام ہو گئے۔ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کو میں سمجھتا تھا کہ وہ مرادآباد کے مشہور محلہ "گنج" کے باشندے ہوں گے۔ کتاب سے معلوم ہوا کہ "گنج مرادآباد" ضلع اناؤ میں ہے۔

ناموں کے اندراجات الف بائی ترتیب سے ہیں۔ لیکن ایک حرف کی فصل میں بعض اوقات کچھ اندراجات لغوی ترتیب کے برخلاف

آجاتے ہیں۔ مثلاً ص۸۱ پر تبسمل تخلص کے ناموں کے بیچ میں بشیر احمد ڈار داخل ہوگیا ہے۔ ص۸۴ پر برجیس امروہوی اور برجیس لکھنوی کے بیچ میں بالیؔ اور باقرؔ آگئے ہیں۔ ص۱۸۵ پر چار سالار جنگوں کے بیچ میں سالک کان پوری آدھمکے ہیں۔ ص۳۶۱-۳۶۲ پر م کی ردیف میں دوسرے حرف کی (م ک) کے بعد پھر سے ح۔ ف۔ ق (یعنی م ح، م ف م ق) کے نام آجاتے ہیں۔

بعض اشخاص کا اندراج ان کے کم معروف لقب یا تخلص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ سب سے اہم اور مشہور عام جزو کو سبقت دی جاتی۔ خواہ وہ تخلص ہو یا نہ ہو۔ بعض مثالیں:

ص۴۴ بادشہ لکھنوی: نصیر الدین حیدر شاہ اودھ۔

ص۶۷ بحر محبوب: راجا محمد امیر احمد خاں والیٔ محمود آباد

ص۲۸۹ غلام نصیر الدین مولانا عرف میاں کالے۔ غالبؔ ان کے مکان میں رہے ہیں۔ کوئی نصیر الدین حیدر، راجا محمود آباد یا میاں کالے کو تذکرے میں تلاش کرے گا تو ان کے معروف نام سے نہ کہ بادشہ، بحر یا غلام نصیر الدین سے۔

بعض مقامات پر سہو کتابت سے بعض اغلاط راہ پاگئی ہیں۔ دوسری کتابوں میں سہو کتابت سے اتنا فرق نہیں پڑتا تھا جتنا اعداد پر مرکوز رہنے والی اس کتاب میں۔ چند مثالیں:

ص۲۸ ہری چند اختر کی وفات یکم جنوری ۱۸۵۸ء لکھی ہے، جبکہ ۱۹۵۸ء ہونا چاہیے۔

ص۶۳ آبرو کی تاریخ ولادت ۱۰۹۵ھ (۱۸۶۴ء) لکھی ہے۔ ہجری سنہ کے متوازی عیسوی سنہ ۱۶۸۴ء چاہیے۔

ص۹۳ بشیر منذر۔ صحیح بشیر منذز

ص۱۲۹ پرویز شاہدی کی ولادت ۳۱ ستمبر ۱۹۱۰ء درج ہے۔ جبکہ ستمبر ۳۱ دن کا نہیں ہوتا۔ صحیح ۳۰ ستمبر

ص۱۴۰ تفتہ وفات ۲ ستمبر ۱۸۶۹ء (۱۵ رمضان ۱۹۲۶ء)۔ ۱۹۲۶ء کے بجائے ۱۲۹۶ھ چاہیے۔

ص۱۴۹ خیر بہوروی کے سلسلے میں دو جگہ ضلع بلیا کا ذکر ہے اور دونوں جگہ کاتب نے بلیا کی ی پر تشدید بنائی ہے۔ صحیح بدون تشدید۔

ص۱۹۳ سروجنی نیدڈو۔ صحیح نائیڈو۔ نیڈو آغا حیدر حسن کی زبان ہے۔

ص۳۱۱ پر صفو کا نمبر ۲۳۱ درج ہے۔ ص۳۳۲ پر نمبر ۲۳۲ درج ہے

ص۲۸۳ علیم حیدر آبادی کی عرفیت 'عوثو پاشا' لکھی ہے۔ غوثو پاشا ہونا چاہیے۔

ص۳۵۴ مسعود سعد سلمان لاہوری کی ولادت اور وفات کے بجائے دونوں جگہ وفات عنوان دیا ہے۔ پہلی جگہ ولادت چاہیے۔

ص۳۲۷ لطیف حسین 'اریب'۔ تخلص 'ادیب' چاہیے

ص۴۲۱ احمد لاری کے بجائے 'احمر لاری' چاہیے۔

مالک رام صاحب کا مرغوب طرز املا ایک نام کے آزاد اجزا کو بھی ملا کر لکھنا ہے اور یہ کہیں کہیں نظر آتا ہے مثلاً ص۱۹۱ بیصبر۔ ص۳۸۲ پہلا کالم فراشخانہ۔ دوسرا کالم رامپور۔ ص۲۸۲ کالم ۲ جینپور۔ ترقی اردو بیورو کے املا نامہ میں ایسے اجزا کو منفصل لکھنے کی ہدایت ہے۔ بہتر ہو کہ اب مالک رام صاحب بھی اسے قبول کرلیں۔ آخر وہ اپنا نام تو مالکرام نہیں لکھتے۔

یہ اچھا کیا ہے کہ انھوں نے اکثر اندراجات کا ماخذ درج کردیا ہے لیکن بعض صورتوں میں ماخذ کے مصنف کی صحیح شناخت نہیں ہوپاتی۔ مثلاً:

کشکول (۱)۔ تذکرۂ کلیم۔ تذکرۂ غیر مسلم شعرائے سیتاپور۔ اوراقِ گل۔ خوں بہا۔ دبستان امیر مینائی۔ تلامذۂ مصحفی۔ بیاضِ قادری۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ وفیاتِ اعیانِ پاکستان۔ تاریخ شاہجہانپور۔

بہتر ہوتا کہ وہ تذکرے کے آخر میں کتابیات کے تحت تمام ماخذوں کے مصنف اور ایڈیشن کی تفصیل دے دیتے۔ تاریخ کے بکثرت مصرعے کسی مسعود کے کہے ہوئے ہیں۔ یہ مسعود کون ہے اور تاریخیں کس کتاب میں درج ہیں، واضح کرنا چاہیے تھا۔

متعدد اشخاص کا اندراج دو دو تین تین مقامات پر ہے۔ سوانحی لغات میں یہ ناگزیر ہے۔ چاہیے کہ نام کے مشہور ترین جزو کے تحت تفصیل دی جائے۔ بقیہ اجزا میں سے جن کا آزاد اندراج ضروری ہو لکھ کر اشارہ کردیا جائے۔ "دیکھیے ....." اگر ایسا اشارہ نہ کیا جائے تو شبہ

ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار ایک شخصیت کو دو علاحدہ شخصیتیں سمجھ بیٹھا ہے۔ مالک رام صاحب نے کہیں کہیں اشارہ کیا ہے۔ بیشتر صورتوں میں نہیں کیا۔ پھر یہ کہ دونوں اندراجات میں احوال یکساں نہیں ہوتا، کچھ کمی بیشی ہوتی ہے مثلاً ایک اندراج میں ولادت کا ذکر ہے وفات کا نہیں، دوسرے میں وفات کا ذکر ہے ولادت کا نہیں۔ یہاں تک بھی کوئی قباحت نہ تھی۔ کافی صورتوں میں یہ ہوا ہے کہ دوسرے اندراجات میں ایک دوسرے سے متضاد اطلاعات دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ضعف بصارت کے سبب مالک رام صاحب تقابل اور ملان نہیں کر سکے۔ ذیل کی مثالوں میں بادی النظر میں دوسرے ماخذ سے جو اختلافات دکھائی دیئے ان پر اپنے مشاہدات درج کرتا ہوں۔ لازمی نہیں کہ دوسروں کے بیانات ہر جگہ درست تر مانے جائیں۔

ص۱۱ ابراہیم جلیس کی ولادت کا مقام بنگلور ۱۱ر اگست ۱۹۲۴ء دیا ہے۔ سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے عزیز احمد نے اپنے ایم فل کے مقالے میں لکھا ہے:

"ابراہیم جلیس کی ولادت ۲۲ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو گلبرگہ میں ہوئی" (رسالہ شگوفہ حیدرآباد نومبر ۱۹۹۱ء ص۴۸)

ص۱۸ کالم ۲ میں متواتر ڈو احسن لکھنوی، سید مہدی حسن درج ہیں پہلے کو نبیرۂ مرزا شوق لکھا ہے، دوسرے کو ڈرامہ نویس۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب مرتب انھیں دو علاحدہ اشخاص سمجھتے ہیں، حالاں کہ دونوں بالیقین ایک ہیں۔ نبیرۂ شوق ہی ڈرامہ نویس تھے۔ پہلے کی تاریخ وفات ۳۱ر اگست ۱۹۳۹ء (۱۵ر رجب ۱۳۵۸ھ) لکھی ہے۔ ماخذ نہیں دیا۔ دوسرے کی تاریخ ۱۹۴۰ء دی ہے۔ حوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند ۹: ص۴۳۳ واقعی اس حوالہ میں ۱۹۴۰ء ہی ہے لیکن صحیح ۳۱ر اگست ۱۹۳۹ء ہے جو مسعود حسن رضوی صاحب نے احسن مرحوم کی قبر کے کتبے سے نقل کی۔ مجھے نیر مسعود نے یادداشت ادیب سے نقل کر کے بھیجی۔

ص۱۹۔ احمد جمال پاشا کی تاریخ ولادت یکم جون ۱۹۳۲ء لکھی ہے دستاویز میں انھوں نے اپنی خود نوشت میں یکم جون ۱۹۳۶ء لکھی ہے معلوم ہوتا ہے کہیں کاتب نے ۲ اور ۶ میں التباس کیا ہے۔

ص۲۲ حکیم احمد شجاع کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۳۱۴ھ (۱۲ر جولائی ۱۸۹۶ء) درج ہے۔ ماخذ 'خوں بہا' اور 'تذکرۂ معاصرین'۔ مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد سے ڈاکٹر اے بی اشرف نے حکیم احمد شجاع (کتابیات) چھاپی۔ اس میں تاریخ پیدائش ۷ر اکتوبر ۱۸۹۳ء درج ہے۔ توقع ہے کہ مقتدرہ کے لیے مرتب نے تحقیق کر کے تاریخ لکھی ہوگی۔

ص۴۱ پر شیر علی افسوس کی تاریخ ولادت ۱۷۳۲ء (۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹ھ) دی ہے۔ ہجری سنہ صحیح ہے اس کے مطابق عیسوی سنہ ۱۷۴۵۔۴۶ء ہونا چاہیے۔

ص۵۸ اوج یعقوبی کی وفات کی تاریخ ۱۴ر اگست دی ہے۔ سنہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ وہ حیدرآباد میں میری ایک شاگرد کے والد تھے حکومت آندھرا پردیش نے کچھ عرصہ کے لیے انھیں اردو کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔ دو بیویوں سے ان کی ۲۴ اولادیں ہیں

ص۶۰ پر امجد علی اشہری کا مختصر اندراج استدراک کے تحت دیا ہے حالانکہ متن میں ص۳۹ پر پہلے ہی زیادہ تفصیل سے آچکا تھا۔ اسی طرح انجم اعظمی کا ذکر ص۵۲ پر تفصیل سے ہے۔ ص۶۲ پر ایک دوسرے ماخذ سے لے کر استدراک میں نسبتاً اختصار سے دیا۔

ص۸۶ بوگس حیدرآبادی کی وفات ۹ر/۱۰ر مئی ۱۹۹۱ء بعمر ۷۴ برس۔ تاریخ ولادت نہیں دی۔ دستاویز میں انھوں نے اپنی تاریخ ولادت ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۰ء لکھی ہے جس کے معنی ہیں کہ موت کے وقت ان کی عمر ½ ۵۰ سال تھی۔

ص۸۷۔ خواجہ احسن اللہ خاں بیان "صحیح نام خواجہ احسن الدین ہے جیسا کہ ان کے حیدرآبادی شاگرد ہمدم نے لکھا ہے۔
(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو جلد ۲ حصہ ۱ ص۶۴۴)

ص۲۵ پر جاں نثار اختر کا ذکر اختر کے تحت ہے۔ ص۱۱۴ پر جاں نثار اختر کے تحت۔ بہتر ہوتا دوسرے مقام پر صرف یہ لکھ دیا جاتا: "دیکھئے اختر جاں نثار"

ص۹۷ پر غلام ربانی تاباں کی تاریخ ولادت ۱۴ر فروری ۱۹۱۴ء لکھی ہے اور مولد پتورہ ضلع فرخ آباد ہے۔ جب کہ دستاویز میں انھوں نے تاریخ ۱۵ر فروری ۱۹۱۴ء اور مولد قائم گنج ضلع فرخ آباد دیا ہے۔

ص۱۲۹ پر حسرت بھیکم پوری، حبیب الرحمٰن شروانی صدر یار جنگ کی تاریخ ولادت ۱۲۸۵ھ لکھی ہے۔ ص۲۳۹ پر صدر یار جنگ کے تحت ۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ (۵ جنوری ۱۸۶۷ء) دی ہے ص۱۲۹ پر تاریخ وفات جمعہ ۱۱ اگست ۱۹۵۱ء (۸ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ) درج ہے جبکہ ص۲۳۹ پر جمعہ صبح ۶ بجے ۲۶ شوال ۱۳۶۹ھ (۱۱ اگست ۱۹۵۰ء) دی ہے۔ یہاں مدفن بھموری ضلع علی گڑھ میں دکھایا ہے۔ زیادہ تفصیلات کے سبب ص۲۳۹ کی تاریخیں صحیح تر معلوم ہوتی ہیں۔

ص۱۳۵ پر "حفیظ۔ سید محمد" کا ذکر ہے جس میں تاریخ ولادت و وفات دونوں درج ہیں اور حوالہ ہے ہماری زبان ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کا۔ لیکن ہماری زبان کے اس شمارے میں محض تاریخ وفات دی ہے، تاریخ ولادت نہیں جس کے معنی ہیں کہ ماخذ کوئی اور بھی ہے۔ ص۲۴۱ پر "محمد حفیظ سید" کا اندراج کر کے محض تاریخ وفات دی ہے۔ مقام وفات سیتاپور درج ہے یہاں ماخذ کا حوالہ نہیں۔ دونوں اندراجات صحیح ہو سکتے ہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ یہ میرے استاد ڈاکٹر محمد حفیظ سید ہیں۔ اندراج میں اس کی صراحت ڈاکٹر یا پروفیسر لکھ کر دینی چاہیے تھی۔

ص۱۳۹ پر حیات اللہ انصاری کے نام کے آگے لکھا ہے "میزبان۔ صحافی و سیاستداں"۔ معلوم نہیں، میزبان، کس لفظ کی تخریب ہے۔

ص۱۴۳۔ بدیع الزماں خاور وفات ۲۷ ستمبر ۱۹۹۰ء بعمر ۵۰ برس۔ حوالہ ہے ہماری زبان ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۰ء کا۔ ہماری زبان کے اس شمارے میں عمر تقریباً پچاس برس، لکھی ہے۔ 'تقریباً پچاس' کو قطعی طور پر ۵۰ برس نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں اپنی عمر قریب بہشتاد لکھی ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھ دیا کہ مصحفی نے اپنی عمر ۸۰ سال بتائی ہے۔ اس پر قاضی عبدالودود نے چٹکی لی۔

"ظاہرا ہشتاد اور قریب بہشتاد میں ان کے نزدیک
کچھ فرق نہیں۔" (معاصر ۵ ص۹۲)

مالک رام صاحب کو ایسا موقع نہیں دینا چاہیے۔ انھوں نے تذکرے میں تاریخ ولادت نہیں دی۔ دستاویز کے مطابق خاور ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ اس طرح وفات کے وقت ان کی عمر ۵۲ سال تھی جسے تقریباً ۵۰ سال کہا جا سکتا ہے، ۵۰ نہیں۔

ص۱۴۵ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا سن ولادت ۱۹۲۵ء دیا ہے میرا خیال ہے کہ اس سے قدیم تر ہونا چاہیے۔

ص۱۴۱ پر آغا خلش کا نام طفیل احمد کاشمیری دیا ہے۔ ص۱۴۲ پر ان کا اندراج خلش کاشمیری (آغا) کے تحت ہے جہاں ان کا نام غلام احمد بٹ دیا ہے۔ دونوں جگہ کافی تفصیلات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی شخص کا ذکر ہے پھر نام میں اختلاف کیوں جبکہ دونوں بیانات کا ماخذ تذکرۂ معاصرین جلد اول ہے۔

ص۱۵۸ ذوق کی تاریخ ولادت دیوان ذوق مرتبہ آزاد کے حوالے سے ۱۷ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ دی ہے۔ عابد پشاوری نے آزاد کے والد کے اخبار کے حوالے سے ۱۲۰۳ھ کو صحیح قرار دیا ہے۔

(عابد: ذوق اور محمد حسین آزاد ص۲۵)

ص۱۶۷ روشن صدیقی کی وفات پہلے شاہجہاں پور میں دکھائی ہے چند سطروں کے بعد اسی اندراج میں وفات درگاہ شاہ ولایت میرٹھ میں ظاہر کی ہے۔ ممکن ہے یہ کسی دوسرے شخص کا اندراج ہو جس کا نام درج ہونے سے چھوٹ گیا ہو۔ فی الحال اس کا ماخذ تذکرۂ معاصرین جلد اول پیش نظر نہیں۔

ص۱۸۷ پر کسی ڈاکٹر سید سجاد حسین (الہ آباد یونیورسٹی) کا ذکر ہے جو ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے الہ آباد میں ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔ میں الہ آباد یونیورسٹی کے کسی ڈاکٹر سید سجاد حسین سے واقف نہیں حیدر آباد کے ڈاکٹر سجاد ۱۹۴۵ء کے قریب انتقال کر گئے تھے۔

میجر سید حسن بلگرامی کی وفات ص۱۳۲ پر ۳۱ مئی ۱۹۱۵ء کو اور ص۲۰۴ پر شب ۳۰ مئی ۱۹۱۵ء لکھی ہے۔ ممکن ہے ان کا انتقال ۳۰ اور ۳۱ مئی کی درمیانی شب کو ہوا ہو جس کی وجہ سے کسی نے ان کی تاریخ ۳۰ مئی اور کسی دوسرے نے ۳۱ مئی لکھ دی ہو۔

حسن نعیم کا ذکر ص۱۳۲ اور ص۲۰۴ پر ہے۔ دونوں اطلاعات میں چند الفاظ کا فرق ہے۔

ص۲۰۴ پر پروفیسر سید حسن کا سنہ ولادت ۱۹۰۸ء لکھا ہے۔ دستاویز میں سید حسن نے لکھا ہے کہ ولادت میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق جولائی ۱۹۱۱ء ہے۔ مشروط اندراج سے لگتا ہے کہ ۱۹۱۱ء صحیح تاریخ نہیں

۱۹۰۸ء ہی اصل تاریخ ہے

شاہ میراں جی شمس العشاق کا ذکر تین جگہ ہے۔ ص ۲۱۵ پر شاہ میراں جی بیجاپوری لکھ کر ان کا سنہ وفات ۹۰۲ھ دیا ہے۔ ان کی شناخت کے لیئے مصنف مرغوب القلوب لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان سے مرغوب القلوب نہیں، شرح مرغوب القلوب منسوب کی جاتی ہے۔ بعض نسخوں میں اس رسالے کا نام ترجمۂ مرغوب القلوب دیا ہے یہ میراں جی شمس العشاق کی نہیں، میراں جی خدا نما کی تالیف ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر حفیظ قتیل کی کتاب "میراں جی خدا نما" ص ۸۵-۸۴

ص ۲۲۴ پر شمس العشاق شاہ میراں کے تحت محض وفات کا ذکر ہے لیکن ۹۰۲ھ کے سامنے محض ایک سنہ عیسوی ۱۴۹۶ء دیا ہے جبکہ ۹۰۲ھ کا بہت بڑا حصہ، ۱۴۹۷ء کے مطابق ہے۔ ان کا تیسرا ذکر ص ۲۷۳ پر، میراں جی شمس العشاق کے تحت ہے۔ اب کی بار ڈاکٹر حسینی شاہد کی کتاب شاہ امین الدین علی اعلیٰ سے اخذ کر کے ان کی ولادت تقریباً ۸۸۷ھ، ورود ہند تقریباً ۹۲۲ھ اور وفات ۹۸۱ھ میں لکھی ہے۔ میری رائے میں شمس العشاق ۹۰۲ھ میں پیدا اور ۹۹۴ھ میں فوت ہوئے۔ قدما کی ولادت ووفات کی تاریخوں کا تعین کتنا نزاعی مسئلہ ہے۔ وہ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ داد دینی چاہیئے مالک رام صاحب کی تہوّر کی کہ ایسے اختلافی امور کو کتاب میں ٹانک کر مذاکرے کا ڈر ڈال کر دیا۔

ص ۱۱۲ پر نریش کمار شاد کے انتقال کے سلسلے میں لکھا ہے:

"جمنا میں لاش پائی گئی۔ غالباً خودکشی"۔

وجہ درست ہو سکتی ہے گو ۸ر جون ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں ان کی موت کا سبب عارضۂ قلب لکھا ہے۔

حد یہ ہو گئی کہ ایک زندہ معاصر علی جواد زیدی کے بارے میں بھی اختلافی بیانات ملتے ہیں۔ ص ۱۸۱ پر زیدی، علی جواد کے تحت ان کی تاریخ ولادت ۱۰ر مارچ ۱۹۱۶ء اور ص ۲۳۵ پر ۱۹ر جولائی ۱۹۲۰ء دی ہے۔ پہلی جگہ ان کے استاد کا تخلص جرم محمد آبادی اور دوسری جگہ محترم محمد آبادی لکھا ہے۔ جرم صحیح ہونا چاہیئے کیونکہ تذکرے میں ص ۱۱۱ پر جرم محمد آبادی کے حالات دیئے ہیں، محترم کے کہیں نہیں دیئے۔

ص ۲۲۵ پر شمیم کرہانی کی جائے ولادت پارہ ضلع غازی پور لکھی ہے۔ حال میں مجھے ان کے ایک عزیز ملے جن کے مطابق شمیم کرہانی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔

ص ۲۲۸ پر ضیاء الدین احمد برنی کی ولادت ۱۸۹۰ء میں اور وفات ۵ر مئی ۱۹۰۹ء لکھی ہے۔ سنہ وفات صریحاً غلط ہے۔ حوالہ ہے مشاہیر کے خطوط ص ۱۳۹ کا۔ یہ مجموعہ عبداللطیف اعظمی کی تالیف ہے اس کے ص ۱۳۹ پر برنی کا سنہ وفات ۳ر مئی (۵ر مئی نہیں) ۱۹۶۹ء دیا ہے۔ مالک رام صاحب نے ان کا مدفن پاپوش نگر کراچی لکھا ہے یہ مشاہیر کے خطوط میں درج نہیں ہے جس کے معنی ہیں کہ مالک رام صاحب نے کہیں اور سے لیا ہے۔

فلک پیما کا ذکر دو جگہ ص ۲۶۴ پر عبدالعزیز میاں عرف فلک پیما کے تحت اور ص ۳۰ پر فلک پیما کے ذیل میں ہے۔ دونوں میں کوئی بڑا اختلاف نہیں۔ ص ۳۰ پر ان کی تاریخ وفات ۷ر مئی ۱۹۵۱ء (بعمر ۷۲ سال) لکھی ہے۔ حوالہ نقوش لاہور نمبر ص ۹۳۸۔ واقعی نقوش میں عمر ۷۲ سال لکھی ہے لیکن اس کی صحت میں کلام ہے کیونکہ خود مالک رام صاحب نے ص ۲۶۴ پر ولادت اور وفات دونوں کی تاریخیں دی ہیں جن سے ان کی عمر سوا ستر سال نکلتی ہے۔

ص ۲۷۔ عرشی صاحب کی تاریخ وفات ۲۱ر فروری ۱۹۸۱ء دی ہے لیکن ان کے بیٹے ڈاکٹر ممتاز عرشی نے لکھا ہے:

"ابّا کا انتقال ۲۴ر فروری ۱۹۸۱ء کی رات کو دو اور ڈھائی بجے کے درمیان ہوا"۔

(غالب نامہ۔ عرشی نمبر شمارہ (۱) ۱۹۹۲ء ص ۲۵۱)

دوسری طرف عرشی صاحب کی بیٹی ڈاکٹر زہرہ عرشی اسی رسالے میں لکھتی ہیں:

"۲۳ر فروری ۱۹۸۱ء کی صبح روانہ ہوئی اور ۲۵ فروری کو صبح ۴ بجے جب یہ اطلاع ملی کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔۔۔ علی گڑھ سے رام پور کا سفر کیسے طے کیا، مجھے نہیں معلوم"۔

(ایضاً ص ۲۶۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتقال کی صحیح تاریخ ۲۵ر فروری کی اولیں ساعت ہے۔

منشی فدا علی عیشؔ لکھنوی کا ذکر پہلے صـ۲۸۲ پر اور پھر اس سے اگلے صفحے ۲۸۴ پر ہے جس سے لگتا ہے جیسے یہ دو علاحدہ اشخاص ہیں دوسرے اندراج میں تفصیلات زیادہ ہیں۔

صـ۲۸۳۔ طالب علی خاں عیشیؔ لکھنوی کا حال یکے بعد دیگرے صـ۲۸۳ کالم ۲ میں دو بار ہے۔ پہلے کا ماخذ رسالہ دانش ہے دوسرے کا خوش معرکۂ زیبا۔ پہلے میں سنہ وفات ناسخ کے مصرع تاریخ سے ۱۲۴۰ھ نکالا ہے جو درست ہے۔ دوسرے بیان میں دوسرے دو مصرعوں سے ۱۱۴۰ھ اور ۱۲۶۸ھ نکالے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مصرعوں سے بھی ۱۲۴۰ھ ہی نکلتا ہے۔

صـ۳۰۲ پر پہلے فیاض احمد (مصنف 'شمیم' و 'انور' ناول) کا ذکر ہے جہاں محض تاریخ وفات دی ہے۔ اس کے ایک اندراج بعد فیاض احمد خاں گوالیاری کا ذکر ہے۔ جس کی محض تاریخ ولادت و جائے ولادت دی ہے میرا خیال ہے کہ یہ دونوں شخص ایک ہی ہیں۔

صـ۱۵۴ پر محمد فاروق دیوانہ گورکھ پوری کی شناخت رشید صاحب کے حاجی بلغ العلیٰ کہہ کر کرائی ہے۔ حوالہ ہے ہماری زبان ۸ ر جون ۱۹۶۹ء کا۔ میں نے یہ پرچہ نکال کر توجہ سے دیکھا لیکن کہیں ذکر نہ ملا۔ پھر ۸ ر جون ۱۹۶۸ء کا پرچہ دیکھا، اس میں انتقال کی خبر مل گئی۔ گو ان کی شناخت میں یہ نہیں لکھا کہ یہ رشید صاحب کے حاجی بلغ العلیٰ تھے۔

دوسرا اندراج صـ۳۴۰ پر فاروق دیوانہ (مجنوں کے والد) کا ہے۔ یہاں ماخذ بیاضِ قادر کا ہے۔ چونکہ دونوں جگہ نام اور تاریخ وفات مشترک ہیں اس لیے یقین ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت ہیں۔

کیفؔ بھوپالی کا ذکر دو جگہ صـ۳۲۰ اور صـ۳۲۱ پر ہے۔ صـ۳۲۰ پر کیف کا نام انعام اللہ خاں لودھی لکھا ہے اور تاریخ ولادت اواخر ۱۹۱۷ء۔ صـ۳۲۱ پر کیف کا نام محمد ادریس خواجہ لکھا ہے۔ ولادت ۱۹۱۲ء اور وفات ۱۹۹۱ء۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے کیف کا نام خواجہ محمد ادریس ہی لکھا ہے لیکن سنہ ولادت ۱۹۲۰ء دیا ہے (اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔ بھوپال ۱۹۶۵ء صـ۲۹۴)

ظاہرا کیفؔ بھوپالی کا نام خواجہ محمد ادریس ہی تھا، انعام اللہ خاں نہیں۔ میں کسی دوسرے کیفؔ بھوپالی سے واقف نہیں۔

صـ۳۲۳ گدّی غیاث الدین کے لیے لکھا ہے "دیکھئے غیاث الدین گدّی" لیکن غیاث الدین کہیں موجود ہی نہیں، نہ غ کی ردیف میں، نہ اس کے بعد استدراک میں، نہ کتاب کے آخر میں ضمیمے میں۔

صـ۳۲۵۔ معلوم نہیں کیوں میری تاریخ ولادت ۲۰ ر ستمبر ۱۹۲۳ء لکھی ہے صحیح ۱۹ ر ستمبر ہے۔ حیرت ہے کہ دستاویز میں ۲۲ ر ستمبر ۱۹۲۳ء چھپی ہے جب کہ میں کئی جگہ ۱۹ ر ستمبر لکھ چکا ہوں۔

صـ۳۲۹ مانیؔ جائسی کا سنہ ولادت ۱۸۸۵ء لکھا ہے۔ یہ اتنی قطعیت سے یقینی نہیں۔ سید صفدر حسین عابدی کی کتاب "مانیؔ جائسی حیات و شاعری (لکھنؤ ۱۹۷۰ء)" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جگہ مانیؔ نے اپنا سنہ ولادت "غالباً ۱۸۸۵ء" لکھا ہے۔ دوسری جگہ ۱۹۰۵ء میں اپنی عمر "کوئی ستّر سال" لکھی ہے یعنی وہ تقریباً ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ (صـ۲۰-۱۹)

گوپال متّل کی ولادت کی تاریخ صـ۳۲۴ پر ۶ ر جون ۱۹۰۷ء اور صـ۳۳۲ پر ۶ ر جون ۱۹۰۹ء دی ہے صـ۳۳۲ کو سہواً صـ۲۳۲ لکھا ہے۔

احمقؔ و مدّاحؔ پھپھوندوی کی تاریخ وفات صـ۲۴ پر ۸ ر اگست ۱۹۵۷ء دی ہے اور مدّاحؔ و احمقؔ پھپھوندوی کے تحت صـ۳۵۱ پر ۱۶ ر اگست ۱۹۵۷ء۔

صـ۳۵۵ پر ڈاکٹر مسیح الزماں کی تاریخ ولادت ۱۸ ر مارچ ۱۹۲۵ء دی ہے، وہ مجھ سے بڑے تھے۔ تقریباً ۲ سال پہلے ایم اے پاس کیا۔ عجیب بات ہے کہ ۱۵ ر فروری ۱۹۷۵ء کے ہماری زبان میں ان کی وفات ۸ ر فروری ۱۹۷۵ء شب کے وقت۔ ان کی عمر محض ۴۸ سال لکھی ہے۔ اس حساب سے وہ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی صحیح تاریخ ولادت ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء ہوگی۔

قلی قطب شاہ ثانی کا ذکر دو جگہ ہے صـ۳۰۸ پر قطب و معانی کے تحت، صـ۳۶۱ پر معانی کے تحت۔ ثانی الذکر میں ولادت ۵ ر رمضان ۹۷۳ھ (۱۴ ر اپریل ۱۵۶۵ء) لکھی ہے۔ حوالہ ہے کلیات محمد قلی قطب شاہ کا (ظاہرا ڈاکٹر زور کی مرتبہ) اس وقت وہ پیش نظر نہیں لیکن ڈاکٹر زور ہی کی 'معانیِ سخن' میں ۱۴ ر اپریل ۱۵۶۶ء لکھی ہے (حیدرآباد ۱۹۵۸ء صـ۱۹)۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ۱۴ ر اپریل ۱۵۶۵ء مطابق ۱۴ ر رمضان ۹۷۳ھ لکھی ہے۔ (کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ دہلی ۱۹۸۵ء صـ۲۴)

سچ یہ ہے کہ یہ ہجری تاریخ ۱۵۶۶ء میں پڑتی ہے۔ ص ۳۰۸ پر جلوس کی تاریخ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) لکھی ہے جب کہ ص ۳۶۱ پر ربیع الثانی ۹۹۸ھ (جون ۱۵۸۰ء)۔ اس عیسوی تاریخ کے ساتھ ۹۸۸ھ پڑتا ہے ۹۹۸ھ نہیں۔

ص ۳۳۲ ' مجاز ردولوی۔ اسرار الحق (فانی بدایونی)" معلوم نہیں اس اندراج میں فانی بدایونی کیوں لکھا ہے۔؟

ص ۳۳۳ مجنوں گورکھپوری کی وفات کی تاریخ ۴ر جون ۱۹۸۸ء ہے اس پر شان الحق حقی نے تاریخ کا شعر کہا۔ حیرت ہے کہ ماخذ سیاست حیدرآباد بابت ۵ر جون ۱۹۸۸ء ہے۔ حقی کا قطعہ 'تاریخ وفات' سے اگلے ہی دن حیدرآباد دکن کے اخبار میں کیونکر چھپ گیا۔؟ ایسا تو نہیں کہ سیاست سے محض تاریخ وفات لی ہو۔ تاریخ کا شعر بعد کے کسی ماخذ سے لیا ہو۔

ص ۳۳۸ پر محمد احسن فاروقی کی تاریخ ولادت ۱۵ر نومبر ۱۹۱۳ء درج ہے۔ 'طلوع افکار' کراچی جنوری ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر احسن فاروقی کا گوشہ چھپا ہے۔ اس میں ص ۱۱ پر 'کوائف' کے عنوان کے تحت ان کا سوانحی خاکہ ہے۔ اس کے مطابق سنہ پیدائش ۲۲ر نومبر ۱۹۱۲ء ہے۔ نوٹ دیا ہے کہ اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق ۱۵ر نومبر ۱۹۱۲ء ہے جو صحیح نہیں۔ مالک رام صاحب نے وفات کی تاریخ ۲۶ر فروری ۱۹۷۸ء لکھی ہے 'طلوع افکار' کے کوائف میں ۲۶ر نومبر ۱۹۷۸ء دی ہے۔ واللہ اعلم کیا درست ہے۔

ص ۳۸۰ نازش پرتاپ گڑھی کا سنہ ولادت ۱۹۲۲ء 'عالمی ادب' کے حوالے سے لکھا ہے۔ خود انھوں نے دستاویز میں اپنی تاریخ ولادت ۱۲ر جولائی ۱۹۲۴ء لکھی ہے۔

ص ۳۹۵ پر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی تاریخ ولادت یکم جولائی ۱۹۱۳ء دی ہے دستاویز میں خود انھوں نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے جو سرکاری تاریخ ہو سکتی ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنے مجموعۂ کلام 'اندروئم' میں دیئے گئے سوانحی خاکے میں انھوں نے صحیح تاریخ ۱۲ر اگست ۱۹۱۱ء دی ہے۔ (اندروئم لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۱۵۷)

واجد علی شاہ کا ذکر ص ۲۶ پر تفصیل سے اور ص ۴۰۱ پر مختصراً ہے۔ دونوں جگہ ہجری تاریخ وفات ۲۴ر محرم ۱۳۰۵ھ دی ہے لیکن ص ۴۰۱ پر اس کا عیسوی سنہ ۱۸۸۸ء غلط ہے۔ ص ۲۶ پر ۱۸۸۷ء صحیح ہے۔

ص ۴۰۲ پر وامق جونپوری کی تاریخ ولادت ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء دی ہے۔ دستاویز میں انھوں نے اپنا سنہ ولادت ۱۹۱۰ء کو لکھا ہے۔

ص ۴۰۴ پر وجہی کا سنہ وفات ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) دیا ہے۔ وجہی کے محقق ڈاکٹر شو پرشاد جاوید وششٹ نے طے کیا ہے کہ وجہی نے ۱۶۵۶ء اور ۱۶۷۱ء کے درمیانی زمانے میں وفات پائی۔ ان کا خیال ہے کہ ۱۶۶۰ء کے قریب فوت ہوئے۔
(ملا وجہی، ساہتیہ اکاڈمی۔ دہلی ۱۹۸۴ء ص ۱۸)

خواجہ وزیر لکھنوی کا ذکر ص ۴۰۴ پر اور اس کے کچھ آگے ص ۴۰۵ پر ہے۔ ص ۴۰۴ پر ان کی تاریخ وفات ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ (۱۷ر اگست ۱۸۵۴ء) لکھی ہے۔ ص ۴۰۵ پر ۲۲ر ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ (۱۵ر ستمبر ۱۸۵۵ء) دی ہے۔ یہاں عیسوی سال صریحاً غلط ہے۔ ۱۸۵۴ء ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق ۲۲ر ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ صحیح ہے۔
(لکھنؤ کا دبستان شاعری طبع اول علی گڑھ ۱۹۴۴ء ص ۲۵۱)

ص ۴۰۶ وفا شاہجہاں پوری کا نام اسد علی خاں لکھا ہے۔ دستاویز میں انھوں نے اپنا نام احمد علی خاں لکھا ہے۔ وہاں تاریخ ولادت ۶ر اپریل ۱۹۲۰ء ہے جو مالک رام صاحب نے نہیں لکھی۔

سید محمد ہادی مچھلی شہری کا حال دو بار ص ۴۱۱ اور ص ۴۱۲ پر ہے پہلے میں صرف تاریخ ولادت دی ہے، دوسری بار سنہ ولادت اور تاریخ وفات دونوں۔ دوسرا اندراج الف بائی ترتیب کے خلاف ہاشمی کے بعد ہے۔

ڈاکٹر غلام یزدانی فرحت اللہ بیگ کے ہم جماعت کا ذکر دوبار ہے۔ پہلے غلام یزدانی کے تحت ص ۲۸۹ پر، جہاں ان کی تاریخ ولادت ۱۸۸۲ء لکھی ہے۔ پھر یزدانی کے تحت ص ۴۱۶ پر جہاں یہ تاریخ ۲۲ر مارچ ۱۸۸۵ء دی ہے۔ ماخذ کا اظہار دونوں میں سے کسی جگہ نہیں کیا۔

ص۴۲۲ پر جاوید وششٹ کی تاریخ ولادت ۵ر جون ۱۹۲۰ء لکھی ہے۔ انھوں نے دستاویز میں صراحت کی ہے کہ سرٹیفکیٹ میں یہی تاریخ درج ہے۔ صحیح تاریخ ۲۲ر ستمبر ۱۹۲۰ء ہے۔

ص۴۲۳ پر ایم حبیب خاں کی تاریخ ولادت ۱۱ر جولائی ۱۹۲۴ء لکھی ہے۔ دستاویز میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ کے لحاظ سے ہے اصل تاریخ ۱۱ر جولائی ۱۹۲۱ء ہے۔

ص۴۲۵ پر رشید حسن خاں کی شناخت کے لیے ایک لفظ "نقاد" لکھا ہے "محقق" لکھنا بہتر ہوتا۔

ص۴۲۵۔ سعادت نظیر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ محمد سعادت اللہ خاں تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۴۴ نکلتا ہے۔ وفات کی تاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۱۶ء لکھی ہے۔ خوش قسمتی سے دستاویز میں ان کے خود نوشت حالات موجود ہیں اس کے مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۱۶ء ان کی تاریخ ولادت ہے تاریخ وفات نہیں۔ خود انھوں نے لکھا ہے کہ "محمد سعادت اللہ خاں تاریخی نام رکھا گیا ہے جس سے ۱۳۴۴ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔"

(ص۱۴۵)

نام میں اللہ کے 'ل' کو دوبار جوڑا جائے تبھی ۱۳۴۴ برآمد ہوتا ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں بھی اللہ کے 'ل' کے اعداد دو بار شمار کیے جاتے ہیں۔

ص۴۲۹ پر کاظم علی خاں کی شناخت کے لیے ایک لفظ 'ڈاکٹر' لکھا ہے۔ اپنی تمام تحقیق کے باوجود کاظم علی خاں ابھی تک ڈاکٹر نہیں ہیں۔

ص۴۳۰ پر پروفیسر محمد حسنین کی تاریخ ولادت ۲ر اکتوبر ۱۹۴۰ء لکھی ہے۔ دستاویز میں انھوں نے صحیح تاریخ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء لکھی ہے اسے سہو کتابت نے ۱۹۴۰ء بنا دیا۔

ص۴۳۱ پر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا کی تاریخ ولادت یکم مئی ۱۹۴۴ء اور ص۳۶۵ پر یکم مئی ۱۹۲۴ء دی ہے۔ ثانی الذکر صحیح ہے۔ اردو کتابت میں ۲ کو کبھی ۴ کبھی ۶ لکھ دیا جاتا ہے۔

ص۴۳۱۔ راجیندر بہادر موج کی تاریخ ولادت ۳ر جولائی ۱۹۲۴ء درج ہے دستاویز میں یہ سہواً ۳ر جولائی ۱۹۴۴ء چھپ گئی ہے۔ ان کے بارے میں ایک کتابچے مرتبہ اکرم فاروقی میں تاریخ ۳ر جولائی ۱۹۲۲ء درج ہے — (راجیندر بہادر موج۔ موج ادبی اکادمی فتح گڑھ یو پی ۱۹۸۹ء ص۳) یہ ان کی سرکاری تاریخ ولادت ہے۔ کل وہ مجھ سے ملے تو بتایا کہ صحیح تاریخ ۴ر فروری ۱۹۲۱ء ہے۔ تذکرے میں مولد کا نام پہل پور چھپا ہے۔ صحیح بہیل پور ہے۔

ص۴۳۱ پر صلاح الدین نیر کو جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔ وہ حیدرآباد سکریٹریٹ میں ایک سرکاری افسر ہیں۔

مندرجہ بالا جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب نے یہ یادداشتیں ذاتی استعمال کے لیے جس ماخذ سے ملیں لکھ چھوڑیں۔ شائع کرنے سے پہلے ان میں بہت سی چھان پھٹک کی ضرورت تھی۔ بینائی کی زبوں حالی کے سبب یہ ممکن نہ تھا۔ شائقین اور متقدمین کے اصرار پیہم کے سبب چھاپ دیا۔ اس کتاب میں ایک طرف جہاں معلومات کا گنجینہ ہے وہیں متعدد اغلاط بھی در آئی ہیں۔ قاری کو چاہیے کہ اس کتاب کو خام مواد سمجھے اور اس کے کسی بھی اندراج کو استعمال کرنے سے پہلے دوسرے ماخذ سے جانچ لے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو میں معتدبہ ترمیم و اضافے کیے۔ مالک رام صاحب کی جسمانی معذوری کے سبب یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی کتاب پر گہری نظر ثانی کر کے درست کر سکیں۔ کیا خوب ہو کہ ان کی اجازت سے کوئی جواں سال لیکن پختہ کار محقق اس کتاب میں تصحیح و اضافہ کر کے ایک معتبر ایڈیشن تیار کر دے۔

عرش ملسیانی نے "ارمغان مالک" کے مضمون "نگارشات مالک رام" میں اطلاع دی ہے کہ مالک رام صاحب نے ایک "تذکرۂ ادبائے اردو" مرتب کیا ہے جس میں کم و بیش تین سو ادیبوں کے حالات پوری تحقیق سے جمع کیے ہیں۔" (جلد اول ص۱۵)

اس پر بھی تمام اہل تحقیق کا حق ہے۔ وہ بھی شائع ہونا چاہیے۔ اگر اس میں کچھ جھول ہوں گے تو باخبر قاری درست کر لے گا

□□

برف برف موسم

لیے لیے پھروں کب تک اب اور آوارہ
چلوں بھی، چل کے کہیں پھینک دوں یہ اپنی لاش

وہ آگ بجھ گئی جو اپنے ساتھ لایا تھا
وہ آگ بجھ گئی تب راز یہ کھلا مجھ پر
چمک رہے تھے جو منظر طلسم کس کا تھا

وہ آگ بجھ گئی تب جانا کیسی آگ تھی وہ
اک ایسی آگ کہ مل بیٹھیں جس کے گرد اگرد
بنا کے حلقہ بہم قوم قوم کے افراد
جدا جدا خد و خال و زبان کے باوصف
شعاع مہر سے ایسے دمکتے نین نگیں
ہوں جیسے فرد یہ سب ایک ہی قبیلے کے
نہیں، شجر کوئی جیسے چنار کا چھتنار
یہ شاخ و برگ اسی نخل آتشیں کے شرار
اک ایسی آگ کہ ڈھل جائیں جس کی حدت
جہاں کے نقش کہ برعکس یک دگر ہیں تمام
پگھل کے ایک نئے رنگ کی اکائی میں
کچھ اس طرح سے کہ قلب وجود کے اطراف
ہو کوئی شعلۂ جوالہ جیسے گرم طواف
اک ایسی آگ کہ چنگاریاں جب اس سے اڑیں
ہو کائنات کا آہنگ ذات کا آہنگ

وہ آگ بجھ گئی اور برف جمتی جاتی ہے
نہ جانے اور ابھی رات کتنی باقی ہے
یہ رات، آہ! خزاں کی یہ سرد لمبی رات

چلوں بھی، چل کے کہیں پھینک دوں یہ اپنی لاش
لیے لیے پھروں کب تک اب اور آوارہ!

عرفی آفاقی
۱۰/سی۔۲۰، ریلوے کالونی
بادشاہ نگر
لکھنؤ

عبدالقوی دسنوی
۲۰ پرنس کالونی، عید گاہ ہلز
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

کچھ اپنی باتیں

ہوش وحواس کی آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو اپنے دادا حکیم سید لیاقت حسین کے مکان میں پایا۔ زنانہ مکان، خلوت خانہ مردانہ حصہ، چاندنی، پہلی منزل کے مختلف کمرے ۔ یہی میری دنیا تھی۔ دادا کو دیکھا نہیں، دادی ضعیف ہو چکی تھیں۔ گھر سے باہر کم نکلتی تھیں، نہایت نیک طبیعت، عبادت گزار خاتون تھیں۔ ان کے علاوہ چچا، چچی، چچیرے، پھپھیرے بھائیوں کا جمگھٹا، ہنسی مذاق قہقہے، ایک عجیب خوشیوں اور مسکراہٹوں سے بھرپور ماحول۔

مردانہ مکان میں صبح سے رونق رہتی تھی۔ گاؤں کے لوگ وہاں آجاتے تھے، محفل جمتی تھی۔ کبھی دسنہ سے متعلق باتیں ہوتیں کبھی ملک کے حالات پر تبصرے ہوتے، اخبارات کی خبریں سنائی جاتیں، قصے کہانیوں کا دور چلتا۔ تقریباً روزانہ کا یہی دستور تھا۔

اسی مردانہ حصے میں پورب کی طرف کمروں میں یا برآمدے میں ہمارے بھائیوں کو ایک مولوی صاحب پڑھایا کرتے تھے، جن سے دسنہ کے قریب اندی نام کی بستی کے دو لڑکے اودھ نرائن اور دیو نرائن بھی پڑھنے آتے تھے۔ میں بھی کبھی ان کے قریب جاکر بیٹھ جاتا تھا۔

گرمیوں میں رات کے وقت صحن میں چوکیاں بچھائی جاتی تھیں، گاؤ تکیے لگائے جاتے۔ والد صاحب (پروفیسر سعید رضا) چھوٹے چچا سید معین الدین اکثر تاریخی قصے سناتے اور بچے ان تاریخی قصوں میں کھو جاتے۔

کچھ بڑے ہوئے تو دسنہ لائبریری اور مسجد تک قدم پہونچے جیرائن ندی کے کنارے تک کبھی کبھی اپنے بزرگوں کے ساتھ جاتے ان کے ساتھ باغات اور ہرے بھرے کھیتوں سے گزرتے تو عجب لطف آتا، خوشیوں سے دل لبریز ہو جاتا۔

یہ باتیں میں اُس دسنہ کی بتا رہا ہوں جہاں میں یکم نومبر ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا اور جو بہار شریف سے تقریباً آٹھ نو میل کے فاصلے پر ہے یہاں کے تعلیم یافتہ باشندوں اور کتب خانۂ 'الاصلاح' کی وجہ سے ملک میں اسے بڑی شہرت اور عزت ملتی رہی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر ابوظفر ندوی، پروفیسر سید سعید رضا، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمان، سعید الحق عاشق، سید شہاب الدین دسنوی وغیرہ اسی دسنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دسنہ کے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں اس کتب خانہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جلسے ہوتے، اسٹوڈنٹس کانفرنس کے انتخابات لڑے جاتے۔ بڑے پیمانے پر تقریبات منعقد کی جاتیں۔ وزیروں کو جلسوں میں شریک ہونے کے لئے دعوتیں دی جاتیں، ادیبوں کا استقبال کیا جاتا۔ کبھی مولوی عبدالحق (بابائے اردو) تشریف لا رہے ہیں، کبھی مولانا عبدالسلام ندوی کی آمد ہے، کبھی مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کا انتظار ہے۔ کبھی مسعود عالم ندوی تشریف لائے ہیں، کبھی

خواجہ احمد فاروقی اس بستی میں ایسے اچھے کتب خانے کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور کبھی مولانا عبدالماجد دریابادی بے تابانہ دیار علامہ سید سلیمان ندوی چلے آ رہے ہیں اور کتب خانے کو دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔

ہندستان کے مشہور و معروف رہنماؤں نے بھی اس بستی کی شہرت سن کر یہاں آنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود، اچاریہ کرپلانی، محمد شفیع داؤدی ایسے ہی رہنما تھے جو یہاں آئے اور اس بستی سے متاثر ہو کر رہ گئے۔

دسنہ کے رہنے والوں کی آپس کے میل محبت، اتحاد و اتفاق اور ایثار و قربانی کی وجہ سے اس بستی نے بہت ترقی کی اور ہمیشہ بارونق بنی رہی۔ انجمن الاصلاح دسنہ نے بزرگوں کو متحد و متفق رکھا جس کی وجہ سے دسنہ میں تہذیبی، سماجی اور تعلیمی کاموں کو فروغ ملا۔ اس انجمن نے ایک مکتب "مدرسہ انجمن الاصلاح" کے نام سے قائم کیا تھا جس میں پانچویں جماعت تک تعلیم ہوتی تھی۔ اسے ہائی اسکول بنانے کی کوششیں ہو رہی تھیں لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ملک کو تقسیم کر دیا اور اس بستی کی ترقی تھم گئی اور ہائی اسکول کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

نوجوانوں کی انجمن "اسٹوڈنٹس کانفرنس" نے نوجوانوں میں علمی و ادبی صلاحیت پیدا کرنے میں مدد کی اور آگے بڑھنے کا جذبہ بیدار کیا اور اس بستی میں تہذیبی اور سماجی کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے ان کو آمادہ کیا۔

مدرسہ انجمن الاصلاح دسنہ میں تین استاد اور ایک گرو جی تعلیم دیتے تھے۔ دسنہ کے رہنے والوں کے بچے یہاں تعلیم پاتے تھے۔ اس مدرسہ نے بھی بستی کے بچوں کی ذہنی تعمیر میں بڑا کام انجام دیا۔ دسنہ کے بزرگوں نے ہمیشہ اس مدرسہ سے گہری دلچسپی لی اور اسے خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف رہے۔

میری تعلیم پہلے گھر پر ہوئی۔ پھر دسنہ کے مدرسہ "الاصلاح" میں ہوئی۔ جہاں پہلی بار اقبال کی نظم "بچے کی دعا" (لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری) سنی اور یاد کی — اور ترانۂ ہندی ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

کو بھی اسی مدرسہ میں بار بار سننے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے پہلے شعر کے علاوہ یہ دو شعر مجھے بہت پسند تھے اور ہیں ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

لیکن میری والدہ محترمہ حسنیٰ بیگم کو دسنہ میں میری پڑھائی سے اطمینان نہ تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں دسنہ سے باہر کسی شہر میں اچھے اسکول میں تعلیم پاؤں۔ چنانچہ انھوں نے والد صاحب سے میری تعلیم سے متعلق فکرمندی کا اظہار بار بار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں دسمبر کی آخری تاریخوں میں مجھے اپنے بڑے چچا مولوی سید عبدالحفیظ ندوی صاحب کے ساتھ کھڑگپور جانا پڑا۔ بڑے چچا عبدالحفیظ صاحب بی۔ این ہائی اسکول کھڑگ پور میں بحیثیت ہیڈ مولوی فرائض انجام دے رہے تھے اور اسکول میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شہر میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔

میرا داخلہ انہی کے اسکول میں چوتھی جماعت میں ہوا جو نہایت اچھا اسکول تھا، جہاں کے اساتذہ اپنے طلبا سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے فرائض نہایت ذمہ داری سے ادا کر رہے تھے۔ مجھے وہاں کا ماحول پسند آیا اور پڑھائی میں میری طبیعت خوب لگی۔ اساتذہ میں چندر موہن صاحب نے مجھے متاثر کیا۔ چنانچہ سالانہ امتحان میں اوّل آیا۔ میرے بڑے چچا میرے اس نتیجہ سے بہت خوش ہوئے۔ میرا حوصلہ بڑھایا۔

یہ شہر نہایت صاف ستھرا تھا، آبادی زیادہ تر بنگالیوں کی تھی اس لیے ان سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔ بنگالی زبان کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان کے باغبانی کے شوق نے مجھ میں پیڑ پودوں اور پھولوں سے دلچسپی پیدا کی۔ چنانچہ اپنے کوارٹر میں میں نے بھی باغبانی شروع کی۔ کھیل کود سے دلچسپی پہلے دسنہ میں پیدا ہوئی تھی

کھڑگپور میں یہ دلچسپی اور بڑھ گئی۔

۱۹۴۰ء کے دسمبر میں پانچویں کلاس کا امتحان دیا اور ایک نمبر سے اول ہونے سے رہ گیا جس کا مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ اسی زمانے میں عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے اثرات ہندوستان پر پڑنے لگے تھے کلکتہ میں جاپانیوں کی بمباری کا خطرہ بڑھنے لگا۔ چنانچہ دسمبر کی تعطیل میں دسنہ پہونچا تو والد صاحب نے مجھے کھڑگپور جانے سے روک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے چھ ماہ دسنہ میں گزارنے پڑے۔

جون ۱۹۴۲ء کے آخر میں مجھے مولوی سید نجم الہدیٰ ندوی صاحب کے ساتھ آرہ (ضلع شاہ آباد) بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ آرہ ضلع اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ میں نے ساتویں کا پرائیوٹ امتحان دیا اور جنوری ۱۹۴۳ء میں ضلع اسکول میں آٹھویں میں داخلہ لے لیا۔ یہ اسکول نہایت اچھا تھا۔ اس وقت اس کے ہیڈ ماسٹر سلطان احمد صاحب تھے جن کی تعلیم انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ وہ اسکول کو بڑے وقار کے ساتھ چلا رہے تھے۔

اس اسکول میں بھی اردو کا سکشن الگ تھا۔ حبیب الرحمٰن صاحب اُردو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے طلباء میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کیا چنانچہ کلاس میں چندہ کرکے کئی رسائل منگائے جانے لگے۔ طلباء باری باری ان رسائل کو پڑھتے تھے۔

آرہ میں ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ میرے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی، چچیرے بھائی امین الدین اور رکن الدین تعلیم حاصل کرنے کے لئے آرہ آگئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد مولوی نجم الہدیٰ صاحب کے عزیز عبدالاحد اور عبدالماجد آگئے تو گھر میں چہل پہل بڑھی، ادبی شوق پیدا ہوا۔ عبدالاحد صاحب کی کوششوں سے ایک مختصر رسالہ (غالباً ساٹھ صفحہ کا) ہاتھ سے لکھا ہوا "آواز" کے نام سے نکالا گیا، جس کے چند ہی شمارے تیار کیے جاسکے۔ اس زمانے میں شاعری کا شوق مجھے، رکن الدین اور عبدالاحد صاحب کو ہوگیا تھا۔ کچھ نظمیں ہم لوگوں نے لکھیں جو "آواز" میں شامل کی گئیں۔ میرا تخلص شورش تھا۔ رکن الدین کا تخلص یکتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے چند مضامین بھی لکھے تھے جن میں "باغی اور ایک خواب" انگریزوں کی غلامی کے خلاف تھے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔ یہ دور بڑے ہنگاموں کا تھا۔ جون ۱۹۴۷ء میں پٹنہ انجینئرنگ کالج میں ڈپلوما کورس میں داخلہ لیا۔ لیکن آزادی کے ساتھ تقسیم کی پریشانیوں کو جھیلنا پڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھائی نہیں ہوئی ــــ اور امتحان میں دو ایک پرچے خراب ہوگئے جون ۱۹۴۸ء میں اپنے والد کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ بھائی صاحب سید عبدالحی بھی چند روز بعد بمبئی آگئے اور ہم لوگوں کا داخلہ سینٹ زیویرس کالج بمبئی میں ہوگیا۔ میرا داخلہ فرسٹ ایر سائنس میں ہوا اور بھائی صاحب کا بی اے (آنرز) اُردو میں ہوا۔ بھائی صاحب نے ۱۹۵۰ء میں ایم اے اُردو میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ چونکہ تمام مضامین کے طلباء میں ان کے نمبر سب سے زیادہ تھے اس لیے بمبئی یونیورسٹی کے چانسلر گولڈ میڈل کے حقدار ہوئے۔

میرے انٹر سائنس میں پہونچنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے ختم ہوگیا۔ جون ۱۹۵۴ء میں والد صاحب ریٹائر ہوئے تو ان کی خواہش سے جولائی ۱۹۵۴ء میں انٹر آرٹس میں داخلہ لیا۔ بھائی صاحب کا اس زمانے میں سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوگیا تھا۔ میں نے اسی کالج سے ۱۹۵۵ء میں انٹر آرٹس کیا۔ ۱۹۵۷ء میں بی اے (آنرز) فرسٹ کلاس اور ۱۹۵۹ء میں ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس میں کیا۔

سینٹ زیویرس کالج کے تمام اساتذہ اور خاص طور سے پادریوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان کی خاموشی، ان کا اخلاق اور ان کی لگن دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی تھی۔ وہاں اساتذہ کی حاضری کا کوئی رجسٹر نہیں تھا لیکن تمام اساتذہ اپنے وقت پر آتے اور اپنے فرائض انجام دیتے۔ میں نے اپنے والد پروفیسر سعید رضا کو کبھی چھٹی لیتے یا کالج دیر سے پہونچتے نہیں دیکھا۔ طلباء کی حاضری بھی کم ہی لی جاتی تھی۔ لیکن کلاس بھرے ہوتے تھے۔ کالج کا ماحول ہمیشہ خوش گوار نظر آیا۔ اس کالج نے میری ذہنی تعمیر میں بڑی مدد کی۔

بزم ادب کے ذریعہ پروفیسر نظام الدین گوریکر کی نگرانی میں تحریری / تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ ایک سالنامہ رسالہ "کاروانِ ادب" نکلتا تھا جس میں زیادہ تر طلباء کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ

طلباء اشتہارات کی رقم سے نکالتے تھے۔ ہر سال دو ایک تقریبیں "یوم اقبال"۔ "یوم غالب"۔ "یوم چکبست"۔ "یوم حسرت"۔ "یوم پریم چند" وغیرہ کے نام سے ہوجاتی تھیں جس میں ہر مذہب و ملت کے طلبا و اساتذہ شریک ہوتے تھے۔ شہر کے معززین بھی اس کی رونق میں اضافہ کرتے تھے۔

کاروانِ ادب کا پہلا شمارہ ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا تھا اس کے پہلے دوسرے شمارے کے ایڈیٹر س۔م۔ زیدی رہے جو اردو کے لئے کام کرنے کا نہایت اچھا جذبہ اور سلیقہ رکھتے تھے پھر دو تین سال کاروانِ ادب شائع نہیں ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں ایک شمارہ میری ادارت میں نکلا۔ اس شمارے میں میرا پہلا اور آخری افسانہ "نہ سنا جائے گا"۔ شائع ہوا جسے عام طور پر پسند کیا گیا تو مجھے بیحد مسرت ہوئی تھی۔ اس کے بعد کاروان ادب کے ایک شمارہ کا میں مہتمم مدیر رہا اور ایک شمارے کے ادارے میں شامل رہا۔

۱۹۵۴ء میں میری ایک مختصر کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل "ایک اور مشرقی کتب خانہ" شائع ہوئی جس میں کتب خانہ الاصلاح دسنہ کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس کتاب میں دسنہ اور اس کے مصنفین و محترم شخصیتوں سے متعلق معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ یہ کتاب میں نے قرض لے کر اور اشتہارات حاصل کرکے شائع کی تھی۔ دسنہ کے سید اختر حسن صاحب نے اسے فروخت کرانے میں بڑی مدد کی جس کی وجہ سے میں قرض کی رقم ادا کرنے کے لائق ہوا۔

اس زمانے میں میری ادبی صلاحیتوں کو بڑھانے میں میرے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی رضا نے بڑی دلچسپی لی۔ انھیں کتابوں اور رسائل کے مطالعے کا بڑا اچھا ذوق رہا ہے وہ اچھے اچھے رسائل اور نئی نئی کتابیں لایا کرتے تھے جن کا مطالعہ میں بھی کرتا تھا۔ میں کالج کے زمانے میں جو کچھ لکھتا اپنے بڑے بھائی کو ضرور دکھادیا کرتا۔ وہ بڑی دلچسپی سے میری تحریروں کو پڑھتے اور ضروری اصلاح کرتے اور مشورہ دیتے۔

۱۹۵۶ء میں میری ایک مختصر کتاب "حسرت کی سیاسی زندگی، چند جھلکیاں" شائع ہوئی جو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ سردار جعفری نے لکھ کر میری ہمت افزائی کی تھی۔

۱۹۶۰ء میں میں نے احمد سیلر ہائی اسکول بمبئی میں بحیثیت استاد تقریباً ایک سال کام کیا۔ اس دوران میں وہاں سے طلباء کا ایک سالنامہ "شاہین" شائع کیا، جس میں صرف طلباء کی تحریریں شامل کی گئی تھیں۔ اس رسالہ نے وہاں کے طلباء میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔

اسی زمانے میں انجمن نوجوان مصنفین سے میرا تعلق کیفی بھائی (کیفی اعظمی) کی وجہ سے گہرا ہوگیا تھا، جس کے تحت پروفیسر احتشام حسین نے چھ دن حالی پر لکچر دیئے تھے جس نے ادبی حلقہ میں بڑی دھوم مچادی تھی۔ نوجوان مصنفین کی دو روزہ کانفرنس بھی ہوئی تھی جس کا کنوینر میں تھا۔ اس کانفرنس میں بمبئی کے تمام ترقی پسند ادیبوں اور غیر ترقی پسند ادیبوں نے شرکت کی تھی، یہ کانفرنس ہر طرح کامیاب رہی۔

عروس البلاد بمبئی میں میں نے بارہ تیرہ سال گزارے۔ اس شہر نے میری ذہنی تعمیر میں بہت مدد کی۔ سینٹ زیویرس کالج، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، احمد سیلر ہائی اسکول، صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ ترقی پسند مصنفین، انجمن نوجوان مصنفین نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی اور زندگی اور ادب کو سمجھنے میں مدد کی۔

۱۲ر فروری ۱۹۶۱ء کو میں بھوپال آکر سیفیہ کالج سے منسلک ہوگیا۔ اس وقت اس کالج میں آرٹس، سائنس اور کامرس میں ڈگری تک تعلیم تھی۔ کالج ترقی کی منزل میں تھا۔ اس کے بانی ملا سجاد حسین نہایت محنت اور لگن کے ساتھ کالج کی تعمیر میں مصروف تھے۔ کالج کے سکریٹری فخرالدین صاحب کالج سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور اس کی ترقی کے لیے فکرمند تھے اور آج بھی ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا اور میں اس کالج کا ہمیشہ کے لیے ہوکر رہ گیا۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں اس کالج سے سالنامہ مجلہ سیفیہ جاری کیا جس نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس کے کئی شمارے منظر عام پر آئے — "غالب نمبر" اور "یادگار اقبال" نے بڑی دھوم مچائی۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں سہ ماہی "نوائے سیفیہ" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ یہ رسالہ اشتہارات حاصل کرکے نکالا جاتا تھا۔ تین سال

تک اسے جاری رکھا جاسکا۔ اس کے تین نمبر بھوپال میں پیش کیے گئے جو بھوپال اور بیرون بھوپال میں پسند کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

شعبۂ اردو سے یہ چند کتابیں بھی شائع ہوئیں:

۱۔ اور ہندوستان جاگ اُٹھا (مرتب عبدالقوی دسنوی)
۲۔ علامہ اقبالؔ بھوپال میں (عبدالقوی دسنوی)
۳۔ غالبؔ اور بھوپال (" ")
۴۔ تاور نامہ غالبؔ (مرتبہ " ")
۵۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی (" ")
۶۔ نذرِ سجاد (مرتبہ " ")
۷۔ ارمغان سیفیہ (مرتبہ عبدالقوی دسنوی۔ ڈاکٹر محمد نعمان)
۸۔ مطالعۂ خطوط غالبؔ (عبدالقوی دسنوی)
۹۔ جواہرِ آزاد (مرتبہ: " " ڈاکٹر محمد نعمان)

۱۹۶۸ء میں شعبۂ اُردو میں ایم اے کی تعلیم مخالفتوں کے باوجود شروع ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشہور و مقبول شاعر ڈاکٹر مظفر حنفی بھوپال یونیورسٹی اور سیفیہ کالج کے شعبۂ اُردو کے پہلے طالب علم ہیں جنھوں نے اُردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے ایم۔اے میں ساری یونیورسٹیوں میں اوّل آکر شعبۂ اُردو سیفیہ کالج کا نام بلند کیا۔ آجکل کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

میں تقریباً ۳۰ سال سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو سے منسلک رہا۔ ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اُردو میں کتب خانہ کی بنیاد ڈالی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے وقت تک کتابوں اور رسائل کا قیمتی ذخیرہ وہاں جمع ہو گیا تھا۔

اس دوران میں اُردو کے نامور نثر نگار اور شعراء راجندر سنگھ بیدی، آنند نرائن ملا، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، فیض احمد فیضؔ، سردار جعفری، کیفیؔ اعظمی، جاں نثار اخترؔ، مجروحؔ سلطان پوری، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام، شہباز حسین، خواجہ احمد عباس، علی جواد زیدی، اختر الایمان، ظ۔ انصاری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر عبدالحق، مجتبیٰ حسین، احسن علی خاں، اختر جمال، رفیعہ سلطانہ، سید صباح الدین عبدالرحمان، پروفیسر نثار احمد فاروقی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر قمر رئیس اور ساگر سرحدی وغیرہ شعبۂ اردو کی دعوت پر کالج تشریف لائے۔ ان حضرات کی آمد پر اُردو کے طلبا میں عجیب جوش و خروش پیدا ہو جاتا اور ان میں پڑھنے لکھنے اور آگے بڑھنے کا ایک خاص جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ اس طرح شعبۂ اُردو سیفیہ کالج کو آگے بڑھنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔

میں شعبۂ اُردو سیفیہ کالج سے یکم نومبر ۱۹۹۰ء کو ریٹائر ہوا ۳۱ر اکتوبر کو میں نے خود ہی اپنے طلباء، کالج کے اساتذہ اور شہر کے معززین کو سیفیہ کالج سے رخصت ہونے پر بلایا اور اپنی باتیں کہیں، کچھ حقائق بتائے۔ شعبۂ اُردو کو ۷۸۶ روپئے دیئے اور کچھ کتابیں کتب خانۂ شعبۂ اُردو کو پیش کیں اور سبھوں کو الوداع کہا۔

میں نے اپنی بعض مطبوعات کا ذکر اوپر کیا ہے۔ ان کے علاوہ میری حسبِ ذیل مختصر کتابیں مختلف وقتوں میں شائع ہوئیں:

(الف) تحقیق و تنقید

۱۔ ایک شہر پانچ مشاہیر ۲۔ سات تحریریں
۳۔ تلاش و تاثر ۴۔ مہدی حسن افادی
۵۔ اقبالؔ اور دلّی ۶۔ مطالعۂ خطوط غالبؔ مع اضافہ
۷۔ مطالعۂ غبارِ خاطر ۸۔ اقبالؔ اور دارالاقبال بھوپال
۹۔ اقبالیات کی تلاش ۱۰۔ ابوالکلام آزاد
۱۱۔ مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد ۱۲۔ تلاشِ آزاد
۱۳۔ اُردو شاعری کی گیارہ آوازیں (زیرِ طبع)
۱۴۔ ابوالکلام آزاد اور ان کے نامور ہم عصر (زیرِ تکمیل)
۱۵۔ حیاتِ ابوالکلام آزاد (زیرِ تکمیل)

(ب) ترتیب و تدوین

۱۔ مضامین لسان الصدق ۲۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ

(باقی ص ۳۲ پر)

غزلیں

گھل سی گئی روح میں اُداسی
راس آئی نہ ہم کو خود شناسی

ہر موڑ پہ بے کشش کھڑی ہے
اک خوش بدنی و کم لباسی

لاکھ میں پَروں کے، پیر چھوٹے
اب رختِ سفر ہے بے اساسی

نقشِ مضموں اسی میں ہے، گو
مضمونِ نفس ہے اقتباسی

آئی بھی تو کیا نگارِ تعبیر
اوڑھے ہوئے خواب کی رداسی

جادو سا الم کا کر گئی ساز
ان آنکھوں کی ملتفت اُداسی

عبدالاحد ساز
۸۴۔ چکلا اسٹریٹ
بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳

مرا سکوت مقالوں کے کام آئے گا
جو کچھ کہا تو حوالوں کے کام آئے گا

اثاثہ حرف و معانی کا جوڑ کر رکھ لیں
ہمارے بعد رسالوں کے کام آئے گا

ہم اپنی قدروں کا خود احترام کرتے ہیں
یہ وصف ساری مثالوں کے کام آئے گا

ہر ایک لفظ محبت میں ڈوب کر لکھنا
صحیفہ دل کا جیالوں کے کام آئے گا

ہر ایک بوند میں ہیں جگمگاہٹیں دل کی
مرا لہو بھی اُجالوں کے کام آئے گا

نذیرؔ شہر کی تاریخ جب بھی لکھو گے
ہمارا نام حوالوں کے کام آئے گا

نذیر فتحپوری
مُدیر اسباق: ۱۱/۲/۴- نیتا پارک ایروڈا
پونہ - ۶

کبھی تو نقش بر آب لکھ دے
نفس نفس کامیاب لکھ دے

جواں ہیں تشکیک کے اندھیرے
وفا کی روشن کتاب لکھ دے

وہ جس کی تعبیر ہو محبت
مرے قلم! تو وہ خواب لکھ دے

ستارے بے نور ہو رہے ہیں
افق افق ماہتاب لکھ دے

کوئی بھی رُت بے خزاں نہ گزری
مگر تو جشنِ گلاب لکھ دے

ہے کوئی ناقد؟ بلاؤ شاہین
میری غزل کا جواب لکھ دے

مناظر حسن شاہین
ڈبو۔ بارا
گیا (بہار)

ڈاکٹر حبیب نثار
مکان ۹-۹-۵-۱۹۰۵، فرحت نگر - حیدرآباد
۵۰۰۰۲۳

"طلسم ہوش رُبا" میں موسیقی کے نقوش

اردو داستانیں ہماری تہذیب کا مرقع ہیں۔ داستان میں موسیقی تہذیب کے ایک اہم عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اردو داستان نگاروں نے موسیقی کا بیان بڑی باریک بینی اور موسیقی کی تمام تر مبادیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا ہے۔ ذیل میں احمد حسین قمر اور محمد حسین جاہ کی تخلیق "طلسم ہوش رُبا" میں موسیقی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

طلسم ہوش رُبا میں جاہ و قمر نے موسیقی کا نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ موسیقی کے ذریعہ جادو بھی کیا ہے۔ عمرو عیار، برق فرنگی، اسد بن کرب غازی اور دوسرے عیار موسیقی کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ افراسیاب بھی ماہر موسیقی ہے۔ عمرو عیار کے بارے میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"جاننا چاہیے کہ عمرو کو کوہ ابو قبیس پر آمیر کے ساتھ حضرت جبرئیل نے شاگرد کیا ہے اور تین دانے انگور کے کھلائے ہیں۔ ایک دانے کی خاصیت یہ ہے کہ عمرو خوش الحان ہے اور لحن داؤدی رکھتا ہے۔" [1]

چنانچہ عمرو عیار غزلیں بھی گاتے ہیں، دھرپد، خیال، ٹھمری اور دادرا بھی۔ قوالوں کی طرح کان پر ہاتھ رکھ کر خوب خوب تانیں اڑاتے ہیں۔ طلسم ہوش رُبا جلد اول میں عمرو ایک تیرہ سالہ لڑکے کے روپ میں نظر آتے ہیں اور "ہاتھ کان پر رکھ کر تانیں مارنا" [2] شروع کر دیتے ہیں اور "اشعار عاشقانہ اور غزل پُر از مضمون مہاجرت محبوب" [3] گانے لگتے ہیں۔

عمرو عیار نَے (بانسری) بجانے میں بھی اکمل ہیں۔ انھیں یہ فن کرشن جی سے عطا ہوا ہے۔ (قومی یک جہتی کی اصطلاح بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں اختراع ہوئی لیکن ہمارے داستان نگاروں نے بہت پہلے ہندستان میں قومی یک جہتی کی ضرورت کو محسوس کیا تھا چنانچہ عمرو عیار کا کردار اس کی بہترین مثال ہے۔ عمرو کے یہاں لحنِ داؤدی ہے اور نَے نوازی کرشن کنھیا کی۔ قومی یک جہتی کا اس سے بہتر تصور اور کیا ہو سکتا ہے۔ موسیقی اس تصور کو تقویت پہونچاتی ہے)۔

چنانچہ عمرو اپنے اسی فن کے سہارے سوسن زبان دراز کے بیٹوں نیرنگ و گیرنگ، برادران ملکہ حیرت جادو کی گرفتاری کے لیے کرشن جی کا روپ اختیار کرتے ہیں اور سوسن کے قلعہ آتش میں جا کر انھیں گرفتار کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"عمرو نے سوچتے سوچتے تصویریں شاہانِ گزشتہ کی نکالیں کندھیا (کذا کنھیا) کی تصویر پہ نگاہ پڑی دیکھا جوان خوش رو بیٹھا ہے اور نَے بجا رہا ہے۔ بس عمرو کو خیال آیا کہ اس صورت پر اپنے کو تا بہ سوسن پہونچائیں نَے سن کر مبہوت ہو جائے گی، ضرور دھوکا کھائے گی۔ کنھیا کی صورت بن کر تیار ہوا مکٹ سر پر رکھ لیا لباس فاخرہ زیب جسم کیا، ایک مرکب ممکن کر کے اس پر سوار ہوا۔ اس شان و شوکت سے عمرو درّہ کوہ سے نکلا۔ سناٹا صحرا کا، طائر درختوں پر زمزمہ سرائی کر رہے ہیں۔ عمرو نے نَے کو دہن میں رکھ کر بانسری کو دھر پھونکا نَے بجاتا ہوا نئے طور سے چلا، جنگل صحرا میں جو

شروع کر دیا طائران صحرا بے قرار ہو کر شاخ ہائے درخت سے اتر آئے، پروں کا سر عمرو پر سایہ کیا۔ عمرو سلیمانِ وقت بنا ہوا غزل عاشقانہ گاتا ہوا چلا جاتا ہے۔"[۴]

یہاں صرف عمرو کی فنِ موسیقی میں مہارت کا بیان نہیں ہے بلکہ اس فن کی تاریخ اور اس کے پس منظر سے اس کی واقفیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے (عمرو نے) نے نوازی کے لیے کنہیا جی کی صورت اختیار کی۔ اس کی نے نوازی میں یہ تاثیر ہے کہ چرند و پرند مدہوش ہو کر اس کے سر پر اپنے پروں سے سایہ کرتے ہیں۔ عمرو بانسری میں "جنگلا" بجا رہا ہے جنگلا کے سُر ترحم و غم گیتی کے جذبات کو مہمیز کرتے ہیں۔

عمرو کی بانسری کی آواز جب سوسن زبان دراز کے کانوں میں پڑتی ہے تو اس کی حالت کیسی متغیر ہوتی ہے ملاحظہ ہو:۔

"سوسن زبان دراز سایہ میں ایک نخل کے بیٹھی شراب خواری کر رہی ہے نیرنگ دگیر نگ پہلو میں (ہیں) ناگاہ گانے کی آواز (آئی) گھبرا کر کہا۔ اے فرزند! یہ کون بجا رہا ہے .....۔"[۵]

"طلسم ہوش رُبا" میں عمرو عیار موسیقی کے ماہر ہیں۔ دوسرے عیار اور کنیزیں ان کے آگے ہیچ و پوچ ہیں۔ ایک جگہ عمرو عیار کے بارے میں ایک کنیز اس طرح اظہار خیال کرتی ہے:۔

"ہر تان پر تان سین قربان[۶]۔"

جبکہ جلد دوم میں مزید تفصیل سے یہ بیان ملتا ہے:۔

"اس کنیز نے دست بستہ عرض کیا.... اس ہنگام پیر سالی میں بھی ایسا گاتا ہے کہ ناہید فلک بھی رو برو اس کے بے آبرو ہے۔ تان سین کی روح اس پہ نثار ہونے کی آرزو رکھتی ہے۔ بیجو اگر اس وقت سنتا تو باورا ہو جاتا......"[۷]

ایک بیان برق فرنگی کی زبانی سنیے۔ عمرو عیار اور برق فرنگی نے مشعل جادو کے خیمہ میں عیاری کی ہے۔ عمرو گا رہے ہیں — برق کہتا ہے کہ:۔

"ملکہ صاحب! یہ لوگ یادگار ہیں تان سین اور بیجو باورا وغیرہ کی ان لوگوں نے آنکھیں دیکھی ہیں۔"[۸]

طلسم ہوش ربا کا اہم ترین بلکہ مرکزی کردار عمرو عیار ہی ہے۔ داستان میں دوسرے کردار اسی کے ذریعہ سامنے آتے ہیں۔ فنِ موسیقی میں عمرو یکتا ہیں چنانچہ جہاں کہیں کوئی غزل گاتا ہے، بانسری بجاتا ہے وہاں عمرو کی بات نکلتی ہے، اس کی فنِ موسیقی میں مہارت کا بیان ہوتا ہے۔ گویا عمرو کی اس فن میں مہارت کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا وہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ باقی تمام کردار عمرو کے پرتو ہیں۔ کم از کم اس فنِ لطیف کے سلسلے میں تو یہی بات صادق آتی ہے۔

طلسم ہوش ربا میں موسیقی رزم و بزم ہر سطح پر اپنے سُر بکھیرتی نظر آتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جنگ اور جشن ہی کے محور پر ساری طلسم ہوش ربا رقص کرتی ہے۔ چاہے شراب کی محفل ہو یا رقص کا بیان، ہر جگہ موسیقی کی کارفرمائی ملے گی۔ آیسر کی فوج کی روانگی کا منظر دیکھیے:۔

"یکایک سامنے سے ہاتھی نمودار ہوئے مستکوں پر ان کی آئینے نصب تھے۔ جھولیں زربفتی پڑی تھیں، علمدار علموں کو جلوے دیتے تھے پھریروں پر تعریف خدائے لایزل تحریر۔ پرچم پر ایک ایک کے سورۂ انا فتحنا کی تفسیر۔ ان کے بعد گجیال شتر تال دمامے اور نقارے نقرئی و طلائی ہاتھیوں اور اشتروں پر نقارچی بادلہ پوش پگڑیاں گلنار باندھے اچکنیں کمخواب کی پہنے دوال مرصع لیے نقاروں پر چوب لگاتے دمامے رعد آسا گڑگڑاتے تجمل و شان دکھاتے نکلے...

... اس کے سامنے گھوڑا اسد بن کرب غازی کا، نقارے کئی ہزار بجتے۔ پس پشت چالیس ہزار سوار چلہ پوش....."[۹]

افراسیاب کی فوج کی شان ملاحظہ ہو:۔

"سامنے سے گرد اڑی اور نقاروں کے بجنے کی صدا

آئی۔ دیکھا تو آگے آگے نقارچی ..... دمامے شتری
اور فیل بجاتے ..... پیدا ہوئے اور سواریاں ساحروں
کی ظاہر ہوئیں۔" ۱۰

یہ دو مثالیں جنگ کے لیے روانہ ہونے والی افواج کی ہیں جن کے ہمراہ نقارے ہیں۔ اب ایک مثال جشن کی ملاحظہ ہو کہ کیا کیا اہتمام کیا گیا ہے:۔

"خلاصۂ کلام دل سے شہزادے نے دُنیا کو فانی
سمجھ کر تہیہ کر لیا کہ آج سامانِ عشرت ہر طرح کا مہیا کرکے نوبتِ
عیش و نشاط میں بسر کیجیے ..... سیارہ بن عمرو اپنے
عیار کو بلا کر ارشاد کیا کہ ..... لبِ دریا خیمۂ زربفتی ہمارے
لیے نصب کیا جائے ..... اربابِ نشاط حاضر ہو کر
مجرا کریں۔ آج جنگل میں ہم سیرِ شبِ ماہ دیکھیں گے .....
اس حکم کے سنتے ہی سیارہ نے انتظام کیا .....
جب یہ جلسۂ عشرت پیدا ہو چکا، شہزادہ کو اطلاع
دی۔ قاسم لباسِ رنگین پہن کر ..... زینت بخش انجمن ہوا
... سامنے رقاصانِ زہرہ ناچنے لگے اور اشعار
عاشقانہ گانے لگے۔" ۱۱

یہ شہزادہ قاسم کے یہاں منعقد ہونے والے جشن کا بیان ہے جس میں موسیقی کے سُر نہیں سُنائی دیتے ہیں لیکن موسیقی کی محفل کے اہتمام کا اندازہ ہوتا ہے۔ افراسیاب کا جشن بھی اس سے مختلف نہیں ملاحظہ ہو:۔

"شہنشاہِ طلسم ملکہ کا ہاتھ پکڑے تخت پر آکر بیٹھا
اور حکم دیا کہ کوئی سامانِ عشرت و کامرانی اٹھا نہ رہے۔
..... پھر تو ہنڈولوں اور جھولوں پر اسّی ہزار پری زادیاں
جا بیٹھیں ..... ملہار لہک لہک کر گانے لگیں .....
جھولوں کے پیڑوں پر جو گھنگھرو نصب تھے، ان سے
آواز چھم چھم کی بلند ہوئی ..... پچکاریاں رنگ کی
چلنے لگیں، دف، دائرہ، الگوجا (کذا الغوزہ)،
قانون، بین، چنگ، جل ترنگ، سب طرح کے
ساز اور باجے تمام باغ میں بجنے لگے۔ صدائے

ارغنوں ہر سمت پھیلی۔ شراب کا دور شروع ہوا۔ عبیر گلال
اُڑنے لگا ..... حکم ہوا آتش بازی چھوٹے ..." ۱۲

طلسم ہوش ربا میں چند جادوؤں کا تعلق بھی موسیقی سے ہے چنانچہ حاکم حجرۂ سوم نقارہ نواز اور حاکم حجرۂ چہارم شہنا نواز کے کردار جلد ششم میں ملتے ہیں۔

نقارہ نواز جب نقارہ پر ضرب لگاتا ہے تو مخالف فوج کے سپاہی بے موت مرتے ہیں۔ احمد حسین قمر نے نقارہ کی جو ہیئت اس داستان میں بیان ہوئی ہے وہ دیو ہیکل نقارہ کی ہے۔ جدید سائنسی تحقیق سے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بلند آواز اگر مسلسل سنی جائے تو یہ کانوں کے لیے ہی نہیں کمزور دل والوں کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے کان کی قوتِ سماعت فوت ہو سکتی ہے۔ کمزور دل والوں کے دل کی دھڑکن بند ہو سکتی ہے۔ ہمارے داستان نگار نے ایک صدی قبل ہی اس تحقیق کے نقوش اپنی داستان میں قلم بند کر دیئے تھے۔ ۱۳

اس دیو ہیکل نقارہ پر ظاہر ہے کہ جب حاکم حجرہ سوم ضرب لگاتا ہوگا تو کیسی بھیانک آواز فضا میں گونجتی ہوگی — آواز کا یہی بھیانک پن انسان کے اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے جس کی وجہ سے فوجِ مخالف بے موت مرتی ہے۔

قمر نے اس نقارہ کو ناکارہ کرنے کی ترکیب بھی بتا دی ہے۔ احول مربع نشین کا گرم خون اس نقارہ کو ناکارہ بنا سکتا ہے چنانچہ امیر حمزہ کا یہ جان نثار نقارہ پر جا کر اپنا سر گردن سے جدا کرتا ہے اس کے جسم کا گرم خون جب نقارہ پر گرتا ہے تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے (جسم سے نکلنے والا خون نقارہ تک پہنچتے پہنچتے سرد ہو جاتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نقارہ پر منڈھے ہوئے چمڑے پر جب خون جم جائے گا تو آواز کیسے پیدا ہوگی۔ غالباً اسی نکتہ کو قمر نے پیش نظر رکھ کر یہ جادو اختراع کیا۔)

اسی طرح حاکم حجرۂ چہارم شہنا نواز کا خاتمہ قمر نے شہزادہ ارکان وحشی کے ذریعہ کر دیا ہے۔ شہزادہ ارکان وحشی کی ترکیب سحر کارانہ ہے۔ مصنفِ داستان اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ موسیقی ارکان کے آہنگ یا سُروں کی بندش کے علاوہ

کچھ نہیں ۔ یہاں ارکانِ وحشی کی ترکیب، منتشر سُر کے لیے استعمال کی گئی ہے لہٰذا شہنا نواز موسیقی کے ذریعہ جادو کرتا ہے۔

موسیقی میں سُر اگر صحیح لگتے ہیں تو راگ راگنیاں سر چڑھ کر بولنے لگتی ہیں ورنہ بے وقت کی راگنی بن جاتے ہیں ۔ اسی طرح اگر موسیقی کے جادو کو کوئی چیز توڑ سکتی ہے تو وہ صرف ارکان یا سُروں کا انتشار ہے۔

داستان نگار منشی احمد حسین قمر نے طلسم ہوش ربا، جلد ششم میں لکھا ہے کہ "حجرۂ ہفت بلا" خاص حقیر مؤلف کا ترتیب کردہ ہے یعنی سابق کو اس کی اصلاً خبر نہ تھی "۔ گویا نقارہ نواز اور شہنا نواز منشی احمد حسین قمر ہی کی اختراعات ہیں۔

اب موسیقی کے سلسلے میں ایک بہت ہی معرکۃ الآرا بیان دیکھئے — افراسیاب نے مشعل جادو کو اپنی مدد کے لیے مدعو کیا ہے۔ مشعل جادو کی یہ خصوصیت ہے کہ اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ وہ سحر کے ذریعہ نقل جسم و روح کرتا ہے اور مخالف فوج کے سپاہی جب اس سے آنکھیں چار کرتے ہیں تو ان کی روح جسم چھوڑ دیتی ہے — افراسیاب نے مخالف فوج کے ان مُردہ سپاہیوں کو تہس نہس کرنے کے لیے آتشبار جادو کے ذریعہ ایک بھیانک آتش کو جلا رکھا ہے جس میں امیر حمزہ کے سپاہیوں کے مردہ جسموں کو ڈلوا دیتا ہے تاکہ مشعل جادو کے خاتمہ کے بعد وہ پھر زندہ نہ ہو سکیں۔ ملکۂ بُراں مشعل جادو سے مقابلہ کرتی ہے۔ تین مرتبہ اختر مروارید سے وہ مشعل جادو کو مارتی ہے لیکن وہ پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ چوتھی بار ملکۂ بُراں کی آنکھیں مشعل جادو سے چار ہو جاتی ہیں اور وہ

"بیکار ہو گئیں لہرا کر زمین پر گریں مشعل نے روحِ بُراں کو ایک طوطیِ زریں بال کے جسم میں بند کر دیا۔"[14]

افراسیاب بُراں کے لاشے کو اپنی نگرانی میں آتشِ سوزاں کے قریب لے جاتا ہے۔ آتش بار جادو آگ میں کھڑا ہے۔ اقتباس دیکھئے —

"آتش بار جادو آگ میں کھڑا ہے۔ پکار رہا ہے اے شہنشاہ لایئے — لاشۂ بُراں مجھے دیجئے۔

افراسیاب نے ساحرہ سے اشارہ کیا۔ ساحرہ نے لاشہ پھینکا، حدتِ آتش سے قریب آگ کے نہ جا سکی۔ آتش بار نے بڑھ کر لاش گود میں لیا۔ لاشہ لیتے ہی ایک چادر میں لاشۂ بُراں لپیٹا۔ افراسیاب سے آنکھ ملائی۔ کہا۔ کیوں او افراسیاب خانہ خراب، تو نے اپنے باپ کو پہچانا۔ منم مہرِ سپہرِ آفتاب عالم تاب عیاری نیرِ برجِ چرخِ خنجر گزاری تیرے آتش بار کو پہلے ہی پکڑ لیا اس کی شکل بن کر آگ میں کھڑا ہوا۔ حفظ میں دادو کو مار کر میں نے روغنِ موسیقار لیا تھا وہ بدن پر ملا ہوا ہے اس روغن پر آگ تاثیر نہیں کرتی۔ اسی روغن میں چادر تر کر کے لاشۂ بُراں لپیٹا ہے۔ اس کا بھی موئے جسم نہیں جل سکتا۔ دیکھ آتش بار میرے پاس موجود ہے۔ یہ کہہ کر لاشۂ بُراں کاندھے پر ڈالا، آگ سے لاشِ آتشبار نکال ایک خنجر اس کے شکم پر مارا لاشِ آتشبار جلنے لگی۔ آتش کی بارش ہوئی۔ لاشۂ بُراں لے کر عمرو بھی آگ میں کود پڑا۔ اندر نقب لگا رکھی تھی، نقب سے نکل گیا۔"[15]

احمد حسین قمر نے یہاں " روغنِ موسیقار " کا بیان کیا ہے۔ موسیقار یعنی ققنس، جس کی چونچ کے سوراخوں سے سُر نکلتے ہیں۔ جب اس کی عمر تمام ہوتی ہے تو وہ کوڑا کچرا جمع کر کے ایک ڈھیر بناتا ہے اور اس پر بیٹھ کر راگ دیپک گاتا ہے۔ کچرے کے ڈھیر میں آگ لگ جاتی ہے وہ خود بھی جل جاتا ہے اور پھر اس کی راکھ سے بیضہ بنتا ہے اور بیضہ سے وہ پھر جنم لیتا ہے

قمر نے اسی اساطیری روایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ موسیقار کا پہلے روغن تیار کیا، پھر اس روغن کو عمرو کے ذریعہ استعمال کروایا کہ اس روغن پر آگ اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ خود آگ ہے۔

طلسم ہوش ربا کی جلدوں میں حسب ذیل اصنافِ موسیقی کا ذکر ملتا ہے:

دھرپد[16] ۔ ترانہ[17] ۔ خیال[18] ۔ ٹھریاں[19] ۔ تروٹ[20] ۔ ساون[21]

غزل[21]۔ ہولی[22]۔ بھاگ[23]۔ برہا[24] اور دادرا[25]۔

طلسم ہوش ربا میں موسیقی کی اصطلاحات و تلازمات دیکھئے :۔

سُر[26]۔ تال[27]۔ سم[28]۔ توڑا[29]۔ گت[30]۔ بکرت[31]
ٹھیکہ[32]۔ لہرا[33]۔ ادھا[34]۔ پچی لینا[35]۔ تان و گٹکری[36]
چکاری[37]۔ الاپ[39]

راگ / راگنی کی مالا دیکھئے کہ پڑھنے والے پر ان کا طلسم سر چڑھ کر بولتا ہے :۔

ایمن[40]۔ بھوپالی[41]۔ دیپک[42]۔ سوہاگ۔ ملہار[43]
کانگڑا[44]۔ کامود[45]۔ جوگیا[46]۔ بھیرویں[47]۔ جنگلا[48]
دیس[49]۔ کدارا[50]۔ پیلو[51]۔ دھناسری[52]۔ نٹ[53]
پوربی[54]۔ گوری[55]۔ مالکوس[56]۔ کھٹ[57]۔

موسیقی کے سازوں کی فہرست دیکھئے جو طلسم ہوش ربا کی مختلف جلدوں میں بیان ہوئے ہیں :۔

مردنگ[58]۔ پکھاوج[59]۔ طبلہ[60]۔ بین[61]
نے[62]۔ طنبورہ[63]۔ ستار[64]۔ اکتارہ[65]۔ سارنگی[66]
شہنائی[67]۔ رباب[68]۔ جلاجل[69]۔ ڈھول[70]۔ دف[71]
چنگ[72]۔ سرود[73]۔ طبل[74]۔ قرنا[75]۔ نقارہ[76]۔ تاشا[77]
دائرہ[78]۔ مجیرا[79]۔ جھانجھ[80]۔ کھنجری[81]۔ نفیری[82]
ترئی[83]۔ کھڑتال[84]۔ ڈفلی[85]۔ ڈگڈگی[86]۔ دمڑو[87]
بیلہ[88]۔ الگوجہ[89] (کذا الغوزہ)۔ قانون[90]۔ نرسنگھا[91]
جل ترنگ[92]۔ بگل[93]۔ طرم[94]۔ نائے رومی[95]۔ ارگن[96]
دلمے[97]۔ ویل[98] ...[99]

موسیقی کے سازوں کی اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ طلسم ہوش ربا کے مصنفین ہندستانی موسیقی اور کرناٹکی موسیقی دونوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں تحن داؤدی اور نَے کنھیاجی کی طرح موسیقی کے یہ دونوں دبستان بھی ایک ہی تھے ان داستان نگاروں کے سامنے نہ فرقہ کی تقسیم کے کچھ معنی تھے اور نہ مختلف مذاہب کی تقسیم کا کوئی مطلب تھا۔ یہ تو وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک انسانیت ہی سب کچھ ہے اور سب انسان ایک ہیں۔

یہ داستانیں ہندستان کی قومی یک جہتی کے نظریات کی کیسی اچھی مثالیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ ان داستانوں پر لکھنے والے انھیں "افیون کی پینک میں لکھی جانے والی داستانیں" کہہ کر خود افیون پی کر خاموش ہو گئے۔

داستان میں تخیل کی مدد سے واقعات کے "گل بوٹے" کھلائے جاتے ہیں۔ مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے ۔۔۔ داستانوں کی یہ تعریف اٹھارھویں صدی تک لکھی جانے والی داستانوں پر صادق آتی ہے لیکن اٹھارھویں صدی میں لکھی جانے والی بعض داستانوں میں اور انیسویں صدی اور اس کے بعد لکھی جانے والی بیشتر داستانوں میں نہ صرف زندگی کی حرارت اپنی تپش کا احساس دلاتی ہے بلکہ یہ داستانیں اپنے عہد کے تہذیبی نقوش کو محفوظ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے داستان کی مروجہ تعریف میں ہمیں ترمیم کرنی ہوگی کہ داستان میں صرف تخیل کے گل بوٹے ہی نہیں کھلائے جاتے بلکہ زندگی کا بیان بھی ہوتا ہے۔ البتہ داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر ہوتے ہیں اور قصہ در قصہ کی تکنیک بروئے کار لائی جاتی ہے۔ داستانوں کی یہی روایت جو زندگی اور اپنے عہد کی تہذیب کو بیان کرتی ہے، اردو ناول کو ورثے میں ملی ہے۔

□□

حواشی :

1۔ محمد حسین جاہ "طلسم ہوش ربا" جلد اول ص۱۳ آٹھواں ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ
2۔ ایضاً ص۱۵۷ 3۔ ایضاً ص۱۵۸
4۔ احمد حسین قمر طلسم ہوش ربا جلد ششم ص۸۲-۱۸۱ دوسرا ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ 5۔ ایضاً ص۱۸۶
6۔ محمد حسین جاہ۔ طلسم ہوش ربا جلد اول ص۶۴۶
7۔ ایضاً جلد دوم ص۳۴
8۔ احمد حسین قمر طلسم ہوش ربا جلد پنجم حصہ اول ص۵۰۱ مطبع نول کشور لکھنؤ تیسرا ایڈیشن

گورنر اتر پردیش
شری بی. ستیہ نرائن ریڈی
۲۱ ستمبر ۱۹۹۲ء کو
ہندستان ایروناٹکس لمٹڈ
میں ہندی پکھوارے
کے اختتام پر
ہندی بحث و مباحثہ
مقابلے میں جیتنے والوں
کو انعام
دیتے ہوئے۔



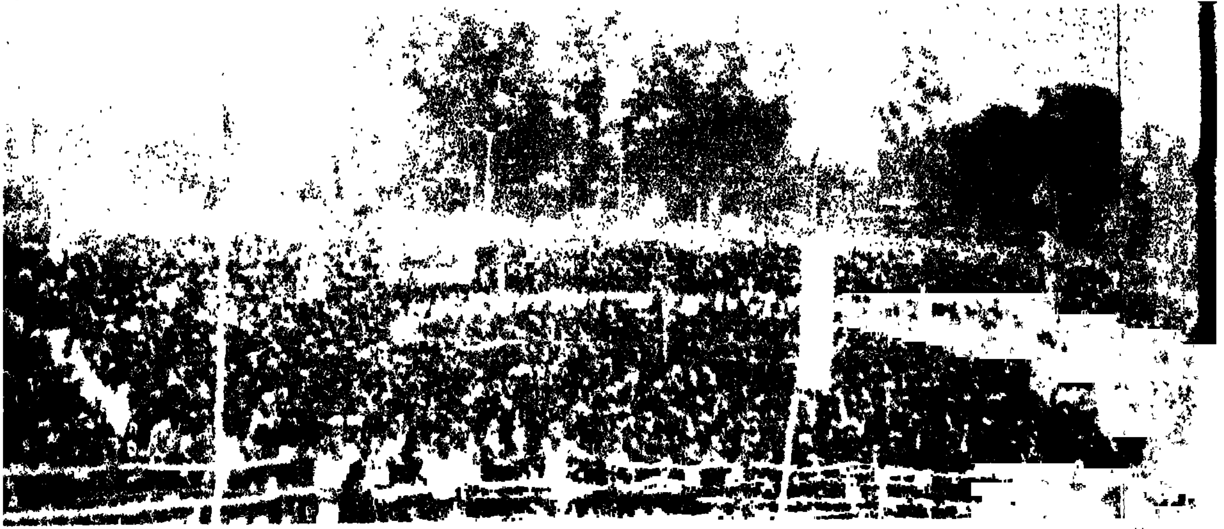
وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ ۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو
لکھنؤ میں محنت کش خواتین کے لئے
ہاسٹل کا سنگ بنیاد
رکھتے ہوئے۔











وزیر اعلا شری سنگھ کلیان سنگھ ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو
بیگم حضرت محل پارک میں اترپردیش ٹکنالوجی فیئر-۹۲
کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش دیکھتے ہوئے۔





اعلا اترپردیش
کلیان سنگھ
ستمبر ۱۹۹۲ء کو
دین دیال اپادھیائے
یادگاری
حضرت محل پارک لکھنؤ
منعقدہ ریلی میں
کرتے ہوئے





وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ ۱۹ راکتوبر ۱۹۹۲ء کو
اینکسی میں اترپردیش ٹیکسٹائل کارپوریشن
کی کارکردگی کا
جائزہ لیتے ہوئے

۹؎ محمد حسین جاہ۔ طلسم ہوش ربا جلد اول ص ۵۴

۱۰؎ ایضاً ص ۹۸ ۱۱؎ ایضاً ص ۵۷۴ تا ص ۵۷۶ ۱۲؎ ایضاً ص ۵۰۰

۱۳؎ ادیب اپنے تخیل سے خیال پیش کرتا ہے، فلسفی اس کو
نظریہ کی شکل دیتا ہے اور سائنس داں اس پر تجربہ کرکے عملی
صورت میں نتائج اخذ کرتا ہے۔

۱۴؎ احمد حسین قمر طلسم ہوش ربا جلد ششم ص ۱۵۰

۱۵؎ ایضاً ص ۱۵۱

۱۶؎ محمد حسین جاہ طلسم ہوش ربا جلد اول ص ۸۷۴

۱۷؎ ایضاً ص ۱۳ ۱۸؎ ۱۹؎ ایضاً ص ۶۴۶

۲۰؎ ایضاً ص ۸۷۴

۲۱؎ ایضاً جلد سوم ص ۲۸ لکھنؤ اشاعت ۱۸۸۹ء

۲۲؎ ایضاً جلد اول ص ۶۴۶ ۲۳؎ ایضاً ص ۱۴۸

۲۴؎ ایضاً ص ۵۷۲ ۲۵؎ ایضاً ص ۵۲۶

۲۶؎ ایضاً ص ۳۱ ۲۷؎ ایضاً جلد چہارم دوسرا ایڈیشن ص ۱۸۹

۲۸؎ ایضاً جلد اول ص ۱۳ ۲۹؎ ایضاً ص ۱۲۱

۳۰؎ ایضاً جلد سوم ص ۸۱۳ ۳۱؎ ایضاً جلد اول ص ۱۳

۳۲؎ احمد حسین قمر "طلسم ہوش ربا" جلد پنجم حصہ اول ص ۲۳۱

۳۳؎ محمد حسین جاہ " " جلد اول ص ۱۵-۱۴

۳۴؎ ایضاً ۳۵؎ ایضاً ص ۸۶۵ ۳۶؎ ایضاً ص ۲۱۷

۳۷؎ ایضاً ص ۲۸۱ ۳۸؎ ایضاً ص ۳۷۱ ۳۹؎ ایضاً ص ۴۲۱

۴۰؎ ایضاً جلد سوم ص ۵۴۰ ۴۱؎ ایضاً ص ۹۴ ۴۲؎ ایضاً ص ۲۰۴

۴۳؎ ایضاً ص ۲۷۹ ۴۴؎ ایضاً ص ۲۰۴ ۴۵؎ ایضاً ص ۹۹۳

۴۶؎ ایضاً جلد اول ص ۲۲۲ ۴۷؎ ۴۸؎ ایضاً ص ۹۷۱

۴۹؎ ۵۰؎ ایضاً ص ۸۶۵ ۵۱؎ تا ۵۷؎ ایضاً ص ۸۷۴

۵۸؎ ایضاً ص ۳۱ ۵۹؎ ایضاً ص ۵۱ ۶۰؎ ایضاً ص ۳۱

۶۱؎ ۶۲؎ ایضاً ص ۱۳۱ ۶۳؎ ایضاً ص ۴۰ ۶۴؎ ایضاً ص ۸۴۶

۶۵؎ ایضاً جلد دوم ص ۴۵۸ ۶۶؎ ایضاً جلد سوم ص ۳۰۲

۶۷؎ ایضاً جلد اول ص ۱۵ ۶۸؎ ایضاً ص ۵۳ ۶۹؎ ایضاً ص ۵۵

۷۰؎ ایضاً جلد سوم ص ۵۶۸ ۷۱؎ ایضاً ص ۵۴۳

۷۲؎ محمد حسین جاہ طلسم ہوش ربا جلد اول ص ۱۳۱ ۷۳؎ ایضاً ص ۲۴

۷۴؎ ایضاً ص ۵ ۷۵؎ ۷۶؎ ایضاً ص ۱۵

۷۷؎ ایضاً جلد چہارم ص ۱۶۴ ۷۸؎ ایضاً جلد اول ص ۲۰۶

۷۹؎ ایضاً جلد دوم ص ۶۰۹ ۸۰؎ ایضاً جلد سوم ص ۹۴

۸۱؎ ایضاً جلد سوم ص ۷۵۴ ۸۲؎ ایضاً جلد سوم ص ۲۱

۸۳؎ ایضاً جلد اول ص ۴۳ ۸۴؎ ایضاً جلد چہارم ص ۶۸۸

۸۵؎ ایضاً جلد اول ص ۷۸ ۸۶؎ ایضاً ص ۳۸۲ ۸۷؎ ایضاً ص ۴۱

۸۸؎ ایضاً جلد چہارم ص ۱۶۶ ۸۹؎ ۹۰؎ ایضاً ص ۵۰۰

۹۱؎ ایضاً جلد اول ص ۴۰ ۹۲؎ ایضاً ص ۷۷ ۹۳؎ ایضاً ص ۴۷۸

۹۴؎ ایضاً جلد سوم ص ۵۰۱ ۹۵؎ ۹۶؎ ایضاً جلد اول ص ۵۳

۹۷؎ ۹۸؎ ایضاً ص ۴۰

۹۹؎ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اپنی تنقیدی تصنیف "طلسم ہوش ربا" میں آلاتِ موسیقی وغیرہ کی تفصیل اسی طرح درج کی ہے لیکن انھوں نے اصناف نغمۂ موسیقی، راگ / راگنی اور سازہائے موسیقی کو ایک ہی میں گڈمڈ کر دیا ہے۔

□□

اپنے معاونین سے

اہلِ قلم معاونین سے پھر گذارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات فل اسکیپ کاغذ پر ایک ہی طرف تحریر کریں اور ادارے کو اصل کاپی ہی روانہ کریں۔ نقل اپنے پاس ضرور محفوظ کر لیں۔

بعض حضرات گزارش کے باوجود کاربن یا زیراکس کاپی بھیج دیتے ہیں جس سے اشاعت میں دشواریاں ہوتی ہیں۔

——— ایڈیٹر

غزلیں

ہر دل میں آگ ، شہر ہے صحرا ہے آگ میں
اتنی بڑھی ہے آگ کہ دریا ہے آگ میں

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے جلتے ہوئے مکان
کیسے ہیں لوگ جن کا تماشہ ہے آگ میں

یہ آج کس نے آگ کے معنی بدل دیے
یہ آج کس نے پھول کھلایا ہے آگ میں

بس صرف میرے گھر پہ نہیں آگ کے ستم
اک حشر سا بپا ہے کہ دنیا ہے آگ میں

وہ مجھ سے کر رہے تھے محبت کا اعتراف
جلنے سے میں نے ان کو بچایا ہے آگ میں

آنکھوں میں اس کی رقصاں ہیں شعلے شباب کے
کیا لطف ہے کہ نرگسِ شہلا ہے آگ میں

مجھ کو جلا کے خود بھی سکوں میں نہیں ہے وہ
تڑپا ہے اس نے مجھ کو جو دیکھا ہے آگ میں

سہیل کاکوروی
۲۶۔ قندھاری لین
لکھنؤ

اگر دیکھے کوئی وحشت میں چہرہ آج انساں کا
تو کہہ دے آئینہ دیوانگانِ پا بجولاں کا

نہیں ظلمت شکن کوئی سوادِ شامِ ہجراں کا
مزاجاً اب ہے بے حد سرد خونِ گرم دہقاں کا

میں خوددارِ ازل فطرت آشنائے اہلِ غیرت ہوں
مجھے منظور کیونکر ہو اٹھانا بارِ احساں کا

ارادوں کے قدم آمادۂ لغزش نہیں ہوتے
اثر مجھ پر نہیں پڑتا کبھی طنزِ حریفاں کا

تصوف جس کو کہتے ہیں بعنوانِ خود آرائی
وہ اک صیقل شدہ آئینہ ہے مردِ مسلماں کا

ہمیں تو ہیں شناسائے رموزِ آبلہ پائی
ہمارے دم سے ہے گل رنگ ہر گوشہ بیاباں کا

مبصرؔ ہیں عیاں اس پر سبھی اسرارِ سربستہ
مصور ہے جو ایسے دور میں شامِ غریباں کا

مسعود احمد عباسی مبصرؔ امروہوی
نگہبا ایکا یونانی ڈسپنسری، شاہ پیر گیٹ، میرٹھ

وحشتِ دستِ جنوں وسعتِ داماں مانگے
ذوقِ نظارہ ہر اک گام پہ طوفاں مانگے

پھر وہی ذوقِ تماشا ہے وہی رنگِ بہار
پھر وہی خنجرِ بیداد رگِ جاں مانگے

پھر وہی جوشِ جنوں ہے وہی نظارۂ شوق
پھر مقابل میں تجھے دیدۂ حیراں مانگے

پھر وہی تیشۂ فرہاد وہی کوہِ گراں
پھر وہی عزمِ جواں خسروِ دوراں مانگے

راس آیا ہے اسے جب سے بیاباں کا سفر
آبلہ پائے جنوں خارِ مغیلاں مانگے

مجھ کو ساقی کا کرم خود ہی پلا دیتا ہے
ہو جو کم ظرف وہی بادۂ عرفاں مانگے

کیا قیامت ہے کہ گھرتے ہی گھٹاؤں کے نیازؔ
مے فروشوں کا پتہ زاہدِ ناداں مانگے

نیازؔ سلطان پوری
بھٹی حبہ دل
سلطان پور

بادشاہ حسین رضوی
سبزی منڈی، جعفرا بازار، گورکھپور

ہلّور
یہ خُلدِ بریں ارمانوں کی

"ادھا گاؤں" ہاتھ میں ہے، کھلی کتاب کے اوراق ہوا کے زور سے پھڑپھڑاتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے پھیل جاتی ہیں، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں۔ سرسوں کے پھول، ہرا بھرا میدان، لمبا سا دالان، ٹوٹی محرابیں، پرائمری اسکول، باؤلی میں تختیاں دھوتے اور چکنی مٹی پوتتے بچے..... پاجامہ، قمیص اور ٹوپی میں ملبوس اس دُبلے پتلے لڑکے کو غور سے دیکھتا ہوں، اس کے نقوش اپنے چہرے پر تلاش کرتا ہوں، آسمان کی طرف سر اٹھائے مسجد کے میناروں، شیو مندر کے چمکتے کلش کے بیچ پھیلا گاؤں، ذہن کے پردے پر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

کچے پکے مکانوں کے سلسلے، پُرپیچ تنگ گلیاں، پرانا امام باڑہ دھول اڑاتی لاریاں، آم کے باغات، بڑا سا ڈھول، تاشے، جھانجھ بوڑھی کاکی کے یہاں سے دیوالی کی رات میں چرائے گئے مٹی کے دیے، مانگ تیجی، گڑیوں کا پیٹنا، میرا بابا کا عرس، الاؤ کے گرد آدھی رات تک قصّوں، داستانوں کا سلسلہ، بزرگوں کی جھڑکیاں، شعری محفلیں۔ پورا قصبہ جیسے سانس لے رہا ہو۔ جہاں پہونچ کر زمانے کی کلفتیں، بے چینیاں ذہنی تناؤ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹ کر قرار مل جاتا ہے۔

ملک میں بہت سے اُتار چڑھاؤ آئے، تقسیم کے بعد کی سرخ آندھی ہو یا آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات۔ ان آندھیوں سے بے پرواہ، پرسکون، آپس میں میل جول اور مشترکہ تہذیب کے وارث یہاں کے باشندوں نے اپنے چاروں طرف جو حصار قائم کر رکھا ہے اُسے کوئی آندھی آج تک ہلا نہیں سکی۔

ترائی کے دامن میں ضلع سدھارتھ نگر کا یہ قصبہ ہلّور اور اس کی تہذیبی وراثت کتنی پرانی ہے اور اس کی جڑیں کتنی گہری ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

عہدِ وسطیٰ میں ایران کے شہر مشہد سے شاہ عبدالرسول صاحب ہندستان آئے اور بادشاہِ وقت کی راجدھانی سے کافی دُور، ترائی میں گوتم بُدھ کی سرزمین لمبنی کے نزدیک ہلّور کو اپنے قیام اور مرکزِ درس و تدریس کے لئے منتخب کیا۔ اس وقت یہ علاقہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہاں پر تھارو لوگ آباد تھے۔ تھاروؤں کے راجہ جوڑی بھتی کی رہائش گاہ یہیں پر تھی۔ کہتے ہیں کہ تھاروؤں کی زبان میں ہلّور بمعنی خزانہ استعمال ہوتا تھا۔

شاہ عبدالرسول صاحب کے کشف و کمال سے متاثر ہو کر تھاروؤں کے راجہ نے ہلّور کو شاہ صاحب کی نذر کر دیا اور خود ترائی کے شمالی جنگلوں کی طرف بڑھ گیا۔ کہتے ہیں کہ عبدالرسول صاحب کے ساتھیوں نے ہلّور کا نام بدل کر دوسرا نام رکھنے کی صلاح دی لیکن شاہ صاحب نے فرمایا کہ:

> "ابھی تک ہلّور کو ظلم و جبر اور جہالت کی راجدھانی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا مگر اب اسے علم و فن اور اخلاص و مروت کی راجدھانی کے طور پر جانا جائے گا۔"

یہ کام انھوں نے اپنے دورِ حیات میں جا کر دکھایا۔ نورِ ایمانی کی شمع جو انھوں نے روشن کی، اس نے پورے علاقے میں اپنی کرنیں بکھیر دیں۔ ان کی شہرت مشک کی طرح گرد و نواح میں پھیلتی چلی گئی، دُور دراز کے علاقوں سے لوگ ان کے پاس حصولِ علم کے لئے آتے اور فیض یاب ہوتے رہتے۔ دیکھتے دیکھتے پوری ترائی، یہاں تک کہ نیپال میں بھی بہت سے لوگ ان کے مُرید ہو گئے۔ ان کی بزرگی اور روحانیت نے عوام کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ پیری مریدی کو انھوں نے پسند نہیں کیا اور نہ ہی اپنا کوئی سلسلہ چلایا۔

ہر سال ساتویں ذی الحجہ کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے ان کے عقیدت مندوں کی بھیڑ اکٹھا ہوتی ہے۔ منتیں پوری ہونے پر لوگ ان کے مزار کو دودھ سے نہلاتے ہیں، چادر چڑھاتے ہیں لیکن چڑھاوا وصول کرنے یا کسی قسم کی کوئی چیز لینے دینے کا یہاں کوئی رواج نہیں ہے۔ نہ کوئی ٹرسٹ نہ کوئی مجاور۔ ایک فقیر مزار کی دیکھ بھال کرتا ہے اسی کے خاندان کے افراد پشت در پشت یہ کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ قصبہ کتنا پرانا ہے، اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ویسے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ سوری کے عہد میں یہ قصبہ کافی اہمیت کا حامل رہا ہوگا، اسی لیے اس نے اپنے بندوبست میں بلہور کو تپّہ کا درجہ دیا اور شاہ عبدالرسول صاحب کے نام پر آباد گاؤں رسول پور کو اس علاقہ کے پرگنہ کا درجہ دے دیا۔

اس قصبہ کے لوگوں کی روحانی پاکیزگی، سیادت اور بزرگی کا تذکرہ اورنگ زیب نے بھی کیا ہے۔ عالمگیر ثانی نے کئی گاؤں بطور معافی عطا کیے اور یہ سلسلہ آگے تک چلتا رہا۔ آصف الدولہ نے بھی سادات کی اس بستی کی شہرت سُن کر یہاں ایک امام باڑہ اور اہلِ ہنود کے لیے مندر بنوانے کی پیش کش کی۔ قصبے کے وسط میں طویل و عریض امام باڑہ اور مشرقی کنارے پر شیو جی کا پُرانا مندر آصف الدولہ کی مالی اعانت سے تعمیر ہوا، جو آج بھی عہدِ رفتہ کی عظمت اور قومی یکجہتی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

شاہ عبدالرسول کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی نسل کے لوگوں نے کبھی دربار کی طرف رُخ نہیں کیا اور نہ کبھی رعبِ شاہی سے مرعوب ہوئے۔ انگریز سرکار کے حکام، اس قصبے میں آنے سے گریز کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ کبھی انگریزوں کے لائل نہیں رہے، جس کا اعتراف انگریزوں نے ۱۸۴۳ء کے گزٹ میں خود سے کیا ہے۔

بیگم حضرت محل نے نیپال جاتے ہوئے بلہور میں قیام کیا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی کافی قدر و منزلت کی اور بڑی تعداد میں نیپال کی سرحد تک پہونچانے بھی گئے تھے جس کی خبر پاتے ہی حکومتِ انگلشیہ کے اعلا افسران مشتعل ہوا تھے، اس سے پہلے کہ کوئی قہر نازل ہوتا، راجہ بانسی کی سفارش پر (جن کے اجداد شاہ عبدالرسول صاحب کے معتقد تھے) معاملہ رفع دفع ہوا۔

متوسط درجے کے زمیندار اور نیم متمول قسم کے لوگوں کی اس بستی میں کتب بینی اور شعر و سخن کا کافی چرچا رہا ہے۔ حقے اور الاؤ کے گرد بیٹھ کر راتوں میں دیر تک داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ، قصۂ رستم و سہراب اور آلھا اودل پڑھی جاتیں۔ غالب، میر، مومن، میر انیس، مرزا دبیر کے مراثی اور دیا شنکر نسیم کی مثنوی کے ذکرے رہتے۔ آئے دن طرحی اور غیر طرحی نشستیں اور مسالمے ہوتے رہتے۔ اس ماحول نے لوگوں میں سخن فہمی کے ساتھ ساتھ ذوقِ شاعری بھی پیدا کیا اور کئی اچھے شاعر و ادیب پیدا کیے۔

عشرت بلہوری، اعجاز بلہوری اور قیس بلہوری کا شمار یہاں کے کہنہ مشق شعرا میں ہوتا ہے ان حضرات کو زبان اور فنِ شاعری پر خاصی دسترس تھی اور انھوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ شاعری میں بھی اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا۔ ایک زمانے میں محمد عاقل صاحب کے تنقیدی مضامین اور قیس بلہوری کی غزلیں 'نگار' میں شائع ہوتی رہی ہیں بطور شاعرانہ تعلی قیس صاحب فرماتے ہیں ؎

مالکِ ملکِ فصاحت قیس بلہوری ہوں میں!
مجھ سے بڑھ کے داغ کی ہرگز زباں دانی نہ تھی

سادات رضویہ کی بستی ہونے کی وجہ سے یہاں نوحہ قصیدہ اور مرثیہ لکھنے والوں کی خاصی تعداد رہی ہے۔ آج بھی علامہ شمر بلہوری کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان کے علاوہ فہیم، باقر، نائل، جمال، عزم، فہیم، عزیز، شاہد، آمر اور کئی اچھے شعراء ہیں جو باہر کے

مشاعروں اور مسالموں میں شریک ہو کر دادِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔

حسن عباس فطرت ہلوری کا نام دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں جن کی ادبی تخلیقات، رپورتاژ اور تنقیدی مضامین ہندستان پاکستان اور ایران کے جریدوں میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں انھوں نے بہت سی کتابوں کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس وقت پونا میں ہیں اور صحافت سے وابستہ ہیں۔

ڈرامہ نگاری میں سلطان احمد رضوی اور ریڈیو فیچر میں حسن رضوی نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ نئے شعراء میں اطوار حسین رضوی رزم اور شکیل ہلوری نے اپنی پہچان بنالی ہے۔

کافی طول و عرض میں پھیلا، چاروں طرف سے ہرے بھرے کھیتوں، باغوں اور چھوٹے چھوٹے مواضعات سے گھرا، راپتی ندی سے کوئی دو میل دُور جنوب میں واقع دس ہزار سے اوپر آبادی کا یہ قصبہ اپنی مخصوص پہچان رکھتا ہے۔ خاتمۂ زمینداری کے بعد عام طور پر متوسط درجے کے زمینداروں کو مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہلور پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ یہاں کے لوگ پہلے ہی سے بیدار تھے اور صرف زمینداری پر ان کا دار و مدار نہیں تھا۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ تھے اور سرکاری ملازمتوں میں آ گئے تھے۔

یہاں کے لوگ بسلسلۂ ملازمت ملک کے چاہے جس حصے میں رہیں، ماہ محرم کے آتے ہی وہ اپنے قصبے میں لوٹ آتے ہیں۔ محرم ان کے لیے محض ایک مذہبی فریضہ نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے یہ ان کی کلچرل پہچان بن گیا ہے۔ بلاتفریق مذہب و ملت تقریباً ہر گاؤں میں تعزیے رکھے جاتے ہیں۔

یوں تو چاند رات ہی سے قصبے میں مجلسوں اور ماتمی جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن نویں محرم مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔ جب عالمگیر ثانی کے وقف کی جانب سے بڑا تعزیہ چوک پر آتا ہے، جسے دیکھنے کے لیے ہزاروں کی بھیڑ اُمنڈ پڑتی ہے۔

اتنی بڑی بھیڑ! نہ کہیں پولیس نہ سیکورٹی فورس۔ آج تک کبھی کسی قسم کی شکایت نہیں ملی۔ شہروں میں جب محرم اور درگا پوجا یا دیگر مذہبی جلوسوں کے ساتھ پولیس دستوں کی چوکسی دیکھتا ہوں تو بے ساختہ اپنا قصبہ یاد آجاتا ہے۔ فرقہ پرستی کا عفریت جب ایک ایک کر کے شہروں کو نگل رہا تھا اس وقت بھی یہ گوشہ پوری طرح شانت اور پُرسکون رہا۔ یہاں جو آپسی میل، لگاؤ اور اپنائیت کا جذبہ ہے وہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور قوت بھی۔ اس کی جڑیں کچھ اتنی ہی گہری ہیں جتنی کر ریٹھے کے اس بوڑھے درخت کی ہوں گی جسے شاہ عبدالرسول صاحب نے لگایا تھا اور جو آج بھی سر اٹھائے کھڑا ہے۔



غزل

رات کا منظر جواں تھا اور ہم
اس کی یادوں کا دُھواں تھا اور ہم

چاندنی بکھری ہوئی تھی جھیل پر
سر پہ نیلا آسماں تھا اور ہم

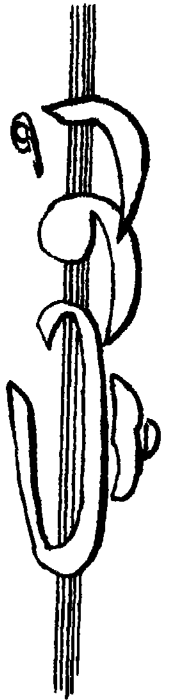
آڑے ترچھے راستوں پر چل پڑے
دل امیرِ کارواں تھا اور ہم

شام کوئی شامِ تنہائی نہ تھی
آہٹوں کا سا گماں تھا اور ہم

دُور سرحد پار تھا اس کا مکاں
راہ میں دریا رواں تھا اور ہم

سیّدہ شان معراج

تارن تکلی
شاہجہاں پور



سکھری گگریا میں رہی اپنا رُوپ نہار
پنگھٹ پہ ہر ہی آگئے ڈولی لیے کہار
لوٹ کے ڈھونڈو گے ہمیں، ہم کیسے لیں مان
سپنے میں ہوتی نہیں، رُوپ ڈھلے پہچان

مورت ہے تو پیار کی، یا دیوی کا رُوپ
نس دن میں پوجا کروں، دے چندن کی دھوپ
رُوپ ترا پہچان لوں، ایسی کہاں نگاہ!
میں اک قطرہ اور تم، ساگر ایک اتھاہ

بچپن پربھات کی کرن، یووَن چڑھتی دُھوپ
عمر آخری شام ہی، رنگ رہے نہ رُوپ
وقت بنے گا فاصلہ، سپنے ہوں گے دُھول
دُھوپ ڈھلے گی رُوپ کی، تم جاؤ گے بھول

ایسا نہ دیکھا کہیں، گرماتا سا رُوپ
تم پونم کا چاند ہو، یا ساون کی دُھوپ
آدھی رات آکاش میں، جلا رُوپ کا دیپ
تن من اُجلا ہو گیا، جو بھی گیا سمیپ

بازگشت کے رُوپ میں، بدل بدل کے رُوپ
کیا کیا دکھلائے نہیں ہم نے رنگ انوپ
کہہ دو لے جائیں کہیں، سپنے اپنا رُوپ
دیواروں کو پھاند کے، آنگن آئی دُھوپ

ہمیں نچاتا ہے کوئی، ہے اِتنا انداز
مگر نظر آتے نہیں، وہ دھاگے اعجاز

بھگوان داس اعجاز
ڈی - ۳۵۱، بلجیت نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸



بیوپاری ہر آدمی، ہر ناتا بیوپار
ایسے کیسے ہو بھلا دُنیا کا اُدّھار

اک کو سوکھی روٹیاں، دوجا کھائے کھیر
دونوں کی ماں ایک ہی، الگ الگ تقدیر

کہیں پہ ندیا خون کی، اور کہیں پہ آگ
سر پر رکھے پوٹلی، بھاگ مسافر بھاگ

کیا تجھ کو معلوم ہے، لالچ کا اتہاس
سرمایہ جتنا بڑھے، بڑھتی جائے پیاس

دُنیا کی کیا سوچتے، تھمی نہ اپنی کھوج
اپنے ہی پریوار کا اُٹھا نہ ہم سے بوجھ

پرویز اختر
محلہ قاضی سرائے، چاندپور
ضلع بجنور
۲۴۶۷۲۵

ڈاکٹر نگار فاطمہ ہاشمی
۳۶ - نادان محل - لکھنؤ

نشتر سندیلوی

انیسویں صدی میں جہاں فانی بدایونی، سائل دہلوی، جگر مرادآبادی، ریاض خیرآبادی، بیخود موہانی اور واقف سیتاپوری جیسے نامور شعراء پیدا ہوئے وہیں ایک ایسا ستارہ بھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا جس کی شعاعیں اس کی اپنی بے نیازی کی وجہ سے اپنے زمانے میں تو منظرِ عام پر نہ آسکیں لیکن جب بھی کسی اہلِ قلم نے قصبہ سندیلہ کی ادبی فضا کو اجاگر کیا تو یہ شخصیت ایک ممتاز شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئی۔ یہ شخصیت باکمال اور ماہرِ فن شاعر چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی کی ہے۔

چودھری وزیر حسن نشتر ۱۸۹۷ء میں قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا نام محمد حسن تھا۔ نشتر صاحب کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی۔ جہاں آپ نے اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی نیز فارسی کی بہت سی کتابیں مولوی سید کاظم حسین عرف میرن صاحب اور اپنی والدہ کے نانا مولوی سید توکل حسین صاحب سے پڑھیں۔ بعد ازاں دسویں درجہ کا امتحان لکھنؤ سے پاس کیا اور پھر آپ کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا اور آپ سندیلہ واپس آگئے۔ یہیں ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔ آبر گنوری نے نشتر کے انتقال پر اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

رنج بجا ہے شعر و ادب کے آبر مقدر پھوٹ گئے
ضرب پڑی اک روح پہ کاری دل کے رشتے ٹوٹ گئے
چرخِ سخن کا روشن تر اک اور ستارہ ڈوب گیا
بارہ ستمبر سن اڑسٹھ کو نشتر ہم سے چھوٹ گیا[3]

جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے آپ نے کچھ عرصہ تک کورٹ آف وارڈس اور کمشنر آفس جھانسی میں ملازمت کی لیکن ان کا دل ملازمت میں نہ لگا اور نوکری سے استعفا دے دیا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ اپنی جائداد وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ لیکن طبیعت میں استغنی بے نیازی تھی کہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بالکل نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا انتظام ان کے بڑے بھائی صدیق حسن نہاد کرتے تھے۔

نشتر صاحب شاعری میں اتنا کھو چکے تھے کہ اپنے لباس وغیرہ کی بھی فکر نہیں تھی۔ انھوں نے کبھی اس بات کی فکر نہیں کی کہ وہ اپنے کلام کو محفوظ رکھیں۔ جب وقت موڈ ہوا شعر کہا اور کاغذ کے کسی پرزے پر لکھ لیا۔ بقول ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی:

> "نشتر صاحب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ فنا فی الشعر تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ان پر خود رفتگی کا عالم طاری رہتا تھا۔ گھر بار اور اہل و عیال کی ذمہ داریاں ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے کو تمام ذمہ داریوں سے مبرا کر رکھا تھا۔"[2]

نشتر صاحب کا زیادہ تر وقت شعر و ادب کی محفلوں میں گزرتا تھا۔ شعری نشستوں کے علاوہ اپنے یہاں بھی شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کرتے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "لمعاتِ نشتر" کے نام سے سید سخی احمد ہاشمی (استاد شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد) کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۸ء میں پاکستان سے چھپا ہے۔

اس مجموعہ کا بیشتر کلام مولانا عبدالعلی شوق سندیلوی کی کتاب "اصلاح سخن" سے لیا گیا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں نشتر صاحب کے صاحبزادے مسلم سندیلوی، جو خود بھی شعر کہتے ہیں، نشتر صاحب کی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ "نظمیات نشتر" کے نام سے شائع کرایا ہے
نشتر سندیلوی ایک سادہ مزاج انسان تھے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ان کی شخصیت اور فن پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:۔

"نشتر صاحب کو فارسی اور اردو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اس پر آرزو صاحب کی اصلاح۔ اس لیے ان کے اشعار بہت رواں، آبدار اور سلیقہ سے ڈھلے ہوئے لگتے ہیں۔ غزل کے مضامین میں بھی سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی کی آمیزش ہوتی ہے۔ پست، پُرپیچ، مبہم یا مبتذل قسم کے مضامین سے قطعی اجتناب کرتے تھے۔ طبیعتاً نشتر صاحب بہت ملنسار، خوش گفتار، وضعدار اور بہت بااخلاق شخص تھے اپنے ان تمام معاصرین کو جو سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں تشریف لاتے، اپنے یہاں ضرور مدعو کرتے تھے بعض کا تو قیام ہی ان کے دولت خانے پر ہوتا تھا اور ان کے وہاں بھی کسی کسی ..... وقت شعری نشست ہو جایا کرتی تھی"۔[۳]

نشتر صاحب شروع میں کمال تخلص کرتے تھے لیکن ۱۹۱۲ء سے انھوں نے اپنا تخلص بدل کر نشتر کر دیا۔ ہنر سندیلوی کی صحبت اور ہمت افزائی نے نشتر صاحب کے فن کو کافی نکھارا ان کے انتقال کے بعد نشتر صاحب نے علامہ آرزو لکھنوی کو اپنا استاد بنالیا کیونکہ آرزو صاحب منشی التفات رسول ہاشمی تعلقہ دار سندیلہ کے استاد تھے اور سید التفات رسول نے آرزو لکھنوی کو سندیلہ بلایا تھا اور ان کے مشورے سے اپنے یہاں کے سالانہ مشاعرے کو فروغ دیا تھا۔ آرزو صاحب اس مشاعرے کے منتظم خصوصی ہوتے تھے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک آرزو صاحب کا مستقل قیام سندیلہ میں ہی رہا۔ ان کی صحبت اور شاگردی نے نشتر کے فن میں چار چاند لگا دیے۔ آرزو، نشتر کا شمار اپنے چہیتے شاگردوں میں کرتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مسدس میں یوں کیا ہے ؎

سبق آموز سیاست ہے ترا نظم و نسق
کہ الٹ جاتا ہے ادنیٰ سے اشارے میں ورق
توسنِ طبع سے طے ہوتا ہے صحرا لق و دق
جنبشِ خامہ سے دل ہوتا ہے فولاد کا شق
ہے سب آلات سے اعلیٰ یہ گراں تر تیرا
چاک کرتا ہے رگِ سنگ کو نشتر تیرا

نشتر خود بھی آرزو لکھنوی کی بہت عزت کرتے تھے۔ آرزو کے انتقال پر ان کو سخت صدمہ ہوا ان کو اپنی دنیا ویران نظر آنے لگی۔ ان کا یہ شعر ان کی دلی کیفیات کا آئینہ دار ہے ؎

بجھے دل میں کہاں سے لاؤں نشتر
جو رونق تھی چراغِ آرزو سے

نشتر نے شاعری کی تقریباً سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے جس میں علامہ آرزو کا سا انداز بیان اور زبان کی گھلاوٹ تو نہیں ہے لیکن اشعار میں کہیں کہیں مترنم اور سبک الفاظ کے استعمال سے اس کی دلکشی میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ایک غزل پیش خدمت ہے ؎

افسردہ دل کی آہ رسا کو خبر نہیں
بجھ بھی گیا چراغ، ہوا کو خبر نہیں
قاتل کے دستِ سرخ میں مجھ باوفا کا خون
یوں مل گیا کہ رنگِ حنا کو خبر نہیں
نکلی ہے منھ سے بے خودیِ شوق میں جو خود
بابِ اثر کدھر ہے دعا کو خبر نہیں
کھوئی گئی ہے دیکھ کے شکلِ مریضِ غم
کس حال میں ہے خود یہ قضا کو خبر نہیں
پیاسے لہو کے بیٹھے ہیں دشت جنوں کے خار
نشتر یہ ان کے آبلہ پا کو خبر نہیں

نشتر کی غزلوں میں جذبے کے ساتھ فکر کی پرواز اور تخیل

کی بلندی نے کچھ اور ہی کیفیت پیدا کر دی ہے شعر ملاحظہ ہو ؎

آنکھ لبریز اشک ہے یعنی
رس چلا ہے پھر آبلہ دل کا

غم کی حالت میں رونا اور آنسو بہانا انھیں قطعی پسند نہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کہہ کے یہ پلٹے ہیں آنسو آنکھ تک آئے ہوئے
آبروئے غم کی گنوا دیں گے تو کیا پائیں گے ہم

نشتر کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے اقبال، جگر اور فانی کے رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ سندیلہ کے مشاعرہ میں جگر نے ایک غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آکے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

نشتر کا انداز بھی بہت کچھ جگر کی اس غزل کی پیروی کر رہا ہے ؎

ہے وہی قفس مرا گھر صیاد ہی کام پڑنا ہے دام سے
مجھے کیا چمن کے سلام سے مجھے کیا گلوں کے پیام سے
مرا حال زار ہے زار تر جسے دیکھتا تھا زمانہ بھر
تمھیں فرض کیا تھا کہ دیکھتے مجھے آکے منظرِ عام سے
نہیں اب مرا کوئی آسرا، ہوں چراغ منتظرِ فنا
شبِ غم کی دیکھوں گا صبح کیا، یونہی جھلملاتا ہوں شام سے

نشتر کی غزلوں میں عشق و محبت کی روایتی داستان کے علاوہ حقیقت کی آمیزش بھی دکھائی دیتی ہے۔ صوفیانہ خیالات سے پُر ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ہوس کوش تماشا ہے ترا دورِ حیات
زیست طوفانِ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی کہتے ہیں جس کو یہ عناصر کا طلسم
اک حسیں خواب کی دنیا کے سوا کچھ بھی نہیں

زندگانی اک کہانی ہے غمِ بیداد کی
سانس جو آتی ہے اک آواز ہے فریاد کی
ہستیِ موہوم اور پھر اس پہ امیدِ ثبات
پائیداری تا بہ کے ایوانِ بے بنیاد کی

چمن کو جگمگایا تیرے جلووں کی نمائش نے
پتہ بتلا رہی ہے شعلۂ گل کی لپک تیرا

جہاں تک نظم کا تعلق ہے، نشتر صاحب علامہ اقبال سے کافی نزدیک نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں "موجۂ بیباک"۔ "شکست"۔ "تمکینِ آدم"۔ "بے خودی"۔ "علامہ آزاد کی یاد میں"۔ "اقبال"۔ "سیاسی مہر" اور "مست الست" کافی مقبول ہیں۔ نظم میں ان کا انداز زیادہ تر فلسفیانہ دکھائی دیتا ہے جس میں سنجیدگی، سادگی، سلاست، روانی اور پائداری کے ساتھ ساتھ کیف و اثر بھی موجود ہے۔ بطور نمونہ نشتر کی ایک نظم "خدا" کے چند اشعار پیش ہیں ؎

میں اس کا ہوں جو صحرا کو بھی دریائے رواں کر دے
فلک کو جو زمیں کر دے زمیں کو آسماں کر دے
جو وہ چاہے بھرے گلشن کو تاراجِ خزاں کر دے
کرم کر دے تو شاخِ خشک کو بھی گلفشاں کر دے
جو وہ چاہے تو اہلِ کارواں کو گم نشاں کر دے
جو وہ چاہے تو بچھڑوں کو شریکِ کارواں کر دے
جو وہ چاہے تو ہوں غفلت میں بھی آثارِ بیداری
جو وہ چاہے تو بیداری کو بھی خوابِ گراں کر دے
جو وہ چاہے تو بخشے آبِ حیواں ابرِ باراں کو
زمینِ شور کو چاہے چمن زارِ جناں کر دے
جو وہ چاہے تو ناممکن کو ممکن کر کے دکھلا دے
جو وہ چاہے تو برگِ کاہ کو کوہِ گراں کر دے

نشتر نے تاریخیں بھی کہی ہیں جس میں دلی جذبات کے ساتھ ساتھ

ان کی نمی خوبیاں بھی اُجاگر ہوتی ہیں۔ اپنے عزیز دوست سید محمد علی رضوی بلگرامی کی وفات پر آپ نے ان کی تاریخِ وفات لکھی تھی ۔۔ ملاحظہ ہو ۔۔

جہاں تیرہ و تار دل سوگوار
شگفتہ گل آنکھوں میں قلب فگار
ہے قطرۂ شبنم اشکِ یتیم
یہ دم بھر میں اُف انقلابِ عظیم
کہ ہر دوی سے لے کے تا بلگرام
جدھر دیکھئے ایک ماتم ہے عام
تجسس کا تھا دل کی دنیا میں جوش
تجسس میں بیٹھا تھا نشتر خموش
کہ ناگاہ گردوں سے آئی صدا
غروب آج مہرِ وکالت ہوا
۱۹۳۶ء

غرضکہ نشتر اُردو زبان کے ایک مستند اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شعر و شاعری کی خدمت میں گزارا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (سابق صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد (سندھ) یونیورسٹی) نے کتنی سچی بات لکھی ہے:۔

"حضرت نشتر سندیلوی موجودہ دور کے ایک باکمال اور پختہ کار شاعر ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے استاد حضرت آرزو لکھنوی کے رنگ میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ حضرت آرزو کی طرح نشتر بھی لکھنؤ کی شرافت اور وہاں کی تہذیب و ادبیت کے علمبردار ہیں ان کا قلم ان کی وضع قطع اور ان کا رکھ رکھاؤ سب کا سب اسی مذاق کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب جو عرفِ عام میں "برائے ادب" کہلایا جاتا ہے حضرت نشتر کے یہاں "سراپا ادب" ہے اور وہ ہر غیر ادبی عنصر سے پاک ہے۔ سادگی زبان، تازگی بیان، معنی آفرینی، سوز و گداز اور رفعتِ مضامین وغیرہ ان کے کلام کی عام خوبیاں ہیں"۔ ۴ے

□□

حواشی

۱ے نظمیات نشتر ص۱۱
۲ے تذکرہ مشاہیر سندیلہ ص۲۹۴
۳ے نظمیات نشتر ص۶
۴ے لمعات نشتر ص۳۶

کچھ اپنی باتیں ۔۔ ص۱۸ کا بقیہ

۳. بچوں کا اقبال ۴. مکاتیب عبدالحق بنام محوی
۵. نذر تخلص ۶. ماہنامہ لسان الصدق (مدیر: ابوالکلام محی الدین آزاد)
۷. ہفتہ وار پیغام بنگران ابوالکلام آزاد (تقدیم ثانی)

(ج) اشاریے

۱. غالبیات ۲. انیس نما
۳. ہندوستان میں اقبالیات ۴. وصیت رائے نواب رائے پریم چند
۵. یادگار سلیمان ۶. یادگار آزاد۔

میری شادی کا غذی محلہ (بہار شریف) میں مولوی جلال الدین احمد کی صاحبزادی تحسین النساء سے ۱۹۵۳ء میں ہوئی اور میری زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی۔ اور آج مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ اب تک ہم دونوں نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ خوش گوار زندگی گزاری ہے اور یقین ہے کہ باقی زندگی بھی اسی طرح خوشیوں کے درمیان گزر جائے گی۔

□□

غزلیں

ٹوٹتے خوابوں کو منظر دے دے
یعنی صحرا کو سمندر دے دے

یہ حصارِ در و دیوار نہ دے
پالنے والے مجھے گھر دے دے

آبلہ پائی مقدر میں رکھ!
ہاتھ اٹھاؤں تو گلِ تر دے دے

امتحاں دے چکے ہم پیاس کا اب
تشنگی کے لیے سمندر دے دے

دے دے اعزاز جبیں کو میری
کوئی سجدہ تہِ خنجر دے دے

میرے ہاتھوں کو قلم کر دے مگر
جو نہ خم ہو کبھی وہ سر دے دے

خود سے بھی خود کو چھپانے کیلئے
ایک احساس کی چادر دے دے

ملکہ نسیم
۱۲/ایف۔ فارسٹ کالونی
چار املی۔ بھوپال

روز اُٹھاتی رہتی ہے سر خواہش کیوں
جسم کا ہر حصّہ کرتا ہے لغزش کیوں

چاروں طرف ہریالی، بادل آوارہ
خشک ندی پر پیار کی پہلی بارش کیوں

صبح کی سیر بزرگوں کو راس آئے مگر
لمبی عمر کی اتنی زیادہ کوشش کیوں

دُھوپ میں پیسے چُنتے چُنتے پاؤں جلیں
ہر خط میں گھر والوں کی فرمائش کیوں

محل کھنڈر بن جاتے ہیں رفتہ رفتہ
آخر چھنتی جاتی ہے آسائش کیوں

قید ہو گھر میں تم جاوید اک مُدّت سے
بستی والوں سے آخر یہ رنجش کیوں

ملک زادہ جاوید
سی ۱۳۳۹- اندرا نگر
لکھنؤ

یہی صبح لکھ رہی ہوں یہی شام لکھ رہی ہوں
میں ورق ورق پہ دل کے ترا نام لکھ رہی ہوں

یہ حدیثِ زندگی ہے کہ میں شعر کی زباں میں،
جو گزر رہی ہے مجھ پر وہ تمام لکھ رہی ہوں

جو مہک ترے بدن کی مری سانسوں میں بسی ہے
انھیں سانسوں کا مہکتا میں سلام لکھ رہی ہوں

جو رفاقتوں کا پیماں، وہی زندگی کا حاصل
کہ میں کائنات اپنی ترے نام لکھ رہی ہوں

یہ تری حسین آنکھیں، یہ شفق نواز ڈورے
اِنھیں بادہ لکھ رہی ہوں اُنھیں جام لکھ رہی ہوں

کوئی راز اب نہیں ہے یہ مری غزل سرائی
سرِ بزم پڑھ رہی ہوں، سرِ عام لکھ رہی ہوں

مری آرزو کا زینت یہ حسین آئینہ ہے
غم و درد کی فضا میں جو کلام لکھ رہی ہوں

زینت تسنیم
نشاط لائبریری۔ محلہ تارین
شاہ جہاں پور

لیقؔ رضوی
بی - ۱۴۳۸، کریلی، الہ آباد

اردو میں شخصی مرثیے کی روایت

— ۶ —

حالیؔ کے بعد جن شعرا نے شخصی مرثیے کو ایک علاحدہ صنفِ سخن کی طرح اپنایا، ان میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ لکھنوی کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے (۹) مرثیے تصنیف کیے ہیں۔ 'صبحِ وطن' کا تیسرا حصہ شخصی مرثیوں پر ہی مشتمل ہے۔ چکبستؔ نے حالیؔ کی طرز پر داستانِ غم بیان کرنے کے بجائے مرنے والے کے صفات نیز اس کے انتقال سے ہونے والے سماجی نقصان کو اپنے مرثیوں کا موضوع قرار دیا ہے زبان و بیان کی خوبیوں اور اظہار کی بے ساختگی نے ان مرثیوں کو شاعری کے لازوال مرقعے بنا دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیبؔ:

"چکبستؔ کے مرثیے شاعری کے وہ کارنامے ہیں کہ اگر حالیؔ کے مرثیۂ غالبؔ کو الگ رکھ دیں تو ان کا جواب کہیں نہ ملے گا۔" ؎۵

چکبستؔ نے ۱۹۰۱ء میں ممتاز مراٹھا لیڈر مہادیو گووند رانا ڈے کی موت پر ایک پُردرد مرثیہ کہا تھا جس میں موصوف کی شخصی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی موت پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ مرثیہ مسدس کے فارم میں ہے اور اس میں کل (۱۷) بند ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

تیرے فراق میں ہے یہی حال قوم کا
تو ناخدائے کشتیِ اصلاحِ حال تھا
طوفان جو بُغض و جہل و تعصب کا تھا بپا
تھی ان خرابیوں میں تری ذات رہنما
تجھ کو تو موت لے گئی باغِ نعیم میں
چھوڑا ہمیں دو آبۂ اُمید و بیم میں

چکبستؔ نے دوسرا شخصی مرثیہ ۱۹۰۴ء میں اپنے جواں سال دوست پنڈت پرتاپ کرشن گرٹو کی موت پر کہا تھا۔ یہ مرثیہ بھی مسدس کے فارم میں ہے اور اس میں کل ۲۱ بند ہیں۔ مرثیے کے تمام بند چکبستؔ کے درد و غم کے آئینہ دار ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

اے فدائے یاس و حرماں اے شہیدِ آرزو
خاک کے دامن میں کیسا بے خبر سویا ہے تو
چشمِ دل کو باعثِ حیرت ہے تیری جستجو
پھول تھا پر ہاتھ سے جاتا رہا مانندِ بُو
لالہ و گل سے طبیعت تو نے بہلائی نہیں
کیا ہوا باغِ جہاں کی تجھ کو راس آئی نہیں

چکبستؔ کا تیسرا مرثیہ 'ماتمِ یاس' (۱۹۱۱ء) پنڈت اجودھیا ناتھ آغا کی موت پر کہا گیا ہے۔ یہ مرثیہ بھی مسدس کے فارم میں ہے اور اس میں کل (۱۳) بند ہیں۔ مرثیے کا پہلا بند ہی اپنے اندر رنج و غم کی ایک پوری دنیا آباد کیے ہوئے ہے ملاحظہ ہو ؎

اے جوانی کے مسافر اے اجل کے میہماں
سو گیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں
تھک کے نیند آئی ہے ہوتا ہے یہ چتون سے عیاں
نیم باز آنکھوں میں ہے کیفیتِ خوابِ گراں

کارِ دُنیا سے یوں کوئی بے خبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دُولھا کبھی یوں سوتا نہیں

چکبست نے اپنے عہد کے ممتاز صحافی گنگا پرشاد ورما کی موت پر ایک پُردرد مرثیہ کہا تھا، جس میں موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی موت سے ہونے والے سماجی نقصان کا ماتم کیا ہے۔ مسدس کے فارم میں کہا جانے والا یہ مرثیہ ۱۹۱۲ء کی یادگار ہے اور اس میں کل (۱۶) بند ہیں ؎

کس کے ماتم میں یہ سامانِ سیہ پوشی ہے
کچھ عجب طرح کی احباب میں سرگوشی ہے
کہیں سکتہ ہے، کہیں عالمِ بے ہوشی ہے
یہ تو مجمع ہے اور اس طرح کی خاموشی ہے
کون دل سرد ہوا غم ہوا تازہ کس کا
قوم کے سامنے ہے آج جنازہ کس کا

چکبست کے شخصی مرثیوں میں "نشترِ یاس" (۱۹۱۵ء) خصوصی مقام کا حامل ہے۔ چکبست نے یہ نظم اپنے ایک عزیز پنڈت تیج ناتھ نرائن چکبست کے سانحۂ ارتحال پر کہی تھی۔ انھوں نے نامعلوم اسباب کی بنا پر عین نوجوانی کے زمانے میں خودکشی کر لی تھی۔ مسدس کے فارم میں کہی جانے والی اس نظم میں کل آٹھ بند ہیں۔ بطور نمونہ ایک بند پیش ہے ؎

نہ اعتبار رہی اس حیاتِ فانی کا
مگر اُمید سے ہے لطف زندگانی کا
پیامِ مرگ ہے غم یاسِ جاودانی کا
شباب روح کا ہے، حوصلہ جوانی کا
بشر کا دل نہ ہو زندہ تو آب و گِل کیا ہے
فقط طلسم امیدوں کا ہے یہ دل کیا ہے

مجاہدِ آزادی گوپال کرشن گوکھلے کی موت سے متاثر ہو کر چکبست نے ۱۹۱۵ء میں ایک پُردرد مرثیہ تصنیف کیا تھا جس میں انھوں نے گوکھلے کی شخصی خوبیاں نیز جدوجہد آزادی میں ان کی بے لوث خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ چکبست نے گوکھلے کی موت کو ہندستان کی موت سے تعبیر کیا تھا۔ اس مرثیے میں چکبست نے سیرت نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ مرثیہ مسدس کے فارم میں ہے اور اس میں کل دس بند ہیں۔ مرثیے کا ہر بند اور ہر مصرع گوکھلے سے چکبست کی بے پناہ عقیدت کا ترجمان ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رُلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قومِ ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دُنیا سے یوں روانہ ہوا
"زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا"

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

چکبست نے ممتاز سیاسی لیڈر اور مجاہدِ آزادی بال گنگا دھر تلک کی موت پر بھی ایک مرثیہ لکھا تھا۔ اس مرثیے میں آہ و زاری کی لے نسبتاً زیادہ تیز ہے اور تقریباً ہر مصرع اپنے اندر درد و غم کی ایک مکمل دنیا آباد کیے ہوئے ہے۔ یہ مرثیہ بھی مسدس کے فارم میں ہے جو کل آٹھ بند پر مشتمل ہے، دو بند پیشِ خدمت ہیں ؎

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبحِ وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار
بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

لاش کو تیری سزاوار نہ رقیبانِ کہن

ہو جبیں کے لیے صندل کی جگہ خاکِ وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
وہی اس کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

چکبست نے ۱۹۱۶ء میں اپنے استاد بشن نرائن در کی موت پر ایک مرثیہ لکھا تھا، جس میں موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے چکبست نے در صاحب کی شرافت نفسی اور انسان دوستی کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ مرثیہ مسدس کے فارم میں ہے اور اس میں کل ۱۶ بند ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں، دل کا سہارا نہ رہا
گلشنِ علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلعِ دانش و بینش کا ستارا نہ رہا
سب یہ غم ایک طرف، ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

چکبست نے ۱۹۱۶ء میں اقبال نرائن مسلداں کی موت پر بھی ایک پُردرد مرثیہ لکھا تھا۔ مسدس کے فارم میں کہا جانے والا یہ مرثیہ کل سات بند پر مشتمل ہے۔ ایک بند پیش ہے ؎

بہت دیکھا ہوا ہے رنگ دُنیا کی رفاقت کا
کہیں عشقِ مراتب ہے کہیں رُعبِ دولت کا
وفا بدنام ہے بازار کھوٹا ہے محبت کا
مگر اس داغ سے خالی تھا سکہ تیری الفت کا
یہ رتبہ آدمی کے واسطے دُنیا میں کیا کم ہے
عزیزوں سے زیادہ دوستوں میں تیرا ماتم ہے

شخصی مرثیہ نگاری کی روایت میں صفی لکھنوی کا نام بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے کئی مرثیے لکھے ہیں، جن میں مہاتما گاندھی، خواجہ الطاف حسین حالی، چکبست لکھنوی اور ظریف لکھنوی کی اموات پر کہے جانے والے مرثیوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ صفی لکھنوی اپنے مرثیوں میں محض آہ و بکا کرنے کے بجائے مرنے والے کی شخصی صفات کا بیان اور اس کی موت سے ہونے والے سماجی نقصان کی نشان دہی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان کے تعلق سے بھی صفی کے مرثیے خاصے کی چیز ہیں اور جنھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

خواجہ الطاف حسین حالی کی وفات پر صفی نے ایک پُردرد مرثیہ کہا تھا جس میں مرحوم کی شخصیت و کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی خدمات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مسدس کے فارم میں کہے جانے والے اس مرثیہ میں کل گیارہ بند ہیں۔ آخری مصرع سے حالی کی تاریخِ وفات کا مادّہ بھی برآمد ہوتا ہے۔ چند بند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں ؎

اس بزم میں آ کے جانے والا
پھر جا کے ادھر نہ آنے والا
کھوٹوں کو کھری سنانے والا
اے قوم! ترا جگانے والا
خاموش لحد میں سو رہا ہے
اور اس کو زمانہ رو رہا ہے

دل خون کیا جب اس خبر نے
آنسو برسائے چشمِ تر نے
دل سے درخواست کی جگر نے
لکھی یہ صفیِ نوحہ گر نے
تاریخِ وفاتِ خواجۂ حالی
ہستی حالی سے اب ہے خالی

پنڈت برج نرائن چکبست کی موت پر بھی صفی لکھنوی نے ایک مرثیہ لکھ کر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔ مرثیے میں چکبست کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شمعِ بزمِ شعرا برج نرائن چکبست
بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس

موت نے خاک کے پردے میں چھپایا اس کو
ایک تصویر تھی ذہن و ذکا کی افسوس

ہے سیہ پوش جماعت وکلا کی صد حیف
تیرہ وتار ہے محفل شعرا کی افسوس

صفی نے اپنے حقیقی بھائی اور اردو کے ممتاز و منفرد مزاح گو شاعر ظریف لکھنوی کی وفات پر مرثیہ لکھ کر اپنے رنج و غم کا اظہار کچھ اس مہارت کے ساتھ کیا ہے کہ مرحوم کی شخصی خوبیاں بھی اُجاگر ہو گئی ہیں۔ غم انگیزی کے لحاظ سے یہ مرثیہ ان کے دیگر شخصی مرثیوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

جو اُٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اُٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

یہ شور ماتم ہے یا قیامت، دکھائی بے طاقتی نے طاقت
جو ہل نہ سکتا تھا وقتِ آخر وہ سیکڑوں کو ہلا کے اُٹھا

شکستہ بازو ضعیف کیونکر سنبھالے ٹوٹی ہوئی کمر کو
ظریفِ دُنیا سے اُٹھنے والا صفی کے دل کو بٹھا کے اُٹھا

انور حسین آرزو لکھنوی کے شعری سرمائے میں بھی کئی شخصی مرثیے شامل ہیں۔ آرزو نے اپنے مرثیوں میں اس بات کا خاص التزام کیا ہے کہ اظہار رنج و غم کے ذیل میں مرنے والے کی شخصیت پر بھی روشنی پڑے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی آرزو کے مرثیے نادر ہیں۔ آرزو کے شخصی مرثیوں میں "مرثیہ مہاتما گاندھی" کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ غزل کے فارم میں کہے جانے والے اس مرثیے میں کُل (۱۵) اشعار شامل ہیں۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

آفت میں بے بسوں کا سہارا نہیں رہا
جو تھا سروں کا چتر وہ سایا نہیں رہا

اُٹھے پرائے درد سے بھی جس کے دل میں ٹیس
غم خوار ایسا کوئی کسی کا نہیں رہا

آمادۂ فساد تھی دُنیائے خود غرض
رہتا وہ کیوں جو لائقِ دُنیا نہیں رہا

رستہ اجل کا روک دیا دے کے اپنی جاں
مُردوں کو زندہ کر کے مسیحا نہیں رہا

قیمت اس ایک جان کی اے آرزو یہ ہے
لاکھوں کو اپنی جان کا دھڑکا نہیں رہا

اس کے علاوہ آرزو لکھنوی نے نواب روشن آرا بیگم، حکیم سید محمد مہدی کمال لکھنوی اور اپنے کم سن بیٹے المعروف بہ للّن کی اموات پر بھی مرثیے تصنیف کیے تھے۔

□□

غزل

جمیل دوشی

[illegible]

غم کا نغمہ ہوں، غموں کے شہر میں گانا مجھے
مطربو! بزمِ مسرّت میں نہ لے جانا مجھے

اُڑ رہا ہوں میں بھی دنیا میں ہوا کے ساتھ ساتھ
کیسی شہرت دے رہا ہے میرا افسانہ مجھے

اے غمِ دُنیا ٹھہر! محوِ خیالِ دوست ہوں
جب ذرا مصروفیت کم ہو تو یاد آنا مجھے

دوستوں کی طرح یہ کس نے کیا مجھ کو سلام
اس شکستہ حال میں یہ کون پہچانا مجھے

کیا مرے چہرے میں ہے پنہاں کوئی چہرہ جمیل
کس لیے تکتا ہے سارا آئینہ خانہ مجھے

کشمکش

زندگی کیا ہے
ہاتھ سے گرا ہوا جام
جامِ سفال
جامِ جہاں نما
یا پانی کا ایک بلبلا
خلعت انعام تحفے
حسابِ سود و زیاں
بیمار کی رات
اجزا کا پریشاں ہونا
چادرِ خاک
زندگی موت زندگی
ایک ماندگی کا وقفہ
لامتناہی سلسلہ روز و شب
یا محض شب

حیات و موت
عبارت ہے ایک دوسرے سے
تکملہ ہے ایک دوسرے کا
پھر بھی خوف کیوں

موت
شہد سے زیادہ شیریں
عروسِ حیات سے زیادہ خوش رُو
لیکن
سانسوں کے تار ٹوٹنے کا خوف
لمحوں کی مالا بکھر جانے کا اندیشہ

زندگی کیا ہے
ہاتھ سے گرا ہوا جام
جامِ سفال
جامِ جہاں نما
پانی کا ایک بلبلا
یا کچھ بھی نہیں!

□□

سید شمیم حسین
اُردو اکادمی،
قیصر باغ، لکھنؤ

ماہیے

جگ سارا ہے تشنہ لب
قطروں سے محبت کے
تر ہوگا نہ جانے کب

کچھ منہ سے نہ کہیے گا
اچھی سی غزل سُن کر
سر دُھنتے ہی رہیے گا

ہاں، چھیڑ سکھی سرگم
آئے گا مرا ساجن
برسے ہے گھٹا جھم جھم

یہ بہتا ہوا پانی
دیتا ہے کبھی فصلیں
لاتا ہے کبھی ہانی

چپکے سے صدا دینا
خوشبو کی خبر اس کو
اے بادِ صبا دینا

تسکین کا باعث بن
غم ہو کہ مسرت ہو
ہر چیز کا وارث بن

اپنوں کی کبھی باتیں
دیتی ہیں محبت سے
تشویش بھری راتیں

صدف جعفری

غزلیں

بات جب وسعتِ جنوں کی پتھروں تک آگئی
داستانِ زخمِ دل بڑھ کے سروں تک آگئی

جب نقابِ رُخ اُلٹ کے آگیا وہ آفتاب
دل کشی پس منظروں کی منظروں تک آگئی

بخش دی اُس نے روانی خامۂ تاریخ کو
دھار جب میرے لہو کی خنجروں تک آگئی

آرہے ہیں بہرِ جنگ اک کے مقابل سیکڑوں
بُزدلی اب رفتہ رفتہ لشکروں تک آگئی

آگیا گردش میں جس دم اے صدا پرکارِ فکر
وسعتِ امکاں سمٹ کے محوروں تک آگئی

مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی

پیر جلیل شمالی
گولہ گنج۔ لکھنؤ

یاد بھُولی ہوئی باتیں نہ دلاؤ لوگو!
کسی برباد کو کیوں اور ستاؤ لوگو!

تہر بن جائیں تمہارے لیے انکی آہیں
تم غریبوں کو نہ اتنا بھی ستاؤ لوگو!

وہ تو اب دُور بہت دُور ہوا ہے ہم سے
تم کوئی اور نیا رنگ دکھاؤ لوگو!

میں نے چاہا ہے سدا اسکو بنالوں اپنا
میری یہ بات کبھی اس کو بتاؤ لوگو!

ان کی باتوں کا مزا کیسے ملے گا محمود
اب ذرا کوئی نیا گیت سُناؤ لوگو!

محمود الحق صدیقی محمود

اے ۲۸ بی، برما ریلوے کالونی
لکھنؤ

بکھرے پڑے ہوئے ہیں زمیں پر جو کل کے پھُول
محسوس ہو رہا ہے کھلے ہیں اجل کے پھُول

جب شاخ پر نہ ہوں تو کہاں بانکپن بھلا
جی چاہتا ہے دیکھیں گلستاں میں چل کے پھُول

کن دل فریبیوں کو سمیٹے ہوئے بھلا
جھیلوں میں غسل کرتے ہیں رنگیں کنول کے پھُول

سر پر، کبھی گلے میں، کبھی فرشِ خواب پر
پہنچے کہاں کہاں ہیں چمن سے نکل کے پھُول

دکھلائے دن عجیب مقدر نے اے نسیم
بیدار صبح کو جو ہوئے آنکھ مل کے پھُول

نسیم واسطی

واسطی ہاؤس، بفتی محلہ
جون پور

وہ رند نہیں ہوں میں اک بوند کو جو ترسے
چاہوں تو گھٹا برسے اٹھ کر مرے ساغر سے

جب یاد وہ آتے ہیں کیا مجھ پہ گزرتی ہے
پُوچھے تو ذرا کوئی میرے دلِ مضطر سے

جب تو ہی محافظ ہے کشتی کا تو غم کیا ہے
میرے لیے خود راہیں نکلیں گی سمندر سے

دیوانہ تو ہوں لیکن ان میں سے نہیں ہوں میں
وہ ہوں گے جو سر اپنا ٹکراتے ہیں پتھر سے

وہ حسن پہ نازاں ہیں جانے دو غبار ان کو
ہم عشق پہ نازاں ہیں ڈرتے نہیں خنجر سے

سید اسرار حسین غبار سندیلوی

۱۹۔ کٹرہ اعظم بیگ
گلی قصر حسینی لکھنؤ

نئی سرکار جنتا کے دوار

اتر پردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

"ماحولیات کے سدھار میں ہر فرد اپنا تعاون دے" ——— گورنر

اتر پردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرائن ریڈی نے ماحولیاتی آلودگی کے تمام مقامات پر نگرانی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک سماج کا ہر فرد یہ نہ سوچے گا کہ آلودگی کی روک تھام میں اس کی حصہ داری ضروری ہے تب تک سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کی جانب سے کی گئی کوششوں سے امید افزا کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی۔

شری ریڈی، گورنر ہاؤس کے دربار ہال میں بھارت نیپال ماحولیاتی بیداری کے ایک وفد کے ممبران کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کو خطاب کر رہے تھے۔

شری ریڈی نے کہا کہ آبادی بڑھنے کی وجہ سے مختلف مسائل پیدا ضرور ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عام آدمی سے لے کر نگر مہا پالیکا، جل نگم وغیرہ ادارے بھی سماج میں صاف ستھرا ماحول نہیں بنا سکے۔ انھوں نے جگہ جگہ پر جمع کوڑے کے ڈھیروں، کھلی نالیوں اور ناکافی پانی کی فراہمی کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ یہ لاپروائی بھی آلودگی پھیلانے کی ایک وجہ ہے، اس میں ناخواندگی، معلومات میں کمی بھی شامل ہے۔

گورنر نے مشورہ دیا کہ دریاؤں میں گرائے جانے والے نالوں کو کسی اور مقام پر لے جانے کی اسکیم بنائی جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ پودے لگا لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے۔ شجر کاری صرف نمائش کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔

شری ریڈی نے کہا کہ جنگلوں کا تعلق ہماری قدیم تہذیب و تمدن سے ہے جنگلوں میں ہمارے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے، جنگلوں میں پران اور علم شعری تخلیقات وجود میں آئیں۔ عوامی بہبود کی فکر بھی جنگلوں کے پرسکون ماحول میں پیدا ہوئی، اس لیے ان کی حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھنا چاہیے۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے وزیر جنگلات اور ماحولیات ڈاکٹر سرجیت سنگھ ڈنگ نے کہا کہ بیرونی ماحولیاتی آلودگی سدھارنے کے لیے اندرونی ماحولیات کو پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ماحولیات کو محدود معنوں میں نہیں لیا جانا چاہیے۔ اس کا دائرہ وسیع ہے اور یہ عوامی زندگی کا اہم جز ہے۔

گورنر نے سائنسی نظریات کو فروغ دینے پر زور دیا

اتر پردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرائن ریڈی نے لکھنؤ کرسچین انٹر کالج کے ہال میں اس کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ایس پی. تارسن کی یاد میں منعقدہ سائنسی انقلابی ہفتہ وسیمینار کا افتتاح کیا۔

گورنر نے اس موقع پر کہا کہ ہندستان رشیوں منیوں کا دیش ہے، جہاں زمانۂ قدیم سے مذہبی ثقافتی نیز روحانی اور سماجی روایتوں کے ساتھ ہی سائنسی نظریات کو فروغ دینے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ ہندستان میں ہی ڈاکٹر سی. وی. رمن، ڈاکٹر جگدیش چندر بوس، ڈاکٹر بھابھا اور

پروفیسر بیربل ساہنی جیسے سائنسدانوں نے جنم لیا ہے اور ہندستان میں رہ کر ہی سائنسی دنیا میں ایسے کارنامے انجام دیئے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ سائنسداں ہی ہیں جنھوں نے اپنی سوجھ بوجھ سے ہمارے ملک کا نام دنیا میں روشن کیا، اس پر ہم جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔

گورنر نے اس موقع پر حاضرین سے اپیل کی کہ وہ ڈاکٹر توارسن کی آدرش زندگی سے تحریک حاصل کر کے طلبا میں سائنسی زاویۂ فکر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کریں تاکہ ہمارے طلباء میں ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن، ڈاکٹر جگدیش چندر بوس، ڈاکٹر بھابھا، پروفیسر بیربل ساہنی اور ڈاکٹر توارسن جیسے ہونہار سائنس داں بننے کا جذبہ پیدا ہو سکے اور وہ مستقبل میں اپنے شاندار کاموں سے دنیا میں ہندستان کا وقار بڑھائیں۔ یہی ڈاکٹر توارسن کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔

گورنر نے حاجی وارث علی شاہ کے مزار پر چادر چڑھائی

اترپردیش کے گورنر شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی نے دیویٰ میں حضرت سید وارث علی شاہ کے مزار پر حاضری دی اور چادر چڑھائی۔ گورنر نے اس موقع پر دیویٰ میلہ اور نمائش ایسوسی ایشن کے عہدے داران سے تبادلۂ خیال بھی کیا۔ نیز میلہ بھی دیکھا۔

اس موقع پر منعقدہ انجمن بارگاہ وارثی کے زیر اہتمام قومی یکجہتی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے گورنر نے حضرت وارث علی شاہ کی تعلیمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حضرت وارث علی شاہ ہندستان کے وہ عظیم صوفی سنت تھے جنھوں نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راہ پر چلنے کی تلقین کی اور محبت، ایک جہتی، خیر سگالی، ہمدردی اور اچھے سلوک کا پیغام دے کر مثالی زندگی بسر کرنے پر زور دیا۔

شری ریڈی نے کہا کہ حضرت وارث علی شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قومی یک جہتی کو مستحکم کرنے کے لیے اپنے والد قربان علی شاہ کی یاد میں دیویٰ میلہ کی شروعات کی، تاکہ ہر مذہب و ملت اور فرقے کے لوگ ایک ہی مقام پر جمع ہو سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ نیز جذبہ اخوت کو بڑھاوا ملے۔

کیمیاوی کھاد کی قیمت میں اضافہ کسانوں کے مفاد میں نہیں

—— وزیر اعلا

اترپردیش کے وزیر اعلا شری کلیان سنگھ نے مرکزی حکومت کی کیمیاوی کھاد قیمت پالیسی کے متعلق کی گئی بنیادی تبدیلیوں پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم شری پی وی۔ نرسمہا راؤ سے درخواست کی ہے کہ کیمیاوی کھاد قیمت پالیسی جیسے اہم مسئلہ پر پالیسی کے تحت فیصلے پر دوبارہ غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے

اس سلسلے میں وزیر اعظم کو تحریر کردہ ایک خط میں وزیر اعلا نے کہا کہ کیمیاوی کھاد پالیسی کے متعلق کی گئی بنیادی تبدیلی سے غلہ کی پیداوار پر برا اثر پڑے گا۔

انھوں نے کہا کہ ایسے وقت میں جب مرکزی حکومت مرکزی غلہ پول کے واسطے دیگر ممالک سے غلہ درآمد کر رہی ہے اور ملک کے غیر ملکی زرمبادلہ مصارف میں اضافہ ہو رہا ہے، یہ بات قابل غور ہے کہ کیا ان حالات میں کیمیاوی کھاد قیمت پالیسی ایسی ہو جس سے ایک طرف کسانوں کی پیداواری لاگت میں غیر متوقع اضافہ ہو اور دوسری جانب پیداوار میں کمی آئے اور کل ملا کر بڑھتی ہوئی مہنگائی کا ماحول بنے۔

انھوں نے کہا کہ مناسب تو یہ ہوتا کہ اس طرح کے بنیادی اور مکمل فیصلے سے قبل مختلف ریاستوں کے وزرا اعلا کے ساتھ غور و خوض بھی کر لیا جاتا ورنہ مرکزی حکومت کے ایک طرفہ فیصلے سے ریاستی حکومتوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ اترپردیش میں گزشتہ دو برسوں میں موسلا دھار بارش کی وجہ سے خریف کی فصل پر برا اثر پڑا ہے —— اور متعدد اضلاع میں خشک سالی کی حالت بنی ہوئی ہے اس حالت میں ریاستی حکومت کسانوں کو بیج، کھاد پانی اور

بجلی کی فراہمی کو یقینی بنا کر غذائی پیداوار میں اضافے کے خصوصی اقدام کر رہی ہے۔

انھوں نے کہا کہ ریاست میں سال ۹۱-۱۹۹۰ء کے قبل کھاد کی کھپت میں تقریباً دس فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن نائٹروجن کی قیمتوں میں گزشتہ اگست ۱۹۹۱ء میں اضافے کی وجہ سے کھاد کی کھپت میں گزشتہ دو برسوں میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ اندیشہ یہ ہے کہ موجودہ قیمتوں میں اضافے کے باعث کھاد کے استعمال میں کمی ہوگی۔

وزیر اعلا نے کہا کہ مرکزی حکومت نے کھاد کی قیمت میں اضافے کا اعلان ایسے وقت میں کیا ہے جبکہ کسان اپنی ربیع کی پیداوار میں بیج اور کھاد کا ضروری بندوبست کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ قیمت میں اضافے کے باعث کھاد بازار میں صورت حال واضح نہیں ہے اور بیوپاری مختلف شرحوں پر کھاد کی فروخت کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ریاستی حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں ہو پا رہا ہے کہ کھاد بیوپاریوں سے گفتگو کر کے قیمت کے بارے میں کوئی برابری لا سکے۔

وزیر اعلا نے اس بات پر زور دیا کہ ملک کو غذا کے معاملے میں خود کفیل بنانے کے لیے کیمیاوی کھاد کی کھپت میں اضافہ بہت ضروری ہے ورنہ غذائی اشیا کے بڑھتے ہوئے داموں کے سنگین حالات کے ساتھ غذائی اشیا کی ضرورت کے لیے غیر ممالک پر بھی انحصار کرنا ہوگا جس کے لیے غیر ملکی زر مبادلہ کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔

"ہندی کا وقار بڑھانا ہمارا قومی فریضہ" — راجندر کمار گپت

قومی زبان سے ملک کی شناخت بنتی ہے اور اس کا وقار بلند ہوتا ہے نیز یہ زبان ملک کو ایک رشتے میں باندھنے کا کام کرتی ہے۔ آج ملک میں ہندی کو وہ مقام نہیں حاصل ہو سکا ہے جو ہونا چاہیے وہ صرف قومی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے۔ ہمیں ہر ممکن کوشش کر کے ہندی کو قومی زبان کی شکل میں قائم کرنا ہوگا۔ ہندی ملک کا نشان ہے اور اس کی ترقی اور وقار کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔

وزیر مالیات و پارلیمانی امور شری راجندر کمار گپت نے ان خیالات کا اظہار یہاں قیصر باغ میں واقع جے شنکر پرساد ہال میں نیو انڈیا انشورنس کمپنی کے منطقائی دفتر کے زیر اہتمام منعقدہ "ہندی سماروہ" میں کیا۔

وزیر مالیات نے کہا کہ ریاستی حکومت نے اپنے تمام کاموں کو لازمی طور پر ہندی میں کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے نتیجہ میں پوری طرح سے ہندی ریاست میں رائج ہو گئی ہے۔ انھوں نے ادارہ کی جانب سے ہندی کی ترقی کے لیے کی جانے والی موثر کوششوں کی تعریف کی۔

ریاستی حج کمیٹی کی وظائف اسکیم شروع
طلبا کو وظائف دیئے جائیں گے

اتر پردیش کے وزیر مسلم اوقاف اور جیل شری اعزاز رضوی نے بتایا ہے کہ اتر پردیش کے حاجیوں کے لڑکے اور لڑکیوں کی درس و تدریس کے لئے وظائف دیئے جانے کے احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔

شری رضوی نے بتایا کہ ریاستی حکومت اقلیتوں کو تعلیم یافتہ بنا کر ان کی ہمہ گیر ترقی کرنا چاہتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت اتر پردیش ریاستی حج کمیٹی کی جانب سے وظائف اسکیم پہلی بار شروع کی گئی ہے۔

اسکیم کے مطابق انٹرمیڈیٹ طلبا کو سو روپئے، بی۔اے، بی۔کام کو ۱۵۰/- روپئے، بی ایس سی کو ۲۰۰/- روپئے، ایم۔اے۔ ایم۔کام نیز بی۔اے۔ایم۔ایس کے طلبا کو ۲۵۰/- روپئے۔ ایم ایس سی اور ایم بی اے کے طلبا کے لیے ۳۰۰/- روپئے اور ایم بی بی ایس نیز انجینیرنگ کا کورس کرنے والوں کے لئے ۴۵۰/- روپئے دیئے جانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

مقررہ فارم پر اہل طلبا اپنی درخواستیں ریاستی حج کمیٹی اتر پردیش کو روانہ کریں۔

اس سال ۱۵، اضلاع میں ساٹھ واچ ٹاور قائم کیے جائیں گے

اتر پردیش کے وزیر اوقاف اور جیل شری اعزاز رضوی نے کہا ہے کہ تحفظ کے پیش نظر ریاست کے پانچ سنٹرل جیلوں اور دس ضلع جیلوں میں واچ ٹاوروں کے قیام کی ہدایت دی گئی ہے۔ اس کے لیے ۹۴ لاکھ روپئے کی رقم محکمہ تعمیرات عامہ کو مہیا کرائی گئی ہے۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ اس سال تقریباً ساٹھ واچ ٹاور قائم کیے جائیں گے۔ واچ ٹاوروں کا قیام سب سے پہلے سنٹرل جیل وارانسی، نینی تال فتح گڑھ، بریلی، آگرہ اور ضلع جیل فیض آباد، بریلی، اناؤ، علی گڑھ، میرٹھ، ایٹہ، آگرہ، جھانسی، لکھنؤ اور گورکھپور میں ہوگا۔ ہر جیل میں چار واچ ٹاور بنائے جائیں گے۔

گنگا کی آلودگی دور کرنے کا کام
۱۵۷ کروڑ کی ۱۰۶، اسکیموں پر کام شروع

اتر پردیش کے وزیر شہری ترقی شری لال جی ٹنڈن نے بتایا ہے کہ گنگا ندی کی آلودگی دور کرنے کے لیے مرکزی حکومت کے تعاون سے ۱۰۶ اسکیموں پر کام شروع کیا جا رہا ہے۔ ان پر تقریباً ۱۵۷٫۳۲ کروڑ روپئے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔

شری ٹنڈن نے کہا کہ گنگا ایکشن پلان کے تحت ریاست میں قابل تعریف کام ہوا ہے۔ پہلے دور میں کان پور، وارانسی، الہ آباد، فرخ آباد، فتح پور، مرزاپور، رام نگر (وارانسی) اور رشی کیش (ہردوار) سمیت ۲۰ شہروں کو اس پروگرام کے تحت شامل کیا گیا ہے۔

شری ٹنڈن نے کہا کہ ریاست میں گنگا کی صفائی کا کام خاص طور سے جل نگم کے توسط سے کرایا جا رہا ہے۔ ملک کے سبھی شہروں میں کل ۸۷۳ ایم۔ ایل۔ ڈی غلاظت کی صفائی ہوتی ہے جس میں ریاست کا حصہ ۴۳۱ ایم۔ ایل۔ ڈی ہے اور اس کے برخلاف اب تک ۳۷۲ ایم ایل ڈی کی صفائی کا کام مکمل ہو چکا ہے، جو کہ مقررہ نشانے کا ۸۶ فیصد ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ریاست میں سات سیور صفائی پلانٹ اس پلان کے تحت قائم کیے گئے ہیں۔

وزیر شہری ترقی نے بتایا کہ سیور نظام کے فروغ میں ہندستان میں پہلی بار کلوز سرکٹ ٹیلی ویژن (سی۔ سی۔ ٹی۔ وی) نظام کا استعمال اتر پردیش میں ہوا ہے۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ رشی کیش سے لے کر وارانسی تک گنگا ندی کا پانی ایک آدھ جگہ کو چھوڑ کر باقی سبھی مقام پر نہانے کے قابل ہو گیا ہے۔ کان پور میں ایسا گنگا ایکشن پلان کے دوسرے دور ہی میں ممکن ہو سکے گا کیونکہ پہلے دور میں مکمل پانی کی صفائی کی اسکیم منظور نہیں ہو سکی تھی۔

شری ٹنڈن نے کہا کہ گنگا ندی کے صفائی کے کام کو مکمل کرانے کیلئے ۶۸۰ کروڑ روپئے کے تصرف کا تخمینہ ہے۔ گزشتہ اگست تک ۱۰۷٫۹۴ کروڑ روپئے صرف ہو چکے ہیں اور باقی کام آئندہ دو برسوں میں مکمل کر لیا جائے گا۔

ہر قیمت پر امتحانات کی اہمیت کو قائم رکھا جائے گا

وزیر تعلیم شری راج ناتھ سنگھ نے بتایا کہ ریاستی حکومت ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحانات کی اہمیت کو ہر قیمت پر قائم رکھے گی۔

گیس پیپروں کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے حکومت کے اس قول کا اعادہ کیا کہ گیس پیپر، گائڈ بک اور کنجی کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس طرح کی اشاعت سے غریب اور ہونہار طلباء کے مستقبل کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

انھوں نے مزید کہا کہ امتحان میں نامناسب ذرائع کا استعمال اور مدد دینے والی گائڈ بک، کنجی یا اسی طرح کی اشاعت کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر ضرورت ہوئی تو حکومت گیس پیپر، گائڈ بک نیز کنجی کی اشاعت پر پابندی کے لیے قانون بنائے گی۔ □□



نام کتاب: **متاعِ آخرِ شب** (شعری مجموعہ)

شاعر: محسن زیدی — قیمت: ۴۰/- روپے

ملنے کے پتے: (۱) مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی

(۲) نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ

یوں تو اُردو میں شعری مجموعوں کی ایک بڑی تعداد ہر سال شائع ہوتی ہے لیکن چند مجموعے ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو خود اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک محسن زیدی کا مجموعہ "متاعِ آخرِ شب" ہے۔

محسن زیدی اُردو کے ان شعرا میں ہیں جو اپنی سنجیدہ فکر اور شعری اسلوب کی وجہ سے آج کے شعرا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ "متاعِ آخرِ شب" سے پہلے ان کے دو مجموعے "شہرِ دل" اور "رشتۂ کلام" شائع ہو چکے ہیں، اور یہ مجموعہ انھیں کا تسلسل ہے لیکن زیادہ تفکر، شعری مشق اور اظہار کی قدرت کے ساتھ۔

محسن زیدی غزل کے شاعر ہیں اور اسی کافر صنف کی عشوہ طرازیوں میں انھوں نے عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔ ان کے لیے غزل ہی زندگی ہے اسی لیے وہ غزلوں کے اشعار میں زندگی کا ہر منظر پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

پھر بھی نہ جانے ہو گیا دشمن زمانہ کیوں؛
میں تو بُرائیوں میں نہ اچھائیوں میں تھا

کچھ لوگ ہیں ایسے بھی جو حق بات کہیں گے
ایسا تو نہیں سب ہی نمک خوار ہیں اس کے

دشمن کو بھی ہم نے کبھی دشمن نہیں سمجھا
ہم جان سے گئے اپنی وسیع النظری میں

یہ رات ڈھلے گی تو بلا سر سے ٹلے گی
اک عمر رہے ہم اسی خوابِ سحری میں

ان اشعار میں ہر جگہ زندگی کا ایک نیا پہلو اور نئی تصویر بن کر اُبھرتا ہے۔ اگر کہیں زمانے کے دشمن ہو جانے پر تعجب اور افسوس ہے تو کہیں اس پر اطمینان کہ کچھ لوگ ابھی ایسے ضرور ہیں جو اظہارِ حق کی جرأت رکھتے ہیں۔

محسن زیدی کی خوبی ان کی چھوٹی چھوٹی پر اثر تصویروں کے علاوہ ان کے اظہار کی سادگی اور بے تکلفی ہے وہ کسی بات کے کہنے کے لیے تصنع سے کام نہیں لیتے۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ گفتگو کر رہے ہیں اور شاید ان کے اشعار میں تاثر کا سبب ان کے لہجے اور اظہار کا یہی خلوص اور سادگی ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ؎

کوئی بے وجہ کیوں خفا ہوگا
کچھ تو اس کو بُرا لگا ہوگا

ہم نے تو اسی طرح گزارے ہیں شب و روز
اپنے لیے ہر دن وہی ہر رات وہی ہے

یہ روزمرہ گفتگو کا انداز قاری کو شاعر کے تجربہ کا شریک بنا دیتا ہے اور پڑھنے والا اشعار کو اس طرح پڑھنے لگتا ہے جیسے وہ خود کسی سے ہم کلام ہو۔

محسن زیدی کے یہاں بعض لوگوں نے کربلا کے تلازمات اور علامات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محسن زیدی کی غزلوں میں ایسے الفاظ اکثر آتے ہیں جن سے ذہن واقعۂ کربلا کی یاد دلا دیتا ہے لیکن محسن زیدی ارادی یا غیر ارادی طور پر ایسے تلازمات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مقصد درحقیقت اس واقعے کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ وہ ان تلازمات سے آج کی صورتِ حال یا سانحے کی Intencity میں

اضافہ کرتے ہیں ان کے اس طرح کے اشعار کا منظر نامہ بھی ہماری آج کی زندگی اور اس کے سانحات ہوتے ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھیے ؎

مشعلیں سر کی بجھائی گئیں طشتِ زر میں
کب سے مقتل میں چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

صحرا میں تشنگی کا تو شکوہ ہے اور بات
کیوں شورِ العطش لبِ دریا بلند ہے

اور یہ اشعار ان کے اچھے اشعار میں ہیں، ان میں اثر بھی ہے اور یہ واقعے کی زیادہ گہری تصویر بناتے ہیں لیکن محسن نے اپنی شاعری میں کربلا کے شعری تلازمات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ محسن کی خوبیوں کے بنیادی وہی اشعار ہیں جہاں زندگی زیادہ کھلی فضاؤں میں رقص کرتی نظر آتی ہے اور جہاں زندگی کے تلخ تجربوں کو وہ لطیف اور خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

اس کے بیانِ حق میں جو پہلو رہا کا تھا
وہ گفتگو کے فن سے نبھائے گیا اسے

——— (ڈاکٹر شارب ردولوی)

نام کتاب: "**امشب**" (شعری مجموعہ)
شاعر: عشرت ظفر قیمت ۱۵/۰ روپے
ملنے کا پتہ: خورآم پبلی کیشنز ۱۰۵/۶۵۴ ۔ نعیم آباد کالونی
کان پور- ۲۰۸۰۰۱

عشرت ظفر کا تخلیقی سفر اس بات کا شاہد ہے کہ اس نے بہت سی منزلیں طے کرلی ہیں۔ وہ شعر کہنا ہی نہیں جانتا بلکہ شعر کہنے کا ہنر اور سلیقہ بھی جانتا ہے۔ اس کے لیے شاعری صرف مرصع سازی نہیں بلکہ لفظوں کی وہ ترتیب ہے جہاں لفظ اشعار کا معیار بن جاتے ہیں۔ عشرت ظفر جانتا ہے کہ لفظ کیا ہے، اس کی شناخت کیا ہے اور وہ کس طرح برتا جاتا ہے۔ وہ لفظوں سے بازی گری نہیں کرتا بلکہ شاعری کرتا ہے سچی اور کھری شاعری ـ جس میں لفظ و معنی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اس کے پاس فن بھی ہے اور فن کی باریکیوں کا التزام بھی۔

" امشب " عشرت ظفر کا تازہ مجموعۂ کلام ہے اور اس کا حرف حرف اس بات کا غماز ہے کہ عشرت ظفر کے لہجے اور اسلوب پر نہ کسی اور کے خیال کی پرچھائیاں ہیں نہ اس کی ابھری کسی اور کے منظر نامے سے مستعار ہے۔ پیکر سے پیکر تراشی تک جو کچھ ہے وہ خود اسی کا ہے۔ اسے احساس کے گھنے جنگلوں سے گزرنا بھی آتا ہے اور راستہ بنانا بھی۔ وہ ہجر کے موسموں کی زرد شاخ کا تنہا پھول سہی پھر بھی اس میں اس کے اپنے رنگ ہیں اور وہ ہر حال میں تر و تازہ ہے۔

اس تازہ مجموعہ کلام میں عشرت ظفر کی شاعری اچھی سے بہتر کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ اس کا ایک ایک شعر عشرت ظفر کے ادراک و شعور کی لے اور آہنگ سے بھرپور ہے ؎

گہرا بہت گھنا تھا مگر بادباں کھلے!
ساحل نہ تھا کہیں بھی مگر کشتیاں بڑھیں

خاک پر رکھتی نہیں پاؤں ہوا
برگِ گل ہاتھ میں جب سے آیا

پیاس پانی کی بجھی صدیوں بعد
چاند سا جسم ندی میں اترا

ان دو تین شعروں کے علاوہ، جو میں نے یہاں نقل کیے ہیں، آپ " امشب " کا کوئی بھی صفحہ یا ورق دیکھیے، عشرت ظفر کی اچھی اور خوبصورت شاعری نا آفریدہ لمحوں سے تصویریں بناتی نظر آتی ہے ؎

اچانک آج ملی طاقِ جاں میں رکھی ہوئی
اُداس اُداس سی شام خزاں جو یاد نہیں

روشن ہے اُفق کی لوحِ سادہ
کیا وقتِ طلوعِ بادباں ہے

اور اس خوبصورت شاعری کے بعد اس کتاب کا المیہ یہ ہے کہ اس کی کتابت و طباعت انتہائی ناقص ہے۔ کاش عشرت ظفر

اس کی طرف توجہ کرتے۔ اگر یہی مجموعہ بہتر طباعت سے آراستہ ہوتا تو لوگ اسے اور پسند کرتے اور اس کی پذیرائی اس طرح کرتے جو ایک اچھے مجموعے کے شایانِ شان ہے۔

—— وقار ناصری

نامِ کتاب: **طرزِ گفتگو** (شعری مجموعہ)

شاعرہ: فاطمہ وصیہ جائسی   قیمت: چوبیس روپے

ملنے کے پتے: (۱) نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

(۲) ۴/۲۔ ساتویں گلی نشاط گنج۔ لکھنؤ

"طرزِ گفتگو" فاطمہ وصیہ جائسی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے دو اور شعری مجموعے "ریزہ ریزہ حیات" اور "قطرہ قطرہ سمندر" شائع ہو چکے ہیں۔

سیرت و کردار سے ایک معزز، محترم اور مذہبی خاندان کی فرد ہونے کی بنا پر فاطمہ وصیہ کے سیرت و کردار کی بلندی کی چھاپ ان کے کلام میں اکثر و بیشتر نظر آتی ہے ؎

صرف کردار ہی معیارِ نظر ہے اپنا
ہم کو کچھ آپ کی دولت سے سروکار نہیں

فاطمہ وصیہ جائسی کے ارد گرد ایک طرف تو مذہبی چرچے تھے اور دوسری طرف والد کے جذبۂ وطن پرستی نے گھر کے ہر فرد کو محبِ وطن بنا دیا تھا۔ فاطمہ وصیہ نے اپنے گھر، خاندان اور معاشرے کا گہرا اثر قبول کیا۔ مذہبی ماحول کے زیرِ اثر انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا نوحے، قصائد اور نعت سے کی اور بعد میں تحریکِ آزادی اور والد کی سیاسی سرگرمیوں نے شاعرہ کے رگ و پے میں قومی و ملکی محبت کا سرچشمہ موجزن کر دیا ؎

چھو نہ پائے گا کبھی عشق کے معیار کو وہ
جس کی قسمت میں فرازِ رسن و دار نہیں

فاطمہ وصیہ نے غزلیں زیادہ کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، خیالات کی بلندی، زبان و بیان کی ندرت، خوبصورت تشبیہات اور نادر استعارات، غرض کہ تمام اوصافِ شاعری کی جھلک ان کے کلام میں نمایاں ہے۔

شاعرہ کے عقیدے کی چھاپ تلمیحات کی شکل میں ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے ؎

تشنگی ایسی کہ دریاؤں کا پانی گھٹ جائے
سامنے آئے جو پیاسا تو سمندر ہٹ جائے
کیا ہے شمشیر زنی دل سے تو پوچھو اس کے
کسی غازی کا جو میدان میں بازو کٹ جائے

جب بھی زنجیر کی آواز سنائی دے گی
کسی بیمار کی تصویر دکھائی دے گی

فاطمہ وصیہ کو شاید تمام اصنافِ شاعری میں غزل سب سے زیادہ پسند ہے جس کا اظہار بھی انھوں نے اپنے دیباچے میں کیا ہے:

"غزل بہترین ذریعہ ہے اپنے غموں میں ڈوب جانے کا۔"

اور جب غموں میں ڈوب کر وہ غزل کہتی ہیں تو وہ محض غزل نہیں ہوتی بلکہ ؎

زندگی ملتی ہے اس سے ہمیں ملتی ہے نمو
دیکھنے میں تو لکیریں ہیں مگر ہے یہ لہو

فاطمہ وصیہ جائسی تمام تر مذہبی بغض و عناد سے بالاتر صرف انسانیت کی علمبردار ہیں ؎

دیر ان کا ہے، حرم میرا، یہ افسانے غلط
اس طرح سوچیں تو پھر ہمسائگی کیسے کٹے

نہ رنگ و نسل کے جھگڑے نہ بات صوبوں کی
جبینیں لاکھ مگر ایک آستاں ہوتا

—— صفیہ اسرار حسین



عنوانات

سرورق: ابوالفضل۔ کتابت و تزئین: حسن اختر

نیا دور

جلد ۴۷ نمبر ۹

دسمبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

ٹیلیفون ــــــ ۲۴۵۶۶۰

معاونین

○ نجیب انصاری

○ محمد الیاس خاں

ٹیلیفون ــــــ ۲۴۷۱۰۸

پیشکش

آتما سروپ

(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ

یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: ــــ تین روپے

زرِ سالانہ: ــــ تیس روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی، لکھنؤ

نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومتِ اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

دسمبر کا مہینہ ہر سال ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم نے اس سال، جو اب ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہے، کیا کھویا اور کیا پایا۔ جہاں تک پانے کا تعلق ہے تو یہ فہرست بڑی مختصر ہے۔ زبان و ادب کی سطح پر اردو کی جو صورتحال ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ پھر بھی ہر سال کی طرح اس سال بھی اردو کی کچھ اچھی کتابیں وجود میں آئیں، کچھ ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان کو اعزازات سے نوازا گیا۔ کچھ اچھے جلسے اور سمینار ہوئے جن میں اردو اکاڈمی، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اور ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے زیر اہتمام ہونے والے جلسے، سمینار اور مشاعرے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کچھ دیگر انجمنوں نے بھی اچھے جلسے کرائے۔ لیکن ——

اسی تصویر کا دوسرا رخ اگر دیکھا جائے کہ ہم نے اس سال کیا کھویا، تو اس کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ان ادیبوں اور شاعروں، فن کاروں اور دانش وروں کی یاد آتی ہے۔ جو ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ ان میں پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر حکم چند نیر، کمار پاشی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، حکیم عبدالقوی دریا بادی، مولانا اسحاق علمی، کرنل بشیر حسین زیدی، عابد علی خاں، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، ڈاکٹر اخلاق حسین عارف، قیصر حیدری، پروفیسر نریش چندر، حامد الانصاری غازی، عبیدالرحمٰن خاں شیروانی، ثمر ہلوری، معین الدین حسن علوی، واقف رائے بریلوی، ڈاکٹر امیر حسن اور سری نواس لاہوٹی وغیرہ شامل ہیں۔

اردو کے ان باکمالوں کی ایک طویل فہرست ہے جو اس سال ہم سے بچھڑ کر ابدی نیند سو گئے۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں کچھ نام چھوٹ بھی گئے ہوں —— ادارہ نیا دور ان سب کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ایڈیٹر

شیریں زبان و طوطیِ ہندوستان

شاہراہِ شوق میں ہے کون خسرو کے سوا
شمع بن کر روشنی دے جس کا ایک اک نقشِ پا
صاحبِ دل، شخصِ حق آگاہ و مردِ باخدا
شاعرِ شیریں مقال و مطربِ رنگیں نوا
چھو لیا جا کر فلک کو جب ذرا پرواز کی
سرحدیں لا کر ملا دیں، ساز اور آواز کی

نغمگی گونجی ہوئی ہر سُو یہ خسرو ہی کی ہے
ذہن اور دل میں بسی خوشبو یہ خسرو ہی کی ہے
قوس کی صورت تنی ابرو یہ خسرو ہی کی ہے
گود میں پالی ہوئی اُردو یہ خسرو ہی کی ہے
خود بھی ویسا ہی تھا وہ جیسا کہ اسکا ساز تھا
ساری آوازوں میں خسرو اک نئی آواز تھا

زندگی کا لہلہاتا تھا چمن اس کے لئے
گوش بر آواز رہتا تھا سخن اس کے لئے
تھی چمن کی خاک بھی سرو و سمن اس کے لئے
وہ وطن کے واسطے تھا اور وطن اس کے لئے
موتیوں سے منہ ہر اک اہلِ وطن کا بھر گیا
ہند کی ناری کا اونچا فخر سے سر کر گیا

چھو لیا جس شے کو دُونی اس کی قیمت ہو گئی
بات جو کہہ دی وہی بڑھ کر کہاوت ہو گئی
جس "مکرنی" پر نظر کی خوب صورت ہو گئی
چند حرفوں کی بنی مورت قیامت ہو گئی
لفظ کچھ آ کر جہاں بے جوڑ اور "انمل" ملے
یہ ہوا محسوس بس رُوٹھے ہوئے دو دل ملے

پیار کا دریا چڑھا ایسا کہ پانی پا گئے
لفظ فیضِ خسروانہ سے معانی پا گئے
وہ جو بوڑھے ہو چکے تھے، پھر جوانی پا گئے
چھو گئے اس کے قلم سے جو، روانی پا گئے
رکھ دیئے گیتوں میں بھر بھر کر چھلکتے جام سے
سر بہ سر حضرت نظام الدین کے پیغام سے

سر سے پا تک ہندوی، رفتار سے گفتار سے
آب ہے موتی کی قائم خسروی کردار سے
ساز ہندی کو سجایا فارسی کے تار سے
جل اُٹھے لاکھوں دیئے، دیکھا جدھر بھی پیار سے
ایک سے ہر اک سوا انداز میں، اعجاز میں
ہند میں خسرو ادھر، سعدی اُدھر شیراز میں

جان اپنی زندگی نادان تھی کھوتی رہی
بات منظورِ خدا جو تھی، وہی ہوتی رہی
بے بسی، بے بس تھی کیا کرتی کھڑی روتی رہی
سیج پر سوئی ہوئی "گوری" پڑی سوتی رہی
ہوتے ہوتے ختم یوں سارا فسانہ ہو گیا
دُور کی آواز اک اس کا ترانہ ہو گیا

عمر انصاری
۲۰۔ امین آباد پارک، لکھنؤ



ڈاکٹر ولی الحق انصاری،
دارالامان، ۲۰۰، اکبری محل،
لکھنؤ

دھڑکتے دل بھی کچھ ملے کٹے سروں کے درمیاں
تھے درد آشنا بھی کچھ ستم گروں کے درمیاں

پنپ نہ پائی زندگی کبھی ڈروں کے درمیاں
کراہتے رہے بشر 'سکندروں' کے درمیاں

نہ ہم پھنسے تھے جب تلک ستم گروں کے درمیاں
ہمارا گھر بھی تھا یہیں 'انھیں گھروں کے درمیاں

ہیں سنگلاخِ دہر میں مثالِ چشمہ سار، ہم
نکالتے ہیں راہ اپنی پتھروں کے درمیاں

چمن میں انقلابِ نو کی دے انھیں کوئی خبر
چھپائے ہیں جو اپنے سر ابھی پروں کے درمیاں

روایتوں کی گود میں پلیں بڑھیں بغاوتیں
ہمیشہ بت شکن رہے ہیں بت گروں کے درمیاں

فریقِ جنگِ زرگری نہ پا سکیں سکونِ دل
ملے گی جنسِ عافیت قلندروں کے درمیاں

کسی کی تو رگوں میں گرم خون دوڑنے لگے
اٹھے کبھی تو کوئی سر جھکے سروں کے درمیاں

جزیروں ہی کی طرح اپنا بھی وجود ہے یہاں
ابھرتے ڈوبتے رہے سمندروں کے درمیاں

یہ ہیں زمانہ ساز یا شکارِ انقلاب ہیں
کہاں سے آئے اہلِ قصر بے گھروں کے درمیاں

کنارِ راہ پھینک دیں کسی نے چند روٹیاں
چھڑا ہوا ہے معرکہ گداگروں کے درمیاں

شکستہ گھر میں آج بھی بھٹک رہی ہے زندگی
کھنڈر کے بام و صحن میں گھرے دروں کے درمیاں

جو ربط باہمی ہے حسن و عشق میں نہ پوچھئے
کہاں سے آئے برگِ گل نچے پروں کے درمیاں

پیمبروں کی امتیں شکارِ تفرقہ ہوئیں
اگرچہ تھا نہ تفرقہ پیمبروں کے درمیاں

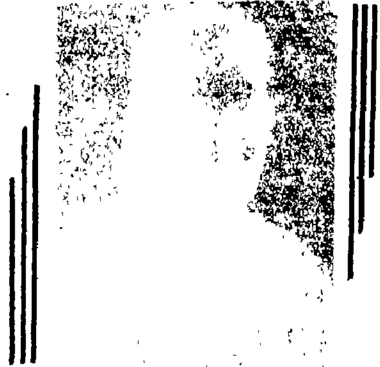
ہے اتنا ناامید کیوں وہ وقت جلد آئے گا
کھلے ہوئے ملیں گے پھول پتھروں کے درمیاں

ہمارا اہلِ دہر پر سے اعتبار اٹھ چکا
ملے ہیں ہم کو راہزن بھی رہبروں کے درمیاں

یہ سب شہیدِ عشق ہیں انھیں میں اس کو ڈھونڈ لے
ولی کا سر بھی ہے یہیں انھیں سروں کے درمیاں

تبھی ہے لطفِ انجمن ولی کہ بزمِ شعر میں
سخن شناس بھی ہوں کچھ سخنوروں کے درمیاں

رام لعل نابھوی
محلہ دیوان ۔ نابھا (پنجاب)



ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

علم و ادب، تحریر و تقریر میرے بس کی بات نہیں، لیکن کام چلا لیتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح سانس کا آنا جانا میرے بس میں نہیں لیکن سانس چلا لیتا ہوں۔

لکھنا پڑھنا میرا شوق ہے، مجھے اس میں لطف آتا ہے۔ میرا پیشہ نہیں۔ یہ خاندانی مرض ہے اور یہ مرض لاعلاج ہے۔ یہ ایک داستان ہے جسے شروع ہوئے تو بہت دیر نہیں ہوئی لیکن ختم آخری سانس کے ساتھ ہی ہوگی۔ سانس کا آنا جانا کب بند ہوگا، کیسے بند ہوگا، کہاں بند ہوگا۔ اور پھر کیوں بند ہوگا۔ پتہ لگانے کی بہت کوشش کی۔ کسی نے کہا یہ راز اللہ میاں کے پاس پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اللہ میاں کو تلاش کیا۔ نہ راز ملا اور نہ اللہ میاں!!

۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوا۔ خاموش رہا۔ دایا نے تھپیڑ جڑ دیے ـــ میں چیخ پڑا ـــ تب سے آج تک چیخ رہا ہوں ـــ چلّا رہا ہوں۔

تعلیم میٹرک تک رہی۔ شہر نابھا میں تب کالج نہیں تھا متوسط گھرانا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ملازمت مل گئی۔ شادی ہوگئی ـــ دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور فارن چلے گئے۔ لڑکی نے ایم اے کیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ سب بچے اپنی والدہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ اکیلا پیدا ہوا تھا، اکیلا رہ گیا۔ اکیلا ہی رہ رہا ہوں۔ ٹیگور نے ٹھیک کہا تھا۔ "اکیلا چلو" ـــ ہم نے ٹیگور کا کہنا مان لیا۔

پہلے ۱۰ سال نابھا میں، پھر ۱ سال پیپسو میں، پھر ۱ سال پنجاب میں اور آخر کے ۹ سال ہریانہ سرکار کی ملازمت کرکے ریٹائر کر دیا گیا۔ پھر یوں لگا کہ "جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا۔" آپ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں ؎

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

یہ تو تھیں سرسری باتیں۔ اب کام کی باتیں سنو ـــ ہمارا گھرانا ادبی گھرانا تھا۔ گھر کتابوں سے اٹا پڑا تھا۔ پردادا عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" میں ان کی فارسی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا نام منشی گوبند رام تھا۔ "شجاعت ہمو"۔ "بستان سعدی" "تاریخ دیوانات" وغیرہ اردو میں لکھیں۔ "شرح قصائد عرفی" فارسی پر ان کو مہاراجہ نابھا نے انعام دیا اور ریاست کی لائبریریوں کے لیے کتابیں خریدیں۔ شوکت میرٹھی سے ٹکرائے۔ لیکن جب انھوں نے "رسوم اگروالان" میں لکھ دیا کہ "ناخواندہ برہمنوں کو دان نہ دیا جائے" تو شہر میں برہمنوں نے ہنگامہ کیا اور کچھ نظم و نثر کی کتابیں وجود میں آئیں۔

میرے والد حکیم ہری داس صابر منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے بڑے بھائی رام سہائے تمنا لکھنوی کے شاگرد تھے، صاحبِ تصنیف تھے، تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ پنڈت دینا ناتھ مُعجز کی اُردو گیتا منظوم پر جہاں سرتیج بہادر سپرو اور علامہ اقبال کی تقاریظ چھپی ہیں وہیں ان کی تقریظ بھی ہے۔

اسکول میں ہی ناولوں کا چسکا پڑ گیا۔ دیوکی نندن کھتری کے دو ناول "چندرکانتا سنتتی" اور "بھوت ناتھ" اُردو میں ہاتھ آئے یہ کئی جلدوں میں تھے۔ لیکن اتنے دلچسپ کہ کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پھر "فسانۂ آزاد"۔ "سیر کوہسار" پڑھے۔ دوسرا چسکہ فلم بینی کا تھا۔ پہلی فلم "عالم آرا" سے شروعات کی اور مدتوں "فرسٹ ڈے، فرسٹ شو" ہمارا موٹو رہا۔ اس سے پہلے بائسکوپ خوب دیکھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ مجھے جلسوں میں تقریریں سننے کا شوق جنون کی حد تک تھا، چنانچہ آریہ سماج، سناتن دھرم کے جلسوں، سکھ پرب اور میلاد النبی سب میں جاتا۔ ایک دن ایک تقریر سنی اور گھر آکر یادداشت سے تقریر لکھ دی۔ دوسرے دن دوسری تقریر لکھ ڈالی والد صاحب کو دکھائیں۔ انھوں نے تھپکی بھی دی اور دونوں تقریریں لائل پور کے پرچے "جاگرت" میں چھپوا دیں۔ ۱۹۹۲ء میں دو مضامین ہندی میں لکھے۔ ایک میں سنسکرت کے حوالے دیئے۔ وہ دونوں مضامین "ایشور آرادھنا" چنڈی گڑھ میں چھپ گئے۔

دفتر کی مصروفیات، گھر کی مصروفیات نے کہیں کا نہ چھوڑا پڑھنے کا شوق البتہ جاری رہا۔ پھر کیا ہوا کہ ایک دن ایک مزاحیہ خاکہ "بولیے" لکھا۔ لوگ کہتے ہیں Silence is gold اور ہم نے ثابت کیا Speech is gold۔ پہلا خاکہ تھا۔ ہمیں کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ڈرتے ڈرتے علامہ منوّر لکھنوی کو سنا کر ان سے رائے پوچھی۔ انھوں نے مجھے ڈائرکٹر ریڈیو اسٹیشن نئی دہلی (اُردو سروس) کے پاس بھیج دیا۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ وہ پہلا خاکہ پنجاب کے ایک بندے کا اُردو مجلس سے نشر ہو گیا۔

یہ بات ۱۲ر جولائی ۱۹۷۰ء کی ہے۔ یہ اندازہ ہو گیا کہ ہم لکھ سکتے ہیں، پڑھ سکتے ہیں۔ اور دونوں صحیح۔ پھر ہم نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اُردو سروس، اردو مجلس۔ فوجی سروس نئی دہلی کے بعد دس بارہ ریڈیو اسٹیشنوں سے خاکے نشر کر دیئے۔ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے بھی ایک خاکہ نشر ہوا۔ غرضکہ خاکے نشر ہوتے رہے چھپتے رہے۔

اسی بیچ اُردو سروس سے "انشائیہ" موضوع ملا۔ ہم نے انشائیہ کا نام تو سن رکھا تھا لیکن اس "بلا" کے متعلق معلومات صفر تھیں۔ لغات سے معنی نکالے۔ وکٹورین ایسے (Essay) پڑھے حسب نسب کا پتہ لیا۔ انشائیہ نگاروں کو پڑھا۔ پاکستان میں انشائیہ کی تحریک کو سمجھا۔ ایک اچھوتا مضمون لکھ ڈالا۔ اسے رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے خطوں کے ذریعہ سراہا۔ اب انشائیوں کا سلسلہ چلا تو دوردرشن دہلی کے "بزم" پروگرام میں دوبارہ انشائیہ پر مذاکرہ میں حصہ لیا۔ دوردرشن جالندھر پر ہونے والا انشائیہ پر مذاکرہ، دوردرشن سری نگر اور دوردرشن بمبئی سے بھی ٹیلی کاسٹ ہوا۔ غرضکہ انشائیے لکھتا چلا گیا۔ چھپتے رہے، نشر ہوتے رہے۔ ریڈیو اسٹیشن جالندھر پر ایک مذاکرہ انشائیہ پر ہوا۔ اس میں انگریزی کے ایک پروفیسر، پنجابی کے ایک پروفیسر، ہندی کے ایک پروفیسر اور اُردو میں راقم الحروف شامل ہوئے۔

اس مذاکرے میں انگریزی ایسے، اُردو انشائیہ ہندی پنجابی للت نبندھ نصف گھنٹے تک زیر بحث رہے۔ پوری تاریخ کھنگال دی گئی۔ ایسا ہی مذاکرہ پھر رامائن کے پھلواری پرسنگ پر ہوا، اس میں بھی چار زبانوں کے ماہرین شامل ہوئے۔ اُردو کا حصّہ میرا تھا۔ پھر ڈائرکٹر دوردرشن بدل گئے اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کو نہ جانے کس نے بتا دیا کہ انھوں نے ایک سرکلر سارے اسٹیشنوں کو یکم مئی ۱۹۸۵ء کو بھیجا کہ پروگرام تجویز کرتے وقت رام لعل نابھوی کو، انشائیہ اور طنز و مزاح میں یاد رکھا جائے۔ سرکلر سارے اسٹیشنوں پر پہونچ گیا اور پھر اسے بستۂ خموشی میں اس احتیاط سے رکھ دیا گیا کہ نہ بستہ ملا نہ اتا پتا۔ اب کوئی ڈائرکٹر جنرل ہی کو نہ پوچھے تو ہمیں کون پوچھے گا۔ شاید

اسی ضمن میں ڈائرکٹر جنرل نے پھر کوئی سرکلر جاری نہیں کیا اور ہم اس میدان کے اکیلے شہسوار بنے ہوئے ہیں۔ اُردو سروس، اردو مجلس پر انٹرویو ہوئے۔ کلام بھی سنایا۔ انٹرویو دیگر ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی نشر ہوئے۔

آیئے ذرا دور درشن کی طرف چلیں —

حکومت ہند نے مجھے دُور درشن جالندھر کی ایڈوائزری کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ یہی نہیں پھر ایک پینل طنز و مزاح کا وہیں بنایا اور اس کا بھی ممبر مجھے نامزد کردیا۔ ہم دوردرشن کی ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ میں حرف گیری کرتے۔ منتظمین سُنتے کیوں کہ انھیں سننا پڑتا تھا لیکن ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیتے کیوں کہ یہ حق انھیں حاصل تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پھر موقع ہی نہیں ملا —!!

دوردرشن دہلی کی مارننگ ٹرانسمیشن میں میرا انٹرویو ہوا۔ وہیں اُردو کے "بزم" پروگرام میں انٹرویو ہوا۔ دوبار انشائیہ مذاکرہ وہیں ہوا جس میں میری شرکت تھی۔ دوردرشن جالندھر پر انٹرویو ہوا۔ دُوردرشن بمبئی پر کلام سنایا۔ لیکن دوردرشن پر جو نمایاں کام ہوئے وہ یہ ہیں کہ حکومت ہند کے حکم سے "کوئی اور کویتا" پروگرام میرے مکان پر ریکارڈ ہوا اور وہ نیشنل پروگرام میں دکھایا گیا۔ اس کے بعد میری لائبریری پر فلم بنانے کے سلسلے میں دور درشن جالندھر سے پروگرام ایگزیکٹیو آئے۔ ابھی وہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ حکومت کے حکم سے ایک ٹیم میرے مکان پر آئی اور اس نے دو دن محنت کرکے میری لائبریری کی فلم بنا ڈالی، جو ہونی تو تھی نیشنل پروگرام میں ٹیلی کاسٹ لیکن، میرے انٹرویو کے ساتھ دوردرشن لکھنؤ سے ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ یہ سلسلہ تو بہت چلتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایسے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے والے بھی کم نہیں ہوتے۔

پھر یوں ہوا کہ دُوردرشن جالندھر پر نیشنل شاعروں میں طنزیہ مزاحیہ کلام دو تین بار سنایا۔ کلام اچھا ہی ہوگا جو پھر بلایا گیا ورنہ کون بلاتا اور ہم کب جاتے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہنسنے چلانے پر مجبور کیا گیا لیکن زندگی کی نکیل تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے ہنسنے ہنسانے کا کاروبار شروع کردیا۔ ہنسنا تو ہمارے بس میں ہے۔ ہنسانے کے لیے ذرائع چاہئیں اور وہ میسّر نہیں۔

واہی صاحب نے پٹنہ سے ایک خط میں مجھے لکھا کہ ہندستان میں طنزیہ و مزاحیہ نظم اور نثر دونوں میں لکھنے والے تم ہی ہو۔ انھوں نے تو "آپ" لکھا تھا لیکن مجھے لفظ "تم" پسند ہے اس لیے تم لکھ دیا۔ آپ چاہیں تو "تم" کو "آپ" میں بدل سکتے ہیں۔

آیئے اب آپ کو میں تصنیفات، تالیفات اور تراجم کی طرف لیے چلتا ہوں —

۱. تبسم (طنزیہ و مزاحیہ خاکے) ۳ ایڈیشن
۲. آم کے آم (انشائیے) " ۲
۳. تلوک چند محروم (تنقید) " ۲
(ساہتیہ اکادمی دہلی کی ایما پر لکھی گئی)
۴. پُوتر پاپی (ناول کا اُردو ترجمہ) محکمہ السنہ نے شائع کیا
۵. چکبست (تنقید) [حکومت ہند کی ایما پر لکھی گئی اور شائع ہوئی]

دو سَو کے قریب مضامین لکھے، ان میں کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جو علم و ادب کی دنیا میں پہلی بار لکھے گئے۔ آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو سنیے:

۱. اقبال کا فلسفہ شاہین
۲. شیخ سعدی کا ہندستان آنا
(اس مضمون کی تصنیف کے لیے ۱۲ کتابیں تلاش کیں اور ان سب کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ شیخ سعدی کبھی ہندستان نہیں آئے۔ قاضی عبدالودود نے لکھا کہ حالی نے سعدی کی کذب بیانی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ میرے مضمون میں حالی کی کتاب "حیات سعدی" پر حرف گیری ہے۔ یہ مضمون "معارف" اعظم گڑھ میں چھپا۔
۳. عربی، فارسی، اُردو میں رامائن
۴. فارسی، اردو میں یوگ واشسٹھ
۵. عربی، فارسی، اُردو میں گیتا

۶۔ فارسی اور اُردو میں مہابھارت

۷۔ فارسی میں رامائن

۸۔ رامائن اور مسلمان

۹۔ اُردو میں رامائن

۱۰۔ مہرشی شو برت لال کی رامائن (۱۱) رامائنوں میں قومی یکجہتی

۱۲۔ تلسی داس کی مذہبی شاعری

۱۳۔ آفتؔ لکھنوی کی ایک نایاب رامائن

۱۴۔ وِسرا ئے وہمی کی رامائن

۱۵۔ پنجاب میں فارسی ادب

۱۶۔ فارسی کے ہندو انشا پرداز

۱۷۔ عربی ادب میں ہندوؤں کا حصہ

۱۸۔ عربی، فارسی ادب میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں

۱۹۔ سنسکرت میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں

ان شخصیتوں پر جو دنیائے ادب کی درخشندہ ستارے ہیں پہلی بار میں نے قلم اُٹھایا۔ ان کے نام ہیں۔

۱۔ صوفی امبا پرشاد

۲۔ طوطا رام ساسانی لکھنوی

۳۔ جنگ بہادر جنگؔ میرٹھی

۴۔ لالتا پرشاد شاؔد میرٹھی

۵۔ پنڈت ہری چند اخترؔ

۶۔ لال چند فلکؔ

۷۔ بھگونت رائے راحتؔ کاکوروی

۸۔ بنواری لال شعلہؔ

۹۔ بلونت سنگھ

۱۰۔ منشی جواہر سنگھ جوہرؔ (آپ غالبؔ کے شاگرد تھے)

۱۱۔ دیوان مانی بہاری لال (" " " ")

۱۲۔ مول چند نشی دہلوی

۱۳۔ کرپال سنگھ بیدارؔ

۱۴۔ نادرؔ کاکوروی

۱۵۔ گوبند پرشاد فضاؔ لکھنوی

ان میں سے، مضامین ملک کے مقتدر پرچے "معارف" میں چھپے۔ کچھ پاکستان میں چھپے۔ انٹرویو چھپے۔ ۵ ممالک میں مضامین خاکے چھپے۔ دوسری زبانوں میں تراجم ہوئے۔

ساہتیہ اکاڈمی دہلی کی کتاب انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر میں انگریزی میں دو مضامین چھپے۔

ساہتیہ اکادمی کی کتاب "A Critical Inventory of Ramayan Studies in the World vol. I میں میرا نام اسکالرز کی لسٹ میں درج ہے۔ دوسری جلد میں مضمون شائع ہوگا۔

انگریزی میں مضامین چھپے۔ ریڈیو اسٹیشن سے تقاریر نشر ہوئیں۔

پنجابی میں دو کتابوں کے علاوہ جو پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیں، کچھ اور مضامین بھی چھپے۔ مختلف رسالوں، پرچوں میں مضامین چھپے۔ ریڈیو اسٹیشن سے تقاریر کیں، ۵۰ کے قریب تبصرے لکھے۔

ہندی میں پنجاب یونیورسٹی کی کتاب میں مضمون شامل ہوا۔ مختلف رسالوں، پرچوں میں مضامین چھپے۔ کچھ کتابوں پر تبصرے بھی چھپے۔

اُردو میں پچاسوں کتابوں پر تبصرے چھپے۔ اس زبان میں سبھی اصناف پر کام کیا۔

انعامات لینے کے لیے کچھ طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ میں کسی گروہ میں شامل نہیں ہوا۔ اکیلا تھا، اکیلا ہوں۔ شاید اس لیے کہ اللہ بھی اکیلا ہے۔ گروہ بازی، شاعرہ بازی، پینترے بازی اور باہمی تعریف و توصیف کا کاروبار میں نے نہیں سیکھا۔ کسی نے سکھایا، نہ میں سیکھ سکتا تھا۔ وہ حربے جو انعامات حاصل کرنے کے لیے کام میں آتے ہیں، وہ میرے ہاتھ نہیں آئے۔ پھر طبیعت میں بغاوت۔ انعام کون دیتا۔ لیکن پھر بھی ۸ انعامات ملے۔ شاید آپ اسے بھی سننا چاہیں۔

۱۔ حکومت ہند سے پہلا انعام "آم کے آم" پر

۲۔ ہریانہ اُردو اکادمی سے خواجہ احمد عباس ایوارڈ ۔ (نقد، پلیک،

مثال . سند)

۳. بہار اردو اکیڈمی سے اردو ادب میں مجموعی خدمات پر خصوصی انعام

۴. آندھرا پردیش اُردو اکاڈمی سے "تبسم" پر انعام

۵. بہار اردو اکادمی سے "آم کے آم" پر انعام

۶. ہریانہ ساہتیہ اکادمی سے "آم کے آم" پر انعام

۷. ہریانہ ساہتیہ اکادمی سے "تبسم" پر انعام

۸. محکمہ السنہ پنجاب سے "آم کے آم" کی اعلا طباعت پر انعام

کچھ کام کی باتیں آپ نے سنیں. شاید پہلے بھی باندھی ہوں . اب خاص باتیں سنیے ؛

میرا کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ میں کسی مضمون کو شروع کرنے سے پہلے کتابیں تلاش کرتا ہوں، ایڈیشن جمع کرتا ہوں. مثلاً شاہنامۂ اردو۔ از منشی مول چند ۱۶ نسخے ، بہار دانش. ۶۰ نسخے وغیرہ۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ لائبریریوں سے، دکانوں سے، ردی کتابیں بیچنے والوں سے ایسی کتابیں تلاش کر کے لاؤں جو کہیں دستیاب نہ ہوں . پھر ان کو پڑھوں اور مضامین لکھوں . میرے پاس مختلف زبانوں میں بہت نادر و نایاب کتابیں ہیں ، قلمی نسخے ہیں . قریب دس ہزار کتابیں میرے پاس ہیں اور اس سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں کہ ضرورت کی کتاب نکالنے میں صرف ایک سکنڈ لگتا ہے

میری پسند لغات ، ببلیوگرافی ، مکتوبات ، ملفوظات ، دیوان، انشائیے ، خاکے ، طنز و مزاح ، تنقید ، تحقیق ، تاریخ ، سوانح عمریاں ، تذکرے ، یادگاری جلدیں ، قلمی نسخے ، پرانی کتابیں ، مخطوطات ، مسودے ، مذاکرے ، مناظرے ، ہیں .

یوں تو میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ زیادہ تر وقت پرانی اور نایاب کتابیں حاصل کرنے، گم شدہ اوراق تلاش کرنے، ان کو سجانے، سنوارنے پھر پڑھنے اور لکھنے میں صرف کرتا ہوں. لیکن اگر کوئی شخص میرے کام میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کرتا ہے یا کوئی بغض و حسد کا مریض کاٹنے کو دوڑتا ہے تو پھر نہ میری زبان رکتی ہے اور نہ قلم ۔ ٹکرا جانا میری فطرت ہے .

میرے انٹرویو ، مجھ پر مضامین متعدد اخباروں، رسالوں میں چھپے ہیں۔ انگریزی اور ہندی و پنجابی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے . بیکھ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی اردو نظم ، پنڈت رتن پنڈوروی اور شری سرسوتی سرن کیف کی نظمیں اور ڈاکٹر ستیہ دیو ورما کی سنسکرت نظمیں میرے لیے سرمایہ حیات ہیں . ان سب نے ڈاک کے ذریعہ از خود نظمیں بھیجی ہیں .

لیجیے صاحب ؛ اب آپ کہیں گے " اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں "۔ آخری بات سنتے جائیے . ذکر میں نے اپنا کر دیا ہے . داستان کو ہزار داستان سے بچایا ہے۔ تذکروں میں آپ شامل فرما لیجیے . وہ جو چلے گئے ، ان کے نام اور کام کا پتہ ان تذکروں ہی سے ملا ہے .

میں کبھی بیمار نہیں ہوا۔ ۷۵ سال کی عمر میں بھی بچوں کی سی عادتیں برقرار ہیں۔ کودتا پھاندتا پھرتا ہوں ۔ اب آپ اپنا کام کیجیے . میرا "کام تمام" کیجیے ۔ میں چلا ۔

□□

مرزا دبیر کے قلمی آثار

صفحہ ۲۲ کا بقیہ

۲۳. جب سے مدینہ مسکنِ خیر الوریٰ ہوا ۴۶

(۲۴ر ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ . نومبر ۱۸۴۶ء)

۲۴. خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبرؐ پہ چل گیا ۵۹

(۲۷ر صفر ۱۲۶۳ھ ۔ جنوری ۱۸۴۷ء)

(محررہ صفدر مرزا)

۲۵. شمعِ طاقِ حرمِ لم یزلی ہے عباسؑ ۹۳

(۲۶ر رجب سہ شنبہ ۱۲۶۳ھ ۔ جون ۱۸۴۷ء)

۲۶. مجموعۂ صد واقعہ یہ ماہِ صفر ہے ۱۶۰

(۱۵ر رجب ۱۲۶۴ھ ۔ جون ۱۸۴۸ء)

۲۷. جس دم اسیر عترتِ مشکل کشا ہوئے ۴۳

(سلخ محرم الحرام ۱۲۶۴ھ ۔ جنوری ۱۸۴۸ء)

۲۸. جب آسماں سے لشکرِ انجم رواں ہوا ۱۲۹

(۶ر ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ ۔ دسمبر ۱۸۵۴ء)

۲۹. جب لشکرِ اسلام کے کوفے میں سر آئے ۴۴

(۱۰ر شعبان ۱۲۶۵ھ ۔ جولائی ۱۸۴۹ء)

غزلیں

زندگی سے بڑی سزا ہی نہیں
اور کیا جرم ہے پتہ ہی نہیں

اتنے حصّوں میں بٹ گیا ہوں میں
اپنے حصّے میں کچھ بچا ہی نہیں

زندگی موت تیری منزل ہے
دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں

سچ گھٹے یا بڑھے، تو سچ نہ رہے
جھوٹ کی کوئی انتہا ہی نہیں

اس کا بل جانا کیا، نہ ملنا کیا
خواب در خواب کچھ مزہ ہی نہیں

چاہے سونے کے فریم میں جڑ دو
آئینہ جھوٹ بولتا ہی نہیں

اپنے اشعار میں وہ زندہ ہے
نور سنسار سے گیا ہی نہیں

کرشن بہاری نور
۶۷، غوث نگر، لکھنؤ

تیرے بغیر چاند عجب سا لگا مجھے
ناکام حسرتوں کا جنازہ لگا مجھے

وہ کچھ دنوں تو واقعی اپنا لگا مجھے
اس کی زباں سے جھوٹ بھی سچا لگا مجھے

اب یہ ہوا کہ خود ہی تماشہ میں بن گیا
پہلے تو عشق کھیل تماشہ لگا مجھے

اس طرح طے ہوئی ہیں محبت کی منزلیں
ہر اک قدم پر آگ کا دریا لگا مجھے

کیا پوچھتے ہو کوچۂ جاناں کی رونقیں
جب رات ہو گئی تو سویرا لگا مجھے

اب حادثوں کے بعد بھی میں جاگتا نہیں
اے انقلاب کوئی طمانچہ لگا مجھے

میں اپنی پیاس لے کے وہاں آگیا ہوں راز
دریا بھی جس مقام پہ قطرہ لگا مجھے

راز الہ آبادی
۳۰، بہادر گنج
الہ آباد



اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱ - نیا گاؤں (ایسٹ)
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

مرزا دبیر کے قلمی آثار

(۱) ذخیرۂ ادیب مرحوم

اُردو کے مشہور و معروف اور مستند محقق و نقاد پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے بڑی دیدہ ریزی اور جستجو سے متعدد مرثیے جمع کر کے ایک بے مثال کتب خانہ قائم کیا اور اس میں عمر بھر اضافہ کرتے رہے۔ اس کتب خانہ کے بارے میں مجھے خواجہ غلام السیدین اور سید علی اکبر کاظمی (ڈپٹی ناظم تعلیمات حکومت جموں کشمیر) نے آج سے کوئی تیس سال پہلے مطلع کیا تھا۔ جب میں نے کتب خانہ دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہاں قلمی مرثیوں کے سیکڑوں نسخے اور مطبوعات میں متعدد نادر و نایاب چیزیں موجود تھیں۔ میں نے ادیب مرحوم کی نگرانی میں سالہا سال کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

(۲) ذخیرۂ سید محمد رشید صاحب

دوسرا کتب خانہ سید محمد رشید صاحب مدظلہٗ کا ہے۔ یہاں بھی بیش بہا نادر و نایاب نوادرات ہیں۔ جو چیزیں ادیب مرحوم کے پاس نہیں تھیں، وہ یہاں آسانی سے ملتی ہیں۔ موصوف بڑے خوش اخلاق اور مددگار ہیں۔ کتب خانہ میں بیٹھ کر میں نے کئی کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔

(۳) قلمی مرثیوں کا ایک بڑا ذخیرہ راجہ صاحب محمود آباد کی ملکیت میں ہے۔ یہاں وہ قیمتی اور نایاب چیزیں ہیں جو اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ میں کوئی پندرہ سال تک اس نادر الوجود کتب خانے کو کھنگالتا رہا اور کئی کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ ان میں دیوانِ میر، دیوانِ دلگیر، دیوانِ نامی اور میر ضمیر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

(۴) قلمی مراثی کا ایک قابلِ ذکر ذخیرہ مشہور و معروف اُردو پبلشرز مرزا امیر علی جون پوری کا ہے۔ اس میں میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ کے نادر و نایاب مرثیے موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ بھی عرصہ دراز تک میری دست رس میں رہا۔

ان سبھی کتب خانوں نے میرے ادبی سفر میں سنگِ میل کا کردار ادا کیا اور مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں نے رثائی ادب میں کئی کتابیں اور بے شمار مضامین شائع کیے۔ ان میں باقیاتِ انیس، میر انیس نمبر نقوش لاہور، اودھ میں اُردو مرثیے کا ارتقاء، مراثیٔ دبیر (مطبوعہ اُردو اکادمی لکھنؤ) اور شاعرِ اعظم مرزا سلامت علی دبیر وغیرہ پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی گئیں۔ مزید برآں ان کتب خانوں میں بیٹھ کر میں نے تین اور اہم کتابیں مرتب کر کے تیار کی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) **باقیاتِ دبیر**: اس میں مرزا دبیر کی قدیم ترین نادر و نایاب مطبوعات اور مخطوطات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا دبیر کے کوئی بیس غیر مطبوعہ مرثیے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ کلامِ دبیر کے سیکڑوں غیر مطبوعہ بندوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ کتاب ۲۲ × ۱۸ سائز میں ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) **مراثیٔ میر خلیق**۔ خلیق کے مرثیے نادر و نایاب ہیں اور آج تک ان کا کوئی مرثیہ شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اوپر کے کتب خانوں میں ان کے سیکڑوں غیر مطبوعہ مرثیے موجود ہیں۔ ۳۰ مرثیے مجھے مرحوم مہاراجکمار صاحب نے استفادہ کے لیے دیئے تھے جن کا زیراکس لیا گیا ہے۔ کئی مرثیے خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "اودھ میں اُردو مرثیے کا ارتقاء" میں خلیق کے مراثی کی تفصیلی فہرست شائع کی ہے۔ کتاب ۵۵۶ صفحات میں ہے۔

(۲) ہندو مرثیہ گو شعراء - آج سے دس سال قبل یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یہ پروجیکٹ مجھے دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کتاب ۴۴۸ صفحات میں مکمل ہو گئی ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حیدرآباد کے بے نظیر کتب خانوں نے میری تحقیق کی پیاس کسی حد تک بجھائی ہے۔ یہاں مجھے انیس اور دبیر کے غیر مطبوعہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ اور خانقاہ پھلواری شریف کے بیش بہا اور غیر مطبوعہ مرثیے بھی میں نے دیکھے ہیں۔ یہاں بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

(۱) مراثی دبیر (قلمی) ذخیرہ ادیب مرحوم

نمبر شمار	مطلع	تعداد بند
۱.	آفاق میں مخصوص جو اُمت ہے نبیؐ کی	۹۰
۲.	انیسویں شب آئی جو ماہِ رمضاں کی	۳۱
۳.	اے برتر بتا گوہر بے بہا ہے کیا	۲۹
۴.	اے خالقِ سُبحاں تو مری عقل رسا کر	۹۳
	(نسخۂ محمود آباد میں ۱۰۶ بند ہیں اور ۱۲۶۱ھ کا ہے)	
۵.	اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے	۱۹۰
۶.	اے شمع قلم انجمن افروز رقم ہو	۹۵
۷.	اے لوح و قلم زیب دہ لوح و قلم ہو	۹۵
۸.	اے مومنو! سب خلق پہ احسان علیؑ ہے	۹۲
۹.	اے مومنو! شاہِ شہدا ہوتے ہیں شبیرؑ	۵۲
۱۰.	اے مومنو! کس باغ میں عالم ہے خزاں کا	۳۵
	(مجموعہ مرثیہ میر ضمیر ص ۲۵۹ میں غلطی سے چھپا ہے)	
۱۱.	اے مومنو! کیا باعثِ ایجادِ زمیں ہے	۱۱۰
۱۲.	بانو پچھلے پہر اصغرؑ کے لیے روتی ہے	۲۷
	(مالک اس مرثیہ بلاس رائے ذاکر سید الشہداءؑ)	
۱۳.	بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے	۹۲
۱۴.	برگشتہ ہے چرخِ ستم ایجاد دوبارہ	۳۰
	(ناتمام۔ تخلص ندارد)	
۱۵	بزمِ عزا میں رُوحِ حسنؑ کا ورود ہے	۱۲۶
۱۶	بلا سے چھٹ کے حرم کربلا میں آئے ہیں	۵۲
۱۷.	بلقیس پاسباں ہے یہ کس کی جناب ہے	۱۰۰
۱۸.	پرچم ہے کس علم کا شعاعِ آفتاب کی	۱۰۲
۱۹	بڑھتا ہے رجز رن میں رجز خوانِ پیمبرؐ	۳۴
۲۰.	تھے حسن میں یوسفؑ سے بھی بہتر علی اکبرؑ	۷۵
۲۱.	ثابت جو انتقال نجوم و قمر ہوا	۱۳۷
۲۲.	جانبازیِ حُر کی جو حرم میں خبر آئی	۶۸
۲۳.	جب آفتاب برجِ امامت ہوا غروب	۷۱
	(نسخۂ دوم ۶۲ بند)	
۲۴.	جب اخترِ یعقوبؑ پہ کی مہر خدا نے	۱۱۰
۲۵.	جب اہل بیت بے سر و ساماں ہو گئے	۲۱
	(نسخۂ دیگر خلیق تخلص ہے، اس میں ۵۱ بند ہیں)	
۲۶.	جب پریشاں ہوئی مولا کی جماعت رن میں	۲۱
۲۷.	جب پشتِ زیں سے دوشِ نبیؐ کا مکیں گرا	۶۳
	(نسخۂ ثانی میں خلیق تخلص ہے)	
۲۸.	جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی	۷۷
۲۹.	جب چمن خاک میں اکبرؑ کی جوانی کا ملا	۴۶
۳۰.	جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے	۵۰
۳۱.	جب خانۂ زنداں میں سکینہؑ نے قضا کی	۲۱
۳۲.	جب داخلِ وطن حرمِ مصطفےٰ ہوئے	۳۹
۳۳.	جب دُخترِ خاتونِ قیامت ہوئی پیدا	۶۶
	(نسخۂ دوم ۵۹ بند)	
۳۴.	جب دولتِ اولادِ شہِ دیں نے لُٹا دی	۲۸

مطلع	تعداد بند
۳۵۔ جب رن میں بوسہ گاہ پیمبرؐ ہوئی قلم	۵۵
۳۶۔ جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے	۹۴
(نسخۂ دوم میں ۹۲ بند اور نسخۂ سوم میں ۹۱ بند ہیں)	
۳۷۔ جب رن میں شیرِ حق کا پسر حملہ ور ہوا	۳۸
۳۸۔ جب رن میں صبح خاتمۂ پنجتن ہوا	۳۵
۳۹۔ جب رونقِ مرقعِ کون و مکاں ہوئی	۸۴
(موافق اصل است، سر مو فرق نیست نسخۂ دوم ۵۱ بند، سوم میں ۴۸ بند)	
۴۰۔ جب سرنگوں ہوا علم کہکشانِ شب	۱۵۰
(نسخۂ دوم میں ۱۱۵ بند)	
۴۱۔ جب سے کہ ہوا سلسلہ تولیدِ بشر کا	۶۴
۴۲۔ جب شام میں سیپارۂ صبح الم آئے	۷۵
۴۳۔ جب صبح کو مشرق سے نمایاں ہوا خورشید	۹۰
۴۴۔ جب عابدِ مریض کو داغِ پدر ملا	۴۵
۴۵۔ جب فوجِ حسینیؑ کے علمدار کو مارا	۳۵
۴۶۔ جب قطع کیا روز کی منزل کو قمر نے	۱۲
(ناقص)	
۴۷۔ جب کربلا کو شام سے لشکر ہوا رواں	۲۷
۴۸۔ جب طے سفرِ شام ہوا ماہِ صفر میں	۵۹
۴۹۔ جب کہ دو پہر میں زہراؑ کا چمن رن میں لٹا	۲۳
۵۰۔ جب لشکرِ خدا کے جواں کام آچکے	۳۳
۵۱۔ جب مبتلا بلا میں شہِ کربلا ہوئے	۴۹-۷۸
(شروع کے ۴۸ بند نہیں ہیں مرثیہ مطلع ثانی سے شروع ہے)	
۵۲۔ جب محفلِ حاکم میں شہِ دیں کا سر آیا	۶۹
۵۳۔ جب نیزے کی خواہش ہوئی اکبر کے جگر کو	۸۱
۵۴۔ جب وعدے پہ شبیرؑ نہ پھر آئے سفر سے	۳۰

مطلع	تعداد بند
۵۵۔ جب ہو گیا تباہ سفینہ نجات کا	۸۰
۵۶۔ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ	۵۱
۵۷۔ جب یزید اپنے گناہوں سے پشیماں ہوا	۶۷
(نسخۂ دوم ۳۶ بند)	
۵۸۔ جو زائرِ حسین علیہ السلام ہو	۴۵
(دو نسخے)	
۵۹۔ چھانٹے گئے جب نخلِ گلستانِ پیمبرؐ	۲۰
۶۰۔ حسینؑ جب کہ چلے بعد دوپہر رن کو	۳۰
۶۱۔ خاصانِ خدا کو جو محبت ہے خدا سے	۵۳
(نسخۂ ثانی ۴۴ بند)	
۶۲۔ خورشید نے برہم جو کیا دفترِ انجم	۱۲۰
(نسخۂ دوم ۱۱۴، نسخۂ سوم ۱۱۲ بند)	
۶۳۔ داخل ہوئے جب مدینہ میں ابنِ یداللہ	۲۷
۶۴۔ دنیا جو بنتِ خسروِ کنعاں کا نام تھا	۱۱۰
۶۵۔ دنیا کا عجب حال کتابوں میں لکھا ہے	۱۴۷
۶۶۔ دو پہر میں چمنِ فاطمہ مقتل میں لٹا	۲۳
۶۷۔ دیکھا جو حرؑ نے احمدِ مرسلؐ کو خواب میں	۳۰
۶۸۔ ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا	۸۱
۶۹۔ رن میں باندھے ہوئے سہرے کو جو آئے قاسمؑ	۴۶
(نسخۂ دوم ۳۱ بند)	
۷۰۔ رن میں زوالِ مہرِ نبوت کا وقت ہے	۶۴
۷۱۔ زنداں سے اسیروں کو رہا کرتے تھے حیدرؑ	۳۷
۷۲۔ زندانِ شام میں جو حرم کو سحر ہوئی	۷۵
(نسخۂ دوم ۳۷ بند)	
۷۳۔ زوالِ فوجِ خدا جب دمِ زوال ہوا	۲۹
۷۴۔ زینبؑ کو نہایت غمِ شاہِ شہدا تھا	۳۲
۷۵۔ زینبؑ کے پسر معرکہ آرائے وغا تھے	۹۴
(نسخۂ دوم ۸۸ بند)	

تعداد بند	مطلع
۱۵۴	۷۶. سیفی کا نمونہ مری شمشیر زباں ہے
۱۱۱	۷۷. شاہِ شہداء مطلع تسلیم و رضا ہے
	(نسخۂ دوم ۹۲ بند)
۱۱۰	۷۸. شرف ازل سے جو ازواجِ مرتضیٰ کو ملا
۴۱	۷۹. شیریں کو جب حسین نے آزاد کر دیا
۳۸	۸۰. صبح عاشور نے جب چاک گریباں کیا
۳۷	۸۱. صغرا کو عجب فرقتِ شبیر کا غم تھا
۴۳	۸۲. صغرا کے لیے تحفۂ غم لاتی ہے زینبؑ
۶۰	۸۳. ظلمات کے چشمے پہ سکندر کی ہے آمد
۴۴	۸۴. عاشور کو ہر سمت جو ہوا دفتر ایماں
	(نسخۂ دوم ۱۰ بند)
۸۰	۸۵. عباسؑ دلاور گہرِ اہلِ وفا ہے
۲۵	۸۶. عزیزو! آج شہادت کی رات آئی ہے
	(بغیر مقطع کے مجموعہ مرثیہ میر ضمیر ص ۱۵۹ میں چھپا ہے)
۲۸	۸۷. عزیزو! بخیۂ زخم جگر نہیں ہوتا
۳۸	۸۸. غم شبیر میں جو آہ و بکا کرتے ہیں
۳۲	۸۹. فرزندِ علیؑ برجِ سخاوت کا قمر ہے
۲۵	۹۰. فرزند کو امت پہ فدا کرتے ہیں شبیرؑ
۴۴	۹۱. فلک نے کارِ قضا سے جب انفراغ کیا
۱۳۶	۹۲. فولاد کی ضریح میں کس کا مزار ہے
۸۴	۹۳. قدرت کے آفتاب کا مطلع حسینؑ ہے
۴۶	۹۴. قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے
۶۶	۹۵. قید سے یوسفِ شبیر رہا ہوتا ہے
۷۵	۹۶. کب خلد ہے بزمِ غمِ مولا کے برابر
۹۰	۹۷. کرسی نشین عرشِ منور حسینؑ ہے
	(نسخۂ دیگر ۴۲ بند)
۱۰۳	۹۸. کس کی زباں سے پیاس نے پائی ہے آبرو

تعداد بند	مطلع
۱۲۸	۹۹. کوفے میں بہار آئی جو گلگشتِ چمن کو
	(نسخۂ دیگر ۱۱۸ بند)
۸۴	۱۰۰. کوہِ قیم پر جو علیؑ کا گزر ہوا
۱۱۱	۱۰۱. کیا آمدِ جبریل تھی مرغوبِ نبیؐ کو
	(نسخۂ دیگر ۱۰۷ بند)
۴۰	۱۰۲. کیا خاطرِ شبیرؑ ہے درگاہِ خدا میں
۸۵	۱۰۳. کیا خلقِ حسن تھا حسنؑ سبز قبا میں
۴۵	۱۰۴. کیا شاہِ خراساں کی زیارت کا شرف ہے
	(نسخۂ دیگر ۴۴ بند)
۱۰۲	۱۰۵. کیا شیعانِ شیرِ خدا کا وقار ہے
۸۴	۱۰۶. کیا فضلِ حق سے فوجِ حسینی کا اوج ہے
۴۲	۱۰۷. کی عالمِ فلک نے جو تسخیرِ آفتاب
۱۰۵	۱۰۸. گلگونۂ رخسارِ فلک گرد ہے ان کی
۱۵۹	۱۰۹. گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے
۲۲	۱۱۰. گم ہو گیا ہے کہاں کے بستاں یوسفِ حسینؑ
۳۰	۱۱۱. محبوس جب کہ نائبِ مشکل کشا ہوئے
۲۲	۱۱۲. محوِ قضا جو قاسمؑ گل پیرہن ہوا
۶۴	۱۱۳. معراجِ سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے
۱۰۰	۱۱۴. مقتل ہے چمن فصلِ بہاری کی ہے آمد
۴۶	۱۱۵. ملتا ہے مزا روح کو حیدرؑ کی ثنا سے
۴۶	۱۱۶. ممکن نجوم ہفت فلک کا شمار ہے
۱۳۴	۱۱۷. منبر نشینِ انجمنِ شاہِ دیں ہوں میں
۳۳	۱۱۸. مومنو! احمدِ مرسل پہ نبوت ہے ختم
۴۵	۱۱۹. مومنو! اشک بہاؤ کہ محرم آیا
	(۳ نسخے)
۹۲	۱۲۰. مومنو! بےکس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ
۵۹	۱۲۱. میدان میں صفیں جو بندھیں فوجِ شام کی
۳۳	۱۲۲. نمازِ عصر کو جب شاہ نے تمام کیا

مطلع	تعداد بند
۱۲۳۔ وہ درد ہے کیا درد جو درماں نہیں رکھتا	۱۱۰
۱۲۴۔ وہ کون دو مظلوم ازل ہیں دوسرا میں	۷۷
۱۲۵۔ وہ کون دو یوسفؑ ہیں جو آوارہ وطن ہیں	۱۰۲
۱۲۶۔ وہ کون ہے جو یوسفِ بازار شاہ ہے	۷۸
۱۲۷۔ ہوتا ہے عیاں مصحفِ ربّ دوسرا سے	۱۰۲
(نسخۂ ثانی ۸۷ بند)	
۱۲۸۔ ہے یوسفِ کنعان فصاحت سخن اپنا	۹۹
۱۲۹۔ یارب صغیر سن میں کوئی بے پدر نہ ہو	۳۸

---

(۲) مراثیِ دبیر (قلمی) ذخیرۂ سید محمد رشید

مطلع	تعداد بند
۱۔ آتا ہے رن میں کون کہ ایماں کا زور ہے	۴۵
(مکتوبہ ۱۹ دسمبر ۱۸۷۲ء بقلم سید مرتضیٰ کوتوالی دھولپور)	
۲۔ آدم کا داد رس بنی آدم میں کون ہے	۱۵۶
۳۔ آمد گلِ مرادِ حسنؑ پر خزاں کی ہے	۷۴
۴۔ آمد ہے بادشاہِ فلک بارگاہ کی	۶۷
(مقطع ندارد)	
۵۔ آمد ہے تاجدار ثریا جناب کی (۳ نسخے)	۱۳۰
(۳ جمادی الآخر ۱۲۹۶ھ بقلم سید افضل حسین ثابت) دربار حسین ص ۱۳۸ میں اسے صفدر شاگرد دبیر کا دکھایا گیا ہے)	
۶۔ آیا خط مسلم جو امام مدنی کو	۴۸
۷۔ ارشاد مجھے آج ہے یہ لوح و قلم سے	۱۰۶
(دربار حسین ص ۳۳۷ میں قدیر شاگرد دبیر کا دکھایا گیا ہے)	
۸۔ اصغرؑ پہ جب کہ پیاس کی شدت سوا ہوئی	۱۰۸
(۲ نسخے)	

مطلع	تعداد بند
۹۔ اللہ رے شہ بے کس و بے یار کی آمد	۶۲
۱۰۔ اللہ نے پیدا جو کیا رنج و بلا کو	۱۳۵
(پٹیالہ اخبار مطبوعہ ۱۲ جون ۱۸۷۳ء کا کوَر چڑھا ہوا ہے)	
۱۱۔ اے باغِ طبع رنگِ بہارِ سخن دکھا	۱۲۶
۱۲۔ اے جذبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے	۱۹۰
(دو نسخے)	
۱۳۔ اے دشتِ قتل دامن صد کوہ طور ہو	۵۲
(مکتوبہ بحیاتِ مصنف)	
۱۴۔ اے روزہ دارو! آہ و بُکا کے یہ روز ہیں	۳۷
۱۵۔ اے طبعِ رواں سیفِ قلم جلد علم کر	۱۲۰
۱۶۔ اے مومنو! کس عہد سے یہ بزمِ عزا ہے	۸۳
(مکتوبہ بحیاتِ مصنف، مالک مرثیہ قربان حسین)	
۱۷۔ اے مومنو! کیا باعثِ ایجاد زمین ہے	۱۰۰
۱۸۔ اے نظم رزم بزم میں عالم پسند ہو	۹۷
(بغیر مقطع نوشتۂ میر عابد حسین ۲ جون سنہ ۱۸۸۰ء "دربار حسین" ص ۱۵۹ میں اسے سید محمود تسنیم کا بتایا گیا ہے)۔	
۱۹۔ برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی ہے آمد	۱۲۰
۲۰۔ پامال جب کہ گلشنِ خیر الوریٰ ہوا	۲۷
(مکتوبہ ۲۵ محرم ۱۲۹۲ھ در اکبرآباد)	
۲۱۔ پرچم کشا ہوا علم زرفشانِ مہر	۱۵۰
۲۲۔ پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی	۲۴۵
۲۳۔ پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی	۹۴
(نوشتہ بحیات دبیر)	
۲۴۔ پیری میں اگر بخت جواں ہو تو مزا ہے	۹۹
(مقطع ندارد) "مرثیہ مصنفہ مرزا دبیر سلّمہ"	

مقطع	تعداد بند
۲۵. تسبیح امامت جو گری خاک شفا پر	۱۰۸
(مکتوبہ ۱۰ شہر صفر روز سہ شنبہ ۱۲۶۴ھ)	
۲۶. ثابت جو انتقال نجوم و قمر ہوا	۱۰۹
(مقطع ندارد۔ نوشتہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ)	
۲۷. جب آسماں پہ لشکر انجم رواں ہوا	۱۲۴
(مکتوبہ ۱۳۰۵ھ)	
۲۸. جب اختر یعقوبؑ پہ کی مہر خدا نے	۱۳۷
۲۹. جب داخل وطن حرم مصطفےٰ ہوئے	۲۹
۳۰. جب ربط خاک و آتش و آب و ہوا ہوا	۸۰
(از بستۂ نورالحسن)	
۳۱. جب رن میں آستین چڑھائی حضور نے	۹۲
۳۲. جب رن میں ابن شیر خدا حملہ ور ہوا	۶۹
۳۳. جب رن میں بعد فتح عدو ایک شب رہے	۵۶
۳۴. جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے	۹۷
۳۵. جب رن میں شاخ نخل امامت قلم ہوئی	۹۵
۳۶. جب رو چکے شبیر عزیز و رفقا کو	۳۱
(مکتوبہ ۱۲۵۳ھ)	
۳۷. جب رونق مرقع کون و مکاں ہوئی	۱۰۹
(بخط نورالحسن کوکب ۱۲۷۹ھ)	
۳۸. جب زہر سے شہید امام رضاؑ ہوئے	۲۷
۳۹. جب زیب دہ منزل اوّل ہوئے شبیرؑ	۶۹
۴۰. جب سرنگوں ہوا علم کہکشان شب	۲۵۵
(مکتوبہ ذی الحجہ ۱۸۹۲ء نسخۂ ثانی ۱۱۳ بند یکم اپریل ۱۸۷۵ء)	
۴۱. جب سکۂ زر اشرفی مہر ہوا روز	۱۸۲
(مکتوبہ ۱۹ فروری ۱۸۶۸ء)	
۴۲. جب شامیوں میں صبح کی نوبت کا غل ہوا	۱۳۵
۴۳. جب قبل حشر ہوگا ظہور امام عصر	۱۰۹

مطلع	تعداد بند
۴۴. جس روز سے ہے ملک خضر آب بقا پر	۱۱۹
(مکتوبہ ۲ مئی ۱۹۱۰ء)	
۴۵. جب کوزۂ خورشید بھرا شیر سحر سے	۱۰۰
۴۶. جب لالۂ شفق نے دکھائی بہار صبح	۱۴۰
۴۷. جب ماہ نے نوافل شب کو ادا کیا	۲۲۷
(ذی الحجہ ۱۸۹۲ء۔ از بستۂ نورالحسن نسخۂ ثانی ۲۲۶ بند)	
۴۸. جب نخل انتقام میں تیغوں کے پھل لگے	۱۷۰
(دو نسخے)	
۴۹. جب نہر پر حسین برادر کو رو چکے	۵۵
(مکتوبہ بحیات مصنف 'اخبار کارنامہ مطبوعہ ۳۰ اپریل ۱۸۷۷ء کا کور چڑھا ہے)	
۵۰. خورشید نے برہم جو کیا دفتر انجم	۱۱۱
(مکتوبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ بخط سید علی)	
۵۱. دست خدا کا قوت بازو حسینؑ ہے	۱۳۹
۵۲. ذرہ ہے آفتاب در بوترابؑ کا	۸۱
(نسخۂ ثانی ۸۷ بند از بستۂ نورالحسن ۱۳۰۵ھ)	
۵۳. ذیقعدہ میں وہ قاعدۂ نو ہو سخن میں	۲۱۴
(مقطع ندارد)	
۵۴. رن کی زمیں نمونۂ عرش جلیل ہے	۹۰
(مکتوبہ دہم رجب ۱۲۶۹ھ در بمبئی)	
۵۵. زنداں میں جبکہ بند غزال حرم ہوئے	۴۵
۵۶. زنجیر جہنم سے جب آزاد ہوا حُر	۹۱
(نسخۂ ثانی ۴۰ بند مکتوبہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ)	
۵۷. شاہ شہداء مطلع تسلیم و رضا ہے	۹۲
مطلع ثانی: جب زیب دہ منزل اوّل ہوئے شبیرؑ	
(مکتوبہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ)	

مطلع	تعداد بند
۵۸. صغرا کو عجب فرقتِ شبیر کا غم تھا	۷۸
(مکتوبہ ۱۲۴۸ھ)	
۵۹. طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے	۱۶۸
۶۰. فلک نے کار قضا سے جب انفراغ کیا	۶۴
(تمام شد بتاریخ بست و چہارم محرم ۱۲۵۴ھ)	
۶۱. قرآن میں یک سورۂ یک آیہ ہے کس کا	۲۰۰
۶۲. کس کا علم حسینؑ کے منبر کی زیب ہے	۱۳۸
۶۳. کس کی زباں سے پیاس نے پائی ہے آبرو	۱۶۱
۶۴. کوفے میں بہار آئی جو گلگشت چمن کو	۱۵۹
۶۵. کیا شاہ خراساں کی زیارت کا شرف ہے	۴۵
(نسخۂ ثانی مکتوبہ ۹ ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ)	
۶۶. کیا فضل حق سے فوجِ حسینیؑ کا اوج ہے	۸۳
۶۷. مسافروں کی مدینے میں جب رسید آئی	۱۳۰
(مکتوبہ ۱۲۸۶ھ)	
۶۸. معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے	۱۱۳
("مرثیہ میاں دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ")	
۶۹. مفتاح قفل باب سخن ہے زباں میری	۵۶
(تمام شد ۱۲۹۱ھ)	
۷۰. موسیٰ کو سرِ طور پر معراج ہوئی ہے	۷۵
(مکتوبہ بحیات دبیر)	
۷۱. مومنو! احمد مرسل پہ نبوت ہے ختم	۳۳
(مکتوبہ ۱۲۹۶ھ)	
۷۲. مومنو! اشک بہاؤ کہ محرم آیا	۳۳
("مرثیہ دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ")	
۷۳. مومنو! نور سے معمور قلم ہوتا ہے	۱۰۹
(مکتوبہ یکم ستمبر ۱۸۹۸ء بخط میر باقر حسین جعفری)	
۷۴. واحسرتا کہ ماہِ محرم گزر گیا	۴۶
(مکتوبہ یکم ربیع الاول ۱۲۷۸ھ مقابلہ نمودہ)	

مطلع	تعداد بند
۷۵. ہوتا ہے عیاں مصحف رب دوسرا ہے	۸۸
(مکتوبہ ۱۲۹۷ھ)	
۷۶. ہر جلسے میں مشتاق یہ سب کہتے تھے رو رو	۶۸
۷۷. یہ ترجمۂ آیۂ لولاک ثنا ہے	۷۸
(مکتوبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ بخط سید عنایت علی پھلسری)	

(۳) مراثی دبیر (قلمی) ذخیرہ مرزا امیر علی جونپوری

مطلع	تعداد بند
۱. آفاق میں مخصوص جو اُمت ہے نبیؐ کی	۷۶
۲. آہو رے کعبہ قربانیِ داور ہے حسینؑ	۲۹
۳. آیا خط مسلم جو امام مدنی کو	۹۷
۴. اعدا جو باغِ فاطمہ تاراج کر چکے	۴۰
(مکتوبہ ۵ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ)	
۵. اللہ نے پیدا جو کیا رنج و بلا کو	۱۳۱
(بخط نور الحسن کوکب، نسخۂ ثانی ۹۷ بند)	
۶. انجیلِ مسیح لبِ شیریں ہیں عباسؑ	۱۹۲
(بغیر مقطع، نامکمل)	
۷. اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے	۹۸
(مکتوبہ ۱۲۷۴ھ از بستہ سید نثار علی)	
۸. اے دشت قتل دامن صد کوہ طور ہو	۱۱۳
۹. اے ساقیِ دوراں تو مے فخر پلا دے	۵۵
۱۰. اے عزیزو! دہم ماہِ محرم ہے آج	۴۵
(مکتوبہ ۱۲۹۳ھ نسخۂ ثانی ۱۲۹۵ھ)	
۱۱. اے لوح و قلم رشک دہ لوح و قلم ہو	۸۵
۱۲. اے مومنو! سب خلق پہ احسانِ علیؑ ہے	۵۴
(مکتوبہ ۱۲۸۹ھ)	
۱۳. اے مومنو! کس عہد سے یہ بزم عزا ہے	۷۷
(بحیات مصنف)	

مطلع	تعداد بند
۱۴۔ اے مومنو! کیا صاحبِ اعجاز ہے عباس	۱۲۱
(مکتوبہ ۱۲۲۰ھ بمقام کربلائے معلی در رسالۂ ناظم صاحب لکھنوی۔ نسخۂ ثانی ۵۰ بند)	
۱۵۔ اے مومنو! دہ سرو گلستانِ رسالت	۳۸
(بحیاتِ مصنف)	
۱۶۔ اے یارو! سنو حادثۂ گردشِ دوراں	۴۶
(مکتوبہ ۱۵ رذی الحجہ ۱۲۸۰ھ نسخۂ ثانی ۴۰ بند ۱۲۸۰ھ)	
۱۷۔ باغِ فردوس سے یہ بزمِ عزا بہتر ہے	۲۷
۱۸۔ بحرِ ثنائے شاہِ شہیداں کا جوش ہے	۱۰۵
۱۹۔ برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی ہے آمد	۱۲۰
(نسخۂ ثانی ۱۱۸ بند بمقام بٹالہ ۲ ررمضان ۱۲۸۴ھ۔ نسخۂ سوم ۱۱۵ بند)	
۲۰۔ بزمِ عزا میں روحِ حسنؑ کا ورود ہے	۱۳۷
۲۱۔ بلا اُٹھا کے حرم کربلا میں آتے ہیں	۵۶
۲۲۔ بلقیس پاسباں ہے یہ کس کی جناب کا	۴۸
۲۳۔ بے حکمِ علیؑ ابرِ درافشاں نہیں ہوتا	۱۳۰
۲۴۔ پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی	۱۰۵
(مالک عبدالقدیر سید محمود علی بصیر)	
۲۵۔ پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی	۱۳۱
۲۶۔ پڑھتا ہے رجز رن میں رجز خوانِ پیمبرؐ	۵۵
(۳) نسخے۔ ایک نسخہ بخط سید محمود کی ابن مولوی علی رضا مکتوبہ ۱۹ رذی الحجہ ۱۲۸۹ھ	
۲۷۔ پیدا کیا خالق نے جو کعبے کی زمیں کو	۶۹
(دو نسخے)	
۲۸۔ تسبیح فاطمہؑ جو ادا کی امام نے	۷۶
۲۹۔ تقسیم وفا روزِ ازل کی جو خدا نے	۷۸
۳۰۔ توڑا صنمِ عباسؑ نے جب شہ کی کمر کو (بحیاتِ مصنف)	۷۰
۳۱۔ تیغوں سے جب قلم چمنِ مرتضیٰؑ ہوا	۵۰
۳۲۔ جب آفتاب تاجِ سرِ آسماں ہوا	۵۹
(مطبع نول کشور جلد دوم میں انیس کے نام ملتا ہے)	
۳۳۔ جب آ کے حرم باغِ فلک میں رہے شب کو	۳۴
۳۴۔ جانبازیِ حُرکی جو حرم میں خبر آئی	۱۵۹
۳۵۔ جب احمدِ ثانی کو پیامِ اجل آیا	۴۷
(اس پر اخبار پٹیالہ مطبوعہ ۱۳ رمارچ ۱۸۷۳ء کا کور چڑھا ہوا ہے)	
۳۶۔ جب اہلِ بیت بے سر و سامان ہو گئے	۳۲
(نسخۂ ثانی مطبوعہ اسلاف میر انیس صد ۱۵۴ میں خلیق کے نام سے موجود ہے)	
۳۷۔ جب باغِ حسینی پہ خزاں آ گئی رن میں	۶۸
(مطبع نول کشور جلد ۴ میں انیس کے نام چھپا ہے)	
۳۸۔ جب بامِ آسماں پہ بچھا فرشِ نورِ صبح	۴۸
(مقطع ندارد)	
۳۹۔ جب بختِ ابنِ زعفرِ جنّی رسا ہوا	۷۷
۴۰۔ جب پریشاں ہوئی مولا کی جماعت رن میں	۳۷
(مکتوبہ ۱۲۸۹ھ نسخۂ ثانی ۳۵ بند)	
۴۱۔ جب حد سے بڑھا کفرِ یہودی و نصارا	۶۶
۴۲۔ جب ختم کیا سورۂ وَاللّیل قمر نے	۷۷
(نسخۂ دیگر مکتوبہ ۱۲۹۱ھ ۴۸ بند)	
۴۳۔ جب ربطِ خاک و آتش و آب و ہوا ہوا	۸۰
۴۴۔ جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے	۱۱۸
(مکتوبہ ۱۸۹۶ء نسخۂ ثانی ۱۲۷۲ھ ۵۰ بند)	
۴۵۔ جب رونقِ مرقعِ کون و مکاں ہوئی	۱۱۲
۴۶۔ جب سامنے ظالم نے اسیروں کو بلایا	۵۲
(نسخۂ ثانی میں ۳۶ بند ہیں اور اس میں دلگیر تخلص ہے)	

	مطلع	تعداد بند
۴۷.	جب سرنگوں ہوا علم کہکشان شب	۱۲۰
	(مکتوبہ ۱۲۹۱ھ نسخہ ثانی ۷ اگست ۱۸۶۴ء)	
۴۸.	جب شام کے کشور میں چراغاں ہوا شب کو	۱۴۶
۴۹.	جب شہ کے رفیقوں کا ہوا خاتمہ بخیر	۳۴
	(مکتوبہ ۱۲۸۰ھ)	
۵۰.	جب عابدِ مریض کو داغِ پدر ملا	۳۰
۵۱.	جب فاطمہ کے عقدِ شہِ لافتیٰ ہوا	۸۱
۵۲.	جب فتح نامہ فوجِ عدو نے رقم کیا	۳۶
	(نسخہ ثانی ۳۰ بند)	
۵۳.	جب فوجِ حسینی کے علمدار کو مارا	۳۶
	(مکتوبہ ۱۲۹۱ھ)	
۵۴.	جب قتل رن میں فاطمہ کا لال ہوگیا	۳۵
۵۵.	جب قطع رن میں رشتۂ دینِ خدا ہوا	۴۸
۵۶.	جب کربلا میں عترتِ اطہار لٹ گئی	۳۴
۵۷.	جب گرم عدل و داد کا بازار ہوئے گا	۱۰۷
	(مکتوبہ ۱۲۷۴ھ)	
۵۸.	جب متصل مسجد کوفہ حرم آئے	۶۴
	(مکتوبہ ۱۲۵۲ھ نسخہ دیگر ۱۲۵۸ھ)	
۵۹.	جب مدینے میں بہتر کی سنائی آئی	۱۶
	(بغیر مقطع)	
۶۰.	جب موسم جوانیِ اکبرؑ گزر گیا	۳۶
	(نوشتہ سید محمد حسن پھولسری)	
۶۱.	جب کہ زنداں میں نبی زادیوں کو رات ہوئی	۴۶
۶۲.	جب کہ سجادؑ حزیں قیدِ ستم سے چھوٹے	۳۲
۶۳.	جس وقت پڑا سکۂ شب سیم قمر پر	۱۲۰
۶۴.	جعفر صادقؑ کا رتبہ خلق میں مشہور ہے	۴۱
	(دو نسخے)	
۶۵.	جنت میں جہنم سے خدا لاتا ہے حُر کو	۸۳

	مطلع	تعداد بند
۶۶.	حرزِ علم احمد مختار ہے عباسؑ	۱۴۲
	(مکتوبہ ۱۲۸۱ھ بخط عابد علی نسخہ ثانی ۱۰۸ بند)	
۶۷.	حضرت کو ہوا ماہِ محرم جو سفر میں	۴۸
۶۸.	خط کوفے سے آئے جو امامِ مدنی کو	۹۹
۶۹.	خورشیدِ امامت جو گرا روئے زمیں پر	۴۸
۷۰.	خورشیدِ صبح کشورِ مہر و وفا ہے حُر	
	(مکتوبہ ۱۲۹۱ھ)	
۷۱.	خورشید کا عروج ہے برجِ خیام سے	۷۰
۷۲.	خورشید نے کیا جو مقام آسمان میں	۴۷
۷۳.	داغِ غمِ حسینؑ میں کیا آب و تاب ہے	۸۴
	(پٹیالہ اخبار مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۶۳ء مطبوعہ نولکشور کا کور چڑھا ہوا ہے۔ ایڈیٹر: سید رونق علی)	
۷۴.	دستِ خدا کا قوتِ بازو حسینؑ ہے	۹۹
	(اخبار مرقع تہذیب لکھنؤ یکم فروری ۱۸۷۵ء کا کور چڑھا ہے۔ دو نسخے)	
۷۵.	دنیا جو بنتِ خسروِ کنعاں کا نام تھا	۱۲۶
۷۶.	رخ سے عروسِ شب نے جو الٹی نقابِ شب	۱۴۳
۷۷.	رکنِ دینِ نبیؐ جب کہ گرایا رن میں	۲۴
	(کور: ناصر الاخبار مطبوعہ نومبر ۱۸۶۳ء)	
۷۸.	رن کو رواں ہے سیفِ خدا آج خیر ہو	۷۵
	(دو نسخے۔ مکتوبہ ۱۲۷۲ھ)	
۷۹.	رن کی زمیں نمونۂ عرشِ جلیل ہے	۱۳۱
	(کور: اخبار انجمن ہند مطبوعہ ۲۵ اپریل ۱۸۶۴ء)	
۸۰.	زنداں کی طرف ہند مجلس سے رواں ہے	۷۱
۸۱.	زنداں میں چہلم جو ہوا اہلِ حرم کو	۸۶
	(کور: اخبار پٹیالہ ۹ جون ۱۸۶۳ء۔ مکتوبہ ۱۲۹۵ھ)	

مطلع	تعداد بند
۸۲. زہرا کے مرقع کو مٹایا جو قضا نے	۱۸
۸۳. زیبا یہ تخت و تاج ہے اکبر کے واسطے	۲۴
۸۴. زینب کو نہایت غم شاہِ شہداء تھا	۳۲
۸۵. سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل	۱۳۱
۸۶. سجاد کو فرصت جو ملی دفنِ پدر سے	۲۷
۸۷. سرتاجِ کائنات حسنؑ اور حسینؑ ہیں	۱۴۰
۸۸. سقائے سکینہ جو گیا باغِ ارم کو	۳۰
(مکتوبہ ۱۲۸۱ھ)	
۸۹. سیفی کا نمونہ مری شمشیر زباں ہے	۱۶۱
۹۰. شق کیا چاند کو انگشت سے پیمبرؐ نے	۴۸
۹۱. شہرہ جہان میں حسن عسکریؑ کا ہے	۲۲
۹۲. شہید ہوگئے جب رن میں سیدِ والا	۲۶
۹۳. شیریں کو عجب الفتِ سلطانِ اُمم تھی	۵۰
۹۴. شیریں کو جب حسینؑ نے آزاد کر دیا	۳۵
۹۵. صغریٰ کو نہ امید رہی جبکہ شفا کی	۲۵
۹۶. صغریٰ کو عجب فرقتِ شبیرؑ کا غم تھا	۴۵
۹۷. صغریٰ کے لیے تحفۂ غم لاتی ہے زینبؑ	۴۰
(دوسرا نسخہ ۱۳۰۸ھ کا مکتوبہ ہے)	
۹۸. عابدؑ کو جب یزید سے بابا کا سر ملا	۲۰
(مکتوبہ ۱۳۰۵ھ)	
۹۹. عباسؑ کے حصے میں دغا حق نے ادا کی	۴۰
۱۰۰. عباسؑ نے جب کوچ کیا باغِ ارم کو	۳۸
۱۰۱. عزیزو! آج شہادت کی رات آئی ہے	۴۵
(مرثیہ میر ضمیر کے نام سے چھپا ہے)	
۱۰۲. عزیزو! فکر کرو تعزیہ اٹھانے کی	۴۷
(مقابلہ نمودہ۔ دفترِ ماتم جلد ہشتم میں صرف ۷ بند ہیں)	
۱۰۳. عصیاں کے عارضے سے جو دل ناتواں ہوا (۲ نسخے)	۷۷

مطلع	تعداد بند
۱۰۴. فرزند کو امت پہ فدا کرتے ہیں شبیرؑ	۶۹
(تمام شد بخط سید مظہر علی عظیم آبادی)	
۱۰۵. قاسم کو جو رن میں فدیۂ شاہ زمن ہوا	۲۷
(بخط سید برخوردار حسین)	
۱۰۶. قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے	۴۰
۱۰۷. کرسی نشین عرش منور حسین ہے	۸۹
(بخط سید محمد حسنین ولد سید لطافت علی ساکن پھولپور)	
۱۰۸. کس صاحبِ شمشیر کے ہاتھ میں سپر ہے	۱۰۴
(دو نسخے)	
۱۰۹. کعبے کے لیے قبلہ نما روحِ حسنؑ ہے	۴۰
۱۱۰. کعبہ ہے اک دریچۂ ایوانِ کربلا	۵۸
۱۱۱. کعبہ ہے وہ دل جس میں غم آلِ عبا ہے	۴۲
۱۱۲. کوفے میں بہار آئی جو گل گشت پہ چمن کو	۱۲۹
۱۱۳. کوہِ رقیم پر جو علی کا گزر ہوا	۸۲
(کوہ۔ ناصر الاخبار دہلی مورخہ ۲ نومبر ۱۸۷۳ء)	
۱۱۴. کوئی جہان میں نہ محتاج بے وطن ہوئے	۵۵
۱۱۵. کی عالمِ فلک نے جو تسخیر آفتاب	۴۱
(مکتوبہ ۲۲ صفر ۱۳۰۳ھ در مقام کربلائے معلیٰ)	
۱۱۶. کیا آمدِ جبرئیل تھی مرغوب نبیؐ کو	۹۲
۱۱۷. کیا بیشِ خدا صاحبِ توقیر ہے زہراؑ	۱۰۳
(انیس کے نام چھپا ہے)	
۱۱۸. کیا تشنگی روزۂ ماہِ رمضاں میں ہے	۳۰
۱۱۹. کیا خلق حسن تھا حسن سبز قبا میں	۸۶
(نوشتہ ۱۸۶۵ء نسخۂ ثانی ۸۴ بند)	
(مرثیہ من تصنیف مرزا سلامت علی)	
۱۲۰. کیا خوب روایت ہے یہ بنیاد عزا کی	۳۶
۱۲۱. کیا شاہِ خراساں کی زیارت کا شرف ہے	۴۶
۱۲۲. کیا شیعانِ شیرِ خدا کا وقار ہے	۷۳

(مکتوبہ ۱۲ صفر ۱۲۹۱ھ ملاحظہ ہو تحفۂ نوروز ۱۸۸۵ء [illegible])

مطلع	تعدادِ بند
١٢٣۔ کیا فضلِ حق سے فوجِ حسینی کا اوج ہے	٦٥
١٢٤۔ کیوں قالب صد مہر ہر اک ذرّہ ہے رن کا	١٣٠
١٢٥۔ گم ہوگیا ہے کھا کے سناں یوسفِ حسینؑ	٤٢
(کور: اخبار مرقع تہذیب لکھنؤ یکم فروری ١٨٧٥ء)	
١٢٦۔ گھیرا جو ماہِ فاطمہ کو فوجِ شام نے	٦٠
١٢٧۔ مارا گیا جو یوسفِ کنعانِ فاطمہؑ	٣٦
١٢٨۔ محبوبِ خدا فخرِ رسولانِ سلف ہے	١٠٦
١٢٩۔ محوسِ جنگ نائبِ مشکل کشا ہوئے	٦٣
(مقطع ندارد)	
١٣٠۔ مداحِ بادشاہِ ذوالاقتدار ہوں	٨٣
(بخط سید اصغر حسین جونپوری ١٢٨٢ھ)	
١٣١۔ مسافروں کی مدینے میں جب رسید آئی	١٤٨
(دو نسخے)	
١٣٢۔ معراجِ سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے	٦٩
١٣٣۔ مغرب میں جو غرق جہازِ قمر ہوا	١٩٩
١٣٤۔ ممتاز جو بانو ہوئی عقیدۂ دیں سے	٦٦
(دو نسخے)	
١٣٥۔ ممکن نجوم ہفت فلک کا شمار ہے	٦٤
(بخط سید اکبر حسین ١٢٩١ھ)	
١٣٦۔ میداں میں آمد آمدِ شاہِ جلیل ہے	٥٣
(بحیاتِ مصنف)	
١٣٧۔ میں بھی جہاں میں وائل و سحباں سے کم نہیں	٩٧
(مکتوبہ ١٩ رمضان روز پنجشنبہ ١٢٧٣ھ مقابلہ کیا گیا)	
١٣٨۔ ناجی بخدا فرقۂ اثنا عشری ہے	٩٢
١٣٩۔ نکہت جو بہشتوں کی فراہم ہو تو کیا ہو	١٤٢
(مکتوبہ ١٢ رمضان ١٢٩٣ھ)	
١٤٠۔ واجب ہے شش جہت پہ تولّائے پنجتنؑ	١٢٩
١٤١۔ واحسرتا کہ ماہِ محرم گزر گیا	٢٦

مطلع	تعدادِ بند
١٤٢۔ وطن میں شۂ مولا کا جب نزول ہوا	١٤٦
١٤٣۔ وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا	١١٢
(نوشتہ پنجم جمادی الاول ١٢٦٧ھ)	
١٤٤۔ وہ کون دو یوسف ہیں کہ آوارہ وطن ہیں	٦٠
١٤٥۔ ہم شکلِ نبیؐ فخرِ حسینانِ جہاں ہے	٧٧
١٤٦۔ ہند آتی ہے زنداں میں بڑے جاہ و حشم سے	٧١
(مکتوبہ ١٨٧٠ء۔ انیس کی جلدوں میں چھپا ہے)	
١٤٧۔ ہے قصد کچھ فضائلِ باقرؑ رقم کروں	٥٠
(دفتر ماتم جلد ہفتم میں ٣٢ بند ہیں)	
١٤٨۔ ہے یوسف کنعاں فصاحت سخن اپنا	٩٩
(نوشتہ ٢٠ ربیع الثانی ١٢٦٧ھ)	
١٤٩۔ یارب شرِ نارِ جہنم سے اماں دے	٤٠
١٥١۔ یارب گلِ امید کسی کا خزاں نہ ہو	٧٨
(مکتوبہ بحیاتِ مصنف)	
١٥١۔ یارو غمِ حسینؑ کی عزت عظیم ہے	٤٢
(دو نسخے)	
١٥٢۔ یارو! کریم وہ ہے جو وعدہ وفا کرے	١١٩
(بخط سید احمد حسین شہری ١٨ ذیقعدہ سنہ ١٢٩٩ھ)	
١٥٣۔ یا فاطمہ فریاد کرو شیرِ خدا سے	١٢٣
(بحیاتِ مصنف نوشتہ)	
١٥٤۔ یثرب کے چمن سے گلِ زہراؑ کا سفر ہے	٩٨
(بخط سید محمد ١٥ ذیقعدہ ١٢٨١ھ مقام دھولپور)	
١٥٥۔ یعقوبؑ سے یوسف کی جدائی ہے محبو!	٧٣
(مکتوبہ جون ١٨٧٤ء)	
١٥٦۔ یہ نظمِ سخن نظمِ ثریا سے ہے بہتر	٥٠
(نوشتہ بحیاتِ مصنف مالک سید حسین علی)	

ذیل میں وہ مرثیے درج کیے جاتے ہیں جو "دفتر ماتم" کی قدیم ترین جلدوں یعنی جلد اول مطبع سبطیہ لکھنؤ مطبوعہ سنہ ۱۳ھ، جلد چہارم مطبع شمس العلوم لکھنؤ ۱۳۱۴ ہجری اور جلد ہشتم مطبع جعفری ۴، ۱۳۱۵ھ میں درج ہیں اور جن کے آخر میں تاریخیں بھی موجود ہیں۔ یہ مرثیے ان مسودوں سے نقل کیے گئے تھے جن کے ساتھ سال کتابت بھی لکھا گیا تھا۔

"دفتر ماتم" کی یہ جلدیں نہ صرف کمیاب ہیں بلکہ نادر و نایاب ہیں۔ ان کا ذکر غالباً آج تک کسی نے نہیں کیا ہے۔ راقم کی نظر میں ان جلدوں کو وہی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جو کسی بیش بہا اور نادر الوجود مخطوطے کی ہوتی ہے۔ یہ جلدیں سید محمود رشید صاحب کے کتب خانے میں آج سے پندرہ سال قبل میری نظر سے گزری ہیں۔

	مطلع	تعداد بند
۱۔	دشتِ جنگاہ میں جب آمدِ نوشاہ ہوئی (۲۵ محرم ۱۲۴۰ھ ۔ اگست ۱۸۲۴ء)	۷۱
۲۔	انساں کے لیے قید ہلاکت کا سبب ہے (۱۲ صفر ۱۲۴۲ھ ۔ ستمبر ۱۸۲۶ء)	۴۸
۳۔	کس کا علم حسینؑ کے منبر کی زیب ہے (۲۵ ذیقعدہ ۱۲۴۵ھ ۔ اپریل ۱۸۳۰ء)	۱۳۹
۴۔	جس وقت شمسِ شرع، برجِ فلک ہوا (۱۲۴۷ھ ۔ ۱۸۳۱ء)	۸۵
۵۔	قریبِ کوفہ جب رانڈوں کا کارواں آیا (۱۲۴۷ھ ۔ ۱۸۳۱ء)	۴۵
۶۔	ریاضِ خلد کو جبرئیل صاف کرتے ہیں (غرۂ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ ۔ اپریل ۱۸۳۳ء)	۴۹
۷۔	پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی (۲۸ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ ۔ مئی ۱۸۳۳ء)	۱۵۳
۸۔	کان میں نالۂ زہرا کی صدا آتی ہے (۱۱ محرم ۱۲۴۹ھ ۔ مئی ۱۸۳۳ء)	۵۴

	مطلع	تعداد بند
۹۔	جب رہے میدان میں تنہا حسینؑ (۸ صفر ۱۲۴۹ھ ۔ جون ۱۸۳۳ء)	۳۶
۱۰۔	ہیں آج مومنو! بستۂ تشنہ دہن کے پھول (سلخ ذی الحجہ ۱۲۴۹ھ ۔ اپریل ۱۸۳۴ء)	۳۲
۱۱۔	جب رن میں قطع رشتۂ وحیِ خدا ہوا (۱۲۴۹ھ ۔ ۱۸۳۳ء)	۸۷
۱۲۔	ہے کوچ فاطمہؑ کے چمن سے بہار کا (۲ ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ ۔ جنوری ۱۸۳۷ء)	۸۲
۱۳۔	آفاق میں مخصوص جو امت ہے نبیؐ کی (۲ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ ۔ جولائی ۱۸۳۸ء)	۱۰۴
۱۴۔	ہفتاد و دو تن کے لیے جب رو چکے عابد (۲۳ ذیقعدہ ۱۲۵۴ھ ۔ فروری ۱۸۳۹ء)	۳۳
۱۵۔	خط کوفے سے آئے جو امامِ مدنی کو (۱۹ شعبان روز جمعہ ۱۲۵۵ھ ۔ اکتوبر ۱۸۳۹ء)	۹۹
۱۶۔	فردوسِ بریں گلشنِ رخسار ہے کس کا (۴ جمادی الاول ۱۲۵۶ھ ۔ جولائی ۱۸۴۰ء)	۱۱۴
۱۷۔	کیا خلقِ حسن تھا حسنِ سبز قبا میں (۳ جمادی الثانی ۱۲۵۷ھ ۔ جولائی ۱۸۴۱ء)	۸۵
۱۸۔	یوں حالِ اسیریٔ سکینہؑ ہے قلم بند (۱۳ جمادی الثانی ۱۲۵۷ھ ۔ جولائی ۱۸۴۱ء)	۸۱
۱۹۔	معراجِ سخن کو ہے مرے ذہنِ رسا سے (۲۷ ربیع الاول ۱۲۵۸ھ ۔ مئی ۱۸۴۲ء)	۱۱۹
۲۰۔	اے عرش و فلک نوحۂ سرمشقِ قلم ہو (۱۵ ذیقعدہ ۱۲۶۰ھ ۔ نومبر ۱۸۴۴ء)	۲۲۴
۲۱۔	داغِ غمِ حسین میں کیا آب و تاب ہے (۱۰ رجب ۱۲۶۲ھ ۔ جون ۱۸۴۶ء)	۱۰۲
۲۲۔	جب رونقِ مرقعِ کون و مکاں ہوئی (۲۰ شعبان ۱۲۶۲ھ ۔ جولائی ۱۸۴۶ء)	۱۲۴

(باقی آئندہ)

غزلیں

اک روشنی سی آج دکھوں کی ڈگر میں ہے
جلتے ہوئے توے کا تبسم نظر میں ہے

ممکن ہے آشنا ہو وہ محلوں کے کرب سے
پاگل سا ایک شخص جو بیٹھا کھنڈر میں ہے

برسوں سے اس میں پھل نہیں آتے تو کیا ہوا
سایہ تو اب بھی صحن کے کہنہ شجر میں ہے

کیوں چھوڑتا نہیں ہوں میں ٹھنڈے الاؤ کو
کچھ جان کیا ابھی کسی دبکے شرر میں ہے؟

تابانیاں ہیں ذہن کی حاصل مجھے مگر
اختر کوئی چراغ نہ دل میں نہ گھر میں ہے

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور

میرا اپنے آپ سے بھی فاصلہ ہو جائے گا
کیا خبر تھی یوں بھی اپنا سامنا ہو جائے گا

سوچتا کوئی نہیں کیوں دھند ہے ماحول میں
سب یہی کہتے ہیں کوئی حادثہ ہو جائے گا

رنگ لائے گی مرے ہر قطرۂ خوں کی بہار
دست قاتل ایک دن دستِ دعا ہو جائے گا

اس قدر کیوں ہو پریشاں اے مرے چارہ گرو!
کب بھرا تھا زخم دل جو پھر ہرا ہو جائے گا

گر یونہی حالات سے مانوس ہم ہوتے گئے
اپنے حق میں سوچنا بھی مسئلہ ہو جائے گا

ٹوٹ کر ملتے رہو احباب سے شبنم میاں!
کون کس کے بیچ سے کب لاپتہ ہو جائے گا

شبنم نقوی
۱۸۷ ۔ ہمت گنج، الہ آباد

کنور مہندر سنگھ بیدی کی یاد میں

مردِ اردو نقیبِ فن آگاہ
لوگ کہتے تھے اس کو عالی جاہ

لفظ در لفظ جہد یک جہتی
رہی اس کی سخنوری کی گواہ

وہ قلم کا غنی ادب کا دھنی
اس کی نظروں میں تھا فقیر بھی شاہ

شہ نشینی مشاعروں کی ملی
کبھی نیچی ہوئی نہ اس کی کلاہ

رندِ رنگین و پارسائے گرد
صاحبِ شملہ و حشم آگاہ

اہلِ فن میں بچھی صفِ ماتم
فکر کا غم سے پیرہن ہر سیاہ

ذکر بیدی کی موت کا آیا
دل سے نکلی سحر کی یاد میں آہ

تسنیم فاروقی □□

تلسی داس مارگ۔ نزد اسپتال لکھنؤ

یہ زندگی کے شرارے.....

بری زمیں سے بہت دور آسماں پہ کہیں
سنا ہے اور بھی آباد ہیں صنم خانے
سکوتِ شام کا پردہ جہاں سرکتا ہے
جوان رات سناتی ہے کتنے افسانے
ہزار صدیوں سے انساں کی سوچتی آنکھیں
الجھ رہی ہیں پُراسرار نور پاروں سے
وہ علم و نور کی ساعت ہو یا کہ تاریکی
ہمارا انس ہمیشہ رہا ستاروں سے

یہ کائنات کی بے پایاں وسعتیں یارب
کہاں کہاں ترے جلووں کے پھول بکھرے ہیں
تصورات سے دل کش حقیقتیں ہیں تری
ہمارے خوابوں کے چہرے انھیں سے نکھرے ہیں
خلا کے شانے پہ لہراتا نقرئی آنچل
یہ کہکشاں ہے کہ چرخِ بریں کا روزن ہے
زمیں بھی ایک ستارہ ہے تیری خلقت میں
مگر یہ زیست کی رعنائیوں سے روشن ہے
حسیں پرندوں کے نغمات جھومتے بادل
کوئی بھی رنگِ چمن زار بے اثر نہ لگے
زمیں کا حسن یونہی تا ابد رہے قائم
خدا کرے اسے انسان کی نظر نہ لگے
جواں پہاڑوں کے چشمے صدا ابلتے رہیں
یہ زندگی کے شرارے یونہی مچلتے رہیں

عامر ریاض

۶۴۔ ایم ایم آئی جی، اسٹیٹ بنک کالونی
سیتاپور روڈ اسکیم
(ریکٹرانی) لکھنؤ

کاظم علی خاں
۳۴ - بی/۱۰ ، جاپلنگ روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

حیرت الہ آبادی

شعرائے اردو کے انبار در انبار تذکرے اپنے دامن میں ایسے بے شمار صاحبِ دیوان شاعروں کا نام اور کلام رکھتے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں کوئی نام یا مقام حاصل کرنے سے محروم رہ کر اردو تنقید کے دربار میں بھی بار پانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ادبی تاریخ اور تنقید کی بارگاہوں میں بار نہ پانے والے ایسے گمنام اردو شاعروں کے حق میں تحقیق ہی وہ آخری پناہ گاہ ہے جو انبار در انبار گرد آلود تذکروں کے بے شمار اوراقِ پارینہ کے بحرِ بے کراں کو کھنگال کر، ان شاعروں کے نام و کلام کو ماہ و سال کی گردشوں کے گرداب میں غرقاب ہونے سے بچا کر ادبی تاریخ اور تنقید کو نئے باب فراہم کرنے کا اہم کام سرانجام دیتی ہے۔

اردو تحقیق گرد آلود تذکروں کی مدد سے ہماری ادبی تاریخ اور تنقید کے کتنے ہی فراموش کردہ اور بے نشان قدیم شاعروں پر نیا مواد فراہم کر کے انھیں نئی زندگی کی نوید دے چکی ہے اور ابھی تذکروں کے دامن میں پناہ پانے والے جو اور گم نام شاعر ادبی تاریخ و تنقید کے دربار میں بار پانے کا انتظار کر رہے ہیں، ان کے اعداد و شمار کا گوشوارہ تیار کرنا بھی بے شمار دشواریوں کا وہ ہفت خوان ہے جسے طے کرنا آسان تو کیا شاید سر حدِ امکان سے بھی "پرے" ثابت ہوگا۔ اردو کی ادبی تاریخ و تنقید میں نام و مقام پانے سے محروم ایسے ہی گم نام و بے نشان صاحبِ دیوان شاعروں کی طویل فہرست میں محمد جان خاں حیرت الہ آبادی کا نام بھی شامل ہے۔

اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ کے لیے میں ادھر اپریل ۱۹۹۲ء سے جس انتخاب حیرت الہ آبادی کی تقدیم، ترتیب و تدوین کا کام سرانجام دینے میں معروف ہوں، اس کے منظرِ عام پر آنے میں شاید ابھی چند ماہ کی مزید مدت درکار ہوگی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھے یہی طریق کار بہتر معلوم ہوا کہ انتخاب حیرت الہ آبادی کی اشاعت سے قبل کم از کم اس کے مقدمے کے ضروری حصے اس غرض سے شائع کرا دوں کہ حیرت الہ آبادی کے ایسے گمنام شاعر کے نام و کلام سے بے خبر اردو کے عام ادبی حلقے کسی قدر باخبر ہو سکیں اور احوالِ حیرت سے باخبر اردو تحقیق کے محدود و مختصر ادبی حلقے سے اس مقالے کے ذریعہ رابطہ قائم کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکوں۔ گویا حیرت پر یہ مختصر مقالہ میری زیر تسوید کتاب "انتخاب حیرت الہ آبادی" کی تیاری کے لیے زمین ہموار کرنے کا وہ کام کر رہا ہے جسے انگریزی میں "گراؤنڈ ورک" (Ground work) کہتے ہیں۔ یہ مقالہ دراصل حیرت الہ آبادی سے باخبر ادبی حلقوں کو اپنی تحقیق کی "ویولینتھ" (Wave length) پر لانے کی ایک کوشش ہے۔

حیرت الہ آبادی کی داستانِ حیات میں حالات و واقعات کا جو فقدان ملتا ہے اس کے پیشِ نظر ان کی زندگی کی داستان کا بیان اس اعتبار سے تو آسان ہے کہ اس کے لیے ہمیں محض چند سطریں درکار ہوں گی لیکن حیرت کے ان دستیاب ناکافی حالات کی تلافی کے لیے احوالِ حیرت پر اضافہ کرنے کا کام دشواریوں کا وہ خارزار ہے جسے طے کرنا آسان نہیں۔ ہم نے اس مقالے اور انتخاب حیرت الہ آبادی کے مقدمے میں حیرت کے ناکافی حالات کی تلافی کے لیے

دست یاب مواد پر اضافہ کرنے کا جو دشوار گزار کام سرانجام دیا ہے اس میں ہم کہاں تک کامیاب یا ناکام رہے ہیں، اس کا فیصلہ ادبی حلقے کتاب کی اشاعت کے بعد ہی کر سکیں گے۔

یہ مختصر مقالہ مقدمۂ انتخاب حیرت الہ آبادی سے ماخوذ ہونے کے باوجود اپنے دامن میں کچھ ایسا نیا مواد بھی رکھتا ہے جو کتاب کے مقدمے میں موجود نہیں۔ نئی معلومات کے علاوہ مواد کی ترتیب اور پیش کش کے اسلوب کی بنیاد پر بھی یہ مقالہ چند ایسے امتیازی پہلوؤں کا حامل ہے جو اسے مقدمۂ انتخاب حیرت الہ آبادی کی محض نقل ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکن ان امور کے باوجود اس مقالے میں ہم نے مقدمۂ کتاب کے متعدد مباحث شعوری طور پر اس لیے نہیں چھیڑے ہیں کہ مقالہ پڑھنے کے بعد بھی کتاب اور اس کے مقدمے سے قارئین کی دل چسپی برقرار رہے۔ مقالے اور مقدمے کے مواد و اسلوب کا تقابلی موازنہ ہماری اس بات کا بہ خوبی اثبات کرے گا۔ یہ طریق کار نہ صرف اصولی اعتبار سے موزوں و مناسب ہے بلکہ اسے بروئے کار لا کر ہم نے اپنے بعض ایسے "کرم فرماؤں" سے اپنی مدافعت کی کلی سعی کی ہے جو

قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے

کے مقولے پر عمل پیرا رہنے کے عادی ہیں۔

حیرت الہ آبادی کے حالات ہمیں انیسویں صدی عیسوی کے گنتی کے جن چند قدیم و معاصر مصادر کی "لکشمن ریکھا" کے حصار و حدود میں محصور و محدود ملتے ہیں ان کی مختصر فہرست میں محض یہ نام شامل ہیں:

(۱) **تذکرۂ سخن شعرا**: عبدالغفور نساخ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء صـ۱۳۲

(۲) **آئینۂ حیرت**: حیرت الہ آبادی۔ مطبع حسینی و دھرم پرکاش الہ آباد طبع ۱۲۹۸ھ (مطابق ۸۱-۱۸۸۰ء) صـ۱۰۲ (تقریظ خواجہ غلام غوث بے خبر) صـ۲۳۴ نیز صـ۲۴۸ (خاتمۃ الطبع)

(۳) **فغانِ بے خبر**: خواجہ غلام غوث بے خبر، نامی پریس الہ آباد طبع اول مطبوعہ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء صـ۳۹ تا ۴۱ (یہ کتاب اپنے دامن میں خواجہ بے خبر کی وہی تقریظ رکھتی ہے جو آئینۂ حیرت (طبع ۱۲۹۸ھ) میں پہلے ہی شامل ہو چکی تھی لہٰذا ظاہری طور پر تو یہ کتاب احوالِ حیرت کے لیے ایک علاحدہ ماخذ نظر آتی ہے لیکن کلی طور پر اس میں وہی پرانا مواد ملتا ہے جو آئینۂ حیرت میں اس سے قبل موجود تھا)۔

(۴) **کلیاتِ حیرت**: حیرت الہ آبادی۔ مطبوعہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء (بہ حوالہ مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی مؤلف جواہر سخن (جلد ۴) صـ۱۶۹ مع حواشی)

حیرت الہ آبادی کے حالات کے سلسلے میں بیسویں صدی عیسوی کے جو ماخذ ہمارے پیش نظر رہے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:-

(۵) **تذکرۂ خمخانۂ جاوید** (جلد دوم)، لالہ سری رام رائے گلاب سنگھ پریس لاہور۔ طبع ۱۹۱۱ء صـ۵۴۵ و بعد

(۶) **انتخابِ سخن** (جلد ہفتم): مرتبہ حسرت موہانی۔ اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۳ء صـ۱۰۷ تا صـ۱۱۲ (اس کتاب کے پہلے اڈیشن کا صحیح سنہ اشاعت معلوم نہیں، لیکن یہ شاید ۱۹۲۹ء میں شائع ہونے والی انتخاب سخن کی جلد ہم سے پہلے چھپا ہوگا۔ بہ حوالہ ڈاکٹر احمر لاری مقدمہ انتخاب سخن جلد ۷ طبع ۱۹۸۲ء صـ۱۶ حاشیہ ۱۱)

(۷) **تذکرۂ جواہر سخن** (جلد چہارم): مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی۔ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد۔ طبع ۱۹۳۹ء صـ۱۶۶ تا ۱۶۹ (بہ شکریہ جناب عرفان عباسی لکھنؤ)

(۸) **رسالہ نگار کراچی** (پاکستان) ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء صـ۲۰ (مقالہ از ڈاکٹر ولی الحق انصاری بہ حوالہ عرفان عباسی)

(۹) **دبستانِ آتش**، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ طبع دسمبر ۱۹۷۷ء صـ۸۲

(۱۰) **سخن وران اترپردیش** (جلد دوم): عرفان عباسی (قلمی نسخہ ورق ۳۱۰ - مخزونہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ)

(۱۱) **انتخابِ حیرت الہ آبادی**: مرتبہ کاظم علی خاں (راقم الحروف)۔ ترتیب کی منزل سے گزر کر یہ کتاب اشاعت کے لیے

تیاری کے آخری مرحلے میں ہے۔

(۱۲) **اکبر الٰہ آبادی**: طالب الہ آبادی۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد (سنہ اشاعت نامعلوم) صفحہ ۴۱ تا صفحہ ۴۳

(۱۳) **قصیدہ نگاران اتر پردیش**: علی جواد زیدی۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ۔ طبع ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۲۹ تا صفحہ ۱۳۰ (بہ حوالہ جواہر سخن جلد ۴ صفحہ ۱۶۸)

(۱۴) **گل رعنا**: حکیم سید عبدالحی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع ۱۳۷۰ھ صفحہ ۴۸۵ (حاشیہ ۵)

(۱۵) **انتخاب کلام افسر**: مرتبہ سید مظفر حسن۔ نامی پریس لکھنؤ طبع جنوری ۱۹۸۴ء صفحہ ۳۳۳

(۱۶) **شاہ محمد رفیع الزماں قادری، زیدی الحسنی**: مرتبہ سید مظفر حسن۔ ماڈرن آفسیٹ پریس لکھنؤ طبع ۱۹۹۲ء صفحہ ۱۳۷

[اس کتاب (صفحہ ۱۸۶) میں محمد جان خاں حیرت الہ آبادی کے استاد میر اعظم علی اعظم کے ماہ و سنہ وفات سے متعلق شاہ محمد علیم علیم کی ہجری تاریخ بھی اہمیت رکھتی ہے]

حیرت الہ آبادی کا صحیفۂ حیات وہ بند کتاب ہے جس کے بیشتر ابواب بے نقاب ہونے کے منتظر ہیں۔ اس صورت حال پر ہمیں ساحر لکھنوی کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ان میں ہی کہیں ہوگا اب ذکر ہمارا بھی
جو بند کتابیں ہیں دنیا ترے ہاتھوں میں

حیرت الہ آبادی کے حالات زندگی پر دستیاب مواد کی مقدار اتنی کم ہے کہ مواد کی کمی کے باعث قلم قدم قدم پر آگے بڑھنے کے بجائے رک جاتا ہے۔ قلم کے دم بہ دم رک جانے پر ہمارے ذہن میں خواجہ آتش لکھنوی کا یہ شعر گونجنے لگتا ہے ؎

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

(یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حیرت الہ آبادی ان شاعروں میں تھے جن کا سلسلۂ تلمذ آتش سے ملتا ہے)۔

حیرت الہ آبادی کے ایسے تاریخ ادب کے گمنام شاعر کی زندگی کی داستان کے بیان میں پہلی منزل تو ان کا وہ خاندان ہے جس کے متعلق مواد کا فقدان ہماری تحقیقی صلاحیتوں کے امتحان کے لیے ایک ایسے پریشان کن سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے جسے انگریزی میں "Baffling" یا "Testing task" "Question" کہتے ہیں۔ حیرت الہ آبادی کے صحیفۂ حیات میں ان کا خاندان وہ بند باب ہے جسے "کھل جا سم سم" جیسے کسی طلسماتی فقرے کی مدد سے کھولنا آسان نہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق تذکرہ سخن شعراء (مطبوعہ اکتوبر ۱۸۷۴ء)، آئینہ حیرت (۸۱-۱۸۸۰ء) اور کلیات حیرت (طبع ۱۸۹۲ء) انیسویں صدی کے وہ تین قدیم ترین معتبر اور معاصر مصادر ہیں جو خانوادہ حیرت کے اس بند باب کو کھولنے کی قدیم اور اصلی کلید (Old and Original Key) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تین ماخذ میں سے ابتدائی دو مصادر تو ہماری رسائی میں موجود ہیں لیکن کلیات حیرت سردست ہمارے دسترس میں موجود نہیں۔

خانوادہ حیرت کے باب میں "سخن شعراء" اور "آئینہ حیرت" جیسے مصادر ہمیں پہلی بار یہ بتاتے ہیں کہ حیرت الہ آبادی کے والد کا اصل نام تو "بازید خاں" تھا لیکن وہ "باز خاں" کی عرفیت بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ تذکرہ سخن شعراء میں حیرت کی ولدیت "باز خاں" ہی ملتی ہے جو آئینہ حیرت (صفحہ ۲۴۳ نیز صفحہ ۲۴۸) کے مطابق پدر حیرت "بازید خاں" کی عرفیت تھی۔ آئینہ حیرت کے حوالے سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حیرت کے والد "بازید خاں عرف باز خاں" دراصل جہانگیر خاں کے فرزند تھے اور حیرت کے دادا "جہانگیر خاں" فوج میں رسالدار تھے۔ اس طرح ہمارے نزدیک حیرت الہ آبادی دراصل ایک سپاہی زادے کے فرزند تھے۔ ان امور کی روشنی میں ہمارے یہ معروضات غلط نہ ہوں گے کہ حیرت الہ آباد کے ایک ایسے ملازمت پیشہ خاندان کے چشم و چراغ تھے جس میں ان کے دادا کی فوج میں رسالداری سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خانوادہ حیرت میں فن سپہ گری میں مہارت کی روایت کم سے کم ان کے دادا جہانگیر خاں تک ضرور موجود رہی ہوگی۔ ہمیں ابھی تک ایسا کوئی ماخذ نہیں ملا ہے

جو حیرت کے والد اور دادا کو شاعر ثابت کر سکے۔ ان قرائن کی روشنی میں ہمارا یہ اندازہ بعید از قیاس نہیں کہ حیرت الہ آبادی خاندانی شاعر ہو کر اپنے "غیر ادبی خانوادے" میں شاید پہلے شاعر رہے ہوں گے۔ حیرت الہ آبادی کے والد بازید خاں کا نام بیسویں صدی عیسوی کے درج ذیل مصادر میں "بایزید خاں" بھی ملتا ہے۔ لیکن آئینۂ حیرت (طبع ۱۲۹۸ھ/۸۱-۱۸۸۰ء ص۲۳۴ نیز ص۲۴۸) میں دو مقام پر پدر حیرت کا نام "بازید خاں" ہی مرقوم ملتا ہے۔

(۱) تذکرہ خم خانۂ جاوید (جلد ۲): لالہ سری رام لاہور طبع ۱۹۱۱ء ص۵۴۵

(۲) تذکرہ جواہر سخن (جلد چہارم)، مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی الہ آباد طبع ۱۹۳۹ء ص۱۶۶

(۳) سخنوران اتر پردیش (جلد دوم): عرفان عباسی (قلمی نسخہ) ورق ۳۱۰۔

احوالِ حیرت پر بیسویں صدی عیسوی کے مآخذ میں سے صرف مندرجہ ذیل دو مصادر میں حیرت کے دادا "جہانگیر خاں" کا نام ملتا ہے:

(۱) جواہر سخن جلد چہارم

(۲) سخنوران اتر پردیش (جلد دوم)۔

دست یاب مواد کی بنیاد پر حیرت کے والد اور دادا کے صحیح سنینِ ولادت و وفات تو متعین نہیں کیے جا سکتے لیکن آئینۂ حیرت (ص۲۳۴ تا ۲۳۵) میں شامل حیرت الہ آبادی کے قطعۂ تاریخ تکمیلِ دیوان کے عنوان کی عبارت سے یہ انکشاف ضرور ہوتا ہے کہ حیرت کے دادا جہانگیر خاں آئینۂ حیرت کی تکمیل ۱۲۹۶ھ سے قبل ہی وفات پا چکے تھے۔ مذکورہ عبارتِ عنوان میں حیرت کے والد "بازید خاں عرف باز خاں" کے نام کے ساتھ "مرحوم" یا "مغفور" جیسے الفاظ کی عدم موجودگی اس امکان کی نشان دہی کرتی ہے کہ آئینۂ حیرت کے سال تکمیل ۱۲۹۶ھ تک حیرت کے والد شاید بقید حیات رہے ہوں گے۔ آئینۂ حیرت مطبوعہ ۱۲۹۸ھ (ص۲۴۸) میں شامل خاتمۃ الطبع کی منثور عبارت میں بھی حیرت کے دادا جہانگیر خاں کے نام کے بعد تو لفظ "مغفور" مرقوم ملتا ہے مگر پدر حیرت "بازید خاں عرف باز خاں" کے نام کے پہلے یا بعد "مرحوم" یا "مغفور" جیسے الفاظ کا کوئی "سابقہ یا لاحقہ" (Prefix or Suffix) موجود نہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ آئینۂ حیرت کی طباعت ۱۲۹۸ھ (۸۱-۱۸۸۰ء) تک بھی شاید پدر حیرت فوت نہ ہوئے ہوں گے۔ ہم اپنے اس قیاس کی تصدیق کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت کے منکر نہیں۔

ہمیں جن نصف درجن سے زائد مصادر میں حیرت کا نام "محمد جان خاں" مرقوم ملتا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) سخن شعرا، طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص۱۴۴

(۲) آئینۂ حیرت طبع ۱۲۹۸ھ مطابق (۸۱-۱۸۸۰ء) سرورق نیز ص۱ (تقریظ خواجہ بے خبر)، ۲۳۴ و ۲۴۸ (خاتمۃ الطبع)

(۳) فغانِ بے خبر طبع ۱۸۹۱ء ص۳۹ و ص۴۰

(۴) خم خانۂ جاوید جلد دوم طبع ۱۹۱۱ء ص۵۴۵

(۵) اکبر الہ آبادی: طالب الہ آبادی طبع اول (سنِ اشاعت نامعلوم) ص۱۴۱

(۶) جواہر سخن جلد چہارم طبع ۱۹۳۹ء ص۱۶۶

(۷) دبستانِ آتش۔ طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص۸۲

(۸) سخنوران اتر پردیش جلد دوم (قلمی نسخہ) ورق ۳۱۰۔

سخن شعرا۔ آئینۂ حیرت (خاتمۃ الطبع ص۲۴۸) خم خانۂ جاوید جلد دوم۔ اکبر الہ آبادی (ص۱۴۱) جواہر سخن جلد چہارم اور سخنوران اتر پردیش جلد دوم (قلمی) جیسے مآخذ محمد جان خاں حیرت کو دیار الہ آباد کا باشندہ لکھتے ہیں اور آئینۂ حیرت (ص۲۴۸) یہ بھی بتاتا ہے کہ حیرت دیار الہ آباد کے "محلہ منڈوی دانی متصل دائرہ شاہ غلام علی صاحب مغفور" کے "ساکن" تھے۔ محمد جان خاں کے تخلص "حیرت" کی تائید ان تمام قدیم و جدید مصادر سے ہوتی ہے جن کے ایک درجن سے زائد ناموں کی فہرست سطور گزشتہ میں پیش کی جا چکی ہے۔

متعدد مصادر بتاتے ہیں کہ محمد جان خاں حیرت الہ آبادی فن شاعری میں اعظم الہ آبادی کے صاحب دیوان شاگرد تھے ۱؎ حیرت الہ آبادی کے استاد میر اعظم علی اعظم (متولد ۱۸۰۲ء) محمد رضا (رئیس خلد آباد واقع الہ آباد) کے فرزند الہ آباد کے باشندے خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (متوفی ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ مطابق چہارشنبہ ۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء) ۲؎ کے صاحب دیوان شاگرد اور متعدد شاگردوں کے استاد تھے ۳؎ اعظم عرصے تک آگرہ میں ملازمت کرتے رہے مگر ریٹائر ہو کر انھوں نے اپنے وطن الہ آباد میں ہی باقی زندگی گزاری اعظم الہ آبادی کا دیوان دو بار چھپا تھا۔ سنین اشاعت ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) نیز ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) بتائے جاتے ہیں۔ اب اس دیوان کی دونوں ہی اشاعتیں نایاب ہونے کی حد تک کمیاب ہیں۔ بیشتر دستیاب مصادر اعظم الہ آبادی کا صحیح سنہ وفات بتانے سے قاصر ہیں۔ تذکرۂ شعر و سخن (ص ۱۲۹ بہ حوالہ دبستان آتش ص ۸۲) اور آئینۂ حیرت (ص ۲۴۸ خاتمۃ الطبع) کے اندراجات سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ حیرت کے استاد اعظم الہ آبادی نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) سے ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰-۸۱ء) تک کی درمیانی مدت کے دوران وفات پائی ہوگی۔ قیاس پر مبنی اس تخمینی اندازے پر ہماری تازہ تحقیق اس نئی اور اہم معلومات کا اضافہ کرتی ہے کہ محمد جان خاں حیرت الہ آبادی کے استاد میر اعظم علی اعظم الہ آبادی نے ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ میں وفات پائی تھی جو تقویم میں ۹ جنوری ۱۸۷۵ء سے ۶ فروری ۱۸۷۵ء تک کی درمیانی مدت کے مطابق ملتا ہے۔ ہماری اس معلومات کا ماخذ خود حیرت الہ آبادی کا وہ قطعہ تاریخ ہے جس کا متن ہم نے آئینۂ حیرت (ص ۲۴۵ تا ۲۴۶) سے انتخاب حیرت الہ آبادی کے قطعات تاریخ سے متعلق حصے میں پیش کر دیا ہے۔

اعظم الہ آبادی کے نمونۂ کلام کے ماتحت چند اشعار تو مقدمۂ انتخاب حیرت الہ آبادی میں پیش کیے جا چکے ہیں لیکن اس مقالے میں بھی حیرت کے استاد اعظم الہ آبادی کے بعض منتخب اشعار پیش کرنا بے محل نہ ہوگا

ملاحظہ ہو ؎

(۱) زندگی بھر نہ یم دیدۂ گریاں ٹھہرا
کشتیِ عمر ڈبوئی تو یہ طوفاں ٹھہرا

—— جواہر سخن جلد سوم ص ۵۹۳

(۲) فارغ البال کیا بے سر و سامانی نے
مالِ دنیا نہ رہا چور کا کھٹکا نہ رہا

—— ایضاً ص ۵۹۴

[اعظم الہ آبادی کے اس شعر ۲ کا مضمون ناسخ لکھنوی اور مرزا غالب کے درج ذیل اشعار کی صدائے بازگشت محسوس ہوتا ہے ؎

ناسخ: کھلے دروازے ہر شب چین سے سوتے ہیں ہم جب سے
دیا ہے خانۂ ویراں کو عہدہ پاسبانی کا

—— (انتخاب غزلیات ناسخ، مرتبہ کاظم علیخاں ص ۱۷)

مرزا غالب: نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

—— (دیوان غالب۔ مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ۴۴) ۔ کاظم علیخاں]

——

(۳) خوشی دیکھتے ہیں محن دیکھتے ہیں
تماشائے چرخ کہن دیکھتے ہیں (اعظم الہ آبادی)

—— (جواہر سخن جلد ۳ ص ۵۹۴)

(۴) نہ واں کان ہیں ان کے نہ یہاں میری زباں
نہ وہ سنتے ہیں نہ ہم دردِ جگر کہتے ہیں

—— تصویر شعرا د آگرہ طبع ۱۸۹۱ء

(۵) ہے زبانوں پہ انھیں کی مرا جینا مرنا
آنے جانے کی تمھارے جو خبر دیتے ہیں

—— ایضاً ص ۴۲-۱۴۱

(۶) ہم نے شیشے کو چھپایا کبھی داماں کے تلے
پی مئے ناب درِ قاضیِ دوراں کے تلے

—— تذکرہ شوکت نادری ص ۵۵

(۷) تو وہ بت ہے کہ تری جلوہ نمائی کے لیے
آرزو خانۂ کعبہ میں مسلماں کرتے (جواہر سخن ص ۵۹۵/۳۶)

(۸) حوصلہ دُنیا کا زر کے ساتھ ہے
طاقتِ پرواز پر کے ساتھ ہے

——— جواہرِ سخن جلد ۳ صفحہ ۵۹۵

(۹) اعظم جو خاک ہو تو بحقِ ابو تراب
یا تو نجف کی خاک ہو یا کربلا کی خاک

——— تذکرۂ گلستانِ بے خزاں صفحہ ۲۱

احوالِ حیرت الہ آبادی سے متعلق نصف درجن قدیم وجدید مصادر میں (جن کی تفصیل اس مقالے کے حاشیہ ۱۲ میں دیکھی جاسکتی ہے) محمد جان خاں حیرت الہ آبادی کو صرف اعظم علی اعظم الہ آبادی کا شاگرد بتایا گیا ہے لیکن ہم حیرت کے سوانح نگاروں کے اس بیان پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ حیرت الہ آبادی اعظم الہ آبادی کے علاوہ (شاید اپنی ادبی زندگی کے محدود و مختصر عرصے کے دوران) مولوی وحید الدین وحید فتحپوری کے بھی شاگرد رہے تھے۔ مولوی وحید الدین وحید ضلع فتحپور کے قصبے کڑا میں ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے قصبۂ کڑا ضلع فتحپور ہی میں اپنے مکان (واقع محلہ مولیانہ) میں آگ لگنے سے وفات بھی پائی تھی۔ حیرت الہ آبادی کے استاد مولوی وحید الدین وحید کی تاریخ وفات شنبہ ۹ر اپریل ۱۸۹۲ء مطابق ۱۱ر رمضان ۱۳۰۹ھ متعین ہوتی ہے۔ فنِ شاعری میں وحید الدین وحید محمد بشیر بشیر (تلمیذ خواجہ آتش لکھنوی) کے شاگرد تھے مگر وحید نے اپنی چند غزلوں پر آتش لکھنوی سے بھی اصلاح حاصل کی تھی۔

حیرت الہ آبادی کے استاد مولوی وحید الدین وحید کے اہم وقابل ذکر شاگردوں میں مشہور مزاحیہ شاعر سید اکبر حسین رضوی اکبر الہ آبادی (زمانۂ حیات ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء تا ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء) بھی شامل تھے۔ اس رشتے سے حیرت الہ آبادی اور اکبر الہ آبادی ایک دوسرے کے استاد بھائی بھی ہوتے تھے۔ احوالِ حیرت پر ہمارے یہ اضافے حیرت الہ آبادی کے ناکافی حالات کی تلافی کی کوشش قرار دیے جاسکتے ہیں۔[۵]

حیرت الہ آبادی کے استاد مولوی وحید الدین وحید کی ضخیم دواوین کے مصنف تھے جو ان کی حیات میں اشاعت سے محروم رہے۔ وحید کی وفات کے بعد ان کا کلام "انتخابِ وحید" کے عنوان سے انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ طالب الہ آبادی کی کتاب "اکبر الہ آبادی" صفحہ ۴۳ تا ۴۵ اور "سفینۂ غزل" (صفحہ ۴۰۳ تا صفحہ ۴۱۴) وحید الدین وحید (استاد حیرت و اکبر الہ آبادی) کا جو نمونۂ کلام چھپا ہے، یہاں اسی سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

استاد حیرت الہ آبادی مولوی وحید الدین وحید کا نمونۂ کلام

پیش کردہ طالب الہ آبادی

جلوۂ عارض نظر زیرِ نقاب آیا تو کیا
(۱) منھ پہ رکھ کر چاند دامانِ سحاب آیا تو کیا ، صفحہ ۴۴

تیری ہی آنکھوں کے (آگے) مے کشی کا لطف تھا
(۲) بعد تیرے بزم میں جامِ شراب آیا تو کیا "

اب بھی آجاتا تو رہ جاتی ہماری زندگی
(۳) بعد مرنے کے اگر خط کا جواب آیا تو کیا "

وہ ملے ہم کو فنا کا رنگ دکھلانے کے بعد
(۴) راہ پر تقدیر بھی آئی تو مٹ جانے کے بعد "

قبر میں کیا کیا فرشتوں کو تھے ارمانِ سوال
(۵) کچھ نہ پوچھا مجھ سے تیرا نام بتلانے کے بعد "

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
(۶) اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد "

[طالب الہ آبادی کی کتاب اکبر الہ آبادی صفحہ ۴۴ میں شعر ۶ کو وحید ہی کا کلام قرار دیا گیا ہے لیکن کتاب "فرحتِ دل" مرتبہ عبد اللہ خاں ایمان صفحہ ۱۱۷ میں منقولہ بالا شعر (۶) کو جلیل سے منسوب کیا گیا۔ کتاب "فرحتِ دل" اشعار کے غلط انتساب کی مثالوں سے خالی نہیں، تذکروں میں جلیل تخلص رکھنے والے متعدد شاعر ملتے ہیں جن میں جلیل حسن جلیل مانک پوری زیادہ مشہور

ہیں۔ صاحب فرحتِ دل کے قول کی روشنی میں زیر بحث شعر کو جلیل تخلص کے کسی شاعر کی تخلیق سمجھا جائے یہ بات بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اب رہے جلیل مانک پوری، تو ان کی غزلیات کے دو دواوین ہمارے دسترس میں موجود نہیں ۔۔ کاظم علیخاں]

(۷) کس وقت تیرے رُخ پر زلفِ دوتا نہیں ہے
کب روشنی کی دُشمن کالی گھٹا نہیں ہے (ص۴۲)

(۸) قاصد کی جان جائے پُرزے کریں وہ خط کے
تقدیر میں ہماری، کیا کچھ لکھا نہیں ہے (")

نمونۂ کلام وحیدُ الدین وحید
از سفینۂ غزل مرتبہ سید محمد عباس

(ص۴۰۳ تا ص۴۱۰)

(۹) اُٹھالے جائیں گلشن سے کدھر ہم آشیاں اپنا
ہوا ہے عین فصلِ گل میں دُشمن باغباں اپنا ص۴۰۵

(۱۰) کانٹے گلوں کی جا نظر آتے ہیں باغ میں
کیا دیکھتے ہی دیکھتے نقشا بدل گیا ص۴۰۶

(۱۱) بس اپنے ایک رنگ پہ رہنے کی کس سے داد
ہم آج تک وہی ہیں زمانہ بدل گیا (")

(۱۲) میں نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو ص۴۰۸

(۱۳) غربت کی شام دیکھ کے رونا سا آگیا
آنکھوں کے نیچے پھر گئی صبحِ وطن ابھی (")

(۱۴) ہزار بار خزاں آئے باغ میں تو کیا
میری نظر میں ہیں کیفیتیں بہاروں کی (")

(۱۵) سب کی ہے اس عہد میں مٹی خراب
ذلتیں باقی ہیں، توقیریں گئیں (")

(۱۶) کل خدا جانے کیا کریں گے وہ
جن کو ہے فکر عمر بھر کی آج

("سفینۂ غزل" ص۴۱۰)

اساتذۂ حیرت الہ آبادی کے ذکر کے بعد تلامذۂ حیرت کی تلاش میں تو ہماری تحقیقی تگ و دَو "بے ثمر" رہی۔ لیکن حیرت الہ آبادی کے دائرہ تعارف و تاثر میں شامل افراد و احباب کی فہرست تیار کرنے میں ہماری سعی بے سود نہ رہی۔ آئینۂ حیرت (ص۲۱۱) میں شامل تقریظ بے خبر اور (ص۲۳۵ تا ۲۴۴ میں موجود) متعدد قطعاتِ تاریخ کے بافہم مطالعہ کی بنیاد پر درج ذیل افراد حیرت الہ آبادی کے دائرہ تعارف و تاثر کی فہرست میں شامل ملتے ہیں:

(۱) خواجہ غلام غوث بے خبر (آئینۂ حیرت ص۱ و ۲)
(۲) سید غلام محی الدین شیدا اکبر آبادی (ص۲۳۵)
(۳) حاتم علی مہر ساکن اکبر آباد (ص۲۳۵)
(۴) عنایت علی ماہ (شاگرد آتش لکھنوی) مقیم اکبر آباد (ص۲۳۵)
(۵) محمد زکریا خاں زکی دہلوی شاگرد مرزا غالب (ص۲۳۵-۳۶)
(۶) مولوی امیر محمد امیر رام پوری (ص۲۳۶)
(۷) نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی (ص۲۳۶ تا ص۲۳۷)
[عزیز بریلوی کا دیوان ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ ک]
(۸) سید شاہ محمد علیم ساکن محلہ یحیٰی پور دائرہ حضرت شاہ رفیع الزماں صاحب مغفور "الہ آباد" شاگرد میر اعظم علی اعظم الہ آبادی (ص۲۳۷ تا ۲۳۸)۔ علیم الہ آبادی بھی حیرت الہ آبادی کے استاد بھائی ثابت ہوتے ہیں۔
(۹) منشی محمد علی الفت الہ آبادی مقیم فرخ آباد (ص۲۳۸ تا ۲۴۱) الفت کی دَو تاریخوں میں سے پہلی تاریخ کافی طویل ہے اور اس میں آئینۂ حیرت پر منظوم تنقید ملتی ہے۔
(۱۰) میر مرتضیٰ رشید عظیم آبادی (ص۲۴۱)
(۱۱) خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی (ص۲۴۱ تا ص۲۴۲) خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی کو مرزا غالب سے دہلی میں ملاقات کرنے کا بھی شرف حاصل تھا۔ (بہ حوالہ اکبر علی خاں عرشی زادہ۔ رسالہ نگار رامپور، مارچ ۱۹۶۳ء ص۴۱)
(۱۲) شیخ الطاف حسین حذر فتحپوری شاگرد میر سید حسین لاغر لکھنوی" تلمیذ منشی مظفر علی اسیر (ص۲۴۲ تا ۲۴۴)

(۱۳) کنور پربھو نرائن سنگھ بہادر ولد مہاراجا ایسری نرائن سنگھ بنارس (ص۲۴۴ تا ۲۴۵) کنور پربھو نرائن سنگھ کے یہاں فرزند کی ولادت (سنِ ولادت ۱۲۹۱ھ) ہونے پر حیرت الہ آبادی کے دو عدد قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔

(۱۴) مولوی غلام امام شہید (ص۲۴۶) قطعہ تاریخ وفات مولوی غلام امام شہید از حیرت الہ آبادی (سنہ وفات شہید ۱۲۹۶ھ)

(۱۵) شیخ سعادت علی ساکن رامپور (ص۲۴۶،۲۴۷). شیخ سعادت علی کی وفات پر حیرت الہ آبادی کے تین عدد قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ شیخ سعادت علی رامپوری دراصل حیرت الہ آبادی کے قریبی دوست تھے۔

منقولہ بالا فہرستِ احبابِ حیرت، احوالِ حیرت پر ہمارے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق محمد جان خاں حیرت الہ آبادی اپنے مذہب و مسلک کے لحاظ سے سنی تھے، جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اصحابِ کرام کی کافی ہے یہ صفت
یعنی ہر ایک جزو تھا اسی کلیات کا

آئینہ حیرت (ص۵) میں شامل اس شعر میں "اصحابِ کرام" کی ترکیب محلِ نظر ہے۔ اس کی تفصیل انتخاب حیرت الہ آبادی میں شامل غزل نمبر۲ کے حاشیے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

محمد جان خاں حیرت الہ آبادی کا دیوان "آئینہ حیرت" کے عنوان سے ۱۲۹۸ھ (مطابق ۸۱-۱۸۸۰ء) میں مطبع حسینی دھرم پرکاش (الہ آباد) میں چھپا تھا جیسا کہ اس دیوان کے سرورق و بعض قطعاتِ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان حقائق کی بنیاد پر صاحب جواہرِ سخن (جلد چہارم ص۱۶۶) کا یہ بیان خلافِ واقعہ ہے کہ آئینہ حیرت ۱۲۹۶ھ میں چھپا تھا۔ ۱۲۹۶ھ دراصل اس دیوان کا سالِ تکمیل ہے (تفصیل کے لیے مقدمۂ انتخاب حیرت الہ آبادی ملاحظہ ہو)

مولفِ خم خانۂ جاوید (جلد ۲، ص۵۲۵) کا بیان ہے کہ حیرت الہ آبادی "۱۸۷۵ء کے قریب" فوت ہوئے تھے۔ یہ بیان ہمارے نزدیک اس لیے قابلِ قبول نہیں کہ آئینہ حیرت (مطبوعہ ۸۱-۱۸۸۰ء) اور کلیاتِ حیرت (مطبوعہ ۱۸۹۲ء) کی متعدد داخلی شہادتیں اس باب میں دوسری ہی داستان بیان کر رہی ہیں۔ یہ شہادتیں بتاتی ہیں کہ حیرت الہ آبادی نے اپنی یہ دونوں کتابیں خود ہی چھپوائی تھیں۔ ان شہادتوں کی تفصیل ہم مقدمہ انتخاب حیرت الہ آبادی میں پیش کر چکے ہیں۔ یہ حقائق اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ حیرت الہ آبادی کم سے کم ۱۸۹۲ء تک تو ضرور بہ قیدِ حیات تھے۔ دستیاب مصادر حیرت الہ آبادی کا صحیح سنِ وفات بتانے سے قاصر ہیں۔

آئینہ حیرت (طبع ۱۲۹۸ھ/۸۱-۱۸۸۰ء) کا آغاز اُردو نثر میں خواجہ غلام غوث بے خبر کی اس تقریظ سے ہوتا ہے جس کا مکمل متن ہم انتخاب حیرت میں پیش کر چکے ہیں۔ آئینہ حیرت (طبع ۱۲۹۸ھ مطابق ۸۱-۱۸۸۰ء ص۱-۲) کے علاوہ بے خبر کی یہی تقریظ بعد کو ان کی کتاب "فغانِ بے خبر" (طبع ۱۳۰۹ھ م ۱۸۹۱ء) میں بھی چھپی تھی۔ آئینہ حیرت میں بے خبر کی اس تقریظ کی موجودگی اس کے زمانۂ تحریر کو بھی متعین کرنے میں ہماری معاون ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بے خبر کی یہ تقریظ آئینہ حیرت کی اشاعت (۱۲۹۸ھ/۸۱-۱۸۸۰ء) سے قبل معرضِ تحریر میں آ چکی ہوگی۔ دیوانِ حیرت پر بے خبر کی تقریظ کے زمانۂ تحریر کی نشان دہی احوالِ حیرت پر ہمارا دوسرا اضافہ ہے جس سے حیرت الہ آبادی کی کتابیات (BIBLIOGRAPHY) میں شامل تمام قدیم و جدید مصادر خالی ملتے ہیں۔

ہماری تحقیق کے مطابق آئینہ حیرت میں خواجہ بے خبر کی یہ تقریظ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس تقریظ کے عنوان کی عبارت اپنی ایک داخلی شہادت کی بنیاد پر حیرت الہ آبادی کی اس اردو نثر کا نمونہ ثابت ہوتی ہے جو نایاب ہونے کی حد تک کمیاب ہے۔ آئینہ حیرت سے خواجہ بے خبر کی تقریظ کے عنوان کی عبارت کا مکمل متن حیرت الہ آبادی کی اردو نثر کے نمونے کے طور پر ہم سطورِ ذیل میں پہلی بار پیش کر رہے ہیں جو احوالِ حیرت پر ہمارا اہم اضافہ ہے:

"گلدستۂ گلستانِ شیریں مقالی، طغرائے منشور بے مثالی، تقریظ نوشتۂ جناب معلیٰ القاب خواجہ

غلام غوث صاحب بے خبر، منشی لفٹننٹ (کذا لیفٹننٹ)
گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کہ فی حد ذاتہ متین و مہذب
و فرزانہ ہیں ۷ اصناف کلام نظم و نثر میں یگانہ ہیں
بایں ہمہ اس زمانۂ ناپرساں میں حیرت کے حال پر
نظر کرم رکھتے ہیں، مختصر یہ ہے کہ حسن صورت و کمال
سیرت بہم رکھتے ہیں۔" [۵۸]

اس عبارت کے فقرے کا یہ جز "۔۔۔ حیرت کے حال پر نظر کرم رکھتے ہیں ۔۔۔" اس بات کا اثبات کرتا ہے کہ یہ تحریر خود حیرت الہ آبادی کی نثر ہے۔

آئینہ حیرت کے تقریظ نگار خواجہ غلام غوث بے خبر (ولادت نیپال ۲۵۔۲۴ ۱۸ء م ۱۲۴۰ھ)۔ وفات الہ آباد ۸ ار شوال ۱۳۲۲ھ مطابق دوشنبہ ۲۶ ر دسمبر ۱۹۰۴ء) نہ صرف اپنے دور کے مشہور فارسی شاعر و نثر نگار تھے۔ بلکہ وہ اردو نثر کے میدان میں بھی اچھی شہرت رکھتے تھے۔ اردو نثر میں بے خبر کی جو دو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں ان کے نام یہ ہیں :۔

(۱) فغان بے خبر۔ نامور پریس الہ آباد طبع ۱۸۹۱ء
(۲) انشائے بے خبر: مرتبہ انتظام اللہ شہابی۔ مرتضائی پریس آگرہ (سنہ اشاعت ندارد۔ سنہ تکمیل "۱۳۵۹ھ" مطابق ۴۱۔۱۹۴۰ء)

خواجہ غلام غوث بے خبر کے دائرہ تعارف و تاثر میں ان کے دور کے جو مشاہیر شعر و ادب شامل تھے ان میں مرزا غالب بھی ایک اہم و قابل ذکر نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کے اردو خطوط کے مجموعے عود ہندی کی ترتیب و اشاعت میں خواجہ بے خبر نے جو حصہ لیا تھا اس کی تفصیل بے خبر پر ہمارے اس تازہ مقالے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو منتظر اشاعت ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق غالب و بے خبر دونوں ایک دوسرے کے مکتوب الیہ رہے ہیں۔ بے خبر کے نام غالب کے دو درجن سے بھی زائد مطبوعہ اردو خطوط موجود ہیں۔[۵۹]

بے خبر لیفٹننٹ گورنر صوبہ ہائے مغربی و شمالی کے میر منشی ہونے کے باعث اپنے دور کے سرکاری حلقوں میں بھی اچھا رسوخ و اثر رکھتے تھے۔ آئینہ حیرت کی اشاعت (۸۱۔۱۸۸۰ء) تک بے خبر اسی اہم عہدے پر مامور تھے۔ آئینہ حیرت پر بے خبر کی تقریظ کتاب کی شہرت کا سبب بنی ہوگی۔[۶۰]

مقدمہ انتخاب حیرت الہ آبادی میں ہم غزلیات حیرت پر تنقید کرنے کا جو کام سرانجام دے چکے ہیں، یہاں اس مقالے میں اس کام کا اعادہ کرنا تحصیل حاصل کی مثال ہوگی۔ لہٰذا اس مقالے کے اختتام میں ہم حیرت الہ آبادی کا نمونۂ کلام پیش کر رہے ہیں۔

(۱) گر نہ عشق اٹھاتے جو کہیں حضرت خضر
تو پھر نہ حوصلۂ عمر جاوداں ہوتا

(۲) قاصدا کوچۂ قاتل کی علامت سن لے
کوئی گریاں کوئی نالاں کوئی بسمل ہوگا

(۳) باغ ہستی سے گئے جانب صحرائے عدم
لالہ رو غنچہ دہن، سرو گلستاں کیا کیا

(۴) یہ عکس ہے تمہارے رخ بے نقاب کا
یا آئینے میں پھول کھلا ہے گلاب کا

(۵) مجھ کو اظہار محبت کی ضرورت کیا ہے
جب مرے دل کی حقیقت سے خبردار ہیں آپ

(۶) فرہاد نہیں، قیس نہیں، کون کرے قدر
ہم بھی جو نہ رکھیں تو کہاں جائے محبت

(۷) جان جاتی ہے یار کے باعث
یہ خزاں ہے بہار کے باعث

(۸) جواب آئے کہاں سے کہ ان کے کوچے میں
پڑے ہیں نامے کے ٹکڑے بھی نامہ بر کی طرح[۶۱]

(۹) ہم سری ان کے قد کی کرتا ہے
باغ میں سرو ہے ثمر گستاخ

(۱۰) رخ بھی دکھلاؤ مجھے، زلف سیہ فام کے بعد
قاعدہ ہے کہ سحر ہوتی ہے ہر شام کے بعد

نہ پائے چین کسی طرح سے دلِ عاشق
(۱۱) یہی تو ایک وہ کارِ ثواب سمجھے ہیں

ہزاروں آفتوں میں بھی خدا کو یاد کرتے ہیں
(۱۲) فرشتوں سے نہیں ہوتا، جو آدم زاد کرتے ہیں

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
(۱۳) سامان سو برس کے ہیں، کل کی خبر نہیں[۱۱]

دیدہ بازی ہے رقیبوں سے ہمارے آگے
(۱۴) دیکھتے ہیں جو دکھاتا ہے مقدر ہم کو

آئے ہمارے گھر بھی تو نا آشنا کے ساتھ
(۱۵) ہیں مہربانیاں بھی تمہاری، جفا کے ساتھ[۱۲]

نہ تو کچھ فکر میں حاصل ہے، نہ تدبیر میں ہے
(۱۶) وہی ہوتا ہے، جو انسان کی تقدیر میں ہے

بوسہ لیا جو چشم کا بیمار ہو گئے
(۱۷) زلفیں چھوئیں، بلا میں گرفتار ہو گئے

وطن چھوٹے تو کہو کس طرح قرار آئے
(۱۸) عدم سے آئے تو دنیا میں اشکبار آئے

درپیش ہیں جو رنج و الم کہہ نہیں سکتے
(۱۹) ہم پر جو گزرتی ہے، وہ ہم کہہ نہیں سکتے

تم کو تو درِ غیر پہ دیکھا نہیں لیکن
(۲۰) پہچانتے ہیں نقش قدم کہہ نہیں سکتے

□□

حواشی :

[۱] دیکھئے : (۱) آئینۂ حیرت : حیرت الہ آبادی۔ مطبع حسینی دہرم پرکاش (الہ آباد)۔ طبع ۱۲۹۸ھ ص۲۴۵ تا ص۲۴۶ نیز ص۲۴۸

(۲) خم خانۂ جاوید (ج۲) : لالہ سری رام۔ رائے گلاب سنگھ پریس لاہور طبع ۱۹۱۱ء ص۵۴۵

(۳) جواہر سخن (جلد۴) : مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی۔ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد طبع ۱۹۳۹ء ص۱۹۲

(۴) انتخاب سخن (جلد۷) : مرتبہ حسرت موہانی۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ طبع ۱۹۸۳ء ص۱۰۷

(۵) دبستان آتش : ڈاکٹر شاہ عبدالسلام۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ دہلی طبع دسمبر ۱۹۷۰ء ص۸۳

(۶) سخن وران اترپردیش (جلد۲) : عرفان عباسی (قلمی نسخہ) ورق ۳۱۰

[۲] بحوالہ ادبی مقالے : کاظم علی خاں۔ نامی پریس لکھنؤ طبع دسمبر ۱۹۸۲ء ص۱۴۳

[۳] استاد حیرت الہ آبادی میر غلام علی اعظم الہ آبادی کا نام یا کلام درج ذیل، ایک درجن سے زائد مصادر میں موجود ہے :

(۱) گلدستۂ تصویر شعراء۔ مطبع حیدری آگرہ۔ طبع ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء ص۳۹ تا ص۴۲

(۲) تذکرۂ سخن شعراء : عبدالغفور نساخ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص۳۶

(۳) تذکرۂ سراپا سخن : محسن علی محسن۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص۳۱۹

(۴) تذکرۂ گلستانِ بے خزاں : میر قطب الدین باطن۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ طبع جون ۱۸۷۵ء ص۲۱ و ۲۲

(۵) تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد۱) : لالہ سری رام مطبع نول کشور لاہور طبع ۱۹۰۸ء ص۲۳۸

(۶) تذکرہ نادر : مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۵۷ء ص۲۸

(۷) انتخاب سخن (جلد۷) : مرتبہ حسرت موہانی ص۱۰۷

(۸) دبستان آتش ص۸۲ تا ص۸۴

(۹) ادبی مقالے ص۲۷۵ و ۲۷۶

(۱۰) یادگار شعراء : اسپرنگر۔ مترجمہ طفیل احمد۔ یو۔پی اردو اکادمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۵ء ص۲۵

(۱۱) شاہ محمد رفیع الزماں الہ آبادی : مرتبہ سید مظفر حسن۔ ماڈرن آفسیٹ پریس لکھنؤ۔ طبع ۱۹۹۲ء ص۱۳۷

(۱۲) تذکرۂ شعراء : مصنفہ ابن امین اللہ طوفان۔ مرتبہ قاضی عبدالودود آزاد پریس پٹنہ طبع ۱۹۵۴ء ص۵۷

(۱۳) انتخاب کلام افسر: مرتبہ سید مظفر حسن۔ نامی پریس لکھنؤ۔
طبع جنوری ۱۹۸۴ء صـ۳۱ تا صـ۳۳

(۱۴) جواہر سخن (جلد سوم): مرتبہ مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی۔ ہندستانی
اکیڈمی الہ آباد طبع اول صـ۵۹۲ تا صـ۵۹۵ (بشکریہ عرفان عباسی)

(۱۵) قاموس المشاہیر (جلد اول): نظامی بدایونی۔ نظامی پریس
بدایوں، طبع ۱۹۲۴ء صـ۸۵

(۱۶) تذکرۂ شوکت نادری، کلب حسین نادر۔ ترجمہ و ترتیب ڈاکٹر
شاہ عبدالسلام۔ نامی پریس لکھنؤ۔ طبع ۱۹۸۴ء صـ۵۵

(۱۷) غزل ان سائیکلوپیڈیا: مرتبہ ذکی کاکوروی۔ نامی پریس لکھنؤ
طبع ۱۹۶۸ء صـ۹۴

۴ے اعظم الہ آبادی کی یہ غزل ان کے استاد خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی
کی ایک غزل کی ہم زمین ہے (کلیات آتش۔ مطبع نول کشور کان پور
طبع اپریل ۱۸۸۸ء صـ۱۶۷ تا صـ۱۶۸)

۵ے بہ حوالہ (۱) اکبر الہ آبادی، طالب الہ آبادی۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد
طبع اول (سنہ اشاعت نامعلوم) صـ۳۹ تا صـ۴۲
(۲) تذکرہ ماہ و سال: مالک رام۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ طبع
نومبر ۱۹۹۱ء صـ۴۴ نیز صـ۴۰۴ (اس تذکرے (صـ۴۰۴)
میں مولوی وحیدالدین وحید کا وطن الہ آباد اور سال ولادت
۱۸۲۹ء لکھا ہے)
(۳) اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر صغرا مہدی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی طبع دسمبر ۱۹۸۱ء صـ۵۴ نیز صـ۸
(۴) انتخاب وحید: مرتبہ سید علی حسین زیبا۔ انجمن ترقی
اردو ہند دہلی طبع ۱۹۳۹ء صـ۱۱
(۵) اخبار دبدبۂ سکندری رامپور مورخہ ۲ر مئی ۱۸۹۲ء (بہ حوالہ
رسالہ معاصر پٹنہ حصہ ۲ صـ۱۲۳)
(۶) سفینۂ غزل، مرتبہ سید محمد عباس۔ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی،
لاہور، ڈھاکہ۔ طبع مئی ۱۹۵۸ء صـ۴۰۳ تا ۴۱۰
(۷) انتخاب کلام افسر صـ۹۸، صـ۱۵۱ نیز صـ۲۱ تا صـ۲۶
(۸) شاہ محمد رفیع الزماں۔ الہ آبادی صـ۱۳۷ تا صـ۱۳۸

۶ے آئینۂ حیرت صـ۲۲۵ تا صـ۲۲۶ میں شاگرد غالب زکریا خاں زکی
دہلوی کے تین عدد اُردو قطعات تاریخ بہ سلسلۂ سال تکمیل آئینۂ
حیرت (۱۲۹۶ھ) موجود ہیں۔ تلامذہ غالب: مالک رام۔ مکتبۂ
جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ طبع مئی ۱۹۸۴ء (صـ۲۲۲-۲۳۳) میں
شامل احوال زکریا خاں زکی دہلوی کی فہرست مصادر پر
آئینہ حیرت (طبع ۱۲۹۸ھ) ہمارا اضافہ ہے۔ تلامذۂ غالب کی
کتابیات کی فہرست بھی اس اضافے کی طالب ہے۔ (رک)

۷ے فغان بے خبر: خواجہ غلام غوث بے خبر۔ نامی پریس الہ آباد
طبع ۱۸۹۱ء صـ۳۹ تا صـ۴۱

۸ے آئینۂ حیرت: صـ۱

۹ے بہ حوالہ 'خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ': کاظم علیخاں۔ کتاب نگر لکھنؤ
طبع ۱۹۸۱ء صـ۸

۱۰ے خواجہ غلام غوث بے خبر کے احوال پر ہمارا ایک علاحدہ مقالہ
منتظر اشاعت ہے، جس میں احوال بے خبر سے متعلق مصادر
کی فہرست بھی موجود ہے۔ یہاں کم و بیش ڈیڑھ درجن مصادر
کی فہرست پیش کرنا تحصیل حاصل ہے

۱۱ے آئینۂ حیرت (صـ۹۱) کے اس شعر پر کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر
یاد آتا ہے ؎

کیا جانے اس کو لکھ دیا کیا اضطراب میں
قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

ذوق دہلوی، مرزا غالب، مومن دہلوی اور داغ دہلوی وغیرہ کے
دواوین میں منقولہ بالا شعر کی زمین میں متعدد غزلیں موجود ہیں۔
ذوق کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں
کیا جانے میں نے لکھ دیا کیا اضطراب میں

(کلیات ذوق (اردو): مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ ترقی اردو
بیورو نئی دہلی۔ طبع ۱۹۸۰ء صـ۱۵۵)

حیرت الہ آبادی کا زیر حوالہ شعر خود حیرت کے استاد مولوی وحیدالدین
وحید فتح پوری کے ایک شعر سے معنوی مماثلت رکھتا ہے۔

(وحید کے شعر کے لیے دیکھیے کتاب اکبر الہ آبادی: طالب الہ آبادی ص ۴۳)

۱۲ے آئینۂ حیرت (ص ۱۳۸) میں شامل حیرت الہ آبادی کی غزل ۱۲۸ کے اس مشہور و مقبول مطلعے پر ہمیں انگریزی کی یہ کہاوت یاد آتی ہے:

"Nothing is so certain as death and nothing is so uncertain as the time of death."

۱۳ے آئینۂ حیرت (ص ۱۹) میں شامل حیرت الہ آبادی کا یہ "حسنِ مطلع" مومن خاں مومن دہلوی کے ایک "دوغزلے" کی زمین میں ہے [دیوانِ مومن (مع شرح) مرتبہ ضیا احمد ضیا بدایونی۔ رام دیال اگروال پبلشر الہ آباد۔ طبع پنجم ص ۱۸۴ تا ۱۸۷]

حیرت الہ آبادی نے اپنے اس "حسنِ مطلع" میں جو مضمون پیش کیا ہے اس پر مرزا غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

(دیوانِ غالب لکھنؤ طبع ۱۸۸۲ء ص ۴۲)

اپنے مُعاونین سے

اہلِ قلم معاونین سے پھر گذارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات فل اسکیپ کاغذ پر ایک ہی طرف تحریر کریں اور ادارے کو اصل کاپی ہی روانہ کریں۔ نقل اپنے پاس ضرور محفوظ کر لیں۔

بعض حضرات گزارش کے باوجود کاربن یا زیراکس کاپی بھیج دیتے ہیں جس سے اشاعت میں دشواریاں ہوتی ہیں۔

—— ایڈیٹر



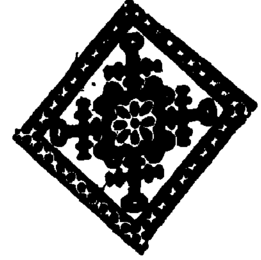
محمد جان خاں حیرت الہ آبادی کے دیوان "آئینۂ حیرت" طبع ۱۲۹۸ھ (مطابق ۸۱-۱۸۸۰ء) کا سرورق۔
(سالار جنگ میوزیم۔ حیدر آباد)

یہاں مولوی وحید اور حیرت الہ آبادی دونوں کے مماثل اشعار پیش ہیں ؎

قاصد کی جان جائے، پرزے کریں وہ خط کے
تقدیر میں ہماری "کیا کچھ" لکھا نہیں ہے
—— مولوی وحید الدین وحید

جواب آئے کہاں سے کہ ان کے کوچے میں
پڑے ہیں نامے کے ٹکڑے بھی نامہ بر کی طرح
—— حیرت الہ آبادی

غزلیں



بازارِ محبت میں یہ قیمت ہستی ہے
جتنی ہی یہ مہنگی ہے اتنی ہی یہ سستی ہے

کچھ دیر یہاں رک کر پھر گرمِ سفر ہونا
دیوانو ٹھہر جاؤ یہ پیار کی بستی ہے

ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لیے صدیوں
راہیں بھی ترستی ہیں منزل بھی ترستی ہے

کیوں بادہ ساغر کا احسان اُٹھائیں ہم
ان آنکھوں کی مستی میں سو جام کی مستی ہے

شادابی گلشن کی اللہ رے سیہ بختی
اٹھتی ہے گھٹا لیکن کچھ دُور برستی ہے

یہ وحشتِ دل آخر لائی ہے کہاں جوہرؔ
کچھ راز نہیں کھلتا صحرا ہے کہ بستی ہے

چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

۹۔ ریوا بلڈنگ، لیڈر روڈ۔ الٰہ آباد

ہر اک قدم پہ محبت کے گل کھلا کے چلے
بس ایک ہم تھے جو کانٹوں پہ مسکرا کے چلے

ہجوم چار طرف ہے تو نا خداؤں کا
مگر یہ کشتیِ دل رُخ یہ کس ہوا کے چلے!

اک اور تازہ بلا آ گئی محبت پر
تری طرف سے بھی کچھ وارجب وفا کے چلے

ہجوم جلوہ بھی ہے قیدِ احترام بھی ہے
نگاہِ شوق کہاں تک کوئی بچا کے چلے

تھی ایک راہِ تمنا مگر یہ فرق بھی تھا
میں دل جھکا کے چلا لوگ سر جھکا کے چلے

تری نگاہ کی محفوظ گفتگو کی قسم!
سوال کر نہ سکے اور جواب پا کے چلے

انیسؔ! دے گئے کچھ آپ حصہ قاسمؔ
غزل کی دولتِ افکار بھی لُٹا کے چلے

قاسمؔ شبیر نقوی نصیر آبادی

شبیر منزل، نصیر آباد
رائے بریلی

کھلا یہ راز یہاں سب کا ہاتھ خالی ہے
گدا بھی دستِ نگر شاہ بھی سوالی ہے

وہ شخص اور کسی کو تو دیکھتا بھی نہیں
نگاہ اس نے کئی بار مجھ پہ ڈالی ہے

حیات "عکس بہ جوئے رواں" کی صورت ہے
میں جی رہا ہوں یہ اک امرِ بے خیالی ہے

میں آسمان ہوں پستی مرا مقدر ہے!
عجیب شے مری تصویر باکمالی نہ ہے

یہیں سے پھیلے گا طوفان ہر طرف یارو
فصیل و در میں وہ بنیاد تم نے ڈالی ہے

میں ڈر گیا تھا بصارت نہ میری کھو جائے
کہ اس کو دیکھ کے میں نے نظر ہٹالی ہے

بشیرؔ اس کی یہ فطرت ہے اس کا شیوہ ہے
محبتوں سے ملا دشمنی نکالی ہے

بشیر فاروقی

۵۱۵۔ مراد علی لین
عقب رائل ہوٹل،
لکھنؤ

لئیق رضوی
۵. ۴۴/۱۴۴۱- کریلی، الہ آباد

اُردو میں شخصی مرثیے کی روایت

(۷)

شخصی مرثیے کی روایت میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا نام بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے کئی شخصی مرثیے تصنیف کیے ہیں۔ ان میں مہاتما گاندھی کی موت پر کہے جانے والے مرثیے "السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام" کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مرثیے میں جوش نے مہاتما گاندھی کی موت پر آنسو بہانے کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں نیز ملک و قوم کی خاطر ان کی بے لوث خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور انھیں امیر کارواں، شہید اتحاد نوع انساں، ابوالہند، دانائے کامل اور رسولِ عافیت جیسے ناموں سے یاد کیا ہے۔ مرثیے کا ہر ہر مصرع مہاتما گاندھی سے جوش ملیح آبادی کی گہری عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ ہر چند کہ مرثیے میں اظہار رنج وغم کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود بعض مقام پر رنج وغم کی مخصوص فضا نظم کا حصہ بن گئی ہے۔ زبان وبیان کی ندرت اور اظہار کی برجستگی مرثیے کی قدر وقیمت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ چند بند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؂

اے زمیں کی جیب کے آئینہ الماس بار
اے فلک کی بزم کے ہمسر درخشان بہار
اے وطن کی سرزمین کے آسمانِ ذی وقار
اے زمانے کی صدف کے گوہر انجم نگار
اے صفا کی موج کے لعلِ درخشاں السّلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

السّلام اے سینۂ اقوام کے دردِ نہاں
السّلام اے مرہم زخمِ دلِ ہندوستاں
السّلام اے دوست گیر و چارہ سازِ بیکساں
السلام اے آہ سردِ تیرہ بختانِ جہاں
السلام اے اشکِ گرمِ سینہ چاکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

جب سے تو اے بلبلِ شیریں زباں خاموش ہے
مہر بر لب گلستاں ہے، باغباں خاموش ہے
بوئے گل آزردہ ہے، جوئے رواں خاموش ہے
گلشنِ دیرینۂ ہندوستاں خاموش ہے
السلام اے ساکنِ شہرِ خموشاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

جوش نے مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر بھی ایک پُر درد مرثیہ کہا تھا۔ اس مرثیے میں بھی جوش نے اس امر کا بطور خاص اہتمام کیا ہے کہ اظہار رنج وغم کے ساتھ ہی ساتھ مرنے والے کی شخصیت کی خوبیاں اور اس کے انتقال سے ہونے والے سماجی نقصانات پر بھی روشنی پڑ سکے۔ مرثیہ غزل کے فارم میں ہے۔ جس میں کل تیرہ اشعار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

اے متاعِ بردۂ ہندوستان و ایشیا
اے کہ تھا ناخن بہ تیرے عقدۂ حق کا مدار

موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
اہلِ بدعت کی کلائی، خنجرِ باطل کی دھار

تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو
اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، سلطاں شکار

قوم کو بخشا ہے تیری موت نے وہ بانکپن
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار

اس کے علاوہ جوش کے دو شخصی مرثیے اور ہیں، جن میں ایک انھوں نے اپنی بہن کی موت پر اور دوسرا کسی شہیدِ وطن کے لیے کہا تھا چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ بہن شاداب تھے جس سے روایاتِ قدیم
وہ بہن تابندہ تھا جس سے اب و جد کا وقار

(بہن کی یاد)

اے بہادر! اے شہیدِ خنجرِ اربابِ کیں
جان جو اس شان سے دیتا ہو مر سکتا نہیں
بڑھ رہی ہے اس طرف گردن میں پھانسی کی گرہ
کھل رہا ہے اس طرف آغوشِ فردوسِ بریں
نوجوانو! توڑ ڈالو سبحہ و زنار کو
تا کجا یہ احمقانہ دارو گیرِ کفر و دیں

(ایک شہیدِ وطن کی یاد میں)

جگر مراد آبادی نے بھی گاندھی جی کی موت پر ایک پُر درد مرثیہ نظم کیا تھا جس میں گاندھی جی کی موت پر آنسو بہانے، انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ان کی قومی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے تعلق سے بھی یہ مرثیہ خاصے کی چیز ہے۔ غزل کے فارم میں کہا جانے والا یہ مرثیہ ۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ چند شعر پیش ہیں ؎

وہی ہے شورِ ہائے و ہو، وہی ہجومِ مرد و زن
مگر وہ حسنِ زندگی، مگر وہ جنتِ وطن

وہی زمیں، وہی زماں، وہی مکیں وہی مکاں
مگر سرورِ یک دلی، مگر نشاطِ انجمن

ہزار در ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ ملک
مگر وہ پیرِ نوجواں وہ ایک مردِ صف شکن

وہی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی
پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن

وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند
وہی ہے انجمن مگر کہاں وہ صدرِ انجمن

فراق گورکھپوری نے بھی شخصی مرثیے کی روایت کو آگے بڑھانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی اور اپنے چھوٹے بھائی کی اموات پر پُر درد مرثیے تصنیف کیے ہیں۔ بھائی کے انتقال کی خبر فراق کو جیل میں ملی تھی، جہاں وہ سول نافرمانی کے جرم کی سزا کاٹ رہے تھے۔ چھوٹے بھائی کی اچانک موت اور اس کے آخری رسوم میں شریک نہ ہوسکنے کے قلق نے فراق کو اندر تک توڑ دیا۔ چنانچہ فریاد کی لے اشعار کے پیکر میں ڈھل گئی۔ فراق کے یہ اشعار ان کے شدید رنج و غم کے آئینہ دار ہیں۔ بقول رفعت سروش،

"بھائی کی موت پر فراق کا دل خون کے آنسو رویا اور انھوں نے جن الفاظ میں اس کا ماتم کیا ہے اس سے اُردو کے ایک اہم شخصی مرثیے کی تشکیل ہوئی۔ شخصی بھی اور آفاقی بھی۔ کیونکہ اس میں غلام ہندستان کی پوری فضا سانس لے رہی ہے اور انگریزی سامراج کی بربریت بھی بے نقاب ہو رہی ہے۔"

غزل کے فارم میں کہے جانے والے اس مرثیے میں کل اکیس اشعار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مرنے والے یاد آتی ہے جواں مرگی تری !
اٹھ گیا دل میں لیے تو دل کے ارماں ہائے ہائے

میری قسمت میں تجھے کاندھا بھی دینا جب نہ تھا
دل نے کیوں باندھا تھا تجھ سے عہد و پیماں ہائے ہائے

الوداع اے زورِ بازو ، پیارے بھائی الفراق
اب تو میں ہوں اور تیرے داغِ ہجراں ہائے ہائے

گھر کو میں کیا منہ دکھاؤں گا رہا ہو کر فراق
میں اسیر اور ان کا یہ حالِ پریشاں ہائے ہائے

علامہ جمیل مظہری نے مہاتما گاندھی کی موت پر جو پُر درد نظم کہی تھی وہ بھی شخصی مرثیہ گوئی کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اظہار رنج و غم کے علاوہ گاندھی جی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بیان اس مرثیے کا بنیادی موضوع ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

مئے محبت انسانیت کا متوالا
کہ جس نے عقل کو سانچے میں عشق کے ڈھالا
بنا کے جس نے اہنسا کو جنگ کا آلا
ملوکیت کا مزاجِ کہن بدل ڈالا
جھکا دی گردنِ مغرور کج کلاہوں کی
جھپک رہی تھی پلک جس سے بادشاہوں کی
وہ اس کا وقت کے دھارے کو موڑتے جانا
ہر ایک موڑ پہ کچھ نقش چھوڑتے جانا
عمل کے پاؤں کی زنجیر توڑتے جانا
دلوں کے ٹوٹتے رشتوں کو جوڑتے جانا
غرض کہ آنکھ پہ پردہ جو تھا اٹھا کے گیا
دلوں کی اینٹ سے مندر نیا بنا کے گیا

حسرت موہانی نے بال گنگا دھر تلک کی وفات پر ایک مرثیہ کہا تھا ، جو بعد میں کان پور کے "آریہ گزٹ" اخبار میں شائع بھی ہوا تھا[2]۔ مرثیے میں تلک کی شخصی خوبیوں کے ذکر کے علاوہ ہندستان کی جنگِ آزادی میں ان کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک ، مہراج تلک ، آزادی کے سرتاج تلک

جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زور ان کا
اب رہ کے بہشت میں نزدِ خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک

اس کے علاوہ حسرت نے اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال پر بھی ایک پر درد مرثیہ تصنیف کیا تھا[3]۔ ان اشعار میں حسرت کے رنج و غم کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی بے کار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری بے کار ہے تیرے بغیر

حواشی :

۱۔ بحوالہ پروفیسر سید احتشام حسین ۔ اردو ادب میں مہاتما گاندھی۔ روایت اور بغاوت (لکھنؤ ۔ ۱۹۶۲ء) ص ۲۲۴

۲۔ سہ ماہی اردو ادب ، علی گڑھ (حسرت نمبر) اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۱۳۳

۳۔ ایضاً ص ۹۹

غزلیں

کیا زمانہ ہے کبھی یوں بھی سزا دیتا ہے
میرا دشمن مجھے جینے کی دُعا دیتا ہے

روز تنہائی میں آواز کے پتھر سے کوئی
شاخِ مژگاں سے پرندوں کو اڑا دیتا ہے

اپنا چہرہ کوئی کتنا ہی چھپائے رکھے
وقت ہر شخص کو آئینہ دکھا دیتا ہے

جو زمانے کو اشاروں پہ چلاتا تھا وہ اب
اپنا سر وقت کے قدموں پہ جھکا دیتا ہے

حاکمِ وقت بھی چاہے تو نہیں دے سکتا
وقت جس طرح سے انساں کو سزا دیتا ہے

اس نے یہ شغل نکالا ہے کہ خلوت میں حسنؔ
دل پہ لکھتا ہے مرا نام مٹا دیتا ہے

حسن کاظمی
ہمایوں باغ۔ کان پور

میری جبینِ شوق ترا آستاں رہے
تابانِ خلوص و مہر و وفا کا نشاں رہے

جلووں سے تیرے قلب مرا ضو فشاں رہے
پردہ نہ کوئی میرے ترے درمیاں رہے

لازم ہے عرضِ شوق سے پہلے نظر اُٹھے
میری وفا کی لب پہ ترے داستاں رہے

پاسِ وقارِ یار رہا کہہ سکے نہ کچھ
ہم تو زبان رکھتے ہوئے بے زباں رہے

واعظ پیوں گا شوخ نظر سے اگر ملے
شیشہ، سبو نہ جام و مے ارغواں رہے

وہ کام کر کہ یاد کریں سب تجھے بسنتؔ
دنیا میں سب کے لب پہ تری داستاں رہے

بسنت کمار بسنت
۳۹/۲۵۱۔ ڈیڑھی بازار
رکاب گنج۔ لکھنؤ

جب نیند ہمیں آئی افکار کی باہوں میں
سپنے میں نظر آئے غمخوار کی باہوں میں

ماتھے پہ شکن ابھری پلکوں سے رضا جھانکی
اقرار کا پہلو ہے انکار کی باہوں میں

اشعار کی شکلوں میں تصویر کے پیکر میں
افکار کے لاشے ہیں فنکار کی باہوں میں

تکیہ تھا ہمیں جن پر دیتے ہیں ہوا وہ ہی
ہر برگ کو دیکھا ہے انگار کی باہوں میں

پیمانہ تو پیمانہ، مےخانہ سما جائے
بیخودؔ کا عقیدہ ہے میخوار کی باہوں میں

انور جمال بیخود بلگرامی



سیّاحوں کی جنّت: اُتّر پردیش

سیّاح کا لفظ ذہن میں آتے ہی جس قسم کا خیال اُبھرتا ہے وہ ایک صاف ستھرے کردار ہی کا تصور ہوتا ہے۔ سیاح بغیر تفریق مذہب وملت، صلح وآشتی اور امن وامان کا ایک پجاری ہوتا ہے۔ سیاح ہر شے کو وسیع پیمانے پر اپنے کھلے ہوئے ذہن کے کینوس پر ابھار کر اپنے فہم وادراک کی کسوٹی پر کس کر حق وباطل کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ فیصلہ کرکے حق کو حق کی راہ پر اور باطل کو باطل کی راہ پر چھوڑ دے بلکہ وہ حق کی تبلیغ کرتا ہوا انسداد باطل کی تلقین بھی کرتا ہے۔ محبت اس کا سرچشمۂ حیات ہے۔ محبت جو لافانی ہے محبت جو ازلی زندگی کا ماخذ ہے۔ محبت جو زیست کی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارتی ہے۔ سیاح ہر شے میں خوبصورتی دیکھنا چاہتا ہے خوبصورتی نہ صرف منظر کی بلکہ خوبصورتی کردار واطوار کی۔

سیاح محب مناظر قدرت ہے اور اپنے قرب وجوار کے مناظر کو وہ ہر وقت دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ جب کسی بھی خوبصورت مقام کو وہ دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں اچانک جو تصور ابھرتا ہے وہ تصور ہری بھری پرسکون اور خوش گوار فضا کا ہوتا ہے خوش گوار فضا جو زندگی ہے اور اس سے ملنے والا لطف حاصل زندگی ہے۔ جنگل، پھول، باغ، سبزہ یہ سب انسانی زندگی کے فرحت اور آسائش کا ایک ذریعہ ہے، ایک ذریعۂ تحریک ہے۔ انسان اگر خوش ہے تو وہ جوان ہے۔ اگر وہ جوان ہے تو پرعزم ہے اگر وہ پرعزم ہے تو وہ سفیر ہے راہ ارتقا کا۔ اس کے کشکول میں زاد راہ کی شکل میں محبت ہی محبت ہوتی ہے۔

انسان کے اندر جستجو اور تحقیق کا جذبہ جب شدت اختیار کرلیتا ہے تو اس کی تسکین کا واحد راستہ محض سیاحت ہی ہوتا ہے سیاحت اس کے علم کو دوبالا کرتی ہے۔ جس طرح انسان کے ذہنی نشو ونما میں تین چیزوں کی بے انتہا ضرورت ہوتی ہے جس میں وسیع مطالعہ عمیق مشاہدہ اور ذاتی تجربہ، سیر وسیاحت ایک ہی عمل کے تین نام ہیں، جس کے ذریعہ انسان اسرار زندگی کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

آج ہندستان کا سیر وسیاحت کے لیے آنے والے تمام بیرونی ممالک کے سیاح کی ہمارے ملک میں بھیڑ لگی ہے۔ بیرونی ممالک کے ان سیاحوں کی دل چسپی کا سبب یہ ہے کہ ہمارا ملک اپنی سنہری تاریخ کو آج بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہمارے معاشرے کے اعلیٰ اقدار، ہمارے سماج کی اعلیٰ فکریں ہم کو موجودہ چمک دمک کے ماحول میں بھی اقدار دیرینہ سے الگ نہیں کرپائی ہیں اور یہ سیاح ہمارے ملک کے مناظر کو ہی دیکھنے کے لئے نہیں آتے بلکہ یہ ہمارے معزز مہمان بھی ہوتے ہیں جنھوں نے ہمارے ملک میں مہمان نوازی کے تذکرے کتابوں میں پڑھ رکھے ہیں۔ جب یہ سیاح ہمارے ملک میں بغرض سیر وسیاحت آتے ہیں تو ہماری تہذیب کے خصائص کے اہم جزو مہمان نوازی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے۔ ہماری مہمان نوازی سے متاثر ہوکر وہ سیاح بار بار ہمارے ملک کو دیکھنا بھی چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں بیرونی سیاحوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

اتر پردیش کو قدرت نے اپنے ہاتھوں سے سجایا اور

سنوارا ہے۔ قدرت نے اپنی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسین مناظر اور قدرتی خزانوں سے ہمارے ملک کو مالا مال کیا ہے۔ یہاں ایک جانب برف سے ڈھکے اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں، کل کل کرتی بہتی ندیاں اور جگہ جگہ گرتے ہوئے آبشار مع ابھار جنگلات کے ساتھ ساتھ جنگلی جانوروں کی دل کو چھو لینے والی کشش سیاحوں کو آنے کی دعوت دیتی ہے۔ مشہور پھولوں کی وادی اور 'اولی' جیسے دلفریب سیاحتی مرکز اسی ریاست کی وراثت ہیں اس ریاست میں سیاحوں اور فطرت سے کھیلنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی زبردست صلاحیت ہے۔

قدرت کے حسین مناظر کے ساتھ ساتھ اتر پردیش میں بودھ تیرتھ استھل، عقیدت و احترام کے مرکز بدری ناتھ، کیدار ناتھ دھام، متھرا، اجودھیا، پریاگ اور وارانسی جیسے مذہبی مقامات ہیں۔ دنیا کے عجائبات میں فن تعمیر کی بے مثال عمارت تاج محل اسی ریاست میں ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کی علامت دیوی شریف، مگہر اور لکھنؤ اسی ریاست میں ہیں۔ جن مقامات پر ہمیشہ جو رب ہے وہی رام ہے، کی صدا گونجتی رہتی ہے

ریاست کے ان تاریخی، مذہبی، ثقافتی اور سیاحتی اہمیت والے مقامات میں سیاح شہر کے پرشور ماحول سے دور کچھ پل سکون و اطمینان اور ہنسی خوشی کے ماحول میں گزارنے کی توقع سے آتے ہیں۔ یہاں کی شیریں یادوں کے ہمراہ دوبارہ یہاں آنے کی پرزور خواہش کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ ان مقامات پر تیرتھ یاتریوں اور سیاحوں کی رہائش کھانے پینے اور نقل و حمل کی سہولتیں مہیا کرانے کے لیے ریاستی حکومت نے لاتعداد قیام گاہوں کی تعمیر کرائی ہے۔ یہاں پر سبھی ضروری سہولتوں کے ہمراہ سیاحوں کو ہر قسم کی اطلاعات دینے کا بندوبست ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان مقامات پر آنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے گزشتہ سال ۱۹۹۰ء میں ۴۴ لاکھ سیاح ریاست میں آئے تھے جبکہ ۱۹۹۱ء میں ان کی تعداد ۴۹۵ لاکھ ہوئی۔ ان دو سالوں کے درمیان اتر پردیش کے مختلف مقامات پر آنے والے غیر ملکی سیاحوں کی تعداد تقریباً ۴۱،۷۱ لاکھ تھی جن سے ریاست کو ۱۸۰،۹۱۴۶ کروڑ روپئے غیر ملکی زر مبادلہ حاصل ہوا۔

ریاست کا شمالی علاقہ (اترانچل) سیاحوں کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہاں اپنے قدرتی حسن کے انواع و اقسام کے دلفریب مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دور حاضر میں ریاست کے شمالی حصے میں مختلف مقامات پر محکمہ سیاحت کے توسط سے ۳۳ رہائش گاہوں کی تعمیر کرائی جا رہی ہے۔ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ان رہائش گاہوں کی تعمیر کے لئے حکومت نے ۷۰،۱۸۳ لاکھ روپئے کی رقم مختص کی تھی جس کے برخلاف مالیاتی سال رواں کے دوران ۱۱،۱۰۱ لاکھ روپئے تعمیراتی کاموں پر اور ۵،۹۸ ۴ لاکھ روپئے رہائش گاہوں کی سجاوٹ پر صرف کیے گئے۔ ان اسکیموں کے مکمل ہو جانے پر اترانچل علاقہ میں ۱۷۰۲ مزید بستروں کی رہائشی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں جوشی مٹھ (چمولی) میں ۴۲ بستر والے، گو پیشور (چمولی) میں ۲۴ بستروں والے اور پرولا (اترکاشی) میں ۲۰ بستروں والی سیاحتی رہائش گاہوں کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے۔

مالیاتی سال رواں میں سیاحتی ترقیاتی پروگراموں کے تحت حکومت نے ۴۱۸،۲۲ لاکھ روپئے اور اجابت گاہوں کی تعمیر کے لئے ۱۰ لاکھ روپئے کی رقم منظور کی۔ اسی طرح سیاحتی گرڈ اسکیم کے تحت کل ۹،۶۶ لاکھ روپئے کی رقم صرف کی ہے۔ سال ۹۲-۹۱ میں ریاستی سرکار نے ضلع پوڑی گڑھوال سے 'پوڑی' اور الموڑہ کے "سیتلا کھیت" کو سیاحتی شہروں کی حیثیت سے ترقی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

ریاست کی موجودہ حکومت نے سیاحتی مقامات کو نجی زمرے کے توسط سے فروغ دینے کے نظریہ کے تحت سیاحت کو صنعت کا درجہ دیکر بطور صنعت فروغ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے وہ افراد بھی مستفیض ہوں گے جو سیاحتی بندوبست کو چلانے کے خواہش مند تو ہیں لیکن ان کے پاس سرمایہ نیز دیگر وسائل کی کمی ہے۔ ریاست میں ہوٹل کاروبار کو فروغ دینے کے پیش نظر اب تک نجی زمرے میں ۲۳۲ ہوٹلوں کے لیے جگہ کا انتخاب اور منظوری دی جا چکی ہے۔

ہر سال سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ۴۲۸۵ بستروں کی صلاحیت والی ۱۳۳ سیاحتی قیام گاہیں تیار کرائی گئی ہیں۔ ان میں سے ۵۱ میدانی علاقوں میں اور ۸۲ اتراکھنڈ علاقوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ سفر اور دیگر خصوصی راستوں پر سیاحوں کے لیے سہولتیں مہیا کرائی گئی ہیں۔

ریاستی حکومت نے اجودھیا، وارانسی اور برج علاقے کی خصوصی تہذیبی آثار کی اہمیت کے پیشِ نظر تین سرد سے کمیٹیوں کی تشکیل کی ہے۔ گوتم بدھ کی زندگی کے خصوصی واقعات سے وابستہ مقامات کو جوڑنے اور ان میں رہائش، نقل و حمل اور ٹیلی مواصلات کی سہولتوں کو یقینی بنانے کے پیشِ نظر بودھ پریپتھ اسکیم پر کام چل رہا ہے۔ آگرہ میں ممتاز باغ کی تزئین کاری کے لیے امریکی کمپنی کے تعاون سے اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔ تاج محل کے اطراف و جوانب کے ماحول میں سدھار لایا جائے گا۔ بیرونی ممالک سے آنے والے سیاحوں کو ریاست کے اہم تاریخی، مذہبی، تہذیبی و ثقافتی مقامات سے واقف کرانے کے لیے سیاحتی مراکز کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ان مراکز پر سیاحتی معلومات پر لٹریچر مفت فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی دہلی۔ چنڈی گڑھ۔ احمد آباد۔ مدراس۔ بمبئی اور کلکتہ میں بھی اتر پردیش کے سیاحتی دفاتر قائم ہیں۔

محکمہ سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے پیکج ٹورس کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی سہولتوں کی توسیع وارانسی اور آگرہ کے علاوہ احمد آباد اور کلکتہ میں بھی کیے جانے پر غور کیا جا رہا ہے۔

سیاحوں کو بڑی تعداد میں متوجہ کرنے کے لیے مختلف مقامات پر میلوں اور مقابلوں کا انعقاد بھی ہر برس کیا جاتا ہے جن میں اجودھیا اور چترکوٹ کے رام میلے، جشنِ لکھنؤ، بین الاقوامی آم میلہ، کل ہند پتنگ بازی مقابلہ، بین الاقوامی یومِ سیاحت اور آگرہ میں تاج مہوتسو اور دست کاری میلہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کاروبار کے طور پر سیاحت کا فروغ ریاست کے اقتصادی بندوبست میں سدھار لائے گا اور اس کا فائدہ سیاحتی مقامات کے قرب و جوار کے علاقوں کے باشندوں کی مالی حالت سدھارنے میں اہم رول ادا کرے گا۔

ملک و بیرونِ ملک سے آنے والے سیاحوں کے سبب یہاں کی تہذیبی وراثت کو آگے بڑھایا جا سکے گا اور تہذیبی ماحول کی تبدیلی سے اعلیٰ سطح پر آپسی بھائی چارہ، اخوت اور قومی یکجہتی کو تقویت ملے گی۔

سید فصاحت حسین رضوی
آر۔ ایس III/ ۱۹۰
ڈیکسٹ رائے کالونی۔ لکھنؤ

بگولے درد کے

میرے دلِ صد چاک پر جب روشنی ڈالی گئی
بس ہر نظر خالی گئی
کچھ بھی نہ تھا اس شہر میں
سب کچھ پڑا تھا زہر میں
نشتر ہی نشتر تھے وہاں
آہوں کے خنجر تھے وہاں
سامانِ آسائش نہ تھے، امکانِ آرائش نہ تھے
بس اک دلِ صد چاک تھا، سب کچھ وہاں پر خاک تھا
کچھ تھے بگولے درد کے
بکھرے تھے غموں کے دائرے۔ جو زخم تھے اپنوں کے تھے
دل نے سنبھالے تھے مگر، اچھی طرح رکھے تھے سب
حالانکہ دل تھا ہی کہاں!

فاطمہ وصیہ جائسی
۳۷۔ ساتویں گلی، نشاط گنج
لکھنؤ

وہ جس کو ٹوٹ کر چاہا بہت ہے
اسی نے دل مرا توڑا بہت ہے
جنوں کی جس جگہ پر ہے ضرورت
وہیں پر عقل کا پہرا بہت ہے
کسی کی رائیگاں ساری عبادت
کسی کا صرف اک سجدہ بہت ہے
عداوت کے لیے اک زندگی کم
محبت کے لیے لمحہ بہت ہے
جہاں پر حسن کا جلوہ ہے اختر
وہیں پر عشق کا چرچا بہت ہے

سلیم اختر سیتاپوری
شیخ سرائے۔ سیتاپور
۲۶۱۰۰۱

شمع کی مانند میں جلتا رہا
زندگی کا یوں سفر چلتا رہا
زندگی بے کیف ہو کر رہ گئی
سونا آنگن دیکھ کر روتا رہا
شہر میں نفرت کے شعلے جل اٹھے
پھر ہمارا آشیاں جلتا رہا
رہروانِ شوق جب بڑھنے لگے
منزلوں کا خود نشاں ملتا رہا
آرزوؤں کا چمن تو لٹ گیا
خار بن کر پھول بھی چبھتا رہا

طفیل احمد انصاری
مفتی محلہ۔ جون پور
۲۲۲۰۰۱



ملتا ہی نہیں کوئی خریدارِ تمنا
بیٹھے ہیں سجائے ہوئے بازارِ تمنا
خود ہو گئے بے رنگ تو کچھ غم نہیں ہم کو
رنگین مگر کر دیا رخسارِ تمنا
آدابِ تمنا سے ہی واقف نہیں جو لوگ
وہ خاک سمجھ پائیں گے اسرارِ تمنا
لے آئی ہے پروائی تری یاد کی خوشبو
پھر مہکا ہے اجڑا ہوا گلزارِ تمنا
سینچا تھا اسد ہم نے جنہیں خونِ جگر سے
کیوں پھل سے ہیں محروم وہ اشجارِ تمنا

اسد رضا
اے۔ ۱۱/۱۷۔ حوض رانی، مالویہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

چمن میں بلبلِ رنگیں غزل سرا بھی تو ہو
فضا میں رنگِ تغزل ذرا ذرا بھی تو ہو
مجال کیا کہ وہ دستِ گرفت سے نکلے
فصیلِ شہر میں قاتل مرا چھپا بھی تو ہو
یہ جی میں ہے کہ سمندر کی تہ کو چھو آئیں
ہمارے ساتھ مگر عزم بے بہا بھی تو ہو
الٰہی خیر سے پیدا سبیل کرے کوئی
ہجوم یاس میں جینے کا آسرا بھی تو ہو
بہت ہی سہل ہے مہتاب کا سفر قیصر
ہے شرط یہ کہ وہاں اپنی مدعا بھی تو ہو

قیصر الہ آبادی
اے۔ ۱۲، ایس۔ وی۔ روڈ
باندرہ (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۰



نام کتاب: "عکسِ جاں" (شعری مجموعہ)
شاعر: ظفر مہدی   قیمت: ۹۰/ روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

شاعرِ شہر نگاراں مجازؔ کے وطن ردولی (بارہ بنکی) کی سرزمین ہمیشہ سے شعر و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس خطۂ علم و ادب کے بے شمار شعراء و ادباء زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک اپنے فکر و فن کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ یہاں کے تقریباً تمام تعلقہ داران شعر و ادب سے شغف رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض تو خود ہی شاعر تھے اور جو شعر نہیں کہتے تھے وہ شعراء کو نوازتے اور ان کی پذیرائی کرتے رہتے تھے۔

آج بھی قصبہ ردولی کے متعدد شعراء و ادباء اپنی علمی صلاحیتوں اور ادبی بصیرتوں سے اردو ادب کو مالا مال کر رہے ہیں ان میں پروانہؔ، شارب، باقر مہدی اور ظفر مہدی کے نام محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔

"عکسِ جاں" کے شاعر ظفر مہدی نے ادب نواز و شعر فہم تعلقہ دار گھرانے میں آنکھیں کھولیں جہاں ہمیشہ شعر و سخن کا چرچا رہا کرتا تھا اور جہاں اکثر مشاعرے اور شعری نشستیں منعقد ہوا کرتیں۔ ایسی ادبی فضا میں ظفر مہدی نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔

ظفر کی شاعری آمد کی شاعری ہے آورد کی نہیں۔ وہ شعر کہنے کے لیے خود نہیں بیٹھتے بلکہ شعر ان کو بیٹھنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔

"عکسِ جاں" ظفر مہدی کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جس کی

ظفر مہدی محبت کے علمبردار ہیں۔ وہ دنیا کو محض برائی، قتل و غارت گری کا مقام تصور نہیں کرتے بلکہ ان کی نظر میں دنیا کی ایک شکل یہ بھی ہے ؎

یہاں سچائیاں بھی بولتی ہیں
یہ کوچہ کوچۂ قاتل نہیں ہے

زندگی کے سلسلے میں ظفر مہدی کا نظریہ بڑا مثبت اور رجائی ہے ؎

تہِ غبار مجھے روشنی سی لگتی ہے
ہزار رنج ہوں لیکن خوشی سی لگتی ہے

اور "عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا" کے مترادف ظفر کی خواہش کچھ اس طرح ہے ؎

نئی منزلوں کی ہے جستجو، ہے ظفر کی بس یہی آرزو
ہو جو خواب بھی تو یہ کہہ سکوں مرا خواب خوابِ ارم تو ہے

بنیادی طور پر ظفر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے اندازِ فکر میں جدت اور خیالات میں ندرت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست کا انھیں خوب سلیقہ ہے۔

انھوں نے دورِ حاضر کی چمک دمک میں ماضی کی روایات اور اعلیٰ اقدار کو کبھی فراموش نہیں کیا ؎

اس دورِ نمائش کی تقلید مبارک ہو
جاتی ہے کہاں لیکن یہ راہگزر کیسے

شاعر کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے جس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

دل کی بستی جو بہت آباد تھی
تیرے جاتے ہی کھنڈر ہوتی گئی

پہلے انجام پر نظر رکھے
پھر کسی سے دغا کرے کوئی

کتابت و طباعت نہایت شاندار اور گٹ اَپ بے حد دیدہ زیب ہے۔

غزال ضیغم ____

نام کتاب: چشمِ براہ (شعری مجموعہ)
شاعر: عتیق الہ آبادی   قیمت: ۳۵/ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن تہذیب نو۔ ۲۰۲ چک۔ الٰہ آباد

عتیق الہ آبادی نئی نسل کے ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جو عوام و خواص دونوں میں پسند کیے جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف وہ مشاعروں کے مقبول شاعر ہیں تو دوسری طرف سنجیدہ قاری اور ناقد کے بھی زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ "چشم براہ" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے اور اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشاعروں میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے کبھی شاعری کی نچلی سطح پر نہیں اترتے بلکہ انھوں نے فن کے معیار کو اپنی شاعری میں پورے طور پر برقرار رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں عہد حاضر کے مسائل اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور قاری کے ذہن میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ وہ ان مسائل کا حل مذہب کے پس منظر میں تلاش کرتے ہیں۔ واقعہ کربلا ان کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی لڑائی اسی نہج پر لڑنا چاہتے ہیں۔ حسب ذیل دو شعر اس بات کا ثبوت ہیں ؎

چلے ہوئے سبھی خیموں سے جھانکتے سر پر
ردا اڑھا دے جو، وہ ہاتھ ڈھونڈتا ہوں میں

موجِ فرات اس لیے بے تاب ہے عتیق
پہرہ جو اٹھ گیا ہے تو پیاسا نہیں رہا

عتیق کی شاعری میں زمانے کی زہرناکی اور ماحول میں گھلی ہوئی بربریت سے لڑنے کا زبردست حوصلہ ملتا ہے ؎

تم اس محاذ پر تنہا نہیں ہو ہم بھی ہیں
ہمارے واسطے بھی راستہ کھلا رکھنا

اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری میں انسانی سے ہمدردی محبت دردمندی، انسانیت کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ جگہ جگہ بکھرا ہوا ملتا ہے، جو آج کی شاعری میں ذرا کم نظر آتا ہے۔

"چشم براہ" میں جہاں اس طرح کے آفاقی مسائل ہیں وہیں ہلکی پھلکی رومان پرور فضا بھی ہے۔ نرم گرم جذبات، ہجر و وصال کی کیفیتیں، شادمانیاں، ٹیس، کرب اور رومان سے جڑے ہوئے دوسرے نفسیاتی پہلو ان کے اشعار میں جا بجا ملتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے ؎

آج ہوا کا جھونکا بن کر گاؤں سے وہ آئے گا
گھر کی ٹوٹی دیواروں پر دیپ جلا کر رکھا ہے

چلیے نہیں ملیں گے نہ دیکھیں گے آپ کو
لیکن ہماری سوچ پہ پہرے بٹھائیے

گفتگو ان کی چبھ گئی دل میں
دیکھیں یہ پھانس کب نکلتی ہے

چشم براہ میں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور پروفیسر مناظر حسین نے عتیق کی شاعری سے متعلق اظہار خیال کیا ہے کہ شعری یا نثری مجموعوں میں اس طرح کے اظہار خیال کو شامل کرنا روایتوں میں سے ہے۔ اگر اس مجموعہ میں یہ "اظہار خیال" شامل نہ بھی کیا جاتا تو اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہ پڑتا کہ قاری تخلیق کو پڑھ کر ہی تخلیق کار کی تخلیقی قوت کا اندازہ کرتا ہے، اور جہاں تک تخلیقی قوت کا سوال ہے وہ عتیق الہ آبادی کے اندر بھرپور موجود ہے اور اسی لیے یہ شعری مجموعہ حال میں شائع ہونے والے دوسرے شعری مجموعوں سے قدرے ہٹ کر ہے، جس کے لیے عتیق الہ آبادی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اسرار گاندھی ____

نام کتاب "شاخِ یاسمین" (شعری مجموعہ)
شاعر: کملا پت سہائے ماہر بلگرامی

قیمت : ۔/۲۲ روپے

ملنے کا پتہ : دانش محل ۔ امین آباد لکھنؤ

"شاخ یاسمین" ناہر بلگرامی کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے جو ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں نظموں، رباعیوں اور قطعات کے علاوہ تقریباً ۱۲۵ غزلیں ہیں۔ ناہر صاحب نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ متعدد قومی اور سماجی نظموں کے علاوہ ان کی سیکڑوں غزلیں منظر عام پر آکر باذوق قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اس کتاب میں شامل کچھ قطعات ملاحظہ ہوں ؎

چاندنی رات جواں ہو تو غزل ہوتی ہے
کیف انگیز سماں ہو تو غزل ہوتی ہے
فکر اقبال کی ، انداز بیاں غالب کا
میر کی شستہ زباں ہو تو غزل ہوتی ہے

رونق صحن چمن زار غزل ہوتی ہے
بزم کی گرمی بازار غزل ہوتی ہے
جب کوئی درد کا پرساں نہیں ہوتا ناہر
ایسے میں مونس و غمخوار غزل ہوتی ہے

اس مجموعے میں شامل طویل نظم "محبت" اور مختصر نظمیں "عبادت" اور "نوحۂ سرزمین بنارس" انسان دوستی کی اچھی مثالیں ہیں۔ "نہرو کا جشن صد سالہ" ایک شاندار قومی نظم ہے اور حطیات بیخودی ناہر صاحب کی ایک بے مثال تخلیق ہے۔ ان نظموں سے ناہر صاحب کے مذاق سخن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

——— کوثر سلطانہ

نام کتاب : "الہام" (شعری مجموعہ)

شاعر : شریف قریشی　　　قیمت ۔/۲۲ روپے

ملنے کے پتے : (۱) شریف قریشی ۱۸/۱ بھوسہ منڈی۔ فتح گڑھ۔ ضلع فرخ آباد (یو پی)

(۲) مکتبہ دین و ادب ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

شریف قریشی کی شعری کاوشوں کا تیسرا مجموعہ "الہام" ہے ان کے ذہنی و فکری رویوں کے بارے میں احمد ندیم قاسمی اور منیر نیازی جیسے فن کاروں کی رائے یقیناً اہمیت کی حامل ہے۔ "الہام" سے قبل ان کے دو شعری مجموعے "نقش دوام" اور "صحرائے جاں" شائع ہو چکے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ خوب سے خوب تر کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہیں۔

"الہام" میں غزل کے علاوہ حمد، نعت، منقبت اور نظمیں ہیں۔ دعائے غیر منقوط سے انھوں نے اپنے اس مجموعہ کی ابتدا کی ہے، جس سے ان کی فنی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل ان کا خاص میدان ہے اور اس مجموعہ میں بیشتر غزلیات ہی ہیں۔ ان کی غزلیں ان کے تجربات اور احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ کسی طے شدہ نظریہ کے لیے انھوں نے اپنی غزلوں کو وقف نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے چاروں طرف بکھرے ہوئے بے شمار موضوعات کو اپنی غزل کے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ انھیں بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے بعض ایسے اشعار بھی ان کے یہاں مل جاتے ہیں جو ان کی پہچان کہے جا سکتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چلیں چراغ جلادیں کہ شام ہوتی ہے
ہمارے بعد کوئی بے چراغ آئے گا

دستکوں پہ چونکنے کی رسم پارینہ ہوئی
گھر کی دیواروں نے حل سارے مسائل کر دیے

یہ اور بات کہ بہتر عروج پا جائیں
مگر زیادہ دنوں تک خدا نہیں رہتے

——— (ڈاکٹر) نجابت ادیب





عنوانات

سرورق: ابوالفضل۔ کتابت: حسن خستہ

جلد ۴۷ نمبر ۱۱

فروری سنہ ۱۹۹۳ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون: ۲۲۵۶۶۰

معاونین:
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس خان
ٹیلیفون ۲۲۷۱۰۸

پبلشر
انل سروپ
(ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: تین روپیہ
زرسالانہ: تیس روپیے

[illegible]

نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہمارے ملک کی اسیٔی بنیاد جمہوریت پر قائم ہے اور سیکولرازم جمہوریت کی روح ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ صدیوں سے میل جول کر رہتے چلے آرہے ہیں۔ ہماری جمہوریت پر دوسرے ممالک رشک کرتے ہیں کیونکہ ہمارا ملک ہندوستان باہمی رواداری، صلح کل اور امن و آشتی کے زریں اصولوں پر ہمیشہ سے گامزن رہا ہے۔ یہاں کے صوفی سنت ادیب و شاعر اور خدا پرست درویشوں نے آپسی بھائی چارے اور قومی یکجہتی کا درس دے کر ہمیں متحد رہنے کی ہدایت کی اور ہمیں ایک ایسا لائحہ عمل دیا جس کے تحت ہمارے ملک میں گنگا جمنی تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

چشتی نے جس زمیں کو پیغام حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہمیں یقین ہے کہ اگر ہندوستان کے عوام بقائے باہم کے اصولوں پر نیک نیتی کے جذبے کے ساتھ قائم رہیں گے تو ہندوستان دنیا کی نگاہوں میں عظیم تر ہو جائے گا۔

☐ اسی مہینے میں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا انتقال ہوا تھا۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

☐ معروف شاعر جناب ساحر سسرالی کا گزشتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۹۳ء کو ایک مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ آپ کی عمر تقریباً ۶۲ برس تھی۔ مرحوم طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے لئے مشہور تھے۔ ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے

——————— ایڈیٹر

دیارِ گنگ و جمن

اقبال ماہر
۲۲۴، قاسم گنج، الہ آباد

دل و نگاہ کی راحت ہے خلد زارِ وطن
یہ جوئبار و خیابان و مرغزار و چمن

یہ شامیانۂ انجم یہ جگمگاتا گگن
لیے ہے لیلئ شب ماہتاب کا درپن

جو سمٹی چادرِ شب پھیلا صبح کا دامن
پڑی زمین پہ سورج کی جگمگاتی کرن

یہ غنچہ جیسے کہ آویزۂ نگارِ چمن
کلائی شاخ کی پہنے ہے پھول کا کنگن

شبابِ لالہ و گل وہ خرامِ بادِ صبا
خمارِ نرگسِ رعنا بہارِ سرو و سمن

طلوعِ صبح یہ سنگم یہ دلفزا اشنان
وہ ایک ٹیلے پہ سادھو بھی گیان میں ہے مگن

چمن چمن یہاں اک حجلۂ عروسی ہے
کلی کلی گل و لالہ کی بن گئی ہے دلہن

یہ تتلیوں کا حسیں رقص تختۂ گل پر
کہ جیسے قوسِ قزح کا ہو گوشۂ دامن

کہیں ہے مطربہ دلنواز نغمہ طراز
غزل سرا ہیں کہیں انجمن میں اہلِ سخن

کہیں ہے شان جوانوں میں کجکلاہی کی
کہیں ہیں لالہ رخ و گل عذار و غنچہ دہن

یہی ہے درس گہ علم و دانش و حکمت
یہ کارگاہِ ہنر یہ نگار خانۂ فن

فراق و اکبر و اعجاز و بسمل و سپرو
یہی ہے نوح و مہادیوی و ہنر کا وطن

یہ خانقاہ مقابر امام باڑے ہیں
یہ آشرم ہے یہ سنگم ہے یہ آنند بھون

یہ خسرو باغ یہ قلعہ ہے یہ اشوک کی لاٹ
کھنڈر سناتے ہیں شاہوں کی داستانِ کہن

وہی ہے شان کلیسا کی گردوارے کی
یہ مسجدوں میں عبادت یہ مندروں میں بھجن

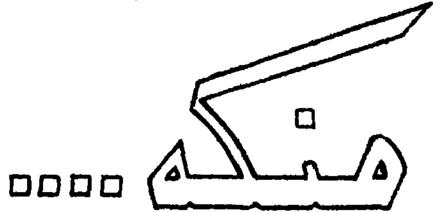
اسی زمیں سے اٹھی تھی صدائے آزادی
یہ ہے جواہر و موتی و اندرا کا وطن

ہر اک زباں پہ یہاں ہے پیامِ یکجہتی
فضائے امن میں ہے شیخ و برہمن کا ملن

کہیں نہ جاؤں گا اس در کو چھوڑ کر ماہر
بہت عزیز ہے مجھ کو دیارِ گنگ و جمن

خود نوشت

پروفیسر منظر عباس نقوی
شعبۂ اردو
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ





منکہ مسمی منظر عباس پسر سید عسکر حسن مرحوم، بہ نسب نسبی نقوی الحسینی المطلبی الہاشمی، بہ علاقۂ وطنی (بربنائے ہجرت متواترۂ اسلاف) مکی ثم مدنی الحجازی ثم صیداوی الشامی ثم واسطی العراقی ثم امروہوی الہندی، قوم سابق سید، قوم حال بھارتی، پیشۂ آبا معافیداری، پیشۂ خود معلمی، ساکن محلہ حقانی، واقع امروہہ ضلع مرادآباد کا ہوں۔ وہی مرادآباد جو شائستۂ آداب رندی و عشقبازی حضرت جگر مرادآبادی اور صنعت تمباکو خوردنی و ظروف سازی کے باعث ہندستان میں واقع ریاست اترپردیش کا خاصا مشہور مقام ہے۔ اسی مرادآباد سے اگر آپ کو بذریعۂ ایکسپریس ٹرین دہلی کے سفر کا اتفاق ہو اور آپ کسی ایسی نشست پر تشریف رکھتے ہوں کہ روئے مبارک آپ کا بجانب انجن ہو تو اپنے داہنے ہاتھ والی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتے رہیے اور جوں ہی آموں کے ہرے بھرے باغات نظر آنے لگیں تو یقین کر لیجیے کہ اب امروہہ قریب ہے۔ وقت اگر رات کا ہو تو اس لائن کے جس اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے سامنے لالٹین یا موم بتی جلتی دکھائی دے، بس "یا علی مدد" کہہ کر احتیاط سے پائیدان پر قدم رکھتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر آیئے کہ یہ فقیروں اور درویشوں کا مسکن ہے، اس لیے یہاں کے ریلوے اسٹیشن کی شانِ خانقہی بیسویں صدی کے ان برقی قمقموں کی چمک دمک کو گوارا نہیں کرتی ــــ!

اگر آپ کا ارادہ یہاں مستقلاً سکونت اختیار کرنے کا ہے تو ــــ اہلاً و سہلاً، مرحبا، خوش آمدید، موسٹ ویلکم، سواگتم ــــ مگر ایک بات پہلے ہی گوش گزار کر دوں کہ یہاں کی "گزران" ذرا سخت ہے، اس کے باوجود کوئی اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتا، اِلّا یہ کہ کم بخت ہو جیسا کہ بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں:ــــــ

امروہہ پائے تخت ہے
گزران یاں کی سخت ہے
جو چھوڑے وہ کمبخت ہے

میں اپنے وطنِ عزیز امروہہ کے بارے میں کچھ عرض کروں گا تو وہ وطنی تعلق کی بنا پر مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسے گواہ کو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں جو ہر طرح غیر جانب دار ہے یعنی "جغرافیہ ضلع مرادآباد" کا مولف ــــ نام منشی منولعل، پیشہ منصرم ڈپٹی انسپکٹر ضلع مرادآباد ــــ کتاب لکھی گئی "حسب الارشاد فیض بنیاد جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی"۔ مقام اشاعت الہ آباد، سنہ طباعت ۱۸۷۲ء ملاحظہ فرمائیں منشی صاحب موصوف کا یہ بیان:ــ

"سابق طرف مشرق آبادیٔ ہذا (حسن پور) کے ایک گاؤں عزیز پور جس میں قوم تگا کی سکونت تھی، آباد تھا، بعدہٗ شاہ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ درویش نے ولایت سے آکر اس مقام پر قیام کیا۔ اس وجہ سے

مقام ہذا میں آبادی شروع ہوئی۔ چنانچہ مزار ان کا جو زیارت شاہ ولایت کے نام سے مشہور ہے، اب تک یہاں موجود ..... وجہ تسمیہ تحقیقات سے یہ معلوم ہوئی ہے کہ جب شاہ شرف الدین یہاں تشریف لائے اس وقت کسی شخص نے انبہ یعنی آم اور رہو مچھلی ان کی نذر گزرانی۔ اس وجہ سے اس کا نام آم روہو رکھا۔ اب کثرت استعمال سے امروہہ کہلاتا ہے۔"

آگے چل کر منشی منولعل جی نے کتاب مذکور کی فصل پنجم میں سادات امروہہ کے بارے میں جو گہر افشانی فرمائی ہے، چلتے چلاتے وہ بھی سن لیجیے (اچھا ہو کہ آپ یقین نہ کریں!) :

"..... اور یہ بات بھی مزاجوں میں سمائی ہوئی ہے کہ شرافت اور عزت میں ہم سے بڑھ کر دوسرا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ دنیا میں دو مراتب اعلیٰ ہیں، ایک گدائی دوسرا شاہی۔ سو ہمارے بزرگوں کو دونوں حاصل تھے، یعنی جد امجد ہمارے شاہ شرف الدین صاحب معروف بہ شاہ ولایت درویش باکمال تھے اور ان کے صاحبزادے کو شہزادی شاہ دہلی کی منسوب تھی کہ جن کی اولاد میں ہم ہیں۔ پھر شرافت میں کون ہمارے ہمسر ہو سکتا ہے۔ اور یہ لوگ نسبت اپنے لڑکے لڑکیوں کی سوائے اپنے کنبے کے دوسرے خاندان میں ہرگز نہیں کرتے اور شاذ و نادر کوئی کر بھی لے تو تمام شہر میں انگشت نما ہوتا ہے۔ بازار اور اپنے دیہات جاگیر میں جانا کسر شان سمجھتے ہیں۔ یہ ہی باعث ان لوگوں کے بگڑ جانے اور جاگیریں بک جانے کا ہوا۔ اپنے علاقہ معافی وغیرہ میں کبھی نہ گئے۔ ملازموں کے اعتبار پر کاربراری ہوئی انھوں نے اپنا گھر بھرا اور ان کو قرضدار کر دیا۔ کبھی کہہ دیا ژالہ زدگی ہو گئی، کبھی بتایا موش خوری ہوئی، کسی سال خشکی کا حیلہ کیا، کسی سال غرقی کا بہانہ لیا۔

اب اگر تحقیقات کیجیے تو بہت سے ملازم یہاں کے رئیسوں کے ایسے نکلیں گے کہ خود رئیس بن بیٹھے اور آقا ان کے تباہ و برباد ہو گئے ..... افسوس کہ یہ لوگ اپنی سنڈھائی سے خراب و برباد ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔" (صفحہ ۴۲ تا ۴۴)

ان ہی سادات امروہہ میں سے منجملہ بہت سے دوسرے منصب داروں کے، ایک پنج ہزاری منصب دار' اس خاکسار، پریشان روزگار کے جدِ نامدار میر غلام اسداللہ خاں عرف میر کلو، ساکن محلہ گزری، بھی تھے، جن کے بارے میں صاحب "تاریخ اصغری" لکھتے ہیں :۔

" سید غلام اسداللہ خاں بہادر عرف سید اسداللہ جن کا میر کلو لقب زیادہ مشہور ہے، بڑے عالی ہمت اور صاحب فہم و فراست تھے۔ عہد عالمگیر ثانی میں رفتہ رفتہ بر سالہ محمد احمد خاں بموجب فرمان مورخہ سنہ جلوس بادشاہ ممدوح منصب پنج ہزاری ذات و پنج ہزاری سوار تک سرفراز ہوئے۔ بھاؤ مرہٹے کی لڑائی میں بمقام پانی پت بہ ہمراہی نواب دوندے خاں داد شجاعت دے کر مجروح بھی ہوئے تھے۔" (صفحہ ۱۳۵)

میر کلو کے پوتے سید فرحت علی ابھی صغیر سن ہی تھے کہ دادا اور پھر والد سید عبدالہادی دونوں کا انتقال ہو گیا اور جاگیر داخل کورٹ آف وارڈ کر دی گئی اور پھر بحال نہ ہو سکی۔ ان کے بیٹے سید منظر حسن صاحب میرے پردادا تھے جنھیں حصول معاش کے لیے پیشۂ وکالت اختیار کرنا پڑا۔ سید منظر حسن صاحب مرحوم کے تین بیٹے ہوئے، سید اظہر حسن (میرے دادا)، سید اطہر حسن اور سید اصغر حسن طالب۔ طالب شاعر بھی تھے اور حضرت مصحفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ میرے دادا ڈاکٹر سید اظہر حسن صاحب نے پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد آگرہ میڈیکل اسکول سے (جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھی) ایل، ایم، پی (LICENTIATE MEDICAL PRACTIONER) کی سند حاصل کی اور برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر ترقی کرتے ہوئے صوبہ دار میجر کے عہدے تک پہونچے۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر جو سات ہندستانی فوجی ڈاکٹر انگلستان

کے جشنِ فتح میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے ان میں ڈاکٹر سید اظہر حسن بھی تھے، جہاں سے سند خوشنودی اور وکٹوریہ کراس حاصل کرنے کے بعد وقت سے کچھ پہلے ہی انھوں نے پنشن لے لی اور امروہہ آکر اپنے مردانے مکان میں مطب شروع کر دیا۔ دادی صاحبہ کا انتقال اس سے پہلے ہی ہو چکا تھا، اس لیے والد کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ چنانچہ جب دادا نے مطب شروع کیا تو والد کو اپنے ساتھ کمپاؤنڈر کی حیثیت سے لگا لیا۔

١٩٢٧ء میں والد کی شادی میری والدہ اعجاز فاطمہ کے ساتھ اس وقت ہو گئی جبکہ ان کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ والدہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں اور ان کے والد سید علی اختر صاحب مرحوم اپنے باپ سید باقر حسین صاحب کے اکلوتے صاحبزادے۔ سید باقر حسین صاحب ریاست پرکھاری میں تحصیل دار تھے۔ انھوں نے اپنی ذاتی کمائی سے دو گاؤں خرید کیے۔ محلے میں ان کا شمار صاحبِ حیثیت لوگوں میں ہوتا تھا۔ شادی کے تین ہی سال بعد والدہ اپنے مائکے میں آکر رہنے لگیں اور میرے والد کی حیثیت گویا "گھر داماد" کی سی ہو گئی۔ ننہالی اجداد میں میر سعادت علی سعادت امروہوی (بہ تحقیق ڈاکٹر عبدالحق، استادِ میر تقی میر) جو میری والدہ کے دادا سید باقر حسین صاحب کی چوتھی پشت میں دادا تھے (یعنی سید باقر حسین بن سید ریحان علی بن سید عارف علی بن سید نجابت علی بن میر سعادت علی سعادت امروہوی) "تاریخِ ادبِ اردو" میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، لیکن ان کے بارے میں خود میری معلومات بس اسی قدر ہیں جتنی تذکروں میں ملتی ہیں۔ اس میں لے دے کے بس اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ یکم نومبر ١٩٢٣ء کو محلہ حقانی (امروہہ) کے جس ننہالی مکان میں میری ولادت ہوئی اس کی ایک سہ دری بزرگوں کے بیان کے مطابق، میر سعادت علی سعادت کے پوتے سید عارف علی صاحب کی بنوائی ہوئی ہے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا (اور یہ واقعہ کوئی ١٩٣٠ء یا ١٩٣٨ء کا ہے) تو اپنے ننہالی گھر میں کچھ نیم شہری، نیم دیہاتی سا ماحول پایا۔ فصل پر گاؤں سے اناج، دالیں، جاڑوں کے موسم میں گنے، گڑ کی بھیلیاں، مونگ پھلیاں، کچے چنے، رس کے گھڑے ہر چوتھے پانچویں روز آتے۔ کالے تل کے لڈو جو گیند برابر ہوتے تھے ایک بڑے منھ والی مٹکی میں بھر دیے جاتے۔ دالان کے کچے فرش میں ایک طرف لکڑی کی ادھ کھلی گڑی ہوئی تھی۔ ایک موٹے سے بھاری موسل سے دیہات کی عورتیں باجرا کوٹتیں اور جب باجرے کی گری نکل آتی تو اسے چھان پھٹک کر باجرے کی کھچڑی بنتی جسے دھوپ میں بیٹھ کر بڑی چینی کی بڑی بڑی سفالیوں میں تل کے تیل سے تر بتر کر کے ہرے دھنیے اور لہسن کی چٹنی کے ساتھ مزے لے لے کر کھایا جاتا۔

عید بقر عید پر جب گاؤں سے دودھ آجاتا تب عید کی سویوں کا مزا آتا۔ ایک بار عید کے دن گاؤں سے دودھ آنے میں بہت دیر ہو گئی۔ میں نے مجید کسان سے جو دودھ لے کر آیا تھا، ذرا برہمی کے انداز میں پوچھا،

"مجیدا! تم اتنی دیر سے دودھ کیوں لاتے ہو کہ ہمیں بغیر دودھ کی سویاں کھا کے عیدگاہ جانا پڑتا ہے"؟

بولا: "میاں صاحب! بُرا زمانہ آگیا ہے۔ تڑکے سے بالٹی لے کر دروازے دروازے جاتا ہوں تب کہیں لٹیا لٹیا جمع کر کے ایک بالٹی دودھ ہو پاتا ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ اس کا یہ جواب سن کر مجھے بہت شرم آئی اور دل میں کہا، لعنت ہے ایسی زمینداری پر۔ خدا کا شکر ہے کہ ١٩٥٢ء میں ہماری آزاد حکومت نے ہمیں اس لعنت اور روز روز کی مقدمے بازیوں کی علت سے آزادی دلائی۔ خس کم جہاں پاک!

عید بقر عید، شب برات کی رونق تو اب بھی بحمداللہ جوں کی توں ہے لیکن ایک کمی کا بری طرح احساس ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر میں دیوالی بھی منائی جاتی تھی۔ ایک مٹی کے گھروندے میں کئی دیے روشن کیے جاتے۔ گاؤں سے کسان کھیلیں بتاشے اور کھانڈ کے بنے ہاتھی گھوڑے لاتے اور ہم خوب کٹر کٹر کھاتے۔ اب یہ کیوں نہیں ہوتا۔؟ کیوں ہولی دیوالی آتے ہی یہ باتیں ہونے لگتی ہیں کہ کہیں فساد تو نہیں ہو گیا، کسی کا گھر تو نہیں جل گیا؟ — ہائے ہائے یہ کیا انقلاب ہو گیا۔؟!!

محرم کی مخصوص طور پر تیاریاں ہوتیں۔ ادھر بقر عید ختم ہوئی اور امامباڑے کھل گئے۔ ان پر قلعی ہونے لگی۔ جھاڑ فانوس لگا کے جلانے

لگے۔ محرم کا چاند نظر آیا اور امام باڑوں پر پنج وقتہ نوبت بجنے لگی۔ امام باڑے کی چھت یا صدر دروازے پر کالا علم لہرانے لگا۔ مجلسیں شروع ہو گئیں۔ کہیں میر انیس کا مرثیہ ہو رہا ہے ؎

فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے

کہیں میر خلیق کا مرثیہ پڑھا جا رہا ہے ؎

جب چلے یثرب سے سبط مصطفےٰ سوئے عراق

پاکستان کے مشہور آرٹسٹ صادقین کے والد سید سبطین احمد صاحب مرحوم سوز خوانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ جب مرزا دبیر کا مرثیہ ؎ گلگونہ رخسار فلک گرد ہے رن کی

شروع کرتے تو سامعین پر ایک محویت کا عالم طاری ہو جاتا۔ رات کو ایک عزا خانے میں سید ظل سبطین صاحب مرحوم نثاری فرماتے اور مجمع پھڑک اٹھتا ——

" حاکیانِ حکایتِ ظلم و ستم و راویانِ روایتِ درد و الم صفحۂ قرطاس پر اس طرح اشک ریز ہیں کہ جب روز عاشور اشقیائے بدنہاد لاشِ قاسم ناشاد پامال سُم اسپاں کر چکے اور خون نوشاہِ نامراد سے سینۂ حسینؑ گلگوں قبا کو لالہ زار بنا کر ایک رات کی دولہن کے ارمانوں کا خون کر چکے تو اس وقت — حضرات — دفورِ الم سے جناب عباسِ علمدار، نورِ چشم صاحبِ ذوالفقار، بے قرار، بچشم اشکبار خدمتِ امام ابرار میں حاضر ہو کر یوں طالب اجازتِ میدانِ کارزار ہوئے کہ ......"

کچھ ایسا ہی ماحول تھا گھر اور گھر سے باہر کا جب سنہ ۴۲ء میں خان بہادر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی پانچویں ریڈر ختم ہو جانے پر، میرا داخلہ سادات امروہہ کے مقامی تعلیمی ادارے امام المدارس ہائی اسکول کی چوتھی کلاس میں کرایا گیا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم چھڑ چکی تھی میونسپل بورڈ نے یہ انتظام کیا تھا کہ سڑکوں پر لگے بجلی کے کھمبوں پر لاؤڈ اسپیکر نصب کرا دیے تھے جن سے ریڈیو کے نشریات سنائے جاتے رہتے تھے اور اس طرح راہ چلتے لوگ جنگ کی تازہ بہ تازہ خبروں سے آگاہ اور قوالیوں، نعتوں اور فلمی گانوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ اختری بائی فیض آبادی (بیگم اختر) کی گائی ہوئی غزل "دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے" غالباً پہلی غزل تھی جس کے ذریعے ہم صنف غزل سے متعارف ہوئے۔ اسکول سے گھر آتے جاتے روز نئی نئی خبریں سننے کو ملتیں۔ آج جاپان نے فلاں شہر پر بمباری کی۔ رات نازی طیاروں نے فلاں شہر کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔

دیواروں پر جگہ جگہ بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے جن میں ہٹلر ایک چیتے کا روپ دھارے دنیا کے گلوب پر پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ برطانوی سامراج کے سب سے بڑے غلام ملک ہندستان کے شہروں پر بھی ہوائی حملے کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ امروہہ میں بھی راتوں کو "بلیک آؤٹ" کیا جاتا اور دن میں جب خطرے کا سائرن بجا کر "ٹیک کوَر" کی مشقیں ہوتیں تو سڑکیں سنسان ہو جاتیں اور "سول گارڈز" سیٹیاں بجاتے ادھر سے ادھر بھاگتے پھرتے۔ معززین شہر کے دیوان خانے "ہوائی حملے کی پناہ گاہ" بنا دیے گئے تھے اور وہ خود "آنریری مجسٹریٹ" جن کا کام یہ تھا کہ ننگے بھوکے ہندستانیوں کو جام، جیلی، مکھن، پنیر کے ڈبے دکھا کر اور کمبل مچھردانی کے دام میں پھنسا کر فوج میں بھرتی کرائیں۔

روزمرہ کی ضرورت کا سامان آٹا، دال، چاول، نمک، شکر، صابن بازار سے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ راشن کی دکانوں کے سامنے بوڑھے، بچے، جوان مٹی کے تیل کی خالی بوتلیں اور ڈبے لیے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہتے۔

غرض ہم اسکول آتے جاتے یہ سب نظارے دیکھتے رہتے خاندان میں ہر طرف ڈاکٹر ہی ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر اظہر حسن (دادا) ڈاکٹر اختر حسن (تائے)، ڈاکٹر محمد احمد (دادا کے چچا زاد بھائی) ڈاکٹر تہور حسن (پھوپھا)، ڈاکٹر مظاہر حسن (والد کے چچا زاد بھائی)، ڈاکٹر علی حسین ڈاکٹر محمد عیوض — اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمیں بھی ڈاکٹر بننے کا بچپن سے شوق تھا۔ امام المدارس میں اس وقت تک سائنس کی تعلیم کا انتظام نہ تھا اس لیے ۱۹۴۵ء میں ہم نے ساتواں درجہ پاس کرنے کے بعد ہندو ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اسی سال اتحادی طاقتوں نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا تو دنیا بھر میں دہشت پھیل گئی۔ ہمارے سائنس ٹیچر کپور صاحب نے ایٹم بم پر ایک لیکچر دیا اور بم کی

تھا سی ساخت بھی۔ اس پروگرام بنا کر ہم لوگوں کو سمجھا دی۔ پرنسپل کرشنا ترپی صاحب اس جلسے کی صدارت فرما رہے تھے۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں ہنستے ہوئے کہا:

"لڑکو! کپور صاحب نے آپ کو ایٹم بم بنانے کا نسخہ تو بتا ہی دیا ہے۔ اب دیر کیا ہے۔؟"

ہم پرنسپل صاحب کے مشورے پر غور کر ہی رہے تھے کہ ہر گلی کوچے سے "کانگریس زندہ باد۔ مہاتما گاندھی زندہ باد۔ جواہر لال نہرو کی جے ہو۔ قائداعظم زندہ باد۔ مسلم لیگ زندہ باد۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندستان" کے نعرے بلند ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اگست ۱۹۴۷ء آگیا اور ۱۵ راگست کو لال قلعہ پر ترنگا لہرانے سے پہلے ہی ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ یہ ملک کا بٹوارہ کیا ہوا، سب کچھ بٹ گیا۔ زبان بٹ گئی، تہذیب بٹ گئی، دل بٹ گئے، خاندان بٹ گئے۔ اُدھر ملتان، لاہور۔ ادھر دلی، دہرہ دون، امرتسر میں فسادات کی وہ آگ بھڑکی کہ الاماں والحفیظ ہر طرف انسانی خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ شیطان ننگا ہو کر ناچنے لگا اور تہذیب و شائستگی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

ہندو کالج کے اساتذہ میں مشہور مزاح نگار مولوی سلطان احمد صدیقی شہباز امروہوی اردو اور فارسی زبانوں کے بے مثل استاد تھے۔ اگرچہ نابینا تھے، لیکن حافظہ فیضی ابوالفضل جیسا پایا تھا، ایک ایک شعر کی تشریح میں درجنوں اشعار اساتذہ کے سنا ڈالتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اُردو زبان و ادب سے جو دلچسپی پیدا ہوئی وہ مولوی صاحب مرحوم ہی کے طریقۂ تعلیم کا فیضان ہے۔ مجھے بچپن سے تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ مولوی صاحب ڈبیٹ کے لیے تقریریں بھی خوب لکھواتے۔ چوں کہ خود شاعر تھے اس لیے حسب موقع شعر موزوں کر کے تقریر میں اس طرح چسپاں کر دیتے کہ تقریر کے زور اور تاثیر میں بڑا اضافہ ہو جاتا۔ کالج میں ہندو طالب علموں کی اکثریت تھی، لیکن ڈبیٹ چاہے اُردو کی ہو یا ہندی کی، ہر جگہ کالج کی نمائندگی ہمیں کو کرنی پڑتی۔ مولوی صاحب اُردو میں تقریر لکھا دیتے اور ہمارے سنسکرت کے پنڈت جی، جن کے جسم پر ہمیشہ ایک لمبا انگرکھا، ماتھے پر چندن کا ٹیکہ اور سر پر لال رنگ کی پگڑیا رہتی، اس تقریر کو شدھ ہندی میں منتقل کرا دیتے۔ مجھے دیوناگری رسم خط نہیں آتا تھا۔ پنڈت جی بولتے جاتے اور میں تقریر اُردو رسم خط میں لکھ لیتا۔ گھر آکر اوپر کے کمرے میں آویزاں ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے ہاتھ چلا چلا کر تقریر کی مشق کی جاتی اور جب ڈبیٹ میں صدر جلسہ کی طرف ہاتھ جوڑ کر ——

"شریمان سبھاپتی مہودے تتھا اُپستھت سجنو! آج کے واد و یواد پرتی یوگتا کا وشے یہ ہے کہ ....." شروع کرتا تو حاضرین جلسہ انگشت بدنداں رہ جاتے کہ ایک مسلمان لڑکا "پرستاوک" اور "انومودک" جیسے کٹھن سنسکرت شبدوں کا پریوگ اپنے بھاشن میں کس سرلتا سے کر رہا ہے۔ اور نتیجہ میں یہ ہوتا کہ مقابلے میں لاکھ کوئی کتنا ہی سر کیوں نہ مارے، انعام ہم ہی کو ملتا۔ ۱۹۴۸ء کا وہ کل ہند مقابلہ آج تک یاد ہے جس کی صدارت ریاست رامپور کے چیف منسٹر کرنل سید بشیر حسین زیدی مرحوم نے فرمائی تھی اور ان کے دست مبارک سے ہم نے ایک بڑا سا چمچماتا ہوا کپ فرسٹ پرائز میں حاصل کیا تھا۔

دلی، دہرہ دون سے فسادات کی خبریں آرہی تھیں لیکن خدا کا فضل ہے کہ امروہہ اس طوفان بے تمیزی سے محفوظ تھا۔ پھر بھی مسلمانوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور وہ گھر بار چھوڑ کر سرحد سے پاکستان کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے خاندان کے بیشتر افراد بھی، جو فوجی یا غیر فوجی سرکاری ملازم تھے، مع اہل و عیال پاکستان منتقل ہو گئے۔ لوگ اپنا اثاثہ اونے پونے داموں بیچ باچ کر چپ چپاتے راتوں رات نکل جاتے اور صبح کو پتہ چلتا کہ رات فلاں چلا گیا فلاں چلا گیا۔ میرے ننہالی رشتہ داروں میں ایک صاحب اُردو کتابوں کے تاجر تھے۔ وہ کتابیں فروخت بھی کرتے تھے اور ایک ایک آنے، دو دو آنے یومیہ کے حساب سے قصے کہانیوں کی کتابیں کرائے پر بھی چلاتے تھے۔ انھیں ڈر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فساد ہو جائے اور ان کی دوکان نذر آتش کر دی جائے، چنانچہ اپنی دوکان کی ساری کتابیں دو بڑے بڑے صندوقوں میں بھر کے ہمارے گھر رکھوا گئے۔ میں اپریل ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول کے امتحان سے فارغ ہوا تو تعطیلات میں وقت گزاری کے لیے یہ قیمتی سرمایہ بغیر کچھ لیے دیئے ہاتھ لگ گیا۔ میں ایک کتاب

نکالتا۔ رات گئے دیر تک پڑھتا اور واپس صندوق میں رکھ دیتا مجھے یاد ہے کہ مچھر ہاتھ پیروں کا خون چوستے رہتے اور میں لالٹین سامنے دھرے "طلسم ہوش ربا" میں کھویا رہتا۔ اس طرح دو تین مہینے کے اندر قصے کہانیوں کی درجنوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔

اردو زبان سے دل چسپی پیدا کرنے میں ان مجالس عزا کا بھی بڑا ہاتھ ہے جن کا سلسلہ امام علیہ السلام کے چہلم تک زور و شور سے جاری رہتا۔ دور دور سے ذاکرین اربعین کے زمانے میں امروہے آتے اور بڑے معرکے کی تقریریں ہوتیں۔ ان میں تفسیر قرآن بھی ہوتی، فلسفہ بھی تاریخ اسلام بھی اور مصائب امام حسین علیہ السلام بھی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس شخص نے دس پندرہ سال تک مولوی سید ابن حسن صاحب قبلہ نوہروی مرحوم کی تقریریں سن لی ہوں ممکن نہ تھا کہ اسے اردو زبان پر عبور نہ حاصل ہو جائے۔ واللہ! مرحوم نے کیا زبان پائی تھی، کیا خطابت تھی، کیا انداز بیان ہوتا تھا۔ اگر کہیں حضرت علی کی بت شکنی کا ذکر آجاتا تو پتھر کے تعلق سے سارے کے سارے محاورے اپنی تقریر میں صرف کر دیتے۔ مجمع جھوم جھوم اٹھتا اور واہ واہ! سبحان اللہ، جزاک اللہ کی صداؤں سے عزاخانے کے در و دیوار گونجنے لگتے۔

ہندو کالج سے ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میں رام پور چلا گیا، جہاں میرے والد محکمۂ حفظان صحت میں ایک دیہی ڈسپنسری کے انچارج تھے اور رام پور جاکر انٹر سائنس میں داخلہ لے لیا، مگر عین امتحان کے دوران کاربون میں فریکچر ہو گیا۔ میں امتحان نہ دے سکا اور امروہے آگیا۔ جہاں اپنے پرانے ادارے ہندو انٹر کالج سے (جو اب پوسٹ گریجویٹ کالج بن چکا ہے) ہسٹری، سوکس اور اردو لے کر ۱۹۵۲ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔ رام پور کی ملازمت ختم ہونے کے بعد اب میرے والد صاحب علی گڑھ آچکے تھے اور یونیورسٹی ہاسپٹل میں ملازم تھے۔ اس طرح مجھے تعلیم جاری رکھنے کا موقع مل گیا اور ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بی اے کلاس میں داخلہ لے لیا۔ یہاں انگریزی ادبیات اور سیاسیات کے ساتھ تاریخ بھی میرا ایک اختیاری مضمون تھا۔ تاریخ کے استاد پروفیسر خلیق احمد نظامی کے لیکچر آج تک یاد آتے ہیں۔ التمش اور بلبن کے کارنامے علاؤالدین خلجی کے معاشی اقدامات، محمد تغلق کے وہ کام جن کی بنا پر وہ تاریخ میں پاگل مشہور ہو گیا۔ فیروز شاہ تغلق کا انتظام سلطنت اور عوامی فلاح و بہبود کے اقدامات۔ یہ سب کچھ ایسے عالمانہ انداز میں پڑھایا کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک ذہن میں محفوظ ہے اور یہی ایک کامیاب لیکچرر کی پہچان ہے۔

والد اگرچہ ملازم تھے لیکن تنخواہ اتنی کم تھی کہ گھر کے مصارف مشکل ہی سے پورے ہو پاتے تھے۔ اس لئے والد کی مرضی کے خلاف میں نے ایم اے میں داخلہ لینے کے بجائے بی ایڈ کو ترجیح دی، تاکہ جلد سے جلد تعلیم مکمل کر کے برسر کار ہو جاؤں اور گھر کی مالی مشکلات میں والد کا کچھ ہاتھ بٹا سکوں۔

یہ ۵۴-۵۵ء کی بات ہے۔ سٹی ہائی اسکول میں ٹیچنگ پریکٹس چل رہی تھی۔ ایک روز نویں جماعت کو انگریزی کی ایک نظم پڑھا کر کمرے سے باہر آیا تو پرنسپل محمد اکرم صدیقی صاحب (خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) میرے پیچھے پیچھے آئے اور بڑی شفقت سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا:-

"مسٹر! میں دیکھ رہا ہوں، اس بیچ میں آپ سب سے اچھا پڑھا رہے ہیں۔ بی ایڈ کرنے کے بعد ہمارے اسکول میں کوئی جگہ نکلے تو اپلائی کیجئے گا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اگست ۱۹۵۵ء میں جب سٹی اسکول کے لیے ایک سکنڈ گریڈ ٹیچر کی جگہ کا اشتہار نکلا تو اکرم صاحب مرحوم نے مجھے پھر یاد دہانی کرائی اور جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ یعنی ایک عارضی ٹیچر کو (جو اب میرے قریبی دوستوں میں سے ہیں) ہٹا کر میرا تقرر ان کی جگہ پر کر دیا تنخواہ اگرچہ صرف ایک سو دس روپے ماہوار تھی، لیکن والد کی اور میری تنخواہ کل ملا کر ڈھائی سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے اور گھر کی گزر بسر فراغت سے ہونے لگی تھی۔ چیزوں کی قیمتیں بھی کم تھیں۔ گیہوں پندرہ سولہ روپے کا ایک من، شکر اور دالیں بھی کوئی روپے سوا روپے فی سیر، بناسپتی گھی دو سوا دو روپے کا ایک سیر مل جاتا تھا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ مجھے بی۔ اے اور بی۔ ایڈ کی چار پانچ لڑکیوں کے ٹیوشن مل گئے۔ اس ٹیوشن بازی میں صبح سے شام تک بھاگ دوڑ تو بہت کرنی پڑتی۔ لیکن گھر کی

ماہانہ آمدنی میں کم از کم چار سو روپیے کا اضافہ ہوگیا۔ پھر تو الٹے تلے ہوگئے اس آمدنی میں اتنا کچھ پس انداز کر لیا کہ جولائی ۱۹۵۸ء میں ہماری اور ہماری چھوٹی بہن کی شادی ایک ہی ہفتے میں چار پانچ دن کے فرق سے ہوگئی۔ بیوی کا نام بلقیس فاطمہ بنت سید محمد ارزانی صاحب مرحوم محلہ بنگلہ امروہہ (ولادت یکم ستمبر ۱۹۴۰ء)

دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۵۹ء میں میں نے ٹیچر امیدوار کی حیثیت سے اردو میں ایم۔اے پاس کرلیا اور فرسٹ ڈویژن کے ساتھ فرسٹ پوزیشن بھی حاصل کی۔ اب سوچا کیوں نہ پی ایچ۔ ڈی بھی کرلیا جائے صدر شعبۂ اُردو پروفیسر آل احمد سرور کے مشورے پر "وحیدالدین سلیم: حیات اور ادبی خدمات" تحقیق کا موضوع طے پایا۔ حضرت مجنوں گورکھپوری علی گڑھ "تاریخ ادب اُردو منصوبے" کے تحت بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوچکے تھے، وہ میرے نگراں مقرر ہوئے۔ میں نے سٹی اسکول سے دو سال کی رخصت بلا تنخواہ لے لی اور یکسوئی سے ریسرچ کے کام میں لگ گیا۔

دو سال ختم ہونے پر میرا مقالہ مکمل ہوگیا اور ۱۹۶۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ مجنوں صاحب کی عالمانہ گفتگو اور مشوروں سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مرحوم بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ان کا تلمذ میرے لیے باعثِ افتخار رہے۔ ۱۹۶۲ء میں پی ایچ۔ ڈی مکمل ہونے کے ساتھ ہی کچھ ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ مجھے شعبۂ اردو میں لیکچرر کی جگہ مل جاتی۔ لیکن مقابلے میں راہی معصوم رضا مرحوم بازی مار لے گئے۔ ان کا عارضی حیثیت سے بحیثیت لیکچرر تقرر ہوگیا اور میں بدستور سٹی ہائی اسکول میں انگریزی اور اُردو پڑھاتا رہا۔

۱۹۶۵ء میں جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے میرا انتخاب ہوگیا تھا لیکن سلیکشن کمیٹی کے ہفتہ عشرہ بعد ہی انڈو پاک جنگ چھڑ گئی اور یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ دوسرے سال یعنی نومبر ۱۹۶۶ء میں سرور صاحب قبلہ کی عنایت سے میرا تقرر بحیثیت لیکچرر شعبۂ اُردو میں ہوگیا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ میری ادبی شخصیت کی تعمیر میں سرور صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہی کی حوصلہ افزائی نے مختلف ادبی موضوعات پر مضامین لکھوائے۔ انھیں مختلف مذاکرات میں پیش کیا۔

یہ مقالات ادبی رسائل اور مختلف مجموعوں میں شائع ہوئے اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ غرض ہمارا شمار بھی پڑھے لکھے لوگوں میں ہونے لگا — حقیقت اس میں کتنی ہے، اس کا فیصلہ قاری ہی بہتر طور پر کرسکتا ہے۔

۱۹۷۵ء میں پروفیسر خورشیدالاسلام صاحب کے دورِ صدارت میں ترقی پاکر ریڈر ہوا اور آٹھ سال مکمل ہوجانے پر یکم جنوری ۱۹۸۳ء کو پرسنل پروموشن اسکیم کے تحت میرا تقرر شعبے میں پروفیسر کی حیثیت سے ہوگیا۔ ۳۱ جولائی ۱۹۹۰ء کو پروفیسر قاضی عبدالستار صاحب کے ملازمت سے سبکدوش ہوجانے پر شعبۂ اردو کی سربراہی میرے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو تاحال انجام دے رہا ہوں۔

شعبۂ اُردو ایک بڑا شعبہ ہے۔ اساتذہ اور طلباء دونوں کی تعداد کے اعتبار سے بھی ہے اور بحمداللہ اپنے علمی و ادبی معیار کے لحاظ سے بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ شعبے کے انتظامی امور میں مجھے سب ہی ساتھیوں کا پورا تعاون حاصل ہے۔

اولاد میں بحمداللہ تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی نجم السحر (ولادت ۱۹۶۱ء) جس کی ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں شادی ہوگئی اس کے شوہر امام مجتبیٰ نقوی جیولوجیکل سروے آف انڈیا میں جیولوجسٹ ہیں۔ تین نواسیاں کلثوم زہرا (پونم) کنیز زہرا (سونم) اور بتول زہرا (ریشم) بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ خدا ان کی عمریں دراز کرے۔ دوسری دو بیٹیاں نسیم السحر (ولادت ۱۹۶۵ء) اور زیب السحر (ولادت ۱۹۶۹ء) ابھی زیر تعلیم ہیں۔ ایک ایم۔اے دوسری بی۔ایڈ کر رہی ہے۔

ایک وقت تھا گھر دعائیں دینے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب بزرگ ایک ایک کرکے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب سوائے ایک بڑی بہن کے جو عمر میں مجھ سے تین سال بڑی ہیں، کوئی نہیں جسے سلام کیا جائے۔ ماشاءاللہ ہر طرف ہمیں کو سلام کرنے والے ہیں۔ اور تو اور ایک بیس سال چھوٹا بھائی حسن عباس جسے گودوں میں پالا تھا، پڑھایا لکھایا تھا، ۱۳ اپریل ۱۹۹۰ء کو عارضۂ قلب میں مبتلا ہوکر داغِ مفارقت دے گیا۔ خدا اس کے بچوں کی دستگیری فرمائے اور عمریں دراز کرے۔

میں عمل کے اعتبار سے صفر، لیکن عقیدے کی رو سے پکا مسلمان ہوں کیونکہ "لا الٰہ الا اللہ" میرا ۵۲۲۶ ہر ہے اور اللہ کے سوا کسی دوسرے

کے آگے سر جھکانے یا اس سے طالب استعانت ہونے کو اشرف المخلوقات کی توہین خیال کرتا ہوں۔ یونیورسٹی کے ہر فارم داخلہ اور فارم امتحان میں مذہب کے خانے میں اسلام اور اس کے آگے شیعہ لکھا جاتا رہا ہے۔ شیعیت اگر حضرات محمد اور آل محمد صلواۃ اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کی محبت سے عبارت ہے تو پکا شیعہ بھی ہوں۔ تاریخی حقائق عقائد سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ فقہی تفصیلات اجتہادی ہیں نہ کہ اساسی، ان میں افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، تاکہ اختلافات ممکنہ حد تک کم ہوسکیں۔ دنیاوی معاملات میں ہندو، مسلمان، سنی، شیعہ، وہابی، بریلوی، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی۔ یہاں تک کہ کسی کٹر دہریے سے بھی کسی قسم کی تفریق روا رکھنا یا امتیازی سلوک کرنا میرے مسلک میں حرام ہے ــــ ان معاملات کا فیصلہ صرف اور صرف "انصاف" کی ترازو پر ہونا چاہیے ــــ زندگی می گزرد، بقول غالب ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

خود نوشت ان لوگوں کو زیب دیتی ہے جنھوں نے زندگی میں کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔ یہاں تو عمر بھر میں نہ عقل ہی کا کوئی معرکہ جیتا، نہ عشق ہی کی کوئی مہم سر کی۔ ایک "گل محمد" قسم کا کاہل بے عمل، اَن سوشل، دائم المرض انسان جسے صرف باتیں بنانا آتا ہے سائیکل تک چلانا نہیں آتا (پھر عشق و مشق کا چکر کیا چلاتا!)۔ وہ تو کہیے بھائی سید امجد حسین صاحب ایڈیٹر "نیا دور" کا اصرار تھا جس نے یہ چند باتیں، کچھ اپنے، کچھ اپنے بزرگوں اور کچھ اپنے گردوپیش کے بارے میں قلم بند کرادیں تاکہ سند رہیں، اور بوقت ضرورت (جس کا امکان ذرا کم ہی ہے) کام آویں۔

□□

حواشی:

۱؎ یہی شاہ ولایت سید حسین شرف الدین [ولادت ۶۴۰ھ (۱۲۴۲ء) بمقام واسط (عراق)، وفات ۱۴ر رجب ۷۲۹ھ (۱۳۲۸ء) بمقام امروہہ] مورث اعلیٰ ہم سادات نقویہ کے ہیں۔

سلسلہ نسب آپ کا یوں ہے: سید حسین شرف الدین بن سید علی بزرگ واسطی (متولد ۵۹۴ھ مقام واسط (عراق)، بن سید مرتضیٰ (متوفی ۶۴۴ھ) بن سید ابوالمعالی (ولادت ۵۰۵ھ بمقام واسط)، بن سید ابوالفرح واسطی (ولادت ۴۶۱ھ بمقام صیدا (شام)، بن سید داؤد (ولادت ۴۱۴ھ وفات ۴۹۶ھ)، بن سید حسین (ولادت ۳۸۰ھ وفات ۴۴۹ھ)، بن سید علی (ولادت ۳۴۲ھ وفات ۴۳۸ھ بمقام صیدا)، بن سید ہارون (ولادت ۲۹۴ھ وفات ۳۶۵ھ)، بن جعفر ثانی (ولادت ۲۴۶ھ وفات ۳۴۲ھ) بن امام علی نقی الہادی علیہ السلام (ولادت ۲۱۲ھ شہادت ۲۵۴ھ) الیٰ آخرہ۔

۲؎ حضرت شاہ ولایتؒ جن کی اولاد میں شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی، سب ان کو "دادا سے جی" کہتے ہیں۔ زندہ کرامت دادا سے جی کے مزار کی یہ ہے کہ اس احاطے میں پائے جانے والے بچھو نیش زنی نہیں کرتے۔ مزار مبارک ہزاروں عقیدت مندوں کا بلا اختلاف مذہب وملت مرجع ہے۔ ۱۹ر سے ۱۲ر رجب المرجب تک ہر سال شان دار پیمانے پر عرس منایا جاتا ہے، جس میں قل کے وقت دادا سے جی کی شیعہ اولاد بھی اپنے دینی مسلک کے خلاف سر پر رومال اور سینے پر ہاتھ باندھے بیٹھی رہتی ہے ــــ منظر

۳؎ حضرت شاہ ولایت کے صاحبزادے سید عبدالعزیز جن کا عقد سلطان فیروز شاہ تغلق کی بیٹی سے ہوا تھا۔

۴؎ سدھائی (یا حماقت؟) میں بحمداللہ اب بھی کمی نہیں، اس کے باوجود کہ نہ وہ معافیاں رہیں نہ معافیداری، نہ دولت نہ ثروت۔ چنانچہ صاحبزادی کی رسم کتخدائی ہو یا صاحبزادے کی شادی کا ولیمہ، "بالے" کا عقیقہ ہو یا "آپا کا چالیسواں" دیگیں اب بھی کھنکے جاتی ہیں۔ قورمے بریانی کی خوشبو سے حویلی، دالان اور چیل کوؤں سے آسمان آباد رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ "میر صاحب" اس بازار سے کچھ عرصہ کے لیے گزرنا ترک کردیتے ہیں جہاں سے جنس کی خریداری ہوئی تھی، اس خوف سے کہ مبادا ابھی کچھی عزت سادات "بھی کہیں نذر لالہ رام سرن داس سٹنڈن نہ کرنی پڑ جائے۔ (نوٹ: مشارٌالیہ اس تبصرے کے "سادات امروہہ ضلع مراد آباد" ہیں نہ کہ ممبرانِ (۱۵، جم ۱)

لیں

یوں بھی خالی نہیں گھر بے سر و سامانی سے
اس پہ آباد اسے کرتے ہیں ویرانی سے

کی اگر ترک خودی بھی تو خدا بن بیٹھا
باز آتا بھی ہے زاہد کہیں شیطانی سے

یہی آنکھیں جو نظر آتی ہیں اتنی ویران
انھیں آنکھوں میں تھے کیا خواب پرستانی سے

ذہن روشن مگر افکارِ سیہ سے وہ بھی
شہر آباد مگر غولِ بیابانی سے

دل کہیں، دھیان کہیں، جسم کہیں، جان کہیں
کہ عبارت ہے مرا نظم پریشانی سے

کیوں زمانے پہ بھی کچھ ان کی نظر ہے کہ نہیں
لوگ کیا دیکھ رہے ہیں مجھے حیرانی سے

کاٹ دی ہم نے بھی فی الجملہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ
لطف کیا کیا نہ لیے اک غمِ پنہانی سے

کیا تماشا ہے کھلا اتنا ہی وہ بھی عرفی
جس قدر آپ ملبّس ہوئے عریانی سے

عرفی آفاقی

۱۰/سی-۱۲، ریلوے کالونی
بادشاہ نگر، لکھنؤ

ازل کی پہلی کرن پہلا حادثہ بھی میں
تجھے پتہ ہے ترے سچ کی ابتدا بھی میں

عذابِ گم شدگی سخت مجھ پہ تھا ہر چند
پکارتا مجھے کوئی تو بولتا بھی میں

وہ اپنے خوف کی تردید کرنے والا ہے
فصیلِ ہو سے گرا دوں کوئی صدا بھی میں

نظر بھی رکھتا ہوں میں اپنی تیز گامی پر
غبارِ راہ کو دیتا ہوں راستہ بھی میں

بہت بسیط خلا ہے کہاں سراغ ملے
ستارہ تھا تو کہیں ٹوٹ کر گرا بھی میں

نہ جانے میرے لیے اس کا فیصلہ کیا ہو
جزا کا حق بھی مرا لائقِ سزا بھی میں

فروغِ رنگ فضا کی بلندیوں پہ کبھی
کہیں کھنڈر میں لرزتا ہوا دیا بھی میں

ہے تیز گردشِ پرکارِ وقت میرے لیے
بساطِ جاں پہ نشانِ رمِ ہوا بھی میں

مری غزل میں ہیں روشن دھنک کے ساتوں رنگ
فرازِ حرف پہ ہوں اپنی اک فضا بھی میں

محمد احمد رمز

۱۹۶/۳۰ - ترلوک پوری ۔ دہلی
۱۱۰۰۹۱

سید شاہد نقوی

مرزا جعفر حسین کا آخری انٹرویو

برِ صغیر کے صاحبِ طرز ادیب، ممتاز صحافی اور تحریکِ آزادی کے سرگرم کارکن مرزا جعفر حسین کا ۹۲ سال کی عمر میں ۲ جولائی ۱۹۸۹ء کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ یہ انٹرویو راقم الحروف اور ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی (صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) نے ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جبلی کانفرنس (۱۹۸۶ء) منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر مرزا صاحب سے لیا تھا۔ غالباً یہ اُن کا آخری انٹرویو تھا۔

شاہد: ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ حالیہ آپریشن (اپنڈکس) کے بعد جبکہ آپ کی صحت پوری طرح بحال بھی نہیں ہے آپ نے یہ زحمت گوارا فرمائی کہ اپنے عہد کے کچھ اہم واقعات پر آپ روشنی ڈالیں گے۔

مرزا صاحب: اب تم مجھے خاصا بہتر دیکھ رہے ہو۔ ایک تو طویل عمری ہی سب سے بڑی بیماری ہے، اس پر مستزاد کہ آپریشن کی صعوبت بھی اٹھا چکا ہوں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ یا تو بستر ہے، جس پر دراز رہتا ہوں یا جب لیٹے لیٹے طبیعت اکتا جاتی ہے تو اس کرسی پر بیٹھ کر تھوڑا وقت گزار لیتا ہوں۔ مہینے میں ایک آدھ بار گھر سے باہر بھی نکلنا ہو جاتا ہے۔ زیادہ دیر گفتگو نہیں کر سکتا۔ تمھاری محبت کا ممنون ہوں۔ پاکستان سے صرف تمھارے اور مرزا اظہر برلاس کے خطوط برابر آتے رہے مگر میں کسی کو جواب نہ دے سکا۔

شاہد: قبل اس کے کہ گفتگو کو آگے بڑھایا جائے، آپ کو ایک افسوس ناک خبر سنانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ ہمارے وفد کے قائد سید سبطِ حسن جو گولڈن جبلی کانفرنس کی تقریبات کے سلسلے میں ہندوستان آئے ہوئے تھے، دلی میں اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ یہ خبر ابھی ابھی آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن سے ملی ہے۔

مرزا صاحب: حقیقتاً بڑی افسوس ناک خبر ہے، مجھے سخت صدمہ ہوا۔ سبطِ حسن صاحب نے کافی عرصہ لکھنؤ میں گزارا تھا۔ ہمارے بڑے ہونہار نوجوانوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے خاص اور چہیتے شاگرد تھے۔ سردار جعفری مجاز وغیرہ کے ساتھیوں میں تھے۔ اس زمانے میں اکثر ان سے ملاقاتیں رہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی شہر سے انھوں نے "پرچم" کا اجرا کیا، جو کافی مقبول ہوا اور آزادی کے بعد میرا ہفت روزہ اخبار بھی اسی شہر میں اسی نام سے نکلتا رہا۔ سبطِ حسن غالباً پانیر یا نیشنل ہیرالڈ سے

بھی کچھ عرصہ منسلک رہے۔ مارکسی فکر کے مبلغ تھے اور صحافتی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ان کے طرز استدلال کا دھیماپن بڑا پرکشش تھا۔ یہ صفت دوسرے انقلابی نوجوانوں میں بہت کم تھی۔ افسوس صحت اس امر کی اجازت نہ دے سکی کہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شریک ہوتا اور نہ کئی جاننے والوں سے ملاقات ہو جاتی۔ ان کی موت کا بہر حال افسوس ہے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

(نوٹ: یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کانفرنس کے دوران جب مرزا جعفر حسین کا تذکرہ سید سبط حسن سے ہوا تو انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر موقع ملا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ مگر بدقسمتی سے یہ ملاقات نہ ہو سکی۔)

شاهد: مرزا صاحب! آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس مرتبہ میرا آنا ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جبلی کانفرنس کی تقریبات کے سلسلے میں ہوا ہے لہٰذا اس حوالے سے آپ کی توجہ ترقی پسند مصنفین کی تاسیسی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جو ۱۹۳۶ء میں آپ ہی کے دولت کدے کے قریب رفاہ عام کلب میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کا ادبی حلقوں میں کیا ردعمل ہوا تھا۔

مرزا صاحب: اس کانفرنس کے انعقاد کے وقت یا اس کے فوری بعد کوئی خاص ردعمل نہیں ہوا۔ میں خود اس کانفرنس میں شریک تھا۔ کوئی بہت بڑا مجمع بھی نہیں تھا۔ البتہ پڑھے لکھے نوجوان خاصے سرگرم نظر آتے تھے۔ بنّے پیش پیش تھے۔ خیر بنّے (سجاد ظہیر) تو بنیاد رکھنے والوں میں تھے۔ لکھنؤ کے بیشتر پرانے خیال کے شاعروں اور ادیبوں نے سرد مہری دکھائی۔ ہاں بعد میں اس کے گہرے اثرات ضرور مرتب ہوئے۔ جس کا ثبوت تم لوگوں کی پچاس سال بعد بھی اس تحریک میں تسلسل کے ساتھ دلچسپی رکھنا ہے۔

ڈاکٹر محمود الحسن: احتشام حسین، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری مسعود حسن رضوی ادیب، شوکت تھانوی، اثر، سراج وغیرہ جیسے حضرات کا ردعمل کیا تھا؟

مرزا صاحب: احتشام حسین تو ان نوجوان ادیبوں کے سرخیل تھے جو نہ صرف کانفرنس سے متاثر تھے بلکہ وہی نظریات رکھتے تھے جو اس کے بانیان کے تھے۔ بعد میں احتشام حسین نے بحیثیت مارکسی نقاد بڑا نام کمایا۔ ان کی خدمات بھی بہت ہیں۔ احتشام حسین کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ رجعت پرستوں اور قدامت پسندوں کی نظر میں بھی ان کے احترام میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ اسی طرح حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر اشرف، جوش، مجاز، ڈاکٹر علیم، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، عمر انصاری کا تعلق بھی ترقی پسند مکتبۂ فکر سے تھا۔ اور یہ لوگ شریک تھے۔ مگر دوسرے حضرات کو تامل رہا۔

شاهد: "انگارے" کی اشاعت نے، جس کے لکھنے والوں میں سجاد ظہیر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ تھے پورے ہندستان میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور ترقی پسند تحریک اور اس کے ادیبوں شاعروں وغیرہ کے خلاف ایک محاذ کھل گیا تھا آپ اس سلسلے میں اس وقت کے حالات پر کچھ اظہار خیال فرمائیں گے۔؟

مرزا صاحب: دراصل اس زمانے میں مذہب پرستی بہت تھی اور عام لوگوں نے اسے بدتہذیبی پر محمول کیا۔ خود میرے عزیز دوست اور بنّے میاں کے بڑے بھائی علی ظہیر نے اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس عہد میں جس میں اخلاقیات ہر چیز پر فائق تھی، اس لب و لہجہ اور انداز بیان کو درشت و نامناسب سمجھا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک اکثریت اس کی مذمت میں لگ گئی۔ سچ پوچھو تو ان تحریروں پر لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ انھیں بالکل توقع نہ تھی کہ نئی نسل قدامت پرستی اور مروجہ اقدار زندگی کی ایسی تضحیک کر سکے گی۔ البتہ نوجوان نسل اور کشادہ ذہن رکھنے والوں میں ملا جلا ردعمل تھا۔ جوش کی

شاعری پہلے ہی زمین ہموار کرنے میں لگی تھی، خودساختہ مذہبی ٹھیکیداروں پر ان کے تابڑتوڑ حملے، فرنگیوں کے خلاف جذبۂ بغاوت کو ابھارنا اور سماجی برائیوں نیز فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ان کی شاعری سرگرمِ عمل تھی جسے فرسودہ خیالات کے حامل لوگ ناپسند کرتے تھے۔ جوش پر کفر کے فتوے بھی لگے مگر 'انگارے' نے کچھ اس سے زیادہ ہی آگ لگادی تھی۔ بعد میں بہت سی ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن کا لہجہ 'انگارے' سے بھی زیادہ سخت تھا، مگر یہ رسالہ چونکہ پہلی بار شمشیرِ برہنہ لے کر میدان میں کودا تھا لہٰذا ردِعمل شدید تھا۔

ڈاکٹر محمودالحسن: مرزا صاحب! 'انگارے' پر ردِعمل آپ نے بیان فرمایا۔ یہ بتائیے کہ مجموعی طور پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں ترقی پسند تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ 'انگارے' سے ممکن ہے تھوڑا سا دھچکا لگا ہو مگر چوں کہ یہ تحریک زندگی، سماج، معاشرت، اخلاق، سیاست و ثقافت پر حقیقت پسندانہ بلکہ سائنٹیفک سوچ رکھتی تھی۔ لوگوں کو اس نے سوچنے پر ضرور مجبور کردیا ہوگا۔

مرزا صاحب: جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، اس زمانے میں مذہب پرستی کا دوردورہ تھا، جاگیردارانہ معیشت و معاشرت تھی، اخلاقیات کی اساس بھی کچھ اسی نظام کی رہینِ منت تھی لہٰذا نئے رجحانات اور جدید فکر کو قبول کرنے میں عام تامل تھا۔ مسن ادیبوں اور شاعروں کی بہ نسبت نوجوان تعلیم یافتہ طبقے میں اس فکر کی پذیرائی زیادہ ہوئی۔ ویسے جوانی چونکہ خود انقلاب انگیز ہوتی ہے، یہ انقلابی خیالات نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہوئے۔ پرانے خیالات کے لوگ جان بوجھ کر دوردور رہے۔ معدودے چند پرانے ادیب تو ضرور اس فکر کے حلقہ بگوش نظر آئے مگر اکثریت کو تامل ہی رہا۔ دراصل پرانی روایات کے حامل ادیبوں کو اس وقت بھی وہی استعارے، تشبیہات، رموز و کنائے بہتر نظر آئے جو انھوں نے وراثت میں پائے تھے اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگ کس قدر میراث پسند ہیں۔ نئی شاعری اور نیا ادب ان حضرات کو کچھ ننگا ننگا سا لگا، اور اسے انھوں نے محض سیاسی اور پروپیگنڈے کا ادب قرار دیا جبکہ اصل صورت حال اس سے مختلف تھی۔ آزادی کی تحریک نے ہماری پوری سماجی زندگی کو بدل ڈالا تھا۔ ادب اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان بیچاروں کا بھی قصور نہیں کیوں کہ وہ حقیقت پسندی اور زندگی کو برتنے میں دیکھنے کے عادی بن چکے تھے۔ سائنٹیفک سوچ تو بہت دور کی بات ہے۔

شاھد: مرزا صاحب! آپ سیاسی حیثیت میں تو ایک ایسی جماعت سے وابستہ رہے جو سوشلزم کی پرچارک تھی، دوسری جانب آپ فرقہ وارانہ تنظیم آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی رہے، ادب میں روشن خیالی کی تبلیغ بھی کی اور ترقی پسند تحریک سے تامل بھی برتا۔ آخران روئیوں پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے۔؟

مرزا صاحب: تمھارا یہ کہنا کہ ترقی پسند تحریک سے میں نے تامل برتا صحیح نہیں ہے، میری سوچ، فکر اور تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ میں تمام عمر فرسودہ روایات کے خلاف مسلسل جنگ لڑتا رہا۔ ترقی پسندی کی اصطلاح تو بعد کی پیداوار ہے میں نے زندگی کا وہی رُخ پیش کیا جو میرے مشاہدے اور تجربے میں آیا۔ غلط بات کو برملا غلط کہا اور لکھا۔ لوگوں کی ناراضگی بھی مول لی مگر خلافِ عقل و ضمیر کوئی بات نہ کی۔ اب اس کے علاوہ اگر ترقی پسندی کوئی اور چیز ہے تو ہوا کرے۔ ادیب اور صحافی دونوں حیثیتوں میں میں نے زندگی اس کے مسائل انسانی دکھ سکھ کو محسوس کیا اور اپنی بساط بھر اسے پیش بھی کیا۔ رہی سیاسی وابستگی تو میں ایک ایسی پارٹی میں شامل تھا جو جمہوریت سوشلزم، سیکولرازم کی حامی تھی اس پارٹی میں میں نے تمام عمر گزاری ہے اور آخری سانس تک اس سے رفاقت قائم رہے گی

کیا میرا یہ مسلک اور نظریہ کسی بھی اعتبار سے قدامت پسندانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ مذہبی وابستگی کے باوجود تنگ نظری کو پاس نہیں پھٹکنے دیا اور مذہبی پلیٹ فارموں سے فرقہ پرستی کی کھل کر مذمت کی۔ آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس میں شمولیت بھی اسی مقصد کے پیش نظر تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت مسلم لیگ میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت تھی جس میں شیعہ بھی شامل تھے، میں کانگریس ہی سے وابستہ رہا جو سوشلسٹ معیشت کے نظریات رکھتی تھی اور فرسودہ جاگیردارانہ نظام کی مخالف تھی۔ شیعوں اور سنیوں دونوں ہی میں نیشنلسٹوں کا ایک حلقہ تھا، جس کے اپنے نظریات تھے جو یقیناً مسلم لیگ سے نہیں ملتے تھے۔ یہی کیفیت کچھ ادبی دنیا میں بھی تھی۔ ادب نہ کانگریسی ہوتا ہے نہ مسلم لیگی۔ اس کی جڑیں سماج اور انسانوں میں ہوتی ہیں۔ جو ادب انسان کے جذبات اور امنگوں کی ترجمانی نہ کرے وہ ادب کی تعریف سے خارج ہے۔ میرا ہمیشہ یہی مطمح نظر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمود الحسن: ہم ابھی اتر پردیش اردو اکادمی سے آرہے ہیں جہاں شاہد کے شعری مجموعے "سوغات" کی رسم اجرا تھی مگر سبط حسن صاحب کے ناگہانی انتقال کی خبر سے یہ تقریب ایک تعزیتی جلسے میں بدل گئی۔ شاہد شروع ہی سے آپ سے بہت متاثر رہے ہیں ان کے مجموعے کا بھی آپ نے مطالعہ کیا ہوگا، اس پر کچھ ارشاد فرمایئے گا؟

مرزا صاحب: شاہد کو میں بچپن سے جانتا ہوں ان کے والد میرے ہم پیشہ وکیل اور دوستوں میں تھے۔ میں نے تم سے وعدہ بھی کیا تھا کہ "سوغات" پر کچھ لکھوں گا مگر گرتی ہوئی صحت اور بینائی مانع رہی۔ وعدہ اب بھی برقرار ہے اور میرا جی بھی ان پر لکھنے کو چاہتا ہے۔ مجھے شاہد کی شاعری میں جو بات اچھی لگی۔ وہ ان کا کلاسیکیت سے لگاؤ ہے ان کی نظموں اور غزلوں میں یہ رنگ کافی جھلکتا ہے۔ نواب عالم اور ممتاز جیسے مذہب پرستوں کے دوست ہوتے ہوئے بھی ان کے رنگ ڈھنگ الگ ہی تھے۔ یہ دوران تعلیم تقریباً روز شام کو میرے یہاں آتے تھے۔ ان کا کلام میرے خیال میں جیسا ہونا چاہیئے تھا ویسا ہی ہے ان کی فکر آج بھی وہی ہے جو لکھنؤ میں رہتے ہوئے تھی۔ انھوں نے مجھے کبھی بھی ناامید نہیں کیا۔ یہ ان کی محبت ہے جو آپ کے بقول یہ مجھ سے شروع سے متاثر ہیں۔ حالاں کہ میرے یہاں کی نشست و برخاست میں شریک ہونے والوں کو احتراز برتنے کی تلقین کی جاتی تھی مگر محفلوں میں ہمیشہ اضافہ ہی رہا۔

شاہد: جی تو نہیں چاہتا کہ سلسلۂ فیض منقطع ہو مگر آپ کی صحت بھی پیش نظر ہے لہذا زیادہ زحمت نہ دوں گا۔ آپ کا حلقۂ احباب میری دانست میں ہمیشہ ان لوگوں پر مشتمل رہا جو فکری اعتبار سے فراخ دل، کشادہ ذہن اور ترقی پسند سوچ رکھتے تھے مثلاً لال بہادر شاستری، مہابیر پرشاد، رفیع احمد قدوائی، مولانا آزاد، جوش، حیات اللہ انصاری، مجاز احتشام حسین، سجاد ظہیر، جے پرکاش، علی ظہیر اور دوسرے بہت سے لوگ جو سوشلزم کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے مگر آپ نے کبھی علانیہ طور پر اپنے کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ کیا۔

مرزا صاحب: پہلے تو یہ سن لیجئے کہ جوش تقریباً میرے ہم عمر اور گہرے بے تکلف دوست تھے۔ خلوت اور جلوت دونوں کے۔ ان کی تمام بزم آرائیاں اسی غریب خانے پر ہوتی تھیں اور جو نام آپ نے لیے اس میں سے بیشتر ان محفلوں میں شریک بھی ہوتے تھے لیکن سب سے جوش جیسے مراسم نہیں تھے احتشام حسین مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لہذا تعلقات میں حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ اردو ادب کے نیر درخشاں تھے۔ سنجیدہ، پروقار، کم گو، شریف النفس

ادبی رشتے کے علاوہ میرے پڑوسی بھی تھے۔ میرے یہاں غروب آفتاب سے پہلے آنا پسند کرتے تھے۔ میں بھی جب کبھی موقع ملتا ان کے یہاں جاتا تھا۔ رہے سجاد ظہیر، تو ان کے بڑے بھائی علی ظہیر میرے دوست تھے۔ لہٰذا بنّے میاں سے تعلقات میں چھوٹائی بڑائی حائل رہی۔ مجاز، حیات اللہ انصاری اور دیگر ادیبوں و شاعروں سے گاہے گاہے ملاقات رہتی تھی۔ جے پرکاش، رفیع احمد قدوائی اور بہت سے دوسرے سیاست داں کانگریس میں ہونے کی وجہ سے دوست رہے۔ مولانا آزاد اور میرے حلقۂ احباب میں؟ میں تو خود ان کے ارادت مندوں میں سے ایک تھا۔ ان جیسا عالم متبحر اور دانش ور کم از کم میری دانست میں تو کوئی اور نہیں ہے۔ سیاست میں بھی کانگریس میں جو ان کا احترام تھا وہ گاندھی جی کے بعد ان ہی کا کیا جاتا تھا۔ ان کا ہم پایہ اگر سچ پوچھو تو ہندستان میں کوئی تھا ہی نہیں۔ میری کتاب "مشاہیر غالب" جو غالب کے فارسی کلام کا انتخاب ہے اس کے محرک مولانا آزاد ہی تھے مگر افسوس جب کتاب شائع ہوئی تو وہ سدھار چکے تھے البتہ یہ اطمینان ہے کہ مسودہ کا مطالعہ وہ فرما چکے تھے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا میں بے حد ممنون ہوں کہ ان کی دلچسپیوں کے باعث اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ لال بہادر میرے دکھ سکھ کے ساتھی تھے وہ انتہائی نفیس انسان تھے۔ جب ۱۹۴۲ء میں میں انڈر گراؤنڈ ہوا تو یہ بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم لوگوں نے ساتھ ساتھ جیل کی صعوبتوں کو جھیلا۔ عجب عالم ہے سب دوست بچھڑ گئے اب ملیں تو کس سے ملیں۔ آخری عمر میں تنہائی سے تو بعض اوقات کلیجہ پھٹا سا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمود الحسن: مرزا صاحب! جب کتابوں کا ذکر آ گیا تو مجھے کہنے دیجئے کہ آپ نے آخری عمر میں ہمارے ادبی سرمائے میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ لکھنؤ پر ہی بلکہ مختلف ادبی موضوعات پر آپ کی دس بارہ کتابیں موجود ہیں۔ 'ادبیات' سے لے کر 'مشاہیر غالب' تک اور 'اودھ کے دسترخوان' سے لے کر 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار' تک کا سفر آپ کا یادگار سفر ہے اور 'کشمکش حیات' (سوانح) کا تحفہ تو ہمارے سوانحی ادب میں ہمیشہ ہی ممتاز مقام رکھے گا سنا ہے آپ دو ایک کتابیں اور بھی لکھ رہے ہیں۔؟

مرزا صاحب: شکریہ! زندگی نے مہلت دی تو دو ادھورے کام پورے کرنا چاہوں گا۔ یعنی ایک میری کتاب 'دبستانِ لکھنؤ کے ہندو شعراء' اور دوسرے انیس کے اس مرثیہ کی شرح ہے:

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

شاہد: مرزا صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ہم نے کافی وقت لیا۔ گفتگو ختم کرنے سے پہلے صرف یہ اور دریافت کرنا چاہوں گا کہ لکھنؤ کے آپ نے سبھی ادوار دیکھے، موجودہ لکھنؤ آپ کو کیسا لگا۔

مرزا صاحب: میرے لیے تو لکھنؤ مر چکا ہے۔ سماج معاشرت تہذیب اخلاق رہن سہن سب ہی کچھ بدل چکا ہے۔ ویسے آپ کے سوال کا جواب "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" میں موجود ہے۔

□□

اہلِ قلم معاونین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نثری و شعری تخلیقات فل اسکیپ کاغذ پر ایک ہی طرف تحریر کریں۔ ادارہ کو اصل کاپی ہی روانہ کریں، نقل اپنے پاس ضرور محفوظ کر لیں۔

کاربن یا زیراکس کاپی ہرگز قابل قبول نہ ہوگی۔ بعض حضرات گزارش کے باوجود زیراکس کاپی روانہ کر دیتے ہیں جن کی اشاعت ممکن نہیں۔

ایڈیٹر

میں دیکھ رہا تھا گردوں سے

یہ خون ہے کس کا؟
مسلم کا؟
یا ہندو کا؟
یا
سکھ کا؟
یا
عیسائی کا؟
آخر کس کا یہ خون ہے جو
اجلی دھرتی پر جذب ہوا۔؟

مندر رویا
مسجد روئی
گوردوارے اور کلیسا سب ....
اتنے میں اک آواز آئی

"کیوں روتے ہو
تم کیوں آخر؟

مخلوق ہماری قتل ہوئی
سب بندے میرے بندے تھے
سب انساں تھے
کوئی کھوج رہا تھا گیتا میں
کوئی ڈھونڈ رہا تھا قرآں میں
گرو گرنتھ میں کوئی
اور کوئی

انجیل میں میرا جو پیا تھا
سب بندے میرے بندے تھے
سب قتل ہوئے
اک آفت سب پر ٹوٹ پڑی
یہ آفت لانے والے مگر
ہندو تو نہیں تھے
سکھ تو نہیں
مسلم تھے نہ وہ عیسائی تھے
پھر کون تھے وہ؟
پھر کون تھے وہ؟؟
وہ وہ تھے
روزِ ازل جن کے
گردن میں پڑا تھا
طوق
ہماری لعنت کا!
وہ بھیس میں مسلم و ہندو کے
کہیں عیسائی
کہیں سکھ بن کر
دھرتی پر شر پھیلاتے ہیں

خیر اب جو ہوا سو ہوا چھوڑو
تریاق یہ لو
ہر زہر کو زائل ہونا ہے
یک جہتی کی تجدید کرو
یوں شامِ غم میں عید کرو

ہندو مسلم کے اشکوں سے
مسلم ہندو کے اشکوں سے
اب اپنی عبادت گاہوں کو
روشن جو کریں تو بات بنے!
پھر عید دیوالی بن جائے
پھر قوم مثالی بن جائے!

آنسو پونچھو
ماتم نہ کرو
کچھ غم نہ کرو
سب مل کے اٹھو
اے لوگو
وجودِ ذات کے تم
گل بوٹے ہو
بت جھڑ کا دھندلکا دور ہوا
غم کا موسم کافور ہوا
پھر کھل کے اٹھو"

آواز آتی ہے گردوں سے
"سب بندے میرے بندے ہیں
جو روزِ ازل سے آپس میں گھل مل کر رہتے آئے ہیں
اک دوسرے کا دکھ ہنسی خوشی
ہر دور میں سہتے آئے ہیں
یوں شامِ غم میں عید کرو
یک جہتی کی تجدید کرو"

ایم۔ کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر "اشتراک" وکلی
قاضی پور خرد، گورکھپور

کالی داس گپتا رضا
۴۳۔ سلے جل درشن۔ چوتھی منزل
نیپین سی روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۰۳۶

محمد بخش مہجور اور انشائے نورتن

انشائے نورتن کے آخر میں سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"منشیانِ سخن اس پر مخفی اور پوشیدہ نہ رہے کہ
یہ ہیچمدان، دل پریشان، محمد بخش نام متخلص بہ مہجور خلف
حکیم خیر اللہ مغفور، شاگرد میاں جرأت مرحوم ہمیشہ نقل
ہائے عجیب و قصہ ہائے غریب سے ذوق و شوق رکھتا
تھا....."

پھر لکھا ہے کہ اگرچہ وہ پہلے ہی "قصص دلفریب و فسانہ ہائے عجیب" پر اردو میں دو کتابیں "انشائے گلشنِ نوبہار" اور "انشائے چار چمن" کے نام سے تصنیف کر چکے تھے۔ تاہم انھیں خیال ہوا کہ "افسانۂ رنگیں اور حکایات نگاریں" سے ایک اور کتاب مزین کریں جس کا نام "انشائے نورتن" ہو اور اس میں نو باب ترتیب دیے جائیں۔ پھر امید کرتے ہیں کہ اس سے ان کا نام زندہ رہے گا۔ بقول میر حسنؔ ؎

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام

اور بقول مولوی جامی ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

اس طرح ۲۴۴ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب معرضِ وجود میں آئی۔ تفصیل آگے آئے گی۔ پہلے مختصراً مہجور کے کوائف پر ایک نظر ڈال لیں۔ صرف تین ہی تذکروں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

ریاض الفصحا میں لکھا ہے:[۱]

"شیخ محمد بخش مہجور تخلص خلفِ حکیم خیر اللہ..... پہلے فتح پور میں رہتے تھے۔ اب چند سال سے..... لکھنؤ آ گئے ہیں اور محلہ مفتی گنج میں بس گئے ہیں۔ جوانِ ظریف الطبع و مہذب الاخلاق" ہیں۔ نوجوانی ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا اس لیے جرأتؔ کی شاگردی اختیار کی اور اب بھی انھیں سے مستفید ہوتے ہیں۔ اگرچہ مجھ (مصحفیؔ) سے بھی مدت سے اعتقاد رکھتے ہیں۔ تین کتابیں ان کے قلم سے اردو زبان میں رونق پذیر ہو چکی ہیں..... عمر ۴۵ سال ہوگی۔ ؎

بازارِ عشق میں کوئی لیتا نہیں مجھے
جنسِ زبوں ہوں یا کہ متاعِ گراں ہوں میں

مہجور ہوں مریض کسی پردہ پوش کا
چشمِ اجل سے ہائے جدا تک نہاں ہوں میں

آنکھ اس سے خدا جانے کہ کس وقت لڑی تھی
پر اتنا تو ہے یاد کہ بجلی سی پڑی تھی

تھا چشمۂ حیوان پہ یہ ابر کا ٹکڑا
یا شب لبِ جاناں پہ وہ مسّی کی دھڑی تھی

اس شوخ کی فرقت میں میں کس کس کو مناؤں
بجلائی پہ دل آج ہے کل سانس اڑی تھی

دنیا میں کسی سے کوئی اُمید رکھے کیا
جیتے جی توقع اسے یاں جس سے بڑی تھی

سوا آہ وہ بھولے سے کبھی جا نہ پھرا واں
مہجور سے بے کس کی جہاں نعش گڑی تھی

شور سے تیرے تو ہمسایوں کا ہے ناک میں دم
اتنا رُسوا نہ کر اے نالۂ شب گیر مجھے
خواب میں دیکھی تھی وہ زلفِ پریشاں سوا آہ
ہوگا سودا یہی سب دیتے ہیں تعبیر مجھے

اے رشک نہ کھو آبرو اس دیدۂ تر کی
ہم کو تو توقع نہیں کچھ تجھ سے اثر کی

سراپا سخن[۵]

سراپا سخن میں فتح پور کو فتح پور ہنسوا لکھا ہے اور لکھنؤ کو مولد اور مسکن۔ تصانیف کے لیے درج ہے "ایک دیوان، ایک مثنوی موسیٰ باغ کی تعریف میں اور چار چمن علم و حکمت میں ان سے یادگار رہیں۔" عمر کی وضاحت نہیں کی، مگر لکھا ہے کہ "۱۲۴۰ھ میں بیت اللہ شریف کو گئے۔ مدینۂ منورہ جا کر وفات پائی۔ شاگرد قلندر بخش جرأت ؂

مہجور سُنی تو نے بھی ہے کچھ خبرِ دل
یہ بے خبری کیسی ہے، چل ہے سفرِ دل

سخنِ شعرا[۶]

سخن شعرا کا ترجمۂ مہجور بیشتر سراپا سخن کی نقل ہے۔ اس میں تین معمولی اضافے ہیں۔ ایک یہ کہ تصانیف کے بیان میں چار چمن سے پہلے (انشائے) نورتن کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ "نسخۂ نورتن نظر سے گزرا۔" تیسرے یہ شعر زائد ہے ؂

میں پُرغم اس لیے بلبل صفت دن رات نالاں ہوں
کہ باغِ دہر میں گُل کی روش کچھ دن کا مہماں ہوں

مہجور ریاض الفصحا کے مؤلف مصحفی سے ایک مدت سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ ان سے اعتقاد بھی رکھتے تھے۔ اس لیے میری رائے میں مصحفی کے بیان کو ترجیح دینی چاہیئے کہ مہجور پہلے فتح پور میں رہتے تھے بعد میں لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ اگرچہ انھوں نے فتح پور کو مہجور کی جائے ولادت نہیں کہا تاہم ان کے بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مہجور فتح پور میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ سالِ ولادت کے لیے ریاض الفصحا میں دو اشارے موجود ہیں۔ اول یہ کہ مہجور کا ترجمہ لکھتے وقت جرأت (استادِ مہجور) زندہ تھے۔ دوم یہ کہ اس وقت مہجور کی عمر پینتالیس سال ہوگی۔ جرأت کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا ہے۔ اگر ریاض الفصحا میں مہجور کا ترجمہ ۱۸۱۰ء میں بھی شامل کیا گیا ہو تو سالِ ولادت ۱۷۶۵ء قرار پائے گا۔ میرا خیال ہے کہ مہجور کا ترجمہ مصحفی نے ریاض الفصحا میں پہلے ہی سال یعنی ۱۲۲۱ھ ہی میں درج کر دیا ہوگا کیوں کہ مہجور ان کے خاص ملنے والوں میں تھے۔ ۱۲۲۱ھ میں سے ۴۵ سال کم کرنے سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتا ہے جو مطابق ہے ۶۳-۱۷۶۲ء کے اور شاید یہی مہجور کا سالِ ولادت ہوگا۔ وفات مدینۂ منورہ میں ۱۲۴۰ھ میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ مہینہ ذی الحجہ ہی کا ہوگا جو جولائی/اگست ۱۸۲۵ء کے مطابق ہے۔ اس طرح میری رائے میں شیخ محمد بخش مہجور ۶۳-۱۷۶۲ء کو فتح پور میں پیدا ہوئے اور جولائی/اگست ۱۸۲۵ء کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔ انتقال کے وقت عمر ۶۲ سال تھی۔

مہجور کی تصانیف ریاض الفصحا (۷-۱۸۰۶ء) کے مطابق تین ہیں اور تینوں اُردو میں ہیں۔ سراپا سخن (آخر ۱۸۵۲ء) نے بھی تین ہی کا ذکر کیا ہے اور اس کی تفصیل یہ دی ہے: ایک دیوان، ایک مثنوی موسیٰ باغ کی تعریف میں اور چار چمن۔ سخن شعرا (۶۵-۱۸۶۴ء) تین کے بجائے چار تصانیف کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں چار چمن سے پہلے (انشائے) نورتن کا نام بھی درج ہے۔ خود مہجور نے انشائے نورتن میں صرف دو کتابوں انشائے گلشن نوبہار اور انشائے چار چمن کا نام دیا ہے اور انشائے نورتن کا ذکر اس طرح کیا جیسے یہ ان کی آخری تصنیف ہو۔

اسے محض اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ سخن شعرا کے مؤلف کے سوا کسی نے مہجور کی کسی تالیف یا تصنیف کے مطالعے یا دیکھنے کا ذکر نہیں کیا۔[۸] سخن شعرا میں ہے: "نسخۂ نورتن نظر سے گزرا۔" البتہ ریاض الفصحا میں مہجور کی تین اُردو تصانیف کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"دوستانِ معنی پرست اکثر نقلِ دانش برداشتہ
برطاقِ دلش جا دادند۔"

انشائے نورتن کا جو قدیم مطبوعہ نسخہ میرے کتب خانے میں ہے اس کے خاتمۃ الطبع سے پہلے اصل قلمی نسخہ کے خاتمے سے متعلق تین تاریخی قطعے ہیں۔ پہلا قطعہ خود مہجور کے قلم سے ہے جو پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری شعر یوں ہے ؎

یکایک غیب سے آئی ندا یوں
یہ انشا پر فصاحت کیا کہی ہے

۱۲۲۹ھ

دوسرا قطعۂ تاریخ "مسرور ہمشیرہ زادہ مہجور" کا فکر کردہ ہے۔ اس کے اشعار چار ہیں۔ آخری شعر یہ ہے ؎

یکبار غیب سے بس آئی ندا کہ اس کا
انشائے نورتن ہے کیا نام بے بہا ہے

۱۲۳۰ھ

تیسرا قطعۂ تاریخ جس کے تین شعر ہیں، نوازش علی خاں ضبط کا ہے۔ آخری شعر یہ ہے ؎

تاریخ خاتمہ یہ کہی اس کی ضبط نے
پیدا و بے عدیل ہے انشائے نورتن

۱۲۳۲ھ

چوں کہ ۱۲۲۹ھ (مطابق ۱۴-۱۸۱۳ء) خود مہجور یعنی مصنفِ کتاب کی کہی ہوئی تاریخ ہے اس لیے ترجیح اسی کو ہے۔ اب میرے پیش نظر انشائے نورتن کا جو نسخہ ہے وہ بہت بعد کا ہے۔ خاتمۃ الطبع کا ضروری حصہ درج کیا جاتا ہے:

"چوں کہ کتاب مستطاب انشا نورتن ..... اس تصنیف میاں مہجور ..... افصح شاعرانِ زمن کہ عبارت اس کی نہایت رنگین و شیریں و نمکین ہے اور رموز کنایات و لطیفہ و حکایات اس کے از بس خوش آیند اس جزیرۂ معمورۂ بمبئی میں باوجود کثرتِ شائقین و طالبین کمیاب تھی اس لیے جناب ..... حضرت قاضی ابراہیم صاحب بن ..... قاضی نور محمد صاحب (رنے) ..... بتصحیح تامہ ..... مولوی ..... غلام محی الدین محمد جعفر و ثانیاً مولوی سید غلام علی و سید غلام حسین ..... بحلیۂ طبع آراستہ (کرائی)"

اگرچہ اس خاتمے میں مطبع کا نام نہیں آیا تاہم ہمیں یقین ہے کہ یہ کریمی پریس ہی سے چھپی ہوگی۔ یہ پریس قاضی نور محمد نے ۱۲۷۰ھ میں قائم کیا تھا اور اس کا انتظام ۱۲۹۵ھ سے ۱۲۹۸ھ تک قاضی ابراہیم کے ذمہ رہا۔ ۱۲۹۹ھ میں قاضی صالح محمد اس کے منتظم مقرر ہوئے تھے۔ گویا انشائے نورتن کا یہ ایڈیشن ۱۲۹۵ھ تا ۱۲۹۸ھ یعنی ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیان چھپا۔ اس سے پہلے ۱۲۲۹ھ تا ۱۲۹۸ھ میں اس کے کتنے ایڈیشن نکلے اور کہاں کہاں سے شائع ہوئے ہمیں معلوم نہیں۔

کتاب کے ۹ باب ہیں: "پہلا باب عاشقوں اور معشوقوں کے افسانے، دوسرا باب عورتوں کے چرتروں کے بارے میں، تیسرا باب دادخواہوں کے عدل میں، چوتھا باب بادشاہوں فقیروں کے مصرعہ کہنے اور شاعروں کے فی البدیہہ مطلع کرنے اور بادشاہوں کے چھچھا کہنے اور کبیشروں کے کبت کہنے میں، پانچواں باب ظریفوں کے لطائف میں، چھٹا باب عاقلوں کی نقلوں میں، ساتواں باب احمقوں کی نقلوں میں، آٹھواں باب افیونیوں کی نقلوں میں، نواں باب بخیلوں اور منحوسوں کی نقلوں میں۔"

ابواب کے ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ ان کے تحت کیا لکھا گیا ہوگا۔ بیشتر حکایتیں اور لطیفے جو ان میں بیان ہوئے ہیں وہ آج کے ذوق پر پورے نہیں اترتے۔ تاہم ہر حکایت یا لطیفے کے آخر میں مثنوی کے انداز میں خاتمے کے جو شعر دیے گئے ہیں وہ سب مہجور کے طبع زاد ہیں اگر انھیں جمع کر لیا جائے تو ان کی تعداد دو ڈھائی سو سے کم نہ ہوگی۔ اب جبکہ مہجور کا کلام تقریباً مفقود ہے۔ یہ منظوم اثاثہ مہجور کے شاعرانہ قد کو ناپنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

انشائے نورتن میں جگہ جگہ مختلف شاعروں کے اردو فارسی اشعار بھی درج ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشعار ان شاعروں کے ہیں جو یا تو اس زمانے سے (۱۸۲۰ء) پہلے فوت ہو چکے تھے یا اس وقت زندہ تھے۔ امید ہے کہ یہاں اس کا اندراج معلومات میں اضافہ کرے گا۔ صرف اردو

اشعار دیئے جاتے ہیں جو اشعار مثنیوں سے اخذ کیے گئے ہیں یا مشاہیر اساتذہ (سودا، میر، درد، میر حسن، جرأت، مصحفی وغیرہ) کے ہیں انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

از بسکہ چھا رہا ہے عالم میں نور اس کا
ہر برگ ہر شجر میں دیکھو ظہور اس کا

——— امجد علی خاں

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

——— سراج

شہ بے خودی نے عطا کیا اسے جب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

——— سراج

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلت علی اللہ تعالیٰ

——— سلیمان شکوہ

صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے
اب وداع ننگ ہے اور رخصت ناموس ہے

——— شاہ قدرت

ہے جی میں اس کی کاکل پر خم کو دیکھیے
اس آرزو کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

——— تہنا

شمع کی طرح کون رو جانے
جس کے دل کو لگی ہو سو جانے

——— گنا بیگم

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

——— قائم

دل سیر مسیحا سے ہے بیمار تمہارا
وارستۂ عالم ہے گنہگار ہمارا ——— قائم

یوں نہ کوئی عشق کا بیمار ہو
ہائے دشمن کو نہ یہ آزار ہو

اے خوشا اوقات اس وارفتہ کی
رات دن جس کی بغل میں یار ہو

کس کو طوبیٰ کی ہوس ہو دوستو
ہم ہوں اور وہ سایۂ دیوار ہو

ہجر کی شب کیا کرے ضبط فغاں
دل کی بے تابی سے جو ناچار ہو

حضرت عیسیٰ کی قسم سے کیا اسے
جو کسی کا کشتۂ رفتار ہو

کیا بجھے شربت سے اس کی تشنگی
یار کا جو تشنۂ دیدار ہو

زیست ایسے شخص کی مسرور کیا
یار جس کے پاس نے غم خوار ہو

——— مسرور

تو ساتھ ہو حسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ تو ذرا دھوم سے نکلے

——— مرزا گھسیٹا عشق

جب قبر میں ان دونوں کو یکجا اتارا
غل تھا کبھی الفت نے انہیں مار اتارا

——— الٰہی بخش

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

——— مظہر علی زار

نہ سر کی خبر نہ ہوش پا ہے | کیا جانے مجھ کو کیا ہوا ہے
دیکھے نہ کسو کے میں نے ابرو | خنجر سا یہ دل میں کیوں لگا ہے
واقف نہیں شکل سے بھی جس کی | افسوس کہ اس پہ جی چلا ہے
یوسف کو بھی تو نے اے زلیخا | دل خواب میں دیکھ کر دیا ہے
یہ عشق مرا تو دیکھ میں نے | دیکھا نہ صنم کو سنا ہے

ہنگو نہیں جس کے نام سے بھی لے والے وہ جی میں کھُب گیا ہے

کیا کہیے ضمیرؔ تم سے واللہ

یہ عشق ہے یا کوئی بلا ہے

——— ضمیرؔ

دل ولا سے سے ہے کرتا بے قراری بیشتر

خانۂ ماتم میں ہو پڑھے سے زاری بیشتر

——— خواجہ حسن

پایا ہے بے کسی میں عجب میں نے یار دل

میں غمگسار دل ہوں مرا غم گسار دل

——— خواجہ حسن

دم نکل جائے کہیں یا مجھ نحیف وزار کا

یا کہیں جلدی میسر وصل ہو دلدار کا

——— شمیم

بہا اس بے بہا کا کیا بھلا ہو

سر قاتل پہ جس کا خون بہتا ہو

——— ظہور

یاران ہم رفیق و شفیقان و دوستاں

سب آشنا ہیں زندگیِ مستعار کے

جب مند گئی یہ آنکھ تو سلے دوست بجز برگ

پھٹکے ہے کون گرد کسی کے مزار کے

——— قدرت اللہ

قسمت تو دیکھو ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

——— قائمؔ

تدبیر کوئی اب نہیں بن آتی ہے مجھ کو

وہ دیکھوں ہوں تقدیر جو دکھلاتی ہے مجھ کو

——— شمیم

کیوں نہ وہ گل کی روش باغ جہاں میں شاد ہو

خانماں برباد ہو کر جس کا پھر آباد ہو ——— مسرورؔ

دل تڑپے ہے اور دیدہ تکے راہ کسی کی

ایسی نہ لگا نا مرے اللہ کسی کی

——— عمادۃ الملک

دم کا یہ مہمان ہے دم جو دم ہے سو غنیمت ہے

زیست نظر آتی ہے کم جو دم ہے سو غنیمت ہے

——— فہیم

دل کو یقیں ہوا کہ بس اب جی سے جاچکے

جب ہم تمھارے دام محبت میں آچکے

——— شمیم

آوارہ و سرگشتہ نہ دیوار نہ در کے

سائے کی طرح ہم نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

——— قندری

مسرورؔ پہنچ منزل مقصد پہ سویرے

رستے میں ٹھہرنا نہیں اچھا سفری کا

——— مسرورؔ

گو قائمؔ اور سراجؔ کے سوا باقی شاعر غیر معروف سے ہیں تاہم ان میں سے بیشتر کا ترجمہ مصحفی کے دو تذکروں تذکرۂ ہندی (قبل ۱۲۰۱ھ تا ۱۲۰۹ھ) اور ریاض الفصحا (۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۶ھ) میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعرا یا مہجورؔ کے ہم عصر تھے یا ان کے عہد سے کچھ پہلے کے تھے۔ غنیمت ہے کہ ان کا کچھ کلام انشائے نورتن میں محفوظ ہے، ایک ایک شعر ہی سہی۔

□□

حواشی

۱؎ تاریخ آغاز ۱۲۲۱ھ (مطابق ۰۷-۱۸۰۶ء)

تاریخ اختتام ۱۲۳۶ھ (مطابق ۲۱-۱۸۲۰ء)

۲؎ تذکرہ فارسی میں ہے۔ ضروری عبارت کا ترجمہ اردو میں میں نے کیا ہے

۳؎ ولادت ۱۷۴۹ء وفات ۱۸۱۰ء

۴؎ غلام ہمدانی مصحفی ولادت ۱۷۴۷ء وفات (لکھنؤ) ۲۵-۱۸۲۴ء

۵؎ آغاز ۱۲۶۹ھ (مطابق آخر ۱۸۵۲ء)

۶؎ ۱۲۸۱ھ (مطابق ۶۵-۱۸۶۴ء)

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

ٹھہرے ہوئے نہ بہتے ہوئے پانیوں میں ہوں
یہ میں کہاں ہوں کیسی پریشانیوں میں ہوں

اک پل کو بھی سکون سے جینا محال ہے
کن دشمنانِ جاں کی نگہبانیوں میں ہوں

یوں جل کے راکھ خواب کے پیکر ہوئے کہ بس
اک آئینہ بنا ہوا حیرانیوں میں ہوں

جب راہ سہل تھی تو بڑی مشکلوں میں تھا
اب راہ ہے کٹھن تو کچھ آسانیوں میں ہوں

آساں نہیں ہے اتنا کہ بک جاؤں اس کے ہاتھ
ارزاں نہیں ہوں، خواہ فراوانیوں میں ہوں

مجھ کو بھی علم خوب ہے سب مدوجزر کا
میں بھی تو سب کے ساتھ انھیں پانیوں میں ہوں

میں زیرِ دام بھی ہوں تو اپنے ہی دام میں
پابند ہوں تو اپنی ہی نگرانیوں میں ہوں

میں اپنی شمعِ فکر سے روشن ہوا تمام
چاروں طرف میں اپنی ہی تابانیوں میں ہوں

محسن تمام تر سروساماں کے باوجود
پوچھو نہ کتنی بے سروسامانیوں میں ہوں

محسن زیدی
۱۷۷، راؤز ایونیو
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مجھے خبر بھی ہو کیا میں ہی کب حواس میں تھا
سنا تو ہے مرا قاتل مرے لباس میں تھا

میں اپنے جامۂ ہستی پہ ناز کیا کرتا
مرا وجود تو پیوند سا لباس میں تھا

بہت نشیب میں بہتا تھا جب بھی دریا
عجیب کرب مری حسرتوں کی پیاس میں تھا

تمھیں اگرچہ نہ دیکھا تھا آج سے پہلے
مگر یہ جسم یہ چہرہ مرے قیاس میں تھا

عجب زمانہ تھا تعلیم کا زمانہ بھی
میں اسکے دل میں تھا اور وہ مرے کلاس میں تھا

یہی ستارے مری میز پر تھے بکھرے ہوئے
یہ ماہتاب بھی کل شب مرے گلاس میں تھا

بہت حسین ہے یہ خواہشوں کی وادی بھی
مگر وہ سانپ اسی ریشمی سی گھاس میں تھا

کوئی سمجھ نہ سکا میرا درد اے افسر
مرا قیام بھی کس شہرِ ناشناس میں تھا

خورشید افسر بسوانی
کٹرا بازار، بسواں
سیتاپور ۲۶۱۲۰۱

ڈاکٹر محمد انصار اللہ
۳/۲۶۴ سرسید روڈ، سرسید نگر، علی گڑھ

"انسان" میں اقبال کی سہ نظمیں

بیسویں صدی کے دوسرے عرصے میں پنجاب سے جو رسالے نکل رہے تھے، ان میں ایک "انسان" بھی تھا۔ اس ماہنامے کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۱۲ء میں نکلا تھا۔ سرورق کے ضروری اندراجات اس طرح ہیں:

"مقامِ اشاعت: امرتسر
علمی، ادبی، اخلاقی اور روحانی مضامین کا ماہوار رسالہ
انسان
ایڈیٹر: غلام قادر فرخ امرت سری
قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ۲/ روپے، فی پرچہ ۳/"

سرورق پر ہی فہرست مضامین بھی ہوتی تھی۔ "انسان" کے لکھنے والوں میں خان بہادر مرزا سلطان احمد (بہاول پور)، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، خواجہ عبدالرؤف عشرت، پیارے لال شاکر، مہاراج بہادر برق، سید ضامن علی کنتوری، محمد دین فوق، خان بہادر سید اکبر حسین، منشی تیرتھ رام فیروزپوری، سورج نرائن مہر، میاں سعید اللہ منٹو، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، گوری شنکر لال اختر اور سوامی ستیہ دھاری وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ سرورق کی عبارت کے علاوہ رسالے کے نام سے بھی اس کے مزاج و مقاصد کا تصور کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اس رسالے پر جو گزری اس کا اندازہ ایڈیٹر کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے:

"..... وہ اصحاب جو زمانہ کی ہوا سے متاثر ہو چکے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اسے دل چسپی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اگر کسی ہندو کے پیش کیا گیا تو اس کے سرورق پر غلام قادر فرخ لکھا ہوا دیکھ کر اس نے سر پھیر دیا کہ یہ ایک مسلمان کا رسالہ ہے اور اگر کسی مسلمان کی خدمت میں بھیجا گیا تو اس نے اس خیال سے واپس کر دیا کہ اس میں ان کے مطلب کے مضامین نہیں ہیں۔"

حالات کے ناموافق ہونے کے باوجود ایڈیٹر نے "انسان" کی ترقی کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ جنوری ۱۹۱۳ء میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ:

"انسان ماہوار بھی بدستور جاری رہے گا اور ہفتہ وار انسان اخباری صورت میں کم از کم پانچ سو درخواستیں آنے پر جاری کیا جائے گا۔"

"انسان" کے قدر شناسوں میں علامہ اقبال بھی تھے۔ ان کی زندگی میں ان کے بارے میں یہ بات کہی جانے لگی تھی کہ:

"اقبال ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے ... (ان کی شاعری میں) وطنیت کا جذبہ کم (ہو گیا) .... تمام عشاقِ اردو اس دن کے منتظر ہیں کہ جب اقبال کی شاعری مثل سابق کے ایک وطنی اور خالص اردو شاعری کی حیثیت سے پھر جلوہ نما ہوگی۔"

(رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو ص ۱۹۲)

لیکن "انسان" کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد تک اقبال نہ صرف حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار رہے بلکہ انھوں نے پنڈت ہری لال شرما

کے ہفتہ وار اخبار "ہندو" کے "رام نمبر" کے لیے بھی ایک نظم لکھی تھی جس میں راجا دشرتھ کے بیٹے رام کو "امامِ ہند" قرار دیا تھا۔ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ماہنامہ "انسان" میں چھپی ہوئی اقبال کی تین نظمیں ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں توقع ہے کہ اقبال شناسی میں ان سے کچھ مدد ملے گی۔

(۱)

"امامِ ہند" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی مختصر مگر معنی خیز نظم اخبار "ہندو" لاہور کے "رام نمبر" میں شائع ہوئی ہے

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

(انسان، اپریل ۱۹۱۲ء)

اس نظم میں کل چھ شعر ہیں اور یہ نظم اب اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کے تیسرے حصہ میں "رام" کے عنوان سے شامل ہے۔

(۲)

عہدِ طفلی

ہاں اٹھا اے ساحرِ ایام یہ جادو ذرا
ابلقِ گردوں نہ ہو محوِ رمِ آہو ذرا
ہائے پھر آجا کہیں سے عمرِ رفتہ تو ذرا
لا وہ نظارہ پئے چشمِ تماشا جو ذرا
خون رلواتے ہیں ایامِ جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وہی ایامِ طفلی کے مزے
ہائے وہ عالم کہ عالمگیر تھی اپنی ادا
غیرتِ صد فصلِ گل تھی اپنے گلشن کی ہوا
مکتبِ طفلی میں غیر از درسِ آزادی نہ تھا
زنگِ افکارِ جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا
مایۂ دارِ صد مسرت اک تبسم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر وہ تکلم تھا مرا
تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لیے
وسعتِ آغوشِ ادراک جہاں میرے لیے
تھی ہر اک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لیے
خالی از مفہوم خود میری زباں میرے لیے
درد اس عالم میں جب کوئی ستاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے
تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر
اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر
آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل مرا جامِ شرابِ ذوقِ استفسار تھا
آہ اے دنیا نمک پاشِ خراشِ دل ہے تو
جس کے ہر دانے میں سو بجلی ہے وہ حاصل ہے تو
جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تو
جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو وہ محمل ہے تو
تیرے ہاتھوں کوئی جویائے مے تسکیں نہ ہو
ایمن از مارِ زمینِ گلستاں گلچیں نہ ہو

(انسان۔ نومبر ۱۹۱۲ء)

(۳)

صدائے درد

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا نے اس نظم میں "جذباتِ حبِ وطن" کی جس خوبی سے تصویر کھینچی ہے اور جس خوش اسلوبی سے اس کے روشن اور تاریک پہلو پر روشنی ڈال کر ہندوستانی قومیت کی تائید اور ابنائے وطن کو باہمی اتحاد و یگانگت کی تہدید کی ہے، انھیں کا حصہ ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہندو مسلمان ڈاکٹر اقبال کے ان ہمدردانہ مشوروں پر کاربند ہوں گے اور تمام کدورتوں سے آئینۂ دل صاف کر کے دائمی صلح و امن کی بنیاد قائم کریں گے۔

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

لے ہمالہ تو چھپا لے اپنے دامن میں مجھے
ہے غضب کی بے کلی اپنے نشیمن میں مجھے

مدتیں گزری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

آہ! ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی پھر ہستی کہاں

حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا
آہ اس بستی میں اب میرا گزارا ہو چکا

پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتیِ موجِ اٹک
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

ہاں سلامِ آخری اے مولدِ گوتم[1] تجھے
اب فضا تیری نظر آتی ہے ناموسِ مجھے

الوداع اے مدفنِ ہجویریِ[2] اعجاز دم
رخصت اے آرام گاہِ شنکر[3] جادو رقم

الوداع اے سیرگاہِ شیخِ شیراز[4] الوداع
اے دیارِ بالمیکِ[5] نکتہ پرداز الوداع

الوداع اے سرزمینِ نانکِ[6] شیریں زباں
رخصت اے آرام گاہِ چشتیِ[7] عیسٰی نشاں

سرزمیں تیری قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیا، یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

رمزِ الفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے
کارزارِ عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں ہکیا انساں ہیں یہ
غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب ناداں ہیں یہ

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے
صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے

دل حزیں ہے جاں رہینِ رنجِ بے اندازہ ہے
آہ! اک دفتر تھا اپنا، وہ بھی بے شیرازہ ہے

امتیازِ قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ
اور اس الجھی ہوئی گتھی کو الجھاتے ہیں یہ

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے

رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی

ایک ہی مے سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

اقبال

(انسان۔ فروری، مارچ ۱۹۱۳ء)

□□

حواشی: [1] گوتم بدھ [2] سید علی ہجویری عرف حضرت گنج بخش [3] سری شنکر اچاریہ ہندستان کا قدیم فلاسفر [4] شیخ سعدی شیرازی [5] ہندستان کا قدیم شاعر [6] گرو نانک [7] خواجہ معین الدین چشتی

میری دھرتی، مری مٹی، مری محسن تو ہے

تیری آغوشِ محبت میں جو ملتا ہے سکوں
وہ کسی غیر کی باہوں میں کہاں اے ملناڈ[1]
تیری گاتی ہوئی چوٹن سے جو اٹھتی ہے مہک
وہ کسی اور کی آنکھوں میں کہاں اے ملناڈ

تیرے جلووں میں وہ جادوئی کشش ہے پنہاں
جو نظر پڑتی ہے تجھ پر وہ ٹھہر جاتی ہے
تیرے گالوں کی شفق تاب سنہری کرنیں
اوڑھ کر شام ذرا اور نکھر جاتی ہے

تیرے سینے پہ مچلتی ہوئی تنگا لہریں
یا شراوتی کا وہ لہراتا شگفتہ آنچل
وہ کر بھدرا کا فسوں ساز امڈتا جوبن
یا کہ ورّدا کا سبک سار مصفّا جھرنا
سب ترے نام کی خوشبو کی قسم کھاتے ہیں

تیرے ہر ذرہ میں تقدیس ہے مسجد جیسی
تو مطہر ہے ترا حُسن عبادت جیسا!
تیرے دم سے ہے یہ رنگین نظاروں کا فسوں
تیرا ہر رنگ ہے آئینِ محبّت جیسا
سانس لینے کو ٹھہر جائے جو اک پل راہی
وہ محبّت بھری نظروں کا اسیر ہو جائے

تیرے کہساروں، چمن زاروں، سمن زاروں میں
نکہت و نور بھی ہے نغمہ و رعنائی بھی
موسموں میں ترے وہ کیفیتِ حسنی ہے
دیکھ کر جس کو مہک اٹھتی ہے تنہائی بھی

تجھ میں پوشیدہ ہیں قدرت کے خزانے کتنے
تجھ سے وابستہ ہیں رنگین فسانے کتنے
تیری مٹی میں جو تابندہ ہے صندل کی مہک
اس کی کرنوں سے معطّر ہیں نہ جانے کتنے

مسکراتے ہوئے اشجار کے سایوں کی قسم
گنگناتے ہوئے شفاف سے جھرنوں کی قسم
شوخ و شنگ اور شرارت بھرے نغموں کی قسم
میری دھرتی، مری مٹی، مری محسن تو ہے

■■

ساجد حمید
معرفت جناب ایچ۔ ایم بشریف
سوائی پلیا۔ شموگا۔ ۵۷۷۲۰۱
(کرناٹک)

[1] اس علاقہ کو ملناڈ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں بارشیں خوب ہوتی ہیں۔
ملناڈ کا اصل کنڑ ہے جس کے معنی ہیں 'بارش کی زمین'
[2،3،4] اس علاقہ میں بہتی ہوئی ندیاں [5] یہاں کے جنگلات میں صندل کی افراط ہے۔

مصطفیٰ زیدی وفا
۱۵/۶۰ ڈالی باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ہندستانی تہذیب کا اجتماعی تشخص

"جب ہم لفظ 'تہذیب' استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اس قوم یا ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانی جاتی ہے۔ انسان قدروں کے بنانے اور انھیں محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتار ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ 'تہذیب' قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں کا احاطہ کرلیتی ہے، اس کو بناتی اور سنوارتی ہے اور ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں اس طرح 'تہذیب' ایک قوم کے شعور کی مظہر بن جاتی ہے لیکن اس کی سطح کبھی یکساں نہیں رہتی کیوں کہ تہذیبی اقدار یکساں طور پر قوم کے ہر طبقے کی ملکیت نہیں ہوتیں۔" [1]

" واقعہ یہ ہے کہ تہذیب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مکان یا زمین کی طرح کسی شخص کی ملکیت ہو سکے۔ وہ تو ایک خاص انداز سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے، جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تجربوں کی مسلسل تنظیم اور تشکیل کرتا رہے اور ان کی مدد سے پرانی چیزوں سے نیا لطف اور کیف بھی حاصل کرے۔ امریکہ کے معلم اعظم ڈیوی (DEWY) کے بقول تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت ہمیشہ بڑھتی رہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور گہرے معنی حاصل کر سکے۔" [2]

قابل غور امر یہ ہے کہ تہذیب کے اصلی اور حقیقی عناصر کیا ہیں اور ہم کن صفات کی حامل شخصیت یا قوم کو مہذب کہہ سکتے ہیں؟

یونانِ قدیم کے مفکرین نے ان صفات کو جو تہذیب کے کمال کے لئے لازمی ہیں، ایک لفظ سوفروسائن (SOPHROSYNE) سے ادا کیا ہے۔ یعنی اعتدال، عدل اور ضبط نفس۔ اس کے ساتھ ہی علم اور اخلاق، عبادت اور قناعت، نیک نفسی اور مرنجاں مرنجی — تہذیب و انسانیت کے اجزاء ہیں۔ تہذیب کے مفہوم میں ہمہ گیری، سکون اور عزت نفس بھی شامل ہیں۔ بقول خواجہ غلام السیدین:—

" حالی نے تہذیب کو معنی 'لفظ آدمیت' کہا ہے۔" [3]

تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک ہمہ گیر نظر ڈال سکے۔ اس کی طبیعت میں احساسِ تناسب ہو۔ یعنی حقوق اور مطالبات میں عدم توازن نہ ہونے دے۔ اسی توازن کی برقراری

کو مذہب اور فلسفے نے عدل سے تعبیر کیا ہے۔

ہر قوم اور ملک کا کچھ نہ کچھ تہذیبی سرمایہ ہوتا ہے، چاہے وہ بہت زیادہ مہذب اور متمدن نہ کہی جاسکے پھر بھی ہر قوم اپنے وجود کے تسلسل کے لیے کچھ بنیادیں رکھتی ہے۔ یہ بنیادیں کسی اقدار پر بھی ہوتی ہیں جو کسی قوم یا ملک کو اپنے پیش رو افراد سے ورثے میں ملتی ہیں اور انھیں اقدار سے وہ دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ یہی اقدار اس کی شناخت یا منفرد و مخصوص خصوصیت قرار پاتی ہیں۔ ہر قوم اپنے تہذیبی ورثے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ نئے افکار و خیالات، مادی ایجادات، زندگی بسر کرنے کے وسائل میں اضافے اور سہولتوں کے حصول سے یہ تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ساخت رکھتا ہے، اس لیے تبدیلی اور ارتقاء کا احساس بھی نمایاں ہوتا ہے۔

قدروں میں ہونے والی یہ تبدیلی کسی قوم یا ملک کی تہذیب میں رد و بدل اور ارتقاء کی بنیاد ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور یہی جہد پیہم اور کوشش و کاوش کا عمل مسلسل تہذیب کے عناصر میں رد و قبول اور کمی بیشی کا باعث بنتا ہے۔

یہاں ایک بنیادی اہمیت کا سوال پیدا ہوتا ہے، یعنی اقدار کے تعین کا حق و اختیار کسے اور کیوں کر ہے؟ ہمارے اب تک کے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ قدروں کا تعین ایک پیچیدہ امر ہے کیوں کہ قدریں تہذیب کے انھیں عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں جو صدیوں کی تعمیری اور تخلیقی جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن سماجی زندگی کے ہر دور میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔

قدیم ادبیات میں اخلاق، انسان دوستی، محبت اور فن کے مخصوص تصورات تھے اور وہ اپنے زمانے کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھے اور انھیں اسی نظام حیات و معاشرت نے پیدا کیا تھا جس کی اساس زرعی پیداوار اس کے پیدا کرنے کے طریقوں یا وسائل اور ان پر قبضہ رکھنے کی قوت و اہلیت پر تھی لیکن مختلف اسباب، ارتقائی اور انقلابی اثرات کے نتیجے میں انسان کا علم، ذہن اور تہذیبی تصورات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر بدلتا گیا۔ فطرت پر قابو پانے اور رازہائے سربستہ کھولنے کی جدوجہد میں اس نے خود کو بدل لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مادی حالات کے بدل جانے سے انسان کا شعور بھی بدلا اور ان قدروں میں بھی تبدیلی آئی جنھیں وہ عزیز رکھتا تھا۔

تبدیلی کا مفہوم یہی ہے کہ مادی حالات یا وسائل حیات بدل جانے سے انسانی افکار و شعور میں بھی تبدیلی آتی ہے اور اب جو قدریں قائم ہوں گی ان میں نیا پن، وسعت اور انسان کی طاقت و صلاحیت پر بھروسہ ہوگا۔ فطرت کے بارے میں خیالات بدلے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محبت کی جگہ نفرت، خوش اخلاقی کی جگہ بد اخلاقی، راستی کی جگہ کجروی یا انسان دوستی کی جگہ انسان دشمنی پیدا ہو گئی بلکہ روح عصر کے تقاضوں کے مطابق پہلے سے زیادہ مفید، واضح اور روشن خیالات اور افکار کو جگہ دی گئی۔ — تہذیب کے لازمی عناصر میں رد و قبول کی گنجائش ہوتی ہے جو اس کا رشتہ ماضی اور مستقبل سے استوار رکھتی ہے۔ جمود یا ٹھہراؤ — کسی بھی شعبۂ حیات میں ہو، دیرپا نہیں ہوتا — بیشتر خود فنا ہو جاتا ہے کیوں کہ زندگی چلتے رہنے سے عبارت ہے۔ تبدیلی تو قانونِ فطرت ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعض قوانین فطرت دائم و قائم ہیں، ان میں تبدیلی اتنی سست روی سے ممکن ہے کہ صدیوں پر محیط ہو، ورنہ کارخانۂ قدرت الٹ پلٹ جائے۔

تہذیب کی بنیاد وجود پر ہے۔ وجود سے مراد زندگی ہے۔ اس کائنات میں زندگی کے سوا کوئی چیز اہم نہیں ہے اور زندگی — زندہ ہستیوں ہی میں موجود ہوتی ہے، باہر مطلق نہیں۔ زندگی کا سب سے بڑا مظہر زندہ بشر ہے اور جتنی بھی مردہ چیزیں ہیں، زندہ چیزوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی وجود بشر ہی وہ اکائی یا مرکزی نقطہ ہے جو تمام عادات و اطوار انسانی پر محیط بھی ہے اور ان کا پابند بھی۔

تہذیب کی بنیاد کا دوسرا پتھر روئے زمین کا کوئی مخصوص

خطہ یا علاقہ سے جہاں اس تہذیب پر عمل پیرا افراد رہتے بستے ہیں کیوں کہ اگر صرف اخلاق، شائستگی، رواداری، ایمان داری، انسان دوستی وغیرہ قدریں ہی کل تہذیب ہیں تو مغربی تہذیب کس معنی میں مشرقی تہذیب سے مختلف ہوئی یا ایرانی تہذیب کس معنی میں ہندستانی تہذیب سے جدا ہوئی۔ مذکورہ بالا اقدار کی نوعیت آفاقی ہے یعنی ان کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

صاحبان علم الاخلاق اور فلاسفہ نے وجود بشر کی پانچ اقسام بتائی ہیں یعنی نفسی، اجتماعی، عینی، معروضی اور مطلق۔ اسی طرح تہذیب کے بھی کئی پہلو ہیں۔ خدا کا تصور، تعمیرات، ادارے، فنون لطیفہ اور آئین معاشرہ بھی کسی قوم یا ملک کے تہذیبی عناصر میں شامل ہے۔

ان معروضات کے بعد ہندستانی مزاج عامہ پر نظر ڈالی جائے تو موضوع زیر بحث کی مختلف جہات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ہندستان میں تہذیب کا جو عام تصور ہے وہ دراصل گزشتہ روایات کا عطیہ ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بدلتی ہوئی زندگی میں کوئی روایت پوری طرح کارآمد یا دیرپا نہیں ہوتی۔ اب تک ہم تہذیب کو شرافت، شائستگی، متانت، نفاست، لطافت جذبات پر قابو، ایک رچا ہوا شعور، ایک ذوق جمال، ایک نرم و شیریں معقولیت سمجھتے ہیں۔ یہ تصورات غلط نہیں ہیں، اس میں تہذیب کی بعض قدریں آجاتی ہیں۔ مگر اس طرح ایک خاص افتاد ذہنی پر زور دینا دراصل جاگیردارانہ نظام کی دین ہے۔ یہ اس فارغ البال طبقے کی خصوصیات تھیں جو مالی مشکلات سے آزاد تھا اور جس میں شرافت اور ذاتی وجاہت کی بڑی اہمیت تھی۔ تہذیب کی اس توضیح میں وقت اور حالات کی قدرتی تبدیلیوں کا احساس نہیں ہے۔

ہندستانی عوام کی موجودہ نسل کے لیے جدوجہد آزادی اور پھر حصول آزادی (۱۹۴۷ء) کی بڑی اہمیت ہے۔ اس واقعے یا کامیابی نے زندگی کے تمام شعبوں پر دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ قوم و ملک کے لئے یہ نہ صرف ایک تاریخی موڑ ہے بلکہ جمہوری حکومت کے قیام کی بدولت اپنی دنیا خود بنانے کا ولولہ اور جوش بھی پیدا ہوا۔ اسی کے سبب ہندستانی مزاج عامہ میں زبردست تبدیلی آئی اور جو رجحانات نمایاں ہوئے وہ ان معنوں میں انقلابی کہے جا سکتے ہیں کہ ماضی کے پختہ اور محکم اقدار و خیالات سے متصادم ہوگئے۔

ہمارے تعلیمی ادارے شخصیت کی تربیت، اخلاق کے معیار کو بلند کرنے اور انسان دوستی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی کی ضروریات ان پر پابندیاں عاید کرتی ہیں کیونکہ کارزار حیات میں ان کی افادیت کم ہوگئی ہے۔

جو چیزیں تعلیمی اداروں میں اعلیٰ اور حسین، نیک اور مفید سمجھی جاتی ہیں، زندگی میں ان کی حیثیت اور نوعیت بدل جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ استادوں اور شاگردوں میں ایک عجیب بے یقینی ہے۔ علم انسان کے لیے اب حصول معاش کا ذریعہ ہے۔ یہ روح کی خلش دور کرنے اور انبساط داخلی کے فروغ کا وسیلہ نہیں رہ گیا۔ اگرچہ علم و ریاضت کی اہمیت کو صدیوں پہلے سمجھ لیا گیا تھا۔ مقدس گیتا میں کہا گیا ہے:

"ریاضت سے علم حاصل ہوتا ہے اور تفکر سے علم پر جلا ہوتی ہے۔" ؎۱۰

ہماری موجودہ زندگی پر مادیت اتنی غالب آچکی ہے کہ ساری فکر و کوشش زندگی کی دستیاب نعمتوں سے فیض یاب ہونے تک محدود ہوگئی ہے۔ اور چوں کہ یہ نعمتیں گراں ہوتی جارہی ہیں اس لیے لوگ حصول زر کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم مڑ مڑ کر زندگی کی اچھی قدروں کی طرف دیکھتے تو ہیں لیکن انھیں اپنانے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے یا انحراف کرتے ہیں کیوں کہ یہ اقدار ہمارے اعمال و اقوال پر کچھ پابندیاں لگاتی ہیں اور ان کا یہ مطالبہ پورا کرنے میں ہمیں مادی نقصان ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔

یہی دانستہ انحراف یا گریز ایک عجیب تضاد کو جنم دیتا ہے۔ تعلیمی اور تدریسی ادارے سب دفتری نظام کے لیے پرزے فراہم کرنے والے کارخانے ہوگئے ہیں۔ یہ پرانی تہذیب کے ترانے گا کر موجودہ زندگی کے حقائق سے گریز سکھاتے ہیں۔

سارا زور دولت کے حصول پر ہے مگر اس کی فراوانی بھی مضر ہے کیوں کہ دولت کی فراوانی جہاں لوگوں کو معاشی آسودگی اور خوش حالی سے دوچار کرتی ہے وہیں بے شمار نفسیاتی الجھنوں

کا ذریعہ بھی نکال دیتی ہے۔ یہی ذہنی انتشار قدروں کو متزلزل کر دیتا ہے اور انسان ہمیشہ پاؤں تلے جھٹکے محسوس کرتا رہتا ہے۔

دولت کا اپنا رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ دولت مندوں کے طور طریقے غریبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی مخصوص قدریں ان کے اپنے مزاج کے مطابق ملے پاتی ہیں، جبکہ غریبوں کے پاس سوچنے کے لیے دماغ نہیں ہوتا یا فرصت نہیں ہوتی۔ وہ تو پُرآسائش اور خوابناک زندگی کی راحتوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور اس کی تعبیر میں مسلسل سرابوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ان سرابوں کا سحر بھی بڑا ہی دل خوش کن ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسی طبقے کے کچھ افراد اپنے حق یا انسانی قدروں کی بازیابی کے لیے آواز بلند کریں تو اسے بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لیے کہ دولت مند اور اونچی سوسائٹی والوں کو انقلاب کے نام ہی سے چڑھ ہوتی ہے۔ جان بوجھ کر اپنی قبر کون کھدوانا چاہتا ہے۔

ان کے لئے یہ دنیا ایک ٹرین کی مانند ہے اور غریب عوام اس کے پہیے ہیں۔ وقت کی پٹری پر یہ ٹرین دوڑ رہی ہے اور صرف سرمایہ دار ہی اسے ڈرائیو کر سکتے ہیں۔ اور سرمایہ دار بذاتِ خود ایک ناقابلِ تسخیر قوت کا دوسرا نام ہے۔ وہ اپنی شکست سے بچنے کی ہمیشہ ترکیبیں تلاش کر لیتا ہے۔ چاہے اس کے لیے مروجہ انسانی اقدار کو پامال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اقدار کی یہی شکست و ریخت تہذیبی ورثے میں تبدیلی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے یہ اور بات ہے کہ اپنے مطلب کی راہیں نکالنے کے لیے اکثر دورنگی چال چلی جاتی ہے۔ مثلاً لوگوں کی عام ضروریات کا خیال سب کو ہے مگر تقریر و تحریر میں اس کو اعتراف کر لینا کافی ہے۔ اسے پورا کرنے کے وسائل فراہم کرنے کی کوشش نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس پر زور اس لیے نہیں ہے کہ تجرباتی طریقہ، عقلیت اور ادراک بڑی چیزیں ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ اس سے کارخانوں کے بنانے اور چلانے، حکومت کے لیے طاقت مہیا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

سائنس کی تعلیم میکانکی ہے، اس کو موجودہ اجتماعی علوم کی بنیاد نہیں دی گئی۔ بلکہ ہر سائنس کو ایسے شعبوں میں تقسیم کیا جا چکا ہے جہاں دوسرے علوم کا گزر نہیں، کیوں کہ ان کا تعلق انسانی زندگی کے روحانی اور جذباتی پہلوؤں سے ہے۔ آرٹ اور شعر و ادب اسی لیے کم مایہ ہیں کہ یہ تو دھنک، چاندنی اور سبزہ زار کے حسن سے لطف اندوز ہونا سکھاتے ہیں یا بغاوت پھیلاتے ہیں۔ طلباء کے لیے طلب علم کی مدت ایک زبردستی کی قید ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے ایسے ذہنی قلعے نہیں رہے جن میں لوگ باہر کے فتنوں سے محفوظ رہ کر زندگی کے مثبت اور افادی پہلوؤں کو روشن تر اور مفید تر بنانے کی سعی کریں۔ گھریلو جھگڑوں کو باہر نہ جانے دیں۔ ان کی کچی دیواروں میں جو رخنے پیدا ہو گئے ہیں وہ موجودہ بحران کا نتیجہ ہیں یا موجودہ بحران ان سے باہر آنے والی ہواؤں کا نتیجہ ہیں۔

اس بحران نے ہماری اجتماعی زندگی میں اخلاقی پستی کو فروغ دیا ہے:

"کسی بھی معاشرے کی اخلاقی پستی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد اچھائی برائی میں فرق نہ کر سکیں۔ ایسا معاشرہ کبھی بھی خوش بختی سے دوچار نہیں ہو سکتا۔" ۵

اس اخلاقی پستی کا ادراک بھی سب کو نہیں ہے۔ قدریں یوں بدل گئی ہیں کہ ان کے مضر اثرات و نتائج پر نظر بھی نہیں جاتی اور اگر احساس ہو بھی تو حالات کا جبر کہہ کر صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔

ہماری زندگی میں "ہم" کی جگہ "میں" نے لے لی ہے۔ مشترکہ خاندانوں کی جو بھی کمیاں رہی ہوں۔ یہ بڑی خوبی تھی کہ فرد "ہم" کے صیغے میں سوچتا تھا۔ یعنی اس کے افعال و اعمال کا نتیجہ صرف اسی فردِ واحد کی ذات تک محدود نہ رہ کر کم سے کم ایک پورے خاندان کو متاثر کرتا تھا لہٰذا وہ محتاط رہتا تھا۔ پھر ہدایت و رہبری کے لیے تجربہ کار افراد ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ جواب دہی اور احتساب کا خوف بد اعمالیوں سے روکتا تھا اور انسان دوسروں کے لیے بھی جیتا تھا۔

کاشت پر انحصار کم ہو جانے، حصولِ علم ہی ذریعہ معاش بنتے جانے، مدنیت (URBANISATION) کے فروغ، ہجرت کے شوق، رسل و رسائل میں سہولت بڑھنے سے معاشرے میں اجتماعی مزاج کی جگہ انفرادی مزاج پنپ رہا ہے۔ سیاست کے غلبے

(باقی آئندہ)

غزلیں

ہو کے مصلوب، صلیبوں کو سجائے رکھیے
اپنی لاشوں کو بھی کاندھوں پہ اُٹھائے رکھیے

اس پُر آشوب زمانے میں اگر جینا ہے
پھول کی سیج پہ کانٹوں کو بچھائے رکھیے

آئے الزام نہ پت جھڑ کی طرفداری کا
زخم دل کے ہی سہی پھول کھلائے رکھیے

خوبصورت ہے بہت ردِّ انا کی تدبیر
سر کو اس شوخ کے قدموں میں جھکائے رکھیے

ڈالیے چاند ستاروں پہ کمندِ تسخیر
پاؤں دھرتی پہ مگر خوب جمائے رکھیے

کون جانے ہو کوئی ان میں خضر پوشیدہ
بھولے بھٹکوں کو ابھی ساتھ لگائے رکھیے

یورشِ سنگ سے اس دور میں بچنا ہے محال
جام و آئینہ بہرحال بچائے رکھیے

تیرگی عہدِ رواں کا ہے مقدر جاوید
دل جلا کر ہی سہی، دیپ جلائے رکھیے

ڈاکٹر جاوید وششٹ
وششٹ آشرم، فتحپور بلوچ
فرید آباد

مشکل ہے بہت چشمِ خریدار میں آئے
اس دور میں یوسف بھی جو بازار میں آئے

میرا بھی لہو گر نگہِ یار میں آئے
رنگینیٔ گلشن لب و رخسار میں آئے

یہ قصرِ امارت تو نظر آتا ہے لرزاں
کہہ دو نہ کوئی سایۂ دیوار میں آئے

مدت ہوئی دیکھی ہی نہیں فصلِ بہاراں
کیوں تو ہی نہ اب ناز سے گلزار میں آئے

کہتے ہیں خریدار چلن اس کا نہیں ہے
ہم جنسِ وفا لے کے ہیں بازار میں آئے

اب علم بھی شہرت کا بنا دست نگر ہے
افضل ہے وہی نام جو اخبار میں آئے

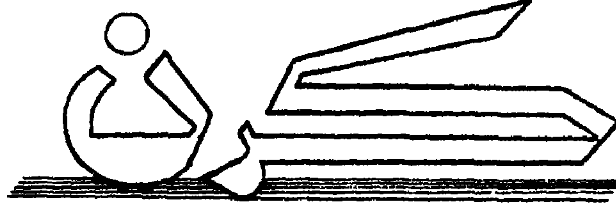
منظر یہ جگر پاش تو دیکھے نہیں جاتے
پھر روشنی کیوں دیدۂ بیدار میں آئے

کیوں عظمتِ پارینہ کے قصے ہے سناتا
گر فرق کوئی اس سے نہ کردار میں آئے

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل، سندیلہ
ہردوئی ۲۴۱۲۰۴

افسانہ

علی امام نقوی
۱۰۳/۵۴ ۔ نیا نگر، کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی
میرا روڈ (ایسٹ) تھانے ۴۰۱۱۰۴



طلعت بستر پر پڑی مسلسل روئے جارہی ہے۔ گھر کے تمام افراد چپ ہیں، دونوں بڑی بچیاں مجھے اور اپنی ماں کو حیرت اور التجا بھری نظروں سے کئی بار دیکھ چکی ہیں گویا وہ خاموشی کو توڑ دینا چاہتی ہیں، لیکن اسے شکست کرنے کی کوشش غالباً اس لیے نہیں کر رہی ہیں کہ اگر یہ سکوت ٹوٹا تو گھر کے خاموش سنگین اور قدرے سوگوار ماحول میں تناؤ کا اضافہ ہو جائے گا، اور ـــ اس کے باوجود بھی مسئلہ حل نہ ہوسکے گا۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ طلعت کئی دنوں سے بیمار ہے اور آج میری جیب میں صرف دس روپے بچے ہیں۔ سات مہینے کی بے زبان طلعت اپنی تکلیف کا اظہار رو رو کر کرتی ہے یا پھر وہ اپنے ننھے سے ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں لے کر گلے کو زور سے کھینچتے ہوئے بلک اٹھتی ہے۔ میں خالی خالی نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے پیکر میں "میراث" والی صابرہ دکھائی دیتی ہے۔

"اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیجئے"۔

میرا ہاتھ پتلون کی جیب میں جاتا ہے۔ انگلیاں دس روپیے کے نوٹ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ہاتھ باہر نکال کر بیوی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں آہستہ سے کہتا ہوں:

"اسے جے جے لے جاؤ"۔

طلعت پھر بلک اٹھتی ہے۔ بڑی بیٹی نے سر سے ڈھلکا ہوا دوپٹہ سنبھال کر ماں کو دیکھا۔ میں سمجھ گیا وہ ماں کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔

"جاؤ، نسیم کو ساتھ لے جاؤ"۔

"آپ آج چھٹی کر لیتے"؟

"باؤلی ہوئی ہو۔ صاحب لوگ انگلینڈ جارہے ہیں۔ ایرپورٹ تو جانا ہی ہوگا"۔

کیمس کارنر پر واقع گرینڈ پراڈی اپارٹمنٹ سے مرسڈیز لے کر نکلا ہوں اور گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے سوچتا ہوں، بیرام سیٹھ بھی مزاجاً ڈھونڈو کے صاحب کی مانند ہے۔ کیوں نہ اپنا مسئلہ میں اس سے بیان کروں۔ بیوی طلعت کو لے کر جے جے پہونچ گئی ہوگی، اور جے جے بیرام کے دادا نے بنوا کر غریب شہریوں کے علاج معالجہ کی خاطر میونسپل کارپوریشن کی تحویل میں دے دیا ہے۔ اگر بیرام سیٹھ وہاں ایک فون کر دے تو جے جے کا پورا اسٹاف میری بچی کو بچانے کی خاطر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کر دے گا۔ لیکن دیر ہو چکی ہے شاید۔ یہ تو ایرپورٹ کے لیے نکل چکے ہیں۔

"یار ڈھونڈو! تم تیمناپتی پر ہی کیوں رہ گئے۔ دجز روڈ طے کرنے کے بعد ادھر کیمس کارنر پر آؤ، دیکھو تو ادھر کتنے موہن ہیں"؟

"میاں! کیا بڑبڑ کرتا ہے۔ اسپیڈ بڑھاؤ۔ اپن کو ایرپورٹ پہونچنے کا ہے جلدل"۔

بیرام سیٹھ 'جلدی' کو ہمیشہ 'جلدل' کہتا ہے۔ مالک کا حکم۔ ذہن سے پہلے میرا بایاں پیر قبول کرتا ہے۔ ایکسیلیٹر پر دباؤ پڑتا ہے اور مرسڈیز ایک لطیف جھٹکے سے ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہے۔

"آپ آج چھٹی کر لیتے"...

"صاحب!"

"بولو میاں۔"

"آپ کو چھوڑنے کے بعد میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ میری بیٹی بیمار ہے۔"

"تو چھٹی کائے کو کرتا ہے۔ عورت کو بول کر آتا۔ اس کو جب میں دکھانے کا۔ گرینڈ پا نے، وہ ہاسپٹل کائے کے واسطے بولا کر دیا ہے۔"

"وہ ادھر ہی گئی ہے اسے لے کر۔"

"بس، فکر نئیں کرنے کا۔ تم ایرپورٹ سے واپس بنگلے پر جاؤ۔ کیٹی کو تھوڑا شاپنگ کرنے کا ہے۔"

"میں .... میں منشی آپ سٹ ہوں صاحب۔"

"کیا وہ ...." مہر د بیرام نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کسی انجانے خوف نے زبان پکڑلی ہے۔ میں نے بیک ویو مرر میں انھیں دیکھا۔ دونوں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ پھر بیرام سیٹھ مجھ سے کہتا ہے:

"گاڑی کوئی بھی ٹیکسی اسٹینڈ پر روکو، اور تم واپس جاؤ۔"

واپسی طوفانی رفتار سے ہوئی ہے۔ بنگلے کے دروازے پر آیا اور باورچی کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے بیرام کی سالس کیٹی بھی موجود ہے۔

"تم گھر جاؤ بھائی، تمھاری بچی ...."

"کیا.... ؟!"

وہ خدشہ جو پچھلے دو دنوں سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا، زبان پر آنا چاہتا تھا، لیکن نہ آیا۔ البتہ لینا ضبط نہ کر سکی اور اس کے آنسوؤں نے میرے ذہن میں موجود خدشہ کو زبان دے دی۔ بس۔ ایک سسکاری منہ سے نکلی اور اسی پل کیٹی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچی میری چل بسی تھی، لیکن خوف زدہ کیٹی تھی۔ وہ نظریں چُراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہم سب دل گیر ہے۔ جاؤ گاڑی لے کر جاؤ۔"

کیمس کارنر سے ابراہیم رحمت اللہ روڈ بہ مشکل دس منٹ کے فاصلے پر ہے، پر آج تو یہ مسافت میلوں پر محیط معلوم ہو رہی ہے۔ گاڑی کا اے سی یونٹ پوری رفتار سے کولنگ پھینک رہا ہے اور میرے دل ودماغ میں دہکتے جہنم کی تپش آنکھوں سے خارج ہونا چاہتی ہے لیکن ہو نہیں رہی ہے۔

بلڈنگ کے سامنے گاڑی سے اترتے ہوئے میں نے بچوں کو دیکھا۔ کچھ لڑکے کمرے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ کچھ غم زدہ سے کھڑے ہیں۔ مکان کی کھڑکی سے پڑوس کی عورتیں جھانک رہی ہیں۔ میری نظریں ادھر ادھر بھائی کو ڈھونڈھتی ہیں، وہ نظر نہیں آرہا۔ کار کا دروازہ مقفل کرنے کے بعد میں کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ بیوی کی خالی خالی نظریں مجھ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ عورتیں کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی ہیں۔ نسیم، فہیم، اقی، نگو اور ضیا سب رو رہے ہیں اور زمین پر قبلہ رو، سات مہینے کی طلعت پڑی ہے۔ خاموش۔ چپ، ساکت، اس کی پلکیں پوری طرح بند نہیں ہوئی ہیں۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں اس کی آنکھیں مجھ سے مخاطب ہیں۔

پاپا! میں نے آپ کی مجبوری جان لی ــــ اور آپ کی مشکل حل کر دی۔ ممی، بھائیوں اور بہنوں میں سے کسی نے بھی تو آپ کی مجبوری کو نہیں سمجھا، اسی لیے اُدھر آپ ڈیوٹی پر گئے، اِدھر میں نے اپنی سانسیں سمیٹ لیں۔ پر ــ پاپا! مجھے دادی کے پاس تو پہونچانا ہی پڑے گا۔"

وہ جہنم جو دل اور دماغ میں دہک رہا تھا، آخر کار آنکھوں کی راہ بہہ نکلا۔ رونے دھونے کے بعد، میں کمرے سے نکل کر باہر آگیا ہوں۔ بھائی ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ پڑوسی آرہے ہیں۔ سروں پر رومال باندھے پُرسہ دے رہے ہیں۔ عارف نے حفیظے کو خبر کر دی ہے، وہ آتا ہی ہوگا۔ میں عارف کو مکتبہ بھیجتا ہوں کہ میرے دوستوں کو بھی خبر مل جائے اسی شہر میں میرے والد ہیں۔ دوسرے بھائی ہیں۔ شاید وہ بھی آ جائیں۔ اطلاع تو ہر جگہ کر ہی دی ہے عارف نے۔ کسی غم گسار نے چائے کا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ بہ مشکل دو چار گھونٹ ہی حلق سے اتار پایا کہ دل سے ایک بونڈر اٹھا ہے۔ جس راہ سے عارف ابھی گیا ہے اسی پر دھونڈو آ رہا ہے۔ میرے دل کی آواز شاید اس نے سن لی ہے۔ میرا دوست۔ میرا یار۔ مگر نہیں یہ تو.... حفیظے ہے۔ مگر اس کے ساتھ کون ہیں؟ اقو، دنے، جیت نرائن یا راجارام؟ کوئی بھی نہیں۔ صرف اور صرف حفیظے۔

حفیظے مجھ سے لپٹ کر مجھ کو تسلی دے رہا ہے۔ اس کا تھل تھل وجود کچھ زیادہ ہی تھل تھلانے لگا ہے۔ میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ ادھر حفیظے میری کمر تھپ تھپا رہا ہے۔ کتنی کٹھن گھڑی ہوتی ہے کسی کو پرسہ دینے کی۔ میرا شاعر دوست کتنا مجبور ہے۔ مجبور رہے یا الفاظ اپنا تاثر کھو بیٹھے ہیں۔؟

"آج عوامی سنٹر میں ادبی نشست ہے۔ آپ کے تمام دوست وہاں چلے گئے۔ موتی نے وہاں خبر کروا دی ہے۔"

میں اور حفیظے عارف کے چپ ہوتے ہی ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پھر حفیظے کی نگاہ اس راہ پر پڑتی ہے جو بڑی سڑک سے متصل ہے۔ میری نظریں بھی اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہ نے اور سکو آ رہے ہیں۔ یہ...... تین بتی کے راما یہاں کیوں آ رہے ہیں؟ لیکن نہیں یہ تو امرت اور لینا ہیں۔ کاش میرے لیے بھی کوئی تین بتی جیسا علاقہ ہوتا، جہاں تین چار روز پہلے کسی ڈھونڈے کے حکم پر رومال گھومتا۔ ایک رستم اکٹھا ہوتی تو میں بھی طلعت کو اتنی آسانی سے مرنے نہ دیتا۔

"اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیجئے۔"

"کس کا انتظار ہے۔؟" آٹھ نمبر والے صغیر بھائی پوچھ رہے ہیں۔ مجھ سمیت سوگواروں کا مجمع ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جواب سن لینے کے بعد وہ پھر سوال کرتے ہیں۔

"خبر کر دی تھی نا؟ چچا نہیں آئے۔ بابا راجا نہیں آئے۔؟"

میرے بچے ان سوالوں کے جوابات دیتے ہیں۔ پھر بھتیجی گلوگیر انداز میں بھائی کی آمد کی خبر سناتی ہے۔ سب کی نظریں ایک ساتھ اٹھتی ہیں۔ صغیر بھائی مجھے تیاری کا حکم دیتے ہیں۔

پانچ منٹ بعد طلعت کا لاشہ ہاتھوں پر اٹھائے میں گھر سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ بیوی قمیص کا دامن پکڑ کر بین کرتے ہوئے پوچھتی ہے کہ میرے چاند کو کہاں لے جا رہے ہو؟ شکیلہ بھابی نے اسے سنبھال لیا ہے اور اب میں گھر سے باہر ہوں۔ گھر میں کہرام برپا ہے۔ بھائی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے صغیر بھائی غیظ کے عالم میں اس سے کہتے ہیں:

"اوئے باہر نکل۔ دیکھتا نہیں، بچی کی میت باپ کے ہاتھوں پر ہے۔"

کئی ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ حفیظے، عارف، امرت اور پڑوسیوں کے ہاتھ۔ مگر وہ ہاتھ مجھے نہیں دکھائی دیتے جنھیں نظر آنا چاہئے۔ میری نگاہیں تو بابا اور چھوٹے بھائیوں کو تلاش کر رہی ہیں، اور جو بھائی میرے سامنے ہے وہ قریب ہو کر بھی کتنا دور ہے۔ سات ماہ کی چھوٹی سی جان کا غم کتنا شدید ہے۔

طلعت عارف کے ہاتھوں پر ہے۔ اس کا آخری سفر شروع ہو چکا ہے۔ پیچھے بین و بکا کا شور ہے۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ پر بھی کہرام برپا ہے۔ ٹریفک کا شور، ہارنز کی آوازیں، لوگوں کا سمندر اور سامنے یعقوب گلی میں عوامی سنٹر کی چھوٹی سی کھولی میں میرے ادیب شاعر دوست کسی تخلیق کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہوں گے۔ سماجی حقیقت نگاری کی باتیں ہو رہی ہوں گی، قدریں زیر بحث رہی ہوں گی۔ مجھے تو اپنی طلعت کو والدہ کی قبر میں تو پنا ہے۔

سر اٹھانے کے بعد میں عارف کو تلاش کرتا ہوں، وہ نظر نہیں آ رہا۔ طلعت کسی اجنبی کے ہاتھوں پر ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں، راہگیر جلوس جنازہ پر نگاہ پڑتے ہی سروں کو ڈھک لیتے ہیں۔ کچھ ساتھ چلتے ہیں اور جلوس جنازہ میں شریک ہر شخص طلعت کے ننھے سے وجود کو ہاتھوں پر اٹھانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کر رہا ہے اور نہ جانے کیوں، اب مجھے طلعت کے مرنے کا، کچھ زیادہ غم نہیں۔

□□

محمد بخش مہجور ــــــ صفحہ ۲۳ کا بقیہ

---

۷ تذکرۂ ماہ و سال مولفہ، مالک رام میں سال ولادت ۱۷۸۱ء

۸ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے سرے سے ان تصانیف کو دیکھا ہی نہ ہوگا۔

۹ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ریاض الفصحا میں انھیں ۲۱ سال کا لکھا ہے گویا مہجور سے ۱۲ سال چھوٹے تھے۔

۱۰ ناسخ کے شاگرد (ریاض الفصحا)

۱۱ چمپا حقیقت میں سنسکرت "چمپا" ہے۔

گراں قدر مراتب کیا وہ شئے تھی

گراں قدر مراتب کیا وہ شئے تھی
وہ اک مالا جسے گوندھا تھا میں نے
وہ اک مالا جسے گوندھا تھا تم نے
وہ مالا جس کے ہر دانے پہ لکھا لا الٰہ تھا
کہ جس کی آب سے ہر اک شلا پہ رام لکھا تھا
اسی کے ورد سے نروان بھی تھا۔ موکچھ بھی تھا۔ وصل بھی
وہ اک مالا
کہ جس میں ایک دانہ رام نے گوندھا
محبت کا، اخوت کا، مروّت کا
وہ اک مالا
کہ جس میں ایک دانہ کرشن نے گوندھا
محبت کا۔ ریاضت کا۔ عمل کا
وہ اک مالا
کہ جس میں نانک و چشتی و وارث نے
پروئے دانۂ اخلاص و ایثار و رواداری
وہ مالا کس قدر عظمت نشاں تھی
تلک، رسکھان و میر اسکے ادب کی جان تھی
کلامِ غالب و چکبست کی سوغات تھی
وہ مالا کس نے توڑ دی۔ کیسے ٹوٹی
ہر اک دانہ فضا میں ایسا بکھرا
سرا مالا کا ملتا بھی نہیں تھا
فضا میں کس طرح اس کو میں ڈھونڈوں
نہیں ہمدم کوئی جس کی مدد لوں
بس اک امید ہے جس کے سہارے
مری کوشش ہے جاری
کبھی تو کوئی چارہ ساز ہوگا
بڑھے گا میری جانب اور کہے گا
گراں قدر مراتب کیا وہ شئے تھی



اسرار سید
ممتاز ہاؤس
نیپئر روڈ۔ لکھنؤ

مسکہ ......

(صلا کا بقیہ)

انجمن سادات امروہہ، کراچی، جن کی آسودہ حالی کی خبریں سُن کر جی خوش ہوتا ہے)۔

۵ـ اب سے تقریباً ۱۰ سال پہلے تک یہ سہ دری اپنی اصلی شکل میں باقی تھی؛ چھات کڑی کی چھت، اندرونی دیواروں میں تلے اوپر متعدد چھوٹے بڑے طاق، کچا فرش، دیواروں پر کہگل (یا ریک بھس ملی ہوئی مٹی سے استرکاری) یہ سہ دری چھوٹی اینٹ سے بنی ہوئی ہے اور دیواروں کے آثار کافی چوڑے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جب ایک مرتبہ برسات میں اس کی چھت بیٹھ گئی تو راقم الحروف نے چھت بدلوانے کے ساتھ ساتھ عمارت کو مستحکم بنانے کے خیال سے طاق بندی کرادی اور کہگل کو صاف کراکے دیواروں پر سیمنٹ کا پلاسٹر کرادیا۔ اس طرح اب سہ دری کی شکل بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہے، لیکن دروازوں کے وہ موٹے موٹے بھدّے کواڑ جو شاید میر عارف علی ہی کے زمانے کے ہیں، ابھی تک تبدیل نہیں کرائے ہیں تاکہ اس سہ دری کی تاریخی اہمیت باقی رہے۔

(منظر)



لئیق اختر فیض آبادیؔ
امام باڑہ ۔ فیض آباد (یو۔پی)

یہ دیکھے بھالے چہرے

نام اور شہرت والوں کی بھیڑ میں کچھ چہرے ایسے بھی ہیں جو نام و نمود کے چکر سے اور دامِ شہرت کی اسیری سے بہت دور رہتے ہیں اس مضمون میں ذکر ہے انہی دیکھے بھالے چہروں کا۔

(ل۔ الف)

پہلا چہرہ

دراز قد، موٹا تازہ بدن، میانہ رنگ، جامہ زیب۔ غضب کی ذہانت ۔۔۔ حاضر جوابی کے سو فی صد مالک۔ رئیسانِ شہر ان کے پرستار، راجے مہاراجے ان کے گرویدہ، حکام ان کے شیدا، جس بزم میں پہونچ جاتے قہقہوں کی بارش ہونے لگتی۔ "کوڑی نہ رکھ کفن کو" پر عامل۔ شاہ خرچی میں طاق، نہ ان کو پانے میں دیر لگتی تھی نہ لٹانے میں۔ نجیب الطرفین سید تھے نام تھا سید ایوب حسین۔

ایک دن ایک مشہور و معروف مغنیہ نے کہا:

"سید صاحب! آپ کی پیشانی تو بس دو انگل کی ہے۔"

برجستہ جواب دیا ــــــ

"لیکن مقدر ہاتھ بھر کا ہے۔"

جون کے ابتدائی دن تھے اور صبح کا وقت۔ ایوب صاحب چہل قدمی کرتے ہوئے گزر رہے ایک ایسے راستے سے جس راستے میں ان کے حبیب صادق اور رفیق دیرینہ کی جوتوں کی دکان تھی۔ دوست شوکیس میں جوتے "ٹانگ رہے تھے، ایوب صاحب نے پوچھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔؟"

دوست نے جواب دیا، "جوتے لگا رہا ہوں۔"

ایوب صاحب نے فوراً نہلے پر دہلا پھینکا ــــــ باپ دادا کا نام بھی تو لیتے جاؤ" ــــــ

گرمیوں کی شام تھی۔ بہشتی اپنی مشک سے دیوان خانے کے باہر کچی زمین پر چھڑکاؤ کر کے جا چکا تھا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مہک رہی تھی۔ بید کے مونڈھے لگا دیے گئے تھے۔ خوشبودار پھولوں کے ہار حقوں کے نیچوں میں لپیٹ دیے گئے تھے۔ خانہ ساز تمباکو سے چلمیں آراستہ ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک نووارد تشریف لائے ــــــ جامہ دانی کا انگرکھا بر میں جامہ دانی کی چنی ہوئی دوپلی سر پر، باون چناؤ کا چوڑی دار پاجامہ پہنے، پیروں میں جے پوری ناگرہ، ہاتھوں میں ہاتھی دانت کی نازک سی چھڑی۔ سرخ و سفید چہرہ۔

علیک سلیک کے بعد دونوں ہم عمر بغل گیر ہوئے ــــــ نووارد نے فرمایا:

"حضرت! غریب خانہ لکھنؤ میں ہے۔ ضلع جگت بولنے میں آپ کی شہرت اس کندۂ ناتراش تک پہونچی، حقیر بھی ضلع جگت کے در کا فقیر ہے۔ اس علم سے استفادے اور اس ہنر میں یکتا بننے کے لیے آپ کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

ایوب صاحب نے فرمایا۔" اجی قبلہ! اب کہاں کا ضلع اور کیسا جگت۔ محترم اب تو کھری کلیان اور مواقعاتی زبان راج پاٹ سنبھال رہی ہے۔ آپ تشریف لائے ہیں تو بزرگوں کا عطا کردہ جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ ضرور حاضر کروں گا۔"

نو بجے شب میں دسترخوان بچھا۔ ہمہ نیامتیں (نعمتیں) سجائی گئیں۔ پُرتکلف کھانے کے ساتھ بے تکلف گفتگو کا دور بھی چلتا رہا دس بجے تک تیس چالیس حرف شناس ولفظ آشنا صاحبانِ زبان بھی ضلع جگت سے لطف حاصل کرنے کے لیے آگئے۔ پھر بیٹھے آمنے سامنے ضلع جگت کے دو طرحدار ــــ شروع ہوا ضلع درزی پر۔

لکھنؤ کے میر نادر حسین نے ابتدا کی: ــــ

"اپنے کام کاج میں جواب نہیں رکھتا۔"

ایوب صاحب نے کہا: ــــ

ماہرِ فن نہ ہوتا تو آنکھوں کو بٹن کیسے بناتا۔؟"

ــــ "پیسہ لے کر جیب کاٹتا ہے۔"

ــــ "آپ جیب میں پڑے رہیے وہ گلا کاٹ کر بھی سزا نہیں پاتا۔"

ــــ آستیں میں دشنہ پنہاں رکھتا ہے۔"

ــــ "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست۔"

ــــ "قسمت کی یک سوئی اسی کو کہتے ہیں۔"

ــــ "لاحول ولا قوۃ! ایسی بھی کیا یک سوئی جو رنگ برنگے دھاگوں کی مرہونِ منت ہو۔"

تین بجے شب میں ضلع ختم ہوا سید ایوب حسین صاحب کی فتح پر۔ دسمبر کی وہ رات ان کی زندگی کی آخری رات تھی۔ برف میں بھلی ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دانت سے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ وہ گئے ایک دعوت میں، رات گئے واپس آئے، حسبِ دستور صبح صادق کے وقت اٹھے، نمازِ فجر کے بعد چائے پی کر لیٹ رہے، جب ناشتہ آیا تو کہنے لگے

"بائیں طرف سینے میں درد ہے۔ ناشتہ نہ کروں گا۔"

اعزا سمجھے کہ ریاحی تکلیف ہوگی، دن میں درد کی وجہ سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ دو بجے دن میں ان کے ایک عزیز ترین دوست آگئے۔ پُرلطف باتوں میں مصروف ہوکر درد کی تکلیف بھول گئے۔ یکبارگی درد کا ایسا لہرا آیا کہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبا کر یا علیؑ ادرکنی کہا اور ہمیشہ کے لیے بلبلِ ہزار داستان نے آنکھیں بند کرلیں۔

دُوسرا چہرہ

نہ لمبے، نہ ناٹے، درمیانی قد، کسا ہوا بدن، ڈھلکا ہوا رنگ، صوفی منش فرشتہ خصلت، عابد شب زندہ دار، بلند پایہ شاعر۔ غزل، ہزل، قصیدہ، نعت پاک، مرثیہ، سلام، نوحہ، مخمس، مثنوی، کھٹمل نامہ، مچھر نامہ، بیل نامہ، پیچش نامہ، قطعہ، رُباعی، کہہ مکرنی، دوہہ۔ جو کچھ بھی انھوں نے کہا مستند تھا ان کا فرمایا ہوا۔

ماہر نباض، حکیم حاذق، علم نجوم کے واقف کار۔ کہیں جم کر بیٹھے ہوتے تو لاکھوں میں کھیلتے۔ سادہ لوح، سادہ مزاج، سادہ لباس، سادہ رہن سہن، سادی غذا، یہ تھے سید علی عباد قیس زنگی پوری۔ پوری زندگی آبِ رواں کے مانند گزار دی۔ ملوک الکلام نے اپنے کلام کا جتنا بھی اثاثہ چھوڑا تھا اگر وہ رائیگاں نہ ہوگیا ہوتا تو اردو شاعری کا گنجِ گراں مایہ ہوتا۔

استخارہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا سفر حضر، مشاعروں، مقاصدوں اور مسالموں میں شرکت بھی استخارہ پر مبنی ہوتی تھی۔ ایک مقاصدہ میں جب معرکہ آرا قصیدہ سنا چکے تو ہزاروں پرستاروں کی خواہش پر دوسرا قصیدہ سنانے کے لیے شیروانی کی اوپری جیب میں تسبیح نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا۔ جب ایک جیب میں تسبیح نہیں ملی تو دوسری جیب میں تلاش کی، وہاں بھی تسبیح نہ تھی، اتنے میں سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب علم و مرتبہ شناس دوست نے ان کی تسبیح ان کو دکھا کر کہا ــــ

"لازم کی ملزوم میرے پاس ہے۔"

قیس صاحب نے فوراً شیروانی کے بٹن کھولے اور پھر قمیص کی جیب سے دوسری تسبیح نکال کر فرمایا:

"عقل مند برسات میں دو چھاتے لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ جب ایک بھیگ جاتا ہے تو دوسرا لگا لیتے ہیں۔"

ایک دن سرِ شام الہ آباد میں ڈاکٹر مصطفےٰ صاحب مرحوم کی

کوٹھی پر یہ اطلاع پاکر جناب نوح ناروی صاحب مرحوم تشریف لائے کہ قیس صاحب وہاں ان دنوں مقیم ہیں۔ نوح ناروی صاحب نے ایک شعری نشست میں قیس صاحب کو مدعو کیا، قیس صاحب نے استخارہ دیکھا، بہتر آیا، منظوری دے دی۔

نوح صاحب نے فرمایا: "طرحی نشست ہے "گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے" مصرع طرح ہے۔ قیس صاحب اس نشست میں شریک ہوئے۔ تین بجے رات میں ان کی باری آئی تو تمام سخن فہم ہمہ تن گوش بن گئے۔ اس وقت غزل جدیدیت کے نرغے میں پوری طرح نہیں آئی تھی۔ قیس صاحب نے مطلع سنا کر سب کو مسحور کر دیا ۔

لحد میں آئے ہیں جس دل کے ہم ستائے ہوئے
اسی کو پھر بھی کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

اس شعر پر داد و تحسین کی اتنی زوردار بارش ہوئی کہ قیس صاحب شرابور ہو گئے ۔

پلٹ کے پھر مری جانب نگاہ ناز سے دیکھ
شکار ہاتھ سے جاتا ہے چوٹ کھائے ہوئے

دوسری غزل کا یہ شعر حاصلِ شعری نشست قرار دیا گیا تھا ۔

لوٹ میں زلف کے ہاتھ آئی پریشانیِ دل
سرخیِ خونِ تمنا گلِ رخسار کے ہاتھ

تیسری غزل کا مندرجہ ذیل شعر زبان زدِ خاص و عام ہو گیا تھا ۔

کیا گہرے گہرے گھاؤ ہیں تیرِ ملال کے
آؤ تمھیں دکھائیں کلیجہ نکال کے

کبھی کبھی قیس صاحب خطِ نستعلیق میں بذلہ سنجی کی تحریر بھی بن جاتے تھے ۔ ایک شام ایک بزرگوار جو بہ آواز بلند مرضِ ریاح میں مبتلا تھے، بھری بزم میں اپنے مرض کا مظاہرہ کر بیٹھے۔ قیس صاحب نے بزرگوار کو مخاطب کر کے کہا:

"باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا"

سطحِ ذہنِ ثقاہت کی ناہمواری اگر پیشِ نظر نہ ہوتی تو میں قیس صاحب کے نو تصنیف "پیچش نامہ" کے پندرہ بند نقل کر دیتا۔ لیکن خوفِ فسادِ سوئے ادب کی وجہ سے صرف ایک بیت پر اکتفا کر رہا ہوں۔ پہلے "پیچش نامہ" کی تخلیق کی وجہ بیان کر دوں ۔

قیس صاحب کے دوستوں میں ایک مولوی صاحب بھی تھے بڑے متقی، زاہد اور اللہ والے۔ خلافِ شرع وہ تھوکتے بھی نہیں تھے وہ ایک حدیث کے مطابق کبھی کسی مردِ مومن کی دعوت سے انکار نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے اکثر ہم جماعت ان کے متعلق کہا کرتے تھے ۔

جان جائے خرابی سے
ہاتھ نہ ہٹے رکابی سے

ایک دعوت میں مولوی صاحب نے میزبان کے پیہم اصرار پر کچھ اتنا زیادہ نوش جان کر لیا کہ خونیں پیچش ہو گئی۔ قیس صاحب نے دوستانِ باصفا کی فرمائش اور مولوی صاحب کی منظوری سے پندرہ بند کا پیچش نامہ فی البدیہہ نظم کر دیا ۔

پیچش کے خوں سے سُتدا ہر اک سرخ پوش ہے
مہتر کا ٹوکرا سبدِ گل فروش ہے

ایک دن ایک عزیز قریب کے پروردۂ ناز و نعم اکلوتے جوان سال صاحبزادے تشریف لائے۔ قیس صاحب قیلولہ فرما رہے تھے۔ وہ صاحبزادے حفظِ مراتب سے ناآشنا اور تہذیبِ بزرگاں سے بے خبر قیس صاحب کے سرہانے بیٹھ گئے۔ قیس صاحب کو یہ بے ادبی ناگوار ہوئی۔ اپنی ناگواری پر قابو پاکر انھوں نے اپنے ایک بھتیجے کو آواز دی۔ بھتیجے صاحب فوراً حاضر ہوئے ۔

قیس صاحب نے کہا: "میاں آپ فوراً قرآن مجید لے آئیں"

قرآن مجید آیا تو قیس صاحب نے کہا: "میرے سرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین کی تلاوت کرو"

بھتیجے نے گھبرا کر پوچھا۔ "عمو جان! خدا آپ کا سایۂ حیات ہم سب کے سروں پر تا حشر قائم رکھے۔ یہ سورۂ یٰسین کی تلاوت کا حکم کس لیے؟"

قیس صاحب نے جواب دیا۔ "یہ صاحبزادے قبضِ روح کے لیے سرہانے تشریف لا چکے ہیں۔"

—— صاحبزادے اپنی غلطی پر چونکے اور لگے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرنے۔

تیسرا چہرہ

چھریرا بدن۔ درمیانی قد و قامت، بات کے دھنی، دُھن کے پکّے، ذاکر، مقرر، مورخ، محقق، ادیب، شاعر، مفکر، دانش ور —— مہمان نواز، وضع دار، وسیع القلب، کشادہ ذہن، ہر مذہب و ملت میں مقبول، ہر دل عزیز، حق گو، حق پرست، حق نواز۔ سچوں کے دوست، جھوٹوں کے دشمن۔ خدا کے علاوہ نہ وہ کبھی کسی سے ڈرے نہ کسی سے دبے۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔

یہ تھے مولوی سید علی اظہر عرف اچھن صاحب —— وہ اپنی حق پرستی مظلوم نوازی اور صاف گوئی کی وجہ سے زندگی بھر انگاروں سے کھیلتے اور خارزاروں سے الجھتے رہے۔ تحریک تقسیم وطن کے سخت ترین مخالف، یوں تو بڑے بڑے مسلم لیگی رہنماؤں سے ان کے قریبی روابط تھے پھر بھی وہ مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی دھجیاں اڑاتے رہتے تھے۔ فیض آباد کے عید ملن کے وہ بانی تھے۔ ہولی ملن کے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ قومی امور ہوں یا ملی معاملات۔ لوکل باڈیز کے الیکشن ہوں یا اسمبلی اور پارلیمنٹ کے چناؤ۔ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی اہمیت کو تسلیم کرا لیتے تھے۔ جب وہ جوان تھے اس وقت ہاکی، فٹ بال، اور ٹینس کے بہترین کھلاڑی تھے۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ دونوں وقت ان کے دسترخوان پر چار چھ مہمان ضرور ہوتے۔ لذیذ طعام کے دلدادہ تھے۔ کوفتہ کباب، اسٹو، چقندر گوشت، انڈے دانے، مٹر پلاؤ اور نورتن چٹنی بڑے اہتمام اور پورے لوازم کے ساتھ خود تیار کرتے۔ علمائے کرام، سیاست داں، وزراء، رئیسان شہر، سنت سادھو سب گھرے اور مخلصانہ روابط رکھتے تھے۔ مزاج یار کی خاطر بھی کبھی کسی نے ان کو سر تسلیم خم کرتے نہیں دیکھا۔

امام باڑہ جواہر علی خاں فیض آباد میں واقع جامع مسجد میں سید علی اظہر صاحب کے بزرگوں کی قائم کردہ سالانہ مجلس عاشور کے دن دو بجے آج تک اپنی قدیمی روایات کے ساتھ برقرار ہے۔ شہر کے ہزاروں پیر و جوان و طفل سوگواران حسین سر و پا برہنہ اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ جب تک علی اظہر صاحب زندہ رہے، اس مجلس کو خطاب کرتے رہے۔ نویں محرم کی شام ہی سے علی اظہر صاحب چاک گریباں اور سر و پا برہنہ ہو جاتے۔ ان کی سات آٹھ منٹ کی ذاکری میں قیامت خیز گریہ ہوتا تھا۔ اب اس مجلس کو اتر پردیش کے سابق لوک آیکت جسٹس مرتضیٰ حسین صاحب خطاب کرتے ہیں۔

علی اظہر صاحب محب اہلبیتؑ اور شیدائے حسینؑ ابن علیؑ تھے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ ان کا انتقال عاشور کی شب میں ہوا۔ بعد غسل و کفن ان کا جنازہ جامع مسجد میں منبر کے پاس عاشور کے دن رکھ دیا گیا۔ وہ منظر بہت ہی گریہ کن تھا۔ ذاکر شاہِ مشرقین منبر کے قریب ابدی نیند سو رہا تھا اور منبر پر جسٹس مرتضیٰ حسین صاحب اپنے مخصوص انداز میں مصائب کربلا بیان کر رہے تھے۔

عاشور کے دن ۵ ½ بجے بلا تفریق مذہب و ملت ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اپنے عہد کی چلتی پھرتی انسائکلو پیڈیا، عربی فارسی اور اُردو ادب کی بولتی لائبریری اور معلومات عامہ کی جیتی جاگتی تصویر آغوش لحد کے سپرد کر دی گئی۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

□□

ہندستانی تہذیب کا اجتماعی تشخص .... صہ ۳۲ کا بقیہ

اطلاعات کی افراط، صارفانہ جذبے کی ترقی، بیک وقت مختلف متضاد اور باہم متصادم افکار و نظریات کی بھرمار نے فرد کی آزادیٔ فکر و عمل سلب کر لی ہے۔ اس معجون مرکب نے ہندستانی تہذیب کے اجتماعی تشخص کو مزید انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔

حواشی:

۱؎ ادب اور تہذیبی ورثہ؛ سید احتشام حسین
۲؎ روح تہذیب؛ خواجہ غلام السیدین
۳؎ ایضاً
۴؎ شریمد بھاگوت گیتا۔ ۱۲ واں اشلوک
۵؎ مغربی تمدن کی ایک جھلک؛ مولانا سید مجتبیٰ موسوی لاری۔



ڈاکٹر بشیشر پردیپ

اے ۵۵۵ ۔ اندرا نگر ۔ لکھنؤ

تار ٹوٹنے تک

اُس کے اسپتال سے آنے کے بعد اس گلی کے باشندوں میں سب سے پہلے جو اس کی عیادت کو آیا وہ موتی تھا ۔ اس کے پڑوسی کا کتّا ! موتی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دُم ہلانے لگا ۔ اور جب وہ اس کی چارپائی کے نزدیک آیا تو اس نے دیکھا موتی کا پیٹ پھولا ہوا ہے ۔ اس کے اپنے پیٹ کی طرح ـــ اور وہ حیران رہ گئی ـــ وہ اپنی بیماری کو بھول کر موتی کے پیٹ کو دیکھنے لگی ۔

" یہ کیا ہوا تجھے موتی ـ ؟ " اس نے ہاتھ بڑھا کر موتی کو سہلایا اس ایک پل میں وہ اپنا درد بھول گئی ۔

آج پورے ایک ماہ بعد اس نے موتی کو دیکھا تھا ـــ اسپتال میں اپنی بیماری ، دواؤں ، ڈاکٹروں ، نرسوں اور عیادت کے لیے آنے والے عزیزوں ، رشتہ داروں کے درمیان وہ موتی کے بارے میں بالکل نہیں سوچ سکی تھی ۔ جب موتی کے مالک اس کی عیادت کے لیے آئے تھے تو اس نے ان سے موتی کے بارے میں پوچھا تھا لیکن اس وقت انھوں نے نہیں بتایا تھا کہ موتی بیمار ہے ـــ تو کیا یہ انھی دنوں بیمار پڑ گیا ـ ؟ !

اُسے کینسر تھا ـ اور اب تیسری منزل میں تھا ـ گھر والوں نے اسے اُس کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی مہلک بیماری ہے ۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی بیماری اب آخری منزل میں ہے ۔

اب کی بار وہ پورا ایک ماہ اسپتال میں رہی تھی اور اب ڈاکٹروں نے اس کے شوہر کو بتا دیا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے ۔ گھر لے جائیے ۔ زندگی کے آخری چند روز وہ گھر میں گزار لے اور جب وہ گھر آئی تو حیران تھی ـــ لوگ صحت یاب ہونے کے بعد اسپتال سے چھٹی پاتے ہیں اور وہ بغیر صحت یاب ہوئے اپنے گھر آ گئی تھی ـ !

" گھر میں آرام رہے گا ـــ ہے نا ؟ " گھر پہونچنے کے بعد اسے سہارا دے کر اس کی چارپائی تک لاتے ہوئے اس کے شوہر نے اس سے کہا ۔

" ہاں ـ " اس نے بے چارگی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پلنگ پر بیٹھ گئی ـ اُف ! وہ کتنا تھک گئی تھی ـ !

اس نے دیکھا تھا کہ اس کا شوہر اس سے نظریں ملانے میں گھبراتا ہے ۔ شاید اس لیے کہ اس کی نگاہیں کہیں چغلی نہ کھا جائیں ۔

وہ شوہر سے پوچھنا چاہتی تھی ـــ آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں آپ میں اتنی ہمت کیوں نہیں ہے ؟ آپ یہی سمجھتے ہیں نا کہ میں مرنے سے پہلے نہ مر جاؤں ؟ نہیں ایسا نہیں ہوگا ـــ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ موت کو خوشی خوشی گلے لگا لوں ـــ جتنی زندگی ہماری قسمت میں لکھی ہے وہی تو جینے کو ملے گی ـــ جتنی مدت کے لیے ہم دونوں کا ساتھ ہے اتنا ہی ساتھ تو رہے گا ـــ زندگی نے جو کچھ بھی ہمیں دیا ہے ہم اس کے لیے زندگی کے شکر گزار ہیں ۔

لیکن جب وہ اپنے شوہر کے اداس چہرے کی طرف دیکھتی تو خود بھی اداس ہو جاتی ـــ اس کا علاج اب زیادہ تر ان دواؤں پر موقوف تھا جو اس کے درد کو کم کرنے کے لیے دی جاتی تھیں ۔

جیسے ہی دوا کا اثر کم ہوتا وہ کراہ اٹھتی۔ اور اس کا شوہر اسے پھر دوا دے دیتا اکثر ایسا بھی ہوا کہ اسے ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہوتا اور موتی آجاتا۔۔۔ اور وہ اپنا درد بھول کر موتی کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھنے لگتی۔ موتی کے مالک کے لڑکے راجو نے اسے بتایا تھا۔

"آنٹی! موتی کو ایسائٹس (ASCITES) ہوگیا ہے۔ اس کے پیٹ میں پانی ہوجاتا ہے۔ چار پانچ بار نکلوا چکے ہیں۔ پہلے ہر ہفتہ نکلواتے تھے۔ اب ہر دوسرے تیسرے دن نکلوانا پڑتا ہے"۔

اور ایک دن جب راجو آیا تو موتی بھی اس کے پیچھے پیچھے آگیا گرتا پڑتا۔ جھولتا ہوا سا۔ پھولے ہوئے پیٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔۔۔ راجو اس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور موتی پاس کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سر کو ایک طرف جھکا کر عجیب سوالیہ انداز میں۔۔۔

راجو بولا۔ "آنٹی! ڈاکٹر کہتا ہے موتی کا علاج کرنا بالکل بے کار ہے۔ یہ بچے گا نہیں۔۔ اسے مروا دینا ٹھیک رہے گا۔"

اور وہ روہانسا ہوگیا۔ یہ سن کر وہ بھی اداس ہوگئی۔۔ اس کی اپنی بیماری کے بارے میں ڈاکٹر سب جانتے ہیں۔ انھوں نے اس کے شوہر کو بھی بتادیا ہے۔ شوہر نے اگرچہ اسے نہیں بتایا ہے لیکن وہ جان گئی ہے۔۔۔ شوہر کو معلوم ہے کہ وہ بچے گی نہیں۔ پھر بھی اس کا علاج کروا رہا ہے۔۔۔ اور وہ بھی برابر دوا لے رہی ہے۔ جب تک سانس تب تک آس۔۔۔ لیکن موتی ؟۔۔۔ وہ تو جانور ہے۔۔ اس نے موتی کی طرف دیکھا۔ موتی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہہ رہا ہو۔۔

"ہاں۔ اب میں دو چار ہی دن کا مہمان ہوں"۔

موتی آنکھوں سے باتیں کرتا تھا۔ اپنی مہلک بیماری کے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا۔ اپنا دکھ۔ اپنی بے بسی۔

اس نے دیکھا۔ موتی کا پیٹ آج کچھ زیادہ پھولا ہوا ہے۔ لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف چلے گئے۔۔۔ اس نے اندازہ لگایا۔۔ اس کا پیٹ بھی کافی اوپر تک پھول آیا تھا۔۔ وہ لیٹے لیٹے اپنے پیٹ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ہاتھوں سے پیٹ کی سوجن محسوس کر لیا کرتی۔ اس کے پیٹ کی سوجن بڑھتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر تو باقاعدہ فیتے سے اس کے پیٹ کی سوجن ناپا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے اور نگاہیں موتی کے پیٹ کی طرف۔

کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے موتی کی بیماری اور اس کی اپنی بیماری ایک سی ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ اور بھی موتی کے نزدیک آگئی تھی۔

موتی آتا تو وہ اس سے کہتی۔۔

"ارے موتی! اب تو نہ آیا کر۔ دیکھ! تجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جاتا۔ تیری تو اب ٹانگیں بھی ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔۔۔ نہ آیا کر اب!"

لیکن موتی کی آنکھیں جواب دیتیں۔۔۔ "جب تک چل سکوں گا۔۔ آؤں گا ضرور۔ اور جب ٹانگوں پر کھڑا ہی نہ ہو پاؤں گا تو بات دوسری ہے۔"

وہ خود بھی تو اب بہ مشکل ہی بیڈ پر سے اٹھ پاتی ہے۔۔۔ ابھی چار ماہ پہلے وہ کتنی چاق و چوبند اور تندرست تھی! اچانک ایک دن اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم ٹوٹ رہا ہے ٹمپریچر لیا گیا تو بخار تھا۔۔۔ اور پھر یہ بخار اس کی زندگی کا حصّہ بن گیا۔۔۔ اسے ہر وقت بخار رہنے لگا۔ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اور بخار۔۔۔

پیٹ میں درد تو اسے پچھلے سال بھی ہوا تھا۔۔۔ اور ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا تھا۔۔۔ اور وہ دونوں فکرمند ہوگئے تھے۔۔۔ ان کے کوئی بچہ نہ تھا۔ آپریشن کے بعد تو بچے کی امید بھی جاتی رہے گی۔۔۔ اور وہ ایسے ڈاکٹروں کا علاج کرانے لگے جو بغیر آپریشن کے شفا کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور اس کا مرض بڑھ گیا۔۔۔ اسے علاج کے لیے بمبئی بھی جانا پڑا۔۔۔ ایک بار نہیں تین بار۔۔۔ اور وہ جان گئی کہ اسے کوئی مہلک بیماری ہے، جو اس سے چھپائی جارہی ہے۔ گھر کے کسی فرد نے اسے نہیں بتایا۔ نہ شوہر نے۔۔ نہ اس کے ماں باپ نے۔۔ لیکن ان کے چہروں پر لکھی تحریر سے اس نے اپنی بیماری کے بارے میں سب جان لیا جس طرح شوہر اسے جھوٹی تسلی دیتا۔ اسی طرح وہ بھی اسے کھوکھلا دلاسہ دیتی۔۔۔

"ارے آپ اداس ہوگئے؟ میں ٹھیک ہوجاؤں گی۔۔۔

بالکل ٹھیک "۔

"ہاں ۔۔۔ یقیناً تم ٹھیک ہو جاؤ گی ۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی "۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے شوہر کے ہونٹوں پر رینگ جاتی ۔ اور اسے دکھ ہوتا ۔ وہ آپس میں اس کی بیماری کے بارے میں کھل کر بات کیوں نہیں کرتے ۔ ؟

جب اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا مرض لاعلاج ہے تو وہ اکیلے میں کتنا روئی تھی ۔ "نہیں نہیں ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ بھگوان ایسا نہیں کر سکتے "۔ لیکن بھگوان کو شاید یہی منظور تھا ۔

اور اب ۔۔۔ اب تو اس نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے ۔۔۔ اس آخری گھڑی کے لیے ۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بھی ہمت سے کام لے ۔۔۔ لیکن اس کا شوہر تو اسے بیماری کا نام بھی نہیں بتا رہا تھا ۔

موتی اب تقریباً روز ہی آ جاتا ۔ کبھی پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ، جب اس کے پیٹ میں پانی بھر جاتا اور کبھی پچکے ہوئے پیٹ کے ساتھ، جب اس کے پیٹ میں سے پانی نکال دیا جاتا

اور ایک دن راجو آیا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ روتا رہا ہے ۔

"کیوں راجو؟ کیا بات ہے ۔ ؟"

"پاپا موتی کو لے گئے ہیں ۔۔۔ مروانے کے لیے ۔۔۔ ساتھ میں ہمارا نوکر شنکر بھی گیا ہے ایک بوری لے کر ۔۔۔ موتی کو انجکشن لگے گا ۔ اور جب وہ مر جائے گا تو بوری میں بند کر کے اسے دریا میں ڈال آئیں گے "۔

اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔۔۔

"دیکھو بیٹا! تمھیں صبر تو کرنا ہی پڑے گا ۔ تم تو جانتے ہو موتی بہت تکلیف میں تھا "۔

"ہاں!" راجو نے آہستہ سے سر ہلا دیا ۔ اور پھر اچانک بولا "آنٹی! تم بھی تو بہت تکلیف میں ہو "۔

۔۔۔ اور وہ سُن ہو کے رہ گئی ۔۔۔ راجو نے کتنی سچی بات کہی تھی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ لیکن موتی تو ایک جانور ہے ۔ وہ اپنی موت پر اپنے سے تعلق رکھنے والوں کی حالت زار کے بارے میں نہیں سوچ سکتا ۔۔۔ وہ یہ سب باتیں راجو کو کیسے سمجھائے ؟!

اس کا شوہر اسے دوا دینے لگا تو اس نے شوہر کو بتایا ۔۔۔ "پڑوسیوں کے کتے کو موت کا انجکشن دے دیا گیا ہے "۔

اس کا شوہر بھی یہ سُن کر اداس ہو گیا ۔ اسی وقت وہ بولی ۔

"یہ مرسی کلنگ (MERCY KILLING) ہوئی نا ۔ ؟ یہ مرسی کلنگ ہے نا؟" یعنی جس کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو، جو بہت تکلیف میں ہو اسے ڈاکٹری رائے سے، اس کی اپنی رضامندی حاصل ہو جانے کے بعد ابدی نیند کا انجکشن دے دینا "۔

اور وہ شوہر کی آنکھوں میں دیکھنے لگی ۔

اور اس کے شوہر نے نگاہیں جھکا لیں ۔

اور اسی وقت اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔

" دیکھیے میں سب جان گئی ہوں ۔۔۔ اب آپ جھوٹ نہ بولیے گا ۔ مجھے کینسر ہے نا ۔ ؟ "

جواب میں اس کے شوہر نے اپنی نگاہیں اس کی طرف کر دیں ۔ کرب ۔ بے چینی ۔ درد ۔ سب ایک ساتھ ان نگاہوں میں سمٹ آیا ۔۔۔ اور پھر ان آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا دیا ۔ درد کی ایک لہر سی اُس ہاتھ سے اِس ہاتھ اور پھر اِس ہاتھ سے اُس ہاتھ تک سرایت کر گئی ۔

"لیکن بھگوان پر تو بھروسہ رکھنا ہی پڑے گا ۔ آگے جو بھی قسمت میں لکھا ہے "۔

"یہی تو میں بھی کہنا چاہ رہی تھی ۔ دو ہی باتیں تو ممکن ہو سکتی ہیں ۔۔۔ مرسی کلنگ ۔ یا پھر صبر اور تحمل سے اس بیماری کو جھیلنا ۔ جتنے دن بھی زندگی باقی ہے ۔ ہم دونوں کا ساتھ باقی ہے ۔۔۔ ہنسی خوشی گزار دینا "۔

"ہاں "۔

اور جب دوسرے دن ڈاکٹر آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پیٹ کی سوجن اگرچہ کچھ بھی کم نہ ہوئی تھی ۔۔۔ وہ ہشاش بشاش اور پُرسکون تھی ۔ اور جب اس نے شوہر کو پکارا ۔۔۔

غزلیں

بے کسی کہہ لیجئے یا بے بسی کہہ لیجئے
روز کی اس موت کو ہی زندگی کہہ لیجئے

بے دلی سے مسکرا کر روز ملنے کی یہ رسم
آپ اگر چاہیں تو اس کو دوستی کہہ لیجئے

اس کے سینے میں ہزاروں درد کے طوفان ہیں،
آپ اس قطرے کو چاہے اشک ہی کہہ لیجئے

سب بُرا کہتے ہیں مجھ کو آپ کیوں خاموش ہیں
یہ تکلف کس لیے ہے، آپ بھی کہہ لیجئے

پیار سے جو بھی ملے اپنا سمجھتا ہوں اُسے
شاؔد اس احساس کو میری کمی کہہ لیجئے

خوشبیر سنگھ شاؔد

۲۲۰ ۔ رام نگر، عالم باغ
لکھنؤ

جذبۂ عشق و وفا کو عینِ ایماں کر چکے
اک نگاہِ سرمگیں کو اب رگِ جاں کر چکے

ہوگئی آساں محبت کی رہِ دشوار بھی
ہم سفر میں جب حواس و ہوش قرباں کر چکے

الجھنیں مٹنے لگیں آزاد دل ہونے لگا
قیدِ ارماں پھر کہاں جب ترکِ ارماں کر چکے

اب جسے بھرنے کو تیری رحمتیں بے چین ہیں
بے نیازی کے حوالے ہم وہ داماں کر چکے

جان کر نیّرؔ کہ اب نورِ سحر آنے کو ہے
دل میں جو بھی تھا وہ نذرِ شامِ ہجراں کر چکے

نریندر کمار سہنا نیّرؔ

اے ۶۰۲ ۔ لالباغ کمپلکس
لکھنؤ

انقلاباتِ جہاں ہیں رُونما میرے لئے
دہر کا ہر حادثہ پیدا ہوا میرے لئے

لکھ دیا دونوں جہاں کا غم بہ عنوانِ حیات
کاتبِ قسمت نے یہ اچھا کیا میرے لئے

مُسکرا اٹھی یکایک کائناتِ زندگی
آج کس کی آنکھ سے آنسو گرا میرے لئے

سب نے پائیں دو جہاں کی نعمتیں روزِ ازل
اور ہوا تجویزِ دردِ لا دوا میرے لئے

موسمِ رنگیں کی ان مدہوش راتوں میں صدؔا
تازیانہ ہے پپیہے کی صدا میرے لئے

مرزا محمد ہادی صدؔا لکھنوی

تکیہ پیر جلیل (شمالی)
لکھنؤ

زندگی میں صرف خوشیاں ہی نہیں
سوچنا ایسا خیالِ خام ہے

بے وفائی کا نہیں ان کے یقیں
یہ بھی شاید گردشِ ایام ہے

یاد ان کی ہر گھڑی آتی رہی
بھول جانا بس انھیں کا کام ہے

گم ہوئی تاریکیوں میں زندگی
ان کی چاہت کا یہی انعام ہے

اک ثریّاؔ ہی نہیں اسکا شکار
اک زمانہ کشتۂ آلام ہے

ثریّا خانؔ

ایم ۔ ایس ۔ ۹۲ سکٹر ڈی
علی گنج، لکھنؤ



نام کتاب: معلّم اردو قاضی نذر الاسلام نمبر
ایڈیٹر: اظہار احمد — قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: گوکرن ناتھ روڈ، حسن گنج لکھنؤ

قاضی نذر الاسلام کا شمار بنگلہ زبان کے عظیم ترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ پچاس ساٹھ سال قبل جب سماجی اور سیاسی زندگی کا منظر نامہ آج سے بالکل مختلف تھا، اردو داں طبقے نے ان کی تخلیقات میں ظاہر کیے جانے والے خیالات کو اپنی رگِ جاں کے قریب محسوس کیا تھا۔ ان دنوں ان کی تخلیقات کے تراجم متعدد رسائل میں برابر شائع ہوتے تھے لیکن فکری قطب نما کی سوئی نے اپنا رُخ بدلا تو ان پر توجہ کم ہوگئی۔

آج صورت حال بالکل معکوس ہے اور شاید اسی لیے نذر الاسلام کی علاقہ بندی (RELEVANCE) میں کہیں زیادہ اضافہ ہوگیا ہے اور شاید اسی سبب سے "معلّم اردو" نے ان افکار و خیالات کو پیش نظر میں لانے کے لیے، جو بہ وجوہ پیچھے جا پڑے ہیں، قاضی نذر الاسلام نمبر شائع کیا ہے۔ اس کارِ نیک کے لیے اس رسالہ کے مدیر اور دیگر متعلقین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اردو دنیا نذر الاسلام سے "ودروہی" نامی نظم کے ذریعہ متعارف ہوئی، دھیرے دھیرے یہ تعارف شناسائی کے حدود میں داخل ہوگیا لیکن صرف شعری تخلیقات کی حد تک۔ دوسرے اصناف سخن میں ان کے کارناموں سے اردو داں طبقہ بڑی حد تک ناواقف ہی رہا۔ زیر نظر شمارہ اس شناسائی کے دائرہ کو وسیع کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ بنگال کے اس باغی شاعر کی ۱۸ نظموں اور ایک افسانہ کے تراجم کے علاوہ ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر ۱۴ معلوماتی اور تنقیدی مضامین کی شمولیت نے اس نمبر کو خاصا وقیع بنا دیا ہے۔ نذر الاسلام کے خطوط نے، جن کا ترجمہ احمد سعدی صاحب نے کیا ہے، اس نمبر کی قدر و قیمت اور بھی بڑھا دی ہے۔ ان خطوط سے بنگال کے اس عظیم ادیب کی ایک ایسی شخصیت ابھرتی ہے جس کے پیر تو بے شک زمین پر جمے ہیں لیکن نگاہیں افق کی بلندیوں کو چھو رہی ہیں۔ مالی دشواریوں نے اس شاعر کو ہمیشہ پابہ زنجیر رکھا لیکن انھوں نے اپنے فن اور فکر پر اس کا سایہ تک پڑنے نہ دیا۔ ہم عصر شاعر عبد القادر کو ان کی نصیحت (تم آج کے انسانوں کی خوشنودی کے لیے کل آنے والوں سے بے عزتی کا تحفہ وصول نہ کرنا) خود ان کی کھلی ڈلی، بے باک، جری اور از کار رفتہ اقدار پر سوالیے قائم کرنے والی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

۱۹۴۲ء کی تحریک کے دوران ہی وہ ہمیشہ کے لیے قوت گویائی سے محروم ہوگئے تھے۔ آج پچاس سال بعد ان اقدار اور آدرشوں کی پھر سے آبیاری کی ضرورت ہے، جن کی یہ تحریک اور ان کی شاعری علامت تھی۔ زیر نظر شمارہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ایک سو چھتیس صفحات کے اس نمبر کی قیمت صرف دس روپے ہے جو بہت ہی مناسب بلکہ خاصی کم ہے۔ امید ہے یہ خاص نمبر نہ صرف مقبول ہوگا بلکہ نذر الاسلام شناسی کو عام کرنے میں بھی معاون ہوگا۔

عابد سہیل

نام کتاب: "پسِ دیوارِ حرف" (شعری مجموعہ)
شاعر: فضا ابن فیضی — قیمت:
ملنے کا پتہ: فیضی پبلیکیشنز۔ مئوناتھ بھنجن

ممتاز شاعر فضا ابن فیضی کا "پسِ دیوارِ حرف" غزلوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک عرصے سے بے تکان تخلیقات کی دنیا میں محو سفر ہیں اور انھوں نے اپنی شناخت بنالی ہے۔ میری نظر میں فی زمانہ کم ہی شاعر ہیں جو اس طرح برابر کہہ رہے ہیں۔ اردو کے بیشتر جرائد میں ان کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے۔ غزلوں کا یہ مجموعہ ان کے مزاج کی طرح نفاست و سلیقہ کا آئینہ دار ہے۔ کتابت و طباعت معیاری ہے۔ نئی زمینوں کی تلاش اور ان میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنا فضا صاحب کی نمایاں خصوصیت ہے بقول جناب مخمور سعیدی:

"وہ اپنی سنجیدگی فکر اور لہجے کی متانت سے بڑی

سے بڑی بھیڑ میں الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ ہم عصر زندگی کے وہ سبھی ذہنی اور جذباتی نشیب و فراز جن سے آج کا انسان دوچار ہے، ان کی شاعری میں نہ صرف اپنی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں، بلکہ ان کی بہت سی ایسی تہیں جن میں عام نظر کی رسائی مشکل ہے" ان کے لمسِ قلم سے وا ہوتی نظر آتی ہیں۔"

جناب منصور سبزواری نے بڑے خوبصورت انداز سے ان کے تخلیقی عمل کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"بادی النظر میں ایسا لگتا ہے جیسے فضا ابن فیضی اپنے تخلیقی اوقات میں مطلق شعوری عمل سے شعر کہتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں تجرِ علمی کی ایک دبیز لہر، پیچیدہ تراکیب اور دوہری معنوی کیفیت پر کبھی کبھی اس طرح چھا جاتی ہے کہ ان کے اشعار میں سے "قاموسیت" جھانکنے لگتی ہے۔ لیکن یہ سانحہ ان کے کمتر قاری پر گزرتا ہے۔ ورنہ جب معقول ادراک کی معیت میں ان کے اشعار کی روح میں اترا جاتا ہے تو "دانش برہانی" کی جگہ "دانش روحانی" کی چھاؤں ملتی ہے۔ اور ایک انکشاف یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ لسانی منطق، لہجے کا استدلال اور جذبے کی پختگی سب کچھ اس لیے تھی کہ فضا جیسی تہ دار شخصیت کے لیے اکہری شخصیت کے شعر کہنا غیر مستحسن عمل تھا۔"

ان اقتباسات کو پیش کرنے کا مقصد یہی تھا کہ قارئین ایک نظر میں ان کی شاعرانہ خصوصیات و شعری عمل سے کسی حد تک روشناس ہو جائیں، ورنہ "پسِ دیوارِ حرف" کے حوالے سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جو مختصر تبصرے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ سطور تعارف کی حد تک ہیں اور اردو داں طبقہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ۱۹۹۱ء میں شائع شدہ شعری مجموعوں میں مذکورہ بالا مجموعہ مخصوص اہمیت کا حامل ہے جس میں ایسے ایسے اشعار ہیں کہ پڑھتے جائیے اور سر دُھنتے جائیے۔ نمونے کے طور پر چند شعر پیش کر رہا ہوں ؎

دھوپ اتری تو سمٹنا پڑا خود میں اس کو
ایک سایہ، کہ جو تھا اپنے شجر سے اونچا

سفر تمام ہوا آبلوں پہ چلتے ہوئے
زمانہ میرے لیے ریگ زار ایسا تھا

مجھ سے، خود اپنی ہی ہستی کا تحفظ نہ ہوا
ایک آئینہ تھا، جو ٹوٹ گیا ہے مجھ سے

بہت گھٹا تو ہوا میں ہلال کی صورت
طلوع صبح مجھے اس زوال میں کتنا

اب نہیں کہ لوگ تجھے بھول جائیں گے
میں اپنے پیچھے تیری خبر چھوڑ جاؤں گا

چلنے پھرنے سے ہمارے کچھ تو رونق آگئی
ورنہ جب گھر سے چلے تھے ہم تو صحرا کچھ نہ تھا

——— سہیل احمد

نام کتاب: "مانک موتی" (مختصر ترین افسانے)

مصنف: رتن سنگھ قیمت: چالیس روپے

ملنے کا پتہ: رگھبیر پبلشرز ۲۲۔ آدرش نگر۔ جبل پور (ایم۔پی)

رتن سنگھ نے مختصر ترین افسانے لکھنے والے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت بنالی ہے اور ان کے افسانے بہت مختصر، بہت واضح اور سلیس زبان میں ہوتے ہیں مگر ان کے پیچھے اکثر گہری فکر ہوتی ہے جو ان کے مختصر ترین افسانوں کو بھی اہم بنا دیتی ہے۔

رتن سنگھ نے اپنے مختصر ترین افسانوں کو اب مزید مختصر کر دیا ہے۔ اب وہ جو افسانے لکھ رہے ہیں اور 'مانک موتی' میں جو افسانے شامل ہیں وہ پانچ یا چھ سطروں میں مکمل ہو جاتے ہیں لیکن بڑی بات یہ ہے کہ ان پانچ چھ سطروں میں بھی بہت کچھ ہے جس سے دل و دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔

اردو میں منی افسانے یا مختصر ترین افسانے لکھنے کو فن کے طور پر

نہیں اپنایا گیا ہے۔ لیکن اب شاید رتن سنگھ اس فن کو باقاعدگی سے اپنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اگر وہ اپنے اس ارادے پر قائم رہے تو ان سے اچھی امیدیں وابستہ رکھنا عبث نہ ہوگا۔

"مانک موتی" میں شامل افسانچے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ان میں بڑا لطیف طنز بھی ہے اور بڑی سنجیدہ فکر بھی۔ یہ افسانچے اتنے مختصر ہیں کہ انھیں بطور حوالہ لکھا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر دو افسانچے حاضر ہیں:

"ایک منکر نے کہا:
میں خدا کو نہیں مانتا۔ لیکن میرا وشواس ہے
کہ خدا مجھے مانتا ہے۔"

ایک اور ملاحظہ ہو:

"میرے ایک دوست نے اپنی نئی کوٹھی دکھانے کے بعد پوچھا۔ کیسی لگی۔؟
سب کچھ اچھا تھا۔ بڑے بڑے ہال، کمروں میں دیوار سے دیوار تک بچھے ہوئے قیمتی غالیچے، بڑھیا فرنیچر، چھتوں سے لٹکتے ہوئے فانوس، بڑھیا الماریاں، الماریوں کے کانچ کے پیچھے سے جھلکتی ہوئی ہر قسم کی چیزیں، کراکری ریڈیو، وی سی آر، ٹی وی اور نہ جانے کیا کیا۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد میں نے کہا:
"ایک کمرے میں لائبریری بھی ہوتی تو اچھا تھا۔"
"جن صاحب نے یہ کوٹھی بیچی ہے ان کی بہت بڑی لائبریری تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک پل کے لیے رُکا اور پھر بولا،۔ "دراصل کتابوں کا گیان ان کے کسی کام نہیں آیا اس لئے انھیں یہ کوٹھی بیچنی پڑی۔"

چند سطور میں پوری کہانی ہے اور بہت کچھ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ اگر رتن سنگھ اپنے اس فن کو نکھارنے کی کوشش کریں تو بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

"مانک موتی" میں اگرچہ غور و فکر کے لیے بہت کچھ ہے پھر بھی اتنی مختصر کتاب (جو صرف ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے) کی قیمت چالیس روپے بہت زیادہ ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "بعد از خدا" (نعتیہ مجموعۂ کلام)
شاعر: انور قدوائی — قیمت: ۱۹ روپے
ملنے کا پتہ: ۸۱/۲۲۷۔ اچھو تی گلی۔ منصور نگر۔ لکھنؤ

"بعد از خدا" انور قدوائی کا دوسرا مجموعہ ہے جو حمد، نعت منقبت اور سلام وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ان کی غزلوں کا مجموعہ "شیرازۂ حیات" کے نام سے ۱۹۸۹ء سے شائع ہو چکا ہے۔

مذہبی شاعری حد ادب میں رہتے ہوئے حسن پاکیزہ اظہار عقیدت، زبان و بیان کی دلکشی، احتیاط اور فنی دسترس کی متقاضی ہے۔ انور قدوائی کے زیر نظر مجموعہ میں بڑی حد تک وہ محاسن موجود ہیں۔ انھوں نے بڑے مؤدبانہ، والہانہ اور محتاط انداز و الفاظ میں عقیدت و احترام اور دلی جذبات کا اظہار کر کے اپنی فنی ریاضت و صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے، جس کی عکاسی ذیل کے اشعار سے بخوبی ہوتی ہے:

وہ دن بھی دور نہیں جب کہے گی یہ دنیا
ہمیں بھی احمدِ مختار کی ضرورت ہے

———

خدا کرے یہی عالم رہے تصور کا
کبھی ہوں کعبہ میں انور کبھی مدینے میں

———

اسی حسرت سے منھ تکتا ہوں سب کا
کوئی کہہ دے بلایا ہے نبیؐ نے

زیر نظر مجموعہ کتابت۔ طباعت۔ گرد پوش اور اپنی ترتیب و تزئین کے لحاظ سے دلکش اور جاذب نظر ہے۔ اس میں شامل تمام تخلیقات عاشقان رسولؐ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہیں۔ اس قسم کی کتابیں ہر گھر کی زینت بن سکتی ہیں۔

——— عرفان عباسی

□□



جلد ۴۷ و ۴۸ | نمبر: ۱۲ و ۱

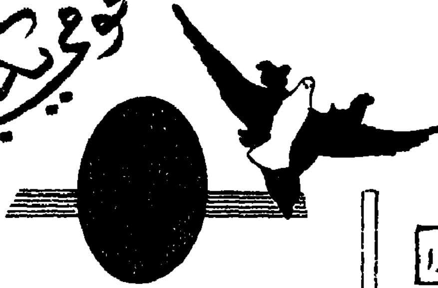
مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء

ایڈیٹر سید امجد حسین
فون نمبر: ـــــ ۲۴۵۶۶۰
سب ایڈیٹر: نجیب انصاری
فون: ـــــ ۲۴۷۱۰۸
معاونین محمد الیاس خاں
مبین احمد صدیقی

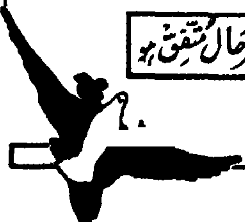
پبلشر: انل سروپ
(ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)
مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ
فی شمارہ: تین روپئے
سالانہ: تیس روپئے
ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اترپردیش
ـــــ خط و کتابت کا پتہ: ـــــ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
ـــــ بذریعہ رجسٹری ـــــ
ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اترپردیش۔ لکھنؤ

سرورق: ابوالفضل ۔ کتابت و تزئین: حسن اختر

قومی یکجہتی نمبر



نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضرُوری نہیں کہ حکومتِ اُترپردیش اُن سے بہر حال متفق ہو



اپنی بات

قومی یکجہتی ہمارے ماضی کی وراثت بھی ہے اور ہمارے مستقبل کی امانت بھی۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے دکھ سکھ، خوشیاں اور غم، مسرتیں اور مصیبتیں مشترک رہے ہیں اور کوئی بھی طاقت ہمیں مذہبی، لسانی یا نسلی بنیاد پر تقسیم نہیں کر سکی ہے، اس لیے کہ ہماری تہذیبی روایت ایک رہی ہے۔ ہمارے میلے، تہوار، رسم و رواج، رقص و موسیقی اور سب سے بڑھ کر زندگی کے بارے میں ہمارا زاویۂ نظر مشترک رہا ہے۔ ہماری ہندستانی قومیت کی اساس یہی اشتراک ہے اور ہندستانیت کا یہی احساس اقوامِ عالم میں ہماری شناخت اور پہچان ہے۔ اقبالؔ نے بہت پہلے کہا تھا ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہماری ہستی یا ہمارا قومی تشخص آج اسی قومی یکجہتی کی دین ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری بولیاں، ہماری عبادتیں غرضکہ زندگی کے بہت سے گوشے ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں لیکن یہ اختلاف نہیں ہماری تہذیبی رنگا رنگی ہے۔ پنڈت نہرو کے لفظوں میں "یہ کثرت میں وحدت اور رنگا رنگی میں یک رنگی ہی ہندستانیت ہے" اور قومی یکجہتی کا سچا تصور اسی کثرت میں وحدت سے عبارت ہے۔ دنیا کی عظیم تہذیبوں کے کھنڈرات کے درمیان ہندستانی تہذیب کا روشن مینار ہزار ہا برس سے دنیا میں محبت، امن و آشتی، سماجی انصاف اور انسانی عظمت کی کرنیں بکھیر رہا ہے۔ موجودہ دور میں قومی یکجہتی کی شاید سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اسی لئے نیا دور یہ آپ کی خدمت میں قومی یکجہتی نمبر پیش کر رہا ہے۔

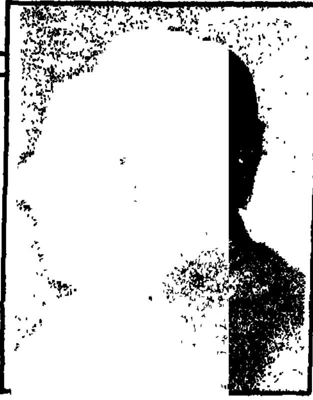
ہم نے ملک بھر کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں سے قلمی تعاون کی درخواست کی اور انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ہماری درخواست کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ ہم انتہائی ممنونیت اور شکر کے جذبات کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہیں گے کہ کسی مضمون یا قلم کار کے زاویۂ فکر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ آزادیٔ تحریر و تقریر کے جمہوری حق کے پیشِ نظر ان کے رشحاتِ قلم ان کی قدآور شخصیت کے ساتھ نیا دور کے صفحات کی زینت ہیں۔ بہرحال ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ قومی یکجہتی کے موضوع پر ہر رُخ سے گفتگو کی جا سکے۔

یہ ایک چراغِ محبت ہے جسے روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس چراغ سے سیکڑوں چراغ اور روشن ہوں گے۔ اگر ماضی کے حوادث نے راہوں کو تاریک کر دیا تھا تو یہ اندھیرے اب مستقبل کی روشنی سے دور ہو جائیں گے اور پھر ہمارا کاروانِ وطن ترقی کی شاہراہ پر پورے جوش و خروش سے رواں دواں نظر آئے گا۔

اس خصوصی شمارے کا اس طرح وجود میں آنا شاید ممکن نہ ہوتا اگر پرنسپل سکریٹری انفارمیشن شری یوگیندر نرائن اور ڈائرکٹر انفارمیشن شری ایل۔ روپ کی جانب سے حوصلہ افزائی ہمارے شریکِ حال نہ ہوتی۔ ہم جوائنٹ ڈائرکٹر انفارمیشن شری راجیش شرما کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے قدم قدم پر نہ صرف ہماری رہنمائی کی بلکہ بہت سے بیش قیمت مواد کی نشاندہی بھی کی۔ آخر میں اپنے رفقائے کار شری اسرار ستیہ اور شری نجیب انصاری کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس شمارے کی ترتیب و تدوین میں اپنے دن رات ایک کر دیئے۔

ہم اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں بہرحال آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ایڈیٹر





راج بھون
لکھنؤ
۲۴ مارچ ۱۹۹۳ء

پیغام

مجھے یہ جان کر بیحد مسرت ہوئی کہ موقر علمی و ادبی جریدہ نیادور کا "قومی یکجہتی نمبر" شائع ہو رہا ہے۔ نیادور ہندستان کا انتہائی مشہور و معروف اور معیاری جریدہ ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کے مختلف اور اہم موضوعات پر خصوصی شمارے شائع ہوتے رہے ہیں۔

ہندستان ایک عظیم ملک ہے، جس کی زمانۂ قدیم سے اپنی ایک شان دار مذہبی، ثقافتی اور سماجی اہمیت رہی ہے۔ ہندستان ہی دنیا کا وہ پہلا ملک ہے جس میں سب سے پہلے بنی نوع انسان کو حق و انصاف، اخوت و خیرسگالی، امن عالم و بقائے باہم اور اتحاد و یکجہتی کا یہ عظیم پیغام دیا کہ تمام عالم ایک کنبہ ہے۔ دراصل انسانیت کا یہی وہ پیغام ہے جس پر تمام مذاہب میں یکساں طور پر زور دیا گیا ہے۔ آج جب دنیا حق و انصاف کے راستے سے بھٹکتی نظر آ رہی ہے اور عوام گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں تو آج کے اس دور میں انسانیت اور اتحاد و سالمیت کے پیغام کو عام کرنے کی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارا ملک پچھلے دنوں بڑے نازک دور سے گزرا لیکن یہ بات اطمینان کی ہے کہ اس ملک کے امن پسند لوگوں نے اپنے ملک کی اتحاد و یکجہتی کی قدیم روایت کو زندہ و تابندہ بنائے رکھا اور حالات کو جلد ہی معمول پر لا کر قابل صد ستائش کام انجام دیا۔

آج محبان وطن کی یہ عظیم ذمہ داری ہے کہ ملک کی آزادی، یکجہتی اور سالمیت کو مضبوط بنائے رکھیں، تبھی مساوات پر مبنی سماج کی تشکیل عمل میں آسکے گی، اور تمام باشندگان ہند اطمینان و سکون کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر سکیں گے۔

مجھے امید ہے کہ نیادور کے اس "قومی یکجہتی نمبر" میں ایسا قابل قدر مواد شائع ہوگا جس سے ملک میں پیار و محبت، ایثار و قربانی، یکجہتی اور امن و آشتی کا جذبہ یقیناً پروان چڑھے گا۔

نیادور کے اس خصوصی شمارے کی کامیاب اشاعت اور مقبولیت کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

بی ستیہ نارائن ریڈی
(بی ستیہ نارائن ریڈی)



Dr Syed Kalbe Sadiq

37 JAUHARI MOHALLA
LUCKNOW-226 003 (INDIA)
PH (0572) 265529

مکرّمی!

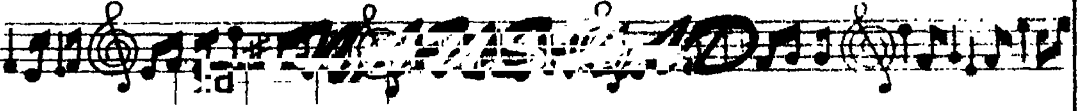
یہ اطلاع مسرت بخش ہے کہ ماہنامہ نیا دور یکجہتی نمبر شائع کر رہا ہے۔ وقت کے اس اہم ترین موضوع کی طرف آپ کی توجہ ہوئی۔ مبارکباد۔ زوردار بلکہ شہ زور اقدام کے لیے ابھی ملک کے تحفظ اور ترقی کے لیے قومی یکجہتی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ ہندستان ایسے ترقی پذیر ملک کے لیے یکجہتی میں ادنیٰ خلل، ترقی کے کارواں کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ کمزور تو مرتا ہی ہے، شہ زور بھی تھکتا ہے، کمزور ہوتا ہے اور تعمیر و ترقی کے وظیفے سے محروم ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ نیا دور کا قومی یکجہتی نمبر اس حقیقت کے ابلاغ و تفہیم میں کامیاب ہوگا۔

اس شمارے کی مقبولیت کے لیے دُعاگو ہوں۔

فقط والسّلام

(ڈاکٹر سید کلبِ صادق)

۱۳ر فروری ۱۹۹۳ء



"ASHIANA" Carter Road, Bandra, Bombay -400 050

Phone 6490764

پیغام

انتہائی مسرت کی بات ہے کہ "نیا دور" ایک قومی یکجہتی نمبر نکال رہا ہے۔ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی آج نہ صرف ایک اشد ضرورت کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہندستان کی بقا کا سوال بھی کھڑا ہوا ہے۔

یہ سمجھنا کہ کسی فرقہ کی فرقہ پرستی صرف اس کے حریف فرقہ کے لیے خطرناک ہوتی ہے خیالِ خام ہے۔ ایک فرقہ کی فرقہ پرستی کا آخری شکار خود اسی قوم کے افراد ہوتے ہیں

نازی جرمنی کی مثال ہے، جس کی نفرت کا آخری شکار وہ معصوم جرمنی باشندہ ہوا جو کبھی نازی قوم پرستی کی رو میں بہہ گیا تھا۔ چنانچہ ہٹلر جب بھی آئیگا، تو وہ اپنے لئے خودکشی اور قوم کے لئے تباہی کا انجام بھی تقدیر میں لکھا کر لائے گا۔

میں آپ کے خصوصی نمبر کے لئے دعاگو ہوں کہ خدا کامیاب کرے اور اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ہندستانی عوام نیک اور شریف ہیں اور وہ خود ہی اس فرقہ پرستی کو مل کر شکست دیں گے۔

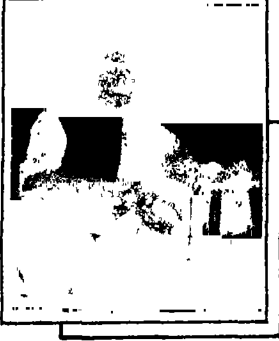
نوشاد علی

(نوشاد علی)

۱۹ر فروری ۱۹۹۳ء



Tel. : 333769



PADMA BHUSHAN

Pt. Samta Prasad Misra

C. 23/22, Kabir Chaura
VARANASI – 221001

پیغام

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ماہنامہ نیادور قومی یکجہتی نمبر شائع کرنے جارہا ہے..... میری پانچ پشتوں سے طبلہ وادن چلا آرہا ہے۔ میرا گھرانہ طبلہ سمراٹ پرتاپ مہاراج کا گھرانہ ہے۔ حالیہ واقعات سے ہم بہت دکھی ہیں۔ ہم تو ہیں کلاکار، ہم امن چین چاہتے ہیں۔ تب ہی کلا اور ہندستان کی ترقی ہوگی۔ ہمارے ملک ہندستان میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب اپنے بھائی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ سب بھائی ملکر اپنے ملک کی ترقی کے لیے کام کریں۔ اسی میں ہم سب کی اور ہمارے ملک کی بھلائی ہے۔ رام رحیم سب ایک ہی ہیں... میں اپنے ملک کے بہتر مستقبل اور امن و سکون کے لئے دعا کرتا ہوں۔"

آپ کا

(signature)

(پدم بھوشن پنڈت سامتا پرشاد)

۲۴ فروری ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے

ترجمہ و ترتیب: اسرار رشید

مولانا آزاد اور قومی یکجہتی

مولانا ابوالکلام آزاد پیدائش سے ہی بہت ذہین تھے۔ ان کے فہم و ذکا، علم و دانش اور عقل و ادراک کا یہ عالم تھا کہ سولہ سال کے سن میں ہی انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں نیز ریاضیات، فلسفہ اور ادب پر قدرت حاصل کرلی تھی۔

مولانا آزاد کا اپنے خاندان اور اس کے گرد و پیش کی روایتی زندگی سے جلد ہی جی اچاٹ ہوگیا۔ ان کا خاندان کچھ روایتی خیالات کا پروردہ تھا۔ مولانا نے اپنی خاندانی روایات سے بغاوت کی اور خود "آزاد" ہو گئے۔

عالم نوجوانی میں مولانا آزاد اکثر مذہبی تفریق و اختلافات میں الجھے لیکن بالآخر اس نتیجے پر پہونچے کہ اگر دنیا کے تمام مذاہب آفاقی حقیقتیں ہیں تو مذہب میں تفرقہ، مخاصمت اور اختلاف کیسا؟ تمام مذاہب کے پیرو دوسرے مذہب کو بے بنیاد اور غلط کیوں سمجھتے ہیں؟ اور اسی کے پیش نظر مولانا نے قرآن پاک کے لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن اور لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن کے مصداق اپنی زندگی کو ایک نئی جہت دی۔

آزاد کی نظر میں تمام لوگ ایک ہی خدا کے بندے ہیں جو الگ الگ طرح سے خدا کو الگ الگ ناموں سے پہچانتے اور مانتے ہیں۔ "سارا عالم ایک کنبہ ہے" کے مصداق آزاد اسلام کو بھی صلح و آشتی کا مذہب مانتے ہیں۔

خدا کی وحدانیت کے سلسلے میں قرآن پاک میں (خدا کی جانب سے) بار بار اعلان ہوا ہے کہ میں نے چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی ہدایت کے لیے قریہ قریہ، بستی بستی غرض کہ مختلف علاقوں میں پیغام محبت پہونچانے کے لیے اپنا پیغامبر یا نبی بھیجا تھا جس کو مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے الگ الگ نام دے دیئے۔

پس یہ ثابت ہوگیا کہ خدا ایک ہے اس کے نام مختلف ہیں تو یہ مذہبی اختلافات کس لیے؟ مذہب کا کام تو پیغام محبت پہونچانا ہے، مذہب درس انسانیت کا اعلان ہے۔ مذہب دلوں کو جوڑنے کا نام ہے نہ کہ اختلافات بڑھانے اور فتنہ کھڑا کرنے کا۔

قرآن پاک میں (خدا کی جانب سے) پھر اعلان ہوتا ہے کہ میں ہی وہ ہوں جس کی تمام بنی نوع بشر عبادت کرتے ہیں اور کوئی بھی میرے سوا دوسرا خدا نہیں ہے۔ اب میری عبادت کوئی کس طرح سے اور کس زبان میں کرتا ہے یہ اس کو اختیار ہے۔

مولانا آزاد نے قرآن پاک کے اس فلسفے کو عقل و استدلال کی کسوٹی پر کسا اور یہی صحیح پایا کہ اگر قرآن پاک کی ضرورت دیگر مذاہب کے لوگوں کو ہے تو ان کے لئے بھی قرآن پاک کا ترجمہ ان کی اپنی مادری زبان میں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ قرآن پاک کی اہمیت اس کی زبان سے نہیں اس کے پیغامات سے ہے جسے دنیا کے ہر کس و ناکس تک پہونچنا چاہیئے۔ چاہے ترسیل کا ذریعہ کچھ بھی ہو۔

مولانا آزاد کا یقین ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کے لوگوں کی خواہ وہ ہندو ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا مسلمان ہر ایک کی جزا و سزا کا فیصلہ ایک ایسی طاقت کرے گی جو ہے تو ایک لیکن اس کے نام جدا جدا ہیں اور اسی لیے دنیا کی تمام مذہبی کتابوں



میں جو جذبہ قدرِ مشترک ہے وہ محض محبت، اخوت، خیر سگالی اور حق پرستی کا ہے جس کا قرآن پاک میں متعدد بار ذکر آیا ہے۔ مولانا نماز پنجوقتہ پڑھتے تھے اور کعبے کی طرف ہی رخ کرکے پڑھتے تھے لیکن فروعات کے قائل نہیں تھے۔

مولانا آزاد قرآن کی روشنی میں اسلام کو کوئی نیا مذہب تصوّر نہیں کرتے تھے ان کا یقین اس بات پر تھا کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی پیغمبر خدا کا پیغام اور فرمان لے کر آتا رہا ہے اور اس کا مقصد نیکی کی راہ دکھانا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس بات کو انھوں نے اس طرح کہا ہے:

" خدا کا مقصد دُنیا میں ہر شخص
کو حق کا پیغام دینا ہے۔ حق اور
نیکی جو کسی فردِ واحد یا ذاتِ واحد
کی میراث نہیں ہے۔ اس کے تقاضے
مساوی ہیں اور ہر شخص کو حق پرستی
اور نیک نیتی کا اختیار ہے"

ہندستان کے سماجی و سیاسی پس منظر میں مولانا آزاد نے مسلمانوں کو مذہبی تنگ نظری اور عصبیت سے اوپر اٹھ کر قومی دھارے کے ساتھ چلنے کی تلقین کی کیوں کہ یہی مذہب اسلام کی بھی تعلیم ہے اور یہی تعلیم دُنیا کے دیگر تمام مذاہب کی بھی ہے۔

(بشکریہ، آزاد اکادمی جرنل لکھنؤ
مارچ ۱۹۹۳ء)

" درخت کے پتّوں کی طرح
سب مذہب الگ الگ نظر آتے
ہیں مگر جڑ کو دیکھا جائے
تو سب ایک ہی نظر آتے ہیں"

——— مہاتما گاندھی

نظریہ

قومی یک جہتی کو جب تک مذہبی یک جہتی سے اونچا درجہ نہیں دیا جاتا، تب تک حقیقی معنوں میں ایکتا قائم نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ مذہبی یک جہتی ایسے مسائل پیدا کرتی ہے جو قومی یک جہتی کو پھلنے پھولنے نہیں دیتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے دلوں میں انسان دوستی پیدا ہو۔ کیونکہ قومی یک جہتی کا تعلق دلوں سے ہے۔ یہ آسمان میں پیدا نہیں ہوتی۔ میرا ایک شعر ہے ؎

وہ تو ہر اک افق پہ ہے اسکی نظر ہے چارسو
عشق میں شرق و جنوب غرب و شمال کچھ نہیں

صرف مذہبی انسان ہی اگر نیک ہوتے تو مذہب ہی نیک پرستی کی اصل بنیاد ہوتا اور نیک پرستی ہی اتحاد قائم کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ایسا نہیں ہے....

میرے نزدیک ایک نیک پرست مسلمان، ایک بد پرست ہندو سے کہیں زیادہ بہتر ہے.... انسان کی نیکی ہی اس کے دل میں جذبۂ اتحاد پیدا کر سکتی ہے۔ ہم جتنا ہی مذہب پرست ہوتے جاتے ہیں۔ مذہب ہمارے نزدیک قدرِ اول بن جاتا ہے اور ہم اتحاد سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔ میرا ہی ایک شعر ہے ؎

ہر دیر و حرم سے کترا کر مُلّا آیا میخانے میں
مُلّا کیلئے لیکن دُنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں

میں محض قومی یک جہتی کا حامی نہیں بلکہ میں تو انسانی یک جہتی کا حامی ہوں"

——— آنند نرائن مُلّا

۲۳۔ بلونت رائے مہتہ لین
کرزن روڈ۔ نئی دہلی

علی سردار جعفری
۱۰۔ سیتا محل ۔ پدمن جی پیٹیٹ روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

تین ہندستانی : ایک بادشاہ ایک شہنشاہ ایک شاعر

دہلی اور لکھنؤ سے کلکتہ کا ایک تاریخی اور تہذیبی رشتہ ہے۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں جلاوطن ہو کر لکھنؤ سے کلکتہ گئے اور وہیں کی خاک میں دفن ہو گئے۔ لارڈ ڈلہوزی کے حکم پر فوج نے لکھنؤ پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا اور بادشاہ کو قیدی بنا لیا۔ انگریزوں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ اودھ انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ لیکن انھوں نے اس دباؤ کے آگے سر نہیں جھکایا جس کے بعد انھیں کلکتہ لے جایا گیا اور سارے علاقے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔

(کارل مارکس، اودھ کا الحاق)

—— یہ ایک انتہائی سفاکانہ عمل تھا۔

واجد علی شاہ خاصے قابلِ قدر شاعر تھے، جنھوں نے کتھک کو بھی فروغ دیا۔ راس لیلا میں جو جنم اشٹمی کے موقع پر قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں کھیلی جاتی تھی، وہ خود شری کرشن بنتے تھے۔ ان کی اہلیہ بیگم حضرت محل نے ۵۹-۱۸۵۷ء کی قومی جنگ آزادی میں اودھ میں باغیوں کی قیادت کی۔ (کارل مارکس)

کالن کیمپ بیل اور جنرل آوٹرم نے ۱۵ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور یہ شہر جو مشرقی آرٹ کے نمونوں سے مالا مال تھا، تاراج کر ڈالا۔ لڑائی اگلے چار پانچ دن تک جاری رہی، جس کے بعد مجاہدینِ آزادی بٹھور کے نانا صاحب، فیض آباد کے مولوی احمد اللہ اور بیگم حضرت محل کی قیادت میں بریلی منتقل ہو گئے۔ بیگم حضرت محل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں سے متعدد مقامات پر مورچہ لیا اور اگست۔ ستمبر ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کی فوجوں سے آخری مقابلے کے بعد وہ نانا صاحب کے ساتھ نیپال فرار ہو گئیں۔ (نانا صاحب کو آخری پیشوا باجی راؤ دوم نے گود لیا تھا)۔

چند خطوط اور کاغذات ہاتھ لگنے پر سازش کرنے کے الزام میں ملوث کر کے ۱۴ جون ۱۸۵۷ء کو واجد علی شاہ کلکتہ میں گرفتار کر کے فورٹ ولیم بھیج دیے گئے اور ان کے ساتھیوں کے اسلحہ ضبط کر لیے گئے۔ فورٹ ولیم میں واجد علی شاہ دو سال رہے۔ ان دو برسوں میں ان کا زیادہ تر وقت شعر و شاعری میں گزرا۔ بھگت سنگھ نے جیل کی اس کال کوٹھری سے، جس میں انھیں قید کیا گیا تھا، پھانسی کے پھندے کو گلے لگانے سے قبل اپنے بھائی کلتار سنگھ کو جو آخری خط لکھا تھا اس میں واجد علی شاہ کا یہ شعر بھی تھا ؎

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

واجد علی شاہ نے یہ شعر ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کو خیرباد کہتے وقت کہا تھا۔

واجد علی شاہ کی جلاوطنی کے صرف دو سال بعد آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر رنگون لے جائے گئے اور کلکتہ راستے میں پڑا۔ کورٹ مارشل نے انھیں "سنگین مجرم" قرار دے کر



پھانسی کی سزا دی تھی، جسے بعد میں تاعمر جلا وطنی کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ حکومت برطانیہ کی قید کے دوران ہی رنگون میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی آخری آرام گاہ اسی شہر میں ہے۔ انھوں نے نوشتۂ تقدیر بہت پہلے ہی پڑھ لیا تھا اور اس کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا:

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

— نیتاجی سبھاش چندر بوس کی خواہش تھی کہ آخری شہنشاہ ہند کے باقیات کو دہلی لایا جائے۔ حکومت ہند اگر نیتاجی کی اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرے تو قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے یہ ایک نہایت اہم اقدام ہوگا۔ لال قلعہ میں مغل شہنشاہ کے طور پر ان کی تخت نشینی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار کی طرح ہوئی تھی لیکن انتقال کے وقت ان کی حیثیت ہندستان کے شہنشاہ کی تھی۔ دیر ساورکر نے "ہندستان کی جنگ آزادی" (The Indian War of Independence) نامی اپنی کتاب میں صورت حال کی اس انقلابی تبدیلی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں:-

"سپاہیوں کے رہنماؤں نے، جن کی تلواریں انگریزوں کے خون سے تربتر تھیں، عظیم الشان اور عالی مرتبت شہنشاہ کے حضور میں عرض کیا،

"خداوند! میرٹھ میں انگریزوں کو شکست فاش دی جا چکی ہے۔ دہلی آپ کے قبضۂ اختیار میں ہے اور پشاور سے کلکتہ تک کے عوام آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ پورا ملک انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے اور اپنی خداداد آزادی کو حاصل کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس وقت آزادی کا پرچم آپ بلند کیجئے تاکہ ہندستان کی آزادی کے لیے جنگ کرنے والے سارے ہی لوگ اس کے تلے اکٹھا ہو سکیں ہندستان نے دوبارہ سوراج حاصل کرنے کے لیے جنگ کا بگل بجا دیا ہے اور اگر آپ نے ملک کی قیادت کی باگ ڈور سنبھال لی تو ہم ان فرنگی شیطانوں کو سمندر میں ڈبو دیں گے یا انھیں گدھوں کی غذا بنا دیں گے۔"

سپاہیوں کے رہنماؤں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ان کی ایسی پرجوش تقریریں سن کر جن میں ایک ہی طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا بادشاہ کا دل جوش و خروش سے بھر گیا۔ شاہ جہاں اور اکبر کی یادیں ان کے دل و دماغ پر چھا گئیں اور ان کے دل میں ایک ملکوتی جوش موجیں مارنے لگا کہ غلامی کی زندگی کے مقابلہ میں آزادی کے لئے جان دے دینا کہیں بہتر ہے۔ انھوں نے سپاہیوں سے کہا:

"میرے پاس مال و دولت نہیں ہے اس لیے آپ لوگوں کی تنخواہیں نہ مل سکیں گی۔"

سپاہیوں نے جواباً کہا: "ہم ہندستان بھر میں انگریزوں کے خزانے لوٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔" اور جب بادشاہ نے جنگ آزادی کی قیادت کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو لال قلعہ کے در و دیوار جم غفیر کی تالیوں سے گونج اٹھے۔"

(ص ۱۲۱-۱۲۰)

اس سے قبل میرٹھ کے توپ خانے نے انھیں ۲۱ توپوں کی سلامی دی تھی۔

بہادر شاہ ظفر باکمال شاعر تھے، پکے مسلمان اور مکمل طور سے سیکولر تھے۔ مغل شہنشاہیت کے بانی بابر نے گاؤ کشی پر پابندی عائد کر دی تھی جس پر بہادر شاہ ظفر کے عہد تک عمل ہوتا رہا۔ گائے کا گوشت شاہی مطبخ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ قلعۂ معلی میں عید قرباں کے موقع پر اونٹ کی قربانی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے تہواروں کی طرح دسہرہ اور دیوالی بھی قومی تہواروں کی شکل میں منائے جاتے تھے "پھول والوں کی سیر" ایک سالانہ جشن تھا جس میں بادشاہ اور بیگمات شرکت کرتی تھیں۔ اس موقع پر جلوس پھولوں کے پنکھے لیے ہوئے

لال قلعہ سے روانہ ہوتا اور مہرولی جاتا۔ جہاں جشن ایک ہفتہ تک برپا رہتا تھا۔ یہی جلوس جوگ مایا مندر جاکر وہاں پھولوں کے پنکھے چڑھاتا تھا اور دوسرے دن مشہور صوفی خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ پر حاضری دیتا اس ایک ہفتہ میں دہلی کی ساری آبادی بلا تفریق مذہب وملت جلوس میں شرکت کرتی اور جشن میں شامل ہوتی۔

۱۸۵۸ء کے بعد جب انگریزوں نے ہندستان پر مکمل قبضہ حاصل کرلیا۔ قومی میل جول کا یہ تہوار بند کردیا گیا۔ آزاد ہندستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پھول والوں کی سیر نامی یہ تہوار دوبارہ شروع کیا۔ آج تک پھولوں کا یہ جشن جسے سرکاری سرپرستی حاصل ہے برابر منایا جاتا ہے اور صدر جمہوریہ اور وزیراعظم بھی اس میں شرکت کرتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کی دہلی ہندو مسلم اختلافات سے پاک تھی۔ دہلی فرقہ وارانہ کشیدگی کی زد میں ۱۸۵۴ء میں پہلی بار اس وقت آیا جب برطانوی ریزیڈنٹ تھامس مٹکاف نے عید قرباں کے موقع پر گاؤکشی کی اجازت دے دی۔ فسادات تو نہیں ہوئے لیکن کشیدگی نے پورے شہر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ غالب نے اپنے ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر نہایت افسوس کے ساتھ کیا ہے۔

غالب جو انیسویں صدی کی مشترکہ تہذیب کی ایک شان دار علامت تھے، ۱۸۲۷ء میں جب وہ تیس برس کے تھے کلکتہ گئے۔ اس وقت بطور شاعر انھیں شہرت مل چکی تھی۔ غیر معمولی فہم وفراست اور ماورائی دور اندیشی سے بہرہ مند اس شاعر کی نظروں میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ مثالی انسان کا ان کا تصور ان کی شاعری میں جگہ جگہ عیاں ہے۔ ایک فارسی نظم میں انھوں نے ناقابل تقسیم انسانیت کا اپنا تصور پیش کیا ہے ؎

رہروان چوں گہر آبلۂ پا بینند
پائے را پایہ فرا تر ز ثریا بینند

ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند
ہر در سینہ نہانست ز سیما بینند

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند
بادہ را شمع طربخانۂ ترسا بینند

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنّار و صلیب
خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں دیر دو رنگ
ہر چہ بینند بعنوانِ تماشا بینند

آزاد ترجمہ: جب (مثالی انسان) اپنے پیروں کے چھالے دیکھتے ہیں تو انھیں اپنا راستہ ثریا سے بھی بلند نظر آتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے جو ظاہر ہے اسے وہ گہرائی سے دیکھتے ہیں اور دلوں کے راز ہائے نہاں پیشانیوں پر پڑھ لیتے ہیں.... پیشانی پر قشقہ انھیں ہندوؤں کی عظمت کی یاد دلاتا ہے اور شراب پارسیوں کے پرمسرت تہواروں کی، زرتشتیوں کے نغمے، برہمنوں کا قشقہ و زنّار عیسائیوں کی صلیب انھیں فقیروں کا لباس، تسبیح، مسواک اور جانماز معلوم ہوتی ہے۔ شب و روز کی تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کے مظاہر میں وہ خود کو گرفتار نہیں کرتے عدم موجود بھی انھیں موجود نظر آتا ہے اور جو کچھ انھیں نظر آتا ہے اُسے وہ محض تماشا سمجھتے ہیں۔

دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے غالب نے چودہ پندرہ دن بنارس میں قیام کیا تھا، قیام کے دوران وہ اس مقدس شہر کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے ؎

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور

بنارس را کسی گفتا کہ چینست
ہنوز از گنگ چینش بر جبین ست

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد
دگر پیوند جسمانے نگیرد



چمن سرمایۂ اُمید گردد
بمردن زندۂ جاوید گردد

بہ تسلیم ہوائے آن چمن زار
ز موجِ گل بہاران بستہ زنار
فلک را قشقۂ کش گر بر جبین نیست
پس ایں رنگینیِ موج شفق چیست

عبادت خانۂ ناقوسیانست
ہمانا کعبۂ ہندوستانست
بتانش را ہیولے شعلۂ طور
سراپا نور ایزد چشم بد دور

تگر گوئی بنارس شاہدی ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

آزاد ترجمہ: "خدا بنارس کی شان و شوکت قائم رکھے جو انتہائی مسرت و شادمانی کا کنج اور خوشیوں کا سبزہ زار ہے۔ بنارس کو کسی نے شکن قرار دیا تھا اور اب بھی وہ شکن دریائے گنگا کی شکل میں اسکی پیشانی پر موجود ہے۔ ہر وہ شخص جسے اس باغ میں موت نصیب ہوتی ہے وہ موت و زیست کے گرداب سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے لیے یہ چمن (بنارس) سرمایۂ امید بن جاتا ہے کیوں کہ یہاں کی موت اسے زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔ بنارس ایسے موسم بہار کا نام ہے جہاں موسم خزاں شفاف پیشانی پر صندل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور موسم بہار پھولوں کا مقدس ہار بن جاتا ہے اور جھٹپٹے میں دریا کی چھب چھپ سے آسمان کی پیشانی پر کاشی کی خاک قرمزی نشان بن جاتی ہے۔ بنارس کعبۂ ہند اور سنکھ پھونکنے والوں (ہندوؤں) کی سرسبز وادی ہے۔ یہاں کے بُت اور مورتیاں اسی روشنی سے بنی ہیں جو کبھی شعلۂ طور تھی اور خدا اسے چشم بد سے دُور رکھے۔ غروب اور طلوع ماہتاب کے وقت شہر بنارس اپنے حسن اور چمک دمک کے نظارے کے لیے دریائے گنگا کا آئینہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے"

لیکن کلکتہ میں ان کے احساسات بالکل مختلف تھے۔ وہاں یورپی لڑکیوں کا حسن انھیں پسند آیا۔ سبزہ زاروں پر چہل قدمی کر کے وہ لطف اندوز ہوئے اور وافر مقدار میں پھل اور شراب انھیں خوب خوب پسند آئے۔ لیکن جس چیز نے انھیں واقعتًا متاثر کیا وہ عہد جدید کی جھلکیاں تھیں۔ ان کے دور بیں ذہن نے یہ احساس کر لیا کہ وہ صنعتی ثقافت جس کی بنیاد فاتح انگریز ڈال رہے تھے وہی ہندستان کا مستقبل ہے۔ مغل تہذیب کی آخری گلکاری ان کی رُوح میں جذب تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اب اس کا چل چلاؤ ہے اور وہ جاگیردارانہ اقدار جو انھیں عزیز تھیں، اب ختم ہونے جا رہی ہیں۔ انھوں نے ماضی پر آنسو بھی بہائے لیکن مستقبل کو ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا، یہ احساس کیے بغیر کہ اس سماجی اور معاشی نظام کے جلو میں پروان چڑھنے والی ناگزیر تباہ کاری اور بربادی اس عظیم ترین اور سچ پوچھیے تو اس واحد سماجی تبدیلی کے لیے جس سے ایشیا اس وقت تک ناواقف تھا"۔ (کارل مارکس) "تاریخ کے لاشعوری ہاتھ" کی حیثیت رکھتی تھی۔

غالب جب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے دہلی واپس آئے تو وہ ایک بالکل مختلف شخصیت کے مالک تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے چند سال قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سید احمد خاں نے جو بعد میں سرسید کے نام سے مشہور ہوئے جب ابوالفضل کی آئینِ اکبری کی شرح لکھی اور غالب سے اس کا پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

صاحبان انگلستان را نگر
شیوۂ و انداز اینان را نگر



آتشی کز سنگ بیرون آورند
این ہنرمندان زخس چون آورند

تا چہ افسون خواندہ اند اینان بر آب
دو د کشتی را ہمی راند در آب

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چون طائر بپرواز آورند

رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ
شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

کاروبار مردم ہشیار بین
در ہر آئین صد نو آئین کار بین

پیش این آئین کہ دارد روزگار
گشتہ آئین دگر تقویم پار

آزاد ترجمہ: "انگریزوں کو دیکھو، وہ ہمارے مشرقی بزرگوں سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ ہواؤں اور لہروں کو انھوں نے بے اثر کر دیا ہے۔ وہ آگ اور بھاپ سے جہاز چلاتے ہیں مضراب کے بغیر ساز پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے جادو کے کمال سے الفاظ ہواؤں پر پرندوں کی طرح اڑتے ہیں۔ ہوائیں آگ سے روشن ہیں — شہر چراغوں کے بغیر روشن ہیں — اس نئے آئین نے سارے پرانے قوانین کو منسوخ کر دیا ہے۔"

انھوں نے نئے صنعتی نظام کو پرانے قوانین اور نظام پر فوقیت دیتے ہوئے سرسید سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ

مردہ پروردن مبارک کار نیست

("مردہ (قدروں) کو سینے سے لگائے رکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔")

انگریزی سے ترجمہ:

—— (س ع س)

یہ اتحاد ملک کی قوت ہے دوستو

خاکِ وطن سے مجھ کو عقیدت ہے دوستو!
ہندوستاں کی دل میں محبت ہے دوستو!
یہ اتحاد ملک کی قوت ہے دوستو!
بھارت کو ایکتا کی ضرورت ہے دوستو!
نفرت نہ کوئی دل میں کدورت ہے دوستو!
ہر شخص مایہ دارِ محبت ہے دوستو!
صدیوں سے اہلِ دیر و حرم ساتھ ساتھ ہیں
مدت سے رسم و راہِ رفاقت ہے دوستو!
نصرانی و ہنود و مسلمان و سکھ ہیں ایک
آپس کے اتفاق میں طاقت ہے دوستو!
باقی نہ ذات پات کا اب بھید بھاؤ ہو
بھائی کے دل میں بھائی کی عزت ہے دوستو!
یہ شیخ کی اذان برہمن کا یہ بھجن
آباد ہر مقامِ عبادت ہے دوستو!
ہر مذہب و زباں کو ہے آزادی فروغ
دستورِ ہند اس کی ضمانت ہے دوستو!
گیتا کا جو سبق ہے وہ قرآں کا پیام
دیر و حرم میں ذکرِ محبت ہے دوستو!
یہ ہے کبیر و نانک و چشتی کا گلستاں
یہ اکبر و اشوک کی جنت ہے دوستو!
معمارِ ہند ذاکر و قدوائی و پٹیل
آزاد کی بھی فہم و فراست ہے دوستو!
یہ لالہ زار بسمل و اشفاق و اندرا
پھولوں میں ان کا رنگ شہادت ہے دوستو!
گاندھی کا یہ اہنسا جواہر کا پنچ شیل
پیغام امن و درسِ اخوت ہے دوستو!
یک جہتی وطن کا ہے ماہرؔ قصیدہ خواں
امن و اماں اگر ہے تو راحت ہے دوستو!

آفاق عالم ماہر
۲۳۶ - ملکسی پور - الہ آباد

محمد حسن
ڈی - ۷، ماڈل ٹاؤن - دھلی
۱۱۰۰۰۹

یک جہتی اور ہمہ جہتی

قومیں محبتوں سے بنتی ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ میں ایک کائنات ہے۔ اس کا اپنا کنواں، اپنا برگد کا درخت، اپنا آنگن اور اپنا آسمان ہوتا ہے۔ مگر جب پڑوسی کا آنگن، برگد، کنواں اور آسمان اس سے آ ملتے ہیں تو پھر یہ دائرہ پھیلتا، بڑھتا ہوا قوم تک پہونچتا ہے۔ یہ دائرہ جتنا بڑا، جتنا حقیقی اور جتنا گہرا ہوگا، قوم اتنی ہی توانا اور قوی ہوگی۔

کل تک قوم محض ایک معاشی ضرورت تھی۔ جغرافیائی سرحدوں میں زرعی یا صنعتی خود کفالتی کا منصوبہ تھی جس کا مقصد کسی مشترک دشمن سے مدافعت کے طور پر خود اپنے سرمایہ داریا ہم قوم صنعت کار کا استحکام تھا اور اس سے ہر قوم کے سربراہ نے (خاص طور پر صنعتی اور زرعی اجارہ داروں نے) بڑے فائدے اٹھائے اور اپنے دائرہ کار کو اسی بنا پر آگے بڑھاتے بڑھاتے دنیا کو ایک بار نہیں دو بار جنگ عظیم کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ ایٹم بم کی تباہی پھیلائی اور آج بھی ان ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

قوم پرستی کا یہ جارحانہ روپ اب بڑی حد تک بے نقاب ہو چکا ہے۔ ہر قوم کے اندر قومیتیں اپنی پہچان بنانے اور اپنے حقوق کی جدو جہد میں لگی ہوئی ہیں۔ دنیا میں قومیتوں کی نئی کھوج جاری ہے اور عالمی سطح پر جغرافیائی نقشے تیزی سے بدل رہے ہیں۔

اس صورت حال میں ہندستان میں قومی یک جہتی کی کون سی تصویر ابھرتی ہے۔؟

قوم کا تصور بڑی حد تک صنعتی ترقی سے جڑا ہوا ہے۔ ۱۸ ویں صدی میں جب یورپ میں مشینی دور آیا اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے تو ان کے لیے نئے بازاروں کی بھی ضرورت ہوئی اور منڈیوں کی بانٹ میں مختلف ملکوں کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی اپنی جغرافیائی سرحدوں میں ان ملکوں کی صنعتی اجارہ داریاں قائم ہونے لگیں۔ اسی آویزش کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ کم ترقی یافتہ ملکوں پر صنعتی ممالک قبضہ کر کے وہاں سے سستے داموں کچا مال اور مزدور اور وہاں کی منڈیوں پر سیاسی اقتدار کے ذریعہ اجارہ داری حاصل کرتے رہے۔

ایسے ہی مقبوضہ ملکوں میں ہندستان بھی تھا۔ لگ بھگ دو سو سال تک انگلستان اس ملک کے مختلف حصوں پر حکمراں رہا اور انھیں لوٹتا کھسوٹتا رہا۔ اپنے مفاد کی خاطر رسل و رسائل کی آسانیاں، ڈاک کا نظام اور پریس، دفتر اور دوسرے انتظامی ڈھانچے بھی قائم کرتا رہا ان میں تعلیمی نظام بھی تھا جس کے ذریعہ یہاں آزادی کے تصورات بھی پہنچے اور ہر علاقے کے رہنے والوں کے درمیان یک جہتی اور آزادی کے مشترکہ تصورات پیدا ہوئے سیاسی غلامی کا زہر اسی قومی یک جہتی کا تریاق بن گیا۔

ہر علاقہ، ہر زبان، ہر قومیت، ہر مذہب و ملت کے لوگ آزادی کا خواب دیکھنے لگے۔ سب میں یہ خواہش مشترک تھی کہ انگریزی تسلط ہٹے تو اس کی جگہ ان کی اپنی زبان، اپنے مذہب، اپنے کلچر کو سرفرازی ملے۔ لہذا جب ڈیڑھ سو سال کی لگاتار جدوجہد کے بعد آزادی ملی تو یہ قومیتیں، یہ زبانیں، یہ مذہبی گروہ سب کے سب اس سوال سے دوچار ہوئے کہ ان سب کو مشترکہ طور پر یہ سرفرازی



کس طرح اور کس حد تک حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی ہمارے باہمی ٹکراؤ کا سبب بھی ہے اور باہمی سمجھوتے کا بھی۔ اگر ہندستان کو موجودہ شکل میں، ایک ملک، ایک تاریخ، ایک جغرافیائی وحدت اور ایک تہذیبی اکائی کے طور پر باقی رہنا ہے تو صرف اسی مشترکہ پہچان اور باہمی سمجھوتے سے ابھرنے والی صورت ہی میں ممکن ہے اس کے علاوہ باقی سب صورتیں بکھراؤ، انتشار اور بحران کی ہیں۔

لہٰذا قومی یک جہتی ہماری ضرورت ہی نہیں ہے، وقت کا تقاضا بھی ہے اور تاریخ کی دین بھی۔ اگر کوئی ایک فرقہ پورے ملک کو ایک وردی، ایک عقیدہ، ایک زبان کے شکنجے میں رکھنا چاہے یا اپنی منمانی باقی لوگوں پر عاید کرنا چاہے تو وہ صرف نت نئے اختلافات اور ٹکراؤ ہی کے دروازے کھولے گا۔ یہ راستہ قوت اور توانائی کے بجائے بکھراؤ ہی پیدا کرے گا۔ کتنا ہی طاقت ور گروہ کیوں نہ ہو اور کتنی ہی بڑی اکثریت والا گروہ کیوں نہ ہو، وہ پورا ہندستان نہیں ہے اور اسے خود کو پورے ملک کا تنہا نمائندہ کہنے کا ہرگز حق نہیں پہونچتا۔ جواہر لال نہرو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"مادرِ ہند اینٹ، پتھر، کھیت کھلیان، پیڑ پودے
کا نام نہیں ہے، مادرِ ہند ان کروڑوں ہندستانیوں
کا نام ہے جو یہاں آباد ہیں۔ یہی مادرِ ہند ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ ان کروڑوں ہندستانیوں کے الگ الگ رنگ روپ ہیں، الگ الگ کلچر ہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے کے الگ الگ ڈھنگ ہیں۔ مگر اس سب رنگا رنگی کے باوجود ان میں ایک مشترک عنصر موجود ہے۔ یہ مشترک عنصر ہے باہمی رواداری کا احساس۔ یہ خیال کہ یہ ملک ان سبھی کا ہے جو یہاں رہتے ہیں اور جنھوں نے اس کی آزادی، معاشی ترقی اور تہذیبی نشوونما میں حصہ لیا ہے۔ یہ احساس جتنا قوی ہوگا، قومی یک جہتی کی بنیادیں اتنی ہی مضبوط ہوں گی۔

قومی یک جہتی کا یہی تصور دراصل ہماری تاریخ، فلسفہ اور تہذیب کا مرکزی تصور ہے۔ بے شک ایسے عناصر آج بھی ہیں اور ہمیشہ موجود رہے ہیں جو قومی یک جہتی کے اس تصور کے مخالف ہیں۔ اور صرف اپنے ہی سانچے کا ہندستان دیکھنا چاہتے ہیں، اور اسی نادیے سے تاریخ، فلسفے اور تہذیب کو پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندستان کو ایک قدم آگے بڑھتا دیکھتے ہیں تو اسے دو قدم پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ آج کے دور میں پیچھے کی طرف دوڑ لگانا قوم کے ساتھ غداری کرنے کے مترادف ہے۔ دقیانوسیت اور اندھی ماضی پرستی کسی ملک کو آگے نہیں لے جا سکتی۔ تاریخ سے چپکے رہنے والے خود کو اور شاید دوسروں کو بھی تباہ تو کر سکتے ہیں مگر کوئی ٹھوس قومی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

قومی یک جہتی کا راستہ، خوش دلی، رواداری اور باہمی میل ملاپ ہی سے ہموار ہو سکتا ہے۔ سچی جمہوریت دراصل اسی کا نام ہے کہ قوم کا کم سے کم تعداد والا فرقہ بھی خود کو محفوظ محسوس کرے اور اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے علاقے کی پہچان کے ساتھ پورے ملک کے فروغ میں حصہ لے، جبر کی گنجائش اور ضرورت جتنی کم ہوگی جمہوریت کی جڑیں اتنی ہی مضبوط ہوں گی اور قومی یک جہتی کے رشتے اسی قدر مستحکم ہوں گے۔

بنیادی بات صرف اتنی ہے کہ مختلف ہونے کے معنی ہرگز ہرگز مخالف ہونا نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ جو لوگ ہم سے مختلف ہیں وہ لازمی طور پر ہمارے مخالف نہیں ہیں۔ اس بات کے کئی پہلو ہیں: لباس۔ زبان۔ رہن سہن۔ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سبھی میں ہر علاقے اور ہر فرقے کے لوگ الگ الگ ہیں اب اگر کوئی یہ چاہے کہ سب کو ایک ہی طرح سے رہنا چاہیے اور جو لوگ اس طرح نہیں رہتے ان پر پھبتی کسی جائے یا ان کا مذاق اڑایا جائے تو یہ جمہوریت کے خلاف بھی ہے اور قومی یک جہتی کے منافی بھی۔ جو لوگ جتنی بڑی تعداد میں ہوں ان پر اتنی ہی بڑی ذمہ داری ہوگی کہ وہ کم تعداد والوں کے دل میں کسی قسم کا اندیشہ یا عدم تحفظ کا احساس پیدا نہ ہونے دیں۔

دراصل قومی یک جہتی کے لیے باہمی اعتماد اور بھروسہ ہونا نہایت ضروری ہے اور بھروسہ پیدا ہوتا ہے قربت سے۔ لوگ ہوں یا فرقے جتنے ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں گے، ان کے مزاج اور کلچر سے اتنے ہی ناواقف رہیں گے اور ناواقفیت سے شک شبہ ہی نہیں غلط فہمیاں اور پھر ان غلط فہمیوں سے نفرتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ پھر اس ناواقفیت کی



دلدل میں طرح طرح کے خود غرض عناصر پیدا ہونے لگتے ہیں جو ان دوریوں اور نفرتوں ہی کی خوراک پر پلتے بڑھتے ہیں، لہٰذا قومی یک جہتی کا سنگ بنیاد مختلف مزاج والے عناصر کی باہمی قربت ہے۔

غرض قومی یک جہتی کی اصل مختلف قومیتوں کے درمیان خوش دلی اور اعتماد ہے اور یہ مشترک مفاد اور مشترک معاشی تقاضوں ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ ایک کا کام دوسرے سے چلتا ہے۔ اسی خوش دلی اور رواداری بلکہ باہمی احترام اور افہام و تفہیم سے قومی یک جہتی ہی نہیں جمہوریت کو استحکام حاصل ہوسکتا ہے۔

آج کی دنیا میں جب قومیتوں کی باہمی آویزشیں افریقہ سے لیکر وسط یورپ تک جغرافیائی وحدتوں کو پارہ پارہ کر رہی ہیں۔ ایسے ممالک بھی ہیں جو صدیوں لڑتے رہنے کے باوجود مشترک وفاق اور معاشی اکائیاں قائم کر رہے ہیں۔ ہندستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور جمہوریت کا مطلب ہے ایک سے زیادہ اور مختلف عناصر کے درمیان برابری اور سماجی انصاف کا قیام۔ اس لحاظ سے قومی یکجہتی رنگا رنگی اور مختلف مزاجوں اور تہذیبوں کے درمیان ایک مشترک اور رضاکارانہ اتحاد سے عبارت ہے اور یہی قوم اور ملک کے لیے فلاح کا راستہ ہے۔

□□

جاہل!

"مذہب کا اہم عنصر روح کی یک جہتی ہے جو آدمی اس عنصر کو نہیں سمجھتا ہے وہ ویدوں اور شاستروں کا عالم ہونے کے باوجود جاہل ہے۔ جو مظلوموں کے غم سے غمگین نہیں ہوتا، جو ناانصافی کو دیکھ کر غصہ نہیں ہوتا، جو سماج میں اونچ نیچ کے فرق کو بڑھاتا ہے ــــ وہ عالم ہو کر بھی جاہل ہے۔"

ــــــ پریم چند

ہم ایک ہیں

اب دھرم نہ بھاشا کی کوئی بات کریں گے
اب ہندو مسلمان نہ آپس میں لڑیں گے
اک ساتھ ہے جینا، ہمیں اک ساتھ مریں گے
ہر جام محبت کو محبت سے بھریں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

اس دیس میں ہر آن محبت کا چلن ہے
ہندو ہے جو بھائی تو مسلمان بہن ہے
ہر پھول سے مہکا ہوا یہ اپنا چمن ہے
رنگ اور اخوت کا بہاروں میں بھریں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

اب تو کسی ماں باپ سے اولاد نہ بچھڑے
اب کوئی سہاگن کا بھی سیندور نہ اُجڑے
ہو ختم فساد اور یہ ہر روز کے جھگڑے
افواہوں پہ اب کان نہ ہم لوگ دھریں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

اسلاف نے جینے کے طریقے جو بتائے
وہ ساری روایات ہیں سینے سے لگائے
ہم پرچم اخلاق ہیں ہاتھوں میں اُٹھائے
اب ہندو مسلمان نہ آپس میں لڑیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

ــــــ ڈاکٹر پیکر جعفری آنولوی
ڈی ۸۴/۴ - ایل ڈی اے کالونی
عیش باغ لکھنؤ



اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ روڈ، الہ آباد

ایک مشورہ
ایک اپیل

دوستو!

اس وقت ہمارا ملک ایک نہایت نازک دور سے گزر رہا ہے جب ملک میں صدیوں سے بود و باش رکھنے والے مختلف فرقوں ذاتوں اور مذاہب کے لوگوں میں نفاق اور نفرت کے بیج بونے والی طاقتیں اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوکر جمہوریت، سیکولرازم اور قومی یکجہتی کے ہمارے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کرنے، ہمارے دیس کو، دیس کے لوگوں کو تقسیم کرکے، ملک کو پھر سے بیرونی طاقتوں کی شکارگاہ بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔

اقبال نے لکھا ہے ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا!

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک کے عام باشندوں میں ہمیشہ سے بردباری، انسان دوستی، سبھی مذاہب کے لئے یکساں محبت و احترام اور عقیدت کا جذبہ رہا ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر صدیوں تک نہ جانے کتنے قبیلوں، فرقوں، ذاتوں اور قوموں کے لوگ اس ملک میں آتے رہے۔ لیکن وہ سب کے سب اس ملک کے وسیع کلچر کا حصہ بن گئے۔

دوستو! میں نے اپنے لڑکپن میں وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب مذہبی رواداری اور مختلف فرقوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت و احترام کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ ہندو مسلمان ہولی، دیوالی، عید اور محرم مل جل کر پورے جوش و خروش اور عقیدت سے مناتے تھے دونوں فرقوں کے عوام نہ صرف ایک دوسرے کے تیوہاروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے بلکہ شربت کی سبیلیں بھی لگاتے تھے۔ ویسا سنہری زمانہ اب دیکھنے میں نہیں آتا۔ انگریزوں نے "بانٹو اور حکومت کرو" کے مصداق مختلف فرقوں میں نفاق کے بیج بوئے اور اپنی سازش میں کامیاب ہوئے۔ ہماری تاریخ کو بدلنے کے علاوہ انگریز حکمرانوں نے یہ بھی کیا کہ عدالتوں میں قسم کھاتے وقت قانون بنا دیا کہ ایک خدا کی سوگند کھانے کے بجائے ہندوؤں کو گیتا پر، مسلمانوں کو قرآن پر، سکھوں کو گرنتھ صاحب پر اور عیسائیوں کو بائبل پر ہاتھ رکھنا پڑے گا۔ یہی قاعدہ فوج میں عہد لیتے وقت عائد کر دیا — لیکن جب اس کے باوجود آزادی کی لڑائی میں سبھی فرقوں کے لوگ یکجا ہو گئے، تو انگریزوں نے عوام کے مذہبی جذبات ابھار کر فسادات کروائے اور آخرکار ملک تقسیم ہو گیا۔

آج کل ملک کی بیشتر ریاستوں میں قومی یکجہتی کی مخالف طاقتوں کا زور بڑھ رہا ہے ایسے میں اگر ملک کی جمہوری طاقتیں، دانشور، ادیب، صحافی اور ملک کو سیکولر، آزاد اور متحد رکھنے والے لوگ بیک زبان آواز نہیں اٹھاتے اور ان طاقتوں کے خلاف تحریک نہیں چلاتے قربانیاں نہیں دیتے تو وہ دن دور نہیں جب ملک میں قتل و غارت گری کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور غیر ملکی طاقتیں سکون بحال کرنے یا مختلف فرقوں میں سمجھوتہ کرانے کے بہانے ہمارے ملک پر قابض ہو جائیں گی اور ملک پھر سے غلام ہو جائے گا۔



جب جرمنی جیسا ترقی یافتہ اور طاقت ور ملک ایک دُنیا کو فسطائیت کا
نشانہ بنانے کے بعد ہٹلر کی فسطائیت کے باعث تقسیم ہو گیا اور برسوں
دوسروں کے زیر اثر رہا تو ہندستان جیسے ترقی پذیر ملک کی کیا بساط ہے۔

دوستو!

تمام مذاہب کے سچّے رہنما اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کو بنانے والا ایک ہے اور اس کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے تو پھر اس لاشریک اور لامحدود کے لیے جھگڑا کیوں؟ اس خدائے واحد نے تو سب انسان ایک سے پیدا کیے ہیں اور موت کے بعد وہ دفنائے جائیں یا جلائے جائیں — مٹی میں مل جاتے ہیں۔ انسان انسان کے درمیان جتنے بھی تفرقے ہیں وہ سب انسان ہی کے ڈالے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دیس کے باسی سکون و اطمینان سے رہیں تو ہمیں امن کے تینوں ستونوں کو پھر سے مضبوط کرنا ہوگا۔ ملک میں سچی جمہوریت لانی ہوگی۔ سرکار کو پورے طور پر سیکولر رہنا ہوگا۔ عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر چناؤ جیتنے پر بندش لگانی ہوگی۔ اور قومی یکجہتی کو طاقت ور بنانا ہوگا تبھی ملک ایک رہ سکتا ہے اور اس کے باشندے امن اور چین سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

صوفی شاعر سائیں بلھے شاہ نے کہا ہے ؎

وڑ اندر دیکھو کیہڑا ہے
باہر خفتن پئی ڈھونڈھیندی اے

یعنی اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ کون ہے جو اس کائنات کا اور تمہارا خالق ہے۔ پاگل دُنیا اسے باہر ڈھونڈھ رہی ہے جبکہ ؏

ہر ہر دے وچ صورت رب دی اے

یعنی ہر ذی روح میں وہ موجود ہے۔ بلھے شاہ مزید کہتے ہیں ؎

بلھا شوہ اساں تھیں وکھ نہیں
بن شوہ دے دوجا کچھ نہیں
پر دیکھن والی اکھ نہیں
تائیں جان جدائیاں سہندی اے

یعنی اے بلھے! وہ مالک قادر مطلق ہم سے الگ نہیں، اس کے بغیر اس کائنات میں ایک تنکا بھی نہیں، لیکن اسے ہر چیز میں دیکھنے والی آنکھ نہیں۔ اسی لیے لوگ خدا سے اور ایک دوسرے سے جدائی محسوس کرتے ہیں۔ سائیں بلھے شاہ مندر مسجد میں یقین نہیں رکھتے تھے وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔

دوستو!

آخر میں میں آپ سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سوچیں اس عظیم ملک میں، اس کے رنگا رنگ کلچر کا جزو بنتے ہوئے آپ انسانوں کی طرح رہنا ہے یا ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے، نقصان پہنچانے اور مارنے کی کوشش کرنے والے خون خوار درندوں کی طرح آپ جو بھی طے کریں گے اسی میں آپ کی، اس ملک کی اور آنے والی نسلوں کی بہبودی یا بربادی مضمر ہوگی۔

□□

آدم خور جن!

ہمارا ملک آج ایک بہت ہی بھیانک دور سے گزر رہا ہے اور ہر وہ شخص، جسے اپنے وطن سے محبت ہے، وہ بے حد پریشان اور بے چین ہے — جدھر نظر اٹھائیے آگ لگی ہے اور خون بہہ رہا ہے۔

اس سلسلے میں میں ایک سیمینار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس بدنصیب ہندو مسلم سوال پر شاید ابھی حال ہی میں علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا۔ اخباروں میں اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بہت صاف گوئی اور فراخ دلی سے باتیں ہوئیں۔ اس میں مشہور فلمی ہستی اور شاعر جاوید اختر نے کہا کہ "وہ آدم خور جن، جسے ہم ہندو فرقہ پرستی کہتے ہیں، اس کی جان مسلم فرقہ پرستی نامی ایک طوطے میں بستی ہے، اس کا گلا گھونٹ دو۔ وہ آدم خور جن خود بخود مر جائے گا۔"

ارشد راہی

کلدیپ نیر
ڈی ۔ ۲۵ ، وسنت وہار ، نئی دہلی ، ۱۱۰۰۵۷

ہندستان کی فرقہ وارانہ صورتحال

ایک اجمالی جائزہ

فسادات کی آگ بظاہر بجھ چکی ہے لیکن اس کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی ہیں ۔ ملک کے بیشتر حصوں میں خوف اور دہشت کے بادل چھائے ہوئے ہیں ۔ ملک میں کسی حد تک پولرائزیشن بھی ہوا ہے ۔ سیکولرازم کو بہت چوٹ پہونچی ہے اور سبھی مذاہب کے لوگوں میں مل جل کر پیار محبت سے رہنے کا جو جذبہ تھا وہ مجروح سا ہوا ہے ۔

یہ بات میں کلکتہ ، بمبئی ، بنگلور ، بہار ، ہریانہ ، اترپردیش ، راجستھان وغیرہ کا بذات خود جائزہ لینے کے بعد کہہ رہا ہوں

زیادہ تر شہری علاقوں کے مسلمانوں کے دلوں میں شک و شبہ کا احساس گھر کر گیا ہے اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں تاہم وہ ان مصیبتوں کو جھیلنے کے لیے کمربستہ ہیں ۔ زیادہ تر ہندو بھی ان واقعات سے پریشان ہیں ۔

لیکن فرقہ وارانہ عناصر اور نام نہاد سیاست دانوں کو ان واقعات کا بالکل افسوس نہیں ہے اور وہ لوگ نفرت کی آگ کو اور ہوا دینے میں لگے ہوئے ہیں ۔

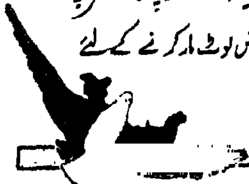
جیسے جیسے میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں گیا ویسے ویسے منظر بدلتے رہے ۔ کہیں پر حالات بہتر تھے تو کہیں پر اس کے بالکل برعکس ۔ لیکن مستقبل کے بارے میں لوگوں کی فکریں ان کے چہروں سے عیاں تھیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک سے کوئی ایسی چیز جاتی رہی ہے جو شاید واپس نہ آسکے ۔ اور وہ چیز ہے ایک ہندستانی کی طبعی شان اور اس کی بُردباری ۔ اس کے اصول ، اور بلاتفریق مذہب و ملت ایک دوسرے کے لئے عزّت نیز زندگی کی خوشیوں اور غموں کو محسوس کرنے کی اس کی صلاحیت ۔

جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے ان میں لیڈرشپ کے مسئلہ پر کافی ناامیدی پائی جاتی ہے جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ۔ نوجوان طبقہ خاص طور سے بے چین ہے اور کافی حد تک ناامید بھی ۔

ایک اچھی بات جو پہلی بار مجھے دیکھنے کو ملی یہ ہے کہ سیکولر ذہنیت کے لوگوں میں فرقہ پرستی سے لڑنے کی بیداری بڑھ رہی ہے ۔ تقریباً سارا پریس ہندستان کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش کرنے والی طاقتوں کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہو گیا ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ سب سے خطرناک بات وہ زہر ہے جسے فرقہ پرست عناصر دیہی علاقوں میں پھیلانا چاہتے ہیں ۔ ابھی تک دیہی علاقے اس آگ سے محفوظ ہیں ۔

دیہات کے لوگوں کے لیے آپسی تعلقات سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں ۔ جو کچھ بھی شہروں میں کیا گیا ہے اب اسے دیہاتوں میں دہرانے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ اگر سیکولر سیاسی جماعتیں دیہی علاقوں میں اپنی سرگرمیاں نہیں بڑھاتیں تو فرقہ پرست عناصر کو وہاں بھی پیر جمانے کا موقع مل جائے گا ۔

یہ سچ ہے کہ برسوں سے اکٹھا ہونے والی نفرت کی بارود میں چنگاری ڈالی گئی ۔ کئی جگہ پر یہ آگ زوروں سے بھڑک رہی ہے ۔ وحشیانہ جذبوں کو اُبھارا جا رہا ہے ۔ جرائم پیشہ اور شرپسند عناصر اپنے پُرانے جھگڑوں کو نپٹانے کے لیے یا پھر محض لوٹ مار کرنے کے لئے



میدان میں کود پڑے ہیں۔ کچھ کالونائزرس نے جھگی جھونپڑیوں کو جلاکر اس کی جگہ پر اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کرنے کے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فسادات کا استعمال کیا ہے۔

بہر حال یہ ایک دل سوز منظر تھا۔ انسانیت پر دل ہلا دینے والے ظلم کیے گئے۔ خاص طور سے عورتوں اور بچوں پر جس کا موازنہ برصغیر کی تقسیم کے دوران ہونے والے تشدد سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بار اس پیمانے پر خون نہیں بہا جتنا کہ تقسیم ہند کے دوران بہا تھا۔ لیکن ایک دوسرے کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات اتنے ہی شدید تھے۔ سب سے زیادہ متاثر ہوا بمبئی! جہاں لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا جیسا کہ ۱۹۸۴ء کے دوران دہلی میں ہوا تھا۔

کروڑوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔ سرمایہ اور سیاح دونوں عنقا ہو گئے اور مستقبل قریب میں سرمایہ کاری کے امکان بھی کم ہی ہیں۔ جاپان کے ایک بینک نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے ہیں۔ جاپان اور دوسرے بزنس گروپس میں سے کچھ جو کہ ہندستان میں سرمایہ لگانے کی تیاری کر رہے تھے، اس مسئلہ پر پھر سے غور کر رہے ہیں۔ اقتصادی بہبود کے جو کچھ بھی فائدے تھے ان پر پانی پھر گیا۔

مالی نقصان سے کہیں زیادہ معنی رکھتا ہے وہ نقصان جو ساکھ اور امیج کو پہونچا ہے۔ سوال یہ اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ذات پات اور مذہب کے نام پر ہونے والی خون ریزی کے ساتھ ٹوٹنے کے کنارے پر ہے۔؟ فرقہ پرستی کی مہربانی سے ملک میں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے

فرقہ پرستوں نے مستقل پروپیگنڈے کے ذریعہ سیکولرازم کے آئیڈیل پر ضرب لگانے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقے کے بعض کھلے دل و دماغ کے لوگ بھی اس لفظ کے استعمال سے گریز کرنے لگے ہر چند کہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے علاحدہ رکھا جانا چاہیے۔ عام آدمی آج بھی رواداری اور میل محبت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن نام نہاد وسیع النظر لوگوں کے زاویۂ نظر میں فرق آیا ہے۔ اب وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر مہاتما گاندھی کے الفاظ اب ان کے لیے بے معنی ہو گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہے ہوتے تو ان کی یہ صفت اس آڑے وقت پر کام آئی ہوتی۔ کیونکہ سیاسی جماعتیں یا تو فسادات کی آگ جلائے رکھنے میں لگی ہوئی ہیں یا پھر اتنی بے اثر ہیں کہ وہ اس آگ پر قابو نہیں پا سکتیں اور یہ تو کھلا ہوا راز ہے کہ انتخابی اعداد و شمار ان سب جماعتوں کے پیش نظر ہیں۔

اب جبکہ دونوں فرقوں کے لیڈروں نے اپنے اپنے فرقہ کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے اور سیاسی جماعتوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور خود ساختہ دانشوروں نے اپنے آپ کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ لیا ہے، ایسی صورت میں ہم کہاں جائیں۔؟ یہی وقت ہے؟ صحافی، قلم کار، دانشور اور درس و تدریس سے وابستہ لوگ اپنے خیالات ملک کے عوام کے سامنے پورے زور و شور کے ساتھ رکھیں معاملہ یہ نہیں ہے کہ ایک جماعت دوسرے کی مخالف ہے، یہ بھی نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ جھگڑا ہے بلکہ معاملہ ایک ساتھ مل جل کر رہنے کی روایات کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرنے والوں اور ان روایات کی حفاظت کرنے والوں کے درمیان ہے ——— اور خطرے کا الارم بج چکا ہے۔!!

——— ترجمہ و تلخیص: خورشید احمد

سنتے ہیں طوفان میں ڈوبا ہوا تھا ایک درخت
جس کی چوٹی پر نظر آتے تھے دو آشفتہ بخت
ایک ان میں سانپ تھا اور ایک غمگیں نوجواں
دو صندوں کا ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں

سچ ہے درد مشترک میں ہے وہ سوز ا...
عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عد...
لیکن اے عاقل مسلمانو! مدبر ہندو...
ہند کے سیلاب میں اک شاخ پر تم بھی تو...

——— جوش ملیح آبادی

گیان چند
۲۵/۹ - اندرا نگر - لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

نیا آدمی نامہ

قومی یکجہتی کے معنی ہیں کہ قوم کے تمام طبقوں اور گروہوں کے افراد ایک دوسرے سے بھائی چارگی کے ساتھ رہیں، ایک ساتھ مل کر کسی اعلیٰ مقصد کے لیے گامزن ہوں لیکن آج فروری ۱۹۹۳ء کے وسط میں یہ دیکھتا ہوں کہ پچھلے ڈھائی سال کے واقعات نے عموماً اور گزرے ڈھائی ماہ کے سانحات نے خصوصاً ملک کو اوپر سے نیچے عموری اعتبار سے بھی شق کر دیا ہے اور افقی اعتبار سے بھی۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟

میں اس موقع پر ذاتی رنگ میں کچھ لکھنے کی اجازت چاہوں گا۔ میں ایک ایسے قصبے کا رہنے والا ہوں جہاں ہمیشہ مسلم اکثریت رہی ہے۔ وہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ اکتوبر نومبر ۱۹۹۰ء میں کچھ تناؤ ضرور رہا تھا لیکن تشدد نہیں ہوا۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں نے زندگی میں کبھی بچشم خود فرقہ وارانہ فساد نہیں دیکھا۔ کبھی ایک دن کو کرفیو میں نہیں رہا۔ ہمیشہ شہروں کے نواحی علاقوں میں مقیم رہا ہوں جہاں فسادی آنے کی زحمت نہیں کرتے۔ میرے والد اُردو پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ان کے تمام دوست نچلے طبقے کے مسلمان تھے۔ برادری میں کافی احترام کے باوجود کوئی ہندو ان کا گہرا رفیق نہ تھا۔ ہمارے ایک باغ میں ایک مسلمان مالی ملازم تھا۔ والد صاحب مرتے وقت وصیت کر گئے کہ اسے کبھی ملازمت سے نہ ہٹانا۔ ہم نے حین حیات اس مالی کو برقرار رکھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کو اسی خدمت پر مامور کیا۔

ہماری زمینداری کا کارندہ (منشی) نیز ذیلدار ہمیشہ مسلمان ہوتے تھے۔ میں نے تعلیم کی ابتدا اُردو سے کی۔ میرے استاد مولوی مظہر عالم تھے۔ معمولی پڑھے لکھے جنھوں نے میرے سب بھائیوں بلکہ ایک بہن کو بھی اُردو پڑھائی۔ سفید داڑھی، کندھے پر رومال، فرشتہ صورت، میرے ہائی اسکول کے اُردو فارسی کے استاد مولوی ظفر حسین عاصی امروہے کے شیعہ تھے۔ میں اپنے تمام اساتذہ میں ان دونوں کا سب سے زیادہ احترام کرتا ہوں۔ مسلمانوں میں انسان کے آگے سجدہ ممنوع ہے۔ ہندوؤں میں مذہبی بزرگوں کے سامنے ڈنڈوت کرنا جائز ہے مجھے اپنے دونوں مذکورہ بالا استاد اگر آج مل جائیں تو میں ان کے آگے سجدۂ احترام کرنا چاہوں گا۔ میں مراد آباد اور الہ آباد میں پڑھا۔ کہیں ہندو مسلم منافرت کا سامنا نہیں ہوا۔ کیا ہو گیا ہے آج؟ کیوں ہو گیا ہے؟

ہندستانی قوم کو توڑنے پھوڑنے میں مذہب، ذات برادری علاقہ اور زبان کا خاص رول رہا ہے۔ ان میں سب سے اہم فرقہ واریت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے عملاً مذہب کی سب سے بڑی دین نفرت رہی ہے محبت نہیں، اس نے ابنائے قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ انسان دوستی نہیں دی۔ لیکن یہ پوری حقیقت نہیں۔ مذہب کی تادیب کے بغیر اخلاقی قدریں جاری وساری نہیں رہ سکتیں۔ مذہب کی سب سے بڑی دین انسان کو اخلاقیات کی راہ دکھانا ہے۔ جو لوگ فرقہ وارانہ فساد کرتے اور کراتے ہیں کیا بڑے دین دار ہوتے ہیں؟ نہیں۔ ان کے بشرے پر نظر ڈالیے تو ان کی غیر مذہبیت اور غیر انسانیت آنکھوں ہی سے نہیں رؤم رؤم سے برس رہی ہوگی۔ سیاسی اقتدار کے بھوکے جرائم پیشہ لوگوں سے سانٹھ گانٹھ کر کے معاشرے کو اس طرح پھاڑتے ہیں جیسے گرم دودھ کو نیبو کا عرق۔
جو شخص مذہب کی حفاظت کی ہانک لگا کر ایک فرقے کو دوسرے فرقے



کے خلاف صف آرا کر دیتا ہے، وہ دیندار نہیں، وہ مجرم ہے جو دھرم کا مکھوٹا پہنے غارت گری کر رہا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد ملک کے دو بڑے فرقوں کے بیچ جو لوہے کی دیوار کھڑی ہو گئی ہے، جو عدم اعتماد آ گیا ہے ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ جنھوں نے یہ کیا یا کرایا ہے وہ نہ تو مذہب کے پاسبان کہے جا سکتے ہیں اور نہ ہی مذہبی انسان۔ ٹی وی پر اچھلتے کودتے تخریب کاروں کی صورتیں دیکھیے، گنڈے جیسے لگتے ہیں۔

لیکن کیا سارا قصور ایک ہی طبقے، ایک ہی گروہ کا ہے۔؟

افسوس آج ہندو مسلمانوں کے جذبات کو اور مسلمان ہندوؤں کے جذبات کو سمجھنے کا اہل نہیں۔ میں نے انگریزی کے بعض مسلم صحافیوں کے مضمون پڑھے تو محسوس ہوا کہ میں بھی، جو اردو کے سبب مسلمانوں سے ملتا رہتا ہوں، ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں ڈوب سکتا۔ دوسری طرف پڑھے لکھے ہندوؤں کو مسلم معاشرے سے جو شکایتیں ہیں، ان کے دلوں میں جو کڑواہٹ بھری ہوئی ہے، مسلمانوں کو اس کا علم نہیں کیونکہ دونوں فرقوں کے افراد اپنے اپنے گروہ میں کھل کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں، دوسرے فرقے کے سامنے اس موضوع کو ٹال جاتے ہیں

آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر شخص اپنے مذہب ہی کو دنیا کا سب سے معقول مذہب سمجھتا ہے، اسی کی ہر بات کو بنی نوع انسان کے لیے بہترین لائحۂ عمل سمجھتا ہے۔ اسے دوسرے مذہبوں کے عقیدوں، عبادت کے طریقوں، رسوم و رواج میں بعض خامیاں، بعض غیر معقولیتیں دکھائی دیتی ہیں، اپنے مسلک میں نہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ عقل کی کسوٹی پر اسی کا مذہب کھرا اترتا ہے۔ لیکن کیا اس نے واقعی عقلی دلائل کی بنا پر اپنے مذہب کو قبول کیا ہے؟ کیا یہ محض اس کی ولادت کا اتفاق تو نہیں کہ وہ جس مذہب کے گھرانے میں پیدا ہوا ہے اسی کو مکمل جانتا ہے۔ یہ ایک قسم کا خاندانی پیناٹزم ہے۔ کوشش کیجیے کہ اس کے سحر سے آزاد ہو کر اپنے اور دوسروں کے مذاہب کے طور طریقوں کو پرکھ سکیں۔ ہو سکتا ہے دوسروں کے طریق میں اتنی خامیاں نہ ہوں اور آپ کا طریق اتنا مکمل نہ ہو جتنا آپ سمجھتے ہیں۔

ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں، دوسرے کے نقطۂ نظر کو نہ جانتے ہیں، نہ جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کے مذہبی عقیدوں میں سے بیشتر ایسے ہیں جن سے دوسرے فرقے کے افراد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آپ ان عقائد پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہیں، لیکن جو عقائد، جو مذہبی رسوم، جو جلسے جلوس، جو شور کرنے والی تقریبیں دوسروں کو متاثر کرتی ہیں ان کے بارے میں اُن سے بات چیت کر کے ان کا راستہ اپنائیے۔

ہندو مسلمان دونوں ایک سکے کے دو رُخ ہیں۔ مجھے اپنے مسلمان شاگردوں سے جو اپناپن، جو الفت، جو عقیدت ملی وہ میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اسے دیکھ کر میں اپنے اس عقیدے میں راسخ ہو گیا ہوں کہ ہندو مسلمان کا امتیاز صرف اہلِ سیاست بالخصوص مذہبی سیاست گروں کا آفریدہ ہے۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ ڈھارس بندھتی ہے یہ دیکھ کر کہ ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت ابھی ہندو مسلمانوں کی دوئی کی قائل نہیں ہے۔ عوام ایک دوسرے سے مل کر رہتے ہیں۔

ہندوؤں اور سکھوں کے بیچ تناؤ یا من مٹاؤ ایسی بات میری فہم سے باہر ہے۔ ہندو اور سکھ تو ایک ہیں، دو ہیں ہی نہیں۔ جموں اور پنجاب میں یہ عام بات ہے کہ خاندان کا ایک فرد کیش (لمبے بال) رکھنے والا سکھ ہے، دوسرا ہندو۔ جموں میں میرے جاننے والے کا بڑا لڑکا کیش رکھتا تھا، باپ یا دوسرا لڑکا نہیں رکھتا تھا۔ میرے ایک مالک مکان کیش نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سب لڑکے داڑھی بال رکھتے تھے۔ خود میرے لڑکے کی شادی سکھ گھرانے میں ہوئی ہے اور میرے اور لڑکے کی سسرال کے گھرانے کے بیچ مکمل ہم آہنگی اور اپناپن ہے۔

کوئی ۴۴ سال پہلے میں بھوپال میں رہتا تھا۔ وہاں پنجاب نیشنل بینک میں کھاتا کھولا۔ بینک کے پنجابی کلرکوں کو پنجابی میں باتیں کرتے دیکھا تو گھبراہٹ ہوئی کہ یہ کون غیر ہیں، کہاں کی بولی بول رہے ہیں، کہیں مجھے ذبح کھسوٹ تو نہ لیں گے؟ بعد میں بھوپال میں کسی پنجابی سے رشتہ نہ رکھتی) گھرانوں سے میرے گھرانے کی سب سے زیادہ دوستی جموں میں جا کر رہا تو وہاں کے لوگ تقریباً پنجابی ہی ہیں، معلوم ہوا کہ زبان کے معمولی فرق کے باوجود وہ بالکل ہم جیسے ہیں۔ وہاں سکھوں کو بھی نزدیک سے ملتا ہوا۔ اندازہ ہوا کہ وہ اسی طرح گھریلو انسان ہو

ہیں جیسے ہندو۔

ہندو مسلمان اور ہندو سکھ کے بہت سے مسائل اس وجہ سے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ہم زبان نہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات، خیالات اور جذبات سے واقف نہیں۔ ہر فرقے کے غیر سیاسی اہل رائے ایک دوسرے سے ملیں، ایک دوسرے کی شکایتوں کو معلوم کریں اور ان میں سے جن کا تدارک ممکن ہو، کریں۔ لیکن جہاں شکایت برائے شکایت یا شکوہ برائے تنازعہ ہو اس کا کیا کیا جائے۔ شکوے شکایتوں کے موجدان شکایتوں کے پردے میں جو افتراق پیدا کرتے ہیں اس کا اصل مقصد اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عوام مکر کی چالوں سے مات کھا جاتے ہیں۔ آج پڑھے لکھوں، طبقہ بالا یا اوپری متوسط طبقے میں جو تعصب اور نفرت پائی جاتی ہے، غریب عوام میں اس کا پتہ نہیں۔ آپ نے یہ تو مشاہدہ کیا ہی ہوگا کہ فرقے وارانہ فساد شہروں کی وبا ہیں۔ گاؤں بالعموم ان سے محفوظ رہتے ہیں یعنی اسی فی صد آبادی کو ان سے سروکار نہیں۔

مجھے فرقہ وارانہ فساد کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر فرقہ الف کے کسی فرد کو علم ہو کہ فرقہ ب کے فلاں فلاں شخص نے فرقہ الف کے کسی شخص کو محض بربنائے ملت مارا یا زخمی کیا ہے یا اس کے مال و اسباب کو جلایا یا لوٹا ہے تو فرقہ الف کا کوئی بلونت فرقہ ب کے اس منفرد کو مارے یا اس کے مال ومتاع کو نقصان پہونچائے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن خواہ مخواہ دوسرے فرقے کے کسی بھی غیر متعلق شخص، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر اس لئے تشدد کرنا کہ وہ دوسرے مسلک کے پیرو ہیں، کہاں کی مذہبی خدمت ہے۔؟ دوسرے فرقے کے کتنے ہی لوگوں کا قلع قمع کیجیے، ملک سے ان کا تخم مٹنے والا نہیں ہندستان میں نہ مسلمان ختم ہو سکتے ہیں نہ پنجاب میں ہندو ـــ!! پھر کیا حاصل ہے مذہبی بلووں سے۔

لکھنؤ میں اپنے محلے اندرا نگر میں ایک سکھ کو اسکوٹر پر جاتے دیکھا اور سوچا کہ کیا اسے اس لیے مار دیا جائے کہ پنجاب میں دہشت گرد بسوں میں سے چن چن کر ہندوؤں کو مارتے ہیں۔ اس سکھ کو دہشت گردوں کے فعل کا ذمہ دار کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اور میں اپنے گھر کے سامنے کی سڑک پر ایسے مسلمانوں کو گزرتے دیکھتا ہوں جنھوں نے سفید گول جالی دار ٹوپی سر پر منڈھی ہوتی ہے، جن کی پریشان داڑھی اصلاح سے واقف نہیں۔ ان پر ان کی ہیئت یا ان کے سیدھے سادے عقیدے کی وجہ سے کیوں کسی قسم کا تشدد کیا جائے۔ ان سب کے ایک گھر ہوگا۔ بیوی بچے ہوں گے، جن کے دل میں اسی طرح کے الفت کے جذبات ہوں گے جیسے میرے اہل خانہ کے ہیں۔ سب انسان ایک ہیں۔ ہر فرقے کی ماؤں بہنوں، بیٹیوں، بیویوں، باپوں، بھائیوں اور شوہروں کے جذبات یکساں ہوتے ہیں

ہندستانی عوام کو مسلسل افلاس سے متعلق مسائل سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ مندر مسجد صرف پیٹ بھرے ہوؤں کا مسئلہ ہے۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ فرقہ وارانہ فساد میں مرنے اور مارنے والے زیادہ تر نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں اور گھر پھونکے جاتے ہیں امرا کے بنگلے نہیں۔ آپ نے کبھی یہ سنا ہوگا کہ کسی فرقہ وارانہ فساد میں کوئی بڑا آدمی، کوئی بڑا لیڈر مارا گیا یا مجروح ہوا۔ دوسروں کے کندھے پر رکھ کر بندوق یہ چلاتے ہیں، نشانہ بنتے ہیں عوام۔

قوم کے اصلی مسائل ہیں: افلاس، بے روزگاری، معیار زندگی بڑھانا، آبادی میں اضافے کی شرح کم کرنا، بیماریوں میں کمی لانا، سر چھپانے کے لیے چھت کا انتظام، شرح خواندگی بڑھانا، ہریجنوں کی فلاح، مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت کا یقین دلانا۔ سکھوں کو یہ احساس دلانا کہ وہ بھی ملک کے شاندار شہری ہیں۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے خصوصی مسائل، بچوں کے کھیلنے یا تعلیم حاصل کرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرنا، خطرناک پیشوں میں لڑکپن گنوانا۔ اسٹیشنوں پر اور گاڑیوں میں بھیک مانگنا، عورتوں پر مظالم، کوئی ہنگامہ ہو، لڑائی ہو، ڈکیتی ہو، سب سے پہلے عورتوں کی عصمت دری کی جاتی ہے۔ گھروں میں ساس بہو کی ناچاقی۔ جسے بہو بنا کر لاتے ہیں اسے جہیز کے لیے زندہ جلا دینا یا اسے زندہ رہنے دیا جائے تو زندہ درگور کی طرح۔ کتنے گھروں میں کربلا کا عالم ہے بوڑھوں کا یہ احساس کہ اولاد ان کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتی۔ وہ تنہا بے سہارا ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اب کسان اور مزدور کافی خوش حال ہو گئے



ہیں لیکن کیا ہم نے دھیان سے دیکھا کہ اب بھی ان کی قمیص کتنی پھٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے اور ہمارے لباس، مکان اور خوراک میں کتنا فرق ہے۔ وہ دن بھر محنت شاقہ سے چُور ہو جاتے ہیں۔ ہم اس لیے گھومنے جاتے ہیں یا ورزش کرتے ہیں کہ ہمیں جسم کو حرکت دینے کا موقع نہیں ملتا۔ ہمیں شکایت ہے کہ بھوک نہیں لگتی۔ فکر رہتی ہے کہ گھر میں جو خوردنیات ہیں، انھیں کب کھائیں۔ عمروں کا اوسط بڑھ گیا ہے لیکن بیماریاں اب بھی کم نہیں ہوئیں۔ لوگ صحت مند نہیں۔ بیماری میں علاج کتنا مہنگا ہے۔ شفا خانوں میں حشر کا عالم ہوتا ہے۔ پرائیویٹ ڈاکٹروں کو مریض کی شفا سے زیادہ اپنی آمدنی کی فکر رہتی ہے۔

قوم کے مسائل یہ ہیں۔ کہاں مندر بنے، کہاں مسجد یہ مسئلہ عوام کا نہیں، اہلِ مذہب کا نہیں، اہلِ سیاست کا ہے۔ میرے پاس ان مسائل کا کوئی حل نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح مذہبی اور سیاسی لیڈروں کو اس بات پر رضامند کر لیا جائے کہ اگلے دس بیس برسوں کے لیے ملک بھر کی عبادت گاہوں کے معاملات کو بہ صورت موجودہ منجمد رکھا جائے۔ جب تک قوم کے اہم ترین مسائل بہتری کا رُخ اختیار نہیں کر لیتے، عبادت گاہوں کو یونہی رہنے دیا جائے۔

جہاں تک اجودھیا کا سوال ہے اس قضیے سے تمام سیاسی اور مذہبی لیڈروں کو بے دخل کر دیا جائے۔ باہر کے کسی بھی شخص کو اس میں دخل دینے پر امتناع کر دیا جائے۔ اجودھیا کے قدیمی باشندوں پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جائے۔ مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے دس دس مقتدر و محترم اہل رائے کا انتخاب کیا جائے جو نہ سیاسی لیڈر ہوں نہ مذہبی پیشوا۔ انھیں ایک کمرے میں مقفل کر دیا جائے کہ جب تک تم کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کر لوگے تمھیں نہ باہر آنے دیا جائے گا نہ کھانے پینے کو دیا جائے گا۔ وہ جو بھی حل تجویز کریں، سرکار اسے پوری طاقت سے لاگو کرے۔

میرے بعض ہندو دوست کہتے ہیں کہ ملک کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ ہمارے دونوں طرف کے پڑوسیوں نے خود کو اسلامی ملک قرار دے دیا ہے، پھر ہندستان کو کیوں نہ ہندو ملک کہہ دیا جائے۔ میرا اس معاملہ میں ذہن بالکل صاف ہے کہ ہندستان کو بنیاد پرست نہیں بننا چاہیے۔ ہندستان کی طاقت اور حسن اس کے تہذیبی تنوع میں ہے۔ اس تنوع میں یک رنگی بہ نشین موج بھی ہے۔

اس کا مظاہرہ میں نے مرکزی حیدر آباد یونیورسٹی میں دیکھا وہاں کا کیمپس ایک چھوٹا موٹا ہندستان ہے۔ یہاں ملک کی ہر ریاست کے باشندے رہتے ہیں۔ متعدد ایسے خاندان ہیں جن میں شوہر ایک لسانی علاقے کا ہے، بیوی دوسرے لسانی علاقے کی۔ مثلاً بیوی یو پی کی بولنے والی ہے، شوہر آندھرا کا تیلگو۔ شوہر مراٹھا ہے، بیوی کنڑ۔ یہی کیفیت کیمپس کے باہر کے اساتذہ کی ہے مثلاً شوہر پنجابی ہے بیوی تامل یا شوہر پنجابی ہندو ہے بیوی مغربی یہودن۔ شوہر دہلی کا اُردو گو مسلمان۔ بیوی امریکن۔ اور یہ سب جوڑے اور گھرانے مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہتے ہیں۔

ہندستان میں مختلف ملتوں، مختلف علاقوں، مختلف زبانوں مختلف ذاتوں کے افراد کو مساویانہ حقوق کے ساتھ رہنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اگر ہندستان میں مذہبی اور لسانی اقلیتیں پورے اطمینان اور عزت کے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو یہ اکثریت کے لیے شرم کی بات ہے۔ جو ملک اقلیتوں کو مطمئن نہیں رکھ سکتا وہ مہذب کہلانے کے قابل نہیں۔ یہ دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ اکثریتی فرقے کے تمام دانشور، تمام اہلِ فکر، پورا انگریزی پریس سیکولر ہے۔ وہ اقلیتوں کے حق کے لیے آوازیں اٹھاتا رہتا ہے لیکن وہ مذہبی سیاست گردوں کو نہیں کر پاتا۔ یہ سیاست گر حسب موقع بھولے عوام پر اپنا جادو چلا بیٹھتے ہیں۔

تعصب اور مذہبی منافرت کے خلاف جنگ میں ہمیں سب سے پہلے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے دلوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ کیا وہاں تو یہ زہر موجود نہیں۔ اگر ہے تو اسے دور کریں۔ دوسرے فریق کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ میل کہاں تک ممکن ہے۔ ملک کے بنیادی مسئلوں کی طرف توجہ دلائیں تاکہ دینی مناقشے ان مسائل کے حل میں آڑے نہ آئیں۔ ہم راہِ عمل میں سرگرم نہ ہو سکیں تو کم از کم رائے عامہ پر جو بھی صالح اثر ڈال سکیں اس سے گریز نہ کریں۔ یہ کبھی نہ بھولیں کہ سارا قصور فریق مخالف ہی کا نہیں

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
شعبۂ اردو۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
حیدرآباد

ہندستانی کلچر کا مزاج

"ترانۂ ہندی" میں اقبال نے ہندستانی کلچر کے دو گوشوں کی طرف بہت ہی اہم اشارے کیے تھے۔ وہ کہتے ہیں ؎

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

واضح طور پر اقبال اس پہلو کی نشاندہی کر رہے تھے کہ ہندستان کی عظمت اور اس کا حسن ان ہزاروں ندیوں کی وجہ سے ہے جن سب میں اس حد تک ایک بات مشترک ہے کہ وہ سب ندیاں کہلاتی ہیں لیکن ان کی سمتیں ان کے مخرج و منبع الگ الگ ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ہزاروں کی تعداد یعنی کثرت، حسن ہے اور اسی کثرت کی وجہ سے ہمارا گلشن "رشکِ جناں" ہے۔

یہ جو ہزاروں ندیوں کا استعارہ ہے اس کے پس منظر میں ہزاروں چھوٹی بڑی تہذیبی اکائیاں ہیں جن کی اساس مختلف معتقدات، زبان، رسم و رواج پر ہو سکتی ہے لیکن یہ سب اکائیاں مل کر ایک وحدت میں بدل جاتی ہیں جس وحدت کا نام ہندستانی تہذیب ہے۔

یہ ہندستانی تہذیب کیا ہے، اس کی خصوصیات کیا ہیں اور اس کا مزاج کیا ہے؟

جس طرح ندی کے مزاج میں دو باتیں ناگزیر ہیں:

(۱) اس میں پانی ہوگا (۲) اس میں بہاؤ ہوگا۔ بالکل اسی طرح سے ہندستان کی تمام تہذیبی اکائیاں کچھ مشترک خصوصیات رکھتی ہیں۔

اقبال نے تہذیبی اکائیوں کے لیے ندی کا استعارہ اسی لیے وضع کیا تھا کہ ندی میں فعالیت ہے بہاؤ کی وجہ سے اس کی سمت بدل سکتی ہے مگر ندی کبھی الٹی نہیں بہتی اور جب الٹی بہتی ہے تو پھر تباہی آتی ہے۔ ہندستان میں بھی ساری تہذیبی اکائیاں اپنے اندر جمود یا ٹھہراؤ نہیں رکھتیں بلکہ فعالیت رکھتی ہیں۔ وہ بھی ماضی کی طرف لوٹنا نہیں چاہتیں بلکہ اپنے ماضی کی وراثت سے انکار نہ کرتے ہوئے اپنے حال کو ایک سمت دیتے ہوئے مستقبل کی طرف رواں دواں ہیں۔

ہندستانی تہذیب کا مزاج سمجھنے سے پہلے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم کلچر کا تصور کیا رکھتے ہیں۔؟

روزانہ زندگی کی بول چال میں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بہت کلچرڈ (Cultured) ہے فلاں آدمی ان کلچرڈ (un cultured) ہے تو دراصل ان فقروں کو ادا کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر ہم کسی انسان کے حسب و نسب، تاریخی پس منظر، اس کے عقائد اور اس کے سارے تصورات کو شامل کر لیتے ہیں اور چونکہ ہر مظہر کی بنیاد تصور پر ہوتی ہے اس لیے زندگی کی قوسِ قزح کا ہر رنگ کسی نہ کسی کلچر کو ظاہر کرتا ہے۔ اس روشنی میں کلچر کی تعریف یوں ہوگی:

"کلچر انسان کے ان تخلیقی تصورات کا نام ہے
جس کے مظاہر مخصوص نظامِ حیات کی ترتیب، تنظیم اور
تہذیب کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔"

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کلچر کے محرکات کیا ہیں۔ کلچر کی بنیاد کیا ہے؟ رنگ، نسل؟ عقیدہ یا مذہب؟ معاشی یا اقتصادی نظام، اخلاقیات؟ وہ کون سی قدر ہے جو تصورات کو ابھارتی ہے۔



متذکرہ بالا نظریات میں بہت سے نظریات ایسے ہیں جنھیں عملاً شکست ہو چکی ہے مثلاً رنگ و نسل کی بنیاد پر کلچر کا تصور رکھنے والے دوسری جنگ عظیم میں مکمل طور پر شکست کھا چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ آج بھی Aparthied کے نام پر جنوبی افریقہ کے مختصر سے علاقے میں نسل کی بنیاد پر کلچر کا تصور رکھنے والے افراد موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کا نظریہ اس لیے درست نہیں کہ جس نسلی تفوق کا وہ دعوا کرتے ہیں وہ نسلی تفوق اس وقت کہاں باقی رہے گا جب وہاں سب اسی نسل کے افراد ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ سفید فام ہونے کی بنیاد پر کلچر وجود میں آتا ہے تو کیا جنوبی افریقہ کے سفید فام افراد کا کلچر وہی ہے جو لندن یا برلن کے سفید فام افراد کا ہے؟ اور یہ حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

بہت سارے لوگوں نے مذہبی اصطلاحات کو خلط ملط کیا ہے اور نہایت غیر ذمہ داری سے ہندو کلچر اور اسلامی کلچر کے فقرے استعمال کیے ہیں۔

مذہب یقیناً ہماری زندگی کا بہت بڑا جزو ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن مذہب کا تعلق عقائد سے ہے اور مذہب کی ہمہ گیری علاقے کی رہین منت نہیں ہوتی۔ ایک ہی عقیدے کے افراد دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہو سکتے ہیں۔ ان کی بولیاں مختلف ہوں گی۔ ان کے معاشرے میں اختلاف ہوگا۔ ان کے ذہنی رویے ایک جیسے نہیں ہو سکتے ان میں ایک بات مشترک ہوتی ہے اور وہ ہے عقیدہ۔ اور عقیدہ اپنے اظہار کے لیے عبادات کا نظام رکھتا ہے جبکہ کلچر کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کا علاقہ ہونا چاہیے اور یہ علاقہ اس کے پہاڑوں کی عظمت اور دریاؤں کی روانی، اس کے مخصوص پھولوں کی مہک، اس کے پھلوں کی شیرینی سے عبارت ہوتا ہے اور یہ سارے اجزا مل کر چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح ایک بڑی تصویر بناتے ہیں اس تصویر میں مذہب کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور کہیں نہ کہیں زعفرانی رنگ یا ہرے رنگ کا استعمال ہوتا ہے لیکن بس اتنا ہی جتنا کہ آنکھوں کو بھلا لگے۔

مذہب دراصل طہارت نفس کا دوسرا نام ہے اور ہم اپنے باطن کی تطہیر کے لیے خارج سے پانی حاصل نہیں کرتے بلکہ اندرون کی ہی روشنی ہماری طہارت کرتی رہتی ہے۔ اسی لیے ہمارے ملک میں مذہب اپنی بہت اہم رہا اور آج بھی ہے اور رہے گا۔ لیکن مذہب نے بھی بیر کا سبق نہیں دیا بلکہ ہندوستانی مزاج یہ رہا ہے کہ راستے مختلف ہوں ایک ہوتی ہے' باجے ہزاروں ہو سکتے ہیں صدا ایک ہوتی ہے۔ مہاتما نے کہا تھا،

"آج کے دور کا تقاضا ایک مذہب نہیں ہے بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رواداری کے ساتھ پیش آنا ہے۔ ہم جامد سطح پر نہیں پہونچنا چاہتے بلکہ کثرت میں وحدت چاہتے ہیں۔ تمام مذاہب کی روح ایک ہے لیکن یہ مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہے۔ یہ مختلف مظاہر تا ابد قائم رہیں گے۔ دانش مند اس ظاہری پیکر کو نظر انداز کرتے ہیں اور مختلف پیکر میں ایک ہی روح دیکھتے ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں،

"ہندستان مختلف مذاہب کا ملک ہے لیکن ماضی میں مذہب نے ہمیں تقسیم نہیں کیا ہے"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی ایسے کلچر کا تصور نہیں رکھتے جو (۱) جس میں ٹھہراؤ ہو، جو ماضی کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہو، جو قانونی ارتقا کا منکر ہو۔ (۲) ہم ایسے کلچر کا تصور رکھتے ہیں جو مذہب کی اہمیت کا منکر نہ ہو لیکن ہر رنگ کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش نہ کرے۔ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں اس طرف اشارہ کیا تھا، جب انھوں نے کہا تھا ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

تو انھوں نے کچھ گوشوں کی وضاحت اور صراحت کر دی تھی۔ مثلاً جب مذہب بیر رکھنا نہیں سکھاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے مذاہب ہوں گے ان میں آپس میں جھگڑا نہیں ہوگا اس لیے کہ مذہب بیر رکھنا نہیں سکھاتا اور ہر مذہبی فکر کو پھولنے اور پھلنے کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن تمام مذہبی افکار کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم رہے گی مگر

تو اتنا ہی سب کو بیک کہنا ہے اس لیے کہ ہم ہندی ہیں، ہمارا وطن ہندوستان ہے۔ تیرتھ رام، جہان آبادی کے لفظوں میں ؎

گنگا نہانے شیخ اگر تیرا اذن ہو
گر تیرا حکم ہو تو برہمن کرے وضو

اس روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی کلچر کی ایک مزاج اور نفاست مذہب کے کسی ایسے تصور کو تسلیم نہیں کرتی جس کی بنیاد تعصب یا منافرت پر ہو اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں کی روایات نے مذہب کا استحصال نہیں کیا بلکہ مذہب کے تقدس کو سخت ترین حالات میں بھی برقرار رکھا۔ مذہب مقدس ہے اعلا و ارفع ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان ان لطیف رشتوں کا نام ہے جن کی بنیاد پر انسان تو انسان ہے جانور بھی مدارج حیات طے اور اعلا منصب حاصل کر سکتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس ملک نے کائنات کے ذرے ذرے کی اہمیت کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اس کا احترام کیا اور اس کے تقدس کو برقرار رکھا۔ جمادات ہوں یا نباتات، شجر ہوں یا حجر، حیوان ہوں یا انسان۔ چاند سورج یا ستارے ہوں یا آکاش، دھرتی اور پاتال۔ سب کا احترام کر کے ہندستانی کلچر نے یہ سکھا دیا کہ جس طرح ندی میں پانی بہر حال ہوتا ہے اسی طرح ہندستانی کلچر کی "آب" احترام خالق و مخلوق ہے۔

اب ہندستانی کلچر کا دوسرا رخ دیکھئے اور اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ دوسرا پہلو بھی کم اہم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں سب کا احترام کیا جائے گا اور اس احترام میں کوئی تصنع نہیں ہوگا بلکہ یہ دل کی گہرائیوں سے ہوگا وہاں احترام کا لازمہ ہے کہ باہمی تفاہم ہو تصادم نہ ہو۔ تعاون ہو کشمکش نہ ہو۔

کہاوت ہے کہ جو دوسرے کی عزت کرتا ہے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ چونکہ ہندستان نے احترام کا سبق دیا تھا اس لیے اس کا احترام کیا گیا اور یہ سب جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو بشر پسند ہیں وہ شر پسند نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی شر پسند ہے تو پھر وہ ہندستانی کلچر کے مزاج سے بالکل بے خبر ہے۔ ہندستان کے لوگ تو امن پسند ہیں اور ہزارہا برس کی تاریخ میں ہندستان کے لوگ زندگی کے بارے میں امن پسند رویہ رکھتے آئے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ درست ہے یا غلط بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ ہندستان نے کبھی بھی توسیع پسندی، فتوحات اور ملک گیری کی طرف توجہ نہیں کی۔

زندگی ایک نعمت ہے۔ ایک رس بھرے پھول کی مانند ہے اور انسان شہد کی مکھی ہے جو پھولوں کے اس رس کی ہر بوند کو اپنا لینا چاہتا ہے اپنے ہی محدود دائرے میں رہ کر زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونا ہی مقصد حیات ہے۔ چاند کی کرنیں۔ بارش میں مٹی سے اٹھتی ہوئی سوندھی مہک، نرم اور آہستہ خرام ہواؤں کے جھونکے۔ بہتے ہوئے دریا کی موسیقی، بے شمار پرندے، چراگاہوں اور مرغزاروں میں کلیلیں کرتے ہوئے جانور۔ ان سب میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے یہی تو حسن ازل ہے جو ہر شے میں جھلک رہا ہے اور یہی تصورات زندگی کو جارحیت کی طرف نہیں بڑھنے دیتے بلکہ اپنے ہی دائرے میں رہ کر کسی طرح زیست کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں اور یہ "زیست" کرنے کا ہنر ایسی تخلیقات کی طرف توجہ دلاتا ہے جو زندگی کو سجا سکیں، سنوار سکیں، حسین سے حسین تر بنا سکیں۔ اسی لیے یہاں کے لوگوں کے خواب بھی حسین رہے ہیں، اس کی تعبیر بھی حسین رہی ہے۔ رومن رولاں نے لکھا ہے:

"اگر دنیا میں کوئی خطہ ارض ایسا ہے جہاں انسان نے اپنے وجود کے خواب سے لے کر آج تک کے خوابوں کے لیے جگہ پائی ہے تو وہ ہندوستان ہے۔"

یہ ہندستان جو ہم سب کے خوابوں کا جہاں ہے اس ہندستان کے کلچر کی روح رواداری، باہمی احترام اور رنگا رنگی میں یک رنگی پر مبنی ہے۔ یہ ہندستان وہی ہندستان ہے جس نے اپنی ہزارہا برس کی تاریخ کے اٹوٹ تسلسل کو آج تک برقرار رکھا ہے۔ میکس ملر نے لکھا ہے:

"ہندستان کے جدید ترین اور قدیم ترین طرز فکر کے درمیان ایک اٹوٹ تسلسل ہے جو گزشتہ تین ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر مجھ سے دریافت کیا



جاناکرکس آسمان کے تلے انسانی زمین نے اپنے
منتخب عطیات کو ارتقا کی شکل دی ہے، زندگی کے
اہم ترین مسائل کا حل دریافت کیا ہے جس کی طرف
ان لوگوں کی بھی توجہ مبذول ہوئی ہے جنھوں نے افلاطون
اور کانٹ کا مطالعہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ
سرزمین ہندستان ہے"۔

اس ہندستان کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال نے کہا تھا ؎

یونان و مصر و روماں سب مٹ گئے جہاں سے
باقی ہے لیکن اب تک نام و نشاں ہمارا

ظاہر ہے کہ جغرافیائی طور سے یونان، مصر اور روم تینوں ملکوں کا وجود آج بھی ہے۔ ان کے اسلاف کے کارنامے بھی موجود ہیں ان کی اپنی تہذیبی روایات بھی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ہر بڑی تہذیب نے یا اپنے کو فنا کر دیا یا اپنا مزاج بدل دیا۔ لیکن ہندستانی کلچر نے اپنے مزاج کو برقرار رکھا۔ آج بھی جب دنیا میں دوہرے معیار ہیں اور آدازوں کے جنگل میں ایک دوسرے کو دبانے، سزا دینے اور کچلنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ہندستان کا باہمی احترام، رواداری اور انسان دوستی کا پرچم سربلند ہے۔ اس کلچر کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس سربلندی کی حفاظت مقدس وطنی فریضہ ہے۔ سلام مچھلی شہری نے کہا تھا ؎

اُبھر چکی ہے جو بحرِ افق کے ساحل سے   وہ کشتیِ سحر زرنگار ڈوب نہ جائے
بچا کے لائے ہیں جس کو بھنور کے چنگل سے
وہ ناؤ پھر مرے پروردگار ڈوب نہ جائے



نیا آدمی نامہ

ص۲۵ کا بقیہ

ہمارا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم فرشتہ نہیں، مذہبی منافرت دور کرنے کے لیے ملک کو آج پھر مہاتما گاندھی کی ضرورت ہے۔ کہاں سے لائیں انھیں؟ جسے تیسری دنیا کہتے ہیں اس کے سب ممالک کے، بالخصوص عوام کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ آج کوئی ملک دوسرے ملکوں کی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک ملک کے باشندوں ہی میں نہیں، تیسری دنیا کے سبھی ملکوں میں یک جہتی کی ضرورت ہے لیکن اس کو اپنا مقصود بنانے سے پہلے ہمیں اپنا گھر تو ٹھیک کر لینا چاہیے اور تیسری دنیا تک ہی کیوں محدود رہیں، مشرقین کے ڈانڈے کیوں نہ ملائے جائیں۔

مجھے تین بار باہر کے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں کے باشندوں سے کم ہی مل سکا لیکن جس قدر بھی ملا اس سے یہی اندازہ ہوا کہ سب کے سینوں میں ایک ہی قسم کا دل دھڑکتا ہے۔ جاپان میں پی ایچ ڈی اردو کی دو طالبات اور ایک طالب علم نے میری اور میری اہلیہ کی اسی عقیدت کے ساتھ خدمت کی جیسے میرے حیدرآبادی شاگرد کرتے۔ مغربی ممالک میں جانے سے پہلے گوروں سے ہیبت معلوم ہوتی تھی۔ جیسے وہ ہمیں کھا جائیں گے۔ اکبر الہ آبادی کا مصرع ذہن پر مسلط رہتا تھا جس میں کچھ یہ کہا ہے کہ جان کی خیر چاہو تو انگریز سے ڈرتے رہو مغرب میں جا کر معلوم ہوا کہ وہ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں۔ وہ بھی اسی اخلاق اور گرم جوشی کا ثبوت دیتے ہیں جیسے کوئی اپنا ہم وطن ـ ایک برمی جوڑا ملا۔ شوہر برمی بودھ، بیوی امریکن۔ وہ برمی اسی انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی ہندستانی۔ میرے لڑکے کی پڑوسن ایک امریکی نیگرو خاتون تھی۔ کبھی کبھی اس سے بات ہو جاتی تھی۔ وہی گھریلو انداز جو ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔

حبّ وطن اور قوم پرستی بہت اعلیٰ جذبے ہیں لیکن اسی قوم پرستی نے بنی نوعِ انسان کو بانٹ دیا ہے ورنہ بنیادی حیثیت سے تمام انسانوں کی نفسیات اور جذبات یکساں ہیں۔ ان سب کو ملانے کے لیے کسی ایسے غیر مذہبی مسیحا کی ضرورت ہے جو بارے آسمان کی نہیں، زمین کی، خدا اور پرمیشور کی نہیں، انسان کی باتیں کرے، جو وحدتِ انسانیت کا درس دے۔ آج دنیا میں کوئی اس قد و قامت کا پیغمبرِ انسانیت دکھائی نہیں دیتا۔ کیا ادب، ناول اور شعر اس راہ میں کچھ کر سکتا ہے۔؟ سنت کبیر اور نظیر اکبر آبادی کی یاد آتی ہے۔ ایک نیا آدمی نامہ لکھنے اور اس کی دیس بدیس میں تشہیر کرنے کی ضرورت ہے۔ ◻◻



کربلا

کربلا — کربلا

کربلا — ظلم و بیداد کا سلسلہ
کربلا — صبر و ایثار کا مرحلہ
کربلا — جہدِ انکار کا حوصلہ
آج ہر موڑ پر
آج ہر گام پر
اِک نئی کربلا

خون معصوم بچوں کا سنسان راہوں میں ہے
شور آہ و فغاں کا سسکتی ہواؤں میں ہے
زہر نفرت کا پیوستہ نیلی فضاؤں میں ہے
بڑھتا جاتا ہے
اِنساں سے اِنساں کا فاصلہ
کربلا — کربلا
آج ہر موڑ پر
آج ہر گام پر
اِک نئی کربلا

سوختہ بستیوں میں تشدد کی یلغار ہے
تنگ و تاریک گلیوں میں لاشوں کا انبار ہے
قہقہے — دل لگی
ولولہ — نغمگی
آج شہرِ نگاراں سے بیزار ہے

بھوک — فاقہ کشی
خوف — بے چارگی
اب تو محنت کشوں کا مقدر ہے
ہر شخص بیکار ہے
کب تلک — کب تلک
خونِ ناحق بہانے کا یہ ولولہ
کربلا — کربلا
آج ہر موڑ پر
آج ہر گام پر
اِک نئی کربلا

سرنگوں نا اُمیدی کے صحرا میں ہے
بے نواؤں کا اُجڑا ہوا قافلہ
اور مجروح و مظلوم طے کر چکے — بارہا
صبر و ایثار کا مرحلہ
ختم پھر بھی نہیں — ختم پھر بھی نہیں
ظلم و بیداد کا سلسلہ
اب تو باقی ہے بس — اب تو باقی ہے بس
جہدِ انکار کا فیصلہ
کربلا — کربلا
آج ہر موڑ پر
آج ہر گام پر
اِک نئی کربلا
کربلا — ظلم و بیداد کا سلسلہ
کربلا — صبر و ایثار کا مرحلہ
کربلا — جہدِ انکار کا حوصلہ

زاہدہ زیدی
آبشار - ۴، ایچ آئی جی فلیٹ
سرسید نگر - علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲



پروفیسر گوپی چند نارنگ
ڈی۔۲۵۲، سروودیہ انکلیو۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۱۷

کلاسیکل اُردو شاعری اور ملی جلی معاشرت

شاعری کو مَن کی موج کہا گیا ہے۔ یعنی یہ الفاظ کے ذریعہ اظہار ہے داخلی کیفیات اور جذبات کا۔ داخلی کیفیتیں عالمگیر ہوتی ہیں۔ مثلاً محبت اور نفرت، غم اور خوشی۔ اُمید اور ناامیدی، حسرتوں کا نکلنا، یا ان کا خون ہوجانا۔ یہ سب جذبے اور تخئیلی تجربے کی مختلف صورتیں ہیں۔ جغرافیائی یا سماجی حد بندیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ شاعری زماں یا مکاں کی پابند نہیں ہوتی۔ انسان کہیں بھی ہو، اس کا تعلق خواہ کسی معاشرے سے ہو، درد میں اگر سچائی اور خلوص ہے تو وہ اس سے متاثر ہوگا، لیکن شاعری صرف جذبات ہی جذبات نہیں، اس میں آثار و واقعات کا پرتو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ رمزیہ پہلو کے ساتھ ساتھ شاعری کے بیانیہ امکانات بھی ہیں۔ ہر زبان کی شاعری کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ اپنا ماحول اور اپنا پس منظر ہوتا ہے جس سے وہ اپنی ذہنی تصویروں کے لیے رنگ حاصل کرتی ہے۔ اسی فضا اور ماحول کا تعلق معاشرت سے ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی زبان کی شاعری اپنے ماحول اور معاشرت سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

چنانچہ قدیم اُردو شاعری سے بھی اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی ہندستانی معاشرت کو سمجھنے کے لیے مدد لی جاسکتی ہے۔ گیارھویں صدی میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا باقاعدہ سابقہ شروع ہوا تو باہمی اشتراک اور اختلاط سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آنے لگا۔ مغلوں کے عہد حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں میں مذہب کے ظاہری اختلاف کے باوجود عوام کی سطح پر باطنی یک رنگی اور اندرونی وحدت پیدا ہوچکی تھی اور ایک ملی جلی معاشرت وجود میں آرہی تھی۔ ہماری اُردو شاعری اسی مخلوط معاشرت کی ترجمان ہے۔

معاشرت کے کئی پہلو ہیں۔ رہن سہن، آداب و اخلاق، رسم و رواج، خوراک و پوشاک، میلے ٹھیلے، تیج تہوار وغیرہ۔ ہم پہلے تہواروں کو لیتے ہیں:

ہندستان میں موسموں کے لحاظ سے تہواروں کے دو حصے کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے کے تہواروں کا آغاز رکھشا بندھن سے ہوتا ہے۔ اس کا اصلی مدّعا یہ تھا کہ برسات کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے بعد دُعا مانگی جائے۔ اس روز برہمن یگیہ اور ریاضت کے بعد خلق خدا کی حفاظت کے لیے۔ اکھی یعنی تعویذ تقسیم کرتے ہیں بہن کی طرف سے بھائی کو راکھی باندھنے کا رواج نسبتاً نیا ہے۔ غالباً اس کا آغاز راجپوتوں سے ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پسندی کے رشتوں کو مضبوط کرنے میں اس تہوار کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ہمایوں کے عہد حکومت میں جب بہادر شاہ والی گجرات نے اودے پور پر حملہ کیا تو رانی کرناوتی نے راکھی بھیج کر ہمایوں سے مدد کی گزارش کی گو ہمایوں کے پہنچنے سے پہلے چتوڑ فتح ہوگیا تھا اور رانی جوہر کرکے ستی ہوچکی تھی لیکن ہمایوں نے بہادر شاہ کا تعاقب کیا اور اسے گجرات سے نکال دیا، جس کے تھوڑی مدت کے بعد وہ مارا گیا۔

اکبر نے راجپوتوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرکے باہمی محبت

کی اس روایت کو فروغ دیا ۔ چنانچہ راکھی کو سلونو (سالِ نو) کا نام اکبر ہی کے زمانے میں دیا گیا۔ اس تہوار سے مغلوں کی مزید محبت کا ثبوت برہمن رام کوِر کے شاہی تعلقات سے ملتا ہے۔ اس برہمن نے شاہ عالمگیر ثانی کی لاش کو جمنا کی ریتی میں پڑا پایا تھا اور ساری رات اس کا سر اپنے زانو پر لیے بیٹھی رہی تھی ۔ سلونو کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس میل جول کی تصدیق نظیر اکبرآبادی کی نظم راکھی سے بخوبی ہو جاتی ہے ۔ نظیر مخلوط معاشرت کے آثار و کوائف کی منظر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے ؎

پھریں ہیں راکھیں باندھے جو ہر دم حُسن کے مارے
تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے مارے
پہن زنّار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے
نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تہوار کی راکھی

تہواروں کے چلتے سلسلے کا خاتمہ دیوالی پر اور دوسرے کا ہولی پر ہوتا ہے دیوالی کی ہر رات چراغاں کیا جاتا ہے ۔ ہولی دن میں منائی جاتی ہے ۔ اس موقع پر خوشی اور کامرانی کا اظہار ایک دوسرے پر رنگ ڈال کر کیا جاتا ہے ۔ دیوالی کی تقریب میں مسلمان بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے ۔ شاہ عالم آفتاب کے ہندی اردو کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ قلعہ معلیٰ میں دیوالی بھی عید ، بقر عید ، آخری چار شنبہ اور عُرسوں کی طرح بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی ۔ اماوس کے روز سرسوتی کے پوجن کا التزام کیا جاتا تھا ۔ جابجا چراغ جلائے جاتے تھے آتش بازی کے تماشے ہوتے تھے ۔ عورتیں سولہ سنگار کرتی تھیں اور منگل گان ہوتے تھے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ آج سے دو سو برس پہلے ہندستان کے مقامی تہوار محض مذہبی مراسم نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ سماجی میل جول اور باہمی رواداری کا مرقع بن گئے تھے ۔ دیوالی اور شب برات میں ایک حد تک یک رنگی پیدا ہو گئی تھی اور دیوالی کی طرح شب برات کی آتش بازیاں بھی رواج کا حصہ تھیں ۔ سید احمد دہلوی نے رسوم دہلی میں لکھا ہے کہ دہلی کے مسلمان رمضان اور عید کی طرح دیوالی کو بھی ایک تہوار گنتے تھے اور اس دن سسرالی رشتوں میں بالکل ہندوؤں کی طرح لین دین کی رسمیں ہوتی تھیں ۔ اس زمانے میں ملی جلی معاشرت میں دیوالی کا اثر شب برات کے علاوہ مہندی کی آمد ، عرسوں کی روشنی اور شادی بیاہ کے جلوسوں وغیرہ میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ آتش بازی کے بغیر کوئی تہوار مکمل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ قدیم اُردو مثنویوں سے اس کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ میر تقی میر کی مثنوی "شادی" اور حاتم کی مثنوی "بہاریہ" میں ہندستان کی ملی جلی معاشرت کا یہ پہلو نمایاں طور سے دیکھا جا سکتا ہے ۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ سے متعلق حاتم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

قطار ایسے چراغوں کی بنائی
کتابوں پر ہو جوں جدول طلائی
در و دیوار بام و صحن و گلشن
چراغوں سے ہوا ہے روز روشن

دیوالی کے معاشرتی کوائف کو نظیر اکبرآبادی نے بھی بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے ؎

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دیوالی کا
ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دیوالی کا
سبھی کے جی کو سماں بھا گیا دیوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دیوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دیوالی کا

ماگھ میں جب بہار کلیوں کو گدگدانے لگتی ہے تو مسرت کے قدرتی اظہار کے لیے بسنت پنچمی کا تہوار منایا جاتا ہے ۔ قدیم اُردو شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کا تہوار مسلمانوں میں بھی مقبول تھا ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں بسنت کے تہوار سے متعلق نو نظمیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کو شاہی تقریب کا درجہ حاصل تھا اور اسے بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا ۔

اورنگ زیب کے جانشینوں کے زمانے میں بھی بسنت شاہی تہواروں میں داخل تھی ۔ شاہ عالم آفتاب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تہوار کے دن قلعہ معلیٰ میں زرد لباس پہننے کا رواج تھا ۔ پھولوں کا گڑوا بنا کر



سر پر لانے کی رسم ادا کی جاتی تھی اور سب مل جل کر پھولوں سے کھیلتے تھے۔ ذوالقدر جنگ درگاہ قلی خاں نے اپنی تصنیف "مرقع دہلی" میں بسنت کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس تہوار پر شہر میں عجیب رونق ہوتی تھی ۔ قدم شریف، قطب صاحب، روضہ شاہ حسن رسول نما اور مزار شاہ ترکمان پر بڑا مجمع ہوجاتا تھا۔ قوالوں مجرائیوں اور زائروں کی ٹولیاں پھولوں کے گلدستے اور خوشبوئیں ہاتھوں میں لیے گاتی ہوئی آتیں۔ حسین لوگ شامل ہوتے اور چھ روز تک بڑی رنگین محفلیں جمتی تھیں۔ بسنت کے اس مشترک پہلو کی عکاسی اردو بارہ ماسوں میں بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ بسنت کا ذکر مثنویوں کے علاوہ ہمارے قدیم غزل گو شاعروں کے ہاں بھی ملتا ہے ؎

کویل نے کوک آ کے سنائی بسنت رت
بر آئے خاص و عام کہ آئی بسنت رت

——— آبرو

بیٹھے وہ زرد پوش جھلک سے بنا بسنت
چاروں طرف سے آج اٹھی جگمگا بسنت

——— آبرو

کھینچ لائی ہے چمن میں کیونکر اس مغرور کو
تو نے کیا سرسوں ہتھیلی پر جمائی ہے بسنت

——— سوز

اس ادا و ناز سے آئی ہے جو تو مجلس میں
کیا مرے یار سے سیکھے ہے تو رفتار بسنت

——— ثناء اللہ فراق

تو نے لگائی آ کے یہ کیسی آگ اے بسنت
جس سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت

——— انشا

مزا بسنت کا جب ہے کہ وہ بسنتی پوش
خوشی سے بیٹھ کے پہلو ہمارے گائے بسنت

——— شہید

تھی چمن میں آ گئی کیا صورت بہار بسنت
کہ شاخ شاخ پہ ہے نغمۂ ہزار بسنت

——— احمد علی رونق

بسنت کی طرح ہولی کی رنگینیاں بھی محض ہندوؤں تک محدود نہ تھیں۔ "قلعہ معلیٰ" میں ہولی کی تقریب بھی ذوق و شوق سے منائی جاتی شاہ عالم آفتاب سے متعدد ہولیاں منسوب ہیں۔ "قلعہ معلیٰ" میں پھاگ گانے اور پھاگ کھیلنے کا عام رواج تھا۔ نیل اور کیسر رنگ کی پچکاریاں بھری جاتی تھیں۔ ایک دوسرے پر عبیر اور گلال چھڑکتے تھے اور پھولوں کی گیندوں سے کھیلتے تھے۔ سید احمد دہلوی کا بیان ہے کہ مسلمانوں شادی بیاہ کے موقع پر ابٹنا کھیلنے کی رسم بہت کچھ ہولی سے ملتی جلتی ہے۔ اردو شاعری میں ہماری مخلوط معاشرت کے ان پہلوؤں نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے [12]

سب کے تن میں ہے لباس کیسری
کرتے ہیں صد برگ سوں سب ہمسری
چاند جیسا ہے شفق بھیتر عیاں
چہرہ سب کا از گلال آتش فشاں

——— فائز

گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی
پکارے یک بیک ہولی ہے ہولی!
لگی پچکاریوں کی مار ہونے
ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے
کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری
کوئی چنپا بدن عمروں میں تھوڑی
کھلے بالوں میں ہے ابرک کی افشاں
کہ جیسے رات کو تارے ہوں رخشاں
تماشا سا تماشا ہو رہا ہے
کہ ہر اک رات سے جی دھو رہا ہے

——— شاہ حاتم

اور ؎

قمقمے جو گلال کے مارے مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں   گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں

جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے

راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

میر تقی میر

ان شاعروں کے علاوہ ہولی کا ذکر سودا، قائم چاندپوری، جرأت، مصحفی، قدرت اللہ قاسم، سحر لکھنوی، حاتم علی بیگ مہر، اور نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی ملتا ہے۔

رواداری کے یہ جذبات یکطرفہ نہیں تھے جس طرح مسلمان ہندوؤں کے تہواروں میں دلچسپی لیتے تھے اسی طرح ہندو بھی اسلامی روایات اور نظریات کا احترام کرتے تھے۔ عہد مغلیہ کے اکثر ہندو مصنفین اپنی تصانیف کی ابتدا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور "یا فتاح" جیسے اسلامی کلمات سے کرتے تھے۔ اردو کے بیشتر شعراء نے اپنے دواوین وغیرہ کے آغاز میں حمد، نعت اور مناجات کے باقاعدہ عنوان قائم کیے ہیں۔ ہندوؤں میں متعدد ایسے شاعر ہوئے ہیں جو نہایت احترام و عقیدت سے نعت کہتے تھے۔ ان میں سے ہرگوپال تفتہ، بندرابن خاصی، بال مکند بے صبر، دوارکا پرشاد افق، منشی رام لوکرم، شیو پرشاد وہبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چھنولال طرب کی نعتوں اور منقبت کا ایک مخطوطہ کتب خانہ رضائیہ رام پور میں محفوظ ہے۔ روپ چند نامی شاگرد ساقی سکندر آبادی کی غزلوں میں ایک شعر نعتیہ ضرور ہوتا تھا۔ کالکا پرشاد نادان اور بہاری لال مشرق، درگا سہائے سرور، بشن نرائن حاکم، راجہ مکھن لال، مرکشن پرشاد، پربھو دیال عاشق، رام بہادر لال جویا اور ہری چند اختر نے بھی رسول عربی کی شان میں احترام کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ محفوظ الرحمٰن نے ایک مجموعہ "ہندو شعراء دربارِ رسولؐ میں" ۲۵ برس پہلے شائع کیا تھا۔ ایسا ہی ایک اور مجموعہ "ہندو شعراء کا نعتیہ کلام" بھی شائع ہو چکا ہے۔

یہی عالم اسلامی تقریبات کا تھا۔ مرثیے محرم بڑے احترام کے ساتھ منایا کرتے تھے۔ گوالیار کا محرم آج بھی مشہور ہے۔ شرر نے "گذشتہ لکھنؤ" میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ہزارہا ہندو صدقِ دل سے تعزیہ داری اختیار کرتے تھے اور سوز خوانی میں شریک ہوتے تھے

شہیدانِ کربلا اور اہلِ بیت کا جو احترام ہندوؤں کے دلوں میں تھا اس کی تصدیق ہندوؤں کے لکھے ہوئے مراثی سے ہوتی ہے۔ ایک شاعر راما راؤ نے شہادت امام حسین علیہ السلام پر ایک کتاب لکھی تھی جو نایاب ہے۔ لکھنؤ میں مرثیے کی ابتدا ایک ہندو شاعر چھنولال طرب ہی سے ہوئی۔ راجہ الفت رائے، دوارکا پرشاد افق، پیارے لال رونق، چندی پرشاد شیدا کے مراثی درد و سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مرکشن پرشاد کے دو مجموعے "ماتم حسین" اور "نوحۂ شاد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ دورِ جدید کے تقریباً ۳۰ ہندو شاعروں کے مراثی کتابی صورت میں "ہمارے حسینؑ" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

غرض اردو شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سیاسی زوال کے باوجود محبت اور رواداری کے رشتے مضبوط تھے۔ یہ اثرات یکطرفہ نہیں تھے بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا اور معاشرتی سطح پر ایک ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ تہواروں کے علاوہ مقامی میلے ٹھیلوں اور کھیل تماشوں میں بھی یہی رنگ نمایاں تھا۔ ان میں پھول والوں کی سیر، چھڑیوں کا میلہ، عیش باغ کا میلہ، قیصر باغ کا میلہ، جشن بے نظیر وغیرہ کا ذکر متعدد شاعروں کے ہاں مل جاتا ہے۔

مخلوط معاشرت کی یہ یک رنگی اس زمانے کے رسم و رواج میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مذہبی رسوم الگ الگ ہیں لیکن عام رواج ایک جیسے ہیں۔ برات لڑکے والوں کے گھر سے لڑکی کے گھر جاتی ہے۔ شادی سے کچھ روز پہلے مسلمانوں میں "مائیوں بٹھانا" ایک رسم ہے۔ اس میں دلہن کو مانجھے پر بٹھایا جاتا ہے۔ مانجھا پنجابی لفظ ہے یعنی پلنگ یا چارپائی۔ شرر لکھتے ہیں کہ:

> "یہ ایک خالص ہندی رسم ہے جسے نہ عرب سے تعلق ہے نہ عجم سے۔ اس لیے کہ مانجھے اور اس کے ساتھ کنگنے کھیلنے کی ابتدا ہندوستان کے سوا کسی اور جگہ ثابت نہیں ہوتی۔"

مسلمانوں میں شادی سے پہلے دلہن سے صحنک یعنی حضرت فاطمہؓ کی نیاز دلوائی جاتی ہے۔ اس رسم کی ایجاد شاہ جہاں کی ماں جودھا بائی سے منسوب ہے۔ مسلمانوں نے ساچق اور مہندی کی رسمیں بھی ہندوستان میں آنے کے بعد اپنائی ہیں۔ سہاگ پڑے کی چیزیں یکسر ہندوستانی ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں دولہا کو دستار اور سہرے سے آراستہ



کیاجاتا ہے۔ دلہن کے پہلی دفعہ مانگ بھری جاتی ہے۔ ٹیکا خالص ہندوانہ چیز ہے۔ سولہ سنگار سے دونوں واقف ہیں۔ مثنوی "سحرالبیان" سے دلہن کی یہ تصویر ملاحظہ ہو ؎

کھجوری گوندھی وہ پاکیزہ چوٹی
کہ سب اہلِ نظر کی جان لوٹی

پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا
وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں چمکا

اگر ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے تھے
زرِ خالص کے زیب پا چھڑے تھے

جو ٹیکا اس کے ماتھے پر لگایا
قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا

برات کی پیشوائی کے بعد عورتوں کی ریت رسمیں بھی دونوں میں کم و بیش ایک ہیں۔ نبات چھُوانا، نیگ رخصتی وغیرہ عرب ایران کی رسمیں نہیں۔ انگوٹھے میں لہو لگوانا، کالے تل چبوانا، کھیر کھلانے اور جوتی پر کاجل پارنے کا ذکر مثنویوں میں ملتا ہے ؎

اک پرستار چلبلی اچپل
لائی جوتی پہ پار کر کاجل

کان سے اک لگا گئی چونا
چھیڑتی ایک ایک سے دونا

(مثنوی سعیدین)

منڈھا نے گانے کا رواج دونوں کے یہاں ہے۔ میر حسن کے اشعار دیکھیے ؎

سحر کا وہ ہونا وہ ٹونے کا وقت
وہ دُلہن کی رُخصت وہ رونے کا وقت

چلے لے کے چنڈول جس دم کہار
کیا دو طرف سے زر اس پر نثار

کھڑے تھے جو واں چشم کو تر کیے
سو موتی انھوں نے نچھاور کیے

بس مخلوط معاشرت کا اثر ہمارے مراثی پر بھی ہوا ہے۔ مراثی میں اہلِ بیت کا ذکر کرتے ہوئے جو معاشرتی پس منظر دکھایا جاتا ہے سراسر عرب نہیں ہے بلکہ بہت سی ہندوستانی رسمیں بھی اہلِ بیت سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ شیخ چاند نے صحیح لکھا ہے:

"ہندوستانی مرثیہ نگاروں نے ایک عجیب بدعت کی ہے کہ جنگِ کربلا کے عرب نژاد مظلومین کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ لباس، وضع قطع، رفتار گفتار طرزِ معاشرت، رسوم و آداب سب ہندوستانی ہیں۔ حتیٰ کہ خیالات اور معتقدات وغیرہ بھی ہندوستانی ہیں گجرات اور دکن کے مرثیوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے بلا لحاظ زمان و مکان عرب شخصیتوں کو اپنے زمانے اور مقام کے ماحول میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ سودا نے قدیم مرثیوں کی پیروی کی ہے اس نے اپنے مرثیوں میں ہندوستانی معاشرت کے عناصر بڑی آزادی سے داخل کیے ہیں۔"

سودا کے بعد بھی یہی انداز رہا اور میر تقی میر، میر ضمیر، انیس و دبیر وغیرہ سب نے عرب کرداروں کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کیا کروں بیٹی کی شادی سے سخن
بھر کے لہو سے دھری گویا لگن

نتھ سہاگ اپنے کی کھایا کر دُلہن
تخت چڑھتے ہی اُتاری یا رسولؐ

سودا

قصہ کوتاہ میر کہاں تک آلِ عبا کے دکھ سہیے
رو دیجے کڑھیے ماتم کریے کوٹیے چھاتی سر دھنیے

میر

نتھ میری اتاری ہے ذرا آنکھ تو کھولو
گر دو نہ تسلی تو ذرا منھ سے تو بولو

ضمیر

میر انیس کے مراثی کا مطالعہ کرتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ کو

کا میدان گویا لکھنؤ کے مضافات میں ہی واقع ہے۔ اُن کے مزاج میں لکھنؤ کی فضا ہے۔ لکھنؤ ہی کے گھروں کی رسمیں ہیں، لکھنوی لباس اور وضع قطع ہے۔ بین کا انداز بھی لکھنوی ہے حتیٰ کہ بات چیت کا لہجہ اور معمولی معاشرتی کوائف بھی ہندستانی ہیں ؎

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نامور
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

غزل رمزیہ صنفِ سخن ہے۔ اس میں معاشرت کی تصویر واضح طور پر سامنے نہیں آتی۔ البتہ کہیں کہیں اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں رواج ہے کہ ایک دوسرے کو ملتے وقت نمستے یا رام رام کرتے ہیں۔ رام رام کرنے سے توبہ کرنا بھی مراد لیا جاتا ہے۔ ولی کا شعر ہے ؎

کیا دغا دار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

اگر آنکھ پھڑکے تو سمجھا جاتا ہے کہ کوئی خوشی نصیب ہونے والی ہے

کھوا پھڑکے آدے گے من ہرنا
لگوں گی آج پیا کے چرنا
——— محمد قلی قطب شاہ

کون دیدار مجھے آ کے دکھائے گا جو
دن میں سو بار مری آنکھ پھڑک جاتی ہے
——— شیر علی افسوس

سودا کا ایک شعر ہے ؎

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے

آبِ حیات میں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

"ہندستان کا قدیم دستور ہے جب سپہ سالار لڑائی میں مارا جاتا تھا تو اس کی لاش کو آگے لے کر تمام فوج کے ساتھ دھاوا کر دیتے تھے۔ سرہند پہ جب درّانی سے فوج شاہی کی لڑائی ہوئی اور نواب قمر الدین خاں مارے گئے، تو میر منّون کے بیٹے نے یہی کیا اور فتح یاب ہوا۔"

کوّے کے بولنے سے پردیس سے خط پہنچنا یا گھر میں مہمان آنا مراد لیا جاتا ہے ؎

شگون لیتے ہیں کس خوش بیاں کی آمد کا
صفیرِ طوطیِ جنّت صدائے زاغ میں ہے
——— سودا

برہمنوں کے ہاتھ دیکھنے کا ذکر یقین نے کیا ہے ؎

پڑتا ہے پاؤں اس بتِ کافر کے بار بار
کیا برہمن کو موہ لیا ہے دکھا کے ہاتھ

سفر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے یا کسی کام کا آغاز کرتے ہوئے چھینک آنا یا چھینک سننا منحوس خیال کیا جاتا ہے ؎

روئے وطن نہ دیکھا، تو نے جو مصحفی پھر
شاید کہ چھینک کے تو اپنے وطن سے نکلا

بعض فرقوں میں سانپ کے کاٹے کو تیسرے دن دریا میں بہا دینے کا رواج تھا۔ انشا کا شعر ہے ؎

چھوڑ مت زلف کے مارے کو تو دریا میں ہنوز
سانپ کے کاٹے کو دیتے ہیں بہا تیسرے دن

دفع چشم بد کے لیے جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں ان کے نام سنیئے ؎

سونے کا چھلا مور کا پر ہی فقط نہیں
اک زر دپوٹلی میں بھی تھوڑا سپند باندھ
——— انشا

زخم چشم سے محفوظ رہنے کے لیے نیلا ڈورا باندھتے ہیں یا پلکوں کا ایک آدھ بال جلاتے ہیں ؎

نیلے ڈورے توڑ بھی ڈال اپنے دونوں پاؤں کے
کیا بھلے موٹے کڑے سونے کے توڑے اڑ گئے (انشا)



ہر روز جلاتا ہوں کہ اس کو نظر نہ ہو
باقی مری اب آنکھوں میں دو چار ہیں پلکیں

——— عشقی

انتہائی خوشی کے موقع پر گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں ؎

آنکھیں مری کرے جو منور جمالِ یار
گھی کے چراغ طور کے اوپر جلاؤں میں

ہندوؤں میں رسم ہے کہ گھی کے چراغ جلاکے گنگا میں بہا دیتے ہیں ؎

دن رات پھول بہتے ہیں تو رات بھر چراغ
فردوس میں بھی یاد رہے گی بہارِ گنگ

——— ناسخ

بیمار کا صدقہ چورا ہے میں رکھواتے ہیں ؎

آنکھیں جو ہوئیں چار تو بیمار ہوا میں
چورا ہے میں رکھ آئے صدقہ مرے دل کا

——— ضمیر شکوہ آبادی

ہتھیلی کھجلانے سے دولت ہاتھ آنے کا شگون لیا جاتا ہے ؎

شاید کہ گنج حسنِ بتاں ہاتھ آئے گا
کھجلاتی ہیں جو آج ہماری ہتھیلیاں

——— سیف (خلف ناخر مکیش)

تعزیت کے لیے ننگے سر جانا معیوب خیال کیا جاتا ہے ؎

کون یہ آج موا کس کا مقدر جاگا
سوگ میں جس کے وہ ڈالے ہوئے آنچل آئے

——— رونق (شاگرد ناسخ)

دردِ سر کی شکایت ہو تو سر کا اُتارا صدقے کرتے ہیں ؎

دردِ سر کی ہے شکایت آپ کو
غیر کے سر کا اتارا دیجیے

——— داغ

پان ہندستان کی نعمت ہے۔ یہاں مہمان کی خاطر تواضع پھول پان سے کی جاتی ہے ؎

تمھاری بزم میں بھولے سے میں چلا آیا
کرو نہ میرے لیے پھول پان کی تکلیف

——— داغ

پان کا ہماری روزمرّہ زندگی میں بڑا عمل دخل ہے۔ یہ طرح طرح کا بنتا ہے اور طرح طرح سے پیش کیا جاتا ہے۔ پان رخصتی کے بھی مشہور ہیں۔ داغ کا شعر ہے ؎

پردہ اٹھا کے مجھ سے ملاقات بھی نہ کی
رخصت کے پان بھیج دیے بات بھی نہ کی

یہ چند اشعار یونہی اِدھر اُدھر سے لیے گئے ہیں۔ ہندستانی معاشرت سے متعلق اس قسم کے حوالے اگر جمع کیے جائیں تو پورا دفتر مرتب ہو جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہماری معاشرت ایک مخلوط معاشرت ہے۔ ہندستان صدیوں سے مختلف مذہبوں نسلوں اور فرقوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ہماری معاشرت میں رنگا رنگ مذہبی اور تہذیبی اثرات کارفرما رہے ہیں۔ اس میں ایک بنیادی ہم آہنگی اور یک جہتی ملتی ہے۔ اسی ہم آہنگی اور یک جہتی کی بعض لازوال تصویریں ہماری کلاسیکل اردو شاعری میں محفوظ ہیں۔

(۱۹۵۸ء کی ایک غیر مطبوعہ تحریر)

□□

ہندستانی

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا جب کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پہلے ہندستانی ہیں اور بعد میں ہندو یا مسلمان.....
میں چاہتا ہوں کہ لوگ پہلے بھی ہندستانی ہوں اور آخر تک ہندستانی رہیں۔ ہندستانی کے علاوہ کچھ نہیں۔"

——— ڈاکٹر امبیڈکر

عنوان چشتی

شعبۂ انسانیات و لسانیات

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

گرو گرنتھ صاحب میں
بابا شیخ فرید کے شبدوں کی معنویت

مذہبی دائرہ دو رویوں یا رجحانوں پر مشتمل ہے۔ ایک کی بنیاد اصول پسندی اور دوسرے کی روحانی حسیت پر ہے۔ اصول پسندی کا براہ راست رشتہ خارجیت سے ہے اور روحانی حسیت کا تعلق داخلیت سے ہے۔ خارجیت اور اصول پسندی قدامت پرستی اور بنیاد پرستی کی طرف لے جاتی ہے یہ راہ سخت ہے اس میں لچک نہیں۔ داخلیت اور روحانی حسیت بقائے باہم، رواداری اور اخلاقی شعور کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ یہ راہ نرم ہے اور اس پر چلنے کا انداز بھی لچک دار ہے۔ یہ دونوں رویے یا رجحان ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ فرق صرف فوقیت کا ہے۔ وہ لوگ جو اصول پسند ہیں، اپنے موقف پر سختی سے عمل کرتے ہیں لیکن روحانی حسیت کی تکذیب نہیں کرتے البتہ اسے ثانوی درجہ کی چیز تصور کرتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو روحانی حسیت کے امین ہیں لچک دار رویہ رکھتے ہیں لیکن اصول پسندی کا انکار نہیں کرتے البتہ اس کو قدر اول کی شے بھی خیال نہیں کرتے عرف عام میں یہ لوگ صوفی سنت کہلاتے ہیں اور ان کا نقطۂ نظر تصوف یا "سنت مت" کہلاتا ہے تصوف ہو یا سنت مت دونوں کی بنیاد روحانی حسیت اور اخلاقی شعور پر ہے اسلئے تصوف میں نجشیت پر محبت کو، بد ہیئتی پر جمال پسندی کو اور اصول پر آدمی کو فوقیت اور فضیلت حاصل ہے۔ تصوف میں (اور سنت مت میں بھی) جو کچھ ہے خدا سے ہے اور آدمی کے لیے ہے۔ تصوف کے دائرے میں انسان، زبان، کلچر اور ہر ازم نیز اصول اور مذہبی رسوم سے بلند، ماورا اور بڑا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے **الخلق عیال اللہ**

یعنی تمام مخلوق اللہ کی عیال (اولاد) ہے۔ شاستروں میں آیا ہے کہ:
وسودھیو کٹمبکم یعنی سب لوگ زمین (دھرتی ماتا) کا خاندان ہیں ــــ قرآن کریم کی سورۂ حجرات اس پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

> "اللہ نے تمام انسانوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ ذاتیں اور قبیلے محض پہچان کے لیے بنائے ہیں"

اس لیے انسانی دائرے میں رنگ، نسل، نظریے اور قومیت کی ہر بنیاد گمراہ کن ہے جو عالمگیر انسانیت اور بھائی چارے کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ صوفی اور سنتوں نے اپنے فکر و کار سے اس دیوار کو گرانے کی کوشش کی ہے۔ انسانیت کے عالم گیر تصور کے فروغ کے لیے کام کیا ہے اور انسان کی عظمت کا رجز پڑھا ہے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا ہے اور غم زدہ انسانوں کو سچی خوشی سے ہم کنار کرنے کی کوشش ہے۔ صوفی سنتوں نے یہ کام تواضع، خدمت خلق اور اپنے لچک دار رویے کے ذریعے انجام دیا ہے۔ گرو نانک اور شیخ الشیوخ بابا فریدالدین گنج شکرؒ اسی دائرے کے روحانی علمبرداروں میں شامل ہیں۔

بابا صاحب بلاتفریق مذہب و ملت انسانوں کی خدمت اور مدد فرماتے رہے۔ اس بات سے بابا صاحبؒ کے جاننے اور ماننے والے واقف ہیں کہ سلطان دہلی غیاث الدین بلبن بابا صاحبؒ



کا بہت معتقد تھا۔ ایک دن بابا صاحب کی خدمت میں ان کا ایک معتقد آیا اور اس نے باباصاحب کو اپنی پریشانی کا حال سنایا اور التجا کی کہ اگر وہ اس کے حق میں بلبن کو سفارش کردیں تو اس کا کام بن سکتا ہے۔
سائل نے سوال کردیا۔ بابا صاحب تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ ایک طرف ان کا دنیا کے جھمیلے سے الگ رہنے کا اصول تھا، دوسری طرف ایک پریشان انسان کی بھلائی کا نظریہ تھا۔ انھوں نے وقتی طور پر ذاتی اصول کو چھوڑ دیا، دوسروں کی بھلائی کے نظریہ کو اپنایا۔ یعنی انھوں نے بلبن کے نام سفارش نامہ تحریر کردیا:

"میں اس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس شخص کو کچھ دیں گے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا اور آپ ممنون و متشکر ہوں گے۔ اگر آپ کچھ نہ دیں گے تو عطا نہ کرنے والا بھی حق تعالیٰ ہوگا اور آپ معذور ہوں گے۔"

یہ مختصر سا خط اپنے دامن میں ایک جہان معنی رکھتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں باباصاحب نے انسان کے فاعلِ حقیقی (اور کارساز ہونے کے تصور کی نفی کی ہے (گرو نانک صاحب کی تعلیمات میں بھی یہ نکتہ اہم حیثیت رکھتا ہے) اور انسان کی حاکمیت کے تصور کی نفی کرکے اللہ کی حاکمیت کے تصور کو پیش کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں باباصاحب نے اپنے فقیرانہ اور بلبن کے شاہانہ منصب کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس تحریر میں تیسری خوبی یہ ہے کہ اس میں لاگ میں لگاؤ، قربت میں دوری اور نیازمندی میں بے نیازی کی شان موجود ہے چوتھی خوبی یہ ہے کہ باباصاحب نے اپنی ذات اور مصلحتوں پر دوسروں کی ذات اور مفاد کو ترجیح دی ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ باباصاحبؒ اپنے قول و عمل سے ضرورت مندوں کی جائز امداد کا درس دیا ہے۔

باباصاحبؒ کے حالات میں ایک اور واقعہ ملتا ہے جس کی گاگر میں سوچ کا سمندر لہراتا ہے۔ روایت ہے کہ ایک دن باباصاحب محفل میں جلوہ افروز تھے۔ ایک شخص آیا اور اس نے باباصاحب کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کیا۔ باباصاحبؒ نے پوچھا:

"میاں یہ کیا ہے۔؟"

اس نے جواب دیا، "یہ قینچی ہے میں قینچیوں کا کاروبار کرتا ہوں آپ اس تحفے کو قبول کرلیں گے تو میرے کاروبار میں برکت اور ترقی ہوگی۔"

یہ سن کر باباصاحب نے فرمایا:-

"میاں! تمھارے کاروبار میں انشاءاللہ ضرور ترقی ہوگی۔ یہ قینچی ہے۔ کاٹنے کا کام کرتی ہے۔ میں فقیر ہوں اور جوڑنے کا کام کرتا ہوں، اس لیے مجھے قینچی نہیں سوئی چاہیے۔"

واقعہ یہی ہے کہ صوفیوں اور سنتوں نے ہمیشہ جوڑنے کا کام کیا ہے دلوں کو جوڑا ہے اور بکھرے ہوئے انسانوں کو بھی جوڑا ہے صوفی ہوں یا سنت ہر عہد میں قینچی کے عمل سے دور اور سوئی کے کام سے قریب رہے ہیں۔

بابا شیخ فرید کا دور باباگرونانک سے پہلے کا ہے۔ نانک صاحب نے ان کے شبدوں کو اپنایا ہے۔ اس کا واضح مقصد یہ ہے کہ جو افکار اور افکار بابافرید کو عزیز تھے گرونانک کو بھی پیارے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گروگرنتھ صاحب شیخ فریدؒ کے شبدوں سے خالی ہوتا۔ شیخ فرید کی طرح گرونانک بھی روحانی انداز فکر کے حامل اور اخلاقی قدروں کے داعی تھے۔ انھوں نے تاعمر ہندوؤں اور مسلمانوں کی بعض غلط رسوم پر وار کیا۔ لیکن انسانوں کو وحدت کی ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔ دراصل کثرت کو وحدت بنانے کا عمل، ہماری مشترکہ قومی تہذیب کا بنیادی عمل ہے۔ جو کام صوفیوں اور سنتوں نے روحانی دائرے میں کیا، وہی کام ادیبوں اور شاعروں نے زبان و ادب کے دائرے میں سرانجام دیا۔ اور سیاسی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں نے اپنے دائروں میں کیا ہے۔ یعنی اس انداز فکر کی بنیاد اپنے اپنے تشخص قائم رکھتے ہوئے دوسرے افراد یا جماعتوں کے عقیدوں، ثقافتوں اور مذہبی قدروں کا احترام کرنے اور رواداری نیز بقائے باہم پر ہے۔ اس کام کو صوفیوں اور سنتوں نے سب سے زیادہ تقویت دی۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ فرید اور گرونانک مہاراج کا نام سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔

گروگرنتھ صاحب میں بابافریدؒ کے جو "شبد" شامل ہیں، روحانی حسیت اور اخلاقی شعور کی متعدد جہات نظر آتی ہیں۔

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تصوّف کی بنیاد "صفائے قلب" پر ہے۔ حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے "صفائے قلب" پر بصیرت افروز اظہار خیال فرمایا ہے۔ "صفائے قلب" کا تصوّر دو لہروں پر مشتمل ہے۔ ایک لہر منفی اور دوسری مثبت ہے۔ منفی لہر میں بساط قلب کو دنیا کی ہوا و ہوس سے خالی کرنا شامل ہے، بقول حضرت بابا فرید یہ کام ذکر نفی و ذکر جلی نیز توبہ و استغفار کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ مثبت لہر میں بساط قلب کو جلوۂ حقیقی سے منور کرنا شامل ہے۔ یہ کام مراقبے سے کیا جا سکتا ہے۔ مراقبے کی بنیاد ارتکاز فکر و خیال نیز توجہ اور یکسوئی پر ہے ؎

تمنا، تصوّر، تجلّی، وصال
یہ جو کچھ ہے سب فضلِ ربِّ میاں

(عنوان چشتی)

بابا فریدؒ نے اپنے شعروں میں دل کو ہوا و ہوسِ دنیا سے خالی کرنے کے لیے دُنیا اور اس کی آلائشوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ بابا فرید نے یہ کام کئی انداز سے سرانجام دیا ہے۔ کہیں انھوں نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے، کہیں دنیا اور دنیاداری پر طنز کیا ہے اور کہیں کہیں پر دنیا کو فاعل حقیقی کے مقابلے میں باطل ٹھہرایا ہے ؎

ہوا و حرص کو چھوڑو، یہ عشق رائیگاں کب تک
شکستہ سائباں میں زورِ بارش سے اماں کب تک

وجودِ غیر کے ہر نقش کو دل سے مٹا دینا
سہاگن کو پیا سے کام ہے اوروں سے کیا لینا

جو شیوہ بندگی ٹھہرا تو پھر کیسی بد اندیشی
درختوں کی طرح ہے وسعتِ دامانِ درویشی

مصلّٰی زیبِ دوش و خوش لباس و خوش کلام ایسے
بظاہر چاندنی جیسا، مگر دل تیرہ شب جیسے

مثالِ سبزہ شوقِ پائمالی شرطِ قربت ہے
کچل کر بھی ہرا ہے، یار کے قدموں سے نسبت ہے

[یہ اشعار (تراجم) ترجمانِ فرید سے ماخوذ ہیں]

ان اشعار میں ہوا و حرص کو عشق رائیگاں قرار دے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دینا، وجود غیر (ماسوا اللہ) کے ہر نقش کو دل سے مٹا دینے کی تلقین کرنا بندگی (عجز و انکسار سے عبادت کرنا) پر زور دینا۔ نام نہاد مذہبی لوگوں کی ظاہرداری پر طنز کرنا۔ اور آخری شعر میں سبزہ کی طرح پائمالی پر فخر کرنا، خالص متصوفانہ اندازِ فکر ہے جو "صفائے قلب" کے تصور کی دونوں قسم کی لہروں پر محیط ہے۔ چونکہ یہ کلام گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہے، اس لیے اس انداز فکر سے بابا صاحب اور ان کی روحانی تحریک کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

آج ہندستان بعض منفی اور مضر تحریکوں کے اثر سے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ بعض افراد آگ بھڑکانے کا شعوری اور غیر شعوری کام کر رہے ہیں۔ لیکن مثبت سوچ رکھنے والے اور تعمیری نقطہ نظر رکھنے والے حضرات اس آگ کو بجھانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ آگ کو بجھانے کا عمل، در اصل اپنے وجود، اپنی بساطِ زندگی، اپنی تہذیب، معاشرت اور سب سے بڑھ کر انسانیت کو بچانے کا عمل ہے۔ صوفیوں اور سنتوں کی تعلیمات میں آگ بجھانے کی کیفیت موجود ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ:

"ہندستانی معاشرے میں جو تضاد اور تصادم، تناؤ اور کھنچاؤ، بے کیفی اور بیزاری ہے اس کو دور کرنے کے لیے اپنی جڑوں پر استوار ہونے اور دلوں کو روحانیت کی شمع سے منور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک سچی بات یہ ہے کہ نفرت سے نفرت اور محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ حرص، رقابت، حسد اور دشمنی ایسے ہی جذبات کو مخالف یا فریقِ ثانی کے دل میں جگاتی ہے۔ اس لیے اپنی پرانی تہذیبی قدروں اور تمدنی روایات پر از سر نو ایمان تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔"

(تنقید نامہ از عنوان چشتی ص ۲۶)

□□

"انسانوں کو یکجہتی کا سبق چیونٹیوں سے سیکھنا چاہیے۔"
(نامعلوم)



پروفیسر محمد ولی الحق انصاری
دارالامان، ۲۰۔ فرنگی محل
لکھنؤ

قومیت کا تصور اور یکجہتی

قومیت کا جدید تصور یورپ کی دین ہے اور اس میں ثقافتی عناصر سے زیادہ جغرافیائی اور سیاسی عناصر کو دخل رہا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں مختلف ثقافتی عناصر پر مشتمل قومیں وجود میں آتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ٹوٹتی بھی رہتی ہیں جن کی تازہ ترین مثال زیکوسلاویکیہ، سوویت روس اور یوگوسلاویہ کی ہے۔ جو ماضی قریب میں ایک ایک قومیں تھیں اور آج نسلی تقسیم کے نتیجے میں ان میں سے ہر ایک ٹوٹ کر مختلف ریاستوں اور قوموں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ یہی حالت کچھ ہندستان کی بھی رہا ہے جس کی تشکیلیں مختلف زمانے میں مختلف ہوتی گئی ہیں۔ انگریزی حکومت سے پہلے عموماً یہ ملک مختلف ریاستوں میں تقسیم رہا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ صرف اشوک، علاء الدین خلجی، محمد تغلق اور اورنگ زیب ہی کے عہد میں برصغیر ایک مملکت کی حیثیت سے سامنے آیا۔ انگریزی دور میں البتہ عملی حیثیت سے یہ ملک ایک اکائی بنا اور حقیقتاً ہندستانی قومیت کا تصور اسی عہد کی دین ہے۔ اس عہد میں ہندستان میں وہ تمام علاقے شامل تھے جن پر موجودہ پاکستانی، ہندستانی بنگلادیشی اور کچھ حد تک برما اور سری لنکا کی ریاستیں مشتمل ہیں۔ لیکن سیاسی عمل کے تحت انگریزوں کے عہد کا ہندستان اور ہندستانی قوم آج مختلف ملکوں اور قوموں میں بٹ چکا ہے۔

لیکن اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ قومیت کا تصور صرف سیاست اور جغرافیائی حدود تک محدود رہے۔ قومیت کی اصل بنیاد انداز فکر کی یکسانی ہے۔ اگرچہ اس میں نسل، تہذیب، مذہب وغیرہ کو بھی پورا دخل حاصل رہا ہے۔ جدید زمانے میں اس کی مثالیں ویت نام اور جرمنی ہیں جو سیاسی مصالح کے تحت تقسیم ہوئیں لیکن نسلی، تہذیبی اور انداز فکر کے دباؤ کے تحت ان کی تقسیمیں عارضی ثابت ہوئیں اور یہی کچھ حال شمالی اور جنوبی کوریا کا بھی ہے، جہاں سیاست، نسل اور تہذیب سے شکست کھاتی معلوم ہو رہی ہے۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، یہاں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے میں مذہب کو خاص دخل رہا ہے اور ابتدا سے مذہبی اقدار اور انداز فکر کی پیدا کردہ اخلاقیات نے ہندستان کے مختلف تہذیبی علاقوں کو سیاسی تقسیموں کے باوجود ایک لڑی میں پروئے رکھا۔ اس ملک میں مختلف علاقوں کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ انداز بود و باش میں فرق ہے۔ پہناوے مختلف ہیں، مذہبی عبادتوں کے انداز میں بھی فرق ہے لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود مختلف مذاہب کی تعلیم کے تحت پیدا ہونے والے اخلاقی عناصر تقریباً ایک ہیں اور جن کا لب و لباب ہے "کر بھلا، ہو بھلا"۔ اور یہی وہ مخفی طاقت (Underlying Force) ہے جس نے اختلافات میں یک رنگی اور مختلف ریاستوں میں بٹے ہونے کے باوجود ہندستان کو ایک ملک اور ہندستانیوں کو ایک قوم بنا دیا ہے۔ انھیں اخلاقی قدروں کے تحت آج بھی اس ملک میں ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کا احترام کرتے ہیں، ایک زبان کا بولنے والا دوسری زبانوں سے بیر نہیں رکھتا۔ ایک خاص قسم کا لباس پہننے والا دوسرے لباسوں کو قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱۔ نیا گاؤں (ایسٹ)، لکھنؤ

شاہانِ اودھ اور قومی یکجہتی

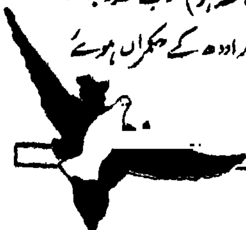
ہندستان پر زمانہ دراز تک انگریزوں کا تسلط رہا۔ وہ ہندستانی اقوام کو ایک دوسرے سے لڑوا کر حکومت کرتے رہے اور تاریخ کے اوراق کو جن میں آپسی میل ملاپ اور قومی یک جہتی کے خوش گوار واقعات درج ہوتے تھے، ان کو مسخ کرنے کی فکر میں پوری طاقت سے کام لیتے تھے ہمیں ماضی کے ہندستان میں قومی یک جہتی کی درخشندہ مثال شاہان اودھ کے زمانے میں ملتی ہے۔ اودھ کے حکمراں اگرچہ مسلمان تھے لیکن امور سلطنت میں ہندوؤں کا بھی دخل رہتا تھا۔ مسلمان ان کو معتبر اور معتمد سمجھتے تھے۔ ہندو بھی مسلمانوں کے خیر خواہ اور وفادار تھے۔

مغلیہ سلطنت کا یہ دستور تھا کہ جب کسی شخص کا تقرر کسی صوبے میں بطور حکمراں کیا جاتا تھا تو اس کے ساتھ کے عملہ کا انتخاب بھی بادشاہ دہلی کی طرف سے ہوتا تھا۔ جب ۱۷۱۹ء میں نواب برہان الملک میر محمد نیشاپوری نے اودھ کی حکومت قائم کی تو ان کے ساتھ اور لوگوں کے علاوہ راجہ نول رائے ایک معزز عہدے پر مامور کیے گئے یہ سلسلہ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ تک قائم رہا۔

نواب آصف الدولہ کے عہد تک جو غیر مسلم ممتاز عہدوں اور مختلف وزارتوں پر فائز تھے ان میں بعض لوگ بڑے عالم اور اعلا درجے کے شاعر بھی تھے چنانچہ تذکروں اور تواریخ میں جن لوگوں کا ذکر ملتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

راجہ نول رائے وفا۔ پورن چند۔ راجہ لعل جی بہادر۔ راجہ پٹر چند، راجہ جھاؤ لال، راجہ گلکیٹ رائے۔ راجہ رام رائے دہلوی۔ راجہ رام بہادر سنگھ۔ راجہ بینی بہادر۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ، راجہ بختاور سنگھ، رائے آتما رام، بھگوان داس ہندی۔ رائے نجاب رائے والی بنسن گوپال۔ رائے حق مل معنی راجہ دیا مل۔ بہادر سنگھ مسکین بیتل داس کشن چند قریب۔ دیوان راجہ کشن سنگھ۔ لال اودھے لال۔ لالہ رام پرشاد۔ لالہ بھوانی پرشاد۔ مہاراجہ ٹکیت نرائن۔ رائے کھیم نرائن۔ رائے دولت رام۔ راجہ مہا نرائن مہندر، رائے سروپ سنگھ دیوانہ۔ جگل کشور ثروت۔ رائے سناتھ سنگھ بیدار۔ لالہ شتاب رائے زار رائے ٹیکو لال مستانہ۔ رائے بانکے رام۔ رائے منو لال صفا۔ لالہ بیج ناتھ وغیرہ۔

سعادت خان برہان الملک ۱۷۱۹ء میں قیام حکومت کے لیے جب دہلی سے اودھ جارہے تھے تو وہ کشتی میں دریائے گنگا پار کررہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک مچھلی جست کرکے ان کی آغوش میں آپڑی۔ انھوں نے اپنی مہم اور قیام حکومت کے لیے اسے نیک فال سمجھا۔ اسی مناسبت سے مچھلی کو اودھ میں سرکاری نشان کے طور پر شامل کرلیا گیا۔ نواب برہان الملک نے ابتدا میں اودھ میں اپنے لیے ایک خس پوش چھپر کا بنگلہ بنوایا۔ ان کے زمانے میں اودھ بنگلہ کے نام سے مشہور تھا۔ ان کی وفات (۱۷۳۹ء) کے بعد ان کے داماد نواب صفدر جنگ نے بنگلے میں توسیع کی اور بعد میں اس مقام پر فیض آباد شہر کی بنیاد ڈالی (تفصیلات کے لیے راقم الحروف کی کتاب اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا، مطبوعہ ۱۹۸۱ء ملاحظہ ہو) نواب صفدر جنگ کے بعد ان کے بیٹے نواب شجاع الدولہ بہادر اودھ کے حکمراں ہوئے



ان کے بعد ۱۷۷۵ء میں جب نواب آصف الدولہ بہادر مسند وزارت پر رونق افروز ہوئے تو انھوں نے تخت نشینی کے کچھ بعد ہی فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ اس سے پہلے لکھنؤ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

فیض آباد سے لکھنؤ آتے ہی نواب آصف الدولہ شہر کی تعمیر و ترقی کی طرف پوری تن دہی کے ساتھ متوجہ ہوئے اور نہایت ہی قلیل عرصے میں اس شہر کو معمور و آباد کیا۔ انھوں نے نئی وضع کی خوش شکل اور خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ سنگی بارہ دری اور باؤلی والا مکان ان تعمیرات میں مشہور تھے۔ ۱۷۹۲ء میں اپنے لیے ایک محل بنوایا جو کہ "دولت خانہ آصفی" کے نام سے مشہور تھا۔ نواب صاحب نے بہت قلیل عرصے میں لکھنؤ کو ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔ باغ باغیچے بنوائے جن میں چار باغ، لال باغ اور عیش باغ اب تک زبان زد خاص و عام ہیں۔ ہر طرف آبادی پھیلنے لگی۔ بازار قائم ہوئے۔ یحیٰ گنج۔ وزیر گنج۔ فتح گنج۔ رکاب گنج۔ دولت گنج۔ ٹھاکر گنج۔ بیگم گنج۔ ٹکیٹ گنج۔ ترمنی گنج بھوالی گنج، نانک گنج۔ تحسین گنج۔ نواز گنج۔ حسن گنج۔ خدا گنج۔ علی گنج۔ خیالی گنج۔ ڈالی گنج وغیرہ آج تک قائم ہیں۔ ٹکیٹ گنج۔ بھوانی گنج اور نانک گنج قومی یک جہتی کی یاد دلاتے ہیں۔

نواب آصف الدولہ بہادر سخاوت میں حاتم دوراں اور جواں مردی میں رستم زماں تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ فیاضی کے مقابل میں ذکر سخاوتِ حاتم طائی قصۂ پارینہ ہو گیا تھا۔ لکھنؤ میں مشہور ہے کہ

جس کو نہ دے مولا
اس کو دے آصف الدولہ

اور یہ مثل آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ میں نے اکثر و بیشتر سن رسیدہ لوگوں سے یہ فقرہ متعدد بار سنا ہے۔ رومی دروازے کے لوگ آصف الدولہ بہادر کا نام لیے بغیر صبح کو اپنی دکان نہیں کھولتے تھے اور بقول شرر لکھنوی ہندو دکان دار آج تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی جوش عقیدت سے کہتے ہیں "یا آصف الدولہ ولی"

بڑا امامباڑہ

یہ ہندستان میں سب سے بڑا اور عظیم الشان امامباڑہ ہے جو ہندستان کی تہذیب و تمدن اور قومی یک جہتی کا اعلا نمونہ اور درخشاں علامت ہے۔ ہر سال اسے دیکھنے کے لیے ہزاروں سیاح لکھنؤ آتے ہیں، ان میں غیر ملکی سیاحوں کی کافی تعداد ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس بے مثل فن تعمیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ امام باڑے کی تعمیر کا سبب یہ ہوا تھا کہ اودھ میں ۱۷۸۴ء میں قحط پڑ گیا تھا اور شرفائے لکھنؤ تک قحط کا شکار ہو رہے تھے۔ نواب مرحوم نے قحط سے متاثر رعایا کی مشکلات دور کرنے کے لیے امام باڑے کی تعمیر شروع کرادی جو ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوئی اور اسی سال امامباڑے میں تعزیے رکھے گئے۔

بہت سے لوگوں نے اپنی تاریخوں میں امام باڑے کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ شاعروں نے کئی شاہکار نظمیں اس کے فن تعمیر پر کہی ہیں۔ سرشار نے فسانۂ آزاد میں اس کی گہما گہمی بیان کی ہے چکبست لکھنوی نے ایک بڑی شاندار نظم امام باڑے کی تعریف میں کہی ہے جو کلیاتِ چکبست میں موجود ہے۔

نواب آصف الدولہ ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی حکومت میں ہندو بڑے ذی اثر اور صاحبانِ اقتدار تھے یہ لوگ بھی مسلمانوں کے دوش بدوش ایام محرم نہایت ہی جوش عقیدت سے مناتے تھے۔ عزاداری کی برکت سے ہی ان کے زمانے میں قومی یک جہتی کی بنیاد پڑی تھی۔ قومی یک جہتی کا یہ بار آور درخت واجد علی شاہ کے زمانے میں مزید پھولا پھلا۔ انگریزوں نے اس اتحاد و اتفاق کا پرچم تار تار کیا۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لکھنؤ کی مجلسوں میں ہندو بھی پڑھتے تھے۔ وہ بھی گھروں میں تعزیہ رکھتے تھے۔ منی لال جوان سندیلوی کے مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو

ہم شان خلد کوچہ و بازار لکھنؤ
جام جہاں نما در و دیوار لکھنؤ
حوریں بھی آتی ہیں پئے دیدار لکھنؤ
حق نے ملائکہ ہیں طلب گار لکھنؤ
ہر شخص کی زباں پہ ہے چرچا حسینؑ کا
سایہ ہے لکھنؤ پہ شہ مشرقین کا

ایک انگریز خاتون جس نے ہندستانی رسومات کا بغائر مطالعہ

لکھنؤ میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۷ء تک کیا تھا. اپنی کتاب میں عزاداری کے ساتھ ہندوؤں کی عقیدت کے بارے میں لکھتی ہیں:

"لکھنؤ میں کسی شیعہ مسلمان کا گھر تعزیہ سے خالی نہیں ہوتا. ہندوؤں کو بھی تعزیوں سے کافی عقیدت ہے. چنانچہ تعزیہ دیکھ کر یہ لوگ مودبانہ جھک جاتے ہیں. مجالس میں ہر مذہب وملت کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور مسلمان انھیں بخوشی بٹھا لیتے ہیں. اس طرح امام باڑوں میں ہر مذہب کا آدمی جوتا اتار کر داخل ہو سکتا ہے. یہ طریقہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سوائے یورپی لوگوں کے کسی اور سے امام باڑہ کے باہر جوتا اتارنے کے لیے بتانا بھی نہیں پڑتا."

تعزیوں سے ہندوؤں کی عقیدت کی مزید تائید ایک اور مغربی خاتون مس فانی پارکس سے ہوتی ہے. وہ لکھتی ہیں کہ:

"یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی ایام محرم میں اپنے گھروں میں تعزیے رکھتے ہیں. میرا باورچی ایک مجوسی تھا. وہ بھی محرم میں تعزیے پر کم از کم چالیس روپے خرچ کر کے ایک پرجوش مسلمان کی طرح عزاداری کے مراسم بجا لاتا تھا. عاشورہ کے دن اپنے تعزیے کو دفن کرنے کے بعد پھر وہ اپنے دھرم کی پیروی کرنے لگتا تھا."

مذکورہ بالا اقتباسات کی مزید تائید مرزا محمد حسن قتیل لکھنوی سے بھی ہوتی ہے. وہ لکھتے ہیں:

"لکھنؤ میں خدا کے فضل سے ہندو بھی تعزیہ دار، مرثیہ گو اور مرثیہ خوان ہیں."

ذیل میں چند ہندو وزراء کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں جو اودھ کے حکمرانوں کے وفادار رہے اور جنھوں نے اودھ میں عزاداری کے فروغ کے لیے قومی یکجہتی کی بنیادیں مضبوط کیں.

راجہ نول رائے

ابتداء میں نواب برہان الملک کے سکریٹری تھے. نواب صفدر جنگ نے اعلا صلاحیت اور قابلیت دیکھ کر انھیں مہاراجہ کا خطاب دیا، اودھ کا نظم ونسق ان کے ہاتھ میں رکھا. پہلے انھیں وزیر مال بنایا بعد میں انھیں روہیل کھنڈ کا صوبہ دار مقرر کیا. بعد میں وہ نواب صفدر جنگ کی حمایت میں نواب احمد خاں بنگش کی فوج کے ساتھ لڑتے ہوئے ۱۳ اگست ۱۷۵۰ء کو کام آئے. نول رائے اردو اور فارسی کے شاعر تھے. وفا تخلص کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے.

راجہ جھاؤ لال

فیض آباد کے ایک گمنام شخص تھے. نواب شجاع الدولہ کے عہد میں داروغہ اصطبل ہوئے. جب نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو انھوں نے جھاؤ لال کو راجہ کا خطاب، خلعت، ہاتھی اور جھالر دار پالکی عنایت کی اور وزیر جنگ کے خطاب سے ممتاز کیا. راجہ صاحب بڑے مدبر اور شریف انسان تھے. نواب آصف الدولہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے. جب ۱۷۹۶ء میں ریزیڈنٹ نے ناراض ہو کر انھیں نواب آصف الدولہ کی مرضی کے خلاف عظیم آباد بھیجا تو شہر لکھنؤ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا. نواب صاحب ان کے عظیم آباد چلے جانے کے بعد بے حد رنجیدہ اور ملول ہوئے. انھوں نے اتنا اثر قبول کیا کہ ان کے فراق میں دوسرے سال انتقال کیا. لکھنؤ میں امین آباد سے گولہ گنج جاتے ہوئے راستے میں ایک پل پڑتا ہے وہ جھاؤ لال نے بنوایا تھا. اور اب تک یہ پل جھاؤ لال کے نام سے مشہور ہے. ٹھاکر گنج میں سڑک کے داہنی طرف ایک شاندار امام باڑہ آصف الدولہ کے زمانے میں انھوں نے تعمیر کرایا تھا اس کے آثار اب تک موجود ہیں. امام باڑے کے نو دروازے اور دیواریں اب بھی اچھی حالت میں کھڑی ہیں. چھت منہدم ہو گئی ہے. امام باڑے میں کسی زمانے میں شیعہ بیت المال بھی تھا. آصف الدولہ کے زمانے سے اس میں ہر مہینے کی تیرھویں کو جھاؤ لال بڑی دھوم دھام سے مجالس کیا کرتے تھے. امام باڑے کے مقابل میں سڑک کے اس پار جھاؤ لال کی تعمیر کردہ عالی شان مسجد اب تک اچھی حالت میں موجود ہے. موصوف ہمیشہ عزاداری بڑے تکلف سے کرتے تھے اور جہاں جاتے تھے امام باڑے بنواتے تھے.



راجہ ٹکیٹ رائے

مہاراجہ دھراج خطاب تھا۔ ابتدا میں ایک معمولی دیہاتی تھے نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں خوش نظر خواجہ سرا کے یہاں پندرہ روپے ماہوار پر جواہر خانہ کے تحویلدار تھے بعد میں مختار الدولہ نواب سید مرتضیٰ خاں نائب سلطنت کے دار وغہ دیوان بنے اور پھر اکبر علی خاں متخلص مقبل کے ملازم ہوئے۔ بعد ازاں اپنی خوش بختی سے نواب آصف الدولہ کے دیوان (وزیر) مقرر ہوئے۔

تمام ممالک محروسہ میں کوئی ایسا مقام نہیں تھا جہاں انھوں نے مسجدیں اور امامباڑے نہ بنوائے ہوں۔ ٹکیٹ رائے عزاداری دل و جان اور جوش و خروش سے کرتے تھے۔ ٹکیٹ گنج آج بھی لکھنؤ میں مہدی گنج کی طرف ان ہی کے نام سے آباد ہے۔ یہاں انھوں نے ۱۷۸۶ء میں ایک شاندار امام باڑہ اور بہت خوبصورت مسجد بنوائی تھی۔ امامباڑہ اب موجود نہیں ہے۔ مسجد ابھی اور بہتر حالت میں ہے۔ اس کی پیشانی پر عمدہ خط نستعلیق میں تاریخی قطعہ کندہ ہے۔ اس میں نواب آصف الدولہ، حسن رضا خاں سرفراز الدولہ اور ٹکیٹ رائے کے نام بھی درج ہیں۔ ٹکیٹ رائے کا انتقال لکھنؤ میں ۱۷۹۹ء میں ہوا۔ ٹکیٹ رائے کے عزیزوں نے بھی جن میں بلاس رائے رنگین بھی تھے، لکھنؤ میں امامباڑے تعمیر کیے۔

بخت مل حیدر

موضع کوٹ ضلع مرادآباد میں نواب آصف الدولہ کے عہد میں ایک ہندو مسمی بخت مل حیدر نے امام باڑہ تعمیر کیا تھا۔ وہ اس میں تعزیہ بھی ایام محرم میں رکھتے تھے۔ نواب صاحب نے جون ۱۷۸۰ء میں ایک حکم کے ذریعہ موضع کوٹ عرف حیدر گڑھ امام باڑے کے مصارف کے لیے بخت مل حیدر کو عنایت فرمایا۔

سیتل داس مختار

آصف الدولہ کی سرکار میں اعلا مرتبے پر فائز تھے۔ آلِ رسولؐ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کی شان میں اشعار بھی کہتے تھے ان کی یہ رباعی قابلِ ذکر ہے ؎

یا شاہ نجف بخاک پائے حسین
باشد دل و جان ما فدائے حسین
از جور فلک سخت بجان آمدہ ایم
مارا بنواز از برائے حسنینؑ

مہاراجہ میوارام

ان کا خطاب تھا نواب افتخار الدولہ افضل الملک مہاراجہ میوارام بہادر صلابت جنگ۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر نے انھیں خاک سے پاک کیا اور اپنا دیوان یعنی وزیر مال بنایا۔ بادشاہ نے انھیں تین لاکھ روپے کے انعام سے نوازا تھا۔ میوارام نے امامباڑہ بھی بنوایا تھا، جس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ ایام محرم میں عزاداری بڑی پابندی کے ساتھ اعلا پیمانے پر کرتے تھے اور دو تین لاکھ روپے عشرہ محرم اور ائمہ طاہرین کی وفات پر خرچ کرتے تھے آخر عمر میں کربلائے معلیٰ گئے اور وہاں حضرت امام حسینؑ کے روضۂ مطہرہ کے کلید بردار ہوئے۔ جولائی ۱۸۶۷ء میں کربلا ہی میں ہی انتقال کیا اور وہیں دفن ہیں۔

نواب شرف الدولہ

بادشاہ امجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں داروغہ عمارات تھے ان کا نام جگن ناتھ تھا، وہ ذات کے اگروال تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ میں منصور نگر کے قریب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے روضے کی شبیہ لاکھوں روپئے خرچ کر کے تعمیر کی، جسے "کاظمین" کہتے ہیں۔ یہ محلہ کاظمین کے نام سے ہی مشہور ہے۔ کربلا میں شاہی زمانے سے اب تک برابر مجلسیں ہوتی ہیں۔ ۸ ربیع الاول کو لکھنؤ میں جو چپ تعزیہ اٹھتا ہے وہ یہیں آکر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ عشرے کے دن حسین آباد کی ضریح بھی اسی کربلا (کاظمین) میں بڑھائی جاتی ہے۔

شرف الدولہ بڑے خلوص و عقیدت سے مجالس عزا برپا کرتے تھے۔ گھڑیالی میں ایک امامباڑہ بھی تعمیر کیا تھا جہاں ۸ محرم کو حضرت عباسؑ کی حاضری ہوتی تھی۔ یہاں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ شرف الدولہ کا انتقال نومبر ۱۸۶۱ء میں ہوا۔ کاظمین میں دفن ہیں۔

دلارام

لکھنؤ کے مشہور ہندو رئیس تھے عزاداری شان و شوکت سے کرتے تھے۔ انھوں نے ایک امامباڑہ واجد علی شاہ کے زمانے

میں قیام کیا تھا۔ اس میں برابر آیتیں پڑھتے تھے۔

جن امام باڑوں کا ذکر اوپر ہوا ہے وہ سب راقم الحروف نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ تفصیلات "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء" میں درج ہیں۔

تمام اودھ میں قومی یکانگت اور یک جہتی کی ناقابل فراموش مثال واجد علی شاہ نے قائم کی تھی۔ اگر لوگ صدق دل سے اودھ کے اس آخری بادشاہ کی محبت اور رعایا پروری پر توجہ دیتے تو آپسی میل ملاپ اور بھائی چارہ کا جذبہ ابھرا ہوجاتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب معزولی کے بعد ۱۲ مارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ سفر کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے تو پورا لکھنؤ اور آس پاس کے دیہاتوں کا سیلاب قیصر باغ میں امنڈ آیا اور ہر شخص اپنا یا پرایا، ہندو اور مسلمان آہ وزاری اور اشک باری میں ڈوبا ہوا یہی کہہ رہا تھا ؎

لکھنؤ سارا ہوگیا ویران
کوچہ کوچہ پڑا ہے اب سنسان
ہوئی اس درجہ خانہ بربادی
نام کو رہ گئی ہے آبادی

لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت بادشاہ اپنے وطن عزیز اور رعایا کے لئے اس قدر ملول اور یاس میں غرق تھے کہ بارہ بند کا ایک ترجیع بند مخمس کہا، چند بند ملاحظہ ہوں ؎

شب اندوہ سے رو رو کے سحر کرتے ہیں
دن کو کس رنج و تردد میں بسر کرتے ہیں
نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دوستو شاد رہو تم کو خدا کو سونپا
ہم نے اپنے دل نازک کو جفا کو سونپا
قیصری باغ جو ہے اس کو صبا کو سونپا
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سامنے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یارب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بادشاہ کے منع کرنے کے باوجود سیکڑوں لوگ کان پور تک گئے۔ بادشاہ یہاں سے الہ آباد پہونچے۔ یہاں ان کو رہنے کی بڑی تکلیف ہوئی۔ گرمی نے بھی بہت ستایا۔ آٹھویں روز یہاں سے روانہ ہوئے۔

جب بادشاہ داخل بنارس ہوئے تو بنارس کے مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ پھولے نہیں سمائے۔ وہ شہر کے ناکے تک خود استقبال کے لیے گئے اور سڑکوں پر کیوڑہ گلاب کا چھڑکاؤ بہت کثرت سے کرایا۔ خود بہت سادہ پوشاک پہنے بادشاہ کی گاڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہے۔ ہرچند کہا گیا کہ گاڑی پر بیٹھ جائیں مگر خلاف ادب سمجھ کر منظور نہ کیا۔ جب بہت اصرار کیا تو بادشاہ کی گاڑی سے دو تین گاڑیاں چھوڑ کر ایک گاڑی کے پیچھے والی نشست پر بیٹھ گئے۔ اہل بنارس زیارت کے لئے بہت مشتاق تھے۔

بادشاہ مہاراجہ بنارس کے یہاں پندرہ دن مہمان رہے اور انھی کی کوٹھی میں قیام کیا۔ سفر کی جو تکلیفیں کان پور اور الہ آباد میں ہوئیں وہ یہاں آرام ملنے کی وجہ سے دور ہوگئیں۔ مہاراجہ نے بادشاہ کے قیام و طعام اور غسل خانہ وغیرہ کا نہایت معقول انتظام کیا تھا اور ہزار دل و جان سے مہمان داری کے فرائض انجام دیے۔ مہاراجہ نے اپنی کوٹھی کو اپنے جلیل القدر بادشاہ کے لیے خوب آراستہ کیا۔ قد آدم آئینے اور مختلف بادشاہوں کی تصاویر سے سجایا تھا۔ نذریں پیش کیں۔ ایک ہزار روپیہ تصدق بھیجا۔ ضیافت کے لیے سات ہزار۔ مہاراجہ نے باریابی کی درخواست کی، بادشاہ نے بہ الطاف خسروانہ اجازت دی اور فرمایا ہم تم کو خلعت اور ہاتھی پالکی سے سرفراز کرتے مگر مجبور ہیں۔ اور خلعت وغیرہ کی قیمت کے موافق زر نقد ادا کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے مہاراجہ بنارس کی خوش خلقی اور تہذیب اور مہمان داری کے واقعات اپنے کلیات

موسومہ "شیوع فیض" ۱۲۵۳ھ مطبع سلطانی کلکتہ ۱۸۶۰ء میں بہ عنوان "مثنوی در بیان حالات سفر کلکتہ" میں اس طرح کیا ہے ؎

بنارس کا راجہ عجب نیک تھا
ہزاروں میں لاکھوں میں وہ ایک تھا
مکاں اس نے پہلے کیا تھا درست
سبھوں کی طبیعت ہوئی خوب چست
عجب اس کی کوٹھی بہارِ ارم
زمیں پر مگر تھی فلک سے بہم
سجاوٹ پری زاد کرے لطیف
مگر عین گرمی میں فصل خریف
وہ آئینے تھے روئے دیوار پر
جو پریوں کے رکھتے تھے ہر بار پر
کوئی قدِ آدم کوئی نیم قد
کوئی نیک رو، کوئی دنیا کا بد
تصاویرِ شاہانِ ماضی عجب
نظر آتا تھا بولتی ہیں یہ سب
ہماری بھی تھی نصب تصویر نیک
نظر آگئی سب حسینوں میں ایک
جو تصویر اپنی نظر آگئی
یہ شرمندہ صورت بھی گھبرا گئی
کہا دل سے کیوں کر چھپاؤں تجھے
یہاں سے کہاں لے کے جاؤں تجھے
وہ ایسا اطاعت پہ آمادہ تھا
یقینی ہمیں پر وہ دل دادہ تھا
عجب ٹھاٹھ سے نذر دے کے ہٹا
کہ دربار کا پھر گیا جمگھٹا
کہا چوبداروں نے ہوشیار ہو
ادب سے تفاوت سے اس جا چلو
کیا دور سے جھک کے اس نے سلام
پکارا یہ دربان اے نیک نام
ادب سے قرینے سے اور دور سے
سلامت شہ ہند ذی شان رہے
یہ سلطانِ عالم سلامت رہے
یہ شہِ جانِ عالم سلامت رہے
غرض بعد مجرا ہٹا ذی شعور
حکایات لطف و طرب کے حضور
بڑا یا بہت خوب معقول سب
جواہر کی بھی ایک کشتی عجب
عجب جیغۂ صنعتِ الماس کار
کہ تھے آب پر جس کی موتی نثار
وہ پشمینے کی کشتیاں تین چار
تو ہر قسم کے پارچے بے شمار
وہ سب کشتیاں ایک اوپر پچاس
جو کیں پیش کش آئیں وہ میرے پاس
عجب سرد کوٹھی تھی اس ماہ کی
سکونت حقیقت میں تھی شاہ کی
ہر اک سو بچھے تھے پلنگ نفیس
نہ دو تین تھے بلکہ تھے بیش بیش
مبالغ تصدق کے بھیجے ہزار
کہا ہوں نثار رو شہر یار
عجب لطف سے پندرہ دن رہے
کہ کچھ عیش رفتہ بھی یاد آگئے

غرض مہاراجہ بنارس بادشاہ پر کیے گئے مظالم اور ان کی ہمدردی، غم گساری اور انسان دوستی کی وجہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ اس سال (۱۸۵۹ء) کوئی تہوار نہیں منایا۔ قلق لکھنوی "شہر آشوب" (مطبوعہ اردوئے معلی علی گڑھ) میں مہاراجہ بنارس کی زبان سے کہتے ہیں ؎

والدہ سے پاس جو کہتا تھا کوئی اس کا یار
کہ کیا اب کی برس آپ نے کوئی تہوار
تو وہ کہتا تھا کہ ہوں عیش میں ہم تو سرشار
اور اس طرح سے لٹ جائے ہماری سرکار
شاد کیا خاک ہوں کس سے کہیں کس غم میں ہیں
اپنی سرکار کے مٹ جانے کے ماتم میں ہیں
آرزو تھی کہ مرے گھر مرا آقا آئے
تا نمک خوار بھی ہم چشموں میں عزت پائے
یا فلک دفعتہً اس قہر کی آفت ڈھائے
کہ وہ آئے بھی تو تشریف یہاں یوں لائے
ہائے کیا روؤں میں اس پھوٹی ہوئی قسمت کو
دیکھوں آوارہ وطن اپنے ولی نعمت کو

والیان بنارس میں ذرہ برابر تعصب نہیں تھا۔ وہ اردو فارسی کے شاعر بھی تھے۔ رواداری اور دوسرے مذاہب کے ساتھ گہری دلچسپی اور عقیدت مندی کا یہ حال تھا کہ بنارس کے ہی راجہ بلوان سنگھ تخلص راجہ فرزند راجہ چیت سنگھ آل رسولؐ کے شیدائی تھے۔ وہ واقعات کربلا سے متاثر ہو کر مرثیہ بھی کہتے تھے۔ انھوں نے ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں ایک معرکہ آرا مرثیہ ۱۰۳ بند میں کہا جو ایک سال کے بعد ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) میں آگرہ میں شائع ہوا۔ اس کے آخر میں راجہ کے دوستوں اور خاندان کے دیگر لوگوں نے تاریخیں کہیں۔ ان میں بکرورتی سنگھ تخلص کنور، بابو رن سنگھ بہادر اور مرزا حاتم علی بیگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرثیہ کا آخری بند یہ ہے:

غلام سرور انجم سپاہ ہوں راجہ
میں نیتر فلک عز و جاہ ہوں راجہ
یہ سچ ہے ملک معانی کا شاہ ہوں راجہ
سخی ہوں خلق میں عالم پناہ ہوں راجہ
بس ست حب حسینؑ و حسنؑ بسینہ من
ہمیں زمرد و لعل ست در خزینہ من

قصہ کوتاہ مہاراجہ بنارس نے واجد علی شاہ کے تئیں اپنے اعلیٰ کردار اور شرافت نفس کا ثبوت فراہم کر کے انسان دوستی کی ایسی درخشندہ مثال قائم کی جو کتب تواریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

واجد علی شاہ اگرچہ مذہبًا شیعہ تھے لیکن ان میں مطلق تعصب نہ تھا۔ رواداری اور رعایا پسندی کا اس قدر خیال تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ جلیل القدر اور ذمہ دار عہدوں پر ہندوؤں کو بڑے بڑے خطاب سرفراز کر کے مامور کیا۔ ان میں مشیر الدولہ مؤید الملک مہاراج الدھراج بال کرشن بہادر جسارت جنگ۔ مہاراجہ بہاری لال بہادر۔ راجہ کندن لال بہادر، بابو پورن چند۔ مدبر الدولہ منشی الملک راجا جوالا پرشاد بہادر محکم جنگ۔ کنور راج بہادر۔ ہردیال سنگھ۔ بخشی الملک راجا لال جی بہادر۔ بخشی الملک راجا الفت رائے۔ بخشی الملک کنور دھنپت رائے۔ رائے بنسی دھر۔ پنڈت کشن نرائن اور راجا راؤ امرا سنگھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آج سے ستر سال قبل پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ۱۹۲۴ء میں "راجا کندن لال اشکی" پر ایک مضمون لکھا تھا جو بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی جرنل بابت ستمبر ۱۹۲۴ء میں چھپا تھا۔ موصوف ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں اپنی کتاب "سلطان عالم واجد علی شاہ ص۹۶" میں مضمون بالا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"کچھ بہت دن نہیں ہوئے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو رہے تھے۔ نہ یہ باہمی عداوت و نفرت تھی، نہ یہ بدظنی و بے اعتباری۔ ابھی کل تک مسلمان اپنے ہندو ہمسایوں کو اور ہندو اپنے مسلمان پڑوسیوں کو ان کے سن اور خاندانی تعلقات کے لحاظ سے بھائی، چچا، دادا، ماموں، پھوپھا وغیرہ کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ رشتے صرف زبانی نہ ہوتے تھے۔ ہماری سوسائٹی نے جو حقوق اور فرائض ان رشتوں سے وابستہ کر دیئے ہیں وہ سب ادا کیے جاتے تھے خوشی اور غم، تقریبوں اور تہواروں میں ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔ یہ رشتے عارضی بھی نہ ہوتے



تھے بلکہ اکثر کئی کئی پشتوں سے چلے آتے تھے اور کئی کئی پشتوں تک چلتے تھے۔ باہمی اتحاد نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ رسمی مذہب کی حدیں جگہ جگہ سے ٹوٹ چلی تھیں۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کی رسمیں اور مسلمانوں میں ہندوانے تہوار منائے جانے لگے تھے۔ جن ہندو اور مسلمان گھرانوں کو پاس پاس رہتے ہوئے دو تین پشتیں گزر گئی تھیں، ان میں یہ پتا بھی مشکل سے چل سکتا تھا کہ وہ ایک دادا کی اولاد اور ایک خاندان کے رکن نہیں ہیں۔ دونوں اپنے اپنے مذہب میں پکّے تھے۔ مگر اختلاف مذہب سے ان کے باہمی تعلقات میں فرق نہ پڑتا تھا۔ آج اس میل ملاپ، اس اتحاد کے لیے ہماری نگاہیں ترستی ہیں اور اس رواداری اور بے تعصبی کے لیے ہمارے دل تڑپتے ہیں۔"

یہ بیان شاہان اودھ کے زمانے پر بالعموم اور واجد علی شاہ کے عہد پر بالخصوص صادق آتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہی کے زمانے میں امامباڑہ حسین آباد اور شاہ نجف کے امامباڑے کا سارا انتظام منشی رام پرشاد صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ضریح مبارک کے ساتھ پا پیادہ سرگرم اہتمام رہتے تھے۔

[اودھ اخبار لکھنؤ جلد ۱۲ نمبر ۴ مطبوعہ لکھنؤ
۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء]

"میں ایک سچّا ہندو ہوں،
اس لیے
ایک سچّا مسلمان ہوں،
سچّا سکھ ہوں — اور
سچّا عیسائی بھی۔"

— مہاتما گاندھی

یہ بات بھولتے ہیں ہم

عابدہ کھان
پروڈیوسر "اردو" ... دوردرشن، منڈی ہاؤس، نئی دہلی

تمہارا جسم، میرا جسم
الگ الگ
تمہارا رنگ، میرا رنگ
الگ الگ
تمہارا دھرم، میرا دھرم
الگ الگ
یہ سب الگ الگ مگر یہ بات بھولتے ہیں ہم
لہو — تمہارے جسم میں ہو یا ہمارے جسم میں
لہو کا رنگ ایک ہے
الگ الگ دھڑک رہے ہیں دل یہ مانتا ہوں میں
مگر دلوں کی دھڑکنوں کا رنگ ڈھنگ ایک ہے
ہمارا ذہن ایک ہے
ہماری فکر ایک ہے
ہماری راہ ایک ہے
ہمارے دل کا حوصلہ اور امنگ ایک ہے
حصولِ امن کے لیے ہماری جنگ ایک ہے
لہو کو گرم مت رکھو
لہو ہوا جو گرم، خوں کی ندیاں بہیں گی پھر
ہماری آنے والی پیڑھیاں کہاں رہیں گی پھر
لہو کو گرم مت رکھو
لہو کا کھیل کھیلنا تو دشمنوں کی چال ہے
لہو کو عام مت کرو
چلو اٹھو گلے ملو
لہو لہو سے مل گیا
جو دل کا پھول کھل گیا
تو نفرتوں کی جنگ میں وہ پھر ہماری ڈھال ہے
لہو — تو لازوال ہے

عشرت علی صدیقی
۱۹۳- زنبور خانہ کینٹ روڈ
لکھنؤ

قومی مسائل کا حل : یک جہتی

ہندستان میں قومی یک جہتی پر آج جو زور دیا جارہا ہے وہ دراصل ایک قدیم ورثے کو نمایاں کرنے، بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش ہے۔ یہ ورثہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ قوم کا تصور۔ ہندستان کے فکروعمل میں قومی یک جہتی آزادی کی قومی تحریک سے بہت پہلے جھلکنے لگی تھی۔ یہ محض سیاسی اصطلاح نہیں بلکہ سماجی حقیقت اور وقت کی ضرورت بھی ہے اور اس ملک میں پائے جانے والے مذہبوں کی قدر مشترک بھی ہے۔ وید، انجیل اور قرآن سب میں نہ صرف تمام انسانوں بلکہ پوری کائنات کو، جس میں ہماری اس دنیا کے علاوہ اور بہت سی آباد اور غیر آباد دنیائیں بھی شامل ہیں، ایک ہی خالق کی مخلوق قرار دیا گیا ہے۔ رب العالمین کا تصور قرآن کی طرح وید میں بھی موجود ہے۔ یہ تصور قومی یک جہتی سے بھی آگے انسانی یک جہتی تک جاتا ہے۔ اس طرح قومی یک جہتی کو نقصان پہونچانے والی باتیں اور حرکتیں نہ صرف قومی مفاد کے خلاف بلکہ انسانیت کے تقاضوں کے بھی منافی ہیں۔

فطری رجحان

ہندستان میں قومی یک جہتی برطانوی سامراج کے آنے سے پہلے موجود تھی، جب متعدد تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے متعدد مذہبوں کے ماننے والے اور متعدد زبانوں کے بولنے والے ایک ساتھ رہتے ایک دوسرے کے عقیدوں سے متاثر ہوتے اور ایک دوسرے کے رسم و رواج اور رہن سہن کو اپنے سانچے میں ڈھال کر اپناتے اور پرامن بقائے باہم کے راستے پر چلتے تھے۔ اپنے مذہب کی پابندی دوسرے مذہبوں کے احترام کو رد کرنے کے بجائے اسے ضروری قرار دیتی تھی۔ رواداری کی شکل میں ظاہر ہونے والی قومی یک جہتی زندگی کا ایک بنیادی اصول اور اس ملک کے باشندوں کا ایک فطری رجحان بن گئی تھی۔ ہندستان کی آب و ہوا نے اس رجحان کو تقویت پہنچائی۔ مقامی سنتوں نے جس زمین کو بھکتی سے سینچا اور زرخیز بنایا اس پر معین الدین چشتی اور نظام الدین اولیا جیسے باہر سے آئے ہوئے بزرگوں نے اخوت، محبت اور انسانیت کا چمن لگایا۔ زمین کے زرخیز اور آب و ہوا کے موافق ہونے کی وجہ سے اس چمن کی خوشبو دور دور تک بلکہ ملکی حدود کے باہر تک پھیل گئی۔ یہ خوشبو آج بھی برقرار اور باعث کشش بنی ہوئی ہے۔ باہر سے میل محبت کا پیغام لانے والے صوفیوں کے علاوہ کچھ لوگ اسلحے لے کر بھی آئے۔ ان میں سے کچھ لوٹ مار کے لیے آئے تھے اور اپنی ہوس پوری ہوجانے پر واپس چلے گئے۔ کچھ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان میں سے بعض حکمراں بن گئے۔ باہر سے آنے والے حکمرانوں کی مقامی حکمرانوں سے اور پھر ان کی آپس میں لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن ان لڑائیوں کی بنیاد اور غرض و غایت مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ ہندو راجاؤں کی فوجوں میں مسلمان کمان سنبھالتے تھے اور مسلمان بادشاہوں کے لشکروں میں ہندو جاں نثاری کے جوہر دکھاتے تھے۔

لیکن یہ جدال و قتال بھی قومی یک جہتی کو مجروح نہیں کرسکا۔ حکمرانوں کی مصلحت نے انھیں رواداری کی راہ پر لگایا اور اس راستے میں مذہب مانع نہیں بلکہ معاون ثابت ہوا۔ کبھی کبھی کسی نے



سیاسی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کیا لیکن "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" والے واقعات بھی تاریخ کے صفحات میں موجود اور محفوظ ہیں۔ مثلاً گورو گوبند سنگھ نے دعوا کیا کہ وہ وحدانیت پرستی میں اورنگ زیب سے افضل ہیں اور شیواجی نے اورنگ زیب کے نام ایک خط میں ان کو رب العالمین اور رب المسلمین کے فرق کی طرف توجہ دلائی۔ سکھوں کی مقدس کتاب گورو گرنتھ صاحب میں بابا فرید کا کلام شامل ہے۔ اور شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ وید اور اپنشدوں کے عالم اور معتبر مفسر تھے۔ قرون وسطیٰ کے یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات اس زمانے میں قومی یک جہتی کے جذبے کے موجود اور موثر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

مذہبی برادری اور سیاسی برادری

مذہبی مملکت کا تصور اس زمانے میں ہندستان میں ناپید تھا۔ حکمراں طبقہ کسی ایک مذہبی فرقے تک محدود نہیں۔ بلکہ اس طبقے میں مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے اور مختلف مذہبوں کے ماننے والے امرا شامل ہوتے تھے۔ مذہبی برادری کے سیاسی برادری ہونے کا تصور یورپ میں ابھرا۔ وہاں چرچ کو سیاست اور حکومت میں جیسی بالادستی حاصل تھی، ویسی ہندستان میں نہ تو مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہوئی اور نہ ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کو۔

دونوں فرقوں کے مذہبی پیشواؤں نے فقیری اور سنیاس کو دولت اور حکومت پر ترجیح دی۔ ان میں اقتدار کی ہوس نہیں بلکہ وہ اقتدار سے پرہیز کرتے تھے، اسی لیے وہ تعصب کی تلقین کرنے کے بجائے انسانی محبت اور بھائی چارے کا درس دیتے تھے ___ قومی یک جہتی کا درس! یہی درس اب سے سو سال پہلے سوامی ویویکانند نے شکاگو میں مذاہب عالم کی پارلیمنٹ کے بین اقوامی پلیٹ فارم سے دیا تھا۔ انھوں نے قومی یک جہتی کے تصور کو بین اقوامی یک جہتی تک پہونچا دیا۔ مختلف مذاہب کے علما کو خطاب کرتے ہوئے سوامی ویویکانند نے کہا تھا:

"عیسائی کو ہندو یا بودھ ہو جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ ہندو یا بودھ کے لیے عیسائی بن جانا ضروری ہے۔ البتہ ہر مذہب دوسرے مذاہب کی روح اپنے اندر سمولے اور اس کے ساتھ ہی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اپنے اصولوں کے مطابق ترقی کرے۔ ہر مذہب نے اعلا کردار کے عورت مرد پیدا کیے ہیں اور اگر اس شہادت کی موجودگی میں کوئی یہ تمنا کرے کہ صرف اسی کا مذہب باقی رہے اور باقی سب مذہب فنا ہو جائیں تو میرے نزدیک اس کی حالت انتہائی قابل رحم ہے۔"

ویویکانند مساوات اور انسانیت دوستی کے ویدانتی فلسفے کو ماننے اور تمام مذاہب میں اسلام کو اس فلسفے سے قریب ترین سمجھتے تھے۔ کھلم کھلا اس کا پرچار بھی کرتے تھے۔ آج کے مذہبی پرچارک جو دوسری طرح کا پرچار کر رہے ہیں، اس کی بنیاد مذہبی عقائد پر نہیں بلکہ سیا
اغراض پر ہے۔

تعصب کا عنصر

ہندستانی سیاست میں تعصب کا عنصر برطانوی سامراج کی آمد کے بعد تیزی سے بڑھا۔ ملک کی تاریخ میں یہ تباہ کن موڑ ہے۔ اس سے پہلے یہاں مذہب کے غلط استعمال کی کوششیں زیادہ کامیاب نہ ہو سکی تھیں اور اختلافات عام طور پر عناد کی شکل نہیں اختیار کرتا تھا۔ بعد میں فرقہ پرستی اور علاحدگی پسندی کے روپ میں ظاہر ہوا اور ح
نے مذہبی اور لسانی یگانگت کو دبایا اور اجنبیت کو بڑھایا۔

پہلے اگرچہ سرکاری اور درباری زبان ہونے کی وجہ سے فارسی کی درس و تدریس کو مقبولیت حاصل ہوئی مگر حکمرانوں نے سن
کی بھی، جو ہندستان کی قدیم زبان تھی، سرپرستی کی۔ لسانی میل
نے ہندی، ہندوی یا ہندستانی زبان کو جنم دیا۔ اور برج بھاشا کی اہم شاخیں ہندی اور اردو ساتھ ساتھ ترقی کرنے لگیں۔ جب برطانوی حکومت نے انگریزی کو راج بھاشا اور راشٹر بھاشا

حیثیت دے دی تو ہندوستانی زبانوں کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہوگیا اجنبیت نے بڑھ کر رقابت کی شکل اختیار کر لی۔ بدیسی حکومت نے اس رقابت میں دو چند رنگت پیدا کر دی اس حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر اپنے دیسی کارندوں کے ذریعے دونوں ذہنوں کی سوچ کو محدود کر کے قومی یکجہتی کے جذبے کو کمزور کر دیا مگر اسے قوم کے رگ و پئے سے پوری طرح نکال نہیں سکی۔

دو قومی نظریہ

بدیسی زبان اور تہذیب کی ظاہری اور مصنوعی چمک دمک نے ہندوستان کی زبانوں اور تہذیبوں سے واقفیت اور ان کے باہمی لین دین میں رکاوٹ ڈالی جس کی وجہ سے نہ صرف پڑوسیوں سے بلکہ خود اپنے سے بھی واقفیت کم ہو گئی۔ خود اعتمادی کے ساتھ خودداری بھی گھٹ گئی اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مذاہب کے آفاقی پہلو کو نظرانداز کر دیا۔ عدم واقفیت نے غلط فہمیوں کو بڑھایا بدیسی حکومت نے اپنی اغراض کے لیے اس عدم واقفیت اور ان غلط فہمیوں میں اضافہ کیا اور اس حکمت عملی کا نتیجہ دو قومی نظریے کی شکل میں نمودار ہوا جس کے لئے دونوں بڑے فرقوں کے کچھ لیڈر ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگے اور جن لوگوں نے اپنی اغراض کے لیے قومی یکجہتی کو زک پہونچائی تھی وہ اس صورت حال پر مسکراتے رہے۔ لیکن بہت جلد لوگوں کو محسوس ہوگیا کہ ان کو دھوکا دیا گیا ہے اور قومی یکجہتی کو زک پہونچنے سے ان کے مفاد کو زک پہونچی ہے۔

پچھلے دو ڈھائی برسوں میں جہاں ایک طرف قومی یکجہتی کو نقصان پہونچانے والی حرکتوں میں اضافہ ہوا ہے اور دو قومی نظریے کا ایک نیا روپ سامنے آیا ہے وہاں دوسری طرف اس نقصان کی تلافی۔ اس نظریے کی نفی اور مزید نقصان کی پیش بندی پر توجہ بھی پہلے سے زیادہ دی جا رہی ہے۔ ۶ دسمبر کے واقعات اور بمبئی اور سورت کے فسادات کو پہلے عمل کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے جبکہ ان واقعات اور فسادات کے رد عمل سے دوسرے عمل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ملک کی مجموعی آبادی اور ذرائع ابلاغ کی مجموعی کارکردگی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ پہلے عمل کے حمایتی اور ان کا جوش کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور دوسرے عمل کے شرکا کی تعداد اور سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انسانیت دوستی، شرافت اور رواداری کے فطری رجحان اور قومی یکجہتی کے قدرتی جذبے کو عمل اور رد عمل کے اس چکر سے تقویت ملی ہے۔ جبکہ اس رجحان اور جذبے کے مخالفوں میں ضد کے ساتھ ساتھ ندامت اور مایوسی بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ البتہ ہیرا پھیری ابھی جاری ہے۔

پھول اور کانٹے

دو قومی نظریہ حقیقت کے بھی خلاف تھا اور فطرت کے بھی۔ اس لیے کہ قوم کا تعین محض مذہب کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ میں عیسائی مذہب کے ماننے والے ایک قوم نہیں ہیں بلکہ متعدد ملکوں اور قوموں میں منقسم ہیں۔ اسی طرح مغربی ایشیا کے جن ملکوں کی ساری یا بیشتر آبادی مذہب اسلام کے ماننے والوں پر مشتمل ہے وہ الگ الگ قوموں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں کئی مذہبوں کے ماننے والے بستے ہیں اور سب مل کر ایک قوم کہلاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء والی تقسیم میں مذہب کا سہارا لیا گیا تھا مگر اس سہارے کی کمزوری اس وقت واضح ہو گئی جب ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کی آبادی کا ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ دو قومی نظریے سے تھوڑے سے افراد کو چاہے کچھ فائدہ پہونچ گیا ہو مگر ایک قوم کی تقسیم سے جو دو اور بعد میں تین قومیں وجود میں آ گئیں ان سب کے عام لوگوں کے سکون، ترقی اور خوش حالی سے نقصان پہونچا ہے نقصان دہ ثابت ہو جانے والے اس دو قومی نظریے کے بیج کو تخریب کی کھاد اور فساد کا پانی دے کر اگانے کی نئی کوششوں کا نتیجہ بھی پرانی کوششوں کے نتیجے کی طرح سراسر نقصان دہ ہوگا۔ کیونکہ کانٹے بو کر پھول نہیں پیدا کیے جا سکتے۔ نئے طریقوں کے استعمال سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کانٹوں کا رنگ اور سائز بدل جائے۔ مذہب کی طرح زبان، علاقے اور ذات برادری کے فرق کو بھی

بنیاد بناکر منافرت پھیلانے اور قوم کو لڑا کر گروہوں میں بانٹنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے مگر کانٹوں کے پھول بن جانے کی اُمید یا بات کرنا اپنے آپ کو اور اپنے مخالفوں کے ساتھ اپنے حامیوں کو بھی دھوکا دینے کے مترادف ہوگا۔

سرسید کا مسلک

دھوکا دینے اور دھوکا کھانے کی بہت سی مثالیں ہندستان کے ماضی اور حال میں موجود ہیں اور ہمارے بزرگ اس خطرے کے خلاف لگاتار آگاہی دیتے رہے ہیں۔ جو لوگ کانٹوں کو پھول کہہ کر بیچتے رہے ہیں وہ اس فریب کے خلاف آگاہی دینے والوں کو نشانہ بھی بناتے رہے ہیں۔ کبھی زبان اور قلم سے، کبھی پستول اور بم سے۔ ان دونوں طرح کے حملوں کی ان گنت مثالیں ہمارے ملک کے ماضی اور حال کی تاریخ میں موجود ہیں۔

نمونے کے طور پر ماضی سے سرسید کو اور حال سے مہاتما گاندھی کو لے لیجیے۔ سرسید کو ان کے مخالف ہی نہیں بعض مؤید بھی دو قومی نظریے کا علمبردار کہتے ہیں جبکہ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں ایک تقریر کے دوران ایک قومی نظریے کی تبلیغ کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"یاد رکھیے کہ ہندو اور مسلمان مذہبی اصطلاحات ہیں۔ در اصل ہندستان کے تمام باشندے چاہے وہ ہندو ہوں، چاہے مسلمان، چاہے عیسائی اپنی جائے رہائش کے اعتبار سے ایک قوم ہیں۔۔۔ وہ زمانہ بیت گیا جب ایک ملک کے باشندوں کو محض مذہب کی بنیاد پر دو قومیں کہا جا سکتا تھا۔"...

سرسید مسلمانوں کو پسماندگی سے نکالنا ضرور چاہتے تھے مگر ہندوؤں سے لڑانا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ دونوں فرقوں کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے انھوں نے جنوری ۱۸۸۴ء میں گورداسپور (پنجاب) کی ایک تقریر میں، جس میں ان کے بیشتر مخاطب مسلمان تھے، کہا تھا:

"ہمیں (ہندوؤں اور مسلمانوں کو) ایک جان اور ایک قالب بننے کی کوشش اور ایک ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اگر ہم متحد ہو جائیں گے تو ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے ورنہ ایک دوسرے کی مخالفت دونوں کے زوال اور بربادی کا باعث بن جائے گی۔"

گاندھی جی کی شہادت

اسی اتحاد کا پرچار گاندھی جی زندگی بھر کرتے رہے اور آخر میں انصاف اور رواداری پر مبنی قومی یکجہتی پر اپنے پختہ عقیدے اور دیا عمل کی وجہ سے ان کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ وہ جانتے تھے مانتے تھے اور جتاتے تھے کہ قومی یکجہتی ہندستان کے لیے قدرت کا فیصلہ ہے، تقدیر کا نوشتہ ہے اور قومی مسائل کے حل کے لیے تیر بہدف نسخہ ہے۔ یہ دوا مرکب نہیں مفرد ہے۔ اس کا بنانا اور استعمال کرنا بہت آسان ہے۔ مگر اسے زبردستی دشوار بنایا جا رہا ہے۔

قومی یکجہتی سے کچھ لوگ قومی یک رنگی مراد لیتے ہیں۔ اگر زبردستی مسلط کی جانے والی یک رنگی سے قومی یکجہتی کے قیام میں رکاوٹ پڑے گی۔ اسی طرح جو لوگ مذہب کی پابندی اور وجود کو قومی یکجہتی کے منافی سمجھتے ہیں وہ قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے کے بجائے اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر کمزور کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اور قومی یکجہتی میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ مذہب سے زندگی ڈسپلن آتا ہے وہ قومی یکجہتی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ گاندھی جی، مولانا آزاد جیسے لوگ مذہبی ہونے کے باوجود قومی یکجہتی کی تصویر تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ قومی یکجہتی کے بغیر ہندستانی آزاد ہو سکتی ہے اور نہ آزاد اور خوش حال رہ سکتی ہے۔

ابھی تک کسی نے کوئی دوسرا نسخہ تجویز نہیں کیا ہے۔ اگر کچھ لوگ صحیح نام سے غلط دوا بیچنے کی کوشش کر رہے ہیں ایک تشویش ناک بات ہے۔

□□

ڈاکٹر خلیق انجم
اُردو گھر، راؤز ایونیو
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہماری مشترکہ تہذیب

ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں کئی صدیاں گزری ہیں اور اسے بنانے اور نکھارنے میں ہندو اور مسلمان دونوں کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ صوفیوں، سادھو سنتوں، مختلف زبانوں اور خاص طور سے اُردو کے شاعروں نے اس مشترکہ تہذیب کی تعمیر میں شعوری کوششیں کی ہیں۔ ہماری مشترکہ تہذیب کی داستان بہت طویل ہے۔

دنیا کی مختلف نسلوں، مذہبوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ سرزمین ہند پر زرخیز میدانوں کی تلاش میں یا حملہ آوروں کی صورت میں آتے رہے۔ بیشتر لوگوں نے اس عظیم الشان برصغیر میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہاں کی تہذیب و تمدن میں ایسے ضم ہوئے کہ ان کی اپنی نسلی اور تہذیبی انفرادیت بھی باقی نہیں رہی۔ ایسے بھی کچھ لوگ تھے جو حملہ آوروں کی صورت میں ہندستان آئے۔ جب تک انھیں اقتدار حاصل رہا یہاں رہے اور پھر واپس اپنے وطن چلے گئے۔ ایسے لوگوں میں یونانی اور انگریز شامل ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ہندستانی قومیت کے بارے میں بات کریں یہ طے ہو جائے کہ قومیت کیا ہے اور کن عناصر پر اس کی بنیاد ہے۔

قومیت کے موجودہ تصور کی بنیاد جغرافیائی حدود پر ہے۔ صرف مذہبی، نسلی، لسانی اور تاریخی رشتے سماج کو متحد نہیں کر سکتے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ مخصوص جغرافیائی حدود میں رہنے والے ایک ہی مذہب کے لوگوں نے ایک قوم کی شکل اختیار نہیں کی۔ مسلمان اور عیسائی دنیا کے مختلف ملکوں میں آباد ہیں لیکن ان کی بنیادی وفاداری اپنے ملک اور ملک میں رہنے والے مختلف مذاہب کے لوگوں سے ہے دوسرے ملکوں میں رہنے والے اپنے مذہب کے لوگوں سے نہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک ہی نسل کے لوگوں نے زمانۂ قدیم میں دنیا کے مختلف ملکوں میں ہجرت کی تھی لیکن اب ان کی تہذیب، زبان، مذہب وغیرہ ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کے بارے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کے آباد اجداد اصلاً کس علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

جس طرح مذہب اور نسل وغیرہ قومیت کی بنیاد نہیں بن سکے۔ اسی طرح زبان بھی قومیت کو اساس فراہم نہیں کرتی۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کوئی ملک مختلف حصوں میں تقسیم ہو۔ اس کا تاریخی، تہذیبی، مذہبی اور لسانی سرمایہ ایک ہی تھا۔ لیکن ملک تقسیم ہونے کے بعد مختلف قومیں وجود میں آگئیں۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش اس کی زندہ مثال ہیں ان تینوں ملکوں کے لوگ ہمیشہ سے ایک ساتھ رہے۔ ان کا مذہبی، لسانی اور تہذیبی سرمایہ ایک ہی تھا۔ لیکن جب ان کا الگ الگ وجود قائم ہوا تو ان تینوں ملکوں کے لوگوں نے الگ الگ قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ دراصل ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے مختلف نسلوں، علاقوں، مذہبوں کے لوگوں میں فطری طور پر محبت اور یگانگت کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے اس لیے یہ قوم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل غیر منقسم برصغیر کے مختلف سماجی گروہوں میں وہ اشتراک تھا۔ جس کی بنیاد پر یہ ایک ہندستانی قوم تھی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم آزاد ہوئے لیکن المیہ یہ ہوا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان ایک باقاعدہ ملک کی حیثیت سے وجود میں آگیا۔ پاکستانی



مفکروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس نوزائیدہ ملک کی قومیت کا تھا۔ پاکستانی عوام کو یہ احساس دلانا تھا کہ اب وہ ایک علاحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں کل تک پاکستان کے علاقے میں بسنے والے بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی ہندستانی قومیت کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ راتوں رات پاکستانی قوم وجود میں آگئی، جس کی وجہ سے پاکستانی قومیت اور کلچر بھی وجود میں آگیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستانی کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب میں پاکستانی کلچر کا نام لیتا ہوں تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں ایک جغرافیائی حدود میں رہنے والوں کی اس روح کو دریافت کروں جو قومی سطح پر ایک بنگالی، ایک پنجابی، ایک سندھی، ایک پٹھان، ایک بلوچی اور ایک مہاجر میں مشترک ہے۔ جس کے باعث ان سب کے طرز فکر وعمل میں بنیادی مماثلت کا اشتراک پایا جاتا ہے بلکہ جس میں ہر علاقے کے رہنے والے برابر کے شریک ہوں۔" [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں جغرافیائی حدود پہلے وجود میں آئیں اور قومیت اور پاکستانی کلچر کا احساس بعد میں شروع ہوا۔

جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر برصغیر ہند دنیا کا منفرد ملک رہا ہے۔ یہ ملک شمال میں ہمالیہ کے اونچے اونچے پہاڑ، مشرق میں خلیج بنگال، جنوب میں بحرِ ہند اور مغرب میں بحرِ عرب سے گھرا ہوا ہے۔ گویا دنیا کا ایک حصہ اور دنیا سے الگ تھلگ بھی۔ یہاں کی زمین زرخیز اور ایسی زرخیز کہ ہزاروں برس سے مختلف نسلوں کے قافلے زرخیز زمین کی تلاش میں اپنے وطنِ عزیز کو خیرباد کہہ کر اس سرزمین پر ہجرت کرنے کو مجبور تھے اور زر کی ہوس میں اس سونے کی چڑیا کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے بیرونی حملہ آور بھی اس مقدس سرزمین کو اپنے پیروں تلے روندتے رہے۔

ہندستان کے ابتدائی حکمرانوں کا ہندستانی عوام اور خواص سے رشتہ سیاسی ضرورتوں کے تحت رہتا تھا۔ حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے وہ عوام سے قربت حاصل کرتے تھے۔ یہ حکمراں سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر ہندو اور مسلمانوں میں فرق بھی کرتے لیکن صوفیائے کرام نے کبھی مذہب کے نام پر عوام میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ان کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں برابر تھے۔ صوفیا حضرات ایک طرف تو حکمراں طبقے کے ظلم و استبداد کے خلاف جہاد کرتے اور دوسری طرف بے بس، مجبور اور لاچار انسانوں کو انسانی عظمت اور خودداری کا درس دے کر ان میں خود اعتمادی اور بلند کرداری پیدا کرتے۔ مختصر یہ کہ تصوف کی بنیاد انسان دوستی، مذہبی رواداری اور مساوات پر تھی۔ تصوف کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمان صوفیوں نے وحدت الوجود کے فلسفے کی تبلیغ کی تو ہندوؤں کو یہ فلسفہ ویدانت کے فلسفے سے ہم آہنگ نظر آیا اور نفرت کی جو دیواریں دونوں مذاہب کے درمیان کھڑی تھیں، آہستہ آہستہ گرنے لگیں۔ ان دونوں مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں بھگتی تحریک کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

بھگتی تحریک کا آغاز گیارھویں صدی میں جنوبی ہند میں ہوا۔ اس سلسلے کے پہلے بزرگ رامانج تھے جنھوں نے تحریک کے لئے فلسفیانہ اساس فراہم کی۔ کچھ ہی عرصے میں یہ تحریک جنوبی ہند سے نکل کر شمالی ہند میں پھیلنی شروع ہوئی۔ اس عہد میں راجپوت ریاستوں میں وشنومت فروغ پا رہا تھا۔ اس تحریک نے وشنومت کو تقویت پہونچائی۔ دو تین صدیوں بعد اس سلسلے میں بھگت رامانند پیدا ہوئے، جن کی بدولت اس تحریک کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ رامانند سے پہلے بھگتی کی بنیاد وشنومت پر تھی۔ رامانند نے رام چندر جی کو موضوع بنایا۔ اس تحریک میں اتنی وسعت اور فراخدلی تھی کہ مسلمان بھی متاثر ہونے لگے۔

سولھویں صدی کے آغاز میں کبیر نے اس تحریک کو ایک ایسا رخ دیا کہ مسلمانوں کی رہی سہی مغائرت بھی ختم ہوگئی۔ انھوں نے ایک ایسے خدا کا تصور پیش کیا جو مسلمانوں کے خدا کے تصور سے ہم آہنگ تھا۔ کبیر نے اپنے دوہوں اور گیتوں کے ذریعہ اس فلسفے اور عقیدے کی تبلیغ کی جسے ہندو اور مسلمان دونوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کبیر کے علاوہ تلسی داس اور سورداس وغیرہ نے بھی مذہبی اور تہذیبی یک جہتی کے لیے شعوری کوششیں کیں۔

مسلمانوں میں یہ کام ملک محمد جائسی، شیخ منجھن اور قطبین

نہ کیا۔ ان حضرات نے ہندو دیوی دیوتاؤں اور ہندوستانی موضوعات کے سہارے ہندو مسلم عوام کو تصوف کے راستے پر لانے کی کوشش کی۔ کئی شاعروں نے ہندوستانی قصوں پر مبنی مثنویاں لکھیں۔ اس سلسلے میں نقانی کی کدم راؤ پدم راؤ۔ نصرتی کی پھول بن۔ قطب مشتری، مادھو نل کام کندلا اور غواصی کی مینا ستونتی اور مدھو مالتی وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

برج بھاشا کے شاعروں میں عبدالرحیم خانخاناں، عالم شیخ آزاد، خان محبوب، جانا موسیٰ، مبارک علی خاں، رحیم نے بھی دونوں قوموں کی جذباتی ہم آہنگی کے لیے شعوری کوششیں کیں۔

صوفیوں، سنتوں اور شاعروں کی شعوری کوششوں سے مذہب کے بنیادی اختلافات اس حد تک دور ہو گئے کہ ہندو مسلمان صوفیوں کے مرید ہوتے اور مسلمان ہندو بزرگوں کے۔ سلطان سخی سرور کے مریدوں میں ہندوؤں کی تعداد غیر معمولی تھی۔ ان ہندو مریدوں کو سلطانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ پنجاب کے مختلف اضلاع میں آج بھی موجود ہیں۔ بنگال کے چیتنیہ مہاپربھو کے بہت سے چیلے مسلمان تھے۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری کے معتقدوں میں بڑی تعداد میں ہندو بھی تھے۔ آج بھی وہاں کے بیشتر ہندو صبح کو درگاہ پر ماتھا ٹیک کر اپنے کاروبار پر جاتے ہیں۔

گرو نانک کے مریدوں میں مردانہ بھی شامل تھے جو ہر وقت اپنے مرشد کے ساتھ رہتے تھے۔ مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ سکھوں کی مقدس ترین کتاب گرنتھ صاحب میں بابا فریدؒ کا بھی کلام شامل ہے جسے انتہائی احترام کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ سکھ اپنے دوسرے مذہبی پیشواؤں کے برابر ہی بابا فرید کا احترام کرتے ہیں۔

گورو ارجن دیو جی نے امرتسر کے گوردوارہ ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد ایک مسلمان بزرگ سائیں میاں میر سے رکھوایا تھا۔

ہندوستان کی عظمت فوجی طاقت میں نہیں بلکہ یہاں کی فکر، فلسفہ مذہبی رواداری، ہزاروں سال کی پروردہ تہذیب، انسان دوستی کے جذبات، سیکولر روایات کا احترام، ادب، رقص، موسیقی، نقاشی، سنگ تراشی، مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ میں ہے اور جب اس کا احساس مغل بادشاہوں کو ہوا تو انھوں نے یہاں کی تہذیب کو اپنانے کے

شعوری کوششیں کیں اور کچھ ہی عرصے میں وہ تہذیب جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کہلاتی تھی، اب ہند ایرانی تہذیب کہی جانے لگی۔

اس تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک مشترکہ کلچر کی تشکیل دینے کے لیے شعوری اور غیر شعوری کوششیں کی تھیں چوں کہ مسلمان یہاں کی آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہاں کے رسم و رواج کو اس طرح اپنایا کہ یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ رسم و رواج مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ سید احمد دہلوی نے دہلی کے رسم و رواج پر "رسوم دہلی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

"پہلے اس سے کہ میں ان رسوم کو شروع کروں، اس قدر عرض کر دینا مناسب جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں، وہ تقریباً سب کی سب ہندو والی رسمیں ہیں جن میں بہت سی رسمیں توجوں کی توں ہیں۔ بعض کے نام تو وہی ہیں۔ اگرچہ تاریخ بدل گئی ہے بعض میں برائے نام فرق کر دیا ہے۔ بعض کو مذہبی امور میں تغیر نام سے شامل کر لیا۔ مثلاً رسم تیجا ہندوؤں میں، فاتحہ سوم مسلمانوں میں۔" ۲۵

اُردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور سیکولر ذہن کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔ اس زبان نے لسانی، ادبی اور شعوری روایات ہندوستان اور ایران دونوں سے لی ہیں۔ اردو کا ڈھانچہ کھڑی بولی یعنی ہندوستانی ہے لیکن اس نے الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ دنیا کی مختلف زبانوں اور خاص طور سے فارسی اور عربی سے لیا ہے۔ اس لیے اس زبان نے مشترکہ تہذیب کی جس طرح نمائندگی کی ہے ہندوستان کی کسی اور زبان نے نہیں کی۔ اُردو شاعری نے مذاہب سے کہیں زیادہ انسانیت پر زور دیا ہے۔ اُردو شاعر کی نظر میں دیر و حرم، ناقوس و اذاں سے زیادہ میکدہ ہے کیوں کہ میکدے میں مذہب کی بنیاد پر انسان اور انسان میں تفریق نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر تقی میر کہتے ہیں ؂



میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مرزا محمد رفیع سودا ؎

ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

میر ہی کے ذوشعر اور سنئے ؎

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

مسجد ایسی بھری بھری کب تھی
مے کدہ اک جہان ہے گویا

غالب کہتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یگانہ چنگیزی کو دیکھئے ؎

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

اب بیسویں صدی کے شاعروں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

——— اقبال

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شان مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں (چکبست)

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

——— اقبال

قتل آدم کا میں الزام صنم کس کو دوں
ترے ابرو پہ بھی ہے برسر محراب بھی ہے

——— پروفیسر مسعود حسین خاں

اردو شاعری کی انسان دوستی، سیکولر روایات اور متصوفانہ انداز فکر نے ایک ایسی کھلی فضا قائم کر دی کہ شاعر نہ صرف ایک دوسرے کی تہذیب کا احترام کرتے ہیں بلکہ ان مذہبوں سے غیر معمولی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں نے بڑی تعداد میں کرشن جی، رام چندر جی، مہاویر جی، گوتم بدھ اور گورو نانک جیسے بزرگوں پر بے شمار نظمیں کہی ہیں یا اپنی شاعری میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ہندو شاعروں نے بھی رسول اکرم حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور صوفیائے کرام پر بے شمار نظمیں کہی ہیں۔

اردو کے ممتاز ترین نعت گو شاعر محسن کاکوروی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول عمل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن سے ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل

"ڈاکٹر سید محمود نے اپنے ایک مقالے "متحدہ ہندستانی قومیت" میں لکھا ہے کہ سعد سلمان لاہوری سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک بھاشا سنسکرت میں بڑے بڑے عالم اور شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سعد سلمان نے ہندی زبان میں پورا ایک دیوان مرتب

چندر شیکھر کمبار
وائس چانسلر، کنڑ یونیورسٹی

قومی یکجہتی - ایک ثقافتی ضرورت

ہم ایک مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ آج جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا اور آزادی۔ ہم نے ان دونوں کے باہمی تعلق اور انحصار کو فراموش کر دیا ہے۔ یہی فراموشی ہماری اس مصیبت کے لیے ذمہ دار ہے۔ اس حقیقی آزادی کی ذمہ داری نبھانے کے لیے شاید نہ تو ہم تیار ہیں اور نہ ہی اس کو سمجھ سکنے کے لیے بیدار۔

ہم ایک نئی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں لیکن اس سے ہم شاید نفرت کے بیج ہی بو رہے ہیں۔ آزادی کے بعد ہم نے جتنا خون بہایا ہے اتنا تو آزادی کی لڑائی میں بھی نہیں بہایا تھا کیا ہم اب اپنی اس آزادی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں جس کے لیے ہم نے ذرا بھی خون نہیں بہایا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اندر جھانک کر دیکھنا ہوگا۔

احتساب نفس مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ اشد ضروری بھی ہے۔ تہذیب یافتہ ہونے کے یہی معنی ہیں کہ ہم اپنی فکر کو متوازن رکھیں۔ اگر ہم اپنی فکر کو توازن میں رکھنا نہیں سیکھتے ہیں تو ہمارا خاتمہ یقینی ہے۔

قومی ہم آہنگی ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ملک کے عام لوگ جو سیاسی داؤں پیچ (جسے ہم غلطی سے سیاست سمجھتے ہیں) سے عموماً ناواقف ہوتے ہیں، ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے آئے ہیں۔

بیجاپور کے صوفی سنت، سوالاگی کے سنت، سراہٹی کے سوامی اور راج باغ ساور کا عرس وغیرہ کچھ ایسی مثالیں ہیں جو ہمیشہ قومی ہم آہنگی کو فروغ دیتی رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گجرات کے برہمنوں میں عربی زبان کے بارے میں جو شکوک و شبہات تھے ان کو مغل دور حکومت میں دور کیا گیا۔

بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ نے ہندو دیوتاؤں پر نظمیں کہیں اور ہندستانی موسیقی پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔ موسیقی میں ہم امیر خسرو کی ایجادات سے آج بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں اور پنڈت روی شنکر آج بھی اس ستار کو بخوبی بجا رہے ہیں جس کی ایجاد امیر خسرو نے کی تھی روی شنکر کی موسیقی میں نفرت کی گونج کوئی نہیں تلاش کر سکتا۔

یہ ساری علامتیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ قومی ہم آہنگی صرف ایک احساس نہیں ہے بلکہ ایک ثقافتی ضرورت ہے۔ اپنی تہذیبی اقدار کو ہر نسل میں نئے سرے سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن آج پیار سے کہیں زیادہ نفرت پر زور دیا جا رہا ہے۔ غلطی سے نفرت کو بہادری سمجھ لیا گیا ہے۔ نفرت ہمارے دل و دماغ کو پتھر بنا دیتی ہے، جب ہم کسی دوسرے مذہب سے نفرت کرنے لگتے ہیں تو ہمارا یقین خود اپنے مذہب سے اٹھتا جاتا ہے۔ نفرت وہ آگ ہے جو اس آدمی کو بھی جلا کر راکھ کر دیتی ہے جو اسے لگاتا ہے۔

ہمیں رواداری اور پیار کی نصیحت نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیں پہلے ان باتوں کو خود اپنی زندگی میں اپنانا چاہیے۔

(ترجمہ و تلخیص: نرگس خورشید)

"اہنسا ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم دوسروں کے مذاہب کی بھی ویسی ہی عزت کریں جیسی ہم اپنے مذہب کی کرتے ہیں"

—— مہاتما گاندھی



سبط محمد نقوی
چیف ایڈیٹر 'ہماری توحید' (ہندی)
ماہنامہ غفرانمآب، لکھنؤ

قومی یکجہتی - ایک بنیادی ضرورت

کوئی ملک یا قوم ہو، یک جہتی اس کی ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر امن و سکون کی توقع نہیں کی جا سکتی اور امن و سکون کے بغیر سماجی، معاشی اور سیاسی استحکام و استقلال کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر ہندستان کے ایسے بہت سے مذہبوں زبانوں اور نسلی طبقوں والے طویل و عریض ملک میں جہاں ہندو، مسلم سکھ، عیسائی، مسجد، مندر، ہندی، اردو، بنگلہ، تمل، تیلگو، مراٹھی کنڑ، شمالی، جنوبی، فارورڈ، بیک ورڈ، دریا، شہر، پنجاب، کشمیر جھارکھنڈ ایسے ان گنت سوال ہوں جو بڑی آسانی سے نہایت خطرناک حد تک یک جہتی سوز و امن شکن بنائے جا سکتے ہوں۔

لیکن نہایت فکرمندی کی بات ہے کہ اس سوال پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی توجہ کا یہ مستحق تھا اور جو کچھ توجہ دی گئی وہ بھی ایسے انداز میں کہ قومی یک جہتی کا فروغ قومی احتیاج نہیں بلکہ اقلیتوں کیلئے حفاظتی کارروائی بن گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس شدت سے قومی یک جہتی کے فروغ کے چرچے ہوئے اس سے کئی گنا شدت کے ساتھ اس کی خاموش مگر موثر مخالفت کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عملی زندگی میں اس جذبے کا فروغ تو کیا ہوتا اسے نظریاتی طور پر بھی مستحکم اساس مہیا نہیں کی جا سکی۔

آج جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ یہی ہے کہ اس نظریے کو ہم فکری اساس مہیا کریں جس سے یہ قوم کا "عقیدہ" بن سکے۔ لائحہ عمل بنانے کی منزل ثانوی ہے۔ اسے ایک جذباتی رومان لینا اور "عقیدہ" کا رتبہ نہ دینا ایک مہلک فروگذاشت ہوگی۔

ویسے تو ہندستان کی تاریخ اہنسا اور بقائے باہم کی تاریخ ہے ایسی تاریخ اقوام عالم میں، جس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ لیکن اس ملک نے قومی یک جہتی کے نادر و کمیاب نمونے ماضی قریب میں بھی پیش کیے ہیں۔ یہ وہ مبارک زمانہ تھا، جب انڈین نیشنل کانگریس اور مجلس خلافت متحد ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح بدیسی سرکار کے خلاف منظم ہو گئی تھیں جس کی مثال اہل مزاح "مشت خاک اور آندھی کے ساتھ" سے دیتے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ اس دور کے مسلم رہنماؤں نے حکیم اجمل خاں کی سرکردگی میں گائے کا ذبیحہ اور قربانی "حرام" قرار دے دی تھی اور برطانوی حکومت گائے کی قربانی پر اس درجہ مصر تھی کہ گائے قصاب "خان بہادری" کے خطاب کا وعدہ اور پانچ ہزار روپیہ کا نقد انعام لے کر "شاہی حکام" دہلی کی گلیوں میں تلاش کرتے پھرتے تھے اور کوئی مسلمان ایسا ہاتھ نہ لگ سکا جو اس خون کا دھبہ اپنے دامن پر لگنے کا روادار ہوتا۔

ظاہر ہے کہ سات سمندر پار کی بدیسی قوم کی اس وسیع و عظیم ملک پر حکمرانی کی جڑ ہی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کی حکمت عملی تھی۔ یہ بے مثال یک جہتی لازوال بن جاتی تو برطانوی اقتدار کے زوال اور ملک کے استقلال میں کیا کسر رہ جاتی۔ اس لیئے جتنی لمبی سانس کھینچی تھی، اتنی گہری ہوک گئی۔ برطانوی سنتا اور اس کے دلال اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں جٹ گئے اور پھر.... کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے والے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے آمنے سامنے آ گئے۔ اسے زبردست المیہ سمجھنا چاہیے کہ یک جہتی کو نشانۂ ستم بنانے کی اس منظم مہم کا سامنا

کرنے کی موثر تدبیر — کم سے کم فکری سطح پر — نہیں کی گئی۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہی ہے کہ جس ملک کے مزاج میں اہنسا رچی بسی تھی، جس کی پوری تحریک آزادی عدم تشدد کی بنیاد پر چلائی گئی تھی اس کی آزادی ملک کی تقسیم، خون، آنسو، ہجرت اور آہ و کراہ کے جلو میں آئی، اور اس کے زہریلے اور یک جہتی سوز امن شکن اثرات قومی زندگی میں جاری و ساری ہیں

قومی یک جہتی کو سب سے زیادہ نقصان "قومیت" کی تعریف نے پہونچایا۔ قومیت کے تشکیلی عناصر کو اس قدر وسعت دی گئی اور اس کا دائرہ اتنا تنگ ہوگیا کہ اقلیتوں کا تشخص امتیاز طریقۂ عبادت کے سوا کچھ بچا ہی نہیں۔ حالانکہ اقلیتوں کے اپنے مذہبی اور ثقافتی تشخص تھے، جن کے ساتھ وہ ہزاروں سال سے ملکی مفادات سے ٹکرائے بغیر زندگی بسر کر رہے تھے۔ قومی یک جہتی کی جوت اگر دلوں میں جگانا ہے تو "قومیت" کی تعریف فراخ دلی اور کشادہ نظری کے ساتھ کرنا ہوگی جس سے گھٹن محسوس کیے بغیر اقلیتیں قومی دھارے میں بہنے کی لذت پاسکیں۔

ایک اور اہم مسئلہ زبان کا مسئلہ ہے۔ ہندی بلاشبہ کثیر التعداد ہندستانیوں کی زبان ہے۔ آئین سازوں نے اسے قومی رابطے کی زبان کا، دوسری قومی زبانوں کے لیے مناسب تحفظات کے ساتھ جو رتبہ دیا ہے وہ کسی طرح بے جا یا نادرست نہیں۔ لیکن اس مسئلے میں ہندی والوں نے جس شدت پسندی کا مظاہرہ کیا، اس کے ردعمل کی زد میں ہندی کی مقبولیت سب سے زیادہ آئی۔ قومی یک جہتی کے مسئلے پر غور کرتے وقت اس بارے میں بھی سوچنا اولیات میں سے ہے۔

یقیناً جماعتی تشخص کے علاوہ بھی اقلیتوں کے مسائل ہیں جن پر بے لاگ اور متوازن انداز میں نتیجہ خیز حد تک غور و خوض نہیں ہوا۔ روزگار کا مسئلہ خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ روزی روٹی ایسی اولین ضرورت عقدہ لاینحل بن کے رہ گئی ہے۔ محروم طبقے کو غلط فہمی ہے کہ روٹی اور روزگار فرقہ واریت سے مربوط ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ .... اس غلط فہمی نے قومی یک جہتی کے آئینے کو بہت نقصان پہونچایا۔

اس غلطی اور غلط فہمی دونوں کا ازالہ بھی ممکن تھا اگر مسلم اقلیت میں سماجی کارکن ہوتے، ان میں لیڈروں کی جتنی کثرت ہے ٹھوس سماجی کام کرنے والے اتنے ہی کمیاب ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی اقلیت میں کچھ باشعور، دردمند، مہم جو اور متوکل سماجی کارکن پیدا ہو سکیں تو قومی یک جہتی کے مضبوط ہونے میں مدد ملے گی۔ یہی نہیں اقلیتوں کو دنیا کی ہوا کا رُخ اور ملک کے حالات کو پہچاننا بھی لازمی ہے۔ "لڑاؤ اور راج کرو" کی حکمت عملی والے اقتدار سے ملک آزاد ہو چکا ہے۔ ملک میں ایک دستاویزی آئین برسرعمل ہے، جس میں فرد اور جماعت سبھی کے حقوق کی صراحت موجود ہے۔ ملک میں بالغ رائے دہی کا حق تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ایسے میں کسی سرکار کے لیے بھی اکثریت کے حقوق کا استحصال کرکے اقلیتوں کو خوش کرنا کیسے ممکن ہے؟ سرکار ایسا کرنے پر آمادہ بھی ہوجائے تو ہماری عدلیہ دستور شکنی کی اجازت کیسے دے گی؟ ان سوالات کا منطقی و مدلل جواب ہی قومی یک جہتی کی پونجی ہے۔ اگر یہ راس المال تلف ہو گیا تو قومی یک جہتی کا خزانہ لٹ جائے گا۔ یہ خزانہ لٹا تو امن و سکون غارت ہوجائے گا۔ امن و سکون کا غارت ہونا ہی تباہی کا پیغام ہے۔

□□

ایکتا

• ہمارے ملک میں مذہب الگ الگ ضرور ہیں، نظریات الگ الگ ہیں لیکن خدا ایک ہے اور ہم سب اسی ایشور یا خدا کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ہماری انسانیت اور اس کی اعلا قدریں ایک ہیں اسی لیے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر بھائی بہنوں کی طرح رہنا چاہیے؟

—— فادر اوسوالڈ لیوس



پروفیسر سید محمود الحسن
صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

جدید اردو شاعری میں سیکولر روایات

تاریخ انسانی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مہذب سماج میں زندگی بسر کرنے کا سب سے بڑا سلیقہ یہی رہا ہے کہ ہر فرد خود زندہ رہے اور دوسروں کو زندہ رہنے کا موقع دے البتہ جیسے جیسے تہذیبی ارتقا کی رفتار تیز ہوتی گئی جیسے جیسے ذہن و دماغ کی وسعت کے ساتھ مہذب زندگی کے تقاضے آگے بڑھتے رہے اسی لحاظ سے زندگی کی اعلا قدروں کا معیار بھی بلند ہوتا رہا۔ کبھی رشیوں، منیوں اور مفکروں نے انسانیت کی اعلا قدروں پر زور دیکر اسے سکون حاصل کرنے کے ذرائع سے روشناس کرایا کبھی سیاسی رہنماؤں اور قومی مصلحین نے قومیت اور اجتماعی تصورات کے پیمانے مقرر کیے لیکن ہر طرز فکر میں تہذیبی عظمت و بلندی کے لیے جن عناصر کو بنیادی حیثیت دی گئی وہ یہ ہیں کہ انسانی مساوات، ظلم و جور سے نفرت، اتحاد و اتفاق، اقتصادی برابری، فرقہ وارانہ یگانگت اور علاقائی یکجہتی کی ایسی تبلیغ کی جائے جس کے ذریعہ تمدن اپنے ارتقا کی آخری منزل تک پہونچ سکے۔ اس طرح انفرادی فطرت کے اختلات کے باوجود ان تصورات کی ہم آہنگی انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب رکھتی ہے اسی سلسلے میں مذہبی آزادی اور فرد کے ذاتی و انفرادی اعتقادات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں مذہب سے دوری کا تصور کار فرما نہیں ہوتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ مذہب کی یہ آزادی دوسروں کے مذہبی اعتقادات کے برتنے میں حائل نہ ہو اور اسے سیاست سے الگ رکھا جائے۔ انھیں تصورات کو وسیع معنوں میں سیکولرازم کی اصطلاح قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے سید سبط حسن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

> "سیکولرازم کی بنیاد اس کلیے پر قائم ہے کہ ضمیر و فکر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ لہذا ہر فرد بشر کو اس کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل پر خواہ ان کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب و اخلاق سے۔ فلسفہ و حکمت سے ہو یا ادب و فن سے، اپنے خیالات کی بلاخوف و خطر ترویج کرے۔ طاقت کے زور سے کسی کا منھ بند کرنا یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا، حقوق انسانی کے منافی ہے اور اس بات کا اقرار بھی ہے کہ بحث و مباحثے میں ہم اپنے حریف کی دلیلوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں"۔

چنانچہ علم و سائنس کی ترقی نے ان تصورات کو زیادہ اہمیت بخشی ا موجودہ دور کے فلسفۂ حیات کی رو سے اسی کو سیکولر نظام معاشر

کہا گیا جہاں کسی طرح کے مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلافات یا سماج کے کسی گروہ سے نفرت و دشمنی کی گنجائش موجود نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ اختلافات یکسر مٹ جاتے ہیں لیکن یہ تصادم جہالت اور وسیع النظری، نظم و ضبط اور ہیجان و بے چینی کے درمیان ہوتا ہے یعنی معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے اس طرح نہ تو لسانی، مذہبی، علاقائی یا رنگ و نسل کا امتیاز باقی رہتا ہے نہ فرد اور سماج میں کسی قسم کی کشمکش محسوس کی جاتی ہے یعنی اگر سیکولر نظریے کی پابندی کی جائے تو بعض اختلافات کے باوجود ایک طرح کی یکجہتی اور یگانگت برقرار رہتی ہے جہاں سطحی اور غیر حقیقی عقائد کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس طرح انسانیت کے گہوارہ کا دامن بھی وسیع ہو سکتا ہے اور کمزور اور مظلوم افراد میں عزم و استقلال کے جذبات بھی ابھر سکتے ہیں۔

ہندوستان تہذیب و تمدن اور علم و فن کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ فلسفیوں اور مفکرین نے ایسے نظریات و افکار کی اشاعت کی تاکہ آپس میں ہمہ گیر محبت اور اتحاد و اتفاق کے عناصر عوام کے دلوں میں جگہ بنا سکیں یہاں سادگی میں بھی بلند تصورات کو مقبول بنانے پر زور دیا گیا، اور رواداری، اخوت، انسانی فلاح و بہبود کے اعلا اصول سمجھے گئے۔ یہ تصورات بھگتی طرز فکر میں بھی رائج تھے اور صوفیائے کرام کے نظریات میں بھی اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان دونوں فکری دھاروں میں گہری یکسانیت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ تصورات محض عام تہذیب اور معاشرے میں اہمیت نہیں حاصل کر چکے تھے بلکہ مختلف فنون میں ان کی عکاسی نظر آتی ہے۔ فن تعمیر، موسیقی، مصوری ہر ایک کے ذریعہ یکجہتی اور ہم آہنگی کے رجحان کو قوت بخشی گئی اور ہر ایک کے ذریعہ زندگی کے حقائق کی ترجمانی اور اس کی تلاش کو مقصد قرار دیا گیا اور سب سے بڑھ کر شعر و ادب کے ذریعہ ان نظریات کی اشاعت پر توجہ دی گئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہندوستان کی طرز زندگی اور معاشرے کے بنیادی تصورات سوائے اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی و یکجہتی کے کسی طرح کی نفرت یا نفاق سے تعلق نہیں رکھتے۔ کبیر اور سورداس کے دوہے ہوں یا میرا بائی کے بھجن، جائسی کی شعری تخلیقات ہوں یا تلسی داس کے اقوال، کالی داس کے ناٹکوں کے کردار ہوں یا پنچ تنتر کی کہانیاں۔ ان تمام تخلیقات میں ہندوستان کی زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے اور ہر جگہ زندگی کا حسن اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں انسانیت کی تابناکی اور اس کی مسرتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے پس منظر میں یہی احساسات حاوی ہیں کہ نفرت و نفاق کی گنجائش زندگی کو پرسکون بنانے میں نہیں ہو سکتی۔

اردو شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب اور اس کی اعلا قدروں کی ترجمانی ہر دور میں ہوتی رہی جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور اجتماعی طرز زندگی کے شعور کو زیادہ سے زیادہ تقویت بخشی جائے اور اس کی تبلیغ بھی کی جائے اسی لیے شاعری کے ہر دور میں وسیع المشربی، مذہبی رواداری اور یکجہتی کی مثالیں آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں اور جیسے جیسے تہذیبی زندگی اور موجودہ دور کے مطالبے اس کی تبلیغ کی ضرورت محسوس کرنے لگے، یہ خیالات زیادہ اہمیت اختیار کرتے گئے۔

نظیر اکبر آبادی نے ہندوستان کے موسم ہولی، بسنت، دیوالی اور عید وغیرہ تہواروں، یہاں کے میلوں، ٹھیلوں اور آدمی، روٹی اور مفلسی ایسی نظمیں کہہ کر انسان دوستی، ہمدردی اور رواداری کے جذبات کی ترجمانی کی۔ اس کے بعد لکھنؤ اور دہلی ان دونوں مرکزوں میں ان شعرا کو مقبولیت حاصل رہی جنھوں نے غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ تہذیبی عناصر کی ترجمانی پر توجہ دی۔ یہ شعرا انسان پرستی اور انسان دوستی ہی کو فن کا مقصد سمجھتے تھے، جہاں اتحاد و اتفاق ہی کے ذریعہ انصاف کی آواز بلند ہو سکتی ہے۔ آتش نے اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا ؎

ہوائے دہر اگر انصاف پر آئے تو سن لینا
گل و بلبل چمن میں ہوں گے باہر باغباں ہوگا

اسی طرح صبا لکھنوی اس بات کی تبلیغ کر رہے تھے کہ ؎



کفر و اسلام کے جھگڑے کو چکا دو صاحب
جنگ آپس میں کریں شیخ و برہمن کب تک

غالب نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں ان خیالات کا اظہار کیا ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اسی طرح محمد حسین آزاد، حالی، اکبر، درگا سہائے سرور، جگت موہن لال رواں اور بہت سے شعراء نے اخوت، بھائی چارے اور قومی اتحاد و اتفاق پر زور دینے کے علاوہ اس بات کی تلقین کی کہ مختلف مذاہب میں امتیاز نہ برتا جائے لیکن جیسے جیسے قومیت اور آفاقیت کے نظریات وسیع ہوتے گئے، انسانی شعور جیسے جیسے پختہ ہوتا گیا، سیاسی اور سماجی تصورات میں جتنی پیچیدگی پیدا ہوتی رہی — اور فلسفیانہ کاوشوں نے جس قدر ہم آہنگی اور یگانگت کے نظریات پیدا کیے اردو شعراء کی تخلیقات میں بھی ان موضوعات کو وسعت ملتی رہی۔ چنانچہ جدید اردو شعراء محدود روایات سے ذہنی آزادی کے ساتھ ایسے سیکولر رجحانات کی ترجمانی پر بھی متوجہ ہو گئے جو نئے معاشرے سے ہم آہنگ ہوں، زندگی میں نئی آب و تاب پیدا کر سکیں، اور جس میں روشن اور شاندار مستقبل کی نشاندہی موجود ہو، اس سلسلے میں سب سے پہلے اقبال نے گزشتہ عظمت کا احساس دلا کر معاشرے کی جدید نوعیت کی طرف متوجہ کیا جس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی خود اعتمادی اور توانائی حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تھی، چنانچہ ان کا یہ شعر ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس پہلو کی طرف واضح طور پر اشارہ کر رہا ہے کہ ملک و قوم کی ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ انفرادی آزادیِ فکر کے باوجود وطن کی عظمت اور بلندی پر فخر کرنا لازمی ہے۔

چکبست نے اگر ان خیالات کا اظہار کیا کہ ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

تو اسی کے ساتھ مذہبی رسوم و قیود سے آزاد ہو کر ایسی فضا میں سانس لینا چاہا جہاں سوائے رواداری اور وسیع المشربی کے کچھ اور نہ ہو ؎

شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے
کچھ سمجھ کر ہم شریکِ بزمِ رنداں ہو گئے

آزادیِ ہند سے قبل شعراء سیاسی طور پر ایسی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے کہ ان سے ان کیفیات کے اظہار سے زیادہ متحد ہم رنگی کے تقاضے نہیں کیے جا سکتے لیکن جب یہاں کے جمہوری نظام میں سیکولر نظریے کو مخصوص حیثیت حاصل ہو گئی تو جدید شعراء نے اپنی فکری اور فنی کاوشوں سے نہ صرف یکجہتی اور اجتماعی و تہذیبی ہم آہنگی کی تبلیغ کی بلکہ اردو کا تقریباً ہر شاعر اس کوشش میں شریک ہو گیا کہ مذہب و ملت، ذات و فرقہ، طبقات، علاقائیت، لسانی اور طبقاتی ان مختلف بنیادوں پر انسانیت اور قومیت کی ترقی میں جو خلیج حائل ہے اسے دور کر کے نئے امکانات روشن کیے جائیں۔ مجموعی طور پر جدید دور کا ہر شاعر ایک نئے نظامِ معاشرت کو مرتب کرنے کی ذمہ داری محسوس کر رہا ہے اور اس طرف متوجہ ہے کہ قومی تہذیبی زندگی کو زیادہ سے زیادہ روشن اور تابناک بنایا جائے۔ عام طور سے ان سب کے احساسات و جذبات کا بنیادی تصور یہی ہے کہ تنگ نظری، تعصب اور نفرت و مفاد پرستی، یہ ایسے خطرناک رجحانات ہیں جن سے سوا تباہی و بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اس کے خلاف آواز بلند کر کے اتحاد و اتفاق اور میل و محبت کے سوتے پیدا کیے جائیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ ذہنی وسعت کے ذریعہ فراخ دلی اور رواداری کی تبلیغ کی جائے جس سے محبت و اخوت کا پیغام عام ہو سکے۔ ان کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن ہے جب توہم پرستی، فرسودہ روایات اور تنگ نظری کے بجائے روشن خیالی کے احسا

عام ہوں اور اسی کے ذریعہ انسان دوستی کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ان تصورات کی تبلیغ سے تاریکی کو دور کر کے انسانیت کو روشنی اور تابناکی حاصل ہو سکتی ہے۔ جدید شعرا میں اس طرح کے تصورات کی مثالیں جوش ملیح آبادی کے یہاں سب سے پہلے نظر آتی ہیں لیکن ان کے علاوہ دوسرے شاعروں نے بھی ان نظریات کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے بلکہ استعاروں اور علامتوں کا سہارا لے کر غزلوں کے ذریعہ بھی ان کی اشاعت پر زور دیا گیا ہے۔ فراق نے ارتقائے تہذیب پر اس طرح اعتقاد کا اظہار کیا کہ ؎

اے نظامِ کہن پتہ آہٹ لے
وہ دبے پاؤں موت آئی دیکھ

بنتی ہے حبابِ دل کئی ہے دنیا
ملتی ہیں بہت کچھ اس کی بھی مثالیں

آنند نرائن ملا نے جذبۂ قومیت کو ان الفاظ میں ابھارا کہ ؎

وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے
نہ مذہب ہم سمجھتے ہیں نہ ملت ہم سمجھتے ہیں

اور علی سردار جعفری نے انسانوں کے دکھ درد کا مداوا ان الفاظ میں تلاش کیا کہ ؎

امانتِ غمِ انساں امانتِ غمِ دل
یہ اک چراغ ہے قندیلِ مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

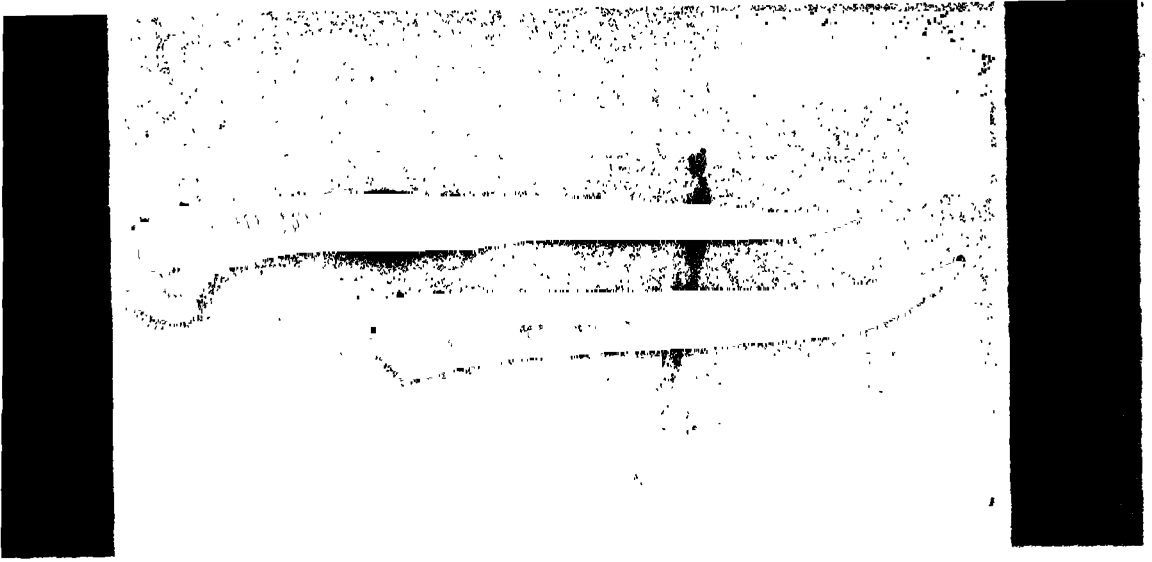
اور اسی طرح مجروح سلطان پوری، تلوک چند محروم، سکندر علی وجد، مجاز، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، میراجی، کیفی اعظمی، تاباں، سلام مچھلی شہری، جذبی، روش، جاں نثار اختر، شمیم کرہانی، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، وامق جونپوری، علی جواد زیدی اور جمیل مظہری وغیرہ کی نظموں اور غزلوں میں مختلف انداز میں یہ احساسات پیش کیے گئے ہیں کہ انسان اور انسان کے انفرادی اختلافات وہ چاہے مذہبی ہوں یا طبقاتی، تہذیبی زندگی کے ارتقا میں شدید رکاوٹ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ تیس برسوں میں جن شعرا کی نئی تخلیقات کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں زبیر رضوی، نازش پرتاپ گڑھی، ساغر مہدی، ندا فاضلی، بلراج کومل اور شہریار کے علاوہ بہت سے ایسے شعرا کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے سیکولر روایات کو آگے بڑھانے پر توجہ دی۔ اور اس طرح نظریات و تصورات کے ساتھ آج کا شاعر اپنے عہد سے جتنا قریب ہوتا جاتا ہے اس کی تخلیقات میں یہ عناصر زیادہ واضح شکل میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ ان سب نے مذہبی شدت پسندی سے انحراف بھی کیا اور جمہوریت کی قدروں، تہذیبی آزادی، ذات پات کی تفریق سے مخالفت، فرقہ وارانہ دیوانگی سے نفرت کے لیے آواز بلند کر کے متحدہ انسانیت کے احساسات پیدا کرنے پر زور دیا۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ مذہب کی اعلا قدروں کی اشاعت غلط نہیں ہے لیکن اگر کسی تخلیق سے فرقہ واریت کی تبلیغ ہوتی ہے تو وہ انسانیت کی بہت بڑی دشمن ہوگی جس سے معاشرت کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ایک اچھے ادیب اور شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر مذہب و ملت کے انسان کی خوش حالی اور سکون اور عالمگیر نظامِ انسانیت کی تشکیل پر توجہ دے تاکہ اس کے فن کے ذریعہ تہذیبی زندگی کی اعلا قدروں کی اشاعت ہو سکے۔ دورِ جدید کے اردو شعرا میں اس کی مثالیں تقریباً ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی شاعری میں مظلومیت کی آواز بھی سنائی دیتی ہے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے عزم و استقلال کا جذبہ بھی۔ وہ مشترکہ تہذیب کے خد و خال کی اشاعت بھی کرتے ہیں اور اجتماعی آزادی کی تبلیغ بھی۔ انھوں نے پوری طرح محسوس کر لیا ہے کہ فنی قدروں کو آگے بڑھانے میں ان کی ذمہ داری کس حد تک ہے اور اپنے نغموں سے وہ کس طرح انفرادی و اجتماعی زندگی کو حسن کی آب و تاب سے جلا دے سکتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ایک عظیم الشان اور روشن مستقبل کی نشان دہی کرتی ہیں جن کے ذریعہ قومی اور تہذیبی زندگی میں سکون و اطمینان کی ایسی لہر پیدا ہو سکتی ہے جہاں ہر فرد مسرت و شادمانی محسوس کر سکتا ہے۔ یہ سب سیکولر نظریات کی دین ہیں جو اندھیرے میں بھی روشنی کی کرن بن کر تہذیب کو





تصویر بشکریہ
آرکیولوجیکل سروے۔

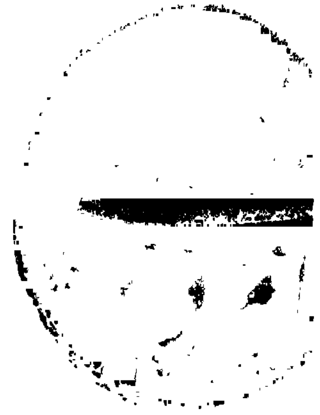


اٹھارھویں صدی کا راجستھان کا ایک خنجر جس پر قیمتی ھیرے اور جواھرات جڑے ھوئے ھیں ۔ یہ جنگ کرنے یا خون بہانے کے لئے نہیں تھا بلکہ تحفہ کے طور پر پیش کیا جاتا تھا تاکہ آپسی دوستی اور محبّت کو فروغ حاصل ھو۔

(تصویر بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی)





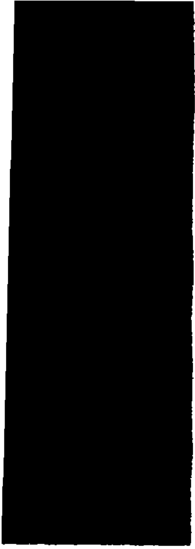


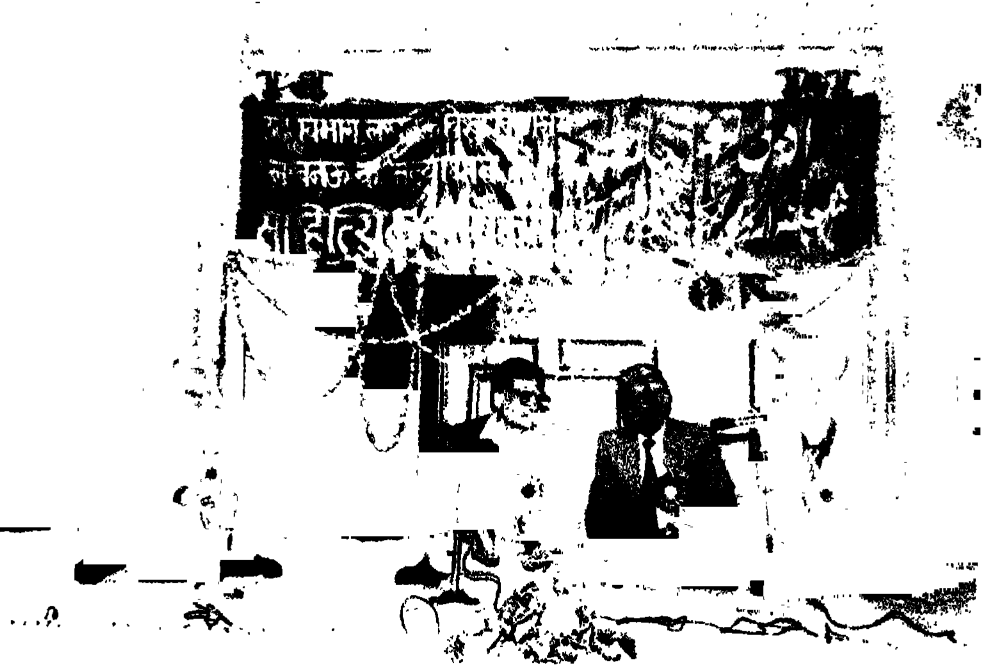
بسم الله الرحمن الرحیم



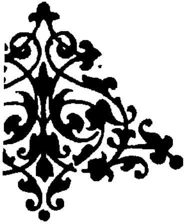


لایق العنایه والاحسان ...
شامانه امیدوار بوده بداند که چون ...
مراحم ذاتی و مکارم جبلی همت والانهمت و تمامی نیت حق طویت بر رعایت ...
انتظام احوال طبقات خواص و عوام مصروف و از روی شرع شریف و ملت حنیف ...
که دیرها و دیرنشینان [illegible] نشود و تکیه‌ها تازه بنا نیابد و در این ایام معدلت ...
بعرض اشرف اقدس ارفع اعلی رسیده که بعض مردم از راه عنف و تعدی ...
و برخی کنند و دیگر که بنواحی آن [illegible] و جماعه ارمنیان [illegible] آنحال که ...
قدیم آنجا با آنها تعلق دارد مزاحم و متعرض میشوند و میخواهند که اینها را از ...
آنکه از مدت مدید با آنها متعلق است بازخواهند و [illegible] باعث پریشانی و ...
لهذا الحکم والاعلی [illegible] این منشور لامع النور [illegible]
بجناب [illegible] دیگر منع [illegible]
ایام [illegible] دولت [illegible]
ایام [illegible] ثانیه سنه [illegible] هجری





شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ ادبی تقریبات کا ایک منظر
تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر نیر مسعود (صدر شعبۂ فارسی)، پروفیسر سیّد
محمود الحسن (صدر شعبۂ اُردو)، پروفیسر مہندر سنگھ سوڈھا (وائس چانسلر) ۔ اور
جسٹس مرتضیٰ حسین کو دیکھا جا سکتا ہے ۔







راجیش شرما
سوچنا بھون لکھنؤ

بقائے باہم کی سرزمین: ہندستان

جو لوگ اپنی زندگی میں ہی مثال بن جاتے ہیں وہ واقعی عظیم ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ سماج کے رہنما ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کی یاد سے ہماری امیدوں، ارمانوں، مسرّتوں اور غموں کو تقویت ملتی ہے۔ ہمارے عظیم رشیوں نے زبردست ریاضت کے بعد جس مذہب اور تہذیب کی عمارت تعمیر کی وہ آج بھی اسی شان و شوکت کے ساتھ کھڑی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کئی مذہب وجود میں آئے اور کچھ دیگر مذاہب باہر سے آنے والے لوگ اپنے ساتھ لائے۔ ان سبھی کے ساتھ جو بقائے باہم کا احساس پیدا ہوا، وہ بھی ہمارے رگ و پے میں پیوست ہے۔ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جس کے اتحاد کا بنیادی تصور سبھی مذاہب کو ایک نجی کام سمجھتا ہے۔ اسی یقین کی بنا پر الگ الگ راستوں پر چل کر بھی انسان اس اصول تک پہونچتا ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہ انسان کو بہترین زندگی کی تعلیم دیتا ہے ۔۔۔۔

اسی سلسلے میں مختلف تہذیبوں، فنون اور موسیقی نے گزشتہ پانچ ہزار سالوں میں ہندستان کو جس طرح روشن اور منور کیا اسی کی بنا پر یہ عظیم ملک دنیا میں ایک منفرد حیثیت اختیار کر گیا۔ سبھی مذاہب کے فن کاروں نے اسے وہ نیا انوکھا اور بے مثال قوس قزحی رنگ عطا کیا جس کی طرف ساری دنیا صدیوں سے کھنچتی چلی آرہی ہے اور نوع انسانی کو ہر خطرے سے نجات دلانے کے لیے دنیا نے ہندستان ہی کی جانب دیکھا ہے۔

یہ ملک اپنے جلال و کمال میں تابناک سورج کی طرح ہے تو اس میں چودھویں رات کے چاند کی گنگا میں پڑتی ہوئی نورانیت بھی ہے۔ خواہ موسم ہو یا ہوائیں، معدنیات ہوں یا جغرافیہ، زبانیں ہوں یا مذاہب، لباس ہوں یا رسم و رواج، ایسا پرکشش کوئی دوسرا ملک نہیں ہے ہندستان کیا ہے؟ یہ بذات خود رواداری کی ایک دنیا ہے۔ ہندستان کو دیکھنا رواداری کی اس مکمل دنیا کو دیکھنا ہے جو باقی دنیا کے لئے ایک اسرار بھی ہے اور ایک تحریک بھی۔ آپ اپنے ملک کے صرف نقشے کو دیکھیں جب بھی اس کے تصور سے جوش سے بھر جائیں گے ہمالیہ کی تیس ہزار فٹ کی اونچائیوں سے لے کر انڈمان نکوبار کے شفاف سمندر اور کنیا کماری کی چھیلی پرکشش رنگا رنگی۔ جہاں ہمالیہ کی اونچائیاں اور سمندر کی شفافت وسعتیں ہوں، جہاں درختوں کی اتنی قسمیں ہوں کہ شمار نہ کی جا سکیں اور تنہا گڑھوال کی پھولوں کی وادی کو ہی رنگوں کا ابے مثال تنوع ملا ہو کہ جنّت کا تصوّر بھی ماند پڑ جائے۔ جہاں کا آرٹ کلچر اور موسیقی لاثانی ہو۔ جہاں عمارتوں کی عمارت اور محبت کے آنسوؤں سے نم اور خلا میں ہمارے خوابوں کی طرح کانپتا ہوا محلوں کا محل تاج محل ہو، جہاں کا آسمان اتنے رنگ بدلتا ہو اور ہزاروں میل کی لمبی اڑان کے بعد جہاں سائبریا سے چل کر پرندے ہوا خوری کیے آتے ہوں، جہاں کا صرف ایک پرندہ مور ہی دنیا کے پرندوں میں شہنشاہ کی حیثیت رکھتا ہو اور جو اپنی سربلندی، اپنے قدموں کے ا اور رنگوں کی چمک دمک میں سارے پرندوں سے برتر ہو اور اس کے ساتھ ہی اتنا وسیع القلب کہ گھنے جنگلوں سے لے کر گاؤں کے آنگن تک دوستی بانٹتا ہو۔ وہ کیسا بے مثال ملک ہوگا اس



نغمے یا تصور ہمارے دل میں گدگدی پیدا کردیتا ہے۔ اور پھر مختلف لباس، ہزاروں قسم کے رواج، تیج تہوار، سیکڑوں میلے، دیوی دیوتاؤں، درختوں، پودوں کے ساتھ بقائے باہم کا تصور صرف ہندوستان میں ہی ممکن ہے جہاں گورے، کالے، پیلے، سانولے سبھی رنگوں کے لوگ کاندھے سے کاندھا ملا کر جدوجہد کر رہے ہوں، جہاں رہتے ہوں، ان کے اتحاد کی چادر کون تار تار کرسکتا ہے۔

اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ اس عظیم خواب کا راز کیا ہے تو دو لفظوں میں اس کا جواب ہوگا — رواداری اور ایک دوسرے کی عزت کرنا — یہی وہ اصول ہے جو قدرت کی انوکھی دولت کی طرح صرف ہندوستان کو ملا ہے۔ اسی کو آج دنیا دیکھتی ہے اور حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

آدھی دنیا سے زیادہ آبادی والے ایشیا کے دو ملکوں میں آج دو طرح کے تجربے ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں جمہوریت کسوٹی پر ہے اور چین میں ایک دوسری طرح کے نظام سے اتحاد قائم کیا گیا ہے۔ ایسی صورت حال میں عالمی سطح پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان ہی ایک ایسا واحد ملک ہے جہاں جمہوریت کے توسط سے بات چیت، بحث مباحثہ، رواداری، برداشت اور ایک دوسرے کے اعتقادات کا احترام کرتے ہوئے اتحاد کا بے مثال تجربہ ہو رہا ہے۔ اس ملک کا قانون، آئین، مذہب، تہذیب، کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کی اجازت دیتا ہو۔ انسان کی اخلاقی اور سماجی آزادی کی اس لڑائی کو کیا ہم ناکام ہو جانے دیں گے؟

جمہوریت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تعریف سے بہتر کوئی دوسری تعریف نہیں ہے کہ "رواداری ہی جمہوریت ہے" یہ صرف ایک تعریف نہیں ہے بلکہ اس ملک کی دولت بھی ہے۔ صرف یہی وہ ملک ہے جہاں عورت کو عورت کے طور پر، بے روزگار کو بے روزگار کے طور پر اور غریب کو غریب کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔

ہمارے سارے مذاہب عورت کی عزت کی حفاظت کرنے لوگوں کو برابری کا حق دینے، رحم اور محبت کی ایسی دنیا بسانے کی ترغیب دیتے ہیں جس میں چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی چین سے رہ سکے۔

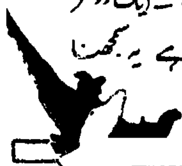
آزادی کے گیت ہم سیکڑوں سال سے گاتے آئے ہیں...
لیکن گیت اور سنگیت کے ان سروں کو فسادات، حسد اور نفرت نے بار بار مجروح کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ فسادات کی تاریخ یہی ہے کہ اس میں اکیلا اور بے سہارا آدمی ہی مارا جاتا ہے اس کی جان کی قیمت کے بارے میں کیا کہا جائے۔ سماجی نفرت کا شکار اس کی روزی روٹی بھی ہوتی ہے۔

ہندوستان اپنی بنیادی شکل اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بے حساب قیمت ادا کرچکا ہے۔ سیکڑوں سالوں میں وید ویدانت کی وسیع النظری، قرآن کے بھائی چارے، نانک کی رواداری کے نظریے نے اسے بار بار بچایا۔ قرون وسطیٰ کی کٹر پسندی سے صوفی سنتوں اور فقیروں نے اسے بچایا اور ملی جلی تہذیب کو فروغ دینے میں اپنا سب کچھ، سانس کا آخری حصہ تک نچھاور کر دیا۔ یہ ایک عظیم انقلاب تھا بغیر فوجی یا اقتدار کی تلوار کا سہارا لیئے بغیر قانون یا کسی آئین کی تعزیرات کا سہارا لیے۔ زبردست طوفان کی جانب بڑھتی ہوئی دنش کی ناؤ کو وہ صوفی سنت اپنی عبادت، ریاضت، محبت اور میل جول کے پتواروں سے حفاظت کے ساتھ کنارے تک نکال لائے۔ اسی سے مذہب کی عظمت کے پہلو ظاہر ہوئے۔ اسی سے مذہب کسوٹی پر کھرا اترا اور ہندوستانیت کی عظمت ظاہر ہوئی۔

اسی سے موسیقی آرٹ اور فنون کے میدانوں میں وہ بے مثال اتحاد قائم ہوا جس کو دیکھ کر دنیا حیرت میں پڑ جاتی ہے اور جس پر ہمیں ناز ہے۔ اسی بات کو سمجھ کر اقبال نے اپنے منفرد انداز میں کہا تھا کہ۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

آج پھر ہم کسوٹی پر ہیں۔ ہم پھر ذات پات اور فرقے کی سطح پر سرگنوانا شروع کر رہے ہیں۔ سچ ہو یا جھوٹ — ایک دوسرے کو رد کرنے اور غیر معتمد ثابت کرنے کا مقابلہ سا ہو رہا ہے۔ یہ سمجھنا



مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ جتنا ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کھوتے ہیں اتنا ہی اپنی نفرت اور بربریت کو ہوا دیتے ہیں۔

بحران کا یہ دور الزام لگانے کا نہیں، دوسرے کی صفات کو پہچاننے کا ہے۔ یہ وقت دور رکھنے کا نہیں، سیکڑوں سال کے اٹوٹ اعتماد کے سہارے دوستی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے ساتھ اس کے قریب جانے کا ہے۔ گاندھی جی نے تقسیم شدہ ملک کے المیہ سے پیدا ہونے والی آزادی پر بار بار یہی سمجھانا چاہا تھا کہ اس کے پاس جاؤ، اس کا ہاتھ پکڑ کر پیڑ کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر اس سے پوچھو — تم کیسے ہو؟ تمھارے کیا دکھ ہیں؟ دیکھنا اس سے نفرت کی دیواریں ڈھا جائیں گی اور اس عظیم ملک کی عظیم روح تمھیں اپنے تحفظ میں لے کر بے خوف بنا دے گی۔

مجھے پتہ نہیں کہ میں کس زبان میں اپنی بات کہہ سکتا ہوں کیوں کہ بے شمار لوگ بے شمار لفظوں اور بے شمار زبانوں میں بے شمار باتیں کہہ رہے ہیں کہ سننے والوں کے دلوں میں کہرام عدم تحفظ اور اکیلا پن ابھرتا جا رہا ہے۔ لوگ باتوں سے گھبرا گئے ہیں۔ ان باتوں سے گھبرا کر وہ کوئی پرسکون گوشہ تلاش کر رہے ہیں جہاں انسان اپنے آپ سے پوچھتا ہے — میں کون ہوں؟ کن عناصر سے بنا ہوں؟ میرا مذہب کیا ہے؟ میری سچائی کیا ہے؟ ....

جیسے جلے ہوئے گھر کے ملبے سے کوئی پرانی یادیں نکالتا ہے۔ سہارے اور زندگی کی کوئی چیز کسی ہیرے کی طرح تلاش کرتا ہے، ویسے ہی عدم تحفظ کے احساس کے درمیان اپنی پہچان کو تلاش کرنا ضروری ہے۔

جب یہ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب بن رہی تھی، جب اس کی روایت کی اینٹ پر اینٹ رکھ کر مضبوط عمارت بنائی جا رہی تھی تو سوچنے والے سوچتے اور کہتے تھے اور سننے والے ان باتوں کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ شکوک اور شبہات تب بھی تھے۔ غور و خوض تب بھی ہوتا تھا، بحثیں تب بھی چلتی تھیں لیکن وہ اتنی جاندار بحثیں تھیں کہ انھوں نے صرف نظریے اور فلسفے ہی نہیں پیدا کیے بلکہ ایک دوسرے کی اونچائی اور گہرائی کو یکساں احترام کی سند بھی عطا کی۔ تشکیک و دلائل کی اس پیچیدگی کی بنا پر ہی لوگ مذہب کی پناہ میں چلے گئے۔ ایک ہندو بنا، ایک بودھ، ایک جین، ایک سکھ، بعد میں ان میں ایک مسلمان، ایک عیسائی اور ایک پارسی بھی شامل ہو گیا۔ پھر بھی سیکڑوں سالوں سے انھوں نے ہندستانی سماج کو چوٹ نہیں پہونچائی۔ بلکہ ہندستانی تہذیب اور آرٹ کو ان سے عزت ہی ملی۔

'لفظ' رویّے کی بازگشت ہے۔ رویّہ پہلے اور لفظ بعد میں آیا۔ یہ اتصال سوچ بچار اور غور و خوض سے وقوع ہوا لیکن لفظوں کا تحفظ اسی وقت تک ممکن ہے جب تک رویوں کا تحفظ کیا جا سکے۔ جب الفاظ آگے بڑھ جاتے ہیں اور رویہ پیچھے رہ جاتا ہے تو جھوٹ، ڈھونگ اور بربریت کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اسی لیے اکثر بولنے سے زیادہ چپ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ خود احتسابی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ کو ٹٹولنا لازمی ہو جاتا ہے۔ گاندھی جی کا مون برت سنتوں، رشیوں کی عبادت اور ریاضت اسی رویے کو بچانے اور رکھنے کا عظیم عمل تھا۔ اپنی ریاضت سے انھوں نے رویّے کو بچا 'لفظ' کا تحفظ کیا۔

آج جب کہ زبان اور الفاظ کا کہرام مچا ہوا ہے۔ لفظ کے تحفظ کا کام سماج کے چوتھے کھمبے کا ہی ہے۔ یہ بہت زبردست ذمہ داری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ کب بولنا اور لکھنا ہے اور کب چپ رہنا اور سوچنا ہے۔

(ترجمہ اور ترتیب : نجیب انصاری)

مورچگاں را چوں بود اتفاق
شیر ژیاں را بر دارند پوست

(اگر چیونٹیوں میں اتحاد ہو جائے تو وہ بھی مضرت شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔)

—— شیخ سعدیؒ

شفاعت علی
جے ۴۹ - ڈالی باغ، لکھنؤ

غیاث پور کے حضرت جی

صبح کا سہانا وقت تھا۔ سورج ایک سرخ گولے کی شکل میں آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ دریا پر اشنان کرنے والوں اور پوجا ارچنا میں مصروف لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ حضرت جی کو یہ منظر بہت بھایا۔۔۔ عبادت کا یہ طریقہ دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔۔۔

ع "ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے"

پاس کھڑے ہوئے شخص نے یہ الفاظ سنے۔ اپنے مرشد کی طرف دیکھا ان کی ترچھی ٹوپی پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے بڑے ہی والہانہ انداز میں کہا ع

"من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے"

"ہر قوم سیدھے راستے پر ہے جو اپنا دین اور قبلہ بھی رکھتی ہے" کہنے والے یہ بزرگ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء تھے جنھیں دنیا عقیدت و احترام سے حضرت جی، سلطان جی اور محبوب الٰہی بھی کہتی ہے۔ اور

"میں نے ترچھی ٹوپی پہننے والے کی طرف قبلہ سیدھا کر لیا ہے"۔ کہہ کر جواب دینے والا کوئی دوسرا نہیں بلکہ سلطان جی کے محبوب ترین مرید حضرت امیر خسرو تھے۔

صوفیائے کرام مذہبی عصبیت اور تنگ نظری سے ہمیشہ بالاتر رہے ہیں۔ ان کے فقیرانہ دربار میں اخوت، محبت اور بھائی چارگی کے بڑے ہی روح پرور نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی مذہب و ملت اور ذات برادری کا امتیاز کیے بغیر لوگوں کو انسانیت کا درس دیا۔ ان کی زندگی صلح کل اور اتحاد و یکجہتی کا معیاری نمونہ تھی۔ اور صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کا آستانہ فیض و برکت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے ہر مذہب و قوم کے لوگ سیراب ہو رہے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء بدایوں (اتر پردیش) کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو مالی اعتبار سے غریب لیکن علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ پانچ برس کے ہوئے تو سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ والدہ نے اپنے یتیم بچے کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے لیے بڑی ہمت اور استقلال سے کام لیا۔ انھیں کی تربیت کا اثر تھا کہ بچپن ہی سے آپ اللہ کے بندوں کی بھلائی اور بہتری کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ علم حاصل کرنے کا شوق، دنیاداری سے نفرت اور ضبط و برداشت کی عادتیں بھی والدہ ہی کا فیض تھیں۔ غریبی کا یہ عالم تھا کہ آپ کے گھر میں کئی کئی دن چولھا نہ جلتا اور ماں بیٹے کو فاقے کرنے پڑتے لیکن صبر و شکر کے علاوہ زبان پر شکایت کا کوئی لفظ نہ آتا۔ فاقے کے دنوں میں آپ کی والدہ کہا کرتیں کہ "آج ہم اللہ کے مہمان ہیں" تو حضرت جی کو بڑا سکون ملتا۔ آپ فرماتے تھے کہ ایسے دنوں میں جو لطف حاصل ہوتا تھا اور فقر و فاقہ میں جو لذت ملتی تھی اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

بدایوں میں سولہ سال کی عمر تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد والدہ کے ساتھ آپ دہلی آ گئے۔ یہاں اس زمانے میں کئی نامور اساتذہ موجود تھے آپ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔



بدایوں میں کسی نے آپ سے شیخ فریدالدین گنج شکر کے فضل و کمال کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے ان کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا مگر کسی وجہ سے اس ارادے کی تکمیل نہ ہو سکی تھی لیکن دل میں ان سے ملنے کی جو تڑپ تھی اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ آخرکار اسی لگن نے ان کو شیخ فرید کی خدمت میں پہونچا دیا۔ اس وقت آپ کی عمر بیس برس تھی۔ شیخ فرید آپ کی ذہانت اور لگن سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے آپ کو اپنے حلقے میں داخل کر کے خلافت نامہ لکھ دیا اور فرمایا:

"دہلی چلے جاؤ۔ تم ایک سایہ دار درخت ہو گے جس کے سایے میں اللہ کے بندے آرام پائیں گے۔"

پیرو مرشد کے حکم سے آپ دہلی واپس آ گئے اور یہاں آکر شہر کے شور و غل سے دور یکسوئی کے ساتھ عبادت کرنے کی غرض سے آپ نے ایک پرسکون جگہ غیاث پور میں قیام فرمایا (یہی غیاث پور اب نئی دہلی کا ایک بارونق علاقہ ہے جو بستی حضرت نظام الدین کے نام سے مشہور ہے)۔

غیاث پور اب محبت اور یک جہتی کا مرکز بن گیا غریب حاجت مند اور بے سہارا لوگ دور دور سے آپ کی خدمت میں آنے اور فیض و برکت حاصل کرنے لگے۔ آپ کے پاس آنے والوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ اس کے سامنے بادشاہوں کے دربار پھیکے پڑنے لگے۔ جو بھی آتا خالی ہاتھ نہ جاتا۔ اناج، کپڑا، نقد، تحفے یا نذرانے کی صورت میں جو کچھ بھی آپ کے پاس آتا، آپ غریبوں اور ضرورت مندوں کو بانٹ دیتے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی سائل اس وقت پہونچتا جب ساری چیزیں تقسیم ہو چکی ہوتیں اور اس کو دینے کے لیے کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس وقت بھی آپ اسے اپنے در سے خالی ہاتھ نہ جانے دیتے ـــــ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے ایسا ہی ایک واقعہ تحریر کیا ہے:ـــ

"ـــ کہتے ہیں کہ آج سے بہت پہلے، کوئی چھ سات سو برس پہلے، باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر دہلی جاتے ہوئے ایک سرائے میں آکر اترے کنیزیں، خدام، زر و جواہر، بیش قیمت مال و اسباب سبھی کچھ ساتھ۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایک دوسرا مسافر مفلس اور مفلوک الحال، دہلی سے آتے ہوئے اسی سرائے میں ٹھہرا۔ رئیس کو بوئے انس محسوس ہوئی۔ بڑھ کر پوچھا۔

"کدھر سے آنا ہوا؟"

جواب ملا۔ "دہلی سے۔"

پوچھنے والے کا اشتیاق دہلی کا نام سُن کر تیز ہوا۔ پوچھا:

"اس شہر میں ایک درویش خواجہ نظام الدین ہیں، وہاں بھی حاضری کا اتفاق ہوا؟"

مفلس بولا۔ "اتفاق کیسا؟ انھیں کے پاس تو گیا تھا۔ حاجت مند ہوں، چاہتا تھا کچھ مل جائے۔ میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہیں تھا۔ پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں پڑی تھیں، وہی میرے حوالے کر دیں۔ انھیں کو لیے چلا آ رہا ہوں۔"

سننے والا اب شوق و اشتیاق سے بے خود تھا بولا۔ "خدا کے لیے وہ جوتیاں میرے حوالے کر دو اور یہ میرا ساز و سامان سب تمھاری نذر ہے۔"

سائل دنگ و حیران کہ جوتیوں کے عوض یہ لاکھوں کی دولت؟ رئیس صاحب کہیں مجھ بےنوا سے دل لگی تو نہیں کر رہے ہیں۔ اُدھر رئیس صاحب ہوش میں کب تھے اور ہنسی دل لگی کی سکت ہی ان میں کہاں تھی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار پانچ لاکھ میں پڑا اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اُتری جوتیاں آنکھوں سے لگا، سر پر رکھ پگڑی کے اندر لپیٹ لیں اور ایک وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے۔ جوتیاں جس محبوب کی تھیں، وہ تو وہی ہیں جنھیں زبان خلق محبوب الٰہی کے نام سے پکارتی ہے اور امیر وہی امیر خسرو تھے جن کا یہ فارسی شعر اُس وقت سے اب تک خدا معلوم کتنے دلوں کی حال و قال کی محفلوں کو گرما چکا ہے

متاع وصل جاناں بس گراں است

گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے

یہ بیت تو خیر لاکھوں ہی کی تھی۔ کہنے والا تو یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب تک رسائی اگر نقد جاں کے معاوضہ میں ہو جائے تو بھی سودا نہایت ارزاں ہے۔"

سب مذہبوں کی توقیر و تعظیم، قومی اتحاد، پیار اور محبت اور انسان دوستی بھی حضرت نظام الدین اولیاء کا مسلک ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ صوفیائے کرام کے آستانوں پر بسنت کے موقع پر میلہ لگتا ہے اور عرس کی تقریبات اس قوالی کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں ـــــ

آج رنگ ہے رنگ ہے رنگ ہے ری

کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں ہی ہوا تھا۔ پھر دوسرے آستانوں کے عرس میں اسے ضروری قرار دے دیا گیا۔

بسنت کے سلسلے میں یہ روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے بھانجے مولانا تقی الدین کی وفات نوجوانی میں ہی ہو گئی تھی۔ حضرت جی ان کو بہت چاہتے تھے۔ ان کی وفات کا صدمہ اتنا ہوا کہ آپ خاموش رہنے لگے۔ آپ کے اس حال سے سبھی لوگ بہت پریشان رہتے۔ حضرت امیر خسرو سے سلطان جی کی یہ کیفیت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ایک دن وہ گھومتے پھرتے کالکا جی کے مندر کی طرف جا نکلے۔ وہاں بسنت کا میلہ لگا ہوا تھا اور مندر میں پجاری مورتی پر سرسوں کے پھول چڑھا اور کرکے بھجن گا رہے تھے۔ خسرو کو یہ منظر اتنا اچھا لگا کہ انھوں نے سرسوں کے کچھ پھول لیے، اپنی پگڑی میں لگائے اور وجد کے عالم میں "عرب یار توری بسنت منایو" گنگناتے ہوئے حضرت جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے خسرو کو اس حال میں دیکھا تو مسکرانے لگے اور اسی دن سے اپنے یہاں بسنت کے میلے کی بنیاد ڈالی۔ یہ میلہ یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے زندگی بھر محبت اور خدا کی بندگی کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا۔ آپ نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ جن لوگوں نے آپ کو ستایا تھا انہیں بھی دعائیں دیا کرتے تھے فرماتے: جو ہم کو رنج دے خدا اس کو تمام راحتیں عطا کرے۔ آپ یہ بھی ہدایت کرتے کہ لوگ نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بدی کرتے ہیں۔ لیکن بزرگوں کا اصول یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بھی نیکی اور بھلائی سے دیا جائے۔ آپ کے حسن سلوک سے بھٹکے ہوئے بھی سیدھے راستے پر آجاتے تھے۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ دہلی میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے جو بہت پڑھے لکھے اور قابل تھے لیکن انہیں اپنے علم کا غرور بہت تھا۔ اس غرور نے ان کے دل میں ایسا کھوٹ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی شہرت عظمت اور لوگوں کے دلوں میں ان سے عقیدت و محبت کا جذبہ ان مولوی صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دن وہ دہلی سے غیاث پور کے لیے چلے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر اس فقیر کی باتوں میں کیا ہے جو لوگ دیوانہ وار غیاث پور کی طرف بھاگتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء سے جو لوگ ملنے جاتے وہ اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ تحفہ لے کر جاتے۔ کھانے کا سامان، پہننے کے کپڑے مٹھائی اور اشرفیاں تک پیش کرتے۔ حضرت جی کبھی خود کوئی چیز نہ لیتے۔ جو سامان بھی آتا، آپ کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ کچھ دیر بعد خادم آتے اور اٹھا کر لے جاتے۔ یہ سارا سامان ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ لوگ بھی یہ سمجھ کر تحفہ دیتے تھے کہ حضرت جی کے وسیلے سے مستحق لوگوں کی مدد ہو جائے گی۔

مولوی صاحب غیاث پور کے لیے چل تو دیے لیکن انھوں نے کوئی تحفہ نہیں لیا تھا۔ جب بستی کے قریب پہونچے تو انھوں نے یہ حرکت کی کہ ایک کاغذ میں تھوڑی سی مٹی رکھ کر اس کی پڑیا بنالی۔ سوچا کہ جہاں سب لوگوں کی چیزیں رکھی ہوں گی وہیں یہ پڑیا بھی رکھ دیں گے۔ جب خادم آئے گا تو سب چیزوں کے ساتھ یہ پڑیا بھی اٹھا کر لے جائیگا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ پڑیا کس نے رکھی ہے۔ چنانچہ انھوں نے



بھی کیا اور وہ پڑیا تحائف کے پاس رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک خادم آیا اور سب چیزیں اٹھاکر لے جانے لگا۔ جب وہ پڑیا اٹھانے لگا تو حضرت جی نے اسے روک دیا، فرمایا:

"یہ پڑیا مجھے دے دو، اس میں میری آنکھوں کا سُرمہ ہے۔"

مولوی صاحب نے یہ سنا تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنی حرکت پر وہ بہت شرمندہ ہوئے اور اپنے کیے پر بہت پچھتائے۔ جب محفل وعظ ختم ہوئی تو حضرت جی وہ پڑیا اپنے ساتھ لے گئے۔ حاضرین یہی سمجھتے رہے کہ کسی عقیدت مند نے اس پڑیا میں حضرت جی کے لئے سرمہ ہی پیش کیا ہے۔

حضرت جی کے اخلاق اور عالی ظرفی سے مولوی صاحب کے علم کا غرور بُری طرح ٹوٹ گیا۔ وہ سوچتے رہے کہ اگر حضرت جی ان کی عیب پوشی نہ کرتے تو کتنی بے عزتی اور بدنامی ہوجاتی۔ حضرت جی کے اس برتاؤ نے مولوی صاحب کو سیدھے راستے پر لگا دیا۔ انھوں نے اپنی حرکت سے توبہ کی اور حضرت جی کے مریدوں میں شامل ہوگئے۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے عالم انسانیت کو رواداری مساوات اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ نفرت، عداوت اور حسد سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی ایک تقریر میں جو کتابی شکل میں "بات پریم اور بھائی چارے کی" کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔ حضرت جی سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے:

"ایک بار آپ کے ایک مُرید خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ قینچیاں بنانے کے بہت اچھے اور مشہور کاریگر تھے۔ بڑی محبت سے ایک قینچی اپنے پیرومرشد کے لئے بنا کر لائے اور انھیں پیش کی۔ حضرت کو قینچی پسند آئی۔ انھوں نے تعریف کر کے اپنے مرید کا دل رکھ لیا۔ لیکن یہ کہہ کر قینچی واپس کردی کہ:

"میرے لیے تو یہ بیکار ہے کیونکہ قینچی کاٹنے کا کام کرتی ہے اور میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ مجھے تو تم سوئی دے دو۔ کیونکہ وہ جوڑنے کا کام کرتی ہے۔"

محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے اسی جوڑنے کے کام نے بدترین حالات۔ فرقہ پرستی کے تباہ کن ماحول اور خطرناک سیاسی طوفانوں میں بھی انسانیت، محبت اور آپسی اتحاد کا چراغ کبھی بجھنے نہیں دیا۔ آپ کے آستانے سے اس چراغ کی روشنی آج بھی مذہبی تعصب اور نفاق کے اندھیروں کو دور کر کے محبت اور بھائی چارے کے ماحول کو اُجاگر کر رہی ہے۔

□□

قابلِ تقلید

"نگھاسہ فردھان موضع لوکی (ضلع کھیری) کے پاس گرام سماج کی زمین ہے جس میں پرانی عیدگاہ ہے۔ اس عیدگاہ کا گنبد مٹی کے گھڑے کا بنا ہوا تھا۔ یہ گنبد کسی طرح ٹوٹ گیا۔ یہ واقعہ ۸ نومبر ۱۹۹۲ء کے آس پاس علم میں آیا۔ اس وقت بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کی وجہ سے ماحول گرم تھا۔ پھر بھی اس کی اطلاع ملتے ہی پردھان گرام سبھا پپرچھیٹ شری رام لکھن ورما اور پردھان گرام سبھا حسناپور کے تعاون سے ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء کو گرے ہوئے گنبد کی مرمت کرادی گئی۔

دونوں گرام پردھانوں کے اس کام سے علاقے میں افواہیں پھیلانے والوں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور امن و انتظام کو کنٹرول میں رکھنے میں کافی مدد ملی۔"

بشکریہ: دیویندر چودھری
آئی اے ایس
ضلع مجسٹریٹ کھیری

حسن واصف عثمانی
۱۱ - کلمن کی لاٹ ، قیصراموں بھاٹک ، لکھنؤ

قومی یکجہتی : لفظی ترکیب کا مفہوم

انسانی زندگی ایک فرد کی اکیلی اور تنہا زندگی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بیک وقت انفرادی اور اجتماعی ہوتی ہے لیکن کسی بھی جغرافیائی خطے میں انسان بحیثیت فرد جتنا اجتماعیت کی بنیاد ڈالتا ہے اور سماجی ادارے پیدا کرتا ہے تو ملکوں، قوموں اور تہذیبوں کا وجود ہوتا ہے۔ بابل اور نینوا کی، مصر، یونان، روم کی، ایران اور چین کی قدیم اور نابود تہذیبوں کا تجربہ آج کی دنیا اور اس کے ملکوں کو منتقل ہوا ہے۔ مغرب تہذیب اور خود جدید ہندوستانی تہذیب بھی انہی تجربوں کا سلسلہ ہیں اور ۲۰ویں صدی کی آخری دہائی میں ساری دنیا کا رخ ایک عالمی یک جہتی کی سمت ہے۔

کسی بھی ملک کے اندر قومی یک جہتی کا مفہوم اب اور زیادہ واضح ہو گیا ہے اور اس کا مقصد وسیع تر اور انسان کی اخلاقی زندگی سے وابستہ ہو گیا ہے۔ عالمی یک جہتی اور قومی یک جہتی میں اب ٹکراؤ کا نہیں، ہم آہنگی کا زمانہ ہے۔ اسی لیے قومی یک جہتی کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔

ایک عالمی نظام کا خواب بہت پرانا ہے اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے زمین کی طنابیں کھینچ لی ہیں جس سے وہ ایک معاشی وحدت بن گئی۔ انسانی عقل و دانش کے تمام خزانے دنیا کی عمومی ملکیت بنتے جا رہے ہیں۔ کسی جغرافیائی خطے میں مقامی اور علاقائی ماحول سے پیدا ہونے والی انفرادیت اور اجتماعیت نے لاکھ ایک تہذیب، ایک قوم اور ایک ملک کا روپ دھار لیا ہو۔ اس پر عالمی تہذیب کا اثر پڑ رہا ہے۔

جغرافیائی، سیاسی اور قومی دائروں میں جو فطری یک جہتی ہوتی ہے وہ پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ آفاقی بن رہی ہے۔ اس ماحول میں قومی یک جہتی کا مفہوم بھی ایک نیا انسانی فلسفہ بن گیا ہے۔ قومی یک جہتی ایک جلی ہوئی اور پیٹی یا افتادہ لفظی ترکیب نہیں ہے بلکہ یہ فرد کو خود شناسی اور اس دنیا میں بہتر اور کارآمد زندگی بسر کرنے کا ایک نظریہ عطا کرنے کی کوشش سے وجود میں آئی ہے۔

قومی یک جہتی کسی وقتی ضرورت، تکمیل یا ہنگامی حالت سے مقابلے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ انسانی زندگی کے بارے میں ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جو تاریخ کے تجربوں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے جائزوں سے پیدا ہوا ہے۔

یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ۲۰ویں صدی کی آخری دہائی سے پہلے شاید اس نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ہم جس صدی کے آخری برسوں میں سانس لے رہے ہیں وہ تمام انسانی تجربوں کے نچوڑ کی صدی ثابت ہو رہی ہے۔ یہ صدی دو عالمی جنگوں، ایٹمی اسلحہ اور ٹکنالوجی کی لمحہ در لمحہ جیت کی صدی رہی ہے۔ اس نے پوری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ کوئی ملک کوئی جغرافیائی خطہ ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ عالمی معاشیات نے عالمی سیاست کو اپنا تابع بنایا ہے۔ اس صدی میں نوع انسانی کو بہتر زندگی دینے کے خواب بھی دیکھے گئے۔ جمہوریت اور سماجی انصاف کے تصورات نے دنیا بھر میں اپنی جگہ بنالی ہے۔



۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب نے ایک سبق یہ دیا کہ انسان کو برابری سے بہرہ ور کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی بالشویک انقلاب کی ناکامی سے یہ سبق ملا کہ برابری کو اوپر سے نافذ نہیں کیا جا سکتا — مساوات کسی سیاسی یا انتظامی عمل سے نہیں پیدا کی جا سکتی بلکہ یہ اجتماعی ارادے کی بے لچک استقامت سے پیدا ہو سکتی ہے اور انسانی شعور کی اس بلند سطح سے جنم لیتی ہے جس میں اخلاقی اور انسانی اقدار کو پہلی اینٹ کی جگہ دی گئی ہو۔

ہندستان میں ہم قومی یک جہتی کی لفظی ترکیب اور اس کے مفہوم سے زندہ اور بیدار تعلق نہ رکھ سکیں تو ہمارے جغرافیائی خطے، نئی نسلوں، تہذیبی لہروں اور ایک درجن سے زیادہ بڑی اور مالامال زبانوں کے ملک میں سماجی زندگی کا کوئی تصور اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کچھ مقاصد پر ذہنی اور عملی اتفاق نہ کر لیں۔ یہی ہماری قومی یک جہتی ہو سکتی ہے اور جو ہماری سماجی زندگی میں موجود ہے۔ ایک شہری کی حیثیت سے ہم اپنے اور اپنے ہم وطن شہریوں کے حقوق کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک تحریری آئین کے پابند ہیں۔ قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ کے اداروں کے ماتحت رہنے کو ہم سب نے خود قبول کیا ہے۔ ایک کثیر جہتی زندگی میں قومی یک جہتی ہی ایسی بنیاد ہو سکتی ہے جو ہماری زندگی اور اس کے تمام اداروں کو سلامت رکھ سکے۔ ہندستان میں جمہوریت کی سلامتی اور اجتماعی زندگی میں سماجی انصاف کے شعور کی بقا کا راز یہی ہے۔

قومی یک جہتی کو آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ آزمائش اس وقت ہوتی ہے جب کوئی فرد یا گروہ ہندستان کے جغرافیائی خطے کی رنگا رنگی اور کثیر جہتی سے انکار کرتا ہے۔ یہ انکار ایک بڑی اور ناقابل تردید حقیقت کے مقابلے میں نسل، زبان، عقیدے یا علاقے کی چھوٹی اور جزوی حقیقت سے وابستہ ہونے کے عمل سے جنم لیتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی انحراف ہوتا ہے، دانش اور شعور کا فیصلہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ انحراف اس بڑی اور بنیادی سچائی سے بھی انحراف ہے کہ نسل، زبان، عقیدے اور علاقے کے اختلاف کے باوجود ہندستان ایک جغرافیائی وحدت ہے، اس کی رنگا رنگی میں ٹکراؤ نہیں ہے۔

بلکہ یہ ایک ایسی قوس قزح ہے جس کا ہر رنگ دوسرے رنگ کو نمایاں کرنے کے لیے ہے۔

ہندستان کی یہ تصویر کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔ ویدک عہد میں بھی تصویر یہی تھی اور آج بیسویں صدی میں بھی تصویر یہی ہے۔ بھارت کا لفظ ایک اصطلاح کے طور پر پورے برصغیر کی وحدت کا اظہار کرتا ہے اور ایک ایسے جغرافیائی خطے کی جانب اشارہ کرتا ہے جو ہمالیہ، خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کے دریاؤں اور ایک جزیرہ نما پر مشتمل ہے۔ یہ جزیرہ نما اتنا بڑا ہے کہ ایک براعظم کی برابری کرتا ہے۔ اس میں تہذیبوں، سلطنتوں اور زبانوں کے عروج وزوال کی بہت سی کہانیاں دفن ہیں۔ یہاں وقت کے بہاؤ نے عہد قدیم، قرون وسطیٰ اور عہد جدید کو ایک سلسلہ بنا دیا ہے جس میں اشوک اور اکبر کے عہد بھی شامل ہیں اور ان کے درمیان کے دور بھی — اور پھر اکبر سے آج تک کا زمانہ بھی شامل ہے۔ اس جغرافیائی خطے میں عالمی تہذیبوں کی آمد بھی اس کی تاریخ ہے اور یہاں سے بودھ دھرم کا چین، جاپان، تبت اور جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلاؤ بھی اس کی تاریخ ہے۔

ہر زمانے میں قومی یک جہتی کے احساس اور عمل نے اس براعظم کو ایک وحدت رکھا۔ ہندو دھرم اور تہذیب نے اس وحدت کو پائیدار بنایا۔ وہ بھی ہمارے ماضی، حال اور مستقبل میں شامل ہے۔ اسلام نے عرب اور عجم کی روایتوں کو اس جغرافیائی خطے میں ایسا مقامی رنگ دیا کہ وہ بھی ہندستانی ہو گئیں۔ مسیحیت نے مغربی افکار اور روایتوں کی ترویج کی۔ یہ سب ایک مشترکہ وراثت ہیں اور ان کی ہم آہنگی سے قومی یک جہتی جنم لیتی ہے۔ یہ عمل ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ جاری رہا ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس پر کوئی روک لگا سکے۔

ہم اس وقت قومی یک جہتی کا جب بھی نام لیتے ہیں تو جانے یا انجانے میں ہندستانی تاریخ اور تہذیب کے اسی دھارے کا ذکر کرتے ہیں جس نے ہر دور میں ہم آہنگی اور امتزاج کی دل کش تصویریں بنائی ہیں۔ ہندستانی تاریخ اور تہذیب بظاہر سنگھرش کی داستان ہے لیکن اپنے آخری نتیجے میں یہ بشری سنگم کی کہانی ہے۔



قومی یک جہتی کی لہر نے بحران کے ہر زمانے میں بحران کو بے طاقت کیا اور دبا دیا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی یہی ہوگا۔ عالمی رجحان بھی اس عمل کی رفتار تیز کر سکتا ہے۔ لیکن ہم اگر قومی یک جہتی کے عمل کو شعوری طور پر سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں تو خود ہم بھی اس کی رفتار کو تیز تر بہت تیز کر سکتے ہیں۔ ہم کو کرنا بھی یہی چاہئے اور اس لفظی ترکیب قومی یک جہتی میں نئی جان ڈالنا چاہئے۔

الفاظ کو معنویت کا قالب عطا کرنے کی ذمہ داری ہم جیسے جیتے جاگتے انسانوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔

□□

قومی یک جہتی کیسے....؟

آزادی کے بعد ہمارے ملک کے دستور کی بنیاد جمہوریت اور سیکولرازم پر رکھی گئی، اور اس دستور کی ترتیب ہمارے قومی رہنماؤں نے اس طرح دی کہ ملک کے کروڑوں لوگ، جو مذہب، عقیدے، کلچر اور زبان کے اعتبار سے مختلف ہیں، ان سب کے حقوق مساوی بنا دیے گئے۔ ہمارا دستور نہ تو کسی کو ممتاز سمجھتا ہے اور نہ کسی کو کمتر۔ اور جب یہ امتیاز ختم کر دیا گیا تو پھر ان سب میں بلا کسی فرق کے قومی یک جہتی پیدا ہونی چاہیے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے اندر نہ تو ابھی تک پورے طور پر وطنیت کا جذبہ پیدا ہوا اور نہ قومیت کا اور نہ ہی اس میں قومی یک جہتی کا ماحول ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جبکہ حکومت نے سماج میں صدیوں سے پسماندہ لوگوں کی ترقی کے لیے کام کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنے ہی ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ملک کے کروڑوں کمزور لوگوں کے حقوق کو سلب کیے ہوئے ہے۔ اس طبقے نے اپنی طاقت اور دولت کے زعم میں ملک کے دستور کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور قومی یک جہتی کی تصویر دھندلی ہوتی جا رہی ہے۔

ملک میں قومی یک جہتی کے فروغ اور بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ طاقت ور جا ہے اس کے پاس علم کی طاقت ہو، دولت کی طاقت ہو یا اکثریت کی طاقت ہو، وہ گرے ہوئے کمزور لوگوں کے حقوق، جو دستور نے انھیں دیئے ہیں، کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے محبت کا رشتہ قائم کرے۔ ان کی ضروریات کو سمجھے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہو جائے تو پھر ہمارے ملک میں قومی یک جہتی کے لیے کسی تحریک یا سہارے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قومی یک جہتی خود بخود پروان چڑھے گی اور عوام میں مقبول ہوگی۔

(ڈاکٹر) فوق کریمی (علیگ)
کریمی بلڈنگ۔ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ



مندر و مسجد میں
مت بانٹو
خدا کو دوستو

گر رہیں گے بند دروازے دریچے کھڑکیاں
روشنی کی ہر کرن مایوس واپس جائے گی

مندر و مسجد میں مت بانٹو خدا کو دوستو
ورنہ اس معبود کی پہچان گم ہو جائے گی

ہے دعا موہن کی بھارت میں رہیں آباد سب
لالہ و گل کی مہک ذہنوں میں بستی جائے گی

مَنْ مُوہَنْ شَرما بدایونی
نیو گورنمنٹ پریس کمپاؤنڈ
لکھنؤ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
۹۹/۱-۸-۱۱ سورنیہ نگر۔ حیدرآباد
۵۰۰۰۲۰

قومی یکجہتی: نئے چیلنجز اور نئے مسائل

آج سے پہلے کبھی قومی اتحاد اور یکجہتی کو ایسے گمبھیر چیلنج کا سامنا نہ تھا جیسا کہ آج ہے۔ جب ملک آزاد ہوا اور خاص طور پر شمالی ہندستان فرقہ وارانہ دار وگیر کے جس وحشت ناک دور سے گزرا تھا۔ موت، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا جو بازار گرم تھا وہ بھی طویل مدت تک جاری نہ رہا اور بالآخر ہم اپنے گھر کو سنبھالنے کے لیے سر جوڑ کر سرگرم ہو گئے۔

یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ ہماری قومی آزادی کی تحریک نے کبھی بھی مذہب کو سیاست سے نہیں جوڑا تھا اور سیکولر اقدار ہمیشہ ہی ہماری رہنمائی کرتی رہیں۔ تقسیم کے بعد بھی ہندستان نے سیکولرازم ہی کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا۔ ہمارا آئین سیکولرازم جمہوریت اور سماجی انصاف کے اصولوں پر مبنی ہے جہاں سبھی مذاہب کے ساتھ برابری کا ذکر ہے اور حکومت پابند ہے کہ کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر فوقیت نہ دے۔ وہیں سیاسی اور ریاستی امور کو مذہب سے الجھانے یا مذہب کو سیاست میں دخیل ہونے کے خلاف بھی آئین صاف ہے۔

اسی بنیاد پر عوامی نمائندگی قانون میں مذکور ہے کہ انتخاب کالعدم قرار دیا جائے گا اگر یہ ثابت ہو جائے کہ امیدوار نے مذہب کا استحصال کیا تھا۔

سیکولرازم کو ہمارے آئین اور ہماری سیاسی تہذیب کی بنیاد بنانے میں نہ تو کوئی مصلحت پوشیدہ تھی اور نہ ہی کسی خاص طبقے کی خوشنودی مقصود تھی۔ یہ ہمارے سماج کی ضرورت اور ہمارے ملک کا مزاج تھا، اور یہ نہ صرف ہماری قومی آزادی کی تحریک کی دین تھی بلکہ صدیوں پرانے ہمارے سماجی رویے اور روایت کا ورثہ بھی تھی۔

مشکل تو یہ ہے کہ آج ہم ان قدروں سے بے نیاز ہو کر سیکولرازم کے مطلب اور مفہوم کو ہی مسخ کر رہے ہیں اور اس کے متعلق شک اور شبہ کا ماحول بنا رہے ہیں۔ اتنے برسوں کے بعد اب یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ سیکولرازم اصل میں کیا ہے اور نقلی کیا ہے کہا جا رہا ہے کہ یہ مغربی تصور ہے جسے ہندستان کی سرزمین پر زبردستی مسلط کیا جا رہا ہے۔ یہ پودا یہاں پروان نہیں چڑھ سکتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سیکولرازم کے لیے مشرق و مغرب کے امتیاز کی بات بھی ایک پہیلی لگتی ہے۔ یوں تو جمہوریت، پارلیمنٹ، بینکنگ، صنعت، ٹکنالوجی، قانون اور مختلف سیاسی، قانونی اور نظم و نسق کے ادارے، کہاں مغرب سے الگ ہیں اور کن پر مغرب کی چھاپ نہیں ہے۔ مغرب اور مشرق کے امتیاز سے الجھانے کا کوئی سیاسی مقصد تو ہو سکتا ہے لیکن علمی اور عملی مقصد ہرگز نہیں۔

یورپ میں سیکولرازم کا تصور ایک خاص ماحول میں ابھرا تھا لیکن یہی تصور ہمارے یہاں دوسرے ہی حالات میں پروان چڑھا۔ سیکولرازم کا بنیادی مطلب یہی ہے کہ مذہب کو سیاست سے علاحدہ رکھا جائے۔ دونوں میدان الگ ہیں اور اختلاط سے دونوں ہی مجروح ہوتے ہیں۔ دینی مسائل الگ ہیں اور دنیوی مسائل الگ۔ ثانی الذکر بدلتے رہتے ہیں اور ہر دور میں نئے حل کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی لیے آج مذہب کو سیاست سے خلط ملط کرنا الجھنیں پیدا کرنے کا باعث

ہوتا ہے۔ سیاست کا تقاضا ہے کہ ملک جن مسائل سے دوچار ہے انہیں مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے اور ان کا حل تلاش کیا جائے۔ کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کے لیے حل تلاش کرنا نہیں ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۲ ہجری میں رسول اکرم (ص) کے سامنے یہ سوال تھا کہ غیر مسلموں، عیسائیوں اور بالخصوص یہودیوں سے تعلقات کیوں کر استوار کیے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک معاہدہ تشکیل دیا جسے تاریخ میں "اِنَّھُمْ اُمَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے قانون کے لئے رواداری کی بنیاد پر اپنے اپنے مذہب کے مطابق اپنے معبود کی عبادت کرتے ہوئے ہم ایک "امت واحدہ" میں منسلک رہ سکتے ہیں۔

یہاں غالباً یہ تصور ہے کہ ایک تو مذہبی گروہ ہوا جسے "ملت" کہہ لیجئے اور دوسرا متعدد مذاہب کے پیروؤں پر مشتمل ایک علاقائی گروہ جسے "امت" کہا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی معاہدہ کی اساس پر "امت" اور "ملت" میں فرق کیا ہے۔ "امت" ان کی رائے میں آج کے "قوم" اور "نیشن" کے تصور کا ابتدائی روپ ہے۔

مولانا آزاد سبحانی نے بھی متعدد بار کہا کہ انسان کو دو قسم کے تعلقات کا تعین کرنا ہے۔ ایک تو وہ تعلقات ہیں جو اس کے اور خدا کے درمیان ہیں، یہ اٹل ہیں۔ ان میں کسی ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے وہ تعلقات ہیں جو انسان کو اپنے برابر کے انسان سے متعین کرنے ہیں۔ ان کا اول الذکر تعلقات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ متعدد مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تعلقات ہیں یہ 'دنیوی' امور پر منحصر ہیں۔ ہم کارخانے میں کام کرتے ہیں کھیتی کرتے ہیں، تجارت، بیوپار میں مصروف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تعلقات دنیوی ہیں اور ہماری روزمرہ زندگی میں جو جینے کے سوال پیدا ہوتے ہیں انھیں حل کرنا ہے اور اس حل کے لیے آپس کے تعلقات استوار کرنے ہیں۔ بس یہی بنیاد ہے دینی اور دنیوی مسائل کو الگ الگ زاویوں سے دیکھنے کی۔ سیکولرازم کی ضرورت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی لیے ریاست کو سیکولر ہونا ضروری ہے۔ سیکولرازم کے مفہوم میں کہیں دہریت یا بے دینی کو دخل نہیں۔

لگتا ہے ہم نے آزادی کے بعد ان مسائل پر سوچنا بند کر دیا اور منتشر خیال جڑ پکڑنے لگی۔

پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ سماجی تعلقات میں سیکولر نقطۂ نظر کی ضرورت ہندوستان کی سماجی تاریخ کے ارتقاء سے ابھری ہے۔ ایک تو وہ دور تھا جب مذہب ان معنوں میں تھا ہی نہیں جو معنی آج اس سے منسوب ہیں۔ خود مذہب کا ارتقاء خداؤں کی کثرت سے خدا کی وحدت کے تصور کی سمت ہوا ہے۔ اور خداؤں کی تجسیم سے شروع ہو کر آج ہم اس خدا کو جانتے ہیں جس کی تجسیم ممکن نہیں۔ کوئی اسے "تصور مطلق" کہتا ہے اور کوئی کچھ اور۔

صوفیوں نے اس تصور کو نئے معنی عطا کیے۔ یہ کہا گیا کہ خدا نہ صرف محیط کُل ہے بلکہ کُل میں شامل ہے اس میں گھل مل گیا ہے۔ اور کسی نے کہا کہ خدا، انسان اور کائنات تین اکائیاں الگ الگ ہیں۔

ان مسائل میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں بات یہی ذہن نشین کرنی ہے کہ مذہبی عقائد بھی اپنی جگہ دائمی طور پر قائم اور حالت انجماد میں نہیں ہیں۔ مذہبی عقائد بھی، ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستان ہی کی تاریخ دیکھئے۔ عیسائیوں، یونانیوں اور مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے ہی سے یہاں یہ کشمکش جاری تھی۔ گوتم بدھ نے بغاوت کی۔ منو کے شاستر کی رو سے ہندو سماج جو چار طبقوں — برہمن، کشتری، ویش اور شودر — میں بٹ گیا تھا، اسے گوتم بدھ نے تسلیم نہیں کیا۔ آریہ سماج نے آگے چل کر کہا کہ یہ طبقاتی تفریق پیدائش سے نہیں پیشہ سے تعلق رکھتی ہے — لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تفریق نہ صرف پیدائشی اعتبار سے باقی ہے بلکہ اس میں ذیلی تفریق بھی ہوتی جا رہی ہے اور ذات پات کا بکھیڑا کھڑا ہو گیا ہے جو کئی الجھنیں پیدا کر رہا ہے اور قومی اتحاد کے لئے رخنہ بن رہا ہے۔

علاوہ ازیں اس سخت تقسیم کی وجہ سے باہر سے آنے والوں کو ہندوستانی سماج سے دور رکھا گیا۔ یہ تقسیم صرف آرین نسل



سے متعلق لوگوں کے لیے محدود ہے ۔ اچھوت اور چنڈال الگ ہیں ۔
مسلمانوں کو ملیچھ کہا گیا ۔ "ہون" ، "لوگ" آئے ۔ راجپوت کہلائے انھیں کشتری تسلیم کر لیا گیا ۔ لیکن جاٹ بھی آئے اور انھیں شودر کہا گیا۔

یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ مسلمان جب ہندستان آئے تو یہ بہت بعد کی بات ہے (اور اس وقت (دور عباسیہ میں) مذہب کو سیاست سے علاحدہ کر دیا گیا تھا ۔ خلیفہ ریاستی امور پر نظر رکھتا تھا اور مذہبی معاملات میں فتویٰ دینا مولوی کا کام تھا ۔ ہندستان میں مسلم حکمرانوں کے دور میں اس پالیسی پر عمل کیا گیا اور دور وسطیٰ کی تاریخ شاہد ہے کہ بادشاہوں اور مولویوں میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے کہ کس کو کس پر برتری حاصل ہے ۔

اور یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ ہندستان کے مسلمان بادشاہ کسی اعتبار سے کسی بیرونی حکومت یا خلیفہ کے تابع نہیں تھے ۔ نہ خراج دیتے تھے اور نہ ہی ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا ۔ یہ بھی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ان مسلم حکمرانوں نے اپنے "آبائی وطن" کو مالدار اور خوشحال بنانے کے لیے انگریزوں کی طرح ہندستانی دولت کو باہر نہیں بھیجا ۔ حقیقت میں وہ ہندستانی حکمران تھے اور انھوں نے جو کچھ بھی کیا اسی ہندستان کے لیے کیا ۔ موسیقی میں ، طرز تعمیر میں ، پینٹنگ میں جو بھی ارتقا ہوا وہ ہندستانی تہذیب کا حصّہ ہے ۔ کتھک ، خسرو کی ایجاد کی ہوئی راگ راگنیاں ، طبلہ ، ستار مغل مصوری سب کچھ ہندستانی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہیں انھیں "غیر ملکی اثرات" کا نام دے کر نکال دیجیے تو ہماری تہذیب مفلس ہو جائے گی ۔

یہ سب تہذیبی عوامل مل کر ہندستان کو بناتے ہیں ۔

پھر جب ہم قومی یک جہتی کی بات کرتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قومی یک رنگی یا یکسانیت کی بات نہیں ہے ۔ ہندستان ایک ملک نہیں ایک برِّاعظم ہے ۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کے ماننے والے یہاں نہ ہوں ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے مذہب یہاں ملیں جن کا دنیا کے دوسرے حصوں میں نشان بھی نہ ہو ۔ ہندستان ایک کثیر لسانی ملک بھی ہے ۔ یہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ ۱۷ زبانیں تو وہ ہیں جن کا آئین کے آٹھویں شیڈول میں ذکر ہے اور جو ترقی یافتہ ہیں لیکن ایسی متعدد بولیاں اور زبانیں ہیں جو اپنی شناخت بنائے رکھنا چاہتی ہیں ۔ کھاسی ، سنتھالی اور نکوباری تو وہ زبانیں ہیں جو جنوب مشرق سے آنے والے آسٹرلائیڈ گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ دراوڑوں سے پہلے آئے ہیں پھر سنٹرل ایشیا سے دراوڑ آئے ہڑپہ اور موہن جو داڑو کی تہذیب ان کی نشانی ہے آج بھی عورتیں مانگ میں جو سیندور لگاتی ہیں وہ دراوڑی روایت ہے ۔ شیولنگ کی پوجا بھی ان کا مذہب تھا اور پاکستان میں براہوی دراوڑ زبان ہے ۔ جنوبی ہند کی زبانیں تامل ، ملیالم ، کنڑی ، تلگو اسی دراوڑ زبان سے نکلی ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ ملیالم ، کنڑی اور تلگو پر سنسکرت اثرات زیادہ ہیں ۔ شمالی ہندستان ، مغربی اور مشرقی ہند کی زبانیں ہند آریائی ہیں ۔ کشمیری کا تعلق مغرب کی طرف سنسکرت کی جو شاخ انڈو یورپین کے نام سے گئی تھی ، اس سے ہے اور اس پر ازبک زبان کا اثر بھی ہے اور سنسکرت کا بھی ۔ ہندستان ان سب زبانوں اور بولیوں کا دیش ہے ۔ ایسے میں قومی یک جہتی کے معنی الگ الگ شناختوں کو (خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی اور تہذیبی) ختم کرنے کے نہیں ہیں کثرت میں وحدت کی تعمیر ہی پر ہمارا قومی اتحاد منحصر ہے ۔ اس حقیقت پر پردہ ڈالنا انتہائی خطرناک عمل ہوگا ۔

آج کل قوم کے شیرازے ہی کو بکھرنے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ عبادت گاہوں کا سوال ایک معنی میں بین مذہبی نہیں بلکہ ہم مذہبی سوال ہے ۔ اس کو اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے ۔ کسی مذہب کے متعلقین کو مجروح کیے بغیر سب کی مرضی سے اسے حل کیا جانا چاہیے ۔

آج ہمیں ایک گرتی ہوئی معیشت کو آزادی اور انصاف کی بنیادوں پر مستحکم کرنا ہے ۔ علاقائی نابرابری کو دور کرنا ہے جو علاقائی عصبیت اور تناؤ کی بنیادیں فراہم کرتی ہے اور ملک کے شیرازے کو توڑنے کا باعث بنتی ہے ۔

آج قومی یک جہتی کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے لیے نہ صرف سیاسی سطح پر بلکہ اقتصادی سطح پر اور

عابد سہیل
۲۲۰، ایس۔ پی۔ جرنلسٹ کالونی
سیکٹر سی۔ علی گنج، لکھنؤ

دُور نہیں ہیں بُلا کے دیکھو

آزادی کے بعد ایک چھوٹے سے عرصے سے قطع نظر تقریباً ہمیشہ ہی ایسے حالات پیدا ہوتے رہے ہیں جن میں قومی یکجہتی پر زور دینے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ اس صورت حال کے قدیم اور فوری اسباب کی تلاش ایک ایسا عمل ہوگا جسے چاہے کتنا ہی پیچھے کیوں نہ دھکیلا جائے وہ لمحہ کبھی نہ آئے گا جہاں سے ابتدا کی جا سکے کہ عمل اور ردعمل کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ چنانچہ مسئلہ کو آج کے پس منظر میں ہی دیکھنا ہوگا لیکن اس سے قبل ہمارے ذہنوں میں یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ جس چیز کے حصول کے لئے ہم کوشاں ہیں وہ اصل میں ہے کیا اور وہ ضروری کیوں ہے۔ اسے حل کرنے اور اس کے لیے غور و خوض کرنے کا سوال تو بعد میں آئے گا۔

قومی یکجہتی انگریزی کے دو الفاظ Integration اور National کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں ہی الفاظ ایسے ہیں جن کے ایک سے زیادہ معنی لیے جا سکتے ہیں۔ پہلے لفظ کے ایک معنی ہیں "Common to whole Nation"(1) یعنی وہ سب جو پوری قوم میں مشترک ہو اور دوسرے معنی ہیں (2) Peculiar to a Particular Nation یعنی ایسا کچھ جو پوری قوم کی خصوصیت ہو۔ یہی حال دوسرے لفظ Integration(3) کا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں (4) Ending of Racial Segregation یعنی نسلی علاحدگی پسندی کو ختم کرنا، اور دوسرے Combination of Diverse Elonents of Forception یعنی متضاد نقطۂ نظر کا ملنا یا یکجا ہونا۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ لفظ National Integration کو Integration of Nation بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ لفظ "Nation" کی کلاسیکی تعریف مشترک نسل، زبان اور تاریخ پر اصرار کرتی ہے جبکہ ملک کی معین حدود، سماج اور ایک حکومت پر اصرار ثانوی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مروجہ ترتیب (National Integration) کے مضمرات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ملانے اور جوڑنے کے لیے ایک سے زیادہ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے چیز اگر ایک ہی ہوئی تو نہ اسے جوڑنے کی ضرورت ہے اور نہ ملانے کی۔ آج قوم کی تعریف 'معینہ سرحد' سماج اور ایک حکومت' ایک حد تک تو درست ہے لیکن ہندستان ایسے وسیع و عریض ملک میں جہاں درجنوں مذاہب کے ماننے والے اور درجنوں زبانیں بولنے والے لاکھوں اور کروڑوں لوگ آباد ہوں، ایک مذہب اور ایک زبان پر اصرار نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ بعض ممالک میں جبراً ملانے کے جو نتائج ماضی قریب میں سامنے آئے ہیں اور جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اس مسئلہ پر نئے سرے سے غور کریں، صرف اپنے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر بھی اور اس احساس کے ساتھ کہ نہ صرف سروں کے اوپر پھیلا ہوا آسمان مشترک ہے بلکہ وہ زمین بھی مشترک ہے جس کے بغیر ہم نہ کھڑے ہو سکتے ہیں، نہ بیٹھ سکتے ہیں نہ لیٹ سکتے ہیں۔

قومی یکجہتی پر اصرار کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب



کسی ملک کا کوئی ایک فرقہ یا ایک سے زائد فرقے، قومیت (مذہبی، نسلی یا لسانی) یا اس کے بڑے حصے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں روا رکھا جا رہا ہے جس کے وہ مستحق ہیں یا وہ سلوک کیا جا رہا ہے جس کے وہ مستحق نہیں ہیں۔

بادی النظر میں یہ خیال ہوتا ہے کہ شکایت صرف عددی اعتبار سے کمزور فرقے اور قومیت کو ہی ہو سکتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ شکایت اکثریت کو بھی ہو سکتی ہے ـــ جائز یا بے بنیاد ـــ لیکن مسئلہ اکثریت اور اقلیت کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کیا سماج کوئی ایسا طریقہ کار دریافت کر سکا ہے یا نہیں جس میں ایک دوسرے کے احساسات سے واقف ہونے اور اگر ضرورت پڑے تو تزکایات کو دور کرنے کی کوشش کی جا سکے۔

جو نظریہ ایک معین حدود اور حکومت کے تحت مختلف لسانی، مذہبی اور نسلی گروہوں کو مساوی حقوق کی ضمانت اور آزادی کا اعلان اور اقرار کرتا ہے اسے سیکولرازم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ۱۸ ویں صدی کے اوائل میں جمہوریت کی ابتدائی شکلوں کے دوران پروان چڑھا جب واضح (Well defined) طبقے اور گروہ ٹوٹ رہے تھے۔ یہ نظریہ اس فکر کا اثبات تھا کہ مذہب (جو بنیادی طور سے ایک روحانی تجربہ ہے) کی تفریق حکمرانی کے تصور کی پوری طرح ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ لیکن یہ نظریہ مذہب کو مسترد نہیں کرتا بلکہ حکمرانی کے عمل میں کسی ایک مذہب کی کسی دوسرے مذہب پر بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ سماج کے ہر فرد کو اپنی پسند کے مذہب پر مکمل طور سے عمل پیرا ہونے کا حق اور مکمل آزادی بھی دیتا ہے۔ جان اسٹارٹ مل کے اس قول کو کہ "آپ کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں میری ناک شروع ہوتی ہے"۔ ایک طرح سے سیکولرازم کی اساس بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

قومی یکجہتی اسی سیکولرازم کا منطقی نتیجہ بھی ہے۔

ہندوستانی فلسفہ اور ثقافت کے مشہور مفکر ڈاکٹر نند کشور دیوراج لکھتے ہیں :۔

The modern state, however, is almost completely independent of religions authority . . . . while it is true that no state can ignore the sentiments of the people regarding justice and fair deal and the fact that most people belong to one religion or other, each with its own norms of moral and social behaviour, it is also true that the modern state depends more on nationalistic and other social motives for its support by the people (5)

ترجمہ:

" بہر حال دَورِ جدید کی حکومت مذہبی اقتدار سے تقریباً مکمل طور سے آزاد ہے . . . . . . یہ تو صحیح ہے کہ کوئی حکومت انصاف اور منصفانہ سلوک کے سلسلے میں لوگوں کے جذبات کی ان دیکھی نہیں کر سکتی اور یہ کہ زیادہ تر لوگ کسی نہ کسی مذہب سے تعلق بھی رکھتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کے اخلاقی اور سماجی رویوں کے اپنے اپنے معیار ہوتے ہیں لیکن آج کی حکومت عوام کی حمایت کے لیے قومی اور دوسرے سماجی محرکات کا زیادہ سہارا لیتی ہے۔"

چنانچہ لا مذہبی (سیکولر) حکومت کے معنی صرف یہ ہوئے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں۔ یعنی سرکاری مذہب کوئی نہیں۔ انتخاب، ملازمتوں اور فیصلوں کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ ملک کا قانون اور آئین ہوگا۔ سیکولر یا لا مذہبی حکومت مذہب دشمن ہرگز نہیں ہوتی بلکہ ہر مذہب اور اس کے رسوم کو پھلنے پھولنے کی مکمل آزادی دیتی ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں دیکھئے تو کم از کم ایسا کوئی واقعہ میرے علم میں نہیں کہ کسی ہندو نے مسلمانوں کے طریق عبادت یا کسی عبادت پر کبھی اعتراض کیا ہو یا کوئی مسلمان ہندوؤں کے عبادت کے طریقوں پر معترض ہوا ہو۔ یہی دوسرے فرقوں کے سلسلے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ مذہب کی "بنیاد" پر اختلافات اور تصادموں کی تاریخ پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے پس پشت اصل



مذہب پر نہیں بلکہ ایسی چیزوں کو اہمیت حاصل ہے جن کا محل مذہب سے دور دور کا واسطہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود فسادات بھی ہوئے اور اس کے بعد اس وجہ سے کہ زندگی اس طرح لوٹ بھی آئی کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ فسادات کا سبب اگر مذہب ہوتا تو ان فسادات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا کیونکہ مذاہب ابھی موجود رہے اور ان کے ماننے والے بھی باقی ہیں۔ فسادات کا سبب کچھ اور ہی ہے۔

دراصل ہر مذہب اپنے بنیادی افکار اور اصولوں کے علاوہ رسوم و رواج کا ایک ایسا دائرہ بنا لیتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ رسوم دھیرے دھیرے مذہب کا حصہ بن جاتی ہیں یا عام طور سے لوگ انھیں بھی مذہب ماننے لگتے ہیں اور دوسری یہ کہ مذہب اور ثقافت کے دھارے انھی سے پھوٹتے ہیں اور سب ملا جلا کر ثقافت سے ان کا رابطہ استوار ہو جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ مذہب کا جزو ہیں یا ثقافت کا حصہ۔ ہندوستان ایسے کثیر المذاہب ملک میں یہ دائرے قدرتی طور سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور جب کبھی ہوتے ہیں ثانی الذکر صورت اکثر مشکلیں اور مسائل پیدا کرتی ہے۔ یہی ہندوستان میں بھی ہوا۔ جہاں سائنس کے میدان میں بے پناہ ترقی کے باوجود سائنسی مزاج (scientific temper) پیدا نہ ہو سکا جس کے سبب سیکولرازم کی روح پوری طرح پروان نہ چڑھ سکی۔

اس وقت ملک کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کے پس پشت مندرجہ بالا تجزیہ کی کارفرمائی بدیہی ہے۔

لیکن مسئلہ کا معروضی تجزیہ ہم سے یہ بھی مطالبہ کر سکتا ہے کہ اس صورت حال کو حقیقت کے طور پر کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے۔ ملک کی آبادی کی اکثریت اگر کسی ایسے نظام کو پسند کرتی ہے جو سیکولر نہیں ہے تو دستور ہند کی دہائی اسے مطمئن نہیں کر سکتی کیونکہ دستور عوام کے لئے ہوتا ہے، عوام دستور کے لیے نہیں۔ وہ اس دلیل سے بھی شاید مطمئن نہ ہو کہ جمہوریت میں اکثریت کا تعین مذہب نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور سیاسی پروگرام کرتے ہیں۔

چنانچہ ہمیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ سیکولرازم اور جمہوریت کے علاوہ ملک کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ اگر یہ راستہ اختیار کیا گیا تو ملک کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ لیکن کیوں؟ اس کیوں کا جواب دینے کے لیے ہمیں ہندوستان کے مختلف مذاہب، زبانوں، ثقافت، صنعت و حرفت، معاشی رشتوں، دنیا کے نقشہ میں ہندوستان کی جغرافیائی پوزیشن، دنیا کے سارے ممالک سے ہماری اور ہم سے ان کی توقعات اور عالمی سیاست کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہوگا جو بذات خود کم سے کم ایک خاصے طویل مضمون کا متقاضی ہے جس کا اس وقت موقع ہے نہ گنجائش لیکن چند اشارے ضروری ہیں۔

ہندوستان کی بوقلمونی ۔ درجنوں مذاہب، تہذیبیں، زبانیں اور خود اس کی ہزارہا سال کی تاریخ کسی مستقل یکسانی کو قبول نہیں کر سکتی بلکہ ہندوستان یقیناً ایک قوم ہے جس کی تشکیل مختلف قومیتوں سے ہوئی ہے ہندوستان ان عظیم تہذیبوں کا سنگم ہے جو ہزاروں برس میں پروان چڑھی ہیں جنھیں برقرار رکھ کر ہی ایک دھاگے میں پرو یا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو گئی ہیں کہ کسی ایک کا خاتمہ دوسری کے لیے موت کی گھنٹی ثابت ہوگا۔

اگر کسی مذہب کو مرجھانے دیا گیا تو وہ آمیزہ بھی منتشر ہو جائے گا جو ہولی، دیوالی، عید، بقرعید کے تہواروں میں ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی کے آداب و اطوار، بات چیت، ملنے جلنے کے طور طریقوں، سلام دعا، نمستے، آداب بندگی وغیرہ میں نظر آتا ہے اور ثقافتیں ایک دن میں نہیں بنتیں، سو دو سو برسوں میں بھی نہیں بنتیں۔ ان کی تشکیل ہزاروں برسوں میں ہوتی ہے۔ یہ برف کے ان تودوں کی طرح ہوتی ہیں جن کا ۸۰ فی صد حصہ پانی کے اندر ہوتا ہے اور صرف ۲۰ فی صد حصہ اوپر۔ اس ۲۰ فیصد کو ختم کر دیا جائے تو ۸۰ فیصد حصہ بھی ختم ہو جائے گا۔

سوال سیاست کا نہیں کسی ایک عقیدے کا نہیں، مختلف عقائد کے درمیان مصنوعی توافق کا نہیں بلکہ رد و قبول کے ایک صحت مند سلسلۂ عمل کا ہے جو ثقافت کی پہچان بھی ہے اور اس کی جنم داتا بھی ۔۔۔



دیوالی کی روشنیاں، ہولی کی مسرتیں، عید اور بقر عید میں لوگوں کا ایک دوسرے سے گلے ملنا کسے پسند نہیں؟ اس ساری رنگا رنگی کو سڑک کوٹنے والا انجن چلاکر آن واحد میں یک رنگی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے لیکن اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ وہی قیمت جو، دور کیوں جائیے، پاس پڑوس کے متعدد ممالک چکا رہے ہیں، اپنی کوششوں میں مکمل طور سے کامیاب نہ ہونے کے باوجود۔ کارخانے، پل، بڑے بڑے باندھ سال دو سال میں بنائے جاسکتے ہیں، لیکن سائنس اب تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں کرسکی ہے اور نہ کبھی کرسکے گی جس کے ذریعہ ثقافت آن واحد یا مختصر سے عرصے میں پروان چڑھائی جاسکے۔

ہندستان کے لیے سیکولرازم اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارا سارا ادب، آرٹ، رقص، موسیقی اور ثقافت کے سارے مظاہر کسی بھی مذہب یا مذہبی روایات کو مسترد کیے بغیر محض مذہبی نہیں اس لیے اگر کوئی ایسا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی جس میں رد کرنے کا عنصر قبول کرنے کے عنصر سے زیادہ ہوا تو وہ سارا شیرازہ بکھر جائے گا جس کا دوسرا نام ہندستان بھی ہے۔

یہی حال زبانوں کا ہے۔ ہندستان کی ہر زبان نے دوسری زبان کو متاثر کیا ہے۔ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں اس طرح گھل مل گئے کہ باہر کے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ (تلی کے لیے حمّال اترپردیش میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا لیکن گجرات میں یہی حمّال ہی مستعمل ہے اور زیادہ تر لوگ لفظ "قلی" سے بالکل ناواقف ہیں)۔ اگر ان زبانوں سے لاپروائی برتی گئی تو دھیرے دھیرے وہ سوتے خشک ہوجائیں گے جو آہستہ آہستہ تشکیل پائی ہوئی مشترک زبان کو اساس فراہم کررہے ہیں۔

کم وبیش ۸۰ کروڑ افراد پر مشتمل ہندستان کو ایک بہت بڑا کارخانہ تصور کیا جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے دس پندرہ کروڑ پرزوں کو ناکارہ بناکر باقی کل پرزوں سے کام لیا جاسکے؟ اور اگر یہ کسی طرح ممکن بھی ہوسکے تو کیا مشین کے وہ حصے جنھیں ناکارہ بنادیا گیا ہو طفیلی پودوں (Parasites) کی شکل نہ اختیار کرلیں گے جو صرف دوسروں کی کمائی پر جیتے ہیں اور کیا ہماری معیشت اتنی مضبوط ہے کہ اتنی بڑی غیر مطمئن اور شکست خوردہ آبادی کا بوجھ برداشت کرسکے؟ اس مفروضے کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کربھی دیا جائے تو کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی جس میں ملک کی آبادی کے سارے ہی حصوں کو مساویانہ حقوق اور فرائض کے ضابطے کا پابند بنانے کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ کار ممکن معلوم ہوتا ہو۔ نسلی، مذہبی اور ثقافتی برتری کی عملی شکل صرف فاشزم کے لیے راستہ ہموار کرسکتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہندستان اتنا وسیع وعریض ملک ہے کہ جرمنی کی طرح یہاں فاشزم آسانی سے قدم نہیں جما سکتا۔ لیکن اس خوش فہمی میں مبتلا ہوکر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو یہ مشکل اور ناممکن کام بھی آسان اور ممکن ہوسکتا ہے۔

سیاسی داؤں پینتروں، مختلف فرقوں اور ذاتوں کی متعدد اور مفادات کے ٹکراؤ یا وقتی مفاہمتوں پر کسی قصر امید کی تعمیر نہ کوئی دیرپا حل ہے، نہ اس مضمون کے دائرہ کار ہی میں آتا ہے۔ ساری دلیلیں اپنی جگہ درست سہی لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ آبادی کے مختلف حصے جذباتی طور پر ایک دوسرے سے شاید اس قدر دور کبھی نہیں ہوئے تھے جتنے آج ہیں۔ اس صورت حال کی مخالف سیاسی طاقتوں کی کامرانی صرف عارضی حل ہی پیش کرسکتی ہے۔ اصل حل ووٹ کے بکسوں کے اندر نہیں دل کے نہاں خانوں میں ہے۔ آخر وہ کون سا کھل جا سم سم، اسم اعظم ہے جو نفرتوں کی یہ آگ دلوں سے نکال کر سینہ چاکان چمن ایک دوسرے سے شیر وشکر کرسکتا ہے۔

بڑے کاموں کی ابتدا ہمیشہ چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے عمل خیال کا مرہون منت ہوتا ہے اور کوئی کارنیک شروع کرنے کے لیے ہرگز ضروری نہیں کہ اس کو عام لوگوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ اور سچ پوچھیے تو عام لوگوں کی اکثریت اگر کسی نقطۂ نظر کی حامی ہو تو پھر اس کے لیے ذہنوں کو تیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

ہندستان کی آبادی کے بیشتر فرقے کم وبیش ایک ہزار سال سے ساتھ ساتھ رہتے آئے ہیں۔ اس طویل مدت میں شکر رنجیوں کے مواقع بھی آئے ہیں اور انتہائی رفاقت کے بھی۔ اور یہ نتیجہ کو ا

ودو کی کوئی ہی نہیں کہ کوششوں اور ہم آہنگی کے مواقع اختلافات اور
دوریوں سے زیادہ ضرور رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود
یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے صرف یہ کہ ایک دوسرے کو پوری طرح
سمجھا نہیں بلکہ بہت سی غلط فہمیاں اپنے دلوں میں لیے ہوئے ہیں
ہم نے بہت کچھ کیا لیکن خود کو دوسرے کی جگہ پر رکھ کر اس کے
احساسات اور جذبات کو اپنے احساسات اور جذبات سمجھ کر کم ہی
غور کیا ہے۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو درجنوں ایسے مسائل جو وجہ
اختلاف بنے ہوئے ہیں اتفاق کا سبب بن جاتے۔

انگریزی کے صحافی سعید نقوی نے ستیش، گجیت، رانا،
سعیدہ، سنوش، ظفر مہدی، ثریا اور مشتاق میں ایک نئے ہندستان
کو دریافت کیا ہے۔ یہ افراد یقیناً ایسے ہیں جن پر فخر کیا جائے لیکن
تقریباً ۸۷ کروڑ کے ملک میں ان سات آٹھ افراد کو کیوں چننا پڑا؟
کیا صرف اس لیے کہ ان کی تعداد اتنی ہی ہے یا زیادہ سے زیادہ سو
دو سو۔ جی نہیں ان کی تعداد سو دو سو نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں میں
ہے۔ ان میں سے ہر ایک وہ "سوناؤ" ہے جس میں مستقبل کے
ہندستان کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ ضرورت بس ان کو سرگرم کرنے
اور ظلم اور زیادتی کے خلاف ان کی نفرت کی آگ کو تیز کرنے کی ہے۔ لیکن
یہ کام اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم خود کو بدلے بغیر، خود اس نارِ نمرود میں
جو گلزار بننے کے لیے بے چین ہے، کودے بغیر غیب سے کسی کے
"بیرون آمد" ہونے کا انتظار کریں۔ ہم میں سے ہر ایک کو "دل بدست
آور" کے اس حج اکبر میں شامل ہونا پڑے گا۔

اس وقت ملک کی جو ذہنی فضا ہے اس میں پہلی لڑائی ہمیں خود
اپنے آپ سے لڑنی ہوگی۔ دوسروں سے محبت، مروت اور بہتر ہمسائگی
کی توقع ہم خود کو ان خوبیوں سے متصف کیے بغیر نہیں کر سکتے۔ سیاسی
پہل بھی اہم ہے اور ضرور کی جانا چاہیے لیکن اس کی چند در چند
مجبوریاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسروں کو قبول کرنے اور خود کو
دوسروں کے لیے قابل قبول بنانے سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ اس
کام کی ابتدا انفرادی طور پر بھی کی جا سکتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی
اور یہ بڑے سے بڑے سیاسی اقدام سے زیادہ پھلے اور دیرپا برگ و
بار لائے گا۔
کرنے کا اصل کام یہ ہے۔

□□

حواشی:

(1,2) The concise oxford Dictionary (1990)
Page 673
(3,4) Ibid concise oxford Dictionary (1990)
Page 521
(5) Hinduism And the Modern Age
By Dr. N. K. Devaraja Edition 1975
Page 81

اُردو کی عمر نسبتاً دوسری ہندستانی زبانوں کے
بہت کم ہے۔ تاہم اپنی وسعت،
شگفتگی اور ہر دلعزیزی کے باعث یہ یقیناً
اوروں پر سبقت لے جاتی ہے۔ دراصل ہر
زبان کسی تہذیب اور کسی کلچر کی آئینہ دار
ہوتی ہے۔ یہی حال اُردو کا بھی ہے
ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی صحیح عکاسی
بھی اُردو کرتی ہے۔ یہی وہ زبان ہے
جس نے آپسی بھائی چارے کو بڑھاوا
دیا۔ لوگوں کے دل ملے اور جنگِ
آزادی کی صف آرائی ہوئی۔ اُردو نے
ہی پرجوش نعرے اور تازگی دینے والے
گیت ہم کو دیے۔ انقلاب کے پیچھے
ہندو مسلم سکھ عیسائی کی کوئی تمیز
نہ تھی۔

پروفیسر محمد نسیم فاروقی
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سدھیش پچوری
۱۷-بی، ہندستان ٹائمز اپارٹمنٹ
۱ میور وہار - فیز I - نئی دہلی ۱۱۰۰۹۱

تہذیبی اتّحاد کی کہکشاں

جدید ادب کے بہت کم قارئین اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ آج سے تقریباً ستاون سال قبل گیتا پریس گورکھ پور نے بھجنوں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، جس کی ادبی حیثیت بھی ہے۔ متعدد مروج مجموعے بعد میں اسی کی طرز پر وجود میں آئے، جو آج بھی کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہیں۔ ان میں کچھ نئے بھجن بھی شامل کیے گئے ہیں، جو غیر معروف یا نیم معروف افراد کا نتیجۂ فکر ہیں۔

لیکن یہ تبصرہ ان بھجنوں پر نہیں ہے بلکہ اس فرق پر ہے جو گیتا پریس کے مجموعے اور دیگر مجموعوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے فرق یہ ہے کہ گیتا پریس والے مجموعے میں ۶۶ بھگتوں میں سے ۳۲ بھگت مسلمان ہیں جبکہ دیگر مروج مجموعوں میں انھیں کوئی مقام نہیں دیا جاتا۔

یوں تو یہ ایک معمولی سی اطلاع ہے کیوں کہ گیتا پریس کے علاوہ چھپے مجموعے سائز میں چھوٹے اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے تیار کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی اس اطلاع میں اس سبب کو تلاش کیا جا سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھگتوں کو بھجن کے مجموعوں میں سے غائب کیوں کر دیا گیا؟ اس کا جواب یہ نہیں ہو سکتا کہ بعد کے ہندوؤں نے مسلمان بھگتوں کو بھگت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرنا چاہا، اس لیے انھیں مجموعوں میں جگہ نہیں دی گئی اگر ایسا ہوتا تو گیتا پریس گورکھ پور کے 'ہندتو' کی جانب سے ۱۹۳۳ء کے بعد آج تک جو ستائیس اڈیشن چھاپے گئے ان میں وہ مسلمان بھگت بدستور کیوں چلے آتے۔ بہرحال ایک سبب تو آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک سبب یہ بھی کہ عام پبلشر اتنا خیال نہیں رکھتے۔ لیکن سکنڈری درجات کی نصابی کتابوں میں کبیر، رس کھان، بھلے ہی موجود ہوں دیگر کئی بھگت چھوٹ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ گیتا پریس کے اس مجموعے کی اب تک چار لاکھ پچاس ہزار دو سو پچاس کاپیاں چھپ چکی ہیں۔ بتیس بھگتوں میں سے کئی ایسے بھی ہیں جن کا نام تک لوگ نہیں جانتے رحیم، رس کھان، خسرو اور نظیر وغیرہ کو چھوڑ کر اگر کسی ہندی والے سے پوچھا جائے تو وہ دیگر نام مشکل سے گنا پائے گا۔ یہ بھی ایک روایتی اجنبیت کا نتیجہ ہے۔

بھارتیندو ہریش چندر نے ایسے ہی شاعروں کے بارے میں کہا تھا:

'ان مسلمان ہرجن پے کوٹن ہندو واریے"

زندگی کی مجموعی گرفت جہاں ہے وہاں کوئی چھوٹتا نہیں ہے مگر جب زندگی کو تفریق کی نظر حاصل ہو جاتی ہے تو سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ گیتا پریس کا یہ مجموعہ تفریق کی اس نظر کے لیے ایک چیلنج ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ تضاد ہے کہ جو کام سیکولر دانش وروں کو کرنا تھا وہ ایک مذہبی ادارہ کرتا ہے۔

بھگتی تحریک نے تمام مذہبی دیواریں توڑ کر اور فرقہ واریت کی حدود عبور کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک تعمیری اور فکری پل کا کام کیا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک ہمیں یک رخا ہونے سے بچاتا ہے جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یاری صاحب، تاج، شیخ، کریم بخش، انشاء، واجد، عادل، مقصود، موج دین، واحد، دین درویش، افسوس، خالص، لطیف حسین، منصور، یکتہ رنگ،



تمام نظام الدین اولیا، وحدت محمود عثمان، طالب شاہ، محبوب خلیل سید وغیرہ تقریباً دو ڈھائی درجن مسلمان بھگت سور، تلسی، کبیر، نیرا کے برابر بھگتی کا جذبہ رکھنے والے اور ایشور کی لیلا کے نغمے گانے والے لوگ ہیں تو موجودہ فرقہ واریت کی شدت یقینی ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بھگتی کے وسیع نظریے نے زندگی میں لازمی حیثیت اختیار کرکے ایک ایسا پل تعمیر کیا ہے جس پر کھڑے ہوکر ہندو، مسلمان کی دوئی مٹ سکتی ہے۔ مزید یہ کہ دو مذہبوں کے درمیان اتحاد کی کشش اسی وقت جگمگاتی ہے جب دونوں کے بیچ میں کوئی تیسرا وسیع نظریہ لازمی ہوجاتا ہے۔ یہ حقیقت ہندو کٹر پسندی کو بھی مسترد کرتا ہے جو مسلمانوں کو الگ تھلگ کردینا چاہتی ہے اور ان مسلمانوں کو بھی جو الگ تھلگ ہونے کو لازمی سمجھ کر اسلامی شدت پسندی کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہندی کی نصابی کتابوں سے متعدد مسلمان بھگت غائب ہیں اسی طرح اردو کی نصابی کتابوں میں بھی انہیں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بعد یکجہتی کی جتنی ضرورت ان دنوں محسوس کی گئی اتنی نئی نسل کو کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ فرقہ پرستی کے وحشی چہرے کو انہی دنوں پہچانا گیا ہے لیکن فرقہ واریت کو روکنے کی انتظامی اور سیاسی کوششیں اگر خاطر خواہ کامیاب نہیں ہو پا رہی ہیں تو شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فرقہ واریت سے نبرد آزما ہونے والی تہذیبی اقدار کو جاننے اور تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

فرقہ وارانہ فسادات میں انسان مارے جاتے ہیں املاک برباد ہوتی ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپسی اعتماد تباہ ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا مجموعے کا تعارف چونکا دینے والا ہے تو صرف اسی لیے کہ ہندی قارئین کی ایک بڑی تعداد کو یہ حقیقت ہی معلوم نہیں ہونے دی جاتی کہ ماضی میں فرقہ وارانہ یگانگت اور قومی یکجہتی آسان تھی اور یہ کہ بغیر کسی بڑے تیسرے نظریے کے مذہبی شدت پسندی کو کمزور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات اس مجموعے کو پڑھ کر آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے۔

(ترجمہ: نجیب انصاری)

مذہب کا اختلاف مٹانے کی بات کر

مہر و وفا کے گیت سنانے کی بات کر
اے ہم نشیں وطن کو جگانے کی بات کر

روٹھے ہوئے دلوں کو منانے کی بات کر
بچھڑے ہوؤں کو پھر سے ملانے کی بات کر

وہ شمع جس سے پھیلے محبت کی روشنی
ایسی بھی ایک شمع جلانے کی بات کر

ہندو نہ کوئی سکھ نہ مسلماں نہ پارسی
مذہب کا اختلاف مٹانے کی بات کر

پھر امن و آشتی کا زمانے کو دے پیام
دنیا کو پھر بہشت بنانے کی بات کر

جس راہ پر چلے تھے کبھی رہبرانِ قوم
اس راہ پر جہاں کو چلانے کی بات کر

جوہر مٹا کے مذہب و ملت کا اختلاف
نفرت کی آگ دل سے بجھانے کی بات کر

——— چندر پرکاش جوہر بجنوری
۷، ریوا بلڈنگ ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد



سچی کہانی

دلیپ سنگھ
۴/۹۹ ۔ راجندر نگر ۔ نئی دہلی ۔ ۶۰

اقبالِ جرم

عجیب رشتہ تھا چاچے محمد حسین کا میرے والد کے ساتھ۔ سارا گاؤں کہتا تھا کہ ان دونوں کی دوستی مثالی ہے۔ لیکن میں نے ان کو ہمیشہ ایک دوسرے [illegible] اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے دیکھا۔ وہ دن تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا تھا۔ مبارک باد دینے کے لیے پورا گاؤں ہمارے گھر امنڈ آیا۔ بس ایک چاچے محمد حسین کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور میرے والد گاؤں والوں کی مبارک باد وصول کرتے ہوئے اور لڈو بانٹتے ہوئے دیکھ دروازے ہی کی طرف رہے تھے کہ محمد حسین کیوں نہیں آئے۔

جب خاصی دیر ہوگئی تو وہ خود چاچے محمد حسین کے گھر کی طرف چل دیے۔ جاکر دیکھا تو وہ اپنی چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ میرے والد نے کسی کی منت سماجت کرنا تو زندگی میں سیکھا نہیں تھا۔ انھیں دیکھتے ہی بولے۔

"لڑکے کی کامیابی سے اتنا جل گئے محمد حسین کہ میرے گھر تک نہ آسکے"!

"لڑکے نے دسویں پاس کرلی تو اب وہ تیرا ہوگیا آیا سنگھا"۔ محمد حسین نے گرج کر کہا۔ "وہ میرے کندھوں پر کھیلا، میری گود میں پلا اور پڑھ گیا تو تو نے اس پر قبضہ جمالیا۔ تجھ میں ذرا بھی عقل ہوتی سردارا تو آج کا جشن میرے گھر میں ہورہا ہوتا"۔

میرے والد جو کسی کے سامنے ہارنا جانتے ہی نہ تھے۔ چپ چاپ واپس مڑ گئے۔ اور پھر جب تھوڑی دیر بعد لوٹے تو پورا گاؤں ان کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میرے والد کہتے آرہے تھے کہ "لڈو کھانے ہیں تو محمد حسین سے مانگو جس کا لڑکا پاس ہوا ہے۔ میرے گھر میں بیٹھ کیوں لگا رکھی ہے"۔

میری شادی پر تو حد ہی ہوگئی۔ پورے گاؤں کے لوگ باراتی بنے بیلوں، تانگوں اور گھوڑوں پر سوار نہر کے کنارے میری سسرال جانے کے لیے تیار کھڑے تھے لیکن محمد حسین کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ میری ماں نے میرے والد سے کہا۔

"بھائی محمد حسین شاید کسی بات پر روٹھ گیا ہے۔ جاؤ اسے منا کر لے آؤ"۔

ماں نے مجھے بھی والد صاحب کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ شاید انھیں ڈھنگ سے منا نہ سکیں۔ ایک طرح سے یہ عقلمندی کی بات تھی کیوں کہ میرے والد کے منانے کا ڈھنگ دنیا سے مختلف تھا۔ جاتے ہی کہنے لگے۔

"تو نے بڑی عقلمندی کی کہ تو بارات میں شامل نہیں ہوا۔ میرے لڑکے کی سسرال والوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ بارات ذرا کم لانا لیکن میں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر انھیں منا لیا ہے کہ میں بارات میں ایک اور آدمی نہیں صرف ایک گدھا لا رہا ہوں۔ اب تو چل پڑ کر تیرے آنے کا کوئی برا نہیں مانے گا"!

محمد حسین نے مونچھوں میں مسکرا کر کہا۔ "ایک گدھا تو بارات میں ہے ہی۔ دوسرے کی کیا ضرورت ہے"!

پھر میرے والد اپنے روایتی غصے میں آکر کہنے لگے۔ "میں نے کون سے تیرے ڈانگر چرا لیے ہیں جو تو مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ سارا

گاؤں اپنے آپ بارات میں شامل ہونے کے لیے نکل آیا ہے اور تو یہاں بیٹھا نخرے دکھا رہا ہے۔"

چاچے محمد حسین نے مسکرا کر کہا۔ "آیا سنگھا! اگر اپنے بیٹے کی شادی پہ بھی نخرے نہیں دکھائے تو پھر کب دکھاؤں گا۔ ویسے میرے کپڑے دیکھ لے۔ میں بھی باراتی بنا بیٹھا ہوں۔ بس تیری ناک رگڑ والی تھی، رگڑ والی۔"

ویسے تو چاچے محمد حسین میرے والد کی زمینوں پہ مزارع تھے لیکن یہ ان دونوں کا کاروباری رشتہ تھا۔ بچپن میں کبڈی کھیلتے اور کشتیاں لڑتے جو دوستی قائم ہوئی تھی وہ اس طرح نبھا رہے تھے کہ سگے بھائی بھی کیا نبھائیں گے۔

ہر سال زمین کی پیداوار کی تقسیم کے موقع پر ان دونوں کا حساب کتاب دیکھنے والا ہوتا ہے۔ میں اکثر ایسے موقع پر چشم دید گواہ ہوتا تھا کیونکہ والد صاحب مجھے اس لیے ساتھ لے جاتے تھے کہ میں زمینداری کے ہتھکنڈے سیکھ جاؤں۔

تقسیم کے شروع میں ہی دونوں گالی گلوچ پر اتر آتے تھے۔ چاچے محمد حسین کہتے۔ "ایک کنستر دانوں کا میں نے مُلّا کے لیے نکال لیا ہے کہ وہ مسجد میں دیا جلاتا ہے۔"

میرے والد جواب دیتے۔ "دیا خود جلا لیا کرو کہ میں نے مُلّا کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔"

پھر والد کہتے۔ "ایک بوری گندم میرے نوکروں کے لیے نکال کر الگ رکھ دے کہ وہ لوگ میرے گھر میں کام کرتے ہیں۔"

چاچے جواب دیتے "کیوں نکالوں۔؟ تیرے نوکروں کے لیے جرمانہ میں کیوں بھروں؟ اور ویسے بھی اپنے گھر کا کام تو خود کیوں نہیں کرتا۔ شکل وصورت سے تو تُو نوکر ہی لگتا ہے"۔

دونوں گھنٹوں لڑتے رہتے۔ اور پھر جب میرے والد اپنا حصّہ خچروں پر لدوا رہے ہوتے تو چاچے محمد حسین ایک بوری گندم ہمارے حصے میں اور ڈال دیتے۔

"اب یہ بوری کیوں رکھ رہے ہو یہاں۔؟"

"بیٹا آیا ہے میرا تمہارے ساتھ۔ اسے کیا خالی ہاتھ لوٹا دوں گا۔"

چاچے محمد حسین نے میرے والد سے اپنی دوستی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ویسے دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھے۔ لیکن اگر چاچے محمد حسین نے کبھی میرے والد سے قرض لیا تو نہ صرف ضمانت دی بلکہ سُود بھی پورا دیا۔ قرض تو انھیں اکثر لینا پڑتا تھا کیونکہ پیداوار کے حصے میں ان کا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ جب بھی انھیں بیج خریدنے یا گھر میں شادی بیاہ کے موقع پر سو دو سو روپیوں کی ضرورت پڑتی تو وہ اپنی بیوی کا اکلوتا زیور کان کے جھمکے میرے والد کے پاس گروی رکھ جاتے۔ جب فصل بکتی تو چھڑا کر لے جاتے۔ لیکن پندرہ بیس دن کے بعد پھر وہ جھمکے ہمارے گھر آ جاتے۔ کہ ضرورتوں سے چھٹکارہ کہاں ہوتا ہے؟

میرے والد انھیں چھیڑتے۔ "محمد حسین! یہ جھمکے تو نے اپنی بیوی کے لیے بنوائے ضرور ہیں لیکن اسے پہننے کبھی نہیں دے گا۔"

محمد حسین جواب دیتے۔ "جھمکے چاہے تیرے گھر میں پڑے رہیں ہیں تو میرے ہی۔ اور پھر اللہ قسم! میری بیوی تو جھمکوں کے بغیر بھی بڑی خوبصورت لگتی ہے۔"

ایک دفعہ گاؤں میں بڑے زور کا سوکھا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے بادل دیکھے بغیر ہماری باقی زندگی گزر جائے گی۔ ان حالات میں فصل کیا اُگتی اور جو تھوڑی بہت اُگی بھی تو اسے بے پناہ دھوپ نے جُھلا کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چاچے میرے والد کو فصل کی طے شدہ رقم نہیں دے سکے۔ میرے والد نے بہت سمجھایا کہ "بھول جاؤ محمد حسین کہ تمھیں میرا کچھ دینا ہے"۔ لیکن چاچے بھلا کب مانتے۔ کہنے لگے۔

"تو نے معاف بھی کر دیا مر دارا تو کیا ہوا۔ قیامت کے دن اللہ کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ یہ قرض تو مجھے چکانا ہی ہے۔"

چاچے محمد حسین کو شاید معلوم نہیں تھا کہ قرض تو شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اگلے سال تک یہ اتنا بڑھ گیا کہ اسے اُتارنے کے لیے محمد حسین کی اچھی فصل بھی مدد نہ کر سکی۔ قرض تبھی اتر سکتا تھا جب محمد حسین اپنے حصے کا سارا اناج میرے والد کے حوالے کر دیتے۔ لیکن ایسا کرتے تو پھر خود کیا کھاتے۔؟



پھر پتہ نہیں کب شیطان نے ان کے کان پھونک دیئے کہ اچانک چاچے محمد حسین قرض ادا کیے بغیر فصل کا اپنا حصہ لدوا کر گھر چل دیئے اور میرے والد کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ وہ اپنا حصّہ کھیتوں سے اٹھوا کر لے جائیں۔

میرے والد حیران رہ گئے کہ اچانک یہ کیا ہوگیا۔ اگر چاچے کہہ دیتے تو والد اپنے حصے کا اناج بھی ان کے حوالے کر دیتے۔ لیکن یہ محمد حسین کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ والد بھی اگر شرافت سے قرض کی ادائیگی کے لیے کہتے تو محمد حسین یقیناً زبردستی اٹھوا کر لایا ہوا اناج انھیں بھجوا دیتے چاہے خود بھوکوں مرتے۔ لیکن دونوں کی رگوں میں گرم خون تھا، ایسا کیوں کرتے۔ میرے والد نے پہلی ہی ملاقات میں جو جملہ بولا اس نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ انھوں نے کہا۔

"محمد حسین! شرافت سے میرا قرض ادا کر دے ورنہ تحصیل دار کی کچہری میں گھسیٹ کر لے جاؤں گا۔"

محمد حسین نے بھی اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر اپنے باپ کی اولاد ہے تو ایسا ضرور کرنا۔"

اب مسئلہ دونوں کی دوستی سے زیادہ دونوں کی عزّت کا ہوگیا۔ میرے والد نے اپنے جگری دوست محمد حسین پر مقدمہ دائر کر دیا۔

آگ جب لگ جاتی ہے تو اسے بجھانے والوں کی بہ نسبت اس پر ہاتھ سینکنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ دونوں دوستوں کے حمایتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ یار لوگوں نے چاچے کو اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے وکیل ڈھونڈ دیا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ کچہری میں آیا سنگھ کی دھجیاں اڑا کر رکھ دے گا۔

چاچے محمد حسین کو فکر ہوئی کہ اگر تحصیل دار نے سوال کیا کہ تم نے آیا سنگھ کا قرض ادا کر دیا ہے یا نہیں، تو کیا جواب دوں گا۔

وکیل نے سمجھایا۔ "کہہ دینا دے دیا ہے۔"

"اگر تحصیل دار نے پوچھا کہ رسید کیوں نہ لی تو کیا جواب دوں گا۔"

وکیل نے کہا۔ "کہہ دینا کہ آیا سنگھ گھر پر نہیں تھا۔ میں نے روپیہ اس کی بہو کو دیا تھا۔ بہو سے رسید کیا مانگتا۔"

چاچے کو یہ بات پسند تو نہ آئی لیکن جب بار بار انھیں سمجھایا گیا کہ جنگ میں سب جائز ہوتا ہے تو وہ یہ بیان دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ وکیل نے انھیں یقین دلا دیا کہ آیا سنگھ شرم کا مارا بہو کو کچہری میں پیش نہیں کریگا وہ یقیناً چپ چاپ تسلیم کرلے گا کہ قرض ادا ہو چکا ہے اور بھری کچہری میں معافی مانگے گا کہ اس کی بہو اسے بتانا بھول گئی۔

محمد حسین کے یہاں جو کھچڑی پک رہی تھی اس کا میرے والد کو علم نہیں تھا۔ انھیں یقین تھا کہ محمد حسین کے لیے سوائے اقبال کرنے کے کہ قرض ادا نہیں ہو سکا، اور کوئی چارہ نہیں۔ وہ جب اقبال کریگا تو اس کی مونچھ نیچی ہو جائے گی، اور یہی میں چاہتا بھی ہوں ورنہ قرض کی وصولی کسے چاہیئے۔

جب تحصیلدار کی کچہری میں مقدمہ پیش ہوا تو پورا گاؤں وہاں موجود تھا کہ اس سے بڑا تماشہ گاؤں میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

تحصیلدار نے پوچھا۔

"محمد حسین! تم نے قرض ادا کیوں نہیں کیا۔؟"

"جی میں ادا کر چکا ہوں۔"

یہ سنتے ہی میرے والد کو جیسے بجلی کے تار نے چھو لیا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"تحصیلدار صاحب! ذرا اس بے ایمان سے پوچھئے کہ جب قرض ادا کر دیا تو رسید کیوں نہ لی"۔

تحصیلدار نے محمد حسین کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جواب دو محمد حسین۔"

محمد حسین کو شاید وکیل کا سکھایا ہوا سبق یاد نہیں رہا۔ ان کے منھ سے آواز تک نہ نکلی۔ وکیل نے جب انھیں ٹہوکا دیا تو وہ اس طرح بولے جیسے کسی بچے کو بھولا ہوا سبق یاد آگیا ہو۔

"حضور! جب میں اس کے گھر رقم دینے گیا تو یہ گھر پر نہیں تھا۔ صرف اس کی بہو گھر پر تھی۔ میں نے اسے پیسے دے دیئے۔ اس سے رسید کیا لیتا۔ حضور آپ بے شک اسے کچہری میں بلا کر پوچھ لیں ــــ!!"

یہ سنتے ہی پوری کچہری میں سنّاٹا چھا گیا۔ لوگ سوچنے لگے کیا



آیا سنگھ اپنی بہو کو کچہری میں پیش کرے گا، اگر پیش نہیں کرے گا تو کیا وہ تب مر رہے گا کہ قرض ادا ہو گیا — محمد حسین کے اس بیان کی وجہ سے شاید دونوں دوستوں میں کھا نیاں چل جائیں — لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا —

نہ سینے والں کے چہرے سے ایک خوف کے لیے یوں لگا جیسے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہوں — پھر سنبھلے اور تحصیلدار سے کہا۔

حضور! ہو سکتا ہے کہ محمد حسین سچ کہہ رہا ہو۔ اگر یہ بہو کو رقم دینے آیا تھا تو صرف اتنا بتا دے کہ میری بہو کا رنگ کیسا ہے کالا ہے یا سانولا یا گورا — بس اگر یہ اتنا بتا دے تو آپ میرا مقدمہ خارج کر دیجئے۔

محمد حسین کے لیے یہ بتانا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ تو ہمارے گھر میں اکثر آتے جاتے رہتے۔ میری بیوی یعنی میرے والد کی بہو کو تو انھوں نے ہزاروں بار دیکھا تھا۔ کئی سال سے وہ عید کے موقع پر اسے عیدی دیتے تھے۔ صرف رنگ کیا، وہ تو اس کے نقش و نگار بھی بتا سکتے تھے۔

محمد حسین کے وکیل نے اپنی مونچھوں پر اس طرح تاؤ دیا جیسے مقدمہ اس کے حق میں ہو چکا ہو۔ محمد حسین کو صرف جواب دینا تھا اور تحصیلدار کو باقاعدہ فیصلہ صادر کر دینا تھا۔

وکیل کو بڑا تعجب ہوا جب محمد حسین نے کوئی جواب نہیں دیا — وکیل کے کہنی مارنے کے باوجود ان کی خاموشی نہیں ٹوٹی — لیکن جب تحصیلدار نے اپنی گرجدار آواز میں ان سے جواب دینے کے لئے کہا تو محمد حسین بھری عدالت میں گھٹنوں کے بل گر کر بولے —

مجھے بہو کے رنگ کا پتہ نہیں حضور — میں نے جب اسے دیکھا ہی نہیں تو اس کا رنگ کیسے بتاؤں، میں نے تو جھوٹ بولا تھا کہ میں قرض کی رقم اسے دے آیا ہوں — اب آپ جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔"

کچہری میں وہ شور و غل اٹھا کہ خدا کی پناہ! محمد حسین کے وکیل کی مونچھیں نیچے ہو گئیں — وہ غصے میں محمد حسین سے بولا —

"تم نے تو سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ جیتا ہوا کیس ہرا دیا کیا تمھیں آیا سنگھ کی بہو کے چہرے کا رنگ نہیں معلوم؟ تم نے تو اسے ہزاروں بار دیکھا ہوگا"!

"ہاں دیکھا ہے وکیل صاحب! لیکن کوئی اس طرح اپنی بہو بیٹیوں کے رنگ روپ کا تذکرہ بھری کچہری میں کرتا ہے — ؟ ایک معمولی قرضے سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا میں اپنے خاندان کی عزت نیلام پر چڑھا دیتا — ؟ میرے یار آیا سنگھ کو پتہ تھا کہ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا، تبھی تو اس نے مجھ سے یہ سوال پوچھا۔"!!

□□

یہ خاک و خون کا تماشا یہ کارِ سنگ نہ کر

نسیم فاروقی

غنی ود اکسی مارگ۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۲

کہہ رہی ہے یہ ارضِ گنگ و جمن
دیش کے حق میں نیک ہو کے رہو
زندگی چاہتے ہو گھر کی اگر
بھائی بھائی میں ایک ہو کے رہو

اپنے اپنے لطیف رنگوں میں
پھول جیسے چمن میں کھلتے ہیں
ایسے آپس میں ایک ہو جاؤ
جیسے پانی میں رنگ ملتے ہیں

تعصبات سے انسانیت کو تنگ نہ کر
یہ خاک و خوں کا تماشا یہ کارِ سنگ نہ کر
قدم قدم پہ بچھا دے محبتوں کے گلاب
مرے ندیم خدا کی زمیں پہ جنگ نہ کر

سب کی اسی مٹی سے ہوئی ہے تجسیم
مل جل کے ہوئی ان سے وطن کی تنظیم
گنگا کے تو ممنون سبھی ہیں یارو
کرتار ہوں، یزداں ہوں کہ رام اور رحیم



نامی انصاری
۹۹/۲۹۵ نالہ روڈ۔ چمن گنج۔ کانپور: ۲۰۸۰۰۱

کلامِ اقبال میں قومی یکجہتی کے عناصر

علامہ اقبال ایک ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شاعر تھے، ان کی فکری شاعری کا غالب رجحان انسان دوستی ہے جس کے مظاہر کہیں نمایاں کہیں پس پردہ، ان کی تمام نظموں اور غزلوں میں موجود ہیں۔ اقبال نے عالمی عصری افکار و مسائل کو جس طرح اپنی شاعری میں جذب کیا ہے اس کی مثال ان سے پہلے اور بعد کی اردو شاعری میں مفقود ہے۔ انہوں نے دنیا کو گھوم پھر کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وقت کے تمام افکار و نظریات کا غور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ مابعد الطبیعاتی نظام افکار کے رمز شناس اور عصری فکر و فلسفے کے کھرے واقف کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت اور اشتراکیت سے لے کر قرآنی نظام فکر تک کوئی راہ انھوں نے اچھوتی نہیں چھوڑی۔ انھیں کے بیچوں بیچ ان کی وطن دوستی کی بھی ایک راہ تھی جس کو انھوں نے اپنے دل نشین نغموں کے چراغوں سے منور کر دیا۔ ان کے ابتدائی کلام ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سے لے کر دورِ آخر کی نظم "شعاعِ امید" تک وطن دوستی پر مشتمل نظموں کی ایک خوبصورت کہکشاں نظر آتی ہے جس کی چمک دمک کچھ لوگوں کی انتہاپسندانہ جذباتیت کے باوجود آج تک ماند نہیں پڑی اور اقبال کی وطن دوستی کا جذبہ آج بھی اہل وطن کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے ہندستان کے پہلے خلاباز کیپٹن راکیش شرما سے جب پرواز کے دوران، اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے پوچھا تھا ——— کہ خلا سے ہندستان کیسا لگ رہا ہے تو راکیش شرما نے برجستہ کہا تھا:

"سارے جہاں سے اچھا"———

اقبال کا ترانۂ ہندی اب ہندستان کا قومی ترانہ ہے اور سرکاری تقریبات میں اس کو دیش گان کے طور پر اجتماعی طور سے یا فوجی دھنوں پر گایا جاتا ہے۔ ترانۂ ہندی سے تو سارا ملک واقف ہو چکا ہے مگر اقبال کی وطن دوستی کے موضوع پر دیگر خوبصورت نظمیں صرف چند پڑھے لکھے لوگوں تک ہی محدود ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع پر ان کی تمام اردو نظموں کو جن میں تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، ہندستانی بچوں کا قومی گیت۔ سوامی رام تیرتھ۔ رام۔ نانک اور شعاعِ امید شامل ہیں، مختصر کتابچوں کی شکل میں ہندی اور جنوبی ہند کی دیگر زبانوں میں شائع کیا جائے تاکہ برادرانِ وطن کو یہ خاطر نشین ہو جائے کہ اقبال کا فکری منظر نامہ کتنا رنگا رنگ ہے اور سرزمین ہند کے افکار و اشخاص سے ان کو کتنا گہرا شغف تھا۔

فکرِ اقبال کو ایک خاص مذہب کے تناظر میں محدود کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ان کے طائرِ فکر کی پرواز لامحدود فضاؤں میں تھی۔ ان کے ہم عصروں میں اردو، فارسی، عربی سمیت دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس نے اقبال کی طرح، کائنات کے سارے رنگوں کو اپنی شاعری میں جذب کر لیا ہو۔ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے تناظر میں ان کی جو نظمیں ہیں ان میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ محاسن بھی اتنے رچے ہوئے ہیں کہ یہ نظمیں آج بھی اتنی ہی زندہ و تابندہ نظر آتی ہیں جیسی اقبال کے زمانے میں تھیں۔

فکرِ اقبال کا ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ وہ صرف ہندستان کے



تو وہ فلسفے ہی کی ثنا خواں نہیں ہے بلکہ ہر دور ہندوستان کے مسائل کو بھی بیدار آنکھوں سے دیکھتی ہے تجزیہ کرتی ہے، للکارتی ہے، غیرت دلاتی ہے اور برادران وطن کو ان کے افکار و اعمال کا آئینہ دکھاتی ہے۔

اقبال اگر ایک طرف ہمالہ کی عظمت و رفعت کے ثنا خواں ہیں تو دوسری طرف ان کو یہ غم بھی ستاتا ہے کہ ؎

بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

وہ جتنے آزردہ مسلمانوں کے طرز عمل سے ہیں اتنے ہی افسردہ ہندوؤں کی بے حسی اور بے عملی سے بھی ہیں۔ ان کے نزدیک شیخ اور برہمن دونوں انسان کی بے عملی کی علامت بن گئے ہیں اور انسانیت ان دونوں کے درمیان گم ہو گئی ہے۔

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

پیکرِ دیں صدق مقال، اکل حلال
خلوت و جلوت تماشائے جمال

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

مثنوی اسرار خودی میں شیخ، برہمن کو اس کے منصب گم کردہ کی یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے:۔

تا شدی آوارۂ صحرا و دشت
فکرِ بیباکِ تو از گردوں گزشت

با زمیں در ساز اے گردوں نورد — در تلاشِ گوہرِ انجم مگرد
من نگویم از بتاں بیزار شو — کافری شائستۂ زنار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن — پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ — درخورِ طوفِ حریمِ دل نۂ

ماندہ ام از جادۂ تسلیم دور
تو ز آذر، من ز ابراہیم دور

حقیقت اولیٰ یہ ہے کہ اقبال کا اردو و فارسی کلام وطن دوستی اور قومی یک جہتی کے جذبہ سے معمور ہے۔ وہ اپنی فکر کا اسلامی تشخص برقرار رکھتے ہوئے بھی عالم انسانیت کی بیداری کے نقیب ہیں اور ان دونوں میں یقیناً کوئی تضاد نہیں ہے۔ تصویر درد اور ترانۂ ہندی، ان کی شاعری کے دور اول کی نظمیں ہیں جو سر تا سر حب الوطنی اور وطن کے لیے فکر مندی کے جذبات میں شرابور ہیں۔ تصویر درد، انہتر اشعار اور آٹھ بندوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جس میں ہندوستان کی زبوں حالی کا نقشہ ہے، مستقبل کے اندیشے ہیں، محبت، رواداری اور اتحاد کے ترانے ہیں اور شاعر کی اپنی دل سوزی اور درد مندی کے منظر نامے ہیں۔ یہ نظم اب سے تقریباً ۹۰ برس قبل لکھی گئی تھی مگر اس میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو موجودہ ہندوستان کے حالات پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔ اس لیے اس نظم کی اہمیت اب بھی برقرار ہے مثلاً ؎

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو، جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

اور ؎

مجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا، اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا
شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

اسی موضوع پر اقبال کی آخری زمانے کی نظم "شعاعِ امید" ہے ؎

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ، صفتِ جوہرِ سیماب



آفتاب اور اس کی شعاعوں کے بیچ مکالماتی استعاراتی یہ نظم نہ صرف اقبالؔ کی اپنے ملک کے لیے دل سوزی اور دردمندی کے جذبات کی امین ہے بلکہ ہیئت کے اعتبار سے بھی اور اپنی خوبصورت امیجری کے اعتبار سے بھی یہ اقبالؔ کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم کے آخری بند میں اقبالؔ کی فکر، مختصر ترین اور موثر ترین لفظوں میں ہندستان کے ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرلیتی ہے ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

اقبالؔ بنیادی طور پر یہاں کے شیخ و برہمن سے مایوس نہیں ہیں تاہم ان کی بے عملی اور بے فکری سے مضطرب ہیں۔ اقبالؔ کا یہ اضطراب بے بُنیاد نہیں تھا۔ ان کی رحلت کے ۵۵ برس بعد شیخ و برہمن ایک نئی آویزش میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ متحد ہو کر شعاعِ امید کو زمانے پر آشکار کرتے، انھوں نے اپنے اردگرد عصبیت کی مضبوط دیواریں کھڑی کرلی ہیں جہاں شعاعِ امید کا بار پانا بھی مشکل ہے۔ اقبالؔ نے اپنے فکاہیہ کلام میں اس نکتے کو ذرا دوسرے انداز میں واضح کیا ہے

اے شیخ و برہمن سنتے ہو، کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

"بالِ جبریل" کا آغاز ہی بھرتری ہری کے اشلوک کے منظوم ترجمے سے ہوتا ہے ؎

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اسی کتاب میں "پیر و مرید" کے عنوان سے جو مکالماتی نظم ہے اس میں منجملہ اور باتوں کے، مریدِ ہندی ہندستان کے بارے میں بھی ایک چبھتا ہوا سوال کرتا ہے ؎

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

پیرِ رومی اس کا جواب دیتے ہیں ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

حقیقت تو یہ ہے کہ دورِ حاضر میں بھی "حیلہ و بے شرمی" کے کام تواتر سے کیے جارہے ہیں اور بدقسمتی سے ان پر شرمندگی کے بجائے فخر و مباہات کا اظہار کیا جارہا ہے۔ کارِ مرداں کرنے والے تو رخصت ہوگئے۔ کارِ دوناں کرنے والے ہندستان کی شبیہ کو طاقت کے زعم میں داغدار بنانے کے درپے ہیں اور شرافتِ نفس کے الفاظ اپنے معنی کھوتے جارہے ہیں۔۔۔!!

اقبالؔ کے آدرش ہندستان کی سب سے اچھی تصویر "نیا شوالہ" میں ملتی ہے۔ بانگِ درا میں شامل یہ مختصر سی نظم گویا ہندستانی قومیت کا میگنا کارٹا ہے۔ اقبالؔ کے تصورات میں جو ہندستان بسا تھا، نیا شوالہ میں اس کے خد و خال واضح انداز میں ملتے ہیں۔ اہلِ وطن کو اقبالؔ کے تصورات کی یاد دلانے کے لیے اس نظم کے چند شعر پیش ہیں ؎

"نیا شوالہ"

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دُنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں



ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس نظم میں اقبال کی قومی یک جہتی کا تصور بڑے دل نشیں انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کے مخاطب شیخ و برہمن دونوں ہیں اور وہ دونوں سے یا یوں کہیے کہ ہندوستان میں رہنے والے دونوں بڑے فرقوں سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں

آج یہی وقت کی آواز ہے۔ اقبال کے زمانے میں بھی یہی وقت کی آواز تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں زبردست تبدیلیوں کے باوجود غیریت کا یہ بھاری پتھر جوں کا توں پڑا ہے اور ہم باوجود اپنی کوششوں کے اس پتھر کو کنارے نہیں لگا سکے۔ باہمی اعتبار اور اعتماد کی وہ فضا نہیں قائم کر سکے جو ایک نئے شوالے کی تعمیر کا بنیادی پتھر بن سکے۔ ظاہر ہے کہ جب بنیادی پتھر ہی اب تک نصب نہیں کیا جا سکا تو دنیا کے تیرتھوں سے اونچا وہ اپنا تیرتھ کیسے بنتا جس کا کلس دامنِ آسمان تک پہونچتا ہو۔ دنیا کا سب سے اونچا تیرتھ استعارہ ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم بننے کا اور اس منزل تک پہونچنے کی ساری تگ و دو اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک خود ہماری اپنی صفوں میں اتحاد، باہمی رواداری، اعتماد اور اخلاص کی مستحکم فضا نہ قائم ہو اور ہم قدم سے قدم ملا کر ایک بیدار اور سرد و گرم چشیدہ قوم کی طرح آگے بڑھنے کو اپنا دھرم ایمان نہ بنالیں۔ بقول اقبال ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

کچھ لوگوں کا اعتراض ہے کہ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اپنی ہندوستانی وطنیت سے گہرا شغف رکھتے تھے مگر بعد میں وہ ایک عالمگیر وطنیت کے تصور کی طرف راغب ہو گئے۔ اس دور میں ان کے تخاطب کا انداز بھی بدل گیا اور وہ ایک خاص فرقے کے ماضی و حال میں اپنی شاعری کا جواز ڈھونڈنے لگے۔ یہ اعتراض اگرچہ بادی النظر میں صحیح معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً یہ ایک ایسی غلط فہمی پر مبنی ہے جو اقبال کے اُردو و فارسی کلام کا بھرپور مطالعہ نہ کرنے کی صورت میں عام ہوئی۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اگر ہندوستانی وطنیت کے بارے میں ان کے خیالات بدل گئے تھے تو انھوں نے "بانگِ درا" میں شامل حب الوطنی کے جذبوں کا اظہار کرنے والی نظموں کو مسترد کیوں نہیں کر دیا، جیسا کہ وہ "ہوشیار از حافظِ صہبا گسار" والی نظم کو کر چکے تھے۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ وطن سے محبت، قومی اتحاد اور رواداری کا جو جذبہ ان کی ابتدائی نظموں میں ملتا ہے وہی جذبہ ان کی دورِ آخر کی نظموں میں بھی مزید ترفع کے ساتھ موجود ہے۔ شعاعِ امید کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان کے آخری دور کے فارسی کلام میں بھی اس جذبے کی روشنی اور گرمی موجود ہے۔ "جاوید نامہ" میں "زندہ رود" (اقبال) جب اپنے رہبر و مرشد رومی کی معیت میں ہفت افلاک کی سیر کرتا ہے تو جہاں اس کی ملاقات منصور حلاج، قرۃ العین طاہرہ، غالب، ٹیپو سلطان اور دیگر مشاہیر سے ہوتی ہے، وہیں وہ فلکِ قمر میں جہاں دوست اور طاسین گوتم میں گوتم بدھ سے بھی ملتا ہے۔ 'جہاں دوست' کو اقبال کے شارح یوسف سلیم چشتی نے لغوی معنی کے اعتبار سے وشوامتر سمجھا ہے جبکہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جہاں دوست کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کی وجہ سے ان کو شیوجی مہاراج قرار دیا ہے۔ جہاں دوست کا تعارف اقبال نے اس طرح پیش کیا ہے ؎

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمہ اش روشن نہاد
موئے سر بستہ و عریاں بدن
گردِ اُو مارے سفیدے حلقہ زن
گفت با رومی کہ ہمراہِ تو کیست
در نگاہش آرزوئے زندگیست

مرشد رومی کا جواب تھا ؎

مَردے اندر جستجو آوارۂ ثابتِ با فطرتِ سیارۂ



اس کے بعد اقبال براہ راست جہاں دوست سے ہندستان کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو جہاں دوست اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں ہندستان کی بیداری اور عظمتِ رفتہ کی باز آفرینی کا مژدہ سناتے ہیں ؎

اے خوش آں قومے کہ جانِ او تپید
از گلِ خود خویش را باز آفرید
عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے
کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیں دارے کہ خفت اندر حرم

ترجمہ: وہ قوم بڑی مبارک ہے جس کا دل مضطرب رہتا ہے اور جو اپنی خاک سے خود اپنی باز آفرینی کرتی ہے۔
عرش والوں کے لیے وہ ساعت صبحِ عید کے مانند ہے جب ملت کی آنکھ بیدار ہوتی ہے۔
صنم کے سامنے بیدار دل کافر، اس دیندار سے بہتر ہے جو حرم کے اندر بھی سویا رہتا ہے۔

جہاں دوست ہندستان کی اندرونی قوت سے بہت پراُمید ہیں مگر جب "رُوحِ ہندوستاں نالہ و فریاد می کند" کے عنوان کے تحت ہم اقبال کے یہ اشعار پڑھتے ہیں تو اس رجائیت آمیز منظر نامے کا دوسرا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے ؎

شمعِ جاں افسردہ در فانوسِ ہند
ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش
زخمہٴ خود کم زند بر تارِ خویش

ترجمہ: ہندستان کے فانوس میں شمعِ جاں افسردہ ہے کیوں کہ یہاں کے لوگ اپنے ناموس سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔
مردانِ ہند خود اپنے اسرار سے ناواقف ہیں کیوں کہ وہ اپنے (وجود کے) تاروں کو اپنے مضراب سے نہیں چھیڑتے۔

جاوید نامہ سے مندرجہ بالا اشعار پیش کرنے کا مطلب صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اقبال اپنی عمر کے آخری دور میں بھی ہندستان کے سیاسی و معاشرتی احوال سے بیگانہ نہیں تھے یہاں تک کہ سیرِ افلاک میں بھی انھوں نے روحِ ہندستان کے اضطراب کو نہ صرف نمایاں کیا بلکہ جہاں دوست کی زبان سے اس کے لئے عمل کا ایک راستہ بھی بتایا۔ خودی کے استحکام کا راستہ محبت اور پریم سے دلوں کے جیتنے کا راستہ۔ انھوں نے غدارانِ وطن کی ان الفاظ میں سرزنش بھی کی ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

آخر میں یہ عرض کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اقبال ساری عمر حب الوطنی اور قومی اتحاد کے جذبے سے سرشار رہے اور انھوں نے ہمیشہ ہندستان کی عظمت اور سربلندی کے نغمے گائے۔ وہ ایک ایسے ہندستان کے نقیب تھے جہاں محبت، رواداری، امن و انصاف اور اخلاق و انسانیت کو قوم کا قیمتی ورثہ تصور کیا جاتا ہو اور ان آدرشوں کے تحفظ کے لیے قوم اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھتی ہو۔

اقبال غلام ہندستان میں پیدا ہوئے اور غلام ہندستان میں ان کی وفات بھی ہوئی۔ مگر آزادی اور بیداری کے جو تصورات ان کی شاعری میں موجزن ہیں وہ ہماری قومی یک جہتی کا قیمتی سرمایہ ہیں، جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر نہ تھے بلکہ پوری قوم کی بیداری کی علامت تھے اور ان کے افکار کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا جانا چاہیے۔

□□

نئے چیلنج نئے مسائل ... صـ۱۱ کا بقیہ

سماج سدھار کی سطح پر بھی بہت کام کرنے ہیں۔ سماجی پسماندگی بھی انتشار پسند اور احیاء پسند تحریکوں کو پنپنے کی بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ آج بھی ہمارے سماج کو راجہ رام موہن رائے، سر سید احمد خاں، ویریشلنگم، گوکھلے اور رانا ڈے وغیرہ جیسے ریفارمروں کی سخت ضرورت ہے جو قوم کو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے بدلے ہوئے مزاج سے ہم آہنگ کریں۔



ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور

سیکولرزم اور اُردو کا شعری ادب

اُردو ادب کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اپنے ابتدائی دور سے لے کر آج تک ہمیشہ اور ہر رنگ میں سیکولر اسپرٹ اور سیکولر کردار کا حامل رہا ہے۔ اُردو ایک ایسی زبان ہے جس کی تشکیل ہی سیکولر طرز پر ہوئی۔ یہ زبان ہندستان میں دو مذہبی فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ربط ضبط، میل جول اور رشتۂ اتحاد و یگانگت سے پیدا ہوئی۔ اس سیکولر تشکیلی عمل کے تحت وجود میں آنے والی اُردو زبان میں پروان چڑھنے والے ادب کا مزاج و کردار بھلا سیکولر کیونکر نہ ہوتا۔

ہر زبان کے ادب کی اصل پہچان اس کے شعری حصے سے ہوا کرتی ہے اور ہر زبان کا شعری ادب اس کے تخلیقی ادب کا معتبر ترین حصہ ہوتا ہے اُردو زبان کا شعری ادب مکمل طور پر سیکولر رنگ و آہنگ رکھتا ہے۔

اُردو کے شعری ادب کے گلشن کی آبیاری مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے شعراء کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ ہر زمانے میں اُردو کے شاعروں کی صف میں مسلمان سخن گروں کے دوش بدوش ہندو اہلِ سخن بھی شامل رہے ہیں اور ان کے ہم قدم سکھ، پارسی اور عیسائی شعراء بھی رہے ہیں۔ متعدد مذہبی عقیدے کے شاعروں کی موجودگی میں اردو شاعری کا رنگ و آہنگ اور اس کا کردار غیر سیکولر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اُردو کے شعری ادب میں ایک مذہب کے ماننے والے شعراء نے دوسرے مذہب کے بزرگوں، تہواروں اور عقائد و تقریبات پر نظمیں لکھنے کی ایسی شاندار سیکولر روایت قائم کی ہے جس کی نظیر عالمی ادب میں بھی نہیں مل سکتی۔ اردو کے مسلمان شاعروں نے کرشن، رام، مہادیو، نانک کے علاوہ ہولی، دیوالی اور جنم اشٹمی وغیرہ پر ان گنت نظمیں کہی ہیں اور غیر مسلم شعراء نے پیغمبر اسلام کی شان میں اور عید، شب برات اور محرم وغیرہ پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں اُردو کے شعراء نے جتنی کثیر تعداد میں شعری تخلیقات پیش کی ہیں اتنی دنیا کی کسی دوسری زبان کی شاعری میں نہیں ملتیں۔

اُردو شاعری کی ہر صنف میں سیکولر نقطۂ نظر اور سیکولر رجحانات کے نقوش ہر دور میں اجاگر رہے ہیں۔

قصیدے میں تشبیب کا حصّہ ادبی اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اُردو کے قصیدوں کی تشبیب کا رنگ ہمیشہ سیکولر رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُردو میں جو مذہبی قصیدے لکھے گئے ان کی تشبیب میں بھی سیکولر رنگ نمایاں رہا ہے جس کی بہترین مثال محسن کاکوروی کے قصیدے "مدیح خیر المرسلینؐ" کی تشبیب میں نظر آتی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

پیغمبر اسلامؐ کی نعت محسن نے ہندو مذہب کے اوتار شری کرشن کے پس منظر میں پیش کی ہے اور یہ سیکولر رجحان و رویّے کا عدیم المثال نمونہ ہے۔

اُردو مثنویات کا سارا اثاثہ ایسی کہانیوں پر مشتمل ہے جن کا تانا بانا اسلام اور ہندو مذہب کے عناصر کی آمیزش سے بنایا گیا ہے اور جن کی



فضا میں مشترکہ ہندو مسلم کلچر بسا ہوا ہے۔ اس طرح تمام اُردو مثنویوں کا رنگ و آہنگ سیکولر ہے۔

مرثیہ اس لحاظ سے ایک مذہبی چیز ہے کہ اس میں اسلامی تاریخ سے تعلق رکھنے والے سانحۂ کربلا کا بیان ہوتا ہے، لیکن اس مذہبی چیز کو بھی اُردو کے مرثیہ نگاروں نے اس طرح سیکولر روپ دیدیا ہے کہ اس میں شہدائے کربلا کے اسلامی کرداروں کو ہندستانی رنگ میں اور کربلا کے واقعات کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی تہذیب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

اُردو کے شعری ادب کی سب سے جاندار صنفیں غزل اور نظم ہیں۔ بالخصوص عصر جدید میں تو عملاً یہی دونوں اصناف اُردو شاعری کی زندہ صنفوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ دونوں صنفیں سیکولر تصوّرات کے جلوؤں سے معمور ہیں۔

غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے اور خود غزل کی آبرو اس کا بھرپور سیکولر کردار ہے۔ اُردو غزل ہر عہد میں انتہائی واضح طور پر سیکولر اندازِ فکر کی آئینہ دار رہی ہے جس کے ثبوت کے طور پر ابتدائی، وسطی اور موجودہ دور کے تین شعر پیش کرتا ہوں۔ پہلا شعر محمود کا ہے جو دکن کے سلطان محمد قلی قطب شاہ سے کچھ پہلے کا شاعر ہے ؎

نا کفر پچھانے دلِ حیراں و نہ دیں کوں
از نقشِ جبیں و راست خبر نیں ہے نگیں کوں

دوسرا شعر وسطی دور کے مشہور شاعر مرزا غالبؔ کا ہے، فرماتے ہیں ؎

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تیسرا شعر عہدِ حاضر کے نامور غزل گو مجروحؔ سلطان پوری کا ہے ؎

ہم ہی کعبہ ہم ہی بت خانہ، ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجیے

اُردو میں نظم کا پہلا اہم شاعر نظیرؔ اکبر آبادی کو قرار دیا جاتا ہے اور نظیرؔ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سے زیادہ سیکولر شاعر اُردو ہی نہیں بلکہ کسی بھی ہندستانی زبان میں شاید ہی ہو سکے۔

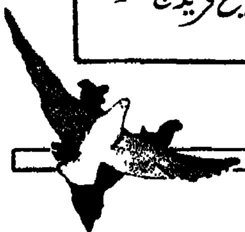
نظیرؔ نے اپنے مذہب کی شخصیتوں اور تقریبات کے متعلق جتنی نظمیں کہی ہیں ان سے کہیں زیادہ نظمیں ہندو اوتاروں، دیوتاؤں اور تہواروں پر لکھی ہیں۔ نظیرؔ کی پوری شاعری میں وہ ہندستان پوری طرح رچا بسا ہے جو مختلف مذاہب کا مسکن ہے اور اسی لیے اس کی شاعری مکمل طور پر سیکولر رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اُردو نظم نگاری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جو ہندستان میں آزادی کی جدوجہد کا زمانہ ہے۔ اس دور میں اُردو کے بے شمار چھوٹے بڑے نظم نگاروں نے اپنی نظموں کے ذریعہ اہلِ ہند کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات اُبھارنے کے سلسلے میں سیکولر رجحانات کی جوت جس انداز میں جگائی ہے وہ صرف اُردو ادب کی تاریخ کا نہیں بلکہ ہندستان کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ اسی دور کے شاعر علامہ اقبالؔ کی بعض نظمیں مثلاً "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ" وغیرہ سیکولر شاعری کے شاہکاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آزادیٔ ہند کے ظہور کے آس پاس کے زمانے میں جب ہندستان کے بیشتر حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے اور سیکولر قومیں سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ امتحان کی اس گھڑی میں بھی اُردو شاعری نے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ سیکولر افکار و خیالات کی تبلیغ کر کے فرقہ واریت کی یورش کو ختم کرنے میں لائقِ فخر خدمات انجام دیں۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک کے رہنماؤں نے سیکولر بنیادوں پر ہندستان کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ اس عرصے میں اُردو کے شعرا نے بھی اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ سیکولر رجحانات کو ہندستانی عوام میں فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

□□

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام
شیخ فرید گنج شکر



عتیق انور صدیقی
نیشنل میوزیم، جن پتھ
نئی دہلی

عہد اکبری میں ویدانت اور وحدت کا تصوّر

عہد اکبری کا ہندستان رقبے، آبادی اور دولت کے اعتبار سے ایک ایسا عظیم ملک کہلانے کا مستحق تھا جس کی سرحد کابل وکشمیر اور کوہ ہمالیہ سے لیکر کم وبیش کنیا کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور اس مغلیہ حکومت کا شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر تھا جس نے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک کے عرصے میں پورے ہندستان کو سیکولر نظریہ، قومی ہم آہنگی اور انسانی بھائی چارہ کے دھاگوں سے اس طرح مربوط کر رکھا تھا جس نے آنے والی نسلوں کو سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی شعور عطا کیا۔ اور ملک ومذہب کے آپسی ٹکراؤ کے بجائے دونوں میں ایک ایسا رشتۂ ہم آہنگی پیدا کیا، جس نے پوری دنیا کو اپنی عظمت اور وحدت کا یقین دلایا۔ خود اس براعظم کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی عظیم سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی ـــــ اکبر نے نہ صرف ہندستان کو سیاسی اتحاد سے روشناس کرایا بلکہ ایک ایسا نیا قومی تصور دیا جس نے وسیع تہذیبی ہم آہنگی پیدا کرکے معاشرے کی فکری صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ یہی وہ نظام فکر تھا جس نے اس عظیم سلطنت کو جنم دیا تھا۔

عہد اکبری میں جب مذہب اور قومیت کے تصور میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی تو "دینِ الٰہی" جیسا مذہب ابھر کر سامنے آیا، جس نے ویدانت اور وحدت کے معنی کو تقویت بخشی۔ ان دونقطوں سے عوام میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دراصل مذہب اس خدا کی ذات کو ماننے کا نام ہے جو ایک ہے۔ یہی ویدانت کا فلسفہ ہے اور یہی وحدت کی بھی تشریح ہے۔

آج ہندستان کے موجودہ حالات کو دیکھ کر ذہن ان گزری صدیوں میں پہونچ جاتا ہے جب آج سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے شہنشاہ اکبر کو بھی کم وبیش اسی طرح کے مذہبی مد وجزر سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس وقت بھی یہ وہی ملک تھا جس میں ہر مذہب اور عقیدے کے ماننے والے موجود تھے۔ مگر اکبر نے جس سیاسی شعور اور مذہبی رواداری کو قائم رکھتے ہوئے مسئلہ کو سلجھایا اس بات کو جاننے کے لئے عہد اکبری میں ویدانت اور وحدت کے تصور پر غور کرنا ہوگا۔

شہنشاہ اکبر کا عہد اگر صرف مذہبی پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے اپنے عہد میں مذہبی ترمیم وتشکیل اور مذہب میں دخل اندازی کی جو بھی پیش قدمی کی اس کی وجہ سیاسی رہی ہوگی۔ مغلوں کی قائم کی ہوئی حکومت کو ابھی صرف تیس سال ہوئے تھے جس میں زیادہ تر عرصہ حکومت کو مضبوط بنانے اور علاقوں کو فتح کرنے میں گزر گیا۔ اور اکبر کو جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی پڑی تو سیاسی اور معاشی اعتبار سے مغلیہ حکومت زیادہ بہتر نہ تھی۔ ایسے پرآشوب دور میں ستم بالائے ستم یہ کہ مذہبی رہناؤں کا شعار ایک دوسرے کی مخالفت بن گیا تھا مذہب کے ان رہناؤں میں نہ تو ذہنی ہم آہنگی تھی اور نہ ہی مقصد کا اتحاد۔ پورے ملک میں ان رہناؤں کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ اکبر کے لیے حکومت چلانا دشوار ہونے لگا ـــ ایسے ماحول میں جہاں اس طرح کی کشاکش ہو، اس میں اگر کوئی بھی انسان اور سلجھے ہوئے ذہن کا شخص مذہب سے متنفر ہونے لگے تو حیرت کی بات نہیں اور پھر بادشاہ کی تو بات ہی اور تھی جس کو اتنا بڑا ملک چلانا تھا جس کی پورے ایشیا میں منفرد پہچان



بننے لگی تھی۔

عہد اکبری کے اس مذہبی اور سیاسی عروج و زوال کی ڈگمگاتی کشتی کو پار لگانے کے لیے ایک ایسے مذہب، ایسے نظریے اور ایسے عقیدے کی ضرورت تھی جس میں تمام مذاہب کا احترام ہو، جس میں تنگ نظری سختی اور ہٹ دھرمی سے پرہیز کیا گیا ہو۔ ایسے معتدل مذہب کو محض نام کے لیے "دینِ الٰہی" کہہ کر اکبر نے ان سب کو خاموش کرنا چاہا جن کی ضدوں کی وجہ سے مغل حکومت کی بنیاد ہلنے کا خطرہ پیدا ہونے لگا تھا۔

اس طرح اکبر نے پہلے خود اپنے ملک کے تمام مذاہب کے رہنماؤں کو یکجا کر کے ہم آہنگی کے تصور کے ساتھ ایک ایسے زاویۂ نظر کو تلاش کرنا چاہا جس میں ہر مذہب کا احترام ہو۔ بھلے ہی ان کے طریقۂ عبادت مختلف ہوں، مگر خدا تک سب کی رسائی ممکن ہو۔ اس خیال کے پیشِ نظر اکبر کے ذہن میں ویدانت اور وحدت کا تصور ایک ایسے حل کی شکل میں نمودار ہوا، جس سے مختلف مذاہب کی بدلتی ہوئی شکلوں کی ایک تصویر بن کر ابھر سکتی تھی۔ کیوں کہ ویدانت اور وحدت کی جڑیں ایک ہی جگہ سے پھوٹتی تھیں۔ اس طرح اکبر نے عوام کو اس خیال سے روشناس کرایا کہ وہ خواہ کسی بھی مذہب کے پیروکار کیوں نہ ہوں۔ سب کے اعتقادات کا سرچشمہ آخر کار خدا کی ہی ذات سے وابستہ ہے اور دراصل ہر مذہب میں خدا کی ذات ہی کو اصل عبادت کے لائق سمجھا گیا ہے۔ ہندستان میں وید مقدس کو اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مشتمل پہلی کتاب مانا جاتا ہے جس میں ایشور تک پہنچنے کا راستہ سمجھایا گیا ہے۔ مگر اس کی تاویلیں انسان نے خود کر ڈالیں۔ اور خدا یا ایشور تک رسائی کا ذریعہ اوتار، دیوی، دیوتا یا بعض دوسری طاقتوں کو مان لیا۔ اور یہیں سے اختلافات کی گتھیاں اس قدر الجھ گئیں کہ خود گوتم بدھ نے ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے خدا تک رسائی کا ذریعہ صرف دھیان اور یکسوئی کے ساتھ عبادت کرنا بتلایا۔ ان کے یہاں خدا یا ایشور کی کوئی شکل نہیں بتلائی گئی جس کو سنسکرت میں "نراکار" کہتے ہیں۔ ویدانت دراصل دو لفظوں سے مل کر ایک لفظ بنا ہے یعنی "وید اور انت"۔ وید کے اصولوں کا جہاں سے خاتمہ یا انت ہوتا ہے وہاں سے ویدانت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں مختلف اپنشد اور اساطیر کے ذریعہ ایشور کو نراکار سروپ یعنی خدا کی ذات کو بغیر کسی شکل کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کو سب سے بڑی طاقت اور سب سے بلند ہستی کا درجہ حاصل ہے۔ یہی تصور سکھوں کے گرو گوبند سنگھ جی کا بھی ہے۔ اور یہی خیال وحدت کے پس پردہ بھی گامزن ہے۔

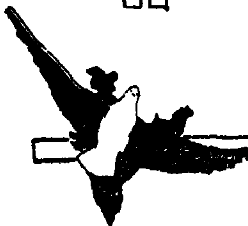
اکبر نے ویدانت کے مرکزی خیال اور لفظِ وحدت کے لغوی و فکری معنوں کو یکجا کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہب چاہے کوئی بھی ہو اس کے طریقۂ عبادت میں بظاہر فرق ہو سکتا ہے مگر جس کی عبادت کی جاتی ہے وہ بہرحال ایشور یا خدا ہی ہے۔

اکبر نے ایک ایسے نظریئے کو متعارف کرایا جس میں ویدانت کا تصور ہو یا وحدت، اس کی مزید تاویلوں سے پرہیز کر کے صرف خدائے برحق کو تسلیم کیا گیا اور کہا کہ خدا یا ایشور بغیر کسی شکل کے اور نراکار ہے اور اس تک پہنچنے یا اس کو خوش کرنے کا ذریعہ مذہب میں سختی برتنے کے عمل میں نہیں ہے بلکہ انسان دوستی، محبت اور آپسی بھائی چارہ میں ہے۔ خدا کے نزدیک وہ شخص قابلِ ملامت کہلائے گا جس نے عبادت گاہیں تو بہت بنوائیں مگر اس نے کسی سے محبت نہ کی، کسی کے دل کو خوش نہ کیا۔

اور قابلِ تعریف ہے خدا کے نزدیک وہ بندہ جس نے محبت کا درس دیا، لوگوں کی مدد کی، بھائی چارہ اور انسان دوستی پر عمل کیا۔ بھلے ہی اس نے عبادت گاہیں نہ تعمیر کی ہوں۔ اکبر کا عہد مذہبی فکر و فلسفہ کے لحاظ سے ایک زرّیں دور تھا، جس میں ویدانت اور وحدت کے تصوّر کو ایک سانچے میں ڈھالا گیا۔ وید مقدس، رامائن، مہابھارت، پنچ تنتر، حمزہ نامہ، شاہنامہ، گلستان و بوستان اور احادیث کے تراجم سنسکرت، ہندی، فارسی اور بعض دیگر ہندستانی زبانوں میں کیے گئے تاکہ ہندو، سکھ اور اسلام کے ماننے والے ایک دوسرے کے ادب اور مذہب کو سمجھ سکیں اور آنے والی نسلوں کے لیے چراغ رہگزر بن سکیں۔

□□





راجندر بہادر موج
موج مارگ۔ فتح گڑھ۔ یوپی

قومی یک جہتی

ہندستان مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور الگ الگ نسل کے لوگوں کا ملک ہے۔ ان کے رسم و رواج بھی جدا جدا ہیں مگر بنیادی طور پر جو چیز ان مختلف النوع باشندوں کو تسبیح کی طرح ایک دھاگے میں پروئے رہی ہے وہ بھارتیتا یعنی ہندستانیت کا جذبہ ہے۔ ہم پہلے ہندستانی ہیں بعد میں کچھ اور۔ یہی ہندستانیت کا جذبہ ہمارے افکار اور اعمال سے ظاہر اور دل و دماغ پر طاری رہتا ہے۔ یہی جذبہ ملک کی سالمیت کا ضامن ہے۔

ہندستان میں مختلف قوموں، ذاتوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ آئے مگر یہ سب ہندستانی ثقافت میں ایسے ضم ہو گئے کہ انھیں کوئی طاقت الگ نہیں کر سکی۔ بیرونی قوموں کے ساتھ نئے رسم و رواج اور نئی تہذیبیں آتی رہیں اور اس کے ساتھ ملک کی یک جہتی کا روپ نکھرتا رہا اور جو بھی یہاں سکونت پذیر ہوا وہ صرف ہندستانی بنا۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا عقیدے سے رہا ہو۔ یہ سب مل کر ہمارے ملک کی شناخت بن چکے ہیں۔

ہمارے مندر، مسجد، گوردوارے اور گرجا گھر ایک ہی خالق کائنات کے عبادت خانے ہیں۔ اس خالق کو خواہ کسی بھی نام سے پکاریں۔ یہ سب متبرک مقامات ہیں، خیر کے مقامات ہیں، شر کے نہیں۔

مہرشی والمیک اور مہاکوی تلسی داس نے مریادا پرشوتم رام کے محبت، اخوت اور جمہوری عقائد کی تبلیغ کی۔ سمراٹ اشوک نے حق اور اہنسا کا پرچم لہرایا تو شہنشاہ اکبر نے اپنے دربار کے نورتنوں کے ذریعہ مذہب، انسانیت اور صلح کل کا پیغام عام کیا۔ اور پورے ملک کو باوجود مختلف عقائد کے قومی یک جہتی کے رشتے میں منضبط کر دیا۔ ہمایوں نے کس طرح راکھی کے چند دھاگوں میں بندھ کر میواڑ کی رانی کرن وتی کو بہادر شاہ والیِ گجرات کی چیرہ دستی سے بچایا۔

مہاتما بدھ اور گرو نانک نے خلق خدا سے محبت کا اپدیش دیا تو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے حق پرستی اور یک جہتی کا درس دیا غرضکہ مذہبی اختلافات کبھی انسان دوستی اور یک جہتی کے راستے میں حائل نہ ہو سکے بلکہ مختلف مذاہب کی صحیح مذہبی تعلیم نے باہمی خلوص کے رشتوں کو اور مضبوط کیا۔

ہندستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں ہندو مسلم سکھ عیسائی وغیرہ ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگوں کی قربانیاں شامل رہی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے دوش بدوش اگر پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل رہے تو مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی بھی رہے۔

مگر آج صدیوں سے قائم باہمی اعتماد اور اتحاد کا ماحول پراگندہ ہو رہا ہے۔ برادرانہ تعلقات میں رخنے ڈالے جا رہے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم مذہب کی صحیح تعلیم سے بھٹک گئے ہیں۔ چند لوگوں نے اپنے مفادات کے لیے عوام کو گمراہ کر دیا اور اس گمراہی کے نشے میں ہم نے یہ سوچنا بند کر دیا ہے کہ ہم پہلے ہندستانی ہیں بعد میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دوستی اور ثقافتی میل جول جو ہمارا قیمتی سرمایہ تھا اسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا۔

کاش ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ ملک پہلے ہے اور



ہم سب ملک کے لیے ہیں۔ ملک کا وقار ہمارا وقار ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ملک کی سالمیت کی اساس باہمی رواداری اور جذباتی ہم آہنگی پر رکھی ہے۔ اسے ضرب پہونچا کر ہم ملک کی سالمیت کی بنیاد کو کمزور کر رہے ہیں۔ اگر یہ رواداری ختم ہو گئی تو ہماری آزادی کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ملک کی سالمیت کی خاطر اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو اہمیت نہ دیں۔ ساری کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔ اپنے مذہبی فرائض کو صحیح طور پر سمجھ کر مخلوق کی خدمت کرنا اور مخلوق سے محبت کرنا ہی خالق کی بھی عبادت ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

□□

ہماری مشترکہ تہذیب ... صہ ۵۸ کا بقیہ

کیا تھا جو ضائع ہو گیا۔

سید محمود صاحب نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جو ہندوستان کے ممتاز ترین شاعر تھے، ان کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھی، ان میں مسعود، قطب علی اور اکرم فیض تین مسلمان تھے۔ اس طرح امیر خسرو، ملا داؤد، عبدالرحیم خانخاناں اور ملک محمد جائسی ہندستانی زبانوں کے زبردست شاعر تھے۔ یہ فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اُردو کے علاوہ دوسری ہندستانی زبانوں میں بھی شاعری کی ہے۔

ہندستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ یہاں تہذیب کی کثرت اور رنگا رنگی ہے۔ مختلف علاقوں میں مختلف انداز کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مختلف تہذیبی اقدار ہیں۔ اور دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا اہم مذہب ہو جس کے ماننے والے اس سرزمین پر نہ ہوں۔ لیکن رنگا رنگی اور کثرت کے باوجود ان سب میں ایسی قدریں مشترک ہیں کہ سب الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں

گویا کثرت میں وحدت ہے اور ہندستانی تہذیب حسین ترین تہذیبی پھولوں کا گلدستہ ہے۔

ہمارے سیکڑوں سال کے مشترکہ کلچر کی اساس اتنی مضبوط ہے کہ اسے سیاسی بنیادوں پر پیدا کی ہوئی فرقہ پرستی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی سیاسی مفاد پرست ہندستان کی سیکولر روایات اور مذہبی رواداری کو نقصان پہونچانے کی ضرور کوشش کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مشترکہ کلچر کی تعمیر اور اس کی مخالفت یا تخریب کا دھارا ساتھ ساتھ بہتا رہا ہے۔ لیکن یہ تخریب ہمیشہ ایک طبقے تک محدود رہا ہے اس لیے یہ کبھی مشترکہ کلچر کو نقصان نہیں پہونچا سکی۔

□□

حواشی:

۱؎ اُردو اور مشترکہ ہندستانی تہذیب۔ مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی دہلی ۱۹۸۷ء صہ ۶۹ و ۷۰

۲؎ رسوم دہلی۔ سید احمد دہلوی۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم دہلی ۱۹۸۶ء صہ ۵۸

۳؎ اُردو اور مشترکہ ہندستانی تہذیب: مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی دہلی ۱۹۸۷ء صہ ۶۹ و ۷۰

قومیت کا تصوّر صہ ۳۱ کا بقیہ

ایک زبان کا ادیب دوسری زبانوں کے ادب سے اصناف قبول کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتا ہے۔ اور یہی جذبہ ہے جس نے اس ملک کے ایک ایک گاؤں کے رہنے والوں میں خونی رشتے نہ ہونے کے باوجود ایسے انسانی رشتے پیدا کر دیئے جنھیں توڑنا کسی بھی طاقت کے لیے ممکن نہیں۔

ہمیں اپنی تہذیب کے اسی عنصر یعنی رواداری پر فخر ہے اور پورا یقین ہے کہ مذاہب کی غلط شکلیں پیش کرنے والے فرقہ پرستوں کی کوششیں ان مضبوط بندھنوں کو نہ توڑ سکیں گی، اور ہندستان ایک رہے گا اور ہندستانی قوم بحیثیت ایک قوم کے پھلے پھولے گی۔

■■



وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ

ہندستانی تہذیب

اِس ملک میں صدیوں سے چلی آرہی یک جہتی کی روایت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ یہ ہمارے ملک ہندستان کی وہ تہذیب ہے جو ہمیشہ سے ہمارا سرمایۂ افتخار رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جب جب ہم نے اس یک جہتی سے غفلت برتی تب تب ہم ان مسائل سے دوچار ہوئے جو اس ملک کی سالمیت کے ساتھ ساتھ ہم سب پر بُری طرح اثر انداز ہوئے۔ لہٰذا ہمیں صدق دل سے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ یک جہتی، جس میں نہ مذہب کی تفریق ہی آڑے آتی ہے اور نہ ذات پات کا فرق۔ جس کی بنیاد محبت، رواداری اور بقائے باہم پر ہے، اس کو ہندستان کے گھر گھر تک پہنچائیں کیوں کہ یہی یک جہتی کشمیر سے کنیا کماری تک ہماری اور ہمارے ملک کی سالمیت کی وہ اساس ہے جس کے بغیر نہ ہمارا وجود ممکن ہے اور نہ ہماری شناخت۔

اگر ہم اپنے ملک ہندستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری دھرتی نے ہر اس قوم اور قبیلہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا جس نے اس دھرتی کو اپنا وطن جانا اور یہاں بود و باش اختیار کی۔ یہ بود و باش صرف رہنے سہنے اور گھر بنانے پر منحصر نہیں کیوں کہ یہ صورت حال تو کسی بھی ملک اور کسی بھی سرزمین پر ہو سکتی ہے۔ یہاں بود و باش کا مطلب وہ وطنیت اور زمین سے وہ رشتہ ہے جو اس سرزمین پر رہنے والوں کی اصل پہچان بن جاتا ہے۔

آریہ، یہودی، مجوسی، یونانی اور مسلمان الگ الگ مذہب، ملت اور مختلف اقوام کے لوگ تھے لیکن یہاں آکر سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے درمیان مذہب، زبان اور رسم و رواج کے فاصلے کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ اس اختلاط اور میل جول نے ایک ایسی تہذیب کو پروان چڑھایا جو سب کی مشترک تہذیب تھی — یک جہتی کی اتنی روشن مثال شاید ہی دنیا میں کہیں اور ہو۔

باہر سے آنے والے آریوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو ہر چند کمتر جانا لیکن غیر شعوری طور پر ان کے مذہب کے بہت سے رسم و رواج ان پر اثر انداز ہوئے۔ مقامی دراوڑ باشندوں نے آریوں کے دھرم سے ناشناسی کے باوجود ان کی بہت سی باتیں قبول کرلیں۔ نئی مذہبی اور روحانی تحریکیں مہاویر سوامی کے جین مت اور گوتم بدھ کے بودھ دھرم کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ اخلاقی اور سماجی بہبود پر مبنی یہ تحریکیں عرصہ دراز تک عوام پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

آریوں کے بعد یہودیوں کے چند قبیلوں نے ہندستان کا رُخ کیا اور کیرالا میں بود و باش اختیار کی۔ وہاں انھوں نے عبادت گاہیں تعمیر کیں۔ اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مذہب کے ماننے والے پہلی صدی عیسوی میں ہندستان کے مغربی ساحل پر آباد ہو چکے تھے ایران کے مجوسی (پارسی) بھی گجرات اور اس کے اطراف میں آبسے تھے۔ اس طرح مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے ہندستان میں آباد ہو چکے تھے۔ اپنے اپنے رہن سہن اور رسم و رواج کے باوجود ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

مسلمانوں کی آمد نے ہندستان کی اس ملی جلی تہذیب کو کچھ اور جلا بخشی، یوں تو اہل عرب قبل اسلام ہی سے ہندستان سے بخوبی واقف تھے اور سمندری راستوں سے تجارت کے سلسلے میں اکثر ادھر آنکلتے تھے



لیکن ان کے باقاعدہ قیام اور بود و باش کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ اسلام کے اولین عہد میں جو مسلمان اس طرف آئے ان کے بارے میں تاریخی حقائق آج بھی کتابوں میں درج ہیں۔ ہندستان میں سب سے پہلی مسجد انہی مسلمانوں نے مالابار کے ساحل پر تعمیر کی، گھر بنائے اور یہیں بود و باش اختیار کی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب محمد بن قاسم نے ہندستان کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔

مسلمانوں کی باقاعدہ آمد محمد غوری سے شروع ہوتی ہے جو آریوں کی طرح فاتح بن کر آئے لیکن ان کو یہاں کی آب و ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ اب وہ بھی ہندستان کی دیگر قوموں کی طرح رہتے بستے اس دھرتی کے ذرّے ذرّے میں پیوست ہو گئے۔ آریوں کے بعد جس تہذیب نے اس ملک کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان مسلمانوں کے ساتھ آنے والی اسلامی تہذیب تھی اور ان دونوں تہذیبوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ یہی وہ تہذیب ہے جس کو ہم "ہندستانی تہذیب" کہتے ہیں۔ اس تہذیب نے بھائی چارے، محبت، رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام سکھایا۔ آپس میں یکجہتی پیدا کی اور ہندستان کو ایک اور بڑی زبان اُردو عطا کی جس نے سارے ملک کو اپنی شیرینی اور لطافت سے متاثر کیا۔ مسلمان صوفی، ہندو سنت اور خانقاہیں اس تہذیب کو پھیلانے کا ایک اور بڑا ذریعہ بنے۔

برسوں سے چلی آ رہی اس یکجہتی کو سب سے بڑا دھکا اس وقت لگا جب انگریزوں نے اس ملک میں قدم رکھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو تجارت کے نام پر اس ملک میں داخل ہوئی۔ اس نے تجارت کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں سازشیں کر کے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کر لیا کہ ۱۸۵۷ء میں سارے ملک پر اقتدار قائم کر لیا۔ ذات پات اور مذہب کی آڑ لے کر لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالی، حکومت کی اور یکجہتی کی فضا کو درہم برہم کر دیا۔

حکومت برطانیہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ووڈ نے ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ ایلگن (LORD ELGAN) کو لکھا کہ ہم نے ہندستان پر اپنا اقتدار ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف کر کے قائم کر رکھا ہے اور ہمیں آئندہ بھی ایسا کرنا ہے۔ لہٰذا تم وہ سب کرو جس کی وجہ سے ان میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے"۔ [1]

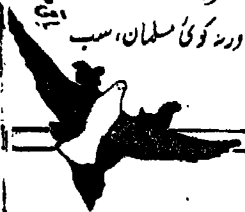
اس کے علاوہ نصاب تعلیم میں رد و بدل کر کے تاریخ کو اس طرح مسخ کیا کہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کی تحریروں پر یقین کرنے لگا۔ جارج فرانسس ہیملٹن (GEORGE FRANCIS HAMILTON) سکریٹری آف اسٹیٹ نے ہندستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ کرزن (LORD CURZON) کو لکھا:-

" میرے خیال میں ہماری حکومت کو خطرہ آج نہ سہی لیکن پچاس سال کے بعد مغربی خیالات کے رفتہ رفتہ وسعت و نفوذ کی وجہ سے ممکن ہے۔ اس لیے اگر ہم ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو دو حصوں میں اس طرح منقسم کر دیں کہ ان کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوں تو ہم ان اختلافات کی بنا پر ہندستان میں اپنی طاقت مستحکم کر سکتے ہیں لہٰذا ہمیں نصابی کتب کچھ اس طریقے سے مرتب کرنی چاہئیں کہ ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے اختلافات میں مزید شدت ہو"۔ [2]

یہ اقتباس بھی دیکھئے جس سے انگریزوں کی شاطرانہ ذہنیت کھل کر سامنے آتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اقتدار کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے کرتے رہتے تھے:-

" مذہبی جذبات و احساسات میں یہ اختلاف و تفرقہ ہمارے لئے (انگریزوں کے لئے) بہت مفید ہے اور مجھے آپ کی کمیٹی آف انکوائری آن انڈین ایجوکیشن سے اس معاملہ میں بڑی توقعات ہیں"۔ [3]

اس دوغلی سیاست کے نتیجے میں بہت دنوں تک ہندستان حکومت برطانیہ کا غلام رہا اور ہندستانی قوم ان کی سازشوں کا شکار رہی۔ لیکن جن کے ذہن بیدار تھے وہ ان کے فریب میں نہ آئے اور انھوں نے ملک کی آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ آزادی کی یہ تحریک بھی اصل میں اس یکجہتی کی دین تھی جس میں نہ کوئی ہندو تھا اور نہ کوئی مسلمان، سب



بشیر فاروقی
۵۱۵۔ مراد علی لین ، عقب رائل ہوٹل
لکھنؤ

ہندستان میں مذہبی رواداری

ہندستان میں مذہبی رواداری سے مُراد یہ ہے کہ یہاں کی مختلف ذاتوں، نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے دلوں میں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے لیے محبت ہونا چاہیے بلکہ ہر اس شے کے لیے محبت ہونا چاہیے جو ہندستانی ہے۔ تمام افراد کو ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام کرتے ہوئے ملک کی سالمیت اور بقا کے لیے اور تمام مذاہب کے درمیان ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔

کبیر، سورداس، تلسی، نانک، چشتی کے ملک ہندستان میں مذہبی سطح پر قومی یک جہتی کی جڑیں ہمیشہ سے بہت مضبوط رہی ہیں۔ عہد قدیم میں آریہ اور پھر بعد میں دوسری اقوام مثلاً مسلمان وغیرہ جب یہاں آئے تو انھیں یہاں کی مٹی نے اتنا متاثر کیا کہ وہ یہیں کے ہو رہے۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جب مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں ہندستان پر غیر ملکی حکمراں حملہ آور ہوئے تو مسلمانوں نے اپنی حب الوطنی کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگاکر مادرِ وطن کی حفاظت کی۔

۱۸۵۷ء میں ہندستانیوں اور انگریزوں کے مابین جو جنگ ہوئی وہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں ہوئی۔ اس سے قبل بھی یہاں کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں ہندو سپاہی اور ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان سپاہیوں کی شمولیت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ملک میں مذہبی سطح پر تعصب یا فرقہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں لیکن جب ہمارے ملک میں فرنگی دورِ حکومت آیا تو فرنگیوں نے ہندستان کی تاریخ مسخ کی جس کے نتیجے میں مذہبی سطح پر بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہمیں وہ دن دیکھنا پڑا کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اس کے باوجود کہ فرنگی دورِ حکومت میں ہندستان کی قومی یک جہتی کو نقصان پہونچا، ملک کے منظر نامے پر ایسی مثالیں موجود ہیں جو قومی یک جہتی کی آئینہ دار ہیں۔ لکھنؤ میں بیگم خدیجہ خانم کی برہمن سہیلی رانی جے کنور کے ذریعہ مسجد کی تعمیر جو بعد میں پرانی کی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ نصیر الدین حیدر کے محلات کی داروغہ دھنیا مہری کے ذریعے دھنیا مہری مسجد کی تعمیر۔ نواب سعادت علی خاں کی والدہ جناب عالیہ کے ذریعہ علی گنج کے ہنومان مندر کی تعمیر۔ نواب آصف الدولہ کے ذریعہ سرائے شیخ کے جگن ناتھ مندر کی تعمیر۔ دیویٰ شریف میں واقع مشہور صوفی سنت حاجی وارث علی شاہ کی درگاہ سے کشمیر کے ہندو راجاؤں کی عقیدت۔ مین پوری کے تعلقدار کا درگاہ کا سنگ مرمر کا فرش بنوانا اس بات کی علامت ہیں کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔

مزار شریف شاہ بدخشانی صاحب واقع راج گڑھ کے لیے مہاراج شری مہاراجہ دھراج شری راجہ بہادر وکرم دت سنگھ جی کا آراضی سے متعلق درج ذیل معافی نامہ ہندستان میں قومی یک جہتی کی بھرپور عکاسی کر رہا ہے۔

(اگلے صفحہ پر "معافی نامہ" کا عکس مع اُردو ترجمہ کے پیش کیا جا رہا ہے۔)



اوم

راج گڑھ درگاہ

یکم مارچ ۱۹۳۷ء

مہاراج شری مہاراجہ دھراج راجہ راوت وکرم دت سنگھ جی صاحب بہادر والی ریاست راج گڑھ دام اقبالہٗ۔

سند شری منشی سید مشتاق علی صاحب جوڈیشل ممبر اسٹیٹ کونسل راج گڑھ جوگ و پنچے آگو مزار شریف شاہ بدخشانی صاحب واقع خاص راج گڑھ کے لیے سرکار سے علاوہ موجودہ زمین دو بیگھہ مقبوضہ درگاہ و اُس کے اطراف وجوانب کی زمین رقبہ بڑلی مواجنی اکہتر بیگھہ آٹھ بسوہ جملہ تہتر بیگھہ آٹھ بسوہ تم کو حسب خواہش تمہارے دوام کے لیے یعنی جب تک مزار شریف قائم رہے۔ بلا کسی لگان ولاگ و ابواب کے بحق مزار شریف معاف کی جاتی ہے اور چونکہ ابتدا ہی سے رقبہ مزار شریف کی درستی وغیرہ کرنے والے اور بانی ہو، اس لیے مندرجہ بالا تمام آراضی تمہارے قبضے و اہتمام میں بحال برقرار رہے گی، اور ساتھ ہی اس کے امورات ذیل کا عمل درآمد ہوگا۔

۱. تم کو حق حاصل ہوگا کہ مزار شریف کے متعلق کل زمین خواہ کسی جز کو حسب دل خواہ اپنے، خواہ مزار شریف کے کاموں میں لاؤ یا اس کے اندر کوئی عمارت بنواؤ یا اس میں سایہ دار و پھل دار درخت لگاؤ، خواہ رقبہ بڑلی کو آباد کراؤ ہر حالت میں بغیر کسی لگان لاگ یا ابواب کے کل زمین بحق مزار شریف معاف رہے گی۔

۲. معاف شدہ زمین میں سے جس قدر زمین تمہارے رہائشی مکان میں آ گئی ہے یا ذاتی عمارت کی توسیع کے سلسلے میں آئندہ آوے وہ زمین مع اسی ذاتی عمارت کے تمہاری ذاتی ملکیت ہوگی اور ان عمارات سے اور مزار شریف سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳. تم کو اختیار ہوگا کہ مزار شریف کے متعلق حقوق جس شخص کو چاہو منتقل کر دو۔

بشرائط مندرجہ بالا یہ سند تم کو عطا کی جاتی ہے۔ فقط

تاریخ یکم مارچ سن ۱۹۳۷ عیسوی | داؤ بہادر

دیوان اور صدر

ریاستی کونسل راج گڑھ



ओम्

[illegible]

हुकूक जिस शख़्स को चाहो मुन्तक़िल करदो।

शरायत मुन्दर्जा बाला पे सनद तुमको अता की जाती है फ़क़त तारीख़ १ मार्च सन् १९३७ ईस्वी

[illegible]



ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی
حیدر منزل، ۴۵۰/۴ ۔ نیو مفتی گنج لکھنؤ

قومی یکجہتی کی علامتیں

ہمارا ملک ہندستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذہبوں کے ماننے والے لوگ ایک ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ اس سرزمین کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے ہر آنے والے کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور سب کے ساتھ بھائی چارے کا برتاؤ کیا ہے۔ یہاں آنے والے لوگ بھی مقامی باشندوں کے ساتھ اتنا گھل مل گئے کہ اپنے کو ہندستانی کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

ان ہی تمام لوگوں سے مل کر "ہندستانی قوم" بنی ہے، جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، بودھ، جین غرض کہ سبھی مذہبوں سے عقیدت رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے بعض شرپسند عناصر ہندستانی قوم میں تفرقہ ڈال دینا چاہتے ہیں۔ ان عناصر میں سے کچھ مسلمانوں کی بات کرتے ہیں تو کچھ ہندوؤں کی، کچھ سکھوں کی تو کچھ عیسائیوں کی یعنی مذہب کی بنیاد پر "ہندستانی قوم" کو تقسیم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یقیناً یہ عناصر ہندستانی قوم اور ہندستان کے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔

ہندستان میں بسنے والے لوگوں کے مذہب تو الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن قوم ایک ہی ہے کیونکہ مذہب (Religion) اور قومیت (Nationality) دونوں الگ الگ چیزیں ہیں ایک نہیں۔ بقول مہاتما گاندھی:

"مذہب سے قومیت کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اگر قومیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ہندستانی پہلے اور ہندستانی آخر میں ہیں، وہ چاہے کسی مذہب کو مانتے ہوں"۔ [۱]

ہندستان میں قومی یکجہتی کے لاتعداد ثبوت تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں اور ان اوراق کو الٹ کر دیکھا جا سکتا ہے کہ یہاں کے سچے پکے ہندوؤں اور مسلمانوں نے جہاں اپنے مذہبی بزرگوں سے متعلق اظہار عقیدت کیا ہے، وہیں دوسرے مذہبی پیشواؤں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اپنے تہواروں میں دوسروں کو شریک کیا ہے تو دوسروں کے تہواروں میں خود بھی شریک ہوئے ہیں۔ اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر کرائی ہے تو دوسروں کی عبادت گاہوں کی بھی، اور اگر اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ہے تو دوسروں کی عبادت گاہوں کی بھی۔

کیا اس بات کو کبھی فراموش کیا جا سکتا ہے کہ شیواجی نے اورنگ زیب سے ہونے والی جنگ کے دوران اپنی فوج کو سختی سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ مسجد اور قرآن کی بے حرمتی ہرگز نہ ہونے پائے۔ [۲] اورنگ زیب نے ہندوؤں اور برہمنوں پر ہونے والے مظالم کی اطلاع پاتے ہی بنارس کے ناظم ابوالحسن کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ:

"... کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے"۔ [۳]

صرف یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر بشمبر ناتھ پانڈے کی تحقیق کے مطابق مہاکال مندر اجین، بالاجی مندر چترکوٹ، کاماکھیہ مندر گوہاٹی، جین مندر گرنار، دلواڑہ مندر آبو اور گوردوارہ رام رائے دہرہ دون کی جاگیریں اورنگ زیب نے ہی عطا کی تھیں۔ [۴]

اسی طرح اودھ کے نواب شجاع الدولہ بہادر کے حکم اور اجازت سے خاص اجودھیا میں پانچ جین مندروں [۵] کی تعمیر کا پتہ چلتا ہے:

(۱) ادھی ناتھ۔ پہلا اوتار۔ یہ سورگ دوار کے نزدیک مری ٹولہ میں واقع ہے۔ یہاں کئی مسجدیں اور مقبرے بھی ہیں۔

(۲) اجیت ناتھ۔ دوسرا اوتار۔ یہ الورا تالاب کے مغرب میں واقع ہے جہاں ایک مورت بھی ہے۔ یہ ۱۷۸۱ سمبت میں تعمیر ہوا۔

(۳) ابھی نندن ناتھ۔ چوتھا اوتار۔ یہ سرائے سے متصل واقع ہے۔

(۴) سوم ناتھ۔ پانچواں اوتار۔ یہ رام کوٹ کے حدود میں ہے۔ اس مندر میں پرس ناتھ، نیم ناتھ دو مورتیاں ہیں۔ یہ مندر بھی ۱۷۸۱ سمبت میں تعمیر ہوا۔

(۵) اننتا ناتھ۔ چودھواں اوتار۔ یہاں ان کے قدم کا نشان موجود ہے۔ یہ مندر گولہ گھاٹ نالا کے کنارے واقع ہے۔ یہ سبھی مندر تقریباً ڈھائی سو سال قبل تعمیر ہوئے تھے۔

اگر لکھنؤ میں دیکھا جائے تو علی گنج کا پرانا مہادیو مندر نواب آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کا بنوایا ہوا آج بھی موجود ہے [۴۹]

ہندستان میں جہاں مسلمانوں نے اپنے ہندو بھائیوں کے عبادت گاہیں تعمیر کرائی ہیں، وہیں ہندوؤں نے بھی اپنے مسلم بھائیوں کی عبادت گاہوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

لکھنؤ میں خدیجہ خانم نے جے کنور نامی ایک پنڈتائن کی معرفت امین آباد میں مسجد بنوائی، جو آج بھی "مسجد پنڈتائن" کے نام سے مشہور اور موجود ہے۔ ایک اور مسجد مولوی گنج لکھنؤ میں موجود ہے جس کو نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں دھنو مہری (یا دھنیا مہری) نے تعمیر کرایا تھا [۵۰] یہ بھی ملتا ہے کہ دھنو مہری نے ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا تھا (جو اب موجود نہیں)

مسجد اور امام باڑوں کی تعمیر کرانے والوں میں نواب آصف الدولہ کے دیوان راجہ ٹکیت رائے کا نام بھی ملتا ہے۔ ان کا تعمیر کردہ امام باڑہ اب موجود نہیں۔ لیکن حیدر گنج (حال ٹکیت گنج) میں مسجد آج بھی موجود ہے جس پر کندہ تاریخ سے مسجد کا سنہ ۱۲۰۴ھ برآمد ہوتا ہے:

برائے حق پرستاں کرد چوں تعمیر ایں مسجد
بود "ھذا البیت اللہ" تاریخ بنائے او [۵۱]
۱۲۰۴ھ

راجہ ٹکیت رائے کی ہی بنوائی ہوئی حیدر گنج میں ایک دوسری مسجد کی اطلاع بھی "تاریخ لکھنؤ" (تاریخ اودھ کا ل از نجم الغنی رام پوری نول کشور ۱۹۱۹ء کے حوالے) سے ملتی ہے۔ صاحب تاریخ لکھنؤ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ٹکیت رائے نے ۱۲۰۹ھ میں بازار راجہ (راجہ بازار) لکھنؤ میں بھی ایک مسجد بنوائی، جو اب موجود نہیں ہے [۵۲]

راجہ ٹکیت رائے کی طرح نواب آصف الدولہ کے وزیر مہاراجہ جھاؤلال نے بھی ایک مسجد اور امام باڑہ تعمیر کرایا تھا جو آج بھی ٹھاکر گنج میں موجود ہے [۵۳]

ہندستان میں اہل ہنود کے بنوائے ہوئے دوسرے امام باڑوں اور مسجدوں میں امام باڑہ بنگلو اور مسجد وقف ٹھاکر دھرم سنگھ آج بھی ماموں بھانجہ مانک چوک، علی گڑھ میں موجود ہے۔ اس امام باڑے کو ٹھاکر کھڑک سنگھ نے ۱۸۶۸ء میں تعمیر کرایا۔ آج کل اس کی نو تعمیر کے سلسلے میں ایک پروجیکٹ اترپردیش وقف، کاس نگم لکھنؤ کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔

امام باڑے تعمیر کرانے والے دوسرے لوگوں میں لکھنؤ کے ہلاس رائے رنگین [۵۴] اور میوارام [۵۵] کے نام بھی ملتے ہیں۔ لیکن اب یہ امام باڑے موجود نہیں ہیں۔

لکھنؤ میں اہل ہنود کے بنوائے ہوئے دو روضے فاطمین اور کاظمین بھی موجود ہیں۔ روضۂ فاطمین، جیتی لال نے رستم نگر میں درگاہ حضرت عباسؑ کے قریب بنوایا [۵۶] (جو پیغمبر اسلامؐ کی بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ کے مزار مقدس واقع جنت البقیع، مدینہ منورہ کی نقل ہے) اور روضہ کاظمین جگن ناتھ اگروال نے منصور نگر میں تعمیر کرایا [۵۷] (جو امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ کے مزارات مقدس واقع کاظمین، عراق کی نقل ہے) روضۂ کاظمین محمد علی شاہ اختر کے عہد میں ۱۲۶۹ھ میں تعمیر ہوا۔ اس کا سنہ تعمیر ملک الشعرا محمد مہدی علی زکی مراد آبادی نے اس طرح برآمد کیا ہے:

زکی جستم ز دل سال بنایش
خرد گفتہ "مزار کاظمین" است
۱۲۶۹ھ

اگر تلاش و جستجو کی جائے تو اسی قسم کے ناموں کی ایک طویل فہرست



تیار کی جا سکتی ہے۔ یہ تو صرف چند مثالیں ہیں، جن سے ہندو مسلم اتحاد، ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کی تعمیر اور ان کی حفاظت کے واضح ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ یہی مندر، مسجد اور امام باڑے ہندوستان کی قومی یکجہتی کے وہ اہم مقامات ہیں جن کی بدولت ہندوستان آج بھی اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لیے مشہور ہے۔

□□

حواشی :

۱، ۲، ۵ رسالہ نیا دور لکھنؤ ص۳۲ ص۴۶ ص۳۱ فروری ۱۹۸۴ء

۳ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی ص۱۴۳ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۴۰ء

۴ دیکھیے "ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات" از ڈاکٹر بشمبر ناتھ پانڈے ص۳۵ فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر (مطبوعہ) لکھنؤ ۱۹۸۶ء

۵ Gazetteer of the Province of Oudh. Vol I, B.R Publishing Corp. Delhi 1985 P. 9

۶ تاریخ لکھنؤ حصہ اول از سید آغا مہدی ص۳۹ جمعیۃ خدام عزا کراچی ۱۹۷۶ء بہو بیگم خطاب اور نام امۃ الزہرا تھا۔ دیکھیے "اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا" از ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، ص۵ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۱ء

۷ و ۸ تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص۲۹۸ اور ص۲۹۳ و ص۱۴۶ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مطابق دھنو مہری کے علاوہ ڈلو مہری نے بھی مسجد اور امام باڑہ تعمیر کرایا تھا۔ (دیکھیے اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص۱۳۰) سید آغا مہدی نے دھنو اور ڈلو دونوں کو بہنیں لکھا ہے (تاریخ لکھنؤ ص۱۴۶)

۹ دیکھیے اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا ص۱۱۳، ۱۱۲۔ قومی اتحاد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ راجہ ٹکیت رائے نے مسلمانوں کے لیے مسجد تعمیر کرانے کے ساتھ ساتھ قریب میں ہی ہندوؤں کے لیے سیتلا دیوی کا مندر بھی تعمیر کرایا (تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص۱۸۴)

۱۰ و ۱۱ تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص۱۷۸ و ص۲۸۱ نیز ص۲۲۳

۱۲ و ۱۳ دیکھیے، اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص۱۱۲ اور ص۱۲۲

۱۴ تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص۱۱۸

۱۵ تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص۱۳۳ و اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص۱۴۴ و ص۱۳۵

۱۶ کلیاتِ زکی۔ از محمد مہدی علی خاں زکی مرادآبادی۔ نول کشور ص۳۳ اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص۱۴۴

رام

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

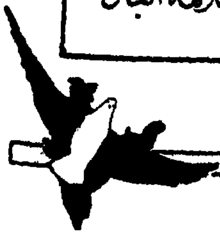
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دُنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

—— علامہ اقبال



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

ہندوؤں کا تعاون

- مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۳ء میں غازی آباد میں ایک سائنٹفک سوسائٹی بنائی تھی۔ اس کے ممبران میں ۱۰۷ مسلم اور ۸۲ ہندو تھے۔ سر سید کے بہت قریبی دوستوں میں مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ، لالہ اجودھیا پرشاد منصف مرزاپور، راجہ جے کشن داس، بابو شیو پرشاد بنارسی اور رائے بختاور سنگھ شامل تھے۔
- یکم اگست ۱۸۸۲ء کو یونیورسٹی کے قیام سے قبل مشاورتی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ۹ ہندو ممبران تھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی مجلس منتظمہ میں ۶ ہندو ممبران تھے۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے گریجویٹ ایشوری پرشاد تھے۔ خان عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹوں کے بیچ میں تھے۔
- لالہ ملک چند دیوان سر سید کے ماموں کی جانب سے مقرر کردہ ان کے سرپرست تھے۔ سر سید کے نانا نواب فخرالدین خاں نے اپنی جائداد کی تقسیم کے وقت لالہ ملک چند کو اپنے بیٹوں کے برابر حصہ دیا تھا۔
- اپنے پوتے راس مسعود کی رسم بسم اللہ کے موقع پر سر سید نے راس مسعود کو اپنے دوست راجا جے کشن داس کی گود میں بٹھایا تھا۔
- مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سر سید کے دادا کے بھائی خواجہ نجیب الدین کو اپنا ہیڈ خزانچی بنایا تھا۔
- سر سید کے غازی پور مدرسے کے سرپرست راجہ دیو نرائن سنگھ تھے۔ مدرسہ غازی پور میں سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔
- ۱۸۸۴ء میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ نے سر سید کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا:

  "آپ کا سب کے لئے محبت کا جذبہ نایاب تحفہ ہے اس ملک کے باشندوں کے لیے"۔
- ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں سر سید نے مسلمانوں کے ایک جلسے میں کہا تھا:

  "دوستو! جس طرح اونچی ذات کے ہندو دور دراز سے آئے اور اس ملک کو اپنا بنا لیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی خود سے اسی ملک کے ساتھ جوڑ لینا چاہیے۔ یہی ہماری جنت ہے اسے جنت ہی رکھنا ہے"۔
- گرداسپور میں ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو انھوں نے کہا تھا:

  ہم (ہندو مسلمان) ایک ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ ایک جگہ پیدا ہوتے اور دفنائے جاتے ہیں۔ ہم جب جب مل کر کھڑے ہوئے، دنیا کو ہلا دیا۔ جب ایک دوسرے کے خلاف ہوئے، تباہی کا سامنا کیا..... کیا مسلمان جو ہندوستان میں رہتے ہیں، ان کو کوئی اور ملک اپنا سکتا ہے؟ کیا ہندو بنا مسلمانوں کے رہ کے خوش رہ سکتے ہیں؟ ہم مل کر ہی ایک ملک ہیں، الگ ہو کر ڈرتے ہوئے مکھوں سے زیادہ



کچھ نمونے:

- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے پرنسپل ایچ جی آئی سڈان تھے اور پہلے ہندو پرنسپل لالہ بیج ناتھ۔
- وائس پرنسپل لالہ بیج ناتھ کو دوسرے وائس پرنسپل مولوی ابو الحسن سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ لالہ جی کا تقرر پرنسپل کے تقرر سے پانچ دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔ لالہ جی کو ۱۲۰ روپئے اور مولوی صاحب کو ۶۰ ساٹھ روپئے ماہانہ ملتے تھے۔
- ۱۸۷۵ء سے ۱۸۹۸ء کے درمیان اس کالج میں دس ہندو اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا۔
- یونیورسٹی کے قیام کے ابتدائی برسوں میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان اسٹاف میں ۶ ہندو اساتذہ تھے، ۵ عیسائی اور ایک پارسی
- اس وقت یونیورسٹی میں ۴۷ پروفیسر، ۶۵ ریڈر اور ۴۷ لیکچرر ہندو ہیں۔
- یونیورسٹی میں ۱۹۱۰ء سے سنسکرت کا شعبہ قائم ہے جس کے پہلے صدر پنڈت رام سروپ تھے۔
- ۱۹۷۰ـ۷۵ء میں ۱۵ طلبا نے یہاں سنسکرت میں پی ایچ ڈی کیا۔ پہلی ڈگری محمد خاں درانی کو ملی تھی۔
- یونیورسٹی کی لائبریری میں ۲۰۰۰۰ سے زیادہ ہندی اور ۶۹۲۷ سنسکرت کی کتابیں ہیں۔
- یونیورسٹی کے کچھ ہال / ہاسٹل ــ سروجنی نائیڈو (لڑکیوں کے لیے)، راجہ جے کشن داس ہاسٹل (جے کے ہاسٹل)، چکرورتی ہاسٹل، دھیان چند ہاسٹل، راجہ مہندر پرتاپ ہاسٹل وغیرہ ہندوؤں کے نام سے ہیں۔
- ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۶ء کے درمیان ڈی. ایس سی (کیمسٹری) کی ڈگری حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر جی. ایس. سہاریہ کا نام نمایاں تھا۔
- ۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۶ء کے درمیان آرٹس فیکلٹی میں ۱۲۲ میں سے ۷۲ اور سائنس فیکلٹی میں ۱۹۱ میں سے ۶۸ ہندوؤں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
- ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان مختلف درجات میں تقریباً ۵۳ ہندو طلبا اعلا اور اعلاترین پوزیشن پر رہے۔
- یونیورسٹی کے قیام کے لیے رقم / وسائل / تعمیر میں مدد دینے والوں میں راجہ جے کشن داس، ٹھاکر جواہر سنگھ، مہارانی ہربنس کور، بیولال، ٹھاکر درگا داس بخش سنگھ، مہارانی نسرانی، راجہ کشن لال کنور، رائے نرسنگھ داس، راجہ بلدیو سنگھ اور بابو سرجیت سنگھ شامل تھے۔
- یونیورسٹی کی لائبریری میں تقریباً ۴۷۰۰ کتابیں مختلف ہندوؤں کی جانب سے بطور تحفہ پیش کی ہوئی ہیں۔
- یونیورسٹی سے موصولہ اطلاعات کی بنیاد پر جن شخصیتوں نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۶ء تک یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کیا ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں:

پنڈت جواہر لال نہرو (۱۹۴۵ء)، ڈاکٹر سی. راج گوپال اچاری (۱۹۴۸ء)، پنڈت گوبند بلبھ پنت (۱۹۵۰ء)، شری ایچ. پی. مودی (۱۹۵۰ء)، ڈاکٹر راجندر پرشاد (۱۹۵۱ء) سروپلی ڈاکٹر رادھا کرشنن (۱۹۵۲/۶۲ء)، ڈاکٹر ایل. مدالیہ (۱۹۵۴ء)، شری کے. ایس. کرشنن (۱۹۵۵ء) ڈاکٹر سمپورنانند (۱۹۵۵ء)، شری وائی. بی. چوہان (۱۹۵۹ء) شری ڈی. ایس. کوٹھاریہ (۱۹۶۳ء)، شری جگت رام (۱۹۶۴ء) شری لال بہادر شاستری (۱۹۶۴ء) شری ترگن سین (۱۹۶۷ء) شری جے پرکاش نرائن (۱۹۶۸ء)، شری پی. جی. گجیندر گڈکر (۱۹۶۹ء)، شری تارا چند (۱۹۷۰ء)، شری بی. گوپالا ریڈی (۱۹۷۲ء)، شری پی. این. سپرو (۱۹۶۲ء)، ڈاکٹر کرن سنگھ (۱۹۶۳ء)، ڈاکٹر ایچ. این. سیٹھنا (۱۹۷۶ء)، شری ڈی. ایس. کوٹھاری (۱۹۷۶ء)

ان میں سے بیشتر کو یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری سے بھی نوازا۔ یونیورسٹی کی ۱۰۰ سالہ تاریخ میں ۳۰ ہونہار طلبا اور معزز شہریوں کو اعزازی ڈگری دی گئی۔



ماخذ

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی روایات
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خطبات (۱۸۹۳ء)
- سرسید احمد خاں کے مختلف لیکچرز
- این انتھالوجی اینڈ ہسٹری آف ایم . اے . او . کالج

پیش کش : راکیش شرما
ترجمہ : نجیب انصاری

ہندستانی تہذیب ...

ص ۱۰۱ کا بقیہ

انسان تھے ۔ دوش بدوش ، قدم سے قدم ملائے ہوئے ایک ساتھ غلامی کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ تھے ۔ حکومت برطانیہ نے ہر چند طاقت کے بل بوتے پر اس سیلاب کو روکنا چاہا لیکن روک نہ سکی ۔ گاندھی ۔ نہرو ۔ پٹیل اور مولانا آزاد جیسے رہنماؤں کی قیادت میں لاکھوں کروڑوں ہندستانیوں نے وہ دن بھی دیکھا جب یونین جیک کی جگہ ہمارا ترنگا لہرایا ۔ ملک آزاد ہوا اور ڈاکٹر امبیڈکر نے ملک کو وہ آئین دیا جو یک جہتی کے زریں اصولوں سے مزین ہے ۔

ادھر کچھ برسوں سے کچھ مفاد پرست عناصر اس یک جہتی اور اس آئین سے سراسر انحراف کی ذہنیت پیدا کر رہے ہیں جو اس ملک کا طرۂ امتیاز رہے ۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ ان کا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا اور یک جہتی کی فضا ویسے ہی برقرار رہے گی ، جیسے پہلے تھی ۔

□□

حواشی :

لے ، ۲ ، ۳ " تاریخ ہند کا المیہ " از محمد ضیاء الحق خاں ص ۱۰-۱۹

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۹۵۶ء

(۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ)

کی دفعہ ۱۹ ۔ ڈی کے قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جا رہی ہیں

(۱) مقام اشاعت : لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت : ماہوار

(۳) پرنٹر کا نام : شری راجیو اروڑا
قومیت : ہندستانی
پتہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس ، گوتم بدھ مارگ ۔ لکھنؤ

(۴) پبلشر کا نام : شری انل سروپ
قومیت : ہندستانی
پتہ : ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش ۔ لکھنؤ

(۵) ایڈیٹر کا نام : شری سید امجد حسین
قومیت : ہندستانی
پتہ : ایڈیٹر نیا دور ، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش ۔ لکھنؤ

(۶) ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں : ' نیا دور ' سرکاری جریدہ ہے

میں انل سروپ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں ۔

(دستخط)
انل سروپ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

سید امجد حسین
سوچنا بھون، لکھنؤ



اُستاد بسم اللہ خاں سے ایک مُلاقات

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق جب ہندستان کے مایہ ناز موسیقار اور بین اقوامی شہرت کے مالک شہنائی نواز استاد بسم اللہ خاں کے دال منڈی بنارس والے مکان پر پہنچا تو انہیں اپنا منتظر پایا۔ اُستاد علیل تھے اور بستر پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے — ایّامِ علالت میں ان سے لیا گیا مختصر انٹرویو پیش خدمت ہے۔

ایڈیٹر

سوال: آپ شہنائی نوازی میں دنیا میں کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ آپ شہنائی کی طرف کیسے راغب ہوئے۔؟

جواب: یہ تو میرا خاندانی شوق ہے اور لگ بھگ دو سو برس سے بھی زیادہ عرصے سے اس فن میں میرا خاندان رہا ہے۔ میرے باپ دادا سبھی اس فن میں تھے۔ اسی لیے میں بھی اسی کی طرف راغب ہوا۔

سوال: گویا آپ کا شوق پابند خاندان رہا۔

جواب: جی ہاں یہی کہہ لیجئے۔ میں پابند خاندان رہا اور میرے خاندان کا ہر فرد اپنی خاندانی روایات کا پابند رہا۔ میں چھ سال کی عمر سے شہنائی بجا رہا ہوں۔ اور بارہ سال کی عمر سے مختلف پروگراموں میں حصہ لے رہا ہوں مجھے تقریباً ایک سو پچاس انعامات مل چکے ہیں، جس میں سے کچھ اس طرح ہیں: پدم شری، پدم وبھوشن، پدم بھوشن، نہرو ایوارڈ، شہنائی ایوارڈ، تان سین ایوارڈ۔ مجھے تین بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری مختلف یونیورسٹیوں سے مل چکی ہے جیسے بی۔ ایچ۔ یو، حیدر آباد اور شانتی نکیتن۔ میں ۲۱ مارچ ۱۹۱۶ء کو ڈمراؤں (بہار) میں پیدا ہوا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ فن آزاد ہے۔ اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کیا موسیقی کا کوئی مذہب ہے؟

جواب: موسیقی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جو بھی اس میدان میں

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی یکجہتی

بنارس ہندو یونیورسٹی، قومی یکجہتی اور ہندستانی تناظر میں نوعِ انسانی کے فروغ اور ترقی کا مرکز رہی ہے۔ اس کے قیام اور ترقی میں جہاں ایک طرف اس کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کا تعاون تھا وہیں دوسری طرف دیگر مذاہب کے ماننے والوں اور ان کے ساتھیوں کا بھی تعاون تھا۔ نتیجے کے طور پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں مالویہ جی کو مسلمانوں سے جو تعاون اور حوصلہ افزائی ملی وہ قابلِ تعریف ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایتھوپیا کے بادشاہ، ہز میجسٹی کنگ ابن سعود آف عربیہ، ہز ہائی نس مہاراج نظام حیدر آباد، نواب رام پور اور سلطان احمد خاں گوالیار کا اس یونیورسٹی کی تعمیر میں خصوصی تعاون شامل رہا۔ آج بھی اس یونیورسٹی میں شعبۂ تکنیکی تعلیم کا رام پور ہال اور یونیورسٹی کیمپس میں نظام حیدر آباد کالونی، جو اساتذہ کی رہائشی کالونی ہے، کے ساتھ ہی سعودی عرب کے شاہ کے تعاون سے یونیورسٹی میں سوئمنگ پول قائم ہے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی ایک بہترین مثال ہے۔

پٹنہ کے علی امام صاحب نے یونیورسٹی کے قیام میں تعاون کے طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو جہاں ایک لاکھ ایک ہزار روپے کی رقم چندے میں دی تھی، وہیں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو صرف اکیاون ہزار روپے بطور چندہ دیے تھے، جسے کم ہونے کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے قبول نہیں کیا۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ جب علی امام صاحب سے پوچھا گیا کہ "آپ نے بنارس ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپیہ چندہ دیا، جبکہ مسلمان ہونے کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو صرف اکیاون ہزار روپے ہی دیے"۔ تو انھوں نے جواب دیا:

"میں پیشے کے اعتبار سے وکیل ہوں اور ہندو اکثریت والے علاقے میں پریکٹس کرتا ہوں، لہٰذا میری یہ آمدنی ہندوؤں کی وجہ سے ہے۔ اس لیے میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں مالویہ جی کی یونیورسٹی کی زیادہ سے زیادہ امداد کروں۔ اسی لیے میں نے ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے کی رقم چندے میں دی ہے۔"

اس سلسلے میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے جگری دوست علامہ محمد حسن فائز بنارسی کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ۱۹۷۰ء میں ایک سووینیر شائع کیا تھا، جس میں بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس کے حوالے سے شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ اخلاقی طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو ان کے جگری دوست علامہ محمد حسن فائز بنارسی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں جتنا تعاون دیا ہے اتنا اقلیتی فرقے کے کسی شخص نے نہیں دیا۔

ممتاز شاعر، ماہرِ تعلیم اور دانش ور علامہ فائز بنارسی، پنڈت مدن موہن مالویہ، بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس اور دیش رتن بابو شیو پرشاد گپت کے گہرے دوستوں میں تھے۔ آغا حشر کشمیری، ڈاکٹر جگن ناتھ داس رتناکر، ڈاکٹر سمپورنانند



اوپیشری پرکاش جی سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ علامہ محمد حسن فائز بنارسی، مالویہ جی اور ڈاکٹر بھگوان داس کو لوگ بنارس میں تری مورتی (تین مورتی) کے نام سے جانتے تھے۔ فائز بنارسی سے نظام حیدرآباد کی بڑی دوستی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب مالویہ جی مالی امداد کے لیے نظام حیدرآباد گئے تھے تو اپنے ساتھ فائز بنارسی کا خط لے گئے تھے۔ فائز صاحب نے اپنی پوری زندگی مالویہ جی کے لیے وقف کر دی تھی۔

آج بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا، اور ملازمین قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے کمربستہ ہیں۔ گذشتہ دنوں کے واقعات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر چندر شیکھر جھا نے اپنے اساتذہ، طلبا اور ملازمین کے ساتھ برت رکھا۔ اور مالویہ بھون سے مہاتما گاندھی کے مجسمے (ٹاؤن ہال) تک امن مارچ کی قیادت کی، جس میں عمائدین شہر کے ساتھ ساتھ عام ہندوؤں اور مسلمانوں نے شرکت کی۔

پیش کش: ——

دنیش مشرا، ڈاکٹر محمد عباس

کاظم رضوی

تلخیص و ترجمہ: مجیب انصاری

سوراج کا مطلب یہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی سب اپنے اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکیں۔"

—— مہاتما گاندھی

اُستاد بسم اللہ خاں ..... صفحہ ۱۱ کا بقیہ

آیا وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ چاہے وہ ہندو ہو، مسلم ہو، سکھ ہو، عیسائی ہو، بودھ ہو۔ سب اس میں ایک ہیں۔ اس میں بارہ سُر میں تمام راگ موجود ہیں۔ سنگیت میں سمندر بھرا ہے۔

سوال: موسیقی کی دنیا میں آپ کس موسیقار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟

جواب: نصیر الدین خاں ڈاگر، کریم الدین خاں اور فیاض خاں سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔

سوال: اس وقت ملک میں سب سے زیادہ قومی یکجہتی کی ضرورت ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: پوری دنیا میں لڑائی ہو رہی ہے مگر سنگیت والوں سے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میرا کہنا ہے کہ سنگیت سیکھو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اگر تمام لوگوں کا رجحان سنگیت کی طرف ہو جائے تو کوئی جھگڑا نہیں رہے گا۔ سنگیت کے ذریعہ ایکتا پیدا ہوگی۔ میں پھر کہنا چاہوں گا کہ سنگیت میں سمندر بھرا ہوا ہے۔

پھر انھوں نے اپنی بانسری کے ذریعہ نوحے کا ایک شعر سنایا، جو اس طرح ہے ؎

پردیس میں بہن کو چلے کس پہ چھوڑ کے
بھیا حسینؑ جاتے ہو کیوں منھ کو موڑ کے

اس کے بعد انھوں نے سُر اور لَے میں یہ بھجن سنایا ؎

ہے پربھو آن داتا گیان ہم کو دیجئے

آخر میں وہ کہتے ہیں کہ مندر میں تو شہنائی ہم نے بہت بجائی ہے۔ دیش میں اگر خوش حالی اور ترقی لانا ہے تو موسیقی سیکھو۔

□□



شرمی کانت دکشت
ترجمہ: اخلاق احمد

ہندو مسلم اتحاد کی لافانی مثال :: مکن پور

ہندوستان صدیوں سے ان صوفی سنتوں کی آماجگاہ رہا ہے جنھوں نے روحانیت کی روشنی سے پورے عالم کی رہنمائی کی۔ یہاں پر دوسرے ملکوں سے آنے والے صوفی سنت بھی ہندستانی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھوں نے خود کو ہندستانی رنگ میں رنگ کر انسانیت کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اس طرح وہ یہاں کی تہذیبی وراثت کا جزو لاینفک بن گئے۔ ایسے ہی ایک صوفی سنت حضرت زندہ شاہ مدار صاحب بھی تھے۔

ضلع کان پور کی بلہور تحصیل میں ایسن ندی کے کنارے واقع مکن پور میں زندہ شاہ کی درگاہ پر پچھلے ۵۷۵ برسوں سے ان کی عقیدت میں سالانہ عرس منعقد ہو رہا ہے۔ اس موقع پر بسنت پنچمی کے دن "بسنت اتسو" کا تہوار بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ اسی دن یہاں ہندستان کا مشہور تاریخی میلہ بہت بڑے تجارتی مرکز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس مبارک موقع پر ہندو مسلم دونوں فرقوں کے لوگ منت مانگنے آتے ہیں۔ زندہ شاہ کے مزار پر ان کے ہندو عقیدت مند سر منڈانے کو نیک شگون سمجھتے ہیں۔ بسنت پنچمی کے دن یہاں کے مخصوص پروگرام دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میلہ کی یہ تقریب ہندو مسلم اتحاد کی انوکھی تصویر پیش کرتی ہے۔ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی یہ عرس آپسی میل جول کی مثال تسلیم کیا جاتا ہے۔

حضرت سید بدر الدین احمد قطب المدار ملک شام کے حلب گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ہندستان آئے اور ۱۴۱۵ء (۸۱۸ھ) میں قنوج کے قریب ایسن ندی کے کنارے مکن پور کے قدرتی مناظر سے متاثر ہو کر یہیں کے ہو رہے۔ مدار صاحب نے یہاں اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو عوام الناس تک پہونچانے کا نیک کام بھی انجام دیا۔ انھوں نے ہندستان کی تہذیبی روایات کے پس منظر میں اسلام کی تشریح آسان اور عام فہم زبان میں کر کے ہندو مسلم دونوں فرقوں کو راہ راست پر چلنے کی تلقین کی اور یہ بات ذہن نشین کرائی کہ "ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں"۔ جس کے نتیجے میں دونوں ہی فرقوں کے لوگ ان کے عقیدت مند ہو گئے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ نہایت پرہیزگار بزرگ تھے۔ انھوں نے ساری عمر بڑی سادگی سے گزاری۔ یہاں تک کہ شادی بھی نہ کی۔ ان کے مزار پر گانا بجانا، چراغاں کرنا اور عورتوں کی آمد و رفت پر پابندی ہے۔

مدار صاحب ۱۷ جمادی الاول ۸۳۸ھ میں زندہ درگور ہو گئے تھے اسی وجہ سے زندہ شاہ کہلائے جانے لگے۔ جون پور کے بادشاہ ابراہیم شرقی ان کے بے پناہ عقیدت مند تھے۔ انھوں نے ہی مدار صاحب کے مزار کی تعمیر کرائی۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۶۸۰ء میں اورنگ زیب جب اس علاقے کے دورے پر آئے تو وہ بھی اظہار عقیدت کے لیے مکن پور گئے۔ انھوں نے وہاں مسجد بھی بنوائی۔ مزار کے سامنے بنی یہ مسجد "عالمگیری مسجد" کہلاتی ہے۔ مزار کے قریب ہی ایک "ہندو دیواستھان" بھی ہے جو "مکنا دیو" کے نام سے مشہور ہے۔



زندہ شاہ مدار صاحب کا پہلا عرس بسنت پنچمی کے دن منعقد ہوا تھا لیکن ہندی اور اسلامی تاریخوں میں فرق ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں ۱۷ ربیع الاول اور ہندوؤں میں بسنت پنچمی کے دن عرس کرنے کی روایت پڑ گئی۔ اسی وقت سے دونوں فرقوں کے لوگ مل جل کر عرس کا اہتمام کرتے ہیں۔

۱۹۲۳ء سے ضلع مجسٹریٹ کی نگرانی میں ایک انتظامیہ کمیٹی کے ذریعہ یہ عظیم الشان پروگرام منعقد ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کمیٹی میں ہندو مسلم دونوں فرقوں کے لوگ شامل رہتے ہیں۔

برسوں سے چلی آ رہی یہ روایت آج بھی برقرار ہے۔ اب بھی یہاں ہر سال پورے جوش و خروش کے ساتھ میلا لگتا ہے۔ اس موقع پر ہندستان ہی نہیں، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش اور سری لنکا وغیرہ سے بھی بڑی تعداد میں عقیدت مند زندہ شاہ کے مزار پر حاضری دینے اور منت ماننے آتے ہیں۔ بسنت کے تہوار کے موقع پر ایک مخصوص پروگرام جو قومی یکجہتی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مشاعرہ، کوی سمیلن، سنگیت، قوالی وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری محکموں مثلاً اطلاعات، صحت اور زراعت وغیرہ کی جانب سے نمائش بھی لگتی ہے۔

آج کے اس پراگندہ ماحول میں ممکن ہو کہ یہ عرس قومی یکجہتی کی ایک اہم روایت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہو جو ہندو مسلم دونوں فرقوں کے مابین مضبوط رشتوں کی لافانی مثال ہے۔ ■■

جوش کے ایک مضمون سے اقتباس

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی ہمارے ان نمائندہ شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے ذات اور ذات کے کرب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے بلا تفریق رنگ و نسل و عقائد مجموعی طور پر انسان کی حریت کے لیے جد و جہد کی۔ ان کے شعری سرمایے اور دیگر تحریروں میں زندگی اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔

زیر نظر اقتباس جوش کے ایک مضمون "دین اسلام: ایک اصلاحی اور انقلابی تحریک" سے لیا گیا ہے، جو پہلی مرتبہ روزنامہ جنگ، کراچی (اپریل ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا تھا اور جسے بعد میں 'مقالات جوش' اور 'افکار' کے جوش نمبر میں بھی شامل کیا گیا۔

"اے انسان..... قوائے کائنات تیرے مخدوم نہیں خادم ہیں۔ یہ تیرے خدا نہیں بلکہ بحکم خدا تو ان سب کا خداوند ہے۔ تصور وحدت کی پشت پر عظمت آدم کا اعلان اور تسخیر کائنات کی بشارت کے ساتھ ساتھ ایک اور عظیم تر حکمت بالغہ کارفرمائی کر رہی ہے لیکن ہنوز وہ کلی کی شکل میں ہے۔ اس حکمت بالغہ کا نام ہے تصور وحدت نوع انسانی، جس وقت یہ کلی پھول بن جائے گی، اس وقت انسانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ ایک مخدوم کے خادم، ایک آقا کے غلام، ایک خدا کے بندے، ایک غیب کے شہود اور ایک کل کے جزو ہیں اور جس وقت انسانوں کے سامنے تصور وحدانیت کا یہ سب سے زیادہ روشن رخ آ جائے گا اس وقت نسل، وطن، قوم اور مذہبی تعصبات پر اب تک جتنی جنگیں ہو چکی ہیں۔ انسان ان پر اپنا گریبان پھاڑ کر ماتم کرے گا، اور اس جغرافیے کے منہ پر تھوک دے گا جو انسان کو نسلوں اور قوموں میں تقسیم کر کے اسے ہلاکت میں ڈالتا ہے..... زندہ باد عظمت آدم پائندہ باد وحدت نوع انسانی۔۔۔"

ہر سانس میں گردوں کے پیام آتے ہیں
ہر آن چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں
بندوں کو جو اک بار لگاتا ہوں گلے
اللہ کے سو بار سلام آتے ہیں

——— پیش کش: لئیق رضوی (الہ آباد)

ڈاکٹر بی سی تیواری
بی۔۱۴/۵۵۷ ۔ ادم نگر۔ عالم باغ لکھنؤ

سنت دادو دیال

پیدائش کے وقت سبھی انسان یکساں ہوتے ہیں۔ مذہب، فرقہ، ذات پات کی کوئی علامت ان کے جسم پر نہیں ہوتی۔ مذہب وغیرہ تو بعد کی چیزیں ہیں جو محض مالک حقیقی تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اسی مذہب کی وجہ سے انسان جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ وہ مذہب کی روح کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

ہندستان میں ہندو مسلم مسئلہ ایک عرصہ سے چلا آ رہا ہے جس کو انگریزوں نے کافی ہوا دی اور اپنا الو سیدھا کیا عہد قدیم میں جب ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ان نئے آنے والوں میں صوفیا بھی تھے جن کا مذہب انسانیت تھا، جنھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو انسانیت کا درس دے کر آپس میں میل محبت بڑھائی۔ ہندستان میں ایسے لوگوں کو سنت کہا جاتا ہے جن کے سرخیل سنت کبیر تھے۔ کبیر کے خیالات سے ہی تحریک حاصل کر کے ہندستان میں متعدد سنت ہوئے۔ ان میں سنت دادو دیال کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ان کی زندگی اور بچپن کے واقعات سنت کبیر سے کافی ملتے جلتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لودی رام نامی ایک برہمن کو دریائے سابر متی میں بہتا ہوا ایک بچہ ملا۔ بچہ کو گھر لاکر انھوں نے اس کی پرورش کی۔ یہی بچہ آگے چل کر دادو کے نام سے مشہور ہوا۔

دادو کا دل دنیا اور دنیاداری میں نہیں لگتا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کے ماں باپ نے انھیں شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔

لیکن اس کا بھی ان کے اوپر کوئی اثر نہیں پڑا۔ شادی کے سات برس کے بعد یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور سانبھر پہونچکر دھنیا کا کام کرنے لگے۔ اس وقت ان کی عمر تقریبًا بیس برس تھی۔

سنت دادو بڑے عبادت گزار اور عفو درگزر کے پتلے تھے ایک دن کی بات ہے، سنت دادو اپنے کمرے میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے کہ کچھ حاسد لوگوں نے کمرے کا دروازہ اینٹوں سے بند کر دیا۔ عبادت ختم کرنے پر انھوں نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ بند ہے۔ وہ کچھ نہ بولے اور پھر سے عبادت میں مصروف ہو گئے۔ کئی دنوں کے بعد جب پاس پڑوس کے لوگوں کو علم ہوا تو انھوں نے دروازہ کھولا اور مجرموں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے انھیں سزا دینے کی ٹھان لی۔

سنت دادو نے انھیں سمجھایا کہ ان لوگوں نے میرا بھلا ہی کیا ہے کیوں کہ مجھے عبادت میں مزید مصروف رہنے کا موقع دیا۔ لہٰذا انھیں سزا دینا مناسب نہیں ہے۔ میں تو ان کا احسان مند ہوں۔ تب سے ان کے نام کے ساتھ لفظ "دیال" (رحم دل) کا اضافہ ہو گیا اور یہ سنت دادو دیال ہو گئے۔

اس وقت تک ان کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ایک بار سنت دادو دیال کی ملاقات فتح پور سیکری میں شہنشاہ اکبر سے ہوئی۔ شہنشاہ نے ان کے علم کا پتہ لگانے کے لئے ان سے سوال کیا:

"خدا کی ذات، انگ (جسم)، وجود اور رنگ کیا ہے ــ؟"

انھوں نے دو لائنوں میں مختصر لیکن مکمل جواب دیا ـــ



عشق اللہ کی ذات ہے عشق اللہ کا انگ
عشق اللہ اوجود ہے عشق اللہ کا رنگ

شہنشاہ اکبر سنت دادو کا جواب سُن کر حیرت زدہ رہ گئے۔

سنت دادو کا کہنا تھا کہ اگر "انا" کو چھوڑ دیا جائے تو مزاج میں نرمی، رواداری اور رحم دلی کے جذبات پیدا ہوں گے اور بیشتر مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ نفس کو قابو میں کرنے پر بہت زور دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر نفس کو قابو میں کر لیا جائے تو خواہشات سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ سنت دادو انسان دوستی کو تمام مذاہب پر فوقیت دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہب تو خود انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

دادو نہ ہم ہندو ہوئیں گے نہ ہم مسلمان
شٹ درشن میں ہم نہیں ہم راتے رحمان

[دادو! نہ تو ہم ہندو ہیں اور نہ مسلمان اور نہ ہی ہمیں
چھ درشن (ہندوازم کا فلسفہ) سے کوئی مطلب ہے
ہمیں تو صرف اپنے خدا سے مطلب ہے]

سنت دادو کا کہنا تھا کہ مذہب میں دکھاوا ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ دکھاوے کی باتوں کو چھوڑ کر اگر انسان نیک نیتی کے ساتھ خدا کو تلاش کرے تو وہ اسے اپنے دل ہی میں مل جائے گا

دادو کوئی دوڑے دوارکا کوئی کاسی جا ہے
کوئی متھرا کو چلے، صاحب گھر ہی ما ہے

آج ہندو مسلم کا سوال ملک کے سامنے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے ہندو مسلمان کو بے دھرم کہتا ہے تو مسلمان ہندو کو کافر۔ حالانکہ دونوں اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہم ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم سب کی عبادت کا مقصد بھی ایک ہی ہے یعنی اپنے معبود تک پہونچنا۔ پھر آپس میں من مٹاؤ کیوں؟

تلخیص و ترجمہ:
نجیب انصاری

صحیح علاج

" ہندوستان جیسے ملک میں جہاں، کروڑوں انسان بستے ہیں جو ابھی نئی زندگی کے دور میں داخل ہوئے ہیں اور جہاں غلط مذہبی تعصب اور بے جا مذہبی جوش کا ابھر آنا کچھ دشوار نہیں ہے، ایسے حوادث ناممکن نہیں کیے جا سکتے۔ اس کا صحیح علاج صرف یہی ہے کہ ملک کے دیگر طبقات اس کی وجہ سے فریقانہ جذبہ نہ پیدا کر لیں۔ جس کی زیادتی ہو اسے ملامت کی جائے جس پر ظلم ہوا ہو اس سے ہمدردی کی جائے۔

یہ علاج نہیں ہے کہ ایک مقامی معاملہ کو طول دے کر اور تمام ملک اور فرقہ کا مسئلہ بنا کر کسی ایک فریق کو مقابلہ کی دعوت دی جائے۔ پھر دوسرا فریق بھی نئی نئی تیاریاں کرے اور اس طرح ختم نہ ہونے والی جنگ قائم ہو جائے۔"

——— مولانا ابوالکلام آزاد



سید آصف حسین عابدی

ڈائرکٹر، ڈپارٹمنٹ آف اوشن ڈیولپمنٹ
لودھی روڈ، نئی دہلی

ہماری تہذیبی قدریں

ملک کی آزادی سے لے کر اب تک ۴۵ سال کا تاریخی سفر ہم طے کر چکے ہیں۔ اس مدت میں ہم نے متعدد کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ صنعت اور سائنس کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ معاشی ترقی ہوئی ہے اور ہمارے رہن سہن کے معیار بہتر ہوئے ہیں لیکن دوسری طرف ہمارے سماج میں بہت سی خرابیوں نے بھی سر اٹھایا ہے۔ باہمی رواداری، محبت، خلوص اور ایثار کی وہ روایت جو ہمارے بزرگوں سے ہمیں ملی تھی نہ صرف یہ کہ کمزور ہو گئی ہے بلکہ دم توڑتی جا رہی ہے۔ اور انسان انسان سے نفرت کرنے لگا ہے۔ ہماری پرانی تہذیبی قدروں کی پاسداری کو کچھ کوتاہ اندیش لوگ دقیانوسیت قرار دینے لگے ہیں۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہی وہ قدریں ہیں جنھوں نے بنگال سے پنجاب تک اور کشمیر سے کنیاکماری تک اس وسیع و عریض ملک کے باشندوں کو جو الگ الگ مذہبوں کے ماننے والے، الگ الگ زبانیں بولنے والے ہیں جن کے رسم و رواج، لباس اور خوراک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان سب کو اتحاد اور یک جہتی کی ڈور سے باندھے رکھا ہے۔

ہماری ان تہذیبی قدروں کو پروان چڑھانے میں مشترکہ خاندان کے نظام کا بھی بڑا دخل رہا ہے جہاں ایک ہی چھت کے نیچے سب مل جل کر رہتے تھے اور بچوں کو شروع ہی سے ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھیں۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بڑوں کے ساتھ ادب سے پیش آئیں۔ ماں باپ اور اساتذہ کی فرمانبرداری اور پڑوسیوں کا احترام کریں۔ یہ تعلیم و تربیت انھیں اچھا انسان بنانے میں معاون ہوتی تھی اور ان کی صفوں سے گاندھی، نہرو اور ابوالکلام آزاد جیسے رہنمایانِ ملک و قوم نکل کر سامنے آتے تھے۔

مشترکہ خاندان کا نظام تو اب بکھر چکا ہے اور بدلے ہوئے موجودہ حالات میں اس کی بحالی ممکن بھی نہیں۔ اب یہ فرض ہماری درس گاہوں کا ہے کہ وہ ایسے اچھے شہری تیار کریں جو ہمارے بیش قیمت تہذیبی ورثے کے امین ہوں اور جن کے لیے ملک کا اتحاد و اتفاق اور فرقہ وارانہ یک جہتی ایک برتر قدر کا درجہ رکھتی ہو۔

سر سید احمد خاں نے کہا تھا:

"ہم کو تمام دوستوں سے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ہوں، سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیئے۔"

ان کا یہ قول آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اگر ہم نے اس راستے سے منہ موڑا اور دوستی اور محبت کے بجائے بیگانگی اور نفرت کو اپنا شعار بنایا تو ہماری انسانیت ہم سے رخصت ہو جائے گی اور ہم حیوانیت کا جامہ پہن لیں گے۔ ایسا ہوا تو یہ ہماری انتہائی بدبختی ہوگی۔

آیئے! اس منحوس امکان کو ٹالنے کے لیے ہم سب ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ یہ انسانیت کا بھی تقاضا ہے اور حب الوطنی کا بھی۔

▭▭

کنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو
گر تیرا حکم ہو تو برہمن کرے وضو

— درگا سہائے سرور



ڈاکٹر نجابت ادیب
نزد دردمیدی کتب انٹر کالج
قلعہ بریلی

مذہبی رواداری کا ستون

فضل الرحمٰن عرف چُنّا میاں کا تعمیر کردہ لکشمی نرائن مندر



مذہبی رواداری کے سلسلے میں جہاں ہندستان کے اور بہت سے شہروں کے نام لیے جا سکتے ہیں، وہیں بریلی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کٹھیر حکمرانوں میں جگت سنگھ، برل دیو، بانس دیو۔ روہیلہ حکمرانوں میں داؤد خاں، علی محمد خاں، رحمت خاں نیز دیگر حکمرانوں میں مدن کھتری، زبیر خاں، محمد رفیع خاں، مکرندرائے اور عین الملک وغیرہ کے دور حکومت میں سبھی مذاہب کے ماننے والوں کو یکساں اہمیت حاصل تھی۔ کٹھیر حکمرانوں کے عہد میں اہم عہدوں پر اگر مسلمان تھے تو دوسری طرف حافظ رحمت خاں کے دور میں سفارتی ذمہ داریاں منشی ٹیک چند اور منشی چترنج کے سپرد تھیں اور وزیر کے عہدہ پر بہادر سنگھ اور راجہ مان رائے فائز تھے۔

بریلی کی مٹی ہی میں مذہبی رواداری کی خوشبو موجود ہے۔

اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند کے قائم کردہ مدرسہ منظر اسلام کے لیے ترمد کرشنا کنور نے اپنی جائداد وقف کی۔ مسٹر ایلفرڈ جان ہنری نے موضع کریلی تحصیل و ضلع بریلی کی مسجد کی خدمت کی غرض سے اراضیات عطا کیں۔ آزاد ہندستان میں سیٹھ فضل الرحمٰن عرف چنّا میاں نے لکشمی نرائن مندر کٹرہ مان رائے میں تعمیر کرایا ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

فضل الرحمٰن عرف چنّا میاں دو سال کی عمر میں شفقت پدری اور سات سال کی عمر میں والدہ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کم عمری میں والدین کا انتقال ہو جانے سے انھیں معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ کچھ صاحب ثروت گھرانوں میں خدمت کے عوض اتنا مل جاتا تھا کہ گزر بسر کر سکیں مگر ان گھرانوں کا تحکمانہ رویہ ان کو سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ ایک روز لالہ گجراتی لال نے چنّا میاں کو مشورہ دیا کہ تجارت کرو، تجارت نوکری سے افضل ہے مگر جواب

میں چناّمیاں کچھ نہ کہہ سکے۔ لالہ گجراتی لال نے انھیں دو روپے دیے اور کہا کہ اس سے تجارت شروع کرو۔ انھوں نے اس رقم سے کچھ سامان خرید کر خوانچہ لگانا شروع کر دیا۔ تجارت کے منافع کی رقم سے انھوں نے لالہ گجراتی لال کے روپے واپس کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور ترقی اور کامیابی کی دعاؤں سے نوازا۔ اس احسان کا احساس چناّمیاں کو ہمیشہ رہا۔ بہر کیف اس معمولی سی رقم سے تجارت شروع کرکے انھوں نے خوب ترقی کی وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ انسان اور انسان کے درمیان مذہبی منافرت کی دیوار کیوں ہے؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوال تھے جن کو وہ حل کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں ان کی ملاقات ہری دوار کے سوامی ہری ملاپی جی سے ہو گئی۔ سوامی جی کو مختلف مذاہب کی اچھی معلومات تھیں۔ ان کی روحانی تعلیم و انسانی درد مندی کے پیغام سے چناّمیاں کافی متاثر ہوئے۔ سوامی جی ہی کی تحریک پر انھوں نے اپنی خرید کردہ آراضی واقع محلہ کٹرہ مان رائے پر مندر کی تعمیر کا ارادہ کیا جو پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ مندر کا افتتاح آزاد ہندستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے ۱۶ر مئی ۱۹۶۵ء (مطابق ۱۳ جیشٹھ سمبت ۲۰۱۷) بروز دوشنبہ (سوموار) کیا۔

تقریباً ۹۰۰ گز پر بنا یہ مندر فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ مندر تین منزلہ ہے۔ پہلی منزل میں کچھ دکانیں ہیں جن کی آمدنی مندر کے اخراجات میں استعمال ہوتی ہے۔ مندر کے صدر دروازہ پر اشوک کی لاٹ بنائی گئی ہے۔ صدر دروازہ کے سامنے مندر کے اندر لکشمی نرائن کی مورتی نصب ہے۔ مندر کا سنگ بنیاد عوام کی خواہش پر خود چناّمیاں نے رکھا اور لکشمی نارائن کی مورتی بھی انھیں کے ہاتھوں نصب ہوئی۔ مندر کے ہال میں داہنی جانب ایک اسٹیج بنا ہے جہاں سے مذہبی اور روحانی درس دیا جاتا ہے۔ اس چبوترے پر سامنے ہی ہندی میں "سیوک شری فضل الرحمان" لکھا ہے۔ ایک اور پتھر بھی وہیں نصب ہے جس پر فضل الرحمٰن کے دستخط ہیں۔ دیوار پر چہار جانب ارجن کو دی گئی شری کرشن کی تعلیمات کی عکسی تصاویر ہیں جن کے نیچے گیتا کے اشلوک درج ہیں۔ اس کے علاوہ اسی حصہ میں ہنومان کی مورتی اور شیولنگ بھی نصب ہے۔ مندر میں رادھا کرشن، سنتوشی ماں، سرسوتی اور درگا کی مورتیاں بھی ہیں۔ لکشمی نرائن کی مورتی کے قریب دروازہ کے اوپری حصے میں گیتا کا ایک اشلوک درج ہے۔ مندر کی تیسری منزل کے دروازہ پر لارڈ وشنو کی مورتی ہے اور ست سنگ (مجلس) میں شرکت کرنے والے عقیدت مندوں کے بیٹھنے کی غرض سے بالکونی بنی ہوئی ہے۔

اس مندر کی تعمیر احمد رضا عرف للّو مستری نام کے معمار کے ہاتھوں ہوئی۔ مندر کی تعمیر کے بعد سیٹھ چناّمیاں بلاناغہ مندر آتے اور آرتی کے بعد اپنے ہی ہاتھ سے پرساد تقسیم کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں کا پرساد لوگ شبھ (متبرک) سمجھتے تھے۔ مندر کی تعمیر میں سیٹھ چناّمیاں کے انہماک کو دیکھ کر شہر کے دیگر متمول افراد نے تعمیر کے لیے رقومات عطا کیں، جن کے نام مندر میں درج ہیں۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو سیٹھ فضل الرحمٰن عرف چناّمیاں نے اس دارِ فانی سے عدم آباد کی طرف کوچ کیا۔ ان کی قبر پر یہ پیغام کندہ ہے:

"نیک ہیں وہ لوگ جن سے دوسروں کا بھلا ہو۔"

"چناّمیاں کا مندر" مذہبی رواداری کا ایک ایسا ستون ہے جس پر ہندستان کی قومی یک جہتی کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

□□

"میں ہند کا ہوں۔
ہند میرا پیارا وطن ہے
وطن کے تئیں میرا پیار ہی میرا ایمان ہے
میں ایک ایمان دار
وطن پرست رہ کر
ہند کی مٹی میں مل جانا چاہتا ہوں"

——— امیر خسرو



ایک یادگار تصویر



آنجہانی گنیش شنکر ودیارتھی

مارچ ۱۹۳۱ء میں کان پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا فساد میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لئے شری گنیش شنکر ودیارتھی نے اپنی جان قربان کی تھی۔ اردو ہندی کے مشہور شاعر اور ناقد نایب اقبال ورما سحر ہتگامی نے "شری گنیش شنکر ودیارتھی" کے عنوان سے ایک مسدس چھ بند میں کہا تھا جو "زمانہ" کان پور جلد ۵۶ نمبر ۶ جون ۱۹۳۱ء میں صہ۲۹۹ پر چھپا تھا۔ ذیل میں اس کے تین بند درج کیے جاتے ہیں۔

ہندو و مسلم کے مل جانے کا تو حامی رہا
میل کی خاطر ہی تو نے آہ کتنا دُکھ سہا
آپ تو اپنے دلی جذبات کی رو میں بہا
جان ہی دے کر کیا پورا اُسے جو کچھ کہا
آج ہم سب کے لئے تو اے خدائے اتحاد
ہو کے قرباں بن گیا ہے رہنمائے اتحاد

علم تھا اور ساتھ ہی اس کے عمل پرداز تھا
تو غریبوں کا سدا ہمدرد تھا ہمراز تھا
انکسارِ طبع سے تو کس قدر ممتاز تھا
خدمتِ قومی کو تیری خدمتوں پر ناز تھا
رشک کے قابل رہی جس طرح تیری زندگی
رشک کے قابل ہے اب اس طرح تیری موت بھی

گرچہ تھا اپنا ہی اُجڑا گاؤں تیرا بھی وطن
اپنی یکتائی سے تھا تو واقعی فخرِ زمن
گو ہے تیری موت سے دل دقفِ آلامِ محن
پھر بھی یہ اک بات تسکیں کا سبب جاتی ہے بن
باخبر ہو کر جیا اور باخبر ہو کر مرا
تو مرا لیکن حقیقت میں امر ہو کر مرا



پیش کش :
ظفر رضوی